

چراغ راہ

جلد ۶

بہ ادارت

نعیم صدیقی

چراغِ راہ

ادب میں اسلامی قدروں کا علمبردار

اشاعتِ خاص • جنوری ۱۹۵۳ء

صفحات : ۴۳۶

قیمت : ساڑھے تین روپے

چندۂ سالانہ ۵ روپے

اشاعتِ خاص سمیت : ۷ روپے

منتظمِ اشاعت
[illegible] بلڈنگ
آرام باغ روڈ
کراچی

مذہب کے جامد اور ترقی پسند اجارہ دار کھڑے دیکھتے رہے۔

اور ———

ادب ایک نیا موڑ مڑ گیا

یہ کچھ حساس ادیب تھے

جن کی خودی کے شاہین جب پھڑپھڑائے تو موجودہ تہذیب الحاد کا بنایا ہوا فکری قفس ٹوٹ گیا۔ ان کے متحرک ذہنوں نے سوچنے کے نئے راستے نکال لیے۔ اور یہ ادب کی جنگاہِ خیالات میں ایک نیا معرکہ لڑنے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

ج

اِسلام کے سائنٹفک سماجی تصور کو
فکر و تخیل میں سمو کر
شعر و افسانہ کی دنیا میں
اِن حسّاس ادیبوں نے نئی ادبی قدروں کے چراغ جلا دیے ہیں

●

ہمارا کلمۂ ادب

ایک خُدا

ایک انسان

ایک نظامِ

● حلقۂ ادبِ اسلامی

اونچے خیالات، پاکیزہ جذبات صالح اخلاقی قدریں

ایک قوم کی اصل قوت و دولت ہوتی ہیں

خیالات، جذبات اور اخلاقی قدروں کے نشوونما دینے میں سب سے بڑا حصہ "ادب" کا ہوتا ہے۔ ادب اگر بگڑ جاتا ہے تو وہ خیالات کو پست، جذبات کو ناپاک اور اخلاقی قدروں کو برباد کر دیتا ہے۔

ہماری دنیائے ادب پر آج زندگی کا مادہ پرستانہ فلسفہ، انسان کا حیوانی تصور، ارتقا کا جدلی نظریہ اور اخلاق کا افادی نقطۂ نظر ہمہ گیر قوت کے ساتھ حکمراں ہے۔ چنانچہ ادب کی روح مسخ ہو رہی ہے۔ پھر ادیبوں، صحافیوں اور پبلشروں کی ایک فوج ہے جو عوام کے ذوق کو بگاڑ بگاڑ کر اور ان کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا اٹھا کر روپیہ کمانے کی مہم میں لگی ہے۔ یہ مہم خیالات، جذبات اور اخلاقی قدروں کو پست سے پست تر بنا دیتی ہے

کچھ نوجوان اہلِ قلم ہیں جو اس فضا کے خلاف جہاد کرنے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ یہ زندگی کا خدا پرستانہ فلسفہ، انسان کا تصورِ عبودیت و خلافت، ارتقاء کا توافقی نظریہ، اور اخلاق کی مستقل قدروں کا نقطۂ نظر لے کر خیالات کا ایک نیا محاذ قائم کر چکے ہیں۔

خیالات کے اس نئے محاذ کا ایک اہم بازو ادارہ چراغِ راہ ہے۔

ادارہ چراغِ راہ کی خدمات دو شعبوں میں منقسم ہیں:

ایک شعبہ ——— ماہنامہ "چراغِ راہ" (کراچی) ہے

جو نعیم صدیقی کی ادارت میں برابر پانچ سال سے ہر مہینے اپنے مقالات، افسانوں اور نظموں کے ذریعے زندگی بخش صالح خیالات و جذبات کا ایک سیلاب لے کر نمودار ہوتا ہے۔

دوسرا شعبہ ——— مکتبۂ چراغِ راہ (کراچی) ہے

جو چوہدری غلام محمد کی زیرِ نگرانی ایک طرف اونچے درجے کے تعمیر پسند مصنفین و ادبا کی تصانیف اعلیٰ طباعتی معیار کے ساتھ سامنے لاتا ہے، اور دوسری طرف وہ مختلف پبلشروں کی مطبوعات کا جائزہ لے کر اپنے مقصدی معیارِ انتخاب پر ایک ایک چیز کو پرکھ کر رائے قائم کرتا ہے کہ کونسی چیزیں ایسی ہیں جو قوم کو اونچے خیالات، پاکیزہ جذبات اور صالح اخلاقی قدروں سے مالا مال کرنے والی ہیں۔ پھر وہ ان چیزوں کی ایک مرکز سے فراہمی کا انتظام کرتا ہے

● اس محاذ کو مضبوط تر بنانے کے لیے ہم آپ سے تعاون کی درخواست کرتے ہیں

آپ کا اور ہمارا تعلق محض کاروباری نوعیت کا نہیں بلکہ ایک مقصد کے لیے جدوجہد کرنے والے رفیقوں کا ہونا چاہیے!

خدا فراموش تفریحی ادب

اور

لوگوں میں سے

ایک انسانی کردار

ایسا بھی ہے

جو

فضول تفریحی باتوں کا گاہک ہے!

تاکہ

ان باتوں کے ذریعے

حقیقت کو جانے بوجھے بغیر

اللہ تعالیٰ کے دتباتے ہوئے مسلکِ حیات سے

[عوام کو]

بہکاتا پھرے

یہی تو ہیں، جن کے لیے دردناک سزا مقدر ہے!

اور

جب کبھی

اس کے سامنے ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں

تو یہ بڑی اکڑ کے ساتھ منہ پھیر لیتا ہے

جیسے کہ اس نے سنا ہی نہ تھا ——— جیسے کہ اس کے کانوں میں گرانی ہے

پس

ایسوں کو المناک عذاب کا مژدہ سنا دو! [لقمٰن — رکوع (۱)]

چند یارانِ حلقہ

ماہر القادری ـــــــ

کسی قدر فلمی سا چہرہ ـــــــ غالباً ایک عرصہ تک فلمی دنیا سے مَس رہنے کی وجہ سے! بڑے گندے تالاب میں رہا! مگر ایک ہی مثال ہے کہ کنول کی طرح رہا! دو دو ہزار روپے تک کی آمدنی دے جانے والی دنیا کو ٹھکرا کے کراچی میں فقیر بنا پڑا ہے۔ ـــــــ جی ہاں! وہی کراچی جہاں "دو دو ہزار روپے" کے دام میں بڑے بڑے شاہین اپنی خودی سمیت پڑے پھڑپھڑا رہے ہیں!

زبان کا ماہر! فن پر قادر! لہٰذا ماہر القادری کہلانے کا سو فیصدی مستحق! اصل میدان تنگ و تازِ شعر، ذہنی سانچہ غزل کا، کلاسیکل غزل کا، فکری قدروں کے لحاظ سے انفرادیت کا حامل! قدرت افسانے پر بھی ہے لیکن کیا مجال جو افسانے پر نئے رنگ کی پرچھائیں بھی پڑنے دے، اپنی کلاسیکیت پر اٹل! ساتھ کے ساتھ مقصد کے تقاضے سے "مقالہ نگاری" اور اس میں استدلال اور جذبے کا زور! ـــــــ یہ سیلاب مولانا آزاد اور مولانا عبد الماجد جیسی بڑی چٹانوں کو بھی ریلتا دیکھا گیا ہے

نقدِ ادب میں وہ چابکدستی کہ ہر مہینے اچھے اچھوں کو چھلنی سے چھان، چھاج سے پھٹک کر رکھ دیتا ہے۔ کوئی تنکا اور کوئی کنکر نگاہ سے بچ کر نہیں نکل سکتا!

مشاعرے کے میدان میں شان مجاہدانہ رہتی ہے۔ "آنکھیں نیم باز" ہاتھ اٹھتا ہوا۔ مل جیسے بل کھا جانے ہی والا ہو۔ ایسے حال میں یہ اندیشہ ہونے لگتا ہے کہ ماہر کا سارا وجود اس کی مترنم آواز میں ڈھل جائے گا۔

دو چیزیں ماہر کے لیے ناقابلِ برداشت ہیں ـــــــ ایک "ترقی پسند" دوسرے منکرینِ حدیث! باقی ساری دنیا کے لیے عالی ظرف اور روادار!

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضور کے دین کی سچی محبت، شعر و ادب، ترنم، شگفتگیٔ مزاج اور حفظِ مراتب کے اوصاف کو جب بھی آپ ملا کر دیکھیں گے تو ہر مرتبہ ماہر القادری ہی نظر آئے گا!

اسعد گیلانی ـــــــ

کسی قدر چندھیائی ہوئی آنکھیں، حسن کا نمایاں حصہ پلکیں ـــــــ آج کل دوشیزاؤں کی امنگ لیے ہوئے ـــــــ ماتھے پر بل جو مسکرانے پر بھی دور نہیں ہوتے۔ رنگ سانولا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بڑا پختہ ہوتا ہے! شیروانی کے لیے تھان انتخاب کرنے کا خاص سلیقہ، سگرٹ سے راہ و رسم نہیں، لیکن ایش ٹرے پسند کرنے کے لیے حسن ذوق موجود!

اپنے ناول کا کردار ہیں کر ایر فورس کے راستے سیدھا جہنم کے دروازے پر جا پہنچا جہاں سے لوگ ہنستے مسکراتے، روپے جیبوں میں کھنکھناتے، یکے بعد دیگرے اندر کودے جا رہے تھے۔ مگر اسعد میں کھوچنے کی بیماری موجود تھی، اس نے سوچا اور اباؤٹ ٹرن کر گیا جہنم کے دروازے سے لوٹا تو پھر ایر فورس میں بھی نہیں ٹکا۔ سیدھا اپنے گھر آ پہنچا! ——— مگر اس کا گھر کہاں ہے۔

"گھر اس کا نہ دلی، نہ صفاہاں، نہ بخارا"

اس کے گھر کا نام تو "جہانِ نو" ہے ——— جہانِ نو لفظوں کی ایک نگری، تخیّل کی ایک بستی، ایک کاغذی گھروندا! مگر اسے اپنے کاغذی گھروندے میں بھی پناہ نہ ملی۔ اس گھروندے پر سیفٹی ایکٹ کی بجلی گری ——— اور وہ صرف "پرواز" اور "فورس" بن کر رہ گیا! اب پھر وہ خیالات کے تنکے چن چن کر جہانِ نو کا کاغذی نشیمن آراستہ کر رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ آسمان کی طرف نگاہِ انتظار سے دیکھتا بھی جاتا ہے!

جب وہ آنکھیں بند کئے یکسنت جہنم کی طرف بھاگ رہا تھا تو اچھا خاصا "ترقی پسند تھا" جونہی اس نے آنکھیں کھولیں، وہ رجعت پسند ہو گیا۔ "انا للہ وانا الیہ راجعون"

رجعت پسند ہونے کے بعد سب سے زیادہ تشویش اس شخص کو اس عورت کے مارے ہوئی جو زندہ زمین میں مر چکی ہے۔ اور پاک زمین میں جنم لے چکی ہے! یہ بھی عجب جادو کی گڑیا ہے کہ پانچ ہی برس میں بھرپور جوانی کا ایک پیکر بن گئی ہے:
حال یہ ہے کہ اب:

ہم ہوئے۔ تم ہوئے کہ میر ہوئے ... اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے۔

وہ مسکراتی ہے تو چھن چھن کرتے ڈالر برس پڑتے ہیں اور یار لوگ ان سے جھولیاں بھر بھر کے پاکستان کو مالا مال کر رہے ہیں۔
اسعد ایسی سونے کی چڑیا پر انگلی اٹھاتا ہے؟ ——— غدار ہے غدار!

وہ اسعد سے ذرا بھی ضرور ہے، مگر دل کو یہ کہہ کر اطمینان دلاتی ہے کہ کیا ہے ایک ملّا ہی تو ہے" اصل طاقت تو مسٹر کے پاس ہے۔ اور مسٹر اس کی مٹھی میں ہے۔ میاں بیوی راضی، تو کیا کرے گا قاضی!

کچھ مدت سے اسعد کے ذہن میں یہ کشمکش رہی ہے کہ اس عورت کے خلاف ادبی و تحریکی دو ہرے محاذ سے لڑے، یا یکسو ہو جائے؟ بات یہ ہے کہ جلسہ گاہ میں دریاں بچھاتے ہوئے سوچنا کوئی آسان کام نہیں، چنانچہ اسعد نے اپنی ادبی حس کے خلاف ہمہ تن خاموش احتجاج پر بیٹھنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اب وہ اور اس کی بیگم صاحبہ دونوں مالیرمیں مطالبے کے محاذ پر عوام کو جمع کر رہے ہیں جب اس کام سے اسعد تھک کر لوٹتا ہے تو تکان دور کرنے کے لئے "جہانِ نو" کی قلمی خدمت کرتا ہے۔
ورنہ یوں وہ ادب کے خلاف بدستور بھوک ہڑتال کئے ہوئے ہے۔ ہتھیار ڈالنے والا نہیں!

ضیا محمد ضیا ———

یہ ایک اور چندھیائی ہوئی آنکھیں ایک اور سانولا رنگ، اور ایک اور سلوٹوں والی پیشانی ہے! جن کو "کمپوز" کرنے سے ضیاد بنتا ہے۔

سرسری نگاہ ڈالئے تو ہرگز تصور نہ کیجئے گا کہ یہ کوئی غیر معمولی آدمی ہے! لیکن مولانا غنیمت کے دیس کا یہ نوجوان واقعی غنیمت ہے اور اس کا غیر معمولی پن اس کے چہرے پر وضاحت سے درج ہے۔

ہمارے شعر کے محاذ کا جانباز سپاہی! تخیل سے مالا مال اور فن میں مضبوط!
چراغِ راہ کی لَو کو برقرار رکھنے کے لئے اپنے خون کے سارے قطروں کو ودیعتِ مژگانِ یار" سمجھ کر اس میں نچوڑ دیتا ہے! تاکہ حساب نہ دینا پڑے!

عاصی ضیائی ــــــــ

ہے تو رام پوری، مگر رام پور کی مخملی ٹوپی سے بالکل مختلف!
اُجلا اور چوڑا چہرہ، شخصیت کا ترجمان! ــــــ ہاتھ میں ہمیشہ چرمی کاغذات دان، اور اس کاغذات دان میں اردو جیثیت گھر کی زبان کے محفوظ! کسی خانے میں روزمرہ کسی میں محاورہ کسی میں گل بکاؤلی اور چہار درویش کی زبان کسی میں اخلاقِ جلالی کی، کسی میں بائیبل کے ترجمے کی!
زبان جس شخص کے گھر کی ہو اسے قدرت چاہے پروفیسر ہی بنائے رکھنے پر کیوں نہ بضد ہو، وہ ادیب بنے بغیر رہ ہی نہیں سکتا!
یوسف کے وعظ کا مصنف! ہمارا واحد کامیاب تمثیل نگار! خاکہ اڑانے کا ماہر تنقید میں انفرادیت کا حامل۔

جیلانی بی اے : ــــــــ

بی اے میں دینیات کے پیریڈ میں ایک نوجوان جو سب سے زیادہ کالجیئٹ حرکات کرتا تھا وہی ایک دن دین کا علمبردار بنا کھڑا تھا۔ اسی کا نام ہے جیلانی بی اے۔
ادب کا تذکرہ چھیڑا نہیں کہ جیلانی بس ہمہ تن ایک فقرے میں ڈھل جائے گا۔ "میں تو کچھ بھی نہیں ہوں!"
جیلانی نے "فضل کریم" کرایا تو اندازہ ہوا کہ یہ شخص کچھ بننے والا ہے۔ "موت کب آتی ہے" اور "اذان" لکھنے پر وہ کچھ قابلِ غور بن گیا۔ "احمد یہ" میں وہ ایک ہی جست لگا کر افسانہ کی سرزمین کا مستند شہری بن گیا۔ لیکن چارلس ڈیلیو فلپس کا "میں" اور "انا نمبر ایک" لکھنے کے بعد وہ اچانک ایک ممتاز افسانہ نگار اور ایک چابکدست ادیب تھا۔
اور اب ــــــ اب وہ لبلم جیسی گہری تجزیاتی کہانی پیش کر کے عالمگیر مرتبہ رکھنے والے ادیبوں میں جگہ پا رہا ہے لیکن آج بھی اسے اگر دیکھیں تو اس کا چہرہ بے معنی سی مسکراہٹ کے ساتھ آپ سے کہے گا۔
"میں تو کچھ بھی نہیں ہوں"
یہ گویا "انوبادی" کے بعد ایک نئی تکنیک پیدا ہوا ہے!

کوثر نیازی : ــــــــ

مولانا عبدالستار خان نیازی سے ہم ضلع، ہم خاندان ہونے کی نسبت کے سوا اور کوئی وجہ یکسانی نہیں!
مقصد کے لئے گہرے جذبات، مزاج میں تحریکیت غالب، تخیل نشوونما پاتا ہوا ــــــ ان رسالوں کے مستقل پرچہ ہر رسالے میں پہلے ایک، پھر دوسری، پھر تیسری ــــــ اور ایک غزل یا سانیٹ مکمل ہو جاتا ہے!
اعلیٰ اعلیٰ حدہ تیار ہا ہے کر ــــ

اور اس کی محبت تمام کی تمام وقف ہوئی ہے حق کے لئے ، اور اسکی نفرت ساری کی ساری ہے باطل کے خلاف!

فضل من اللہ ——

شکل اور صورت اور حلیہ کبھی خفیف سا شبہ بھی نہ دلائے گا کہ اس شخص کو کوئی ادب کے شہر میں گھسنے بھی دیگا —— مگر یہ صبح کو کسی کیکر کی مسواکیں کاٹ کے لانے والا، دن کو کلرکی کی گھاس چھیلنے والا، اور رات کو افسانوں کے پیکر تراشنے والا انوکھا سا شخص شہر ادب میں بے کھٹکے گردش کرتا ہے۔

—— حلقۂ ارباب ذوق سے لے کر حلقۂ ادب اسلامی تک!

پس اللہ کی طرف سے فضل جو ہوا!

مسعود جاوید ——

ایک —— بظاہر مسکراتا ہوا —— زخمی، تقسیم کی چھری کا زخمی! بنگالیوں سے زیادہ اپنوں کا زخم خوردہ! جس کی ٹیسیں ہی اس کا ادب ہیں!

شمیم جاوید ——

اس فسیق کی سب سے پہلی نظم جہان نو میں آئی تو میں نے اس کی گہرائیوں میں ایک سرچشمۂ تخلیق کو اُبلتے ہوئے پایا۔ اپنے بعض ساتھیوں پر اپنا تاثر بیان بھی کیا کہ یہ تو میں کہہ نہیں سکتا کہ شمیم کوئی لڑکا ہے یا لڑکی —— لیکن اسے آگے چل کر کچھ بننا ہے۔

چنانچہ وہ بن گیا اور "منزل ہے کہاں تیری" کے ذریعے ایک دم ابھر کر سامنے آگیا!

عاصی کرنالی ——

غزل کے سانچے میں نظم کے مقاصد کو ڈھال کر لانے میں یکتا، تخلیقی صلاحیت اور تخیل کی نزاکت اور گہرائی میں منفرد!

اتنا بڑا نیک کام کرکے بھی ہے پھر عاصی کے عاصی!

عبدالکریم ثمر ——

شاعری کی دنیا کا مارشل!

جو شخص موٹر سائیکل کی پھٹ پھٹ کے حملوں میں سوچنے والا دماغ اور جذبات بھرا دل زندہ رکھ سکتا ہے۔ اسے مارشل کے سوا اور کیا کہئے!

مندرجات

ادبی و تنقیدی مقالات :

تمثیل

نظمیں :

افسانہ و طنز

غزلیں

جائزہ پاکستان

سوچ بچار

تعریف اللہ ہی کے لئے جس نے اب تک ہمیں انسانیت، اسلام اور ادب کی خدمت کی توفیق دی اور جس نے چراغِ راہ کو ایک عظیم الشان صالح فکری انقلاب برپا کرنے کا ذریعہ بنایا! جو کچھ اب تک ہم کر سکے ہیں اسی کے سہارے کر سکے ہیں اور جو کچھ آئندہ کرنے کے ارادے ہیں ان کے لئے بھی قوت و توفیق اسی سے طلب کرتے ہیں!

اللہ کی طرف سے لمحہ لمحہ رحمت و سلامتی نازل ہو اس انسانِ اعظم کی روحِ اقدس پر جو ہمارے لئے ذریعہ بنا اس سعادت کا کہ ہم وہ نورِ حقیقت پا سکے جس کے بغیر یہ زندگی اندھوں کی طرح تاریک ٹوپے مارتے گذرتی، جو ہماری ذہنی کائنات میں آفتاب بن کر چمکا، جس نے خیر و شر کے دوراہے پر کھڑے ہو کر قافلۂ انسانیت کو صحیح رہنمائی بہم پہنچائی۔ جس نے سچائی اور انصاف کی تدروں کو مجلاّ کیا، ان کو روزمرہ زندگی کے معاملات میں کار روح بنانے کا فن سکھایا، جس نے دین و سیاست کی تقسیم کے نظریئے کی جڑ کاٹ دی، جس نے رہبانیت سے نجات دلائی اور صالحیت کے سانچے میں "اجتماعی انسان" کو ڈھالا، جس نے عورت کو معاشرے میں اس کا صحیح مقام دلایا، جس نے انسان اور انسان کو کاٹنے والے نظریات کو پامال کر کے چھوڑا، جس نے بدی کے خلاف لڑنے والے انسان پیدا کر کے نیکی کا ایک مستقل محاذ خیالات اور عمل کی دنیاؤں میں ہمیشہ کے لئے قائم کر دیا! ــــــ ہم اس انسانِ اعظم کے اتنے احسان مند ہیں، جتنے اپنے والدین تک کے بھی نہیں ہیں!

"چراغِ راہ" ایک مقصدی جریدہ ہے۔ یہ کاروبار نہیں، یہ جہاد ہے جو ہم چراغِ راہ کے ذریعے خیالات کی دنیا میں لڑ رہے ہیں۔ یہ جہاد ہے الحاد کے خلاف، فسق و فجور کے خلاف، ظلم اور شیطنت کے خلاف، جباریوں اور قہاریوں کے خلاف، فواحش اور منکرات کے خلاف، مفاد پرستیوں اور اغراض کے خلاف، قوم و وطن اور نسل و رنگ کی عصبیتوں کے خلاف، ــــ اور ہاں یہ جہاد ہے موجودہ عالمگیر دورِ تہذیب کی بنیادی فکر کے خلاف، اس کے فلسفۂ کائنات کے خلاف، اس کے نظریۂ انسان کے خلاف، اس کے تصورِ تاریخ کے خلاف، اس کی حکمتِ اخلاق کے خلاف ــــ یہ جہاد ہے مارکسزم کے خلاف، یہ جہاد ہے فرائڈی نفسیات کے خلاف، یہ جہاد ہے میکیاویلی کی پیش کردہ سیاسی حکمتِ عملی کے خلاف!! علم و تحقیق کے میدان میں بھی، عمل کے میدان میں بھی، اور شعر و افسانہ کے میدان میں بھی!

چراغِ راہ کی عمر آج پورے پانچ سال ہو گئی ہے ــــ اور اس پانچ سال میں کوئی لمحہ ایسا نہیں گذرا کہ راہِ حق کا یہ سپاہی اپنے اصول و نظریات کے ہتھیار لئے اپنے محاذ پر سرگرم تصادم نہ ہو۔ اس نے کبھی کمر نہیں کھولی، اس کے قدم کبھی نہیں ڈگمگائے، اس نے موقف کبھی نہیں بدلا، یہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹا، یہاں تک کہ اس پر سیفٹی ایکٹ کا بے پناہ وار بھی ہوا لیکن چھ مہینے زخم خوردگی کی حالت میں گذار کر یہ سپاہی پھر اٹھ کھڑا ہوا اور جس مقام پر گرا تھا اس سے آگے بڑھ کر دوبارہ معرکہ آرا ہو گیا۔ اس نے نئی زندگی "قیادت نمبر" شائع کر کے شروع کی جس میں انقلاب دشمن طاقتوں کو چیلنج دیا گیا تھا کہ:-

[illegible]

<u>شورشِ کاشمیری</u>

گر اک چراغِ حقیقت کو گل کیا تم نے
تو موجِ دُود سے صد آفتاب ابھریں گے

اس کی مقبولیت کا عالم یہ ہوا کہ مہینے بھر کے بعد خود مرتب کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ کوئی کاپی کہیں سے حاصل کر سکے!

●

"قیادت نمبر" کے بعد دوسرا معرکہ آرا نمبر "شعر نمبر" کے عنوان سے پیش کیا گیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اسلام پسند شعرا کی پنج سالہ کاوشوں کا ایک جائزہ لے کر منتخب چیزوں کو یک جا پیش کر دیا جائے تاکہ ہمارا اپنا حلقہ بھی اپنے اب تک کے کارنامے کو جان سکے اور دوسری طرف ہمارے مخلص ناقدین بھی، اور ہمارے اوپر پھبتیاں اچھالنے والے حریف بھی اس انتخاب کے ذریعے اندازہ کر سکیں کہ اسلامی فکر دنیائے شعر میں کہاں تک پیشقدمی کر چکی ہے اور اس کی اصل طاقت کتنی ہے!

اس نمبر کی ترتیب سے قبل خود راقم الحروف کو بھی فی الواقع دنیائے شعر کی فتوحات کے بارے میں صحیح اندازہ نہ تھا، مگر جائزہ و انتخاب کے مراحل میں سے گذرتے ہوئے بڑا اطمینان ہوا کہ کام تو بہت سا ہو چکا ہے۔

یہ نمبر بھی اپنے مقصد میں کامیاب رہا!

●

اس کے بعد ایک ماہانہ اشاعت ایک اہم کتاب کی تلخیص کے لئے وقف کی گئی۔ یہ تھی "فورسڈ لیبر ان رشیا"۔ کتاب خود میری نظر سے گذری اور اس میں ایسا ٹھوس مواد دیکھنے میں آیا جو روس کی "ہو اہنہ" اشتراکی جنت کے ایک تاریک جہنمی گوشہ پر روشنی ڈالنے والا تھا۔ مناسب معلوم ہوا کہ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ ان معلومات سے بے خبر نہ رہے۔ چنانچہ پروفیسر عبدالحمید صاحب نے اس کا تلخیصی ترجمہ کیا اور ایک خصوصی اشاعت کے ذریعے اسے ادارہ چراغِ راہ نے قارئین کے سامنے رکھ دیا۔

●

آج ہم پورے اہتمام کے ساتھ چراغِ راہ کی ایک اور اشاعتِ خاص پیش کر رہے ہیں۔

ارادہ تو شروع میں یہ تھا کہ ۱۵ اگست ۵۲ء کو "پاکستان کے پانچ سال" کے عنوان سے ایک اشاعتِ خاص پیش کی جائے جس میں پاکستان کا جائزہ لیا جائے۔ اس کے لئے منصوبہ بنا کر علمی معاونین کو خطوط لکھے گئے اور عنوانات تقسیم کر دئے گئے۔ لیکن جولائی کے شروع میں اندازہ ہوا کہ مقالات والے اس غرض کے لئے کافی نہیں ہیں کہ پانچ سال نمبر نکالا جا سکے۔ چنانچہ منصوبہ میں ترمیم کر دی گئی۔ فیصلہ یہ ہوا کہ جنوری ۵۳ء میں ایک ایسی اشاعت پیش کر دی جائے جس میں جائزۂ پاکستان کے مقالات کے علاوہ، ادبی و تنقیدی مقالات، افسانے اور نظمیں شامل ہوں۔

آج ہم اسی ترمیم شدہ منصوبہ کے مطابق یہ مجموعۂ اوراق پیش کر رہے ہیں۔

اب یہ اشاعت ایک علمی اشاعت بھی ہے، اور ایک ادبی اشاعت بھی!

●

ایک مدت سے ہمارے ادب پر ملائیت کی پھبتیاں کسی جا رہی ہیں، اور پھبتیاں کسنے والے نہ جانے کس بنا پر اس زعم میں مبتلا ہیں کہ ایک ابھرتی ہوئی طاقت کے اقدام کو محض پھبتیاں کس کر اور بوکھلاہٹ دکھا کر روکا جا سکتا ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ حضرات اس سیدھی سی بات کو کیوں نہیں محسوس کرتے کہ "ملائیت" اپنا کوئی تقاضا ہی سرے سے ایسا نہیں رکھتی جو تخلیقی ادب کا موجب بن سکتا ہو۔ ملائیت ایسے نظریات ہی سے محروم ہے کہ جو اسے خیالات کی جنگاہ میں لا کر کھڑا کریں۔ ملائیت تو سماجی زندگی، اجتماعی مسائل اور کشمکش کار

سے گریز کا رجحان رکھتی ہے۔ "زندگی" سے اسے کبھی واسطہ پڑتا ہی نہیں کہ وہ اس سے اثر لینے کے بعد جوابی تاثر کا اظہار کرے۔ ملائیت تو انفرادی مذہب گری کی مظہر ہوتی ہے۔ وہ اپنے مذہب کو زندگی سے کاٹ کر مسجد کے محراب و منبر میں اور خانقاہوں اور حجروں میں سینت سینت کے رکھتی ہے۔ وہ ہر قسم کے سماج اور ہر قسم کے نظامِ اجتماعی کے سائے میں امن و سکون کے ساتھ رہ سکتی ہے۔ وہ ہر طرح کے ماحول کے ساتھ سمجھوتہ کر سکتی ہے۔ وہ آدمی کو متحرک ذہن دیتی ہی نہیں، وہ تو بس پتھر کے مجسمے بناتی ہے، وہ کسی طاقت سے لڑنے کا جذبہ پیدا ہونے ہی نہیں دیتی بلکہ ہر بارگاہ پر سرِ تسلیم خم کر دینے کی اسپرٹ ابھارتی ہے

——— پھر ہمارے یہ حریف بتائیں کہ ملائیت کیسے شعر و افسانہ کی تخلیق کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ اگر ایسا ہو سکتا ہے تو پھر یہ ایک حیرت ناک معجزہ ہوگا!

آیئے، ہم آپ کو اس دھوکے سے نکالیں جس میں آپ مبتلا ہیں۔ اسلام کا ایک وہ تصور ہے جو "انفرادی مذہبیت" کے ذوق نے پیدا کر دیا ہے جس کے مظاہر آپ چاروں طرف پھیلے دیکھتے ہیں اور جو حال ہی میں نہیں، ماضی کی تاریخ میں بھی دور تک نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ تصور واقعی ملا پیدا کرتا رہا ہے اور ملائیت اس کا لازمہ ہے اور اس تصور نے ادب کی دنیا میں کبھی اپنے حقوق کا دعویٰ نہیں کیا! لیکن ہم اسلام کے اس تصور کے مفتوحین ہیں جو انسان کو ایک اجتماعی وحدت کی حیثیت سے لیتا ہے اور اس کے مسائل کو اسی حیثیت سے زیرِ غور لاتا ہے اور ان کا حل کرنے کے لئے پھر وہ اسی حیثیت سے ایک اصول، ایک فلسفہ ایک ضابطہ اور ایک تحریکی جذبہ دیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہمارا اسلام ایک سماجی تحریک ہے، اور اس سماجی تحریک کا ہم ایک سائنٹفک تصور لے کے میدان میں آئے ہیں۔ اسلام کا یہ سائنٹفک سماجی تصور فطری طور پر خیالات کی دنیا میں نفوذ کرنا چاہتا ہے، نفوذ ہی نہیں کرنا چاہتا وہ اس دنیا کو فتح کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ وہ شعر و افسانہ میں آج آپ کے سامنے راستے بنا رہا ہے!

●

ہم پوچھتے ہیں، کیا ادب صرف الحاد کے فلسفوں کو اپنے اندر جذب کر سکتا ہے، لیکن خدا پرستی اس کے اندر کوئی جگہ نہیں پا سکتی؟

ہم پوچھتے ہیں کہ کیا ادب صرف رندانہ ہوسناکیوں کے اظہار کے لئے وقف ہے، اس میں کسی پاکیزہ جذبے کو قبول کر لے کی استعداد نہیں؟

ہم پوچھتے ہیں کہ کیا ادب صرف اشتراکی سماجی تصور کا اجارہ بن کے رہنے کے لئے ہے، وہ اسلام کے سماجی تصور کا ترجمان نہیں بن سکتا؟

ہم پوچھتے ہیں کہ کیا صرف افادی نظریۂ اخلاق کی پسندیدہ قدریں اس کے اندر نمایاں کی جا سکتی ہیں اور اسلامی فلسفہ اخلاق کی قدروں کے دیئے اس میں نہیں جلائے جا سکتے؟

ہم پوچھتے ہیں کہ کیا شعر و افسانہ صرف صنفی انارکی اور زنا کے داعیات کا آلۂ کار بن سکتے ہیں، انہیں زوجیت اور عصمت کے رجحانات کا خادم نہیں بنایا جا سکتا!

ہم پوچھتے ہیں کہ کیا ادب میں جمالیت و فنیت فقدانِ افکار کے لئے وقف ہے جو انسانیت کے لئے مہلک زہر ہیں، لیکن اُن افکار سے جو انسانیت کے لئے اصل جوہرِ حیات ہیں ادب کے جمالی اور فنی پہلو لازماً غارت ہو جانے چاہئیں؟

ممکن ہے کہ آپ ان سوالات کا جواب بغیر سوچے سمجھے اثبات میں دیں، لیکن ہم، اور ہم نہیں، ہماری ادبی نگارشات ان کا جواب ایک پر زور نفی میں دیتی ہیں! کیا آپ نے اس جواب پر توجہ فرمائی!

●

ہم پر طنز کر کے کہا جاتا ہے کہ ادب کے لئے "سلیقہ" چاہئے! ——— (اور ہم کہتے ہیں کہ طنز اور پھبتی کے لئے بھی تو سلیقہ ضروری ہے) اس مشورہ کا شکریہ!

لیکن براہِ کرم ذرا ہمیں یہ بتایئے کہ چراغِ راہ نے (اس وقت دوسرے جرائد کے فائل سامنے نہیں ہیں) گذشتہ ایک سال میں شعر و افسانہ

سوچ بچار

ں میں حلقۂ ادبِ اسلامی کے اہلِ قلم کے جو نتائجِ کاوش پیش کئے ہیں، ان میں کوئی ادبی سلیقہ تھا یا نہیں؟

ہم نے ایک نفسیاتی تجزیہ کارانہ کہانی جیلانی کے قلم سے "چارلس ڈبلیو فلپس کا کیس" کے زیرِ عنوان ابھی ستمبر ہی کے شمارے میں پیش کی تھی۔ خدا را ارشاد ں میں جمالیاتی و فنی سلیقہ تھا یا نہیں؟ اس میں کتنی ایک ملائیت آپ نے تحقیق فرمائی؟ ہم چیلنج کرکے پوچھتے ہیں کہ اس میں کوئی جھول اور کوئی بدذوقی ہو دیکھو تو ضرور اس کی نشاندہی فرمائیے!

پھر اسی سال چراغِ راہ میں راقم الحروف کے قلم سے "نقطے اور لکیریں" "یہ ملا، یہ مولوی" "میں نہیں چاہتا مگر" اور "ڈھمک ڈھم" شائع ہوتے ہیں، میں ان کو گراں قدر مشورہ حاصل کرنے کے لئے پیشِ خدمت کرتا ہوں کہ فرمائیے ان میں کہاں کہاں ادبی سلیقہ غارت ہوا ہے اور کہاں کہاں ملائیت کے چھے آپ کو محسوس ہوتے ہیں؟

اب آئیے، ایک نظر آسمانِ شعر پر ابھرنے والے نئے ستاروں پر بھی ڈال لیجئے۔

ضیا محمد ضیاء نے اس سال "اشتراکی شاعر سے" (انجمن ترقی پسند مصنفین کے منشور کے بعد)، "دفعہ ۱۴۴"، "تماشائیو امت دکھاؤ"، "انقلاب مصر" چار نظمیں معیاری مذاق پیش کی ہیں جن میں تخلیق بھی ہے، جمالیت بھی اور نغمیت بھی! فروغ احمد کی نظم "فرار کے بعد" ایک جوہر دار نظم ہے۔ شاد عارفی نے "فرقانِ جدید" پیش کی ہے۔ ـسم الحروف کے قلم سے "اقبال کے قدر دان" "جشنِ یومِ حرّیت" "بھورے گتے" "مالی! مالی!" "بھوکے ہیں"، پانچ نظمیں پیش کی گئی۔

علاوہ بریں غزل کے روئے زیبا کو ضیا، کوثر نیازی اور دوسرے نوجوان رفقا نے ایک نئی آب و تاب دینے کے لئے جو کچھ کیا ہے اس کی تفصیل ں کرنا ممکن نہیں۔

یہ جن چیزوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، ہم ان کو آپ کے سامنے رکھتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ ان میں شعری سلیقہ کے آثار ملتے ہیں یا نہیں؟ ان کے اندر آپ نے ملائیت کہاں کہاں ملاحظہ فرمائی؟

●

اور اب اس اشاعتِ خاص کے ذریعہ ادبِ اسلامی کی نو خیز قوت کچھ اور چیزیں لائی ہیں۔ براہِ کرم ان چیزوں کو خوب اچھی طرح کرید کر ہمیں مطلع ئیے کہ ان میں "ملائیت" اور "رجعت پسندی" کتنی ایک ہے اور ادبی سلیقہ کس کس موقع پر مجروح ہوا ہے!

ایک ایک چیز پر یہاں کچھ عرض کرنا بے جا ہوگا؛ مگر اس اشاعتِ خاص میں ایک کہانی "نظم بن بعور" ——— جیلانی. بی اے کے قلم سے ہم ایسی کر رہے ہیں کہ جسے بجا طور پر ایک ایسا مقصدی و فنی شاہکار کہا جا سکتا ہے جس کی جگہ دنیا کے اونچے افسانوی ادب کی صفوں میں ہے۔ جیلانی کو "چارلس ڈبلیو فلپس کا کیس" اور "آنانی شمس انڈیا" جیسی کہانیوں نے ایک نمایاں ادبی مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔ لیکن "تعلیم بر عبور" لکھنے کے بعد وہ عظیم ترین نہ نگاروں کے ساتھ کندھا ملا رہا ہے۔ اس کہانی میں وہ ایسی فنی چابکدستی کے ساتھ انسانی نفس کی گہرائیوں میں اترا ہے کہ اس کا کوئی سخت ترین حریف عتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا ——— بشرطیکہ وہ دیانتدار ہو!

اور یوں ہم پورا اعتماد کے ساتھ پیش کر رہے ہیں!

●

ہم اپنی کمزوریوں سے غافل کبھی نہیں رہے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ ہمارے اندر مقصدیت کا جوش بہت زیادہ ہے اور ابھی ہمارے نوجوان رفقا اس پر ادیبانہ قدرت نہیں پا سکے۔ یہ کمزوری ثابت اِن ڈائرکٹ میتھڈ کے بجائے ہمارے قلم کو ڈائرکٹ میتھڈ کی طرف لے آتی ہے۔ یہ کمزوری بسا اوقات، ادب کی جذباتیت پر استدلال

سوچ بچار

جب ایک نئے مقصد کے لئے ادب میں راستہ بنانا ہو تو شروع شروع میں یہ کام مقصدی جوش ہی کے ساتھ ہوتا ہے اور اس جوش کو مصنوعی طریقوں سے چھپایا نہیں جاسکتا۔ اب جبکہ راستہ بن گیا ہے اور اسلامی فکر کے تحت ادب کی تخلیق ہونے لگ گئی ہے، اب ہم اپنے اندر تنقیدی زاویۂ نگاہ کو ابھارنے کی طرف متوجہ ہو چکے ہیں۔ چنانچہ چراغ راہ کے ۵۲ء کے فائل پر نظر ڈالنے سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ ہم نے "اقبال پر ایک ترچھی نظر" (فروغ احمد) "اکبر کا تصور مذہب" (نعیم صدیقی) "چراغ راہ کا شعر نمبر —— تفصیلی جائزہ (عاصی ضیائی) "ترقی پسند ادب کا جائزہ" (عماد الحق صدیقی) "اقبال کا نظریۂ فقر" (محمد خاں مظفر آبادی) "دو خاص نمبر —— تبصرہ (ادارۂ چراغ راہ) "اقبال کا انسانِ مطلوب" (نعیم صدیقی) "ادب اور زندگی" (قیوم، فاروق) "اقبال کا تصور جماعت" (سیکرٹری اقبال اکیڈمی کراچی) "اقبال کا تضاد" (فروغ احمد) "ٹالسٹائی" (جیلانی، بی اے) "ہمارے ادبی محاذ پر جمود" (اسعد گیلانی، کوثر نیازی، مسعود جاوید) جیسے تنقیدی و ادبی مقالات پیش کئے ہیں۔ ہم برابر اس فکر میں ہیں کہ ہمارا ادبی و فنی شعور پختہ تر ہو جائے۔

یہ کمزوری بسا اوقات فنی لغزشوں کی موجب بن جاتی ہے۔ لیکن کمزوری کا ایک دور طے کرنا ہمارے لئے ناگزیر ہے۔ کو غالب کر دیتی ہے۔

مگر کمزوریاں جو ہم میں موجود ہیں، ان کا ہونا یہ معنی نہیں رکھتا کہ ہمارے شعر و ادب میں مقامیت کارفرما ہے! کمزوریاں آپ کے ہاں بھی ہیں اور رہیں گی!

●

چراغ راہ کا ایک اہم کام یہ رہا ہے وہ عوام کو ذہنی طور پر اسلامی نظام زندگی کے لئے تیار کرے، اور ان کو رہنمائی دے کہ ملک کے موجودہ سیاسی حالات میں اسلام پسند جمہور کا راستہ کدھر سے ہو کے نکلتا ہے۔ اس مقصد کے لئے اُن کے سامنے وقتاً فوقتاً بین الاقوامی اور ملکی سیاسی مسائل کی وضاحت کی جاتی رہی ہے، موجودہ قیادت کی پالیسی کے غلط پہلو موقع بہ موقع نمایاں کئے گئے ہیں، اور خاص طور پر دستور کے بارے میں اُن کا شعور بیدار کرنے کے لئے برابر ایک فکری مہم جاری رکھی گئی ہے۔

●

بہرحال "چراغ راہ" خیالات و جذبات اور قدروں کا اسلامی محاذ ہے، تمام غیر اسلامی خیالات، جذبات اور قدروں کے عساکر کے خلاف!

●

یہ محاذ شروع سے اب تک بے سرو سامانی اور مشکل اندر مشکل کی صورتِ حالات میں رہ کر اپنا کام کر رہا ہے۔
ہماری پہلی مشکل یہ ہے کہ ہمارے قلمی معاونین محض کاغذی دنیا کے باشندے نہیں ہیں بلکہ وہ عمل کی دنیا میں بھی معرکے لڑ رہے ہیں، اس لئے لکھنے کے لئے اور لکھنے سے پہلے مطالعہ و تفکر کے لئے وقت نکالنا ان کے لئے ایک آزمائش بن جاتا ہے۔ پھر بھی الحمد للہ ہیں وہ لوگ جو اپنی معاش کے دھندے کر کے، پھر ایک تحریک کے کارکن کی حیثیت سے ذمہ داریاں انجام دے کر اپنے مقصد کی قلمی خدمت کے لئے بھی وقت نکال لیتے ہیں اور اپنے دماغ اور جسم سے کچھ قوتیں نچوڑ لیتے ہیں۔ انہی بیکیاں نئے ایثار کے تعاون سے چراغ راہ زندہ ہے۔ لیکن شکایت نہیں، محض بیانِ واقعہ کے طور پر کہنا ہے کہ اس طرح کی بھی کبھار کی عنایات ایک مقصدی جریدے کو کبھی بھی ایک فاتح قوت نہیں بنا سکتیں —— اور معرکہ جن طاقتوں سے ہے وہ جہانی طاقتیں ہیں!

●

یہاں ایک ضروری بات کہنا یاد آگیا!
لوگ بسا اوقات محسوس کرتے ہیں کہ نعیم چراغ راہ پر چھایا کیوں رہتا ہے؟ —— اس لئے کہ ہر ایک اپنی اپنی جگہ سکڑا پڑا ہے۔ اس فکری بار

سوغاتِ بحار

میں کودی اور اپنے خون کے قطرے ٹپکائے تو اس کا کرم ہے، ورنہ نعیم کے ذمے تو بہت ہی کام ہے جو اسے بجھنے نہ دے۔ مثلاً یہ خاص نمبر جو پیش کیا جا رہا ہے، منصوبہ یہ تھا کہ اس میں کم سے کم دس کہانیاں شامل ہوں، لیکن جب یہ منصوبہ مسلم لیگی قیادت کے منصوبوں کی صف میں شامل ہوتا نظر آیا تو نعیم کو آگے بڑھ کر خلا پُر کرنا پڑا! ــــ پھر جب بھی وہ ایک عالمگیر فکر کو اپنا حریف دیکھتا ہے تو اس کی ہر یلغار کا جواب دینا ضروری سمجھتا ہے۔ وہ اس حریف طاقت سے زندگی کے مسائل کو نجات دلا کر ان پر قابض ہو جانا چاہتا ہے، اور جب وہ دیکھتا ہے کہ ان میں سے کتنے ہی پہاڑ جیسے بڑے اور نمایاں مسائل ہیں کہ رفقا ان کو نظر انداز کر رہے ہیں، تو وہ ان سب کی طرف سے کفارہ دینے کے لئے حریف پر جھپٹتا ہے۔

ــــــــ ورنہ وہ بے صبرا نہیں ہے! بے صبرے وہ ہوتے ہیں جن کا نصب العین شہرت ہوتی ہے۔ وہ شہرت کو اول روز سے اس قابل نہیں سمجھتا کہ اسے گود میں لے کر پیار کیا جائے بلکہ اسے صرف اتنا درجہ دیتا ہے کہ وہ دم ہلاتی ہوئی پاؤں چاٹا کرے!

لیکن سوال یہ ہے کہ اگر وہ احساس کی آگ میں جلتا ہو، اگر وہ سوچتا ہو، اور اگر اس کے اندر تخلیق کے سرچشمے پے در پے پھوٹتے ہوں تو کیا وہ ان کو پاٹ دے!

یقین جانیے جو بھی صاحبِ تخلیق جنسِ کمال لے کے آگے بڑھے گا وہ چراغ راہ کی فضاؤں پر چھا جانے کا پورا پورا حق رکھتا ہے۔ نعیم اس کے راستے میں کبھی حائل نہیں ہوگا، مگر کوئی چھا جانے کے لوازم رکھنے والا آئے بڑھے تو!!

●

ہماری دوسری مشکل مالی مشکل ہے، جس سے پھر گوناگوں مشکلات پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں۔ مالی کمزوری کی وجہ سے ہم ظاہری محاسن پیدا نہیں کر سکتے، مالی کمزوری کی وجہ سے معاوضے ادا کر کے کسی کی خصوصی خدمات سے استفادہ نہیں کر سکتے، پھر مالی کمزوری ہی کی وجہ سے ہم کثیر الاشاعت جرائد میں اشتہارات دے کر چراغ راہ کو وسیع پیمانے پر متعارف نہیں کرا سکتے۔

اول روز سے یہ ایک صاحبِ کفاف جریدہ تھا، لیکن جب سے انڈیا اور پاکستان کے درمیان رسل و رسائل کی پیچیدگیاں بڑھنے کے ساتھ ساتھ سکّے کا تفاوتِ قیمت پیدا ہوا ہے، چراغ راہ کی اشاعت میں کمی آ گئی ہے۔ اور اب جبکہ بنکوں کے ذریعہ تبادلۂ زر کو لازم قرار دیا گیا ہے ہمارے دل پر بہت بڑی چوٹ پڑی ہے۔ اب انڈیا میں ہمارے لئے کوئی میدان نہیں رہا!

ظاہر بات ہے کہ یہ حالات ہماری مشکلات میں اضافہ کرنے والے ہیں!

●

میرے سامنے ان مشکلات میں اپنے مقصد کی جو اہمیت ہے اُس کے زیر اثر میں پوری کوشش کرنا چاہتا ہوں کہ چراغ راہ کو زندہ رکھنے کی انتہائی سعی کی جائے ــــ لیکن سسکتے ہوئے جینا اتنا مکروہ ہوتا ہے کہ مجھے ایسے جینے سے مرنا زیادہ پسند ہے۔ اس لئے راستے دو ہی ہیں ــ

یا تو چراغ راہ ایک مضبوط قوت بن کر جیئے گا،

اور یا میں اگر کسی وقت بھی محسوس کروں گا کہ یہ اب زندگی کے اوپر ایک بار بن گیا ہے تو فوراً فل اسٹاپ کر دوں گا! لیکن توقع یہی ہے کہ دوسرا فیصلہ کرنے کی نوبت نہ آئے گی۔ انشاء اللہ!

●

ان مشکلات میں سے پہلی کا سیدھا سادھا حل یہ ہے کہ رفقا چراغ راہ کو ایک مضبوط فکری قوت بنا کر زندہ رکھنے کے لئے وقت نکالیں اور بغیر منت حاجت (کیونکہ خط و کتابت کی فرصت مجھے ملتی نہیں) اپنی نگارشات سے پابندی کے ساتھ اسے نوازتے رہیں ــ

اور دوسری کا حل یہ ہے کہ چراغ راہ کے قارئین کا حلقہ وسیع کیا جائے۔ اس سلسلے میں چراغ راہ کے جملہ خریدار اگر اتنی تکلیف فرمایا کریں کہ اس

جریدے کو خود پڑھنے کے بعد دوسرے لوگوں میں بھی اسے پھیلائیں اور اس کا تعارف کراتے رہیں تو ان کی طرف سے اتنا کافی ہے۔

لیکن ہمیں خاص طور پر اپنی ایجنسیوں کے تعاون کی ضرورت ہے! ہمارے ایجنٹ حضرات نے جب بھی محنت سے کام کیا ہے تو حیرت انگیز نتائج نکلے ہیں۔ مثلاً اوکاڑہ جیسے قصبے میں لاگت سو سو پرچوں کی رہی ہے، لیکن ایجنٹوں نے جب سے غفلت اختیار کر لی ہے، حلقۂ اشاعت فوراً سکڑتا نظر آیا ہے۔

اگر ایجنٹ حضرات اس اشاعتِ خاص سے خصوصی محنت و توجہ سے کام لینا شروع کر دیں تو حالات میں نمایاں تبدیلی پیدا ہو سکتی ہے۔

●

آخر میں اس افسوس کو ظاہر کئے بن رہا نہیں جاتا کہ ہماری اشاعتِ خاص چند اہم مقالات اور نگارشات سے محروم رہ گئی ہے، اور اس محرومی میں زیادہ تر دخل ہماری اپنی مجبورانہ کوتاہیوں کا ہے!

مگر حکم یہ ہے کہ "لا تاسوا علی ما فاتکم"

ادبی و تنقیدی مقالات

- عاصی ضیائی رامپوری
- محمد حمید اللہ صدیقی
- فروغ احمد بی اے (علیگ)
- ماہر القادری
- اصغر علی عابدی
- نعیم صدیقی

پاکستان بننے کے بعد

ادبی رفتار و رجحانات

عاصی ضیائی ایم اے

پاکستان کے تخیل کی بنیاد کیا ہے ؟ بظاہر تو تمام مسلم جماعتیں، کیا عوام کیا خواص سبھی ایک ہی بات بتاتے ہیں۔ یعنی مسلمانوں کا اسلام کے پیرو ہونے کی حیثیت سے ہندوؤں کے مقابل ایک جداگانہ جماعت ہونا اور لہذا اپنی جداگانہ حیثیت کو مشترکہ قومیت میں مدغم نہ ہونے دینے کی خاطر برصغیر کے مسلم اکثریتی صوبوں میں خود مختار، آزاد حکومت و مملکت کا مطالبہ۔ لیکن یہ ایک خواب اپنی گوناگوں تعبیروں کی بدولت جس طرح خواب پریشاں بن چکا ہے۔ اس کا اندازہ ہم آئے دن کرتے رہتے ہیں۔ اور قبل اس کے کہ ہم اس نوخیز اور "پیدائشی آزاد" ادارے کا ادبی جائزہ لیں ہمیں کم از کم وہ سیاسی الجھنیں صاف کر لینا چاہئیں۔ جن کی بدولت ہماری زندگی کے ہر گوشے میں الجھن اور اضطراب پھیل رہا ہے۔ یہاں تک کہ ادب بھی اس سے محفوظ نہیں ہے۔

تقسیم سے سالوں پہلے ملک ہند میں ایک انوکھی قوم بستی تھی۔ جہاں تک "قوم" کی موجودہ تعریف کے عناصر کا تعلق ہے یعنی نسل، رنگ، زبان، ملک وغیرہ ان میں سے کوئی چیز اس پھیلی ہوئی آبادی میں مشترک نہ تھی۔ پھر بھی یہ لوگ ایک دوسرے کو اپنا سمجھتے تھے۔ اور بعض حالتوں میں ان کے اتحاد کا یہ عالم تھا کہ اپنے ہم وطن بلکہ ہم قبیلہ کے مقابل غیر شخص کو انہوں نے کسی معاملے میں ترجیح دی۔ کیونکہ وہ غیر "ملت" کی قوم کا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان کا آپس کا اتحاد و اشتراک صرف اصولوں کی بناء پر تھا۔ یعنی یہ تمام لوگ اپنے لاتعداد اختلاف کے باوجود، توحید رسالت اور آخرت کو ماننے کی بناء پر ایک دوسرے کے بھائی بنے ہوئے تھے۔

مگر عام طور پر اس قوم کے اکثر افراد کو یہ بات یاد ہی نہیں رہی تھی۔ کہ ان کا باہمی اتحاد محض اصولوں کی بناء پر ہے۔ ان کے ان پڑھ عوام سے لے کر پڑھے لکھے خواص تک یہ سمجھتے تھے۔ کہ بس یہ پوری ایک قوم کسی نہ کسی طرح سے ایک ہے کیونکہ یہ لوگ صریحاً دیکھ رہے تھے کہ ایک نصب العین اور اصول پر یقین رکھنے والی کسی جماعت میں جو ایک ہمہ گیر یگانگت اور ان کے عمل میں یکسانی ہوتی ہے۔ اس کا کہیں پتہ بھی نہ تھا۔ ایک بن جیوں ہے کا گلہ تھا۔ جس کی ہر بھیڑ کا چہرہ ترنہ اٹھا ہوا تھا۔ اسی طرف اندھا دھند بڑھی جا رہی تھی۔ شکر ہے کہ پچھلے دو سو سال سے کسی نہ کسی صورت میں اس قوم کو یاد دہانی کی جاتی رہی۔ کہ ان کا باہمی اتحاد محض ایک نصب العین ہونے کی بناء پر ہے مگر افسوس یہ ہے کہ یہ مصلحانہ کوششیں کی جاتی تھیں۔ خصوصاً وہ الله، لیکن ان کو اپنے مفید مطلب بنا لیتے تھے۔ وہ لوگ جو نیم قومی نیم "مذہبی" بنیاد پر اپنی قوم میں کام کر رہے تھے۔ مجددین اور علماء کی کوشش یہ ہوتی کہ مسلمان عوام کلمہ طیبہ پر عمل کرنے پر متحد ہو جائیں۔ لیکن ان کی مساعی سے فائدہ اٹھانے والے "مسجد دین" اور "قوم پرست" رہنما جن کا مقصد دیانت داری سے یہ ساتھ ہی یہ ہوتا تھا کہ وہ قوم جو مسلمان کہلاتی ہے کسی نہ کسی بنیاد پر یا محض اپنے قومی معاملات سمجھنے کے جذبہ پرستی پر متحد ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی بنیاد نہ تھی۔ ورنہ اگر محض ایک نام "مسلمان" پر دنیا کے مسلم جمع ہو سکتے ہوں۔ تو تمام دنیا کے "گوتم، نور" اور بھی زیادہ آسانی سے ساتھ متحد ہو سکتے ہیں!

بہر حال اسی زمانے میں ہمہ جانب مسلمانوں کے دل میں انگریز دشمنی کا جذبہ گویا پیدائشی موجود ہی تھا: کہ ایک نئی تشویش ان کے لئے اور سامنے لا کھڑی کر دی گئی۔ یعنی تم مسلمان اس ملک میں اقلیت میں ہو۔ اکثریت کا عفریت تم کو معاشی، سیاسی، تعلیمی، تجارتی ہر محاذ پر

یں رہا ہے۔ اور جونہی ملک آزاد ہوا۔ تمہارا جداگانہ وجود کہیں نہ رہے گا۔ اس پروپیگنڈے میں بڑی حد تک صداقت بھی۔ اس کو جس طرح پیش کرتے ہوئے مسلمان قوم کو سراسیمہ کیا گیا ہے۔ اس پر شاید مورخ ہمارے اکابر کو کبھی بری نہ کر سکیں گے۔ مسلمان کتنا ہی گیا گزرا ہو گیا ہو، واقعہ ہے کہ اُسے ہندو سے کبھی خوف نہ ہوا تھا۔ بلکہ تعجب یہ ہے کہ جس جس جگہ مسلمان اقلیت میں تھا۔ وہیں اپنے حریف سے زیادہ نڈر اور بے پروا، تھا تقسیم ہند سے پہلے کانپور، آگرہ۔ بمبئی وغیرہ چند شہر فرقہ وارانہ فسادات کے لئے خاص طور پر مشہور تھے لیکن ان میں سے کہیں ایسا نہ ہوا۔ کہ مسلمان اقلیت میں ہونے کے باعث ہندوؤں کے آگے گھٹنے ٹیک چکے ہوں۔ یہ بے پروائی دراصل اُسی نشہ حکومت کے بچے کھچے اثرات تھے۔ جو اب سے ایک صدی قبل پوری طرح اُتار دیا گیا تھا۔ لیکن خمار ابھی تک باقی تھا۔ مسلمان اپنے کو ہند کا حاکم و فرمانروا بھی سمجھتے تھے، تو بھی انہوں نے ہندوؤں کو کبھی اپنے برابر بھی نہ سمجھا۔

ان حالات میں "دو قومی نظریے" کا صور پھونکا گیا۔ مگر قارئین شاید ادیب کے قلم کو سیاست کے خارزار میں اُلجھتا دیکھ کر خود بھی اُلجھن محسوس کریں۔ اس لئے صرف اتنے حصے پر اکتفا کی جاتی ہے کہ بظاہر یہ "نظریہ" ملک بھر کے مسلمانوں کے دل کی آواز بن گیا اور تمام دوسرے سیاسی حتیٰ کہ "مذہبی" اختلافات بھی مٹا کر مسلمان جوق در جوق ایک جھنڈے تلے جمع ہونے لگے۔ لیکن دراصل اس کے پیچھے بے شمار تجھاؤ۔ غلط فہمیاں، خود فریبیاں اور بدگمانیاں ہیں جنہیں آئندہ کا مورخ ہی کھل کر بتا سکتا ہے سردست ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ :۔

(۱) اس نظریئے کے موجد وہ "سیاسیین" تھے۔ جن کی عمر یا تو عدالت میں یا اُجرت پر قانونی موشگافیاں کر کے اپنے موکلوں کو بچاتے گزری تھی۔ یا اسمبلیوں اور انجمنوں میں اپنے ذاتی حریفوں کو نیچا دکھانے کے لئے جوڑ توڑ کرتے۔ اس کے علاوہ عملاً اور ذہناً یہ لوگ نہایت مخلص مقلدینِ مغرب تھے۔ مغربی تصورِ سیاست وغیرہ پر نہ صرف ایمان رکھتے تھے۔ بلکہ اس پر گہری نظر بھی رکھتے تھے۔ لیکن اسلام سے نہ ان کی زندگیوں کو کوئی واسطہ تھا نہ اس کے بنیادی تصورات ہی کے بارے میں ان کی معلومات کچھ بھی وسیع تھیں۔ اہم تر یہ کہ یہ حضرات اسلامی تقاضوں کو جاننے کے لئے تیار بھی نہ تھے۔ بلکہ ان میں سے اکثر کے ذہن میں اسلام کا وہی تصور تھا۔ جو یورپ عام طور پر ادیانِ سماوی کے بارے میں رکھتا ہے۔ یعنی اسلام ایک "مذہب" ہے جس کا معاملہ انفرادی ہے۔ سیاست اور معاشرت سے اسے کوئی سروکار نہیں۔

(۲) یہ حضرات اگر مسلم قوم کے حقیقی خیر خواہ بھی تسلیم کر لئے جائیں۔ تب بھی ان کی خیر خواہی ہمارے نزدیک دو جہت سے ناقص تھی۔ اوّل یہ کہ یہ لوگ قوم کے لئے جو کچھ بھی خیر خواہانہ کام کرنا چاہتے تھے وہ اس کو یورپی نقطۂ نظر سے ایک "قوم" سمجھ کر اس کے لئے کرتے تھے۔ حالانکہ جیسا ہم نے اوپر کہا مسلمان ان معنوں میں کوئی "قوم" ہیں ہی نہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کی خیر خواہی میں جیسا کہ بعد کے واقعات نے ثابت کیا۔ سو فی صدی خلوص ہرگز نہ تھا۔ یہ لوگ "اوّل خویش" کے قائل تھے اور قوم کے لئے جو کچھ بھی کر رہے تھے وہ اسی امید پر کہ ان کا اپنا حق سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر محفوظ رہے۔

(۳) ان کے سامنے اور ان کی مخاطب وہ "قوم" یا جماعت تھی جو مسلمان کہلاتی تھی۔ جہاں تک بنیادی عقائد و اعمال کا تعلق ہے بلا اختلاف ایک ہی عقیدے، ایک ہی ضابطۂ اخلاق، اور ایک ہی نظامِ عبادت کو مانتے تھے۔ لیکن کچھ تو بے عملی، کچھ لاعلمی اور کچھ کم فہمی کی بدولت اسلام کا بحیثیت کل ایک واضح و جامع تصور ان میں سے کسی کا نہ تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان کی ایک نہایت شاندار گزری ہوئی تاریخ تھی جس کا تعلق متمدن دنیا کے ہر حصے سے تھا۔ اور اس کا کوئی حصہ بھی یہ لوگ رد کرنے پر تیار نہ تھے۔ ایسی قوم کے بارے میں کیا خیال ہو سکتا ہے۔ جو ایک طرف حضرت عمرؓ سے بھی عقیدت رکھے۔ اور دوسری طرف اکبر کا زمانہ بھی اسلامی ہند کا زریں گردانے ؟

(۴) ان لیڈروں اور ان پیروؤں کے علاوہ ایک مختصر سا گروہ جس کے افراد کی تعداد غالباً ناقابلِ اعتنا حد تک کم تھی۔ ایسا بھی

تھا۔ جو ہر قسم کی افراط و تفریط اور عصبیت سے یکسو ہو کر اسلام کو خداوند تعالے کا بھیجا ہوا دین سمجھ کر اس میں اپنی پوری پوری زندگی داخل کرنے کا ساعی اور داعی تھا۔ اس کے لئے یہ بات غیر متعلق تھی۔ کہ مسلمان "قوم" معاشی و سیاسی حیثیت سے انگریز یا ہندو کے غلام ہیں۔ لہٰذا قوم کی بہتری کی خاطر اصول قربان کئے جا سکتے ہیں۔ اس کا ہر مسلم سے مطالبہ تھا کہ اپنی پوری کی پوری زندگی کی باگیں خدا اور رسولؐ کے حوالے کرنے اور اسی کام کی جد و جہد اس نے جاری کر رکھی تھی۔ اور یہاں بھی ایک حد تک وہی ہوا جو اس سے پہلے ہوتا آ رہا تھا۔ یعنی جس طرح پُر خلوص علماء کی کوششیں اہل غرض اپنے مفید مطلب بناتے آئے تھے۔ اسی طرح اس گروہ کی بعض مساعی بھی لیڈری پسند طبقے کا آلۂ کار بن گئیں۔ "سیاسی کشمکش" اور "مسئلہ قومیت" سے پہلے کسی مسلم لیگی لیڈر کے پاس ایک قومی نظریے کا، جو کانگریس پیش کر رہی تھی۔ جواب نہ تھا اور جواب تو اس وقت ہوتا کہ ان کو مسلم ہونے کے بارے میں صحیح اور تفصیلی معلومات بھی ہوتیں۔ جس طرح کانگریسی زعمائے جمہوریت اور قومیت کے سبق یورپ سے لئے تھے انہوں نے بھی لئے تھے اور یورپ میں اسلامی تصورات سیاست و معیشت ڈھونڈنا ظاہر ہے کہ کتنا عبث ہے۔ لیکن جونہی اُوپر کے سلسلہ ہائے مضامین شائع ہوئے۔ ان لوگوں کے ہاتھ میں گویا ایک زبردست حربہ آ گیا اور انہوں نے انہی مضامین کے دلائل سے اپنا "دو قومی نظریہ" ثابت کر ڈالا۔

(۵) ان حالات میں جب قوم کے ذہنی انتشار میں "مطالبہ پاکستان" بلند ہوا تو ایسا معلوم ہوا گویا ہر فرد یہی چاہتا تھا۔ کیونکہ یہ گویا مسلمانوں کی ایک آزاد سلطنت کا مطالبہ تھا اس سے بحث نہیں کہ اس سلطنت میں دستور و قوانین مغربی جمہوریت یا اشتراکیت سے حاصل کردہ ہوں گے یا اسلام سے۔ اسلام پرست مسلمان کون سے ایسے عامل تھے کہ اس کا خیال کریں۔ پھر بھی تحریک اسلامی کے بلند ہونے کے بعد سے زبانوں پر حکومت الٰہیہ اسلامی نظامِ زندگی جیسے الفاظ آنے لگے تھے۔ اور کوئی تحریک مسلمانوں میں مقبول نہ ہو سکتی۔ اگر اس کی ابتداء میں خدا و رسولؐ کا نام نہ لیا جائے اس لئے خالص غیر اسلامی "دو قومی" نظریہ بھی قرآن و حدیث کے سہارے پروان چڑھایا گیا اور سادہ مزاج، ان پڑھ مگر اسلام کے نام کے شیدائی مسلمان نے اس تحریک کو حرزِ جان بنا لیا۔

پس درحقیقت پاکستان بننے میں نہ اشتراکیوں کے خیال کے مطابق صرف سرمایہ دار اور جاگیردار طبقے کا معاشی مفاد ہی ذمہ دار ہے اور نہ عام اسلام پسند حضرات کے بقول یہ خطۂ زمین صرف اعلاء کلمۃ اللہ ہی کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔ بلکہ سچ پوچھئے تو اس میں مختلف لوگوں کے مختلف خیالات و مفادات شامل تھے (۱) لیگی لیڈر، جو ہر اعتبار سے، خصوصاً ہندو کے مقابلے میں، نہایت ناقص بلکہ گھٹے ہوئے تھے اپنی بگڑتی ہوئی حیثیت دوبارہ بنانا چاہتے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ متحدہ ہند میں ان کو کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ پس پاکستان فی الحقیقت ان کے معاشی اور معاشرتی فائدے کے لئے بنا۔

(۲) مسلمانوں کا متوسط پڑھا لکھا طبقہ بھی متحدہ ہند میں اپنی معاشی موت دیکھ رہا تھا۔ ہندو کے مقابل اس میں لیاقت تھی نہیں اور ہمت رہی نہ تھی کہ استقلال سے اس حیثیت تک پہنچنے کی جد و جہد کرے۔ لہٰذا اس کو بھی پاکستان میں کم از کم اپنی روٹی محفوظ نظر آئی۔

(۳) اور ان دونوں کو چھوڑ کر ملک کا سوادِ اعظم تھا جسے فکرِ معاش کی بنا پر اس قسم کا کوئی نظریہ قابل قبول نہ ہوا تھا۔ اس لئے اس کے سامنے یہ مسئلہ اس کی اصل صورت میں رکھا ہی نہ گیا۔ بلکہ یہ جان کر کہ اس اکثریت کو اسلام سے ناواقفیت کے باوصف اس سے والہانہ عشق ہے اس کے لئے یہ نعرہ تصنیف کیا گیا کہ "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ" اور سوادِ اعظم نے اس مقدس مقصد کی خاطر اسے اپنا لیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ جس وقت ملک تقسیم ہوا تو اس ہنگامۂ قیامت کے بعد ہر جماعت اپنا نصب العین پورا ہوتے دیکھنا چاہتی تھی۔ اور جس طرح پاکستان بننے سے قبل ہر نظریے کے حامی اپنا اپنا نصب العین تحریر و تقریر کے ذریعے پیش کر رہے تھے۔ اسی طرح پاکستان بننے کے بعد بھی ان کی یہ کوششیں جاری رہی ہیں اور آج تک جاری ہیں۔ اس مختصر سیاسی جائزے کے بعد آئیے ذرا ادبی محاذ کو بھی دیکھ لیا جائے کہ اس میں کس کس نے کتنا اور کیسا کام سرانجام دیا ہے۔

ترقی پسند تحریک

سب سے پہلی نظر جس منظم ادبی جماعت پر پڑتی ہے وہ ترقی پسند ادیبوں کی جماعت ہے اس سے وابستہ ادیبوں کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا اور نہیں ہے کہ پاکستان ایک اسلامی مقصد کی خاطر حاصل کیا گیا ہے بلکہ الٹا یہ اس نظریے کے مخالف اور مزاحم رہے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق دنیا اس وقت دو طبقوں میں بٹی ہوئی ہے ایک سرمایہ دار، دوسرے مزدور اور کسان وغیرہ، پہلا طبقہ ظالم ہے دوسرا مظلوم۔ اس کے علاوہ ان کے خیال میں معاشی حالات ہی وہ سب سے اہم عنصر ہیں جو دنیا میں انسانی معاشرت کی مختلف طرح پر تشکیل کرتے ہیں۔ ہر قسم کے اصول سیاست، معیشت، دین، مذہب وغیرہ انہی کے بطن سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے خیال میں اخلاقی ضابطے بھی معاشی حالات کے تابع ہیں۔ دنیا میں کوئی پائیدار دوامی قدر نہیں سوائے پیٹ اور جنس کے۔ ہر زمانے میں دنیا کے ان دو طبقوں کی کشمکش اور عمل جدلی کی بدولت معاشرہ ارتقا کرتا ہے۔ اور ہر نئے انقلاب میں سابق معاشرے کے صحت مند اصول باقی رہ جاتے ہیں۔ اور ان کے علاوہ مزید صحت مند عناصر اس میں شامل بھی ہو جاتے ہیں۔ ان کے خیال میں وقت آپہنچا ہے جب دنیا بھر میں ایک انقلاب برپا ہو۔ جس کے نتیجے میں موجودہ سرمایہ دارانہ معاشرہ، جو عوامی کوششوں کے خلاف رجعت پسندانہ جد و جہد میں مصروف ہے اور جس کی حمایت پر مذہب اور اخلاق کے "فرسودہ" قوانین بھی ہیں۔ بدل کر اس کی جگہ عوامی دور آئے گا۔ جب انسانی معاشرے میں سے ہر قسم کی عدم مساوات ختم ہو جائے گی۔ اور ہر فردِ انسان کو دنیا میں پھلنے پھولنے کے یکساں مواقع حاصل ہوں گے۔ پس اس انقلاب کو قریب تر لانے کے لئے عوام سے ہمدردی رکھنے والوں کا فرض ہے۔ کہ وہ ہر محاذ پر اس کشمکش میں عوامی تقاضوں کی پشت پناہی کریں۔

اس مسلک کو ماننے والوں نے جہاں ٹریڈ یونینوں، مزدوروں کی انجمنوں اور دوسری سیاسی اور معاشرتی تحریکوں کو جنم دیا۔ وہیں ان کے لشکر کا ایک دستہ ادب کے میدان میں بھی اپنے جوہر دکھانے لگا۔ ان کے ادب میں عام خصوصیات یہ ہیں:۔

(۱) یہ لوگ بقول خود "ادب برائے زندگی" کے قائل ہیں۔ لیکن زندگی کا صرف وہی پہلو اپنے ادب میں دکھاتے ہیں۔ جو پڑھنے والے کو عوام سے ہمدردی اور سرمایہ داروں سے نفرت دلا سکے۔

(۲) ان کے خیال میں چونکہ اخلاق اور مذہب درحقیقت سرمایہ دار و جاگیردار طبقوں کی تیار کی ہوئی افیون ہیں۔ اس لئے ان کے ادب میں عموماً بد اخلاقی، فحاشی اور خدا بیزاری کا جواز ڈھونڈ ڈھونڈ کر پیش کیا جاتا رہا ہے۔

(۳) اُنہوں نے پہلی بار ادب اور پروپیگنڈے کی سرحدیں ملا دیں۔ اور اب ایک عام ناظر کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ ادب اور پروپیگنڈے میں بنیادی فرق کیا ہے؟

(۴) اُنہوں نے جہاں کھلم کھلا اپنے نظریات کی تبلیغ خطرناک پائی۔ وہاں اپنے ادب میں ابہام کو دخل دیا۔ اور اس کا جواز یہ بتایا کہ ایسے معاشرے ہی میں ابہام ہے۔

(۵) کچھ عرصہ پس پردہ رہنے کے بعد انہوں نے کھلم کھلا اپنے ادب میں اشتراکیت اور سرخ روس کی حمایت شروع کر دی۔

یہ آخری بات بہت چونکا دینے والی ثابت ہوئی۔ اور اس کے بعد اس جماعت کے بہت سے افراد ان سے ٹوٹ گئے۔ ورنہ خارج کر دئے گئے۔ اور چنانچہ ان کو اپنے رویے پر نظر ثانی کرنا پڑی۔ پاکستان بننے کے بعد ان کا مشترک ادارہ بھی منقسم ہو گیا۔ اور یہاں پر ان کا منشور از سر نو مرتب ہوا۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک تو ان کے نظریات پر ایمان لانے والوں میں سب سے پکے سچے مسلمان خود ہی تھے۔ دوسرے تحریک پاکستان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت نے انہیں یہاں اور بھی نامقبول بنا دیا ہے۔ اس لئے انہوں نے ایک بار پھر اپنا اصل مقصد پوشیدہ کر کے بعض بد اخلاقیوں اور فحش کو بھی "ترقی پسندی" کے خلاف ٹھہرایا۔ پھر بھی ایک بار بدنام ہو جانے کے بعد یہ تحریک اپنا مقام حاصل نہ کر سکی۔ اور رفتہ رفتہ کچھ تو اس کے سرگرم اراکین اور ہمدردوں تحریکوں کے اس میں سے خارج ہو جانے اور کچھ حکومت کے اس کو سیاسی جماعت قرار دے کر اس پر تشدد کرنے کی وجہ سے یہ مشکل

دو ڈھائی سال چل کر عملاً اپنی موت مر گئی۔ لیکن کم و بیش پندرہ سال پورے برصغیر ہند کی ادبیات میں اپنا ڈنکا بجاتے رہنے کے بعد اس نے خاصے گہرے اثر چھوڑے ہیں۔ جن کا ذکر آگے آتا ہے۔

سرکاری ادب

دوسرا غیر منظم ادبی رجحان وہ ہے۔ جسے ہم "سرکاری ادب" کہہ سکتے ہیں۔ اس ادب کے خالقوں کا کوئی مستقل اصول یا نظریہ اس کے سوا نہیں ہے کہ برسر اقتدار طبقے کی ہر جائز و ناجائز بات سراہی جائے۔ یا کم از کم اس کی مخالفت نہ کی جائے۔ بلکہ اس سے بے تعلق رہ جائے۔ اس بنے اصولی کے ماننے والے اور اس پر کاربند رہنے والوں کو کئی زمروں میں بانٹ جا سکتا ہے۔

ان میں سے ایک وہ لوگ ہیں۔ جو قوم پرستانہ ادب پیدا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ انہوں نے تقسیم ہند کے ہولناک فسادات پر بھی لکھا ہے اور اس میں مساوات پر شرارت کرنے پر صرف کیا ہے۔ کہ ہمارے زعماء کرام تو نہایت ہی حقوق اور جائز مطالبہ منوا لینے کے کوشاں تھے لیکن ہندو اور کانگریس نہایت ہی تنگ نظر اور متعصب تھے کہ وہ "معصوم" مسلمانوں کو وسیع پیمانے پر قتل و غارت کا پوری طرح سوچا سمجھا منصوبہ بروئے کار لائے؟ اور اس کے جواب میں مسلمانوں نے اکثریت کے علاقے میں جو کچھ ظلم و تشدد کیا۔ وہ بالکل حق بجانب تھا؟ بلکہ در اصل مسلمانوں نے تو کچھ کیا ہی نہیں۔

ان ادیبوں میں وہ بھی ہیں جو اقبال کا نام بیچتے اور اس کے کلام کا جوشیلا حصہ پڑھتے ہوئے ادبی اسٹیج پر جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اور یہاں کے مسلمانوں کو پورے ضابطہ اسلام میں سے جو سبق پڑھانا چاہتے ہیں وہ نہ عبادات سے متعلق ہے نہ اخلاق فاضلہ سے۔ بلکہ صرف "جوش جہاد" سے متعلق ہے۔ ان کے ہاں یہ نہیں مانا کہ جہاد کا اصل مقصد اعلائے کلمۃ الحق ہے اور یہ وہ آخری چارہ کار ہے جو مسلمان کو انتہائی مجبوری پر اختیار کرنا پڑتا ہے بلکہ ان کا مقصد "قوم، ملت اور وطن" کی خاطر جان دینا اور جان لینا ہے۔ یہی وہ حضرات ہیں جو اسلام سے مراد مسلمان لیتے ہیں۔ اور ہمیشہ اسی نشے میں سرشار رہنا اور پوری قوم کو رکھنا پسند کرتے ہیں کہ جلد سے جلد کم از کم دہلی ہی پر "ہلالی پرچم" بلند ہو جائے اس سے آگے انہیں مطلق سروکار نہیں کہ مسلمانوں میں وہ تمام اخلاق حسنہ، جو اسلام کے پیش نظر ہیں، پیدا ہو جائیں۔ یا وہ چنگیز و اسکندر کی طرح محض کشور کشائی ہی کرتے پھریں۔

اور ان ادیبوں میں وہ سنجیدہ پڑھے لکھے حضرات بھی ہیں جو ترقی پسند تحریک سے منحرف ہو کر ایک حد تک "ادب برائے ادب" کی پناہ میں آ گئے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ ضروری نہیں کہ ادب کا کوئی مقصد بھی ہو؟ بلکہ گویا اگر گالیاں بھی دی جائیں۔ اور ان میں کوئی اپیل یا کوئی سلیقہ ہو۔ تو وہ بھی ادب ہے، یہ آخری زمرہ ادب بڑی حد تک الجھی ہوئی ذہنیت کو اپنے اور قوم کے اندر فروغ دے رہا ہے لیکن تعداد میں کم ہونے کی بنا پر اس کا کوئی وسیع اثر نہیں پڑ رہا۔ بلکہ اس کا حلقۂ اثر ایک ایسے طبقے ہی تک محدود رہے جس کا کام فقط ردی کمانا اور نظمیں یا فسانے پڑھنا ہے۔ اسی طرح پہلا زمرہ بھی اب ختم ہوتا جا رہا ہے۔ کیونکہ اب ہنگامی مسائل بھی ختم ہو گئے ہیں۔ اور مسلمانوں کو محض فرضی یاد ہوائی، نیتوں سے ذرا کر مستند نہیں رکھا جا سکتا۔ البتہ دوسرا زمرہ، یعنی مسلمانوں کو "درس جہاد" دینے والے ادیب خوب مقبول ہو رہے ہیں۔ خصوصاً ان کے وہ ناول، فسانے اور نظمیں جن میں مسلمانوں ہیروؤں کے بہادرانہ کارنامے بیان کئے گئے ہوں۔ کیونکہ ان میں لذت کام و دہن کا خاصا سامان موجود ہے۔

بازاری ادب

مجھے اس "بے ادبی" کو ادب، تو نہ کہنا چاہیے۔ لیکن مجھے پاکستان کے پانچسالہ ادبی رجحانات کا تفصیلی جائزہ لینا ہے اس لئے اگرچہ اس ادب کو کوئی معقولیت پسند شخص نہیں قبول کرتا۔ پھر بھی عوام الناس پر اس کا بہت اثر ہونے کی بنا اس کا ذکر بھی ضروری نظر آیا۔ اس ادب کے پیش کرنے والوں کے پیش نظر سستی شہرت اور دولت پیدا کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ اسی ذیل میں وہ تمام رسالے، ناول، نظمیں وغیرہ آ جاتے ہیں۔ جو فلم اور دوسری ہوسناکیوں کا مزے لے لے کر ذکر کرتے ہیں۔ اپنے اخلاق کے

اعتبار سے یہ "ادیب" بھی نہایت پست ہیں، اور ان کا "ادب" بھی انتہائی گندی لذت پرستی کا ترجمان ہے۔ اس کو زندگی کے مسائل سے کوئی واسطہ نہیں۔ بس پونے کا روباری نقطۂ نظر سے اس کے لکھنے والے لوگوں کے جذباتِ سفلی کو برانگیختہ کر کرکے اپنی روزی کماتے ہیں۔ ان میں اکثریت اُن کی ہے۔ جو ترقی پسند ادیبوں کی فحش نگاری سے متاثر ہوئے، اور چونکہ خود ترقی پسند نہ بن سکے کہ اس میں بعض اصولوں اور ضابطوں کی پابندی بہرحال لازمی تھی، اس لئے فقط جنسی گھناؤنے پن کا ذکر ہی آسان ترین راہ پا کر اختیار کر بیٹھے۔ یہ لوگ کم پڑھے لکھے عوام یا اوسط تعلیم پائے ہوئے طالب علموں میں نہایت مقبول ہیں۔ ان کے رسالوں اور کتابوں کی اشاعت سب سے زیادہ ہے اور غالباً روز افزوں ترقی پذیر ہے۔

اسلامی ادب

آخر میں ہمیں اس تحریک کے ماننے والے ادیبوں کا ایک منظم گروہ ملتا ہے جس کا ایمان ہے کہ ہر قسم کی سعیٔ انسانی کا اصلی مقصد رضائے الٰہی حاصل کرنا ہے، اور اسی اصول کو مقبولِ عالم بنانے کی جد و جہد کی خاطر اپنے قلم حرکت میں لا رہے ہیں تقسیم ہند سے پہلے بھی ایسے لوگ موجود تھے، اگرچہ بہت تھوڑے اور منتشر، لیکن ۱۹۴۹ء میں جب ان لوگوں نے متحد ہو کر ایک منصوبے کے تحت کام کرنے کا فیصلہ کر لیا تو نہ صرف ہر ادیب کی سرگرمیاں تیز تر ہو گئیں بلکہ اس تحریک کی طرف بہت سے نئے اہلِ قلم بھی کھنچ آئے، اور تب سے تحریک اسلامی کے ساتھ ساتھ ان کا قلمی جہاد بھی جاری ہے، اور رفتہ رفتہ دوسرے رجحانات کو بے دخل کرتا چلا جا رہا ہے اگرچہ اس کام کی رفتار میں خاصی سستی نظر آتی ہے۔ اس کے کئی اسباب ہیں۔ ایک تو ان ادیبوں کی اکثریت میں اپنے نصب العین کا عشق پوری طرح سمایا نہیں ہوا ہے، اس لئے جو کچھ بھی یہ لکھتے ہیں اس میں کسی قدر تصنع ٹپکتا ہے، دوسرے ان کے وسائل بہت محدود ہیں اور جتنے ہیں، اُن کو بھی مخالف طاقتوں خصوصاً اربابِ اقتدار کی قدم قدم پر مزاحمت اور حوصلہ شکنی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، تیسرے ابھی قوم میں "چٹپٹے" ادب کی چاٹ اس قدر رچی ہوئی ہے۔ کہ وہ اس کو چھوڑ کر اس روکھے پھیکے بے کیف ادب کی طرف آنے میں تکلیف کر رہی ہے۔ لیکن بہرحال؛ خلوص شرط ہے۔ ایک نہ ایک دن قوم دیکھ لے گی کہ ضرورت سے زیادہ مصالحہ دار کھانے صحت کے لئے کتنے مضر ثابت ہوئے۔ اس ادب کی خصوصیات یہ ہیں:۔

(۱) چونکہ اسلامی تحریک میں نمایاں ترین چیز متانت اور وقار ہے اس لئے یہی بات اس کے ادب میں بھی پائی جاتی ہے۔ یہ ادب کسی کی پگڑی نہیں اُچھالتا۔ اور نہ کسی سے للّٰہی بغض نکالنے کا مظاہرہ کرتا ہے، بلکہ اصولی اختلاف کا اظہار بھی معقول طور پر کرتا ہے۔ اس کا طنز بھی دل آزاری کے بجائے دل سوزی اور خلوص پر مبنی ہوتا ہے۔

(۲) یہ ادب ہر طرح کے پارٹی تعصب سے آزاد ہے۔ جس بات کو اس تحریک کے ساتھی حق سمجھتے ہیں۔ اُسے نہ صرف خود پیش کرتے ہیں بلکہ ان سے اختلاف رکھنے والے گروہوں یا افراد میں سے بھی اگر کوئی شخص وہی بات کہے تو بے تامل اسے اپنے دائرے میں جگہ دیتے ہیں

(۳) ان ادیبوں میں سے اکثر وہ ہیں جن کو ترقی پسند ادب کے اسلوب و انداز نے بہت متاثر کیا ہے۔ اس لئے یہ بھی اظہار حق کے لئے وہی حربے کام میں لاتے ہیں۔ جو ان کے حریف استعمال کر چکے ہیں یا کرتے رہتے ہیں +

(۴) ان میں اپنا ذاتی اور جماعتی احتساب اس حد تک پایا جاتا ہے کہ اپنی غلطی کو غلطی تسلیم کرنے میں انہیں تامل نہیں ہوتا۔ اور ان کے اپنے ساتھی کے قلم سے اگر کوئی غیر ذمہ دارانہ بات نکل جائے تو اس کو حق بجانب ٹھہرانے پر اصرار کرنے کے بجائے اس کو تنبیہہ کرتے ہیں۔

خلاصہ

اُوپر جن ادبی رجحانات کا ذکر کیا گیا۔ ان کو مختصراً بیان کر کے ان پر اجمالی رائے اس طرح دی جا سکتی ہے:۔

(۱) ترقی پسند ادب بحیثیت ایک تحریک کا ترجمان ہونے کے پاکستان میں ختم ہو گیا، لیکن اس نے ادب میں جو بے راہ روی، فحاشی اور سطحیت کی راہیں کھول تھیں، ان کا اثر دوسرے تمام رجحانات پر کم و بیش پڑا ہے۔

(بقیہ حصہ کے لئے دیکھئے صفحہ ۳۶)

نئے ادبی وسماجی رجحانات

فروغ احمد بی اے (علیگ)

(پس منظر و پیش منظر)

بنگال کی جغرافیائی اور سماجی یکسانیت بذاتِ خود ایک مستقل موضوع ہے جس وطن کی ساحری میں کیا ہندو کیا مسلمان سبھی یکساں اسیر ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے مشرقی پاکستان، پاکستان کم اور بنگال زیادہ ہے یہ بنگال ہے جہاں فطرت مالا مال ہے لیکن انسان کنگال ہے۔ یہاں دریاؤں کے پیچ و خم اور گھنگھور گھٹاؤں کے مستانہ خرام ہیں۔ اگر نظر گم ہو جائے تو ٹیگور ابھرتا ہے۔ اور جب اس جنت ارضی میں آدم کے بیٹوں کی المناک زندگی پر نگاہ ٹھہر جائے تو نذر الاسلام اور جسیم الدین ابھرتے ہیں۔ "ٹائمس لندن کے ادبی ضمیمہ میں، ایڈورڈ تھامسن نامی ایک انگریز ادیب نے بنگال کو "شعر کی سرزمین" قرار دیا تھا۔ ایک اجنبی سیاح کے لئے یہ آج بھی اسی طرح "شعر کی سرزمین" ہے جیسے ٥ سال پہلے تھی۔ آزادی کے ان ٥ سالوں میں پاکستان کے دوسرے صوبوں میں نئے مسائل کے ریلے جتنی تندی اور تیزی سے آئے۔ بنگال میں اس کا عشرِ عشیر بھی نہ آیا۔ یہاں گھنگور گھٹاؤں کے سائے میں ہمالیہ کے دامن بانس و سپاری اور کیلے کی جھومتی ہوئی لچیلی قطاروں کا حسن آج بھی ہمارے ادیبوں پر جادو کئے ہوئے ہیں۔ اور سیلاب، قحط، ملیریا اور کالا آزار کی ہولناکیاں اور کچے جھونپڑوں کی ویرانیاں نظر فریب ہریالیوں میں ڈھکی چھپی ہیں۔ گنگا اور پدما کے سینے پر زعفرانی بادبان والی کشتیوں کو کھیتے ہوئے جفاکش ملاحوں کے راگ سے آپ مسحور ہو جائیں گے۔ لیکن ان کے نغموں کے زیر و بم میں جو اُن کی روح کا استفہام پوشیدہ ہے اسے کون سمجھے گا!

"میری کشتی گھاٹ پر لنگر سے باندھ دو
اور اس ملاح کے نام سے مجھے متعارف کراؤ
میں نے اس کشتی کو ایک گھاٹ سے دوسرے گھاٹ تک ڈھونڈا ہے
لیکن میں اب تک اس دریا کے آخری سرے کو نہیں پا سکا ہوں۔
میں نے اپنا "سنہرا پھول" اسی دریا میں ترایا ہے۔"

پھر دھان اور پٹ سن کی سنہری ہریالیوں میں بانس کے چوڑے چوڑے ٹوپ لگائے۔ منہ میں سپاری اور پان دبائے گھٹنے گھٹنے بھر پانی میں جھکے اور کھڑے ہوئے دہقانوں کے اس گیت کا لحن بھی آپ کو مست کئے بغیر نہ رہے گا۔

"اے رحمٰن! اے خدا! کون ہے تیرے علاوہ جس سے میں اپنے دل کا حال کہہ سکوں۔
جیسے ایک ابابیل بادل کی تنہائی میں گھلتی ہے
لیکن بادل ہوا کے دوش پر سوار دوسرے ملکوں کو چلا جاتا ہے!"

لیکن ان نغموں میں جو تجسس اور استفہام کی کسک ہے۔ اسے محسوس کرنے کے لئے اچھا سیاح ہوں اور شہر کے آسودہ حال ادیبوں کے دل و دماغ کی ضرورت نہیں جسیم الدین کہتے تھے اور شاید آپ بھی یہی کہیں گے کہ بنگال کے ان پڑھ شاعروں کے ان نغموں کو ماہنامہ عالم کی بہترین شاعری کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن کاش ہمارے ادیب اس پیاس اس تلاش کو محسوس کر سکتے۔ جو ہمارے شاعروں [illegible] کی روح میں صدیوں

سے بسی ہوئی ہے۔ بنگال کا ملاح اور بنگال کا دہقان دو نہیں ایک ہی ہیں۔ دریاؤں میں وہ ملاح ہے اور کھیتوں میں دہقان۔ وہ سادہ لوح اور جفاکش ہے۔ کتنے قحطوں اور کتنے بخاروں کا آزمودہ ہے۔ پھر بھی اس کے نغمے بڑے دلربا ہیں۔ ان کانوں کے لئے جو لحن کو تو جذب کر لیتے ہیں لیکن رُوح کو نہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ آج بھی ہمارا بھولا بھالا فطرت نگار شاعر جذبۂ وطنیت سے سرشار ہو کر گا سکتا ہے: ۔

"میرے سونے کے پاکستان! میرے مشرقی پاکستان!
جہاں دھان کے کھیتوں کی نیلی اور زرد بالیاں لہرا رہی ہیں۔
دور۔ جنگلوں اور درختوں کے سایہ میں۔
بھائیوں، بہنوں اور ماؤں کی محبت سے بسی
یہ جھونپڑیاں مٹی کی بہشت معلوم ہوتی ہیں۔"

لیکن ہمیں یقین ہے۔ کہ یہاں جلد یا بدیر ہریالیوں کا یہ طلسم ٹوٹے گا۔ اور چنگاریاں سلگ سلگ کر شعلہ بداماں ہو جائیں گی۔ البتہ اس کے تخریبی امکانات سے قطع نظر کرنا آسان نہیں ہے۔ اور اس کی ذمہ داری بنگال کے تعمیر پسند ادیبوں کے عام جمود پر ہے۔ میں بلاشبہ جسیم الدین کے اس خطبہ صدارت کو جسے انہوں نے کراچی کے بنگالی ایسوسی ایشن کے کسی اجلاس میں پڑھا تھا۔ بنگال کے انقلاب پسند ادیبوں کے دل کی آواز سمجھتا ہوں۔ لیکن مجھے اس میں شک ہے کہ یہاں کے ادیب قیام پاکستان کی تاریخی اور تہذیبی اہمیت سے آشنا ہو کر شعوری طور پر اسلام کی تعمیری قدروں سے جلد از جلد روشناس ہو سکیں گے۔ بہرحال نئی تبدیلی کی طرف جسیم الدین ان الفاظ میں اشارہ کرتے ہیں: ۔

"۔۔۔۔ میں تو غازی صلاح الدین کی زبردست صلیبی جنگوں سے زیادہ رو پاییاں کی بہادرانہ جنگوں سے متاثر ہوں ۔۔۔۔۔ میری ہیروئن شاجو، دوسے، انورا، یقیناً قیمتی لباس میں ملبوس سیاہ لمبی زلفوں والی خوبصورت اپسراؤں کے ساتھ جگہ نہ پائیں گی۔ مجھے یہ بھی احساس ہے کہ ان نئی فیشن پرست شہر کی خوبصورت لڑکیوں کے مقابلہ میں شاجو کی زرکار سوزنی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ لیکن تاج محل کی خوبصورتی اور حسن سے زیادہ اس کی زرکار سوزنی نے میرے شاعرانہ تاروں کو مرتعش کیا ہے۔"[1]

"مشرقی بنگال کے دور دراز علاقوں کا دورہ کرتے ہوئے میں نے کسانوں کی شکستہ چھتوں کے نیچے پناہ لیتی ہوئی بہشت کی حوریں دیکھی ہیں۔ کہ جہاں چاروں سمتیں ان کی خوبصورتی اور حسن سے منور تھیں اور جن کا جسم بھوک سے لاغر ہو رہا تھا۔ ہمارے فراری ادب نے ان کو بالکل اپنے ہاں جگہ نہیں دی۔ جو کچھ تھوڑی بہت صلاحیتیں مجھ میں ہیں میں نے انہی کے اظہار میں صرف کی ہیں۔ میں نے اپنے دل کی دھڑکنیں ان کے سیدھے سادے گیتوں میں شامل کر دی ہیں ۔۔۔۔۔"

یہ اقتباس پورے خطبے کا خلاصہ بیان ہے۔ ممکن ہے "تغیر محض" اور "انقلاب محض" کے دلدادگان اسے پڑھ کر پکار اٹھیں کہ ہم نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔ لیکن پاکستان کی مجلس دستور ساز میں، مشرقی پاکستان کے نمائندے، جو اکثریت کے مالک ہیں، "قرارداد مقاصد" کی زبان میں ایک ہمہ گیر عزم کا اعلان کر چکے ہیں۔ لہٰذا یہاں کی جماعت ملّی اور معیاری ادب کے موقف کو اتنے سیکولر اور مبہم اسلوب میں متعین نہیں کیا جا سکتا ہم اسے پاک بنگال کے لئے نئے ادب کا منشور قرار نہیں دے سکتے۔ پاک بنگال کے ادیبوں کو اسی طرح ایک واضح اور روشن منشور ادب کی ضرورت ہے جیسے پاک پنجاب۔ سندھ اور سرحد میں زیر عمل ہے۔ محولہ بالا اقتباس میں جس تغیر کی نشاندہی کی گئی ہے۔ وہ یہاں کی تاریخ ادب میں کوئی نئی چیز نہ

---

[1] جسیم الدین کی نظموں کے ایک مجموعے کا انگریزی ترجمہ بعنوان Embroidered Quilt شائع ہو چکا ہے۔

ہے۔ سچی بات تو یہ ہے۔ کہ ٹیگور کے رجحانات ہی سے اس کی ابتدا ہو چکی تھی۔ اس سلسلے میں ایک نہایت اجمالی جائزہ کافی ہوگا۔ لیکن جدید انقلابی رجحانات کے جائزہ سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ مختصراً یہاں کا تاریخی اور سماجی پس منظر بیان کر دیا جائے تاکہ نئے تغیرات کو پورے طور پر سمجھنے میں زیادہ آسانی ہو۔

ٹیگور سے بہت پہلے بنگلہ زبان علم و ادب کی زبان سرے سے تھی ہی نہیں۔ اس زمانے میں باہر والے وغالباً تعصب کی بنا پر اسے "بھوتوں کی زبان" کہتے تھے۔ مذہبی جذبات، سماجی روایات اور منظریہ کیفیات کو گیتوں اور کہانیوں، کہاوتوں کے پیرایہ میں سادگی کے ساتھ ادا کیا جاتا تھا۔ قرنہا قرن سے جو عوامی سرمایہ جمع ہوا تھا اس کے مصنف تک گمنام تھے۔ مسلمانوں کے پاس سترھویں صدی تک جو کچھ رہا سہا مسلم اشراقی بچا تھا اور اٹھارہویں صدی کی تحریک جہاد نے جس حد تک اسے اجاگر کیا تھا۔ بس وہی ان کا نشان امتیاز باقی تھا۔ ورنہ برطانوی عہد میں بندوبست استمراری Permanent Settlement کی لعنت نے تو دائمی طور پر مسلم عوام کو ہندو جاگیرداروں کا محکوم بنا کر رکھ دیا۔

بنگال کے عامۃ المسلمین صدہا سال سے "کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری" رہے ہیں۔ خواص اور ماہرین صنعت و حرفت جو بیشتر مرشد آباد اور ڈھاکہ جیسے تمدنی مراکز میں مقیم رہے۔ ہمیشہ درباری تمدن کے علمبردار رہے۔ بنگال کے عوام ان تمدنی مراکز سے دور اپنے کھیتوں کے آغوش میں اور دریاؤں کے سینوں پر پناہ گزیں رہے۔ ان کا تمدن اُن کی ہریالیاں۔ ان کے تہوار اور ان کے سیدھے سادے درد بھرے گیت تھے جو سیکڑوں سیاسی تغیرات کے بعد آج بھی جوں کے توں ہیں۔ وہ اپنے ادیب آپ رہے۔ ان کا کوئی ادیب کبھی پیدا نہ ہوا۔ جو ان کے سادہ اور ان گھڑ گیتوں کو تراش و خراش دے کر ان کے سرمایہ ادب کو سنوارتا۔ ان کے موضوع ہمیشہ وہی رہے "مادر فطرت" اور اپنا موروثی عقیدہ فطرت سے وہ آسودگی اور ترنگ حاصل کرتے اور موروثی عقیدہ۔ ان کی طمانیت اور سکون قلب کا منبع رہا۔ لیکن ان کی آسودگی اور ترنگ میں ہمیشہ ان کے حکمران شریک غالب رہے۔ اور طمانیت اور سکون قلب کے لئے انہیں اپنے ملاؤں اور پیروں کا حلقہ بگوش رہنا پڑتا۔ یہ ہے ان کی قدیم سادہ لوحی اور جہالت کا تاریخی راز جو آج بھی ان کے سیدھے سادے گیتوں سے جھلکتا ہے۔ حکمرانوں اور جاگیرداروں کے تنے ہوئے چہروں، ملاؤں اور پیروں کے بخشے ہوئے اوہام و خرافات کا اندازہ آپ ان کے گیتوں اور کہاوتوں سے کر سکتے ہیں۔

کیا انہی گیتوں کے مجموعہ کو ہم مسلم بنگال کا قدیم سرمایۂ ادب قرار دیں۔ مسلم عوام کے اپنے گیت، ان کے پیروں کی "پنچھالی"[1] اور ان کے ملاؤں کی "بوتھیالی"[2] سب مل جل کر مجموعی طور پر بھی ادب العالیہ میں شمار ہونے لگیں تو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ بنگلہ زبان میں مسلم کلاسیکل ادب کی یہی کل کائنات ہے جسے گذشتہ ۱۵۰ سال کے سیاسی تغیر کے بعد پے در پے تباہ کن حالات کا مقابلہ کرنا پڑا۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے۔ بندوبست استمراری Permanent Settlement نے مسلمانوں کو دوہری غلامی میں مبتلا کر دیا۔ سیاسی غلامی انگریز حاکموں کی اور معاشی و سماجی محکومی ہندو جاگیرداروں کی اس دوہری غلامی نے بالکل پامال کر کے رکھ دیا۔ بس مسلم خواص کا ایک وہی طبقہ ان تغیرات کی زد سے محفوظ رہا۔ جو پٹھانوں اور مغلوں کے عہد میں بھی درباری تمدن کا علمبردار تھا۔ اور آج بھی مغربی تہذیب کا پروردہ[3] ہے مر

---

[1] یہاں "پنچھالیوں" کی وہی نوعیت ہے۔ جو پنجاب میں بلھے شاہ وغیرہ کی "کافیوں" کی ہے۔ ان میں تصوف اور "معرفت" کے نکتے اور زندگی کی بے ثباتی، یاس و حرماں کے مضامین ہوتے ہیں۔

[2] آج کل بعض بنگالی اہل قلم بڑے زور و شور سے "پوتھی لٹریچر" کا حوالہ دے رہے ہیں۔ پوتھی لٹریچر میں الف لیلیٰ، قصص الانبیاء، سکندر نامہ اور میلاد وغیرہ کی چند کتابیں ہیں۔ جنہیں مقامی زبان لیکن عربی رسم الخط میں تحریر کیا گیا ہے۔

[3] حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

...ہم سا جو حشر ہوتا تھا وہ ہو کر رہا ؎

دوسری طرف انگریزوں کے کلچرل تصادم سے ہندوؤں میں جو شدید اصلاحی ردّعمل پیدا ہوا۔ اس نے انہیں فکری اور علمی و ادبی حیثیت سے مالا مال کر دیا۔ اور چونکہ اپنے مسلم ہم وطنوں کے مقابلہ میں وہ فوقیت یافتہ ہو چکے تھے۔ اس لئے ان کی تہذیبی برتری اٹل تھی۔ ہندوؤں کی اس تہذیبی برتری کا سراغ چنداں دشوار نہیں۔ سیرا مپور اور کلکتہ کے عیسائی مبلغین نے جب مقامی زبان کو اپنا آلۂ کار بنایا۔ تو اس کی زد قدیم مروجہ تہذیب پر پڑی۔ اس کا ردّعمل راما کرشنا مشن اور برہمو سماج وغیرہ اصلاحی تحریکوں کے روپ میں نمودار ہوا۔ یہی وہ زمانہ تھا۔ کہ پہلے پہل بنگلہ زبان میں بلند مضامین کی ادائیگی کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ اور اس میں مذہبی اور سماجی لٹریچر کی پیداوار تیزی سے شروع ہو گئی۔ اسی زمانہ میں تحریک آزادی کی ابتدا ہو چکی تھی۔ اور بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہوتے اس میں کافی شدت آ چکی تھی۔ چنانچہ مذہبی اور سماجی ادب کے ساتھ ساتھ سیاسی ادب کے پروان چڑھنے کا خوب موقع ملا۔ اس دور کو ہم "رینےسانزم" کے دور سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ کیونکہ بنکم چندر چٹرجی کے مکتبہ فکر نے اسی دور میں پہلے پہل متشدد وطنیت کے روپ میں نو ہندویت (New Hinduism) کو جنم دیا۔ ٹیگور اپنے متشدد وطن پرست ہم عصروں کے مقابلہ میں امن پسند وطن پرست تھا۔ چنانچہ "حسن" اور "امن" بظاہر اس کے بنیادی موضوعات رہے۔ لیکن اس پورے پچاس سالہ دور کے سرمایۂ ادب کا جائزہ لینے والے کہتے ہیں۔ کہ ٹیگور کی "آفاقیت" اور "صلح کل" کے علی الرغم ایک چیز قدر مشترک رہی ــــ ہندو کلاسیکیت یا ہندو روایات۔ یہی مابہ الاشتراک بنکم اسکول میں نفرت و تشدد کا روپ اختیار کرتا ہے اور ٹیگور اسکول میں "شانتی" کا نقاب بن جاتا ہے لیکن مابہ الاشتراک کسی طرح اپنی اصلیت کھو کر مابہ الامتیاز نہیں بن سکتا۔

اس طرح یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے۔ کہ ٹیگور تک بنگالی تہذیب اور بنگالی علم و ادب کی زمام کار ہندو اثر کے ہاتھ رہی ہے یہی سبب ہے کہ آج کا معیاری بنگلہ ادب اپنی اصلیت میں ہندو نژاد ہے۔ یہ بات محض سنسکرت الفاظ کی کثرت دیکھ کر نہیں کہی جاتی۔ بلکہ بیشتر ہندو تصورات و اقدار کے غلبہ کی بنا پر یہ فیصلہ کیا جاتا ہے۔ بنگال میں مسلمانوں کی صدہا سالہ حکومت اور ان کی عددی اکثریت کے باوجود کہ زبان و ادب پر ہندو اثر کیوں غالب رہا۔ اس کے اسباب کا سمجھنا اب چنداں مشکل نہیں۔

ماضی قریب میں قدیم مسلم اثر اور جدید ہندو اثر کے درمیان جو مقابلہ ہوا ہے۔ اسے ہم بالکل بے جوڑ کا مقابلہ سمجھتے ہیں۔ ایک طرف ہندو علماء، مفکرین، مصلحین، مدبرین اور ادبا کی مساعی سے پیدا شدہ سرمایۂ علم و ادب دوسری طرف مسلمانوں کے دہقانی گیت اور ان کی پوتھی پتھی۔ کتنا بے جوڑ تھا یہ مقابلہ! چنانچہ انجام وہی ہوا جو قدرتی طور پر بالکل ناگزیر تھا۔ اور آج یہ حال ہے کہ بنگالی ادب کا کوئی معیاری نمونہ پیش نہیں کیا جا سکتا۔ جو ہندو اثر سے بالکلیہ پاک ہو ــــ تشبیہات، استعارات، تمثیلیں اور محاورے تک ہندو دیو مالا اور ہندو تصورات سے ملوث ہیں۔ یہ صورت حال گویا ایک امر فیصل شدہ (Fait accompli) بن چکی ہے۔ جس پر ٹیگور کی عظیم شخصیت اور اس کے بے پایاں سحر فن نے اس طرح مہر توثیق ثبت کر دی ہے کہ کوئی تغیر بظاہر محال نظر آتا ہے۔

* * *

لیکن کیا واقعی کوئی تغیر، جیسا کہ اوپر کے سطور سے اندازہ ہوتا ہے محال ہے؟ نہیں حقیقت میں ایسا نہیں ہے جسیم الدین کا اقتباس نقل کرنے کے بعد اوپر عرض کر چکا ہوں۔ کہ تغیر ٹیگور کی زندگی ہی سے شروع ہو چکا تھا۔ بعض لوگ اس پر کچھ اس طرح روشنی ڈالتے ہیں۔ کہ ایک

بالفعل بنگالی "صاحب لوگوں" کی تعداد شمالی ہندوستان کے "صاحب لوگوں" کے مقابلہ میں کم ہے لیکن وہی آج یہاں کی جماعت اجتماعی کی قیادت انجام دے رہے ہیں۔ اور انہی کو ہر قسم کی سماجی برتری حاصل ہے۔

نئے ادبی و سماجی رجحانات

سطحی ہیں اور جذباتی آدمی اسے قیام پاکستان کا نتیجہ سمجھ کر مطمئن ہو جاتا ہے بھلا مگر نہ ہم اسے جدید سمجھتے ہیں۔ نہ اطمینان بخش۔ یہ تغیر ناقابل اطمینان بھی ہے اور قدیم بھی ہے۔ ذیل کے سطور سے شاید آپ اس کے ناکارہ پن اور قدامت کا اندازہ کر سکیں۔

ٹیگور کا پیام صلح و آشتی بے ضرر اور سکون بخش ہے۔ لیکن سیاسی و معاشی محکومیت اور سماجی انتشار کا مداوا نہ تھا۔ وہ بس بوڑھی نسل اور "روحانیت" پسند طبقہ کے لئے سامان طمانیت تھا اور آج بھی ہے۔ لیکن دوسری طرف نئی نسل کا خون تحریک آزادی نے پہلے ہی گرما رکھا تھا اپنے وطن کی معاشی و سماجی بدحالی کا براہ راست مشاہدہ اور پھر یورپ اور وسط ایشیا کے سیاسی و سماجی انقلابات کی سہانی داستانوں کا مطالعہ کرتے ہی ہر قسم کے جمود، امن پسندی اور سلامت روی کے خلاف بغاوت کی آگ ان کے دل و دماغ میں بھڑک اٹھی۔ یہ گویا ٹیگوریت پر پہلی ضرب تھی۔ بقول جیبا نندا داس، ٹیگور کے بعض مقلدین ہی میں اس تبدیلی کے آثار شروع ہو چکے تھے۔ مثلاً ستیا ندرناتھ دتا کے یہاں روایاتی اور جدید اسالیب کی آمیزش کا پتہ چلتا ہے۔ حتیٰ کہ خود ٹیگور بھی جدید تغیر کے اثر سے محفوظ نہ رہ سکے۔

جدید تغیر کا جائزہ لیتے وقت یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ نئی انقلاب پسندی یا تو انتہائی مبہم ہے یا سراسر الحادی اور تخریبی۔ اس ضمن میں سب سے پہلے تین باغی شعراء ——— موہت لال موزمدار، قاضی نذر الاسلام اور جتین سین گپتا کے نام لئے جاتے ہیں۔ موہت لال۔ موزمدار شدت جذبات، حسیت اور ٹھوس پن میں منفرد ہے۔ لیکن وہ ٹیگوری کلاسکیت سے کلی طور پر نجات نہ پا سکا۔ نذر الاسلام کی انقلابی دہشت پسندی اور جوش بیان تو ضرب المثل بن چکی ہے۔ لیکن اس کی انقلابیت سائیکلونی اور مانسونی طوفان لہ سے مشابہ ہے۔ جس کی کوئی راہ اور سمت متعین نہیں۔

نذر الاسلام کی "مجاہد کی صدا" ملاحظہ ہو:۔

"پُر آشوب گھٹائیں، تاریک راتیں اور ہولناک آندھیاں شاہد ہیں کہ اپنی ٹوٹی ہوئی کشتی کو
میں نے لہروں کے سپرد کر دیا ہے۔"

• • •

"میرے نوحوں کو سن کر گور غریباں کے چراغ پھر سے زندگی کا سانس لیتے ہیں
اور میں جگنو کی طرح ہر گھر میں آگ جلاتا جاتا ہوں۔
نئی زندگی فرات کے دھارے کی طرح بہہ رہی ہے
لیکن اس کا ساحل قربانی کا پیاسا ہے"

کبھی وہ "طائر صبح" سے یوں خطاب کرتا ہے:۔

"اے او طائر صبح!
چل آج سے ہی میں تیرا ہمنوا اور ہمسفر ہوں
تو جو بھی نغمہ چھیڑے گا
اسی کے سرگم پر میری شاعری کی برکھا برسے گی

لہ اس تشبیہ کا تحت الشعوری پس منظر "حوالدار نذر الاسلام" کی عراق والی فوجی زندگی کا تجربہ ہے۔ ممکن ہے واقعہ کربلا بھی اس میں شامل ہو۔ (ف۔ ا)

جب ہم اس کی یہ پکار سنتے ہیں ؛ -

"شباب ! اور شباب !
تیرے جوان نغموں کی تھرتھراہٹ سے میرا دلربا ساز
خود بخود بج اٹھتا ہے"

تو بے ساختہ جوش کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے ؂

کام ہے میرا تغیر، نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ "انقلاب و انقلاب و انقلاب"

اُردو میں جوش اور بنگلہ میں نذر الاسلام کے مابین بہت قریبی مماثلت ہے۔ نہ جوش کی راہِ سفر اور سمتِ سفر متعین ہے نہ نذر الاسلام کی۔ دونوں انقلابی ہیں لیکن ان کی انقلابیت جذباتی ہے۔ اور واضح تفکر اور متعین شعور سے ناآشنا نذر الاسلام کی نظم "ودروہی" (باغی) کو اس کا شاہکار کہا جاتا ہے اور اگر شاہکار کسی یکتا ادیب کی زندگی کا یکتا ثمر ہوتا ہے۔ تو "ودروہی" کا مصنف اس قدر طوفانی ہے کہ ہم اسے کسی مسلک کے خانے میں نہیں رکھ سکتے۔

جب سے پاکستانی مدبرین کے ہجیسا فیض تدبر سے اُردو اور بنگلہ کا قضیہ بڑھتا جا رہا ہے۔ یہاں کے مقامی دانشور اقبال کے مقابلے میں نذر الاسلام کو پیش کرنے لگے ہیں۔ بے شک نذر الاسلام کے یہاں کچھ مذہبی علامتیں ملتی ہیں۔ اور خصوصاً تحریک پاکستان کے دوران میں اس کی لکھی ہوئی نظموں کو ایک خاص مقام دیا جاتا ہے۔ لیکن "کالی دیوی"، "دیوالی" اور قبل از ہیں ہندو دیو مالا کے بے شمار ارکان اس کے یہاں موجود ہیں۔ جن سے اس کے وجدان کو غذا ملتی ہے۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ اس کی شاعری اس کی اپنی خانگی زندگی کا پرتو ہے۔ اسلام کی مذہبی اقدار سے وہ اسی حد تک مانوس ہے۔ جس حد تک ان کے شعور میں قدیم تلمیحوں کا اثر اس پر پڑا ہے۔ ہاں اس نے عربی فارسی کے بے شمار الفاظ بڑی خوبی سے کھپائے ہیں۔ اس سے بنگلہ زبان کی زمین اسلامی ادب کے لئے قدرے ہموار ہو گئی ہے لیکن یہ بات کہ نذر الاسلام کو اس کی بعض ظاہری خصوصیات کی بنا پر اسلامی شاعر قرار دے دیا جائے ایسی ہی ہے جیسے جوش کو اس کی بعض مذہبی نظموں کی بنا پر اسلامی شاعر مان لیا جائے۔

سوبت لال موزمدار اور نذر الاسلام سے جتین سین گپتا بالکل مختلف ہے۔ وہ اپنے یاسیہ اور عرفانی نغمات اور بے لوث قنوطیت کے لئے مشہور ہے لیکن راہِ سفر اور سمتِ سفر اس کے یہاں بھی متعین نہیں۔ اور ہم اس کی نظموں کو تعمیری یا جائز ادب کے خانے میں نہیں رکھ سکتے۔ ابہام اور انقلابیت اور تخریبی رجحان ان تینوں اوّلین باغیوں کے یہاں موجود ہیں۔ لہٰذا ان اقانیم ثلاثہ کے بطن سے باغیوں کا ایک دوسرا گروہ پیدا ہوا۔ ان کا فکر زیادہ یکسو اور شعور زیادہ واضح ہے۔ لیکن اشتراکیت سے آگے یہ کچھ سوچ نہیں سکتے۔ مسائل حاضرہ کا حل ان کی اپنی روایات میں نہیں۔ اس لئے وقت کی چلتی ہوئی باد شمال کے رُخ پر بہہ نکلے ہیں۔ اس گروہ میں پریمندر امترا اور بودھا دیو باسو کے نام اور پہلے جانتے ہیں۔

"پریمندرا بودھا دیوا گروہ" کے ادیب اگرچہ نئی زندگی کے "حقیقی" پہلو پر زور دیتے ہیں۔ لیکن وہ شیلی، کیٹس، ورڈز ورتھ وغیرہ انگریزی شاعروں کی جستی اور ماورائی رومانیت سے اس قدر متاثر ہیں کہ ان کی بیشتر انقلابی نظمیں اطوپیائی (Utopian) خصوصیات کی حامل ہوتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بغاوت کے جوش میں انہوں نے روایات شکنی کی، روایت سے آزادی تو حاصل کی۔ لیکن پھر مغربی روایت میں

بحوالہ مقالہ ادھایندو داس گپتا مطبوعہ اسٹیٹسمین کلکتہ ۔۔۔ ۱۳ جون ۔۔۔ء

گرفتار ہو گئے ۔ سوال یہ ہے ۔ کہ بنگال کے انقلابی ادیب کلی طور پر رومانیت سے نجات کیوں نہیں پاسکتے ؟ اور نذر الاسلام جیسے طوفانی شاعر بھی "طائر صبح کے نغمے کے سرگم" پر "شاعری کی برکھا" برسانے پر کیوں مجبور ہو جاتے ہیں ۔ اور ان کی "اذان" پر، "پیچھے ——— بہت پیچھے چمپاکلی بیل" ہی "سجدہ ریز" کیوں ہو جاتی ہے ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بنگال میں فطرت کے یلغار کے مقابلے میں انسان طبعی طور پر اس قدر عاجز رہتا ہے کہ وہ اس کے زبردست طلسم سے اپنے آپ کو اور اپنے گیتوں کو محفوظ نہیں رکھ سکتا ۔ یہاں فطرت کے زبردست طلسم کے آگے انسان طبعی طور پر زیردست ہے ۔ یہی سبب ہے کہ یہاں کے بھوکے اور مریل کسانوں کے گیت سے ایڈورڈ تھامسن جیسے اجنبی سیاحوں کو بڑا دھوکہ ہوتا ہے ۔ "پریندرا بودھا دیا گروہ" کی انقلابیت میں فطرت کا طلسم گھلا ملا ہوا موجود رہتا ہے ۔ اس سلسلے میں اس گروہ کے صرف ایک ادیب کی مثال کافی ہوگی ۔

اچنتیا کے متعلق خود بنگالی ناقدین کی رائے ہے کہ وہ انیسویں صدی کی انگریزی رومانی شاعری سے متاثر ہے ۔ اور وہیں سے اخذ کردہ مابعد الطبیعاتی رجحان کا حامل ہے ۔ حتیٰ کہ نئے انقلابی دانشوروں میں اس کی رومانیت اتنی غیر مقبول ہوئی ۔ کہ بالآخر اس نے شاعری ترک کر کے افسانہ نگاری اختیار کر لی ۔ افسانوں میں رومانیت کی اتنی آزادی نہیں جتنی شاعری میں رہتی ہے ۔ چنانچہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ اب یہاں کے بہتیرے ادیب افسانہ نگاری کی طرف مائل ہیں ۔

بنگلہ ادب میں باغیوں کے تیسرے گروہ "اجیت دتا جیبا نندا داس گروہ" کا بھی وہی حال ہے جو اول الذکر دو گروہوں کا تھا ۔ لیکن خود جیبا نندا داس اپنے گروہ کے کسی مثالی ادیب کو اوروں کے مقابلہ میں کامیاب قرار دیتے ہوئے اس کی کامیابی کا راز ان الفاظ میں بیان کرتا ہے :-

He arrives at his own philosophy and builds his own world, which is never a negation of the actual one, but is the same living world organized more truly and proportionally by the special reading of it by the special poet.

یعنی "وہ اپنا ہی فلسفہ اخذ کرتا ہے ۔ اور اپنی ہی دنیا تعمیر کرتا ہے ۔ جو حقیقی دنیا کی ہرگز تردید نہیں کرتا ۔ بلکہ یہی جیتی جاگتی دنیا ہوتی ہے جسے ایک خاص شاعر کے مخصوص مطمح نظر نے زیادہ حقیقی اور زیادہ متناسب طور پر تشکیل دیا جائے ۔"

کیا اس صراحت کی ضرورت باقی ہے کہ اس بیان میں "خود جیبا نندا داس بھی ہو سکتا ہے بلکہ ہے ؟ ما لینددا اس گپتا اپنے مقالے میں اجیت دتا اور جیبا نندا داس کو شعرائے مستقبل قرار دیتے ہوئے ان کی طلسمانیت اور رومانیت کا اعتراف کرتا ہے ۔ اس سلسلہ میں وہ اول الذکر کی نظم کا ایک انگریزی ترجمہ Dedication مترجمہ Martin Kirkman اور ثانی الذکر کی نظم "وصویسیر بیلاپی" کا حوالہ دیتے ہوئے دونوں کی سنسنی خیزی اور رومانیت پر بے لاگ تبصرہ کرتا ہے ۔

یہاں تک کہ روایاتی آثار کے خلاف مسلسل بغاوت کی جو مختصر سی روداد تحریر کی گئی ہے ۔ اس پر جیبا نندا داس کے تبصرے کا خلاصہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا ۔ وہ اسے "صحت مند تغیر" قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ "بنگلہ ادب کے قاری ذہنی سرعت سے حساس بنتے چلے جا رہے ہیں ۔ اس تناسب سے بدلتے ہوئے شعراء کا کلام ان کے ذوق کا ساتھ نہیں دے رہا ہے ۔ لہٰذا ان شعراء کی مقبولیت کم ہوتی جاتی ہے ادب میں دائمی اقدار سے انکار نہیں اور کلاسیکی نیز تھیوری ادب میں بھی اس کا وجود ہے ۔ لیکن محض اس بنا پر ہم قدیم روایات سے چپکے نہیں رہ سکتے . . . . . .

معاشرتی اور سیاسی تغیرات نے آج ٹیگوری ادب کو ہٹا کر جدید ادب کو جگہ دی ہے ۔ جسے کسی ایک ادیب سے منسوب کرنا مشکل ہے - ان ادیبوں میں انفرادی اختلافات ہیں ۔ بعض رومانیت سے قطعی کنارہ کش ہو کر جدلیاتی مادیت کو شاعری کا لباس پہنانے کے درپے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان میں سے بیشتر اس سلسلہ میں ناکام ہیں - اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ موجودہ گتھیوں کو سلجھانے کی بجائے خود ان میں الجھ گئے ہیں - اور اسی حال میں صف میں بعض دوسرے شعراء (یہ خود اپنے گروہ کا ذکر ہے) جدید مسائل کو حل کرنے میں زیادہ محتاط واقع ہوئے ہیں - ان کی کامیابی کا راز یہ ہے ۔ کہ انہوں نے موجودہ ہیولاتی ماحول کی مدد سے اپنی دنیا آپ بنائی ہے ۔ اگرچہ کبھی کبھی وہ بہت زیادہ آزاد ہو جاتے ہیں ۔ لیکن ابھی بہر حال ان کا کام جاری ہے - اور ایسا معلوم ہوتا ہے ۔ کہ جب یہ تکمیل کو پہنچے گا ۔ تو ٹیگوری ادب کا بالکلیہ خاتمہ ہو جائے گا ۔ اور بنگالی ادب اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ جائے گا ۔"

جیسا نند ا داس کے تبصرے کا یہ خلاصہ جدید تغیرات پر بہت واضح روشنی ڈالتا ہے ۔ اور اب تک کے تمام تغیرات کے ادھورا پن کی تصدیق کرتا ہے ۔

* * *

اب آپ جسیم الدین کے خطبہ صدارت کا دوبارہ مطالعہ کریں ۔ کوئی نئی بات نظر نہیں آئے گی جیسا کہ عرض کر چکا ہوں ، قیام پاکستان کے بعد ہم اس "تغیر" کو کسی نئے "تغیر" سے تعبیر نہیں کر سکتے ۔ یہ تغیر اتنا ہی قدیم ہے جتنے قدیم موہت لال ، نذر الاسلام اور جیتن سین گپتا ہیں - ـــــ اتنا ہی ناکام ہے جتنے ناکام پرتیش مترا ، بودھا دیوا بوس اور اچنتیا ہیں ـــــ اتنا ہی مبہم اور سیکولر ہے جیسے غلام مصطفیٰ ، مفتخر الاسلام اشرف صدیقی اور فرخ احمد جیسے ادیب اور شاعر ہوں یا محبوب العالم ، ابو الکلام شمس الدین اور سید ولی اللہ جیسے افسانہ نگار ۔ ان میں کوئی فن کار ایسا نہیں ہے ۔ جسے ہم پاکستان کا اسلامی فن کار قرار دے سکیں ۔ نئے سیاسی تغیر نے تھوڑی بہت جو کچھ سطحی سی تبدیلی ان میں پیدا کی ہے وہ قومی اور جذباتی ہے نہ کہ دینی اور شعوری ۔ یہاں کے علمی ادبی اداروں میں "تمدنی مجلس" اور مولانا اکرم خاں صاحب کا ادارۂ محمدی خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ تمدنی مجلس کے کاموں کا جائزہ لینے والے جانتے ہیں ۔ کہ اس کے مسلک کے لئے اگر کوئی نام تجویز کیا جا سکتا ہے تو وہ ہی "اسلامی سوشیلزم" ہے جس کا پروپیگنڈا حکمران طبقہ کی طرف سے بہت ہو چکا ہے ۔ اس کے ترجمان ماہنامہ "تہذیب" اور پندرہ روزہ "شونیک" ، اور اس کی تمام مطبوعات اسلام میں اجتہاد قریب "جدیدیت" اور معاشی مسئلہ کے اشتراکی حل پر زور دیتے ہیں ۔

حکمران طبقہ کی دانش مندی سے گزشتہ ۵ سال میں ملک میں ایسے سیاسی حالات رونما ہوئے ہیں ۔ کہ یہاں مرکز کے خلاف ایک عام بیزاری پروان چڑھ رہی ہے ۔ اس بیزاری کو راندگان بارگاہ اور موقع شناس سیاسیین کی ریشہ دوانیاں خوب خوب استعمال کر رہی ہیں ۔ ان کی سیاسی تنظیمیں صوبائیت (بنگالی قومیت) کا زہر پھیلا رہی ہیں ۔ یہ سب کی سب تنظیمیں بیشتر اشتراکیت زدہ نوجوانوں کے زیر اہتمام ہیں اور زندگی کی تگ و دو سے کسی نہ کسی طور پر "تمدنی مجلس" کے معترفین کی سرگرمیوں کے ڈانڈے مل جاتے ہیں ۔

اس طرح یہاں مذہبی جدیدیت اور علاقائی قومیت کے روپ میں اشتراکیت اپنی جڑیں دور دور تک پیوست کئے جا رہی ہے ۔ حال ہی میں زبان کے مسئلہ پر جو ہولناک تخریبی ہنگامہ ہوا ہے اس نے ان اصحاب کی آنکھیں کھول دی ہیں ۔ جو اب تک اس خوش فہمی میں مبتلا تھے ۔ کہ پاکستان میں اشتراکیت کی دال نہیں گل سکتی ۔ یہ تو اصل مرض کی ایک ادنیٰ سی علامت (Symptom) تھی ۔ ابھی آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا ؟ رونا اس بات کا ہے کہ مرض کا مداوا کہیں کارفرما نہیں ہے ۔ مولانا اکرم خاں صاحب کا ادارہ محمدی صوبائیت (علاقائی قومیت) کے مقابلہ میں مرکزیت (ملکی قومیت) کا علمبردار ہے ۔ لیکن موجودہ ہیجانی صورت حال میں محمدی کے مضامین کی مقبولیت آسان نہیں ۔ البتہ دو دار ... نظام کی ساحرانہ تقاریر ، ریڈیو کے نظام نشریات اور بعض دیگر سرکاری و نیم سرکاری ذرائع سے قوم پرستی کا جو ایک سماں باندھا جا رہا ہے

ہیں سے مولانا اکرم خاں اپنے لئے ایک راہ عمل نکال لیتے ہیں۔ اس طرح خود ان کا روزنامہ "آزاد" اور مرحوم لیاقت علی خاں اور نورالامین کے مشترکہ ٹرسٹ کا جاری کردہ روزنامہ "سنگ باد" کے ساتھ ساتھ انگریزی اور بنگلہ کے کئی سرکاری گزیٹ اور بلیٹن قوم پرستانہ رجحان کو پروان چڑھا رہے ہیں۔ گویا اشتراکیت اور علاقائی قومیت کے خطرہ کو دبانے کے لئے یہ دوسرا روگ جسد قومی کو لگایا جا رہا ہے۔ اور اس کی تمام تر ذمہ داری سرکاری اور نیم سرکاری صحافیوں اور ان بھولے بھالے ادیبوں پر ہے۔ جو فوقیت یافتہ طبقہ سے قریب تر ہونے کے باعث ان کی پھیلائی ہوئی قوم پرستی کے فریب میں مبتلا ہیں۔ اس سلسلے میں ایک نیم سرکاری مذہبی ادارہ کا نام نہ لینا بہت بڑی فروگذاشت ہوگا۔ یہ ادارہ قرآنی کے نام پر قائم ہوا ہے۔ اور بائبل سوسائٹیز کے طرز پر دو سال سے کام کر رہا ہے۔ اس کا واحد نصب العین صوبے کے مسلم دانشوروں میں فکری اسلام کی اشاعت ہے۔ بدقسمتی سے اس کی ساعی کو ایک ایسے مذہبی گروہ کے کارندے تقویت پہنچا رہے ہیں۔ جو متحرک خانقاہوں . . . (Mobile monasteries) کی شکل میں عوام کو جامد مذہبیت کی افیون پلانے میں مصروف ہے اور اشتراکیت کے لئے یہاں کی زمین ترکستان و چین کی طرح ہموار ہوتی چلی جا رہی ہے ۔

ان سطور میں عام تخریب کے محض فکری عوامل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن کی گہرائی بیشتر یہاں کے دانشور طبقہ تک محدود ہے اور ان کی اہمیت اس لئے شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ عوام کی قسمت کی باگ ڈور اسی طبقہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ آج کم از کم سیاسی حیثیت سے تو یہ بات مسلّم ہے کہ فوقیت یافتہ گروہ کی ساحری سے نجات کوئی آسان بات نہیں۔ یہی بات نہیں بلکہ معاشی اعتبار سے بھی یہاں کے عوام اب تک دوہری محکومیت کی لعنت سے آزاد نہیں ہوئے ہیں۔ وہ سونا اگاتے ہیں لیکن ان کا سونا بہت ارزاں ہے۔ کیونکہ بدیسی سامان "ترقیات" کی مانگ بڑھ گئی ہے۔ ہاں جاگیرداری کو قانوناً منسوخ کر دیا گیا ہے لیکن عملاً پوری مملکت کا نظام اب بھی وہی ہے ۔ پریشان روزگار اور پریشان حال کسان جب ملتجی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتے ہیں تو انھیں لال پیلی پگڑیاں باندھے ہلس مکھ مارواڑی رحم و کرم کے دیوتا نظر آتے ہیں۔ آپ مشرقی پاکستان میں دیناج پور سے چاٹگام اور سلہٹ سے ورشنا تک سفر کر جائیں۔ آپ کو یہاں کی آبادی کے رگ و ریشہ میں یہ سیٹھ سرایت کئے ہوئے ملیں گے ۔

ان حالات میں یہاں کے عوام کی زندگی کتنی ویران ہو سکتی ہے۔ اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کی اندرونی خلش ان کی متلاشی روح اور ان کے درد کو آپ ان کے گیتوں اور ان کی بانسری کے نغموں میں محسوس کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ آپ ان کی موسیقی سے مسحور نہ ہو جائیں۔ کاش کوئی ان کے پیہم سوال کا حقیقی جواب دے سکتا ۔

موجودہ حالات میں سوائے مایوسی کے اور کچھ حاصل نہیں۔ یا تخریب ہے یا جمود۔ اچھی بات تو یہ ہے، کہ اسلامی شعور پیدا کرنے کا کام یہاں سرے سے ہوا ہی نہیں۔ جامد مذہبیت کے پرستاروں نے چند مذہبی و اخلاقی تالیفات اور تراجم کے گورکھ دھندے فراہم کئے ہیں جن میں سے بیشتر نے خواص و عوام میں پراگندگی فکر پیدا کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کیا ہے۔ بجز ان کے جو اثرات ماضی قریب میں لئے شمالی ہند اور پنجاب کی وہ ہمہ گیر فکری تحریکیں تھیں۔ جن کا کسی نہ کسی دن یہاں تک پہنچنا مقدر تھا۔ ان میں علامہ اقبال رح کی تصانیف و افکار کو اولیت حاصل ہے۔ لیکن ہمارے بعض سادہ لوح، تذکرہ نگار اقبال رح کی نظموں اور مثنویوں کے بنگلہ تراجم کا کچھ اس طرح تذکرہ کرنے لگے ہیں کہ جیسے یہ بھی قیام پاکستان کا ایک ثمرِ شیریں ہو۔ حالانکہ قیام پاکستان سے بہت پہلے اور وہ بھی کسی مسلمان ادیب کے ہاتھوں نہیں

سلہ بحوالہ "اقبال اور بنگالی ادیب" از مولانا دین قیصر ندوی مطبوعہ ماہِ نو کراچی بابت اپریل ف ۱۰

بلکہ اقبال ؒ کے ایک معترب بنگالی ادیب پروفیسر ڈاکٹر منیر چوہدری کے ہاتھوں ـــــــ یہ کارنامہ انجام پا چکا تھا ۔ جنہوں نے اقبال ؒ کی بعض نظموں سے اپنے اہلِ وطن کو روشناس کرایا ۔ بعد ازاں صرف ایک عالم ہے جو بہت سے کر ابو الکلام مصطفےٰ تک کم و بیش چھ مسلمان مسلم ادیبوں نے شکوہ و جوابِ شکوہ کے رنگا رنگ تراجم شائع کئے ۔ ابو الکلام مصطفےٰ نے تو یہ غضب کیا کہ اقبال ؒ سے اہلِ بنگال کو مانوس کرنے کے دھن میں شکوہ و جوابِ شکوہ کے ماحول کو مقامی رنگ میں رنگ دیا ۔ اقبال ؒ کی مثنویوں میں "اسرار خودی" کے تراجم سید عبد المنان دیاریسال ؒ نثر میں اور پروفیسر سید علی احسن احتنگ نے نظم میں کئے ۔ ان سے بہت پہلے ہی شانتی نکتین کے پروفیسر آدم الدین "رموزِ بے خودی کا ترجمہ کر چکے تھے ۔ جو رسالہ محمدی میں قسط وار شائع ہوتا رہا ہے[1]

اتنا کچھ ہو چکنے کے بعد آج بھی اقبال ؒ کو یہاں نذر الاسلام کے مقابلہ میں ثانوی حیثیت حاصل ہے ۔ بنگال کے دانشوروں پر اقبال ؒ کا نظامِ فکر ابھی تک واضح نہیں ہو سکا ہے ۔ اس کا خاص سبب یہ ہے کہ خود مترجمین اقبال ؒ کے اسلامی تصورِ حیات سے کما حقہٗ آشنا نہ ہو سکے اقبال ؒ کے موقف کو سمجھنے اور سمجھانے کی راہ میں جو دشواریاں تھیں وہ حل ہو جاتیں ۔ اور اسلامی شعور کی روشنی پھیل جاتی ۔ اگر بنگالی میں اقبالیات کے بالغ نظر ناقدین موجود ہوتے ۔ اس کے برخلاف تمام بنگالی ماہرین اقبالیات نے مترجمین کی پیدا کردہ ژولیدگیوں میں اور اضافہ کر دیا ۔ چنانچہ آنریبل حبیب اللہ بہار اور سابق وزیر آسام منور الدین چوہدری مرحوم کے علاوہ ابو نعیم فضل الرشید وغیرہم نے اقبال ؒ کے سیاسی و معاشی تصورات کو کافی الجھایا ہے ورنہ یہاں کے صاحبِ علم طبقہ کا ذہن اسلام کے سیاسی و معاشی تصورات کے باب میں اس قدر الجھا ہوا نہ ہوتا اور مقامی زبان میں اقبالیات کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہونے کے باوجود علاقائی قومیت اور اشتراکیت کے تخریبی رجحانات پاکستان کے مشرقی بازو کو اندر ہی اندر ناکارہ نہ بنا رہے ہوتے ۔

جہاں اقبال ؒ کا یہ حشر ہو وہاں اردو کے اُن اداروں اور انجمنوں کا کیا مذکور جن کے پاس نہ خود کوئی بلند اور پاکیزہ نصب العین ہے نہ کسی بلند اور پاکیزہ نصب العین کی حمایت کے لئے وہ تیار ہیں ۔ وہ یا تو اغراض و مفاد کا دنگل ہیں ۔ یا عامیانہ مشاعروں اور قوالیوں سے یہاں کے عام مذاق کو مسلسل بگاڑتے چلے جا رہے ہیں ۔ ایسا ہونا بالکل قدرتی امر ہے کیونکہ انہیں تمام تر افسرانِ حکومت اور اقتدار پرست امراء کی سرپرستیاں حاصل ہیں ۔ وہاں سے موجودہ اربابِ حکومت نے معاشرے کا مزاج بگاڑنے کے سوا اور کیا کیا ہے ! آثار زور شور سے بتلا رہے ہیں ۔ کہ عوام کی اسلامی حس کو مردہ کرنے کی ایک مستقل گہری سازش زیرِ عمل ہے اور اسی کے تحت جہاں گندی اور فحش فلموں کی نمائش ، ریڈیو کے مخربِ اخلاق پروگرام ، عریانی کے مظاہرے اور فحش لٹریچر اور ننگی تصاویر کی درآمد کے لئے کھلا لائسنس حکومت کے پنج سالہ کارہائے نمایاں ہیں ۔ وہاں مذہبی ۔ فکری اور ادبی محاذ پر بھی وہ سب کچھ ہو رہا ہے جو اس مضمون میں جابجا مذکور ہے ۔

یہ مضمون ختم کرتے ہوئے میں ایسا محسوس کر رہا ہوں ۔ اور غالباً آپ بھی محسوس کر رہے ہوں گے کہ یہاں اندھیرا ہی اندھیرا ہے اور امید کی شعاع کہیں سے آتی ہوئی معلوم نہیں ہوتی ۔ دراصل ایسا نہیں ہے اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے کہ کچھ صالح عنصر بھی موجود ہے جسے ملک کی ایک ہمہ گیر اسلامی تحریک نکھار کر اوپر ابھار رہی ہے ۔ اس تحریک کی آواز آہستہ آہستہ اس صوبے کے دور دراز اندرونی گوشوں تک پہنچ رہی ہے اور پچھلے

---

[1] یہ تمام معلومات وحید قیصر ندوی صاحب کے مقالہ سے ماخوذ ہیں ۔ ف ا

[2] یہ ایک الگ موضوع بحث ہے کہ خود اقبال ؒ کے نظامِ فکر میں اشکال ، ابہام اور تضاد موجود ہے اس لئے اس کے مداحوں اور مبصروں کو "آزادی رائے" کا پورا حق حاصل ہو جاتا ہے ۔ بنگلہ تو خیر دوسری زبان ہی ٹھہری ، خود اردو کے "اقبال شناسوں" ادیبوں نے اقبال شناسی کے کیا کیا جوہر دکھائے ہیں ۔ اس کی روداد بہت دلچسپ ہے اور کسی قلم کی منتظر ہے ۔ ! (ف ا)

پانچ سال سے کم از کم اتنا ضرور ہوا۔ کہ جب یہاں اسلام یا اسلامی نظام کا تذکرہ ہوتا ہے۔ تو تحریک اسلامی کی طرف ذہن ضرور منتقل ہوتا ہے۔ اسی کے زیر اثر ایک ادبی تحریک بھی یہاں جنم لے رہی ہے۔ ابھی چند گنے چنے اسلام پسند ادیب مشرقی پاکستان کے صرف دارالحکومت میں موجود ہیں لیکن اب اس تحریک کے اثرات چاٹگام، سید پور، بوگرا وغیرہ شہروں میں بھی محسوس کئے جا رہے ہیں اور آہستہ آہستہ اسلامی ادب کی تحریک کا ایک ہمہ گیر ہیولیٰ تیار ہو رہا ہے۔ لیکن جب تک بنگلہ زبان کے ادیب اس تحریک سے منسلک نہیں ہوں گے۔ اردو کے معدودے چند ادیبوں کے سہارے اس کے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہو سکتے اور بنگالی دانشوروں میں اسلام پسند ادیبوں کا گروہ اسی صورت میں منظم ہو سکے گا جب زندگی کے تمام شعبوں پر ٹھوس اسلامی لٹریچر بنگلہ زبان میں منتقل ہو جائے گا۔ الحمد للہ کہ یہ کام تیزی سے جاری ہے۔

مشرقی پاکستان پاکستانی آبادی کی اکثریت کا گہوارہ ہے۔ یہاں کا جذباتی اسلام جب شعوری اسلام میں تبدیل ہو جائے گا تو ایک ایسی صحت مند رائے عامہ تیار ہوگی جو ملک کی جمہوری جد و جہد میں براہ راست پاکستان کے مستقبل کا فیصلہ اسلام کے حق میں کر سکے گی۔ لیکن یہ اسی وقت ہوگا جب یہاں کے اسلام پسند ادیب اپنے عوام کے قدیم استفہام کا تسکین بخش جواب فراہم کر دیں گے۔

بقیہ ادبی رجحانات

(بقیہ حصہ صفحہ ۲۵)

(۲) "سرکاری ادب" کا وہ حصہ جو مسلمان قومیت پیدا کرنے کے نقطہ نظر سے لکھا گیا ہے، یا لکھا جا رہا ہے۔ پاکستان میں بہت مقبول ہے اور اگرچہ اس کا مقصد مسلمانوں میں مجاہدانہ اسپرٹ پیدا کرنا سمجھا جاتا ہے، لیکن دراصل اس سے ماضی پرستی اور ہیرو پرستی جیسے گمراہ کن جذبات کی ترویج و اشاعت ہو رہی ہے، اور اس کا نتیجہ قوم بھر کے بے عمل اور مائل بہ خواب ہونے کی صورت میں نکلنے کا قوی امکان ہے۔

(۳) "بازاری ادب" ہمارے ملک کے عام کم تعلیم یافتہ طبقہ کے ذریعے پوری قوم میں سب سے وسیع پیمانے پر اخلاقی آوارگی پھیلانے کا موجب ہونے کی وجہ سے خطرناک ترین ہے۔

(۴) "اسلامی ادب" سنجیدہ طبقوں میں رفتہ رفتہ نفوذ کرتا جا رہا ہے لیکن اوپر کے دونوں ادبی رجحانات ذہنی طور پر اس کے آگے قدم قدم پر رکاوٹیں پیش آ رہی ہیں۔ ورنہ معاشرے کے لئے سب سے صحت مند اور مسلمان قوم کا صحیح اور اصلی ترجمان ادب ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کو قوم بھر فروغ دینے پر متحد ہو جائے، ورنہ پچھلے ۸ سال میں باقی ادب جس طرح زوال کی طرف خود جا رہا اور اپنے ساتھ قوم کو لے جا رہا ہے، اس کا انجام نہایت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

پاکستان کے

ترقی پسند ادب کا ایک سرسری جائزہ

حمید اللہ صدیقی۔ بی اے

یہ مقالہ جس مطالعہ و فکر کو اپنے پس منظر میں لئے ہوئے ہے وہ ہمارے نئے ادبی رفیق جناب محمد حمید اللہ صدیقی کو ہماری بہت سی توقعات کا مرکز بنانے والا ہے۔ بہ حیثیت ابتدائی کوشش کے یہ تحریر انتہائی کامیاب تحریر ہے۔ حمید صدیقی کے اندر ایک زور دار تنقیدی رجحان پرورش پا رہا ہے ہم بڑی مسرت کے ساتھ اپنے اس تنقید نگار کا خیر مقدم کرتے ہیں

اس قابل قدر مقالہ میں کہیں کہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تنقید کا وار ادھورا رہ گیا ہے۔ علاوہ بریں تنقیدی رجحان بعض مقامات پر حریفانہ جذبے تلے دب گیا ہے۔ ایسے مقامات پر حاشیے میں ہم نے کچھ اشارات کا اضافہ کر دیا ہے توقع ہے کہ حمید اللہ صاحب ان کو مشورے کی حیثیت سے دیکھیں گے اور گستاخی پر محمول نہیں کریں گے (ان ص)

تحریک کا پس منظر اور مجموعی جائزہ

قیام پاکستان سے قبل کی ترقی پسند تحریک کا اگر ایک سرسری جائزہ لیا جائے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کا سب سے بڑا مقصد ملک اور قوم کی آزادی کی جدوجہد میں سامراجی حکمرانوں کے خلاف ایک نیا محاذ قائم کرنا تھا۔ یہ بات تو سر سید اور ان کے رفقاء کی کوششوں ہی سے ثابت ہو چکی تھی کہ ادب کو ذہنی عیاشی کے دلچسپ مشغلے کے علاوہ سوچے سمجھے مقاصد کے لئے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن اردو ادب میں کسی منظم اور باضابطہ تحریک کی تشکیل نہ ہو سکی تھی اس لحاظ سے ۱۹۳۵ء کو ایک مخصوص اہمیت حاصل ہے اس سال انجمن ترقی پسند مصنفین کے نام سے ایک نیا ادارہ وجود میں آیا جس نے ترقی پسند تحریک کی بنیاد رکھی۔

سنہ ۱۹۳۵ء محض اردو ادب ہی کے لئے اہم نہیں ہے اس سال دنیا کے تقریباً ہر بڑے ملک میں اس طرح کی تحریکیں وجود میں آئیں جن کا مقصد ادب کو اور ادیب کے ذریعہ زندگی کو زمانے کے نئے تقاضوں سے روشناس کرانا تھا۔ ممکن ہے کہ اس طرح کی تحریکوں کا ایک عالمگیر پیمانہ پر یکایک ظہور اس زمانے کے مخصوص تقاضوں کا نتیجہ ہو۔ لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف ممالک کے داخلی اور خارجی مسائل مختلف تھے ان کی معاشرتی اور تمدنی ترکیب جداگانہ

ؔ نہیں بلکہ غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف عوام میں جو انقلابی جذبہ موجود تھا اس کو ٹھکا کر اس کا رخ آہستہ آہستہ اشتراکی انقلاب کی طرف موڑنے کے لئے آزادی کی تحریک کو بعض ادیبوں نے اپنایا تھا۔ ان حضرات نے عہد ساحریت کی ساقی گری اس لئے کی کہ اس میں اشتراکی زہر کی آمیزش کر سکیں (ان ص)

ترقی پسند ادب کا جائزہ

یہ حکایت آسانی سے سمجھ میں ہی نہیں آتی کہ ایک ہی سال میں دنیا کے مختلف ممالک میں ایک ہی طرح کی تحریکیں ایک ہی میدان میں کس طرح وجود میں آگئیں۔ تحریکوں کا جنم لینا کوئی میکانیکی (Mechanical) سی چیز نہیں ہے۔ بلکہ زمانے کے عوامل کے ساتھ ساتھ خود انسانی ذہن انہیں پیدا کرتے ہیں!! اس لئے شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کا مقصد ایک مخصوص نظریۂ حیات کو ہمہ گیر بنانا تھا۔ روس میں کمیونسٹ انقلاب کامیاب ہو کر ایک نئے نظام کی جڑیں مضبوط کر چکا تھا۔ کمیونسٹ پارٹی تقریباً ہر ملک میں کسی نہ کسی پیمانے پر کام کر رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ پڑھے لکھے طبقے پر اثر انداز ہونے کے لئے ادب سے زیادہ موثر اور کون سا آلۂ کار ہو سکتا تھا۔

ہندوستان کے حالات دوسرے ممالک سے ذرا مختلف تھے۔ ملک غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ عوام کو کسی ذہنی یا نظریاتی انقلاب پر آمادہ کرنے کے لئے سب سے پہلے ضرورت اس بات کی تھی کہ یہ زنجیریں کاٹ دی جائیں۔ اس کے لئے ہر وہ نعرہ جس میں بیرونی آقاؤں کے خلاف بغاوت اور انقلاب کا آہنگ ہو زیادہ پسندیدہ تھا۔ سیاسی پلیٹ فارم سے اس قسم کی آوازیں اکثر آتی ہی تھیں۔ اخبارات کے اداریے بھی انہیں جذبات کی تسکین کر رہے تھے۔ لیکن افسانوں اور نظموں میں یہ ایک بالکل انوکھی اور نرالی چیز تھی جو بجلی کی سی سرعت سے پڑھے لکھے طبقے میں پھیل گئی۔ پھر ادب میں یہ چیز اگر عوام کے جذبات کے مطابق تھی تو نئی نسل کے ادیب اور شاعر بھی یہی کہنا چاہتے تھے۔ کچھ لوگ ایسے ضرور تھے جن کے پیش نظر محض سیاسی انقلاب کے خالی خولی نعرے ہی نہ تھے بلکہ چند مخصوص نظریات کی تخم ریزی بھی تھی۔ ایسے لوگ بہر حال کم تھے اس طرح ادب کے اس محاذ پر مختلف مکاتب فکر کے لوگ جمع ہو گئے۔ کہیں کٹر وطن پرست تھے تو کہیں شورش پسند باغی، کہیں مارکسزم (Marxism-۱) کے معتقدین تھے تو کہیں فرائڈ کے پرستار۔

ان مخصوص سیاسی حالات کے ساتھ ساتھ کچھ دوسرے عوامل بھی کار فرما تھے۔ قدیم اور جدید کی آویزش کا سلسلہ تو غدر کے بعد ہی سے شروع ہو چکا تھا اب مشرق اور مغرب کی اقدار و روایات میں کشمکش شدید ہو رہی تھی۔ حکمران قوم کے جلو میں سیاسی اقتدار کے علاوہ اس کے عساکر ہی نہ تھے، اس کا ایک فلسفۂ حیات تھا، اس کے مخصوص دینی، اخلاقی اور سماجی نظریات تھے۔ ادب اور فن کا ایک بیش بہا سرمایہ تھا۔ سائنس کی نت نئی ایجادات کا سہارا تھا۔ ادھر ہندوستان میں بسنے والی اقوام کا سرمایہ قدیم اور منجمد تھا، مدتوں سے تحقیق کا کوئی کام ہی نہ ہوا تھا، ان کے اپنے عقاید و نظریات صدیوں کے انحطاط کے بعد محض اوہام و رسوم کا مجموعہ بن کر رہ گئے تھے۔ افکار و بحث کے توشہ خانے میں کچھ نہ ہونے کی وجہ سے سیاسی محاذ کے بعد ذہن و فکر کے محاذ پر بھی شکست لازم تھی۔ نتیجۂ معاشرے میں دو متضاد طبقوں نے جنم لیا ایک طبقہ ایسا تھا جو مغربی اقدار و نظریات سے بے انتہا مرعوب ہو گیا۔ اس نے یہ یقین کر لیا کہ مزاحمت میں شکست کے علاوہ اور کوئی دوسرا راستہ ہی نہیں۔ اس ذہنی مرعوبیت کے بعد اس نے یہ طے کر لیا کہ مغرب سے جو کچھ بھی مل سکے اور جس طرح بھی مل سکے اسے لے لیا جائے۔ اس کے برخلاف دوسرے طبقے نے مغرب کی ہر چیز کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا اور صحت مند اور مضر عناصر کی کوئی تمیز نہ کی اور جو کچھ بھی اس کا اپنا سرمایہ تھا اسے سینے سے لگا کر بیٹھ گیا۔

سیاسی ماحول تو بغاوت کا متقاضی تھا ہی، اعتدال اور توازن نہ ہونے کی وجہ سے ترقی پسندی کے یہ بھی معنی سمجھ لئے گئے کہ ہر اس چیز کے خلاف بغاوت ضروری ہے جو قدماء نے اختیار کر رکھی تھی۔ یہ درحقیقت اس دوری کا نتیجہ تھا جو ادیب کے دونوں طبقوں میں ہر لحاظ سے وقت کے ساتھ ساتھ بڑھ رہی تھی۔ اس طرح متقدمین کے چھوڑے ہوئے ازلی سرمایے سے ایک شدید نفرت اور اجتناب کے جذبے کے تحت ترقی پسند ادیب آگے بڑھے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ متقدمین اور ترقی پسندوں کے ادب کے درمیان سے تدریجی ارتقا کی کڑی بالکل گمشدہ ہو گئی۔ متقدمین کا پیش کردہ ادب اس میں شبہ نہیں کہ بے مقصد ادب تھا۔ اس کی زندگی محسوسات کی دنیا کی زندگی نہ تھی، بلکہ کسی دوسرے ہی عالم کی تصویر تھی، لیکن فنی نقطۂ نظر سے متقدمین کا ادب بڑا بلند تھا

۱ـ سویرا ۱۰ ـ "مارکسزم در اصل اشتراکی فلسفہ کی رو سے تدریجی ارتقاء زندگی یا معاشرت یا ادب کی تاریخ میں ضروری نہیں بلکہ ان حضرات کے نقطۂ نظر کے مطابق تاریخ کبھی کبھی جست بھی لگایا کرتی ہے اور ذہین ترین افراد کا فرض ہے کہ وہ موقع آنے پر تاریخ کو جست لگانے میں مدد دیں۔" ([illegible])

پس بغاوت اور اجتناب پسندی اس زمانے کے ادب کو فن کی لطافتوں اور محاسن سے بالکل محروم کر دیا یہی وجہ ہے کہ میر، غالب اور درد کے اشعار پڑھ کر آج بھی ہم ایک کیف و انبساط محسوس کرتے ہیں۔ لیکن ترقی پسندوں کی تخلیق (باستثنائے چند) محض ہنگامی حالات کی پیداوار ہونے اور فن کی لطافتوں سے عاری ہونے کی وجہ سے بے رس اور پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ ادب ہنگامی حالات میں پیدا ہوا۔ نفسِ بغاوت کی تشکیل کے لئے علم و ادب کی محفلوں سے لے کر کالج اور اسکول کے طلباء تک میں اس کے نغمے الاپے گئے۔ لیکن جوں ہی حالات سکون پذیر ہوئے یہ ساری قدر و منزلت کھو بیٹھا چنانچہ نومبر ۱۹۴۹ء کی کل پاکستان ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں خطبہ صدارت دیتے ہوئے مولوی[1] چراغ حسن حسرت کہتے ہیں:

> "شروع شروع میں مدت تک ترقی پسندی کا کوئی مفہوم متعین نہیں تھا۔ اس انجمن میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جو صرف الفاظ کے چنگیزی مینار کھڑے کرنا چاہتے تھے اور وہ لوگ بھی ترقی پسند سمجھے جاتے تھے جنہیں معلوم نہیں تھا کہ شعر و ادب کی حدود و قیود کیا ہیں۔ لیکن وہ انھیں توڑنے پر اپنے آپ کو آمادہ پاتے تھے۔ انھیں معلوم نہیں تھا کہ ان کے اسلاف نے ان کے لئے کس قسم کا ورثہ چھوڑا ہے لیکن وہ اپنے ماضی سے بے زار تھے ان کے نزدیک ترقی پسندی یہی تھی کہ کوئی ایسی بات کہی جائے جو لوگوں کو چونکا دے۔ ان کے افسانوں اور نظموں کا موضوع ادنیٰ قسم کی لذت پرستی تھی اور وہ جنسی بے راہ روی اور بے قیدی ہی کو ترقی پسندی کے سمندر کی سب سے اونچی لہر سمجھتے تھے"

پھر مغرب اور مشرق کی اس کشمکش اور مشرق کی دن بدن بڑھتی ہوئی انفعالیت کا ایک اثر ادب پر یہ بھی پڑا کہ اس میں بغیر کسی رطب و یابس کی تفریق کے دوسری زبانوں کا ادب آ کر گھلنے ملنے لگا۔ اس طرح تقسیم سے قبل کا ترقی پسند ادب رنگ برنگ کے کھلونوں کا ایک ٹوکرہ بن کر رہ گیا جس میں توپیں اور بندوقیں بھی ہیں، ہتھوڑا اور درانتی بھی ہے، سامانِ عیش و انبساط بھی ہے، عورت کے انواع و اقسام کے ننگے اور نیم ستر پوش مجسمے (بلکہ کہنا چاہئے کہ گڑیاں) بھی ہیں۔

تقسیم

۱۹۴۷ء میں ہندوستان کے دو حصے ہو گئے۔ سیاسی تحریکیں بھی دو حصوں میں تقسیم ہو گئیں۔ ترقی پسند تحریک کا بھی دو حصوں میں بٹ جانا ناگزیر تھا۔ تقسیم ملک کے ساتھ ہی مسائل یکایک[2] بدل گئے تھے۔ انگریز ملک چھوڑ کر رخصت ہو چکا تھا۔ پاکستان میں مسلمانوں کی اکثریت اور حکومت تھی۔ ملک کی یہ آزادی پچھلی غلامی کے مقابلے میں بڑی خوش آئند تھی لیکن بدقسمتی سے انگریزوں نے منافرت اور تعصب کے جو بیج صدیوں تک بوئے تھے انھیں اب دھرتی کا سینہ چیر کر نکلنا تھا۔ تقسیم کے ساتھ ہی ہندو مسلم فسادات کا ایک افسوسناک سلسلہ شروع ہوا اور ان قوموں نے جو کل تک دوش بدوش[3] چل رہی تھیں جس انسانیت سوز بربریت اور درندگی کا مظاہرہ کیا وہ جبینِ آزادی پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بدنما داغ چھوڑ گیا۔ ادیب کی حساس فطرت اس کے اثرات سے بھلا کس طرح بچ سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۸ء کا ادب بالکل فسادات کا ادب بن کر رہ گیا ہے اور اس طرح فسادات نے تاریخ کے ساتھ ساتھ ادب

• • • •

[1] مولوی یا کامریڈ "(ن ص)"

[2] یہی وہ موقع ہے کہ غیر ملکی اقتدار اٹھنے کے بعد تحریکِ آزادی کے جذبات کی اوٹ میں ترقی پسند ادیب کو کام کرنے کا جو وسیع موقع حاصل تھا وہ کھو گیا اور جیسے یکایک محسوس ہونے لگا کہ موضوعات کے جگنو اندھیرے میں ڈوب گئے ہیں بس لے دے کے "فسادات" کا موضوع باقی ہے۔ یہی موقع ہے جہاں سے ترقی پسند تحریک کے جمود کا آغاز ہوتا ہے (ن ص)

[3] دوش بدوش تو خیر یہ کبھی بھی نہیں چلیں۔ البتہ یکجا بس رہی تھیں۔ (ن ص)

میں بھی ایک مستقل نشان چھوڑ دیا ہے۔

نیا منشور

اب ہم ۱۹۴۹ء میں داخل ہو چکے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کی تاریخ میں یہ سال ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے یہ وہ سال ہے جب تحریک نے اپنا نیا منشور پیش کیا جو قدیم اعلانات کے پیشِ نظر ایک نیا قدم تھا۔ ترقی پسند ادیبوں نے کھلم کھلا اشتراکیت اور روس سے اپنی جانبداری کا اعلان کر دیا۔ یہاں اگر یہ کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہو کہ اب بانیانِ تحریک نے (حالات کے غلط مطالعے کے تحت) یہ محسوس کر لیا تھا کہ نقاب [illegible] کا وقت آ گیا ہے۔ جو کام در پردہ جاری تھا وہ اب منظرِ عام پر آ کر کھلم کھلا بھی کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ کل پاکستان انجمن ترقی پسند مصنفین کے پہلے اجلاس منعقدہ نومبر ۱۹۴۹ء میں خطبۂ صدارت دیتے ہوئے مولوی چراغ حسن حسرت کہتے ہیں :

"آج ترقی پسندی کے خدوخال واضح ہیں، اس کے نقوش اُبھر آئے ہیں، اس کا مفہوم متعین ہو چکا ہے اب وہ کیفیت نہیں کہ راہگذر پر دھند چھائی ہوئی ہے کبھی کبھی کوندا لپکتا ہے تو یارانِ سفر چند قدم بڑھتے ہیں اور پھر رک جاتے ہیں ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ آج آپ لوگوں کو دیکھنا چاہئے کہ ادب اور شاعری خاص کا کھلونا بن کر نہ رہ جائیں، آرٹ پر ایک طبقہ قبضہ کر کے نہ بیٹھ جائے ... رمزوں اور اشاروں میں باتیں کرنے کی بجائے جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہیے" (سویرا ۷،۸)

[illegible] ادب کے نقادوں [illegible] ت کا بہت ہی کھل کر اعتراف کر لیا گیا ہے کہ ترقی پسند ادب اب اشتراکیت کا ہمنوا ہوگا۔ اس کا مقصد ملک میں اشتراکی [illegible] کام کرنا ہوگا۔ اور اس کام میں سب سے زیادہ اعتماد کا اظہار سوویٹ یونین کی رہنمائی پر کیا گیا ہے۔

"اس عہدِ جدید میں ہمیں اپنی ہمسایہ اشتراکی ریاست سوویٹ یونین کی رہنمائی حاصل ہے۔" (سویرا ۷،۸)

اسی طرح ڈاکٹر عبادت بریلوی یہ بتاتے ہوئے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین میں کون شامل ہو سکتا ہے کہتے ہیں۔

"انجمن ترقی پسند مصنفین میں شامل ہونے کے لئے کمیونسٹ ہونے کی ضرورت نہیں آج بھی نہیں ہے، آئندہ بھی نہیں ہوگی۔ اس میں ہر مکتبۂ خیال کے لوگ شریک ہو سکتے ہیں البتہ اس میں شریک ہونے کے لئے چند بنیادی باتوں پر متفق ہونا ضروری ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ انسانی قدروں کو آگے بڑھانے میں مدد کریں گے، جبر و استبداد کی مخالفت ان کا فرض ہوگا سرمایہ دارانہ نظام نے سماجی زندگی میں جو انتشار اور تفرقہ پیدا کر رکھا ہے، جو ہنگامہ برپا کر رکھا ہے اس کو فنا کرنا از بس ضروری ہے ...... دنیا میں جو سرمایہ دارانہ قوتیں اپنے جال پھیلا کر عوام اور انسانیت دوست طاقتوں کو اسیر کرنا چاہتی ہیں ان کے خلاف آواز اٹھانا ترقی پسند ادیب ہونے کے لئے لازمی ہے[2] ..."

۱۔ کیا واقعی (ن ص)

۲۔ ان سارے امور میں جہاں تک منفی اور تخریبی پہلو کا تعلق ہے مسلم ادیب بھی کسی دوسرے سے پیچھے نہیں لیکن کیا انہیں ترقی پسند مانا جا سکتا ہے؟ [illegible] وہ بحث ہے کیونکہ وہ اس منافقانہ اعلان کے بھروسے کے پیچھے چھپی ہوئی حقیقت سے اختلاف کرتا ہے۔ وہ حقیقت جسے اسی اقتباس کے آخر میں بیان کر دیا گیا ہے [illegible] کی انتہائی [illegible] ترقی پسند ادب سے قطعی مختلف ہے۔

ترقی پسند ادب کا جائزہ

"... میں اشتراکیت کو موجودہ سیاسی کشمکش کا واحد حل سمجھتا ہوں۔" (نقوش ۸)

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے عصمت چغتائی رقمطراز ہیں

" معاف کیجئے گا جناب کلمہ پڑھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مسلمان نہ ہو۔ سب کمیونسٹ کو وہی کہا

جو کمیونسٹ کہتے ہیں مگر پھر کہہ دیا کہ کمیونسٹ ہونا ضروری نہیں"

ان توضیحات کے بعد ظاہر ہے کہ جن لوگوں پر اشتراکی نظریات کا کوئی اثر نہ تھا اُن کا ان نام نہاد ترقی پسندوں کی صف سے الگ ہو جانا ناگزیر تھا۔ کچھ ایسے لوگ جن کے اندر پورا اشتراکی فکر پیدا نہ ہو سکا تھا رجعت پسند کہہ کر چھانٹ دیئے گئے اس طرح ترقی پسند تحریک کا یہ وسیع اور ہمہ گیر محاذ سمٹ سمٹا کر ایک ہی نظریہ حیات پر ایمان رکھنے والوں کا اجارہ بن گیا اور یہاں سے تحریک کی تاریخ میں ایک نیا باب کھلا۔

سجدہ سہو ——— یہ تحریک اسی نہج پر چلتی رہی اور فطری طور پر اسمیں شدت پسندی اور انتہا پسندی کے رجحانات بڑھتے گئے۔ جوں جوں یہ رجحانات بڑھ رہے تھے، تحریک کے لئے حالات سخت تر ہو رہے تھے۔ ادب عوام کے لئے غیر مانوس اور اجنبی ہوتا جا رہا تھا۔ رفقا کی تعداد گھٹ رہی تھی۔ مختلف جگہوں پر انجمن کی شاخوں نے دم توڑنا شروع کر دیا تھا اور نوبت بالآخر یہاں تک پہنچ گئی کہ خود تحریک کی زیست اور موت کا سوال پیدا ہو گیا۔ انجمن کے قالب میں زندگی کو واپس لانے کی کوشش کرتے ہوئے ایک نیا موڑ مڑنا ضروری ہو گیا۔ چنانچہ جولائی ۱۹۵۲ء میں ایک دوسری کل پاکستان کانفرنس منعقدہ کراچی میں انجمن کو اپنی سابق فروگزاشت کا اعتراف کرکے اپنی پالیسی کو ازسرنو مرتب کرنا پڑا۔ ۱۹۵۲ء کے نئے منشور کا جائزہ لیتے ہوئے ادارہ ادب لطیف لکھتا ہے :-

"تحریک کی یہ منزل سنگ میل کی حیثیت لئے ہوئے ہے جہاں پہنچ کر انجمن کے مخلص

ممبروں نے اپنی پچھلی انتہا پسندانہ پالیسی سے قطع تعلق کرکے ایک نیا منشور پیش کیا ہے"

اس نئے منشور کے ماتحت انجمن نے اعلان کیا کہ یہ ادبی جماعت ہے اور اس کا تعلق کسی سیاسی جماعت سے نہیں۔ یہ انجمن صحت مند ادب کی تخلیق کے لئے ملک میں جمہوریت کی نشوونما، خوشحالی، صنعتی ترقی، عام تعلیم اور سائنس کی تعلیم کو ضروری سمجھتی ہے۔ نئے منشور کے ماتحت ترقی پسند ادب ہئیت پرستی، حیوانیت، فحش نگاری، جنسی انتشار پسندی، ابہام پسندی، رہبانیت جیسے خطرناک رجحانات کو بے نقاب کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔

یہ اور اسی طرح کے دوسرے مقاصد پیش نظر رکھ کر یہ تحریک ایک نئے انداز پر گامزن ہوئی ہے اب اس کا اندازہ تو بعد کی ادبی تحقیقات ہی سے ہو سکے گا کہ ترقی پسند ادیب الفاظ کو کس حد تک عمل کا جامہ پہناتے ہیں۔

یہ تو تھا ترقی پسند کی تحریک کی تاریخ کا ایک سرسری جائزہ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ اس تحریک کے ماتحت جو ادب وجود میں آیا ہے وہ کیا ہے، اس کی صحیح تعریف کیا ہو سکتی ہے ؟ اس کی اساس فکر کیا ہے ؟ ان نیت کے لئے وہ کن تصورات کو صحت مند سمجھتا ہے۔ اور کن کو مضر ؟ یہی نہیں بلکہ ان تمام چیزوں کے ساتھ ساتھ فن کی کس حد تک پاسداری کرتا ہے ؟ یہ بات کہ یہ ایک صالح اور صحت مند ادب کے صحیح معیار

• • •

ؔ ۔ جب اشتراکیت واحد حل قرار پائے تو ظاہر بات ہے کہ کسی دوسرے حل پر ایمان رکھنے والے ادیب کے ترقی پسند ہونے کا امکان کہاں رہا وہ قطعی طور پر رجعت پسند ہے۔ چاہے وہ انسانی قدروں کو آگے بڑھاتے، سرمایہ دارانہ نظام کے معدات پر حملہ کرنے اور امپیریلسٹ اقوام کے نظام کی تبدیلی کرنے میں پیش پیش کیوں نہ ہو۔

(ادارہ)

اس مقالے کے حدود کے اندر ترقی پسند ادب کے اس حصہ سے پر کس حد تک پڑا اثر تا ہے۔ ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ہمارا کام صرف جائزہ ہے۔ جو تقسیم سے پہلے وجود میں آچکا ہے۔ بھی کوئی بحث نہیں، ہمارے پیش نظر ادب کا صرف وہ حصہ ہے جو اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ترقی پسندوں کے ان رسائل میں شائع ہوا ہے جو یا تو اس تحریک کے نمائندہ ہیں۔ یا اس کے ہمدرد، مثلاً سویرا۔ نقوش۔ ادب لطیف اور بہترین ادب کے ترقی پسند انتخابات سے ہے۔ یہی نہیں، اس بات کا بھی لحاظ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ حوالے کے طور پر صرف انہیں فنکاروں کی تخلیقات پیش کی جائیں جو آج پاکستان میں موجود ہیں۔ یہ تفریق اگرچہ مصنوعی ہے، اس لئے کہ ہندوستان یا پاکستان دونوں جگہ اس تحریک کی روح ایک ہے، مقصد ایک ہے اور نظریہ یا طریق کار ایک ہے۔ لیکن پھر بھی پاکستان کے داخلی اور خارجی مسائل مختلف ہیں، یہاں کے عوام کے عقائد و نظریات جداگانہ ہیں، اس لئے ادب کے اسی حصہ کا جائزہ زیادہ مناسب ہوگا جو یہاں کے حالات سے متاثر ہو کر اور یہاں کے مسائل سے دوچار ہو کر پیش کیا گیا ہے۔

ترقی پسند ادب کیا ہے؟

تعریف اور مقصد یہ سوال کہ ترقی پسند ادب کیا ہے، اب خاصہ پرانا ہو چکا ہے۔ اس کے متعلق اس کے موافقین اور مخالفین بہت کچھ کہہ چکے ہیں۔ مخالفین کے پھیلائے ہوئے مطالب اور معنی سے قطع نظر اگر ہم صرف موافقین کی تشریحات پر ایک نظر ڈالیں تو بھی حقیقی خد و خال چھپے نہیں رہ سکتے۔

پاکستان کے بننے کے بعد ہی حالات کچھ اس قدر ہنگامہ پذیر ہو گئے اور وحشت و درندگی کا ایسا اندوہناک سلسلہ شروع ہوا کہ ادب بھی ہنگامی ہو کر رہ گیا۔ اس زمانہ میں بیشتر تخلیقات فسادات کے مختلف موضوعات پر ہوئیں۔ ۱۹۴۸ء میں رفتہ رفتہ ترقی پسند ادب ایک سوچی سمجھی پالیسی کی طرف آنے لگا جس کا مقصد عوام کے اندر طبقاتی شعور کو بیدار کرنا، طبقاتی نزاع کو عملاً پیدا کرنا اور محنت کش طبقہ کو سرمایہ دار اور جاگیردار طبقہ کے خلاف ایک منظم جدوجہد پر آمادہ کرنا تھا۔ اسی وقت سے کچھ اس طرح کے اعلانات سننے میں آنے لگے:-

"اشتراکیت مستقبل کی ایک حقیقت ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ محنت کش طبقے کی طرفداری کے معنی یہ ہیں کہ ہم مستقبل کی طرفداری کر رہے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ تمام نئے فلسفے، طبقات، تشدد، تمام ادب جو اس حقیقت کو نہ سمجھے، وکیل یا اشتراکیت کی مخالفت کریں وہ رجعت پرست ہیں خواہ اشتراکیت کی مخالفت مذہبی جذبے ہی کے ماتحت کیوں نہ ہو"[1]

(ممتاز حسین: نئی اور پرانی شاعری کا بنیادی فرق، جاوید ادب ۱۹۴۹ء)

اسی مضمون میں آگے اور لکھتے ہیں:-

"انسانی عقل و فہم نے روح کے معنوی سانسے کو مادے پر سے ہٹا دیا ہے۔ زندگی کی وہ تمام قوتیں جو اب تک روح کی شکل میں منتج ہوتی تھیں وہ آزاد ہو گئی ہیں۔ ادب ان مافوق میں سے ایک قوت کا نام ہے۔ یہ قوت تعمیر کا کام دیتی ہے۔ یہ کوئی نظریہ ۔ ۔ ۔

[1] ملاحظہ فرمائیے: ترقی پسند ادب کی یہ سی تعریف ان میں

طاقت نہیں بلکہ سماجی طاقت ہے۔ اس لئے اس کا خوف بھی سماجی ہے۔ ادب سماجی زندگی کا مرقع پیش کر کے اس بنیادی طاقت کو پیش کرتا ہے جو تضاد اور تصادم کو ختم کرتی ہوئی اپنے منطقی حل کی طرف بڑھ رہی ہے اسی کو اشتراکی حقیقت نگاری کہتے ہیں۔ اس نظام میں خیالات کی تبلیغ نہیں بلکہ متحرک زندگی کی تصویر ہے۔"

ظہیر کاشمیری اپنی بات چیت کے دوران میں کہتے ہیں :۔

"کل پاکستان کی بین الاقوامی تقریب پر انجمن ترقی پسند مصنفین نے ادب برائے انقلاب کا نعرہ بلند کیا ۔۔۔۔۔۔ ادب برائے انقلاب کے تصور سے تمام گزشتہ تصورات out of date ہو گئے ہیں۔ اس تصور کو اپناتے ہوئے ہماری ادبی ذمہ داریاں پہلے سے کئی گنا زیادہ ہو گئی ہیں۔ آج سے ہماری عملی تخیل، ہیئت پسندی، خارجیت پسندی یا محاکاتی انداز کی کوئی علیحدہ حیثیت نہیں رہ جاتی جب تک ہم اسے اشتراکی انقلاب کے سانچے میں نہ ڈھال دیں"

(سویرا - ۸،۷)

دو ملک ایک کہانی میں ابراہیم جلیس بھی حمید اختر کی زبانی ماسکو (Moscow) کو ایک آیت یا ایک شعار (Symbol) بنا کر پیش کرتے ہیں :۔

"پورژوائی نظام ایک کہرا ہے، صرف دھند ہے، جو ہمیں دنیا کو نظروں سے اوجھل کئے ہوئے ہے۔ ہم اپنی نظروں کی گرمی سے اس دھند کو، اس کہرے کو ہٹا دیں گے اور ہمیں ماسکو کی عمارتوں کی چھتیں، گنبد، مینار اور کنگرے نظر آئیں گے۔ ماسکو صرف روس کا دارالخلافہ نہیں بلکہ انسانوں کی ایک بستی کا نام ہے، ایک Symbol ہے۔ (سویرا - ۸،۷)

جاں نثار اختر بھی یہی راگ الاپتے ہیں ؎

کیا جنتا کا، کیا جیون کا، ایسے میں ایمان کریں
آؤ کھلے بندوں اب جانبداری کا اعلان کریں
اپنے نغموں اور گیتوں سے رنگ نیا برسا دیں آؤ
لال پھریرا آج ادب کی دنیا پہ لہرا دیں آؤ

سویرا ۸،۷

یہی نہیں ان منفرد اعلانات کے ساتھ انجمن ترقی پسند مصنفین کا پہلا منشور پیش کرتے ہوئے انجمن کے جنرل سکرٹری احمد ندیم قاسمی اگر ایک طرف پاکستانی ادیبوں، ادب برائے ادب کے علمبرداروں اور اسلام پسند[۱] ادیبوں کے ادب کو مکاری، جھوٹ، دغابازی کا ادب گردانتے ہیں سے انسانیت

• • •

[۱] احمد ندیم قاسمی جیسے اونچے ذہین ترقی پسندوں کو بھی اسلامی ادب کے سمجھنے میں ابھی کئی سال کا عرصہ درکار ہے، کیونکہ یہ حضرات خود اسلام کی حقیقت کو نہیں جاننے اور اسے جاننے سے قبل اشتراکی تعصب میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ ان کے دلوں میں اتنی وسعت بھی نہیں کہ اپنے مخالف کو پہلے سمجھ کر پھر اس پر وار کریں تاکہ وہ بالکل مضحکہ انگیز اور اوچھا وار تو نہ ہو۔ (ن ص)

ترقی پسند ادب کا جائزہ

ہو ویت، اور ان کے دشمنوں اور عوام سے غداری کرنے والوں کا ادب کہتے ہیں اور پھر اسے پست ہمتی، یاسیت، وہم پرستی اور اخلاقی پستی[1] کی تلقین کرنے والوں کا ادب کہتے ہیں۔ تو اس کے برعکس ترقی پسند ادب کے متعلق یوں وضاحت فرماتے ہیں:-

"ہم ترقی پسند ادیب ادب کو زندگی کا آئینہ ہی نہیں سمجھتے بلکہ زندگی کو بدلنے اور بہتر بنانے کا وسیلہ بھی تصور کرتے ہیں۔ ہم ادب برائے زندگی، ادب برائے جدوجہد اور ادب برائے انقلاب[2] کے نظریے کو اپنی تحریک کا سنگ بنیاد خیال کرتے ہیں۔ ہماری فکری اساس اشتراکی حقیقت پسندی ہے"

اور پھر پروگرام کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:-

" یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم موجودہ سرمایہ داری جاگیرداری نظام کو توڑ کر محنت کشوں کی قیادت میں ایک عوامی جمہوری نظام قائم کریں جو اشتراکی معیشت کی تعمیر کرے "

(سویرا - ۸،۷)

ظاہر ہے کہ اس نوعیت کے پروگرام کو لے کر جو ادب اٹھیگا اس کا صحیح نام کیا ہو سکتا ہے آخر جو ادیب اشتراکیت کو مستقبل کی ایک حقیقت سمجھیں، اس کے مخالفین کو رجعت پرست قرار دیں، اشتراکی سانچے کو ڈھالے بغیر کسی چیز کی علیحدہ حیثیت کو تسلیم نہ کریں۔ اسکو کو اپنا ... قرار دیں، ادب کی دنیا پر لال پھریرا لہرانے کو بے چین ہوں۔ اور صحت مند ادب کی تخلیق کو اسی وقت ممکن سمجھیں جب ایسا انقلاب برپا ہو جائے۔ جو اشتراکی معیشت کی تعمیر کرے، اس کی تخلیقات کو ہم اشتراکی ادب، کمیونسٹ ادب یا سُرخ ادب کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ یہ وہی ادب ہے جس کے مقاصد اختر حسین رائے پوری نے مالگ پور کے تاریخی اجلاس منعقدہ اپریل ۱۹۳۶ء میں نہایت ہی ان معصوم الفاظ میں واضح کئے تھے:-

"احساس ہر قسم کے ادب کی جان ہے تو پھر غریبوں اور مظلوموں کا حالِ زار ہمیں بے حس کیونکر رکھ سکتا ہے؟ اگر زندگی کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ سماج کے چہرے سے بیکاری کے داغ دھوئے جائیں تو جا شاید کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ ادب کا اشارہ کس جانب ہو، وہ کیا کہے، کن سے کہے اور کس طریقے سے کہے۔ چنانچہ ہندوستانی ادیبوں سے ہماری یہ توقع واجب اور جائز ہے کہ وہ ثابت کر دکھائیں گے کہ ادب کی بنیادیں زندگی میں پیوست ہیں۔ اور زندگی تسلسل تغیر و تبدل کی کہانی ہے۔ زندہ اور صادق ادب وہی ہے جو سماج کو بدلنا چاہتا ہے۔ اسے عروج کی راہ دکھاتا ہے اور جملہ نوع انسان کی خدمت کی آرزو رکھتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے ملک کا ادب زندگی سے اپنے آپ کو وابستہ کریگا اور زندگی کے ارتقا کا علمبردار ہوگا"

(نیا ادب - پنڈت کول)

• • •

[1] جی ہاں! اخلاقی علو تو اس ادب میں ہوگا جس کا بنیادی فلسفہ جیسا کہ ردنی ہے اونچا کوئی انسانی اخلاق نہیں اور اخلاق اور ٹیلون میں اگر انتخاب کا سوال پیدا ہو تو ایک ترقی پسند کو ٹیلون ہی کا انتخاب کرنا چاہئے۔ اور پھر اخلاقی علو ان لوگوں ہی میں پایا جانا چاہیے جن کے نزدیک اخلاق کی کوئی قدر مستقل نہیں ہے (ن م ر)

[2] یہ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی دوسرا ادیب جو اشتراکی حقیقت پسندی کو اپنی فکری اساس نہ مانے لیکن "ادب برائے زندگی" "ادب برائے جدوجہد" اور "ادب برائے انقلاب" کو تسلیم کر کے کام کر رہا ہو تو اس کو آپ کیا قرار دیں گے۔ (ن م ر)

"اور پھر" ڈاکٹر حنی کہتا ہے "میرے ذہن میں ایک ایسا خیال پیدا ہوا جس سے آنے والے چالیس وحشت ناک دنوں میں میرے ہوش وحواس کسی نہ کسی حد تک برقرار رہے۔ جیسے مجھے اپنے ججوں کو دیکھ کر اچانک یاد آگیا کہ یہ آدمی وہی چھوٹے لڑکے تو ہیں جنہیں میں سال بسال تک پڑھاتا رہا ہوں۔ بے شک وہ پہلے سے بڑے اور خطرناک ہو گئے ہیں لیکن پھر بھی وہ چھوٹے لڑکے ہیں جن سے طفلانہ حرکات سرزد ہو رہی ہیں۔"

اس خیال سے اُس میں اخلاقی قوت عود کر آئی وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گیا۔ ہاتھ دوہرے کر کے گھٹنوں پر رکھ لئے اور ججوں کی طرف دیکھ کر پورے سکون کے ساتھ مسکرانے لگا جو اُسے قہرآلود نظروں سے گھور رہے تھے۔

غصے سے پیچ کھاتے ہوئے بھاری بھرکم آواز میں صدر نے حنی سے پوچھا "جانتے ہو تم پر کیا الزامات عاید کئے گئے ہیں؟" "نہیں" قیدی نے اطمینان سے جواب دیا "میں کچھ کہنے سے بالکل قاصر ہوں۔" "ذرا ذہن پر زور ڈالو" جج چلایا۔ پروفیسر نے بے پروائی سے کندھوں کو جنبش دی۔

"تم سامراجیوں کے جاسوس ہو" جج نے کہا "تم نے اپنے گھر جو خطوط لکھے ہیں، ان میں ہمارے ملک کے حالات بیان کئے ہیں اور یہ قانوناً ممنوع ہے۔ تم روس خط لکھ سکتے ہو کیونکہ وہاں کے لوگ ہمارے دوست ہیں۔ لیکن امریکہ کوئی خط نہیں لکھ سکتے۔ اُس پر وال اسٹریٹ کی حکمرانی ہے۔ کسی روز ہم امریکہ کو اس کے چنگل سے نجات دلائیں گے۔"

حنی نے کہا کہ اُس نے جو خط اپنے وطن لکھے ہیں ان میں چینی عوام کی پوزیشن واضح کی گئی ہے۔

"بکواس مت کرو۔ سامراجی جاسوس!" جج ایک ساتھ چلائے۔

"یہ مقدمہ کی سماعت کا پہلا دن تھا۔ مسلسل چالیس روز تک یہی کچھ پیش آتا رہا۔ حان می اسٹول پر بیٹھے بیٹھے تھکن کے مارے اکثر جھولنے لگ جاتا۔ عوامی عدالت کے چھ جج نو نو گھنٹے تک باری باری سوالات کرتے اور دادِ خطابت دیتے رہتے۔

عدالت کا ایک اجلاس اس ضمن میں مثالی نوعیت کا تھا۔ یہ ان دس اجلاسوں میں سے ایک تھا جو عدالت نے حان می سے یہ اعتراف کرانے کے لئے وقف کئے تھے کہ وہ FBI کا ایجنٹ تھا۔ جب پادری نے بتایا کہ FBI کا کام غیر ملکوں میں جاسوسی کرنا نہیں ہے۔ تو عدالت کھلکھلا کر قہقہے لگانے لگی "تم مذہب کے نام سے بھیڑ کی کھال جو تم نے پہن رکھی ہے اسے اتار ڈالو" صدر گرجا "تم حقیقت میں سامراجی بھیڑیئے ہو" پھر صدر تمسخر آمیز انداز میں کہنے لگا کہ جب ایڈگر ہوور غیر ملکی مشنوں کے نیشنل پریسبٹیرین بورڈ کا ایک ٹرسٹی تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ تمام مشنری FBI کے ملازم ہیں۔ حنی اگرچہ تھک کر چور ہو چکا تھا۔ پھر بھی ہنستے ہوئے حقیقت حال کی وضاحت کرنے لگا "بکو مت اے سامراجی جاسوس" ـــــ صدر چلایا اور اس سیلاب میں اس کی آواز ڈوب کر رہ گئی۔

پھر مختلف ججوں نے پرجوش تقریریں کیں۔ چینی جب زور سے بولتے ہیں تو ان کی آواز تیز اور کرخت ہوتی ہے۔ حنی کے لئے یہ انتہائی سخت جسمانی عذاب تھیں اور ان کا مقصد بھی یہی تھا۔ ہر تقریر کے بعد وہی ایک سوال مختلف پیرایوں میں کیا جاتا "تم نے FBI کی طرف سے مخبری کب سے شروع کی؟" حنی کہتا کہ وہ کبھی مخبر نہ تھا "تم جھوٹ بولتے ہو" صدر چیخ اٹھتا۔

متواتر کئی روز تک یہی ہوتا رہا حتیٰ کہ حنی سوچنے لگا کہ وہ اس عذاب سے چھٹکارا پانے کی خاطر اعترافِ جرم کیوں نہ کر لے۔ اس کی قوتِ برداشت ختم ہو رہی تھی۔ اس وقت اس کے ذہن میں جس قسم کے خیالات اٹھ رہے تھے انہیں ڈائری کی صورت میں اس نے ابتلا کے تیس دن گزارنے کے بعد لکھا تھا۔ وہ لکھتا ہے۔

"میں تھک گیا ہوں اور مجھ پر غنودگی کا سا عالم طاری ہے۔ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے بھوک بھی لگ رہی ہے یا نہیں آخری مرتبہ

ترقی پسند ادب کا جائزہ

طریقے سے پڑتا ہے اس کا کام پاکیزہ اور کثیف کی تمیز اور اسکی تنقید بھی ہے۔ یہاں ممتاز حسین کا یہ قول بالکل درست ہے کہ

> "ادب زندگی کی کثافت اور پاکیزگی کا نہ صرف ترجمان ہے بلکہ کثافت کو دور کر کے زندگی کو پاکیزہ توانا اور متحرک بناتا ہے' ادیب کا کام معاشرے کی تطہیر اور تعمیر بھی ہے۔ یہ اسٹالین کے خیال میں "انسانی روح کا انجینئر ہوتا ہے"

ان تمام اصولوں کے پیش نظر یہ دیکھنا لازم ہو جاتا ہے کہ فن کار نے اپنے سامعین کو اندھیری پگڈنڈیوں میں بھٹکتا چھوڑ دیا ہے یا منزل تک پہنچنے کے لیے کوئی روشنی بھی دی ہے۔ خلا میں چھوڑ دینے سے تو کوئی مقصد حاصل نہیں ہوتا یہی نہیں بلکہ بقول ممتاز حسین یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ:۔

> " ادبی تخلیق کے نتائج انسانی ذہن پر کیونکہ مرتب ہوئے۔ وہ انسان کو سوچنے اور سمجھنے میں مدد کرتے ہیں یا نہیں اور اگر کرتے ہیں تو کس عنوان سے' وہ کون سے جذبات کو دبلاتے ہیں ...
>
> . . . . اور کون سے جذبات کو ابھارتے ہیں۔ ذہنی انتشار اور جذباتی انتشار پیدا کرتے ہیں یا کوئی وحدت اور تنظیم پیدا کرتے ہیں"۔

ان چیزوں کو سامنے رکھ کر اگر ترقی پسند ادب پر نظر ڈالی جائے تو یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ تطہیر اور تعمیر کے ان تمام دعوؤں کے باوجود ترقی پسند ادب افسانے اور شعر کے میدان میں اکثر سب کچھ بھول جاتے ہیں وہ یہ خیال بھی نہیں کرتے کہ ان کی تخلیق سے انسانیت کی اعلیٰ صفات کے ابھرنے اور بڑھنے میں کوئی مدد ملتی ہے یا نہیں۔ مثال کے طور پر احمد ندیم قاسمی کے افسانے "نئے فرہاد" کو لیجیے' یہ کہنے کی شاید ضرورت نہیں ہے کہ احمد ندیم کا شمار ترقی پسندوں کے چوٹی کے لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔

کہانی مختصر لفظوں میں یوں ہے :۔ کہ

> پنجاب کے ایک دیہات کا چوپال ہے۔ حقے کا دور چل رہا ہے ایک رہرو حقہ پیتے ہوئے خبر دیتا ہے کہ لاہور میں ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کو شدید جانی اور مالی نقصان پہنچایا ہے۔ عورتوں کی بے حرمتی بھی ہوئی ہے مجمع پر سناٹا طاری ہے۔ یکایک جعفر انتقامی جذبات کو ابھارتا ہے اور دیہات کی ساکن فضا جلتے ہوئے مکانوں، لٹتے ہوئے سامانوں اور روتے ہوئے انسانوں سے مکدر ہو جاتی ہے۔ جعفر بھی قتل و غارتگری میں سرگرم ہے کہ یکایک اس کی ملاقات شانتی سے ہوتی ہے جو ایک سکھ کی لڑکی ہے اور جس سے جعفر دو سال سے نہایت پاکیزہ قسم کی محبت کر رہا ہے۔ یہ وہی شانتی ہے جسے کنویں سے پانی بھرتے اور ہنستے چلتے ہوئے دیکھ کر جعفر سوچا کرتا تھا کہ شانتی چاندنی میں چاندنی بکھر رہی ہے" اور "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ شانتی ہمیشہ یونہی چلتی رہے اور میں اسے یونہی دیکھتا رہوں۔ سورج یہیں جا رہے اور گاگر چھلکتی رہے' اور پانی اچھلتا رہے۔
>
> اس وقت جعفر کے ہاتھ میں خون آلود چھرا ہے شانتی کو دیکھ کر وہ اس طرح محفوظ کر لینے کو بے چین ہو جاتا ہے۔ جیسے ڈبیا میں موتی' لیکن شانتی منڈیر پر بیٹھی ہوئی یہ تقریر کرتی ہے :۔
>
> "تمہارے چہرے پر خون جما ہوا ہے اور تمہاری آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں اور وہ سامنے میرا تایا کھڑک سنگھ پڑا ہے جس نے ایک بار سیٹھی کے میلے پر تمہیں اپنے کاندھے پر بٹھا لیا تھا اور بھاگتے ہوئے سارے میدان میں گھوما تھا۔ . . . . مجھے ایک بار نے جلتے چھرا اور

اشاعت خاص ..

میں بھی ایک باپ کی بیٹی ہوں ۔ میرے بھی دو ننھے بھائی ہیں وہ سب اسباب کی کوٹھڑی میں ٹرنکوں کے پیچھے دبکے بیٹھے ہیں اور شاید گھٹ کر مر بھی چکے ہوں ۔ تمہارے بھائی ہمارے دروازے توڑ رہے ہیں اور اندر پتھر پھینک رہے ہیں اور میں یہاں کتنی دیر سے بیٹھی ہوں ۔ میں تمہاری راہ تک رہی تھی ۔ میں جانتی تھی کہ تم ضرور آؤ گے ۔ مجھے تم سے صرف یہ کہنا تھا کہ کیا مسلمان ایسے ہوتے ہیں ۔ وہ بھی تو مسلمان ہی تھے جنہوں نے ہمارے گروجی کی آمد پر دھرم شالہ میں اپنی مسجد کی لالٹین بھیج دی تھی اور تم بھی مسلمان ہو جو سکھوں اور ہندوؤں پر صرف اس لئے چڑھ دوڑے ہو کہ وہ تمہارے خدا کو کسی دوسرے روپ میں دیکھتے ہیں ۔ میں بڑی تسلی سے آہستہ آہستہ بول رہی ہوں ۔ یہ میرے پاس بھی کرپان ہے اور جب ہمارے گھر کا دروازہ ٹوٹا تو اس کرپان سے اپنا سینہ پھاڑ لوں گی لیکن مجھے تم سے صرف یہ پوچھنا تھا کہ تمہارے لئے یہ سب کچھ مناسب تھا ؟ کیا تمہیں شرم نہیں آتی ؟ کیا تم لوگوں کو جنت ایسے ہی کارناموں کے بدلے میں ملتی ہے ؟ اور کیا واہگرو تمہیں معاف کر دیں گے ؟

جعفر سوچنے لگتا ہے بلوائی قریب تر آ چلتے ہیں ۔ شانتی کے گھر کا دروازہ ٹوٹنا ہی چاہتا ہے ۔ شانتی کی کرپان بھی نکل آتی ہے جعفر اُسے روکتا ہے ۔ اپنا اور واہگرو کا واسطہ دیتا ہے اور بلوائیوں کی طرف بڑھتا ہے اور ایک تقریر کرتا ہے

" میرے بھائیو! مجھے ابھی ابھی پتہ چلا ہے کہ وہ مسافر اصل میں انگریز نے بھیجا تھا ۔ اس کا پیشہ یہی ہے کہ وہ گاؤں گاؤں جاتا ہے اور لوگوں کے دلوں میں زہر پھیر دیتا ہے " فساد رک جاتا ہے ۔ ہندو مسلمان گلے ملتے ہیں اور گاؤں کی زندگی ہمیشہ کی طرح پُر امن ہو جاتی ہے ۔

اور پھر ایک دن جب جعفر کہیں سے کبڈی کا مقابلہ دیکھ کر آتا ہوتا ہے تو دیکھتا ہے کہ گاؤں کے کتنے ہی مکان جل رہے ہیں ۔ گویا فساد پھر شروع ہو گیا تھا ۔ پھر وہ دیکھتا ہے کہ گاؤں کا کرم دین تمام ہندوؤں اور سکھ بوڑھوں کو ساتھ لا رہا ہے ۔ شاید گاؤں بدر کر رہا ہے ۔ جعفر اسے روکتا ہے ، کہتا ہے " ہم انسان ہیں ۔ ہم مسلمان ہیں " بالآخر وہ گاؤں پہنچتا ہے مقبوضہ عورتوں کی قطار لگی ہوئی ہے ۔ بٹوارہ ہو چکا ہے ۔ شانتی کسی اور کو الاٹ ہو چکی ہے ۔ ظاہر ہے کہ جعفر اس کا سب سے بڑا حقدار تھا ۔ وہ شانتی کو لینے کے لئے بڑھتا ہے لیکن روک دیا جاتا ہے گاؤں کے نوجوان اس معاملہ پر مرنے مارنے پر آمادہ ہیں ۔ نتیجۃً جعفر چھرا نکال کر شانتی ہی کو ہلاک کر دیتا ہے "

افسانے کی فنی خوبیوں اور نقائص سے قطع نظر یہ بات غور طلب ہے کہ اس کا مقصد کیا ہے ۔ جعفر کا ان حالات میں شانتی کے پیٹ میں چھرا گھونپ دینا عام بازاری زندگی میں روزمرہ کی عشق و محبت کی وارداتوں سے تو مماثلت رکھتا ہے لیکن عام بازاری زندگی انسان کے اخلاق و کردار کا معیار تو نہیں بن سکتی ۔ اس قسم کے واقعات تو سستے اور ادنیٰ اخبارات میں بھی مل جاتے ہیں جس میں کوئی شخص اپنی داشتہ یا محبوبہ کو کسی اور کے ساتھ دیکھ کر دانت سے اس کی ناک کاٹ لیتا ہے لیکن یہاں پیش نظر فنکار کا فن پارہ ہے پھر ایسے واقعات میں اشتعال کا سب سے بڑا سبب محبوبہ کی اپنی غداری ہوتا ہے ۔ لیکن یہاں تو شانتی مجبور و بے کس ہے اس لحاظ سے ہم جعفر اور سارے گاؤں والے خود غرضی کی اس منزل پر نظر آتے ہیں جہاں

لہ ۔ مقالہ نگار جو اعتراض اٹھاتے ہیں وہ بجائے خود مضبوط ہے لیکن ان الفاظ میں وہ واضح نہیں ہو سکا چنانچہ آپ کے سوال کے جواب میں قاسمی صاحب کہہ سکتے ہیں کہ میرے افسانہ کا مقصد یہی تو ہے کہ اپنے دیہاتی عوام کی پستی کو نمایاں کروں تاکہ اصلاح کا جذبہ بیدار ہو ۔ (ل ص)

ترقی پسند ادب کا جائزہ

انسانیت دم توڑ دیتی ہے اور مایوسی اور شکستگی کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوتا ۔
اسی طرح ہاجرہ مسرور "پرانا مسیحا" میں اپنی ہیروئن میں نیکی کا احساس پیدا کر کے اور صرف چند دنوں کے لئے اس پر عمل درآمد کرنے کے بعد شکستہ
و مایوس بنا کر افسانے کے خاتمے پر یہ کہتی ہوئی گرا دیتی ہے کہ :-

"ہا ہا ۔ نیکی کی قدر نہیں ۔ کیسا بُرا زمانہ آ لگا ہے یہ دُنیا کتنی بڑی جگہ ہے اور کتنی پرانی ۔ وہ
اپنے ننھے سے جذباتی دائرے میں سکڑی سمٹی سسک سسک کر سوچتی رہی اور اس کا جی چاہتا رہا
کہ وہ برہنہ عورت کی تصویر کی طرح بازو پھیلا کر اُڑ جائے ۔ جیسے کہ نیلا پرسکون ، پُر اسرار اور بلند آسمان
سے اپنے بازوؤں میں بھینچ لے"[1]

اس دنیا کو بُری جگہ کہہ دینا تو آسان ہے ثابت کرنا ذرا مشکل ہے پھر اگر یہ مان بھی لیا جائے تو کیا نیکی کرنے والوں کا حاصل بھی دل شکستگی اور بالآخر
خواہش فرار ہے ۔؟ ہاجرہ مسرور نیکی کے بعد احساس آسودگی کی تکمیل باقی ہیں اُنہیں شاید اس کا احساس نہیں ہے کہ اس طرح دُنیا نیک کام کرنے والوں سے
خالی ہو جائے تو وہ سنت بھی قائم نہیں رہ سکتی ۔ اس قسم کے قنوطی اور پست تصورات معاشرے کے لیے انتہائی مضر ہوتے ہیں ۔
اسی طرح احمد ندیم قاسمی کا ایک دوسرا افسانہ "الحمد للہ" ہے جس میں دیہات کے ایک مولوی کے کردار کو دکھایا گیا ہے ۔ یہ مولوی
وظائف پر پلتا ہے ۔ شادی کرتا ہے ۔ بچے پیدا ہونے لگتے ہیں ۔ حالات تنگ اور پریشان ہو جانے میں بڑی مشکل سے ایک لڑکی کی شادی کر پاتا ہے ۔ کہ
دوسری اور تیسری کی جوانی چڑھتی ہوئی بھوت بن کر سوار ہو جاتی ہے ۔ اسی دوران میں مولوی کے نواسا ہوتا ہے ۔ لڑکی کی ساس کے طعنوں کی شدت کو کم کرنے
کے لئے مولوی سوچتا ہے کہ نواسے کی ولادت پر ایک اچھا جوڑا بھیجے مگر کیسے ؟ بے چارہ چودھری جو بلا ناغہ "وظیفہ" بھیجتا رہا ہے اور جس نے
شادی میں بھی بڑھ چڑھ کر مدد دی تھی ۔ ان دنوں بیمار ہے ۔ اس مشکل میں اللہ کے بعد وہ ایک سہارا ہے ۔ مولوی چودھری کے پاس جاتا ہے اور پھر بہت
تیزی سے واپس آ کر بیوی کو یہ مژدہ سناتا ہے کہ چودھری مر گیا ۔ جنازے میں بیس روپے تو ملیں گے ۔ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے ۔ شاید اپنے

سفلہ پن کے احساس پر ۔
یہ پورا افسانہ جو نقوش کے ۱۴ صفحات پر پھیلا ہوا ہے کسی بھی مولوی کی ایک مختصر سوانح ہو سکتی ہے ۔ لیکن اس افسانے کا مقصد کیا ہے اس سلسلہ
میں کہیں بھی کوئی اشارہ نہیں ہے البتہ جگہ جگہ مولوی اِبل کی شکر گزاری ، صبر ، عبادت و ریاضت پر سستے قسم کی تضحیک کے سوائے اور کچھ بھی نہیں ملتا ۔
ممکن ہے کہ صبر و شکر اور اس نوعیت کے دوسرے اوصاف کی اہمیت افسانہ نگار کی نگاہوں میں نہ ہو لیکن قدیم زمانے سے آج تک ان کا شمار انسان
کے بہترین اوصاف میں رہا ہے یہی نہیں بلکہ انسانی ہمدردی کے لئے ان اوصاف کا وجود لازم ہے ورنہ معاشرے میں سوائے ذاتی اغراض و منفعت کے اور
کسی جذبے کے ماتحت انسان کوئی کام نہ کرے اور جس معاشرے میں یہ صورتِ حال پیدا ہو جائے اس میں زندگی کی نوعیت کیا ہو سکتی ہے ؟
یہ اور اسی طرح کے بے شمار افسانے ہیں جس میں انسانی معاشرے کو بنانے سنوارنے اور نکھارنے یا انسانی کردار کو زیادہ جاندار ، بلند اور حسین بنانے
کے لئے کچھ بھی نہیں ملتا ۔ میری مراد یہ نہیں ہے کہ ترقی پسندوں نے اس قسم کے افسانے ہی نہیں لکھے ہیں ، میرا مقصد صرف یہ ہے کہ اس قسم کے افسانے کم اور

۔ مگر ہاجرہ مسرور بھی کہہ سکتی ہیں کہ میرا افسانہ یہ واضح کرتا ہے جب اجتماعی تاریخی ماحول ظلم و جبر پر مشتمل ہو تو اس میں افراد کے نیکی کے جذبات کی تکمیل
[illegible]
[illegible] جب بے نام کیا جائے اور یہ ثابت کیا جائے کہ مذہب کی پیدا کردہ نیکیوں کی بنیاد [illegible] اور وہ
[illegible] پر جو چیز [illegible] طرح اثر انداز ہوتی ہے وہ معاشی تقاضے ہیں ۔

[1] اشاعت خاص [illegible]

بہت کم ہیں ۔ مقصود کے لحاظ سے اے حمید کے افسانے "ایک رات" کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی جس میں کردار تمام رات کی بھوک اور سردی کے باوجود جب صبح اٹھتا ہے تو اس کی زبان پر جرأت اور عظمت کے یہ الفاظ ہوتے ہیں : ۔

"تمہارے بازوؤں میں طاقت اور خون میں گرمی ہے ۔ ہمیشہ بلند مضبوط اور خوبصورت چیزوں کے متعلق سوچو اور زندگی کے اس کھیل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لو خواہ تمہارا کردار کتنا ہی غیر اہم اور مختصر کیوں نہ ہو"

اسی طرح عبدالحمید عدم انسان کا تعارف ان الفاظ میں کراتے ہیں : ۔

اگر تیرے مکاں میں روشنی ہے چاند تاروں کی
اگر سورج ترے در پر ادب سے سر جھکاتا ہے
اگر رزق اس قدر وافر ہے تیرے توشہ خانے میں
فقیہہ شہر بھی تیرا بھکاری بن کے آتا ہے
اگر تو اتنا خوش قسمت ہے تیرے اک اشارے پر
زمانہ دامن گردوں سے تارے توڑ لاتا ہے

—— ÷ ——

تو پھر بھی یہ نہیں لازم کہ انساں نام ہو تیرا
کہ اس تعریف میں مشکل سے کوئی فرد آتا ہے
ارے کم بخت انساں اس روا داری کو کہتے ہیں
کہ جس کے بوجھ سے تلوار کا پھل ٹوٹ جاتا ہے
کبھی دیکھی ہے اس درویش کے افلاس کی وسعت
جو پہلے خود نہیں کھاتا غریبوں کو کھلاتا ہے

(شناخت)

فیض احمد فیض بھی اپنی نظم "شورش بربط و نے" میں اسی طرح ہزیمت و شکستگی کے تمام بادلوں کو چیلنج کرتے ہوئے ان الفاظ میں گرج اٹھتے ہیں : ۔

یہ ہات سلامت ہیں جب تک ! اس خون میں حرارت ہے جب تک
اس دل میں صداقت ہے جب تک ! اس نطق میں طاقت ہے جب تک
ان طوق و سلاسل کو ہم تم سکھائیں گے شورش بربط و نے
وہ شورش جس کے آگے زبوں ہنگامۂ حشمت قیصر و کے
آزاد ہیں اپنے فکر و عمل ' بھرپور خزینہ ہمت کا
اک عمر ہے اپنی ہر ساعت ! امروز ہے اپنا ہر فردا
یہ شام و سحر ' یہ شمس و قمر ' یہ اختر و کوکب اپنے ہیں
یہ لوح و قلم ' یہ طبل و علم ' یہ مال و حشم سب اپنے ہیں

ترقی پسند ادب کا جائزہ

حسن طاہر جنگ کے میدان میں حریف کی صفوں میں ایک ایسا سپاہی دیکھ کر جو نظریات و عقائد میں اشتراک رکھتا ہے بول پڑتا ہے ؎

بچھڑ چکے تھے ہم ایک دوسرے سے آج ہیں
اک ایسی صورتِ حال نے ملایا ہے
ہوا ہے جنگ کے میدان میں سامنا اپنا
بہ روزِ بد بھی ہمیں وقت نے دکھایا ہے۔

وہ رفیق مقابل ہیں آج ہم دونوں
تجھے ترے مجھے میرے وطن نے بھیجا ہے
مگر یہ جنگ لڑی جا رہی ہے کس کے لئے
کچھ اس میں فائدہ میرا ہے نہ تیرا ہے۔

(ملاقات)

یہ نظم وطنیت اور امپیریلزم کے محدود اور مہلک تصور پر ضرب کاری کا کام کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ دو ایسے سپاہی جو ایک ہی نظریہ حیات پر یقین رکھتے ہوں باہم کسی ایک ہی شے الفانیت سے سرشار ہوں محض محبت وطن کی خاطر اپنے مقصد اور نصب العین کا کس طرح خون کر سکتے ہیں۔ شاعری اپنے روشن رخ کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ درد بھی رکھتی ہے۔ کہیں قتیل شفائی زمانے کے ہنگاموں سے زمین چھوڑ کر آسمان میں پناہ لینے اور اسے جانے سنوارنے کی سوچتے ہیں

یوں جو لیے تند مر ہوگا یہاں مجھے نہیں سکوں ملے گا
زمیں کے تو میدان سے ہیں تو آسماں کو سنوار آئیں

کہیں عبدالمجید عدم خدا اور بندگی کے تعلق پر کچھ اس انداز پر طنز کرتے ہیں ؎

[illegible]

لے [illegible] سمجھنے والے [illegible]
[illegible]

٥٠

مے پیتا ہوں، زندہ ہوں — زندہ ہوں تابندہ ہوں
ڈوساقی کی سنے کی دُھن — پاپ نہیں ہے اپنی ہی دُھن

وامق بھی انسان کے جذبۂ شکر کی پُر زور مذمت کرتے ہیں :-

تم نے غربت کو تشکر کی علامت دے کر
نسل آدم کی فنا گاہ بنا رکھی ہے۔ (اگم راہ پرست)

احمد ندیم قاسمی نے بھی صبر کے مفہوم کو کچھ اسی انداز میں سمجھا ہے :-

ندیم فلسفۂ صبر کو دعائیں دو !
برائے غریب کتنی جو ہے غریب نواز!

ادب برائے عوام بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ ترقی پسند ادب عوامی ادب ہے۔ یہ بھی ایک اہم نعرہ ہے بظاہر اس کا مطلب عوام کے جذبات و احساسات کی ترجمانی ہے۔ اب ذرا ایک نظر پاکستان کے عوام پر ڈالئے - یہاں نہ صرف مسلمانوں کی اکثریت بلکہ عظیم اکثریت کے لئے ادب تو ادب، زندگی کا تصور مادی نہیں ہے۔ وہ ایک قادر مطلق ہستی پر ایمان رکھتی ہے اور اسے اس دنیا کی خالق و مالک سمجھتی ہے اور اس کے بھیجے ہوئے[1] نظام حیات (دین اسلام) سے اگر بلحاظ زندگی کی وجہ سے شعوری نہیں تو بے انتہا جذباتی عقیدت اور لگاؤ رکھتی ہے۔ اس اکثریت میں کسان اور مزدور بھی ہیں، ملازم پیشہ اور تاجر بھی ہیں۔ انھیں روٹی اور کپڑا، مکان اور تعلیم عزیز ہے۔ سامانِ عیش و آرام کے یہ بھی متمنی ضرور ہیں۔ مگر اپنے عقائد و ایمان اور اپنی روایات کی محبت کو بیچ کر نہیں اس بات کے لئے شاید دلائل و براہین کی زیادہ ضرورت نہیں ہے۔ آخر اس کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اسلام کا نام ان کے لئے ہر میدان میں موجب تحریک و اقدام ہوا ہے —— تقسیم سے پہلے پاکستان کے حصول کی جدوجہد کے لئے اگر اپنے تمام اختلافات کو پس پشت ڈال کر یہ کسی ایک مرکز پر متحد ہوئے تو اسلام کی بدولت، تقسیم کے بعد بھی جب کبھی سیاسی لیڈروں اور ارباب[2] اقتدار کو ان کا تعاون حاصل کرنا ہوا تو اسلام ہی کے نام پر اپیل کی گئی - یہ کہنا شاید بے جا نہ ہو کہ یہاں کے عوام کو پاکستان سے جو کچھ بھی انس و محبت ہے محض اسلام کی وجہ سے ہے کیونکہ ان کا یہ عقیدہ اور عزم ہے کہ یہاں ایک اسلامی حکومت قائم ہوگی جو ان کے نزدیک ان کی زندگی کے تمام مسائل کا بہترین حل فراہم کر سکتی ہے - چنانچہ کشمیر کی جنگ اور بھارت کے جارحانہ عزائم سے خطرے کے ایام میں بھی اسلام اور جہاد ہی کا وہ نعرہ تھا جس نے انہیں مضطرب اور آمادۂ عمل کیا تھا۔ اس حقیقت کے ادراک کے ساتھ جب ہم ترقی پسند ادب کے سارے ذخیرے پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو اس امر کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے کہ اس میں سوادِ اعظم کے اس عقیدے اور نظریے کی ایک جھلک بھی نہیں ہے۔ البتہ جگہ جگہ ایسے نشتر ضرور پوشیدہ ہیں جو پاکستانی عوام کی اسی رگ و جان سے کھیلنے کی کوشش کرتے ہیں عوام کے جذبات و احساسات[3] اور رجحانات سے اس بے اعتنائی اور بے نیازی اور اس کے برعکس ایک اجنبی تصور اور نظریے کی تبلیغ کے باعث ترقی پسند ادب یہاں کے عوام کے لئے بڑی حد تک اجنبی اور غیر مانوس بن کر رہ گیا ہے بظاہر ہم دیکھتے ہیں کہ اس میں کچھ ان کا ملال اور ہیں بھی سنے کی بیت اور

• • •

١ اس میں شک نہیں کہ عوام کی عقیدتِ اسلام کو غلط طور پر ایکسپلائٹ کیا جا رہا ہے۔ لیکن اس کا حل یہ نہیں کہ عوام کی عقیدتِ اسلام کو ختم کر ڈالا جائے بلکہ ایکسپلائٹ کرنے والوں کو ان کی ناپاک حرکت سے روک دیا جائے۔ (ا ن ص)

٢ یہ تو عوام کے بجا جذبات و احساسات ہوتے لہذا ترقی پسندی ان کے خلاف نہ ہوگی نہ کہ ان کا احترام کرے گی (ا ن ص)

٣ علاوہ برایں اپنے ابہامی انداز بیان کی وجہ سے بھی ترقی پسند ادب ایسا نہیں ہے کہ ہمارے نیم تعلیم یافتہ عوام اس سے استفادہ کر سکیں (ا ن ص)

ترقی پسند ادب کا جائزہ

طلبان بھی، مزدور کا ہتھوڑا اور درانتی بھی ہے، مل اور کارخانہ بھی، کلرک کا قلم اور فائل بھی ہے، دتی اور مل بھی، لیکن ان تمام چیزوں کے ساتھ جو بنیادی تشدد اور
عقیدہ ہے وہ نہ صرف تضاد ہے بلکہ ان کے اپنے تصورات اور عقائد کے منافی۔ دور سے چمکتی ہوئی ریت پر پانی کا دھوکا تو ہو سکتا ہے مگر پیاسا وہاں پہنچ کر پیاس نہیں
بجھا سکتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ترقی پسندوں کا کوئی معیاری سے معیاری رسالہ بھی اپنی پندرہ سولہ سالہ کاوشوں کے باوجود محض ہزار دو ہزار کی اشاعت حاصل کر سکا ہے
اور ان کی ایسی کتابیں جن کی آمد کے استقبال میں بڑے بڑے تبصرے[1] اور مقالے لکھے گئے تھے کتب فروشوں کی دکان کی زینت بن کر رہ گئیں۔

ادب برائے انقلاب

ادب برائے عوام کے نعرے کے فوراً بعد ہی ایک دوسرے نعرے کی گونج سنائی دینے لگی یہ نعرہ "ادب برائے انقلاب"
تھا۔ یا دوسرے معنوں میں ادب برائے سیاست! تقسیم سے قبل آزادی کی جدوجہد کے سلسلے میں ادب سیاست اور انقلاب سے روشناس ہو چکا تھا اور بڑی
پُرجوش انقلابی نظمیں اور افسانے منظرِ عام پر آ چکے تھے۔ یہی نعرہ جب ترقی پسند تحریک نے بلند کیا تو اس کی نوعیت ذرا مختلف تھی۔ پچھلے نعرے کے تحت ایک سیاسی
انقلاب ہو چکا تھا جس کے بعد بیرونی حکمرانوں کی جگہ ملکی حکمران نمودار ہوئے لیکن آزادی کے بعد توقعات پوری نہ ہو سکیں اس لئے ایک نئے انقلاب کی ضرورت پیش آئی۔
جس کا پہلا زینہ ذہنی اور نظریاتی انقلاب تھا۔ یہ نعرہ اسی انقلاب کے لئے ہے۔ اب تک تو ترقی پسند ادیب سرمایہ داروں اور جاگیرداروں سے صلح کر کے صرف انگریزوں
کی حکومت و استبداد کا مخالف تھا۔ اب انگریز جا چکا تھا اور اندرونی انقلاب کے لئے فضا نسبتاً زیادہ سازگار سمجھی گئی۔ یہ نیا نعرہ اسی انقلاب کا متقاضی تھا اور
اس کی پہل کسان اور مزدور طبقے سے ہے۔ اشتراکی انقلاب کے لئے طبقاتی شعور اور نزاع کا ہونا ضروری ہے۔ جب تک محنت کش طبقہ متحد اور منظم ہو کر سرمایہ دار
اور جاگیردار طبقے کے خلاف آمادۂ پیکار نہ ہو انقلاب نہ ممکن ہے۔ اسی شعور اور نزاع و کشمکش کو پیدا کرنا اس کا بنیادی مقصد ہے۔

اس حقیقت سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ زندگی کو کبھی بھی مذہب، سیاست، فلسفہ اور دوسرے چھوٹے چھوٹے خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا اس
لئے جس ادب کا تعلق براہ راست زندگی سے ہوگا اور اس کی بنیادیں معاشرے میں پیوست ہوں گی اس کا زندگی کے ہر حصہ پر محیط ہونا لازم ہے۔ سیاست بھی زندگی کا
ایک جزو ہے اس لئے ادب کا بھی لازمی جزو ہے۔ ادیب کے لئے یہ کبھی ممکن نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی حساس فطرت کے باوجود معاشرے اور ماحول کی تمام چیزوں سے متاثر ہو کر
سیاست سے چشم پوشی کر جائے۔ اس لئے جہاں تک ادب کے اس استعمال کا تعلق ہے شاید ہی کسی کو اعتراض ہو سکے البتہ اس سلسلے میں ایک خاص امر کا لحاظ رکھنا
پڑے گا۔ زندگی اگرچہ ایک مکمل اکائی ہے مگر ان مختلف عناصر سے مل کر اس کی ترکیب ہوتی ہے۔ ان میں توازن اور اعتدال ضروری ہے۔ یہ توازن اور
اعتدال اگر قائم نہیں رہتا تو افراط و تفریط کی کشمکش لازمی طور پر پیدا ہو جاتی ہے۔ ادب کی نوعیت بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔ بہترین ادب نہ تو صرف تخیل ہے
نہ صرف حقیقت، نہ صرف مادہ ہے نہ صرف روح، نہ صرف فن ہے، نہ صرف مقصد، بلکہ ان سب کے مناسب امتزاج کا نام ہے۔ کسی چیز کے غلو
کرنے سے لازماً دوسری چیز کی کمی پیدا ہوتی ہے اور اس طرح وہ نقطۂ اعتدال کھو جاتا ہے جس کے برقرار رہنے ہی سے ادب بہترین ادب بنتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے
جہاں ترقی پسند ادیبوں نے بڑی زبردست ٹھوکر کھائی ہے۔ یہ اپنے مقاصد و نظریات سے قاری کو متاثر کرنا تو چاہتے ہیں لیکن بااوقات افسانہ اور شعر کے قالب میں
انھیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی چیز زبردستی گلے سے اتاری جا رہی ہے۔ فنکار کا یہ کمال تو نہیں ہے کہ جو بات اس کا کردار نہ کہہ سکے وہ اس سے زبردستی

• • •

[1] ۔ [illegible] معاشرہ کے [illegible] ان کے احساسات، ان کے جذبات، ان کی پسندیدہ اخلاقی قدریں سب سے [illegible]
[illegible] پیدا کر سکتی ہے۔ (ایضاً)
[illegible] لکھنے والا لکھتا ہے۔ پھر تعارف کرانے والے تعارف کراتے ہیں [illegible]
[2] ۔ ایسی ادبی [illegible] شذرات شائع کرتا ہے مگر منشی بڑی بے خبر ہے۔ (ایضاً)

کہلا دی جائے زبردستی کی یہ باتیں خواہ مخواہ کی تبلیغ معلوم ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کسی تخلیق کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا اس قسم کے ادب اور فطری تخلیق میں بقول ممتاز حسین وہی فرق ہے جو توبدستو رمعنوی میں ہوتا ہے۔ تبلیغ خیالات کے اس بے جا جوش کے باعث بیشتر اچھی خاصی نظمیں اور افسانے تباہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان کو شروع سے آخر تک پڑھ جائیے ایک قسم کا سپاٹ پن محسوس ہوتا ہے جیسا کہ ان کے مقررین کی تقاریر میں ملتا ہے۔ کہیں کہیں یہ بھی ہوا ہے کہ نظم یا افسانہ ختم کرتے کرتے یکایک مصنف پر یہ جوش طاری ہو گیا ہے اور اس نے خیالات کی ٹھونس ٹھانس کر دی ہے۔

مثال کے طور پر ابن انشا کی طویل نظم "بغداد کی ایک رات" کو لیجئے۔ یہ ان کی منفرد کتنی کا سوال ہے بڑے سادہ اور دل نشین انداز میں الف لیلا کی داستان پر اسرار فضا پیدا کر دی ہے اس کے ساتھ ساتھ جگہ جگہ تصورات پیچھا نہیں چھوڑتے۔ لیکن عین اس وقت جب رات کا دھندلکا ختم ہو رہا ہے اور دجلہ کی ساکن موجیں مرتعش ہونے کو ہیں، شاعر سے نہیں رہا جاتا اور وہ یوں گویا ہوتا ہے۔

اب بخارا و سمرقند کی راہوں سے نسیم
لایا کرتی ہے دم صبح بہاروں کے پیام
اور ہر پھول سے کہہ جاتی ہے چپکے چپکے
تم جو چاہو تو بدل سکتے ہو گلشن کا نظام

تم کو آدم کے مقدر کو جگانے کے لئے
بابل اور ہند کے جادو نہ جگانے ہوں گے
اپنی اس جنت گم گشتہ کو پانے کے لئے
مصر و بغداد میں "کمیون" بنانے ہوں گے

سلام مچھلی شہری کی نظم "بورژوا اسٹوڈنٹ سے" کی بھی یہی کیفیت ہے۔ یہ اسٹوڈنٹ سیج سج کر دیہات کی ایک لڑکی کو اپنی ہوس کا شکار بنانا چاہتا ہے لیکن وہ بھولا کیوں کر دام میں آتی، وہ تو ساتھ ہی ساتھ بڑی مفکر اور فلسفی بھی تھی۔

کہتی ہے ؎

فریب مذہب و سرمایہ داری اور کیا ہوگا
کہ جنتا کے دلوں کو،
آنسوؤں کو،
ان کی آہوں کو — — — دبانے کے لئے۔ اپنے تئیں مسرور رہنے کو۔
ادیبوں شاعروں نے گاؤں کو جنت بنایا ہے۔

— — —

مگر اب عالم مزدور و دہقان اور ہی کچھ ہے
زمیں پر کھیت ہیں مگر وہاں نغمے نہیں ہوتے

— — —

اب ہم مزدور خوابیدہ نہیں، ہم جاگ اٹھے ہیں
ہمارے ہاتھ میں کنگن نہیں شمشیر ہوتی ہے

ہمارے دہقان کے کھیت آج انگارے اگلتے ہیں
ہمارا کارواں ـــ مزدور کی جفتا کی یہ ٹولی
اسی ٹولی کا حصہ ہے جو دنیا بھر میں بکھری ہے
جو اس دم برسرِ پیکار ہے سرمایہ داروں سے
وہی جو اپنے سکوں کے کھنکتے گیت دے دے کر
ہمیں اب بھی سلانا چاہتے ہیں ۔ ــــــــ

یہی کیفیت ہاجرہ مسرور کے افسانے "نئے سفر" کی ہے جس میں دیہات کی ایک غریب بڑھیا یکایک جب یہ معلوم کرتی ہے کہ وہ عورت جو تصویر میں بظاہر ایک شاہزادی معلوم ہو رہی ہے درحقیقت چین کی ایک دیہاتی عورت ہے جو اسی طرح کھیت اور کھلیان سے تعلق رکھتی ہے تو فوراً چین کا کرایہ پوچھنے لگتی ہے، جیسے اسے اگر یہ کرایہ میسر ہو جائے تو وطن کی تمام دلچسپیوں اور سال ہا سال کے لگاؤ کو ٹھکرا کر ابھی پرواز کر جائے گی ۔

شوکت صدیقی کے بیشتر افسانے اسی رنگ میں ہیں "غمِ دل اگر نہ ہوتا" میں تو یہ بات صاف نمایاں ہے کہ یہ پارٹی پروپیگنڈا کے لئے لکھا گیا ہے جس میں رنرھبیر باقاعدہ لٹریچر بانٹتا ہے اور اسٹرائکیں کراتا پھرتا ہے۔[۵]

احمد ندیم قاسمی کا حال بھی اکثر کچھ مختلف نہیں ہوتا ۔ کہانی "لکھی جا رہی ہے" میں بے دخل کئے جانے والے ایک مزارع کی بیوی کا کردار بڑا اہمند ہے ۔ زبیدا سے ظلم نے شوہر سے زیادہ بغاوت کا جذبہ اس کے اندر بھر دیا ہے اور وہ بڑے زور کے ساتھ مزارعوں کو جمع کر کے جاگیردار سے حق وصول کرنے کی تلقین کرتی ہے اور عین اسی وقت یہ بڑے ہی ڈرامائی انداز میں مزارعوں کا جلوس نعرے لگاتا ہوا نکل آتا ہے اس طرح مزارع کی بیوی (فاطمہ) کے دل میں جو بغاوت چند منٹ پہلے انگڑائیاں لے رہی تھی وہ سچ مچ میدان میں نظر آنے لگتی ہے اور "زمین کس کی ہے" کا نعرہ سب سے پہلے فاطمہ ہی سن کر جواب دیتی ہے "ہماری ہے"[۱۶]

موضوعات

ہر ادب کے ساتھ اس کی تبدیلیِ افکار کے لحاظ سے کچھ مخصوص موضوعات بھی ہوتے ہیں ۔ ترقی پسند ادب کے موضوعات پر اگر نظر ڈالی جائے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس لحاظ سے اس کا دامن خاصا کشادہ اور وسیع ہے کہ ادب میں جہاں ایسے بنیادی موضوع نظر آتے ہیں جنہیں ہر زمانے میں ہر ادب نے اپنایا ہے تو اس کے ساتھ روزمرہ کی زندگی اور گرد و پیش کے حالات میں سے بے شمار اہم اور غیر اہم چیزیں ایسی بھی ہیں جنہیں شعر و افسانہ کا موضوع بنایا گیا ہے شاید اس کا سب سے بڑا اور اہم سبب یہ ہے کہ یہاں آکر ادب صرف "برائے ادب" ہی نہ رہا ۔ بلکہ زندگی اور عوام سے متعلق ایک چیز ہو گیا ۔ یہاں ہم چند موضوعات کا مختصر طور پر جائزہ لیں گے ۔

• • •

۱۵ ۔ ہم نے اپنے رفقائے ادب پر نقدہ غور سے پڑھیں اور ہوشیار رہیں وہ کبھی کبھی یہ ٹھوکر کھا جاتے ہیں :ـــــ بالعموم ترقی پسند ادب کا ایک (۵۵)

کہانیوں کو نظم بنانے کی وجہ سے ۔

۱۶ یہ سماج کی موجودہ حالت کی تصویر نہیں، کیونکہ پاکستان میں ابھی تک ایک ایسی فاطمہ بھی موجود نہیں ہے ۔ یہ واقعہ محض ایک خواہش کا اظہار ہو سکتا ہے درحقیقت سچائی نہیں بلکہ دراصل آرزو نگاری ہے ۔ (۵۵)

کسان اور مزدور ترقی پسند ادب کا سب سے پہلا اور بنیادی موضوع محنت کش طبقہ یعنی مزدور اور کسان ہے۔ صنعت و حرفت کی ترقی کی وجہ سے تمدنی اور معاشرتی زندگی میں ایک بڑے انقلاب کا ظہور ہوا۔ سب سے پہلی چیز تو یہ ہوئی کہ دیہات شہروں سے بالکل قریب ہو گئے کسانوں کا ایک حصہ ملوں اور کارخانوں میں محنت اور مزدوری کرنے کے لئے شہر میں اُٹھ آیا۔ اس طرح شہری سماج میں ایک نئے طبقے نے جنم لیا جس کا نام مزدور تھا۔ مزدوروں کے ساتھ ان کے نت نئے مسائل بھی پیدا ہوئے جس سے معاشرے کے دوسرے لوگ متاثر ہوتے رہے۔ یہی نہیں روس میں کسانوں اور مزدوروں کے لئے ہوئے انقلاب نے بھی بڑا اثر کیا۔ اس سے اگر ایک طرف محنت کشوں کو اپنی حیثیت کا احساس ہوا تو دوسری طرف انھیں غلط طور پر (Communism) کہنے والا گروہ بھی چونک پڑا۔ پھر اشتراکیت (Communism) سے متاثر ہو کر کچھ ایسے لوگ بھی پیدا ہوئے جنہوں نے اس طبقہ کو منظم اور متحد کرنے کا بیڑا اٹھایا۔

اردو ادب میں کسانوں کی زندگی کی مصوری تو پریم چند ہی نے شروع کی تھی بلکہ اس میں اس قدر کامیابی حاصل کی تھی کہ ادب کی دنیا میں دوسرے لوگوں کو ان کے اتباع پر مجبور ہونا پڑا - - - - - - - - - - - - - - - - - - - یہ ادب میں ایک نیا موڑ تھا جو بڑی حد تک خوش آئند اور امید افزا دکھائی دیتا تھا۔ ترقی پسند ادیبوں کے لئے بھی محنت کش طبقے کو بحیثیت موضوع کے اختیار کرنا ناگزیر تھا۔ یوں کہ فکر و نظر کے لحاظ سے یہی طبقہ ان کے نئے مستقبل کی در حقیقت بن گیا تھا اور اسی کو براہ راست مخاطب کرکے آمادۂ عمل کرتا تھا۔ لیکن پریم چند کا اس موضوع کو اختیار کرنا ایک فرد واحد کا فعل تھا اور ترقی پسندی ایک تحریک کا نتیجہ تھی، اس لئے یہ موضوع مختلف صوبوں کے ادیبوں نے ایک ہی زمانے میں اختیار کر لیا جس سے نہ صرف یہ کہ مختلف صوبوں کے دیہاتوں میں بسنے والوں کی تمدنی اور معاشرتی زندگی کا اندازہ ہوا بلکہ ایک ہی انداز پر سیاسی اور سماجی شعور ہر جگہ پیدا ہونے اور بڑھنے لگا۔ تھوڑی ہی مدت میں کشمیر، بنگال، پنجاب، یوپی، مدراس اور بمبئی وغیرہ کے محنت کشوں کے رہن سہن اور روزمرہ کے مسائل اور مصائب سے واقفیت کے بدولت ایک جگہ کے لوگوں کو دوسری دور دراز جگہوں کے متعلق وہ کچھ معلوم ہو گیا جو ریل گاڑیوں اور موٹروں کے بدولت پیدا شدہ قربت سے بھی نہ معلوم ہو سکتا تھا۔ پھر یہ بھی حقیقت سامنے آئی کہ اگرچہ مختلف صوبوں کے رہن سہن، بول چال میں بہت فرق ہے۔ مگر ان کی زندگی کے مسائل میں پوری یکانگت ہے اس ہنر نے ترقی پسند ادب کو ہمہ گیر بنانے میں کافی مدد دی ہوتی۔ اگر اس نے اس موضوع کے ساتھ ساتھ اپنے مخاطبین کے جذبات و احساسات کا پورا لحاظ رکھا ہوتا۔

اس مخصوص موضوع کو ادب کی روح و رواں بنانا جس قدر ضروری اور خوش آئند تھا، اسی قدر مشکل اور کٹھن بھی تھا کیونکہ فنکار کے کردار تو مزدور اور کسان تھے۔ مگر نہ تو خود فنکار مزدور یا کسان تھا، نہ اس نے اس طبقہ کی نفسیات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ ان میں سے بیشتر لوگ رئیس زادے یا متوسط طبقہ کے لوگ تھے اور ان میں محنت کش طبقہ سے ان کی ہمدردیاں مارکس اور اس طرح کے دوسرے مفکرین کے مطالعہ کا نتیجہ تھیں۔ روس کے کامیاب انقلاب اور پروپیگنڈا کا اثر تھا، یا پھر کبھی کبھار کا ان سختیوں اور مصائب کا مشاہدہ تھا جن سے محنت کش طبقہ اکثر دوچار رہا ہے ان مسائل اور مصائب سے انھیں براہ راست دوچار ہونے کا موقع نہ ملا تھا نہ ہی ان کے ماحول میں زندگی بسر کرنے کے واردات کا تو صحیح احساس ہو سکتا ہے جس پر وہ گزرتی ہے یہی نہیں اگر کام صرف اتنا ہی ہوتا کہ محض اس قسم کے واقعات کی عکاسی کر دی جائے تو شاید زیادہ کٹھن نہ ہوتا۔ یہاں واقعات کی عکاسی کے بعد ان مصائب سے نجات حاصل کرنے کا صحیح حل بھی دینا تھا۔ اپنا

ہماری رائے میں ترقی پسند ادیبوں کی متعدد نگارشات ایسی بھی ہیں جو مقالہ نگار کی اس رائے کی تردید کر سکتی ہیں۔ ان حضرات نے محنت کشوں کے مخصوص احوال اور نفسیات کو سمجھنے میں جھنڈیاں بہرحال کی ہیں۔ یہ البتہ صحیح ہے کہ ان میں سے بکثرت لوگ ایسے ہیں جو اس طبقے کو روسی اور دوسری غیر زبانوں کے لٹریچر کے ذریعے سمجھتے ہیں اور غیر ملکی کہانیوں کی فضا کو جیل کا توں اُٹھا کے اردو زبان کی فضا میں لا کھڑے کرتے ہیں (ا ن م)

صحیح حل کے لئے کچھ سوچنے کی ضرورت کیا تھی جبکہ پرانے کورس کی طرح ایشیا سے زندگی کے مسائل کے سکنڈ ہینڈ حل سستے داموں مل جاتے اور کام صرف شوکیس میں سجے ہوئے خیالات کے بکے نئے لنڈا بازار کھولنے کا تھا۔ اپنے مسائل کو آپ حل کرنے کی اسپرٹ تو ایک مدت ہو چکی ہے (ا ن م)

ترقی پسند ادب کا جائزہ

نظریہ اور فلسفہ بھی عطا کرنا تھا جو اس طبقے کے ادراک سے باہر تھا۔

جہاں تک محض ماحول نگاری اور واقعات نگاری کا سوال ہے ترقی پسند ادب بڑی حد تک کامیاب ہے یہاں زندگی کشمیر کی جھیلوں کے کنارے برف پوش چوٹیوں کے قریب نظر آتی ہے۔ تو پنجاب کے لہلہاتے ہوئے کھیت اور گنگناتے ہوئے دریا کے آس پاس بھی یوپی کے زرخیز میدان اور خوش نما باغات کے سائے میں بھی، بمبئی کی چال اور کھولی کی گھٹا دینے والی فضا میں بھی لیکن ادب کے تقاضے اس سے کچھ اور آگے بھی ہیں۔ یہاں صرف مزدور کا پچکا ہوا سر، کسان کا جلا ہوا کھلیان ہی اہمیت نہیں رکھتا، اس سے بڑھ کر اہمیت اس ردِ عمل کی، اس احساس کی ہوتی ہے جو ان مواقع پر کردار اور اس کے ساتھ سامعین کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ محض واقعہ کے طور پر تو یہ چیزیں اکثر اخبارات کے کالموں میں بھی آجاتی ہیں اور ہر صاحب بصارت ان کا مطالعہ کر لیتا ہے۔ لیکن بصارت اور بصیرت میں بڑا فرق ہے اور ادب کا کام ہی بصیرت پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اسی بصیرت کے پیدا نہ ہو سکنے کی وجہ سے بقول احمد ندیم قاسمی سارے کا سارا ادب "بے رس ہو کر رہ گیا ہے"

پھر جہاں کہیں یہ بصیرت بہم پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے وہاں حسن اور لطافت کی جگہ پر خشک مقصدیت غالب ہوئی ہے۔ معمولی معمولی دیہاتی کردار ایک فلسفی اور مفکر بن بیٹھتے ہیں۔ جس سے فن کا فطری حسن غارت ہو گیا ہے۔ اور میکانکی انداز غالب آگیا ہے۔ اچھے خاصے چلتے پھرتے کردار خواہ مخواہ کے لئے ساری قدر و منزلت کھو بیٹھے ہیں۔ اس قسم کی بیشتر مثالیں ہم پہلے دے چکے ہیں۔ افسانے اور نظمیں کہیں پروپیگنڈا بن کر رہ گئے ہیں اور کہیں بے مقصد و بے جان رپورتاژ۔

روٹی اور طبقاتی نزاع

ایک دوسرا اہم موضوع روٹی بھی ہے روٹی کی اہمیت سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے۔ زندگی کی ایک بنیادی ضرورت ہے۔ بھوک کی تسکین تو بہر حال ضروری ہے۔ لیکن اس ضرورت کو ترقی پسندوں نے بڑے مبالغے سے پیش کیا ہے۔ مبالغہ یوں کہ بس دو وقت کی روٹیوں کا اگر سہارا ہو جائے تو زندگی کے سارے دکھ دلدر دور ہو جائیں گے۔ ان کے بیشتر کردار بھوکے اور ننگے نظر آتے ہیں جن کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا یہی نظر آتی ہے اس کے ماورا وہ کچھ اور سوچنے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ بلکہ اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ ادب میں بھوکوں اور ننگوں کی اکثریت یوں نظر آتی ہے۔ کہ یہ ہماری قومی زندگی کی ایک حقیقت ہے۔ ملک کی اکثریت کا یہی حال ہے اور یہ تو بہر حال ماننا ہی پڑے گا کہ انسان جب تک بھوکا اور ننگا رہتا ہے۔ کھانے اور کپڑے کے آگے اور کچھ نہیں سوچتا۔ لیکن کیا یہ حقیقت ہے کہ ہمارے مزدور اور کسان پیٹ اور تن سے آگے کچھ بھی نہیں سوچتے؟ اگر نہیں سوچتے تو یہ انھیں سوچنا بھی نہیں چاہئے۔ اس بات سے بہر حال انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہماری قومی زندگی کا تصور مادی نہیں ہے غریب سے غریب انسان بھی بھوک کی حالت میں بسا اوقات بھوک کو بھول بھی جاتا ہے کیونکہ روٹی کی اہمیت اس کے نزدیک بنیادی اور اول درجے پر نہیں ہے۔ اور پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ "اقتصادیت کل زندگی نہیں ہے بلکہ اس کا صرف ایک عنصر ہے چاہے کتنا اہم سہی۔ مگر کسی دوسرے عنصر پر غالب نہیں ہو سکتا۔ یہ سچ ہے کہ بغیر روٹی کے کوئی زیادہ عرصہ تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن پھر وہ صدیوں پرانی مثل بھی ابھی تک بدستور سچ ہے کہ انسان صرف روٹی ہی سے زندہ نہیں رہ سکتا۔[1]"

[1] مجنوں گورکھپوری

[2] اس نظریہ کی تردید تو خود کمیونسٹ تحریک اور ادب میں موجود ہے مزدور اور کسان سالہا سال تک بھوکوں مرتے ہوئے کمیونزم کا سپاہی بن کر رہتا ہے۔ حالانکہ وہ جانتا ہے کہ اس کی مساعی کا پھل نقد انقد اس کو نہیں ملتا ہے اس سے ظاہر ہے کہ زندگی ایسے محرکات بھی رکھتی ہے جو انسان کو بھوکوں مر کر روٹی سے اونچے مقاصد کے لئے جد و جہد کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کی اپنی بھوک اور روٹی سے آگے سوچنا بھی [illegible]

ترقی پسند ادب کا جائزہ

اس ضرورت کو تقاضے بجا بجا کر پیش کرنے اور اس کے احساس کو تیز تر کرنے کا مقصد دراصل محنت کش طبقہ میں بے اطمینانی اور بے چینی پیدا کرنا ہے۔ معاشرتی زندگی میں ہیجان پیدا کرتا ہے جو کمیونسٹ انقلاب کا خاصا ہے۔ حالانکہ مزدور اور کسان کو ان کی ضرورت کا احساس دلا کر اس کے حصول کے اور بھی صلح پسندانہ اور پر امن طریقے ممکن ہیں۔ لیکن آخر اس بات کی کیا ضرورت ہے کہ اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے نفرت کا انتقام، قتل، لوٹ، اور غارت گری کے جذبات کو بیدار کیا جائے۔ اور انہیں غضب بھڑکایا جائے۔ حالانکہ آج تک سرمایہ دار نے مزدور کی بنیادی ضروریات کا بھی کوئی لحاظ نہیں رکھا ہے۔ ان کے حقوق سے چشم پوشی کی ہے۔ اور اکثر ان کے ناموس کا بھی کوئی احترام نہیں کیا ہے۔ اسی وجہ سے تو وہ ظالم، جابر اور انسانیت کش کہلاتے لیکن اگر یہی کچھ جذبات مزدور طبقہ میں بیدار ہو جائیں اور وہ بھی آگ اور خون کی ہولی کھیلنا شروع کر دیں تو انہیں کس طرح سراہا جا سکتا ہے۔ آخر انسانیت اور اخلاق کے کس اصول سے جو مظالم اس کی طرف سے نا روا تھے۔ وہ اسی کے ساتھ روا رکھنے پر درست اور حق بجانب گردانے جا سکتے ہیں۔ اگر یہ چیز انسانیت کے لئے مفید نہیں ہے تو جو لوگ یہ صورت حال پیدا کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں انہیں انسانیت کا مصلح کس طرح کہا جا سکتا ہے۔

پھر نفرت اور انتقام کے شدید ترین جذبات سے جو انقلاب پیدا ہوگا۔ وہ کس حد تک تعمیری ہو سکتا ہے۔ آخر ایک نئی عمارت کی تعمیر کے لئے یہ کب ضروری ہے کہ پرانی عمارت کو ڈائنامیٹ (Dynamite) لگا کر بالکل اڑا دیا جائے۔ تعمیر نو کا نقشہ اگرچہ دوسرا ہے۔ لیکن اس میں مواد (Material) تو وہی لگے گا۔ پھر ادیب تو انسانی روح کا انجینئر ہوتا ہے۔ کیا ایک انجینئر اس طرح کی ناعاقبت اندیشانہ حرکات کے باوجود بھی سراہا جا سکتا ہے۔ نفرت پر تعمیر کی بنیادیں تو نہیں ہو سکتیں۔ یہ تو صرف محبت سے ممکن ہے۔ سماجی زندگی سڑ رہی ہے۔ اس میں پھوڑے اور ناسور بھی ہیں۔ کہیں کہیں کیڑے بھی۔ لیکن اس سڑتے ہوئے جسم کا علاج کس طرح ہو سکتا ہے اس کے لئے تو ایک ماہر سرجن کے حکیمانہ نشتر کی ضرورت ہے، قصاب کے چھرے کی نہیں۔ باقاعدہ جائزہ لینا ہوگا کہ مرہم کی ضرورت کہاں کہاں ہے اور کون کون سے اعضا کاٹ دینا ناگزیر ہے۔ یہ احتیاط اس وقت پیش نظر ہو سکتی ہے جب پیش نظر کام کی ذمہ داریوں کا پورا پورا شعور اور احساس ہو۔ اور دل میں مریض کی محبت ہو۔ اگر یہ جذبات نہیں تو عین ممکن ہے کہ مرض کے ساتھ مریض بھی جان بحق ہو جائے۔ یا اگر بستر علالت سے اٹھے بھی تو اتنی غیر ضروری تراش خراش کے بعد کہ یہ تمیز ہی مشکل ہو جائے کہ یہ مکمل اعضا رکھنے والا انسانی فرد ہے یا کوئی اور جانور۔

ترقی پسند ادب کے طبقاتی شعور اور نزاع کی تلقین کے پردوں میں بھی نفرت اور تخریب پسندی ہے جسے دیکھتے ہوئے یہ یقین ذرا مشکل ہی سے کیا جا سکتا ہے کہ ان تیغ کے لئے یہ کسی دور میں بھی مفید اور صحت مند ثابت ہو سکتا ہے۔ ان جذبات کے ماتحت اشتراکی انقلاب کچھ اس انداز پر آتا ہے۔

آ رہے ہیں جنگ کے بادل وہ لہراتے ہوئے   آگ دامن میں چھپائے خون برساتے ہوئے
کوہ و صحرا میں زمیں سے خون ابلے گا ابھی   رنگ کے بدلے گلوں سے خون ٹپکے گا ابھی
بڑھ رہے ہیں دیکھ وہ مزدور دراتے ہوئے
اک جنوں انگیز لے میں جانے کیا گاتے ہوئے

خون کی بو لے کے جنگل سے ہوائیں آئیں گی   خوں ہی خوں ہوگا نگاہیں جس طرف بھی جائیں گی
جھونپڑوں میں خون، محلوں میں خون، شبستانوں میں خون   دشت میں خون، وادیوں میں خون، بیابانوں میں خون
منتشر ہو جائے گی دنیا کی فضا   دوڑتا ہوگا ہر اک جانب فرشتہ موت کا
سرخ ہوں گے خون کے چھینٹوں سے بام و در تمام   غرق ہوں گے آتشیں ملبوس میں منظر تمام

اس طرح سے گا زمانہ جنگِ خونیں کا سبق
آسمان پہ خاک ہوگی فرش پہ رنگِ شفق
اور اس رنگِ شفق میں با ہزاراں آب و تاب
جگمگائے گا وطن کی حرّیت کا آفتاب

(مجاز "اشتراکی انقلاب")

انقلاب کے اس منظر کو دیکھ کر کون یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کے بعد بھی کچھ باقی رہ جائے گا ۔ جب جھونپڑیوں سے لے کر محلوں تک خون ہو اور فرش سے لے کر عرش تک آگ تو پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ آگ اور خون کے اس ہولناک طوفان کا نشانہ وہی نہیں تھے جو سماجی زندگی کے لئے مہلک ہیں ۔ بظاہر تو یہ بارانِ کرم سبھی کو مستفید کرتا نظر آتا ہے ۔ درحقیقت ترقی پسند ادب اس طرح جن جذبات کو ہوا دیتا ہے ۔ ان کے بھڑک اٹھنے کے بعد صحت مند اور بیمار، ضروری اور غیر ضروری کی تمیز ہی ناممکن ہو جاتی ہے

عورت اور جنس

عورت جس طرح سماجی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی ہے اسی طرح ادب میں بھی اسکی اہمیت ہے ۔ کسی زمانے میں بھی ادب کے لئے یہ بات ناممکن رہی ہے کہ وہ اس "نصفِ انسانیت" کو نظر انداز کر جائے ۔ اس لئے کہ انسان کی اجتماعی زندگی کا یہ ہمیشہ سے ایک ایسا نازک اور کٹھن مسئلہ رہا ہے جس کا حل ہر زمانہ میں مفکرین نے مختلف انداز پر سوچا ہے ۔ ترقی پسند ادب کا یہ موضوع ابتدا ہی سے تنقید اور تبصرے کا بہت بڑا نشانہ رہا ہے ۔ غالباً اس کی بڑی وجہ یہ رہی ہے کہ ابتدا میں ترقی پسندوں کا محاذ نہایت وسیع رہا ہے ۔ ہر وہ شخص جس نے پرانی روایات سے بغاوت کر کے قلم کو کسی انداز پر چلایا ترقی پسند سمجھا گیا ۔ ان میں لذت پرست بھی تھے اور مریضانہ ذہنیت رکھنے والے عیش پسند بھی ۔ یہی نہیں پرانی روایات سے بغاوت کا جذبہ کچھ اس قدر شدید تھا کہ ہندوستان میں عورت کی قدیم معاشرتی حیثیت میں جو اچھائیوں کا پہلو تھا وہ بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا ۔ اس طرح ادب میں جو عورت ابھر کر منظرِ عام پر آئی اس میں اور بازار کی ایک فاحشہ میں کوئی فرق نہ رہ گیا اس بڑھتی ہوئی جنسی مزاجیت (Sexual anarchy) کا ردِ عمل بھی بڑا شدید ہوا اور اس نے ترقی پسندوں کو بڑی حد تک مشکوک اور مذموم بنا دیا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں کم از کم سرکاری طور پر اس بات کا اعلان کرنا پڑا کہ جو ادیب فحش نگاری کرتا ہے وہ ترقی پسند نہیں ہے ۔ ان اعلانات کے باوجود ہمارے سامنے جو ادب ہے ۔ اس میں نمایاں طور پر فحش پسندی کا رجحان اب بھی موجود ہے اور اس رجحان کے مختلف اسباب ہیں ۔

اس کا پہلا بڑا سبب، تو فرائڈ اور مارکس کے وہ نظریات ہیں جن سے تقریباً ہر ترقی پسند متاثر ہے ۔ فرائڈ نے انسان کے نفسیاتی احوال اور سماجی ترتیب کا مرکز روٹی کی بجائے جنس کو قرار دیا ہے ۔ اس کے اپنے خیال میں انسانیت دراصل اس تشنہ کام جنسی جذبے کے لئے ایک علیٰحدہ راستہ نکالنے کی کوشش ہے جو تسکین نہیں پاتا ۔ اور پاک عشق و محبت فطری جنسی جذبے کو اخلاقی اور سماجی تصورات کے ماتحت کچل دینے والی بددیانتی اور خود فریبی کا عکس ہے لہٰذا گناہ اور ثواب، نیکی اور بدی، پاکیزگی اور عفونت، عقلمندی اور حماقت، عظمت اور کمینگی کا کوئی ایسا معیار قائم نہیں کیا جا سکتا جو ہر حالت کے لئے صحیح قرار دیا جا سکے ۔" اس نظریے پر ایمان لانے والوں کے لئے کسی چیز کی کوئی مستقل حیثیت نہیں رہی ۔ وہ تمام چیزیں جنہیں لوگ صدیوں سے مستحسن اور معیوب سمجھتے رہے ہیں اب زیادہ سے زیادہ اپنے مخصوص حالات کے پیش نظر اچھی یا بری قرار دی جا سکتی ہیں ۔ اچھائی یا برائی کا کوئی مستقل معیار باقی نہیں رہا ۔ بلکہ حالات انہیں متعین کرنے لگے ۔ اس نظریے کو نے گروہ ترقی پسندوں میں داخل ہوا اس نے ادب میں عریانیت

ے ترقی پسندوں میں ابتدا تو بڑی بے پناہ جذبۂ تنقید و بغاوت ہر چیز کے خلاف پایا جاتا ہے لیکن کوئی نہ ہوا جو فرائڈ کے خیالات کے خلاف تھوڑی سی معاندانہ تعصب کا ثبوت بھی دیتا آج تو مارکس اور فرائڈ پر تنقیدی نگاہ ڈالنا آزاد خیالی اور ترقی پسندی ہونا چاہئے تھا ۔ یہ سعادت ادب اسلامی کے حصے میں آئی ۔ (ن ص)

ترقی پسند ادب کا جائزہ

شی اور گندگی کا پورا طوفان برپا کر دیا۔ اب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ ترقی پسند نہیں ہیں اور ترقی پسند ادب نے اس سارے سرمائے کو جن میں ان مظاہر کی جھلک ہے Disown کر دیا ہے۔ اس سے اس میں شبہ نہیں کہ سیلاب کا پچھلا زور تو کم ہو گیا ہے لیکن سنہ ۴۹ کی قرار داد انقطاع کی منظوری کے بعد بھی جو ادب ہمارے سامنے آیا ہے اس میں یہ فحاشی اور گندگی بڑی حد تک موجود ہے[1]۔ اس جگہ ایک بڑا مشکل مسئلہ یہ بھی ہے کہ کسے ترقی پسند سمجھا جائے اور کسے نہیں جبکہ پچھلے مصنفین جو جنسی نراجیت پھیلا رہے تھے آج بھی ترقی پسند رسالوں میں اسی طرح جگہ پاتے ہیں اور بدقسمتی سے انجمن نے ابھی تک اپنے مستند ادیبوں کی کوئی فہرست مرتب نہیں کی ہے تاکہ تنقید کا دائرہ انہیں تک محدود رکھا جائے۔

فرائڈ کے معتقدین کے علاوہ مارکس کے مومنین نے بھی اس رجحان کی خاصی پرورش کی ہے۔ مارکس کے نقطہ نظر سے ہر دور کا معاشی نظام اس دور کے سماجی نظام کو متعین کرتا ہے۔ اس کے پیش نظر بھی انسانی صفات اور اخلاق کی بلندی اور پستی کی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے۔ بلکہ ہر دور کا معاشی نظام اپنی ضروریات اور تقاضوں کے لحاظ سے اپنے زمانے کی اخلاقی قدروں کو جنم دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اخلاقی قدریں، ماضی کی اقدار سے مختلف اور متضاد بھی ہو سکتی ہیں۔ اس طرح انسانی اخلاق کو پرکھنے اور جانچنے کا کوئی مستقل معیار نہ رہا۔

زندگی کے خالص مادی تصور کے ساتھ ساتھ ان تصورات نے عملی دنیا میں انسان کو بڑی ڈھیل دے دی۔ ایک طرف ڈارون Darwin ارتقا کی ایک نئی داستان مرتب کر چکا تھا جس کی رو سے دنیا کی حیثیت ایک رزم گاہ (War field) سے مختلف نہ رہی اور انسان اپنی بقا اور ترقی کے لئے ہر قسم کے خود غرضانہ افعال کے کرنے کا حقدار ہو گیا۔ وہ نہ تو اشرف المخلوقات رہا اور نہ اس کی ایسی کوئی ازلی یا ابدی حقیقت باقی رہی جو اسے دوسرے جانداروں سے ممیز اور ممتاز کرتی۔ اس کا وہ یقین اور اعتقاد جو زندگی کی مسلّم اقدار پر تھا، بڑی حد تک چھن گیا۔ سائنس نے حقیقت کو مادہ بنا کر پیش کر دیا۔ آئن سٹائن کے آتے آتے مادہ کا وہ تصور بھی ختم ہو گیا جس کی بدولت اسمیں خود نشو و نما اور حرکت کی طاقت نہ تھی اب یہ متحرک بالذات تھا یعنی ازلی بھی تھا یعنی ابدی بھی تھا۔ اس طرح یقین اور پرانے مسلمات پر ایمان کی آخری بنیاد بھی ڈھ گئی۔ دوسری طرف ہیگل نے نشو و نما کا قانون تضاد کو قرار دیا جس کی رو سے متضاد فلسفے اور خیالات جب آپس میں ٹکراتے ہیں تو ان کے ٹکراؤ سے ایک نئی قوت وجود میں آتی ہے جسمیں پچھلی طاقت کی ساری خوبیاں موجود ہوتی ہیں اس طرح ہر دور فکر اپنے ماضی کا نچوڑ ہوتا ہے۔ مارکس نے مادے کے متحرک بالذات ہونے کی تصدیق کی اور بنیادی اہمیت داخلی جذبات و احساسات کے بجائے خارجی حالات کو دیدی اور سارے علوم و فنون کو تاریخ و عمرانیات سے متعلق کر دیا۔

نظریات کے اس تغیر و تبدل اور تضادات نے مغرب میں زبردست فکری اور ذہنی انتشار پیدا کیا جو کچھ عرصہ کے بعد مشرق میں بھی نمودار ہوا ترقی پسند ادیب انھیں متضاد نظریات سے دوچار نظر آتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مغربی ادب کا بھی بڑا اثر پڑا جس کا خاصا بڑا حصہ (کم از کم بیسویں صدی کا) انھیں نظریات سے متاثر تھا۔ پھر اس پر بڑا اثر جنگ عظیم (Great war) کے بعد کے پیدا شدہ مسائل کا بھی ہے۔ جس سے یورپ کی سماجی اور معاشرتی زندگی کا پورا نظام ہل گیا۔ پرانے مسلمات سے بغاوت کا سلسلہ تو نشاۃ جدیدہ کے بعد ہی سے شروع ہو گیا تھا لیکن ان نظریات کی کشمکش اور اس سے پیدا شدہ انتشار، پھر جنگ کے بعد کا معاشی بحران، معاشرتی ہیجان وغیرہ ان تمام عوامل نے ملکر نہ صرف مغربی ادب کو بلکہ مغربی معاشرے کو ادھیڑ ڈالا۔ اور زندگی غیر متوازن اور گمراہ کن راستوں پر چل نکلی۔ اس کا اثر لارنس اور پراؤسٹ اور اسی قبیل کے دوسرے ادیبوں کی تخلیقات میں نظر آتا ہے۔

یہی مختلف متضاد اور مہلک تصورات تھے جنہیں ترقی پسند ادب نے اپنایا۔ ترقی پسند ادب کے ساتھ اس کی اپنی غلامی کی تاریخ

[1] فحاشی اور جنسی گندگی جدید ادب کے مزاج میں گندھی ہوئی ہے۔ ہزار اہتمام تقویٰ کے باوجود چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ (ا۔ص)

گئی تھی جس میں انہوں نے ہندوستان کے دوسرے لوگوں کی طرح مغرب سے ہر محاذ پر شکست کھا کر ایک منفعل ذہنیت کے ساتھ مغرب سے آئی ہوئی ہر چیز کو بلا کسی تنقید و تبصرہ کے قبول کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان تصورات و نظریات کے طفیل ہی ترقی پسند ادب نے جس عورت کو جنم دیا وہ یقیناً ہماری سماجی زندگی کی صحیح نمائندہ نہ تھی۔ کیوں کہ پورے ترقی پسند ادب پر نظر ڈالنے سے مشکل ہی سے کوئی عورت ایسی نظر آتی ہے جو فلرٹ نہ ہو۔ علمی تصور زندگی کی وجہ سے یہاں محبت کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ یہاں محبت کا مقصد محض جنسی بھوک کی آسودگی ہوتا ہے اور اس آسودگی کے لئے وہ عام طور پر کسی بھی اخلاقی ضابطے کی پابند نہیں نظر آتی اور یہ تسکین ہر اس مرد سے حاصل کر سکتی ہے جس کا کوئی بھی انداز اسے پسند آ جائے۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ جنسی بے راہروی ہماری معاشرتی زندگی کی حقیقت ہے؟ کیا ہمارے معاشرے کی بیشتر عورتیں اسی نہج پر زندگی بسر کرتی ہیں جس پر انہیں ترقی پسند ادب نے دکھایا ہے؟ اور اگر بالفرض یہ ہے تو کیا یہ سماجی زندگی کے لئے صحت مند ہے؟ کیا اس طرح کی جنسی مزاجیت سے کوئی صحت مند سماج وجود میں آ سکتا ہے؟ مغرب کے وہ ممالک جو اس تجربے سے گزر کر اس کی آخری منازل طے کر رہے ہیں، اس بے راہروی سے خود پناہ مانگتے ہیں لیکن بلا اس حد تک چڑھ چکا ہے کہ قابو حاصل نہیں ہوتا۔ درحقیقت ادیب کی ذمہ داریاں تو اس کے بالکل برعکس تھیں لیکن ترقی پسندوں کو اس کا احساس نہیں ہوا۔ اس جنسی لذت پرستی کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ اس سے سستی مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ اور بعض افسانوں میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فن کے نقائص کو چھپانے کے لئے عریانیت کو رشوت[1] کے طور پر پیش کر دیا گیا ہے تاکہ قاری کی توجہ منحرف ہو جائے۔ اس عریانیت اور لذت پرستی کو عام کرنے میں سب سے زیادہ ممتاز حیثیت سعادت حسن منٹو کی ہے جن کا شاید ہی کوئی افسانہ ایسا ہو جس میں اس رجحان کا اظہار نہ ہوا ہو۔ پہلے منٹو کا افسانہ "؟" لیجئے۔ یہ ایک ایسا افسانہ ہے جس کا عنوان ابھی مصنف مقرر نہیں کر سکا۔ اور ناشر نے سوالیہ نشان عنوان کی جگہ پر دیا ہے تاکہ یہ سوال موجود رہے اور اس کے جواب کا احساس باقی رہے۔ یہ افسانہ فسادات کے زمانے کا ہے۔ اس افسانے کا کردار "س" ایک آپ بیتی بیان کرتا ہے۔ کہ ایک دن بارش ہو رہی تھی۔ موسم اچھا تھا یکایک اسے خیال آیا کہ وہ بھی کوئی لڑکی اٹھا کر لائے۔ چنانچہ وہ نکل پڑتا ہے اور سول لائنز (Civil Lines) کا رخ کرتا ہے۔ یکایک سامنے سے ایک موٹر نظر آتی ہے "س" اسے روک لیتا ہے اسے ایک عورت چلا رہی تھی "س" عورت کو قابو میں کر کے اسی موٹر سے اپنے گھر لاتا ہے۔ اس سے اختلاط کی کوشش کرتا ہے، کافی دیر تک جدوجہد ہوتی ہے بالآخر وہ راضی ہو جاتی ہے۔ اتنے میں لڑکا باہر سے دروازہ کھٹکھٹا کر لالٹین دیتا ہے روشنی میں یہ اس کا چہرہ دیکھ کر مایوس ہو جاتا ہے وہ انتہائی بدصورت تھی یہ اسے یونہی چھوڑ دیتا ہے وہ کار میں بیٹھ کر چلی جاتی ہے۔ اس واقعہ کو سنا کر افسانہ نگار اس عورت کے متعلق بتاتا ہے کہ اسی دن جب وہ واپس جا رہی تھی تو اس کی کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا جس میں وہ مر گئی۔ اور وہ مشہور آرٹسٹ "م" تھی جسے مردوں سے بڑی نفرت تھی۔ اور اس طرح "س" دو عورتوں کا قاتل ہے۔ ایک وہ جو اس کے دل ایوان خانہ میں پہلی مرتبہ "م" کے قالب سے نکلی تھی اور دوسری وہ جو کار سے ٹکرا کر مر گئی۔

یہ تھی کہانی۔ اگر محض کہانی ہی کو دیکھا جائے تو سوائے عشرت گری اور بالائی بیت کی معصومی کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ فسادات کے عالم میں اس قسم کے واقعات پیش آئے ہوں گے لیکن معاشرے کے ان گھناؤنے واقعات کو سرمایۂ تجارت بنانا کیونکر درست ہے؟ ان کی عکاسی تو اسی صورت میں حق بجانب ہو سکتی ہے جب ان کے اندر کوئی افادیت کا پہلو بھی ہو۔ پھر اس افسانے کی زبان بھی اتنی ہی فحش ہے جتنا کہ کہانی کا پلاٹ۔ ملاحظہ کیجئے:-

[1] - مقالہ نگار نے بڑی اہم حقیقت کو پکڑا ہے۔ جنسی اشتعال اور عفونیت کے ذریعہ ترقی پسند ادیب قاری کے دل و دماغ پر ڈاکہ ڈالنے کے لئے بالکل وہی حرکت کرتا ہے جیسے ایک اچکا کسی شکار کو پہلے شراب یا بھنگ پلا کر بدمست کرے اور پھر اس کی جیب پر ہاتھ ڈالے۔ جنسی ہیجان کی سطح پر لانے کے بعد یہ حضرات اپنے شکار کے ایمان، عقائد، نظریات اور اخلاقی قدروں پر کھل کر ہاتھ صاف کر جاتے ہیں۔ (ادارہ)

اشاعت

ترقی پسند ادب کا جائزہ

"اس نے سپر سسکیاں لینی شروع کر دیں شاید اس کا پیٹ ہی تھا جس پر میرا ہاتھ پڑا اور وہ دُہری ہو گئی۔ میں نے جیسا بھی بن پڑا اس کے رین کوٹ Rain Coat کے بٹن کھولنے شروع کر دیئے۔ مومی کپڑا بھی کچھ عجیب ہوتا ہے جیسے بوڑھے گوشت میں چکنی چکنی جھریاں پڑی ہوں وہ دبلی رہی اور ادھر اُدھر قیٹ کر مزاحمت کرتی رہی۔ میں نے پورے بٹن کھول دیئے اور اسی دوران میں معلوم ہوا کہ وہ ساڑھی پہنے تھی ـ ـ ـ ـ ـ ـ میں نے کہا یہ تو ٹھیک رہا۔ چنانچہ میں نے ذرا معاملہ دیکھا۔ خاصی سڈول پنڈلی تھی جس کے ساتھ میرا ہاتھ جا لگا[۱] وغیرہ وغیرہ"

آخر اس سے سوائے حیوانیانہ لذت پرستی کے اور کیا ظاہر ہوتا ہے۔

منٹو ہی کا ایک دوسرا افسانہ "موذیل" لیجئے۔ اس میں موذیل نامی ایک یہودی لڑکی ہے جو ترلوچن کے پڑوس کے فلیٹ میں رہتی ہے کوئی سے زیادہ افسانہ ترلوچن اور موذیل کے مستغرقانہ عشق کی روداد ہے جس کے بعد بڑے ہی ڈرامائی انداز میں یکایک موذیل ترلوچن کی ایک محبوبہ کو بچانے کے لئے فسادات کے عین ہنگامے میں دلیرانہ قدم اٹھاتی ہے اور جان دے دیتی ہے افسانے کے فنی نقائص سے قطع نظر ہمیں موذیل کے کردار میں غیر متوقع موڑ کے بعد اس سے ہمدردی ضرور پیدا ہو جاتی ہے لیکن یہ سارا افسانہ سطحی لذت پرستی اور بے حیائی کا مظہر ہے اور پڑھنے والا ہر لمحہ اس بات کا منتظر رہتا ہے کہ ترلوچن جو موذیل کے بھاری بھرکم بدن پر پیپل کی طرح پھیل جاتا ہے کب قدم آگے بڑھاتا ہے پھر موذیل کے کردار کا یہ پہلو عجیب ہے کہ وہ انڈرویئر Underwear بھی نہیں پہنتی اور جب کبھی اسے ناک پونچھنا ہوتا ہے تو بڑے اطمینان سے Skirt اٹھا کر پونچھ لیتی ہے اور ترلوچن بے چارہ شرما جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جگہ جگہ موذیل کی مضبوط چھاتیوں کے دھڑکنے اور گٹھی گٹھی رانوں کے پھیلنے کو بڑا مزا لے لے کر بیان کیا ہے۔

یہ وہی منٹو صاحب ہیں جو فرماتے ہیں:۔

"سمجھ لیجئے کہ مجھ میں جو غیر فطری حرکات (Perversion) مجھ میں جو برائیاں ہیں وہ اس عہد کی برائیاں ہیں[۲]"

یہ بھی ایک عجیب و غریب ذہنیت ہے ادیب کی ذہنیت میں اگر جنسی یا جنس پرستی ہو تو یہ کب ضروری ہے کہ یہی چیز معاشرے میں بھی ہو۔ یہاں ہمیں ممتاز حسین کی اس رائے سے بالکل اتفاق ہے کہ:۔

منٹو سماج کے گرے پڑے سماجی رشتوں سے کٹے ہوئے آزاد منش لفنگوں، بھڑووں اور دلالوں کی زندگی سے متاثر ہے منٹو کو یہ نہیں معلوم کہ حقیقت نگاری کسے کہتے ہیں وہ گورکی، موپاساں، بالزاک، زولا، سمرسٹ ماہم سب کو پڑھتا ہے لیکن یہ نہیں سمجھ پاتا کہ ان کے آرٹ میں کیا فرق ہے۔ وہ اپنے ملکِ عزیز کے سیاسی اور معاشی کردار سے واقف نہیں (نقد حیات) صفحہ ۲۰۹

• • •

[۱] اگر یہ حقیقت نگاری ہے تو ارشاد ہو کہ معاشرے میں ایسے الزکھے واقعات کا تناسب کیا ہے۔ کہ ان کا نوٹس لیا گیا۔ اور اگر یہ اصلاح و انقلاب کی دعوت ہے تو فرمایا جائے کہ اس سے کس شے کی اصلاح ہوگی اور کس طریق سے! (ان ص)

[۲] کیا شاندار تکنیک ہے اپنی خباثت کی ہم گندے اس لئے ہیں کہ سارا جہاں ہی درحقیقت اسی طرح گندہ ہے۔ حالانکہ سارا جہاں اتنا خبیث ہرگز نہیں ہے۔ (ان ص)

ترقی پسند ادب کا جائزہ

مغربی ادیبوں کی محض اندھی نقالی سے ادب نہیں پیدا ہوتا ۔

اسی طرح ہاجرہ مسرور کا افسانہ "چھپے چوری" ہے جس میں ایک لڑکی کی اپنے نوکر سے معاشقے کی داستان ہے جس کا انجام یوں ہے کہ ایک دوپہر میں جب وہ محبوب کی گود میں بیٹھکر اسے پان کھلا رہی ہوتی ہے ۔ تو "دادی اماں" آجاتی ہیں اور اس کا کان پکڑ کر گھسیٹ جاتی ہیں ۔ یہ افسانہ کیوں لکھا گیا اور اس کا سوائے اس کے اور کیا مقصد ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے ایک لڑکی کو لڑکے کی گود میں ڈال کر دونوں نوعات احساسات سے مزا لیا جائے ۔

احمد ندیم قاسمی کا افسانہ "کنجری" بھی کچھ ایسا ہی ہے جس میں ایک لڑکی ہے جس کا باپ اور دادی دن گن کر کاٹ رہے ہیں کہ کب لڑکی جوان ہو اور اسے پیشے پر لگائیں ۔ طوائفیں اپنی لڑکیوں کو تو بحیثیت جانشین کے پیشے پر لگاتی ہی ہیں ۔ لیکن یہاں لڑکی کا باپ بھی موجود ہے اور اسکی اٹھان ہندوستان کی روایات کے لئے بالکل اجنبی ہے ۔

"مولو" میں آغا بابر ایک ایسی لڑکی پیش کرتے ہیں جسے مردوں کی نفسیات میں بڑا درک ہے اور بالآخر جبکہ اُن کے گھر میں سپیدی ہو رہی ہے اور وہ ایک مزدور کے جذبات کو بھڑکا کر اس کا نفسیاتی مطالعہ فرما رہی تھیں تو مزدور خواہشات کے ہیجانات کی تاب نہ لاکر موصوفہ کی عصمت لوٹ لیتا ہے اور اس طرح نفسیاتی مطالعہ مکمل ہو جاتا ہے ۔ یہ کہانی بالکل سستی قسم کی ہے جیسی اکثر ہمارے ملک کے فلمی رسالوں از قسم "خنگاری"، "بیچ" وغیرہ میں چھپا کرتی ہیں اور ان کا مقصد محض جنس بیچکر پیسہ کمانا ہوتا ہے ۔

اعظم ادیب نے "تائی سہاتاں" کا کردار تو بہت بلند پیش کیا ہے ۔ لیکن "تائی سہاتاں" کا اپنے شوہر کی داشتہ کو اپنے گھر میں جگہ دینا اور طرح زناکاری کا انسداد کر دینا ہمارے مزدور طبقہ کی سماجی زندگی کا بالکل غلط تصور پیش کرتا ہے ۔

اسی طرح شوکت صدیقی، انور عظیم اور ممتاز مفتی کے افسانے "پتھر میں آگ"، "لڑھکتی چٹان" اور "احمق" ہیں جو پلاٹ، کردار نگاری اور بے لحاظ سے کوئی اہمیت نہیں رکھتے ۔ "پتھر میں آگ" ایک شاعر کی آوارہ گردی کی جھلک دکھاتی ہے ۔ "لڑھکتی چٹان" میں شوہر کا بیوی کے دوسرے سے ناجائز تعلق کو دریافت کر لینے کے بعد نہایت پُرامن طریقے پر سمجھوتہ کر لینا ہندوستان کے متوسط طبقے کے کلچر کی ایک عجیب و غریب چیز ہے ان شرائط پر سمجھوتوں کی حکایات یا تو مغرب میں سننے میں آتی تھیں یا پھر رئیس اور اونچے طبقے کے لوگوں کے متعلق لیکن ہمارے ملک کے طبقہ میں اس قسم کی صلح ایک عجوبہ ہے ۔

یہ سوقیانہ اور بازاری مذاق ممکن ہے کہ بازاری اور پھر قسم کے لوگوں میں مقبولیت حاصل کرے لیکن پڑھے لکھے اور سنجیدہ طبقے میں پسندیدہ نہیں ہو سکتا ۔ اور پھر نہ تو اس سے معاشرے کی تنظیم ہی کسی صحت مند اصول پر ممکن ہے اور نہ قومی اخلاق و کردار ہی کی جاندار تعمیر ہو سکتی ہے ۔ ناشائستہ اور گندی تصویروں سے تکدر اور انتشار تو پیدا ہو سکتا ہے لیکن کوئی قدر آفریں جذبہ نہیں جگایا جا سکتا ۔

گورکی کہتا ہے :-

> "صاحبو اگر آپ کو متلی ہو رہی ہے تو اس حالت میں سڑک پر جانے کی ضرورت نہیں ہے وہاں
> تندرست انسان ہیں اور بچے چل پھر رہے ہیں اور نوجوان آ جا رہے ہیں وہ آپ کو قے کرتے دیکھیں گے
> اور ان کے لئے مضر ثابت ہو گا"۔

• • •

، مقالہ نگار شاید جاننے بھول گئے کہ ان کہانیوں میں سے بعض کے اندر کوئی نہ کوئی مغربی کہانی ہضم کی گئی ہے ہمارے ایک رفیق نے ایسی چند کہانیاں کر لی ہیں وہ اپنا کام مکمل کر لیں تو انشاء اللہ بعض اہم حقیقتیں سامنے آ سکیں گی ۔ (ناشر)

ترقی پسند ادب کا جائزہ

ترقی پسند ادیبوں کے لئے یہ مشورہ بالکل درست ہوگا اس لئے کہ اگر ادب کے ذریعہ سماج کی تطہیر ان سے ممکن نہیں ہے تو کم از کم کثافت اور عفونت تو نہ پیدا کریں ۔

نظموں اور غزلوں پر اس وبا کا اثر ذرا کم ہے پھر بھی کہیں کہیں منظر کشی کی داد دینی ہی پڑتی ہے ۔ سید مطلبی صاحب " اس ساون میں اس ساون کی یاد" کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں ؎

جوانی کا عالم ترنگیں امنگیں — کئی گر پڑیں اور کئی کود جائیں ۔
وہ پانی میں لہریں وہ لہروں پہ آنچل — وہ ڈبکی وہ غوطے کہ مل ڈوب جائیں
چمٹ جائے کسی ابھر آئیں چھتیاں — وہ کندن بدن وہ جوانی کی بانہیں
اتاریں جو کپڑے کنارے پہ پھینکیں — وہ یوں پوچھے اپنا پیچھا چھڑائیں
نہنگ اب نہیں سب وہ ننگی نظر تھی — یا اتریں ہیں آکاش سے اپسرائیں
اندھیرا پڑے سے یوں ہی گھر میں وہ داخل — کہ آتی ہیں بھیگی ہوئی فاختائیں

جو چلے ہیں یہ بھول جاؤں نظارے
مہینوں سے ساون کے کیسے نہ آئیں !

سویرا ۱۱

یہ ہے ماضی کے ساون کا نچوڑ جس کے بغیر اب ساون کی تمنا بھی نہیں ۔

کیفی اعظمی کے لئے ٹرنک کال پر صنفِ نازک کی آواز ہی بڑا ستم کر جاتی ہے اور اب چاہتے ہیں کہ انہیں روزانہ کوئی اسی طرح ٹیلیفون ہی کیا کرے ۔ چلئے زندگی کی یہ بھی ایک تمنا بن گئی ؎

آج اس نے کیا تھا فون مجھے
اسکی آواز سن رہا تھا میں
نرم لہجے مہکتی سانسوں کے
پھول ہنس ہنس کے چن رہا تھا میں

..

آ رہا تھا ہوا کی لہروں پر
لب نازک کی لرزشوں کا پیام
میں نے بے اختیار چوم لیا
چھلکا چھلکا ہوا سا رنگین جام
روز اس کا پیام آئے گا
روز مژدہ نیا سنائے گی
فون کرنے کو نازنین کوئی
جب پڑوسی کے گھر پہ جائے گی

بہترین ادب ۱۹۴۹ء

ن م راشد کے تو انداز ہی نرالے ہیں ۔ ایک ایرانی چند اجنبی لوگوں سے ملاقات اوّل میں یوں گفتگو شروع کرتا ہے ؎

میں اک کارگر ہوں
سواد کتابی کی لذت سے بےخبر ہوں

. . . . . .

وہ خوش بخت ہوں
جس کی دو بیویاں ہیں —
جوان سالی و رعنا
اور ان میں، خیابان شاہ پور کی رہنے والی
مری ہژدہ سالہ زلیخا
جمیل و جوان تر ہے
اصفہان کی شمع رخشندہ گوہر ملک ہے

— — — — — — — — — اور پھر
تم اگر آج کی شب
زلیخا کے گھر میں
پنیر اور روٹی میرے ساتھ کھاؤ — مگر ہاں یہ سن لو!
کہ تم نے، تمہارے کسی آشنا نے
جو قربان، میری زلیخا کو فاسد نگاہوں سے دیکھا
تو یہ تیمچہ اس کے ناپاک سینے میں بے شک اتر جائے گا۔
(اور پھر رات گزرنے کے بعد)
تو دروازہ آیا۔ ہنسا اور کہنے لگا "تم بڑے سنگدل ہو۔
تمہارا یہ ساتھی تو کل شب وہیں سو گیا تھا"

— — — — ....

تو اس پر رہی سب کے دل میں یہ الجھن
کہ ساتھی کے ٹھکانہ کا ما نہ جانیں

(بہترین ادب ۱۹۴۹ء)

گویا ساتھی نے میزبان کی معصوم بیوی کے سامنے دام ڈال کر جو کچھ حاصل کیا تھا وہ کوئی شاہکار ہے ایک مہمان کا میزبان کے خلوص[1] سے فائدہ

[1] - غالباً یہاں مقالہ نگار نے ٹھوکر کھائی ہے۔ ن م راشد کی ابہام پسندی کے پردوں سے اگر وہ گزر سکتے تو نظم کا مدعا ان کو یہ معلوم ہوتا کہ دو بیویوں کا شوہر جو ہشاش بشاش رہتا ہے وہ دراصل اس نرالے ڈھنگ سے یہ کاروبار کرتا ہے اگر میری رائے غلط نہ ہو تو پھر یہاں عارکاری نہیں ہے۔ (ن ص)

١

اٹھا کر اس طرح کی حرکات کرنا اور پھر اس کے دوستوں کا کوئی کارنامہ سمجھنا سوائے نظریاتی ذلالت کے اور کیا ہو سکتا ہے۔

آزادی

تقسیم ملک کے بعد بیرونی سامراج کی رخصتی کے نتیجہ پر آزادی بھی ادب کا ایک موضوع بن گئی۔ یہ موضوع اگرچہ تقسیم سے پہلے بھی موجود تھا۔ لیکن اس وقت کی تخلیقات میں آزادی کی تمنا اور اس کے حصول کی جدوجہد کی ترغیب ہے۔ تقسیم کے بعد سوال آزادی کے خیر مقدم کا تھا۔ یہ تو بہرحال ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ جمہور جس آزادی کا خواب دیکھ رہے تھے اس کی تعبیر نہ ہو سکی اور موجودہ آزادی بڑی حد تک فریب آزادی ثابت ہوئی اور اس کا اندازہ اہلِ بصیرت کو پہلے سے تھا۔ فسادات اور پھر دونوں ممالک کے داخلی حالات کچھ اس طرح کے ہو گئے کہ مایوسی ناگزیر تھی۔ مہاجرین کی افسوسناک حالت، حکومتوں میں خلوص اور دیانتداری کا فقدان۔ ہر طرف رشوت و خیانت۔ اور اقربا نوازی خود غرضی، لوٹ کھسوٹ کا دور دورہ، یہ ساری چیزیں بڑی افسوسناک اور مایوس کن تھیں۔ پھر سیاسی آزادی کے طفیل چند ہم وطنوں کو اقتدار تو حاصل ہو گیا تھا۔ مگر ملک کے اہم مسائل، معاشیات و اقتصادیات اور خارجہ پالیسی سب پر ابھی تک بیرونی سامراج کا اثر بدستور محسوس ہو رہا تھا۔ ابتدا میں تو بہرحال اس فریب اور دھوکے کو اکثر لوگ نہ سمجھ سکے اور سب کی توقعات یہی تھیں کہ حالات جلد از جلد بہتر ہو جائیں گے، لیکن بعد میں حکومت کا عوام کے ساتھ برتاؤ، قانون سازی کا رجحان۔ شہری آزادیوں کا قتلِ عام ان تمام چیزوں نے فضا کو بالکل تاریک کر دیا۔ ترقی پسند ادیب نے بھی ابتدا وہی فریب کھایا۔ چنانچہ احمد ندیم قاسمی ہندوستان کے ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس منعقدہ اپریل ۱۹۴۹ء کو اپنا پیغام بھیجتے ہوئے کہتے ہیں :-

> "اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان اور پاکستان میں ایک گپ اڑائی گئی کہ فرنگی جا چکا ہے ۔۔۔۔ سب نے یہی سمجھا ہم نے بھی یہی سمجھا۔ یہ گپ کچھ ایسی چکا چوند قسم کی تھی کہ ہماری سیاسی بصیرت اور بصارت کا چندھیا جانا کچھ ایسی تعجب انگیز بات نہ تھی۔ لیکن بہت تھوڑی مدت کے اندر ہم سب نے دیکھا کہ ہمارے حکمرانوں کے قلم ایک آسیبی اشارے سے حرکت کرتے ہیں"
>
> (نیا پرچم ۵)

اس تاثر کے تحت ترقی پسند ادب میں بعض بڑی اچھی نظمیں نظر آتی ہیں۔ چنانچہ فیض احمد فیض اپنی ایک نظم میں نام نہاد جمہوریت کو اس طرح بے نقاب کرتے ہیں ؎

یہ داغ داغ اُجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں۔
جگر کی آگ نظر کی امنگ دل کی جلن
کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کہاں سے آئی نگارِ صبا کدھر کو گئی
ابھی چراغِ سرِ رہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانیِ شب میں کمی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی۔

سویرا ۸/۷

ساحر لدھیانوی کا انداز بھی کچھ ایسا ہی ہے ؎

یہ جشن جشنِ مسرت نہیں تماشا ہے
نئے لباس میں نکلا ہے رہزنی کا جلوس
ہزار شمعِ اخوت بجھا کے چمکے ہیں
یہ تیرگی کے اُبھارے ہوئے حسین فانوس (سویرا ۴۷ء)

پندرہ اگست آزادی کی یاد تازہ کرتا ہے۔ لیکن ۱۹۴۸ء میں ماضی کی یہ یاد کتنی دردناک تھی۔ اختر الایمان اپنی نظم "پندرہ اگست" میں کہتے ہیں۔

وہی کس مپرسی وہی بے حسی آج بھی ہر طرف کیوں ہے طاری
مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے یہ میری محنت کا حاصل نہیں ہے
ابھی تو وہی رنگِ محفل وہی چہرے ہر طرف زخم خوردہ سے انسان
جہاں تم مجھے لے کے آئے ہو یہ وادی رنگ بھی میری منزل نہیں ہے۔
شہیدِ دل کا خون اس حسینہ کے چہرے کا غازہ نہیں ہے
جسے تم اٹھائے لئے جا رہے ہو یہ اندھیری شب کا جنازہ نہیں ہے (نقوش ۴۸ء)

احمد ندیم قاسمی آزادی کی جیکا چوند میں اس کا خیر مقدم تو کرتے ہیں اور اس خیر مقدم میں آزادی کے دامن میں پڑی ہوئی لاشوں اور عصمتوں کا شکوہ بھی پیش کرتے ہیں ؎

کلی چٹک بھی چلی پھول رنگ لا بھی چکا
وہ رنگ جس کو جہاں نے لہو کا نام دیا
مہیب رات شفق میں نہا کے آئی ہے
مہیب رات کا غازہ تھا اگر غازہ
مہیب رات کا انجام بھی جنائی ہے
بُجھا بُجھا سا نہ دیکھو شہاب پاروں کو
یہ اک عجیب سا احساس کبریائی ہے
جو آفتاب دیا ہم کو لالہ فام دیا (سویرا ۴۸ء)

سلام مچھلی شہری کی کیفیت دیکھئے [illegible] آزادی کے بعد یہ نظم لکھتے ہیں ؎

[illegible] کی حدت سے تپتے چمن
[illegible] کفن
[illegible] زندگی پیار تا ہے۔
[illegible]
[illegible] ہے (سویرا ۴۸ء)

اسی طرح کی بہتیری نظمیں ہیں جن میں اس قسم کے تاثرات پائے جاتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ترقی پسند ادیب نے عمداً ایک چیز سے پوشی بھی کی ہے ۔ اس حقیقت کے ادراک کے باوجود کہ موجودہ آزادی محض ایک سراب و فریب ثابت ہوئی کم از کم اس کا یہ پہلو خوش آئند تھا بیرونی آقاؤں کا سیاسی اقتدار اٹھ گیا اور اب ملک کی نوعیت اور فضا ایسی ہوگئی تھی کہ اس میں جمہوری نظام کا مکمل قیام نسبتاً آسان ہے یہی نہیں اس م نہاد آزادی سے بھی کم از کم غیر ملکی غلامی کی زنجیر تو ٹوٹ گئی اور آزاد ممالک کی صف میں جگہ نصیب ہوئی جو انفرادی اور اجتماعی دونوں صورتوں کے لئے باعث فخر ہے ۔ اس مسرت آگیں کیفیت کا احساس ترقی پسند ادب میں کہیں بھی نہیں ملتا ۔ حالانکہ حقیقت کے اس پہلو سے چشم پوشی نہ صرف چشم پوشی ہے بلکہ ایک بڑی حد تک غداری کے مترادف ہے ۔

فسادات

آزادی کے ساتھ ساتھ فسادات بھی ہوئے اور اس انداز پر ہوئے کہ جبینِ آزادی ہمیشہ کے لئے داغدار، مجروح اور بھیانک ہو کر رہ گئی ۔ ہزاروں عصمتوں کے شیشے چکنا چور ہوئے، لاکھوں انسانوں کا خون بہا اور پھر اخلاقی قدریں برباد ہوگئیں ۔ ترقی پسند ادیب بھی اس حالت کی شدت سے متاثر ہوا اور بسا اوقات چیخ پڑا ۔ تقریباً ہر ادیب نے فسادات کے کسی نہ کسی پہلو پر روشنی ڈالی ہے ۔ لیکن جیسا کہ پہلے دی ہوئی مثالوں اندازہ ہوا ہوگا ان میں سے بیشتر کے افسانے اور نظمیں محض اخباری رپورٹ بن کر رہ گئے ۔ حالانکہ موضوع بڑا وسیع تھا اور مواد کی کوئی کمی نہ تھی چند نے تو اس موضوع کو بھی جنسِ تجارت ہی سمجھ کر اپنایا اور فسادات میں عورتوں کی عصمت دری کے واقعات کو اس انداز سے پیش کیا جیسے یہ بھی کوئی بڑا کارنامہ ہے پہ فخر کیا جاسکتا ہے ۔ ایک دوسری اہم چیز یہ ہے کہ بیشتر افسانے تو توازن کا ترازو ہاتھ میں لئے بغیر لکھے گئے اور اس وجہ سے کچھ غیر فطری ہو ہیں ۔ پھر فسادات کے متعلق جتنے بھی افسانے ہیں سب میں ان کا ایک ہی رخ دکھایا گیا ہے یعنی وحشت، بربریت اور درندگی ! حالانکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ درندگی اور حیوانیت کے اس مظاہرے میں کہیں کہیں انسانیت نے بھی اپنی جھلک دکھائی ہے بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے ماحول کا کوئی اثر نہ لیتے ہوئے انھیں لوگوں کی مدد کی ہے جنہیں ان کے دوسرے بھائی دوسری جگہوں پر لوٹ مار رہے تھے ۔ ح کے واقعات اس میں شبہ نہیں کہ انگلیوں پہ شمار کئے جا سکتے ہیں لیکن یہی انسانیت کے روشن مستقبل کی آخری امید بھی نظر آتے ہیں ۔ شاید طرح کی چند مثالیں تاریکی اور مایوسی کے اس دور میں نہ ملتیں تو بہت سے حساس طبائع خود انسانیت کی عظمت اور پاکیزگی ہی سے مایوس ۔ تصویر کا یہ رخ بہرحال اس کے تاریک رخ کے ساتھ بہت ہی اہم تھا خصوصاً اس وقت جب ادب کی تخلیق میں تعمیری احساس پیش فسادات کے ادب میں اس رخ کی کوئی جھلک موجود نہ ہونا ترقی پسند ادب میں بہت بڑی کمی کا احساس دلاتا ہے ۔

امن

موضوعات کے اس سلسلہ کی آخری کڑی امن ہے ۔ امن ظاہر ہے کہ ہر اس انسان کی دلی تمنا ہونی چاہئے جس میں انسانیت ہو انسانیت کو پھلتا پھولتا اور آگے بڑھتا ہوا دیکھنا چاہے ۔ پچھلی دو مہیب اور ہولناک جنگوں کے طفیل آدمیت جس طرح تباہ اور برباد تاج بیان نہیں ہے ۔ پھر دورانِ جنگ کی تباہیوں سے قطع نظر جو معاشی بحران اور معاشرتی مسائل اور خرابیاں پیدا ہوئیں ان سے آج کل کون ہے ۔ جنگ کے بعد ایٹم کے نت نئے تجربات اور اسکی مدد سے مہلک ہتھیاروں کی تیاری ۔ پھر ہائیڈروجن بم وغیرہ کی ساخت جو نتائج پیدا کر سکتے ہیں ان کے پیش نظر ایک اور جنگ پوری انسانیت کی موت کا پیغام بھی ہو سکتی ہے ۔ ان حالات میں جنگ ہر ہوشمند کے نزدیک قابلِ مذمت و نفرت فعل ہے اور امن کے شیدائیوں کا سراہا جانا فطری ہے اس لحاظ سے ترقی پسند ادب میں اس موضوع حد تک قابلِ تعریف ہے لیکن ایک کھٹک اپنی جگہ پر رہ جاتی ہے ۔

امن کو بادی النظر میں انسان کی فطری خواہش ہونا چاہئے ۔ اور اسکو غارت کرنے والا خواہ وہ کوئی بھی ہو قابلِ نفرت ہے لیکن ترقی پسند

ترقی پسند ادب کا جائزہ

ادب میں یہ موضوع ادیب کی فطری خواہش پر نہیں ابھرا ہے بلکہ اس کا واحد سبب امن کی وہ مہم ہے جس کے طفیل میں تقریباً دنیا کے ہر بڑے شہر میں کانفرنسیں منعقد ہوئیں اور قراردادیں پاس ہوئیں۔ یہ تحریک سوویٹ روس کے اشارے پر وجود میں آئی اور اس کے ماتحت روکلا (پولینڈ)، پیرس اور نیویارک میں بعض اہم کانفرنسیں ہوئیں اور حال ہی میں چین میں ایک بڑی کانفرنس منعقد ہو چکی ہے۔ جس میں جنگ کی مذمت کی گئی اور امن کی قراردادیں پاس ہوئیں۔ اس لحاظ سے انجمن ترقی پسند مصنفین کا اس میں حصہ لینا ممکن نہ تھا۔ جہاں تک ان کانفرنسوں میں شرکت کا سوال ہے کوئی اعتراض پیدا نہیں ہوتا لیکن نقص امن خواہ وہ امریکہ اور برطانیہ کی وجہ سے ہو یا روس اور چین کی وجہ سے ہو۔ دونوں صورتوں میں مذموم ہے یہ چیز تو ہرگز اصولی نہیں ہو سکتی کہ جو جنگ روس یا چین کے اشتراکی ممالک لڑیں قابل قبول اور اسکے برخلاف جو جنگ امریکہ یا برطانیہ یا کوئی اور دوسرا نظریہ رکھنے والا ملک کرے، وہ قابلِ نفرت ہو۔ انصاف کا تقاضا تو کچھ اور ہے۔ جنگ اگر ایک مذموم فعل ہے تو سب کے لئے ہے۔ خواہ وہ جرمنی ہو یا جاپان، امریکہ ہو یا برطانیہ، روس ہو یا چین۔ بدقسمتی یا خوش قسمتی سے بعض تاریخی حقائق ناقابلِ تردید بن جاتے ہیں اسی طرح کی ایک حقیقت ربن ٹراپ اور مولوتوف پیکٹ ہے جس کے بعد عالمگیر امن کے سب سے بڑے علمبردار سوویٹ روس نے جرمنی کی فسطائی حکومت سے دوستی کی بنیاد رکھی اور پولینڈ کی سرزمین پر اشتراکی اور فسطائی فوجوں نے نیا زلیتا نہ امن و امان کو غارت کرکے دنیا کو ایک خوفناک جنگ کے جنگل میں پھنسا دیا۔ روکلا (پولینڈ) کے کھنڈر امن کے ان علمبرداروں کے لئے ایک ناخوشگوار طنز کی حقیقت رکھتے ہیں لیکن ترقی پسند ادب نے روس کی اس حرکت پر اسٹالین کی تعریف کے نغمے خوب خوب گائے پھر روس کی اشتراکی حکومت امریکہ اور برطانیہ کے ساتھ لڑی اور یہ عالمگیر جنگ انسانیت کے لئے آبِ حیات بن گئی۔ اب جبکہ جنگ کو ختم ہوئے سات سال ہو چکے ہیں دنیا کا ہر ملک اسلحہ سازی اور عسکری برتری کی ایک دوڑ دوڑ رہا ہے۔ بجٹ میں سے کثیر از کثیر رقوم عالمگیر امن کے نام پر ایک دوسری جنگ کی تیاریوں میں صرف ہو رہی ہے۔ لیکن جنگ کی اس تیاری پر ترقی پسند ادب اگر مذمت کرتا ہے تو امریکہ اور برطانیہ اور دوسری طاقتوں کی۔ اس کے برعکس روس چین اور دوسرے اشتراکی ممالک کی تیاریوں کو جائز سمجھ کر اُسے سراہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس موضوع کے تحت ترقی پسند ادب کا تقریباً تمام حصہ امن کی پرخلوص خواہش سے خالی ہے اس قسم کے مسئلہ میں بے جا جانبداری کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ اسے ایک سستے قسم کا پارٹی پروپیگنڈا کہا جا سکتا ہے کیونکہ امن کے نام پر صرف کانفرنسیں کر لینے اور قراردادیں پاس کر لینے سے حقیقت مستور نہیں ہو جاتی۔ حقیقت بہرحال حقیقت ہی رہتی ہے۔ جارحانہ عزائم خواہ کسی کی طرف سے ہوں، قابلِ مذمت ہیں۔ محض نظریات سے اتفاق نہ رکھنے والوں کو گالیاں دے لینے اور انھیں جنگجو کہہ لینے سے بات وہیں کی وہیں رہ جاتی ہے۔ جنگ کے بعد کی بیشتر نظمیں اور افسانے جو امن کے لئے لکھے گئے ہیں۔ ان میں تمامتر کوششیں امریکی بلاک کو امن دشمن اور اشتراکی بلاک کو امن دوست ثابت کرنے کی معلوم ہوتی ہے۔ چند مثالیں قابلِ دید ہیں۔ مثلاً حسن طاہر "تصادم" کو اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

ساری دھرتی کی دولت کھنچتی چلی جا رہی ہے
ریت سونا اگلتی ہے امریکنوں کے لئے
تاکہ سامانِ جنگ و جدل ڈھالنے کے لئے کارخانے چلیں[۱]
جن کی ایجاد اٹیم کے بم ہوں، شعاعی ہلاکت ہو
زہریلی گیسیں ہوں، بیماریاں ہوں ———
امن کا کوئی ذرہ نہ بچ کر نکل جائے۔ اس دستِ بیدادِ جہاں سوز سے۔
آج انسانیت کے زبوں انحطاط کو

۱؎ اور روسی ترکستان کی کپاس اور غلے سے اگر ماسکو و لینن گراڈ کے کارخانے چلیں اور پیٹ بھریں اور جبری محنت کے کیمپوں کے قیدیوں کی ہڈیوں سے اگر کریملن کا محل تعمیر ہو رہا ہو تو؟ ——— تو وہ انسانیت نوازی ہے۔ (ر ن ص)

صفحۂ زیست سے محو کرنے کی تیاریاں ہیں
دوسری سمت انسانیت جاگ اُٹھی ہے
مشرقِ یورپ سے اک آفتاب جہاں تاب کی روشنی بڑھ رہی ہے،
روگلا، وارسا، پراگ، انساں کا گھر بن گئے ہیں،
اور پیرس، نیو یارک، لندن جہاں
ہڈیوں کے بنائے ہوئے محل اور ایوان کھڑے ہیں
ایک وحشت سے اس نظمِ نو زائیدہ کو کھڑے تک رہے ہیں۔
بھوک، افلاس، بیماریاں، جنگ، شاہی کے سارے سپاہی!
مغربی مسکنوں پر نگاہیں جمائے
اوقیانوس کے پانیوں میں
کہیں غرق ہونے کی خاطر چلے جا رہے ہیں
آج پامیر کی چوٹیوں پہ
دُور مشرق کے ساحل پہ یورپ کے دل میں
اور دنیا کے ہر ایک گوشے میں۔ آزاد انسان کھڑا ہنس رہا ہے
بیوقوفوں کی جنت کے باسی یہ سمجھے ہوئے ہیں
یہ یلغار بھی رک سکے گی! یہ طوفان بھی تھم سکے گا۔
(نقوش ۷)

ظہور نظر "سیل انوار" اس طور پہ بہا رہے ہیں۔

یہ قتل و غارتگری کے مذموم منصوبوں کے مہیب اور تند رو بگولے
یہ جنگ کی سازشوں کی شب تنگ و زہرآلود آندھیاں
یہ ان خداؤں کی آخری کوششیں ہیں - - - - - - - - -
یہ چاہتے ہیں کہ مشتریت کی آگ پھر سے بھڑک اُٹھے — اور دستِ جمہور کو جھلس دے!
جہان کی ظالم اجارہ داری، منافع خوری کی ناتوان و نزار گردن کی سمت تیزی سے بڑھ رہا ہے
یہی نہیں ہے سب یہ چاہتے ہیں کہ صرف مذموم مشوروں اور زہرآلود سازشوں سے
اگر دبایا نہ جا سکے صبحِ احمریں کو
تو پھر یہ فاشزم کے نئے دیوتا بن کر
تمام دنیا کو ہیروشیما کا روپ دیدیں۔

• • •

؎ جی ہاں! اِدھر سے یلغار ہو تو قابلِ خیر مقدم، اور اُدھر سے ہو تو قابلِ لعنت (ن ص)

مگر انہیں کیا خبر کہ ان کی کوئی بھی ترکیب کوئی تدبیر کارگر ہی نہ ہو سکے گی۔
وہ سیلِ انوارِ صبح جو کائنات کے مشرقی افق سے
تمام دنیا پہ اپنی کرنیں بکھیرتا بڑھ رہا ہے ——— اس کی حسین چھاؤں میں
امن جمہوریت، مساوات اور انصاف کی حفاظت کا عزم لے کر
ملوں سے، کانوں سے، کارخانوں سے، دفتروں اور کھیتوں سے
عوام اپنے علم، ہتھوڑے، درانتیاں اور کدال تھامے نکل پڑے ہیں۔

نقوش (۷)

یہ اور اسی طرح کی کتنی نظمیں اور افسانے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ پارٹی Party کی ہدایت Directive کے تحت سب کچھ تخلیق ہو رہا ہے ——— یہ لوگ بھی کیسے سستے آلۂ کار ہیں!

چند متفرق امور

فنیت اس سلسلے میں بہت سی باتیں پچھلے عنوانات کے تحت بھی آچکی ہیں کہ ترقی پسند ادب نے فن کی پاسداری کس حد تک کی ہے۔ لیکن پھر بھی اس کے چند پہلو ایسے رہ گئے ہیں جن کا تذکرہ ضروری ہے۔ ادیب کے بدلتے ہوئے تصورات کے باوجود ادیب کی تخلیق میں، مقصدیت کے ساتھ ساتھ ایک بڑی اہمیت کردار نگاری کی ہے۔ کردار نگاری میں ادیب زیادہ تر اپنی ہی بات دوسرے لوگوں کی زبان سے کہتا ہے۔ اس جگہ اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہو جاتا ہے کہ کیا کہا جا رہا ہے، کن لوگوں کی زبانی کہا جا رہا ہے اور یہ لوگ عام طور پر ان حالات میں جنھیں ادیب نے پیدا کیا ہے یہی کچھ کہتے ہیں یا نہیں؟ اور اسی انداز پر سوچتے ہیں یا نہیں۔ جس انداز پر وہ سوچتے ہوئے دکھائے گئے ہیں؟ کیونکہ اگر ایک مخصوص ماحول میں کردار اپنے معیار سے مختلف اور متضاد باتیں کہتا ہے جو وہ عام روزمرہ کی زندگی میں نہیں کہہ سکتا تو کردار غیر فطری اور بے جان ہو جاتا ہے۔ وہاں یہ بات واضح طور پر محسوس ہونے لگتی ہے کہ فنکار اپنی بات زبردستی کردار سے کہلوا رہا ہے۔

یہی نہیں ادب محض قصے کہانیوں کا نام نہیں رہا بلکہ اس کے ذریعہ فنکار اپنے پڑھنے والوں کو زندگی کی صحیح قدروں سے روشناس کرتا ہے۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ مختلف طبقوں کے مسائل کیا ہیں، ان کی نفسیات کیا ہے۔ اس لحاظ سے اگر ترقی پسند ادب اور خاص طور پر اس کے افسانوں (کیونکہ کردار نگاری کے مواقع پوری طرح افسانوں ہی میں ملتے ہیں) کو دیکھا جائے تو اکثر کردار روزمرہ کی زندگی میں اپنے افسانوی رول Role کے ساتھ نہیں پائے جاتے۔

مثال کے طور پر احمد ندیم قاسمی کے افسانے "نئے فرہاد" ہی کو لیجئے اس کا تذکرہ ہم "ادب برائے زندگی" کے تحت ایک دوسرے انداز پر کر چکے ہیں۔ یہاں مندرجہ سابق اقتباسات کے پیشِ نظر فساد کے پرحول ماحول میں شانتی کی تقریر پر ایک نظر ڈالیے۔ احمد ندیم قاسمی یہ بھول جاتے ہیں کہ شانتی ایک معمولی دیہاتی لڑکی ہے جس سے اس قسم کی تقریر نہ صرف غیر متوقع ہے بلکہ غیر ممکن بھی ہے۔

اسی طرح اس تقریر سے متاثر ہو کر جعفر کا مجمع عام کو خطاب کر کے یہ کہنا کہ وہ خبر جو مسافر نے سنائی تھی انگریزوں کی من گھڑت ہے اور اس سے انگریزوں کا مقصد نفرت اور تعصب پیدا کرنا ہے۔ بالکل تصنع ہے جعفر ایک دیہاتی اور فرقہ پرست مسلمان ہے اس کا یکایک فساد کے متعلق اس قسم کا نظریہ پیدا کر لینا بڑا حیرت انگیز ہے کیونکہ یہ نظریہ خود ترقی پسند تحریک نے بڑی دیر کے بعد پایا ہے اور جعفر کے منہ سے فسادات کے متعلق پالیسی کا یہ بیان بالکل حلق سے زبردستی اگلوایا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

اسی طرح احمد ندیم قاسمی کا دوسرا افسانہ "رئیس خانہ" ہے۔ یہاں ہماری ملاقات ایک ایسے رئیس صاحب سے ہوتی ہے جو ایک مرتبہ ساون کے موسم میں کسی پہاڑی مقام پر ڈاک بنگلہ میں ٹھہرتے ہیں جس کے پاس ہی ایک دوسری قیام گاہ موجود ہے۔ اس قیام گاہ کی نگہداشت فضلو کے ذمے ہے جس کے ایک بیوی "مریاں" نامی ہے۔ اور ایک پانچ چھ سال کا بچہ ہے۔ رئیس صاحب مریاں پر فریفتہ ہو جاتے ہیں۔ ملاو دوسرے سال رئیس خانے (یعنی اسی قیام گاہ) میں ٹھہرتے ہیں اور پوری داستان تراشتے ہیں کہ ان کی ایک بیوی تھی جسکا نام مریم تھا اور جو ایک حادثے کی وجہ سے اچانک مر گئی اور اب ان کی زندگی سنسان ہے۔

دن یونہی گزرتے ہیں یہاں تک کہ ساون کے بادل آتے ہیں اور بارش شروع ہو جاتی ہے۔ اور صاحب فضلو سے کہتے ہیں کہ ان کی راتوں کو آباد کرنے کے لئے ایک عورت کی ضرورت ہے۔ ایک رات کی قیمت ۱۰۰ روپے اور دس روپے فضلو کا انعام۔ فضلو بڑے پس و پیش کے بعد ایک عورت سے معاملہ طے کرتا ہے۔ وہ عورت تمام رات رہتی ہے اور رئیس صاحب محض اسے دیکھتے رہتے ہیں اسی طرح دوسری رات کو دوسری عورت اور تیسری رات کو تیسری عورت آتی ہے اور ۱۰۰ روپے صبح کو لے کر چلی جاتی ہے اور صاحب اسے دیکھتے رہتے ہیں۔ بالآخر فضلو سوچتا ہے کہ یہ رئیس صاحب تو فرشتہ ہیں اور اگر مریاں ہی اس کے پاس جاتی رہتی تو اب تک تین سو روپے ہو گئے ہوتے اور اگر یہ صاحب دس دن اور رہ گئے تو ایک ہزار روپے ہو جائیں گے۔ بالآخر وہ مریاں سے تذکرہ کرتا ہے۔ مریاں روتی ہے، بپھرتی ہے، بگڑتی ہے، بالآخر اس شرط پر آمادہ ہو جاتی ہے کہ اگر صاحب نے اسے ہاتھ بھی لگایا تو آئندہ اس کا فضلو سے کوئی تعلق نہ رہے گا۔ فضلو جو صاحب کی شرافت پر ایمان لا چکا تھا، راضی ہو گیا۔ مریاں رئیس صاحب کے کمرے میں جاتی ہے اور صاحب اس پر اس طرح ٹوٹتا ہے جیسے فاقہ زدہ کسی لذیذ ترین کھانے پر۔ پھر صبح ہوتی ہے صاحب ایک کا ریہ جا چکا ہے۔ مریاں پریشان اور مضمحل ہے، فضلو اپنا سر پیٹ لیتا ہے اور مریاں کہتی ہے:-

"تم نے کہا تھا کہ وہ مجھ کو چھوئے گا نہیں اور اس نے تو مجھے کاٹ کاٹ لیا ہے وہ تو پچھلے ساون بھی میرے ہی لئے یہاں رکا رہا۔ اس نے تو پہلے ہی دن یہاں صحن میں دوربین سے مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ تو اب کے بھی میرے ہی لئے آیا تھا"

مریاں کے ان جملوں کے ساتھ جب ہم اس وقت پر نظر ڈالتے ہیں جب رئیس صاحب وہاں آنے والے تھے اور فضلو نے مریاں کو یہ خوشخبری سنائی تھی تو وہ "حواس باختہ نظر آنے لگی تھی" "اور پھر اداس ہو گئی تھی" اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مریاں کو ابتدا ہی سے اس امر کا یقین تھا کہ رئیس صاحب محض اسی کی وجہ سے وہاں آکر ٹھہرے ہیں اور ان کی پاکیزگی محض ایک ڈھونگ ہے۔ اس یقین کے باوجود اس کا اس موقعہ پر خاموش رہ جانا ۔۔۔ خصوصاً جب فضلو اسے رئیس صاحب کے کمرے میں بھیج رہا تھا یقیناً غیر فطری[۱] ہے۔ غالباً احمد ندیم قاسمی کو یہ یاد نہیں رہتا کہ مریاں اور فضلو کس قدر مضبوط کردار کے ہیں[۲]۔

[۱] رئیس خانہ کی پوری کہانی عجوبگی تو رکھتی ہے۔ فطری پن اس کے مزاج میں بالکل ہے ہی نہیں یہ کہانی صرف ادیب کے ذہن میں پیدا ہو سکتی ہے کرۂ ارضی کی انسانی زندگی میں اس کا پایا جانا متوقع نہیں ہے۔ کیا یہ واقعہ ہمارے معاشرہ کے کسی واقعی پہلو کا ترجمان ہے؟ ہرگز نہیں بس خالص ترقی پسندی ہے۔ (ان ص)

[۲] یہی نہیں بلکہ سوال یہ بھی ہے کہ مریاں جیسی دیہاتی عورت اگر رئیس صاحب کی مزاحمت کرنا چاہتی تو کیا کچھ نہ کر سکتی تھی اور نہیں تو کم از کم واویلا مچا سکتی تھی، مگر وہ کچھ بھی نہیں کرتی بلکہ رئیس کے شکنجے میں پھنسنے کے بعد اپنے آپ کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دیتی ہے۔

(ان ص)

دوسری طرف رئیس صاحب کا کردار ہے ۔ مریاں ایک عام عورت ہے جس کی کوئی نمایاں خصوصیت افسانہ نگار نے نہیں بتائی ہے پھر وہ شادی شدہ بھی ہے اور چھ سالہ بچے کی ماں بھی ۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ احمد ندیم قاسمی ایک رئیس کو ایک عام عورت کے عشق میں دو سال تک مبتلا رکھ کر اور پھر سالوں کی تین پرکیف راتوں میں اسے محض عورتوں کو دیکھتا ہوا پیش کر کے انسانی فطرت کا کون سا پہلو دکھانا چاہتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ رئیس عیاش تھا اس کا اس طرح ایک عام عورت کے لئے دو سال تک بے چین رہنا اور پھر تین عورتوں کو تین رات دیکھتے رہنا ۔ کیا معنی رکھتا ہے جبکہ اس کا مقصد محض عیاشی تھا ۔ جس کے لئے اس سے بہتر عورتیں اسے بہ آسانی دوسرے پہاڑی مقامات پر مل سکتی تھیں ۔ پھر تین راتوں میں اس کا ضبط و نفس عجیب و غریب ہے یہی نہیں چوتھی رات کے دس بجے مریاں اس کے کمرے میں جاتی ہے اور وہ اس پر ٹوٹ پڑتا ہے لیکن صبح کو جب فضلو اپنے گھر سے نکلتا ہے تو صاحب کار میں جاتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ یہ کار کہاں سے آگئی ۔ اس کی ایک ہی صورت ممکن ہے اور وہ یہ کہ صاحب نے چوتھے دن ہی یہ اندازہ لگا لیا ہو کہ آج مریاں ہی آئے گی اور پھر کار کا انتظام کر لیا ہو ۔ لیکن صاحب کو یہ اندازہ کیوں کر ہوا افسانہ اس بارے میں خاموش ہے ۔

اسی طرح قدرت اللہ شہاب کا افسانہ "اور عائشہ آگئی" ہے اس میں عبدالکریم کھوکھرا پار سے پاکستان آتا ہے یہاں اسے ہر چیز اسلامی نظر آتی ہے ۔ یہاں تک کہ حکیم نجیب اللہ کے شراب کے متعلق اسرار و رموز کی بدولت یہ بھی اسلامی بن جاتی ہے پھر وہ کپڑے کی دکان کرتا ہے منافع ہوتا ہے ۔ خداداد کالونی میں مکان لیتا ہے ۔ دکان چلتی ہے ۔ عائشہ کی شادی ہو جاتی ہے ۔ پھر اس کی طبیعت اچاٹ ہو جاتی ہے ۔ لڑکیوں کا بیوپار شروع کر دیتا ہے ۔ خوب منافع ہوتا ہے ۔ کوٹھی خریدتا ہے ۔ سیٹھ بن جاتا ہے ۔ عائشہ حاملہ ہو کر گھر آتی ہے اس کا دل پھر اس کام سے نفرت کرنے لگتا ہے اور وہ پھر کپڑے کی دکان کھول لیتا ہے ۔

یہ ہے افسانے کا پلاٹ جس میں واقعات اس تیزی کے ساتھ آتے ہیں جیسے خراب موسم میں ہوائی جہاز میں Humping ہو رہی ہو یا بائسکوپ والوں کا تماشا دکھانے والا بڑی سرعت کے ساتھ ریل گھماتا جاتا ہو اور کہتا جاتا ہو کہ جھانسی کی رانی دیکھو، آگرہ کا تاج دیکھو، ننگی دھوبن دیکھو وغیرہ وغیرہ ۔

اسی طرح بے شمار افسانے ہیں جن میں کسی نہ کسی پہلو سے کردار یا پلاٹ کے شدید نقائص ملتے ہیں اور پورے افسانے بالکل من گھڑت قصے معلوم ہونے لگتے ہیں جنہیں عام زندگی سے کوئی خاص نسبت نہ ہو ۔

تقریباً یہی حال ان افسانوں کا ہے جنہیں سیاسی یا سماجی شعور پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ اس کی چونکہ کافی مثالیں پہلے دی جا چکی ہیں اس لئے مزید کی ضرورت نہیں ۔

زبان پہ کرم فرمائیاں ایک اور اہم چیز الفاظ اور نت نئی ترکیبوں کا استعمال ہے ۔ ترقی پسند ادیب نے انگریزی اور دوسری زبانوں کے ادب کے مطالعے کے بعد ایک خاص صنف نئی نرالی ترکیبوں کی ساخت کی بھی پیدا کر لی ہے ۔ جہاں تک نئے الفاظ اور ترکیبوں کی ندرت کا سوال ہے بھلا کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے اس سے زبان کا سرمایہ وسیع ہوتا ہے اور پھر اظہار خیال میں سہولت ہوتی ہے لیکن اگر یہی ترکیبیں بھونڈی اور بھدی ہوں تو وجدان پر گراں گزرتی ہیں اور عبارت کے حسن کو غارت کر دیتی ہیں ۔ ثقیل اور بھدی ترکیبوں کا استعمال بھی ایک عام مرض بن گیا ہے ۔ مثلاً

میری نس نس ٹوٹ رہی ہے بوجھ سے ایسے درد کے

("ایک منظر" اختر الایمان)

لہ نہیں بھائی قاسمی صاحب کہہ سکتے ہیں کہ کار ان کی اپنی تھی اور ڈاک بنگلے میں چھوڑ دی تھی (ل ہ س)

"درد کا بوجھ" ترقی پسندوں کی انوکھی اختراع ہے۔ جو غیر مانوس ہے۔

اسی طرح ظہیر کاشمیری کہتے ہیں ع

تند ہوائیں بال بکھیرے چیخ رہی ہیں

یا پھر احمد فراز اپنی نظم "مجسمے" میں رقم طراز ہیں ع

کھردرے گالوں پہ غازے کی تہیں ہانپتی ہیں

یا پھر۔

رات کے بوجھ سے ہانپتی خاموشی

اور دیکھیے۔

"ہال کے اندر قہقہے دھڑک رہے تھے۔ ملی جلی باتوں کی تیز تیز چیخیں تھیں اور یہ تمام شور مجموعی طور پر ایک ہیبتناک کراہ کی طرح لرز رہا تھا" شوکت صدیقی۔

ناول، تنقید اور مقالہ آخر میں چند الفاظ ناول تنقید اور مقالے کے متعلق بھی کہنا ضروری ہے اس لئے کہ یہ بھی ترقی پسند ادب کا ایک حصہ ہیں تقسیم کے بعد عام طور پر کثیر تعداد افسانوں نظموں اور غزلوں کی ہے۔ ناول تو برائے نام ہی لکھے گئے۔ چند ناولٹ البتہ نمودار ہوئے ہیں مثلاً قدرت اللہ شہاب کا ناولٹ 'یا خدا' ہے جو فسادات اور اس کے اثرات کے سلسلے میں ایک معمولی سی کوشش ہے۔ موضوع کے لحاظ سے بھی کچھ زیادہ وسیع نہیں ہے۔

سعادت حسن منٹو کا فلمی ناولٹ "گناری" ان کے اپنے مخصوص رنگ میں ہے جس میں ایک نواب صاحب اپنے ناجائز بیٹے کی عیاشیوں کو خوب سراہتے ہیں۔ باپ اور بیٹے کے درمیان خواہ وہ دور انحطاط کے اثرات ہی کے تحت کیوں نہ ہوں اس قسم کا رشتہ عجیب و غریب ہے کہ وہ لڑکے کی چھیڑ خانیوں کو دیکھ کر مسکرائے اور ہمت افزائی کرے۔

انتظار حسین۔ اے حمید۔ اور اشفاق احمد کے ناولٹ "اللہ کے نام پر" "برف کی وادیوں میں" اور "مہمان بہار" محض نام ہی کے ناولٹ کہے جا سکتے ہیں۔

تنقید اور مقالے کے میدان میں کچھ اچھی اور کام کی چیزیں ملتی ہیں یہاں ممتاز حسین کا تذکرہ نہ کرنا بے جا ہوگا۔ ممتاز حسین کے تنقیدی مضامین اگرچہ ایک مخصوص زاویہ نگاہ سے ہیں لیکن پھر بھی سلجھے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر عبادت بریلوی ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، وقار عظیم، صلاح الدین احمد اور ریاض احمد وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں یہاں بھی اگرچہ تحقیقی مقالات ذرا کم ہی نظر آتے ہیں لیکن تنقید کا پرانا اور فرسودہ انداز بڑی حد تک بدلا ہوا ہے اور تنقید کے سائنٹیفک اصولوں کو کسی حد تک پیش نظر رکھا گیا ہے لے۔

لے مگر ترقی پسند تنقید نگاروں کی تنقید کا انداز بھی انوکھا ہے تنقیدی مقالات میں کہیں تو ہوائی تخیل کی قلابازی ہے۔ کہیں شاعرانہ رنگین بیانی کہیں لفظی فلسفہ طرازی، کہیں ابہام اور کہیں ادھی بات ادھر کی اور آدھی ادھر کی کہنے کے انداز مقالات کو جدا چلنے کیا بنا کے رکھ دیتے ہیں کہ ان میں سیدھی سیدھی طرح بات کہنے کا انداز ہوتا ہی نہیں۔ مثلاً اس ہمارے مقالے کو دیکھیے کہ مقالہ نگار سے آپ چاہے کتنا ہی اختلاف کریں اور چاہے اس کے کتنی ہی کمزوریوں کی نشان دہی فرمائیں لیکن بات سیدھے سیدھے طریقے سے کی ہوئی ہے اور ہر جگہ مدعا واضح ہے لیکن ترقی پسند تنقید نگاروں کی ژولیدہ بیانی نہ جانے کس حلقے میں قدر و قیمت پاتی ہے۔ ہم لوگ تو حیرت میں ہی

پاکستان کے مشاعرے

(جب سے اب تک)

ماہر القادری

مجادلہ، مقابلہ اور مناظرہ کے وزن پر "مشاعرہ" بھی خالص عربی لفظ ہے، مگر جس طرح کے مشاعرے ہمارے یہاں ہوا کرتے ہیں، اہلِ عرب اُس سے قطعاً ناآشنا اور یکسر ناواقف ہیں، عربوں میں شعرخوانی اور "انشاد" کا بہت قدیم سے دستور تھا اور کیوں نہ ہوتا شعر و شاعری تو اُن کی گھُٹی میں پڑی تھی؛ اہلِ عرب کو جاہلیت کے دور میں تین چیزوں سے غیر معمولی دلچسپی تھی ——— جنگ، شراب اور شاعری!

شراب خانوں اور رقص و سرود کی محفلوں سے لے کر جنگ کے میدانوں تک شعر و شاعری کا دور دورہ تھا، شعر و سخن کی معرکہ آرائیاں سب سے زیادہ عکاظ اور ذوالحجنہ کے بازاروں میں نظر آتی تھیں۔ جس شاعر کا قصیدہ سب سے اچھا قرار پاتا اُسے خانۂ کعبہ کی دیوار پر آویزاں کر دیا جاتا "سبعہ معلقہ" اسی شوق عکاظ کی جنسِ گراں مایہ ہیں ——— مگر شاعروں کے یہ جمگھٹے اور شعر خوانی کی یہ محفلیں اردو مشاعروں کے انداز پر منعقد نہیں ہوتی تھیں۔

ایران کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے شاعری میں عرب پر فوقیت لے گیا۔ وہاں کی خاک سے ایسے ایسے نامور اور باکمال شعرا پیدا ہوئے جن کی نظیر دُنیا کی کسی زبان میں نہیں مل سکتی، یورپ کو ہومر کی ایلیڈ پر بہت ناز ہے مگر فردوسی کے شاہنامہ کی بات اُس میں کہاں!

شاہانِ عجم کے درباروں میں شاعروں کے جمگھٹے بلکہ یوں کہئے کہ معرکے اور مقابلے نظر آتے ہیں، ایک شاعر دوسرے شاعر کے قصیدے پر قصیدہ کہتا ہے، معاصرانہ چشمکیں بھی رہتی ہیں "شاعری" بادشاہوں کے تعیش کا لازمی جزو بن کر رہ گئی ہے! قصاید کی تشبیب کو اثر انگیز اور کامیاب بنانے کے لئے باغ و بہار کے ابر، بادہ و جام ہی کے تلازموں کا سہارا لینا پڑتا ہے، شاہانِ غزنوی سے لے کر قاچاری دور تک یہ سلسلہ ٹوٹنے نہیں پاتا۔ ——— غالباً قاآنی کے قصیدہ کا مطلع ہے ———

> ساقیا ساقی بدہ رطلِ گراں زاں مے کہ دہقاں پرورد

شراب، شعر اور ہوس پرستی، ایران کی معاشرت پر غالب ہیں۔

شاہانِ عباسی اور برمکی وزیروں کی شاعر نوازی کے قصے بہت مشہور ہیں مگر ایران کے بادشاہ بھی شاعروں کی قدر شناسی میں ان سے پیچھے نہیں رہے، اور یہ واقعہ ایران کی تاریخِ ادبیات کے سوا اور کہیں نہیں ملتا کہ ایک بادشاہ نے ایک شاعر کا منہ جواہرات سے بھروا دیا تھا۔

شعر و شاعری کی یہ گرم بازاری بادشاہوں، وزیروں اور امیروں کے درباروں تک ہی محدود نہ تھی، شیراز، نیشاپور اور اصفہان وغیرہ کے بازاروں، حماموں اور شراب خانوں بلکہ خانقاہوں اور دانش گاہوں میں بھی شعر کی گونج سنائی دیتی ہے ——— مگر ... ان کے مشاعرے ... [illegible]

[illegible] ... شاعری کی مقلد ہے۔ بحور اور اُن کے اوزان ... [illegible] ... ایران کی شاعری عربی بحور ہی پر قائم ——— [illegible] ... آج کل کہتے ہیں یہ اسی ... [illegible] ... فعولن، فعولن، فعولن، فعولن ... [illegible]

ٹھنڈو" بولنے اور لکھنے لگے مگر شعر و شاعری میں یہ فنی انقلاب زیادہ مقبول نہ ہو سکا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کا فاتحانہ داخلہ ہوا تو وہ اپنے ساتھ فارسی زبان لے کر آئے، اور صدیوں تک "فارسی" کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل رہی، فارسی میں شیرینی تھی، گھلاوٹ تھی اور سلاست بھی! ہندوستان نے اس کو کسی ناگواری کے بغیر قبول کر لیا، ہندوستان کی خاک سے فارسی کے ایسے ایسے نغز گو شعرا اُٹھے کہ جن کی شاعری، ایرانی شاعری سے ذرا سی بھی دبتی نظر نہیں آتی۔ تنہا حضرت امیر خسرو کی ذات شاعری کا ایک مستقل دبستان ہے!

نہ جانے کس نے یہ غلط بات تصنیف کی اور وہ شہرت بھی پا گئی کہ "اردو قلعہ معلیٰ کی زبان ہے"! حالانکہ دلّی کا قلعہ ابھی وجود میں بھی نہ آیا کہ اردو زبان کی بنیاد پڑ چکی تھی! زبانیں بادشاہوں کے محلوں اور امیروں کے ایوانوں میں پیدا نہیں ہوا کرتیں، یہ غلط اندیشی اور لسانی تاریخ سے بے خبری کا ثبوت ہے! اردو کو تو ہندوستان کی تمام قوموں کے آپس کے میل جول نے پیدا کیا، یہ زبان ہندوستان کے تمدن و تہذیب اور معاشرت حالات کے ناگزیر اور فطری تقاضوں کے سبب ظہور میں آئی، یہ خود رو پودے کی طرح پیدا ہوئی اس کو کسی نے لگایا نہیں، یہ نہال نوخاستہ آپ ہی آپ ہندوستان کی خاک سے اُگ آیا ——— فطری زبانیں اسی طرح پیدا ہوا کرتی ہیں۔ بھارت میں جو زبان ان دنوں گھڑی جا رہی ہے وہ فطری نہیں مصنوعی زبان ہے اور مصنوعی زبانوں کی عمر بہت تھوڑی ہوا کرتی ہے۔

اردو زبان بنی تو وہ بھی دوسری زبانوں کی طرح شاعری کے بغیر نہ رہ سکی، اس لئے کہ شعر و شاعری اور زبان کا چولی دامن کا ساتھ ہے! اردو شاعری نے قدرتی طور پر "فارسی" شاعری کے اثرات کو قبول کیا، بحور، اوزان، غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی، مستزاد، مسدس، ترجیع بند وغیرہ یہ سب وہ مال ہے جو ایران سے ہندوستان میں درآمد ہوا۔ اسی طرح اردو شاعری کا سلسلہ فارسی کے واسطے سے، عربی شاعری سے جا کر ملتا ہے۔

اس تمہید کے بیان کرنے کی غرض یہ تھی کہ اردو شاعری، فارسی اور عربی شاعری سے کس قدر قریبی تعلق رکھتی ہے مگر جہاں تک اُردو زبان کے "مشاعرہ" کا تعلق ہے، یہ اسی زبان اور اسی ملک کی ایجاد ہے۔

مشاعرہ کے لئے "مصرعہ طرح" کا التزام، بزم میں شمع کی گردش۔ شاعروں کا خاص انداز سے شعر پڑھنا، اس پر لوگوں کا داد دینا اور واہ وا کرنا، "اے بھائی! مصرعہ تو اٹھائیے" کی آواز کا آنا ——— پھر داد و ستائش کے ایسے فقرے:-

"جیتے رہو میاں! کیا شعر پڑھا ہے"۔

"بس یہ زمین" آپ کی جاگیر ہو کر رہ گئی"

"ارے ظالم! مار ڈالا، او ہو، ہو۔ کیا کہنے، خدا کی قسم کل فجر کے وقت تک اسی شعر کو پڑھے جاؤ"

"اس سنگلاخ زمین میں پھول کھلانا، بس آپ ہی کا حصہ ہے"

"لیجئے میں اپنی غزل چاک کئے دیتا ہوں، آپ کی غزل پر میری غزل نچھاور ہے"

عرب اور ایران کے شعراء، ادیب، اہل قلم اور عوام اس قسم کے مشاعروں کو کیا جانیں؟ انہیں تو ایسی محفلوں کی ہوا بھی نہیں لگی، عرب اور ایران کے زیادہ سے اہل علم ہندوستان اور پاکستان کے مشاعروں میں شریک ہوتے ہیں تو ہم نے ان کو حیرت زدہ سا پایا جیسے وہ بالکل ایک نئی چیز دیکھ رہے ہوں۔ اُردو زبان کے مشاعرے اُن کے لئے عجائب خانے ہوتے ہیں ——— ترکی کی مشہور قوم پرست خاتون خالدہ ادیب خانم جب ہندوستان آئیں اور حیدرآباد دکن کے ایک مشاعرے میں شریک ہوئی تھیں تو اس مشاعرے کے تاثرات کو جس عجیب انداز میں خاتون موصوف نے پیش کیا ہے وہ دیکھنے کی چیز ہے، یوں سمجھئے کہ ہندوستان میں انہوں نے جتنی عجیب چیزیں دیکھیں اُن میں سے ایک اعجوبہ یہی "مشاعرہ" بھی تھا!

ل کے مختلف دور | مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی نے دلّی کے آخری یادگار مشاعرے کا جو نقشہ کھینچا ہے اس انداز کے مشاعرے تو دیکھنے

میں نہیں آئے، سنہ ستاون کے غدر کے بعد یہ بساط ہی الٹ گئی، اس لئے کہ:-

سودا جو بیچتے تھے وہ اپنے دلوں کے دکان اپنی بڑھا گئے

میں نے قدیم طرز کا آخری مشاعرہ ——— آخری اس لئے کہہ رہا ہوں کہ پھر اس طرز کا مشاعرہ میں نے نہیں دیکھا ——— جو دیکھا اور سنا تھا وہ انجمن بہار ادب لکھنؤ کا سالانہ مشاعرہ تھا! یہ ۱۹۲۶ء کا ذکر ہے، اس واقعہ کو بھی چھبیس سال ہو گئے!

شہنشاہ حسین وکیل کی ڈیوڑھی میں مشاعرے کا انتظام تھا، کرسیاں اور صوفے نہ تھے، فرش پر سامعین اور شعراء کی بیٹھک تھی، مشاعرے کا کوئی صدر نہ تھا شاعروں کے سامنے شمع گردش کرتی تھی، پانوں کے بیڑے، پان میں لونگوں کی جگہ لوہے کی کیلیں لگی ہوئی تھیں پہلی بار اسی مشاعرے میں دیکھے، یہ طرحی مشاعرہ تھا، عزیز لکھنوی مرحوم کی غزل کا مقطع اب تک مجھے یاد ہے۔

قصہ عہد جوانی پوچھتے ہو کیا عزیز
آ گیا تھا اتفاقاً نیند کا جھونکا مجھے

اس مشاعرے کی خاص بات یہ تھی کہ مدرسۃ الواعظین کے پرنسپل مولوی سید سبط حسن صاحب نے شاعری پر تقریر کی اور جہاں تک فصاحت و سلاست اور نکتہ آفرینی کا تعلق ہے یہ تقریر بجائے خود اپنی جگہ "غزل" سے کم نہ تھی!

بچپن میں سنا کہ مشاعروں کی بہت شہرت تھی، ہر شہر کے کوئی خوش ذوق تعلقدار سال کے سال بڑے دھوم سے مشاعرہ کیا کرتے تھے! اس دور کے مشاعروں میں "طرحی مصرعہ" کی پابندی لازمی تھی، شعراء اپنے خرچ سے آتے تھے۔ ہاں طعام و قیام مشاعرہ والوں کے ذمہ رہتا تھا!

پھر یہ ہوا کہ شاعروں کو آمد و رفت کا تیسرے درجہ کا کرایہ دیا جانے لگا، اس کے بعد ترقی ہوئی تو معاملہ انٹر تک پہنچا پھر سیکنڈ کلاس ——— یہاں تک کہ آمد و رفت کا کرایہ اور اوپر کے اخراجات کے علاوہ "نذرانے" بھی علی قدر مراتب دئے جانے لگے۔

مشاعرے ٹکٹ کے ذریعہ ہونے لگے، اور یہ محفلیں اور جمگھٹے شاعروں کی آمدنی کا اچھا خاصا ذریعہ بن گئے، ایک ایک شہر اور ایک ایک قصبہ میں مشاعرہ ——— خود میرا یہ عالم رہا ہے کہ شب میں ہٹیا میں مشاعرہ پڑھا اور تیسری صبح سواد بنگال میں طلوع ہوئی! ملک کی بدقسمتی سے اردو ہندی کا جھگڑا بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا، اردو کی حمایت کا جذبہ بھی ان مشاعروں میں شریک کار تھا۔

مشاعروں کا سب سے زیادہ چرچا اس دور "جنگ عظیم" کے زمانہ میں ہوا، سرکاری اور نیم سرکاری طور پر "وار فنڈ" کے مشاعرے ہوتے تھے اور لطف یہ ہے کہ ان مشاعروں میں غزلوں اور روحانی نظموں کے علاوہ قومی اور انقلابی نظمیں بھی پڑھی جاتی تھیں، خود انگریزوں کی سیاست پر چوٹیں ہوتی تھیں ——— چاند عمری صاحب نے ایک بار یو۔ پی کے گورنر مسٹر ہالٹ کی شان میں البتہ ایک قصیدہ پڑھا تھا ورنہ ان مشاعروں میں خود شاعروں کی زبان سے برطانوی حکومت پر طنز اور پھبتیاں سنی گئیں۔

طرحی مصرعوں کا رواج قریب قریب ختم ہو چکا تھا طرحی مشاعرے عموماً ناکامیاب ہوتے اس لئے مجبوراً طرحی غزلوں کے بعد غیر طرحی دور رکھنا پڑا ——— چاندی کا فرش اور شمع کی گردش اب نہ رہی تھی، کرسیوں اور صوفوں پر نشستوں کا انتظام ہوتا اور شعراء اسٹیج پر آ کر بیٹھتے! تحت لفظ پڑھنے والا کا مشاعروں میں رنگ نہ جمتا تھا، ترنم کا عام رواج ہو گیا شاعر کی آواز اچھی ہوتی تو معمولی سے شعر پر بھی تالیاں بجنے لگتیں ——— داد و ستائش کی تالیاں! شہرت کے اس چٹخارے نے بہت ——— پیدا کر دئے جو شاعر کم اور گویئے زیادہ ہیں!

مشاعرہ ——— حقیقت یہ تھا ——— انحطاط کی پیداوار ——— قوم کے بازوئے عمل شل ——— عوامل الملوکی اور انتشار ——— قرن اول کے مسلمانوں کی قریب قریب تمام خصوصیات رخصت ہو چکی تھیں، مذہب معاملہ کو ——— یا وہ طلاق و نکاح کے مسائل تک محدود ہو گیا تھا ——— ایسے عالم میں

و ادب کی خدمت کے نام پر دل کے بہلاؤ کے لئے "مشاعرے" جاری کئے گئے۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ عرب کے دورِ جاہلیت کے بعد آفتاب رسالت جب طلوع ہوتا ہے تو جاہلیت کے اندھیرے چھٹنے لگتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے سپیدۂ سحر نمودار ہو جاتا ہے، ایسی روشنی دنیا نے کبھی کاہے کو دیکھی ہوگی! دورِ جاہلیت کی ایک بڑی خصوصیت شعر و شاعری کی ہنگامہ آرائی تھی، جو اس دورِ سعادت میں دب گئی اب امرؤ القیس اور طرفہ کی نہیں حضرت حسانؓ بن ثابت جیسے شاعروں کی ضرورت تھی، سبعہ معلقہ کے قصائد پر ایک شعر کا بھی اضافہ نہ ہو سکا، اسلام نے ادب و معاشرت کا رُخ ہی بدل دیا، شعر و ادب کے چمنزاروں پر احساسِ اخلاق اور جذبہ نیکوکاری غالب آگیا۔

خلافت کے بعد جب مسلمانوں میں بادشاہت آئی تو جاہلیت پھر سے اُبھرنے لگی، ہوس پرستی اور شراب کو دو آتشہ بنانے کے لئے "شاعری" سے کام لیا جانے لگا، بادشاہوں کے درباروں، وزیروں کی محفلوں اور امیروں کی خلوتوں میں ناچنے گانے والی چھوکریاں اور شعراء دوش بدوش نظر آتے ہیں یہی شاعری زبان اُردو کو بھی ورثہ میں ملی، اگلے لوگوں کی غلطیاں ہمارے حصہ میں آئیں اور "شعر و ادب" کے نام سے آئیں! اور ان غلطیوں میں کچھ اضافہ ہم نے بھی کر دیا مشاعروں میں اُن اشعار پر داد دی جاتی اور مدح و ستایش کے پھول برسائے جاتے جن میں شراب نوشی کو سراہا جاتا، جام و بادہ کی تعریفیں کی جاتیں، رندی اور ہوسناکی کو زہد و ورع پر ترجیح دی جاتی، شیخ و واعظ کا مذاق اڑایا جاتا، دیر و کنشت کے مقابلہ میں حرم کی تخفیف کی جاتی، جنت و دوزخ کی شاعر کے "حسنِ خیال" اور "شوخیٔ فکر" سے تشبیہ دی جاتی! "انا الحق" کی تعریف، منصور حلاج کی مدح، مغان دیر کی منقبت خوانی، زنار برہمن کی شان میں قصیدے اور تسبیح و مصلے پر طرح طرح سے پھبتیاں، آخرت پر ایمان تو تھا مگر یہ تصور بہت دُھندلا پڑ گیا تھا شعراء یہ کہ کر ــــــ بلکہ اطمینان دلا کر ــــــ کہ:

ع کم بخت قیامت ابھی آئی نہیں جاتی

لوگوں کو ہوا و ہوس کے لئے اُبھارتے تھے! "محبوب" کا نام بت اور صنم رکھا گیا اور بُت کی تعریف اور اصنام کی ستائش شاعری کا ایک کلیہ بن گئی۔

تقسیمِ ہند سے دس بارہ سال قبل ہندوستانی مسلمانوں کی زمام سیاست مسلم لیگ کے ہاتھ میں آگئی تھی۔ کوئی شک نہیں کہ مسلم لیگ نے "اسلام" کا نعرہ لگا کر مسلمانوں کو ایک جھنڈے کے اردگرد عوام کو جمع تو کر دیا مگر مسلمانوں کے ذہن و فکر کی اخلاقی انداز پر ذرا سی بھی تربیت نہیں کی۔

کوئی شک نہیں کہ "لے کے رہیں گے پاکستان" اور "بٹ کے رہے گا ہندوستان" ــــــ یہ نعرہ بڑی قوت اور عزم کے ساتھ لگایا گیا، اور اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ ہندوستان بٹ گیا، مگر یہ انگریز بھی بڑا شاطر نکلا اس نے ہندستان کو بانٹا اور پاکستان بنایا ــــــ لیکن اس طرح کہ پاکستان کے دست و بازو جگہ جگہ سے چھانٹ دیئے۔ ہم پاکستان کے موجودہ نقشہ کو دیکھتے ہیں تو بدیہی طور پر نظر آتا ہے کہ یہ وہ "مکمل پاکستان" نہیں ہے جس "پاکستان" کے لئے جد وجہد کی گئی تھی! انگریز نے ہندستان سے اپنا بوریا بستر باندھنے اور آزادی سونپنے میں اتنی جلدی کیوں کی، ہندوؤں کی سازش نے کیا پارٹ انجام دیا، ہمارے لیڈروں نے "نامکمل" اور دست و پا بریدہ پاکستان کو کس لئے قبول کیا؟ ان واقعات کو ابھی تک چھیڑا نہیں گیا مگر زبانیں ہمیشہ گنگ نہ رہیں گی ایک وقت آئے گا کہ ہر چیز صحیح طور پر منظرِ عام پر لائی جائے گی!

تقسیمِ ہند سے قبل بھی بنگال، پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان میں مشاعرے ہوا کرتے تھے اور جو مسلمان ہجرت کر کے یہاں آئے وہ بھی مشاعروں کا قدیم ذوق لے کر آئے، ان کے اندر کوئی اخلاقی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی جب عوام کی زندگیاں، رجحانات اور اُن کا شاعرانہ ذوق نہیں بدلا تو مشاعرے کس طرح بدل جاتے، شعر و ادب ماحول اور معاشرت کی ترجمانی اور عکاسی کرتے ہیں، جب سوسائٹی سنورنے کے بجائے اور بگڑ گئی تو مشاعرے کہاں سے سنور جاتے جس ملک میں قرآن پڑھ کر سینماؤں کا افتتاح کیا جاتا ہو، جہاں کے سرکاری جھنڈے ار رقص و سرود کے جلسوں کی سرپرستی کرتے ہوں، جس جگہ قومی [illegible] کے نام پر مینا بازار اور قمار بازی کے اسٹال لگائے جاتے ہوں، جہاں کی مسلمان عورتیں سینے تان تان کر غیر مردوں کو سلامی دیتی ہوں، جہاں سود اور شراب کا کاروبار پھل پھول رہا ہو، وہاں اس کی کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ سارا ماحول تو جاہلیت کے رنگ میں رنگا ہوا ہو بس ایک "مشاعرہ" [illegible]

اگر پاکستان بننے کے بعد یہاں کا تعلیمی نظام بدل دیا جاتا، انگریز کے کھینچے ہوئے خطوط پر ہمارا کاروانِ تعلیم و تربیت گامزن نہ ہوتا ——— تو پھر ہم شعر و ادب اور اس کے ساتھ مشاعروں میں بھی انقلاب کی توقع کر سکتے تھے! مگر ایسا نہیں ہوا، نہیں ہو سکا، اور نہ بظاہر اس کے آثار نظر آتے ہیں۔

پاکستان میں!! مشاعرے کا نام آتے ہی تصور ایک ایسے عالم میں پہونچ جاتا ہے جہاں بعض شاعروں کی ضیافت کے لئے شراب کی بوتلیں کھولی جا رہی ہیں، اور جام گردش میں آ رہے ہیں، یہ شعرائے کرام (؟) جب مشاعرے میں تشریف لاتے ہیں تو کوئی کوئی شرابی کے نشہ میں اتنا دھت ہوتا ہے کہ اس کے پاؤں لڑکھڑا تے ہوتے ہیں کہ اب گرا، تب گرا، اور شراب کے گرم گرم بھبکے تو ہر شراب پینے والے شاعر کے منہ سے آتے ہیں ——— پنڈال سامعین اور تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے سامنے کی نشست پر بے حجاب عورتیں پوری پوری سنگھار کئے ہوئے خوب بنی سنوری ہوئی بیٹھی ہیں جو جلسوں میں ہیں وہ بھی تاک جھانک سے غافل نہیں ہیں ——— بعض شاعروں کے ترنم نے موسیقی کی سرحد کو چھو لیا ہے، ایسی ایسی مرکیاں لیتے، تانیں اڑاتے اور گلے بازی کرتے ہیں کہ کوئی گایک اور کتھک کیا کرے گا ——— سامعین کی طرف سے اس کے جواب میں چست فقرے، واہ وا، تالیاں، سیٹیاں قہقہے ——— بھارت آنہ والے تھیٹروں اور تماشا گاہوں کا سا رنگ!

پاکستان بننے کے بعد مشاعروں کے اس بازاری پن پر "ہوٹنگ" کا اضافہ ہو گیا، مجمع نے جس شاعر کی چاہی پگڑی اچھال دی! اور یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ مشاعروں کے منتظمین نے بعض شاعروں کی شراب سے ریل پیل کر دی، بلکہ کسی کسی شاعر نے تو مشاعرے میں شرکت ہی اس شرط کے ساتھ کی کہ میرے لئے شراب کا ضرور انتظام کرنا ہوگا۔ ہر جگہ کا ایک ہی جیسا رنگ نہیں رہا، بعض مقامات پر کوئی شک نہیں سنجیدہ مشاعرے بھی ہوئے مگر میں عام حالات بیان کر رہا ہوں۔

کراچی اور مضافاتِ کراچی (ملیر، ڈرگ روڈ اور ماری پور) کے علاوہ مجھے کوئٹہ، حیدر آباد سندھ، میر پور خاص، نہداد پور، سنجورو، سکھر، بہاول پور، ملتان، علی پور، مظفر گڑھ، لاہور، سرگودھا، لائل پور، راولپنڈی، نارائن گنج اور ڈھاکہ وغیرہ مقامات کے مشاعروں میں شرکت کا موقعہ ملا اور اس پانچ سال کے عرصہ میں دور و نزدیک سے بہت کچھ دیکھا۔

مشاعروں کی صدارتیں ڈپٹی کمشنر اور کمشنر صاحبان تو ایک طرف رہے، خود صوبہ کے گورنروں اور مرکزی حکومت کے وزیروں تک نے کی ہیں! ہمارے وزیر اعظم جناب خواجہ ناظم الدین صاحب جو اللہ کے فضل سے "الحاج" بھی ہیں، نماز بھی پڑھتے ہیں، مرغ پالنے کا بھی شوق رکھتے ہیں، خوش خوراک بھی ہیں، کھیلوں کے ٹورنامنٹوں اور کشتیوں کے دنگلوں میں بھی اُن کو دیکھا گیا ہے، شاعری سے بھی خاصہ شغف رکھتے ہیں! گورنر جنرلی کے زمانہ میں "ڈان" کے ہر سالانہ مشاعرے کے بعد خود اُن کے یہاں یعنی گورنر جنرل ہاؤس میں بزمِ سخن منعقد ہوا کرتی تھی، ایک بار تو سامعین کی تعداد ڈھائی سو کے قریب تھی، گورنر جنرل ہاؤس کے ان مشاعروں میں زیادہ تر غزلیں پڑھی جاتی تھیں، ایک بار احسان دانش نے البتہ ایک تیز قسم کی نظم ضرور پڑھ دی تھی بہت سے عمائد مرکزی جبیں نظر آتے تھے اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کم سے کم گورنر جنرل ہاؤس کی کھڑکیاں تو ضرور بدل دی گئی ہیں۔

جو مشاعرے ٹکٹ سے ہوتے ہیں، ان میں کہیں کہیں یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ بے ٹکٹ مجمع نے ایک دم ہلّہ بول دیا اور لوگ پولیس کی مزاحمت کے باوجود پنڈال میں داخل ہو گئے اور یہ تو اکثر ہوتا ہے کہ اوپر کی کلاس میں بیٹھنے والے بڑھتے بڑھتے پانچ روپے کی کلاس تک کشاں کشاں یا خراماں خراماں تشریف لے آئے، کالج کے طلباء کی دلچسپیاں ایسے مواقع پر خاص طور پر شوخ ہو جاتی ہیں۔

کراچی کے مشاعروں میں ایسا ہو چکا ہے بلکہ ہوتا رہتا ہے کہ شعراء صاحبان کو بڑی منت سماجت کے ساتھ موٹروں میں لایا جاتا ہے لیکن مشاعرے کے بعد بیچارے شاعروں کی پوچھ گچھ نہیں ہوتی، کوئی اُن کی داد فریاد نہیں سنتا، واپسی میں شعراء کو رکشاؤں میں یا پھر پیدل ہی جاتے دیکھا۔

پاکستان کے مشاعرے

مشاعروں میں لوگ کافی دلچسپی اور شوق کے ساتھ آتے ہیں اور ٹکٹوں کی بکری بھی خوب ہوتی ہے، مگر مشاعرے کے بعد عام طور پر یہی سننے میں آیا ہے کہ فلاں مشاعرے میں اتنے آدمی بے ٹکٹ گھس آئے تھے، اُس مشاعرے کی ٹکٹوں کی کاپیاں ہی ابھی تک گم ہیں اس لئے آمدنی خرچ برابر برابر ہی رہا! کہنے والے اس طرح کی باتیں کہتے ہیں مگر صرف زبانی باتوں پر منتظمین مشاعرہ سے بدگمان ہوتے ہوئے بھی دل جھجکتا ہے کہ نہ جانے اصل حقیقت کیا ہے؟ اس لئے کہ بعض "بدگمانیاں" گناہ کی حد تک پہونچ جاتی ہیں۔

پاکستان میں "تغزل" آج بھی مقبول ہے اور رہے گی، مشاعروں میں زیادہ تر غزلیں ہی چلتی ہیں بلکہ کامیاب رہتی ہیں، کوئی شک نہیں کہ غزل اگر اخلاقی حدود سے تجاوز نہ کرے تو بڑی اثر انگیز چیز ہے، شاعری کے اصلی جوہر "تغزل" ہی میں کھلتے ہیں، اقبال نے اردو میں چند غزلیں کہی ہیں وہ بھی عام روش سے ہٹ کر، مگر اس کی نظموں میں "تغزل" کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں اس لئے اُن میں بلا کی تاثیر اور قیامت کا سوز ہے، جس شاعر کی طبیعت کو "تغزل" سے لگاؤ ہوگا اس کی اخلاقی، اسلامی، اصلاحی اور قومی نظموں میں بھی ایک خاص لطف ہوگا!

پاکستان کے مشاعروں میں بیشتر شعرا ترنم سے پڑھتے ہیں اور کامیاب رہتے ہیں مگر یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ قومی نظمیں تحت لفظ پڑھی گئیں اور مشاعرے میں دھوم مچ گئی بلکہ پاکستان کے مشاعروں میں تو ترنم سے پڑھنے والے شعرا بھی قومی نظمیں تحت لفظ ہی پڑھتے ہیں:

پاکستان بننے کے بعد مشاہیر شعرا نے روحانی نظمیں بہت ہی کم کہی ہیں مشاعروں میں بھی روحانی نظمیں عام طور پر نہیں پڑھی جاتیں، ورنہ تقسیم ہند سے قبل ہندوستان کے مشاعروں میں اس قسم کی نظموں کے لئے فرمائشیں ہوتی تھیں اور خاص طور سے زنانہ درجہ سے فرمائش کی پرچیاں آتی تھیں۔

جن نظموں میں مہاجرین کی پریشاں حالی، بے سروسامانی اور ان کے گھر بار چھٹنے کا حال ہوتا ہے، بہت توجہ سے مشاعروں میں سنی جاتی رہی ہیں، اور میں نے سننے والوں کو ان پر روتے اور سسکیاں بھرتے ہوئے دیکھا ہے!

پہلے لوگ "اسلامی ادب" اور "صالح لٹریچر" کے نام سے چونکتے سے ہو جاتے تھے، جماعت اسلامی کے پیش کئے ہوئے ادب کی بدولت یہ وحشت اور اجنبیت اب اُنس و دلچسپی سے بدل گئی ہے، مشاعروں میں خالص اسلامی نظمیں پڑھی گئیں ہیں اور بہت کامیاب رہی ہیں، "ملائیت" اور "قدامت پسندی" کی پھبتیاں اپنا مفہوم بدلتی جارہی ہیں۔

اس پانچ سال کی مدت میں ہندوستان کے شعرا کئی بار یہاں آچکے ہیں، مسلمان ہی نہیں ہندو شعرا بھی، پاکستانیوں نے ہندو شاعروں کی خاطر خواہ پذیرائی کی اور وہ مسلمانوں کی فراخ دلی، وسعت ظرف اور رواداری کا اثر لے کر واپس ہوئے، پاکستان سے اس مدت میں بس صرف ایک بار یہاں کے شعرا بھارت کے ایک مشاعرے میں گئے ہیں۔

ارباب اقتدار اور حکومت پاکستان کی روش اور طرز عمل پر جن نظموں میں طنز و تنقید ہوتی ہے وہ اُن کو پبلک بہت زیادہ پسند کرتی [illegible] پتا چلتا ہے کہ ہوا کا رخ کدھر ہے؟ اور عوام کیا چاہتے ہیں، نہ جانے خفیہ پولیس والے مشاعروں کی صحیح کیفیت اوپر والوں تک پہونچاتے بھی ہیں یا نہیں؟ اس قسم کے اشعار پر:-

ہم کو وہ قانون اور ایسی حکومت چاہئے
جس میں اک بڑھیا خلیفہ کا گریباں تھام لے

سامعین داد و ستائش کے جوش میں بے اختیار ہو ہو جاتے ہیں جیسے اُن کے جذبات کی صحیح ترجمانی ہو رہی ہے؛ سرکاری عہدیداروں کے چہروں کا اتار چڑھاؤ، ایسی نظموں کے وقت دیکھنے کے قابل ہوتا ہے، ناخوشی کا اظہار کھل کر وہ کر نہیں سکتے اور مسکرانے کی کوشش میں زیادہ کامیابی نہیں ہوتی!

یہ جو کچھ کہا گیا ہے، سنی سنائی باتیں نہیں، آنکھوں دیکھا حال ہے کہ:-

؎ رہ قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید

افسانہ کی اصل بنیادی قدریں

اصغر علی عابدی

زمانہ کی ستم ظریفی دیکھئے کہ تمام قدیم، جدید، اور جدید تریں تصورات اور رجحانات جو آج تک افسانے میں بسے رہے۔ اب اپنی عمر کے آخری دور میں داخل ہو چکے ہیں۔ اگر یہ ایک طرف سے ابھرتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں تو دوسری طرف سے دبنا بھی شروع ہو گئے ہیں۔ وہ قدریں جو قدیم جاہلانہ افسانوی ادب کا ورثہ تھیں کچھ تو اپنی ناجائز قدامت پسندی اور کچھ توہم پرستی، خیال پروری اور زندگی سے دوری کے باعث شکست کھا کر میدان چھوڑ چکی ہیں تو وہ اصول جو بگڑے ہوئے مذہب نے اگلے تھے، لامذہبیت سے پہلی ہی ٹکر میں اندھے بھینسے کی طرح پریشان ہو کر پیچھے ہٹ گئے ہیں۔ اور وہ نظریات جو مغربی سیکولرزم یا کمیونزم کے سایہ میں پروان چڑھے تھے۔ یعنی "جدید نظریات" جو فی الحال میدان میں قابض نظر آتے ہیں، اندر سے بالکل کھوکھلے ہو چکے ہیں ان کے ہر ہر جز کے خلاف خود ان کے اندر سے بغاوت پھوٹ پڑی ہے اور یہ بغاوت ایک نہ ایک دن انہیں ضرور لے بیٹھے گی۔ تمام ناپاک اور گندہ عناصر اب افسانے کے جسم سے آہستہ آہستہ چھٹتے جا رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کوئی غیر مرئی ہاتھ انہیں چپکے سے پکڑ کر ان کی گردن مروڑ دیتا ہے۔

خود غرضی اور قوم پرستی کے جسم پر باہمی کشاکش کی صورت میں خوب تیز چھریاں چل چکی ہیں۔ اندھی وطن پرستی کے پیر قبر میں لٹک رہے ہیں۔ تہذیب سکھانے، آزادی دلانے اور تمدن لانے کے نام پر لوٹ کھسوٹ کی تحریک چاہے وہ اینگلو امریکی انداز میں اٹھائی گئی ہو یا کومنٹارم کے روپ میں اب خوب ننگی ہو کر سامنے آ چکی ہے، دنیا کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا انسانی گروہ بھی اس سنہرے جال میں پھنسنے کے لئے تیار نہیں۔ فرقہ واریت کی جگہ اگرچہ طبقہ واریت لے رہی ہے لیکن اس کے گلے کی طرف بھی زمانہ کا بیدرد ہاتھ بڑھ رہا ہے۔ لوگ سمجھ رہے ہیں کہ یہ اس سے بھی زیادہ نکمی اور تباہ کن شے ہے۔ "مزدور دوستی" "کسان دوستی" اور "محنت پیشہ عوام کی حمایت" نئے اقتدار پسندوں کا محض ایک پُر فریب نعرہ بن کر رہ گئی ہے۔ نسل، رنگ اور زبان کی بنیاد پر امتیازات کے بندھن اب ڈھیلے پڑ چکے ہیں اور لوگ ان ڈھیلی گرہوں کو دوبارہ تنگ کرنے کی طرف متوجہ نہیں۔ عریانی، بے حیائی اور لذت پسندی کا جنازہ بھی بڑی شان سے اٹھتا دکھائی دیتا ہے جو دانی اور جنسی مقاصد کی خاطر پامال محبت کے ہزار بار الاپے ہوئے راگ کو دوبارہ الاپنے کا خیال اب متروک سمجھا جانے لگا۔ ان بے سُرے نغموں سے تمام سمجھدار انسانوں کو متلی سی ہونے لگی ہے۔ یہ کام اب صرف بازاری لوگوں کا مشغلہ سمجھے جاتے ہیں۔ اگرچہ بعض حکومتیں اور ادارے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر ان کی سرپرستی کر رہے ہیں لیکن ان بیہودہ باتوں کو آرٹ کے تحفظ کا نام دے کر یا کلچر، دھرم، اور سنسکرتی کا واسطہ دے کر کچھ زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رکھا جا سکتا۔ انسانیت کے اہم ترین مسائل کے مقابلہ میں یہ سب بے معنی تخریبی اور غیر مفید کام ہیں ان کا کوئی اخلاقی اور اجتماعی فائدہ ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ تمام ممالک کے تعمیری رجحان رکھنے والے لوگ اپنے اپنے ملکوں کی ان خرابیوں کے خلاف دکھ کی شدت سے چیخ اٹھے ہیں چیخیں اور نعرے رنگ لائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان سے انجمن کی کتنی ہی شمعوں کا گل ہو جانا یقینی ہے۔ اب سماج اور معاشرت کی دکھتی ہوئی رگوں کو ساری دنیا کا مشترک ضمیر پہچان رہا ہے۔ اور ایک ہیجان سا ہے جو اس گھناؤنے پن کے خلاف ابھر رہا ہے جو آج تک عطر اور خوشبو سمجھ کر جسم پر لیپا جاتا تھا۔ [illegible] کی تائید میں جو فلسفے گھڑے گئے تھے۔ لذتیت (Hedonism) [illegible] جائز ٹھہرانے کے لئے جو انوکھے استدلال وضع کئے گئے تھے وہ اس علمی وسعت کے باوجود پھیکے اور بے مزہ ہوتے جا رہے ہیں اب اس بے مزہ لعوق کے مسالے پر بھنبھناتی مکھیاں دیکھ کر سنجیدہ لوگ ان نجاست پسند [illegible] سلام کر [illegible]۔ یہ فلسفے ایک بیساکھی بن گئے ہیں جن کے اندر سے [illegible] کی گولی نکل آئی ہے۔ لہذا اس نقلی "جنالیٹ" [illegible] کا استعمال ہو جانا ایک لازمی امر ہے۔

افسانہ کی اصل بنیادی قدریں

بڑی خوشی کی بات تو یہ ہے کہ ان تمام انقلاب انگیز جذبات کی عکاسی سب سے زیادہ اِس دور کے شاعر اور افسانہ نویس نے کی ہے۔ وہ چاہے دنیا کے کسی گوشے کا رہنے والا ہو۔ امریکہ کا، برطانیہ کا۔ بھارت کا۔ یا روس اور چین کا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا بھر کے شاعروں اور افسانہ نویسوں میں اعلیٰ سطح پر ایک داخلی اتحاد موجود ہے، اور یہ داخلی اتحاد تعمیر و اصلاح کے اُس ابدی شعور کا نتیجہ ہے جو انسانیت کی تخلیق کے وقت اُس کے توام میں گھلا ملا دیا گیا تھا۔ ایک ادیب اگر وہ صحیح معنوں میں ادیب ہے اور اپنے قلب کی گہرائیوں میں اتر سکتا ہے۔ وہ صرف ظاہر پرست نہیں۔ وہ ایک پتھر کا دل رکھنے والا انسان نہیں بلکہ کسی زندہ خون کے پاکیزہ دھارے کا محض ایک ہلکا سا موڑ ہی اُس کا دل ہے تو یقیناً اس میں وہ حس اور بیکلی ہوگی جو زندگی کی اعلیٰ قدروں کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔

ہم اس دور کے بین الاقوامی افسانے کا جائزہ لیں گے تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ کس طرح افسانے میں وہ باتیں ابھر رہی ہیں جن کو ابھرنا چاہئے۔ بلاشبہ ان افسانہ نویسوں کے ذہن پر ابھی تک وہ تمام غلط تصورات لدے ہوئے ہیں جن کے خلاف خود یہ نبرد آزما ہیں، اور اس طرح ان کے اندر ایک ذہنی الجھن کا پتہ بھی چلتا ہے۔ لیکن جہاں تک ان حقائق کا تعلق یا حقائق کی اُس تائید کا تعلق ہے جو جگہ جگہ اُن کے قلم سے ٹپک پڑی ہے وہ نہایت کام کی چیز ہے اور قابل ستائش ہے۔

ایک مغربی افسانہ نویس اپنی کہانی (The Village [1]) میں جنگ عالمگیر ثانی کے پس منظر میں جرمنوں اور اتحادیوں کے اقدامات کو انسانیت اور خدا پرستی کے خلاف بتاتا ہے۔ اس نے اس کہانی میں دکھایا ہے کہ کس طرح ایک موقع پر ہم نے ایک گاؤں کے قریب پڑاؤ ڈالا۔ اس گاؤں کے قریب جن میں بدمعاش انسانوں کے ساتھ ایک شریف خدا ترس اور خادم انسانیت آدمی بھی رہتا تھا۔ لیکن جب جرمن فوجوں نے اقدام کیا۔ اور ہم نے بھی حملہ کی تیاریاں کیں تو میں نے پہاڑی پر دیکھا کہ ہماری توپوں کے دہانے سے نکلنے والے گولے ٹھیک اُس گاؤں پر پڑ رہے ہیں۔ اور اُس کا ایک ایک مکان تباہ ہو رہا ہے۔ وہ خدا دوست اور امن پسند انسان لوگوں کو بچانے کے لئے دوڑ دھوپ کر رہا ہے۔ لیکن اچانک ایک گولے نے اُس کا کام بھی تمام کر دیا۔ اب صرف دو چھوٹے چھوٹے یتیم بچے رہ گئے ہیں جنہیں اس نے بچایا تھا اور وہ اُس کی لاش کو گھسیٹ کر ایک طرف لے جا رہے ہیں ——" یہ ایک انتہائی دردناک منظر کشی ہے جس میں یقیناً حقیقت کی طرف کچھ اشارے ملتے ہیں اور کچھ پائدار قدریں اُبھرتی ہیں۔

اسی طرح ایک اور افسانے (Fifth Day [1]) میں ایک فرانسیسی افسانہ نویس نے جماعتی زندگی کے اندرونی خدوخال واضح کئے ہیں اور خالص تحریکی اور اصولی انداز میں بتایا ہے کہ کس طرح ایک تحریک کا ہمہ وقتی کارکن جس نے اپنی زندگی سے زبان، چشم و گوش، اور جسم کی تمام لذتوں کو رخصت کر دیا ہے اور صرف جماعتی مقصد ہی میں اس کے لئے حقیقی لذت رہ گئی ہے۔ ایک آزمائش کے وقت جبکہ اس کے ساتھی اور وہ پولیس کی گاڑی میں بند کسی نامعلوم مقام کی طرف جا رہے ہیں، چلتے چلتے پانچواں دن شروع ہو گیا ہے، بھوک پیاس سے بُرا حال ہے، حلق سے آواز تک نہیں نکلتی۔ ناکامی اور شکست کا مظاہرہ کرتا ہے۔ وہ اپنے ساتھی سے جو کم عمر ہے بڑے فخریہ انداز میں اپنے تجربوں کا ذکر کرتا ہے، اُسے مستقل مزاجی کی ہدایت کرتا ہے اُس کی زیادہ باتوں پر گمان کرتا ہے کہ اس کا لعاب دہن جلدی خشک ہو جائے گا اور اس کی ہمتیں اُس سے پہلے جواب دے دیں گی۔ لیکن جب اسے محسوس ہوگا کہ اب خود اس کی موت قریب آگئی ہے۔ بھوک اور پیاس نے اُس کے گلے پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔ مگر اس کا "نوعمر" اور "ناتجربہ کار" ساتھی ابھی تک بحال ہے تو وہ بمشکل اپنے ہاتھ اُس کم سن ساتھی کے گلے تک لے جاتا ہے اور پوری قوت سے اس کا گلا گھونٹ دیتا ہے اور اس کے بعد خود بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اس طرح استقامت کا پانچواں دن منزل مقصود کی آمد سے قبل ایک عجیب سماں پیش کرتا ہے۔ افسانہ میں انفرادی غرض پرستی اور شہرت و نمود کے اُس پوشیدہ جذبے کی نہایت عمدہ طریقہ پر عکاسی کی گئی ہے جو ایثار و قربانی کے لاتعداد مظاہر کے پیچھے چھپا رہتا ہے۔

کہانی میں خاص طور پر یہ بات دکھائی گئی ہے کہ جب آدمی کے سامنے کامیابی اور ناکامی کا معیار موت سے پہلے صرف اِسی دنیا میں کامیابی یا ناکامی ہو تو وہ بسا اوقات عارضی کامیابی کی خاطر خود اپنے ہی کمزور ساتھیوں کے خون میں ہاتھ رنگنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ اس واقعہ میں انتہائی جوش و خروش کے ساتھ "جہاد"

---

[1] واضح ہو کہ یہ کہانی اور دوسری کہانیاں جن کی مثالیں اِس مضمون میں دی گئی ہیں۔ سب کی سب بین الاقوامی افسانوی مقابلہ کی کہانیاں ہیں۔ اور اپنے اپنے ملکوں میں پہلا انعام حاصل کر چکی ہیں۔ جس سے ان کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے

میں حصہ لینے والے اُس سپاہی کی داستان پوشیدہ ہے جو زخموں کی تکلیف سے اس قدر نڈھال ہو گیا کہ شہادت کا شیریں جام پینے کے بجائے اُس نے بے صبری سے خودکشی کا زہر بھرا پیالہ منہ سے لگا لیا!

ڈنمارک کے ایک افسانہ نویس (Cristion Galshiot) نے اپنی کہانی (Rings under the water) میں دو عجیب کردار دکھائے ہیں، ایک مالدار اور چھیل چھبیلا قسم کا انسان ہے اُس کی ذہنیت قطعاً سرمایہ دارانہ (کمیونسٹ فلسفہ کے مطابق) ہے وہ غریب انسانوں کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور کوئی بھکاری اس سے بھیک مانگے تو وہ طرح طرح سے اُس کا مذاق اڑانے اور اُس کو ذلیل کرنے کے بعد اُسے کچھ پیسے دے دیتا ہے۔ ایک دن جب وہ ایک بھکاری کو اسی طرح ذلیل کر رہا تھا ایک بحری فوج کا سپاہی اُس طرف آنکلتا ہے اور اس مہذب آدمی کی یہ ذلیل حرکتیں دیکھ کر خوب پیچ و تاب کھاتا ہے، یہاں تک کہ وہ آپے سے باہر ہو جاتا ہے اور اُسے مار کر ہوٹل سے باہر نکال دیتا ہے، وہ کنگلا جو بہر حال اسی طرح ذلت کا نشانہ بنتا تھا سپاہی کی طرف دیکھتا ہے۔ سپاہی ازراہِ مہربانی ایک نوٹ نکال کر اس کو دیتا ہے۔ لیکن کنگلا نفرت سے نوٹ پھینک دیتا ہے اور پوری قوت سے اُس کو ایک لات رسید کرتا ہے۔ بیخبر خود سپاہی لڑکھڑا کر گرتا ہے اور کنگلا بڑبڑاتا ہوا چل دیتا ہے۔ —— انسانی نفسیات کا یہ ایک نہایت ہی گہرا مطالعہ ہے اس میں انسانی طبقات کی کش مکش پر اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ ذلیل کئے جا رہے ہیں۔ تو اس ذلت کا علاج صرف سرمایہ دار کو مار کر بھگا دینا نہیں ہے بلکہ اس کا علاج خود ان پسماندہ لوگوں کے ذہن و فکر کا علاج بھی ہے۔ دراصل ہر شخص کی بدمزاجی اور خرابی کا منبع اُس کا اپنا ذہن ہے۔ ان کا ضمیر ہے۔ جس پر ماحول کے اوپری سانچوں نے بھی ایک حد تک زنگ چڑھا دی ہے۔ لیکن اصلاح کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ خارجی نظام کی اصلاح کسی جانک تخریبی انقلاب کے ذریعہ نہ کی جائے بلکہ دھیرے دھیرے پُرامن اصلاحی اور انقلابی طریق پر کی جائے اور داخلی خرابی یعنی ذہن اور قلب کی خرابی کو خاصی اہمیت دی جائے۔ یہ سب باتیں اس مختصر کہانی کے مجمل اشارات میں بڑی عمدگی سے سمو دی گئی ہیں۔

اسی قسم کی ایک کہانی (Cyclone) ہے۔ جو بین الاقوامی افسانوی مقابلہ میں اول آنے والی دوسری کہانی ہے۔ مدراس کے پی۔ پدمارا جو نے دو نہایت دلچسپ کرداروں کا تذکرہ کیا ہے اس نے دکھایا ہے کہ کس طرح ایک مہذب اور سرمایہ دار بابوجی ریل کے ڈبے میں ایک پانی میں شرابور بھکارن کو دیکھ کر کسمساتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد حسنِ اتفاق سے جب وہ سخت طوفانی بارش کی حالت میں اسٹیشن پر اُترتے ہیں تو کوئی آدمی انہیں سامان لے جانے والا نہیں ملتا۔ اور وہی بھکارن اس کی مدد کرتی ہے اور ان کا سوٹ کیس اٹھائے انہیں ویٹنگ روم تک پہنچاتی ہے۔ بابوجی اسے کچھ دے کر رخصت کر دینے ہیں لیکن شدید بارش۔ آندھی اور تاریکی ان دونوں کو پھر ایک جگہ جمع کر دیتے ہیں۔ بابوجی پر حیوانی خواہشات کا غلبہ ہوتا ہے۔ اور سفلی جذبات کی بالکل نچلی سطح پر اتر آتے ہیں۔ بھکارن اپنا کام کر جاتی ہے وہ بابوجی کے بیدار ہونے سے پہلے اُن کا بٹوہ لے کر چمپت ہو جاتی ہے، بابوجی جاگتے ہی ہکا بکا رہ جاتے ہیں۔ تلاش شروع ہوتی ہے۔ دن کی روشنی میں آندھی اور طوفان سے ڈھکے ہوئے پلیٹ فارم پر بکنگ گھر کے ملبے کے نیچے بھکارن کی نصف کچلی ہوئی لاش ملتی ہے جس کے ہاتھ میں بابوجی کا پرس ہے۔ بابوجی خیال کرتے ہیں وہ ان کا پرس تلاش کر کے انہیں دینے کے لئے آرہی تھی جو کہیں گر گیا تھا۔

اس افسانے میں حالات کی تبدیلی سے ایک مغرور انسان کی نخوت کا خاتمہ اور پھر ایک بے کردار عورت کی مکمل بے ضمیری اور اس کے دردناک انجام سے جو نتائج نکلتے ہیں بڑا (Rings under the water) سے سامنے آتے ہیں۔ افسانے میں یہ تقاضات بہت زیادہ ابدافزا ہیں۔ بلجیم کے ایک افسانہ نویس (Raymond Gerome) نے اپنی کہانی (Roy) میں رنگ کے امتیاز پر حملہ کیا ہے۔ اس کہانی کے واقعات عریانیت اور لذت پسندی میں ڈوبے ہوئے ہیں لیکن اس کا مرکزی خیال نہایت اہم ہے۔ اس میں ایک حبشی کا کردار دکھایا گیا ہے جسے گوری رنگ والی عورت اپنی خواہشات کا نشانہ بناتی ہے مگر بالآخر اس عشق بازی کا نتیجہ حبشی کی موت کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ گوری چمڑی والے رنگ کالی رنگت والے انسانوں کو آج بھی دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں خود سے کمتر سمجھتے ہیں۔ افسانہ نویس نے ایک اور کمال یہ کیا ہے

حد سے بڑھے ہوئے جرائم پر بھی تنقید کی ہے اور بتایا ہے کہ اُن کی ذلت کا سبب خود اس کی ذہنیت کی خرابی تھی۔ یہ اعتدال پسندی اور صراطِ مستقیم کی تلاش آج ہمارے ادب میں جاری ہو جائے تو بڑا کام ہو سکتا ہے۔

ناروے کے افسانہ نویس (John Borgen) نے اپنی کہانی ("Love will banish my childhood dreams") میں نفسیاتی تجزیہ کو انتہائی بلندی پر پہنچا دیا ہے۔ اس کہانی میں صرف دو کردار ہیں ایک عورت اور ایک مرد یہ افسانہ نویس کے نزدیک ساری دنیا کے عورت مرد کے نمایندہ ہیں۔ ان کے درمیان تعلقات کو خوشگوار بنانے کے لئے وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھنے کا اصول پیش کرتا ہے۔ باہمی اعتماد کی تلقین کرتا ہے۔ اور پھر ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد دائمی رشتہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس افسانے کے واقعات خالص رومانی اور حسن پرستانہ ہیں۔ اس میں پرائیویٹ زندگی کی بے حیائی بھی اُجاگر ہے۔ لیکن کانٹے کی بات یہ ہے کہ عورت اور مرد کا باہمی تعلق کچھ اس طرح قائم ہو کہ بچپن کے معصومانہ جذبات کو ٹھیس نہ لگنے پائے۔ ان تصورات کی مالا اُسی طرح گندھی رہے۔ اس طرح افسانہ نویس نے محبت کو سفلی جذبات کے اظہار کا ایک طریقہ بنانے کے بجائے بچپن کے فطری اور معصوم احساسات تک نیچے اتار دیا ہے۔ اس میں خاص طور پر عورت کے کردار کو بچپن کا زیادہ پسند کرنے والا اور اس کا نمایندہ بتایا ہے۔ اور یہ بالکل صحیح ہے۔ عورت کے مزاج کی نزاکت کا خصوصیت سے تذکرہ کیا ہے، جو یقیناً قابلِ قدر ہے اگر رومانی افسانہ ان راہوں پر چلتا رہے تو وہ اعلیٰ تعمیری اور اخلاقی مقاصد کی بلندی تک بآسانی پہنچ سکتا ہے۔

جنوبی افریقہ کی ایک افسانہ نویس خاتون (Ori Scheal) نے اپنے افسانے (The Girl from Onde-Krall) میں ایک قدم آگے بڑھایا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ کس طرح ایک لڑکی کو اپنی شادی کے وقت والد کے نام کی تلاش ہوتی ہے اور اس کی تحقیق کے لئے وہ اپنے گاؤں جاتی ہے۔ جہاں اُسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُس شخص کی ناجائز اولاد ہے جس کے پاس اس کی ماں ملازمہ کی حیثیت سے کام کرتی تھی۔ یہ خطرناک واقعہ اُس کے تمام اعلیٰ منصوبوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔ اس واقعہ میں مغربی معاشرت کی دکھتی ہوئی رگ کو خوب زور سے دبایا گیا ہے۔ جبکہ اس میں مشرق کی موجودہ سوسائٹی کا عکس بھی پوری طرح موجود ہے۔ کیونکہ افسانہ نویس خاتون جنوبی افریقہ میں رہتی ہے اور وہاں بیٹھ کر "مشرق و مغرب" دونوں طرف دیکھ سکتی ہے۔

ایک فرانسیسی افسانہ نویس (Pierre Boileau) نے اپنے افسانے (De Daniel Pecrons Complex) میں مجرمانہ ذہن کے الجھاؤ کا غیر معمولی تجزیہ کیا ہے۔ تحلیل نفسی یا تزکیۂ نفس کا یہ ایک کامیاب عمل ہے۔ اس افسانے کا (Theme) یقیناً کچھ بلند نہیں بلکہ گھٹیا واقعہ زندگی کا تابع ہے۔ لیکن جو بات اہمیت رکھتی ہے وہ ایک مجرم کے ضمیر کی اندرونی آواز ہے جو بار بار اُسے روکتی ہے یہ تجزیہ انوکھے نفسیاتی طریق پر بڑی عمدگی سے کیا گیا ہے۔ اور بہت چھپتا ہوا ہے، اس میں ہمارے آس پاس کے کتنے ہی جرم پسند کرداروں کا اچھا پوسٹ مارٹم ہے۔ ایک شخص اپنے جی کو دھوکہ دے کر کسی کے نام سے دس لاکھ فرانک بینک سے اڑا لیتا ہے اور بڑے بڑے منصوبے بنا کر فوراً بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ عمدہ لباس پہنتا ہے تو ... ہوئے وہ فرسٹ کلاس میں سفر کرتا ہے مگر جھجکتا ہے۔ وہ ایک اونچے درجہ کے انسان سے بات کرنا چاہتا ہے لیکن ناکام ہوتا ہے، وہ ایک سگار نکال کر پینے کی کوشش کرتا ہے مگر اُسے جلانے تک میں کامیاب نہیں ہوتا یہاں تک کہ وہ پشیمان ہو کر کاریڈور کی طرف چلا جاتا ہے اور اپنا چھپا لیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے یہ سب کچھ اس لئے ہو رہا ہے کہ اُسے ان کاموں کی عادت نہیں ہے لیکن جب اس کی منزل مقصود آجاتی ہے اور سوٹ کیس لے کر اترتا ہے تو دروازے میں کھڑے ہوئے آدمی جو کسی کو لینے کے لئے آئے تھے اُسے جاسوس نظر آتے ہیں وہ تیزی سے پلیٹ فارم طرف لپکتا ہے۔ اور شہر میں پہنچ جاتا ہے۔ اُسے موقع حاصل ہے کہ اپنی اڑائی ہوئی رقم کو جس طرح چاہے صرف کرے لیکن رات بارہ بجے تک اپنی جیب میں دس لاکھ فرانک کی کثیر رقم ڈالے شہر میں گھومتا رہتا ہے اور ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کر سکتا۔ یہاں پہنچ کر افسانہ ختم ہو جاتا ہے پڑھنے والے کے ذہن پر پہلا اثر یہ ہوتا ہے کہ کتنا احمق تھا۔ لیکن دوسری ہی دفعہ وہ سمجھ جاتا ہے ایک مجرم کا ضمیر اس کو اسی قسم کی الجھن میں مبتلا کر سکتا ہے۔ اور ... کے جرم کی اولین ذہنی سزا یہی ہو سکتی ہے، کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اس قسم کی سزا پانے والے کتنے ہی مجرم آج مہذب لباسوں میں انسانی سماج کے

اخلاق کو گھن کی طرح کھو کھلا کر رہے ہیں اور ساتھ ہی خود بھی کھوکھلے ہو رہے ہیں ؟

ایک اور کہانی (The Sword of Shiva) میں خواجہ احمد عباس نے دکھایا ہے کہ کس طرح ایک زمیندار کے لڑکے نے ایک نادار طبقے کی عورت کی عصمت لوٹی تھی اور پھر کس طرح اُسی ٹھاکر زادے ، . . . .

ایک مسلمان پٹواری اور ایک برہمن نے آندھی اور مینہ کے وقت اُس عورت کو محض اس لئے محفوظ مقام پہ آنے نہ دیا کہ وہ نیچ ذات سے تعلق رکھتی تھی۔ اس میں خواجہ احمد عباس کا تصورِ مذہب کے بارے میں صحیح نہیں ہے۔ وہ موجودہ پنڈتوں اور بعض مسلمانوں کے غلط اعمال کو دیکھ کر اُسی پر مذہب کا قیاس کرتے ہیں۔ ہندو دھرم کے بارے میں تو نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے کس قدر اُسے سمجھا ہے لیکن "اسلام" کے بارے میں ان کا مطالعہ نہایت محدود معلوم ہوتا ہے۔ وہ اسلام اور "مذہب" کی مروجہ شکل میں تمیز نہیں کر سکے۔ تاہم اس افسانے میں ایک چیز کام کی ہے اور وہ ہے محدود مذہبیت پر تنقید، پنڈتوں اور مذہبی پیشواؤں کے طرزِ عمل پر ضرب، جنہوں نے دین اور دھرم کو اپنی ذاتی اغراض کا آلۂ کار بنا رکھا ہے، افسانہ نویس نے بڑی خوبی سے مختلف کرداروں کو پیش کر کے ان تصورات پر چوٹ کی ہے اور بجا کی ہے۔ آخر میں افسانہ نویس نے دکھایا ہے کہ کس طرح آسمانی تلوار (بجلی) اس عورت کو نشانۂ ظلم بنانے والوں پر ٹوٹ پڑتی ہے اور انہیں بھسم کر دیتی ہے۔ یہ نتیجہ بہت عمدہ ہے اور اس کی وجہ سے خواجہ احمد عباس اور اُن کی طرز پر سوچنے والوں کے ساتھ بہتر توقعات پیدا ہوتی ہیں۔

بھارت اور مغربی ممالک کی طرح خود روس، چین اور مشرقی یورپ میں بھی افسانہ نگار ایسی باتیں کہنے پر مجبور ہو رہے ہیں جو انسانیت کی اعلیٰ قدروں سے میل کھاتی ہیں اور جو مادہ پرستانہ نظام میں نہیں بلکہ خدا پرستانہ نظام میں ہی فٹ ہو سکتی ہیں۔ معلوم نہیں خدا یا ان کو متفارم ان لوگوں کی ان حرکات سے باخبر بھی ہیں یا نہیں اور ان کو اپنے نظام کے بودے پن اور کمزوری کا احساس ہو رہا ہے یا نہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ ادیب چاہے اُس کے ابدی شعور کو لایعنی فلسفوں سے کتنا ہی دبایا اور کچلا گیا ہو۔ اور اس کو مشین کا پرزہ سمجھ کر پورے اجتماعی نظام کی دُم سے باندھ دیا گیا ہو، مگر وہ حقیقت کے لئے برابر بے چین ہے۔ تاہم یہ بات یقینی ہے کہ روس، چین اور ان تمام ممالک کے فن کار جو کمیونسٹ جبریت کے تحت جی رہے ہیں، جبریہ بے ضمیری اور مشینی جذباتیت میں اور لوگوں سے بڑھے ہوئے ہیں۔ خود گورکی جیسا ادیب آخر زمانے میں محسوس کرنے لگا تھا جیسے اُس کا دم گھٹ رہا ہو اور اُس کے قلم کے راستے میں پہاڑ حائل ہو گیا ہو۔ ابھی ہمارے ملک بھارت کے سرخ ادیبوں کو کمیونسٹ خداؤں نے چھٹی دے رکھی ہے اس لئے وہ بیچارے اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اُن کے "لا ابالی پن" اور "بے لگام آزادی" کو سُرخ سویرا ہو جانے کے بعد بھی یونہی رہنے دیا جائے گا۔ حالانکہ یہ بات غلط ہے۔ اگر وہ اپنی دوسری صف کے رہنما ماؤزے تنگ کے خیالات کا بغور مطالعہ کریں تو ان کی غلط فہمی دور ہو سکتی ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود بین الاقوامی افسانوں (چاہے وہ مختصر افسانے یعنی کہانیاں ہوں یا ناول یا ڈرامے) کا موجودہ رجحان بتاتا ہے کہ ان کا قدم تیزی سے اصلاح اور حقیقی ترقی کی طرف اٹھ رہا ہے اور امید بندھتی ہے کہ افسانوی ادب میں بہت جلد ایک صالح انقلاب آ جائے گا۔ لیکن اس معاملہ میں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ افسانے میں جو صالح عناصر داخل ہوتے ہیں وہ ٹھوس بنیادوں پر قائم نہیں ہیں۔ اور نہ ان کے داخلے کا خود افسانہ نویسوں کو شعور ہے۔ ان کی مثال ان ہلکے ذروں کی سی ہے جو ہوا میں اڑ کر بالکل اتفاق سے اِدھر آ نکلے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ افسانہ نویس اپنے آرٹ میں اچھائیوں کے ساتھ برائیوں کی پرورش بھی کر رہے ہیں۔ ان کے ذہن میں انتشار اور کشمکش ہے۔ اُن کے افسانوں میں غیر موزونیت یا عدم مطابقت ہے۔ اُن کے اندازِ بیان میں وہ بلندی نہیں جو اعلیٰ افکار کے لئے ضروری ہے۔ ابھی تک وہی گھٹیا پن بلکہ بازاری پن رائج ہے جو محض پیسے بٹورنے کے لئے اختیار کیا جاتا ہے۔ پھر ان سب باتوں سے زیادہ مہیب حقیقت یہ ہے کہ فن کار اپنی اصلاح کے لئے شعوری جد و جہد کے قائل نہیں ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اصلاح خود بخود ہو جائے گی۔ اور خود بخود ہم آگے بڑھ جائیں گے۔ اگر آج ہمارے اندر کچھ صالح عناصر داخل ہو گئے ہیں تو توقع ہے کہ کل ان میں اس حد تک ارتقاء ہو جائے گا کہ کوئی چیز غیر صالح باقی نہیں رہے گی۔ کیونکہ "ٹھیرو اور دیکھو" کے اصول پر عمل کر کے ادب کی گاڑی کو ٹھیک وقت پہ اسٹیشن پہ پہنچنے دیا جائے لیکن افسانہ نویس بھولتے ہیں۔ اُن کی گاڑی موجودہ منزل تک از خود نہیں پہنچ گئی ہے۔ اس گاڑی کو گذشتہ دو عالمگیر جنگوں نے زبردست دھکا دیا ہے۔ اور پھر موجودہ کوریا کی جنگ نے تیزی سے آگے کی طرف دھکیلا ہے۔ ان لڑائیوں سے اُن تمام نظریات کا پردہ چاک ہو گیا جو انسانیت کی حمایت اور ہمدردی کا آئے دن راگ الاپا کرتے تھے۔ ایٹم بم کے پہلے دھماکے نے اس راز کو فاش کر دیا۔ اور پھر

افسانہ کی اصل بنیادی قدریں

ایٹم بم بنانے کی دوڑ اور اس کے رازوں کو افشا کرنے کی کوششوں نے کتنے ہی شریف آدمیوں کے لبادے اتار کر ان کے خونخوار منصوبوں کو آشکار کر دیا ہے۔ افریقہ میں رنگ اور نسل کے امتیاز کے خلاف کش مکش نے تمام دنیا کے امتیاز پسندوں اور ذات پات کے علمبرداروں کے کان کھڑے کر دیئے ہیں۔ اس سے پہلے امریکہ میں حبشیوں پر توڑے جانے والے مظالم نے بھی کچھ کم کام نہیں کیا ہے۔ یورپ اور سارے مغربی دنیا میں عورت اور مرد کے آزادانہ اختلاط نے جو نتائج پیدا کئے ہیں، انہوں نے جنسی بے راہ روی کے تمام فلسفوں پر لات ماردی ہے۔ یقیناً اس مخالفانہ جذبہ کی پیدائش میں کتنی ہی عصمتوں کے خون، کتنے ہی معصوموں کا قتل، اور کتنے ہی گھناؤنے امراض کے جراثیم کی انتھک اور عبرت انگیز کوششوں کا دخل ہے، کیا ان تحریکوں، اور آزادی کوششوں کا ہمارے ادیبوں کو علم نہیں ہے، وہ آخر جانتے ہوئے بھی اس قدر بھولے کیوں بنتے ہیں؟ یہ صحیح ہے کہ افسانہ نویسوں نے خود کوئی آزادی جد وجہد نہیں کی لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ دوسروں نے بھی کوئی کوشش نہیں کی۔ اگر اوروں کی کوششوں سے ہمارے ہاتھ کوئی قیمتی چیز آگئی ہے تو اسے یونہی ضائع کر دینا سخت حماقت ہوگی۔ اس کو باقی رکھنے اور پروان چڑھانے کی فکر نہایت ضروری ہے، ان قدروں کو جو آج افسانے میں ابھر آئی ہیں یقیناً چند حادثات نے پیدا کیا ہے لیکن اگر ہم نے انہیں پہچان کر اپنے اندر ان کے لئے جگہ نہیں بنائی تو چند دوسرے واقعات انہیں زائل بھی کر سکتے ہیں۔ یہ قدریں اس آزاد پرندے کی مانند ہیں جسے کسی نے ہمارے گھر کی طرف اڑا دیا ہے۔ اور اس نے اس شاخ پر بسیرا کیا ہے جو ہمارے صحن میں لٹک رہی ہے۔ اگر پرندے کو روکنے کی کوشش نہیں کی تو کل وہ یقیناً اڑ جائیگا۔ ہمیشہ سے یہ ایک قاعدہ کلیہ چلا آتا ہے کہ جب کچھ لوگ شعوری طور پر آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ آگے بڑھتے ہیں۔ ورنہ اپنی جگہ کھڑے کھڑے دھنسنے لگتے ہیں یا پیچھے کی طرف پھسلنے لگتے ہیں۔ لیکن غلط فہمی سے وہ یہی سمجھتے رہتے ہیں کہ ہم آگے بڑھ رہے ہیں۔ ایسا سمجھنے والوں کا مزاج اس چھوٹے بچے کی طرح ہے جو گھر کے پھاٹک پر لٹک کر اسے ادھر سے ادھر چلاتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ وہ ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف جا رہا ہے۔ جو افسانہ نویس ترقی کے اس غلط مفہوم کا شکار ہیں۔ انہیں سوچنا چاہیئے کہ اگر کائنات میں روز اول سے لے کر آج تک مسلسل ارتقا ہی ہو رہا ہے تو پھر یہ غلطیوں کی تکرار کیا معنی رکھتی ہے؟ اگر فن کار آنکھیں کھول کر دیکھیں تو انہیں محسوس ہوگا کہ لکھنے لکھانے کے آلے تو ضرور بدلتے رہتے ہیں۔ اسلوب اور ڈھنگ بھی بدلے ہیں اور زبان بھی بدل لی ہے۔ لیکن بار بار وہی خیالات روپ بدل بدل کر آتے ہیں۔ اور انسانیت کو ایک ہی قسم کے نتائج سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ وسائل سفر تو بدل گئے اور انداز سفر بھی کچھ کچھ بدلا۔ لیکن سمت سفر اس وقت تک نہیں بدلتی جب تک اس کے لئے کوئی ارادی جد وجہد نہیں کی جاتی۔ آج تک کی تاریخ کا ایک ایک حرف اس پر گواہ ہے۔

دراصل جس طرح یہ بات غلط ہے کہ ادیبوں کو کسی سیاسی یا اقتصادی تنظیم کا دم چھلا بنا دیا جائے۔ ان کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی جائیں، ان کے قلم دوات کو زنجیروں سے کس دیا جائے اور ان کو مشین کا ایک پرزہ قرار دے کر ہینڈل گھماتے ہی ان سے ان تمام چیزوں کی توقع کی جائے جو سربراہ کاروں کے نزدیک پسندیدہ ہیں، چاہے ان پر ان کا دل نہ ٹھکتا ہو۔ اور ادیبوں نے انہیں اپنے اندر جذب کیا ہو نہ کیا ہو —— —— اسی طرح یہ انداز بھی غلط ہے کہ ہم بے نکیل کے جانور کی طرح ہر کھیت میں منہ مارتے پھریں۔ "آزادی فکر" اور "آزادی عمل" ضروری ہے لیکن انسانوں کے لئے! "جانوروں" کے لئے نہیں! پہلے ہم مکمل انسان بننے کی کوشش تو کریں۔ انسانیت کے اعلیٰ مقاصد، اعلیٰ تصورات، تمدن کی پائیدار بنیادوں اور تہذیب کے صالح اصولوں کو سمیٹنے اور ان سے اپنے دامن کو بھر لینے میں ادیب کو انتہائی حریص ہونا چاہیئے۔ یقیناً وہ اس مقصد کے لئے اپنے پورے ارادے اور شعور سے کام لے گا۔ البتہ یہ کام وہ اسی طرح کرے گا جس طرح ایک فن کار اور آرٹسٹ کرتا ہے۔ لیکن یہ کام وہ کرے گا ضرور۔ کیونکہ صرف اسی طرح یہ ممکن ہے کہ ہم اپنے افسانے اور آرٹ کو برائیوں کی زد سے بچا سکیں اور منزل بمنزل ایک بلند تر اور پائندہ تر مستقبل کی طرف بڑھ سکیں۔

(ادارۂ ادب اسلامی گورکھپور میں پڑھا گیا)

اسلامی ادب کا فلسفیانہ پس منظر

نعیم صدیقی

اسلامی ادب کیا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو اسلامی ادب کے وجود میں آنے کے بعد جہاں حقیقت کو جاننے کے مخلص خواہشمندوں کی طرف سے سامنے آتا رہا ہے وہاں بعض اہل عارفانہ کے حدود پر بھی اور تضحیک و استہزاء کے انداز سے بھی بار بار زبانوں پر آتا ہے! اس کا جواب ہم نے مقالات میں دینے کی بھی کوشش کی ہے اور اپنی ادبی نگارشات ——— اپنے افسانوں اور اپنے اشعار کی مخصوص فطرت کے مظاہرے کے ذریعے سے بھی، مگر کچھ لوگ ہیں کہ ہماری تحریروں کو پڑھے بغیر اور ہماری بات کو سنے بغیر اپنے سوال کا جواب معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا علاج ہمارے پاس نہیں ہے ——— ان کا علاج تو صرف اسی طرح ہو سکتا ہے کہ اسلامی ادب کی لہریں اونچی ہوتے ہوتے کسی دن ان کے سروں پر سے گذر جائیں: ان کا حال یہ ہے کہ ان میں کا ایک خاصا اونچا اچھا لا ہوا ادیب یہ کہتا سنا گیا کہ "یہ اسلامی ادب کہیں چھپتا بھی ہے"؟ ——— مگر بہرحال ہمارا فرض یہی ہے کہ ہم اپنے ادبی مکتب فکر کو برابر واضح کرتے چلے جائیں۔ یہاں تک کہ آج جو کچھ آنکھیں رکھنے والوں کو دکھائی دے رہا ہے وہ کل اندھوں کو بھی نظر آنے لگے!

•

اسلامی ادب کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے محض پروپیگنڈے کے جادو سے وجود دیا گیا ہو بلکہ یہ نئے خیالات کے کچھ پودے ہیں جو عقلی جذبات و عصبیات کی زمین میں اپنی جڑیں رکھتے ہیں۔ پورا عالمگیر ماحول ہے کہ جو ان کی نشوونما کا ذریعہ ہے، یہ انسانی تاریخ کی مٹی ہے کہ جو ان کو غذا دے رہی ہے، اور روزمرہ کے واقعات و حوادث ہیں کہ جو ان کی تربیت میں حصہ لے رہے ہیں!

اسلامی ادب نام ہے ایک ذہنی حرکت کا، اور وہ ذہنی حرکت رد عمل ہے تمام عالم انسانی کے اس تاریخی اتار چڑھاؤ کا جو گذشتہ تین سو برس سے ہو رہا ہے، اور جس سے کسی ادب و فن کا بے تعلق رہ جانا ممکن نہیں ہے!

ہم نے ایک [illegible] تہذیب کے سامنے جس ہم لیا ہے جو دنیا کے اس سرے سے اس سرے تک پورے زور کے ساتھ فروغ یافتہ ہے۔ دنیا بھر کی سیاست، معاشرت [illegible] عدلی عمارت اور [illegible] کا لٹریچر اس فکر و تہذیب کی سلطنت میں گھرا ہوا ہے! نہ کوئی میخانہ اس فکر و تہذیب کے اقتدار سے آزاد ہے نہ کوئی مسجد اور دیر و کعبہ و حرم سب اس کے زیر نگیں ہیں۔

نہ دیر میں، نہ حرم میں نہ [illegible]!

•

یہ تہذیبی نظام جو اپنے مختلف خارجی ڈھانچوں کے ساتھ زمین پر اپنی تاریکیاں پھیلا رہا ہے، جو کبھی جمہوریت کے روپ میں جلوہ گر ہوتا ہے، کبھی آمریت کا لبادہ بدل کر آتا ہے، اور کبھی اشتراکیت کا باجا بجا کر رقص کرتا ہے اس سے آخر آدمی کو کیا ملا؟ ——— اس سے جنگ ملی، اس سے کشمکش ملی، [illegible] ملیں، اس سے تباہیاں ملیں، اس سے معاشی لوٹ کھسوٹ ملی، اس سے فقر و فاقہ ملا، اس سے بے حیائی ملی، اس سے خواہشات پرستی [illegible] ——— اور کیا ملا؟

[illegible] محض [illegible] بنیادی انسانی حقوق سے محروم ہیں کہ ان کا جلاؤ

کی رنگت اقتدار پر چھا جانے والوں کی رنگت سے ذرا سی مختلف واقع ہوتی ہے۔ پھر یہی تہذیب ہے کہ جس کی بنائی ہوئی سُرخ روسی جنت میں چار پانچ کروڑ انسان قدیم مصری اور رومی غلاموں سے بھی زیادہ بدتر حالت میں محض اس لئے مبتلا ہیں کہ ان کے اندر خودی "انا" کا جوہر نہاد قومی ملکیت کے استبداد کی چھری سے پوری طرح ذبح نہ ہو پایا؛ بلکہ ان کی روحوں میں ایک تڑپ باقی رہ گئی! جی ہاں یہی تہذیب ہے کہ جس نے خداوندوں نے تمام عالم انسانی کو شکارگاہوں میں تبدیل کر رکھا ہے اور ان شکارگاہوں کے حقوقِ مالکانہ کے لئے باہم دگر رقابتیں دکھاتے رہتے ہیں! ایک طرف اگر عراق و حجاز سفید رچھیوں کی شکارگاہیں ہیں اور دوسری طرف روسی ترکستان اور چین کو سرخ رچھیوں نے اپنی جولانگاہ بنا رکھا ہے! ایک طرف اگر مراکش اور تیونس سفید جالوں کے حلقوں میں تڑپ رہے ہیں تو دوسری طرف پولینڈ اور چیکوسلوویکیہ کی بیں جو ویسے ہی سرخ جالوں میں صید بسمل بنے پڑے ہیں۔ کمزور مچھلیوں کے ہجوم کے ہجوم ہیں جو برما اور ملایا میں، جاوا اور لنکا میں اور زمین کے چپے چپے میں، مغرب کے بوڑھے مگرمچھوں اور مشرق کے نوجوان مگرمچھوں کے درمیان زندگی کے دن گن رہی ہیں؛ دونوں کی زبانوں پر امن، آزادی، مساوات، اخوت، انصاف اور جمہوریت کے خوش آئند ساحرانہ نعرے ہیں۔ لیکن دونوں کا طرزِ عمل ایسا ہے کہ زمین کا کوئی خطہ ایسا نہیں جہاں ان دل فریب نعروں کا قتلِ عام نہ ہو گیا ہو۔ دونوں کو ایک ہی فتنہ زا ابلیسانہ تہذیب عالمگیر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں سے مسلح کر کے جنگ کے مورچوں کی طرف دھکیل دھکیل کر لا رہی ہے۔ آج حالت یہ ہے کہ ایک مہلک ترین جنگ کا خوف پوری انسانیت کے سروں پر منڈلا رہا ہے۔ ہماری کھیتوں کی لہلہاتی ہوئی فصلیں آئندہ جنگ کے تصور سے لرز رہی ہیں، ہماری اونچی اونچی تعمیرات ایک زلزلے کے اندیشے سے دم سادھے کھڑی ہیں، دنیا بھر کی سہاگنیں اپنے دلوں میں بیوگی کا ہول لئے ہوئے ہیں، دنیا کے بھر کے بچوں کو یتیم ہو جانے کا خوف گھیرے ہوئے ہے، دنیا بھر کے شعر و ادب کے تاج محل تباہی کے آنے والے طوفان کا خیال کر کے کپکپا اٹھتے ہیں! انسانیت تاریخ کی شاہراہ پر ایک ایک قدم بڑھاتے ہوئے بار بار مڑ کر دیکھتی ہے کہ موت اور ہلاکت اور بربادی کا جو غول بیابانی اس کے تعاقب میں ہے وہ کہیں سر پر تو نہیں آ پہنچا!

جس تہذیب نے چار چھ صدیوں میں یہ سماں پیدا کیا ہے، اس کی ناکامی کا حال یہ ہے کہ اس نے کھیتوں کی پیداواریں کئی گنا بڑھا دیں مگر آدمی آج پہلے سے زیادہ بھوکا ہے۔ تیز رفتاری سے اس نے ضروریاتِ زندگی پیدا کرنے کے لئے مشینوں کے انبار مہیا کر دیئے ہیں اور بھاپ اور بجلی کے ہیبت ناک دیو مسخر کر کے پیش کر دیئے ہیں مگر آدمی آج پہلے سے زیادہ محتاج اور محروم ہے؛ اس نے شہر شہر اور قریہ قریہ میں تعلیم گاہیں کھول دی ہیں، مگر آدمی اپنی حقیقت کے بارے میں پہلے سے زیادہ جاہل ہے۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا!

ہاں! اس تہذیب نے امن کے بچاؤ کے لئے اسلحہ خانے بھر دئیے ہیں لیکن آدمی آج پہلے سے زیادہ خوف زدہ ہے!

●

قدرتی طور پر اس کا ردِ عمل مایوسی ہے! کچھ لوگ ضرور ایسے ہیں جو ابھی تک اس سے عقیدتیں وابستہ کئے ہوئے ہیں اور ابھی اس کے مختلف مظاہر کو ادل بدل کر آزمانے اور اس کے بنائے ہوئے نظاموں میں جزوی کتر بیونت کر کے تجربوں میں چند اور قرن گذارنا چاہتے ہیں۔ ایسے متحجر لوگ ہمیشہ پائے جاتے ہیں جو چلتی گاڑی سے اتر کر کسی نئی گاڑی بنانے کے لئے نہ کوئی نقشہ ایجاد کر سکتے ہیں، نہ اس کے لئے عزم و ارادہ کی قوت رکھتے ہیں اور نہ ایسی پیش قدمی کی استعداد سے مالا مال ہوتے ہیں —— چاہے گاڑی سیدھی کسی تباہی کے گڑھے کی طرف کیوں نہ جا رہی ہو۔ ان کو تو بہر حال آخر وقت تک طالع آزمائی کرنی ہے پس

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو!

مگر ہر دور میں ایسے لوگ بھی پائے گئے ہیں جو اپنے اوپر چھائے ہوئے دورِ تہذیب کے مفاسد کا صحیح اندازہ کر لے کے بعد جہاں اس سے مایوس ہو جاتے ہیں، وہاں ایک نئے دورِ تہذیب کے بیج جھولی میں ڈال کر تاریخ کی کھیتی میں کسان کی سی محنت کرنے کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیتے ہیں۔ یہی قافلۂ انسانیت کے پیش رو ہوتے ہیں!

اسلامی ادب کا فلسفیانہ پس منظر

ایسے ہی کچھ لوگ ہیں جنہوں نے دورِ تہذیب کی ناکامیوں کا پورا پورا تجزیہ کرکے اس سے اپنی امیدیں ختم کر لی ہیں۔ انہ نے اس کے اب تک کے مختلف نظاموں کے تجربات پر غور کیا ہے اور پھر اس امر کا جائزہ بھی لیا ہے کہ آیا اس تہذیب کے پاس کوئی اور اسکیم تو باقی نہیں ہے۔ چنانچہ جب اس کے تجربات کی ناکامی کا یقین ہو جانے کے بعد ان کو یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ اب یہاں کسی نئے تجربے کی کوئی اسکیم بھی باقی نہیں ہے اور فلسفے اور لٹریچر کی دنیا میں بھی کسی نئے منصوبے کا کوئی بیج موجود نہیں ہے بلکہ اس کی فکری کوکھ بالکل اجڑ چکی ہے تو ان کے سامنے اس تہذیب سے بغاوت کا فیصلہ کر لینے کے سوا کوئی اور چارہ کار نہیں رہا!

اس فیصلے کے بعد ایک راستہ یہ تھا کہ اس دورِ تہذیب کے یہ باغی مایوس ہو کے بیٹھ رہتے، مگر وہ تارک الدنیا یوگی اور صوفی نہ تھے۔ وہ ایک تمدن کے اندر رہتے تھے، وہ ایک سماجی زندگی بسر کرتے تھے، وہ دوسروں سے اثر لیتے تھے اور دوسروں پر اثر انداز ہوتے تھے، وہ سل پتھر بن کے نہیں جی رہے تھے، وہ غلط اور صحیح کا امتیاز کرنے والے تھے، ان میں "انا" کا جوہر زندہ تھا، ان کی روح میں بیداری موجود تھی، اس لئے ان کے ذہنوں میں حرکت تھی۔

انہوں نے دیکھا کہ جس تہذیب سے وہ بغاوت کرنے اٹھے ہیں اور جس کے بنائے ہوئے انسانیت کُش نظاموں سے وہ دوچار ہیں اس کی روح رواں ایک خاص اساسی فکر ہے، ایک خاص تصورِ زندگی ہے، ایک خاص نظریۂ تاریخ ہے، اور ایک خاص اخلاقی فلسفہ ہے! اس تہذیب کا تصورِ کائنات یہ ہے کہ یہ ایک مادّی ہنگامہ ہے جس کے پیچھے منصوبہ بندی کرنے والی کوئی فعّال طاقت نہیں ہے، اس کا تصورِ حیات یہ ہے کہ زندگی بھی مادّے کا ایک ویسا ہی میکانکی ظہور ہے جیسا کہ حرارت اور حرکت! اس کا تصورِ انسان یہ ہے کہ ایک حیوان ہے جس کا مقصدِ وجود اپنی خواہشات کو پورا کر لینے کے علاوہ کچھ نہیں! اس کا تصورِ تاریخ یہ ہے کہ یہ زور وار کمزور کی کشمکش کی ایک خونیں داستان ہے جس کے قوانین کمزور کو زور ور کے پاؤں تلے روندوا دیتے ہیں اور زورور کو ابھار کر سامنے لے آتے ہیں۔ اس کا تصورِ اخلاق یہ ہے کہ انسانیت کے لئے کوئی اخلاقی ضابطہ مستقل نہیں ہے بلکہ اس کے مفاد کے تقاضے مختلف حالات میں مختلف اخلاقی قدروں کو ابھارتے ہیں۔

یہ فکر جس کی پشت پر مرعوب کن لٹریچر موجود ہے اور جس کے سرچشمے ہر درسگاہ اور ہر علمی ادارے سے ابل رہے ہیں، ذرا سے تجزیئے سے خود بتا دیتی ہے کہ اس کے سانچے میں جو انسان ڈھلے گا وہ کس نوعیت کا ہوگا۔ اسے خواہش پرست ہونا چاہئے، اسے خود غرض ہونا چاہئے، اسے تصادم پسند ہونا چاہئے اور اسے مکار اور جابر ہونا چاہئے! انسانیت کے اس نمونے کو سامنے رکھ کر یہ فیصلہ کرنا کچھ بھی مشکل نہیں رہتا کہ موجودہ دورِ تہذیب جو رنگ لا رہا ہے وہی اسے لانا چاہئے!

اب ان سوچنے والے باغیوں کے سامنے سوال یہ تھا کہ اس فتنہ انگیز فکر کے مقابلے میں کوئی دوسری فکر بھی ہو سکتی ہے کہ جو انسانیت کا بہتر نمونہ ڈھال کے دے سکے اور جس کے بل پر ایک پاکیزہ نظامِ تہذیب استوار ہو سکے؟

اس سوال کو لے کر نگاہِ جستجو جب فضاؤں کا جائزہ لینے نکلی تو وہ ہر طرف سے گھوم پھر کر آخر اسلامی فکر پر مرتکز ہو گئی! چنانچہ ذہنی حرکت کا رخ یکایک بدل گیا اور اسی تبدیلی کے نتیجے میں اسلامی ادب نمودار ہوا ہے!

اسلامی ادب ایک صدائے احتجاج ہے تہذیبِ حاضر کے خلاف! ایک اعلانِ جنگ ہے مروّجہ فلسفہ و فکر کے مقابل میں!

●

مشکل یہ ہے کہ اسلام کو لوگ ایک مذہب اور ایک مّت کی حیثیت سے جانتے ہیں! اور پھر وہ سوچتے ہیں کہ مذہب اور ملت کے لئے ادب میں کیا مقام۔ مذہب اور ملت کی نمائندگی کرنا تو ملّا اور برہمن کا کام ہوتا ہے نہ کہ ادیب کا! بلاشبہ آج جو شئے اسلام کے نام سے آنکھوں کو نظر آتی ہے اسے مذہب اور مّت سے کچھ بھی برتر قرار دینا ممکن نہیں ہے۔ جس شئے کو آج ہم اسلام کے نام سے دیکھتے ہیں وہ مسجدوں میں بے جان رکوع و سجود اور بے روح وعظوں کی شکل میں پائی جاتی ہے، وہ گھروں میں طرح طرح کی جاہلانہ رسموں کی صورت میں نظر آتی ہے، وہ خانقاہوں میں قبر پرستی

اور تعویذ گنڈے کا کاروبار بن ملتی ہے، وہ پیری مریدی مولود اور نعت خوانی کی مجالس کے پیکر میں جلوہ گر نظر آتی ہے، وہ کھوکھلے نعروں کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ ہاں آج جو چیز اسلام کے نام سے پائی جاتی ہے وہ نہایت متضاد چیزوں کے ساتھ ترکیب پا سکتی ہے، وہ نہایت سستے داموں بازار بازار بکتی ہے، وہ کفر و الحاد کی خدمت پر کمربستہ ہو سکتی ہے، وہ زندگی کی تقسیم کو مانتی ہے، وہ دنیا کے مسائل سے سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتی، وہ مایوسی اور جمود پیدا کرتی ہے، وہ اپنے گوناگوں نمونے رکھتی ہے جن میں سے ہر ایک ایک اعجوبہ ہے!

اس "شے" کے لئے ادب میں آخر کیا مقام اور اس شے کی فطرت سے آخر ادب کو کیا تعلق؟ اس شے کا تقاضا تو فی الواقع ادب نہیں ملائیت ہی ہے!

لیکن اسلام ایک اور بھی ہے!

وہ اسلام وہ ہے جو عین انسانی فطرت کی پکار ہے! جو ساری انسانیت کی مشترک متاع ہے! جس کے ہم ویسے ہی ضرورت مند ہیں جیسے سورج کی روشنی کے اور ہوا اور پانی اور غذا کے ضرورت مند ہیں!

آئیے دیکھیں کہ وہ اسلام کونسا ہے!

●

آدمی کی فطرت کا کھوج لگانے کے لئے جب ہم اس کے عالم نفسیات میں داخل ہوتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں اس میں خیال کا ایک کارواں ہے کہ پیہم رواں دواں ہے۔ یہ کارواں کبھی تھکتا نہیں، کبھی تھمتا نہیں۔ چل رہا ہے، چل رہا ہے —— نہ جانے کب سے چل رہا ہے اور کب تک چلتا رہے گا! "نہ حد اس کے پیچھے، نہ حد سامنے"! یہ کارواں جو قدم بھی آگے اٹھاتا ہے اس کے نکلتے ہی اس کے سامنے ذہن کی کہر آلی فضاؤں میں ایک دوراہا پھوٹ آتا ہے، پھر وہ اس دوراہے پر سے جدھر بھی چاہے مڑ جائے، اگلا قدم رکھتے ہی ایک اور دوراہا نمودار ہو جاتا ہے، اور یہ سلسلہ یونہی جاری رہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسانی کاروانِ خیال ہمیشہ ایک دوراہے پر ہوتا ہے۔ یہ دوراہا انسانی فطرت کا امتیازی جوہر ہے! اسی کی حقیقت کو جان لینے پر انسانیت کے بنیادی فطری تقاضے کو جاننے کا دارومدار ہے! آدمی کی نفسیات کی ترکیب ایسی ہے کہ اس کے سامنے جونہی ایک خیال آتا ہے تو اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کا متضاد خیال بھی نمودار ہو جاتا ہے اور دو متضاد خیالات کے ابھر آتا انتخاب کا سوال پیدا کر دیتا ہے۔ متضاد خیالوں کے تضاد کا دوراہا اور ان میں سے ایک کو انتخاب کرنے کی ذمہ داری از خود "خیر و شر" کے احساس میں ڈھل جاتی ہے۔ یہ خیر و شر کا احساس ہی انسانی فطرت کو تمام حیوانات سے ممتاز کرتا ہے۔

"خیر و شر" کے احساس کا ظہور کیسے ہوتا ہے؟ —— یوں کہ جب دو متقابل تخیلات، افکار، احساسات، جذبات یا رویوں میں سے آدمی ایک پر جب کی انگلی رکھ دیتا ہے تو ایک خیال یا احساس کے لئے یہ انگلی جونہی قبولیت کا فیصلہ کرتی ہے دوسرے خیال یا احساس کو ساتھ کے ساتھ رد بھی ہے۔ بس انتخاب کا فیصلہ ہوتے ہی "انا" ایک خیال یا احساس کے موقف سے اس کے متقابل کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیتا ہے۔ پوری فطرتِ کائنات کی طرح انسانی فطرت بھی توحید پسند ہے اور اصلاً تضاد پرور نہیں ہے۔ اب انا جس شے کو قبول کرتا ہے وہ عین فطرت ان میں "خیر" اور جس کے خلاف جنگ کرتا ہے وہ "شر" کی حیثیت پاتی ہے!

یہ واقعہ چونکہ عالم النفس میں ہر لحظہ واقع ہوتا رہتا ہے، اس لئے یوں سمجھئے کہ فطرتِ انسانی ایک ایسی جنگاہ قرار پاتی ہے جس میں مستقل طور پر دو وابستہ ہیں۔ ایک طرف انسان کی اچھی جبلتیں، اس کی فطرت کے پاکیزہ تقاضے، اس کے ملکوتی رجحانات، حسنِ خلق کے میلانات، اور ان کے ساتھ تعلیم و تربیت کے اثراتِ حسنہ اور پھر سماجی ماحول کے خیر کے مظاہر کے پرتو یکجا ہو کر ایک ٹھوس قوت بن جاتے ہیں۔ دوسری طرف جبلت کے حیوانی پہلو، اس کے نفس کے ذلیل رجحانات، اور ان کے ساتھ تعلیم و تربیت کے اثراتِ بد اور سماجی ماحول کے شر کے مظاہر

اسلامی ادب کا فلسفیانہ پس منظر

کے پر تو باہم قوم پاکر ایک دوسری ٹھوس قوت بن جاتے ہیں۔ اس طرح ایک محاذ جبہانی تقاضوں کا، دوسرا انسانی تقاضوں کا، بن جاتا ہے۔ ایک طرف سے اندھی خواہشات زور کرتی ہیں، دوسری طرف سے اخلاقی حاسہ اپنا کس بل دکھاتا ہے۔ ایک طرف سے انفرادیت اینڈتی ہے، دوسری طرف سے دینیت ہل من مبارز کا نعرہ لگاتی ہے۔

انہیں دو محاذوں میں سے ایک فطری محاذ اسلام کا ہے، دوسرا مخالف اسلام قوتوں کا، یا دوسرے لفظوں میں "جاہلیت" کا!

•

مگر ———

کیا ہر فرد کا کاروانِ خیال کسی دوراہے پر ایک ہی موڑ مڑتا ہے؟ کیا ہر ایک کی فکری ترازو ایک ہی تول تولتی ہے؟ کیا ہر ایک کے اندر خیر و شر کے محاذ پر بپا رہنے والے معرکوں کا انجام ہمیشہ ایک سا ہوتا ہے؟ ——— دوسرے لفظوں میں کیا "خیر اور شر" کوئی متعین حقیقتیں ہیں؟

بڑا اہم سوال ہے، بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے۔ مگر سمجھنا چاہیں تو بہت ہی سادہ سا جواب کافی ہے۔ ہر فرد کے اندر خیر اور شر کے محاذوں کی قوت کا توازن بالکل مختلف ہوتا ہے۔ جن لوگوں میں خیر کی قوت زور دار تر ہوتی ہے وہ عقاید، نظریات، احساسات، جذبات اور اخلاقی رویوں کے انتخاب میں بالعموم اپنے فیصلے اسی خیر کے حق میں دیتے ہیں جو فی الواقع فی نفسہٖ خیر ہوتا ہے، جن کی قوتِ خیر اس سے کم تر زور رکھتی ہے وہ خیر اور شر کے میلانات میں سمجھوتہ بازی کر کے مرکب عقیدے اور رویے اختیار کرتے ہیں، اور جن میں خیر کی قوت بہت دب جاتی ہے اور شر کا محاذ مضبوط تر ہو کے رہتا ہے ان کی نگاہِ انتخاب ہمیشہ شر ہی پر جمتی ہے مگر چونکہ انسانی فطرت کی ساخت کا تقاضا یہ ہے کہ خیر کو اختیار کیا جائے اور شر کو رد کیا جائے، اس لئے انسان جس شے کو بھی اختیار کرتا ہے اسے خیر کا نام دے کر اور اسے خیر کا نام دینے کے لئے پورا زورِ استدلال صرف کر کے اپنے ضمیر کو مطمئن کرتا ہے!

مگر کیوں نہیں ایسا ہوتا کہ جیسے پانی ہمیشہ نشیب کی طرف بہتا ہے، جیسے گرم اجسام لازماً پھیلتے ہیں، جیسے زمین اشیا کو کھینچتی ہے جیسے کسی ساکن چیز کو حرکت دینے کے لئے قوت کا صرف کرنا ضروری ہے، اسی طرح انسان طبعی طور پر مجبور ایک ہی فیصلہ کر دیا کرے؟ ——— صرف اس لئے کہ یہ صاحبِ ارادہ ہستی ہے۔ نظامِ فطرت نے اس کے عالمِ انفس کو آزادی دی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسے "غلطی" کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا گیا ہے!

اب آپ پوچھیں گے کہ جب افراد خیر و شر کی تقسیم مختلف طرح کرتے ہیں، مختلف سماجی ماحول اور مختلف نظام ہائے تربیت افراد کی نفسیاتی ساخت کو مختلف طریقوں پر متاثر کرتے ہیں اور صدیوں کے ٹھٹے متاثر کر دیتے ہیں، مختلف قوموں میں اخلاقی حاسہ مختلف طریقوں سے کام کرتا ہے اور مختلف ادوارِ تہذیب میں عالمگیر پیمانے پر انسان کا عالمِ انفس مختلف سانچوں میں ڈھلتا رہا ہے، تو آخر خیر و شر کی مستقل قدر تو کوئی نہ رہی، یہ معاملہ تو تمام تر اضافی ٹھہرا!

نہیں جناب! جب آپ افراد سے آگے گذر کر اور سماجی ماحول کے تمام سانچوں اور قومی نظاموں اور مختلف ادوارِ تہذیب کی دیواریں پھاند کر دیکھیں گے تو آپ کو اپنا نظریہ بدلنا پڑے گا۔ ہم آپ کے سامنے ایک دوسرا سوال رکھتے ہیں، وہ یہ کہ کیا مختلف انسانی افراد اور مختلف انسانی سماجوں کے اندر کوئی قدرِ مشترک بھی اس بارے میں ملتی ہے یا نہیں! کیا خیر کی اور شر کی ایسی قدریں بھی ہیں کہ جو ساری تاریخ پر پھیلی ہوئی ہوں؟ ہاں ایسی قدریں ہیں اور یقیناً ہیں۔ دنیا کے ہر زمانے اور ہر ملک اور ہر سماجی ماحول میں بعض احساسات، تاثرات، جذبات اور کیفیات کو خیر جانا گیا ہے اور بعض کو شر! مثلاً ایثار اور خود غرضی، نفس پرستی اور انسان دوستی، انصاف اور ظلم، امن اور فساد، تعاون اور تصادم، خدمت اور استحصال، مساوات اور نامساوات، یکجہتی اور تفرقہ، بلند نگاہی اور تنگ نظری، دیانت اور خیانت، ایفائے عہد اور وعدہ شکنی، راستبازی اور مکر و دروغ، علم اور جہالت اور یقین اور گمان، خیر اور شر کے متقابل زوج ہیں، اور جانے پہچانے زوج ہیں، اور ان میں باہم جو تضاد اور منافات ہے وہ بھی ہمیشہ سے معلوم رہا ہے اور تاریخِ انسانی میں ان کے درمیان ہمیشہ کشمکش رہی ہے!

یہ دنیا بھر کی مشترک قدریں انسانی فطرت کی آوازیں ہیں ——— اور ان میں سے جو گروپ خیر کا ہے اسی کا نام اسلام ہے، اور جو گروپ شر کا ہے اس کا نام جاہلیت ہے۔

●

اب اور آگے چلئے! جہاں تک ان قدروں کی سادہ اور ابتدائی شکل اور ان کی اصولی حیثیت کا تعلق ہے انسانیت ہمیشہ ان کی قائل رہی ہے۔ مگر جب معاملہ ان کو زندگی کے روزمرہ کے پیچیدہ معاملات پر منطبق کرنے کا، اور ان قدروں کو معاشی، سیاسی اور معاشرتی نظاموں کی رگوں میں خون بنا کر دوڑانے کا پیش آتا ہے تو افراد اور اقوام اور سماجوں کے راستے جدا ہو جاتے ہیں۔ حد یہ کہ خیر و شر کی یہ قدریں عملی زندگی کے طوفان میں باہم گڈمڈ ہونے لگتی ہیں اور انسان اس حد تک دھوکا کھاتا ہے کہ ظلم کو انصاف، فساد کو امن اور جہالت کو علم تک سمجھ بیٹھتا ہے اور اسی طرح اس کے برعکس!

چنانچہ یہی وہ الجھن ہے کہ جسے حل کرنے کے لئے الہام کے ذریعے انسان کے سامنے زندگی کی بنیادی اقدارِ خیر و شر کو عملی تفصیلی مسائل پر منطبق کر کے اس کے شعور کی رہنمائی کی گئی ہے۔ یہ الہامی رہنمائی ہر دور میں انسان کو وضاحت و صراحت سے بتاتی رہی ہے کہ انسانیت کی مطلوبہ قدریں کونسی ہیں اور مردود قدریں کونسی، پھر یہ کہ ان قدروں کے سانچے میں افکار و حسیات کو، اخلاق و کردار کو، اور سماجی ماحول اور سیاسی و معاشی نظام کو ڈھالنے کا اسلوب کیا ہے؛ ان کو روزمرہ کے مسائل پر منطبق کرنے کا سلیقہ کیا ہے؟ ——— یہی الہامی رہنمائی ہے جو آج قرآن اور نبی صلعم کے اسوہ کی حیثیت سے ہمارے سامنے ہے۔ اس کو ہم دینِ اسلام سمجھتے ہیں!

●

افراد انسانی کے نفسیاتی سرچشموں سے خیر و شر کی جتنی لہریں اٹھتی ہیں، وہ انفرادی ذہن کی حدود کے اندر ہی اندر ختم نہیں ہو جاتیں بلکہ پھیلتی ہیں، وہ ایک خاندان پر سے گذرتی ہیں، وہ ایک بستی پر سے گذرتی ہیں، وہ ایک قوم اور ملک پر سے گذرتی ہیں اور پھر وہ پوری انسانیت تک پھیلتی جاتی ہیں، پھر حال کو بھی عبور کر کے مستقبل تک سے جا ٹکراتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں خیالات و حسیات اور میلانات و رجحانات سماج میں سرایت کرتے ہیں اور وہ متمدن سوسائٹی میں بہرحال متعدی واقع ہوتے ہیں۔ کسی کا کوئی خیال بھی یہاں درحقیقت ذاتی نہیں ہے اور ذہن کا کوئی مخفی سے مخفی عمل بھی خالص انفرادی نہیں۔ جب یہاں تنہائیوں کے راز بھی نجی نہیں رہ سکتے، یہاں دلوں کے بھید بھی چھپ نہیں سکتے، بلکہ ہر چیز کا پرتو پورے سماج پر پڑ رہا ہے۔ ہر باطن یہاں ظاہر پر اور ہر ظاہر باطن پر اثر ڈالتا ہے۔ اس طرح افراد کے ذہنی عمل کی مختلف لہریں پھیلتی اور باہم ٹکراتی ہوئی سماجی سطح پر آ کر پھر اسی طرح دو گوشہ محاذوں میں بٹ جاتی ہیں اور معاشرتی نظام میں بھی ویسی ہی رزمِ خیر و شر بپا ہو جاتی ہے جیسے ایک فرد کے عالمِ نفسیات میں رہتی ہے۔ ہم خیالی اور ہم آہنگی کچھ افراد کو کچھ سے قریب کر دیتی ہے اور فرق و تضاد کچھ کو کچھ سے دور کر دیتا ہے۔ اس طرح مختلف طبقے، پارٹیاں، گروہ بندیاں، قومیں اور بلاک وجود میں آتے ہیں۔ پھر ان گروہ بندیوں کی باہمی کشمکش خیر و شر میں جس کو آگے بڑھنے کا موقع مل جاتا ہے اس کے خیالات، اس کی خواہشات، اس کی حسیات اور اس کی پسندیدہ اخلاقی قدریں وقت کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام کا روپ دھارتی ہیں۔ پھر بین الاقوامی میدان میں جو گروہ بندی کشمکش کرتی ہوئی اپنے رجحانات غالب کرتی جاتی ہے وہ سارے دورِ تہذیب کو اپنے سانچے میں ڈھال لیتی ہے۔

●

مگر جس طرح افراد کی داخلی کیفیات خارج کو متاثر کرتی ہیں، اسی طرح ایک سماجی ماحول اپنے دائرہ کے اندر اور ایک دورِ تہذیب اپنی پوری وسعت میں افراد کے باطن کی ساخت کو شدید طور پر متاثر کرتا ہے ——— بلکہ ماحول حکومت، قانون، خزانوں، پولیس، نظامِ تعلیم اور لٹریچر سے مسلح ہونے کی وجہ سے ایک بے پناہ طاقت بن جاتا ہے۔ وہ افراد کے ذہن و سیرت کے لئے جبریت کا ایک سانچہ تیار کر دیتا ہے، وہ ایک قفس بن جاتا ہے، وہ ایک زنداں کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور افراد اس کے اندر بے بس ہو کے رہ جاتے ہیں۔ چاروں طرف سے ہر ایک فرد کے ذہن پر پے درپے

حملہ آور ہوتی ہیں وہ اس کی باطنی لہروں کو بالکل دبا لیتی ہیں۔

لیکن دوسری طرف فرد بھی ماحول کی ناسازگاریوں کے خلاف جدوجہد کرنے سے کبھی باز نہیں آیا ـــــ خیال کی قوت چونکہ متعدی ہے اس
لئے فرد کی دعوت ہی سے جماعت وجود میں آتی ہے اور جماعت چونکہ ایک نشوونما پانے والی قوت ہوتی ہے اس لئے وہ ماحول کو چیلنج کرتی ہے اور
بالآخر توڑ کے رکھ دیتی ہے۔ چنانچہ ماحول کے زنداں کو توڑنے میں انسان کی کامیابیوں کی داستانوں سے تاریخ بھری پڑی ہے!

ماحول چاہے خیر کا ہو، چاہے شر کا ـــــ وہ انسانی کاروانِ خیال کے سامنے قدم قدم پر بچھنے والے دوراہے کو ایک طرف سے کبھی بند
نہیں کر سکتا۔ وہ ایک خیال کے ابھرتے ہی اس کے متضاد خیال کو ابھرنے کے فطری اہتمام کا سدِّباب نہیں کر سکتا۔ وہ آدمی سے آزادیٔ انتخاب ہمیشہ
کے لئے چھین نہیں سکتا۔ وہ ارادے کے شعلے کو کبھی بجھا نہیں سکتا! دوسرے لفظوں میں یہ ناممکن ہے کہ خیر یا شر کے محرکات میں سے کسی ایک سے
زندگی کو، نفسِ انسانی کو، سماجی ماحول کو، دورِ تہذیب کو خالی کیا جا سکے۔ جہاں کہیں خیر کی قوت غالب ہوتی ہے تو شر کی قوت کمین گاہوں میں بیٹھی برابر
اس پر حملے کرتی رہتی ہے، پھر اگر اس کو کوئی کمزور رخنے مل جائیں تو وہ کھلم کھلا محاذ پر آکر فیصلہ کن معرکے لڑنے لگ جاتی ہے۔ اسی طرح جس ماحول پہ
شر کی قوت قائم ہو کے کام کر رہی ہو اس میں خیر کی قوت اس کی گھات میں لگی رہتی ہے۔

یہ کشمکش جس کا چکر نفسیاتِ انسانی سے شروع ہو کر پھر نفسیاتِ انسانی ہی پر ختم ہوتا ہے، اول روز سے ہے اور آخر دم تک رہے گی! اسے ختم کر
دو تو تاریخ کا بہاؤ رک جائے گا، ارتقا کی ندی ریگ بستہ ہو جائے گی، بلکہ یوں کہیے کہ انسان مر جائے گا!

●

اس طرح سوچتے سوچتے ہم تاریخ کے ایک نئے تصور پر جا پہنچتے ہیں۔ یعنی تاریخ خیر و شر کے محرکات کی آویزش کی ایک داستان قرار پاتی ہے۔
خیر کی قوت شر کی قوت سے اور پھر خیر و شر کے مختلف مرکبات کہ جن میں سے کسی میں خیر کی قدریں وزنی ہوتی ہیں اور کسی میں شر کی باہم آویزش کرتے ہوئے
زندگی کی راہ پر بڑھ رہے ہیں۔ یہی کشمکش ہے جو انسان کے اندر سے اس کی قابلیتوں کو ابھار ابھار کے بروئے کار لا رہی ہے۔ یہی تسخیرِ کائنات کی
محرک ہے، یہی علم اور سائنس کی ترقیوں کا وسیلہ ہے، پتھر کے زمانے سے لے کر ایٹم کے زمانے تک کا ہمارا سارا مادی ارتقا اسی کا فیضان ہے۔
اس تصورِ تاریخ کی رو سے یہ حقیقت خود بخود نگاہوں کے سامنے جھلکنے لگتی ہے کہ چونکہ کشمکش ایک مستقل حقیقت ہے اس لئے انسان
بہتر سے بہتر مادی قوتوں سے مسلح ہونے کی جس جدوجہد میں لگا ہوا ہے وہ تاریخِ انسانی میں مادی ارتقا کو بالکل مسلسل بنا دیتی ہے۔ لیکن جہاں
تک اخلاقی پہلو کا تعلق ہے وہ ہمیشہ معرضِ کشمکش میں رہا ہے، کبھی خیر کے ساتھ ہو کر، کبھی شر کے ساتھ ہو کر، کبھی خیر و شر کے مرکب نظاموں کے محاذ
پر سے ـــــ اور پھر اس کشمکش میں ایک ہی قدریں پھر کر بار بار سامنے آتی ہیں۔ خیر کی قدریں بھی، شر کی قدریں بھی، مثلاً شر کے عوامل میں سے
ایک بڑا تاریخی عامل استحصال ہے۔ یہ عامل جیسے آج اپنا پارٹ ادا کر رہا ہے، اسی طرح پچھلے ہر تاریخی دور میں کام کرتا رہا ہے۔ استحصال بگڑے ہوئے
مذہبی نظاموں میں مذہبی اجارہ داروں نے بھی کیا ہے، سیاسی بادشاہوں اور فرماں رواؤں نے بھی کیا ہے، پھر بعد کے دوروں میں جاگیرداروں
نے بھی کیا ہے، پھر مغرب کے تاجر طبقے نے بھی کیا ہے، پھر جدید مشینی انقلاب کے بعد سرمایہ داروں نے بھی کیا ہے۔ صرف استحصال کے ڈھنگ
بدلتے رہے، اور اس محاذ کے سپاہی بدلتے رہے۔ استحصال کا عالم چوں کا توں ایک ہی عامل رہا اور اس کے ایک ہی سے اثرات انسانیت پر پڑے
اور اس کو اخلاقی لحاظ سے ایک ہی حیثیت حاصل رہی۔ اسی طرح خیر کی قدروں میں سے انصاف کی قدر کو لے کر دیکھئے تو یہ بھی تاریخ کے ہر دور میں
ایک ہی شان کے ساتھ نمودار ملے گی۔ انصاف کے لئے انسان نے ہر دور میں یکساں قربانیاں دی ہیں ـــــ سیاسی انصاف کے لئے، معاشی
انصاف کے لئے، معاشرتی انصاف کے لئے! اور کوئی دور ایسا نہیں ہے کہ جس میں اس اعلیٰ قدر کے اندر انسانیت کے لئے بڑی جاذبیت
موجود نہ رہی ہو۔ یہی انصاف تھا جس کے لئے فرعون سے لڑا جا رہا تھا، یہی نمرود سے، یہی قیصر و کسریٰ سے اور آج یہی وہ مقصود ہے کہ جس کے لئے کمزور قوموں کے

نمائندے ہو، ان، اوکے دربار میں آواز اٹھاتے نظر آسکتے ہیں ۔

تاریخ میں ذرائع ووسائل کے بدلنے سے وہ اصولی قدریں کبھی نہیں بدلی ہیں جن کا شعور و احساس خود انسانی فطرت میں پیوست ہے !

●

بہرحال اس طولِ کلام سے جو حقیقت سامنے لانا مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ انسان خیر و شر کے دو محاذوں پر بٹا ہوا ہے، فرد بٹا ہوا ہے، سماجی ماحول بٹا ہوا ہے، عالمگیر دورِ تہذیب بٹا ہوا ہے ——— اور یہ جنگ، یہ اخلاقی جنگ دراصل خیالات و عملیات کی جنگ ہے، جذبات و اخلاق کی جنگ ہے، یا یوں کہئے کہ اخلاقی قدروں کی جنگ ہے !

اس جنگ میں ایک مسلم ادیب جب اپنا مقام تلاش کرتا ہے تو اسے ایک ہی موقف نظر آتا ہے۔ وہ خیر کی ان قدروں کا سپاہی بن کر کھڑا ہو جائے جو اس کی فطرت کے لئے معروف ہیں اور جن کو نبی صلعم نے خدا تعالیٰ کے مستند نمائندے کی حیثیت سے نہ صرف یہ کہ اجاگر کرکے سامنے رکھ دیا ہے بلکہ ان کو زندگی کے عملی مسائل پر منطبق کرنے کی پوری حکمت بھی پیش کر دی ہے اور پھر عملاً اُن کے سانچے میں ڈھلے ہوئے انفرادی اور اجتماعی زندگی کا کامل نمونہ بھی تاریخ کی نمائش گاہ میں سجا کے رکھ دیا ہے۔ ان قدروں پر ایک معاشرہ اور ایک سماج اور ایک ریاست اور ایک نظامِ معیشت کی تشکیل کرکے رہنمائی کا حق ادا کر دیا ہے۔ ان قدروں کو گھر کی چار دیواری کی حدود میں بھی اور جنگ کے میدان تک میں بھی برت کر دکھا دیا ہے !

ایک مسلم ادیب یہ دیکھ رہا ہے کہ اس کے گرداگرد جو سماجی ماحول بلکہ عالمگیر دورِ تہذیب آہنی قفس بن کر محیط ہو گیا ہے "خیر کی" ان قدروں کے بالکل خلاف شر کی قدروں سے ترکیب یافتہ ہے۔ اس ماحول میں وہ سرمایہ و مزدور کی کشمکش دیکھتا ہے، اس میں وہ خداؤں اور مزارعین کے درمیان تصادم کو کارفرما پاتا ہے، اس ماحول میں وہ طبقہ بندیاں کارفرما دیکھتا ہے، اس میں اس کا سابقہ اغراض کے ٹکراؤ سے پڑتا ہے، اس میں وہ عورت کی آبرو کو لٹتے دیکھتا ہے۔ اس میں اسے ہر طرف خباثت کا پرتو پھیلا نظر آتا ہے۔ اس میں اس کے سامنے بنیادی انسانی حقوق پامال ہوتے ہیں، اس میں وہ آزادی کے حق کا خون ہوتے دیکھتا ہے، اس میں چاروں طرف گھناؤنے کردار اس کے سامنے آتے ہیں، اس میں وہ شرمناک واقعات سے دوچار ہوتا ہے ——— اور پھر وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ سماجی ماحول اور دورِ تہذیب کے اثرات کی پے در پے اٹھتی ہوئی لہریں اس کے اپنے ذہن پر بری طرح حملہ آور ہیں۔ چنانچہ وہ مجبور ہے کہ جنگ کے لئے اٹھ کھڑا ہو !!

●

اس طرح جب کچھ ادیب اسلام کی واضح کردہ خیر و شر کی قدروں پر ایمان لا کر خیر کی قوت کے جھنڈے تلے تاریخ کی جنگاہ میں خیالات کا معرکہ لڑنے کے لئے اترے ہیں تو ان کی شمشیرِ قلم کی حرکت نے اسلامی ادب پیدا کیا ہے۔ اسلامی ادب وہ ادب ہے جو خدا پرستی، انسان دوستی، انصاف، ایثار، امن، تعاون، خدمت، مساوات، یکجہتی، بلند نگاہی، دیانت، ایفائے عہد، راستبازی، علم اور یقین کی قدروں کو انفرادی اور اجتماعی زندگی کی فضا میں اُس تعبیر کے ساتھ ابھارتا ہے جو اسلام نے پیش کی ہے۔ اور دوسری طرف وہ خدا ناشناسی، نفس پرستی، ظلم، خود غرضی، فساد، تصادم، انتشار، نامساوات، تفرقہ، تنگ نظری، خیانت، عہد شکنی، مکر و دروغ، جہالت اور گمان کے مظاہر کو اسلام کی روشنی میں متعین کرکے انفرادی اور اجتماعی زندگی کی فضا میں پایۂ اعتبار سے گرا کر پیش کرتا ہے۔ وہ ایسے کرداروں کو ابھارتا ہے جو "خیر" کی قوت میں اضافہ کرنے والے ہوں اور ان تمام کرداروں کو پیچھے دھکیلتا ہے جو "شر" کی قوت کے آلۂ کار ہوں۔ وہ سماجی ماحول کے تمام پہلوؤں کا تجزیہ کرکے دکھاتا چاہتا ہے کہ کہاں کہاں شر دامن گیر ہے اور کہاں کہاں خیر کی کوئی رمق محفوظ ہے۔ وہ انسانیت کے لئے ہمہ گیر اور مستقل افادیت رکھنے والے خیالات کے محاذ کو مضبوط کرنا چاہتا ہے۔ وہ افراد کو موجودہ سماجی ماحول اور موجودہ دورِ تہذیب کے خلاف لڑنے کے لئے تیار کرنا چاہتا ہے !

●

ہم جس عالمگیر دورِ تہذیب کے نرغے میں آئے ہوئے ہیں، ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ یہ ہر جہت سے مفسدہ انگیز اور غارت گرِ امن ثابت ہو رہا ہے۔ اس دورِ تہذیب نے ہم کو فاقہ و افلاس دیا ہے، نامساوات اور ناہمواریاں دی ہیں، طبقہ بندیاں اور بلاک سازیاں دی ہیں، تصادم اور جنگیں دی ہیں، فواحش اور جرائم دئے ہیں، اضطراب اور انتشار دیا ہے، اور زندگی کو پورے کرۂ ارض پر ایک مستقل گھٹن میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس دورِ تہذیب نے جو مختلف نظام اپنی گود میں پال کر ہم تک پہنچائے ہیں وہ سارے کے سارے خیر و شر کے مرکبات ہیں جن میں شر کا پلہ بھاری ہے، ان میں سے کوئی بھی تمام تر نظامِ خیر و فلاح نہیں ہے۔ ان نظاموں کے مقاصد کی تعیین خیر کے اس حقیر سے جزو پر قائم ہیں جو ان میں سے ہر ایک کے اندر کسی نہ کسی حد تک موجود ہے ——— (اور خیر سے بالکل خالی ہو کوئی نظام دنیا میں نہیں چل سکتا) ان مرکب نظاموں کے خیر کا جزو بھی وہ جزو ہے جس کو پروپگنڈے میں ابھار کر لایا جاتا ہے اور پھر پروپگنڈے کے دھندلکے میں ان کے مقاصد چھپا چھپا کے رکھے جاتے ہیں اور ان کے بارے میں طرح طرح سے تاویلیں کی جاتی ہیں۔ مگر مقاصد جب واقعات کے میدان میں ابھر کر سامنے آ جاتے ہیں تو ان کی تاویل کرنا ممکن نہیں رہتا۔

ہمارے نزدیک وہ اربابِ دانش، وہ اربابِ شعر و ادب بڑے ہی قابلِ رحم ہیں کہ جو ان مرکب نظاموں میں سے کچھ کسی کے فریب خوردہ ہیں اور کچھ کسی کے سحر زدہ۔ ان کے لئے اپنے دورِ تہذیب سے بالاتر ہو کر سوچنا ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ مرعوبیت کے مقام سے اوپر ہو کر تنقید کی نگاہ ڈالنا جانتے ہی نہیں۔ یہ جو کچھ موجود ہے اس سے آگے سوچ ہی نہیں سکتے۔ یہ بجز اس کے کچھ کر ہی نہیں سکتے کہ اپنے دورِ تہذیب کی منڈی میں جا کر ایک مال کے مقابلے میں دوسرا مال پسند کر لیں ——— آہ! ایک نئی متوازی منڈی قائم کرنے کے لئے جو اونچے درجے کی آزادیٔ فکر مطلوب ہے وہ ان کو قدرت کی طرف سے ارزانی نہیں ہوئی۔ ان کا حال اس فیشن پرست نوجوان کا سا ہے کہ جو لنڈے بازار میں جا کر ایسے کوٹ پتلون کا سودا چکاتا ہے جو کسی کی اترن بن کر بکا ہے، اور پھر وہ نہا دھو کر اسے زیبِ بدن کر کے سوسائٹی میں گھومتا ہے اور اپنے حسنِ ذوق اور اپنی جدت پسندی پر داد طلب کرتا ہے ——— اتنا ہی نہیں جو لوگ معمولی گھر کے بنے ہوئے دیسی وضع کے کپڑے پہنے نظر آتے ہیں ان کا مذاق اڑاتا ہے۔

اسلامی ادیب سے یہ ترقی پسندی بن نہیں آتی۔ وہ موجودہ دورِ تہذیب کو ایک کل سمجھتا ہے اور اس کے خیر کے حقیر سے اجزاء سے دھوکا نہیں کھاتا بلکہ اس کے ہمہ گیر شر کو اس نے گوناگوں نظاموں کی تاریخ میں بغیر کسی خود فریبی کے دیکھا ہے۔ چنانچہ اس کے سامنے اس کے مفسدہ انگیز نظاموں میں سے کسی کے انتخاب کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ وہ اس پورے دورِ تہذیب کے خلاف لڑائی لڑنے کا فیصلہ کرتا ہے۔

وہ دیکھتا ہے کہ اس دورِ تہذیب کے مختلف نظاموں کے مظاہر میں چاہے کتنا ہی فرق ہو، لیکن ان کی فکری بنیاد ایک ہے اور وہ اسی فکری بنیاد کو فتنہ کی اصل جڑ سمجھتا ہے اور اسی پر کلہاڑا چلانا چاہتا ہے!

●

کسی نظامِ زندگی اور کسی دورِ تہذیب کی صحت کا دارومدار اس پر ہے کہ زندگی کی ماہیت کو اس نے کہاں تک صحت کے ساتھ سمجھا ہے۔ اور زندگی کی ماہیت کو سمجھنے کے لئے اوّل قدم یہ ہے کہ مجموعی طور پر پورے ہنگامۂ وجود کی حقیقت تک رسائی حاصل ہو۔ آج جس دورِ تہذیب سے ہمیں سابقہ درپیش ہے وہ اس ہنگامۂ وجود کے بارے میں اپنے مطالعہ کا آغاز اس فکری موقف سے کرتا ہے کہ اس میں کوئی ارادہ کارفرما نہیں ہے، اس کے پس منظر میں کوئی ہنگامہ آرا نہیں ہے۔ اس کی تہ میں کوئی حکمت کارفرما نہیں ہے۔ یہ مادّے کا ایک بے معنی کھیل ہے، یہ ایک بے منصوبہ ہنگامہ ہے، یہ ایک بلا ارادہ حرکت ہے، یہ ایک لاوارث سلطنت ہے، یہ ایک اندھی نگری ہے۔ اس بستی کا کوئی والی نہیں، اس خاندان کا کوئی سر دھرا نہیں، اس کا کوئی راجا نہیں۔ وہ اس میں کوئی خالق اور مالک نہیں۔ اس فکری موقف پر کھڑے ہو کر جب اس دورِ تہذیب کا فلسفہ زندگی کا جائزہ لیتا ہے تو وہ اسے مادّے کے ایک تقاضائے ارتقاء، اور بالکل آٹومیٹک تقاضائے ارتقاء معلوم ہوتی ہے، اور جب انسان پر نظر ڈالتا ہے تو اسے حیوان قرار دیتا ہے، وہ بے

اخلاق کا تجزیہ کرتا ہے تو اس کا معیار اسے "افادیت" کے سوا کوئی نہیں ملتا ——— یہاں تک کہ اس موقف پر کھڑا ہونے کی وجہ سے یہ فلسفہ سائنس کی ساری شہادتوں کو بھی رد کرتا ہوا حقائق کو اپنے تاویل کے ٹیڑھے بینگے سانچوں میں ڈھالتا چلا جاتا ہے۔

ہمیں اس تہذیب کے فلسفے کے اسی بنیادی موقف سے اختلاف ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ ہنگامۂ وجود بے معنی نہیں، یہ ایک لاوارث جائداد نہیں، یہ اندھی نگری نہیں۔ اس میں نظم، قانون، توازن، توافق، تناسب، آرٹ، ربط، منصوبہ، حکمت اور ارتقاء کارفرما ہے۔ اس کے مظاہر صاف صاف گواہی دے رہے ہیں کہ اس کے پیچھے ارادہ و شعور کارفرما ہے۔ اس کے نظم کا کوئی ناظم ہے، اس کے قانون کا کوئی قانون ساز ہے، اس کے آرٹ کا کوئی آرٹسٹ ہے اور اس کی حکمتوں کا سرچشمہ کوئی حکیم ہے۔ اب ہمارا فکری موقف "ایمان باللہ" قرار پاتا ہے۔ ہم زندگی کو مادے کا آٹومیٹک ظہور نہیں مانتے، ہم اس کو ارادۂ الٰہی کا ظہور مانتے ہیں۔ ہم انسان کو حیوان نہیں قرار دیتے، بلکہ اس کے سینے کو تمام حیوانات کے مقابلے میں اس شرارۂ آسمانی سے آراستہ پاتے ہیں جو اس کے اندر خیر و شر کے اخلاقی حاسہ کو برسرِ عمل لانے والا ہے۔ اس وجہ سے ہم اسے اپنے خالق کے سامنے جواب دہ مانتے ہیں اور اس کے لئے خالق کے مقابلے میں عبدیت ہی کے مقام کو صحیح مقام محسوس کرتے ہیں۔

ہم پوچھتے ہیں کہ اگر اس دورِ تہذیب کے فلسفوں کے مسحور ادیبوں کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے زاویۂ نگاہ سے زندگی کا مطالعہ کریں اور اپنے حاصلِ مطالعہ کو ادب کے سانچے میں ڈھالیں تو آخر اس دورِ تہذیب کے فلسفوں کے باغیوں کو کیوں حق نہیں پہنچتا کہ وہ بھی اپنے جداگانہ زاویۂ نگاہ سے زندگی کا مطالعہ کریں اور اپنے نتائجِ مطالعہ کو ادب میں سموئیں؟ آخر ادب صرف ملحدانہ فکر پر ایمان لانے والوں کا اجارہ کس بنا پر تسلیم کر لیا جائے اور خدا پرستانہ فکر کے علمبرداروں کے لئے اس میدان میں قدغن کیوں ہو؟

●

ہماری خدا پرستانہ فکر کی رو سے ایک صحت مند معاشرہ وہ ہے جس میں ایک اللہ کے سوا کسی اور کی غلامی، اطاعت اور عبدیت پر کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ انسان مجبور نہ ہو۔ جس میں ایک اللہ کے قانون کے سوا کسی فرد، یا خاندان، یا طبقے یا گروہ کی خواہشات قانون بن کر نافذ نہ ہو سکیں۔ جس میں معاشرے کی ساری قدریں اپنی اس تعبیر کے ساتھ اور اس حکمتِ انطباق کے ساتھ عملاً نفاذ پذیر ہوں جن کو خدا نے اپنے انبیاء کے ذریعے متعین کر دیا ہے۔ جس میں خیر و شر کے ان سارے اسباب و مظاہر کو کھول دیا گیا ہو جن کو الکتاب اور الرسول نے گن گن کر وضاحت سے ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ جس میں ہر فرد انسانی کو تمام بنیادی انسانی حقوق یکساں حاصل ہوں۔ جس میں ترقی کے دروازے ہر شخص کے لئے یکساں کھلے ہوں، اور نہ کسی کے لئے مستقل فوقیت حاصل کئے رہنے کے لئے وجوہ موجود ہوں، نہ کسی کے لئے مستقل رکاوٹیں ڈال کے رکھی جائیں۔ جس میں زندگی کے ہر میدان میں مسابقت آزادانہ ہو لیکن وہ ہو اخلاقی حدود کے اندر! جس میں زندگی کی مسابقت میں گر پڑنے والے افراد کو سہارا دینے کی ذمہ داری پورے سماج پر عاید ہوتی ہو۔ جس میں ایک دوسرے کو حق بات کہنے اور غلطی پر ٹوکنے کی آزادی ہر فرد معاشرہ کو پوری طرح حاصل رہے۔ جس میں آدمی اور آدمی کے درمیان سوائے اخلاقی فضیلت کے اور کوئی شے تقسیمِ مراتب کرنے والی نہ ہو۔ جس میں اصول و مقصد کی وحدت کو توڑنے والی جاہلی عصبیتیں کارفرما نہ ہوں۔ جس میں مفاد پرستی کے بجائے حق پرستی اور نفع اندوزی کے بجائے خدمت و ایثار کی اسپرٹ موجود ہو۔ جس میں عورت کو مجلسی کھلونا بنانے سے بچایا جائے اور اسے مساوات اور آزادی کے لفظوں سے فریب دے کر، اس کے کاندھے پر اس کے حصے کے فطری فرائض سے زیادہ کا بار نہ ڈالا جائے۔ جس میں فحاشی کے دروازے بالکل بند رکھے جائیں۔ جس میں فلاح و بہبود کا معیار اخلاقی مقاصد ہوں، نہ کہ مادی مفاد۔ جس میں خیر و فلاح کا معیار اونچا کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ انحصار تعلیم و تربیت کے ذرائع پر کیا جائے اور قانونی جبریت سے کم سے کم کام لیا جائے۔ جس میں فرد اور سماج کے حقوق کو ٹھیک ٹھیک توازن پر قائم کیا جائے کہ کوئی ایک دوسرے کو دبانے پر قادر نہ ہو۔ جس میں دوسری قوموں پر اپنا امپیریلزم مسلط کرنے کے جذبات کے بجائے پوری انسانیت کو اس نظامِ خیر کی طرف بلانے اور نظام ہائے باطل سے نجات دلانے کا اجتماعی جذبہ کارفرما ہو۔

اسلامی ادب کا فلسفیانہ پس منظر

یہ ہے اسلام کا سائنٹفک سماجی تصور!

●

مسلم ادیب اسلام کے اسی سائنٹفک سماجی تصور کو لے کے اٹھے ہیں۔ ہمیں بتایا جائے کہ آخر کیوں اس سماجی تصور کے لئے ادب کی دنیا میں کوئی جگہ نہیں!

بات کو خوب سمجھ لیجئے، اسلامی ادیب کیا کرنے چلا ہے۔ وہ افسانہ و نظم میں فقہ کے مسائل بیان کرنے نہیں اٹھا، وہ اسلام کے قوانین و ضوابط کو ادبی جامہ پہنانے نہیں لگا، وہ اسلام کے سائنٹفک سماجی تصور کو اپنی ادبی فکر کے لئے سانچے کے طور پر استعمال کرنے کا تجربہ کر رہا ہے! کیا اسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مارکس کے سماجی تصور کو ادب میں سمونے والے ادیبوں کے بخلاف محمد صلعم کے دئے ہوئے سماجی تصور کو ادب کی رگوں میں خون بنا کر دوڑا دے؟

●

یہ ہم مانتے ہیں کہ ہم لوگ ایک نیا تجربہ کرنے لگے ہیں، ایسا تجربہ جس کے لئے کوئی واضح نمونہ ہمارے سامنے نہیں ہے۔ ہمارا کام اس لحاظ سے بڑا مشکل ہے کہ ہمیں نقالی کے لئے اپنے سامنے کوئی دوسرے لوگ نظر نہیں آتے۔ ہم غیر زبانوں کے ادب کا مطالعہ کر کر کے اس کا چربہ اتار نے اور اپنے شاہکاروں کے محل نہیں کھڑے کر سکتے۔ بنا بریں ہم ایک انوکھا تجربہ کرتے ہوئے بار بار غلطیاں کر رہے ہیں اور ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ ان غلطیوں اور ٹھوکروں پر آپ ہمارا مذاق ضرور اڑائیں اور ہم پر پھبتیاں ضرور کسیں، لیکن ہم کیا کریں کہ ہر نیا تجربہ کرنے والے کو غلطیوں اور ٹھوکروں کا ایک مرحلہ طے کرنا ہی پڑتا ہے۔ لیکن ہمیں توقع ہے کہ یہ تجربہ جب اپنے ابتدائی دور سے گذر جائے گا تو آپ ہی نہیں، ایک زمانے کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ ہاں یہ ایک اونچے مکتب ادب بھی ہے!

اب بھی ——— اسلامی ادب جس کی عمر پانچ سات برس سے زیادہ کی نہیں ہے اپنے دامن میں شعر و افسانہ کے کچھ نہ کچھ موتی ایسے رکھتا ہے کہ جن کی آب و تاب لازوال ہے اور جن کو زندہ رہنے والے ادب پاروں کی صف میں پورے اطمینان کے ساتھ رکھا جا سکتا ہے!

●

بہرحال ——— یہاں بحث کا کوئی موقع نہیں۔ یہاں تو اسلامی ادب کا فلسفیانہ پس منظر عرض کرنا مطلوب تھا۔ کہ اخلاص اور سنجیدگی کے ساتھ جو لوگ ہمیں سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں، وہ چاہے ہمارے حریف ہی ہوں، ان سطور میں کچھ نہ کچھ سامانِ غور و فکر پائیں گے۔ باقی رہے پھبتیاں کسنے والے تو ان کی پھبتیوں کی ہمیں نہ پہلے پرواہ تھی نہ اب ہے، نہ آئندہ ہوگی!

تمثیل

• مصنّف :— جے او فرانسس

ترجمہ

• عاصی ضیائی ایم۔ اے

(ایک منظری تمثیل)

شکار چور

★ —— مصنف : جے او فرانسس

★ —— مترجم : عاصی ضیائی

یہ ڈراما اسی مصنف کا ہے۔ جس سے میں سابق میں "پروازِ ہمرجنس" نامی ڈراما اخذ و ترجمہ کر چکا ہوں۔ مقام، ماحول اور مرکزی خیال بھی وہی ہیں۔ پلاٹ اور کرداروں میں بہت تھوڑا تغیر ہے۔ لیکن قصہ اور بعض مخصوص مکالمے وغیرہ ایسے نہ تھے کہ "پروازِ ہمرجنس" کی طرح اسے ہندوستانی بنا لیا جاتا اس لئے صرف بامحاورہ ترجمہ کرنے پر اکتفا کی گئی

(ع۔ ض)

★ ————————

کردار :- ۱۔ ٹامس ٹون ۲۔ مرجد ٹون اس کی بیوی نکی ٹک ٹل ۴۔ ڈیوڈ ہیوز

منظر :- ویلز (Wales) کے دیہات میں ایک جھونپڑے کا رہائشی کمرہ۔ داہنی دیوار میں آتشدان جس میں آگ روشن ہے، چمٹے، پھکنی اور طاق پر موم بتی۔ پچھلے کونے میں دروازہ۔ پشت کی دیوار کے وسط میں کھڑکی جس کے پردے بندھے ہوئے ... کھڑکی کے آگے چھوٹی سی میز پر گلدان۔ اسی دیوار میں بائیں کونے کو گلی میں کھلنے والا دروازہ ... [illegible]

[illegible]

وقت : [illegible]

[illegible]

مرجد :۔ شب بخیر، میری جین ۔ جین سے سوؤ

ٹامس :۔ شب بخیر بیٹی

میری جین :۔ (اسٹیج سے پرے بائیں) شب بخیر امی ۔ شب بخیر آبا

مرجد :۔ (ٹامس سے) ۔ بس ؟

ٹامس :۔ ہاں ۔ (اُٹھ کر آرام کرسی آگ کی طرف دھکیل دیتا ہے، اور کھڑکی کے پاس جاکر باہر دیکھتا ہے ۔ مرجد گنجینے پر سے سینی اٹھا کر میز سے چیزیں سمیٹنے لگتی ہے)

ٹامس :۔ نہ معلوم رات وہاں کون تھا

مرجد :۔ کہاں ؟

ٹامس :۔ "بڑے کھیت" میں

مرجد :۔ اَے ہوں ، موچی ہوگا، یا جنکنز درزی ۔

ٹامس :۔ نہیں ۔ سارے لگے ہوئے تھکا دینے والے تو گاؤں میں جاکر زندہ تصویروں کا تماشا دیکھ رہے تھے ۔ جو رات وہاں آیا ہوا تھا

(آتش دان کے پاس آکر اپنا پائپ جلاتا ہے)

مرجد :۔ لے ہاں میں بھول ہی گئی ۔ تو کوئی اجنبی ہوگا ۔

ٹامس :۔ یقیناً اس خرافات پر چوٹ کرنے کے لئے تو دُور دُور سے لوگ آتے ہیں

مرجد :۔ اجی مجھے تو اچنبھا ہوتا ہے —— گاؤں بھر کے آدمیوں سے ایک ذرا سا بڈھا خرگوش پکڑا نہیں جاتا ۔

(دسترخوان اٹھا کر گلی میں جھٹکتی ہے پھر لوٹ کر ایک سرا ٹامس کو دیتی ہے جو اُسے تہ کرنے میں مدد دیتا ہے ۔

ٹامس :۔ میں اسے آج رات پکڑ لیتا جانم اگر میں نے گرجا جاکر توبہ نہ کرلی ہوتی ۔

مرجد :۔ دھنا کبھی کبھار ایک آدھ خرگوش گھر لے آنے سے تمہاری توبہ کا کیا بگڑ جائے گا ؟

ٹامس :۔ نہیں مرجد، لوگوں نے اتنی دقت سے مجھے توبہ کرائی ۔ اور میں پھر نسکا ریچودی کئے جاؤں !

مرجد :۔ پھر ٹامس، تم جانو، میں بہتیرا ہاتھ روک کے خرچ کروں مگر گزر نہیں ہوتی کل ساڑھے اٹھارہ روپے ہفتہ کی آمدنی اس میں کچھ خرگوش بھی آجاتے تھے ۔ تو کمی پوری ہوجاتی تھی ۔

ٹامس :۔ نہیں مرجد میں نیک چلن رہنا چاہتا ہوں مجھے اپنی نیک چلنی پر فخر ہے پھر ابھی دو ہی مہینے تو ہوئے ہیں ۔

مرجد :۔ نیک چلن رہو یا کچھ، کل کو کھاؤ گے کیا ؟

ٹامس :۔ ہاں میں یہ سوچ رہا تھا، مرجد، ٹھیک ہے —— پھر تم پوچھتی ہو تو تھوڑا سا گائے کا گوشت ٹھیک رہے گا ۔

مرجد :۔ ہاں مگر اس کے لئے دام کہاں سے آئیں گے ؟

ٹامس :۔ سب اللہ مالک ہے مرجد، اللہ مالک ہے (زینے کے پاس جاکر) لاؤ میری جین سے کہہ دوں کہیں سو نہ جائے ۔ میری جین !

میری جین :۔ جی !

ٹامس :۔ دیکھو صبح اسکول جانے سے پہلے ڈیوس قصائی کے ہاں ہو آنا

میری جین :۔ کاہے کے لئے ؟

ٹامس :۔ آدھا پونڈ گائے کا گوشت لے آنا بیٹی کہنا میرے حساب میں لکھ لے ۔

(کھڑکی کے پاس جاکر باہر دیکھتا ہے)

مرجد :۔ میرے لئے تم پہلے ہی مصیبت تھے، ٹامس، اور توبہ کرکے تو دس گنا بدتر ہوگئے ہو ۔

ٹامس :۔ (بلا ہیجان کے) نہ معلوم آخر اسے کون پکڑے (ٹھنڈی سانس بھر کر آرام کرسی کی طرف جاتا ہے) دُور، باہر کوئی شخص ایک پرانا مقامی گیت گاتا سنائی دیتا ہے ٹامس کچھ چونکتا ہے) وہ ڈِکی بک ڈل جارہا ہے ۔ سڑک پر (گانا قریب آتا جاتا ہے)

مرجد :۔ ہاں بیچارا ڈِکی ! (ادھر ادھر دیکھ کر) دیکھوں ۔ لو وہ میری جین کے جوتے صاف کرنے کو پڑے ہیں ۔ (کرسی کے نیچے سے جوتے نکالتی ہے)

ٹامس :۔ نہیں میں صاف کروں گا ۔ (جوتے لیکر آتش دان کے پاس کھڑا ہوتا ہے)

مرجد :۔ اچھا تو میں لکڑی کاٹ لوں ۔

ٹامس :۔ نہیں مرجد لکڑیاں میں کاٹوں گا

مرجد :۔ اس سے کیا فائدہ، ٹامس تم سے یہ کبھی نہ ہو سکے گا ۔

ٹامس :۔ "خالی ہاتھوں کے لئے شیطان کو کوئی شرارت سوجھ ہی جاتی ہے" یہی کہا تھا ڈیوڈ ہیوز دکاندار نے (اُف) غارت ہو اس کا یہ گانا !

مرجد :۔ وہ تو گلی میں آرہا ہے (موم بتی جلاتی ہے)

ٹامس :۔ (بے قرار ہوکر) :۔ یہ ڈِکی بک ڈل ! یہ بڑا خطرناک وسوسہ ہے نیک تو خیر نہیں ہے، بیچارا ڈِکی —— ہاں، مگر ہم دونوں کے ایک ساتھ بڑے زور کے کھیل رہ چکے ہیں —— بڑے زور کے !

مرجد: میں لکڑیاں کاٹنے جاتا ہوں۔ میں ڈکی سے آج ملنا نہیں چاہتا۔

(موم بتی لے کر پیچھے باورچی خانے میں چلا جاتا ہے اس کے پیچھے مرجد بوتل تولیہ برش وغیرہ لئے واپس آتی ہے۔ آگ کے پاس جوتوں کے قریب برش رکھتی ہے اور نسل میز پر رکھنے میں گانے کی آواز اونچی ہوتی جاتی ہے۔ یکایک گانا رک کر اس کی جگہ سیٹی بجتی ہے۔ مرجد دروازہ کھولتی ہے)

مرجد: آجاؤ ڈکی بک ڈل۔ تم ہمیشہ اس طرح سیٹی کیوں بجاتے ہو؟

(واپس میز کے پاس جا کر دھونے دھلانے کا اہتمام کرتی ہے)

(ڈکی بک ڈل کھڑکی کے سامنے سے گزر کر دروازے میں نمودار ہوتا ہے میلے کپڑے پہنے نوجوان آدمی ہے۔ کسی قدر کم عقل، مگر ناگوار کسی طرح نہیں معلوم ہوتا۔ ہوش آ جانے پر اپنے حواس کی تیزی اور حرکات کی چستی سے حیوان سا لگنے لگتا ہے۔ بسا اوقات کھو سا جاتا ہے اور کبھی کبھی دوسروں کی بات سمجھنے کی کوشش میں اس کے اندر ذہنی تناؤ کی علامت پائی جاتی ہے)

ڈکی: تمہارے شوہر ہیں، مرجد شوون؟ (دروازے کے دائیں ایک کتا بھونکتا سنائی دیتا ہے) آیا نہیں ابھی (جھکتا ہے اگر باکتے کو ٹھیک سا ہو)

مرجد: تمہارے آدمیوں سے یہ اب بہت وحشت کرنے لگی ہے مگر تم یہ تو بھونکتی بھی نہیں۔

ڈکی: [illegible] کبھی مجھ پر نہیں [illegible] مرجد شوون [illegible] نشان [illegible]

[illegible]

مرجد: آجاؤ ڈکی بک [illegible]

ڈکی: [illegible]

[illegible]

مرجد: [illegible]

ڈکی: [illegible]

مرجد: [illegible]

ڈکی: [illegible]

مرجد: میں نے سنا ہے کچھ دن سے تم پہاڑیوں پر جاتے ہو

ڈکی: ہاں، اگلز فار کو جاتا ہوں۔ (میز پر روٹی کو بھوکی نظر سے دیکھتا ہے)

مرجد: بیٹھو، کچھ کھا پی لو، ڈکی بک۔

ڈکی: نہیں، شکریہ، مرجد شوون۔

مرجد: (اسے میز کے بائیں کرسی پر زبردستی بٹھا کر) ارے بیٹھ بھی لڑکے۔ (روٹی اور مکھن کاٹتی ہے) تمہیں آج کچھ کھانے کو ملا بھی؟

ڈکی: ہاں ہاں! اگلز فار میں میں نے کچھ بالٹیاں درست کی تھیں۔ اس سے سیاہ پڈنگ خرید لی (سوچتے ہوئے) اگر میں پارلیمنٹ کا ممبر ہوتا تو شاید سارا دن سیاہ پڈنگ ہی کھاتا رہتا۔

مرجد: ہاں اُن کو بہت مراعات ملتی ہیں۔ تو رات تم نے زندہ تصویروں کا تماشا نہیں دیکھا؟

ڈکی: نہ۔ کیسا تھا؟

مرجد: معلوم نہیں۔ سنا ہے بڑے زور کا تھا۔ ٹام شکر سے سب پوچھنا۔

ڈکی: نہیں۔ وہ تو شاید پہاڑیوں پہ تھا

مرجد: غریب ٹام! کہتے ہیں وہ تو اس طرح وہ سؤر نہ پکڑتا مگر جب تیس روپے جرمانہ اور خرچہ یا چودہ دن قید کا معاملہ ہو گیا تو وہ کر ہی کیا سکتا؟ پھر بھی میرے خیال میں [illegible] بند رکھ سکتا تھا۔

ڈکی: ٹام جب تک اس سے [illegible] موقع کی تاک میں ہے [illegible] کہاں ہے؟

مرجد: تو تم خالص [illegible]

ڈکی: [illegible] کچھ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

مرجید :۔ اچھا نہیں ہے ؟ تو تم انھیں مزید تباؤ وہ ہمیشہ اس پر جان چھڑکتے تھے (باورچی خانے کا دروازہ کھولتی ہے۔ ٹامس لکڑیاں کاٹنا بنائی دیتا ہے۔ مرجید کہتی ہے ؟ "ٹامس" ! اور ٹامس دھیان ہٹنے سے اپنے ہاتھ پر چوٹ مار لیتا ہے۔ اور زور سے قسم کھاتا ہے پھر لکڑیوں کا گٹھا اور موم بتی اٹھائے ہوئے انگلی چوستا داخل ہوتا ہے)

مرجید :۔ کیا ہاتھ میں چوٹ لگ گئی ٹامس ؟

(ٹامس زیر لب بڑبڑاتا لکڑیاں آتشدان کے پاس ڈال دیتا ہے)

ٹامس :۔ (ٹھنڈا ہو کر) معاف کرنا مرجید میں نے قسم کھائی

مرجید :۔ نہیں، اگر قسم سے تمہیں تسلی ہوتی ہے تو ضرور کھاؤ۔

ٹامس :۔ (ہاتھ میں موم بتی لیے گھوم کر) اخاہ ڈکی تم اب پھر لوٹ آئے،

ڈکی :۔ ہاں ٹامس شوان (ٹامس سے اس کا رویہ کھلم کھلا عقیدتمندانہ ہے)

ٹامس :۔ ہاتھ مت روکو، ڈکی (ڈکی کھاتا جاتا ہے)

مرجید :۔ یہ بلاؤ کا کچھ کہنے آیا تھا ٹامس !

ٹامس :۔ (توجہ سے) بلاؤ ؟ (موم بتی مرجید کو دیتا ہے وہ اسے پھونک سے بجھا کر میز پر رکھ دیتی ہے پھر جھکتی ہے کہ آگ پھونکتی ہے جو خوب بھڑک اٹھتی ہے)

[ڈکی] :۔ ہاں وہ کچھ ٹھیک نہیں ہے بس !

[ٹامس] :۔ تو تم اس کی کچھ دیکھ بھال نہیں کرتے۔

[ڈکی] :۔ ہاں ہاں اچھی طرح۔ جیسا تم نے بتایا تھا۔ تو ذرا چل کے دیکھ لو اسے (ٹامس اپنے ہیٹ کی طرف بڑھتا ہے مگر رک جاتا ہے)

[ٹامس] :۔ نہیں، اسے یہیں لے آؤ۔ سونے سے پہلے (کھڑکی کی طرف اشارہ کر کے) تم اسے کبھی کبھار باہر بھی لے جاتے ہو ؟

[ڈکی] :۔ ہیں ؟ نہیں تو تم ساتھ نہ ہو تو مجھے کیا لطف آئے ٹامس شوان ؟

[ٹامس] :۔ خیر میں تو تمہارا دل بڑھانے سے رہا۔ مگر مل کر کام کرنے کو اور بہتیرے ہیں۔

[ڈکی] :۔ نہیں ٹامس شوان اور کوئی نہیں۔ تم جانتے ہو اور کوئی نہیں۔

---

[1] انگریزی جلا ہٹ کے موقع پر قسم کھائی جاتی ہے۔ جیسے اردو میں گالی دی جاتی ہے یہی ترکا چوری کے لئے۔

ٹامس :۔ کیوں ایک جگہ تو دنیا ہی ہے،

ڈکی :۔ (حقارت سے) وہ میٹھے خرگوش کا شکار کرنے والا ؟ تو یہ کرنے ہرگز نہیں۔

ٹامس :۔ خیر تو موریس موجی ہے۔

ڈکی :۔ وہ ؟ تمہیں موریس کی خبر بھی ہے ؟ اسی نے دو سال ہوئے دریا میں جیند ڈالا تھا۔

ٹامس :۔ کیا ؟

ڈکی :۔ ہاں، تام ٹنکر نے مجھے بتایا اور یہ سنو ٹامس شوان وہ پھندہ لگا کر "خرانٹ" کو پکڑنے کی بات کر رہا ہے۔

ٹامس :۔ پھندا ؟ کیا ہم سب میں یہ طے نہیں ہے کہ "خرانٹ" کو صرف بلاؤ اور جال سے پکڑا جائے ؟ میں کہہ دیتا ہوں۔ ڈکی ! اگر موریس نے "خرانٹ" کے لئے پھندا لگایا تو۔ میں نے توبہ کی ہو۔ یا کچھ، میں اس کی گردن توڑ دونگا۔ اس خرگوش نے ہمیں خوب چکمہ دیا ہے لہذا اسے بھی ایمانداری سے ہاتھ لگنا چاہئیے۔

مرجید :۔ (میز تک جا کر) تمہیں یقین ہے وہ موریس نہیں تھا۔ وہاں کل رات ٹامس ؟

(برتن وغیرہ اٹھا کر کینچی میں رکھتی ہے)

ٹامس :۔ نہیں وہ تو شرطیہ تماشے میں تھا ڈکی ؟

ڈکی :۔ ہاں ؟

ٹامس :۔ تم یہاں آس پاس کے کسی آدمی کو جانتے ہو۔ موریس سے ذرا لمبا بڑی سی ملیڑے دار ٹوپی اوڑھتا ہے ——— جانتے ہو ؟

ڈکی :۔ نہیں کسی کو نہیں۔

ٹامس :۔ رات کو "خرانٹ" کی گھات میں آیا تھا۔ پر اچھے سے نکلا کہ دیکھوں کون ہے۔ مگر وہ جھٹ چلدیا۔ مجھے بس وہ ٹوپی ایک جھلک دکھائی دی۔

ڈکی :۔ (جھلاکی سے) ٹامس شوان تمہیں یاد ہے جب ہم نے آخری دفعہ اس پر داؤ کیا تھا ؟

ٹامس :۔ (کسی قدر تیزی سے) بس اب اس کو رہنے دو ڈکی۔

ڈکی :۔ یاد ہے اس نے پھر ہمیں غچا دیا تھا ؟ اور ہمیں بلاؤ چھوڑ نا پڑا تھا۔

اور فین کی کیا حالت تھی ؟ کان کھڑے، آنکھیں سُرخ انگارا

ٹامس :۔ ہاں ٹھیک ہے ۔ اس نے ہمیں غچّا دیا لیکن اگر اس دن مجھے وہ بات معلوم ہوتی جو آج ہے تو ہم اُسے لیل بھیالس لیتے ـــــ (زور سے ہاتھ بھینچ کر) ہوں، مگر اب تو وہ قصّہ ہی ختم ہو گیا ہے اس کے ذکر سے کیا فائدہ ؟ (آرام کرسی پر بیٹھ کر جوتے صاف کرنے کے لیے ایک جوتے میں ہاتھ ڈالتا ہے)

ڈکی :۔ (تو غیاز) وہ اب بھی وہیں ہے، ٹامس شون (کھڑکی کے پاس جا کر باہر دیکھتا ہے)

مرجد :۔ ایک اکیلا وہی تو نہیں ہے ۔

ٹامس :۔ مرجد اگر مجھے عزت دار آدمی بننا ہے تو نفس کی ترغیب روکنا ہی پڑے گی ۔ اور تم جانتی ہی ہو ۔ میرے لئے نفس کی خاص ترغیب خرگوش ہیں ۔

مرجد :۔ (باورچی خانے کو جاتے ہوئے) خیر اب گلہ کس بات کا ؟ یہی دعا کی تھی ٹامس کہ تم درست ہو جاؤ ۔ مگر سچ مچ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ اتنی سچی نکلے گی ۔ (آہ بھرتی ہوئی جاتی ہے)

ٹامس :۔ آہ یہ نفس امارہ یہ مجھ جیسا آدمی ہی سمجھ سکتا ہے ۔

ڈکی :۔ ٹامس شون وہ قصّہ بالکل ہی ختم تو نہیں ہو گیا ہے نا ؟ تم دیر سویر ہم میں واپس آنے والے ہو ؟

ٹامس :۔ (برش سے یونہی کھیلتے ہوئے) نہیں بالکل ختم ۔ ڈکی ! میں عزت دار آدمی بن ہی گیا ہوں ۔

ڈکی :۔ مگر میرے عزت دار بننے سے پہلے ٹامس شون ـــــ نہ فین نہ مزا کو ۔

ٹامس :۔ ہاں اور مجھے یقین نہیں کہ لوگ تمہیں عزت دار آدمی بنا سکیں گے ـــــ ڈیوڈ ہیوز دکاندار بھی نہیں ۔

ڈکی :۔ میں بننا بھی نہیں چاہتا ۔ بالکل نہیں چاہتا تو نہیں یہ اتنا پسند ہے ۔

ٹامس :۔ (متزلزم ہو کر) وہ دیکھو نا ڈکی ! یہ بھی ان باتوں میں سے ہے جن کا عادی ہونا ہی پڑتا ہے ۔

ڈکی :۔ (الجھ کر) اوہ !

ٹامس :۔ ہاں ! آدمی ہر بات کا عادی ہو سکتا ہے ـــــ دیر یا سویر

ڈکی :۔ (ترحمانہ) کبھی کبھی تمہیں بڑی کوفت ہوتی ہوگی ۔ ٹامس شون ـــــ دنیا کی دلچسپیاں سوچ سوچ کر ۔

ٹامس :۔ ارے نہیں ایسا تو نہیں ہے ۔

ڈکی :۔ بڑے زور کی چیزیں ہیں دنیا میں ٹامس شون ـــــ بھرر بھرر اڑتے ہوئے تیتر ہیں اور خرگوش ـــــ ٹپ ٹپ ـــــ ننھی ننھی دُمیں اٹھائے وہ بھاگے اور پھر مہاشیر ہے جو سمندر سے موٹی ہو ہو کر دریا میں نکل آتی ہے ـــ

ٹامس :۔ (بڑے جوش میں زور زور سے پالش کرتے ہوئے) خدا سمجھے تجھ سے لڑکے تو تو مصر کی دس بلاؤں سے بھی بدتر ہے ۔

ڈکی :۔ وہ رات یاد ہے ٹامس شون ! جب ہم مہاشیر پکڑنے نکلے تھے اور میں رکھوالوں میں پھنس گیا تھا ؟ (یہ واقعہ یاد کر کے ہنستا ہے)

ٹامس :۔ (خود بھی ہنس کر) ہاں تم خوش قسمت تھے کہ میں تمہارے ساتھ تھا ۔

ڈکی :۔ ہائے کیا مزہ آتا تھا مہاشیر کے شکار میں ۔ کیوں ٹامس شون ؟ اب تمہیں اس کا خیال نہیں آتا ؟ دریا پہ گھپ اندھیرا ـــــ میرے پاس مشعل اور تمہارے پاس بھالا ـــــ کھڑے ہیں منتظر ـــــ منتظر ـــــ کہیں کوئی کھڑکا تک نہیں بس دریا ہے کہ پتھروں پر بہہ رہا ہے اور اوپر درختوں میں ہوا ۔

ٹامس :۔ (اچھل کھڑا ہوتا ہے) بس کرو ڈکی ! کیا شیطان نے آدمی بن کر ڈکی ٹک ڈل کا روپ دھار لیا ؟

ڈکی :۔ اور پھر کبھی خرگوش کی گھات میں ـــــ تم ایک طرف میں دوسری طرف اور اُسے ہنکانے کو کھیت میں فین ۔ پھر میں تمہارے پاس آؤں یا تم میرے پاس آؤ ۔ پھر ہم سیٹی بجائیں (اشارے کی سیٹی بجاتا ہے اور پھر یکایک رک جاتا ہے باہر کتا بے چینی سے رونا سنائی دیتا ہے)

ٹامس :۔ (پھسل کر) اُف ـــــ توبہ ! ۔

ڈکی : (دروازے کی طرف) ہاں میں جانتا ہوں میں اُسے یاد دلا رہا ہوں

ٹامس : بیکار ہے ڈکی، بڑے زور کے دن تھے وہ مگر میں چھوڑ چکا ہوں۔

ڈکی : تمہیں معلوم ہے ٹامس شون، گاؤں میں کیا کہہ رہے ہیں؟ کہتے ہیں تم نے ہمت ہار دی۔ کہتے ہیں تم رکھوالوں سے ڈر گئے

ٹامس :- کیا؟ ڈر گیا؟ میں؟

ڈکی :- ہاں تم۔ مورس یہی کہتا ہے۔ جنکنز یہی کہتا ہے۔ ایونز نانبائی یہی کہتا ہے۔ (وفادارانہ جوش سے) اور ٹامس شون، میں نے اُن سے کہا۔ یہ سب جھوٹ بکواس ہے۔

ٹامس : (از خود رفتہ) ٹھیک! اُن سے کہہ دو ڈکی یہ سب جھوٹ بکواس ہے۔ ہونہہ ڈر گیا۔

ڈکی :- تم تو کسی چیز سے نہیں ڈرتے تھا۔ ٹامس شون؟ تمہیں ایک شخص تھے جو کبھی نہیں ڈرتے تھے۔

ٹامس :- میں علاقے کے تمام رکھوالوں کو چکمہ دے سکتا ہوں۔ میں ایسا کر چکا ہوں سینکڑوں دفعہ اور ہمیشہ جیتا۔ بس اتنا ہے کہ میری زندگی کا نیا ورق اُلٹ چکا ہے وہ ڈیوڈ ہیوز دکاندار سے پوچھ لیں۔

ڈکی :- مجھے نفرت ہے۔ ڈیوڈ ہیوز دکاندار سے،

ٹامس :- ہائیں ڈکی یہ بُری بات وہ بڑا اچھا آدمی ہے۔ ڈیوڈ ہیوز اور قصبے کا سب سے پرانا پادری ہے۔

ل :- اُس نے تمہیں ہم سے چھین لیا۔ ٹامس شون ——— مجھے اور ریلاؤ سے اور مجھ سے اب دنیا پہلی سی رہی ہی نہیں۔ آہ! ہم اکٹھے کتنے خوش تھے۔ ہم چاروں جب تک تم نے ڈیوڈ ہیوز کی بات نہیں سنی تھی۔

ل :- وہ نہایت معزز آدمی ہے۔ سچ مانو اور اس نے میرے ساتھ بڑی نیکی کی ہے

ل :- (اس کے قریب جا کر مجسس نظروں سے دیکھ کر) میں جانتا ہوں تم مورس یا جنکنز سے نہیں ڈرتے۔ اور تم رکھوالوں سے بھی نہیں ڈرتے مگر سچ کہنا ٹامس شون کیا تم اس بڈھے ڈیوڈ ہیوز دکاندار سے ڈرتے ہو؟

ٹامس :- (ہچکچاتے ہوئے) ایسے مہمل سوال مت پوچھو صاحبزادے

ڈکی :- ہاں تم ڈرتے ہو ٹامس شون، تم ڈرتے ہی ہو ——— تم بھی، اس نے اب سارا گاؤں گانٹھ لیا ہے۔ سوائے مجھ ڈکی بک ڈل کے، مگر وہ مجھے نہیں پھانس سکے گا۔ ہرگز نہیں بس ایک میں رہ گیا ہوں۔ مگر میں سڑک پر چلتے ہوئے خوب گایا کروں گا اور کسی کی حسد بھری نظر مجھے نہیں روک سکے گی۔

ٹامس :- ڈکی؟

ڈکی :- ہاں؟

ٹامس :- تم کبھی عزت دار آدمی بننا نہیں چاہتے؟ تمہیں یہ خیال کبھی کبھار نہیں آتا ——— اکثر نہ سہی ——— کبھی کبھار؟

ڈکی :- نہیں۔

ٹامس :- تم کبھی نہیں سوچتے کہ گرجا میں بڑا آدمی ہونا اچھی بات ہے؟

ڈکی :- نہیں۔

ٹامس :- یا کبھی نہ کسی دن دیہاتی ضلعی انجمن کا ممبر منتخب ہونا؟

ڈکی :- نہیں،

ٹامس :- تو سوچیے کیا ہو آخر ڈکی؟

ڈکی : (خالی الذہن) سوچتا کیا ہوں، میں ——— مجھے نہیں معلوم آج میں سوچتا رہا ہوں کہ انگلز فارم میں سیاہ پڈنگ بڑی عمدہ بنتی ہے۔ یہی مطلب ہے تمہارا ٹامس شون؟

ٹامس :- نہیں تم کبھی نہیں سوچتے کہ تم اپنے زمانے میں کتنے بڑے گنہگار رہے ہو؟

ڈکی :- نہیں،

ٹامس :- کبھی اپنے جسم کے اندر غیر فانی روح کی بھی تمہیں فکر نہیں ہوتی؟

ڈکی :- نہیں،

ٹامس :- (متفکرانہ) یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر کون بدھو ہے ——— تم یا میں۔

ڈکی :- کوئی آ رہا ہے (یکایک اس کا انداز گرا ہوا ہو جاتا ہے)

ٹامس:- اچھا؟

ڈکی :- تم نے نہیں سنا؟

ٹامس :- نہیں کچھ نہیں، تمہاری ہی آنکھیں ہیں بلی کی سی اور کتے کے سے کان۔

ڈکی :- (چبا کر) یہ ڈیوڈ ہیوز دکاندار ہے

(کتا بھونکنے لگتا ہے۔ ڈکی چپکے سے کہتا ہے "ہش فلِن ہش!"
ٹامس باورچی خانے کے دروازے تک جاتا ہے)

ٹامس :- مرجد جلدی ڈیوڈ ہیوز آ رہے ہیں۔

مرجد :- (داخل ہو کر) بھائی ڈیوڈ ہیوز (اپنی جھاڑن سے آرام کرسی جھاڑتی ہے) ڈکی جانا نہیں، پہلے کچھ ناشتے کے لئے لے جاؤ۔

(ٹامس دروازہ کھولتا اور کتے کو چپ کراتا ہے۔ ڈیوڈ ہیوز کھڑکی کے آگے سے گزرتا ہے)

ٹامس :- (بڑی تعظیم سے) کیسے مزاج ہیں مسٹر ہیوز؟

[illegible]

ٹامس :- جی بالکل [illegible]

ہیوز :- [illegible] مرجد تون؟

مرجد :- جی [illegible]

ہیوز :- (ڈکی کو [illegible])

ٹامس :- تشریف [illegible] ہیوز

مرجد :- پہلی ندی [illegible] اچھی ہے [illegible] ہیوز

ہیوز :- ہاں! [illegible] باندھ رہی ہے۔ [illegible] تون! اس وقت میں تمہارے [illegible] یاد [illegible] کیا تھا۔

ٹامس :- [illegible]

ہیوز :- ہاں!

مرجد :- [illegible]

[illegible]

ہیوز :- اور میں بتاؤں، ٹامس شون، کہ ہماری گفتگو کا موضوع تم ہی تھے

ٹامس :- میں؟

ہیوز :- (ڈکی کی طرف معنی خیز طور پر دیکھ کر) ہاں مگر میں ——

ٹامس :- او مسٹر ہیوز، ڈکی تو اپنے بلاؤ کے سلسلے میں آیا ہے۔

ہیوز :- (متحیر ہو کر) بلاؤ؟

ٹامس :- (گھبرا کر) مسٹر ہیوز جو آپ سوچ رہے ہیں وہ بات نہیں ہے واقعی بلاؤ کچھ ٹھیک نہیں، ڈکی صرف یہ پوچھ رہا تھا —

ہیوز :- میں سمجھا مجھے سن کر افسوس ہوا —— ڈکی —— کہ تم اب بہت ادنیٰ صحبتوں میں اٹھنے بیٹھنے لگے ہو۔ آپ جیسے ایک ٹام شنکر ہی سے۔

ٹامس :- جی دیکھئے نا، ٹام تو اسے اپنا ہنر سکھا رہا ہے اور یہ اس کی مہربانی ہی ہے۔ ڈکی تک ڈل پر مہربان ہوتا ہی کون ہے؟

ہیوز :- وہ اُن میں سے ہے جن پر مہربان ہونا آسان نہیں۔ ٹامس شون میں نے کوشش کی تھی۔

ڈکی :- [illegible] تم نے کوشش کی تھی کہ مجھے [illegible] ڈیوڈ ہیوز!

ٹامس :- ہاں، ڈکی مسٹر ہیوز نے بھلا ہی چاہا تھا۔

ہیوز :- [illegible] میں بہت اچھے [illegible] باقاعدہ کھانا اور باقاعدہ گھنٹے ——۔

ڈکی :- اور بڑی سی چار دیواری بھی ڈیوڈ ہیوز!

ٹامس :- کس قدر بدلی زبان سے مسٹر ہیوز کہو۔ ڈکی تک!

ڈکی :- نہیں ٹامس شون، میں نہیں ڈرتا۔

ہیوز :- صاحبزادے جہاں ادب کا موقع ہو وہاں ادب کرنے سے تمہارا ہی بھلا ہوگا۔

ڈکی :- اگر میں جھاڑی میں سوؤں اور چشمے میں دھوؤں دھلاؤں تو تمہیں یا کسی اور کو اس سے کیا ڈیوڈ ہیوز؟

ہیوز :- (پُر معنی طور پر) کسی ایک نے جوتے کھو جانے کی شکایت کی ہے۔

ڈکی :- کچھ کو خدا جوتے دیتا ہے اور جن کے پاس نہیں ہوتے انہیں ہاتھ

دیتا ہے۔ ڈیوڈ ہیوز!

ٹامس: خاموش، ڈکی!

ہیوز: البیوں سے اور کیا توقع ہو، ٹامس شون؟ تم جانتے ہی ہو اس کے ساتھی کون ہیں ——— انہی سے بھی ادنیٰ، بھک منگے، کبیرے، ہیوڑے[1] ———

ڈکی: ہاں، بھک منگے اور کبیرے اور ہیوڑے اور سارے سڑکوں پر پھرنے والے غریب، وہ مجھے دھتا نہیں بتاتے۔ ڈیوڈ ہیوز، نہ مجھے سخت سُست کہتے ہیں، ہم ساتھ ساتھ پھرتے ہیں اور دوستوں کی طرح باتیں کرتے ہیں ———

ٹامس: ہاں، ڈکی یہ بڑی اچھی بات ہے، ہم جانتے ہیں مگر ———

ہیوز: واہ، کسی بھلے آدمی کے لئے کتنے لطف کی بات ہے۔ ہمیں خیال میں، ٹامس شون اگر تم دوست ہونا چاہتے ہو، تو یہی وقت ہے کہ اس قماش کے لوگوں سے ملنا چھوڑ دو۔

ڈکی: (بھڑک کر) تم اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتے، ڈیوڈ ہیوز؟ یہ ہمارا ہے ——— فین کا اور بلاڈ کا اور میرا۔ تم پہلے ہی گاؤں بھر کو لے چکے ہو۔ یہ تمہارے لئے کافی نہیں ہے؟ ڈیوڈ ہیوز؟ میں نے تو کبھی کبھار چوزے اور کچھ شلجم ہی چرائے ہیں۔ مگر تم اپنی کہو۔ تم نے ایک آدمی چرا لیا۔

ٹامس: ڈکی، ڈکی!

ڈکی: (ملتجیانہ) ہم میں لوٹ آؤ، ٹامس شون!

ٹامس: (نرمی سے) تم یہ باتیں نہیں سمجھتے، ڈکی بک۔ اب جاؤ دوڑ کے بلاڈ سے آؤ۔

ڈکی: ارے ہاں، بلاڈ! میں بھول ہی گیا تھا (جانے کو مڑتا ہے جو کھانے کی ایک پوٹلی لئے داخل ہوتی ہے)

مرجید: چل دیئے ڈکی؟

ڈکی: ہاں، مگر بلاڈ لے کے پھر آتا ہوں

مرجید: یہ لو (ہیوز سے آڑ کر کے ڈکی کو پوٹلی دیتی ہے)

(ڈکی دروازہ کھولتا ہے اور مڑ کر ڈیوڈ ہیوز کو دیکھ کر گستاخی سے گانے لگتا ہے۔ ٹامس اس کی طرف لپکتا ہے اور وہ یکایک گانا بند کر کے پکارتا ہے "ارے ہاں بلاڈ!" پھر جاتا ہے اور اس کا گانا سڑک پر مدھم ہو کر ختم ہو جاتا ہے)

ٹامس: آپ غریب ڈکی بک ڈل کا بُرا نہ مانئے گا۔

مرجید: اس کی تو عادت ہی ایسی ہے مسٹر ڈیوڈ

ہیوز: اوہ، ہاں، شاید۔ خیر، تو میں کیا کہہ رہا تھا؟ ہاں، میں آج رات اپنے ساتھی پادریوں سے مشورہ کر کے آیا ہوں۔

ٹامس: جی؟

(مرجید کھینچنے سے سلائی کی ٹوکری لے کر میز کے بائیں بیٹھ جاتی ہے۔ ٹامس کھڑکی سے میز کی پشت کے پاس کرسی لا کر رکھتا ہے)

ہیوز: میں تمہیں بتا دوں، ٹامس شون، کہ ہم سب دیکھ کر بہت خوش ہوئے ہیں کہ تم نیک چلن رہے ہو (مرجید بے اختیار آہ بھرتی ہے)

ٹامس: جی ہاں میں تو انتہائی کر رہا ہوں، مسٹر ہیوز، یہ سچ ہے کہ ابھی پوری طرح عادت نہیں پڑی ہے۔

ہیوز: ہاں ہاں! پڑ جائے گی اس وقت تمہیں جو چاہئے وہ یہ ہے کہ اپنا ذہن مصروف رکھو (ٹامس بے چینی سے کھڑکی کی طرف دیکھتا ہے) "خالی ہاتھوں کے لئے شیطان کو کوئی شرارت سوجھ ہی جاتی ہے"۔

مرجید: پھر اُسے ہم جیسوں کے لئے تو زیادہ موقع ملتا ہوگا، مسٹر ہیوز؟

ٹامس: آس پاس بے شمار ترغیبیں ہیں۔ میں رات زندہ تصویروں کا تماشا ہی دیکھنے کے لئے مرا جا رہا تھا۔ مگر میں نے سوچا خطرہ کیوں مول لوں، آپ تو وہاں نہیں تھے شاید؟

ہیوز: میں؟ نہیں!

ٹامس: میں خلافِ معمول سونے لیٹ گیا۔

ہیوز: ہاں، ہم نے گاؤں سے دیکھا ہے کہ تمہاری روشنی اب جلد گُل ہو جاتی ہے۔ خیر تو میں کہہ رہا تھا، "ایون بائل ضلع چھوڑ کر جا رہا ہے، تمہیں معلوم ہے؟

---

[1] اردو بول چال میں جاز بردستوں کو حقارتاً ہیوڑے کہتے ہیں۔

ٹامس :- جی ۔

ہیوز :- میں نے اپنے ساتھی پادریوں کو تجویز پیش کی کہ پاول کی جگہ بَینڈ آف ہوپ کے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ تم بہترین رہو گے ۔

ٹامس :- (یکا یک کھڑے ہوکر) - میں مسٹر ہیوز، میں ؟

مرجید :- مسٹر ہیوز، جیلینے ہی بھر میں یا ٹامس زندہ نہ رہیں گے، یا بینڈ آف ہوپ

ٹامس :- یہ تو بڑی عزت ہے کہ کسی کو دی جائے، مسٹر ہیوز، مگر میرے بس کی نہیں، واقعی نہیں۔

مرجید :- میں اپنے ہی شوہر کو اب تک خوب نہ سمجھ گئی ہوں گی ؟ مجھے یقین نہیں کہ بینڈ آف ہوپ ان سے سنبھلے ۔

ہیوز :- میں ——— واقعی !

مرجید :- اگر انھیں کچھ کرنا ہی ہے تو اتوار کی رات کو گیلری میں چھوٹے لڑکوں کو چپ کرانے کا کام بہتر کر سکیں گے ۔

ٹامس :- (مشتاقانہ) :- ہاں یہ کام ہے جو مجھ سے کچھ ہو بھی جائے گا ۔

ہیوز :- میں تمہیں یہ بھی بتا دوں، ٹامس شون، کہ جہاں تک بینڈ آف ہوپ کا تعلق ہے میں نے اپنے ساتھی پادریوں سے خود تمہارا ذمہ لیا ہے ۔

ٹامس :- (مایوسی سے) :- یہ آپ کی بڑی عنایت ہے، واقعی، مسٹر ہیوز ۔

ہیوز :- (فیصلہ کن طور پر) خیر تو ہم اسے پھر طے سمجھیں نہ ؟

ٹامس :- (کھڑکی کے باہر دیکھ کر) سچ پوچھیے تو، مسٹر ہیوز، میرے ذہن پر ایک بوجھ ہے ۔

ہیوز :- ہاں اچھا ؟ شاید میں تمہاری مدد کر سکوں، ٹامس شون ؟

ٹامس :- یہ اُس خرگوش کا خیال ہے "وہ بڑے کھیت والا"

ہیوز :- خرگوش، ٹامس شون، خرگوش ؟

ٹامس :- جی وہ جسے خرانٹ کہتے ہیں۔ آپ نے بھی خرانٹ کا ذکر تو سنا ہی ہوگا، مسٹر ہیوز ؟

بینڈ آف ہوپ یعنی شراب نہ پینے والوں کا عہد کرنے والی انجمن

مرجید :- (بے صبری سے) ابھی اگر گشتی لوٹے سے اونٹ بھی پچھلے پیروں پر چل آتا تو اس کا بھی اتنا چرچا نہ ہوتا ۔

ہیوز :- "خرانٹ" یہ تو وہ خرگوش ہے ۔ جسے کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ ٹامس شون ؟

ٹامس :- ہاں اب تک سب ہار گئے ہیں، میں خود بہتیری دفعہ ناکام رہا، مگر اب اُسے پکڑ سکتا ہوں۔

ہیوز :- اچھا تم نے اتنا بڑا بھید پایا کیسے، ٹامس شون ؟

ٹامس :- جی آپ کو معلوم ہے، مسٹر ہیوز، کہ گرجا میں جہاں میں بیٹھتا ہوں، وہاں سے منبر کے برابر والی کھڑکی میں سے تیرہ کھیت صاف دکھائی دیتا ہے ۔

ہیوز :- ٹھیک ۔

ٹامس :- (رنج سے) معلوم نہیں کیوں، مگر مجھ سے وعظ پر دھیان ہی نہیں دیا جاتا ۔ اب پچھلے ہی اتوار کی صبح کی بات ہے مسٹر الیونز بیان سنا رہے تھے، حضرت موسیٰ کے ارض موعود دیکھنے کا ۔ بڑی خوبی سے وعظ کہتے ہیں، مسٹر الیونز، اور کیوں نہ ہو آخر فاضل دینیات ہیں ۔ مگر آپ کو معلوم ہے، مسٹر ہیوز میں ارض موعود کے بیچ میں کیا دیکھ رہا تھا ؟

ہیوز :- کیا ؟

ٹامس :- یہی بڈھا خرگوش ۔

ہیوز :- کیا ؟

ٹامس :- جی یہ "خرانٹ" ——— ذرا سی پہاڑی پر بڑے اطمینان سے بیٹھا جا رہا ۔ ہر طرف دودھ اور شہد ۔ یوں میں اس کی تصویر ذہن میں کھینچ رہا تھا وہ اس کا بایاں کان آدھا کھڑا ہوا ۔ اور پورے چہرے پر ایک طرح کی مسکراہٹ ۔

ہیوز :- میں نے ہمیشہ کہا کہ وہ کھڑکی پوری طرح بند کر دی جائے سے وعظ کا دھیان بٹتا ہے ۔

ٹامس :- بس ایک دفعہ جی چاہتا ہے کہ اپنی نیک چلنی بالائے طاق اس خرانٹ کو پکڑ لوں ۔

ہیوز :- تو تمہارا خیال ہے کہ اب اُسے پکڑ سکتے ہو ٹامس شہ

ٹامس :۔ خیال والے صاحب یقین ہے یقین !

ہیوز :۔ اور تم نے کسی کو بتایا نہیں ؟

ٹامس :۔ ابھی تک نہیں ، ہاں آپ کو بتا دوں گا ، مسٹر ہیوز آپ
کی اور بات ہے ۔

ہیوز :۔ خیر اگر تمہارے ذہن پر یہ اتنا بار ہے ٹامس شون تو ــــــ

ٹامس :۔ (بیٹھ کر) تو بات یہ ہے مسٹر ہیوز ، آپ کو بتاتا ہوں ، یہ
طے ہے اس علاقے میں کہ "خرانٹ" کو صرف بلاؤ اور جال
سے پکڑا جائے ۔

ہیوز :۔ اچھا ۔

ٹامس :۔ اب یہ لوگ کھیت کے سارے بھٹ روک دیتے ہیں
پھر بھی وہ ہمیشہ نکل جاتا ہے ۔

ہیوز :۔ ہاں یہی سنا ہے میں نے ۔

ٹامس :۔ اور آپ کو معلوم ہے کیوں ؟ کھیت کے بھٹ روک
دینا کافی نہیں ۔

ہیوز :۔ کافی نہیں ؟

ٹامس :۔ نہ ، اُدھر پہاڑی میں ایک پرانی کھوہ ہے آپ جانتے ہیں ؟

ہیوز :۔ ہاں ۔

ٹامس :۔ وہ ایک سرنگ میں جاملتی ہے ، جو کوئی نہیں جانتا کدھر
جاتی ہے ۔

ہیوز :۔ (بڑھتی ہوئی دلچسپی سے) پھر ؟

ٹامس :۔ خیر تو زمین کے نشیب سے ــــــ جو کہ جا کی اُس
کھڑکی سے بالکل صاف نظر آتا ہے ــــــ وہ سرنگ
یقیناً اس "بڑے کھیت" تک کسی جگہ آتی ہے ۔

ہیوز :۔ اچھا پھر ؟

ٹامس :۔ تو آپ سمجھے کہ "خرانٹ" نے کیا کر رکھا ہے اس نے
اس سرنگ کے اندر تک راستہ کھود لیا ہے ۔ اسی لئے لوگوں
کے بلاؤ بھٹک جاتے ہیں ۔

ہیوز :۔ ہاں بے شک ،

ٹامس :۔ لہٰذا بڑے کھیت میں جال لگانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے
یہ اُس سُرنگ میں لگایا جائے ۔

مرجلہ :۔ (تعریفی لہجہ میں) واقعی تم ذہین ہو ٹامس ، اس سے انکار
نہیں ہو سکتا ۔

ہیوز :۔ خیر خیر ! تو یہی بار تھا تمہارے ذہن پر ٹامس شون ؟

ٹامس :۔ جی ۔ اور سچ جانئے اس نے مجھے بڑا پریشان کر رکھا ہے ۔

(باہر ڈکی بائیسکل کی سیٹی بجتی ہے ۔ تینوں چونکتے ہیں)

ہیوز :۔ (اُٹھ کر) یہ لڑکا پھر آ گیا ۔

ٹامس :۔ وہ صرف بلاؤ لایا ہوگا ۔

(ڈکی کھڑکی کے اندر تیزی سے گزرتا ہے پھر جھپاک سے
اندر گر پڑتا ہے "ٹامس شون ! ٹامس شون !" ہیوز کو دیکھ
ایک دم چپ ہو جاتا ۔ مگر اس کے انداز سے دبے ہوئے اضطراب
کا پتہ چلتا ہے ۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹے تھیلے کے اندر بلاؤ
ہے ہیوز کو مبہوت تکتا زینے کے پاس جا کھڑا ہوتا ہے)

ہیوز :۔ (دروازے تک جا کر) اچھا تو اب چلنا چاہیئے (ہاتھ ملا کر) شب بخیر
مرجلہ شون شب بخیر ٹامس شون ۔ تو مینڈ آف ہوپ کا معاملہ
طے رہا ۔

ٹامس :۔ آپ کی تشریف آوری کا شکریہ مسٹر ہیوز ،

ہیوز :۔ (ڈیوڑھی پر) بادل پھر آ رہے ہیں ہاں ، اچھا شب بخیر تم
دونوں کو ۔

(جاتا ہے جب کھڑکی کے پاس گزرتا ہے تو کتا بھونکتا ہے
جس سے اس کے وقار میں خلل پڑتا ہے)

مرجلہ :۔ میں جاؤں صبح کے لئے کوئلے لاؤں (موم بتی لے کر باورچی خانے
میں جاتی ہے)

ٹامس :۔ (آتش دان کی طرف جا کر) تو تم لے آئے ڈکی ؟

ڈکی :۔ (مضطربانہ) ٹامس شون ؟ (تھیلا میز پر رکھ دیتا ہے)

ٹامس :۔ کیا بات ہے ؟

ڈکی :۔ رات "بڑے کھیت" میں وہ آدمی ــــــ تم نے کہا تھا
ٹوپی اوڑھے تھا ؟

ٹامس :۔ ہاں ۔

ڈکی :۔ پلڑے دار؟
ٹامس :۔ ہاں
ڈکی :۔ ایسی ؟ (جیب سے ایک ٹوپی نکال کر)
ٹامس :۔ (مشتاقانہ) ہاں ایسی ۔
ڈکی :۔ جانتے ہو، کون تھا ؟
ٹامس :۔ نہیں، کون تھا ؟
ڈکی :۔ ڈیوڈ ہیوز دکاندار!
ٹامس :۔ (لڑکھڑا جاتا ہے) کیا آ؟
ڈکی :۔ ہاں، ٹام ٹنکر نے اُسے دیکھا
ٹامس :۔ دیکھا؟
ڈکی :۔ وہ اتنی دیر سے گھر لوٹا کر تماشے کا وقت نہیں رہا تھا جب
وہ دکان کے پاس سے گزرا تو دیکھا ڈیوڈ ہیوز اپنی چوپال میں
بڑے چپکے سے گھسا ۔
ٹامس :۔ پھر؟
ڈکی :۔ پھر وہ ایک ٹوپی اور پرانا سا کوٹ پہن کر نکلا
ٹامس :۔ پھر؟
ڈکی :۔ پھر وہ بڑے کھیت کی طرف چل دیا ۔ مگر وہاں زیادہ
نہیں ٹھہرا ۔
ٹامس :۔ ہاں میں مخل ہوا تھا ۔
ڈکی پھر وہ واپس آیا اور کپڑے بدل کے ابھی ابھی مجھے ٹام
نے جو یہ بتایا تو میں چوپال میں گیا، اور سچ مچ، مجھے
وہاں یہ ملی ۔
ٹامس :۔ ڈیوڈ ہیوز دکاندار! ارے میں تو ——
ڈکی [illegible] —— [illegible]
[illegible]
ٹامس :۔ خدا جانے!
ہیوز [illegible]
مرجا [illegible]
میں اسے بالکل معاف کر سکتا ہوں ۔
ٹامس :۔ جانتے ہو میں کیا سمجھا ؟

ڈکی :۔ کیا ؟
ٹامس :۔ میں نے ابھی اُسے "عفریت" کو پکڑنے کی ترکیب بتا ڈالی۔
ڈکی :۔ نہیں، وہ نہیں پکڑ سکتا! ہرگز نہیں! "عفریت" ہمارا ہے ۔
ٹامس :۔ (کمرے میں ٹہل کر) مجھے اس کی تاب نہیں، ڈکی! بدچلنی ہو یا
کچھ مجھے اس کی تاب نہیں!
ڈکی :۔ (مکاری سے) بلاؤ یہ رہا، ٹامس شولن ۔
(ٹامس تیزی سے ڈکی پر ایک نظر ڈال کر چونکتا ہے۔ پھر میز
تک جاکر بلاؤ کو دیکھتا ہے)
ٹامس :۔ کوئی خرابی تو نہیں ہے اس میں، بس ذرا سا گوشت کھائے گا۔
ڈکی :۔ اور ادھر فین زنجیر تڑائے ڈالتا ہے ۔
ٹامس :۔ مجھے چین نہیں آئے گا، —— قبر میں بھی نہیں ——
اگر عفریت کسی اور کے ہاتھ چڑھ گیا ۔
ڈکی :۔ (دروازہ چوپٹ کھول کر) سمندر پار چاند نکل آیا۔ ہوائیں بادل
اُڑا کر لا رہی ہیں۔ ایک آدھ منٹ میں اندھیرا چھا جائے گا۔
ٹامس شولن —— بالکل اندھیرا ۔
(ایک لمحہ کا وقفہ جس میں ہوا کی خفیف سائیں سائیں اور گلی میں ڈالیوں
کی سرسراہٹ سنائی دیتی ہے۔ ٹامس صریحاً اپنے نفس سے ایک بہت
بھاری بازی لڑ رہا ہے ۔ ڈکی اسے غور سے دیکھ رہا ہے)
ٹامس :۔ ہم ضرور پکڑیں گے اُسے ڈکی، ضرور پکڑیں گے ۔ ——
آج ہی رات ۔
ڈکی :۔ تو جال بالاخانے میں رکھا ہے آلوؤں میں چھپا ہوا ۔
ٹامس :۔ میں لاتا ہوں! (گنجینے میں جاکر روشنی بجھا دیتا ہے۔ گاؤں
میں لوگ سمجھیں گے میں سونے لیٹ گیا ۔ زینے پر
(زینے پر چلا جاتا ہے)
(اب کمرہ صرف آگ کی سرخ دمک سے روشن ہے
کھڑکی اور کھلے دروازے کے باہر چاندنی کھلی ہوئی ہے
ایک لمحہ کے لیے سناٹا ہے)
(ڈکی ٹامس کو زینے پر جاتے دیکھتا اور خود بخود
[illegible] ہے۔ یکایک مڑ کر دروازے

کی طرف جھپٹتا ہے جہاں وہ چاندنی میں صاف کھڑا کتے سے
باتیں کرتا نظر آتا ہے۔ جیسے کسی سمجھنے والے دوست سے)

ڈکی :۔ وہ ہم میں لوٹ آیا، فین ۔ ہم پھر ساتھ ہو گئے، ہم
چاروں ۔ (کتا بھونکتا ہے) ہش فین! بالکل چپ! یہ ٹھیک
ہے، تم جاگتے جاؤ۔ آخر ہم جیت ہی گئے نا! ارے
میرے اندر کوئی زور زور سے گا رہا ہے! اللہ یہ سارے
ننھے سفید ستارے بھی ہیں پھر ایکبار ساتھ ساتھ جاتا دیکھ
کر قہقہے لگائیں گے۔ آج رات مزا آئے گا۔ ————
کتنا مزا آئے گا کھیتوں میں ادھر ادھر ڈھونڈتے پھرتے
اور سمندری ہوائیں ہمارے منہ پر لگتی ہوئی! ہے لو لو، فین!
ہے لو لو، نسے چلاؤ!
(گیت کا ایک ٹکڑا گانے لگتا ہے جس کی گت پر
اس کے قدم ناچ کے انداز میں ہلنے لگتے ہیں۔ ٹامس ہال
سے آتا ہے ڈکی کو دروازے سے پرے ناچتا دیکھ کر ذرا
رکتا اور اسے تکتا ہے)

ٹامس :۔ ڈکی، ادھر آؤ (ڈکی فوراً تھم جاتا ہے وہ آہستہ آہستہ
ٹامس کی طرف جاتا ہے جو اسے کندھے سے پکڑ کر چاندنی
میں کھینچے جاتا ہے اور اس کے چہرے کا جائزہ لیتا ہے)
کم و بیش آدمی ہو ———— یا کیا چیز ہو تم؟

:۔ (بے مدعا) میں ———— ڈکی بک ڈل ہوں"

:۔ (نیم خوفزدہ) معلوم نہیں کیوں کبھی میں سوچتا ہوں ———— مگر
خیر چھوڑو (جاکر باورچی خانے کا دروازہ کھولتا ہے) مرجید میں باہر
جا رہا ہوں ———— ڈکی کے ساتھ (معنی خیز طور پر) سمجھیں؟
(ڈکی پھر ہنستا ہے اور بلاؤ کو اٹھا کر اس سے مضطربانہ
چپکے باتیں کرتا ہے)
گئی۔

(ٹامس کھڑکی پر پردہ کھینچ دیتا ہے، دروازے تک جاکر
کتے کو کھولتا سنائی دیتا ہے زنجیر کھڑکھڑاتی ہے کتا بھونکتا
ہے ٹامس کہتا ہے "چپ فین!" اندر دیکھ کر کہتا ہے۔
"آؤ ڈکی!" ڈکی بلاؤ اٹھا کر ابھی تک خود بخود ہنستا باہر
جاتا ہے اور دروازہ بھیڑ دیتا ہے ان کی چاپ سڑک
پر دھیمی پڑتے پڑتے بند ہو جاتی ہے
(ایک طویل وقفہ۔
(مرجید سینی، جلتی موم بتی، روٹی، مکھن کا ڈبہ لئے
باورچی خانے آتی ہے سینی میز پر رکھ کر اور موم بتی سے
کر دروازہ کھولتی ہے چاندنی غائب ہے۔ ہوا کا سناٹا
سنائی دیتا ہے مرجید چپکے سے پکارتی ہے۔ "میری
جین"! کسے کو نہ پاکر مسکراتی اور اطمینان کا سانس لیتی
ہے۔ پھر زینے کے پاس جاتی ہے

مرجید :۔ (دھیمی آواز میں) میری جین؟

میری جین :۔ جی؟

مرجید :۔ تم سوئی نہیں؟

میری جین :۔ نہیں۔

مرجید :۔ تمہیں یاد ہے تمہارے باپ نے تم سے صبح قصائی کے
ہاں جانے کو کہا تھا؟

میری جین :۔ جی!

مرجید :۔ (نہایت پرمعنی انداز میں) ۔ خیر، تو اب تمہیں جانے
کی ضرورت نہیں۔

پردہ

وہ ایک انسانی کردار تھا ——— وہ بھڑک اٹھنے والی آگ لے کے اٹھا،
اور ——— اس کا ذوقِ عمل راکھ بن کر رہ گیا! تب اس پر یہ حقیقت کھلی کہ

زندگی کو "ٹھنڈی آگ" کی ضرورت ہے

نعیم صدیقی اس کردار کے تجربے کو غور سے دیکھ رہا تھا، اس نے اپنے افسانوں کی روح بنانے کے لیے ٹھنڈی آگ پسند کر لی!

ٹھنڈی آگ

بجھی ہوئی آگ نہیں ——— !

- جو جھک سے اُڑ جانے والے مادوں کے لیے کسی کام کی نہیں!
- جو زندگی کی رگوں میں خون بن کر دوڑنے کے لیے ہے!
- جس کا نہ شعلہ ہے، نہ دھواں!

یہ نعیم صدیقی کے بائیس ۲۲ مطبوعہ و غیر مطبوعہ افسانوں، اور کرداری و نفسیاتی خاکوں کا تازہ مجموعہ ہے؛

ایک جاندار افتتاحیہ ——— "میرا قلم، میرا ادب" کے عنوان سے

یہ ایک پیغام ہے ——— "نئی نسل کے نام"

- ان افسانوں میں طنز کے قلم سے موجودہ فاسقانہ سماج کو سخت چرکے دیے گئے ہیں۔
- ان افسانوں کے ذریعے مصنف نے زندگی کو اپنے اظہار کے نئے نئے راستے دکھائے ہیں!
- ان افسانوں میں اسلام کی تصویر پہلی مرتبہ ایک تخلیقی قوت بن کر نمودار ہوئی ہیں!
- ان افسانوں میں اگرچہ لوگوں کے دل بہلانے کا کوئی سامان نہیں مگر ان میں حقیقت کو نکھار کے پیش کرنے سے ایک انوکھی جاذبیت پیدا ہو گئی ہے۔
- ان افسانوں میں ایک مسلم ادیب نے نئے تجربے کرنے کی کوشش کی ہے

طباعتی معیار اعلیٰ

•

خوشنما گرد پوش

•

ضخامت

۳۲۵ صفحات

قیمت: تین روپے آٹھ آنے

مکتبۂ چراغِ راہ، کراچی

- ضیا محمد ضیا
- ماہر القادری
- علی منظور
- شمیم جاوید
- کوثر نیازی
- مضطر گجراتی
- نعیم صدیقی
- ابوسعید حیرت
- طالب حجازی
- ابوالبیان حماد

منزلیں دُور! راہ دشوار!

ضیا محمد ضیا

میں نے مانا مرے محترم ساتھیو اِس فضا میں بہت کام تم نے کیا
چار سُو جب غلاظت تھی ماحول میں، ذوقِ پاکیزگی عام تم نے کیا

تم نے ذہنوں کو مامون و مصئون کیا جاہلیت کے مسموم افکار سے
تم نے چونکا دیا فکر و احساس کو اپنے منثور و منظوم افکار سے

تم نے تخمین و ظن کے اندھیروں میں علم و حقیقت کے فانوس روشن کئے
تم نے ریب و تشکک کی تاریکیوں میں جلائے ہمیشہ یقیں کے دیئے

دہریت کی گھٹائیں امنڈتی رہیں آندھیاں مادیت کی چلتی رہیں
تم نے روحانیت کی جلائی تھیں جو مشعلیں وہ بدستور جلتی رہیں

علم تم نے شرافت کا اونچا کیا بول اخلاق کا تم نے بالا کیا۔
زندگی کی شب تیرہ و تار میں شمع ایماں سے تم نے اجالا کیا۔

تم نے محسوس جو کچھ دلوں میں کیا پوری جرأت سے تحریر کرتے رہے
آدمی کی غلامی کے احساس کو ذہن کسلے کی تعمیر کرتے رہے

مغربیت بھی فتنے اٹھاتی رہی مزدکیت بھی جادو جگاتی رہی
قومیت کی پری رقص کرتی رہی نقش ذہنوں پہ اپنا بٹھاتی رہی

سعی تم نے جو کی لوگ اسلام کے اصل افکار سے آشنا ہو گئے
بے تُکے فلسفوں کی اُڑیں دھجیاں مادّی نظریئے بھی ہوا ہو گئے

تم نے دین و سیاست کی تفریق کے مفسدوں کو زمانے پہ ظاہر کیا
دین کے خالص سِکوں کو رائج کیا کھوٹے سکوں کو ٹکسال باہر کیا۔

تم جو سرگرم سعی و عمل میں رہے علم اور نظریئے کی فضا چھوڑ کر
زحمتیں حق کی خاطر اُٹھاتے رہے عیش و آرام مستی سے منہ موڑ کر
قوم کے بچھوؤں نے بھی کاٹا تمہیں ناگ تم کو وطن کے بھی ڈستے رہے
اور مذہب کے ایوانِ بالا سے بھی خارجیت کے فتوے برستے رہے
ملک میں ایسے بھی لوگ تھے جو تمہیں غدر و سازش کا الزام دیتے رہے
تہمتیں نت نئی تم پہ دھرتے رہے رات دن تم کو دشنام دیتے رہے
چوٹ پڑتی تھی جن کے مفادات پر ہر طرح تم کو بدنام کرتے رہے
تم مگر جذبۂ حق سے سرشار تھے ایسے حالات میں کام کرتے رہے
رہنماؤں کو محبوس رکھا گیا رہروؤں پر بھی پہرے بٹھائے گئے
رہزنوں کو اُبھارا گیا لوٹ پر راہگزاروں پہ کانٹے بچھائے گئے
تم نے مُلّائیت کی سنیں پھبتیاں، تم کو رجعت پسندی کے طعنے ملے
تم نے اپنوں کی کتنی سہیں منتیاں تم کو غیروں نے کتنے ہی چرکے دیئے
سیفٹی ایکٹ کے وار تم پر ہوئے رُعب تم پر حکومت کا ڈالا گیا
پر تقاضا جو حق کی شہادت کا تھا وہ کسی روز تم سے نہ ٹالا گیا
قومیت کے مفادات کو چھوڑ کر عدل و انصاف سے پیار تم نے کیا
حق پسندی کا اُپدیش تم نے دیا حق پرستی کا پرچار تم نے کیا
حکمرانوں کے اعمال و کردار پر خیر خواہانہ تنقید کرتے رہے
تم اصولوں کی خاطر ہی جیتے رہے تم اصولوں کی خاطر ہی مرتے رہے
سامنے جابرانہ قوانین کے تم عزم و ہمت سے سینہ سپر ہو گئے
تم سے اِس مُلک میں قیصریت کے کتنے ہی منصوبے زیر و زبر ہو گئے

تم نے جمہوریت کے لیے بہد کی راہ فاشزم کی بڑھ کے روکا کیے
تم نے پروانہ کی زندگی کی کبھی ظلم پر پوری جرأت سے ٹوکا کیے

بے زباں مفلسوں کی زباں تم رہے، دردِ جمہور کے ترجمان تم رہے
تم محافظ رہے جانِ دہقاں کے حقِ مزدور کے پاسباں تم رہے

فتنہ باطل کا ہر چند چالاک تھا پر تمہارا قلم بھی تو بیباک تھا
تم بھی بے لاگ تنقید کرتے رہے فسق تم پر اگرچہ غضبناک تھا

تم نے اپنے قلم سے سچائی کی پاکیزہ اقدار کو تازگی بخش دی
تم نے اپنی زبانوں سے مُردہ خیالات و افکار کو زندگی بخش دی

سالہا سال سے زندگی کے جو تاریک گوشے تھے تم نے فروزاں کیے
کاروبارِ جہاں میں خرابی کے جتنے بھی پہلو تھے سارے نمایاں کیے

تم نے فطرت کے پوشیدہ اسرار سے آدمی کی نظر کو شناسا کیا
تم نے ہستی کے مستور و پنہاں حقائق کا ادراک لوگوں میں پیدا کیا

تم کلامی مباحث سے بچتے رہے لوگ ہر چند تم سے اُلجھتے رہے
زندگی کے مسائل جو پیچیدہ تھے سب تمہارے بیاں سے سلجھتے رہے

شاہراہِ ادب صاف ہوتی گئی جیسے جیسے قدم تم بڑھاتے گئے
لفظ و معنی میں حائل تھے جو آج تک پردے ابہام کے تم اٹھاتے گئے

ہاں تمہارے قلم نے ہی پردہ اٹھایا فسانے کی جھوٹی روایات سے
کھلبلی ڈال دی تم نے ناول کی دنیا میں سنجیدہ علمی مقالات سے

تم جو شعر و سخن کی حسین وادیوں میں کھڑے مدتوں گیت [illegible] رہے
تم جو سازِ غزل پہ ہمیشہ ہمیں زندگی بخش [illegible] رہے

وحی و الہام کے پاک چشموں سے فکر و تخیل کو سیراب کرتے رہے
حُسنِ تخلیق سے علم و تحقیق کے سادہ خاکوں میں سو رنگ بھرتے رہے

آج میں پوچھتا ہوں مرے ساتھیو! وہ تمہارے کہاں کھو گئے
ہاں جو اُبھرے تھے جذبے بڑے جوش سے کیا وہ بھیوں کے آغوش میں سو گئے

فحش گوئی و عریاں نگاری کو چیلنج کرکے تمہارے قلم تھک گئے
راستہ کچھ بھی چلنے نہ پائے تھے تم اتار لئے سفر میں قدم تھک گئے

جن کو دنیا میں کچھ کام کرنا ہو یوں خوابِ غفلت میں مدہوش ہوتے نہیں
جن کو احساس ہوتا ہے اپنے فرض کا اس طرح خاموش ہوتے نہیں

اپنے مقصد پہ پھر اک نگہ ڈال لو اپنے منشور کو اک نظر دیکھ لو
اپنے وعدوں کو ذہنوں میں تازہ کرو راستہ ہے کٹھن کس قدر دیکھ لو

آج یہ نور و ظلمت کی آویزشِ مستقل فیصلہ کن مراحل میں ہے۔
میری دانست میں آخری معرکہ ہے جو برپا ہوا حق و باطل میں ہے۔

تم کو معلوم ہے دوستو وقت کا قافلہ کس قدر تیز رفتار ہے
راہواروں کو مہمیز کرتے چلو منزلیں دُور ہیں راہ دشوار ہے۔

کاروانِ ادب منتظر ہے تمہارا اُٹھو سوئے منزل بڑھاؤ قدم
نقش کتنے سنورنے کو بیتاب ہیں تھام لو پھر سے ہاتھوں میں اپنے قلم

اسعدِ[1] نکتہ داں کی ادا لے چلو، ماہرِ[2] خوش زباں کا بیاں لے چلو
ہمرکابِ نعیمِ[3] سخنداں ہوں میں مجھکو بھی ہمرہِ کارواں لے چلو

---

[1] اسعد گیلانی مدیر "جہانِ نو" [2] ماہر القادری مدیر "فاران" [3] نعیم صدیقی مدیر "چراغِ راہ"

ساقی سے

ضیاء محمد ضیاء

تہی مدت سے میری آرزو کا جام ہے ساقی
ترا ساغر بھری محفل میں تشنہ کام ہے ساقی

جہاں سے راہ و رسمِ آشنائی مٹتی جاتی ہے
محبت کم ہوئی سینوں میں نفرت عام ہے ساقی

زبانِ ہر بشر سے سن رہا ہوں داستاں غم کی
لبِ ہر ذرہ پہ افسانۂ آلام ہے ساقی

نئے افکار کی یورش ہوئی ہے ذہنِ انساں پہ
دماغِ آدمی پر غلبۂ اوہام ہے ساقی

زمانہ آگیا شاید وفا کی آزمائش کا،
ہوس نے پھر بچھایا ہر قدم پہ دام ہے ساقی

جہاں تہذیب کی بنیاد ہو الحاد پر قائم
وہاں دل کی صفائی اک خیالِ خام ہے ساقی

سکوں کی جستجو میں پھر رہا ہوں ایک مدت سے
ابھی تک میرے دل کی آرزو ناکام ہے ساقی

سنوں کیسے حکایت عشرتِ آغاز کی تجھ سے
مری ہستی گرفتارِ غمِ انجام ہے ساقی

لئے جاتا ہے اپنے ساتھ پھر عشقِ جواں مجھ کو
دیارِ حسن کی جانب مرا اقدام ہے ساقی

مزاجِ عقل پھر برہم ہوا ہے میری جرأت پر
مرا جوشِ جنوں پھر موردِ الزام ہے ساقی

نہیں ہوں بے خبر میں مدعائے آفرینش سے
مرا دل رازدانِ گردشِ ایام ہے ساقی

مرے اشعار پر کون و مکاں کا دل دھڑکتا ہے
کہ میری شاعری اک آتشیں پیغام ہے ساقی

مئے توحید کی لذت سے ہے دل آشنا میرا
مرا ذوقِ سخن پروردۂ الہام ہے ساقی

دکھاؤں گا جہاں کو جوششِ صہبائے ایمانی
اگرچہ میری سرمستی ابھی بدنام ہے ساقی

سمٹتی آ رہی ہے قوتِ حق ایک مرکز پہ
بدل جانے کو اب یہ دورِ صبح و شام ہے ساقی

ہوئی جاتی ہے قائم سطوتِ دینِ براہیمی
تزلزل میں بنائے شوکتِ اصنام ہے ساقی

عیاں ہے صاف میری گفتگو سے مدعا میرا
مرے طرزِ سخن میں کب کوئی ابہام ہے ساقی

نہ بھٹکے گی یہ دنیا مادیت کے اندھیروں میں
افق سے پھر طلوعِ نیرِ اسلام ہے ساقی

شاعرِ نوجواں کے نام

ضیا محمد ضیا

(یہ نظم یومِ آزادی کے موقع پر لکھی گئی تھی)

صبا پھر لے کے آئی ہے نویدِ جشنِ آزادی
مگر بھولی نہیں مجھ کو ابھی گلشن کی بربادی

ابھی تک یاد ہے مجھ کو مرے گلشن پہ کیا گزری
گلاب و یاسمین و سنبل و سوسن پہ کیا گزری

چمن میں اٹھ رہا ہے شاخساروں سے دھواں اب تک
مرے کانوں میں آتی ہے عنادل کی فغاں اب تک

فسوں پھونکا تھا گلچیں نے کچھ ایسا باغبانوں پر
گراتے تھے پیاپے بجلیاں خود آشیانوں پر

شبِ تارِ غلامی کی سحر ظلمت فشاں آئی
بہار آئی بھی گلشن میں تو ہمراہِ خزاں آئی

مرے ہمدم! تجھے معلوم کیا دردِ نہاں میرا
ہے اب تک سوزِ پنہاں سے قفس آتش فشاں میرا

مجھے دیتے ہو تم دعوت چمن میں ہم نوائی کی
دلِ افسردہ میں ہمت کہاں نغمہ سرائی کی

فضائے غم میں نغماتِ مسرت کس طرح گاؤں
کہاں سے آج طرزِ ہم صفیرانِ چمن لاؤں

ابھی تک یاد ہے پُرہول نظارہ گلستاں کا
نظر میں ہر گھڑی رہتا ہے منظر باغِ ویراں کا

طلوعِ مہرِ آزادی کا اب تک یاد ہے منظر
مسلط جب ہوا خونیں اندھیرا اک زمانے پر

بھڑک اٹھے فضاؤں میں یکایک آگ کے شعلے
ہوا زیرِ فلک اک حشر برپا حشر سے پہلے

شر نے اپنی عقل و ہوش کا خرمن جلا ڈالا
خود اپنے ہاتھ سے شہروں کو خاکستر بنا ڈالا

ر میداں دکھائے وہ مظاہر بربریت کے
بھلائے آدمی نے سب تقاضے آدمیت کے

شت کا سماں تھا یہ بہیمیت کا عالم تھا
زمیں کا چپہ چپہ قتل گاہِ ابنِ آدم تھا

ن ہند پہ چڑھتا ہوا دریائے خوں دیکھا
خرد کو صورتِ خس نذرِ سیلابِ جنوں دیکھا

کی خاک پر جب خون کے چشمے ہوئے جاری
زمین و آسماں پر موت کا سکتہ ہوا طاری

ئی تھی کبھی یوں خونِ انسانی کی ارزانی
نہ آئی تھی کبھی یوں ظلم کے دریا میں طغیانی

یہ تُو نے پھر شکستہ ساز کے تاروں کو چھیڑا ہے
کہ میرے دل کے زخموں کا کوئی ٹانکا اُدھیڑا ہے

تماشا دیکھ اب کچھ دیر میری خوں چکانی کا
سمجھ کچھ مدعا شاعر کی آشفتہ بیانی کا

کلیجہ تھام کر درد و الم کا ماجرا سُن لے
گرفتارِ قفس کا نالۂ خونیں نوا سُن لے

مجھے کرنے دے ماتم اپنی امیدوں کے مدفن پر
بہانے دے سرشکِ خونِ دل خاکِ نشیمن پر

بڑھی جاتی ہیں حد سے آج پھر بے تابیاں میری
مرے غم کو بیاں کیسے کر سکتی زباں میری

رُلاتی ہے ہزاروں عصمتوں کی چاک دامانی
قیامت ڈھا رہی ہے جن پہ دشمن کی ہوس رانی

ہزاروں خانماں برباد ہیں میری نگاہوں میں
ابھی لاکھوں ہی انساں ٹھوکریں کھاتے ہیں راہوں میں

سسکتے ہیں پہ اُن کے حال کا پُرساں نہیں کوئی
وہ مرتے ہیں کہ اُن کی زیست کا ساماں نہیں کوئی

نہیں آزاد انساں بستۂ زنجیر ہے اب بھی
غضب ہے آدمی کا آدمی نخچیر ہے اب بھی

بھڑکتی ہے ابھی تک دشمنی کی آگ سینوں میں
نظر آتے ہیں پنہاں اب بھی خنجر آستینوں میں

لباسِ باغباں میں آج بھی صیّاد پھرتے ہیں
بہ شکلِ ابنِ آدم سنگدل جلّاد پھرتے ہیں

نوا سنجانِ گلشن مائلِ فریاد ہیں اب بھی
ہزاروں دل قتیلِ دشنۂ بیداد ہیں اب بھی

ابھی ٹوٹیں نہیں پاؤں سے زنجیریں غلامی کی
ابھی باقی ہے منزل اپنی آوارہ خرامی کی

ابھی ظلمت میں گم ہیں صبحِ آزادی کی تنویریں
ابھی نظروں سے اوجھل ہیں مرے خوابوں کی تعبیریں

ابھی سینوں میں کروٹ لے رہا ہے دردِ محکومی
ابھی جاتی ہے سوئے آسماں فریادِ مظلومی

بلاشک مل گئی ہے آج شیطانوں کو آزادی
مگر ملنی ابھی باقی ہے انسانوں کو آزادی

بدل لینے دے ہمدم یہ نظامِ گلستاں مجھ کو
بدلنے دے یہ سب صیّاد فطرت باغباں مجھ کو

خوشی سے پھر تری اس محفلِ رنگیں میں آؤں گا
میں تیرے ساتھ مل کر حُریت کے گیت گاؤں گا

سناؤں گا تجھے وہ نغمہ ہائے سازِ ربّانی
کہ جن کے زیر و بم سے جاگتی ہے رُوحِ انسانی

ربابِ شعر پر وہ جاں فزا نغمے سناؤں گا
دلوں میں عشق کے سوئے ہوئے جذبے جگاؤں گا

قرآن کی فریاد

ماہرالقادری

طاقوں میں سجایا جاتا ہوں، آنکھوں سے لگایا جاتا ہوں
تعویذ بنایا جاتا ہوں، دھو دھو کے پلایا جاتا ہوں
جُزدان حریر و ریشم کے اور پھول ستارے چاندی کے
پھر عطر کی بارش ہوتی ہے خوشبو میں بسایا جاتا ہوں
جیسے کسی طوطے مینا کو کچھ بول سکھائے جاتے ہیں
اس طرح پڑھایا جاتا ہوں، اس طرح سکھایا جاتا ہوں
جب قول و قسم لینے کے لیے تکرار کی نوبت آتی ہے
پھر میری ضرورت پڑتی ہے ہاتھوں پہ اٹھایا جاتا ہوں
دل سوز سے خالی رہتے ہیں، آنکھیں ہیں کہ نم ہوتی ہی نہیں
کہنے کو میں اک اک جلسہ میں پڑھ پڑھ کے سنایا جاتا ہوں
نیکی پہ بدی کا غلبہ ہے، سچائی سے بڑھ کر دھوکا ہے
اک بار ہنسایا جاتا ہوں، سو بار رُلایا جاتا ہوں
یہ میری عقیدت کے دعوے قانون پہ راضی غیروں کے
یُوں بھی مجھے رُسوا کرتے ہیں، ایسے بھی ستایا جاتا ہوں
کس بزم میں میرا ذکر نہیں، کس عرس میں میری دھوم نہیں
پھر بھی میں اکیلا رہتا ہوں، مجھ سا بھی کوئی مظلوم نہیں

اَلدّین کُلّہٗ اَدَبٌ

علی منظور

[یہ نظم ہم معاصر تمایوں سے بصد شکریہ نقل کر رہے ہیں۔ یہ دین کی ایک اہم حقیقت کی بہترین ترجمان ہے، اور پھر شعری جمال کے لحاظ سے بڑی قدر و قیمت کی حامل! اسلامی شعر و ادب کی دنیا میں ایسی ہی چیزوں کی جگہ ہے !!]

دل کا سکوں ہے اور کچھ، دل کی کسک ہے اور کچھ
بے شک یقیں ہے اور کچھ! لاریب شک ہے اور کچھ

شرحِ ھُوَ الکُل ہوگئی جن صوفیوں کی سرخوشی
درسِ ادب ان کے لیے ہے عارفانہ خامشی

سرکار! میں بے دیں نہیں، کیونکر کہوں کُل آپ ہیں؟
از روئے دیں خالق رہے کُل اور ہے! گُل آپ ہیں!

گُل آپ ہیں، لاریب ہیں، لیکن بلا تشبیہ ہیں
جاں بخش جلوے آپ کے تنزیہ ہی تنزیہ ہیں

معمورہ گلزار آپ کا! گلزار معمور آپ سے!
ہر پھول میں حُسن آپ کا، ہر پھُول کا نور آپ سے

گیندا، ہزارا، سیوتی، چمپا، چنبیلی، موتیا!
یہ ہے گلاب اِس کی یہ ضو! وہ لالہ، وہ بھی پر ضیا!

رنگ آپ کی گلگشت کا جتنا نظر آیا جہاں
آئیں سمٹ کر خود وہاں بکھری ہوئی رنگینیاں!

شاہد ہیں خود شمس و قمر، دن آپ کا، رات آپ کی
تاریکی نور آفریں کیا ہے؟ کرامات آپ کی

شمس و قمر کے روپ میں ہوتے ہیں درشن آپ کے
میرے لیے ہے واسطہ جلوے ہیں روشن آپ کے

میرا ہے کیا؟ کچھ بھی نہیں! جاں آپ کی، دل آپ کا
قائل ہو دہری یا نہ ہو، میں تو ہوں قائل آپ کا

میں نے پڑھا ہے آپ سے حفظِ مراتب کا سبق
اِس اک سبق کے ذیل میں روشن ہوئے چودہ طبق

ادنیٰ بھی آپ اعلیٰ بھی آپ! ایسا کہے کیسں با ادب؟
سرکار من! دیں آپ کا ہے اب بھی سر تا پا ادب

موسٹ ارجنٹ

شمیم جاوید

"ہیلو —— ! تم کون!" "پریس فوٹوگرافر" —— اچھا — !
دیکھو — ! چند اور مہاجر —— ابھی کل آئے ہیں
اُن کے فوٹوز بہت جلد مجھے بھجوا دو
کل کے اخبار میں چھپ جائیں — میں یہ چاہتا ہوں!"

•

"کیا کہا تم نے —— یہ میٹر کوئی ارجنٹ نہیں
بعد یک ہفتہ بھی کھنچ سکتے ہیں فوٹو اُن کے
"تم بھی احمق ہو نرے —— تم کو بھلا کیا معلوم!
تم کو معلوم بھلا کیا —— ! یہ "رموز اور نکات"!

•

"ارے بھائی —— ! وہ ابھی کل ہی یہاں آئے ہیں
یوں پریشان سہی، ذہن تو آسودہ ہیں —
اُن کے ذہنوں میں "تخیل کی نئی جنت ہے"
اُن کی آنکھوں میں چمک ہے "نئے ارمانوں کی"
اُن کے سینوں میں تپش ہے "نئی امیدوں کی"
گو وہ ڈھانچے ہیں —— مگر اِن میں توانائی ہے"
"وہ سبھی کچھ ہے ابھی — جس کی ضرورت ہے ہمیں!"
"بعد یک ہفتہ — بھلا کون کہے کیا ہوگا!؟"

•

"کیا یہ ممکن نہیں! ممکن ہے بہت ممکن ہے!"
"یہ بھی —— پہلوں کی طرح اپنی جہالت دکھلائیں!
یہ بھی —— جلسے کریں، غل شور کریں، لاٹھیاں کھائیں!
اور —— فٹ پاتھ پہ سردی سے ٹھٹھر کر مر جائیں!"

•

"بعد یک ہفتہ —— بھلا کون کہے کیا ہوگا"
ان کے فوٹوز —— بہت جلد مکمل کر لو
ورنہ —— فوٹو کا ہر اک پوز بدلنا ہوگا"

مقبرے

(مقبرے دیکھنے کی ایک دعوت کے جواب میں)

کوثر نیازی

مقبرے دیکھنے جانا ہے تجھے شاہوں کے
وہ کہ اس دور میں ہیں رشکِ محلاتِ جناں
جن کی گل کاری و رنگینیٔ فن کاری سے
آرٹ تابندہ و پائندہ و بیدار و جواں

جن کی ہر اینٹ خرد کے لیے حیرت افزا
جن کا ہر نقش ہے "سامانِ جنوں" پر بھاری
صنعتِ حضرتِ انساں کی جلوہ گاہیں
جن میں مدفون ہے۔ شاہوں کی سلیماں جاہی

تُو نے یہ حکم دیا ہے کہ ترے ساتھ چلوں
اور اکبار مقابر کی زیارت کر لوں
رُوح کو فکرِ دو عالم سے رہائی دے کر
دامنِ چشم کو جلووں کے گہر سے بھر لوں

شکریہ! دعوتِ تفریح کا لیکن اے دوست!
ایک نادار سے انساں کو امارت سے غرض
مائلِ جبت دیں اور ترقی کے قدم؟
کور چشموں کو کسی فن کی نزاکت سے غرض

جب بھی دیکھا ہے کسی مقبرۂ شاہی کو
مجھ کو ماحول کی غربت نے رلایا پہروں
مردہ شاہوں کے مقابل میں یہ زندہ انساں
مجھ کو ان کے غم و دوراں نے ستایا پہروں

ایک اک نقش رعایا کے پسینے کا نچوڑ
ایک اک اینٹ غریبوں کے لہو سے رنگیں
ایک اک سنگ سے اٹھتا ہے دھواں آہوں کا
آخر اس ظلم کا احساس تجھے ہو کہ نہیں؟

مَیں نے تو عہد کیا ہے کہ ہر اک باطل سے
زیست کے آخری لمحے میں بھی لڑنا ہے مجھے
اور اسلام کو دنیا میں نگینے کی طرح
زندگانی کے ہر اک فعل میں جڑنا ہے مجھے

اپنے اس عہد کے ہوتے ہوئے کیسے دیکھوں؟
یہ غریبوں کی تمناؤں کے خوش رنگ مزار
عہدِ شاہی کے مظالم کے یہ عینی شاہد
پادشاہوں کی رعونت کے مثالی شہ کار

کیسے دیکھوں میں مقابر یہ شہنشاہوں کے
جن کے ماحول میں آباد ہزاروں آہیں
کیسے دیکھوں رگِ افلاس سے بہتا ہوا خوں
کیسے دیکھوں میں رعایا کی جنازہ گاہیں

شکریہ! دعوتِ تفریح کا لیکن اے دوست!
ایک نادار سے انساں کو امارت سے غرض
مائلِ جبت دیں اور ترقی کے قدم؟
کور چشموں کو کسی فن کی نزاکت سے غرض

ایک رفیق کے نام

کوثر نیازی

(جس نے راہِ حق میں ثابت قدمی نہ دکھائی)

زندگی دے کے خریدی ہے ہلاکت تُو نے عطر کو چھوڑ کے بھاگے ہو غلاظت کی طرف
اس سے بڑھ کر نہیں گھاٹے کی تجارت کوئی عقل کو چھوڑ کے لپکے ہو حماقت کی طرف

تُو نے حق چھوڑا ہے اندیشۂ غربت سے فقط، سوچتا ہوں تو دل احساس سے جل جاتا ہے
ہائے! اس بات سے بھی تجھ کو نہ تھی آگاہی رزق اس دہر میں کتّوں کو بھی مل جاتا ہے

ہر قدم دشتِ مصائب ہیں یہاں لکھنا ہے پہلے اس رہ کے مراحل کو تو سوچا ہوتا
ڈوبنا پار اُترنے کو یہاں کہتے ہیں پہلے اس بحر کے ساحل کو تو سوچا ہوتا

عشرتِ فانیٔ امروز پہ مرنے والے دائمی نعمتِ فردا بھی تجھے یاد آتی
مشورت تُو نے نہ کی رُوح سے ورنہ غافل منفعت کس میں ہے یہ راز تجھے سمجھاتی
شومیٔ قسمت و ایام کی گردش کہیے کوئی آفت بھی نہیں تھی جو تجھے کھا جاتی

ہائے! یہ وقت جو دیکھا ہے ترے ایماں نے
کاش! اس وقت سے پہلے تجھے موت آجاتی

ذخیرہ اندوزوں سے!

مضطر گجراتی

برائے نفع جنسوں کا ذخیرہ کر لیا تم نے
یقیناً اپنے گوداموں میں دوزخ بھر لیا تم نے

مسلط ہر طرف خلقِ خدا پر فاقہ مستی ہے
نہیں شام و سحر لیکن خیالِ زر پرستی ہے

ہوس بڑھتی ہی جاتی ہے تمہاری کم نہیں ہوتی
یہ کیسی آنکھ ہے جو آشنائے نم نہیں ہوتی

اضافے کر دیئے نرخوں میں تم نے اپنی مرضی سے
بتاؤ کیا یہ غداری نہیں مخلوقِ ارضی سے

تمہارا وردِ روز و شب "کُلُوا" بھی "وَاشۡرَبُوا" بھی ہے
مگر یہ تو کہو مدِ نظر "لَاتُسۡرِفُوا" بھی ہے

تمہاری نفع اندوزی لہو پینا ہے انساں کا
اگر انسانیت یہ ہے تو کیا جینا ہے انساں کا

تجارت کا یہ مقصد ہے کہ ہو نشو و نما سب کی
بظاہر اِک طرح ہو ابتدا و انتہا سب کی

تجارت ہی وہ کیا جس کی غرض سرمایہ داری ہو
وہ سرمایہ ہی کیا جس کی بنا تخریب کاری ہو

یہ دھن دولت اضافی چیز تھی دنیائے امکاں میں
اسے بھی تم نے شامل کر لیا مفہومِ ایماں میں

قیامت ہے تمہارے آئینہ خانوں میں دھن برسے
مگر اِک ایک دانے کو غریبوں کی نظر ترسے

حصولِ رزق کا حق آب و گِل میں یہ بھی رکھتے ہیں
تمہاری ہی طرح جذبات دل میں یہ بھی رکھتے ہیں

ذخیروں کو نکالو۔ تاکہ غلّہ عام ہو جائے
وطن سے قحط مٹ جائے تمہارا کام ہو جائے

وطن اپنا، وطن کے سب غریب اپنے، امیر اپنے
تأسف ہے جو اس پر بھی نہ تم بدلو ضمیر اپنے

حکومت سے ذخیروں کو چھپا لینا تو آساں ہے
مشیت سے مگر صرفِ نظر بیرونِ امکاں ہے

قیامت میں خدا کو بھی تو دینا ہے جواب آخر
لیا جائیگا تم سے دانے دانے کا حساب آخر

مرے احوال

نعیم صدیقی

●

کبھی کبھی مرے احوال یوں بھی ہوتے ہیں!——
پری سی بن کے صدائے رباب اُڑتی ہے!
ہوا کی موج پہ بُوئے گلاب اُڑتی ہے!
یہ میری خاک تو بن کر سحاب اُڑتی ہے!
شراب اُڑتی ہے، شب بھر شراب اڑتی ہے!
——شراب اڑتی ہے، پھر بھی سکوں نہیں ملتا!

●

کبھی کبھی مرے احوال یُوں بھی ہوتے ہیں!——
——فضا میں شوق کے جگنو کئی چمکتے ہیں!——
سراب دل میں تمناؤں کے جھلکتے ہیں!
نظر بہکتی ہے اور ولولے ہمکتے ہیں!
ہوس کا سحر، کہ ہر سُو چمن مہکتے ہیں!
——چمن مہکتے ہیں، پھر بھی سکوں نہیں ملتا!

●

کبھی کبھی مرے احوال یُوں بھی ہوتے ہیں!——
کہ ہوش جیسے نہ ہو، ہوش اڑا سا رہتا ہے
غمِ جہاں، غمِ جاناں مٹا سا رہتا ہے
ہر ایک داغ کا شعلہ بجھا سا رہتا ہے

نہیں ہے گریہ و آہ کسی خود کشی نہیں، بلکہ افسان کا قومی وجود ہوا ہے۔

بیاں میں کیسے کروں اک خلا سا رہتا ہے
خلا، سا رہتا ہے، پھر بھی سکوں نہیں ملتا!

●

کبھی کبھی مرے احوال یُوں بھی ہوتے ہیں! ——
تخیّلات افق پار جا نکلتے ہیں!
وہاں، جہاں کہ فرشتوں کے پَر بھی جلتے ہیں
جہاں فنا نوں کے سوتے کئی اُبلتے ہیں
وہاں، جہاں کہ شعاعوں سے شعر ڈھلتے ہیں
—— تو، شعر ڈھلتے ہیں، پھر بھی سکوں نہیں ملتا!

(۲)

کبھی کبھی مرے احوال یوں بھی ہوتے ہیں! ——
فریبِ نفس کے پردے جو نہی اٹھاتا ہوں
تجھے حقیقتِ عظمیٰ! میں دیکھ پاتا ہوں
تجھے میں دیکھ کے پھر پیچ و تاب کھاتا ہوں
میں اپنی جان کا سارا سکون لٹاتا ہوں
—— سکوں لٹاتا ہوں، پھر بھی سکوں سا ملتا ہے

●

کبھی کبھی مرے احوال یُوں بھی ہوتے ہیں! ——
پرائے غم مرے سینے میں آکے بستے ہیں!
یہ دیدے —— جن سے دہکتے شرر برستے ہیں
ہزار غم زدہ جو رحم کو ترستے ہیں!
کبھی کبھی مجھے آکر یہ ناگ ڈستے ہیں!
—— ناگ ڈستے ہیں، پھر بھی سکوں سا ملتا

اشاعت خاص

چڑیل

نعیم صدیقی

[لاہور میں گذشتہ ایک ہفتے کے اندر پانچ نومولود بچوں کی لاشیں ملی ہیں جن کی ماؤں کی تلاش
میں پولیس کے کارکن دوڑ دھوپ کر رہے ہیں۔ اسی خبر کے تاثر میں یہ نظم آزاد لکھی گئی]

●

ارے! یہ لاشہ ——؟
یہ کوئی بچہ مرا پڑا ہے!
چراغِ ہستی بجھا پڑا ہے!

●

یہ ننھی سی، کامنی سی مورت!
یہ پیاری سی، موہنی سی صورت!
بڑی ہی مظلوم ہے یہ میت
نہ کوئی غسال تھے کہ اس کو بہ طرزِ معروف غسل دیتے
نہ کوئی اس کا کفن سِلا ہے!
نہ کوئی تابوت ہی بنا ہے!
نہ قبر اس کے لئے کھُدی ہے!
نہ کوئی اس کا جنازہ نکلا
نہ کندھا نہیں دیا ہے
س کے مرنے پہ کوئی چیخا
ی کی امی! نہ اس کی آپا!
[illegible] کی آیا!

نہ کوئی بھائی، نہ باپ اس کا
وجود سارا ہے پاپ اس کا

●

وہ کوئی شاخِ چمن نہیں تھی کہ جس پہ یہ پھول مسکرایا!
یہ اک شگوفہ
ہوا میں چھوٹا
یہ ایک تارہ کسی افق پر چمک نہ پایا،
فضا میں ٹوٹا
یقین جانو! وہ ماں نہیں تھی؟
وہ کوئی سنگیں مجسمہ تھا کہ جس نے رات اس کو جن دیا ہے!
وہ ایک سنگیں مجسمہ تھا ——
کہ جس کے سینے میں مامتا کا شرار موجود ہی نہیں تھا۔
مجسمہ —— جس کی چھاتیوں میں سرے سے کچھ دودھ ہی نہیں تھا
نہ اس کی آنکھوں میں تتلیاں تھیں
نہ اس کے ہونٹوں پہ لوریاں تھیں
نہ اس کے اعصاب پہ سے گزیں کبھی بھی جذبوں کی تتلیاں تھیں!

وگرنہ وہ ——

اس جگر کے ٹکڑے کو لے کے گودی میں کھینچ لیتی،
وہ مادریت کی مے کے نشے میں جھوم کر اس کو چوم لیتی،
وہ مادریت کی مے کے نشے میں جھوم کر کہتی "میرا منا"
اگرچہ اس پہ بپھرتی دنیا!
اگرچہ کھاتی وہ تازیانے!

بڑی ہی طاقت ہے مادریت!!!
وہ چاہے کچھ ہو، وہ ماں نہیں تھی!
کہ "ماں" تو بننا ہے کارِ مشکل!
بہت ہی اونچی ہے "ماں" کی منزل!
جو عورتیں "ماں" بنی ہیں اب تک،
وہ مدتوں تک ——

ہزار اکساہٹوں سے لڑتی،
ہوس کے حملوں کو روکتی ہیں!
وہ اپنی عصمت کے آبگینے،
وہ پاک جذبات کے خزینے،
نگاہوں کے داؤں سے بچا کر،
گناہوں کی چھاؤں سے بچا کر،
کبھی کبھی تو کئی برس کی پہاڑ سی رات کاٹتی ہیں!
وہ کرتی ہیں اپنی پاسبانی، نظر کیا یک بہک نہ جائے!
نگاہ میں کوئی راز کھل کر نگاہ سے پھر چھلک نہ جائے
[illegible]

کبھی بھی رومانوی طریقے سے سر کا آنچل ڈھلک نہ جائے
سمیٹتی ہیں وہ اپنا دامن کہ خارِ رہ سے اٹک نہ جائے!
کسی دوراہے پہ کارواں جذبہ و جنوں کا بھٹک نہ جائے!
جو آگ تخلیق کی چھپی ہے بدن کے اندر، بھڑک نہ جائے!
بھرے پیالے کو تھامتی ہیں، کہیں پیالہ چھلک نہ جائے!
بہار آنے سے پہلے غنچہ کوئی اچانک چٹک نہ جائے!

●

کبھی کسی بوالہوس کے آگے وہ جا نہیں ڈالتی ہیں خود کو
سکون و لذت کی اک گھڑی پہ
وہ اپنے عورت پنے کی پونجی کبھی لٹاتی نہیں ملیں گی!
وہ خواہشوں کی زمام تھامے، کھڑی کھڑی راہ دیکھتی ہیں
غبارِ تقدیرِ زندگی سے
کوئی نویدِ حیات ابھرے!!

●

یہ صبر و ضبطِ مجاہدانہ ——
ہے ایک عورت کو مادریت کا پاک منصب دلانے والا
مگر، جو عورت —— کمینہ عورت
حقیر سی دو گھڑی کی لذت پہ اپنا جوہر لٹا چکی ہے
وہ مادریت کے پاک منصب کی اہل رہ جائے، غیر ممکن!

●

وہ ماں نہیں تھی ——
کہ جس نے اس لاش کو جنا ہے،

وہ معصیت تھی!

وہ معصیت جو ——————

بس ایک ہی فرسنگ نہیں لگتی ہے محدود، بے کراں ہے!
فساد کا ایک کارواں ہے!
رواں دواں ہے! رواں دواں ہے!
وہ نالہ کش ہے، وہ نغمہ خواں ہے!
ادب کی دنیا پہ حکمراں ہے!
خیال بن بن کے پرفشاں ہے!
فسانہ و شعر کی وہ جاں ہے!
وہ آج کالا تے ہر دکاں ہے!
نہاں نہاں ہے!
عیاں عیاں ہے!
کہیں پہ بوسے گلاب ہے وہ!
کہیں سبوسے شراب ہے وہ!
کہیں پہ "ہوسے" رباب ہے وہ!
فنونِ تہذیب نو کے من میں رچا بسا ایک خواب ہے وہ!
کہیں وہ "تعمیر" بن گئی ہے!
کہیں وہ "تصویر" بن گئی ہے!
کہیں وہ "تشہیر" بن گئی ہے![1]
علوم و فکر و نظر کے حق میں وہ دامِ تزویر بن گئی ہے!
کمال سے چاہے یا زوال سے وہ ایک تقدیر بن گئی ہے!
وہ فاسقانہ سماج بن کر، فساد کا اک نظام بن کر
گناہ کا اک نظام بن کر ——————

فضائے ذہنی پہ چھا چکی ہے!
وہ حکم و قانون بن گئی ہے!
وہ بن کے تلوار، ذوقِ خیر و فلاح کے آگے تن گئی ہے!
چڑیل ہے یہ!
ہزاروں مردوں کو، عورتوں کو:
دبوچے جا رہی ہے پنجوں میں اپنے سیدھی بسوئے جہنم!
فضائے ہستی کو اس نے اکساہٹوں سے معمور کر دیا ہے
مگر، جو فطرت کے ہیں تقاضے،
وہ جب بھڑکتے ہیں، اور تسکین کے لیے ڈھونڈتے ہیں راہیں
تو وہ تقاضے،
وہ مضطرب، مضطرب تقاضے!
گھٹے گھٹے آتشیں تقاضے!
"حلال" کے راستوں کے اوپر لگے ہوئے دیکھتے ہیں پہرے!
تو، اور بھی پیچ و تاب کھا کر،
کچھ اور بھی گھٹ کے، تلملا کر،
یہ مضطرب مضطرب تقاضے، ابلتے لاوے کی شکل پاکر
سماج کو جب جھنجھوڑتے ہیں
تو فاسقانہ سماج اُن پر "حرام" کی راہیں کھولتا ہے!

یہ فاسقانہ سماج، ہاں ہاں! یہ قاہرانہ نظامِ باطل
یہی تو ہے وہ چڑیل، ڈائن!
حرام کے جو سنپولے جن رہی ہے
مگر نہیں پالتی نہیں ہے ——————

[1] ان مواقع پر تعمیر، تصویر اور تشہیر سے مراد فحش مستقانہ مراد ہیں۔

کیوں؟

نعیم صدیقی

اتنے کھیت، اور اتنے دہقاں، اتنے ہل
اتنی فصلیں، اتنے غلّے اور اناج
دودھ، مکھن، رس، انڈے، کیک، پھل
آدمی پھر بھوک کا مارا ہے کیوں؟

اتنا ریشم، اتنی اُون، اتنی کپاس،
اتنے بافندے ہیں، اتنے جامہ دوز
اتنے رنگا رنگ بکتے ہیں لباس!
آدمی دنیا میں پھر ننگا ہے کیوں؟

سیکڑوں ہیں منزلیں، لاکھوں مقام
یہ سرائیں، یہ ولا، یہ ہوسٹل،
یہ در و دیوار اور یہ قصر و بام
آدمی بے گھر ہے، آوارا ہے کیوں؟

یہ معالج، یہ مسیحا، الاماں
یہ شفا خانے، یہ جراحی کدے
یہ دوائیں، یہ اطبا، الاماں
آدمی بے وقت پھر مرتا ہے کیوں؟

اتنے مکتب، اس قدر دار العلوم
اتنے انبار کتب اور استاد
علم کے چشموں پہ پیاسوں کے ہجوم
آدمی جاہل ہے کیوں اندھا ہے کیوں؟

اتنے کاروبار، اتنے کام کاج
اتنے تہذیبی فرائض بے حساب
طالبِ خدماتِ پیہم ہے سماج
آدمی بیکار یاں پھرتا ہے کیوں؟

کُو بہ کُو، دن رات یہ دورانِ زر
اتنی ٹکسالیں ہیں، اتنے صیرفی
بنک اتنے، اتنا یہ طوفانِ زر
آدمی سکوں سے پھر سستا ہے کیوں؟

اتنے لشکر، اس قدر آلاتِ جنگ،
اس قدر پٹرولیم، بارود، گیس
اتنے گولے، اتنے بم، اتنے تفنگ
آدمی خطرے سے پھر ڈرتا ہے کیوں؟

اتنے مے خانے ہیں، اتنے ناچ گھر
شعر، تصویریں، ترانے، قہقہے
اس قدر تفریح کے رنگیں ہنر
آدمی آلام میں ڈوبا ہے کیوں؟

امن پہ وعظوں کا، تقریروں کا زور
یہ ادارے، یہ مجالس، بے شمار
یہ مقالوں اور تحریروں کا زور
آدمی سے آدمی لڑتا ہے کیوں؟

اتنے اونچے، اتنے گہرے فلسفے
اتنا تحقیق و تفکر کا جنوں
اس قدر ذوقِ خرد کے معجزے
آدمی کا ذہن پھر اُلجھا ہے کیوں؟

اتنے مہر و ماہ و انجم بے حساب
اتنی شمعیں، مشعلیں، جگنو، شرر
اتنے برقی قمقمے ہیں لاجواب
آدمی کے دل میں اندھیرا ہے کیوں؟

اتنی اونچی یہ جہازوں کی اُڑان
چاند تاروں کی یہ صیادی کا عزم
مادیّت کی فضا میں یہ اٹھان
آدمی اخلاق میں گرتا ہے کیوں؟

نعرہ ہائے حرّیت کا یہ خروش
مشرق و مغرب کے ہر ہر دیس میں
موج زن ہے ذوقِ آزادی کا جوش
آدمی پھندوں میں پھر جکڑا ہے کیوں؟

ذہن میں آئی بڑی بالا تری
"وحدتِ انسانیت" پر ہر طرف
ہو رہی ہے کیسی کیسی شاعری
آدمی پھر "قوم" کا بندا ہے کیوں؟

یہ مساوات و اخوّت کی پکار
"لا سلاطیں، لا کلیسا، لا اِلٰہ"
ہو گیا سرمایہ محنت کا شکار
آدمی اب ادنیٰ و اعلیٰ ہے کیوں؟

نَو بہ نَو یہ موڑ، مشکل مرحلے
اتنے تاریخی حوادث خوفناک!
یہ ہزاروں ٹھوکریں، یہ تجربے
آدمی اس حال میں سوتا ہے کیوں؟

اتنے لفظ، اتنے اسالیبِ سخن
اتنے نالے، اتنے نغمے، اتنا شور
دھر میں اتنی زبانوں کا چلن
آدمی کیا جانیں پھر گونگا ہے کیوں؟

اتنے مذہب، اتنے صوفی، اتنے پیر
اتنے معبد، اتنی درگاہیں، مزار
الاماں! اتنے بشیر، اتنے نذیر
آدمی الحاد میں بہکا ہے کیوں؟

اتنے اونچے اونچے مقصد رنگ رنگ
علم و فن، دین و سیاست، جذب و شوق
اک سے اک بڑھ چڑھ کے ہے دل کی امنگ
آدمی خواہش کا متوالا ہے کیوں؟

یہ تمدّن کی علاماتِ فساد
زندگانی کے مرض کے یہ ثبوت
کچھ بھی ہو تہذیب ہے یہ دوں نہاد
آدمی پھر مطمئن بیٹھا ہے کیوں؟

اَے نیل کی موجو!

نعیم صدّیقی

اَے نیل کی موجو! نہ کرو خوفِ کنارا
تم چاہو تو مشکل نہیں گُھس جائے گا خارا!
پانی ہے کہ آتش ہے، یہ پانی ہے پارا
ہر قطرے میں تابندہ ہے جرأت کا شرارا
اَے نیل کی موجو! نہ کرو خوف کنارا

تاریخ پہ کچھ اپنے نشاں چھوڑ چکی ہو
فرعون کی عظمت کا فسوں توڑ چکی ہو
تم عشرتِ فاروق کا غم چھوڑ چکی ہو
مَیں جانتا ہوں رُخ کو کدھر موڑ چکی ہو
مَیں خوب سمجھتا ہوں مشیّت کا اشارا
اَے نیل کی موجو! نہ کرو خوف کنارا

فرعون کا وہ دَور! تشدّد کے وہ کرتوت!
تہذیب پہ ہر سمت سے چھایا ہُوا طاغوت
گہواروں میں جب ذبح کیے جانے لگے پوت
وحشت کا سماں دیکھ کے انسان تھا مبہوت
وہ طفلکِ معصوم! وہ بہتا ہُوا تابوت
اِن موجوں سے تقدیر نے موسیٰ کو ابھارا
اَے نیل کی موجو! نہ کرو خوفِ کنارا

یاں بردہ فروشوں نے جسے بیچ دیا تھا
وہ جس کے تقدس پہ اک الزام لگا تھا
بے جرم کئی سال جو زنداں میں رہا تھا
آخر اُسی یوسفؑ کے لیے تخت بچھا تھا

سورج بنا کنعان کا ٹوٹا ہوا تارا
اے نیل کی موجو! نہ کرو خوف کنارا

تم مہدیٔ سوڈان کی دعوت کی امیں ہو
بربر کی شجاعت کی، حمیت کی امیں ہو
اور آج تو "اخوان" کی اخوت کی امیں ہو
تاریخ کی ہر زندہ روایت کی امیں ہو

ہر زندہ روایت کو کرو زندہ دوبارا
اے نیل کی موجو! نہ کرو خوف کنارا

الحاد کی تہذیب سے کب تک یہ عقیدت؟
اغیار سے یہ خوف! یہ دشمن سے مروت!
مانگے ہوئے افکار کی اب ٹوٹے گی قیمت
کب تک رہیں آپس میں جُدا دین و سیاست
اب چشمِ مسلماں پہ ہے واضح یہ حقیقت
"دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت

ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا"
اے نیل کی موجو! نہ کرو خوف کنارا

ملت کی یہ کھیتی ہے بڑی دیر سے پیاسی
اس خاک کے ہر ذرے پہ چھائی ہے اداسی

سہ وابستہ تصرف (ن م)

موسم ہو جو موزوں تو یہ زرخیز ہے خاصی[1]
اس خاک کو بس چاہیے نم ایک ذرا سی
اس خاک کو سیراب کرو بڑھ کے خدارا
اے نیل کی موجو! نہ کرو خوف کنارا

ترتیبِ کہن زیر و زبر ہو تو عجب کیا،
تنظیم باندازِ دگر ہو تو عجب کیا!
خم جبر کا اکڑا ہوا سر ہو تو عجب کیا!
اللہ کے یہ پیشِ نظر ہو تو عجب کیا!
شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را
اے نیل کی موجو! نہ کرو خوف کنارا

دجلہ کے بھی گرداب ہیں کچھ پہلے سے برہم
کاجان[1] کی لہریں بھی تو بل کھاتی ہیں پیہم
طوفان بآغوش ہیں یاں راوی و جہلم
بے تاب ہے گنگا میں بھی اک موجۂ زمزم
ہے ایک ہی نشہ! کہیں گہرا کہیں کم!
ہے ایک ہی جذبہ! کہیں واضح کہیں مبہم
ہے ایک ہی نغمہ! کہیں اونچا، کہیں مدہم
مل جائیں گی امواج سے امواج یہ باہم
ہو جائیں گے طوفانوں میں طوفان یہ مدغم
سو نَیں ہوں الگ چاہے، مگر ایک ہے سنگم
جو نعرہ ہمارا ہے وہی نعرہ تمہارا
اے نیل کی موجو! نہ کرو خوف کنارا

(حلقۂ ادبی اسلامی کراچی میں پڑھی گئی)

[1] انڈونیشیا کا ایک دریا

اشاعتِ عام

منشورِ آزادی

ابو سعید حیرت

محمدؐ کی نبوت کا ہوا فرمان جب جاری
شہنشاہوں کے درباروں پہ لرزہ ہوگیا طاری

مرتب ہوگیا دستورِ حق، منشورِ آزادی
مقدر ہوگئی کفر و فساد و شر کی بربادی

اندھیرے چھا گئے دنیا کے کسرائی بسیروں پر
تنزل آگیا قیصر کے لہراتے پھریروں پر

بُرے دن آگئے باطل کے اور باطل پرستوں کے
مقدر پھر گئے چشم زدن میں فاقہ مستوں کے

تمنائیں ہوئیں پیدا تمناؤں کے سینوں میں
تڑپ اُٹھے سجودِ شوقِ اُلفت کی جبینوں میں

گھٹا رحمت کی برسی ہر بلندی اور پستی پر
ہویدا ہوگئی رونق رُخِ آیاتِ ہستی پر

خمیدہ ہوگئیں سب گردنیں اکڑی ہوئی یکدم
خدائی سب غرور و تمکنت کی مٹ گئی یکدم

اُسی کے فیض نے مُردہ دلوں کو زندگی بخشی
جبینِ بندۂ خاکی کو یہ تابندگی بخشی

اُسی کے فیض نے صحرانشینوں کو امامت دی
غلاموں کو قیادت دی، فقیروں کو حکومت دی

غضب ہے کچھ مُسلماں دینِ حق سے اب گریزاں ہیں
روایاتِ براہیمی سے ترساں اور لرزاں ہیں

سمجھتے ہیں کہ اس میں بادشاہی مل نہیں سکتی
سمجھتے ہیں کہ بندوں کو خدائی مل نہیں سکتی

اِسی خاطر مجھے لایا گیا ہے اک دوراہے پر
خداوندا! تو اِس مشکل میں میری راہنمائی کر

اُدھر لندن کے ایوانوں میں آوارہ سیاحت ہے
اِدھر آئینِ اسلامی کی ملت کو ضرورت ہے

خداوندا! ہدایت دے پرستارانِ باطل کو
اور اہلِ حق پہ آساں کر دے راہ و رسمِ منزل کو

خداوندا! بچا ملت کو سرکاری نبوت سے
نہیں ہے واسطہ اس کو مزاجِ دینِ فطرت سے

صدائے لا الٰہ گونجی تو ہے حیرتؔ فضاؤں میں
اثر معلوم ہوتا ہے مجھے تیری نواؤں میں

(حلقۂ ادبِ اسلامی حافظ آباد میں پڑھی گئی)

کربلا

طالب حجازی

قوتِ جبروت سے کس نے کہا تھا برملا
سر یہ جھک سکتا نہیں کٹ جائے گو میرا گلا

سرزمینِ کربلا کس کے لہو نے سرخ کی
قصرِ باطل کس کے ایماں کی حرارت سے جلا

مٹ گیا خانوادۂ حضرت خدا کے دین پر
کر گیا لیکن اُجاگر جلوۂ ربِّ علیٰ!

عظمتِ ناموسِ پیغمبر پہ قرباں ہو گیا
ہاں وہ عطرِ آدمیت، وہ شہیدِ کربلا

کانپ اُٹھے ارض و سما دشت و جبل تھرا اُٹھے
خاک پر جس وقت تڑپا فاطمہ کا لاڈلا

کفر کے چہرے پہ مستی ظلم کی رقصاں ہوئی
گردنِ شبیر پہ جب خنجرِ براں چلا

اُن کے ہاتھوں سے لٹی باغِ رسالت کی بہار
جو نمازوں میں ادا کرتے رہے صلِّ علیٰ

جبر و استبداد اُدھر اور جذبۂ شبیر اِدھر
پھر وہی ہے رزمِ کفر و دیں، وہی ہے کربلا

حریت آموزِ انساں داستانِ کربلا
شمعِ راہِ مردِ مومن ہے یہ تدریسِ جلی

اک [illegible] حق و صداقت کا مدار
دے کے [illegible] گئے ہم کو حسینؓ ابنِ علیؓ

[illegible]

رجز

ابو البیان حماد

تا بکے یہ عیش و عشرت نونہالانِ چمن
تیغ و قرآں تھام کر تم باندھ لو سر پہ کفن
کیوں نہ ہو شمعِ یقیں وجہِ فروغِ انجمن
رزم گاہِ خیر و شر میں بے خطر آگے بڑھو!
نردبانِ رفعت و اوجِ ثریّا پر چڑھو

مردِ مومن کو ہے باطل کی غلامی ناپسند
زہر کو وہ کہہ نہیں سکتا کسی صورت بھی قند
دونوں عالم میں وہی ہے سربلند و ارجمند
اُس کی فطرت کفر سے مانوس ہو سکتی نہیں
رحمتِ حق سے کبھی مایوس ہو سکتی نہیں

تم اگر ناموسِ دینِ حق کے بن جاؤ امیں
بالیقیں ہو جائے گی حاصل تمہیں فتحِ مبیں
بھانپ جائے گی ہر اک فتنہ کو چشمِ دوربیں
کون کہتا ہے تمہارے پاس بل بوتا نہیں؟
ہو جو ایمانی تڑپ دل میں تو کیا ہوتا نہیں

ہے تمہاری تیغِ ہمت اس قدر خارا شگاف
پڑ گیا ہے پھر سے باطل کی صفوں میں اختلاف
لرزہ براندام ہے اب کفر کا لاف و گزاف
تم بپھر جاؤ تو دشمن تم سے گھبرائے نہ کیوں
موم کی مانند پتھر بھی پگھل جائے نہ کیوں؟

جو مجاہد ہے وہ باطل سے کبھی ڈرتا نہیں
موت سے ڈر کر خوشامد کفر کی کرتا نہیں
زندۂ جاوید ہو جاتا ہے وہ مرتا نہیں
اس کا دل ہے شعلۂ جوّالۂ ذوقِ یقیں
سینچتا ہے وہ جگر کے خون سے گلزارِ دیں

سر بکف ہو کر مجاہد پھر نکل ہی جائیں گے
دشمنوں کے دل بھی سینوں میں دہل ہی جائیں گے
رستہ پیکار میں گر کر سنبھل ہی جائیں گے
صلح کا پیغام وہ سب کو سناتے جائیں گے

خار و خس بھی ہوں تو گل بوٹے بناتے جائیں گے

تازہ کر دو داستانِ حیدرِ کرار کو
پڑھ بھی لو رودادِ شوقِ جعفرِ طیار کو
اپنے ہاتھوں سے نہ چھوڑو تیغِ بے زنہار کو
غرق کر دو کفر و باطل کو خدا کے قہر میں
ہر جگہ اسلام کا ڈنکا بجا دو دہر میں

چھوڑ دو خوابِ تغافل کو خدارا چھوڑ دو
گرزِ حق سے دیوِ استبداد کا سر پھوڑ دو
اہرمن سے توڑ کر سب کو خدا سے جوڑ دو
بربریت کو زمانے سے مٹانا ہے تمہیں
اپنی جانوں پر بھی آخر کھیل جانا ہے تمہیں

کیا مناسب ہے کہ تم بیٹھے ہوئے روتے رہو
اپنے لمحاتِ گراں مایہ کو یوں کھوتے رہو
وقت شانوں کو جھنجھوڑے اور تم سوتے رہو
سیل بن کر عالمِ ایجاد پر چھا جاؤ تم
خود تڑپ کر پھر زمانے کو بھی تڑپا جاؤ تم

ہو گئے ہو جمع تم شانہ بہ شانہ صف بہ صف
ہاں چلو اب ڈھونڈ لو اپنی مساعی کا ہدف
دے رہا ہے ہاتفِ غیبی نویدِ "لاتخف"
خیر و شر کی کشمکش سے دل نہ گھبرائے کہیں
رزم گاہِ زیست میں بازی نہ ہر جائے کہیں

نیتوں میں پاک بازی ہے ارادے ہیں جواں
جادہ پیما ہو گیا ہے پھر ہمارا کارواں
منزلِ مقصود کی جانب ہے وہ پیہم رواں
زندگی میں پھر نیا اک انقلاب آنے کو ہے
مادیت کا تصور اب بدل جانے کو ہے

[illegible] ہو گیا ہے [illegible] پھر رازِ حق
جلوہ گر ہے ذرہ ذرہ میں بھی اک اعجازِ حق
[illegible] آوازِ حق
ختم ہو جائے ملوکیت کا فرسودہ نظام
[illegible] میں ہو خدا کی بادشاہی کا قیام

تفہیم القرآن جلد اول ایڈیشن دوم

پہلا ایڈیشن ختم ہو کر دوسرے ایڈیشن کی ترسیل شروع ہو چکی ہے نئی فرمائشوں والے حضرات اپنی ضرورت سے مطلع فرمائیں

ایڈیشن دوم بھی حسب سابق سورۂ فاتحہ سے سورہ الانعام تک ۲۹ × ۲۲ سائز کے قریباً پونے سات سو صفحات

مع چار تاریخی جغرافیائی نقشوں پر مشتمل ہے۔ اس ایڈیشن پر صاحبِ مصنف جناب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے

نظرِ ثانی فرما کر کئی مقامات پر ترمیم و اضافے کر دئے ہیں۔ جو ترجمان القرآن بابت ماہ رجب و شعبان ۱۳۷۱ھ میں الگ

شائع کئے جا چکے ہیں۔ فہرست موضوعات بھی دوبارہ نئی ترتیب سے ترمیم و تنسیخ سے شائع کی گئی ہے۔ طبع اول میں جو غلطیاں

رہ گئی تھیں اُن کی تصحیح بھی کر دی گئی ہے۔

متوسط طبقہ کی خواہش کے پیش نظر قسم سوم بھی طبع ہوئی ہے۔

ھدیہ:۔ قسم اول مجلد مع بکس ۲۰/۱۲/۰

ھدیہ:۔ قسم دوم " " " ۱۸/۴/۰

ھدیہ:۔ قسم سوم " بغیر بکس ۱۱/۰/۰

محصول ڈاک :۔ تقریباً ۱/۱۴/۰ الگ

مکتبہ جماعتِ اسلامی پاکستان، جماعتِ اسلامی ہند، مکتبۃ الحسنات رامپور، اور چراغ راہ کی تمام مطبوعات

ہمارے ہاں سے اُن کے اصل نرخوں کے مطابق مل سکتی ہیں۔

تفہیم القرآن کے عکسی ایڈیشن کے لئے اُردو اور عربی کے بہترین خوشنویس اپنی رسم الخط کے جلی اور

خفی نمونہ بمعہ شرح بھیجیں۔

دریافت طلب امور اور فرمائش کرتے وقت اخبار کا حوالہ اور ہمارا اور اپنا پتہ خوشخط تحریر فرمائیں۔

شیخ محمد قمر الدین ناظم مکتبہ تعمیر انسانیت

گجر گلی موچی دروازہ لاہور

اشاعت خاص ۔۔۔ ۱۹۵۲ء

رقصِ وطن

- جیلانی بی اے
- نعیم صدیقی
- فضل من اللہ
- فضل الرحمٰن
- جلال

بعلم بن بعور

جیلانی۔ بی اے

کتاب العدد میں آیا ہے کہ جب بنی اسرائیل موآب کے میدانوں میں خیمہ زن ہوئے تو شاہ موآب نے عمون کے بزرگ راہب بعلم کو بلا بھیجا کہ وہ اس کے دشمنوں کے لیئے بددعا کرے۔ بعلم حقیقت شناس تھا۔ اس نے پہلے تو حیل وحجت کی لیکن جب بعلک شاہ موآب نے بیش بہا انعامات اور منصب بلند کا لالچ دیا تو وہ متزلزل ہو گیا۔ بعلم اپنے خچر پر سوار ہو کر بعلک کے پاس گیا۔ راستے میں ایک فرشتہ برہنہ شمشیر سونتے اس کو روکنے کے لیے کھڑا تھا۔ خچر اسے دیکھ کر اڑ گیا لیکن بعلم نے اسے نہ دیکھا۔ وہ اس کے باوجود بعلک کے پاس چلا گیا جہاں کل روسائے قوم جمع تھے۔ انہوں نے ایک قربان گاہ تیار کی اور اس پر بے شمار بیل اور مینڈھے بھینٹ چڑھائے۔ لیکن جب بعلم بددعا کرنے کے لئے کھڑا ہوا تو اس کے منہ سے بے اختیار بنی اسرائیل کے حق میں کلمات خیر نکل گئے۔

اس پر بعلک نے کہا۔ "یہ تو نے کیا کیا؟ میں نے تمہیں اپنے دشمنوں کے لئے بددعا کرنے کے لئے بلایا تھا لیکن تو ان کے حق میں دعائے خیر کہہ رہا ہے"

بعلم نے جواب دیا۔ "خداوند میرے منہ میں جو کچھ ڈالتا ہے میں اس سے کیسے باز رہ سکتا ہوں"

بعلک نے کہا۔ "میرے ساتھ دوسری جگہ پر آ اور میرے دشمنوں کے لئے بددعا کر"

وہ اسے اس جگہ لے گیا جہاں پر دوسری قربان گاہ تیار کی گئی تھی۔ لیکن یہاں بھی بعلم کی زبان سے بنی اسرائیل کے حق میں کلمات خیر ہی نکلے۔

پھر تیسری بار بھی ایسا ہی ہوا۔

اس پر بعلک کی آتش غضب بھڑک اٹھی۔ اس نے دوہتڑ مارتے ہوئے بعلم سے کہا "میں نے تجھے اپنے دشمنوں کے لئے بددعا کرنے کے لئے بلایا تھا لیکن تو نے ان کے حق میں تین بار دعائے خیر کہہ دی۔ اب تو یہاں سے نکل جا۔ میں تجھے عزت اور منصب بلند عطا کرنا چاہتا تھا لیکن خداوند نہیں چاہتا کہ تجھے عزت اور منصب ملے"

اسی طرح بعلم بغیر انعام پائے لوٹ گیا۔

سورہ اعراف کی ایک ایت (ولو شئنا لرفعنہ بھا ولکنہٗ اخلد الی الارض واتبع ھوٰلہٗ۔ فمثلہٗ کمثل الکلب۔ الخ) کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت شاہ عبدالقادر علیہ الرحمۃ اسی واقعہ کو بیان کر کے مزید فرماتے ہیں کہ جب بعلم بنی اسرائیل کے لئے بددعا کرنے میں ناکام رہا تو اس نے بعلک کو ان کے لشکر میں فاحشہ عورتیں خفیہ طور پر بھیجنے کا مشورہ دیا کہ لوگ بدکاری کریں اور ان پر ذلت پڑے۔ کتاب العدد میں اس ضمن کا اشارہ بھی ملتا ہے۔ "اور اسرائیلی شطیم میں مقیم ہو گئے اور لوگوں نے موآب کی لڑکیوں سے زناکاری شروع کر دی"۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں "حق تعالیٰ نے حضرت موسیؑ کی برکت سے حیلہ پیش نہ چلایا۔ لیکن سکھانے والا مردود ہوا۔ شاید دنیا میں یا آخرت میں اس کو یہ عذاب ہوا کہ کتے کی طرح زبان نکل پڑی"۔ شاہ صاحبؒ کے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے علم حق کو اپنی حرص کے تابع کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ایسا کرنے میں ناکام رہا۔ وہ حقیقت سے آگاہ تھا لیکن نفس سے مغلوب ہوا تو اس کی حالت ہانپتے کتے کی سی ہو گئی۔ ایسے بندۂ نفس کے پاس علم حق کا ہونا یا نہ ہونا ایک برابر ہے۔

یہ مثال جب کبھی مجھے یاد آتی ہے اس کے ساتھ ہمیشہ یہ سوال ابھر آتا ہے۔ ایک پختہ سیرت راہب کیونکر باطل کی مدد کے لئے تیار ہو گیا؟ ایک زاہد و مرتاض کیونکر خدا سے منحرف ہو کر بندۂ نفس بن گیا؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک شخص ایک راہ پر مدت العمر گامزن رہا پھر ایک دفعہ اچانک

سمت مخالف کی راہ پہ پایا جائے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

میرے خیال میں اس کی دو ہی توجیہیں ممکن ہیں۔ یا تو یہ کہ فطرت انسانی میں تدریجی نشو کا کوئی قانون ہی نہیں ہے۔ یہاں جو کچھ ہوتا ہے انقلاب سے ہوتا ہے۔ یا پھر وہ شخص اس راہ ہی پر نہ چل رہا تھا وہ بظاہر اس راہ پر کھڑا نظر آتا تھا۔ حقیقت میں وہ سمت مخالف ہی کا مسافر تھا۔

کم از کم مجھ کو دوسری توجیہہ صحیح معلوم ہوتی ہے اگرچہ وہ بڑی تلخ اور تکلیف دہ ہے۔ اس لئے کہ میں نے بیج کو ایک رات میں تناور درخت بنتے نہیں دیکھا۔

بلعم کا باپ بعور شہر فتورا کا کاہن تھا جو دریائے اردن کے مغربی کنارے پر واقع تھا۔ بلعم اپنے باپ کا چھوٹا بیٹا تھا۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تو اس نے دیکھا کہ وہ ایک ایسی عورت کے زیر سایہ پل رہا ہے جو اگرچہ اس کی ماں نہ تھی تاہم اس کا باپ اس کے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہ اٹھاتا تھا۔ وہ جب کبھی اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرنا چاہتی تو وہ یوں پھڑک اٹھتا گویا ڈر گیا ہے یا گویا اس کی ہتھیلی میں خار لگے ہیں۔ وہ اس کو ملائم آواز میں پکارتی لیکن یہ بھاگ کر اپنی بوڑھی دایہ کی گود میں سر چھپا لیتا جس نے اس کی ماں کے بعل کے آسمانی ہیکل کو چلے جانے کے بعد اس کی پرورش اپنے ذمے لے لی تھی۔ اس بوڑھی دایہ کی ڈانٹ ڈپٹ میں اسے جو لطف و محبت ملتی وہ اس لپیٹ فذا اور گداز عورت کے پیار بھرے بلاوے میں بھی نہ تھی۔ وہ جبلاً محسوس کرتا تھا کہ یہ بڑھیا میری ہے لیکن اس عورت کے متعلق وہ کبھی بھی گمان نہ کر سکتا تھا کہ وہ میری ہے۔ وہ صرف اسی کی نہ تھی اس کے باپ کی بھی نہیں تھی۔ البتہ باپ اس کا تھا۔ گھر بار اس کا تھا۔ لونڈیاں اس کی تھیں وہ ہمیشہ متعجب ہوتا کہ اس کے اندر کیا جادو ہے جو اس کا باپ اس کے سامنے گنگ ہو جاتا تھا۔ اگر وہ اپنے باپ کی بجائے ہوتا تو اس عورت کو کان سے پکڑ کر گھر سے نکال باہر کرتا۔ لیکن اس کا باپ تھا کہ جب وہ حالت غصہ میں کچھ کہنا چاہتا تو اس کی ایک نگاہ اسے خاموش کرنے کو کافی تھی۔ اس کو نہ تو اس کے بھرے بازوؤں، ابھرتی چھاتیوں اور گٹھیلے جسم میں کوئی کشش نظر آتی اور نہ اس کی طرز گفتگو میں۔ البتہ اس کی آنکھوں میں کچھ معانی ضرور پنہاں تھے۔ وہ سیپ کے موتیوں کی مانند چمکتی تھیں۔ اور وہ جب کبھی آنکھ اٹھا کر کسی کی طرف دیکھتی تو وہ گویا دم بخود رہ جاتا۔

اس عورت نے اپنی آنکھوں سے سب کو رام کر لیا تھا سوائے بلعم کے بڑے بھائی کے۔ وہ اس سے بدستور نفرت کرتا رہا۔ اور صرف اسی وجہ سے وہ اپنے باپ کے ساتھ بھی فرزندانہ تعلقات استوار نہ رکھ سکا۔ اس کا باپ صرف کاہن نہ تھا قانونی لحاظ سے شہر کا حاکم بھی تھا۔ اس عہد میں اکثر کاہن شہروں کے قانونی حاکم بھی ہوا کرتے تھے۔ صرف راہب ہی متمدن زندگی سے دور رہتے تھے۔ اس کا باپ پہلے راہب تھا لیکن جب سے اس عورت سے وابستگی ہوئی تھی وہ راہبانہ زندگی چھوڑ کر کاہن بن گیا تھا۔ اور اس عورت سے وہ کیونکر ملا یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ رہبانیت سے کہانت کی طرف انتقال کی توجیہہ اس نے یہ بیان کی کہ وہ اپنے علم حقیقت کو عملی زندگی میں سمونا چاہتا ہے۔ شاید اسی علم کی بنا پر اس نے قانون سے کم اور حسن سلوک سے زیادہ کام لیا۔ اس کا یہی منہاج سیاست و تدبیر اس کے لئے شہرت اور عزت لایا۔ اہل فتورا جانتے تھے کہ کسی کاہن نے اس لیاقت اور قابلیت کے ساتھ امور تمدن نہیں انجام دیئے جس لیاقت اور تدبیر کے ساتھ بعور نے دیئے ہیں۔ اس کے باوجود وہ گھر میں ثانوی حیثیت رکھتا تھا اس کے باوجود وہ اپنی اولاد کے حقوق ادا نہ کر سکا۔ اس کا بھائی شیرد اسی حق تلفی کی بنا پر گھر سے نکل گیا۔ ایک دفعہ اسے تجارت کے لئے سرمائے کی ضرورت پڑی۔ اس نے باپ سے مدد چاہی لیکن وہ متامل ہوا۔ چند ہی روز بعد سیپ کے موتیوں کی سی چمکدار آنکھوں والی کے گلے میں ایک ہار دیکھا گیا جو اس سرمایہ سے کہیں زیادہ بیش بہا تھا جتنا کہ شیرد نے اپنے باپ سے طلب کیا تھا۔ یہ دیکھ کر شیر غضب آلود ہو گیا اور یہ کہہ کر گھر سے نکل گیا کہ میں اس باپ کے گھر میں ہرگز ہرگز نہیں ٹھہر سکتا جس کو اپنی اولاد سے زیادہ اپنی داشتہ سے محبت ہے۔ چند دن بعد سنا گیا کہ وہ ایک اسرائیلی لونڈی کے ساتھ سرزمین ابوالہول کو چلا گیا ہے۔ اس کی جدائی کا اثر اس کے باپ پر ضرور تھا۔ لیکن وہ اس فتنگی عورت کے سامنے اسے ظاہر نہ کرتا۔ وہ کچھ مدت اس طرح چپ چپ سا رہا گویا وہ کسی اہم تمدنی مسئلے کے متعلق فکر کر رہا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ اس عورت نے اس کو ایسی ایسی کہانیاں سنائیں کہ اس کے چہرے سے ملال کی سب شکنیں دور ہو گئیں اور وہ پھر مسرور رہنے لگا۔

بلعم ہنوز بلاغت کو نہ پہنچا تھا لیکن وہ وہبی طور پر ہر بات کی تہہ تک پہنچ جاتا۔ اس کا باپ اس کے سامنے اپنی داشتہ کے ساتھ اکثر ایسی حرکتیں کر بیٹھتا

بعلم بن بعور

جو بعلم پر اس کے کردار کو واضح کر جاتیں۔ انہی گہرے اثرات کی بناء پر بلوغت کو پہنچ کر اس نے ہر ایک متعلق اپنی رائے قائم کر لی۔ وہ جان گیا تھا کہ اس کا باپ ایک کمزور آدمی ہے۔ وہ اصلاً نیک اور نرم خو تھا لیکن اپنی کمزوری کے سبب کسی اصول پر سختی سے قائم نہ رہ سکتا تھا۔ وہ جذبات کے سامنے اکثر جھک جاتا اور اس کی اسی کمزوری کو اس کی داشتہ تاڑ گئی تھی۔ جب کہ وہ اپنی کم گوئی اور کاہلی کے پردے میں ایک نہایت عیار و مکار نیت چھپائے ہوئے تھی۔ وہ اپنا کام نکالنا جانتی تھی۔ اپنے گوہر مقصود کو پانے کے وسیلوں میں وہ نہایت مشاق تھی۔ اگر اس کا ایک پانسہ رد کر دیا جائے تو دوسرا پھینک دے گی۔ دوسرا بھی نہ چلے تو تیسرا پھینک دے گی۔ اس لئے کہ اس کی ہتھیلی میں ایک صد ایک پانسے تھے۔ اور وہ صبر کے ساتھ ان کو پھینکنا جانتی تھی۔ اس کا بھائی کم عیار واقع ہوا تھا کہ وہ دل کی بات روکنا نہیں جانتا تھا اور اسی لئے اپنے باپ کا حقہ کام نہ لے سکا۔

اس کے خلاف بعلم کی اپنے باپ اور اس کی داشتہ سے خوب نبھ رہی تھی۔ وہ عمر اور درجہ میں چھوٹا تھا اس لئے قدرتی طور پر باپ، اس کو چاہتا تھا۔ وہ اس کو ہمیشہ نرم و ملائم لہجہ میں پکارتا اور اس کی ہر ضروری احتیاج پوری کر دیتا۔ جب وہ اس کو اپنے کلاوے میں لے کر پیار کرتا تو اس کو اپنے باپ کی اصلی فطرت سونے کی طرح دلکش نظر آتی۔ اس فطرت کا اظہار وہ بالعموم اس وقت کرتا جب وہ قربان گاہ پہ ہاتھ بلند کئے کھڑا ہوتا۔ اس کی انگلیوں سے لوبان کے مرغولے چکر لگاتے ہوئے نکلتے اور اس کی لرزتی ہوئی آواز ہیکل میں گونج اٹھتی۔ وہ اس وقت خود دیوتا دکھائی دیتا۔ اس کا منڈا ہوا سر بعل کے سامنے خمیدہ ہوتا جبکہ بعل کا عظیم بت اس پر جھکا ہوا اپنے انگلے منہ کی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا اور اس کی مناجات سن رہا ہوتا۔ بعلم اپنے باپ کی اس حیثیت کے نقش کو اپنے دل سے کبھی محو نہ کر سکتا تھا۔ وہ اسے گھر میں بھی ویسا ہی دیکھنا چاہتا تھا لیکن نہ معلوم کیوں گھر کی چار دیواری میں قدم رکھتے ہی وہ دیوتا آدمی بن جاتا۔ اس کی شکل و صورت عام آدمیوں کی سی ہو جاتی اور وہ ایسی ایسی حرکتیں کرتا کہ جن کو دیکھ کر بعلم کے دل میں اس کی اس شخصیت سے نفرت سی ہو گئی۔ وہ ہیکل کے اندر بعل فعور کے سامنے مناجات کرنے والی ہستی ہی کو پسند کرتا تھا اور ویسا ہی بننا چاہتا تھا بلکہ اس سے بھی بڑا۔

وہ اپنے باپ کے ساتھ ہیکل کو جاتا اور اسی طرح سر جھکا کر خداؤں کے خدا کے سامنے کھڑا ہو جاتا۔ اسی طرح مراقبے کرتا اور لرزتی ہوئی آواز میں مناجاتیں پڑھتا۔ جب اس کا باپ ہیکل سے باہر نکلتا تو پجاری سر جھکائے دو رویہ کھڑے ہو جاتے۔ ہجوم اس کے جلو میں ہوتا اور فریادی اس کے سامنے زمین بوس ہو کر پکارتے۔ "اے بعور، بعل کے چہیتے، میری فریاد سن" اور بعور فریاد کرنے والے کی پیشانی پر انگلی سے نشان بنا دیتا۔ وہ اس وقت عظیم اور قوی دکھائی دیتا کیونکہ اس کے منہ کا ہر لفظ تقدیر تھا۔ بعلم اپنے باپ کی ہر حرکت و سکنت بغور دیکھتا اور اس کے نقش اپنے دل پر بٹھاتا چلا جاتا۔ اس کا باپ اتنا دانا تھا کہ اس نے اس حیثیت سے اپنے ذہین بیٹے کو کبھی مایوس نہ کیا۔ دل ہی دل میں وہ مسرور تھا کہ اس کا بیٹا معناً وارث بننا چاہتا ہے۔

بعلم گھر اور ہیکل کی زندگی کے علاوہ کسی اور طرز زندگی سے شناسا نہ تھا۔ وہ ایک ایسے باپ کا بیٹا تھا جس کی زندگی عوام کی زندگی سے مختلف تھی۔ اسی لحاظ سے اس کی زندگی بھی عام بچوں سے مختلف انداز پر تھی۔ اس نے عہد طفولیت میں معروف کھیلیں دوسروں کو دیکھی تھیں لیکن خود کبھی ان میں شریک نہ ہوا تھا۔ جب وہ ذرا سیانا ہوا تو اس نے تیرنا سیکھا۔ لیکن عہد شباب کی کھیلوں میں پوری طرح شریک نہ ہوا۔ وہ طبعاً متفکر تھا۔ اکثر بیٹھا مناجات کے معانی پر غور کرتا رہتا۔ ہیکل کے قدیم مجاوروں کی باتیں سنتا اور ان سے حکمت کے موتی سمیٹتا۔ اس کو اچھے کھانے یا اچھے لباس سے اتنی خوشی نہ ہوتی جتنی کہ کسی نئی حقیقت یا نقطے کے حل ہو جانے یا کسی عقدہ کے وا ہو جانے سے ملتی۔ یہ دنیا اور اس کے لہو و لعب اس کے لئے بے معنی تھے کیونکہ زندگی کی حقیقت اس کے نزدیک بعل کے ہیکل ہی میں محصور تھی۔ باقی سب فانی و لمحاتی تھے۔ اس کے باوجود گاہ گاہ فانی و لمحاتی اشیاء اس کے اس عقیدے کو متزلزل کر دیتیں۔ مثلاً ایک روز اس نے ایک تاجر کی بیوی کو ڈولی میں بیٹھے دیکھا تو وہ دم بخود رہ گیا۔ وہ مسند پر بیٹھی ہوئی تھی جبکہ اس کا خاوند اس کے پاؤں میں نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ نیم دراز نیم وا آنکھوں سے دریا کے کنارے اگی ہوئی دوب کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی مست غزالیں آنکھیں، سپیدۂ سحر کا سا رنگ، لب ہائے لالیں اور آہو کی سی ملائم لچکیلی گردن میں کانچ کے سے سبز مرتبوں کا ہار سب واقعی اور حقیقی تھے۔ اصان کو انکار کر دینا سخت دشوار تھا کہ وہ فانی اور لمحاتی ہیں، لہٰذا ناخوشگوار اور فضول۔ اس روز اسے ہلکا سا احساس ہو گیا کہ کیوں اس کا باپ گھر میں ثانوی حیثیت پر قانع ہے۔

ایک نئے فہم کی سحر اس پر طلوع ہو رہی تھی۔ اور اس کی روشنی سے صرف اس کا دل ہی نہیں اس کا بدن بھی منور ہو رہا تھا۔ بعض اوقات مراقبہ میں بیٹھے ہوئے گھنٹیوں کی جھنکار یکبارگی چونکا کر اسے ایک نئی ابھرتی ہوئی قوت کا احساس دلا دیتی۔ اس کے تصور کی یکسوئی یکلخت ٹوٹ جاتی پھر پرجتن اور پرجتن کے باوجود اپنے تصور میں ویسا جذب و انہماک پیدا نہ کر سکتا۔ اس کی دل اچانک اچاٹ ہو جاتا۔ اور اس کو ایسا محسوس ہوتا گویا ہیکل سے باہر کی دنیا اسے پکار رہی ہے۔

اس تغیر کا پورا احساس اسے فتورا کے تہوار پر ہوا۔ یہ اہل فتورا کا قومی دن تھا۔ اس روز بیلوں، مینڈھوں اور دنبوں کے علاوہ بے شمار سانڈنیاں بعل کی بھینٹ چڑھائی گئیں کیونکہ چار مونہوں والے بعل فغور کو یہ زیادہ مرغوب تھیں۔ قربانیوں کے بعد دریائے اردن کے کنارے گھوڑ دوڑ ہوئی اور اس تقریب میں شاہان حومی و رقیم کے سفیر بھی موجود تھے جو کسی تجارتی و سیاسی معاہدے کے لئے آئے ہوئے تھے ان کی آبنوسی مسندیں کاہن کے قریب بچھائی گئی تھیں۔ اور ان کی بیویاں بھی ان کے ساتھ تھیں۔ بعلم اپنے باپ کے قریب ہی بیٹھا تھا اور وہ وہاں سے ان کے چہروں کو بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ مقابلہ میں سب سے اوّل عوریب نامی ایک آرامی رہا۔ جب وہ اپنے گھوڑے سے اترا تو لوگ اس کو قریب سے دیکھنے کے لئے ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑتے تھے اس کے گھوڑے کی ریال دریائے اردن کے سیپوں اور گونگوں سے گندھی ہوئی تھی اور اس کی زرنگار جھول سورج کی روشنی میں دریا کی لہروں کی طرح جھلملا رہی تھی۔ اس کا چہرہ خون کی تیزی سے سرخ اور پسینے سے بھیگ رہا تھا۔ اس کا چوڑا چکلا سینہ جوش سے ابھرا ہوا اور اس کے مضبوط بازوؤں کے پٹھے تنے ہوئے تھے۔ وہ پہلے کاہن فتورا کے سامنے تین بار زمیں بوس ہوا۔ پھر سفرائے حومی و رقیم کے سامنے جھکا۔ وہ پرتحسین نگاہوں سے اس کو دیکھ رہے تھے۔ سفیر رقیم کی بیوی کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ اس نے اپنے خاوند کی طرف دیکھا اور اپنے گلے کا ہار عوریب کے گلے میں ڈال دیا۔ عوریب نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور اس کے سامنے زمیں بوس ہو گیا۔ اس پر سارا میدان خوشی کے نعروں سے تھرتھرا اٹھا۔

یہ واقعہ ایسا نہ تھا جو اس کے حساس اور اثر پذیر ذہن سے جلد محو ہو جاتا۔ یہ اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر گیا۔ آدمی کی فطرت کا ایک نیا پہلو اس کے سامنے نمایاں ہو گیا تھا۔ وہ تو حقیقت کو ہیکل کی چار دیواری میں محصور سمجھے ہوئے تھا لیکن اب دیکھا ان مسابقت کی حقیقت اتنی ہی ٹھوس اور واقعی تھی جتنی کہ ہیکل کی۔ لوگوں کی نگاہیں بتا رہی تھیں کہ وہ ہیکل کی بجائے یہاں اطمینان محسوس کر رہے ہیں یہاں ان کے جذبات دریا کی موجوں کی طرح آزاد اور سبک تھے۔ جبکہ ہیکل میں گھٹے گھٹے اور دبے دبے نظر آتے تھے۔ وہاں ان کی آنکھوں میں بے چینی اور خوف جھلکتے ہیں لیکن یہاں وہ کشادہ اور مسرور نگاہوں سے گھوڑ دوڑ دیکھ رہے تھے۔ وہ خوشی سے چلّاتے اور جوش سے اچھلتے تھے۔ گویا گھوڑے نہیں خود وہ تھے جو شریک مسابقت تھے۔ وہ جیتنے والے کو کتنی پیار بھری اور تسلیم کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں سے عیاں تھا کہ وہ اپنے حقیقی جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔ کیونکہ ہر ناظر اس سے متاثر تھا۔ لیکن جب وہ اس کے باپ کے سامنے آتے ہیں تو ان کی نگاہیں خوفزدہ اور منجمد ہوتی ہیں۔ جب وہ اس کے سامنے اپنی گذارشات پیش کرتے ہیں اور جب وہ اس کے حضور میں زمیں بوس ہو کر اس کے جذبۂ رحم کو پکارتے ہیں تو وہ مخلص نہیں ہوتے۔ وہ حرکات دل کی نہیں بدن کی ہوتی ہیں۔

جب سفیر رقیم کی حسین بیوی کی خوشی سے چمکتی ہوئی آنکھیں اسے یاد آتیں تو ایک میٹھی ٹیس اس کے پہلو میں اٹھتی گویا عوریب اس کا رقیب تھا۔ بے اختیار اس کے دل میں خیال آتا۔ اگر میں بھی شہسوار ہوتا اور عوریب کی طرح گھوڑ دوڑ جیت لیتا تو سفیر رقیم کی حسین بیوی خوشی سے چمکتی ہوئی نگاہوں سے یونہی مجھے دیکھتی۔ پھر تصور ہی تصور میں وہ اسے اپنی جانب مسرور نگاہوں سے دیکھتا ہوا پاتا تو اس کے رگ و پے میں اک آگ سی بھڑک اٹھتی۔ جب کبھی ایسی ہوک اس کے دل میں اٹھتی تو وہ خاموش اور تنہا رہنا پسند کرتا۔ وہ دریا کے کنارے کنارے دور چلا جاتا جہاں ماہی گیر اپنے ڈونگوں میں مچھلیاں شکار کرتے تھے۔ وہ ایک پتھر پر بیٹھ کر دور دیکھنے لگتا جبکہ اس کا ذہن دو دنیاؤں کا میدان کارزار بنا ہوتا۔ ایک دنیا ہیکل کی دنیا تھی اور دوسری دنیا ہیکل

سے باہر کی دنیا تھی۔ ہیکل ہی دنیا باپ کی صورت میں نظر آتی اور ہیکل سے باہر کی دنیا عوریب کے جلوہ میں۔ وہ ایسا محسوس کرتا گویا اس کی زندگی کی شاخ پر ایک نئی کونپل پھوٹ رہی تھی جس کے وجود سے وہ نہ تو انکار کر سکتا تھا اور نہ اغماض۔

ان دو متحارب قوتوں کی کشمکش اس مصالحت پر ختم ہوئی کہ بعلم نے ہیکل کی حاضری کے ساتھ ساتھ گھوڑ سواری کی تربیت بھی حاصل کرنی شروع کر دی۔ اس کا باپ اس طلب پر سخت متعجب ہوا جب بعلم نے ایک گھوڑا مانگا۔ اس سے پہلے تو وہ اسے اپنے راہب بیٹے ہی کی حیثیت سے جانتا تھا۔ لیکن اس شوقِ شہسواری نے اس کے سامنے اس کی طبیعت کا ایک نیا پہلو ظاہر کر دیا اور وہ اس کی تلون مزاجی تھی۔ کہ جس ذوق و شوق سے کہانت سیکھنا چاہتا تھا اسی درجہ کے جوش کے ساتھ وہ اس سے پلٹ بھی سکتا تھا۔ پھر اس کے باپ نے اس شوق کو جوش جوانی پر محمول کرتے ہوئے اس کی طلب پوری کر دی۔ اور اس نے دل میں سمجھ لیا کہ یہ خبط بھی گزر جائے گا۔

بعلم نے جس گرمی اور جوش سے گھوڑ سواری کی تربیت حاصل کرنی شروع کی اس سے سب کو گمان ہونے لگا کہ وہ اگلے تہوار پر ضرور شریک مسابقت ہو گا۔ لیکن سب قیاسات سے اس کے باپ کا قیاس ہی درست ثابت ہوا۔ تہوار سے کچھ مدت پہلے اس کی سرگرمی یکلخت سرد پڑ گئی۔ اور اس انحطاط شوق کے آثار اتنے واضح اور نمایاں تھے کہ ہر شخص تاڑ گیا۔ اس کے باپ نے بعلم سے اس امر کا ذکر کئے بغیر سمجھ لیا کہ گویا مدعا حاصل ہوا چاہتا ہے۔ یہ اچھا ہوا کہ اس کا خبط دور ہو گیا ہے۔ اب وہ یکسوئی سے کہانت کی تربیت حاصل کر سکے گا۔ لیکن کوئی شخص بھی اس سردی کا سبب معلوم نہ کر سکا۔ بعلم اپنے راز کسی پر فاش نہ کرتا تھا۔ اس کا کوئی دوست و رازداں نہ تھا۔ وہ اپنا دوست آپ ہی تھا۔ اس کے علاوہ اس کے خیالات کچھ ایسے انوکھے اور عجیب تھے کہ سوائے اس کے اور کوئی ان کو سمجھ بھی نہ سکتا تھا۔ وہ پھر تنہا اور خاموش رہنے لگا۔ اور اس کے خاموش چہرے سے بخوبی اندازہ ہو سکتا تھا کہ اس کے اندر کوئی نئی چیز پرورش پا رہی تھی جس نے ابھی تک کوئی متعین صورت اختیار نہ کی تھی۔

ان دنوں اہل فتورا اور نواحی بستیوں میں عوریب کے قتل کا چرچا ہر جا پھیلا ہوا تھا۔ جہاں چار آدمی مل بیٹھتے اسی بات کا ذکر شروع ہو جاتا۔ عوریب کی برہنہ لاش ایک روز دریا کے پرے کنارے پائی گئی جہاں ماہی گیروں کی کشتیاں باندھی جاتی تھیں۔ نعش پر نہ تو ضرب کا کوئی نشان تھا نہ گلا گھونٹنے کا۔ اگر وہ ڈوب گیا تھا تو اس کی لاش کنارے کیسے لگی اور اس کے کپڑے کیا ہوئے؟ ان قیاسات کے باوجود کوئی شخص بھی حتمی طور پر نہ بتا سکتا تھا کہ وہ کیونکر [illegible]۔ لوگ [illegible] سے محبت کرتے تھے۔ اور اسے اپنا قومی بطل سمجھتے تھے۔ اس لئے وہ اس کی ہلاکت کی ٹوہ لگانے سے باز نہ رہ سکتے تھے۔ ہر شخص کی نگاہ بے اختیار سفیرِ قیم کی جانب اٹھ رہی تھی۔ لیکن کوئی ادھر انگلی نہ اٹھا سکتا تھا۔ وہ ایک قوم کا سفیر تھا۔ اور اس پر انگلی اٹھانے کا مطلب [illegible] موت پر انگلی اٹھانا تھا۔ تاہم لوگ یہ سمجھتے رہے کہ عوریب کی موت کا باعث سفیرِ قیم کا جذبۂ رقابت ہے۔ اس کی بیوی اسی روز کلاس [illegible] دنیا سے [illegible] جس روز کہ اس نے اس کے گھر میں پاؤں ڈالا تھا۔ اور اسی روز سے گویا موت اس کی تاک میں لگ گئی تھی۔

لیکن بعلم اس تجربے [illegible] عوریب کی موت پر متأسف نہ تھا۔ اس کے برعکس گویا اس کے دل سے بوجھ اتر گیا تھا۔ اس [illegible] کا ابتلا ختم ہو چکا تھا۔ [illegible] کشاں کشاں کھینچا جا رہا تھا اس کی زنجیریں ٹوٹ گئیں اور وہ آزاد ہو گیا۔ اور اب وہ [illegible] سمجھنے سے سوچ سکتا تھا کہ اس کی اسیری کی وجوہ کیا تھیں؟ وہ جس دنیا کی جانب کھنچا جا رہا تھا اس کی حقیقت بڑی دردناک تھی۔ اس کا آغاز اگرچہ پرُبہار تھا لیکن اس کا انجام خزاں رسیدہ تھا۔ کیا ایسی دنیا اس کی تمنا اور آرزو بن سکتی تھی؟ وہ حقیقت بے شک چاہتا تھا لیکن ایسی نہیں جس کے ساتھ یہ انجام منسلک ہو۔ عوریب کی موت کا تصور اس کے دل میں وحشت سی پیدا کر دیتا۔ اس کی شہرت اتنی [illegible] قوت و جاہت و دولت ابلتا ہوا عوریب آج فقط اک یاد رہ گیا تھا۔ اس انجام کے باوجود شہرت میں کتنی بے پناہ کشش ہے! اور اس کے باوجود عورت سے محبت کرنے میں کتنی بے پناہ لذت ہے!

[illegible] کے ساتھ اس [illegible] شخص کی سی جھنجلاہٹ پیدا ہو گئی۔ بے یقینی اور متزلزل سے اس کی تلخی بڑھ

بھٹک رہی تھی۔ وہ زندگی کے چوک میں وحشت زدہ اور سراسیمہ کھڑا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ کدھر جائے کیا اس زندگی میں کوئی شے ابدی لذت رکھتی ہے؟ اس زندگی میں کہیں سے ایسی بہار مل سکتی ہے جس کو خزاں کا خدشہ نہ ہو؟

ہیکل کی زندگی اب اسے مرجھائی ہوئی پنکھڑی کی طرح دکھائی دے رہی تھی جس سے تازگی اور بوباس نکل چکی تھیں۔ ہیکل سے باہر کی دنیا خاردار پھولوں کی کیاری تھی۔ یہ دیکھنے میں دلکش لیکن چھونے میں ناگ کا ڈنک تھی۔ اس کی ابتدا سیفر قیم کی بیوی کی خوشی سے چمکتی ہوئی آنکھوں سے ہوتی ہے لیکن اس کا انجام عوریب کی برہنہ نعش ہے جس کی موت کا راز کوئی معلوم نہیں کر سکتا۔ لیکن ـــــ لیکن اس میں اتنی کشش کیوں تھی!

وہ اس سوال کا جواب نہ دے سکتا تھا۔ جب وہ اس دنیا سے منہ موڑنا چاہتا تو اس کے نہاں خانۂ دل سے آواز آتی۔ "اسے مت چھوڑ۔ شبنم کی سی آنکھیں، گھنگھروؤں کی نقرئی جھنکار، چاندنی رات میں دریا کی جھلملاتی لہریں اور سپیدۂ سحر کی سی گداز بانہیں پرفریب نہیں ہو سکتیں؟ اتنی حسین چیزیں تکلیف دہ نہیں ہو سکتیں؟ وہ حسن کے سامنے خمیدہ سر ہونا ہی چاہتا تھا کہ موت کا خوف اسے متزلزل کر دیتا۔ اور وہ اپنے آپ سے پوچھنے پر مجبور ہو جاتا "کہیں میں ڈرپوک اور بزدل تو نہیں؟"

اس کی شاخ زندگی پر کونپل پھوٹ چکی تھی۔ وہ رجعت نہ کر سکتی تھی۔ اس کے احساسات ہیکل سے باہر کی دنیا میں الجھنے کے باوجود اس کے خیالات اور تصورات کو بڑھنے سے روک نہ سکتے تھے۔ وہ بہار بے خزاں کی تلاش کئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ وہ اب ابدی لذت چاہتا تھا۔ ایسی لذت جس کے لئے فنا نہیں، جس کے لئے موت نہیں۔

گھوڑ سواری اس میں پہلی سی تحریک پیدا نہ کر سکتی تھی۔ وہ تحریک ختم ہو چکا تھا جس نے اسے اس پر تیار کیا تھا۔ اب اس فن میں اسے کوئی نئی چیز یا دلچسپی نظر نہ آتی تھی۔

اس نے ابدی لذت کا کھوج ایک روز پا لیا۔ عمون کے حاکم نے شمس کے نئے ہیکل کی تعمیر کا حکم دیا تھا جس غرض کے لئے پہاڑوں سے بڑے بڑے پتھر کاٹ کر کشتیوں میں لاد کر لائے گئے تھے۔ ہیکل دریا کے کنارے بننا تھا جہاں اس کا سایہ اردن کی موجوں میں جھولا کرے گا۔ اس لئے پتھروں کی سلوں کے انبار دہیں لگا دیئے گئے تھے۔ وہ جب اپنے گوشۂ عافیت کو جاتا تو ان پتھر کے انباروں کے پاس سے گذر کر جاتا۔ اور سنگتراشوں کی اس ٹولی کو کام کرتے دیکھتا جو اپنی چھینیوں اور تیشوں سے پتھر چھیلا کئے۔ ایک روز اسے پتھروں کے بے ہنگم انبار سے ایک عظیم صورت ابھری نظر آئی۔ یہ شمس کا مجسمہ تھا جو اپنی گاڑی پر سوار گھوڑوں کو دوڑائے چلا رہا تھا۔ یہ مجسمہ ہنوز نامکمل تھا۔ لیکن اس کی ترتیب و تناسب نے گویا عالم کا دل موہ لیا۔ یہ صورت گری بھی اک سحر تھا۔ اس میں اک کشش تھی جو ایک لحاظ سے ہیکل سے باہر کی دنیا سے زیادہ حسین تھی اور وہ پائداری تھی۔ اس میں مایوسی نہ تھی ہر آن امید تھی۔ مجسمہ کو جتنی دیر چاہے تکتے رہیئے یہ بجلی کے کوندے اور دوشیزہ کے جلوے کی طرح نگاہ سے اچانک اوجھل نہیں ہو جاتا۔ اس میں قرار تھا اور جب کبھی وہ زیر تخلیق ابھرتی ہوئی صورت کو دیکھتا اسے اک سکون اور اطمینان سا دل میں رچتا محسوس ہوتا۔ سنگتراش اپنی چھینی اور تیشہ لئے عدم و وجود کی سرحدوں پر کھڑا عدم کو وجود میں لا رہا تھا۔

اچانک ایک روز اس نے معمر سنگتراش کو اپنے کام میں محو دیکھ کر وہ راز پا لیا۔ جب اس نے بوڑھے سنگتراش کی پیشانی سے پسینے کے قطرے ڈھلکتے ہوئے ابروؤں پر اور ابروؤں سے اس کی سفید داڑھی میں گرتے دیکھے تو اس پر عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ سنگتراش کے قریب کھڑا تھا لیکن وہ اس کی موجودگی سے قطعی غافل اپنے کام میں فنا تھا۔ وہ ایسی نگاہوں سے پتھر میں ابھرتے ہوئے نقوش کو دیکھ رہا تھا جو پتھر کو نہیں بلکہ کہیں اور دیکھ رہی تھیں۔ نقوش صورت اختیار کر رہے تھے اور صورت میں زندگی رچ رہی تھی۔ اس عمل خلاقی میں عظمت بھی تھی اور حقیقت بھی اور اس عظمت و حقیقت کی لمس اس کا سارا وجود محسوس کر رہا تھا۔

وہ آہٹ پیدا کئے بغیر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کو یہ راز معلوم ہو گیا تھا کہ آدمی دیوتا بن سکتا ہے۔ لیکن صلاحیت تخلیق سے۔ آدمی کے خیالات میں ایسی قوت تھی جس کے سامنے آسمانوں کے طوفان ہیچ تھے۔ وہ اس حقیقت کو طلوع سحر کی طرح روشن دیکھ چکا تھا۔ اس نے راہ پالی تھی۔

پتھر کے دیوتا نے اسے وہ کچھ دیا جو گوشت پوست کے دیوتا نہ دے سکے۔ تصویروں میں اسے وہ کچھ نظر آیا جو تصور میں بھی اسے نہ مل سکا۔ اس حقیقت کا جلوہ اسے ہیکل یا اس سے باہر کی دنیا میں بھی دکھائی نہ دیا تھا۔ خیال زیادہ حقیقی، سکون دہ اور لذت بخش تھا۔ جب یہ سانچے میں ڈھلتا ہے تو اس میں جادو پیدا ہو جاتا ہے۔ جب وہ خود تیشہ لے کر پتھروں میں جان ڈالنے لگا تو اسے محسوس ہوا گویا وہ اس منزل کو پہنچ گیا ہے جہاں اس کی روح پہنچنے کے لئے پھڑپھڑا رہی تھی۔ اڑتے ہوئے لمحے یہاں زیرِ دام کئے جا سکتے تھے۔ بہتے ہوئے وقت کو بند لگایا جا سکتا تھا۔ اور حسن کو قرارِ نگاہ بنایا جا سکتا تھا۔ یہیں سچائی تھی، یہیں کمال تھا اور یہیں حقیقت تھی۔

بہت جلد وہ اس فن کی گہرائیوں میں اتر گیا۔ اس کی ذہانت ذوق و شوق سے رواں دواں بڑھی جا رہی تھی۔ وہ تخلیق کے مفہوم سے آشنا ہو رہا تھا۔ اس کو معلوم ہو گیا تھا کہ تصور کیونکر تصویر میں ڈھلتا ہے۔ حقیقت کیسے مجاز کا پیراہن پہنتی ہے۔ پھر اس نے امولک کا مجسمہ بنانا شروع کر دیا۔ جو کھیتی کا دیوتا تھا اور جس پر اپنی عزیز اولاد بھینٹ چڑھائی جاتی تھی۔ بعلم نے اس پر اپنی جان بھینٹ چڑھانی شروع کر دی۔ اس تخلیق کے دوران میں اس پر منکشف ہوا کہ تصویروں میں رنگ اور مجسموں میں جان ان کی اپنی نہیں ہوتی یہ خلاقوں کا خون اور انہی کی جان ہوتی ہے۔ جب امولک کی ہستی کا تصور اس کے ذہن میں پرورش پا رہا تھا تو وہ شب و روز یوں بے قرار رہتا گویا اس کی روح پگھل رہی ہے۔ اس کے چہرے کا رنگ روز بروز زرد پڑنے لگا اور وہ ہر وقت یوں کھویا کھویا سا رہتا ہے گویا وہ غریب الوطن پرندہ ہے جو اپنے وطن کو لوٹنا چاہتا ہے۔ خیالات کے سیلاب اس کے اندر اٹھتے لیکن ان کو نظم میں باندھنا جنگلی درندوں کو پالتو بنانا تھا۔ اور جب وہ ایک سلک میں بندھ گئے۔ ان میں نظم و ترتیب اور ہم آہنگی آگئی تو وہ یوں سبک اور تازہ دم ہو گیا جیسے وہ گہری نیند سے بیدار ہوا ہے۔ اب اس کے خیالات عدم سے وجود کے کنارے پر آن لگے تھے۔ امولک نے اس کو اپنی ذات و صفات سے آگاہ کر دیا تھا۔ اب اس کو اس کا جلوہ دوسروں کو دکھانا تھا۔ وہ اس عظیم کام میں منہمک ہو گیا۔ صبح سے لے کر شام تک وہ اپنے کام میں ڈوبا رہتا۔ یہاں تک کہ اہلِ فتورا اسے خبطی اور جنونی سمجھنے لگے۔ لیکن جس کام کا بیڑا اس نے اٹھایا تھا کہ سرزمینِ مدین کا ہر فرد اس کے سامنے تعظیم سے سرنگوں ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ وہ دیوتا دل کا چہیتا ہو گیا۔ وہ دنیوی اغراض سے لاپروا اور بدنی خواہشات سے مستغنی ہو گیا تھا۔ جب وہ تیشہ ہاتھ میں لئے پتھروں کے ٹیلے پر کھڑا ہوتا تو اس کی بھوک پیاس شہوت سب مٹ جاتیں۔ وہ خاک کی خواہشات سے بلند ہو جاتا۔ لیکن جب وہ تھک کر خاستانے بیٹھ جاتا تو معاً اسے خیال گزرتا۔ وہ کیا کر رہا ہے؟ وہ کہاں جا رہا ہے!

جب وہ بازاروں میں سے گزرتا تو اہلِ فتورا تعظیم سے اس کے لئے راستہ چھوڑ دیتے۔ خود اس کا باپ اس کو نئی محبت اور تعظیم بھری نگاہوں سے دیکھنے لگا تھا۔ اس سے اس کو اک گونہ تسکین اور خوشی سی ملتی۔ مگر ابدی لذت میں تھکاوٹ کا احساس بھی ہوتا ہے؟ پھر کیوں کبھی کبھار اس کے اندر یہ پکار سنائی دیتی ہے۔ تو کیا کر رہا ہے؟ تو کہاں جا رہا ہے؟ کیوں کبھی کبھار جب وہ ستانے کے لئے لیٹتا تو وہ یوں محسوس کرتا گویا وہ اپنا سب کچھ امولک کی بھینٹ چڑھا بیٹھا ہے اور اب وہ بالکل خالی ہو گیا ہے۔ بالکل خالی۔ اس بھینٹ سے اس کی روح و زندگی کے سوتے پھوٹنے چاہیئے تھے نہ کہ بند ہونے چاہیئے تھے۔

ایک دن وہ اپنی کارگاہ کی جانب اپنے خیالات میں گم جا رہا تھا کہ ایک آواز نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ بعلم بعور کے بیٹے۔ بعلم بعور کے بیٹے۔ اس پکار نے اسے خیالات کی مستی سے جھنجھوڑ کر جگایا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک سفید ریش بڈھا اس کے پیچھے تیز تیز قدم اٹھاتا چلا آ رہا تھا۔ یہ کون ہے میرے سلسلۂ خیالات کو توڑنے والا؟ بعلم نے خشمگیں نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے دل میں کہا۔ لباس سے ظاہر تھا کہ پکارنے والا بادیۂ مدین سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ غالباً کوئی چرواہا تھا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ تم میری پکار سے ناراض ہو گئے؟ اس فقرے نے بعلم کے دل کو دھو دیا۔ اس نے اپنے چہرے کی شکنیں صاف کرتے ہوئے کہا: نہیں نہیں۔ کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟

[illegible] کی طرف اٹھ گیا۔ وہ بار جو اس [illegible] یہ ادنیٰ زمیت میں صرف بیش قیمت ہی نہ

تھا بلکہ متبرک بھی تھا۔ یہ صیہونیت رو دا ں سلطنت کا نشان بھی تھا۔ بوڑھے نے چنے ہوئے موتی اس کے ہاتھ میں دے دیئے۔ لیکن بعلم خوف و حیرت سے ہکا بکا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ خوف سے اس لئے کہ اگر وہ مار نہ ملتا تو کیا ہوتا؟ اور حیرت سے اس لئے کہ یہ بعدی ان دو دانی کون تھا جو ایسے قیمتی موتی لوٹا رہا تھا؟ بوڑھے کے چہرے پر بدستور مسکراہٹ تھی۔ وہ نرم و ملائم آنکھوں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے پوچھا "تم میری طرف حیرت سے کیوں دیکھ رہے ہو؟ کیا یہ تمہارے موتی نہیں؟"

بعلم نے کہا۔ "میں حیرت ہوں تم کون ہو؟ ایسے بیش بہا موتی لوٹانے والے جب کہ مدین کی ہر شاہراہ رہزنوں سے اٹی پڑی ہے؟"

بوڑھے کی نرم و ملائم آنکھوں میں چمک سی آگئی تھی اس نے مسکرا کر کہا "ضرور کہیئے، ہر چیز سیاہ نہیں ہوتی"۔

بعلم نے کہا "لیکن اندھیری رات میں سفید چیز بھی سیاہی مائل ہو جاتی ہے"۔

بوڑھے کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی۔ اس کی آنکھوں سے اضطراب جھلکنے لگا۔ اس نے جواب دیا "تم سچ کہتے ہو لیکن اس سیاہی سے سفید کی سفیدی قطعی متاثر و ملوث نہیں ہوتی ہے۔ اس فانی دنیا کا ساحل اس کے لئے بے شک باعث کشش ہے جو اسی زمین کی زندگی کو اپنی زندگی کا آغاز و انجام تصور کرتا ہے۔ لیکن اس کے لئے کیسے فریب دہ ہو سکتا ہے جو اس زندگی کو عارضی جائے قرار سمجھتا ہو۔ جس کی نگاہیں دریاؤں کی بجائے کہیں دور لگی ہوں"۔

بعلم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اسے یک بیک مانوس اور فرسودہ ماحول میں ایک نئی چیز نظر آ گئی تھی۔ اس نے بوڑھے سے پوچھا "میں تمہارے لئے کچھ کر سکتا ہوں؟"

"ہاں" بوڑھے نے سکون سے جواب دیا۔ "اپنے موتی گن کر بار میں پرو لو"۔

اگرچہ یہ واقعہ ایسا نہ تھا کہ بعلم اس کو اپنے حافظۂ ذہن میں خاص جگہ دیتا۔ وہ اپنے کام میں اس قدر مگن تھا کہ اسے کسی طرف توجہ دینے کی سدھ بدھ ہی نہ تھی۔ تاہم جب کبھی وہ اسے یاد آتا وہ اس کی بصیرت پر ضرور تعجب کرتا۔ وہ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بجلی کی کوند تھا۔ لیکن نہ تو اندھیرا اچھا تھا نہ بجلی کی کوند۔ اس کے لئے اچھا صرف اپنی بیزاری تھی۔ اس کی تخلیق جوں جوں تکمیل کے قریب آ رہی تھی اس کی باطنی بیزاری بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ لیکن وہ ایسے مقام پر پہنچ چکا تھا جہاں سے پلٹنا ہرگز نہیں جا سکتا تھا۔ بعض اوقات وہ اپنے سے کھل کر سوال کرتا۔ "تو نے اس خلاقی سے کیا پایا؟" تو اسے اس کے سوا کوئی جواب نہ ملتا کہ تصور کی تصویر کشی۔ خیال کو محسوس کے سانچے میں ڈھالنے کی مہارت۔ لیکن جب وہ تصویر کا پردہ اٹھا کر تصور میں جھانکتا تو اسے سوائے خلا کے کچھ دکھائی نہ دیتا۔ جب وہ حسن کے ابر کو ہٹا کر خیال کے سانچے کو ٹٹولتا تو وہ بالکل خالی ہوتا۔ پھر وہ اس شخص کی طرح محسوس کرتا جس نے محنت سے چھت کا ٹپکا بند کیا ہو لیکن جب وہ چھت سے نیچے اترے تو ٹپکا بدستور لگا پائے۔ تو گویا اس نے بس صنعت کاری ہی سیکھی تھی حقیقت نہ پائی تھی؟ وہ ماہر فن ہونے کے باوجود ان سوالوں کا جواب نہ دے سکتا تھا کہ دنیا کے سب انسان کس لئے اتنا ہنگامہ برپا کر رہے تھے؟ اور اس انبوہ آدم میں اس کے وجود کا مقصد کیا تھا؟ اس نے دیکھ لیا کہ وہ اس حد سے ایک قدم آگے نہ بڑھا تھا جس پر وہ ہیکل کے اندر بیٹھا بعل معبود کی مناجاتیں پڑھتا اور اس کے سامنے قربانیاں چڑھایا کرتا تھا۔

ایک دن جب کہ اموک اپنا منہ پھاڑے اس پر جھکا ہوا تھا اور وہ اس کے پاؤں کی موٹی موٹی انگلیوں کی نوک پلک درست کر رہا تھا کہ اس نے اپنے پیچھے کسی کے کھنکارنے کی آواز سنی۔ اس نے مڑ کر دیکھا وہی بوڑھا اس کے پیچھے کھڑا اپنی نرم و ملائم آنکھوں سے اس کو دیکھ رہا تھا جس نے اس روز اس کے گرے ہوئے موتی چن کر دیئے تھے۔ بعلم نے اپنا تیشہ رکھ دیا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ اور اس کا چہرہ کامیابی کی خوشی سے چمک رہا تھا۔ چند ہی روز بعد جب یہ بت مکمل ہو جائے گا تو رو سائے مدین اس ہیکل میں نصب کرنے کے لئے آئیں گے۔ تہوار منایا جائے گا۔ اور اسے اپنا قومی بعل تسلیم کیا جائے گا۔ مدین کے گوشے گوشے میں اس کی صنعت کاری کے چرچے پہنچ چکے تھے۔

بوڑھے نے بعلم کی جانب ملائم لیکن بت کی جانب کرخت نگاہوں سے دیکھا۔ بعلم کو اس کی یہ حرکت سخت ناگوار گزری۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ بوڑھے نے نہ تو بت کے سامنے کوئی مناجات پڑھی تھی نہ اس کے سامنے زمین بوس ہوا تھا۔ اس نے سمجھ لیا کہ یہ بوڑھا ضرور کوئی بے دین ہے جیسا کہ مدین میں بے دینی کی ایک بدذاتی پھیل رہی تھی جس کا بانی مرباب نامی ایک گمراہ کاہن تھا۔

بوڑھے نے اچانک پوچھا۔ "اچھا تو اس اہرمنک سے تجھے کیا ملا؟"

بعلم نے تیزی سے جواب دیا۔ "اطمینان قلب"

بوڑھے نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ "واقعی ایسا کہتے ہو؟"

اگرچہ بعلم دل ہی دل میں جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے لیکن اس نے بہ تکرار و اصرار یہی جواب دیا۔ بوڑھے نے اس کی جانب دیکھا اور اس سے پھر پوچھا۔ "اہرمنک نے تمہیں زندگی کے معنی بتائے ہیں؟ تم یہاں کیوں پھینکے گئے ہو؟"

"ہاں" بعلم نے جواب دیا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اسے کبھی نہ اہرمنک نے، نہ بعل نے، نہ شمس نے بلکہ ان پجاریوں نے ان عقدوں کا حل سمجھایا تھا۔ وہ اکثر اپنے نہاں خانۂ دل میں سوچا کرتا تھا کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور اس کو کہاں جانا ہے؟ زندگی کا مآل کیا ہے؟ یہ دکھ درد رنج و الم کس لئے ہیں؟ لیکن وہ ان کی کوئی معقول توجیہہ کبھی بھی معلوم نہ کر سکا۔ اس نے جتنے بھی مناہج زندگی اختیار کئے تھے وہ سب دل بہلاوے تھے۔ ابھرتے ہوئے درد کو دبانے والے تھے۔ ان کا علاج نہ تھے۔

بوڑھے نے اشتیاق سے پوچھا۔ "وہ کیا ہیں؟ مجھے بھی بتا سکتے ہو؟ میری زندگی اپنی معانی کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئی ہے۔"

بعلم نے کہا۔ "ہماری یہ دنیا دیوتاؤں کی مثالی دنیا کا پرتو ہے۔ اور ہماری زندگی کا مقصد اس پرتو سے اس حقیقت کو معلوم کرنا ہے۔"

بوڑھے نے پوچھا۔ "میں یہی تو پوچھ رہا ہوں کہ تم جو اس پرتو میں اپنا آپ محو کئے ہوئے ہو تمہیں حقیقت معلوم ہوئی؟ وہ کیا ہے؟"

بعلم کی زبان لڑکھڑائی۔ اس نے یہی بات سینکڑوں بار دہرائی تھی لیکن اس پر یہ حقیقت کبھی منکشف نہ ہوئی تھی کہ یہ بڑے بڑے الفاظ بالکل بنجر اور ویران تھے۔

بوڑھے نے آہستہ سے کہا۔ "حقیقت وہ ہے جو زندگی کے پرخار جنگل میں تمہاری اس طرح رہبری کرے کہ تمہارے پاؤں میں ایک کانٹا بھی چبھنے نہ پائے اور تم سلامتی سے پار پہنچ جاؤ۔"

"اس کی علامت؟" بعلم نے سوال کیا۔

"جس طرح بدن صحیح علاج سے صحت محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح دل حقیقت پا کر اطمینان محسوس کرتا ہے۔"

بعلم اس کو الجھانا چاہتا تھا۔ لیکن وہ محسوس کر رہا تھا کہ اپنی سوالات کے آئینے میں وہ اپنی بے بضاعتی اور اپنی شکست دیکھ رہا تھا۔

اس نے کہا۔ "یہ ظاہر ہے کہ تم آباء اجداد کی روایات سے باغی ہو لیکن تم بتا سکتے ہو کہ اس گمرہی میں تم نے کیا حقیقت پائی ہے؟"

بوڑھے نے مسکرا کر کہا۔ "بیٹے طیش میں مت آ۔ میں جویائے حق ہوں۔ اگر میری بات کی تصدیق تمہارا دل نہ کرے تو مجھ کو ترک کر دے۔ لیکن اگر وہ اس پر صاد کرتا ہے تو مجھ سے وہ حقیقت قبول کرے۔"

بعلم [illegible] بوڑھے نے کہا۔ "حقیقت بس اتنی ہے کہ ہم اس خدا کی رضا بجا لائیں [illegible]"

[illegible]

بوڑھے نے [illegible] سے جواب دیا۔ "اس شخص کے ذریعہ جس پر خدا اپنی رضا منکشف کرتا ہے۔"

[illegible]

بوڑھے نے [illegible] کہا۔ "[illegible] زندگی ہے۔"

[illegible] اٹھ کھڑا ہوا۔ چلتے ہوئے اس نے کہا۔ "میرا نام زاحویل ہے۔ میں تو ایک غریب گڈریا ہوں۔"

[illegible] نے سپے دینی کی نئی تحریک کے متعلق سن رکھا تھا کہ اگرچہ اس کے پیرو کم تعداد اور ضعیف تھے لیکن ان کا قائد اعلیٰ نسب اور کریم تھا۔ ان کی

بلعم بن بعور

آواز اگرچہ پست تھی لیکن وزنی تھی۔ اور اپنے اندر آہنی منطق لئے ہوئے تھی۔ کوئی ان کے اعتراضات کا جواب نہ دے سکتا تھا۔ اور یہی ایک بڑی وجہ مخاصمت تھی۔ وہ تحریک زندگی کی کلی اصلاح چاہتی تھی لیکن ان کے اہم مطالبات دو تھے۔ ساری زندگی کا تہذیبی وتمدنی مرکز خدائے خالق ہونا چاہیئے جس کے کوئی مثل نہیں۔ دوسرے زندگی کے معاملات اس عدل وانصاف پر مبنی ہونے چاہئیں جس کا معیار خدائے ہادی نے مقرر کردیا ہے۔ یہ دعوت کہانے خود بلعم پر کشش تھی۔ لیکن اپنے آباء واجداد کی روایت کسی انقلابی جذبے سے شکست توڑ پھوڑ کے پھینک دینا کہاں کی دانش تھی۔ مدت ہائے دراز کی محنت سے تیار کردہ عمارت جنون سے ڈھانے کے لئے تیار ہوجاتا کہاں کی بصیرت تھی۔ بلعم سارے ہیکلوں اور بتوں کو بیوند خاک ہوتے دیکھنے کا تصور نہ لا سکتا تھا۔ کوئی منطق اور کوئی دلیل اسے اس پر آمادہ نہ کرسکتی تھی۔ اور اس تحریک کو کچلنے کی کوشش اس کے نزدیک عین فطری اور مناسب تھی۔

اس کے باوجود وہ اس نظریے کی جانب کھچے بغیر نہ رہ سکا۔ اور اس کی دو وجوہ تھیں۔ ایک تو اس نظریے کی وسعت دوسرے خود اس کا باطنی خلا۔ جب کبھی وہ اموک کے سامنے بیٹھتا یا کام سے فارغ ہوتا تو وہ محسوس کئے بغیر نہ رہتا کہ اس کی محنت اسے کوئی اجر نہیں دے رہی ہے۔ اس پر تہ ماری اور عرق ریزی سے اسے سوائے چابک دستی اور نقوش کے لئے تیز آنکھ کے اور کچھ نہیں ملا تھا۔ جبکہ اس کا دل روز بروز کھوکھلا اور جذبات سے عاری ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی بیزاری اور وحشت بڑھ رہی تھی۔ وہ کوئی سہارا چاہتا تھا لیکن نہیں ملتا تھا۔ اس نظریے میں اسے ایک نئی وسعت اور ایک نیا سہارا نظر آرہا تھا۔ اس میں روح کی تازگی وتسکین کے سب سامان تھے۔ یہاں اس کو اپنے سب سوالوں کا حل ممکن دکھائی دیا۔ یہاں اطمینان قلب بھی تھا۔ کیونکہ یہاں دل کے اٹکاؤ کے لئے متعدد خدا نہ تھے صرف ایک خدا تھا۔ وہ معروض نہ تھا غائب تھا اس لئے ذوق وشوق کے لئے میدان بے کراں تھا۔ یہاں یکسوئی تھی انتشار نہ تھا۔ وہ اپنی طبیعت کے رخ کو مڑتے نہ دیکھ سکا۔ لیکن اچانک یک روز لاوا پھٹ پڑا۔ اس کے دل میں بت کے خلاف اک نفرت سی پیدا ہوگئی۔ جب اس نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو اس کے دل میں ایک وحشت اور بیزاری سی ابھر آئی۔ اس کی چری باچھیں اس کے رخساروں کی ہڈیوں تک پہنچی ہوئی تھیں۔ وہ منہ پھاڑے لمبے لمبے دانت اور سرخ زبان نکالے اس کو کھا جانے کے لئے غرا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر اس کا دل بے اختیار اس سے گویا ہوا "تو یہ وہ فن کاری ہے جس کے لئے اتنے برس کھوئے؟"

یہی تھی! وہ دل ہی دل میں اپنے آپ سے نفرت کرنے لگا۔ وہ انسانوں کی بستیوں سے نکال دیا گیا تھا۔ وہ پتھروں کا سنگی تھا کیونکہ انسان نہ سمجھتے تھے۔ کل اس نے پالکی میں ایک لڑکی کو بیٹھا دیکھا۔ اس کی نظریں بے اختیار اس کی جانب اٹھ گئیں۔ وہ حسن سراپا تھی۔ دیکھا لیکن جلدی سے نگاہیں ہٹا کر دور دیکھنے لگی۔ اس نے دیکھا صرف وہی نہیں ہر راہ گیر اس پالکی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ کیا چیز اپنی طرف کھینچ رہی تھی؟ اس کے گزر جانے کے بعد اس نے اپنے دل میں اک درد سا محسوس کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ لیکن اس نے نہ دیکھا۔ اس کا دل کڑھنے لگا۔ کیا وہ قبیح صورت تھا؟ کیا وہ قابل نفرت تھا کہ اس نے اس کی طرف عظیم الشان خدمت اسی کے ہاتھوں انجام پا رہی تھی۔ اور اب جبکہ وہ لڑکی کی صورت دل میں نقش کئے ہوئے اموک وہ محسوس کر رہا تھا کہ دیوتا وہ تھی نہ کہ یہ بھیانک شکل پتھر۔

اس نے تیشہ ہاتھ سے رکھ دیا اور دریا کی جانب چل دیا۔ اس کے دل میں کشمکش متلاطم تھی۔ وہ حقیقت سے بہت دور جا چکا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا وہ گمراہ ہوچکا ہے۔ اور اگر اسے اپنی زندگی عزیز ہے تو پلٹنے کے لئے ضرور چارہ کرنا چاہیئے ورنہ وہ یہیں ڈھیر ہوجائے گا۔

وہ تنہائی محسوس کر رہا تھا۔ اس کا کوئی دوست غمخوار نہ تھا۔ کوئی اس کا دستگیر نہ تھا۔ اس کی ماں مرچکی تھی۔ اس کا بھائی نہ معلوم کہاں چلا گیا تھا۔ اس کا باپ اپنی سرمستیوں اور رنگ رلیوں میں گم تھا۔ کوئی اس پر دست شفقت پھیرنے والا نہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ اپنی سسکیوں

کو ضبط نہ کر سکا۔ اس نے اپنے ہاتھ بلند کر کے خداؤں کے خدا کو پکارا۔ اور یہ وہی خدا تھا جس کا ذکر زاگریل بھروا سے کیا تھا۔

"میرے خالق، جس کو میری آنکھوں نے نہیں دیکھا مگر جس کی موجودگی میں اپنے دل میں پاتا ہوں، مجھے بچا لے"

اور اس کے خالق نے اس کو واقعی بچا لیا۔ اس نے ایک نظر فشورا پر ڈالی اور چل دیا۔ شہر کی پھیلی ہوئی بستی اور کھجوروں اور زیتون کے جھنڈوں کے اوپر بعل فعور کا ہیکل ابھرا ہوا تھا جس روز امورک کا عظیم الشان بت نصب کیا جانے والا تھا۔ وسلنے مدین کی آمد آمد تھی اس روز سارا شہر امورک کے بیٹے کو ڈھونڈ رہا تھا۔ لیکن وہ کہیں نہ ملتا تھا۔ اس کا باپ تو کئی دنوں کا جانتا تھا کہ اس کا یہ بیٹا بھی بڑے بیٹے کی طرح اسے داغ مفارقت دے کر چلا گیا ہے۔ لیکن اسے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کونسی ساحرہ تھی جس نے اسے پھسلا لیا۔

دریائے اردن کے کنارے پھیلی ہوئی پہاڑیوں میں ایک چرواہے نے ایک روز ایک شخص کو دیکھا جس کی لہردار تل چگی داڑھی تھی۔ اس کی لٹیں اس کے شانوں پر لٹک رہی تھیں۔ اس کا لباس بوسیدہ اور جابجا پھٹا ہوا تھا۔ وہ ایک چٹان پر لیٹا ہوا آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دوسرے دن اس نے اسے دریا کے کنارے مراقبے میں غرق پایا۔ تیسرے روز وہ ایک کھوہ کے گرد ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔ معاً چرواہے کو خیال آیا۔ یہ کہاں سے کھاتا پیتا ہوگا؟ یہ ضرور کوئی پہنچا ہوا شخص ہے۔ اس خیال کے ساتھ وہ ڈرتا ڈرتا اس کے قریب آیا۔ مگر اس شخص نے اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ وہ کچھ دیر کھڑا رہا پھر وہ بصد ادب بولا۔ "اے بزرگ۔ تو بکری کا تازہ دودھ قبول فرمائے گا"

بزرگ ٹہلتے ٹہلتے رک گیا اور اپنی یکسوئی میں خلل ڈالنے والے کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھا۔ وہ ایک جواں سال، معصوم صورت گڈریا تھا جس کا چہرہ خوف اور ادب سے جھکا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر اس کی نگاہوں میں ملائمت آگئی۔ اس نے کہا "اچھا لے آ"

دوسرے دن گڈریے نے درختوں کی ٹہنیاں ادھر ادھر سے اکٹھی کر کے اس کے لئے ایک چھپر سا بنا دیا تاکہ وہ سردی اور دھوپ سے یہاں پناہ لے سکے۔ لیکن وہ بزرگ اپنی آسائش و آرام سے قطعی لاپروا تھا۔ اس کا لباس یہاں تک پھٹ چکا تھا کہ اس کی ابھری ہوئی ہڈیوں والا جسم جابجا سے دکھائی دے رہا تھا۔ جب چرواہے نے اس کو ایک فرغل پیش کیا تو اس نے حقارت سے اسے پرے پھینک دیا۔ گویا اسے دنیا اور اس کی ہر چیز سے حتیٰ کہ اپنے جسم و جان سے بھی نفرت تھی۔

اس کی عادات عجیب و غریب تھیں۔ گڈریے نے کسی شخص کو ایسی حرکتیں کرتے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ اکثر آسمان کی جانب نظریں اٹھائے بڑبڑاتا رہتا تھا۔ پھر وہ دریا کے کنارے اور پہاڑوں کے خشک پتھروں پر سر جھکائے یوں پھرنا شروع کر دیتا گویا وہ کسی کھوئی ہوئی چیز کو ڈھونڈ رہا ہے۔ بعض اوقات وہ ننھے منے کوڑوں اور ٹڈیوں کو ٹکٹکی باندھ کر گھنٹوں دیکھتا رہتا۔ پھر زور کا قہقہہ لگاتا اور سنجیدہ ہو جاتا۔ چرواہا اس کے لیے باقاعدہ دودھ اور کھجوریں لاتا۔ اگر اسے شہد کی ضرورت ہوتی تو وہ بھی بہم پہنچا دیتا۔ اور اس کی خدمت گذاری سے چرواہے کو اک گونہ مسرت سی ہوتی جس کا احساس اس بزرگ کو بھی تھا۔ جب وہ اس کے لئے دودھ کا آبخورہ لاتا تو اس کے چہرے پر ایسی معصوم اور بے غرض خوشی جھلکتی کہ وہ بزرگ اس پر رشک کئے بغیر نہ رہتا۔

ایک دن چرواہا دودھ کا آبخورہ اس کے سامنے رکھ کر چپ کھڑا ہو گیا گویا وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ بزرگ نے اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا اور پوچھا۔

"کہو، کیا کہتے ہو؟"

اس کا چہرہ پر غم تھا۔ اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "دیوتاؤں کے مقبول! میری ماں تین برس سے مفلوج ہے۔ اس کی حالت مردوں سے بدتر ہے جب میں ریوڑ کے چرانے جاتا ہوں تو کوئی اس کی نگہداشت کرنے والا بھی نہیں ہوتا۔ تو اک بار اس کے بدن پر اپنا دست مبارک پھیر دے گا تو وہ بھی چنگی ہو جائے گی"

بزرگ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بیم و رجا سے مضطرب سر جھکائے زمین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بزرگ نے کرخت لہجے میں کہا "میں دیوتاؤں کا مقبول نہیں، ان کا مغضوب ہوں۔ میرا تعلق صرف ایک خدا سے ہے اور کسی سے نہیں۔"

چرواہا اس بات کا مطلب سمجھے بغیر پھر گڑگڑا کر بولا "تیرے منہ میں آسمانی شہد، تیری زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ میرے لئے تقدیر ہے۔ میری مراد بر لا۔" بزرگ اس کی حماقت پر دل ہی دل میں ہنسا۔ وہ سمجھ گیا کہ وہ نادان ہے اور اس کے ساتھ زیادہ قیل و قال عبث ہے۔

"تو تو مجھ سے کیا چاہتا ہے؟"

"بس اک بار اس کے مفلوج اعضا پر اپنا دست مبارک پھیر دے۔" اس نے لجاجت سے زمین بوس ہوتے ہوئے کہا۔

"اگر اس کے باوجود وہ صحت یاب نہ ہوئی؟"

چرواہے نے صرف اتنا جواب دیا۔ "وہ صحت یاب ہو جائے گی۔"

"اچھا اسے لے آ۔"

جب اس کا بیٹا اسے بزرگ کے سامنے لایا تو وہ اسے دیکھتے ہی پکار اٹھی "یہی وہ ناجی ہے جس کو میں نے خواب میں دیکھا تھا۔ میرے ناجی، مجھ پر شفقت کر۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا سر اس کے سامنے جھکا دیا۔ بزرگ دل ہی دل میں ان کی حماقت پر ہنسا۔ اس نے اس کے سر کو خاک سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"مجھ کو بتا فالج کہاں گرا تھا؟"

"یہاں" عورت نے اپنی دائیں جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "جسم کی ساری دائیں جانب۔ سر سے پاؤں تک۔"

بزرگ نے دیکھا عورت کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ لیکن وہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا "تو یہ ہے دیوتاؤں کی تخلیق خاص۔" پھر اس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ عورت خوشی سے چلائی۔ "ہاں یہیں سے مرض شروع ہوا تھا۔"

بزرگ اپنا ہاتھ اس کے شانے تک لے جا کر رک گیا۔ لیکن عورت بے تابی سے چلائی "میں صحت یاب ہو رہی ہوں۔" پھر اس کا ہاتھ اس کے سینے سے گزرتا ہوا پیڑو تک آ گیا۔ عورت نے آہستہ سے اٹھنے کی کوشش کی۔ جب اس کا ہاتھ اس کے پاؤں تک پہنچ گیا تو وہ بغیر کسی سہارے کے اٹھ بیٹھی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ سچ مچ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں "میرے ناجی میں بھلی چنگی ہو گئی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ اس کے پاؤں سے لپٹ گئی اور سسکیاں بھرتے ہوئے انہیں چومنے لگی۔

دوسرے دن جب وہ اپنے مراقبے میں غرق تھا کہ کسی کی لکڑیاں ٹیک ٹیک کر چلنے کی آواز آئی۔ ایک لنگڑا دو لکڑیوں کے سہارے اس کی جانب چلا آ رہا تھا۔ جب بزرگ نے اپنا سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو وہ دور سے پکارا "تعل شعور کے چہیتے، مجھ پر ترس کھا۔" لیکن بزرگ نے اس پر قہر آلود نگاہ ڈالی اور اٹھ کر پہاڑیوں کو چل دیا۔ وہ اس کی پکار سن رہا تھا "میرے ناجی، مجھ پر رحم کر، اے ہیولیٰ انتشار میری مراد بر لا۔" لیکن اس نے پلٹ کر دیکھنے کی بجائے اپنے قدم تیز تر کر لئے۔

"یہ کیا مصیبت ہے!" اس نے جھنجلا کر کہا۔ "میں جس گھنجٹ سے بھاگنا چاہتا تھا اسی میں پھر دھنس رہا ہوں۔" لیکن دل ہی دل میں وہ کل کے خرق عادت پر متعجب ہو رہا تھا۔ کیا واقعی وہ میرے ہاتھ پھیرنے ہی سے شفایاب ہوئی؟ ناممکن! ناممکن!! "لیکن وہ واقعی بغیر کسی سہارے کے اس کی آنکھوں کے سامنے چلتی ہوئی گھر گئی تھی۔

"لیکن اس سے میں نفس کے دھوکے میں مبتلا ہو رہا ہوں۔ یہ خدا کا دست کرم تھا جسے لوگ غلطی سے میرا ہاتھ سمجھ رہے تھے۔ بس اس غلط فہمی کو تادیر تو جاری ہوتا دیکھنا چاہتا ہوں اور نہ اسے برداشت کر سکتا ہوں۔"

لیکن ایک دوسری آواز اس کے اندر بولی "تمہارا فرض ان کو سنا دینا ہے۔ ان کے ذہن نشین کرنا تمہارا فرض نہیں۔ اگر وہ اس بات کو نہیں سمجھتے تو

اس میں تمہارا کیا قصور؟ تم اس کارِ خیر کو مت بند کرو۔ اگر تمہارے ذریعے چشمۂ فیض جاری ہوتا ہے تو تم اسے کیوں روک رہے ہو؟"

پہلی آواز پھر بولی "تم زندگی کا مقصد سمجھنے اور سمجھانے آئے ہو، ایسے شعبدے دکھانے تو نہیں آئے؟"

لیکن دوسری آواز نے جواب دیا "اس کارِ خیر سے تمہارے مقصد کو فائدہ ہی پہنچے گا نقصان نہیں پہنچے گا" اتنے میں فریادی کی پکار اس کے کانوں میں پھر گونجی۔ "دیوتاؤں کے مقبول، میرا بھی بھلا کر"۔ اس پکار میں ایسا درد اور ایسی لجاجت تھی کہ اس کو اپنے درشت رویے پر تاسف ہونے لگا۔ ہاتھ پھیر دینے سے میرا کیا بگڑتا ہے! مجھ کو کارِ خیر سے رکنا نہیں چاہیئے۔ خدا کی خوشی انسان کی خوشی میں ہے"۔

لنگڑا اس کے سامنے جھک گیا۔ اس پر بزرگ نے اسے سختی سے منع کیا۔ "یہ سر آدمی کے سامنے نہیں اپنے پیدا کرنے والے کے سامنے جھکنا چاہیئے۔ اور سب فریادیں اسی کے حضور میں کرنی چاہئیں"۔

لنگڑے نے جواب دیا۔ "ہم اس کو تیرے وجود میں دیکھ رہے ہیں"۔

بزرگ نے تیوری چڑھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اور اسے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ اس کی بائیں ٹانگ زخموں سے گل جانے کے بعد لنگڑی ہو گئی تھی۔ وہ اس پر دباؤ نہ ڈال سکتا تھا۔ بزرگ نے بیزاری سے اس کی ٹانگ پر ہاتھ پھیر دیا۔ اور جونہی اس نے ہاتھ پھیر دیا اس نے اپنا پاؤں زمین پر رکھ کر اس پر اپنا بوجھ ڈالا۔ پھر لکڑیوں پر بوجھ ڈالے بغیر پاؤں کے سہارے دو قدم چلا۔ اس کے بعد اس نے لکڑیاں پھینک دیں اور بغیر کسی سہارے کے چلنا شروع کر دیا۔ وہ خوشی سے چلایا۔ "میں تندرست ہو گیا ہوں" یہ کہتے ہوئے وہ دوڑتا ہوا پہاڑی سے نیچے اتر گیا۔

تیسرے دن ایک ننھی سی بچی اس کے سامنے لائی گئی جو فقط ہڈیوں کی مالا رہ گئی تھی۔ وہ لڑکی چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ اس کی ماں اسے بھینچنے اور لوریوں سے بہلانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن وہ کسی صورت بھی نہ بہلتی تھی۔ اس کی ماں نے ایسی ملتمس نگاہوں سے بزرگ کی طرف دیکھا کہ وہ انکار نہ کر سکا۔ جونہی اس نے بچی کے جسم پر ہاتھ پھیرا وہ یوں چپ ہو گئی گویا اس کے جلتے ہوئے بدن پر کسی نے برف رکھ دی ہو۔

چند ہی ایام میں کوڑھیوں، مفلوجوں، لولوں، لنگڑوں، اندھوں اور دیگر ہر طرح کے روگیوں کا تانتا بندھ گیا۔ لوگ پیدل، خچروں، گدھوں، اونٹوں اور پالکیوں پر چلے آ رہے تھے۔ وہ روتے آتے اور ہنستے جاتے۔ بزرگ کے دستِ معجز نما کا چرچا آگ کی طرح گرد و نواح میں پھیل رہا تھا۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا کہ قریب سے گزر جانے والے قافلے بزرگ کی زیارت کے لئے رک جاتے۔ انہی قافلوں کے ایک خچر سوار نے چرواہے کو بتایا کہ یہ بزرگ بعور کا بیٹا بلعم ہے جس نے فتورا کا ادولک بنایا تھا۔ اس سے پہلے لوگ اس کے پاس جانے کے بغیر آتے تھے۔ اب وہ اسے جان کر آنے لگے۔ رفتہ رفتہ انہیں اس کی گزشتہ زندگی کے ایک ایک سانحہ کا علم ہو گیا۔

چرواہا اور اس کی شفایاب ماں اب یہیں اٹھ آئے تھے۔ انہوں نے اس کے چھپرے کے قریب اپنا چھپر ڈال لیا۔ اور بجائے ریوڑ چرانے کے چرواہا ہمہ تن بلعم کی خدمت میں مصروف ہو گیا۔ وہ زائرین کو اس کے قریب جانے سے روکتا۔ اگر ان کی تعداد کثیر ہو جاتی تو وہ اسے اس جگہ اطلاع پہنچا دیتا جہاں وہ اس ہجوم سے چھپا بیٹھا ہوتا۔ یہ جگہ پہاڑ کی ایک کھوہ تھی جہاں سے بہتا ہوا دریا، جھومتے ہوئے سرکنڈے اور دھوپ، دھنک پھیلا ہوا سلسلۂ کوہ اور نیلگوں آسمان تو دکھائی دے سکتے تھے لیکن زمین کا وہ حصہ دکھائی نہ دیتا تھا جہاں چرواہے نے اپنا چھپر ڈال رکھا تھا اور جہاں لوگوں کا ہجوم اس کے انتظار میں جمع رہتا تھا۔ یہ کھوہ بلعم کی عبادت گاہ اور جائے پناہ تھی۔ یہیں بیٹھ کر وہ اپنے باطن کی بساط پھیلا کر اس کا معائنہ کرتا۔ اور یہیں وہ ذکر و فکر کرتا۔ وہ دو وقت اس کھوہ سے باہر نکلتا اور نیچے آتا جہاں کثیر التعداد مریض پہلے سے جمع ہوتے تھے۔ وہ ایک ایک کر کے آتے اور اپنے ماؤف اعضا پر اس کی بخشی گوارا دوا، جسم و سینے پہ ہاتھ پھیر داتے۔ کوئی اس کا ہاتھ چوم کر اپنی پرنم آنکھوں پر لگاتا، کوئی اس کے قدموں کا دامن چومتا اور پکارتا "دیوتاؤں کے مقبول، میری طرف بھی نظرِ کرم کر"۔ کوئی عورت وہ ... اس کے جاتی بعل کے جیتے ... بہت نئے ... میرا بیٹا مجھ کو چھوڑ کر چلا گیا ہے"۔ کوئی کہتا "میں دکھیارا ہوں مجھ پر اپنا فضل کر، اے بزرگ شمس"

اگرچہ ایسے کلمات اس کے قلب حقیقت شناس پر گراں گزرتے تاہم وہ ان کو قطعی روکنے میں ناکام رہا۔ اس لئے اس نے ایسے احمقانہ کلمات کی طرف توجہ دینی چھوڑ دی۔ گاہ گاہ وہ لوگوں کو مجاز کا پردہ اٹھا کر حقیقت کا جلوہ بھی دکھاتا۔ لیکن لوگ پھر اسی کی ذات کا پردہ حقیقت پر ڈال دیتے۔ اس نے عام آدمی کی استعداد فہم کا پوری طرح سے اندازہ کر لیا۔ وہ جان گیا کہ عام آدمی متفردن سے مطلق کی طرف نہیں جا سکتا۔ محسوس سے غیر محسوس کی جانب جانے میں وہ ہچکچاتا ہے۔ وہ غیر محسوس کو محسوس کرنے کی اہلیت سے بے بہرہ نہیں رکھا گیا۔ لیکن اس کی نشو و نما ایسی ہوتی ہے کہ وہ اس کا خوگر نہیں ہو سکتا۔ اس خیال سے اس نے ادھر زیادہ توجہ دینی چھوڑ دی۔

وہ اپنے چشمۂ فیض سے مطمئن تھا۔ جب وہ شفایاب مریضوں کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلکتے دیکھتا تو خود اس کی آنکھیں بھی پُرنم ہو جاتیں۔ جب وہ انہیں تندرست دیکھتا تو اس کے قلب میں ٹھنڈک، سکون اور اطمینان رچ جاتا۔ زندگی کے جس مرحلے پر وہ اب پہنچ چکا تھا۔ وہ اطمینان بخش تھا۔ یہاں سے حیات کا پورا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ زندگی ایک مرکز سے روشنی حاصل کر رہی تھی اور کائنات کی ہر شے اسی سے منوّر ہے۔ اسی نور کی روشنی سے ہر ذی حیات کی شاہراہ زندگی روشن ہوتی ہے۔ جو اس نور سے دیکھتے ہیں وہ فوز و فلاح پاتے ہیں جو اس سے رخ پھیر کر اندھیرے میں سرگرداں ہیں وہ شقی و خاسر ہیں۔

اس طرز زندگی سے وہ اس لئے خوش تھا کہ یہاں مسابقت، جد و جہد اور کشمکش نہ تھی۔ یہاں رشک و رقابت کی جھلس دینے والی آنچ نہ تھی یہ میدان صرف اسی کے لئے تھا بلا شرکت غیرے۔ اس لئے اس کے ذہن میں کوئی خلش یا خلجان نہ تھا۔ اس کے اعصاب پر کوئی دباؤ نہ تھا جیسا کہ اس نے گھوڑ سواری کی تربیت حاصل کرتے ہوئے محسوس کی تھی۔ جب ذہن میں اس زمانے کی یاد آتی تو اس کا دل گھٹنے سا لگتا۔ رشک و رقابت کا تپ سب سے مہلک تپ ہوتا ہے بالخصوص قلب حسّاس کے لئے۔ تب رات دن اس کا دماغ ایک ہی خیال کی دھیمی دھیمی آنچ پر جھلستا رہتا کہ وہ کیونکر پالا جیتے گا۔ اور اگر وہ بازی ہار گیا پھر ــــــ؟ جونہی اس کی توجہ انجام کی طرف پھرتی اس کا پورا وجود اضطراب اور بے چینی سے دکھنے لگتا۔ وہ جب خواہ انجام چاہتا تھا لیکن اضطراب اور بے چینی کی چکی میں پسے بغیر۔ پھر جب اس نے سنگتراشی اختیار کی تب بھی یہی فکر اس کے دامن گیر رہتی۔ دوسرے سنگتراشوں سے پیچھے رہ جانے کا تصور اس کے دل کو گھن کی طرح کھانے لگا۔ اس جانکاہ عذاب سے اسے اس وقت نجات ملی جب اس نے عام ڈگر چھوڑ کر امونک کا بت بنانا شروع کر دیا۔

لیکن یہاں پر ایسی کوئی وجہ خلش نہ تھی۔ یہ میدان صرف اسی کے لئے تھا۔ یہاں نہ تو گھوڑ دوڑ کی طرح وقت کی پابندی تھی نہ کسی کے آگے نکل جانے کا خیال۔ وہ اس شاہراہ کا واحد مسافر تھا اور یہاں اس قسم کی کوئی پابندی یا دباؤ نہ تھا۔ وہ جب اور جتنے وقت میں چاہے اس مرحلے کو عبور کرنے پر وہ مجبور نہ تھا۔

اس میدان کشمکش سے نکلتے ہی اس کی حیثیت بھی بدل گئی۔ وہ جس وادی کا مسافر تھا اس کی بابت اس کے سوا کوئی اور بتا بھی نہ سکتا تھا۔ اس لحاظ سے وہ معلّم بھی تھا۔ وہ دوسروں کو تلقین کر سکتا تھا بغیر اس کے کہ خود اس کا مکلّف ہوتا یا ثانوی حیثیت اختیار کر کے کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرتا۔ یہ حیثیت اس لحاظ سے بڑی لذّت دہ تھی۔ دوسروں کو تلقین و تعلیم کر کے اس کو اک گونہ حظ حاصل ہوتا۔ جب وہ اپنی زبان کھولتا تو مجمع پر خاموشی طاری ہو جاتی۔ وہ اس کو سننے کے لئے سر کے کان نہیں دل کے کان کھول دیتے۔ دریا ساکن اور پرندوں کی چہچہاہٹ تک بند ہو جاتی۔ پھر وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کی تعلیم ان کے عمل میں ظاہر نہیں ہو رہی تھی۔ کیا قصور اس کی تعلیم میں تھا یا انہی لوگوں کے فہم میں؟ جہاں تک اس کا تعلق تھا وہ اپنے اذہان میں کوئی نقص یا سقم نہیں پاتا تھا اس لئے کہ وہ خود اس سے پوری طرح مطمئن تھا۔

البتہ کبھی کبھار اس کے سکون میں تلاطم پیدا ہو جاتا۔ وہ جب کبھی کسی عورت کے اعضا پر ہاتھ پھیرتا تو اس کے بدن میں اک برق سی کوند جاتی۔ بعض اوقات وہ اس لمس کی سنسناہٹ اپنے مراقبے تک میں محسوس کرتا۔ وہ اس سے بچنا چاہتا تھا لیکن التجاؤں اور التماسوں کا سیلاب

اسے بہائے لئے چلا جاتا اور وہ کبھی اپنے آپ کو روک نہ سکتا۔

ایک دن اس نے خواب میں دیکھا کہ دریا میں سیلاب آیا ہے اور اس کا پانی کنارے توڑ کر چاروں طرف پھیل گیا ہے۔ پانی چرواہے کے چھپر کو بھی بہا کر لے گیا۔ اچانک اس نے دیکھا کہ پانی میں چرواہے کی ماں کی لاش تیر رہی ہے جو اسے مدد کے لئے پکار رہی ہے "میرے ناجی، مجھ پر شفقت کر"۔ لاش اسی کی جانب تیری آ رہی تھی۔ وہ مردہ تھی لیکن اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ بعلم نے اس کو پانی سے نکالنے کی بجائے اس کے ماؤف اعضاء پر اس طرح ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا کہ بیداری کی حالت میں اس کا تصور کر کے اسے شرم آ گئی۔ صبح جب چرواہے کی ماں اس کے لئے دودھ کا آبخورہ اور کھجوریں لے کر آئی تو اچانک اسے رات کا خواب یاد آ گیا۔ اس نے اس کی طرف دیکھا۔ عورت نے بھی اچانک اس کی طرف اس طرح دیکھا گویا وہ رات کے واقعہ کو جانتی تھی۔ اس کی نگاہیں شرم سے جھک گئیں۔ بعلم بھی جھینپ گیا۔ اس کا دل دھڑ دھڑ کانپنے لگا۔ اس کو اپنے خواب اور اپنے خیالات پر ندامت ہوئی لیکن وہ سمجھا کہ عورت کی نگاہیں بتا رہی تھیں کہ وہ اس خواب کو جانتی تھی۔ کیا اسے بھی بعینہٖ یہی خواب آیا تھا؟

چرواہے کی ماں جوانی کی سرحدیں عبور کر چکی تھی اس کے باوجود گزری ہوئی بہار کے نشانات کلیتاً مٹ نہ گئے تھے۔ وہ طبعاً صفائی پسند تھی۔ روز صبح اپنی جھونپڑی کے سامنے جھاڑو پھیرتی اور درختوں کے گرے ہوئے پتوں اور تنکوں کو صاف کرتی۔ دریا سے پانی لاتی اور ایندھن جمع کرتی۔ پھر بعلم کے لئے دودھ گرم کرتی اور اس کو جس چیز کی ضرورت ہوتی فوراً تیار کر دیتی۔ بعلم اس کے امور خانہ داری سے بھانپ گیا تھا کہ وہ ضرور کسی آسودہ حال خاندان کی لڑکی ہو گی۔ اس کی شادی کم سنی میں ہو گئی تھی۔ اس لئے ماں بیٹوں کو باہم دیکھ کر کوئی بمشکل اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ ماں بیٹے تھے۔ کوئی کہتا۔ یہ بہن بھائی ہیں اور ایک شخص تو دھوکہ سے انہیں میاں بیوی سمجھ بیٹھا۔

ایسے خیالات یا ایسے خواب کبھی کبھار آتے لیکن اس تند ہوا کی طرح آتے جو نرم پودوں کی جڑیں کھوکھلی کر دیتی ہے۔ وہ اس طرح اچانک آتے کہ وہ سنبھلنے نہ پاتا اور طرفہ یہ کہ اس کو ان پر کوئی قابو نہ تھا۔ وہ انہیں اپنے دل سے نکالنے کی کوشش کرتا لیکن وہ کچھ اس کے سانپ کی طرح اپنی چمکیلی آنکھوں سے اسے مبہوت کر دیتے۔ اور وہ اس وقت ہوش میں آتا جب کوئی خارجی عنصر اسے گہری بیش آگہی بخشتا۔

اس کے سوا اس کی زندگی بالکل پرسکون تھی۔ وہ مطمئن تھا کہ وہ زندگی کی صحیح شاہراہ پر گامزن تھا۔ بدنی خواہشات کے چند کانٹے باقی تھے وہ بھی نکل جائیں گے۔ وہ لباس سے قطعی بے نیاز ہو چکا تھا۔ جو کپڑے وہ اول روز پہن کر یہاں آیا تھا وہی اس کے بدن پر تھے اور انہی کو اپنے ہاتھوں سے پیوند لگا لیتا۔ اون کی ایک چادر چرواہے نے پیش کی تھی وہ رات کو اس کی رفیق ہوتی۔ اس کے علاوہ اسے کسی چیز کی ضرورت نہ تھی۔ اس نے اکثر [illegible] خواہش میں اسے اپنے اندر نظر نہ آئی۔ جہاں تک غذا کا تعلق تھا وہ خود بخود [illegible] سے اتنے فاصلے پر تھا کہ کام و دہن کے لذائذ اس تک آسانی سے نہ پہنچ سکتے۔ [illegible] لیکن وہ اس کے لئے بھی کوئی خواہش [illegible]

[illegible] ایک خواہش تھی جو پژمردہ نظر آنے کے باوجود ہری تھی اور وہ خواہش جنس کی [illegible] وہ اس [illegible] دب چکی تھی [illegible] وہ انتہائی [illegible] اکثر اس کے بدن میں [illegible] وہ سنگتراشی میں کافی [illegible] نکلنا چاہتا تھا لیکن وہ کبھی [illegible] مصروفیت کی وجہ سے تھی لیکن [illegible] اس کے جسم [illegible] عورت تھا۔ اس کا [illegible] عہد شباب میں [illegible] ایک لڑکی پر فریفتہ ہوا تھا جس کو اس نے [illegible] دیکھا تھا۔ اس کا [illegible] پانی بھرتے دیکھتا۔ اسے [illegible] اس نے اس کے دل کو موہ لیا۔ وہ [illegible] خوب یاد تھا کہ اس کی محبت اس کے سانسوں تک میں رچ گئی تھی۔ وہ سوتے جاگتے اس کے [illegible] رہتا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ اسے اپنے پہلو میں بٹھا کر اس سے خوب باتیں کرے۔ لیکن جب بھی اس سے گفتگو کرنے کا ارادہ کرتا [illegible] اپنے ارادے کو

کبھی بھی پیدا نہ کرسکتا۔ پھر اس نے اس سے شادی کا ارادہ کیا۔ ایک روز وہ اپنے باپ کے سامنے اپنی اس خواہش کا اظہار کرنا ہی چاہتا تھا کہ اسے معلوم ہو گیا کہ وہ ایک کاشتکار کی لڑکی ہے۔ اتنی سی بات اس کے ارادے کو مضمحل کرنے کے لئے کافی تھی۔ مدیانی معاشرے میں صرف دو طبقے معزز تھے تاجر یا کاہن۔ اور اس کا باپ اس مناکحت کی کبھی اجازت نہ دے سکتا تھا سوائے اس کے کہ وہ بھی اپنے بھائی کی طرح گھر سے فرار ہو جاتا۔ لیکن بعلم اتنی جرأت کا مالک نہ تھا وہ طبعاً حیادار تھا۔ اور وہ اپنی حیا کو کبھی بھی دبا نہ سکا۔ اس کے بعد اس نے کوئیں پر جانا موقوف کر دیا۔ لیکن وہ اسے بھی تا دیر نہ کر سکا۔ اور جب وہ پھر کوئیں پر گیا تو اسے معلوم ہوا کہ تین دن ہوئے وہ ایک گھوڑ سوار کے ساتھ چلی گئی تھی۔ اس خبر نے گویا اس کے دل میں خنجر سا بھونک دیا۔ دراصل وہ حیادار نہ تھا بزدل تھا۔ وہ تنہائی میں بیٹھ کر اپنے آپ کو ایک گھوڑ سوار دیکھتا لیکن افسوس وہ اس لڑکی کو اپنے پیچھے گھوڑے پر سوار نہ کرا سکتا تھا۔

اس کے بعد وہ زندگی کے ہنگاموں میں کچھ ایسا مشغول ہو گیا کہ یہ جذبہ گاہ گاہ آندھی کی طرح آتا اور اسے جھکا کر چلا جاتا۔ حسین نگاہیں، شیریں بول، گدرائے ہوئے بازو، اور پائل کی جھنکار سے وہ زخم کھائے بغیر نہ رہتا۔ وہ ان کے سامنے بے بس ہو جاتا۔ لیکن جب وہ حقیقت کے قریب پہنچ گیا تو اس نے چاہا کہ یہ کمزوری بھی دور ہو جائے۔ اس خواب نے اسے بالخصوص چوکنا کر دیا۔ اس نے اسے بتا دیا کہ وہ ابھی زمین ہی پہ رینگ رہا ہے۔

اس نے اس خواہش سے مجاہدہ شروع کر دیا۔ جب کبھی اسے ایسا خیال آتا وہ اٹھ کر پہاڑیوں میں ٹہلنا شروع کر دیتا یہاں تک کہ وہ تھک جاتا اور خیال کا جھونکا گزر جاتا۔ لیکن ہر روز اکثر مریض عورتوں کو چھونے سے وہ خیال زیادہ شدت اور تیزی سے بار بار آنے لگا۔ اکثر اوقات اسے خیال آتا کہ وہ اس مقام سے اسی طرح بھاگ کھڑا ہو جس طرح وہ اس سے قبل فوراً سے بھاگا تھا۔ لیکن یہ عجیب بات تھی کہ اس دفعہ وہ اس خیال کو پورا نہ کر سکا۔ ایک دن واقعی اس نے اپنا عصا سنبھالا اور وہاں سے چلے جانے کی نیت سے پہاڑی راستے پر چڑھنا شروع کر دیا۔ لیکن معاً اس کے دل میں پھر وہی کشمکش شروع ہو گئی۔ اس کے اندر ایک آواز پکاری۔ "ہزاروں بے کس مریضوں کو چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو؟"

اس کے جواب میں دوسری آواز بولی۔ "حقیقت کی طرف، خدا کی طرف۔"

پہلی نے کہا۔ "اب ان کا کون ہو گا؟"

دوسری نے جواب دیا۔ "وہی جو اس سے پہلے ان کا تھا۔"

پہلی نے کہا۔ "انسانوں کے دکھ درد کرنے سے بڑھ کر کوئی کارِ خیر نہیں۔"

"دوسری بولی۔ "یہ صحیح ہے لیکن اپنا آپ بچانا بھی فرض ہے۔"

پہلی بولی۔ "یہ خود غرضی ہے، نفس پرستی ہے۔"

بعلم ٹھٹک گیا پھر لوٹ پڑا۔ اس کی کھوہ کے سامنے مریضوں کا ہجوم لگا ہوا تھا۔ جن کی آنکھیں اس کو دیکھ کر چمک اٹھیں۔ بیمار چہروں، ملتجیانہ نگاہوں اور دردبھری فریادوں کو ٹھکرا کر چلے جانا نیکی نہیں۔ اس نے دل ہی دل میں کہا "میں انہیں چھوڑ کر ہرگز نہیں جا سکتا۔ میں اس چشمۂ خیر کو ہرگز بند نہیں کر سکتا۔" اس کے بعد اس نے وہاں سے ہجرت کا خیال ترک کر دیا۔

جب نصف سے زیادہ مریض گزر چکے تو اس نے دیکھا کہ ایک بہت بڑی کشتی دریا کے کنارے آن لگی ہے۔ اس کشتی کو بدوی غلام کھے رہے کشتی کی سجاوٹ اور آرائش سے ظاہر تھا کہ یہ کسی رئیس کی کشتی تھی۔ کشتی عین اس مقام کے سامنے رکی جہاں پہ بیٹھا وہ دست شفا پھیر رہا تھا۔ اس میں سے ایک زرپوش غلام نکلا اور اس کے سامنے زمین بوس ہو گیا۔ بعلم بدستور مریضوں کی طرف متوجہ رہا اگرچہ کنکھیوں سب کچھ دیکھ لیا تھا۔ جب مریض رخصت ہو چکے تو آگے بڑھ کر بصد ادب گویا ہوا۔ "بعل فعور کے چہیتے، فغورا کے عظیم تاجر اگور کی بیوی تیری پابوسی کی اجازت چاہتی ہے۔"

"وہ بخوشی آ سکتی ہے۔" بعلم نے جواب دیا۔

غلام کشتی کی طرف پلٹنے کی بجائے متامل کھڑا رہا۔ پھر اس نے اپنا سر خمیدہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ چلنے سے معذور ہے۔" بعلم اس کا مطلب سمجھ گیا۔ وہ

کوئی پیشہ ور طبیب نہ تھا اُس مطلب سے اس کے استغنا کو ٹھیس سی لگی۔ اس کو چپ دیکھ کر غلام نے پھر عرض کی "میری اعتبار، اس تکلیف دہی سے خود مریضہ کو تکلیف پہنچتی ہے۔ لیکن وہ غیر ہاتھ کے سہارے سے اجتناب کرتی ہے۔"

غلام کے لب و لہجہ نے اس کے ارادے کو بدل دیا۔ "اچھا چلو" کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور غلام کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ جب وہ کشتی کے قریب پہنچے تو تمام ملاح اور غلام سرنگوں ہو گئے۔ انہوں نے کشتی کے ساتھ ایک صندلی سیڑھی لگادی اور وہ کشتی کے اوپر چڑھ گیا۔ کشتی زرنگار پردوں سے ڈھکی ہوئی تھی اور اس کی چھت سے لوبان و عنبر کے خوشبودار مرغولے نیلگوں فضا میں تحلیل ہو رہے تھے۔ رہبر غلام اسے پردوں کے پاس چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا۔ اتنے میں پردوں کے پیچھے سے ایک لونڈی نکلی جس کے بالوں میں موتی گندھے ہوئے تھے۔ اس نے اس کے پاؤں چومے اور اس کے گزرنے کے لئے پردہ سرکایا۔

اندر کی دنیا طلائی تاروں سے جگمگا رہی تھی۔ ایک تخت پر حریر کا فرش لگا ہوا تھا جس پر چیتے کی کھال بچھی ہوئی تھی۔ اس کھال کی ایک جانب ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ جس کے چاندنی کے سے چہرے پر باہر کی سنہری روشنی طلائی تاروں میں سے منعکس ہو کر پڑ رہی تھی۔ وہ سرعت سے اٹھی اور جھک کر اس کے پاؤں میں گر پڑی۔ بعلم کی طبیعت منقبض ہو گئی۔ وہ سمجھ گیا کہ اسے فریب سے یہاں لایا گیا ہے۔ وہ عورت اس کے پاس چل کر آنے سے معذور تو نہ تھی۔ اس سے اس کا کیا مطلب تھا؟ اس خیال کے ساتھ اس کے دل میں امراء کے خلاف جذبۂ نفرت ابھر آیا۔ اور اس نے معاً فیصلہ کر لیا کہ وہ اس کا علاج نہیں کرے گا۔ بعلم نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اور ذرا درشت لہجے میں کہا "میرے پاؤں مت چھو، میں تو ایک ناپاک انسان ہوں۔"

عورت نے اس کے پاؤں سے الگ ہو کر کہا "بعل فعور کے چہیتے، میں تیرے قدوم میمنت لزوم سے اپنی کشتی کو بابرکت بنانا چاہتی تھی۔ اس لئے میں نے یہ طریقہ اختیار کیا۔ تیری موجودگی میرے لئے باعث صد فخر ہے۔ مجھ پر غضب آلود نہ ہو۔"

بعلم بیٹھ گیا۔ عورت نے پردوں کے قریب کھڑی لونڈیوں کو چلے جانے کا اشارہ کیا۔ جب وہ چلی گئیں تو وہ اس کے قریب ہو کر بیٹھ گئی۔ بعلم نے محسوس کیا کہ اس نے یہ حسین چہرہ کہیں ضرور دیکھا ہے۔ ایکاایکی اسے وہ پالکی یاد آگئی جس میں ایک جوان سال لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے ایک اچٹتی نگاہ سے اس کے دل کو گھائل کر دیا تھا۔ اس یاد کے ساتھ اس کے سارے مردہ جذبات زندہ ہو گئے۔ اس کے تیر نگاہ سے زخم کھانے کی لذت اسی تازگی کے ساتھ پھر ابھر آئی۔ وہ اب پختگی کے کمال کو پہنچ چکی تھی تب وہ اک شگوفۂ ناشگفتہ تھی جس کو بہار کے اولین جھونکے آہستہ آہستہ کھلا رہے تھے۔ اب وہ بہار کی کل متاع سے فیضیاب ہو چکی تھی۔

عورت کہنے لگی "میں نے مدین و مصر کا چپہ چپہ چھان مارا لیکن مجھ کو اپنا گوہر مقصود کہیں سے نہ مل سکا۔ اب اک تیرا سہارا ہے۔ اے بزرگ مجھے مایوس نہ کر۔"

اس کے پلکوں پر آنسوؤں کے موتی تھرتھرا رہے تھے۔

"میں فتورا کے عظیم تاجر اتور کی بیوی ہوں۔ میری شادی ہوئے آٹھ برس ہو گئے ہیں لیکن میری گود ابھی تک ہری نہیں ہوئی۔"

بعلم نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا اور کہا۔ "یہ معاملہ تو خالق کے اختیار میں ہے۔"

عورت نے گویا وہ بات نہیں سنی اور کہا "اس معاملہ سے میری قسمت وابستہ ہے۔ اگر میں اس کے سنسان محل میں رچاوٹ پیدا نہ کر سکی تو میں اپنے نصیب سے بھی ہاتھ دھو بیٹھوں گی۔ میرے خاوند کے پاس اتنی دولت ہے کہ وہ نہیں جانتا کہ اسے کیا کرے۔ جب اسے اپنی بے اخلاف موت کا خیال آتا ہے تو وہ سخت چڑچڑا ہو جاتا ہے۔"

کشتی پر خاموشی چھائی ہوئی تھی صرف دریا کی لہروں کی سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی یا کسی اداس دریائی پرندے کی چہک۔ بعلم چپ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ گویا وہ کسی ناقابل حل الجھن میں مبتلا ہو گیا تھا۔ وہ پھر بولی۔ "اس کی یہ حالت دیکھ کر کئی لوگ اس کا دل بہلاتے اور اس کے رنج کا

علاوہ کرنے کے دوسرے ذرائع سوچ رہے ہیں۔"

بلعم عنبر کے ساتھ عورت کے لباس کی مہک بھی اپنے دماغ میں محسوس کر رہا تھا۔ ایسی جگہ میں بیٹھ کر وہ اپنے خون پسینہ سے کمائے ہوئے حال سے دور ماضی کے قریب ہو رہا تھا۔ اس کو اپنے رگ و پے میں گھنٹیوں کی جھنک پھر محسوس ہو رہی تھی۔ بدن کی خفتہ انگڑائیاں بیدار ہو رہی تھی۔ اتنے میں برھا پنے کی ہلکی ہلکی آواز آنے لگی۔ وہ نغمے اس کی روح کو جسم سے نکال رہے تھے۔ اس نے اُدھر دیکھا جدھر سے یہ آواز آ رہی تھی۔ مگر سوائے زرتار پردوں کی سرسراہٹ کے اور کچھ نہ پایا۔ وہ اس کے اور قریب آ گئی تھی۔ اور اس نے اس کے مہکے ہوئے سانس کو اپنی کھردری داڑھی سے چھوتے پایا۔

اس نے کہا "میں اپنا یہ راز کسی کے روبرو آشکار نہ کر سکتی تھی۔ بعل کے چہیتے مجھ دکھیاری پر ترس کھا" اس کی آواز آنسوؤں سے گھٹ رہی تھی مگر وہ کہے جا رہی تھی "تو مجھ پر رحم کر اور میری چھاتیوں میں دودھ بھر دے۔"

بلعم نے کانپ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی چھاتیاں دریا کی لہروں کی طرح متلاطم تھیں۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور ان سے آنسوؤں کی دولڑیاں رخساروں سے بہہ کر ٹھوڑی تک جا پہنچی تھیں۔ اس کے سرخ ہونٹ نیم وا تھے۔ اس کی آہ کی سی ملائم گردن میں آتشیں موتیوں کا ہار دھک رہا تھا۔ وہ واقعی اس کے مدھ بھرے بدن کی گرم گرم آنچ محسوس کر رہا تھا۔ یہ وقت آزمائش تھا۔ وہ جس ہوس اور جن جذبات سے آزاد ہونا چاہتا تھا وہ پوری قوت سے اسے گھیر رہے تھے۔ وہ ان کے سامنے جکڑا ہوا بیٹھا تھا۔ اس کے باوجود وہ جانتا تھا کہ وہ ایک جست لگا کر ان سے آزاد ہو سکتا تھا۔ ایک ہی بھرپور وار میں ان کو توڑ سکتا تھا۔ صرف ایک انکار سے ان کے طلسم کو باطل کر سکتا تھا۔ لیکن یہی مشکل تھا۔

اس کا دل دھڑ دھڑ کانپ رہا تھا۔ وہ مدت دراز کی محنت سے بنائی ہوئی عمارت کو ایک ہی پل سے گرتا دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ وہ بے بس ہوا جا رہا ہے۔ اس کی جراءت کی نبضیں چھوٹ رہی تھیں اور اس کے اندر جگانے والی آواز گھٹ رہی تھی۔ مگر اس نے اپنے آپ کو بچانے کی آخری کوشش نہ چھوڑی اور ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ عورت نے اس کے پاؤں پکڑ لئے "میرے محسن! مجھ کو مایوس نہ کر" مگر اس کا چہرہ غضب سے سرخ ہو گیا۔ جس شدت سے وہ مغلوب ہوا جا رہا تھا اسی شدت سے وہ چلّایا "پیچھے ہٹ جا خبیث روح، تیرے سانس سے مجھ کو آگ کے شعلوں کی لپٹ محسوس ہو رہی ہے۔ تیری آنکھوں میں مجھ کو سانپ کی سی کشش دکھائی دے رہی ہے۔ تیرے ہونٹوں پر مجھ کو جہنم کے کوئلے دہکتے نظر آ رہے ہیں۔ تیرا فریب ناگ سے زیادہ مہلک اور تیری چالیں بھیڑیے کی چالوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔ میرے پاؤں چھوڑ دے۔ ہوس کی بیٹی۔ میری راہ سے ہٹ جا۔"

وہ اس غضب سے یک بیک سہم گئی اور پیچھے ہٹ گئی۔ لونڈیاں دوڑتی ہوئی آ گئیں لیکن بلعم ان کے ہجوم کو چیرتا ہوا پردوں کو نوچتا ہوا نکل آیا۔ وہ دوڑتا ہوا کشتی سے اترنے لگا لیکن سیڑھی نہ ہونے کی وجہ سے چھلانگ لگا دی۔ اور وہ گیلی ریت میں دھنس گیا۔ اس نے اسی جوش میں قیام گاہ کی طرف بھاگنے کی کوشش کی لیکن اس کے دائیں پاؤں نے جواب دے دیا۔ اس نے کشتی کی جانب دیکھا۔ غلام سیڑھی لگا کر سرعت سے اس کی طرف لپک رہے تھے۔ اور اس کے بعد اس کو ایسا دکھائی دیا گویا آسمان گھوم رہا ہے اور وہ خلا میں ڈوبتا جا رہا ہے۔

جب اسے ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ وہ کھوہ میں اپنی پھوس کی سیج پر لیٹا ہوا ہے اور جروا ہا اور اس کی ماں اس کے ہاتھ پاؤں دبا رہے ہیں۔ اس نے بے اختیار دریا کی جانب دیکھا لیکن پہاڑی کی سنگین اوٹ نظارے میں حائل ہوئی۔ اس نے انہیں اسے موکھے کے قریب کرنے کا اشارہ کیا۔ لیکن اس کی اس خواہش کی تعمیل کی بجائے چرواہے نے دودھ کا آبخورہ پیش کیا۔ جب وہ اٹھ کر بیٹھا تو اسے محسوس ہوا کہ وہ بہت نحیف ہو چکا ہے اور اس کا دایاں پاؤں بھاری پٹیوں میں لپٹا ہوا ہے۔ جب اس نے دودھ پی لیا تو اس کے اوسان کچھ بجا ہوئے۔ اور وہ خود کھسک کر اس موکھے کے پاس آ گیا جہاں سے وہ دریا کا نظارہ بخوبی کر سکتا تھا۔ کشتی کا لنگر اٹھایا جا رہا تھا۔ بلعم نے کشتی کی طرف دیکھ کر کہا "خبیث روح تم پر خداؤں کے خدا کی لعنت ہو۔"

پھر وہ اضطراب سے اپنا سر پورا ہلانے لگا گویا اس کا پھوڑا دکھ گیا تھا۔ وہ دن بھر سخت بے چین رہا۔ اس کی حرکات سے صاف عیاں تھا کہ اس کا باطن متلاطم تھا۔ صبح کے واقعہ نے اس کی پرسکون زندگی میں ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ مدت کے بعد اسے اطمینان نصیب ہوا تھا یہ بھی اس سے چھینا جا رہا تھا۔ لیکن

بعلم بن باعور

اپنے نہاں خانۂ دل میں وہ مطمئن تھا کہ وہ آزمائش سے بے ملوث نکلا ہے۔ وہ بدن کے چنگل سے نروہ بچ نکلا ہے۔ اس کے باوجود جو چیز اسے مضطرب اور بے چین کر رہی تھی وہ روبہ اندمال زخم کا پھر چھل جانا تھا۔ اس کو یہ دیکھ کر دکھ ہو رہا تھا کہ اس کا بدن بدستور جوان تھا اور اس کو ایسا سنہری موقع کھو دینے پر ملامت کر رہا تھا۔ اس کو یہ حقیقت چبھ رہی تھی کہ اتنی کدوکاش اور دشت پیمائی کے باوجود وہ اسی مقام پر تھا۔ اور اتنا علم حاصل کرنے کے باوجود وہ اپنی قلبی کیفیت کو بلند نہ کر سکا تھا۔ اس نے اپنے علم میں تو اضافہ کر لیا تھا لیکن اپنی خواہشات میں کوئی کمی نہ کی تھی۔

چرواہا اور اس کی ماں دونوں بے قرار تھے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر چرواہے نے کہا "بعل فغور کے چہیتے، اب تو اپنا غصہ تھوک دے۔"

چرواہے کی ماں نے آگے بڑھ کر تنکوں کی سیج پر اونی چادر بچھا دی اور بصد ادب بولی "میرے ناجی تیری یہ حالت ہم سے نہیں دیکھی جاتی۔ تو ذرا لیٹ جا۔"

پھر انہوں نے اسے ایک اور دودھ اور شہد کا پیالا پلایا جس سے اس کے تھکے ہوئے اعصاب میں سکون رچنے لگا اور وہ لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کی کھوہ میں زیتون کا دیا جل رہا تھا۔ کچھ لمحات تک وہ کچھ نہ جان سکا کہ وہ کہاں ہے۔ پھر رفتہ رفتہ اسے دن بھر کے گزرے ہوئے واقعات ایک ایک کر کے یاد آنے لگے۔ جب اس نے ان واقعات پر نظر ڈال لی تو اس نے اطمینان کی انگڑائی لی کہ وہ امتحان میں واقعی کامیاب ثابت ہوا ہے۔ اب اس کی طبیعت کا ضعف و اضمحلال بھی دور ہو چکا تھا۔ صرف اس کے دائیں پاؤں میں ہلکا سا درد تھا۔ اس نے انگڑائی لی اور سر اٹھا کر کھوہ کے موکھے میں سے دیکھا۔ آسمان پر ستارے جگنوؤں کی طرح چمک رہے تھے۔

اس کے ہونٹوں پر اطمینان آمیز تبسم کھیلنے لگا۔ اضطراب کی آندھی گزر چکی تھی۔

اتنے میں اس نے دیئے تلے سایے کو حرکت کرتے دیکھا۔ یہ چرواہے کی ماں تھی۔ وہ اس کے لئے جاگ رہی تھی۔ وہ آہستہ سے بعلم کے قریب آئی اور اس کے پاؤں دبانے لگی "میرے ناجی، تمہارے بغیر ہماری دنیا اندھیر ہے۔" اس کی آواز میں آنسو تھے۔ اس نے اپنی اوڑھنی کے پلو سے اپنی آنکھیں پونچھیں۔

بعلم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے آنسوؤں نے اس کا دل پگھلا دیا۔ اس نے آہستہ سے کہا "مت رو، یہ دنیا میرے بغیر بھی چلتی رہے گی۔ ہم سب کا مالک وہی خداوند ہے جس نے زمین آسمان اور ہم سب کو بنایا ہے۔"

بڑھیا اس نے روتے ہوئے کہا "ہمارے خداوند بھی تو۔"

بعلم نے دیکھا اس کی پرنم آنکھوں میں زیتون کے دیئے کی سفید لو تھرتھرا رہی تھی۔ وہ کوئی بوڑھی عورت نہ تھی۔ وہ تو جوانی کی آخری سرحد پر اپنا آپ سنبھالے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی ڈھارس بندھانے کے لئے اس کا ہاتھ خود بخود اس کے سر کی جانب اٹھ گیا۔ گویا وہ ایک بھولی سی بچی تھی جس کو وہ چپ کرانا چاہتا تھا۔ جونہی اس نے پیار سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا اس کا سر ڈھلک کر اس کے سینے پر آ رہا۔

اتنے میں ہوا کا ایک تند جھونکا آیا اور دیا گل کر گیا۔

[illegible] سمندر کو پار کر سکتا ہے [illegible] خدا سے [illegible] لیکن جونہی رات کا اندھیرا چھاتا اس کے دائیں پاؤں [illegible] میں
[illegible] چرواہے کی ماں [illegible] واقعے کا اثر اس کی روح اس پر حکومت کرتی۔ وہ [illegible] کا خیال
[illegible] طلب میں [illegible] جہالت پر افسوس [illegible] لیکن [illegible] اور کائنات کا شور دریائی [illegible]
[illegible] تب اس کی روح نحیف بچے کی طرح [illegible] اپنی جانب [illegible] جھکا
[illegible] آواز سنتے سنتے دور چلا جاتا [illegible] اور وہ تاسف اور ندامت سے اپنی انگلیاں کاٹنے لگتا [illegible]
[illegible] خلوص طلب کے [illegible] سے پناہ مانگتا لیکن ہر روز وہ بہک جاتا یہاں تک کہ [illegible]

(بقیہ بر صفحہ ۱۱۶)

میرا گاؤں

نعیم صدیقی

کرائے کا ایک تاریک کمرہ، ایک بائیسکل اور بجلی کی ایک دکان پر سیلز مین شپ! روز صبح سویرے ایک ہی مقررہ راستے سے جانا اور روز شام کو ایک ہی مقررہ راستے سے لوٹنا! پھیری والوں کی مقررہ آوازیں، اور مالک مکان کی ریڈیو کی ایک ہی طرح کی صوتی لہریں! ــ طبیعت اکتا سی گئی ہے۔ آہ گاؤں کی زندگی!

گاؤں! میرا گاؤں! ـــــ آبادی کے شمال اور مغرب، دونوں جانب میدان، دور تک پھیلے ہوئے کھیت! مشرق اور جنوب کی جانب کھنڈر اور مٹی کے ٹیلے جو سالہا سال سے پانی کے مٹی کاٹتے چلے جانے سے بنے ہیں۔ پھر ان سے آگے دونوں طرف گھومتا ہوا برساتی نالہ جس کا پاٹ تہائی میل چوڑا ہے، یہاں سے وہاں تک ریت ہی ریت، کچھ ادھر ادھر برساتی پانی کے لائے ہوئے سپید پتھر کہیں کہیں سرکنڈے اور کوندل کے بیلے اور ہمیشہ رُخ بدلنے والی پانی کی ایک پتلی سی دھار اور اس دھار میں جابجا مرد اور عورتیں کپڑے دھونے اور نہانے میں مصروف! نالے کے اُس پار ایک ڈھلوانی میدان، سرسبز فصلوں، درختوں اور گھاس سے آراستہ، اس منظر کی سبز زمین پر چھوٹی چھوٹی بستیوں کے بکھرے ہوئے نقوش، ان نقوش کے اندر مسجدوں کے سر اٹھاتے ہوئے چونے گچ مینار۔ جب ڈوبتے سورج کی سنہری شعاعیں اس منظر کو آخری بوسے دے رہی ہوتی ہیں۔ تو میرے گاؤں کے اونچے مشرقی کنارے کی مسجد کے صحن سے اس کا تماشا جمالِ فطرت کے ذوق کو بلوغ تک پہنچا دیتا ہے پھر اس سرسبز خطے میں بنے ہوئے راستے اور پگڈنڈیاں، ان پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے مسافر، کھیتوں میں کام کرتے ہوئے دہقان، تھوڑے تھوڑے فاصلے پر درختوں کے جھنڈ میں دن رات چلتے ہوئے رہٹ، ان سے پانی بھر کے لے جاتی ہوئی کالے بانے پہننے والی عورتیں، تین تین گھڑوں کی لمبی قطار سروں پر لئے ہوئے ایک ایسے توازن کی مظہر جو اگر ٹوٹ جائے تو گویا ساری کائنات کا شیرازہ بکھر جائے، آپس میں چہلیں کرتی ہوئی، اپنے گھڑے کہتی ہوئی، کبھی ایک دوسرے کی غیبتیں کرتی ہوئی، کبھی لڑتی جھگڑتی، کبھی کچھ گنگناتی ہوئی، کبھی اپنے خالی گھڑے رکھ کر راستوں سے ایک طرف ہو کر خاص خاص مقررہ ٹیلوں سے گراوی مٹی کرید کرید کر کھاتی ہوئی اور پلّے کے کونے میں باندھتی ہوئی، اس منظر کی تکمیل کرتی ہیں!

جابجا پگڈنڈیوں اور بنجر رقبوں میں چرتے ہوئے مویشی سر ہلا ہلا کر گلے کی گھنٹیوں کا سرود فضا میں بکھیرے ہوئے! نالے کے ریگستانی ٹیلوں کے آس پاس بھیڑ بکریوں کے منتشر گلے، بانسری اور بین کی تانیں اُڑاتے گڈریے! ان سارے نقوشِ جمال سے بھرا ہوا یہ سبز رنگ کا صفحے کا صفحہ جیسے ایک فریم میں لگی ہوئی تصویر ہو! یہ تصویر میری بار بار کی دیکھی ہوئی تصویر، چاندنی میں دیکھی ہوئی تصویر، برسات میں دیکھی ہوئی تصویر، اور تڑکے اور شام کے جھٹ پٹے میں دیکھی ہوئی یہ تصویر، میرے بلندی پر واقع گاؤں کے سامنے بالکل ترچھی رکھی ہے۔ جیسے نمائش کے لئے بڑے اہتمام سے رکھی گئی ہو۔ اس ارضی قطعے کا پچھلا حصہ اونچا ہوتے ہوتے ایک پہاڑی کے ساتھ جا لگتا ہے۔ ہر صبح جو میرے گاؤں کے لئے طلوع ہوتی ہے۔ اسی پہاڑی کے کناروں سے طلوع ہوتی ہے۔ اور سورج ہر روز اس نیلے پردے کی اوٹ سے نکلتا ہے، برسات میں جب بادلوں کے قافلے گزرتے ہیں۔ تو ان آسمانی قافلوں کے سینکڑوں مسافر اس پہاڑی سے پیار کرنے کے لئے اپنے قافلوں سے بچھڑ جاتے ہیں، گرجتے ہیں اور اشک روتے ہیں۔ تا آنکہ ان کا پورا وجود آنسوؤں میں تحلیل ہو جاتا ہے ٭

میرا گاؤں

آبادی کے عین وسط میں ایک گندا جوہڑ ہے جس کے پانی سے مویشی سیراب ہوتے ہیں، جس میں بھینسیں نہاتی ہیں۔ اور گھنٹوں بیٹھی رہتی ہیں۔ مویشیوں کے گوبر اور پیشاب سے ترکیب پاکر یہ پانی ہمیشہ شوخ سبز رنگ لئے رہتا ہے۔ قسم قسم کے حیوانات اس میں پرورش پاتے ہیں۔ اسی سبز رنگ کے کیمیاوی مرکب سے گاؤں کی گایوں بھینسوں کا دودھ بنتا ہے۔ سال میں دو مرتبہ کچے مکانوں کو لیپنے کے لئے یہی پانی پلستر میں ڈالا جاتا ہے اس کی بو ساری فضا میں پھیلی رہتی ہے۔ مگر کسی ناک نے آج تک اسے محسوس نہیں کیا۔ اس گندے جوہڑ کے بغیر میرا گاؤں زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسی جوہڑ کے کنارے سے گاؤں کے بیچوں بیچ ہوتی ہوئی ایک سڑک گذرتی ہے جس پر خشک موسم میں گرد و غبار، برسات میں کیچڑ اور مارچ۔ اپریل میں جب گندم کی فصل اٹھائی جاتی ہے بھوسہ بکھرا رہتا ہے۔ اس سڑک پر پیپل کے ایک درخت کے نیچے گاؤں کی چوپال واقع ہے۔ اس چوپال کی رونق مہتاب نائی کی قصہ گوئی، جامے میراثی کی دوہے خوانی اور چوہدری کریم کے حقے کے دم سے قائم ہے!

اس چوپال میں جھگڑے چکائے بھی جاتے ہیں اور اسی سے جھگڑے کھڑے بھی ہو جاتے ہیں۔ اتحاد بھی یہیں ہوتے ہیں۔ اور افتراق بھی یہیں سے شروع ہوتے ہیں۔ سارے بناؤ اور بگاڑ کا مرکز یہی ہے۔ یہاں گھروں کے قضیوں پر بحث ہوتی ہے، یہاں مقدمہ بازیوں کی داستانیں بیان ہوتی ہیں، یہاں علاقے بھر کی خبروں پر تبصرے ہوتے ہیں، یہاں ہیر رانجھا اور سسی پنوں کے رومانس پر نکتہ آرائیاں ہوتی ہیں، یہاں تصوف الجھایا جاتا ہے، مذہبی مناظروں کے قصے بیان ہوتے ہیں۔ فقہ کے مسائل چھیڑے جاتے ہیں، اور کچھ نہ ہو تو جمعدار الٰہ یار پہلی جنگ عظیم کی بھولی ہوئی کہانیاں حافظے سے کرید کرید کر دہرانے لگتا ہے۔ جمعدار کے چہرے پر لمبی لمبی، گہری گہری سلوٹیں ہیں، سلوٹیں کیا ہیں جیسے واقعات کے کارواں کے نقوشِ قدم ہیں، نہیں، بلکہ جیسے لڑائی کے مورچے ہیں ——— ویران مورچے، جن میں اب کہانیوں کی نعشیں دبی پڑی ہیں۔ یہ نعشیں کبھی کبھی کروٹ لیتی ہیں۔ اور جمعدار الٰہ یار کی گہرائی میں اتری ہوئی آنکھوں کی بوڑھی پتلیاں چمک اٹھتی ہیں، وہ اپنے بڑھاپے کی بلندیوں سے نئی نسل کی جوانیوں کو بڑی تحقیر سے جھانکتا ہے۔ اور کہنے لگتا ہے:۔

"اونہہ! آج کل کے لونڈے بھی کہتے ہوں گے۔ کہ ہم جوان ہیں، یہ ان کے کملائے ہوئے چہرے اور پچکے ہوئے گال تو دیکھو۔ جیسے کسی گدھی کا چہرہ ہو۔ جوانی بنتی ہے خوراک سے اور پاک بازی سے! اب تو ولایتی کپڑا پہننے کا زور ہے خوشبو ملے ہوئے مٹی کے تیل سے بال بنائے جاتے ہیں۔ اور چائے پی جاتی ہے۔ گھی گیا، مکھن گیا، دودھ گیا۔ اور پھر مسیں بھیگی نہیں کہ چھوکریوں کے پیچھے تاک جھانک شروع ہو گئی نہ نماز، نہ روزہ، نہ خدا، نہ رسول! ہمارا زمانہ ہی کچھ اور تھا، نظریں پاک رہتی تھیں۔ ماں کو ماں کر کے جانا، بہن کو بہن سمجھا، یہ مانگ نکالے صافہ کندھے پر ڈالے گلی گلی گھومنے کا چلن نہ تھا، اتنے پر تو لاٹھیاں چل جاتی تھیں، کسی چھوکرے کی آنکھ میلی دیکھی نہیں کہ بڑے بوڑھوں نے ٹوکا نہیں، "میاں رہ کے ذرا سنبھل کے"! صبح مکا اور اُدھا کر سیر بھر دہی لیا، رات کی روٹی کے چار نوالے کھائے اور کام کو نکل گئے، دوپہر کو روٹی ملی۔ تو اس پر آدھ پاؤ مکھن ڈلا ہوا، ساتھ چار سیر گاڑھی لسی کی لٹیا، رات کو تازہ دودھ کا پیالہ ڈیڑھ پیالہ غٹاغٹ چڑھا کے پڑ رہے کیا دن تھے! صوبیدار جو دیا سرکار کو بھرتی دینے کے لئے گھومتا گھامتا گاؤں میں آیا۔ تو سیدھا میرے چاچے کے پاس پہنچا، اور بولا کہ یار اس کو میرے حوالے کر دو، نوکری کرے گا تو کچھ بن کے رہیگا، علاقے بھر کی عزت ہو گی، مگر چاچے نے کہا کہ خدا کا دیا ہوا سب کچھ ہے، بچے کو نوکری کرا کے میں خاندان کو بٹہ کیوں لگاؤں۔ صوبیدار بھی ضد پکڑ گیا۔ کہ یار اس جیسا گھبرو مجھے کہیں دکھائی نہیں پڑا، سرکار کے گھر نام پائے گا، روپے کی تھیلیاں لائے گا، تمہارا نام چمکے گا، آخر بھرتی کا دن آگیا، یقین جانو کہ جب ڈاک بنگلے میں جوانوں کی قطار کرتے انارے لنگوٹ باندھے صاف ... کھڑی ہوئی۔ تو اس کی نگاہ ہر طرف سے پھر کر یار محمد ہی پر آ کر جمتی تھی، اور یار محمد کو اس نے اول نمبر پر لیا! آج کل کے جوان دسویں پاس کر کے ٹھاکر کی لفٹین بھرتی ہوتے ہیں، ہمارے زمانے میں یہ دریا ٹھنڈا نہیں ہوتا تھا، ہم نے سپاہی رنگ بھرتی ہو کر جانوں کو کھپایا ہے، سائے جگر سکھے ہیں، جمعداری پائی ہے۔ تو اپنے کٹنے کے بدلے میں پائی ہے، کسی کی سفارش سے نہیں پائی، پھر ہم تے جو پکیں

سرکار سے لیا ہے۔ حلال کر کے لیا ہے۔ ہم نے جانیں لڑائی ہیں۔ سومالی لینڈ کے مورچے کی یاد نہ بھولے گی، چوہدری کریم! اتوا تڑ گولیاں برس رہی تھیں۔ اور حکم ہو گیا تھا کہ آگے بڑھو۔ ایک دم بڑھو۔ اور ہم نے اندھے ہو کر گولیوں کی بارش میں مارچ کر دیا۔ دشمن ہکا بکا ہو کر دیکھنے لگا۔ کہ یہ دیو ہیں کہ جن ہیں۔ قدم قدم پہ مرتے جاتے ہیں مگر رکتے نہیں! ہمیں خدا پر بھروسہ تھا۔ اپنے رسول پر یقین تھا اور بادشاہ جالب کی روح آگے آگے ڈھال بنی پھر رہی تھی، آئی بنا ں کوئی مرتا نہیں۔ کیوں جا سے؟ حقہ کی نالی ادھر بھی تو گھما کبھی!" چوہدری کریم انگریز ہم پر بڑا خوش رہا۔ ہم نے ایک دن رجمنٹ کے مولوی کے سامنے قرآن پر ہاتھ رکھ کر جو قسم کھائی تھی اس کے ایک ایک بول کا پہرہ دیا! جرمن بولتا تھا۔ ہائے اگر پنجابی سپاہی مجھے مل جائے تو ساری دنیا پر راج کروں۔ دنیا حیران تھی۔ کہ یہ سپاہی سولہ سولہ روپے پر جان کیسے دیتا ہے۔ جب ہم فرانس میں گئے۔ تو میمیں بازاروں میں کھڑی ہو کر ہمیں سلام کرتی تھیں۔ جس دکان پر جاتے بغیر قیمت ہر چیز حاضر کر دی جاتی۔ جس گھر کے دروازے سے گزرتے گھر والے اندر بٹھا کر پاؤں دھوتے۔ چائے بیڑیاں کھلاتے اور ایک بار تو ایک بوڑھی میم نے میرے ماتھے کو چوم لیا۔ آج بھی ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے میرے ماتھے پر اس کے چومنے کا نشان سا پڑ گیا ہو۔"

جمعدار ترنگ میں کہانیاں سنا رہا تھا کہ اچانک شور ہوا۔ سارے چوپالی اٹھ کر لپکے۔ عورتوں کی ایک پلٹن ایک طرف اور دوسری پلٹن ایک طرف چھتوں پر چڑھ کر لفظی جنگ لڑ رہی تھیں۔ ایک طرف کی کمانڈر انچیف ساجھو تھی۔ اور دوسری طرف کی شرفاں! ہاتھ لمبے کر کر کے اچھل اچھل کر، منہ بنا بنا کر، دونوں طرف کی سپاہنیں گالم گلوچ کر رہی تھیں۔ تیری ماں، تیری دادی، تیرا لکڑ دادا، تیری سات پشتیں تیرا اگلا پچھلا سارا، تیری بوٹیوں کو نمک لگاؤں۔ تیرا کلیجہ بھونوں۔ تیرے بچے کا قیمہ کروں، تیرے منہ میں کتے کی ہڈی، تیرا خصم لولے کمہار کا گدھا! اتنے میں شرفاں کا خصم آ پہنچا۔ "کیا روز روز کی ڈم ڈم مچا رکھی ہے!"

جواب ملا۔ "چل دفان ہو۔ دے لگام اپنی اس گدھی کے منہ میں! بڑا آیا ہے جورو کا دکھ درد بٹانے والا! تیری پسلیوں کو توڑ کر رکھ دوں گی!" ہوتے ہوتے ساجھو کا گبھرو کہیں سے آ نکلا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ کلہاڑی اٹھا کر شرفاں کے گھر والے کے سر پہ دے ماری۔ اب کیا تھا۔ دونوں طرف سے کلہاڑیاں اور لاٹھیاں لئے دو ٹولیاں نکل آئیں۔ اور خون خرابہ ہو گیا۔ گاؤں بھر کا پورا ٹوٹ پڑا۔ تھو تھمبو کر کے دنگے کو روکا گیا۔ زخمیوں کو چارپائیوں پر ڈالا گیا ——— اب آگے پیچھے دونوں پارٹیوں کے آدمی دوڑے کاہنے شاہ کی طرف دو دو سو روپیہ دونوں نے لیا۔ انگوٹھے لگائے۔ اور اب چارپائیوں کی قطار تھانے روانہ ہو لی۔ پرچہ چاک ہوا۔ طبی معائنے کے لئے زخمیوں کو تحصیل ہیڈ کوارٹر کے ہسپتال روانہ کیا گیا۔ ادھر حوالدار پولیس ایک گارد لئے ہوئے موقع پر پہنچا۔ جائے وقوعہ کا نقشہ بنایا گیا۔ مرغ پکڑے گئے۔ نمبردار کے گھر دیگ چڑھ گئی۔ گواہوں کو تیار کیا جانے لگا۔ ایک زخمی راستے میں ختم ہو گیا! رات کو خبر آئی۔ اودھم مچ گیا۔ مقتول کی برادری کی عورتوں نے دوپٹے اتار کر کمروں سے باندھ لئے۔ سروں کے بال کھول لئے۔ گریبان نوچ ڈالے۔ اس زور سے سینے پیٹے کہ گاؤں کے آخری سرے تک دھمک دھمک کی آواز جاتی تھی۔ بینوں کی ماہر عورتیں ہاتھ لمبے کر کر کے اور ایک خاص انداز سے ان کو فضا میں ہلا ہلا کر بین کرنے لگیں۔ اور کئی دن تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ مگر یہ معاملہ کوئی انوکھا واقعہ نہ تھا۔ یہ گاؤں کی زندگی کا ایک اہم باب تھا بات تھی تو اتنی تھی۔ کہ ساجھو کی مرغیاں شرفاں کے صحن میں جب بھی گھستیں۔ تو وہ ان کو ہانکتی۔ اور ہانکتے ہوئے دو گالیاں بھی فضا میں بکھیر دیتی۔ کہ "بہت تمہارے پالنے والوں کے منہ میں سور" اور ساجھو کو یہ شبہ تھا۔ کہ اس کی چتکبری مرغی شرفاں کی بھوسے کی کوٹھڑی میں انڈے دے آتی ہے۔ اور شرفاں چٹ کر جاتی ہے اس لئے جب وہ انڈا دینے کے موڈ میں آ کر کڑکڑاتی۔ تو ساجھو شرفاں کو سنانے کے لئے خوب گلا پھاڑ کر کہتی۔ "حا حرامزادی! جن چوہڑوں کمینوں کے گھر میں انڈے دیتی ہے انہیں کے سر پہ کڑکڑا۔" یہ نت کا رگڑا تھا۔ اس پر دو بول ادھر سے اور چار بول ادھر سے ہوتے ہی رہتے تھے۔ بیچ میں لگائی بجھائی والی ڈائنیں بھی کام کرتی

رہتی تھیں۔ ساہجو سے کہتیں۔ آخر تیرے پڑوسی ایسے ہی کیا بھوکے مر رہے ہیں۔ کہ اب حرام کھانے پہ اتر آئے ہیں۔ کیوں نہیں اس شرفو کا چونڈا اکھاڑتی کسی دن! عجب زمانہ آیا ہے کہ کسی کے حق حقوق کا کوئی لحاظ نہیں رہا۔ تُو تو ساہجو ایسے پٹھے ہاتھوں والی عورت ہے۔ کہ کسی کا تنکا بھی نہیں ہلاتی۔ تو پھر تیری مرغیوں کے انڈے لوگ کس بوتے پر کھاتے ہیں! جس دن تو بول پڑی۔ اُس دن شرفاں ٹھنڈی ہو جائے گی۔ اور یہی ڈائنیں شرفاں سے کہتیں۔ یہ ساہجو بھی عجب خرانٹ عورت ہے۔ سانڈھ مرغی پال رکھی ہے۔ سوکھا چرخہ انڈے کیا دے گا۔ جیسی ساہجو، ویسی اس کی مرغی! ایک تو شرفاں بیچاری پرائی مرغیوں کی بیٹ صاف کرتی پھرے اور اُوپر سے الزام انڈے کھانے کا آخر ساہجو ہی اتنی حرام خور رہ گئی ہے! بہن ساہجو! اس طرح زبان دانتوں تلے دیا کر گز ایسے نہیں ہوتے! رہی سہی کسر وہ اندھی بھکارن پوری کر دیتی ہے جو گلی گلی ہر روز گھوم آتی ہے اور گاؤں کے سارے ہی معاملات میں ٹانگ اڑاتی پھرتی ہے۔ وہ ساہجو کے پاس آئی۔ اور سرگوشی کے انداز میں کہنے لگی۔ ساہجو تم نے شرفاں کا کیا بگاڑا ہے کہ جب میں اس کے گھر گئی تو وہ چغلیاں لے کے بیٹھ جاتی ہے۔ ساہجو! ذرا ہشیار رہنا یہ بڑی کُپتی عورت ہے، ڈنک مارے بنا نہ رہے گی نکھی؟ —— اور ساہجو نے گرم ہو کر چار سنائیں۔ اور پاؤ بھر آٹا بھکارن کی جھولی میں ڈال دیا۔

اب وہ شرفاں کے پاس پہنچی۔ شرفاں! شرفاں! ذرا پاس آؤ۔ کان ادھر کر سنو میرا دل تو ساہجو سے اچٹ گیا ہے۔ ابھی میں اس کے گھر سے اُٹھ کر آ رہی ہوں۔ پاؤ آٹا کیا لیا۔ دس بُرائیاں تمہاری سن کر آئی۔ جب دیکھو تمہاری بد خوئیاں، جب دیکھو شرفاں کی عیب جوئی اس کا دماغ ذرا اونچا ہو گیا ہے۔ یہ مجھ تجھ جیسیوں کو خاطر میں نہیں لاتی۔ ذرا اس سے سنبھل کے رہیو۔ زبان کی بڑی کُتری ہے۔ اور شرفاں دانت پیس کر کہنے لگی۔ کہ میں ایسیوں کا تیل نکال کے چھوڑتی ہوں۔ یہ کہتے ہوئے گڑ کی ایک ڈھیلی اندھی بڑھیا کو تھما دی۔ اس طرح آگ اندر اندر سلگ کر جب بھڑکی۔ تو بہت کچھ اس کی لپیٹ میں آ گیا۔

اور اب چوپال میں خوب گرما گرمی رہتی، کبھی پولیس آ رہی ہے۔ کبھی مقدمے کی پیشیاں ہیں اور گواہوں پر تبصرے ہیں۔ کبھی آئندہ کے انتقامی ردّ عمل پر غور و فکر ہے۔ غرضیکہ گاؤں کی زندگی میں ایک عرصے کے لئے تلاطم رہے گا! گاؤں کی زندگی کی ساری ہما ہمی اسی تلاطم سے ہی تو ہے!

سال میں دو مرتبہ گاؤں میں شادیوں کا موسم آتا ہے۔ اسوّں کتوّں اور چیت بیساکھ! اس موسم میں جیسے ایک ایک ذرّے کے اندر سے جگنو سے جاگ اٹھتے ہیں۔ ایک ایک ہونٹ کے افق سے تبسّم کی صبح پھوٹ پڑتی ہے۔ ایک ایک زبان کے چشمے سے گیتوں کی ندیاں بہنے لگتی ہیں۔ عام طور پر کئی کئی شادیاں اکٹھی ہوتی ہیں۔ بسا اوقات ایک ہی گھر کے متعدد لڑکوں اور لڑکیوں کا معاملہ اکٹھا ہی چکایا جاتا ہے اور پھر کم ہی شادیاں ایسی ہوتی ہیں جو ادلے بدلے کی نہ ہوں۔ ایک ہاتھ سے لڑکی دی اور دوسرے ہاتھ سے لی۔ یہ اس کی خالہ کی لڑکی۔ وُہ اس کے ماموں کا لڑکا۔ یہ چچا کی نورِ نظر، وُہ تائے کا آرام جاں! برادری کے جال کے حلقوں میں ہر سال کچھ نئی گرہیں پڑ جاتی ہیں۔ عزت کی اس چادر میں چار ٹانکے نئے لگ جاتے ہیں۔ رشتوں کے طے کرنے میں بڑی بڑی سیاستیں لڑی جاتی ہیں۔ روٹھنا اور منانا ہوتا ہے۔ بیچ میں دلال کام کرتے ہیں۔ اور تو اور گاؤں کی اندھی بھکارن بھی اس جوڑ توڑ کی مہم میں بڑا پارٹ ادا کرتی ہے۔ منت سماجت بھی ہوتی ہے۔ دھمکی اور دباؤ بھی ہوتا ہے۔ بائیکاٹ ہوتے ہیں۔ ایک رشتہ نہ ہونے کے انتقام میں پہلے سے طے شدہ رشتے کٹوا دیے جاتے ہیں [illegible] کی تاریکیوں اور خلوت کے گوشوں میں اس طرح کی متعدد کارروائیاں ہوتی ہیں۔ جو پال گزٹ میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

بالآخر کوئی بات طے ہو جاتی ہے۔ تو پھر کوٹھوں چڑھ جاتی ہے۔ ایک لڑکی پہلے سے زیادہ شرمیلی ہو جاتی ہے۔ اور ایک لڑکا پہلے سے زیادہ کھسیانا ہو جاتا ہے۔ ان کو دیکھ کر ہم جولی سرگوشیاں کرتے ہیں۔ اور پھر سرگوشیاں خندہ زیر لب بن جاتی ہیں۔

اب اندر ہی اندر کپڑے اور زیورات بننے لگتے ہیں۔ عید و عید آتی ہے۔ تو لڑکے کے گھر سے لڑکی کے* لئے جوڑا بن کے جاتا ہے آٹا، گھی اور شکر کا تحفہ دیا جاتا ہے۔ رنگین رسوں کی پینگ بن کے جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اندر ہی اندر مشورے ہو کر شادی کا کوئی دن طے پا جاتا ہے۔ پھر گاؤں بھر کی ایک مجلس مشاورت بلائی جاتی ہے۔ اس مجلس میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو لڑکے والوں یا لڑکی والوں سے کوئی رنجش ہوتی ہے وہ اسے پوری طرح جتا دینے کے لئے شریک نہیں ہوتے۔ اب ان کو منا کے لانے کے لئے ایک "میلہ" (یعنی وفد) جاتا ہے۔ ایک گھر شریک نہ ہو رہا ہو۔ تو اس کے ساتھ کئی اور روٹھ کے بیٹھ جاتے ہیں۔ اور میلہ باری باری ایک ایک کو منانے کے لئے گلیاں ناپتا پھرتا ہے۔ یہاں تک کہ کئی گھروں کو منانے کے بعد آخر میں کوئی ایک بڑا گھر لامحی نامے کے لئے کوئی کڑی شرط لگا کر میلے کے سارے کئے کرائے پر پانی پھیر دیتا ہے۔

ادھر جو لوگ آ جاتے ہیں وہ بیٹھے حقہ گڑگڑاتے رہتے ہیں۔ روٹھنے والوں کے بارے میں قیاس آرائیاں کرتے ہیں گپیں ہانکتے ہیں۔ اور میلے کے ناکام لوٹنے تک رات آدھی سے زیادہ گذر چکی ہے۔ آخر مجلس ملتوی ہوتی ہے۔ اب پھر تانا بانا جوڑنے کی سنجیدہ کوششیں جاری رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ فضا صاف ہو جاتی ہے اور مجلس مشاورت پھر بلائی جاتی ہے۔ مجلس میں لڑکے والے یا لڑکی والے یا دونوں مشترک طور پر گاؤں بھر کے نمائندوں کے سامنے اپنے نئے تعلق کا تعارف کراتے ہیں۔ اور پھر شادی کی مہمات میں تعاون کی اپیل کرتے ہیں۔ اور طے شدہ دن کے بارے میں اعلان کر کے سب کی منظوری حاصل کرتے ہیں۔ پھر دعائے خیر ہوتی ہے۔ اور شکر بٹ جاتی ہے۔ اور مبارک باد کی آوازیں بلند ہوتی ہیں۔ ادھر لڑکیوں کی فوج ایک گھڑا اور ایک کانسی کا تھال لئے گیت گا رہی ہوتی ہے جن کی آواز رات کے سمے دور دور کی بستیوں تک جا پہنچتی ہے۔ اب شادی کی تکمیل تک نغموں کا طوفان بپا رہتا ہے۔ یہ طوفان کسی ایک گھر سے نہیں ابلتا۔ بلکہ کئی کئی گھروں سے بیک دم اس کے سوتے ابلتے ہیں۔ اور لڑکیاں مختلف گھروں میں جا جا کر ذوقِ تنوع کو سیراب کرتی ہیں۔ ایسے موقعوں پر گلابی اور نوراں تو بالکل قیادت بن جاتی ہیں۔ ایک کمہارن ہے تو دوسری تیلن گاؤں بھر کے نوجوانوں کی بدنگاہی کی تختۂ مشق! صورت تو خیر کچھ سہی، کم بختوں نے گلا بلا کا پایا ہے۔ ڈھول یا "گھڑے تال" کے ساتھ جب یہ پنجابی "گون" گاتی ہیں۔ تو ان کے نغمے ہوتے میں کوئی کسر نہیں رہ جاتی۔ شادی کے موقعوں پر بسا اوقات گانے کی مجلسیں مخلوط ہوتی ہیں۔ بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ نوجوان مردوں کی ایک ٹولی اور عورتوں کا ایک غول آمنے سامنے ہو کر کورس کے طور پر ایک ہی چیز گاتے ہیں۔ پھر جب "گھڑولی" بھری جاتی ہے تو گلابی اور نوراں کی قیادت میں ایک کاروانِ نغمہ گلی گلی گھومتا ہے۔ نوراں بن ٹھن کر دولہا کے نہانے کا پانی ایک پھولدار گھڑے میں سر پر لئے اور سرخ دیہاتی بانا اس کے اوپر رکھے۔ نہایت خطرناک انداز سے متحرک ہوتی ہے جب وہ تھک جاتی ہے تو پھر گھڑی گلابی اٹھا لیتی ہے۔ اس سے زیادہ غارت گر سماں وہ ہوتا ہے۔ کہ جب رات کو "مہراج" اور اس کے شاہ بالوں کو یہی کاروانِ نغمہ پورے گاؤں میں گھماتا ہے۔ اوپر سفید سفید پارہ ہائے ابر کے درمیان چاند چمک رہا ہوتا ہے۔ فضا میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے ایک خاص کیف بکھیرتے جاتے ہیں۔ اور ادھر "ڈھمک ٹھن" "ڈھمک ٹھن" کے انداز پر بجتا ہوا دیہاتی ڈھول، اور ڈھول کی آواز پر حکومت کرتی ہوئی گلابی اور نوراں کی آواز ——

مہراج منڈھ دہ پھلا ہے وا متے اسیں چنبے دیاں کلیاں
بول مہراجا! چال مہراجا! کیہڑے دیلے دیاں کھلیاں
کھلیاں کھلیاں رات گزاری ، دکھن پیراں دیاں تلیاں

[دولہا تو پھلاہ کا شگفتہ ہے اور ہم چنبیلی کی کلیاں ہیں۔ دولہے میاں کچھ بول، ہم کب کی کھڑی ہیں
کھڑے کھڑے ہم نے رات گزار دی۔ پاؤں کے تلوے دکھنے لگے ہیں۔]

میرا گاؤں

بھی طوفان صورت ہے۔ کہ جو ذوقِ معصیت ایک کھیل زاروں کی آبیاری کرتا ہے جس سے دلوں میں کسک آتی ہے۔ جس سے انکھڑیوں میں فتنہ کی نگاہیں نمودار ہوتی ہیں۔

پھر شادی والے گھر کی طرف سے گاؤں بھر کی دعوت ہوتی ہے۔ گوشت کا پتلا پتلا شوربہ اور گڑ اور سوجی سے مرکب حلوا اور جلی ہوئی سوکھی سوکھی چپاتیاں بے دریغ لٹا دی جاتی ہیں۔ برادری والے کھاتے ہیں۔ کمیں کھاتے ہیں۔ گداگر اور بھکاری آ آ کر کھاتے ہیں۔ اور جو بچ رہتا ہے اسے بیل اور مویشی کھاتے ہیں۔ سلطانِ کلیجہ شاہ کی بہی کے کورے صفحوں پر نئے نئے انگوٹھے لگ جاتے ہیں۔

چوپال میں شادیوں کے ہر ہر پہلو پر روزانہ ساتھ کے ساتھ تبصرے ہوتے رہتے ہیں۔ فلاں کا جہیز لاجواب تھا۔ فلاں نے روٹی تحسینوں کی طرح دی ہے۔ فلاں نے کمیوں کو راضی کرنے میں کنجوسی دکھائی ہے۔ فلاں کا جوڑ اچھا نہیں ملا۔ فلاں نے حلوے میں بازاری گھی ڈلوایا ہے۔ آخر جب کھیتی باڑی کے کاموں میں مصروفیت کے دن شروع ہو جاتے ہیں۔ تو چوپال کے ان تبصروں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

ہاں! ایک بار چوپال میں بڑی گرما گرمیاں رہی تھیں! دینو نائی بچارا دس بارہ سال سے "رانڈ" پڑا تھا۔ ایک تو غریبی، اوپر سے اس کا بھینگاپن۔ کوئی عورت بیاہنے کو ملتی نہ تھی کہ کم سے کم چولھا تو گرم رہے۔ وہ ایک مرتبہ چوہا سید ان شاہ کے میلے پر گیا۔ تو واپسی پر ایک عورت ساتھ لے آیا۔ چوپال میں تبصرے شروع ہو گئے۔ انور تیلی مونڈھے پر سَن ڈالے، چرخی گھماتا آیا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ آج وہ کسی اہم خبر کا پٹاخہ لے کر آ رہا ہے۔

چوپالیوں کو سلام کیا، اور سَن بٹتے بٹتے مسکرا کر بات چھیڑی۔ کہ "دینو کو عورت کہاں سے مل گئی"۔ مہتاب نائی کو برادری کا لحاظ تھا۔ اس لئے اس نے بات ٹالنے کے لئے کہا۔ کہ "بیاہ کر لایا ہے اور کیسے، سو ڈیڑھ سو روپیہ پلے سے دے کر آیا ہے یونہی تھوڑی!" مگر انور کو دال میں کالا دکھائی دے رہا تھا۔ انور نے کہا۔ "بھائی تابے! بیاہ کر لانے کا کیا نشان پتہ؟ میں تو جانوں ایسے ہی اڑس لایا ہے"۔ جاما میراثی قہقہہ لگا کر ہنسا اور بولا "انور! تو غریب کا گھر بسنے دیگا یا نہیں"۔ "مگر" انور نے مضطرب ہو کر سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "جی نہیں! آخر دین، ایمان، عزت کوئی چیز ہے کہ نہیں۔ بے نکاحی عورت گاؤں میں اس طرح رہے تو خدا کا عذاب آئے بنا نہیں ٹلتا۔"

اور اب پورے گاؤں میں بے نکاحی عورت کا مسئلہ زیرِ بحث آ گیا۔ چودھریوں اور پنچوں نے دینو کے بتائے ہوئے اتے پتے پر آدمی بھیجے تو معلوم ہوا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ اب دینو کو چوپال میں نوٹس دے دیا گیا۔ کہ یا عورت کو واپس کر کے آ، ورنہ حقہ پانی بند، دینو کہتا تھا کہ میں نے ڈیڑھ سو روپیہ دیا ہے اور چونکہ معاملہ اندیشے والا تھا۔ اس لئے نکاح خفیہ پڑھا لیا تھا۔ اب میں عورت کو ہاتھ سے کیسے جانے دوں؟ میرا گناہ میری گور گردن پر! آخر آپ لوگ کیوں پیچھے پڑ گئے ہیں؟ شام کو دینو کا حقہ پانی بند کر دیا گیا اور ڈھنڈورہ پٹ گیا۔

اب بنئے کی جرأت نہ تھی کہ دینو کو سودا دے، اسے حق نہ تھا کہ کسی کنوئیں سے پانی لے سکے اور کسی کھیت میں رفعِ حاجت کر سکے۔ آخر وہ عورت کو لے کر تیسرے دن پاس کے گاؤں میں اپنے ماموں کے ہاں جا پڑا۔ مگر پنچوں نے پیچھے ہی آدمی دوڑائے اور دوسرے گاؤں والوں کو خبردار کر دیا کہ "اگر بے نکاحی عورت کو پناہ دو گے تو ہمارا آپ کا مرنا جینا ختم، جنازوں تک میں کوئی شریک نہ ہو گا اور نہ کسی طرح کا لین دین رہے گا! وہاں بھی طوفان مچ گیا! ادھر چوپال اس قصے سے خوب گرم رہنے لگی۔

آخر دینو کا ماموں اپنے گاؤں کے دو چار بڑے آدمیوں کو لے کر یہاں پہنچا اور ایک ایک پنچ کی منت سماجت کی۔ آخر طے یہ ہوا کہ دینو جائے اور عورت کے گاؤں سے گواہیاں لے کے آئے کہ عورت پہلے سے بیاہی ہوئی نہیں ہے۔ پھر اس کا نکاح ہو۔ تب ہم گاؤں میں قدم رکھنے دیں گے ——— اور دینو کو یہ سب کچھ کرنا پڑا۔

میرا گاؤں

گاؤں کے شمال میں قبرستان ہے اور قبرستان میں ایک خانقاہ واقع ہے۔ یہ خانقاہ گاؤں ہی کیلئے نہیں بلکہ علاقے بھر کے لئے ایک مرجع ہے۔ اس خانقاہ میں میرے ہی خاندان کے ایک مجذوب بزرگ کا جسد مدفون ہے آس پاس کچھ اور قبریں ہیں۔ جن کے گرد ایک چاردیواری بنی ہوئی ہے۔ اور مغرب کی طرف ایک محراب اور اونچا دروازہ سنگ سرخ سے بنوایا گیا ہے۔ اس دروازے کی محراب میں کانچ کے رنگین فانوس اور گلوب لٹکے ہوئے ہیں۔ قبر کی پائنتی کی طرف کریل کا ایک معمر درخت ہے۔ جس کی ایک ایک ٹہنی کے ساتھ پرانا چیتھڑے لٹک رہے ہیں۔ قبر کے سرہانے مجاور کی نشست ہے۔ مجاور ایک ادھ بالشت آدمی ہے۔ خاندان کا نیچ۔ عادات و اطوار کا پست، ظرف کا کمینہ، نگاہ کا میلا خوب بنا ٹھنا رہتا ہے۔ آنے جانے والے اس کے سامنے قبر کو سجدے کرتے ہیں۔ اور اسے پورا اطمینان دلاتے ہیں۔ کہ شاہ جالب کی روح تک احترام کا حق ادا کر رہے ہیں۔ پھر وہ قبر کے سجدے کے بعد مجاور کے ہاتھ پاؤں چومتے ہیں کیونکہ اسی کے وسیلے سے تو شاہ جالب کی روح تک رسائی ہوتی ہے۔ دربان کو ہاتھ میں نہ لیا جائے تو درگاہ میں باریابی کیسے ہو سکتی ہے۔ عورتیں آتی ہیں۔ بوڑھی عورتیں، نوجوان عورتیں اور بڑی بڑی تمنائیں لے کر آتی ہیں۔ شادی ہو جائے۔ بر اچھا ملے۔ خاوند جلد چھٹی آ جائے، ساس کا دل نرم پڑ جائے۔ بھوت پریت کا سایہ دور ہو۔ گود ہری ہو جائے۔ پھر علاقے کے نوجوان آتے ہیں۔ نوکری کی درخواست لے کر، شادی کی عرضی لے کر، اپنے باپ کی رہن رکھوائی ہوئی زمین چھڑانے کی دعائیں لے کر، پھر جواری آتے ہیں، بازی جیتنے کے لئے شاہ جالب کی حمایت حاصل کرنے، چور آتے ہیں، نقب زنی میں شاہ صاحب سے کامیابی کی ضمانت لینے۔ مقدمہ باز آتے ہیں، مقدمہ جیتنے کے لئے خانقاہ کی تائید حاصل کرنے۔ بیمار آتے ہیں مرض دور کرانے کے لئے کوئی قبر پر پڑے ہوئے مرمریں پتھروں اور رنگ برنگی کوڑیوں اور سیپوں کو بدن پر ملتا ہے۔ کوئی مزار کی خاک چاٹتا ہے اور تبرک کے لئے ساتھ بھی لے جاتا ہے۔ پھر لوگ چادریں لے کے آتے ہیں اور مزار پر چڑھاتے ہیں۔ مرغ لاتے ہیں۔ گھی اور آٹا دانہ لاتے ہیں۔ شیرینی لاتے ہیں۔ نقد پیسے قبر پر رکھتے ہیں۔ دودھ کی مٹکیاں لاتے ہیں۔ بھیڑ بکریاں لاتے ہیں۔ ڈھول بجاتے ہوئے جھنڈے لہراتے ہوئے۔ گانا گاتے ہوئے۔ بھانگڑا ناچتے ہوئے ——— اس طرح شاہ جالب کی روح خوش ہو جاتی ہے۔ اور لوگوں کی آرزوئیں پوری ہو جاتی ہیں۔ مجاور فن کا بڑا ماہر ہے۔ وہ خانقاہ کے [illegible] کو طرح طرح کے خواب سناتا ہے۔ مختلف اوہام میں مبتلا کرتا رہتا ہے۔ فال گیری بھی کرتا ہے۔ دم درود، تعویذ گنڈے کا کام بھی کرتا ہے۔ دنیا کی دنیا ہے کہ اس پر لٹو ہے!

یوں تو نت لوگوں کا تانتا لگا ہی رہتا ہے۔ لیکن اصل رونق جمعرات کی جمعرات کو ہوتی ہے۔ مزار کے سلام کو مردوں اور عورتوں کے غول کے غول ہر طرف سے نکل پڑتے ہیں۔ پھر شام کے جھٹ پٹے کے بعد ذرا زیادہ گہری قسم کے مرد اور عورتیں حاضری دینے نکلتے ہیں۔ [illegible] چھیڑ خانیاں کرتے ہوئے، پنجابی کے گانے گاتے ہوئے۔ خفیہ ملاقاتوں کے وعدے پورے کرتے ہوئے۔ قبرستان کی جھاڑیوں [illegible] کے مشرقی کھنڈروں میں رومانس کی آخری پستیوں میں گرتے ہوئے رات پوری کی پوری گزار دیتے ہیں۔

جمعرات کے میلے سے آگے بڑھ کر پھر عید الفطر اور عید الضحیٰ کا موقع آتا ہے۔ جبکہ [illegible] کے قافلے کے قافلے زیارت کے لئے روانہ ہوتے ہیں۔ جبکہ گاؤں گاؤں کے ڈھول جمع ہو کر ڈھول پیٹنے کا مقابلہ کرتے ہیں۔ [illegible] اور [illegible] کے آرٹ کی بھی نمائش کی جاتی ہے۔ گھوڑ دوڑ، کبڈی اور پہلوانی اور بوجھ اٹھانے کے مقابلے ہوتے ہیں۔ اچھی نسلوں کے بیلوں کی جوڑیاں آتی ہیں۔ جن کی پیٹھوں پر گوٹا لگی سبز اور سرخ جھولیں پڑی ہوتی ہیں۔ اور سینگوں پر سونے کے ورق آراستہ ہوتے ہیں۔ پھر ڈھول کے ساتھ "کراہ لگانے" کا مظاہرہ ہوتا ہے، اچھی جوڑیوں کا شہرہ ہو جاتا ہے۔ اور وہ بڑی بڑی قیمت پا جاتی ہیں۔

بھانڈ اور مداری اپنے کرتب دکھاتے ہیں، کبھی کبھی کوئی طائفہ بھی آ پہنچتا ہے۔ [illegible] رہتی ہے۔ بڑھئی اور لوہار اور جولاہے اور دوسرے صنعت کار اپنی اپنی صنعتوں کے نمونے تیار کر کے لاتے ہیں۔ حلوائی [illegible]

اور جلیبیاں بنا بنا کے ڈھیر لگا دیتے ہیں۔ بنگیارے چوڑیوں کے ٹوکرے سجا کے بیٹھتے ہیں۔ سیٹیاں اور شہنائیاں بجتی ہیں اور ہر طرف رنگ کے غبارے اڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ پگڑیوں پر کلف دار طرّے، ریشمی لنگیوں کے تہ بند، زرکار پوٹھوہاری جوتیاں، کانوں میں سونے کے بالے، نونہ طوطوں پر سفید، سرخ اور پیلے ریشم کے کاڑھے ہوئے کھدر کے کالے رومال، اس لباس کے ساتھ دھنی کے جوان دیدنی ہوتے ہیں۔ ایک دن مردوں کا خاص ہوتا ہے اور اس روز عورتیں کم کم نظر آتی ہیں۔ دوسرے روز عورتوں کا میلا ہوتا ہے اور بس چند سر پھرے لڑکے ان میں گھسے پھرتے ہیں سوچا جائے تو یہ خانقاہ نری مذہبی عقیدتوں کا مرکز نہیں۔ علاقے کا ایک سوشل مرکز ہے۔ اس کے ذریعے مردوں کے لئے بھی اور خاص طور پر عورتوں کے لئے تفریح کا دروازہ کھلتا ہے۔ رومانس کے مواقع پیدا ہوتے ہیں۔ ہر طرح کے آرٹ اور فنون کی نمائش ہوتی ہے مصنوعات کو فروغ ہوتا ہے۔ مختلف بستیوں کے لوگوں کا میل جول بڑھتا ہے۔ ان فوائد کے ساتھ روحانی تسکین اور رضائے الٰہی بالکل مفت!

شاہ جالب کی خانقاہ کی گہما گہمیاں بھی چوپال کے تبصروں کا ایک اہم موضوع ہوتی ہیں۔ ہر جمعرات کی رات کو اسرارِ نہاں کے ابواب یہاں آ کے کھلتے ہیں۔ اور عیدوں کے میلوں کے موقع پر تو دس دن پہلے اور دس دن بعد وہ چرچے رہتے ہیں کہ بس!

اور ایک دفعہ ایسا ہوا کہ صبح سویرے ہی سویرے چوپالی بیٹھے دھوپ تاپ رہے تھے۔ حقہ گرم تھا مگر چوپال بجھی بجھی سی تھی۔ یکایک مکھا ما چوکیدار ایک گدلا اوڑھے اپنی ململی اور بے ڈھب داڑھی کو کھجاتا ہوا اور ٹھٹھر ٹھٹھر دل ڈھول کرتا آیا۔ اور اس نے چوپال گزٹ کے لئے تازہ ترین گرما گرم خبر جیسے چوپالیوں کے اوپر آ کے پھینک دی — "جمالاں اڑ گئی!"

"ہیں جمالاں اڑ گئی؟" بیک زبان دو تین آدمی بول اٹھے۔

"پر لگ رہے تھے اسے، ہیں پر ابر ابر کر رہا تھا۔ یہ تو ایک دن ہونا ہی تھا، سو ہو گیا!"

"گئی کس کے ساتھ؟"

"ابھی کچھ معلوم تو ہوا نہیں، صرف ایک پھُر کی آواز آئی اور بلبل اڑ گئی!"

"بچاری کرتی بھی کیا، دس سال ہو گئے اسے عذاب ہوتے!"

"بھائی جانو! عزت دار نہیں تھی۔ عزت دار ہوتی تو قبر میں جا پڑتی۔ اور اُف تک نہ کرتی۔ آخر اس گاؤں میں ایسی ایسی کڑیاں ہیں کہ گھروں سے اجڑے اجڑے جوانیاں گزار دی ہیں۔ بال سفید ہو گئے۔ مگر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ ان کی طرف! نسل پاک ہونی چاہئے۔ نسل اور بیج پاک نہ ہو تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہونہہ! بچاری کرتی کیا۔ کیوں نہ کنوئیں میں گر کر مر گئی؟"

جمالاں کا بیاہ ہوئے دس برس ہونے کو آئے۔ مگر جعفر سے جوڑ ملا تو ایسا کہ "رات پھیرے" دیا۔ اصطلاح ہے۔ جب دلہن سسرال میں دوجا لو دوزہ پہلی مرتبہ رہ کر میکے آتی ہے۔ تو اسے "رات پھیرا" کہتے ہیں) آئی تو پھر کسی کو اس کی یاد ہی نہ آئی۔ کہ اسے پھر گھر لانا بھی ہے۔ حد یہ ہے کہ شوہر نے اسے تیسرے ہی روز پیٹ ڈالا۔ ایسی تو دنیا میں کبھی نہ ہوئی تھی۔ باپ تھا نہیں انتہائی غربی میں پلی ماں سے گھٹریوں سے پڑا۔ اور دولہا صاحب کا حال یہ کہ پہلی بیوی دو ہی مہینے میں طلاق لے کے چلتی بنی۔ اور دوسری کو مار پیٹ کے دھکا دے دیا۔ گاؤں بھر میں چرچا یہ ہے کہ یہ لڑکا بیوی رکھنے کا اہل ہے ہی نہیں۔ بڑا گھر ہونے کے زور پر شادیاں تو کی جا سکتی ہیں مگر عورت بڑے گھر کی خانقاہ کو پوج کر تو نہیں زندہ رہ سکتی۔ اسے کچھ اور بھی چاہیئے۔ یہی "کچھ اور" میاں صاحب کے پاس نہیں ہے۔ جمالاں بھائی کے گھر پڑی رہی۔ بیسیوں دسیلے کئے گئے۔ گاؤں کے پنچوں نے معاملہ سلجھانے کی کوششیں کیں۔ مگر جمالاں کے خاوند کی یہ ضد۔ نہ ٹوٹی۔ کہ یہ تو طلاق ہی دوں گا۔ کیونکہ اس سے عزت جاتی ہے اور نہ گھر ہی بسا دوں گا کیونکہ جمالاں سے اس کا مزاج نہیں ملا۔ جمالاں کی نگاہ پاک نہیں ہے۔ وہ آتے جاتے کو دیکھتی ہے۔ وہ ہر ایرے غیرے کے سامنے مسکراتی

ہے۔ اس کا چلن ٹھیک نہیں ہے۔ دال میں کچھ کالا ہے؟

پھر جمالاں نے گاؤں کی چکیاں پیسیں۔ چرخے گھمائے۔ کھیتوں پر مزدوریاں کیں۔ پرائی فصلیں مٹھی مٹھی بھر غلے پر کاٹیں۔ ایک ایک روٹی کے لئے گھاس کے گٹھڑ ڈھوئے، لوگوں کے پانی بھرے۔ لپائیاں کیں۔ چولھے بنائے۔ اُپلے تھاپے۔ اور ایک ایک ہفتہ، ایک ایک مہینہ، ایک ایک سال بسر کیا۔ پھر بھی وہ اپنے اکھڑ بھائی کے لئے بارگراں ہی رہی۔ آہستہ آہستہ بھائی نے بدزبانی اختیار کی۔ سیدھے منہ بات کرنا چھوڑ دیا۔ بالآخر مار پٹائی تک نوبت پہنچی۔ بھائی تو خیر۔ لیکن بھاوج تو بس اپنی زبان کی نوک پر ہر وقت بچھو اور تتیے کا ڈنک لئے رہتی۔ جمالاں یہ ڈنک سہتی رہی، سہتی رہی۔ دس سال تک سہتی چلی گئی۔ مگر آخر وہ بھی مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ اس کے سینے میں بھی دل تھا۔ اس کی رگوں میں بھی خون کھولا دواں تھا۔ اس کے اندر بھی انسانوں کے سے جذبات تھے۔ پیمانہ لبریز ہوتا گیا!

جمالاں پر سسرال والوں نے بدنگاہی کا الزام لگا لگا کر آہستہ آہستہ اسے بدنگاہی کے پیاسوں کی طرف دھکیل دیا۔ گاؤں کے سربراہوں نے جمالاں کی آنکھوں کے اندر جھانکنا شروع کیا کہ ان آنکھڑیوں میں اگر کوئی چشمۂ بدنگاہی جھلکتا نظر آئے۔ تو اپنے جام بھریں۔ مگر جمالاں درحقیقت ایک پاکباز لڑکی تھی اس کی آنکھوں کی نیلاہٹ میں ابھی تک فتنے کے سرخ ڈورے کسی نے نہ دیکھے تھے بس اتنا ضرور تھا کہ وہ غیر محتاط تھی۔ وہ ہر طرف آنکھیں اٹھا دیتی تھی۔ وہ جب بات کرنے لگتی تو اس کے ہونٹ عادتاً متبسم ہو جاتے اور ایک دکھی دل بسا اوقات اس تصنع میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ بس اسکی یہی کمزوری تھی۔ جسے ہر شکاری بھانپ رہا تھا۔ اس کے دل کے گھر میں معصیت کی نہ سہی، مروت کی ایک کھڑکی ضرور کھلتی تھی نقب زن اس کھڑکی کے گرد منڈلا رہے تھے۔ کچھ وہ تھے جو ہمدردی کے کلمات کہہ کر اس کے دل میں گھر کرنے کی سعی کرتے، کچھ وہ تھے جو خیرات زکوٰۃ کا روپیہ دیکر اور شادی مرگ پر روٹی بھجوا کر راستہ بنانے میں لگے ہوتے۔ جمالاں کی فطری پاکبازی ان حملوں کی مدافعت کرتی رہی، مگر آخر تابکے۔ ایک طرف اس کی عصمت کے دامن پر چھوٹے داغ لگانے کی مہم تھی جو اس کے اندر جذبۂ انتقام پیدا کر رہی تھی، دوسری طرف بھائی اور بھاوج کی بدسلوکی تھی جو اس جذبہ کی آگ کو بھڑکا رہی تھی اور تیسری طرف شکاری تھے جو جال دل طرف ڈالنے پھیر رہے تھے جمالاں اپنی روحانی تسکین کے لئے خانقاہ کے سلام کی بڑی پابند تھی۔ آندھی ہو، بارش ہو، سردی ہو، کچھ ہو اس نے کوئی جمعرات کبھی ناغہ نہ کی اور اس کے آگے پیچھے شکاریوں کے غول بھی بڑے اہتمام سے نکلتے پھر وہ ایسے گلنے لگتے جن کے ذریعہ جمالاں کے سینے کے جذبات میں تلاطم اٹھایا جا سکے اور ان گانوں میں بسا اوقات خاص اشارے ہوتے اور کتنی ہی باتیں خاص طور پر جمالاں پر منطبق ہو جاتیں۔ پھر کبھی کبھی اس کے قریب کچھ پُر اسرار سرگوشیاں ہو جاتیں، کبھی ہنسی کے طور پر بے تکلفانہ انداز سے کوئی رند مزاج کسی نہ کسی طرح کا نیکھا فقرہ چست کر جاتا جس سے مزاج کو ٹٹولنا مقصود ہوتا۔ پھر اگر ذرا بھی ناگواری کا شبہ ہوتا تو فوراً اس فقرے پر ہمدردی کے سنجیدہ کلمات کا مرہم رکھ دیا جاتا۔

"جمالاں تو تو بڑی دکھی ہے! ظالموں کے ساتھ معاملہ آپڑے تو ایسا ہی ہوتا ہے؟"

"قسمت کا لکھا کوئی نہیں مٹا سکتا جمالاں!"

"اس درگاہ پر جمالاں جس طرح قربان ہے، ضرور کچھ پا کے رہے گی!"

اس طرح کی باتوں میں اصل بات کو لوگ لپیٹ لپاٹ دیتے!

آخر جمالاں نرغے میں آگئی! ایک نوجوان اس سے ہمدردی جتلاتے جتلاتے یہاں تک جا پہنچا کہ جمالاں محض تیری نجات کی خاطر میں للہ فی اللہ یہاں تک جانے کو تیار ہوں کہ جعفرو کے خون سے ہاتھ رنگوں! تو ایک بار اجازت دیدے۔ بس اس کے بدلے میں تجھ سے کچھ نہیں چاہتا، میں صرف شاہ جالب کی محبت ڈھونڈ رہا ہوں! اور جمالاں خانقاہ کے احاطے سے پچاس گز دور کی جھاڑیوں میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ——— مروت کی کھڑکی کے پٹ کھل گئے!

——— مگر وہ کسی کا خون بہانے کو پسند نہ کرتی تھی، وہ قسمت پر راضی تھی، وہ گھل گھل کر مر جانا پسند کرتی تھی!

شکاری بڑا ہوشیار تھا۔ وہ شکار پر ایک دم نہیں جھپٹ پڑا، ورنہ شکار اڑ گیا ہوتا۔ اس نے دھیرے دھیرے بغیر کسی آہٹ کے بڑھنا شروع کیا

اور شکار پر ہاتھ ڈالنے تک کئی مہینے گزار دیئے ۔ آخر ایک جمعرات کو اسی خانقاہ کے پہلو میں دونوں گناہ کے اندھیروں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گئے —— جبکہ شاہ جالب کی قبر کے سامنے قوالی ہو رہی تھی ۔ اور پھر ہر جمعرات تاریک سے تاریک تر ہوتی گئی ۔ ایک بدکار نے جو راستہ کھولا تھا اب وہ دوسرے بدکاروں کے لئے بھی چوپٹ کھل گیا ۔ اب ہر نظر شناس نے بھانپ لیا کہ جمالاں کی انکھڑیوں میں معصیت کے سرخ ڈورے پڑ چکے ہیں اب وہ الفڑ دوشیزہ کے پھندے میں پھنسا ہوا شکار تھی ۔ جمالاں اب خرابات تھی ۔ اب اس کے جام میں تُت نئی شرابیں انڈیلی جاتی تھیں ۔

اور جمالاں چوپال کا نیا رومانی موضوع بن گئی ۔ جعفرو اور اس کی ماں کہتے "دیکھا اب تو بات کھل کر سامنے آگئی ، چڑھے چاند کسی سے چھپے نہیں رہتے ۔ لوگ میرے بیٹے کو ملامت کرتے تھے کوئی نہیں سوچتا تھا کہ جعفرو کیوں کوستا ہے ! جعفرو نے تو پہلے دن ہی اسکی آنکھوں سے اسکی ساری داستان پڑھ لی تھی !"

اب جمالاں کو پَر لگ چکے تھے ۔ اب وہ قفس میں کیوں رہتی ۔ وہ قفس جو اس کے بھائی اور بھاوج نے بنا رکھا تھا اس کے گاؤں والوں نے بنا رکھا تھا اس کے علاقے نے بنا رکھا تھا وہ کیوں اس میں گھٹتی؟ اب وہ اڑنا چاہتی تھی ۔ وہ اب خانقاہ جا کر ہر جمعرات کو جھانپتی تھی کہ کوئی اُڑن ساتھی ہاتھ آجائے تو وہ پھر سے اُڑ جائے —— اور آخر جو تھی اسے اُڑن ساتھی مل گیا وہ پھر سے اُڑ گئی !

چوکیدار بتا رہا تھا کہ کل وہ لیر سے سنور سے میلے کچیلے کپڑوں میں گئی تھی ۔ پہلے ہمیشہ اس کا اور گلابی کا ساتھ رہتا تھا مگر کل اس نے گلابی کو خبر تک نہیں کی ۔ رات اس نے کھانا بھی کچھ نہیں ، گھر میں یہ کہا کہ سر میں درد ہے ، سلام کر کے آؤں گی تو کھاؤں گی نہیں تو ایسے ہی پڑ رہوں گی ۔ مجاور کہہ رہا تھا کہ قبر کے سامنے بڑی دیر تک سجدے میں پڑی دعا کرتی رہی اور ایک روپیہ چڑھاوا چڑھایا ، پھر چلی گئی ۔ لڑکے کہہ رہے تھے کہ رات درگاہ میں ایک اجنبی گھبرو آیا تھا جو جمالاں کو بار بار تاکتا رہا ، پھر وہ جب درگاہ سے نکل کر اندھیرے میں گم ہو گئی تو قبر پر سلام کر کے وہ بھی اسی رُخ چلا گیا جدھر وہ گئی تھی بس اتنی کہانی معلوم ہے ، باقی اللہ جانے ، ایک اودھم جمالاں کے سسرال میں مچا ہوا تھا اور ایک اس کے میکے میں اور چوپال میں رونق آگئی تھی ۔

اور چوپال اس روز بھی بڑی گرم ہو گئی تھی جس روز پہلے پہل سیاست نے اپنا قدم گاؤں میں رکھا ۔ گاؤں کا نمبردار کسی مقدمے میں گواہی دینے ضلع گیا ۔ تو ایک جلسے میں تقریریں سن کے آیا ۔ تقریروں اس کے پلے میں جو کچھ پڑا وہ اتنا ہی تھا کہ ہندو سو کرسیوں میں سے پچھتر خود لے جائیں گے اور پچیس مسلمانوں کو ملیں گی اور جو فیصلہ یہ پچھتر کرسیاں کریں گی وہ پچیس کرسیوں کو ماننا ہوگا ۔ وہ اگر فیصلہ کر دیں کہ گائے کی قربانی بند ہو جائے تو کوئی مسلمان قربانی نہیں کر سکے گا ۔ اسی طرح وہ اگر کسی مسجد کو گرانے کا حکم دیدیں تو اسے پچیس کرسیاں روک نہ سکیں گی ۔ چوپالیوں نے جب یہ سنا تو ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں ۔ جیلے تیلی نے نمبردار سے پوچھا "پھر کیا ہوگا؟"

نمبردار نے کہا "ہوگا کیا ! ہندو مسلم کا کیا میل ، ہم اس چال میں نہیں آئیں گے جلسے والوں نے کہا ہے کہ ہندو بادشاہی الگ ہوگی اور مسلمان بادشاہی الگ ۔ ادھر کی سَو کی سَو کرسیاں ہندوؤں کی ادھر کی سَو کی سَو کرسیاں ہماری ، ان کی کانگرس تو ہماری مسلم لیگ ! اس کا گاندھی تو ہمارا جناح ۔ ان کا ہندوستان تو ہمارا پاکستان !" اور پھر نمبردار نے تہمد کے ڈبّے میں سے اخبار "زمیندار" کا ایک پرچہ نکال کر میدان میں ڈال دیا کہ یہ دیکھ لو اسلامی اخبار ہے اس میں حرف حرف یہ باتیں لکھی ہیں " چوپالی اخبار لئے مسجد کے امام کے پاس پہنچے اور وہاں یہ اسلامی اخبار پڑھا گیا ، حرف حرف پڑھا گیا ، میدہ سالانہ سے لے کر بہتوں کا بھلا ہوگا تک پڑھا گیا اور ایک نئی لہر دوڑ گئی تھی !

نمبردار کے نام اب اخبار زمیندار باقاعدہ آنے لگا اور کاہنے شاہ تو پہلے ہی "ملاپ" منگاتا تھا جسے سارے ہندو باری باری سے کر پڑھتے تھے بار بار دیکھنے لگی ۔ الیکشن لگ رہے تھے اور گاؤں میں سیاست کی فضا پیدا ہو رہی تھی ۔ پہلا مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ ہندوؤں سے سودا خریدنا جائز ہے یا نہیں اور بہت سے مولویوں کے دستخطوں کے ساتھ چھپا ہوا فتویٰ نمبردار لے آیا کہ ہندوؤں سے سودا خریدنا حرام ہے ۔ چند ہی دنوں میں چندہ کر کے ایک لڑکے کو اسلامی دکان کھول دی گئی اور کاہنے شاہ اور مہر چرن سنگھ کی دکان پر اُلّو بولنے لگا ۔ مگر کاہنے شاہ اور مہر چرن سنگھ کی جڑیں گہری تھیں ۔ گاؤں کے

میرا گاؤں

چوہدری اور پنچ ان کے مقروض تھے اور ان میں سے ہر ایک کا انگوٹھا ان کی بہیوں پر لگا ہوا تھا۔ وہ ہر ایک سے ہاتھ جوڑ جوڑ کر کہتے کہ مہاراج جی! ہم تو آپ ہی کے سائے میں پل رہے ہیں۔ آپ ہماری روزی بند کرنا چاہتے ہیں؟ ہم تمہارا کوئی چور نہیں، لیکن پھر ہمارے حساب ساپھ کر دیجئے، کل کو یہ نہ ہو کہ آپ ہمیں ادھر سے بھی جواب دے دیں!" حساب کا دباؤ جب پڑا تو چوہدریوں کی آنکھیں کھلیں، مگر ابھی فتوے کا جوش بھی خاصا زور دار تھا۔ ٹال مٹول ہوتی رہی —

ادھر مشکل یہ آپڑی کہ اسلامی دکان میں سرمایہ تو تھا ہی ڈیڑھ دو سو، وہاں سے بھلا ادھار کیسے ملتا اور گاؤں کی ساری خریداری تو تھی ہی ادھار کی، فصل کی فصل حساب چکے جاتے تھے۔ ایک چوہدری کا باپ مرگیا تو اچانک اس کا مرنا کرنے کے لئے گڑ چاولوں کی ضرورت محسوس ہوئی اور نقد روپیہ بھی ادھار لینا پڑا۔ آخر کاہنے شاہ ہی کے پاس جانا پڑا۔ کاہنے شاہ نے اچھی طرح ٹینٹوا دبایا اور انگوٹھا بھی لگوایا اور زیور بھی گروی رکھ لیا۔ خود نمبردار کو ایک زمین خریدنے کے لئے روپے کی ضرورت پڑ گئی اور وہ بھی کاہنے شاہ کے گھٹنوں کو ہاتھ لگانے پر مجبور ہو گیا۔ یہاں تک کہ بائیکاٹ کے معاہدے میں بڑے بڑے شگاف پڑ گئے اور ادھر اتنے میں اسلامی دکان کا سرمایہ بھی ڈوب چکا تھا، کچھ تو ادھار میں گیا، کچھ ناتجربہ کاری سے نقصان پہنچا، کچھ ہندو دکانداروں کا مقابلہ کرنے میں گیا اور کچھ پیوں کارندے نے کھا پی لیا۔ باقی رہ گئے پھر کاہنے شاہ اور ہرجن سنگھ!

اور ۱۹۴۵ء کا الیکشن آگیا۔ چوپال کی رونقیں بڑھ گئیں۔ ایک امیدوار یونینسٹ پارٹی کا اٹھ رہا تھا، ایک مسلم لیگ کا، اور دونوں کے آدمی دن رات دوڑ رہے تھے۔ دونوں کے گٹھ جوڑ ہو رہے تھے۔ مگر نمبردار کا فیصلہ یہ تھا کہ ہم تو اسلام کو ووٹ دیں گے اور ایک دن آیا کہ خانقاہ کے سامنے پولنگ اسٹیشن قائم ہو گیا۔ لاریاں ووٹروں سے بھر بھر کر آنے لگیں۔ کھانے پکنے لگے۔ مسلم لیگ امیدوار کی طرف سے نمبردار خود منتظم تھا۔ چوپال میں گوشت کی دیگیں اور حلوے کے کڑھاؤ چڑھے تھے لیکن یونینسٹ امیدوار کو اس پورے گاؤں سے کوئی کارندہ نہ مل سکا۔ چنانچہ اس کے آدمی باہر سے آئے اور باہر ہی سے ٹرکوں میں سامان لاکر قبرستان میں ہی پکانے کا انتظام کیا گیا۔ سچی بات یہ ہے کہ یونینسٹ امیدوار کا کھانا اعلیٰ درجے کا تھا۔ چنانچہ دیہاتی آتے اور ان کے نمائندے دونوں طرف کے کھانے کے انتظامات کا جائزہ لینے کے بعد یونینسٹ امیدوار کے دسترخوان پر شکر کے لشکرے چلتے اور ووٹ سیدھے مسلم لیگ کے صندوقچے میں اسلام کو دے آتے۔ الیکشن میں اسلام کامیاب ہو گیا اور پاکستان بننا مقرر ہو گیا۔

پاکستان بننے کے امکانات ابھرے تو اس کے ردعمل کے طور پر ہندوستان میں جا بجا فسادات ہونے لگے۔ فسادات کی خبریں زمیندار اور ملاپ کے ذریعہ گاؤں تک پہنچ رہی تھیں اور فضا مکدر ہو رہی تھی، مگر ابھی اثرات بالکل ابتدائی تھے۔ ۱۹۴۷ء کا سال شروع ہوا تو بڑے پیمانے پر فسادات ابھر آئے اور ان کا اثر ہر جگہ گہرا پڑا۔ اس زمانے میں نمبردار نے جو گاؤں کی مسجد کے امام کا بھی اصل امام تھا، یہ طے کیا کہ امام صاحب جمعہ کے جمعہ جہاد پر وعظ فرمایا کریں اور جہاد کے وعظ شروع ہو گئے۔ پھر آہستہ آہستہ نمبردار نے مسجد میں مسلم لیگ زندہ باد! پاکستان زندہ باد! محمد علی جناح زندہ باد! کانگریس مردہ باد! کے نعرے لگوانے شروع کر دیئے۔ یہ رنگ دیکھ کر ہندوؤں اور سکھوں میں گھبراہٹ پھیلی۔ انہوں نے ایک دن وفد بن کر چوہدریوں سے بات چیت کی کہ ہم پاکستان کے دشمن نہیں ہیں، اگر پاکستان بنتا ہے تو سر آنکھوں پر۔ آپ اپنے پاکستان میں ہمیں امن سے رہنے کی اجازت دیں تو جب ہماری کئی پشتیں یہاں مرکھپ گئی ہیں تو ہم بھی یہیں مٹی ہو جانا پسند کرتے ہیں۔ لیکن اگر آپ کو ہمارا یہاں رہنا پسند نہ ہو تو ہنسی خوشی ہمیں رخصت کر دیجئے۔ فسادات کی بری بری خبریں آ رہی ہیں، ایک طرف مسلمان ہندوؤں پر ظلم کرتے ہیں، دوسری طرف ہندو بدلہ لینے کے لئے مسلمانوں پر دراز دستی کر رہے ہیں، ایسا نہ ہو کہ کل آپ کسی جگہ کا بدلہ ہم سے لینے پر تل جائیں؟ بدلہ اسی سے لینا چاہیے جس نے زیادتی کی ہو۔ ہم ہمیشہ پیار اور محبت اور امن سے رہے ہیں اور آپ لوگوں کے خادم بن کر رہے ہیں۔ آپ کا فرض یہ ہے کہ ہماری جانوں، آبروؤں اور مالوں کی آپ حفاظت کریں۔ ہماری بہو بیٹیاں آپ کی بہو بیٹیاں ہیں۔

چوہدریوں پر بھی ان باتوں کا بڑا اثر ہوا اور انہوں نے قسمیں کھا کھا کر کہا کہ ہم آپ کو سینے سے لگا کر رکھیں گے اور اگر کوئی ہاتھ آپ کی طرف اٹھے گا تو ہم خود اسے روکیں گے۔ آپ اطمینان سے رہیں۔

مگر اطمینان دلوں کے اندر سے اٹھ گیا تھا۔ مارچ اپریل میں حالات نے ایسا رخ پلٹا کہ علاقے بھر میں ہل چل مچ گئی۔ دیہاتوں میں ہنگامے شروع ہو گئے

میرا گاؤں

جان و مال پر ہاتھ ڈالنے کے بہت سے واقعات ہو گئے اور ہندوؤں اور سکھوں نے بیشتر اپنی عورتوں کو شہروں میں بھیج دیا جہاں ہندوستان میں فسادات کی ایک اور طوفانی لہر اٹھی تو ہل چل اور بڑھ گئی ہندوؤں نے باقاعدہ تخلیہ شروع کر دیا بس زیادہ تر بڈھے لوگ باقی رہ گئے ۔ ہمارے گاؤں سے بھی آدمی تعداد نکل گئی ۔ بقیہ جو بھی رہ گئے تھے ۔ وہ گھبراہٹ کے مجسمے تھے کہ ذرا ہوا بھی تیز چل گئی تو ان کے کلیجے دھک سے رہ جاتے ۔ وہ مسلمانوں کی طرف سے اطمینان حاصل کرنے کی ساری تدبیریں کرتے مگر اطمینان اٹھ چکا تھا ۔ زبانیں بڑی میٹھی باتیں اب بھی کرتی تھیں لیکن دل ان پر اعتبار نہیں کرتے تھے ایک دن ایسا ہوا کہ چوپال گزرتے سے اچانک یہ اطلاع نشر ہوئی کہ پنڈی سے سکھوں کا ایک جتھا دھاوا بولتا چلا آ رہا ہے ، وہاں کی جامع مسجد کو اس جتھے نے آگ لگا دی اور جو مسلمان سامنے آیا ذبح کر کے رکھ دیا ۔ اب یہ جتھا سامنے کی پہاڑی میں آکر چھپا بیٹھا ہے ۔ وہ گھسیارے گھاس لینے گئے تو انہوں نے دیکھ لیا ، وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے ۔ آج رات ہمارے گاؤں پر حملہ ہو جائے گا چنانچہ خطرے کی لہر دوڑ گئی ۔ گاؤں میں نمبردار نے فوراً لوگوں کو جمع کرنے کے لئے ڈھنڈورا پٹوا دیا لوگ برچھیاں ، کلہاڑیاں لے کر جمع ہو گئے اور چاروں طرف کے ناکوں پر پہرہ دیتے رہے ۔ اس موقع پر ہندوؤں نے دکانیں بند کر دیں ، بلکہ گھروں کو بھی اندر سے بند کر کے بیٹھے رہے ۔ اور موت کی گھڑیاں گننے لگے ۔ مگر صبح ہو گئی اور کچھ نہ ہوا پھر چند روز کے لئے فضا ٹھنڈی ہو گئی ۔

اور جہاد کے وعظوں کی لے بڑھ رہی تھی ۔ یہاں تک کہ ایک رات کو جہاد ہو گیا ! یہ رات بڑی تاریک رات تھی بڑی خوفناک رات تھی ، یہ رات بڑی بدنصیب رات تھی گاؤں کی فضا اتنی بگڑ چکی تھی کہ جیسے ہندوؤں اور سکھوں کے خلاف دیوار دیوار سرگوشی کر رہی ہے جیسے ہوا کے جھونکوں میں بھی کوئی سازش ہو رہی ہے گھبرو لڑکے سودا لینے آتے تو ڈانٹ کر بولتے ، بعض تو یہاں تک کہہ دیتے کہ اب کلمہ پڑھ لو جو یہاں رہنا ہے ورنہ خیر نہیں ! چنانچہ اس رات کو ہندوؤں کے بقیہ نفوس نے گاؤں سے نکل کھڑے ہونے کا فیصلہ کیا ۔ یہ فیصلہ اس وقت کیا گیا جب کہ خود نمبردار نے چوہدری لیلا کی طرف سے ان کو پیغام دیا کہ اب چونکہ علاقہ میں غنڈوں کا راج ہے اس لئے ہم آپ کی حفاظت سے معذور ہوتے جاتے ہیں ، اب بہتر یہ ہے کہ چند روز کے لئے آپ لوگ سٹک جائیں پھر امن امان ہو جائے تو ہم آپ کو بلا لیں گے ۔ رات کو حفاظت کے لئے آدمی میں خود ساتھ کر دوں گا ۔ نمبردار نے آدمی ساتھ کر دیئے اور سات مردوں ، پانچ عورتوں اور تین بچوں کا یہ قافلہ روانہ ہو گیا ۔ یہ قافلہ جب چوپال کے پاس سے گزرا تو چوپال سنسان پڑی تھی ، یہ پہلی رات تھی کہ چوپال آدھی رات سے پہلے اس طرح سنسان دیکھی گئی ہو ۔ جیسے آج چوپال بھی کسی سازش کا راز سینے میں دبائے ہونٹ سئے پڑی تھی چوپال کے پیپل کا بھی کوئی پتا آج نہیں ہل رہا تھا ۔ جیسے کہیں ذرا سی جنبش ایک خوفناک حقیقت کو فاش نہ کر دے اور قافلہ گزر گیا !

محافظوں کا دستہ اپنی جگہ چپ چاپ جا رہا تھا اور قافلہ اپنی جگہ خاموش ۔ آج جیسے باتیں بالکل ختم ہو گئی تھیں جیسے یہ لاشوں کا کارواں تھا اور دونوں فریق ایک دوسرے کے بارے میں کچھ سوچتے چلے جا رہے تھے ۔ آخر جب میل بھر کا فاصلہ طے ہو چکا اور وہ چھوٹا سا نالہ آ گیا جو غنڈی کے نام سے مشہور تھا اور جس کے بارے میں جنوں بھوتوں کی خوفناک کہانیاں علاقے بھر میں زبان زد تھیں تو محافظوں نے قافلے کو رکنے کے لئے کہا ۔ پھر ایک بناوٹی مسکینی پیدا کر کے ان سے اپنے اس خدشے کا اظہار کیا کہ اس نالہ پر ہمارے گاؤں کی حد ختم ہوتی ہے اور آگے کے علاقہ میں آپ لوگوں کے ہم قوموں کی آبادیاں بھی ہیں فساد جھگڑے کا زمانہ ہے ، وقت کی ہوا میلی ہے ، کیا معلوم کوئی اکالی جتھا آ نکلے اور آپ لوگ ان کا ساتھ دینے پر مجبور ہو جائیں تو ہماری جانوں کی خیر نہیں منزل ابھی چار کوس دور ہے جہاں سے آپ کو گاڑی مل سکے گی ۔ اس لئے ہماری تسلی کے لئے اگر کوئی ہتھیار ہو تو نکال دیجئے ۔ لیکن ایک گنڈاسی چھری کے سوا کسی کے پاس سے کچھ نہ نکلا ۔ وہ کہنے لگے ہم تو مردے ہیں جو زندگی کی راہ پر بے اختیار چلے جا رہے ہیں ۔ ہم کسی سے لڑیں گے کیا ؛ محافظوں کی شجاعت نے اندازہ کر لیا کہ یہ نہتے ہیں اب قافلہ پھر چل پڑا مگر قافلے کے ایک ایک فرد پر کچھ عجیب سی کپکپی طاری ہو گئی ——— سامنے کا نالہ بڑا خوفناک تھا ۔

آگے آگے مرد پیچھے دو نوجوان لڑکیاں ، ان کے پیچھے تین بوڑھی عورتیں اور پھر آٹھ آٹھ دس دس سال کے بچے اور آخر میں حافظ نالہ میں نشیبی راستے سے اتر رہے تھے کہ سامنے سے لنگوٹ باندھے پندرہ بیس آدمی نکل پڑے ۔ عورتیں چیخ اٹھیں ، مرد واویلا کرنے لگے ، پیچھے بھاگ آئے ، مگر معلوم ہوا کہ یہ تو نمبردار صاحب ہیں ! نمبردار نے اطمینان دلایا کہ یہاں وہ خود آدمی لئے اس لئے موجود تھا کہ نالہ ذرا خطرے کی جگہ ہے ۔ خدانخواستہ کوئی گڑبڑ ہو جائے

تو میری ناک کٹتی ہے اور گاؤں بھر کی بے عزتی ہوتی ہے۔ سلامتی سے تم لوگ جاؤ، لو ہاتھ ملا لیں اور بوڑھے نہال چند نے سب سے پہلے ہاتھ ملایا۔ پھر ایک ایک نے! ابھی وہ ایک قدم ہی آگے چلے ہوں گے کہ نمبردار نے پکارا، چاچا نہال چند ذرا بات سنو، آخر تم لوگ اگر کلمہ پڑھ لو تو کیا حرج ہے یہیں آرام سے اپنی دکانوں، اپنے مکانوں، اپنی زمینوں میں بسو! عورتوں کے غول میں سے رام رام کی دھیمی سی آواز گونجی، مگر نہال چند چپ تھا۔ اب محافظ دستے کا سردار آگے بڑھا اس نے نمبردار سے کہا کہ ایسی باتیں سیدھی طرح کون مانتا ہے۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ یا کلمہ یا یہ ٹوکا —— اور چارہ کاٹنے کا ایک ٹوکا اس نے نکال لیا جو نادروں کی جھولی میں دیکھنے والوں کو اچھی طرح دکھائی دے رہا تھا! نمبردار نے کہا۔ "اوئے نہیں ہم زبردستی کسی کا دھرم کیوں خراب کریں" مگر اس پہلوان نے نمبردار کو پرے دھکیل دیا۔ اور کہا کہ اچھا جو کلمہ پڑھتا ہے وہ پڑھ کر ایک طرف ہو جائے اور جو نہیں پڑھتا وہ ایک طرف ہو جائے اور جو نہیں پڑھتا میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ سروپ دیال نے کلمہ پڑھ دیا، دیوی داس نے پڑھ دیا، ایک ایک مرد نے پڑھ دیا۔ بوڑھی عورتوں نے پڑھ دیا، بچوں نے پڑھ دیا —— ہونٹوں کی چند جنبشوں ہی کے بدلے اگر جان بچتی ہو تو یوں ہی اصرف ایک نہال چند رہ گیا۔ پہلوان نے کہا "اچھا نہالے پھر تیار ہو جا" مگر سردار بیچ میں آ گیا کہ "خبردار یہ میرا چاچا ہے" چاچا نہال اس بے وقوف سے پالا پڑ گیا ہے۔ تم پڑھ کیوں نہیں دیتے ہو کلمہ" مگر نہال چند بہت ہی انوکھا آدمی نکلا یہ ہمیشہ انوکھا ہی آدمی تھا۔ یہ صوفی منش تھا صبح سویرے چار بجے اٹھتا اور تین پر جاتے ہوئے اونچی لے میں جب شیخ سعدی، مولانا روم اور بھگت کبیر کے شعر الاپتا تو عجب سماں پیدا ہو جاتا۔ پھر جب یہ اپنے گھر کے تھڑے پر بیٹھ کر تھوڑا تھوڑا چھیل چھیل کر چڑیوں سے کھاتا تو بچے جمع ہو کر اس کے انوکھے پن کو دیکھتے۔ اور آج اس موت کی گھڑی کے سامنے بھی وہ انوکھا ہی نکلا۔ اس نے بڑی آہستگی سے کہا کہ "بھتیجے تمہارے سامنے میں ہمارے باپ دادا رہے، ہم سب اور گھل مل کر رہے لیکن صدی ڈیڑھ صدی کے اس زمانہ میں تمہارا کلمہ ہم جیت نہ سکا تو آج کیا ٹوکے کا کلمہ پڑھ دوں۔ میں تو خدا کا کلمہ پڑھ سکتا ہوں۔ ٹوکے کا کلمہ نہیں پڑھوں گا نمبردار! —— جس کلمے نے یہ ٹوکا لے کے کلمہ پڑھانے والے آدمی پیدا کیے میں اسے نہیں پڑھوں گا" مار دے ٹوکا پہلوان!

—— اور ٹوکا بجلی کی طرح متحرک ہوا اور نہال چند ختم ہو گیا۔ قافلے کی باقی بھیڑ بکریاں کپکپا کے رہ گئیں "تو اچھا تم لوگوں کو بھی نہلانے کے پیچھے جانا ہے یا عقل سے کام لینا ہے" پہلوان نے اکڑ کر پوچھا۔ "مہاراج ہم داس ہیں سیوک ہیں جو حکم ہو، ہم تو اب مسلمان ہیں!" یہ تھا جواب۔ "تو اچھا قطار میں کھڑے ہو جاؤ" یہ تھا حکم! قطار بن گئی۔ پہلوان نے کہا کہ دیکھو تم لوگ کلمہ پڑھ کر آج پچھلے سارے گناہوں سے پاک ہو گئے ہو، اب اگر تمہیں کوئی صعوبت سیدھے جنت میں بھیجنے کی ہو جائے تو تمہارے ہی لئے بہتر ہے ورنہ جیتے جی ہماری طرح گناہوں میں پڑ کر پھر ویسے ہی ہو جاؤ گے۔ اس لئے تمہارے لئے ہم نے شہادت کی موت کا انتظام کیا ہے ——"

یہ سن کر یکدم چیخیں بلند ہو گئیں مگر پھر انتہائی بے بسی کے احساس نے اعصاب کو بالکل سن کر دیا۔ ایک ایک آدمی بے چون و چرا کئے خود بخود اپنی جگہ سے آگے بڑھ کر ٹوکے کے سامنے جا کھڑا ہوتا اور ٹوکا اپنا کام کر ڈالتا —— جب دیوی داس کی باری آئی تو پہلوان کا تھکا ہوا ہاتھ اوچھا پڑا اور گردن پوری طرح کٹ نہ سکی۔ عین اسی حالت میں کہ آدھی گردن کٹی ہوئی تھی دیوی داس کی آواز گونجی کہ کمینے! میں اگر تیری جگہ ہوتا تو لیا اوچھا وار کبھی نہ کرتا۔ تھک گئے ہو تو ٹوکا کسی اور کو دے دو۔ خیر ایک ہی ٹوکے سے سب ذبح ہو گئے، جہاد مکمل ہو گیا۔ صرف دو نوجوان لڑکیاں زندہ چھوڑی گئیں جن کا حال یہ تھا کہ جیسے سِل پتھر ہو گئی ہوں پھر عورتوں کی تلاشی لے کر زیور اور نقدی نکالی گئی اور یہ مال غنیمت اور دو قیدی لڑکیاں لئے غازیوں کی یہ فوج فتحمندانہ شان سے پلٹ آئی۔

ادھر گاؤں کا سماں یہ تھا کہ آج ماؤں نے بچوں کو گھروں سے نکلنے نہیں دیا۔ آج چھپن چھپوت (آنکھ مچولی) بھی نہیں کھیلی گئی۔ آج ایک اور ہی چھپن چھپوت کھیلی جا رہی تھی آج بڑے بڑے چوہدری اور سرپنچ اور بڑے بڑے اپاہل اور بڑے بڑے داڑھیوں والے تکیوں میں دگڑ دگڑ کر لیٹے تھے اور سکتے بھاڑ پھونک رہے تھے۔ یہ لوگ ہندوؤں اور سکھوں کی دکانوں اور مکانوں کو رات بھر لوٹتے رہے تھے ریال قیمتی کپڑوں کے

میرا گاؤں

کے صندوق، برتن، گھی کے کنستر، کھانڈ اور غلے اور گڑ کی بوریاں، پلنگ اور بستر، کمبل اور کھیس، سب کچھ راتوں رات لٹ گیا۔ خطیب صاحب خود تو نہیں نکلے لیکن صبح کو نمبردار کے لڑکے ان کے ہاں بھی ایک دو پیلے سے لحاف اور نوشکیں ڈال گئے۔ ان بےچاروں کے ہاں بستروں کی کمی تھی۔ آخر جہاد کا جذبہ پیدا کرنے میں ان کا بھی حصہ تھا! باقی جسے اور کچھ نہیں ملا اس نے ایندھن اٹھا لیا۔ ورنہ مکانوں کے کواڑ اتار لئے، اور اس بہتی گنگا سے ہر ایک نے ہاتھ دھو لئے! بستی بھر میں صرف ایک گھر بچا۔ یہ امیر خان ترکھان کا گھر تھا۔ امیر خان مڈل پاس بھی تھا، قرآن بھی ترجمہ سے پڑھے ہوئے تھا نمازی بھی تھا، رحمدل بھی تھا، اس نے مسجد کے خطیب سے بحث بھی کی کہ لوٹ مار کا نام جہاد نہیں ہے۔ اس نے چوہدریوں کو بھی سمجھایا کہ پاکستان حبیب اسلام کا گھر ہے تو اسلام کی ٹھنڈی چھاؤں میں ہر انسان کو پناہ ملنی چاہیئے۔ مگر اس کے خلاف یہ پراپیگنڈا کر دیا گیا کہ یہ ہندوؤں سے پیسے لے کر ایسی باتیں کرتا ہے، یہ غدار ہے۔ چنانچہ یہ غدار ساری رات بھر گھر میں کروٹوں پر کروٹیں لیتا رہا، اس کی آنکھوں میں بار ہا آنسو آئے، مگر آنسو بہانے اور کڑھنے کے سوا وہ کچھ نہ کر سکا۔ بدی کے ماحول میں نیکی عام طور پر گوشوں میں پڑی آنسو بہایا کرتی ہے لیکن حالات پر اثر انداز نہیں ہوا کرتی، اور امیر خان حالات پر اثر انداز نہ ہو سکا! افسوس کہ نیکی کی پونجی صرف اکیلا امیر خاں ہی تھا!

چوپال آہستہ آہستہ پھر رونق پر آ گئی اور چوپال میں اس تاریک رات کی داستان پہلے اشاروں میں، پھر کھلے بندوں فخریہ انداز میں بیان کی جانے لگی!

لیکن اس رات کے بعد سے گاؤں کا نقشہ بدل گیا ہے آبادی بڑھ گئی ہے مگر ایک ویرانی اور اداسی چھائی رہتی ہے برادریوں کا اتحاد ٹوٹ چکا ہے، چوہدریوں کی چوہدراہٹیں غنڈہ ازم کے آگے شکست کھا چکی ہیں بدکاری گھر گھر کے دروازے پر دستک دیتی پھرتی ہے۔ اتنی لوٹ مار کے بعد لوگ پہلے سے زیادہ بھوکے ہو گئے ہیں، ننگے ہو گئے ہیں، وہ رونقیں ختم ہو گئی ہیں، چہروں کے تبسم پھیکے پڑ گئے ہیں، دلوں سے خلوص اڑ گیا ہے گلابی اور لنوراں کے گیت دم توڑ چکے ہیں۔ گاؤں کے سامنے ارضی کینوس پر فطرت نے جو تصویر بنا کر مظاہرے کے لئے پھیلا دی ہے وہ گرد سے اٹ گئی ہے!

آپ میرے گاؤں کا نام پوچھتے ہیں؟ —— میرے گاؤں کا نام ہے "حقہ پانی بند! —————— میرے گاؤں کا نام ہے "اغوا"! میرے گاؤں کا نام ہے "جہاد"! میرے گاؤں کا نام ہے "ٹوکا"! میرے گاؤں کا نام ہے "لوٹ مار"!

میرا گاؤں مجھے یاد آتا ہے، اور ہمیشہ یاد آتا رہے گا۔ مگر اس کالی ڈراؤنی رات کے بعد سے یہ میرا گاؤں نہیں رہا، مجھے اس گاؤں سے نفرت ہے، میں اس میں لوٹ کر جانا نہیں چاہتا، میرا کوئی اپنا گاؤں نہیں ہے —— میرے لئے یہی تاریک سا کرائے کا کمرہ، یہی فرسودہ سی سائیکل اور یہی بجلی کی دکان کی نوکری اچھی ہے!

بقیہ مال حرام صفحہ ۱۹۱

"یار کوئی پیسہ تو دو آج" شرفو نے دوستانہ مطالبہ کیا، اس کے مطالبہ میں گداگرانہ لجاجت نہ تھی۔

اس نے کچھ نہ سوچا، غیر شعوری طور پر اس کا ہاتھ کوٹ کی جیب میں چلا گیا: اس نے اٹھنی نکالی اور شرفو کو دے دی۔

شرفو اٹھنی لے کر چل دیا۔

"یہ کیا کیا؟" اس کے ذہن نے سوال کیا! جیسے اس نے اٹھنی ضائع کر دی ہو، "ٹھیک کیا" اور ایک لہر ذہن سے ٹکرائی۔ اور یہ لہریں ایک بار پھر اس کے

ذہن سے ٹکرانے لگیں اور وہ مضطرب ہو کر اٹھ بیٹھا اور ادھر دیکھنے لگا۔ جدھر شرفو جا رہا تھا۔

[illegible] کے کچھ [illegible] شرفو اسے نظر آیا، وہ تیزی سے جا رہا تھا، اس کی چال مستانہ تھی۔ معاً اس کے ذہن پر جیسے بجلی گری، اسے کچھ یاد [illegible] کے مالم میں [illegible] ذہن سے نکل گیا۔ ارے!

[illegible] اس نے ایک لمبا سا [illegible] اس کی چال میں تیزی تھی اور مستی بھی، اور وہ اٹھنی چلنے کے لئے ٹھیکے پر جلد از جلد پہنچ جانے کے لئے کوشاں

بھوکا ہے پنجاب

منعیم صدیقی

(حضورِ والا کے نام ——— ایک کارندۂ خاص کی ڈائری)

نوٹ: تاریخیں دانستہ حذف کردی گئی ہیں اور واقعات کی ترتیب زمانی کو توڑ دیا گیا ہے!

——— (۱)

حضورِ والا!

گندم اس مرتبہ بے حساب پیدا ہوئی ہے۔ غضب خدا کا کہ سات سات، آٹھ آٹھ روپے من کھلے بندوں بک رہی ہے۔ بلکہ بعض مقامات پر تو نرخ ۵ پانچ روپے سے آگے بڑھنے کا نام نہیں لیتا! یہ حالت تو بڑی خطرناک ہے۔ لوگ پیٹ بھر کر کھانے لگے تو پھر کوئی نہ کوئی ہنگامہ بپا کریں گے۔ گندم کا نشہ بڑا قیامت خیز ہوتا ہے۔ یہی نشہ تو تھا کہ جنت کے دارالاماں میں اس نے فتنۂ بغاوت پیدا کر دیا اور امنِ عامّہ کے لئے کارکنانِ قضا و قدر آدم کو ملک بدر کرنے پر مجبور ہو گئے ——— یہ پہلا استعمال تھا سیفٹی ایکٹ کا!

جی ہاں!

یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو

خاکسار تو یہی التماس کرے گا کہ اُس دانے کو بہر حال اتنا ارزاں نہیں ہونا چاہئے جس کی قیمت میں ہم نے جنت دی ہے، ورنہ امنِ عامّہ کی خیر نہیں! لوگ بڑی سرپھری باتیں کرنے لگے ہیں!

——— (۲)

حضورِ والا!

ناچیز بڑا شکر گذار ہے کہ صوبائی حکومت نے آخر کار گندم کا اسٹاک آٹھ روپے بارہ آنے من خریدنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور قیمت فروخت گیارہ روپے چار آنے مقرر کی ہے۔ اس فیصلے کے بڑے دور رس فوائد ہیں۔ ایک تو یہ کہ وزرا اور ان کے اعزہ و اقربا نے اِس فیصلے کا قبل از وقت علم ہو جانے کی وجہ سے اپنے ذخیروں کی فروخت کو روک دیا ہے اور اب وہ ڈیوڑھا کما گئے! دوسرے یہ کہ حکومت کے اِس اقدام نے معاً پورے صوبے کو ایک آنے والے قحط کے اندیشے میں مبتلا کر دیا ہے۔ چنانچہ ہر کوئی گندم خرید خرید کر ڈال رہا ہے اور ذخیرہ اندوز تو اپنے معاشرتی فرض کو ادا کرنے میں خوب چاق و چوبند ہو گئے ہیں! اور تیسرا فائدہ یہ کہ حکومت اس کاروبار میں کچھ کما لے جائے گی، اڑھائی روپے فی من کی گنجائش بڑی حوصلہ افزا ہے۔

ماشاءاللہ! یہ بھی خوب رہا کہ اِدھر یہ فیصلہ ہوا اور اُدھر ڈپو خالی پڑے ہیں۔ مزے کی افراتفری مچ گئی ہے! گندم ڈپوؤں پر آتی ہے براہِ راست عوام کو نہیں ملتی، بلکہ بازار کے عام دوکانداروں کے واسطے ملتی ہے۔ اِس طرح ڈپو ہولڈر بھی بلیک کر کے زیادہ کماتا ہے اور عام دکانداروں کی بھی چاندی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایک چیز بار بار منافع لگنے سے قومی دولت میں بیش بہا اضافہ

ہو رہا ہے!

نیا فیصلہ حضور کو مبارک ہو!

(۳) ———

حضورِ والا!

آپ کی برکات کے طفیل حالات نے ایک اور مبارک قدم آگے بڑھایا ہے۔ صوبائی حکومت نے اِدھر خریداری کا فیصلہ کیا' اُدھر گندم غائب! چنانچہ مجبوراً لوگوں کے گندم کے ذخائر پر جبراً قبضہ کرنے کے اختیارات حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے لئے ہیں! اب ہر ذخیرہ اندوز کو اپنے نجی یا کاروباری ذخیرہ کا اعلان کرنا ہوگا!

ملاحظہ فرمایا آپ نے؟ پنجاب کے ایک زمیندار مگر کمیونسٹ لیڈر نے اپنا اسٹاک ڈیکلیر کیا ہے۔ فقط سولہ من! لیکن جو زمیندار حکومت کی گدیوں پر متمکن ہیں' یا وزرا اور ایم۔ ایل۔ اے ہیں' یا ان کے خسر اور داماد' ان کے چچے اور بھتیجے اور ان کے باپ یا بیٹے ہیں' اُن بچاروں کے پاس تو ایک دانہ بھی نہیں کہ ان کو ڈیکلیر کرنے کی تکلیف کا سامنا کرنا پڑے ——— انہوں نے اپنے اسٹاک اپنے پاس رہنے ہی نہیں دئے تو پھر ڈر کاہے کا!۔

تاج و علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہوکے کریگا زمانہ کیا؟

چھاپے پڑنے شروع ہوگئے ہیں' مگر جانے کیا بات ہے کہ جو اسٹاک بھی برآمد ہوتا ہے' غیر ملکی زمینداروں کے ہاں سے برآمد ہوتا ہے' ملکی زمیندار ذخیرہ اندوزی کے معاملے میں بالکل پاک دامن نکلے ہیں! ——— واقعۃً حضور کے قول کی تصدیق ہوگئی ہے کہ غیر ملکی ملک کے غدار ہیں!

(۴) ———

حضورِ والا!

ڈپوؤں پر آٹے کی نئی نئی اقسام آرہی ہیں! مثلاً آٹے میں چونا ملاکر ایک خاص مرکب تیار کیا گیا ہے۔ یہ بڑا مفید مرکب ہے! ہمارے ملک کی آبادی تیزی سے دِق کا شکار ہو رہی ہے' اور اس کی ایک وجہ غذا میں کیلسیم کی کمی ہے۔ اب عوام کو آٹے میں چونا ملاکر اس لئے کھلایا جارہا ہے کہ کیلسیم کی کمی پوری ہوجائے۔ دق کی روک تھام میں بی' سی' جی کے انجکشنوں سے یہ تدبیر کچھ کم مؤثر نہیں ہے۔

یہاں بعض سرپھرے لوگ یہ کہتے پھرتے ہیں کہ وزارتِ خوراک کی نالائقی ہے کہ اس نے باہر سے اتنی ناقص گندم خرید کی ہے اور ملک کا روپیہ لٹا دیا ہے۔ اِن بچاروں کو کیا معلوم کہ وزارتِ خوراک نے یہ خدمت وزارتِ صحت کے مشورے سے سرانجام دی ہوگی اور وزارتِ صحت نے یقیناً ڈاکٹروں کی ایسوسی ایشن سے رائے لی ہوگی۔ مگر عجب دیس ہے یہاں کسی خدمت کی قدر نہیں!

دوسرا تجربہ آٹے میں کنکر ملانے کا کیا گیا ہے۔ اس کا بھی ایک بڑا قیمتی مقصد ہے۔ آخر پاکستان ابتدا ہی سے خطرات میں گھرا ہے اور جنگ کی تلوار اس کے سر پہ لٹکی ہوئی ہے۔ ایسے حالات میں وہی قوم زندگی کے فرض سے عہدہ برآ ہوسکتی ہے جو دشمن کو لوہے کے چنے چبوانے کے لئے خود لوہے کے چنے چبا سکتی ہو۔ اس کی مشق کی ابتدا کنکریوں سے کی گئی ہے۔

اور قوم ان کنکریوں کو چبانے میں بڑی باہمت نکلی ہے۔ چند ہفتوں کے بعد انشاء اللہ آٹے میں لوہ چون ملایا جائیگا اور آہن پارے!

(۵) ———

حضورِ والا!

ملک کے دشمن "قحط قحط" کی آوازیں بلند کرنے لگے ہیں۔ یہ ایک سوچی سمجھی ہوئی شرارت ہے! مگر یقین جانئے کہ عوام قحط کے خطرے سے ذرہ بھر بھی پریشان نہیں ہیں۔ وہ مطمئن ہیں کہ ان کے سروں پر ایک ایسا وزیرِاعظم بیٹھا ہے جو قحط سے نمٹنے کا وسیع تجربہ رکھتا ہے۔ جس کی وزارت قحطِ بنگال کا سامنا کر چکی ہو' آخر اس کے عہدِ اقبال میں قحطِ پنجاب کیا حیثیت رکھتا ہے کہ اس پر تشویش کی جائے!

ان کل جیسے دشمن کی زبان درازیوں سے کیا ہوتا ہے! قسائیوں کی بددعاؤں سے بیل نہیں مرا کرتے!!!

(۶) ———

حضورِ والا!

آج کل اخبارات میں گندم کی پیداوار اور کھپت کے بارے میں اعداد و شمار کا کرکٹ میچ کھیلا جا رہا ہے۔ کوئی انہی ہندسوں کو آگے پیچھے کر کے یہ ثابت کر دکھاتا ہے کہ گندم کی پیداوار اس مرتبہ سال گذشتہ سے کم ہوئی ہے' اس لئے بروقت ضروری تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں! اور کوئی انہی ہندسوں کو جوڑ گھٹا کر یہ منوانا چاہتا ہے کہ گندم کی پیداوار امسال بھی کم نہیں ہوئی اور مصنوعی قحط پیدا کیا جا رہا ہے۔

- مگر اب تک حکومت کے حسابی جادوگروں کا پلّہ بھاری ہے۔ وہ یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہیں کہ پیداوار کم ہے' اور پھر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ثابت کر دکھاتے ہیں کہ عوام کو بھوکوں نہیں مرنے دیں گے! آخر جن ماہرینِ فنِ اعداد و شمار نے پانچ سال سے پاکستان کے مالیات کو اپنی حسابی جادوگری کے بل پر کامیابی سے چلا دکھایا ہے اور "○" سے آغاز کر کے ملک کے خزانے کو سونے چاندی سے بھر دیا ہے' وہ بھلا اقتصادیات کی چار کتابیں پڑھ کر قلم ہاتھ میں لے لینے والوں سے کہاں چت ہوتے ہیں

(۷) ———

حضورِ والا!

آج بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ قحط تو قحط سہی! لیکن آدمی آخر روٹی ہی کے بل پر تو نہیں جیتا' وہ تو کچھ اور ہی شے ہے جو اسے زندہ رکھتی ہے۔ ادھر یہ نکتہ صوبائی وزارت نے بھی پا لیا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ انجیل کی ورق گردانی کر کے باقاعدہ حضرت عیسےٰ کے زریں مقولے کی تحقیق کی جا رہی ہے۔ چنانچہ اب ہر وزارت کے دفتر میں یہ حکم آویزاں کر دیا گیا ہے کہ "آدمی روٹی ہی کے بل پر نہیں جیتا' بلکہ کلام کے بل پر جیتا ہے" کلام کا مفہوم جدید زبان میں ادا کرنا ہو تو کہنا چاہیے کہ آدمی دراصل تقاریر اور بیانات کے بل پر جیتا ہے۔ حضورِ والا! خدا شاہد ہے کہ جب سے ایہ کلمۂ ایمان افروز سامنے آیا ہے۔ وزرا دن رات تقاریر کر رہے ہیں اور بیانات دیتے پھرتے ہیں۔ اور یہ ناچیز بلا مبالغہ اپنا بار بار کا تجربہ عرض کرتا ہے کہ اگر کبھی صبح کا ناشتہ ڈیوٹی کی شدید مصروفیات کی وجہ سے نہیں کیا جا سکا تو موٹر سائیکل روک کر کسی ہاکر سے اخبار لیا اور اپنے کسی محبوب وزیر کے بیان کی محض سرخی پڑھ کر ہی کام چلا لیا ہے۔ اسی طرح اگر کھانا کھانے کا وقت نہیں ملا تو کسی سرکاری یا مسلم لیگی جلسے میں جا کر ایک تقریر سن لینے سے طبیعت معجزانہ طور پر سیر ہو گئی ہے خود حضور والا کی تقریر سننے کے بعد تو تین تین وقت کے لئے کھانے سے بے نیازی ہو جاتی ہے۔

جو لوگ بھوک اور قحط کی شکایت کرتے ہیں وہ بدبخت اپنے تعصب کی وجہ سے نہ تو دل لگا کر اپنے لیڈروں کے بیانات پڑھتے ہیں' نہ توجہ سے تقاریر سُنتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ بھوکوں مرتے ہیں —— تو ایسوں کو مرنے دیجئے! یہ سارا پنجاب تو نہیں ہیں!

(۸)

حضورِ والا!

آج لوگوں کی نفسیات کو قحط کے وہمی ہوتے سے متاثر کرنے کے لئے موچی دروازے میں ایک جلسہ ہوا۔ تقریر بڑی گرجدار تھی۔ مقرر غریب طبقے کا ایک فرد تھا اور مدت ہوئی کہ وہ اپنی یہ حیثیت ختم کر چکا ہے کہ لوگوں سے چندے بٹور سکے، پھر وہ کسی وزیر یا ایم۔ ایل۔ اے کا عزیز بھی نہیں تھا کہ عملِ دستِ غیب چل سکتا۔ سوال یہ ہے کہ اگر پنجاب میں واقعی قحط تھا تو سب سے پہلے اسے فاقہ زدہ ہونا چاہئے تھا لیکن کم بخت اِس زور شور سے تقریر جھاڑ رہا تھا کہ اگر وہ فاقہ زدہ ہوتا تو دس پندرہ منٹ میں اسٹیج پہ بے ہوش ہو کر گر پڑتا۔ مگر وہ نہیں گرا اور گھنٹہ بھر کی طوفانی تقریر کر گیا۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ وہ قحط کا جھوٹا پروپگنڈہ کر رہا تھا۔

ایسے لوگوں کے متعلق حضورِ والا کی رائے گرامی کیا ہے؟ کیا یہ واقعی غدار نہیں ہیں اور اِن پر سیفٹی ایکٹ کا چھُرا نہیں چلنا چاہیئے؟

(۹)

حضورِ والا!

ناچیز نے بہاولپور کی ستر کھانوں کی دعوت کا حال پڑھا! حضور نے ایسی دعوت کھا کر پنجاب پر بڑا احسان کیا ہے! یہ قحط کے جھوٹے پروپگنڈے کی تردید کا ایک عملی ذریعہ ہے!

حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے دَور میں بھی ایک مرتبہ قحط پڑا تھا۔ چنانچہ آپ نے کھانا پینا چھوڑ دیا اور عوام کے ساتھ مل کر فاقہ کشی فرمانے لگے! مگر اب یہ ہتھکنڈہ بہت پرانا ہو گیا ہے' آج حضورِ والا اسے اختیار کرتے تو رجعت پسند کہلاتے' کیونکہ اِس دور جہل میں تو یوں سوچا جاتا ہے کہ ایک حضورِ والا کے کھانا پینا چھوڑ دینے سے آخر کروڑوں نفوس کی فراہمی غذا پر کتنا اثر پڑتا ہے' بھوک کے سمندر میں اگر آپ نے غذائیت کا ایک قطرہ ٹپکا دیا تو اس سے کونسا تغیر رونما ہو جائے گا۔ آج تو یہی مناسب ہے کہ قوم کا لیڈر پیٹ بھر کر کھائے' بلکہ ہو سکے تو بار بار کھا کر اسے اُگل دے اور پھر دوبارہ' سہ بارہ کھائے' تاکہ اس کے قویٰ خوب تر و تازہ رہیں اور وہ قحط کو دور کرنے کیلئے خوب اچھی طرح سوچ سکے اور ہر عملی قدم اُٹھا سکے!

اسلام کا آخر کوئی لگا بندھا طریقہ تو ہے نہیں کہ ہر دور کے لئے اسے فرض بنا دیا جائے' یہ تو ایک ترقی پسند متحرک دین ہے۔ کل قحط کا مقابلہ کرنے کے لئے اگر امیرِ قوم کا فاقہ کرنا درست تھا تو آج کے حالات کا تقاضا یہ ہے کہ وہ پُرخوری کا مظاہرہ کرے!

یوں حالات میں بھی بڑا فرق ہے۔ وہاں تو حقیقی قحط تھا اور یہاں دشمنوں نے پروپگنڈے سے قحط کا سماں باندھ دکھایا ہے۔ اِس پروپگنڈے کی تردید کے لئے مناسب یہی تھا کہ حضورِ والا بر سرِ عام ستر کھانوں کی دعوت تناول فرما کر لوگوں کو مطمئن کر دیتے کہ پاکستان میں کسی چیز کی کمی نہیں! بس ظرف چاہیئے!

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے!

جن ازلی بدنصیبوں کے معدے ہی تنگ ظرف ہوں' ان کا کیا علاج!

یہ کمترین بڑی لجاجت سے عرض گذار ہے کہ خدارا ایک مرتبہ پنجاب کا دورہ فرمائیے اور ہمارے ہر شہر میں ایسی ہی ستر

کھانوں کی دعوتیں پبلک مقامات پر کھا کر دکھایئے کہ یہاں کوئی قحط و حط نہیں ہے۔ یہ صرف غداروں کی ہنگامہ آرائی ہے!

(۱۰)

حضور والا!

کل یہ حقیر پر تقصیر وزیر اعظم صوبہ پنجاب کی بلائی ہوئی پریس کانفرنس میں شریک تھا۔ باتیں تو میں نے کم سنیں ——— آخر وہ باتیں روز کی سنی ہوئی ہوں اور بار بار دوہرائی جاتی ہوں اور جن کو مجھے بطور ڈیوٹی دن رات سننا اور قلم بند کرنا پڑتا ہو اُن پر توجہ کہاں تک جم سکتی ہے! البتہ کھانے پینے کے سامان پر پوری توجہ رہی۔ دیکھ دیکھ اللہ کا شکر ادا کیا کہ پاکستان میں کمی نہیں اور پنجاب میں آخر کس چیز کا توڑا ہے؟ کیک، انڈے، کیٹلس، بسکٹ، پیسٹری، سوہن حلوا، رس گلے، تلا قند، شکر پارے، بالوشاہی، بھنی ہوئی دال، سیب، انگور، کیلا اور باقی ساری الا بلا!

سوال یہ ہے کہ اگر لوگوں کو بالفرض گندم نہیں ملتی، آٹا نہیں ملتا، یعنی نہیں ملتی تو کس نے انہیں روکا ہے کہ وہ کیک مکھن انڈے نہ کھائیں، بسکٹ پیسٹری نہ کھائیں، سیب انگور نہ کھائیں! میں تو کہتا ہوں کہ حضور والا سے نمونہ لیں اور مرغیاں کھائیں، مرغیاں! جس قوم کا لیڈر مرغیاں کھاتا ہو اس کے بچے بچے کو مرغیاں کھانی چاہئیں! کم بخت مرے جاتے ہیں۔ روکھی سوکھی روٹی پر!

(۱۱)

حضور والا!

بڑا شور ہے آج کل اسمگلنگ کا! مگر عجیب بات ہے کہ اسمگلنگ کا چرچا وہی کرتے ہیں جو خود اس مہم میں پیش پیش ہیں۔ کل آپ کا یہ غلام خانہ زاد اپنے فرضِ تجسس کے تحت پرنس ہوٹل جا نکلا۔ چائے طلب کی، پاس ہی ایک "بزرگ" بیٹھے تھے۔ ٹھنڈی سانس بھر کر اپنے دوستوں سے کہنے لگے کہ اسمگلنگ بڑی غداری کا کام ہے۔ ملک کی معیشت بھی تباہ ہو رہی ہے اور شہریوں کے خلوص کی ساکھ بھی! لیکن حضور والا! میری ڈائری کے اندراجات شہادت دیتے ہیں کہ یہی بزرگ پچھلے ہی ہفتے پانچ ساڑھے پانچ سو من گندم پار کرا آئے ہیں! اب فرمایئے!

کیا اسمگلنگ کو جرم سمجھا جا سکتا ہے؟ نا چیز کی رائے یہ ہے کہ ہرگز نہیں! جرم ہمیشہ وہ فعل ہوا کرتا ہے جسے جرائم پیشہ لوگ کرتے ہیں، لیکن جب کام کو شرفا اور معززین اور ذمہ دار لوگ کرنے لگیں وہ جرم کس طرح رہ سکتا ہے۔ اس کے پردے میں لازماً ملک کی کوئی نہ کوئی خدمت چھپی ہوئی ہو گی!

یہی وجہ ہے کہ اسمگلنگ پر ہماری حکومت کوئی گرفت نہیں کرتی۔ وہ برابر اس تاک میں ہے کہ کہیں کوئی جرائم پیشہ فرد یہ کام کرتا ہوا ملے تو اس پر ہاتھ ڈالا جائے، لیکن اب تک شرفاء اور معززین ہی اس میدان میں چھائے ہوئے ہیں۔

مثلاً وہی بزرگ جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے، اگر میں ان کے بارے میں اپنی ڈائری کے اندراجات کو بالکل حقیقت کے مطابق رکھتا اور اوپر بھیج دیتا تو مجرم وہ نہ بنتے، آپ کا یہ خاکسار بنتا! جس شخص کا بھتیجا وزیر ہو اور بھائی پارلیمنٹری سیکرٹری ہو اس پر اس طرح کا الزام کوئی احمق لگائے تو سزا اس احمق کو ملنی چاہئے، نہ کہ ایک شریف اور معزز آدمی کو! کوئی ایسا احمق نہیں ہو سکتا تو آخر کمترین ہی سر کیوں پھرا ہوا!

کمترین شرفاء کی کسی حرکت کو جرم اور خلاف ورزی قانون سمجھ کر غور کرتا ہی نہیں! یہ مجبوری نہیں سکتا کہ ایسے ذمہ دار لوگ جرائم پیشہ

ہوں ——— جرائم پیشہ تو اور لوگ ہوتے ہیں!

پھر اگر شرفا اور معززین کو مجرمین کی صف میں کھڑا کر دیا جائے تو آخر اس ملک پر حکومت کون کرے گا اور قوم کی لیڈرشپ کون سنبھالے گا؟

——— (۱۲)

حضور والا!

آپ کے بندۂ بے دام نے بہت سوچا کہ آخر جب شرفا اسمگلنگ کرتے ہیں تو ان کے سامنے ملک کی فلاح و بہبود کا کونسا پہلو ہوتا ہے۔ آخر وہ پہلو سامنے آ ہی گیا!

گندم کم ہوگی تو فسادِ خوردنِ گندم بھی کم ہوگا ——— چنانچہ گندم کی درآمد کو حکماً روک کر حکومت نے جو غلطی کی ہے اس کا ازالہ کرنے کے لئے ہمارے شرفا ناجائز درآمد میں مشغول ہیں، اور وہ دراصل گندم کو نہیں "فسادِ خوردنِ گندم" کو برآمد کر رہے ہیں۔ اب سارا فسادِ خوردنِ گندم انڈیا میں بپا ہوگا!

فسادِ خوردنِ گندم مولینا ئے روم کے زمانے میں "عشق" کی صورت اختیار کرتا ہے، مگر اب ہسٹری ایک نئے دور میں داخل ہوگئی ہے اور اب فسادِ خوردنِ گندم سیاسی ہنگاموں کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ یہ چیز عشق سے زیادہ خطرناک ہے۔ عشق تو ایک آدھ گھرا جاڑ کر رہ جایا کرتا ہے، لیکن سیاسی ہنگامے حکومتوں کا تختہ الٹ دیتے ہیں اور ملکوں کے ملک اجاڑ کے رکھ دیتے ہیں۔

لیکن ابھی اسمگلنگ کی رفتار بڑی کمزور ہے، سیاست بازوں کو کچھ نہ کچھ مواقع کام کرنے کے مل ہی جاتے ہیں! ابھی فسادِ خوردنِ گندم کے متاثرین کی تعداد کافی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ حکومت اسمگلنگ کو جائز قرار دے دے!!
حضور اس نکتے پر ذرا توجہ فرمائیں!

——— (۱۳)

حضور والا!

شیخ سعدی کی روایت ہے کہ دمشق میں جب قحط پڑا تھا تو یاروں نے عشق کو فراموش کر دیا۔ اس اصول پر یہاں اگر قحط ہوتا تو لوگ سیاست کو یقیناً بھول جاتے، مگر حضورِ والا دیکھ رہے ہیں کہ یہاں دستور کی مہم چل رہی ہے اور خاصا زور پکڑ رہی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ لوگ شکم سیر ہیں!

اگر کوئی اس کے خلاف رائے دیتا ہے تو اسے ہم بحث کے لئے کمیونسٹوں کے پاس کیوں نہ بھیج دیں۔ اُن کا نظریہ یہ ہے کہ "اوّل پیٹ، بعدہٗ کچھ اور!"۔ اب اگر لوگ بھوکے ہو کر دستوری مطالبہ کی مہم چلا رہے ہیں تو اشتراکی فلسفہ باطل ہوا جاتا ہے، بصورتِ دیگر لوگ بھوکے نہیں! حریف کو بہر حال دونوں میں سے ایک بات ماننی پڑے گی، اور وہ جو بھی مانے ہمارے لئے وہی مفید ہے۔ یا وہ مانے گا کہ کمیونسٹ فلسفہ غلط ہے، یا وہ تسلیم کرے گا کہ قحط نہیں ہے۔ چت بھی اپنی، پٹ بھی اپنی!

ظاہر بات ہے کہ کمیونسٹ حضرات لینن کی نیاز کا ایصالِ ثواب کر کے اینجلز کے توسل سے مارکس کے حضور دعائیں مانگتے ہیں کہ بھوک آئے، فاقہ آئے، بیماری آئے، جنگ آئے، تباہی آئے! غرضیکہ کوئی مصیبت آئے تو ان کا کام چلے۔ قحط توان کے لئے سازگار ترین موسم ہوتا ہے۔ اگر قحط ہوتا تو سیاست کے کھیت میں "شامتِ عمل" کی فصل عام ہوتی، مگر یہاں تو "شکم

ملک کا دور دور تک پتا نہیں ملتا!

جھوٹ ہے، قحط نہیں ہے!

(۱۴)

حضورِ والا!

ہمارے عوام بھی عجب مخلوق ہیں! عوام سے میری مراد اپنے ملک کی اَن پڑھ بھیڑ بکریوں سے نہیں ہے، اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کے متعلق عرض کر رہا ہوں ـــــ ہمارے ملک کے عوام تو یہ ہیں! "ذخیرہ اندوزی، ذخیرہ اندوزی" کا واویلا مچا رکھا ہے اخباروں میں، قہوہ خانوں میں، ریل گاڑیوں اور بسوں میں، ہر جگہ یہی گفتگو ہے!

مگر خاکسار نے گھنٹوں اس پر مغز ماری کی کہ "ذخیرہ اندوزی" کونسا گناہ ہے؟ ذخیرہ اندوزی تو عین فطرت کا تقاضا ہے۔ "آلو اور اروی کے پودے ذخیرہ اندوزی کرتے ہیں یا نہیں؟ چوہے اور چیونٹیاں سب ذخیرہ اندوز ہیں یا نہیں؟ اونٹ کا کوہان ذخیرہ اندوزی کی علامت ہے یا نہیں؟ ـــــ (آدمیوں کے توند ہوتی ہے اور اونٹ کے کوہان!) فطرت کا سارا نظام ذخیرہ اندوزی کے ڈھنگ پر چل رہا ہے، اس اصول سے نہ عالمِ نباتات مستثنیٰ ہے، نہ عالمِ حیوانات! پھر غریب انسان ہی نے کونسا قصور کیا ہے کہ اسے اس فطری اُصول کے دائرے سے نکال باہر کیا جائے؟

ہمارے ذخیرہ اندوز انسانی دنیا کے آلو اور اروی ہیں!

ہمارے ذخیرہ اندوز اونٹ ہیں اونٹ!

ہمارے ذخیرہ اندوز شہد کی مکھیاں ہیں!

ہمارے ذخیرہ اندوز چیونٹیاں ہیں چیونٹیاں!

ہمارے ذخیرہ اندوز چوہے ہیں چوہے!

"چوہے" کا لفظ خواہ مخواہ بدنما سا لگتا ہے۔ یہ محض نفسیاتی غلط فہمی ہے۔ ورنہ پنجاب میں تو "شاہ دولہ" کے چوہے بڑے مشہور ہیں! جہاں شاہ دولہ کے چوہے پالے جاتے ہیں وہاں "شاہ غلّہ" کے چوہے اور سہی!

ذخیرہ اندوزی دُور اندیشی اور عاقبت اندیشی کا دُوسرا نام ہے۔ دوسرا نام کیا، عملی ظہور ہے! اس پر ناک بھوں چڑھانے والے غلطی پر ہیں!

ایک مکھی غلاظت کی مکھی ہوتی ہے جو ذخیرہ اندوزی نہیں کرتی، دوسری مکھی جو ذخیرہ اندوزی کرتی ہے، شہد کی مکھی کہلاتی ہے۔ وہ ذلیل ہے اور یہ معزز!

ہم کو چاہئے کہ ہم اپنے ذخیرہ اندوزوں کی عزت کرنا سیکھیں!

یہ لوگ ہمیں اسراف سے بچاتے ہیں۔ یہ جنس کو آہستہ آہستہ ہاتھ روک روک کر تقسیم کرتے ہیں۔ اس طرح ہم "ہینگ آئی، ہاتھ لگائی" کی حماقت سے بچتے رہتے ہیں!

(۱۵)

حضورِ والا!

ذخیرہ اندوزوں کے خلاف "غدّاروں" نے کافی پرچار کر ڈالا ہے۔ رائے عام بدقسمتی سے ان اچھے بھلے لوگوں کے خلاف ہو گئی

ہے۔ مگر قربان جائیے لیگی حکومت کے کہ رلمئہ عام چاہے بر سرِ حماقت ہی کیوں نہ ہو، اس کا احترام کرنا اپنا فرض سمجھتی ہے ہمارے وزرا جانتے ہیں کہ ذخیرہ اندوزی کرنے والوں میں اکثریت لیگی حضرات کی ہے اور ذخیرہ اندوزی کے خلاف قدم اُٹھانے سے بہر حال ان کو نقصان پہنچے گا۔ مگر وزرا نے یہ قربانی بھی دے دی۔ پہلے ذخیرہ اندوزوں پر چھاپے مارنے کی مہم صرف سرکاری دفاتر کے اندر اندر کاغذی کارروائی تک محدود تھی، مگر اب عملاً شروع ہو گئی ہے۔

فدوی کا اپنا بھتیجا تھا ہے۔ وہ منٹگمری کے ایک چک میں ایک بڑے زمیندار کا پرانا مزارع تھا۔ یوں تو آپ کی جوتیوں کے طفیل یہ پیرِ ذرّہ درگاہ مسلم لیگ کے سایۂ رحمت میں اتنی رسائی رکھتا ہے کہ کتنے ہی گنواروں کو فوج میں ڈائرکٹ "لیس نائک" اور پولیس میں ہیڈ کنسٹیبل بھرتی کرا چکا ہے اور کتنے ہی مڈل فیل نوجوانوں کو کلرکی دلا چکا ہے، مگر اپنے بھتیجے کے لئے کچھ نہ کر سکا۔ وجہ یہ کہ ایک تو فدوی کا بھتیجا کانا ہے، دوسرے یہ فدوی عہدے کو اپنے رشتہ داروں کے لئے استعمال کرنا نہیں چاہتا —— ورنہ "کانا" ہونے سے کیا ہوتا ہے، اُلٹا کمانے کے لئے بڑا چانس ہے یہاں، کیونکہ اندھوں میں کانا راجا بن سکتا ہے، اور حضور سے زیادہ کون اس سے واقف ہو گا کہ یہاں اندھوں کا زور ہے! آخر وہ غریب اپنے آبائی کام میں جُتنے میں مجبور ہو گیا۔

اب کی جو زرعی اصلاحات کے نام سے حکومت پنجاب نے قانون سازی کی ہے تو فدوی کے بھتیجے کی بھی اصلاح ہو گئی ہے، یعنی وہ بے دخل کر دیا گیا ہے۔ اُس نالائق نے مجھے اطلاع بھی نہیں کی۔

ایک دوست کے خط سے معلوم ہوا ہے کہ وہ قریب کے ریلوے اسٹیشن پر قلی کا کام کرتا ہے غلّہ دو چار مہینے کا اس کے پاس تھا اور قلی گری سے چار پیسے کما لاتا، اس طرح وقت گذار رہا تھا۔

مگر بدقسمتی کہ غلہ کی برآمدی کی مہم شروع ہو گئی۔ مہم کا طریق کار یہ ٹھہرا کہ محکمہ مال کے افسر اور پولیس کے کارکن ایک ایک بستی پر دھاوا بولتے ہیں۔ زمینداروں کے ہاں چونکہ کوئی ذخیرہ نہیں ملتا، لہٰذا وہ پوری بستی پر غلّے کا چندہ لگا دیتے ہیں۔ میرے بھتیجے سے بھی اس مہینے چندہ لیا گیا اور اس کے تین من کے ذخیرے میں سے ایک من برآمد کرا لیا گیا۔ غریب کی کمر ٹوٹ گئی ہو گی!

مگر بہر حال عوام کی فلاح و بہبود پر میں اپنے بھتیجے کے آرام کی قربانی کو خوشی سے گوارا کرتا ہوں! اب مجھے کچھ کچھ شبہ ہے کہ کہیں واقعی قحط تو نہیں آ گیا!

غلے کی برآمدگی کی مہم کی رفتار بہت سست ہے۔ غلّہ بہت تھوڑا برآمد ہو رہا ہے۔ اگرچہ سرکاری اخبارات ایک ایک من کی برآمدگی کی خبر بھی پنج کالمی سرخیوں کے ساتھ دے رہے ہیں، مگر بہر حال لوگ سرخیوں کے نیچے جب اصل خبر کو پڑھتے ہیں تو ان کے کھِلے ہوئے چہرے پھر منڈ جاتے ہیں۔

ناچیز نے اِس سلسلے میں رت جگے کر کر کے ایک اسکیم سوچی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ وزارت نے اسے پسند کر لیا ہے۔ اور اب اسمبلی میں ایک بل پیش ہونے والا ہے جس کے تحت موجودہ ہنگامی صورتِ حالات میں حکومت مجاز ہو جائے گی کہ وہ چیونٹیوں اور چوہوں کے بِل کھود دوا کر ان میں سے بھی غلہ برآمد کرے۔ جو کوئی چوہا یا چیونٹی اپنے ذخائر کو چھپانے کی کوشش کرے، یا کسی مہم برآمدگی میں کسی افسر مجاز کے راستے میں حائل ہو، یا حائل ہونے کی نیت رکھے، یا قرائن سے معلوم ہو کہ وہ حائل ہونا چاہتا ہے یا چاہتی ہے تو اسے بلا مقدمہ چلائے غیر معین مدت کے لئے نظر بند کیا جا سکے گا۔ اور کوئی عدالت اس معاملے میں حکومت کے اقدام کو زیرِ بحث نہ لا سکے گی اور نہ کسی نظر بند سے صفائی طلب کر سکے گی! چوہوں کی نظر بندی کے لئے تو چوہے دان پہلے سے موجود ہیں، مگر چیونٹیوں کا مسئلہ بڑا پیچیدہ ہے۔ آج تک عالمِ انسانی میں چیونٹیوں کی نظر بندی کے لئے کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔ غالباً اس ایجاد کا سہرا پاکستان

کے سربلند رہے گا۔ اِس معاملے میں غور و خوض کرنے کے لئے ایک پارلیمنٹری سب کمیٹی بٹھادی گئی ہے اور اس سب کمیٹی کے ساتھ علم حیوانات کے ماہرین و محققین کا ایک امدادی بورڈ علمی ریسرچ پر مامور کیا گیا ہے۔ تین ماہ کے اندر اندر سب کمیٹی کو اپنی سفارشات پیش کر دینی ہوں گی! انجینئروں کی ایک پارٹی کو چیونٹیوں اور چوہوں کے بلوں کا سروے کرنے پر لگا دیا گیا ہے۔

چوہے دانوں کی فراہمی کے لئے بعض ٹھیکیداروں نے ابھی سے تگ و دو شروع کر دی ہے۔ آخر لاکھوں کی کمائی کا موقعہ نکلا ہے ابھی پرسوں ہی ایک ٹھیکیدار نے وزیرِ خوراک اور وزیرِ قانون کی شاندار دعوت کی ہے!

حضورِ والا! اسکیم بڑی شاندار ہے۔ اندازہ فرمایئے کہ صوبۂ پنجاب میں چیونٹیوں اور چوہوں کے کئے کروڑ بل ہوں گے۔ فرض کیجئے کہ یہ تعداد ۲ کروڑ ہو' اور ہر چوہے کے بل میں سے ایک پاؤ' اور چیونٹیوں کے ہر بل میں سے ۲ سیر غلہ برآمد ہو تو برآمدگی کی مہم کے نتائج کہاں جا پہنچیں گے۔

والد مرحوم (بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھا سے اللہ! بسم اللہ شریف کے ختم کا ثواب ان کی رُوح کو پہنچا یو! آمین) فرمایا کرتے تھے کہ جب ۱۸۶۵ء کا مشہور قحط پڑا تو گاؤں کے بعض لوگوں نے چیونٹیوں کے بِل کھودے۔ بعض بلوں میں سے چھ چھ سیر آٹھ آٹھ سیر غلہ برآمد ہوا۔

چیونٹیوں کی ذخیرہ اندوزی کا عالم یہ ہے کہ انہوں نے حضرت سلیمان کے پورے لشکر کی تین دن کی ضیافت کی تھی۔

اسکیم بڑی شاندار ہے۔ خدا اسے کامیاب کرے۔

(۱۶)

حضورِ والا!

میرے بھتیجے کا خط آیا ہے۔ لکھتا ہے' بچے فاقوں مرنے لگے ہیں!

اب مجھے اندیشہ ہے کہ قحط ضرور ہو گا' اور اگر قحط نہیں تو کوئی ایسی ہی چیز اور ہو گی!

لیکن —— پنجاب میں قحط سے کسی جانی نقصان کا اندیشہ نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پنجاب کا آدمی گندم پر نہیں' حقّے پر جیتا ہے۔ اسے اگر حقّہ ملتا رہے تو وہ بغیر کھائے پیئے سو سال تک زندہ رہ سکتا ہے! آپ دوسرے صوبوں کی فکر کیجئے' پنجاب کے شہری گندم کے بغیر جی سکتے ہیں۔ تمباکو کا قحط بہر حال نہیں ہے!

خدارا! حضورِ والا زیادہ پریشان نہ ہوں۔

(۱۷)

حضورِ والا!

صحت کی وزارت کی ایک اونچے درجے کی خفیہ غذائی کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ اس میں غذائی صورتِ حالات پر گہرا غور و خوض کیا گیا۔ غور و خوض کا اصل نقطہ یہ تھا کہ گندم ہوتے کال کی جو کیفیت ہے اس پر تو کسی کا قابو نہیں' یہ تو اللہ کی مرضی ہے اور اس کی مرضی کے آگے دم کون مار سکتا ہے۔ البتہ عوام کے جذبات کو سنبھالنے کی ضرورت ہے۔ اس پر اتفاق ہو گیا کہ عوام کے جذبات کو سنبھالنے کے لئے کانفرنسیں' اسکیمیں اور تجویزیں کافی ہیں! المختصر متعدد تجاویز پیش کی گئیں اور ساری کی ساری پاس ہوئیں۔

ایک تجویز یہ تھی کہ "یقین' اتحاد اور تنظیم" کی پبلسٹی بڑھا دی جائے۔

دوسری تجویز یہ تھی کہ لوگوں کو ڈیوڑھوں پر "کیو" لگانے کی تربیت دی جائے'

بھوکا پنجاب

تیسری تجویز یہ تھی کہ اپوا سے درخواست کی جائے کہ وہ زیادہ سے زیادہ مینا بازار لگائے - نیز بلبل چوہدری کے ناچ دکھانے کا جا بجا انتظام کیا جائے۔ جمالیات کے مظاہرے بھوک سے لوگوں کی توجہ کو ہٹا سکتے ہیں!

چوتھی تجویز یہ تھی کہ پاکستان بھر میں ایک تولہ روزانہ فی کس کے حساب سے آٹا فنڈ جمع کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اتنی حقیر سی مقدار دینا کسی بھکاری کے لئے بھی مشکل نہیں اور قطرہ قطرہ بہم شود دریا کے اصول پر آٹھ کروڑ افراد سے ۲۵ ہزار من روزانہ آٹا جمع ہوگا - اس فنڈ کے لئے ایک مستقل بنک آٹا بنک کے نام سے کھول دیا جائے، جس کی شاخیں ہر راشن ڈپو میں قائم ہوں۔ جیسے ہسپتالوں میں خون کے بنک ہوتے ہیں۔

سوچا گیا ہے کہ آٹا فنڈ کے لئے حضورِ والا کے لبِ مبارک سے اپیل کرائی جائے۔ اگرچہ لوگوں کے سیاسی شعور کی ناپختگی کی وجہ محض اپیل کے بل پر کام نہیں چلے گا بلکہ ہر دوسرے فنڈ کی طرح ناگزیر ہوگا کہ تمام سرکاری افسروں، خصوصاً تحصیلداروں اور پٹواریوں * اور پولیس کے کارکنوں سے مدد لی جائے - آخر جن طریقوں سے مسلم لیگ کے لئے ووٹ حاصل کئے جاتے رہے ہیں وہ آٹا فنڈ کے سلسلے میں کیوں بکار آمد نہ ہوں گے؟ ضرور ہوں گے! آپ ایک تولہ کا حکم دیں تو آپ کے نیاز مند ایک پاؤ روزانہ نکال لائیں گے۔

ادھر مسلم لیگ کے والنٹیرز اور نیشنل گارڈ کے رضاکاروں اور اپوا کی بیگمات سب کو میدان میں اتار دیجئے۔ ایک تو ان کو ماس کانٹکٹ کا موقع ملے گا اور لیگ دفتروں سے نکل کر ایک مرتبہ پھر میدانِ عمل میں آجائے گی اور دوسرے وقط کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔

حضور اندیشہ نہ کریں گے کہ جمع کرنے والے ہاتھ بیچ میں خیانت کر لیں گے - وہ فنڈ کا اگر بیس پچیس فیصد حصہ کھا بھی گئے تو اس سے کیا ہوتا ہے، پھر بھی بہت بڑی مقدار ہوگی - آخر ایک دن میں پچیس ہزار من کے معنی یہ ہیں کہ ساڑھے تین ماہ میں ۹۳۷۵۰ ٹن غلہ جمع ہوگا - اس میں سے اگر تیسرا حصہ بھی کارپرداز اور کارکن ہضم کر گئے، تو بھی ۶۲۵۰۰ ٹن غلہ پنجاب کے بھوکے عوام کے لئے بچے گا۔ لیکن نہیں! حضورِ والا! آپ کے دست و بازو اتنے چلتے پرزے ہیں کہ وہ اپنے حصے کا مال پہلے ہی زیادہ حاصل کریں گے اور بقایا فنڈ بالکل صحیح اعداد و شمار کے مطابق رہے گا!

راشن ڈپوؤں میں آٹا بنک کی شاخیں کھولنا اگر موزوں نہ سمجھا جائے تو پھر مسلم لیگ کے دفاتر موزوں رہیں گے۔ اس آٹے کی تقسیم بھی، تجویز یہ ہے کہ مسلم لیگ کے باوردی رضاکاروں کے ہاتھوں ہو اور وہ آٹا اس شرط پر دیں کہ مسلم لیگ کی رکنیت اختیار کی جائے۔ اس طرح قائداعظم مرحوم کی یہ امانت مضبوط تر ہو جائے گی!

تجویزوں کو کانفرنس نے پاس تو کر دیا ہے، مگر تکمیل اللہ تعالےٰ کے ہاتھ میں ہے! ان کے عمل میں آنے سے قبل کا زمانہ بھی یونہی نہیں گذارا جائے گا۔ فیصلہ یہ بھی ہو گیا ہے کہ ان کی خوب پبلسٹی کی جائے۔ سرکاری اخبارات ان کے بارے میں امید پرور ادارئیے لکھیں اور ہر روز اسی موضوع پر لکھتے رہیں۔ اس سے نفسیاتی اطمینان پھیلے گا۔ اصل چیز ہے ہی نفسیاتی اطمینان! —— اور ہمارے عوام خاص طور پر نفسیاتی اطمینان سے زیادہ اور کچھ چاہتے بھی نہیں! وہ ابتک جملہ مسائل کے بارے میں نفسیاتی اطمینان ہی کے بل پر جی رہے ہیں۔ کشمیر کا مسئلہ ہو یا مہاجرین کا، اسلامی نظام کا ہو یا معاشی تعمیر کا، کونسا حل ہوا ہے؟ مگر دیکھئے لوگوں میں کوئی اضطراب نہیں۔ دل کا اطمینان بڑی چیز ہے سرکار!

خود اس اونچے درجے کی کانفرنس کا چرچا بھی اطمینانِ قلب پیدا کرے گا۔

—— اپنے عوام کو تو حضورِ والا جانتے ہی ہیں!

کانفرنس کی ایک نشست کل پھر ہوگی!

(۱۸)

حضورِ والا!

کانفرنس کی دوسری نشست بھی حسبِ سابق کامیاب رہی۔

اس میں یہ شاندار اسکیم طے ہوئی کہ "غلہ زیادہ اُگاؤ" کی مہم شروع کر دی جائے۔ جس بات اس پر تقریریں ہوں، بیانات دیئے جائیں، اخبارات میں آرٹیکل لکھوائے جائیں، تاکہ لوگ محسوس کریں کہ حکومت غذائی مسئلہ حل کر رہی ہے۔ کھیتوں میں تو غلہ اپنے موسم پر اُگے گا مگر کاغذی دنیا میں بہرحال سبز باغ لگائے جانے چاہئیں اور خیالات کی کھیتوں میں گندم کے پودے لہلہاتے دکھائی دینے چاہئیں۔ لوگوں میں اس حکیمانہ نکتے کا خوب چرچا کرنا چاہیئے کہ "ہر دانہ ہے صد ہزار دانہ"۔ یعنی پنجاب میں جو غلہ موجود ہے اسے صد ہزار سے ضرب دے کر حوصلہ افزا اعداد و شمار سامنے لائے جائیں۔

(۱۹)

حضورِ والا!

کھانے کی آخر ایک چیز گندم ہی تو نہیں ہے کہ پنجاب "بھوک بھوک" کے نعرے بلند کرنے میں حق بجانب ہو! خصوصاً محاورے میں تو گندم کھانے کی کوئی نظیر اساتذہ کے ہاں ملتی ہی نہیں۔ ایک دانہ کھانے کا تذکرہ ضرور آتا ہے مگر اس کے ساتھ دام کا ہونا لازمی ہے سو دام اٹھا کے صیاد جا چکا، اب تو آزادی کا دور دورہ ہے۔ اب کوئی دانہ کیوں کھائے! اب تو آزادی کی ہوا کھانی چاہیئے، علاوہ ازیں محاوروں کی دنیا میں کھانے کی بھی ایک نمایاں چیز ملتی ہے۔ ہوا میں آکسیجن کا جو جزو شامل ہے وہ خون کے سُرخ ذرات کو بڑھاتا ہے۔ پھر ہوا خوری کو نکلا جائے تو سورج کی ابتدائی شعاعوں سے وٹامن "ڈی" ملتی ہے جو مکھن اور انڈوں میں پائی جاتی ہے لہٰذا سورج کی شعاعیں جذب کرنا مکھن انڈے کھانے کے برابر ہے!

شعرا نے کھانے کی جس دوسری اہم شے کا پتہ دیا ہے وہ غم ہے۔ مگر تحقیق یہ ہے کہ غم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک "غمِ روزگار" دوسری "غمِ جاناں"! محققین بیان کرتے ہیں کہ غمِ روزگار میں وٹامن کم ہیں، البتہ غمِ جاناں میں وٹامن بڑی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ غم کی غذا سے جسم کسی قدر دبلا ہو جاتا ہے، بلکہ اس کی کثرت سے بعض اوقات عشاق کا بدن گھٹ کر جوں جتنا بھی رہ جاتا ہے، لیکن روح اس کی وٹامنوں سے بڑی موٹی ہو جاتی ہے۔

مشکل یہ ہے کہ عوام شاعرانہ مزاج کو کھو کر سیاست باز ہو گئے ہیں۔ اِس لئے شعراء کی تجویز کردہ غذاؤں سے رغبت نہیں رکھتے۔ خیر! سیاست کی دنیا میں کچھ چیزیں کھانے کی ہیں۔ مثلاً لاٹھیاں کھائی جاتی ہیں اور گولیاں کھائی جاتی ہیں! اور ایک حکومت پولیس رکھتی ہی اس لئے ہے کہ جب اس کی دنیائے سیاست کے باشندے بھوکے ہوں تو وہ ان کے سیاسی کھانے کا انتظام کرے۔

بہرحال گندم کھانے کا تذکرہ نہ شعر و ادب کے محاورے میں ملتا ہے، نہ سیاست کے روزمرہ میں! لہٰذا فکر کی کوئی بات نہیں۔ جو لوگ غوغا کر رہے ہیں وہ طبعاً شر پسند ہیں! ورنہ یہاں نہ ہوا کی کمی ہے، نہ غم کی، نہ لاٹھیوں اور گولیوں کی!

(۲۰)

حضورِ والا!

ایک بڑھیا حال ہی میں غریبی کے مارے اپنی نوجوان لڑکی کو بازار معصیت میں بیچ گئی ہے۔ اس لڑکی کا افتتاح کل رات کو جی ایم' ایل' اے صاحب نے فرمایا ہے۔ ان سے اتفاقاً فلیٹی میں ملاقات ہو گئی۔ آپ شاعر ہیں اور "ایک رات" کے عنوان سے آپ نے اپنی تازہ نظم سنائی جس میں سارا فسانۂ حقیقت بیان کر ڈالا ہے۔ اتفاق سے ایک اخباری رپورٹر بھی پاس تلی کسلا ٹیا لینے کے لئے پڑا تھا۔ اتا پتا معلوم کر کے اس نے لڑکی سے جا کر انٹرویو لیا اور اخبار میں چھاپ ڈالا!

کچھ پرانے خیال کے لوگ اس خبر پر بڑے حساس پنے کا ثبوت دے رہے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ جب بازار معصیت ہمارے نظام زندگی کا ایک جزو ہے تو اسے قائم رہنے کے لئے نت نئے رنگروٹ —— یا رنگروٹنیاں —— ملتی چاہئیں۔ پرانے خیالات اور مذہب و اخلاق کا ملایانہ تصور بھرتی میں روڑا بنتا ہے۔ آخر کوئی گھر بھوکوں مرتا ہے تو نیا مال منڈی میں آتا ہے اتنی بھوک تو ضروری ہے جس سے تمدن کی مشین کو پرزے ملتے رہیں۔ اس کا نام قحط تھوڑا ہی ہے!

(۲۱) ——————

حضور والا!

اب تو دھڑا دھڑ باہر سے گندم آرہی ہے! امریکہ سے بھی اور روس سے بھی!

امریکہ کی گندم سفید امپیریلزم کے کھیت میں پلی ہے اور روس کی گندم سرخ امپیریلزم کی مٹی میں! وہ ہمارے خون میں سفید ذرات کو بڑھائے گی اور یہ سرخ ذرات کو! توازن درست رہے گا!

مگر جانے کیا بات ہے کہ گندم کا نرخ اتنی درآمد کے باوجود پنجاب کے اکثر شہروں اور دیہاتی علاقوں میں گرنے نہیں پایا' بلکہ بعض جگہ تو اور اونچا ہو گیا ہے۔ ۱۲ روپے من' ۱۸ روپے من' ۲۰ روپے من تک تو ہے!

(۲۲) ——————

حضور والا!

باہر سے جو گندم آرہی ہے' بڑے مزے کی ہے۔ کچھ تو سیلی ہو کر سڑ گئی ہے' کہتے ہیں کہ اس طرح جو کیمیاوی عمل واقع ہوتا ہے۔ وہ پنسلین پیدا کر دیتا ہے۔ پنسلین دنیا کی مفید ترین دواؤں میں سے ہے۔ کوئی ڈاکٹر ایسا نہیں جو دن بھر میں دس بیس انجکشن پنسلین کے نہ لگا دیتا ہو۔ امرت دھارا کی طرح آج یہ ہر مرض کا علاج ثابت ہو رہی ہے۔ اگر کوئی چاہے تو صرف پنسلین لے کر بیٹھ جائے' بس وہ تمام امراض کا ازالہ اس ایک معجزانہ دوا سے کر سکتا ہے۔ مگر اس کی وجہ سے ملک کی دولت بڑی تیزی سے باہر جا رہی ہے۔ اب جو گندم ایک خاص کیمیاوی عمل سے گذری ہوئی آنے لگی ہے' یہ شاید ملک کو پنسلین کی درآمد سے بچا لے اور توازن تجارت درست رہ سکے!

لوگ ان حقائق سے واقف نہیں' بس ذائقے کو بیٹھے روتے ہیں! نالائق کہیں کے!

دوسری خصوصیت اس میں یہ ہے کہ گندم اور مٹی کوڑے کا تناسب پچاس پچاس فیصدی ہے۔ جس مٹی سے گندم پیدا ہوتی ہے وہی مٹی گندم کے ساتھ آرہی ہے تو یہ کوئی خراب بات نہیں۔ یوں سمجھئے کہ ماں بیٹی دونوں ساتھ ساتھ ہیں یوں بھی ؎

حقیقت ایک ہے ہر شے کی' خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

اس کا فائدہ یہ ہے کہ ظاہر پرست گھر ہستنیں اس گندم کا ایک ہفتے کا راشن لے کر اسے صاف کرنے میں بہر حال دو تین روز لگا دیں گی' یوں اس کے ہضم کی رفتار سست رہے گی اور تھوڑی گندم پر ملک زیادہ وقت گذار لے گا!

تیسری خصوصیت اس میں یہ ہے کہ پسوانے پر آدھا آٹا اور آدھی بھوسی نکلتی ہے۔ بھوسی کی کثرت ملک کو قبض جیسی ام الامراض سے بچالے گی۔ ورنہ محض ازالۂ قبض پر ہماری قوم لاکھوں روپے اڑا دیتی ہے

تعلیم کی چونکہ ہمارے ہاں کمی ہے، اس لئے جاہل عوام اکثر اس برآمد کردہ گندم کی نوعیت پہ ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور خاکم بدہن حضور تک کو برا بھلا کہنے لگ جاتے ہیں مگر حضور اور حضور کے اُن افسران کی یہ خدمت ملک کی تاریخ میں مستقبل کا مورخ زریں حروف سے لکھے گا کہ ایسی پُرافادیت گندم دنیا بھر کی منڈیوں سے چھانٹ چھانٹ کے ملک کو بہم پہنچائی۔ ناچیز کی رائے یہ ہے کہ اگر اس سائنٹفک گندم کی قیمت ایک روپیہ من چڑھا دی جائے تو شاید عوام اس کی صحیح قدر کرسکیں!

(٢٣)

حضورِ والا!

صوبائی حکومت کے ایک صوفیٔ طریقت نے بڑا زوردار بیان داغا ہے۔ فرمایا ہے کہ ہم پنجاب کے کسی فرد کو بھوکوں نہیں مرنے دیں گے۔

حضور! ملاحظہ تو فرمایئے، کتنا طنطنہ ہے اِن الفاظ میں، کتنی خود اعتمادی جھلک رہی ہے۔ اپنے حکمرانوں کے تیور ایسے ہی ہوتے ہیں! واللہ! صوبے میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی ہے۔ قحط کے وہم کی جڑیں کٹ گئی ہیں۔

یہ جو حضور نے پرسوں کے اخبار میں ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ لاہور کے مضافات میں ایک عورت نے اپنے شوہر کی بے روزگاری اور غریبی سے تنگ آکر اور اپنے بچوں کے لئے کئی دن سے کچھ نہ پاکر بالآخر کنوئیں میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی اور ساتھ ہی بچوں کو بھی لے ڈوبی، تو یہ واقعہ صوفیٔ طریقت کے بیان کے طنطنے پر کوئی دھبہ نہیں لگاتا۔ وہ عورت بہرحال بھوک سے نہیں مری، اس کے بچے فاقے کی وجہ سے موت کا شکار نہیں ہوئے، ایسا وقت آنے سے قبل اُس بے صبر نے خودکشی کر ڈالی! اسے چاہئے تھا کہ وہ بھوکی تھی تو پڑی رہتی اور موت کا انتظار کرتی، پھر اگر بھوک کے مارے وہ مرجاتی تو صوفیٔ طریقت کے بیان کے پرزے اڑ جاتے اور ثابت ہو جاتا کہ پنجاب بھوکا ہے!

مگر ایسا نہیں ہوا! وہ بیان اپنی جگہ پر جوں کا توں قائم ہے!

حضور والا کے لئے اس حقیر پر تقصیر نے کچھ مرغیاں (وائٹ لیگ ہارن) پالی ہیں، ہوائی جہاز سے روانہ خدمت کر رہا ہوں!

(٢٤)

حضورِ والا!

جن صوفیٔ طریقت کا میں پہلے تذکرہ کر چکا ہوں وہ تو بڑے پہنچے ہوئے بزرگ نکلے۔ اصل میں اللہ والوں کے تقویٰ کے کمالات دنیا کی نگاہوں کے سامنے نہیں آتے۔ کیونکہ یہ لوگ ریاء سے بچتے ہیں، مگر مشک آخر کتنی ہی بے ریا کیوں نہ ہو، اس کی "بُو" اخفاء میں نہیں رہ سکتی۔ صوفیٔ طریقت کا حال یہ ہے کہ جب سے قحط نہیں، فقط قحط کا پروپیگنڈہ شروع ہوا ہے موصوف نے بندگانِ خدا کے دکھ درد میں حصہ بٹانے کے لئے ایک وقت کا کھانا ترک کر دیا۔ دوپہر کو آپ بالکل کچھ نہیں کھاتے۔ صبح کا ناشتہ کرتے ہیں اور بس پھر رات کو جا کے کھانا کھاتے ہیں، دن کا وقت محض اللہ کے ذکر کی غذا پر بسر ہوتا ہے۔ بڑی قربانی ہے، بڑا ایثار ہے۔

مگر دیکھئے "بدنام کنندۂ نکو نامے چند" کو، کہ ایک اللہ والے کی اس قربانی پر پانی پھیرنے کے لئے یہ چرچا کر رہے ہیں کہ صوفیٔ طریقت نے دوپہر کا کھانا محض اپنی صحت کو سنبھالنے کے لئے ترک کر رکھا ہے۔ اور وہ صبح کا ناشتہ خوب اچھی طرح کر لیتے ہیں، توس مکھن

انڈا، پراٹھا، دودھ اور کیا کیا الم غلم ایک ہی مرتبہ اتنا ڈال بیٹھتے ہیں کہ دن بھر معدۂ مبارک ناشتے ہی کو ہضم کرتے کرتے بے حال ہو چکا ہے۔ سوال آخر یہ ہے کہ بالفرض انہوں نے ناشتہ شاندار کیا سہی لیکن اگر وہ دوپہر کا کھانا بھی کھانے لگ جائیں تو ان کو روک کون سکتا ہے؟ اور اب وہ اگر دوپہر کا کھانا ترک کرکے گندم کی ایک خاص مقدار قوم کے لئے چھوڑ رہے ہیں تو اس احسان کو سیدھی طرح کیوں نہیں مانا جاتا؟ سچی بات یہ ہے، حضورِ والا! کہ زمانہ ہی الٹا آگیا ہے۔ کرو تو بھی ڈرو اور نہ کرو تو بھی ڈرو!

(۲۵)

حضورِ والا!

صوفیٔ طریقت کی قربانی پر خاک ڈالنے کے لئے جو مہم چل رہی ہے اس سلسلے کی ایک تازہ روایت عرض کرتا ہوں۔

حضرت موصوف حال ہی میں بنگال تشریف لے گئے تھے اور ایک دوست کے ہاں قیام فرما تھے۔ وہ بظاہر بڑے ہی ثقہ راویوں کا بیان ہے کہ وہ حضرت صاحب کے میزبان سے ملنے گئے تو وہاں خود صوفیٔ طریقت بھی موجود تھے۔ آپ ناشتہ فرما رہے تھے۔ انڈا، پراٹھا، مکھن، رس گلے وغیرہ دسترخوان کی زینت تھے، جیسے ایک محاذ کا محاذ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اتنے میں ایک مرہٹی سپاہی آپ سے ملنے آیا۔ اُس نے ہم وطنی کے رشتے کی بنیاد پر صوفی صاحب سے بڑی تکلفی سے فریاد شروع کی کہ حضور، ہم سے دو روپے کا تین سیر اناج کھا کر لڑا نہیں جا سکتا۔ صوفی صاحب نے اسے دورِ سعادت کی یاد دلا کر صبر کی تلقین کی کہ "نبی صلعم اور صحابۂ کرام کا حال یہ تھا کہ ان کو ترسے سے کھانے کو کچھ ملتا ہی نہیں تھا اور وہ لڑتے تھے، تم کو تو خیر ملتا تو ہے" یہ کہتے کہتے پراٹھے سے تین مربع انچ کا ٹکڑا توڑ، آدھا فرائی انڈا اس میں لپیٹ، آپ نے مرہٹی سپاہی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بتیس دانتوں میں لے لیا۔ سپاہی دیکھتا رہا، جب وہ لقمے کو کچھ آگے سرکا چکے تو سلسلۂ کلام پھر جاری ہو گیا۔ "ہاں تو! پہلے مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ، تم نے تاریخ پڑھی تو ہو گی، نہیں تو کسی واعظ سے سنا تو ہوگا کہ ان کا حال یہ تھا کہ وہ پیٹ پر پتھر باندھ کے کئی کئی دن گزار دیتے تھے" اتنے میں پراٹھے کا ایک بٹا آٹھ حصہ اور انڈا فرائی الہ بن کر ان حضرت کی پیٹ میں پہنچ چکا تھا۔ اور سپاہی مارے شرم کے پانی پانی ہو گیا کہ کہاں مدینے کے سپاہی اور کہاں پاکستان کا یہ مرہٹی سپاہی!

ایک راوی کا بیان ہے کہ صوفی صاحب کا یہ نکتۂ معرفت سن کر اس کے جی میں آئی کہ وہ "گستاخی معاف" کہہ کر عرض کر دے کہ یہ اُس معاشرے کا حال آپ بیان کر رہے ہیں جس میں سپاہی کے پیٹ پر ایک پتھر بندھا ہوتا تھا تو سپہ سالار کے پیٹ پر دو پتھر بندھے رہتے تھے۔ لیکن راوی یہ گستاخی نہیں کر سکا کیونکہ اسے خطرہ تھا کہ صوفی صاحب فوراً جواب دیں گے کہ ہم پتھر سے زیادہ ثقیل پراٹھے اور انڈے پیٹ پر باندھ رہے ہیں، اور کیا چاہتے ہو ——— ظاہر ہے کہ راوی اپنا سا منہ لے کے رہ جاتا۔ لہٰذا وہ دیکھتا رہ گیا!

حضورِ والا! راوی چاہے ثقہ ہوں مگر روایت بہرحال ضعیف ہے۔ اسناد کے لحاظ سے قوی ہونے کے باوجود بھی بعض روایات اپنے متن کے اعتبار سے غلط ہو سکتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ راوی کی آنکھوں نے یا کانوں نے کوئی غلطی کی ہو! راوی کی ثقاہت کے مقابلے میں صوفیٔ طریقت کا پایۂ اعتبار یقیناً چہار گونہ بلند ہے!

(۲۶)

حضورِ والا!

منٹگمری کے دیہات میں ایک عورت نے خودکشی کر لی ہے۔ اس کے خاوند کو اطلاع ہوئی تو وہ بھی گاڑی کے نیچے آکر ختم ہو گیا۔

ایک باغی اخبار نے اس پر نوٹ لکھا ہے کہ حکومت نے ملک کی اقتصادی حالت کو اتنا گرا دیا ہے اور عوامی مسائل خصوصاً غلے کی پیداوار کو حل کرنے میں اس حد تک ناکام رہی ہے کہ اب خودکشی کی وارداتیں عام طور پر ہونے لگی ہیں۔

باغی اخبارات کی خصوصیت یہ ہے کہ واقعہ کوئی بھی ہو تا جو اس کا الزام بہرحال حکومت کے سر رکھ دیں گے! بھائی ایک عورت اور اس کے شوہر کی خودکشی سے حکومت کو کیا تعلق!

(۴۷) ———

حضور والا!

آہ! کیا بتاؤں! ——— حضور آنسو تھم نہیں رہے! گذشتہ عریضہ میں کل ہی منٹگمری کی جس عورت کی خودکشی کا ذکر کیا تھا وہ اس کمترین کے بھتیجے کی بیوی تھی، اور رشتے میں میری پھوپھی زاد بہن کی لڑکی تھی!

حضور! وہ میری بھانجی اور بھتیجا ضرور بھوک کا شکار ہوئے ہیں!

حضور! منٹگمری بھوکا ہے!

حضور! پنجاب بھوکا ہے!

حضور! میں نے آج ہی اپنی نوکری سے استعفےٰ دے دیا ہے!

حضور! میں بھی خودکشی کرنے کا ارادہ کر چکا ہوں!

حضور! ایک آخری گذارش ہے! میری لاش کو حکومت اپنے قبضے میں لے لے اور میرے گوشت کی خوب اچھی طرح بوٹیاں بنا کر۔ پنجاب کے ان تمام "مسائین" کو جبراً کھلائے جو دو مردوں کے حصے کا رزق کھا کر بھی بھوکے ہیں ——— اور جن کی وجہ سے پنجاب بھوکا ہے! ———

خدا حافظ!

بقیہ بلعم بن بعور صفحہ ۱۶۰

اس کے باوجود اس کی شہرت دور دور تک پھیلتی جا رہی تھی۔ ہزاروں مایوس مریض اس کے دست معجز نما سے شفا پا رہے تھے۔ ہزاروں دکھی دل اس سے تسکین حاصل کر رہے تھے۔ اس کا علم زیادہ ہو رہا تھا۔ اس کا مشاہدہ تیز تر ہو رہا تھا۔ اس کو اس امر کا عرفان حاصل ہو چکا تھا کہ سچی خوشی نہ تو بدن کی لذت میں ملتی ہے نہ روح کی لذت میں۔ سچی خوشی علم حق کو عمل کے سانچے میں ڈھالنے میں ہے۔ یہی حقیقت ہے۔ یہی سچائی ہے۔

انہی دنوں سرزمین ابوالہول میں ایک نئی بغاوت نئے عقائد کے ساتھ پرورش پا رہی تھی۔ اکثر قافلے اس کی خبریں لاتے۔ پھر فرعون کی غرقابی کی خبر بھی آئی جب بلعم کو اس بغاوت اور اس کے عقاید کی خوب تصدیق ہو چکی تو اس کا دل بے اختیار پکار اٹھا کہ وہ حق ہے اور اس کو اس تضاد کے عذاب سے صرف اسی تحریک میں شامل ہو کر ہی چھٹکارا حاصل ہو سکتا ہے لیکن اس کی روح اس قدر لاغر ہو چکی تھی کہ وہ اپنے اس عزم کو کبھی معرض تخیل سے نہ نکال سکا۔

جب بنی اسرائیل کا لشکر حق فروغ موآب کے میدانوں میں خیمہ زن ہوا تو بقول ایک پیغمبر کے مدین کی کھال میں رعشہ پڑ گیا بلعم جانتا تھا کہ حق کی یلغار کبھی رک نہیں سکتی۔ فتح صرف حق ہی کے لئے ہے لیکن اس کے باوصف وہ موآب کے سرداروں کی ترغیب کے سامنے اسی طرح بے بس ہو گیا جس طرح رات کے وقت پاؤں کے درد کے سامنے بے بس ہو جاتا تھا۔ اور جب قربانگاہ پر بددعا کرنے کے لئے کھڑا ہوا تو ہیبت خداوندی سے اس کا شعوری باطل دب گیا اور لاشعوری حق ابھر آیا۔ تب اسے واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ وہ ساری عمر حقیقت کے لئے نہیں عظمت کے لئے جد وجہد کرتا رہا تھا۔ سچائی کے لئے نہیں کبریائی کے لئے تگ و دو کرتا رہا تھا۔ فقط

مالِ حرام

فضل مِن اللہ

اٹھنی کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں ہوتی۔ چہ جائیکہ وہ کسی کی پریشانی کا سبب بن جائے لیکن آج یہی اٹھنی اس کے لئے ایک مصیبت بن گئی تھی —— اسے پریشان کئے جا رہی تھی، یہ اٹھنی اسے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ اور اس کی جیب اسے قبول نہیں کر رہی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے اٹھنی نہیں ایک تڑپتی ہوئی مچھلی جیب میں ڈال لی ہے جو تڑپ رہی ہے، بے قرار ہے اور چاہتی ہے کہ وہیں پہنچے جہاں سے کہ اس کا خمیر اٹھا تھا۔

یہ اٹھنی اسے ابھی ابھی ملی تھی۔ اسے ظہر کی نماز ادا کر کے آئے ہوئے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ہو چکا تھا۔ اور وہ حسبِ عادت پیپل کی چھاؤں میں کرسی پر پاؤں رکھ کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی اس عادت پر بعض حضرات نے اعتراض بھی کیا تھا اور اس طرح بیٹھنے سے ایک کرسی ٹوٹ بھی گئی تھی مگر وہ اس عادت کو ترک کرنے کے لئے تیار نہ ہو سکا۔ فضا میں کوئی خاص گہما گہمی نہ تھی۔ بٹرنو موچی خاموشی سے اپنا کام کئے جا رہا تھا۔ سامنے کتنے ہی مسافر لوکل بس کا انتظار کر رہے تھے۔ اور وہ بھی خاموشی سے بیٹھا ہوا تھا۔ روزہ بھی کچھ کچھ چبک رہا تھا۔ اس لئے بس کا جی شارٹ ہینڈ کی پریکٹس کرنے کو بھی نہ چاہا۔ عین اس وقت اس کا چپراسی چمن خان آ گیا، وہ ایک خوش پوش نوجوان کو لایا تھا، یہ نوجوان کچھ پرزے رومال میں باندھے لے جا رہا تھا اور اس نے چونگی پر محصول ادا نہ کیا تھا۔ چمن خان نے اسے پکڑ لیا تھا اور اسے دس گنا رقم بطور تاوان کے محصول کے علاوہ ادا کرنے کے متعلق ڈرایا گیا تھا۔ نوجوان اس کے باوجود چنداں مضطرب نہ تھا، ممکن ہے وہ جرمانہ ادا کرنے کے لئے تیار ہو یا ممکن ہے کہ چمن خان سے اس سے پہلے ہی معاملہ طے کر لیا ہو۔

"منشی صاحب سے بات کیجئے۔"

چمن خان نے "مجرم" سے کہا۔

اور پیشتر اس کے کہ کوئی خاص بات ہوتی چمن خان نے اسے آہستہ سے کہا کہ وہ سوا روپیہ زائد دیدے اور اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔ نوجوان رضامند ہو گیا اور منشی صاحب نے رسید بک سنبھالی اور رسید تیار کرنا شروع کیا "صنعتی مشینری لکھنا"۔ چمن خان نے منشی کو یاد دلایا اور اس نے اس کا دھیان خاص طور پر رکھا۔ عام مشینری اور صنعتی یا زراعتی مشینری کے محصول میں ایک اور پانچ کی نسبت تھی۔ اس لئے عین ممکن تھا کہ اگر وہ یہ الفاظ نہ لکھتا تو پڑتال کرتے وقت محاسب اعتراض جڑ دیتا۔ لالہ دلیس راج تو اس سلسلے میں بہت تیز واقع ہوا تھا۔ وہ تو اس کی ٹوہ میں رہتا تھا۔ جہاں کہیں بھی اعتراض کے جراثیم اس کی قوتِ شامہ محسوس کرتی وہ فوراً اسے نوٹ کر لیتا اور اسے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کے پاس لے جاتا، یہ صاحب تو معاف کرنا جانتے ہی نہ تھے فوراً ٹیڑھے میڑھے حروف میں لکھ دیتے "یہ پرچہ اعتراض جاری ہو" اور صاحب چیرمین —— خصوصاً ایک نئے آدمی کے لئے ایک ایسا دردِ سر پیدا ہو جاتا جس کا علاج ایسپرو سے بھی نہ ہو سکتا۔ اسے اس درد کا پیشگی احساس تھا۔ اور اس لئے اس نے پرانے اور تجربہ کار چپراسی کی بات کو بڑے غور سے سنا اور نوٹ کر لیا اور "صنعتی مشینری" کے الفاظ صاف اور خاص طور پر لکھ دیتے۔ نوجوان چلا گیا تو "چمن" کی تقسیم ہوئی، بارہ آنے چپراسی نے رکھ لئے اور اٹھنی اس کے حصے آئی۔ اس نے مزید کے لئے اصرار بھی نہ کیا۔ کیونکہ اس کا چپراسی اس سے عمر، تجربہ اور جسم کے لحاظ سے بڑا تھا اور پھر یہ شکار بھی تو اس نے پھانسا تھا۔

اٹھنی لینے کو تو اس نے لے لی اور جیب میں بھی ڈال لی۔ مگر یہ اٹھنی اسے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ اور جیب سے نکل بھاگنے کے لئے بے قرار معلوم ہوتی تھی۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ روزے سے تھا۔ ورنہ یہ اس کے لئے پہلا موقع نہ تھا۔ وہ خود تو اس میدان کا شاہسوار نہ تھا، ویسے اس چونگی پر آمدنی کے زیادہ امکانات تھے بھی نہیں، لیکن یہ امکانات معدوم نہ تھے، ہر روز تو نہیں ہفتے میں ایک آدھ بار کوئی نہ کوئی آسامی قابو آ ہی جاتی تھی۔ یہ چونگی اسٹیشن کے اس ناکے پر تھی،

مالِ حرام

جہاں سے عموماً محصول سے بچنے کے لئے لوگ چھپے چوری نکل جایا کرتے تھے، اس لئے چمن خاں کو کوئی نہ کوئی شکار کبھی نہ کبھی قابو کر ہی لیا کرتا، جیسے اس نے آج کیا تھا۔ اور پھر سودا طے ہو جاتا تھا اور اسے کبھی محسوس بھی نہ ہوتا تھا کہ اس کی جیب میں حرام مال گیا ہے، وہ کوئی اضطراب محسوس نہ کرتا اسے کبھی بھی پریشانی نہ ہوتی تھی حالانکہ وہ نماز سے ناغہ نہیں ہونے دیتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود بھی وہ اس بالائی کو بڑے مزے سے حلق کے نیچے اتار لیتا تھا، بلکہ یہ خود بخود حلق سے نیچے اتر جاتی تھی، مگر آج یہ بالائی اس کے معدے کی مکھی بن گئی تھی، شاید۔ اس کی وجہ یہ ہو کہ شرفو کی نگاہیں ——— جب اس نے اٹھنی لی تھی ——— یہ کہتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں، کچھ تو شرم کرو، روزے کی لاج بھی نہیں آتی۔

عصر کی نماز کے بعد بھی وہ دیر تک اٹھنی کے متعلق سوچتا رہا۔ وہ اس کی وجہ سے مضطرب نہ تھا، اس کے ذہن میں ندامت کی کوئی لہر نہ اٹھی تھی، نہ ہی وہ تائب ہونے کے متعلق سوچ رہا تھا، ایک بے نام سا احساس تھا، اسے پریشانی سے تعبیر کر لیجئے۔ بہرحال ایک بات ضرور تھی وہ اس اٹھنی سے خلاصی چاہتا تھا، غیر شعوری طور پر اس کے دل میں یہ خواہش بار بار پیدا ہوتی تھی کہ کوئی آئے اور اس سے یہ اٹھنی لے جائے۔

دن ڈھل رہا تھا، سورج غروب ہو رہا تھا، وہ اب پیپل کے نیچے سے کرسیاں اٹھا کر باغ میں خیمے کے آگے آ گئے تھے، باغ میں طیور اپنے گھونسلوں کی طرف تیزی سے آ رہے تھے اور شام تیزی سے آ رہی تھی، وہ بھی افطاری کی تیاری کرنے لگا، اس نے کھانڈ کی پڑیا لیموں اور گلاس سنبھالا اور مسجد چل دیا، اس دوران میں اٹھنی اس کے ذہن سے چند لمحوں کے لئے اتر گئی، وہ خاموشی سے مسجد کی طرف جا رہا تھا۔ اسے نہ بھوک محسوس ہو رہی تھی نہ پیاس یوں ہی دن گزر گیا تھا، یہ اللہ کی نوازش تھی، وہ اس پر مغرور نہیں ہو رہا تھا، بلکہ اللہ کا شکر ادا کرتا تھا، اسے بڑے مولوی صاحب کا وعظ اچھی طرح یاد تھا، مولوی صاحب نے کہا تھا کہ جب انسان عبادت کر کے اتراتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے اعمال کو غارت کر دیتا ہے مگر جب وہ کہتا ہے "اے اللہ میں عاجز بندہ کسی قابل نہیں تھا، یہ تو تیری عنایت ہی تھی کہ میں اس قابل ہوا . . . . تو اللہ تعالیٰ کو اس کی فروتنی اور عاجزی پسند آتی ہے۔ اور وہ کہتا ہے "میرے بندے تو نے بھی تو کوشش کی، تیری یہ سعی میرے ہاں منظور ہے"۔

نماز سے فارغ ہو کر اس نے کرتے پہنا ایک روپہلی سی ٹمٹماہٹ ہوئی، مدھم سی اور اسے ایک دم پھر سے اٹھنی یاد آ گئی، یہ اٹھنی تھی جو چابیوں سے ٹکرائی تھی۔ افطاری کی جلدی اور نماز کے ہجوم میں وہ اسے بھول سا گیا تھا۔ اب وہ کچھ زیادہ پریشان تو نہ ہوا البتہ وہ اس سے نجات پانے کی سوچنے لگا۔ معاً اسے خیال آیا کہ وہ اسے گندی نالی میں پھینک دے، اس کا ہاتھ جیب میں گیا بھی اور اس نے اٹھنی کو تلاش بھی کر لیا مگر یہ جذبہ کچھ سرد سا پڑ گیا نجانے کیوں، حالانکہ اس نے اسے نالی میں پھینکنے کا فیصلہ ہی اس لئے کیا تھا کہ اس گندگی کو گندگی میں ہی پہونچنا چاہیئے۔ مگر وہ ایسا نہ کر سکا اس کا ذہن اور ہاتھ متفق نہ ہو سکے۔

چونگی پر پہونچ کر وہ کھانا کھانے لگا، چمن بھی کھانے کے لئے چلا گیا، وہ کھانا کھاتا رہا اور اٹھنی کے متعلق بھی سوچتا رہا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد بھی یہ اٹھنی اس کے ذہن پر سوار رہی، اور اس بوجھ کو سر سے اتار پھینکنے کے لئے وہ بے قرار سا ہو گیا، کرسی پر بیٹھے بیٹھے اسے قرار نہ آیا وہ اٹھ کر ٹہلنے لگا اور جب ٹہلتے ٹہلتے بھی مطمئن نہ ہو سکا تو پھر بیٹھ گیا۔ سامنے پھاٹک بند ہوا اور شرفو سامان سمیٹ کر باہر نکلا تھا، اس نے گھڑی کی طرف دیکھا تراویح میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ وہ چمن کا انتظار کرنے لگا۔ تاکہ وہ جلد ہی گھر پہنچ جائے اور تراویح پڑھ سکے۔ ساری رات چونگی سے غیر حاضر رہنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ مگر وہ اس خطرے کو بھی روزے کی خاطر نظر انداز کر دیا کرتا تھا۔

دفعتاً کسی کے پاؤں کی آواز اسے پیچھے کی طرف آتے سنائی دی۔ جلد ہی یہ آواز رک گئی۔ یہ شرفو تھا۔ اس نے اسے پکارا، اس نے ذرا بلند آواز سے کہا۔

"منشی"

وہ اس سے بے تکلف تھا، لہٰذا اس نے کسی تکلف کی ضرورت محسوس نہ کی،

"ہاں بھئی کیا بات ہے"؟ اس نے جواب دیا۔

(بقیہ صفحہ ۱۸۳)

جزیرۂ زندہ دلاں

فضل الرحمٰن

(ذیل کا معلومات افزا مقالہ ماہنامہ "نرالی دُنیا" کے یومِ استقلال نمبر ۱۹۹۵ء سے ماخوذ ہے)

جزیرۂ زندہ دلاں کی عمر آج پورے دس برس ہو گئی ہے۔ آج اس چھوٹی سی دنیا کی دسویں سالگرہ ہے۔ یہ جزیرہ پورے کرۂ ارض کے لئے ایک نمونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے زندہ دل شہریوں نے پوری انسانیت کے قافلے کے آگے بڑے بڑے مراحل ترقی طے کر لئے ہیں، ہم لوگ ترقی کے عساکر کا ہراول دستہ ہیں اور شاید ہم ہی ہونگے جو مستقبل کے پردوں میں چھپی ہوئی جنت امن و مسرت کے دروازوں پر پہلی بار دستک دے رہے ہیں!

آج یہ جزیرہ جس میں ہم آباد ہیں دُنیا کی تہذیب کے ماتھے کا جھومر بن گیا ہے! یہ دنیا کا ایک اعجوبہ ہے مگر افسوس کہ اسے کوئی آنکھ دیکھ نہیں سکتی، اس کے گرداگرد حکومت اسلامستان نے کنکریٹ کی سلوں سے جو مضبوط دیوار اٹھا رکھی ہے وہ اسے دُنیا سے جدا کئے ہوئے ہے۔ اس دیوار کے واحد گیٹ پر کڑے پہرے ہیں، اس جزیرے کے گرداگرد بحری دیدبانی کا ایک سنگین نظام قائم کر دیا گیا ہے۔ مگر وقت آئے گا کہ یہ دیواریں ٹوٹ جائیں گی اور یہ پہرے اٹھ جائیں گے، ہمارا کلچر پہلے اسلامستان کو اور پھر ساری دنیا کو فتح کرے گا۔

ہم نے ان دس سالوں میں اپنے کلچر کے مطابق جزیرۂ زندہ دلاں کی زندگی کو جس شان سے استوار کیا ہے اسے دیکھ دیکھ کر دن کو سورج اور رات کو تارے دنگ رہ جاتے ہیں!

ہمارا واحد شہر رومانس آباد اپنے محلات، اپنے پارکوں اور اپنی رنگا رنگیوں کے لحاظ سے ایک اعجوبہ ہے۔ اس بستی میں آپ کو عبادت گاہ کوئی نہ ملے گی، بلکہ مساجد کے فنِ تعمیر کا مظاہرہ کرنے والی مرمریں عمارات میں ہر سڑک پر آپ کو عشرت کدے ملیں گے۔ ان عشرت کدوں کے ہال کمروں میں عورتوں اور مردوں کے ننگے مجسمے نصب ہیں جو فنی لحاظ سے بالکل شاہکار ہیں۔ ان کے گرد اونچا اسٹیج پھیلا ہوا ہے۔ بغلی کمروں میں رنگا رنگ شرابیں رکھی رہتی ہیں اور گلفام ساقی ڈیوٹی پر موجود ملتے ہیں۔ بینڈ بجتے ہیں عشرت کدوں میں تمام حاضری دیتے ہیں۔ رات کو وقت مقررہ پر بینڈ ملی ترانہ گاتے ہیں جس کو لاؤڈ سپیکروں سے نشر کیا جاتا ہے۔ یہ گویا معبدوں کی اذان ہوتی ہے۔ ہر کوئی اپنی اپنی پسند کی شراب کا جام چڑھاتا ہے۔ مرد عورتیں اسٹیج پر جمع ہونا شروع ہوتے ہیں اور پھر سازندوں کی صف وقت مقررہ پر موسیقی کی لہریں بکھیرنے لگتی ہے، سازوں کے ساتھ انسانی آوازیں بھی شریک ہو جاتی ہیں۔ پھر ایک ایسا وقت آتا ہے کہ جسم یکایک متحرک ہو جاتے ہیں۔ یہ ہماری عبادت ہے۔ اس عبادت کی تکمیل یوں ہوتی ہے کہ پہلے تیز روشنیاں گُل ہو جاتی ہیں اور ہلکے سبز رنگ کی ایک رومانوی روشنی جو بہت ہی دھندلی ہوتی ہے باقی رہ جاتی ہے، اس لمحے لباس تنوں سے الگ کر دئے جاتے ہیں۔ اور انسانیت کی فضول قدروں کو بالکل ختم کر دیا جاتا ہے۔ اور پھر اچانک یہ سبز روشنی بھی غائب ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد کا عالم ایسا ہوتا ہے کہ اسے دنیا کی کسی زبان کے الفاظ بیان نہیں کر سکتے! ——— لوگ اپنی عشرت کدوں میں صبح کرتے ہیں، صبح کو پھر ایک ہلکی سی عبادت ہوتی ہے۔ اور لوگ کام پر چلے جاتے ہیں۔ یہ سارا انتظام سرکاری ہوتا ہے اس کے لئے کسی کو کچھ ادا نہیں کرنا پڑتا۔

چوکوں میں آپ دیکھیں گے کہ کسی چوک میں ستار یا سارنگی بجاتی سا ماڈل چبوترے پر نصب ہے، کسی چوک میں عورت کا ننگا مجسمہ جلوہ افروز ہے اور کسی چوک میں مجرد اعضائے جنسی کے ماڈل شیشے کے بکسوں میں سجا کے رکھ دیئے گئے ہیں۔ ہر طرف آرٹ ہی آرٹ جلوہ گر ہے۔

عورتوں کو مردوں کے دوش بدوش لانے کے لئے قانوناً یہ لازم کر دیا گیا ہے کہ ہر عورت قومی خدمات کے لئے کم سے کم دو گھنٹے کا وقت رضاکارانہ طور پر ضرور دے۔ کسی شراب خانے میں، کسی ریسٹورنٹ میں، کسی دفتر میں، کسی دکان میں، کسی کارخانے میں، کسی عشرت کدے میں، کسی کلب میں، کسی پارک میں، غرضیکہ کسی نہ کسی پبلک مقام پر اپنے آپ کو دو گھنٹے کے لئے پیش کر دے، بلکہ قوم کے حوالے کر دے۔ اسکے ذمے کوئی بارِ فرائض نہیں ہے، بس صرف یہ کہ وہ بن سنور کے رہے، قومی زنانہ لباس میں رہے، یعنی ایک زندہ دل کٹ کلمزارہ، ایک سینہ بند، ایک سینڈل اور ایک پرس کے علاوہ وہ کوئی بارِ لباس اپنے اوپر نہ لے، اور اپنی مسکراہٹوں سے، میٹھی میٹھی گفتگو سے، ترنم پاشیوں سے، رومانوی حرکات سے، مردوں کے دل بہلایا کرے۔ یہ عورت کے مسئلے کو حل کرنے کا ڈائرکٹ میتھڈ ہے۔ ہمارا جزیرہ اُس دنیا سے کٹ چکا ہے جس میں عورت کو اس مصرف میں لانے کے لئے خواہ مخواہ کے تکلف کے طور پر اسے ٹائپسٹ اور کلرک بھرتی کرنا پڑتا تھا۔ یہاں ہم نے یہ فریب کی آڑ ختم کر کے رکھ دی ہے۔ ایک عورت ایک مقام پر یہ ڈیوٹی صرف ایک ہفتے کے لئے دیتی ہے پھر وہ اپنی پسند کی کسی دوسری جگہ چلی جاتی ہے۔ اس طرح ذوق تنوع کے تقاضے بھی پورے ہوتے رہتے ہیں۔

قانوناً یہ لازم کر دیا گیا ہے کہ مرد و عورت، کا جہاں بھی سامنا ہو تو وہ کم سے کم باہم مسکراہٹ سے پیش آئیں، اور اگر ایک فریق زیادہ بے تکلف ہونا چاہے تو دوسرا اس کے رجحان کا احترام کرے۔ بخلاف اس کے اگر کوئی فریق دوسرے فریق کے سامنے نگاہ جھکاتے ہوئے پالیا جائے، یا منہ پھیرتا ہوا ملے، یا بے تکلفی کا مظاہرہ نہ کرے تو اس کا چالان ہو جاتا ہے۔ پرانی دُنیا میں جس طرح ٹریفک کو کنٹرول کرنے کے لئے پولیس کے سپاہی ہر چوراہے پر موجود رہتے ہیں اسی طرح یہاں پولیس کی ایک سپیشل ڈیوٹی یہ ہے کہ وہ صنفی احترام کے تقاضے پورے نہ کرنے والے شہریوں کا برسرِ موقع چالان کر دیں۔ برسرِ عام صنفی حجابات کو عمل میں لانا قانوناً جائز نہ رکھا گیا ہے، اگرچہ عوام نے اس معاملے میں اب تک رجعت پسندی کا ثبوت دیا ہے۔ اسی رجعت پسندی کی وجہ سے عشرت کدوں میں روشنی گُل کر دینے کا دستور باقی ہے۔ لیکن حکومت پورا زور لگا رہی ہے کہ شرم و حیا کی فرسودہ حِس کا کُلی خاتمہ ہو جائے۔ اس مقصد کے لئے ٹیلی وژن، سینما اور سرکاری تھیٹروں کے ذریعے بڑا کام لیا جا رہا ہے۔ پرندوں، مرغوں، کتوں، بلیوں، گھوڑوں، گدھوں اور انسانوں کو "تکلف برطرف" کی سب سے زیادہ ننگی حالت میں نمایاں کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ نانگا کلب کی رکنیت ہر شہری کے لئے ایک اہم تہذیبی تقاضے کے طور پر لازم ہے۔ نانگا کلب کے مراکز کہیں الگ تھلگ واقع نہیں ہیں، بلکہ شہر کے باغوں اور پارکوں میں اس طرح کی سرگرمیاں جاری رہتی ہیں۔

یہ ماحول صنفی انارکی کا ماحول ہے۔ اس ماحول کے نتائج کو معاشرہ ہر طرح Encourage کرتا ہے۔ سوسائٹی میں جو جو شہری بھی نفسانیت میں نمایاں مقام حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کو خاص خطابات اور سنہری تمغات دیئے جاتے ہیں۔ مردوں کو "خان بہادر" اور "عورتوں کو" خاتون بہادر" بنایا جاتا ہے۔ ان میں سے بھی جو جو امراضِ خبیثہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں وہ "[illegible]" کا خطاب پاتے ہیں۔

عورتوں سے قومی خدمات لینے کے لئے یہ ضروری ٹھہرا کہ ان کو بچے پیدا کرنے کی مشین نہ بننے دیا جائے، علاوہ بریں جزیرے کی محدودیت کے پیش نظر آبادی کو بڑھنے دینا خطرناک ہے۔ قانوناً چتیس سال کی عمر سے قبل کسی عورت کو زچگی کے مرحلے میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ سرکاری طور پر برتھ کنٹرول کا انتظام یوں کیا گیا ہے کہ تمام مردوں کو خصی کر دیا گیا ہے، بس سرکاری طور پر

ایک رجمنٹ ایک سو خوب ہٹے کٹے انسانی سانڈوں کی قائم کر دی گئی ہے پنتیس برس سے آگے گذر جانے کے بعد عورت کو حق ملتا ہے کہ اس کی گود ہری ہو۔ مگر بس ایک بچے سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں! پہلے تو قانون انضباط تناسل و توالد کے نفاذ میں ذرا سختی سے کام لینا پڑا مگر چونکہ شہری خوب مہذب تھے، اس لئے جلدی ہی اس کے مطابق ڈھل گئے۔ البتہ دو سال سے محسوس کیا جا رہا ہے کہ عورتیں اب اس بکھیڑے سے قطعی طور پر فرار اختیار کر رہی ہیں۔ عین ممکن ہے کہ آئندہ چند سالوں میں بقائے نسل کے لئے خاص انعامات رکھ کر عورتوں کی خدمات حاصل کرنی پڑیں۔ ایک تجویز اور بھی زیرِ غور ہے کہ دو چار سو عورتوں کا ایک خاص بیڑا انتہائی اونچے معاوضے دے کر مستقل طور پر اس خدمت کے لئے سانڈوں کی رجمنٹ کی طرح بھرتی کر رکھا جائے، تاکہ باقی آبادی امن سے رہے۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہم اس میدان میں یورپ سے بہت آگے نکل گئے ہیں۔

اس ماحول میں خیالی ادب کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ یہاں کے شاعر اور ادیب روز کی آپ بیتیوں کو شعر و افسانہ میں ڈھال دیتے ہیں اس طرح ادب اور حقیقت "من تو شدم، تو من شدی" کی طرح یک جان ہو گئے ہیں۔ اب نہ شاعر کو شاعری کرنے کے لئے خیالی گھوڑے دوڑانے پڑتے ہیں، نہ افسانہ نویس کو اپنی زندگی سے باہر کہیں سے کردار اور واقعات تلاش کرنے پڑتے ہیں۔ مگر ایک ذہنی تبدیلی یہ آ گئی ہے کہ اس حقیقت اساس ادب کے فن پاروں سے لوگوں کی دلچسپی روز بروز کم ہو رہی ہے، کیونکہ جن واقعات و حادثات سے روز ان کو سابقہ رہتا ہے۔ انہی کو ادب میں پاکر اور بار بار پاکر مزہ نہیں آتا۔ چنانچہ اب ادب کا ایک نرالا اسکول نمودار ہو گیا ہے۔ اس اسکول نے حقیقت کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ہے۔ اس مکتب ادب کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ انسان حقیقت پسندی کے مرض کا پرانا مریض ہے اور آدمی کے ساتھ سب سے بڑی اور خطرناک قدامت جو چمٹی ہوئی ہے وہ بھی حقیقت و واقفیت ہے۔ اور یہ حقیقت و واقفیت ہی وہ بد بلا ہے جو تاریخ انسانی میں ہر مصیبت کا سبب بنی ہے۔ تمام اختلافات، جھگڑے، تفرقے اور مذہب اور فلسفے حقیقت ہی کے نام پر نمودار ہوئے ہیں اور انسان کو جتنی پریشانیاں بھی آج تک لاحق رہی ہیں۔ حقیقت و واقفیت ہی کے طفیل رہی ہیں، لہٰذا ادب کا مقصد وجود ہی یہ ہونا چاہئے کہ وہ آدمی کو حقیقت و واقفیت سے نجات دلائے۔ یہ فطرت کی ایک جبریت ہے کہ جس نے آدمی کو حقیقت کا والہ و شیدا بنا رکھا ہے اور انسانی ارتقا بغیر اس کے ممکن نہیں کہ فطرت کی اس جبریت کے خلاف جنگ کی جائے۔ اس ادب کے علمبردار جو کچھ پیش کرتے ہیں، حقیقت کے بالکل برعکس پیش کرتے ہیں بس کوئی دن کی بات ہے کہ یہ مکتب ادب فضا میں چھا جائے گا۔ اس مکتب کی نگارشات گرم حلوے کی طرح بکتی ہیں!

اس ادب کے ایک شاہکار افسانے کی تمہید ملاحظہ ہو:۔

"سورج چمک رہا تھا، اس لئے خوب گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا، آسمان پر ایک ریل گاڑی چلی جا رہی تھی جس پر بھینسیں سوار تھیں، کوے کھیتوں میں رینگ رہے تھے، گلابی گلابی بادل درختوں کے ساتھ لٹک رہے تھے ——— اور وہ، وہ ——— "کنول" سر کے بل چلتے چلتے پر فشاں ہو رہی تھی ——— وہ بالوں میں کانٹوں کی گچھیاں سنوارے، رخساروں پر کالک ملے، آنکھوں میں سُرخی ڈالے ایسی بھلی لگ رہی تھی کہ نفرت کا جذبہ بے تحاشا مشتعل ہو رہا تھا۔ جب کنول نے اڑنے کے لئے پہلی انگڑائی لی تو یہ جذبہ ایک شعلہ بن گیا جس سے دل و جگر میں برفانی برودت دوڑ گئی!"

اسی کے متوازی مصوری اور موسیقی میں بھی حقیقت دشمن آرٹ کے تحت نئے تجربے ہو رہے ہیں۔ مثلاً خود میرے اپنے ڈرائنگ روم

کی مرکزی تصویر اسی نئے آرٹ کا ایک نادر نمونہ ہے۔

حکومت کا نظم و نسق چلانے کے لئے ایک پارلیمنٹ ہے۔ اس پارلیمنٹ کے رکن صرف سَر، خان بہادر اور خاتون بہادر قسم کے شہری ہو سکتے ہیں جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ صدارت اور وزارتِ عظمیٰ صرف سَر کا خطاب پانے والوں کو دی جاتی ہے۔ حکومت اہم معاملات کو پورے شہریوں کے استصواب سے طے کرتی ہے۔ گویا جمہوریت کی اعلیٰ ترین شکل یہاں رائج ہے۔ پارلیمنٹ کے اجلاس کے دوران میں شراب کی بلوریں مینائیں اور سبو چے بغلوں میں لئے اور زمردیں جام ہتھیلیوں پر تھامے قوم کی منتخب عورتیں گردش کرتی رہتی ہیں۔ یا ممبران کے ساتھ بیٹھ کر سامانِ تفریح بنتی ہیں۔

فوج میں کوئی مرد بھرتی نہیں کیا جاتا۔ ساری فوج خواتین پر مشتمل ہے۔ بہادری، جوانمردی اور دفاعی فنون کو مردوں نے قرنہا قرن سے اپنا اجارہ بنا رکھا ہے۔ اس اجارہ کے خلاف احتجاج کے طور پر جزیرۂ زندہ دلاں نے دفاع کی ساری خدمت خواتین کو سونپ دی ہے۔ اس انقلاب کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ فنِ جنگ بھی قطعی طور پر بدل دیا گیا ہے۔ ہماری چھاؤنیوں میں ایک طرف تیغِ ابرو، ناوکِ مژگاں اور برقِ تبسم کو دشمن کے خلاف استعمال کرنے کے جدید تجربات ہو رہے ہیں، دوسری طرف کچھ دستے موسیقی کے جادو کو جنگی مقاصد میں برتنے کی مشق کر رہے ہیں۔ قدیم مشرقی فنِ موسیقی نے یہ کمالات پیدا کئے تھے کہ نغموں کے جادو سے بارش برسائی جاتی تھی اور آگ لگا دی جاتی تھی۔ چنانچہ دفاع کے لئے اسے کافی سمجھا گیا ہے کہ ہماری زنانہ فوج ان دو قوتوں سے مسلح رہے۔ بارش برسا کر دشمن کی پیش قدمی روکی جا سکتی ہے اور اس کو مشکلات میں مبتلا کیا جا سکتا ہے اور جب تباہ کارانہ اقدام کرنا ہو تو آگ لگا دی جا سکتی ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ ان جدید فنونِ حرب کے ساتھ ہماری زنانہ فوجیں ایک دن ساری دنیا کو فتح کر لیں گی۔ ہماری فوجوں کے آلاتِ جنگ طاؤس و رباب ہیں!

یہاں سودے صرف چور بازار میں ملتے ہیں اور ہمارا ایک ہی بازار چور بازار کے نام سے پورے شہر میں تا خانوں کی صورت میں پھیلا ہوا ہے۔ ہماری قوم نے جن روایات اور جن قدروں کے لئے ہجرت کی تھی ان میں سے ایک اہم قدر اور روایت تو یہی چور بازاری ہی کی تھی۔ سوائے معاشرے نے پوری اہمیت کے ساتھ تسلیم کر لیا ہے۔ چور بازار کے تاجروں کو ٹیکس دینا پڑتا ہے جو بالکل چور بازاری کے اصول پر بغیر کسی حساب کتاب کے لگایا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ رشوت کو ایک قدیم قومی قدر کی حیثیت سے جائز رکھا گیا ہے۔ چنانچہ ہر کام کے لئے رشوت کھلم کھلا لی اور دی جاتی ہے، اس کا حساب کتاب بھی رکھا جاتا ہے اور اس پر حکومت کو باقاعدہ ٹیکس ادا کیا جاتا ہے۔

ہاں! خوب یاد آیا، آپ ہماری قومی دولت کے ذرائع کا حال بھی پوچھیں گے۔ ہمارے ذرائع بڑے مضبوط ہیں۔ نہ یہاں کاشت کاری ہوتی ہے، نہ صنعت و حرفت اور قوم عیش کرتی ہے کیسے؟ یوں کہ اسلامستان چھوڑنے سے پہلے پہلے ہم لوگوں نے مناسب موقع پر اپنی کمیونٹی کے سرمائے غیر ملکی بنکوں میں محفوظ کرا دئے تھے۔ اور بعد میں حکومت اسلامستان سے اس بات پر سمجھوتہ ہو گیا تھا کہ وہ ہمارے غیر ملکی سرمایوں کو نہ چھیڑے گی۔ یہ سرمائے ہم نے جا بجا بنکوں کی معرفت بڑی بڑی صنعتی و زراعتی اسکیموں میں لگا رکھے ہیں۔ اب ان کا منافع ہر سال پانچ کروڑ روپے حاصل ہوتا ہے۔ گویا ہماری قومی آمدنی دس ہزار روپیہ فی کس سالانہ ہے۔ اس آمدنی میں سے حکومت نصف حصہ اجتماعی مصارف کے لئے رکھ لیتی ہے۔ بقیہ نقد تقسیم ہو جاتا ہے۔ یہ ہے ہمارا واحد معاشی ذریعہ، اور اس کے بل پر ہمارے ہاں ایک مثالی معاشی مساوات قائم ہے۔

جزیرۂ زندہ دلاں میں خدا کا نام لینا، کسی طرح کی مذہبی عبادت کرنا یا مذہبی مراسم بجا لانا، ایک انتہائی سنگین جرم ہے۔ اس جرم کی سزا بڑی خوفناک ہے، مجرم کو جزیرے کی فصیل پر سے جا کر ہم باہر دھکیل دیا جاتا ہے ——— یہ ہے تو جلاوطنی کی سزا، لیکن مجرم

کے لئے عملاً یہ سزا موت ہی بن جاتی ہے۔ مذہبی مراسم میں سے اگر کوئی چیز باقی رہ جانے دی گئی ہے تو وہ صرف ایک نعرہ ہے "اسلام زندہ باد"! نعرہ بالکل بے معنی ہے، مگر ہماری کمیونٹی کی دیرینہ قدروں میں سے ایک قدر یہ بھی ہے کہ وہ جس رنگ میں بھی ہو "اسلام زندہ باد" کہے بغیر نہیں رہ سکتی! چنانچہ ریڈیو ٹیلی وژن، سینما، رقص ہر چیز کا آغاز و اختتام اسی اسلام زندہ باد سے ہوتا ہے۔

حکومتِ اسلامستان سے ہمارا بَیر اگرچہ ازلی ہے، لیکن ہم ان کی اس شرافت کے بہرحال قائل ہیں کہ انہوں نے اپنے معاہدہ کو خوب نباہا ہے۔ ہمیں با امن یہاں پہنچانے کے بعد ان دس سالوں میں ہمارے داخلی نظم میں کوئی مداخلت نہیں کی، ہمارے غیر ملکی سرمایوں پر ہاتھ نہیں ڈالا اور ہم غیر ممالک سے جو جو کچھ منگاتے ہیں وہ حکومتِ اسلامستان کی نگرانی میں جوں کا توں ہم تک پہنچتا ہے۔

آج کل ہمارے اکابر حکومت، اسلامستان سے اس مسئلے پر گفتگو (واضح رہے کہ باہر کی دنیا سے ہماری ساری گفتگوئیں ریڈیو بے تار برقی کے ذریعے ہوتی ہیں) کر رہے ہیں کہ جزیرۂ زندہ دلاں کے ایک وفد کو موقع دیا جائے کہ وہ اپنے آبائی وطن کا موجودہ نقشہ دیکھنے کے لئے اسلامستان جا سکیں، اسی طرح ایک اسلامستانی وفد کو ہمارے ہاں کے انوکھے نظامِ زندگی کا مطالعہ کرنے کے لئے بھیجا جائے۔ اگر یہ گفتگو کامیاب رہی تو قدیم دنیا سے ہمارا ٹوٹا ہوا ربط پھر بحال ہو جائیگا اور ہمارے کلچر کو پھیلنے کا موقع ملے گا لیکن جزیرہ کے اخبارات میں اس مسئلے پر جو بحث ہو رہی ہے اس میں مخالفانہ نقطۂ نظر بھی بڑا قابلِ توجہ ہے۔ موجودہ نسل اس تبادلہ وفود کے خلاف ہے۔ ان کو خطرہ یہ ہے کہ اگر ہمارا وفد اسلامستان گیا تو ظاہر بات ہے کہ اس کو اپنے کلچر کے مظاہرہ کا موقع وہاں کا ملّائی قانون اور رجعت پسند سماجی نظام دیگا ہی نہیں اور اگر کوئی رکن وفد مذہبی ماحول سے متاثر ہو گیا تو جزیرے کی نکٹی ہو گی۔ اپنے قانون کے تقاضوں کے خلاف ہمیں ان کو اذانیں کہنے اور نمازیں پڑھنے کی اجازت دینی پڑے گی۔ پھر ان کی ڈاڑھیاں اور پاجامے دیکھ کر ہماری خواتین کے ہارٹ فیل ہو جائیں گے علاوہ بریں وہ یہاں کے ہر منظر سے بدکیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ جنونی لوگ توڑ پھوڑ پر اتر آئیں، کیونکہ وہ تعصب زدہ ہیں، پھر یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ہمارے حالات جب جا کر اپنے ملک میں بیان کریں تو پبلک مشتعل ہو جائے کہ حکومت کیوں ایسے نظامِ کفر و فسق کی سرپرستی کر رہی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ اعلانِ جہاد ہو گا۔ نوجوانوں کے یہ احساسات بڑے وزنی ہیں۔ حکومت کو ان پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے ورنہ ہو سکتا ہے کہ ایجی ٹیشن ہو جائے!

آج ہماری تاریخ ہجرت کا اہم ترین باب ہماری نگاہوں کے سامنے ابھر آیا ہے اور ہجرت کے پس منظر میں کام کرتی ہوئی نیرنگیٔ زمانہ کے سارے کرشمے یاد آ رہے ہیں ——— ہا آ!!

ہم لوگ اصلاً اسلامستانی ہیں، مگر تمام اسلامستانیوں کے مقابلے میں ہم اتنی زیادہ ترقی کر گئے تھے کہ دونوں گروہوں کا مل کے رہنا تو کجا، ایک دوسرے کو سمجھنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ ہمارا رہن سہن الگ تھا، ہمارا کلچر الگ تھا، ہمارا لسانی ذوق الگ تھا، ہمارے لباس الگ تھے، ہمارا تصورِ مذہب الگ تھا، ہماری پسند و ناپسند اُن سے الگ تھی۔ آہستہ آہستہ ہم ان کے اندر ایک اقلیت بن گئے۔ ہماری رفتارِ ترقی جتنی جتنی بڑھتی گئی، عوام سے ہمارا بُعد بھی اتنا ہی اتنا زیادہ ہوتا گیا اور ساتھ ساتھ ہماری اقلیتی حیثیت بھی نمایاں تر ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ ایک دیس میں، ایک نظامِ زندگی پر متفق ہو کر رہنا ہم دونوں عناصر کے لئے ممکن نہ رہا۔ آخر ہجرت ہمارے لئے مقدر ہو گئی۔

زمامِ اقتدار ہمارے ہاتھ میں تھی اور اسلامستان بننے سے لے کر ۱۹۵۲ء تک ہم نے سیاست اور معیشت دونوں میدانوں میں کوس لمن الملک بجایا ——— اور اپنا مقام ہم نے باوجود جمہور کی عدم رضا کے چھ سال تک نہیں چھوڑا۔ یہ بات تو اول روز سے ہمارے سامنے تھی کہ تحریکِ اسلامستان کو چلاتے ہوئے ہم نے جو "اسلام اسلام" کے نعرے لگائے تھے وہ ایک دن ہمارے گلے پڑیں گے،

مگر ساتھ ہی ہم نے دلوں میں منصوبہ بندی یہ کر رکھی تھی کہ آزادی کے بعد اقتدار پاتے ہی ایک مرتبہ حریفوں کو کچل کر جب ہم تخت پر بیٹھیں گے تو پھر اسلام کا نام لینے والوں کو مولوی اور مُلّا کہہ کر چپ کرا دیا جائے گا۔ اور اگر خدانخواستہ کوئی سرپھرا ذرا زیادہ جسارت منہ نکلا تو پھر مصطفےٰ کمال بننے سے ہمیں کوئی چیز نہ روک سکے گی۔ اسلام کے دو چار جنونیوں کو پھانسی دینا کافی ہوگا۔ پھر ایک ہلّہ مسلمانوں کی معاشرت کے اُس قلعے پر بول دیا جائے گا جس میں کچھ پرانی قدریں پناہ گزیں تھیں اور اس کے بعد میدان صاف ہوگا!

مگر یہ اندازے غلط نکلے ——— قوم بالکل جاہل تھی! اسلامستان ترکی نہ ثابت ہوا' اور ہم مصطفےٰ کمال نہ بن سکے' کیونکہ زمانہ میں سال آگے آ چکا تھا۔ عوام ہم سے کٹتے گئے اور کم بخت مولویوں کے گرد جمع ہونے لگے۔ یہاں تک کہ بازی مولوی ازم کے ہاتھ رہی اور ہمارا وطن رجعت پسندی کے جھنڈے کے سائے میں چلا گیا! ——— وا حسرتا!

پھر بھی یہ ہماری تاریخ کا زریں باب ہے اور دنیا میں شاید پہلی مثال ہے کہ ہم نے عوام کی مرضی کے خلاف راج کیا' انتہائی حماقتیں کیں اور ڈٹ کر کیں؛ قوم کی تباہی کے سامان پیدا کئے اور کھُل کر کئے' لوگوں کو بے وقوف بنایا اور علی الاعلان بنایا' علماء عام کے مطالبوں اور تقاضوں کو پامال کیا اور دن دہاڑے کیا' قومی دولت کے بل پر عیش منائے اور بیچ کھیت منائے! کوئی ہمارا بال تک بیکا نہ کر سکا لوگ برابر ہمیں سلامیاں دیتے رہے' لوگ ہمارے حضور میں ایڈریس پڑھتے رہے' لوگ ہمارے استقبال کرتے رہے' لوگ ہماری تقاریر سننے کے لئے لاکھوں کی تعداد میں جمع ہوتے رہے' لوگ انتخابات میں ہمیں ووٹ دیتے رہے' لوگ ہم سے خوف کھاتے رہے ——— اور ایک فیصدی کی حقیر سی اقلیت ننانوے فیصدی اکثریت کو بھیڑ بکریوں کی طرح اشاروں پر چلاتی رہی!

مگر افسوس کہ ہم اپنے اصل مشن میں ناکام رہے۔ ہم نے قوم کو ترقی کے راستے پر ڈالنے کے لئے بڑے جتن کئے۔ ہم نے چاہا کہ اسلام پرستی کے فرسودہ جذبات ختم ہو جائیں' ہم نے کوشش کی کہ آرٹ کو فروغ ہو' گھر گھر گانے بجانے کے ہنگامے ہوں' چوکوں اور پارکوں پر ناچ ہوا کریں' عورتیں نیم عریاں ہو کر مردوں کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے زندگی کی رزمگاہ میں اتریں' یورپ کی زندگی کی نقل مطابق اصل اتاری جائے' مگر دو سو سال کی غلامی کی ماری ہوئی قوم ٹس سے مس نہ ہوئی۔

ہم نے قوم کی "اسلام زدگی" کا لحاظ کرتے ہوئے یہ منصوبہ بھی اختیار کیا کہ اسلام کی نئی تعبیر کی جائے اور جو کچھ ہم چاہتے ہیں اسی کو اسلام کے لیبل سے سامنے لایا جائے۔ چنانچہ چند اخبار نویسوں' مصنفوں اور ٹوٹے پھوٹے مولویوں کی مدد سے اسلام کا ایک نیا ایڈیشن بھی تیار کر لیا گیا۔ پھر پروپگنڈہ کیا گیا کہ ملاؤں کا اسلام تو بالکل جعلی ہے' اصلی اسلام تو ہمارے ہی سینوں میں محفوظ تھا' وہ جسے لینا ہو' ہم سے لے! مگر پرانے اسلام کے مقابلے میں قدامت پرست قوم کے ذہنی ماحول میں نیا اسلام چل نہ سکا۔ اور کشمکش بڑھنے لگی! قوم کو ہم جتنا کھینچنے کی کوشش کرتے۔ وہ اتنے ہی زور سے مُلائیت کی گود کی طرف لپکتی!!

۱۹۵۳ء کا سال طوفانِ احتجاج کے ساتھ شروع ہُوا۔ شہر شہر' قصبہ قصبہ گویا ایک حشر بپا ہو گیا۔ پولیس کو جب مظاہرات پر گولیاں چلانے کے لئے کہا گیا تو سپاہیوں نے انکار کر دیا' مجبور کیا گیا تو وردیاں اتار اتار کر استعفے دے دیئے اور خود مظاہرین میں شامل ہو گئے فوج کو بلایا گیا تو وہ بھی ہوا میں فائر کرنے سے زائد کسی شے پر تیار نہ ہوئی۔ آخر ہمیں مولویت کے اندھے بڑھتے سامنے ہتھیار ڈال دینے پڑے۔ پارلیمنٹ کا آخری اجلاس حالتِ محصوری میں ہوا جس میں عوامی دباؤ کے تحت ایک بل پاس ہوا جس کے رو سے نئی پارلیمنٹ کے لئے خاص انتخابات منعقد کرنے کا فیصلہ ہُوا۔ یہ انتخابات بڑی گرما گرمیوں کے ساتھ منعقد ہوئے اور ان کے ذریعے پوری طاقت رجعت پسندوں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔

نئی حکومت کے برسرِ اقتدار آنے پر ہم نے یہ محسوس کیا کہ اب اس ملک میں رہنا موت سے بدتر ہے جس میں اب ایک فرسودہ

ملاّئی راج قائم ہونے والا ہے۔ ہماری نگاہیں اس منظر کی تاب ہی نہیں رکھتی تھیں کہ جدھر رُخ کریں ہم کو داڑھیاں ہی داڑھیاں نظر آئیں، تلاوتِ قرآن کے سوا کوئی آواز ہی سنائی نہ دے، ملک کا ملک فاشی آرٹس سے بالکل خالی ہو، نہ کلب، نہ چکلے، نہ سینما، نہ مینا بازار، نہ شراب خانے —— تو آخر یہ زندہ درگور ہونا نہیں تو اور کیا ہوگا!

ہم میں سے جو لوگ بزدل اور کمینہ کیش تھے انہوں نے زمانے کی ہوا کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ مگر جو لوگ پختہ سیرت، با اصول اور خوددار تھے وہ کسی حالت میں اپنے کلچر اور ذوق کو خیرباد نہیں کہہ سکتے تھے۔ نئے حکمرانوں سے برابر ہمارے ناخدا اپنے مستقبل کے متعلق گفت و شنید کر رہے تھے۔ سوال یہ درپیش تھا کہ آیا ہم بہ حیثیت ایک اقلیت کے اس ملک کے نظام میں اپنی عادات اور دلچسپیوں کے تقاضے کسی طرح پورے کرتے ہوئے زندہ رہ سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک تجویز یہ اٹھائی گئی کہ ہم کو الگ بستیاں بنا کے دے دی جائیں، لیکن جس ملک پر ہم حکمران رہ چکے تھے اس کے اندر ملاؤں کے زیرِ سایہ شودر بن کے رہنے پر ہماری غیرت کیسے آمادہ ہوسکتی تھی۔ آخرکار ہم نے حکومت کو اس پر راضی کرلیا کہ دنیا کے کسی جزیرے میں ہم کو بسا دیا جائے۔ ہالی وڈ کی طرح ایک الگ تھلگ دنیا ہو جس میں ہم ہی ہوں اور ہمارا پسندیدہ نظامِ زندگی ہو۔ اور اس میں ہم —— "بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے"۔ انڈیا سے درخواست کی گئی کہ وہ انڈیمان ہمارے لئے خالی کر دے تو انڈیمان کی ساری آبادی کو اس کے عوض میں بسانے کا انتظام کیا جا سکتا ہے، مگر وہ نہ مانا۔ کوئی اور جزیرہ بھی اس مطلب کے لئے جب نظر نہ آیا تو حکومت اسلامستان نے کروڑوں روپے کا ایک منصوبہ اس غرض کے لئے بنایا کہ ساحل اسلامستان سے دور ہٹ کر ایک نیا مصنوعی جزیرہ بنایا جائے۔ اس منصوبے کے نصف مصارف ہمارے اوپر ڈالے گئے اور ہماری "انجمن زندہ دلاں" نے یہ رقم فوراً جمع کر کے ڈھیر کر دی، کیونکہ ملکی دولت کی ایک بڑی مقدار ہماری کمیونٹی کے افراد کے قبضے میں تھی۔ اب ۱۹۵۲ء پورا [illegible] اس منصوبے کی تکمیل میں صرف ہوگیا۔ تاہم کام بڑی تیز رفتاری سے کیا گیا اور ۱۹۵۵ء کے وسط تک منصوبے کی تکمیل ہوگئی۔ سمندر میں ایک خاص مقام منتخب کیا گیا جہاں پانی کے اندر پہاڑیاں اور چٹانیں موجود تھیں۔ بے شمار جہاز چٹانیں، سیمنٹ اور ریت کی بوریاں اور مٹی بھر بھر کے لاتے رہے، یہاں تک کہ دنیا کے پانیوں میں ایک نیا جزیرہ تولّد ہوگیا۔ جس کا نام "جزیرۂ زندہ دلاں" تجویز کیا گیا۔ یہ تین مربع میل کا جزیرہ جب وجود میں آچکا تو سرکاری اہتمام سے ہماری ہجرت کی اسکیم عمل میں لائی گئی۔

۱۵ ستمبر کی تاریخ ہم سب کے لئے گرونڈی کے "زندہ دلانِ پاکستان کیمپ" میں جمع ہونے کے لئے مقرر کی گئی اور مہینہ بھر پہلے سے اخبار، ریڈیو اور پوسٹروں کے ذریعے اعلان کیا جاتا رہا کہ اس دن سے پہلے پہلے ہماری کمیونٹی کا ہر فرد جسے مصنوعی جزیرے میں آباد ہونا پسند ہو کیمپ میں پہنچ جائے۔ ۱۰، ۱۲ اور ۱۴ ستمبر کو تین لائنوں پر ہمارے لئے اسپیشل ٹرینیں "قافلۂ زندہ دلاں" کے نام سے چلائی گئیں۔ ان ٹرینوں کا منظر بھی خوب تھا۔ چکلوں، سینماؤں، کلبوں، رقص خانوں، شراب خانوں کے عملے کے عملے اکھڑے چلے آرہے تھے۔ کوئی ستار اور طبلے لادے چلا آرہا ہے، کوئی تصاویر اور مجسمے اٹھائے ہوئے ہے، اور کسی کی پیٹھ پر خم اور جام و مینا لدے ہوئے ہیں۔ گاڑی کے اندر رات بھر میخانے آباد تھے، دَور چل رہے تھے، شیشے اچھل رہے تھے، ناچ ہو رہے تھے اور موسیقی کی لہریں منتشر ہو رہی تھیں۔ اس دھوم دھام کے ساتھ اسپیشل گاڑیاں ملک کا تہذیبی عطرِ لالہ کے گرونڈی کے کیمپ میں جمع کر رہی تھیں —— ان گاڑیوں پہ گویا ترقی پسندی اسلامستان کو الوداعی سلام کہہ رہی تھی!

کیمپ میں بڑی بڑی نامور ہستیاں جلوہ فرما تھیں۔ موسیقار تھے، ادیب تھے، آرٹسٹ تھے، فلم اسٹار تھے، رقاص تھے، [illegible] شاعر [illegible] اور [illegible] کے حلقوں میں گھوم گھوم کر اپنے تخلیق یافتہ افسانوں کے لئے مواد جمع کرتے تھے،

مسٹر کا موٹر

جلال

استاد: "طوطو! تم پہلے ایک سبق پڑھ چکے ہو یا نہیں؟"

کئی طوطے: (بیک آواز) "جی! ہم پڑھا نہیں کرتے، ہمیں پڑھایا جاتا ہے!"

استاد: شاباش! شاباش!! مجھے اس جواب سے بہت خوشی ہوئی ——— مگر میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تمہیں ایک سبق پڑھایا گیا ہے ناں؟

ایک طوطا: جی، استاد صاحب! کچھ شبہ سا ہوتا ہے کہ پڑھایا گیا تھا؟

دوسرا طوطا: (کھڑے ہوکر) ضرور پڑھایا گیا ہے، مجھے پورے کا پورا ازبر ہے!

استاد: یعنی حرف بہ حرف یاد ہے؟

طوطا: فرمایئے تو سنا دوں!

استاد: بنچ پر کھڑے ہو جاؤ! ——— کوئی اور بھی ہے جسے وہ سبق یاد رہ گیا ہو؟

ایک اور طوطا: شرمندگی کے ساتھ۔ استاد صاحب! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ کچھ مجھے بھی یاد رہ گیا ہے!

استاد: (اشارہ کرتے ہوئے) تم بھی کھڑے ہو جاؤ بنچ پر! ——— (ایک نگاہ ڈالتے ہوئے) کوئی اور؟ (انتظار کرکے) بس صرف دو؟ کلاس تو اچھی ہے ماشاء اللہ! (بنچ پر کھڑے ہونے والے دو مجرمین کی طرف متوجہ ہوکر) اچھا تو تم لوگ بتاؤ کہ تم نے وہ سبق یاد کیوں رکھا؟

(آنکھیں شرم سے جھکا کر) استاد جی! سچ مانیئے رات بھر جاگ کر محنت کرتا رہا کہ وہ بھول جائے مگر کم بخت حافظے سے اترتا ہی نہیں! لفظ لفظ آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے!

——— حافظہ کوئی گھوڑا تو ہے نہیں کہ سبق اس پر سے اترتا نہیں۔ آخر کتنی ہی باتیں تم روزانہ بھلاتے ہو، وعدے بھلاتے ہوگے، فرائض بھلاتے ہوگے، خدا کو بھلاتے ہوگے، لے دے کے ایک ہمارا سبق ہی نہیں بھولتا تھا! جھوٹ بولتے ہو، تم نے محنت کی ہی نہیں ہوگی۔ عجیب بات کہتے ہو کہ لفظ لفظ آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے، احمق کہیں کے لفظوں کے کوئی ٹانگیں لگی ہوئی ہیں کہ وہ چل پھر رہے ہیں، یا وہ کوئی پہیئے ہیں کہ گھوم رہے ہیں؟ اور لفظ آنکھوں کے سامنے ایسے ہی آ آ کے پھرتے ہیں تو تم آنکھیں دوسری طرف کیوں نہیں کر لیتے، اُن کو بالکل بند ہی کیوں نہیں رہنے دیتے! ——— (لہجہ ذرا مشفقانہ اختیار کرکے) دیکھو! عزیزم! حافظہ بڑی قیمتی چیز ہے، اس کو بے جا استعمال نہیں کرتے، یاد رکھنے کی چیزیں اور ہیں، تم فلمی گانے یاد رکھو، تم اخبارات میں ... والے اشتہارات کو رٹو، تم اپنے وزیروں کے نام اور ان کی تصویریں حافظے میں محفوظ رکھو،

سبق کا مرثیہ

سبق ایسی چیز نہیں ہیں کہ اُن کے ساتھ یاد رکھنے کا سلوک کیا جائے!

طوطا: جناب! آئندہ میں اس کم بخت حافظے کا دماغ درست کرنے کے لئے کچھ جتن کرونگا' آج معافی دے دیجئے!

استاد: بہت اچھا! سِٹ ڈاؤن! (دوسرے طوطے کی طرف روئے سخن کرکے) —— اور تم؟

طوطا: جی؟

اُستاد: جی کیا معنی؟ —— آخر چوبیس گھنٹے تم کیا کرتے رہے کہ کل کا سبق تمہیں بھولا نہیں؟

طوطا: جناب میری اہلیہ کا دودھ پیتا بچہ مجھے کہتا تھا کہ جب سے دُنیا بنی ہے سبق یاد کئے جاتے رہے ہیں' بزرگوں سے یہی ہوتی آئی ہے' یہ عجیب زمانہ آیا ہے کہ روز کا سبق روز بھلا دو' باز آئے ہم ایسی تعلیم سے! جناب! اس نے مجھے ایسا ڈانٹا کہ مجبوراً سبق حافظے سے اتر نہ سکا!

استاد: دیکھو' بڑے بچو! یہ اگلے وقتوں کی باتیں ہیں کہ لوگ سبق یاد رکھتے تھے اور امتحانات پاس کرتے تھے۔ اب جدید تعلیمی سائنس کے تجربات نے نظریات کو بدل ڈالا ہے۔ اب سبق بُھلائے جاتے ہیں اور امتحانات میں فیل ہونا اصل کامیابی ہے۔ قدیم زمانے کے امتحانات پاس کرنے والے طوطے کلرک بنتے تھے' اب طوطوں کی نئی نسل فیل ہو کر ایم' ایل' اے بنتی ہے' پارلیمنٹری سیکرٹری بنتی ہے' سفیر بنتی ہے' وزیر بنتی ہے' لیڈر بنتی ہے! —— اس لئے تم اپنے ننھے بچوں کی باتوں میں نہ آیا کرو' یہ قدیم زمانے کی یادگاریں جب سٹھیا جاتی ہیں تو عجیب بے تکی ہانکتی ہیں۔ یاد رکھو' خوب یاد رکھو کہ حافظہ ہمیں گذرے ہوئے زمانے سے جوڑ رکھنے کا جبری ذریعہ ہے' ہمیں اگر آگے بڑھنا ہے تو فطرت کی اس جبریت کے خلاف لڑنا ہوگا' قدامتوں سے مقاطعہ کرنا ہوگا۔ روز کے اصول روز سوچنے ہوں گے! اب تو خدا سے روز کی روٹی مانگنے کی بجائے دعا یہ کی جانی چاہئے کہ اے خدا! ہمیں روز کے اصول روز سکھا اور گھڑی گھڑی کے لئے ایک نیا دین ہمارے ذہنوں پہ نازل فرما! —— سمجھے؟

طوطا: جی ——!

اُستاد: اچھا! سِٹ ڈاؤن! (طوطا بیٹھ جاتا ہے) عزیز بچو! اب سبق شروع ہوتا ہے' سبق ذرا پیچیدہ قسم کا ہے اس لئے توجہ سے نہ سُننا! کل تم نے جو سبق پڑھا وہ تھا مولوی صاحب کا گھوڑا! مگر اب کل کا دن گذر گیا' گھوڑا پرانا ہو گیا' گھوڑے کے مولوی صاحب بھی پرانے ہو گئے' دراصل یہ سبق پاکستان بننے سے پہلے کا سبق ہے۔ یہ اس زمانے کا سبق ہے جب ایک پنڈت جی ہوا کرتے تھے اور پنڈت جی کی ایک بھلی تھی' انگریز نے انصاف کرنے کے لئے ضروری سمجھا کہ مسلمانوں کے پاس بھی ایک مولوی صاحب ہونے چاہئیں اور بھلی کے مقابلے میں گھوڑا مولوی صاحب کو عنایت کیا گیا! پنڈت جی کی بھلی اور مولوی صاحب کے گھوڑے کو ریس میں لگا دیا گیا اور انگریز نے ایک تیسرا کردار پیدا کرنے پر توجہ دی۔ لارڈ میکالے نے پہلے ایسا نصاب تعلیم تیار کیا' پھر کالجوں کی فیکٹریاں کھول کر بڑے بڑے

... ہوتے ہوئے کچھ مدت کی محنت کے بعد ایک کامیاب نمونہ تیار ...

دونوں بدک گئے' بہلی الٹ گئی' گھوڑا ایسا الٹ ہوا کہ مولوی صاحب زمین پر آ رہے اور دُنیا بدل گئی! ——— ہندوستان تقسیم ہو گیا' اُدھر انڈیا تھا' اِدھر پاکستان! ——— اور مسٹر موٹر دوڑا رہا تھا!

اُستاد: (کتاب بند کرکے) کہو طوطو! کہیں کوئی بات سمجھ تو نہیں لی تم نے؟

طوطے: (بیک آواز) جی نہیں! بالکل نہیں!

استاد: تو آج کا سبق ہے "مسٹر کا موٹر!" یہ سبق نیا ہے اس لئے استاد بھی نیا آ گیا ہے۔ "مولوی صاحب کا گھوڑا" تم نے حضرت "آفاق" سے پڑھا اور آج مسٹر کا موٹر پڑھانے کے لئے ایک دوسرا مدرس "چراغ راہ" حاضر ہے! ہاں تو تم سوچتے ہو گے کہ جب (گرامر) پنڈت صاحب کی بہلی صاف طور پر مؤنث تھی' مولوی صاحب کا گھوڑا مذکر تھا تو مسٹر کا موٹر کس صنف میں داخل ہے۔ طوطو! جب پنڈت جی کی بہلی اور مولوی کے گھوڑے کا زمانہ تھا تو مذکر اور مؤنث کی تمیز بڑے زور و ں پر تھی۔ مگر اب مردوں اور عورتوں کی مساوات کا زمانہ ہے۔ مذکر اور مؤنث اپنے اوصاف و علامات میں سے کچھ لے دے کر ایک درمیانی صورت پر سمجھوتہ کر رہے ہیں۔ جو کام مذکروں کے کرنے کے تھے وہ اب مؤنثیں کرنے لگی ہیں اور جو امتیازات مؤنثوں کے لئے تھے وہ مذکروں میں ابھر رہے ہیں۔ دونوں صنفیں غلط ملط ہو رہی ہیں۔ کسر صرف اتنی باقی ہے کہ قواعد میں ابھی تک برائے نام تقسیم ہوں کی توں ہے۔ مؤنث کو کہتے ہیں "آئی" اور مذکر کو کہتے ہیں "آیا"!

ایک طوطا: مگر اُستاد صاحب! آیا تو مؤنث ہوتی ہے! مرد کو کون آیا رکھتا ہے؟

دوسرا طوطا: تو پھر "آئی" کو مذکر ہونا چاہئے!

استاد: عزیز طوطو! یہ غلط العام ہیں۔ جمہوریت کا زمانہ ہے' جب اکثریت ایک غلطی کو صحیح بنانے پر تُل جائے تو اقلیت کے لئے ضروری ہے کہ اسے صحیح مان لے۔ بہر حال عمل کے میدان میں سمجھوتہ مکمل ہو جائے گا تو پھر قواعد میں بھی اصلاح کرنی پڑے گی۔ یا تو مرد کو "اچھا ہے" کہیں گے تو عورت کے لئے بھی کہنا پڑے گا کہ "عورت اچھا ہے" ورنہ پھر تبدیلی یوں ہو جائے گی کہ "مرد اچھی ہے"۔ (کچھ توقف کرکے) باری باری ایک ایک فقرہ ایسا بولو جس میں قواعد کی رُو سے مذکر و مؤنث کی موجودہ تقسیم کی خلاف ورزی کی گئی ہو۔

ایک طوطا: جلسۂ میلاد النبی کی موقعہ پر گول باغ خوب سجی ہوئی تھی۔

دوسرا: مگر حاضری بالکل تھوڑا تھا۔

تیسرا: عزت مآب گورنر صاحب اسٹیج پر تشریف فرما تھیں' مگر موصوف کا بیگم صاحب ساتھ نہیں تھا!

چوتھا: اور آپ نے ایک اسلامی تقریر کیا!

پانچواں: کشمیر ہماری ہے!

چھٹا: ہم سب اس کے لئے بے دریغ اپنا خون بہائیں گی۔

ساتواں: مگر ہم اصولاً امن پسند واقع ہوئی ہیں' ہم دنیا میں گڑبڑ نہیں مچانا چاہتیں!

*: اخبار زمیندار بڑے اسپیشل خبرے دیتی ہے اور ان کے اوپر خوب چٹ پٹے سرخے جاتی ہے۔

ہماری ارکان دستور یہ نہایت اعلیٰ درجہ کی اسلامی دستور بنانے میں پانچ سال سے لگی ہیں اور سارا عمر لگی رہیں گی لیکن اسلامی خواہ مخواہ کا گڑبڑ مچاتا ہے!

مسٹر کا موٹر

دسواں : یہاں پرانا مُلّائیت نہیں چل سکتا!

گیارہواں : یہاں مسٹر اپنا نیا موٹر چلائے گی۔

(قہقہہ)

استاد : میاں طوطے! تم غلطی کر گئے۔ موٹر موجودہ گرامر میں مذکر ہے۔ مگر خیر! کچھ لوگ مؤنث بھی کہہ لیتے ہیں۔

طوطے : کوئی ایک بتلائیے، موٹر کو مذکر کہیں یا مونث؟

استاد : میں نے بتایا نا کہ آج کل مذکر مونث کا معاملہ خلط ملط ہو رہا ہے، مگر ثقہ اہلِ زبان ابھی تک موٹر کو مذکر بولتے ہیں اقبال کے ہاں سے تم کو نظیر بھی مل سکتی ہے!

"موٹر ہے ذوالفقار علی خاں کا کیا خموش"

ذرا اسے مہارنی کے طور پر چند مرتبہ کہو!

ایک طوطا : مگر ذوالفقار علی خاں کا معاملہ تو الگ تھا، سبق تو ہے مسٹر کا موٹر!

استاد : ذوالفقار علی خاں اور اقبال دونوں مسٹر تھے، اس لئے سند قابلِ قبول ہے (کتاب کھول کر) اچھا طوطو! اب سبق آگے چلتا ہے۔ تمہیں یاد ہوگا کہ مولوی صاحب کا گھوڑا خود اللہ میاں نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا۔ چنانچہ مولوی صاحب پڑھا کرتے تھے کہ "چڑھنے کو میرے گھوڑا کیا خوش عناں بنایا" مگر مسٹر کو اللہ میاں کی بنائی ہوئی چیزوں سے دلچسپی نہیں ہے، اللہ میاں کا مال بہت پرانا ہو گیا ہے، ایک ہی ماڈل جوں کا توں چلا آ رہا ہے۔ مسٹر کا موٹر خداوندانِ مغرب نے بنایا ہے، اگرچہ وہ سارا لوہا اللہ میاں کی کانوں سے چرا کے لائے ہیں۔ جس طرح مولوی صاحب اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر گھوڑا بنانے والے خدا کی تعریف گنگنایا کرتے تھے، اسی طرح مسٹر اپنے موٹر پر بیٹھ کر بلکہ موٹر سے اتر کر بھی اپنا موٹر بنانے والے خداوندوں کی تعریف میں رطب اللسان رہتے ہیں۔

طوطو! یہ جس موٹر کا سبق آج تم پڑھ رہے ہو، یہ کوئی عام موٹر نہیں ہے اور نہ یہ مولوی صاحب کا موٹر ہے کیونکہ جب سے مولوی صاحب کا گھوڑا بدک بھاگا ہے انہوں نے بھی موٹر خرید لیا ہے۔ اور آج کل "ماڈرن مولوی" صاحب بن گئے ہیں، وہی مثل کہ ایک کریلا، دوسرے نیم چڑھا! بس یاد رکھو کہ یہ سبق صرف مسٹر کے موٹر پر پڑھایا جا رہا ہے یہ موٹر "اسپرٹ" پیتا ہے۔ جانتے ہو اسپرٹ کو؟ اسپرٹ شراب کے جوہر کو کہتے ہیں۔ اور یہ ایک ہی رنگ کی شراب نہیں پیتا، بدل بدل کے پیتا ہے، بڑا تنوع پسند ہے اکھلے بازار نہ ملے تو چور بازار سے لے کر پیتا ہے، عام اجازت نہ رہے تو طبی سرٹیفکیٹ حاصل کر کے پیتا ہے۔ یہ عجیب و غریب موٹر ہے طوطو! یہ اسپرٹ پیتا ہے اور جانتے ہو کہ کھاتا کیا ہے؟ یہ "رشوت کھاتا ہے"! حیران کیوں ہوتے ہو؟ یہ عام قسم کا موٹر نہیں ہے۔ رشوت کھانے سے اسکی توند بڑھ جاتی ہے، چنانچہ یہ نیچے کی طرف دیکھ نہیں سکتا، مجبور ہے کہ اکڑی ہوئی گردن کے ساتھ اوپر کی طرف دیکھے۔ لوگ اسے مغرور سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ معذور ہے!

طوطو! تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اس کی دو آنکھیں بھی ہیں۔ یہ آنکھیں دن کو بند رہتی ہیں، صرف رات کو کھلتی ہیں۔ دن کو آنکھیں بند کر کے یہ خواب دیکھتا ہے۔ خواب میں یہ زمین چھوڑ دیتا ہے، پرواز کرنے لگتا ہے، اور اڑتے اڑتے یہ کبھی لندن، کبھی نیویارک، کبھی پیرس جا پہنچتا ہے۔ وہاں کے ایک ایک موڑ سے عقیدت کے

کے ساتھ فرشی سلام کر کے ملتا ہے اور اپنی حرکات و سکنات سے واضح کرتا ہے کہ میرا تمہارا خون ایک ہے!

خواب دیکھتے دیکھتے جب اچانک آنکھیں کھلتی ہیں تو اپنے آپ کو ایک مشرقی دیس کی سڑکوں پر آوارہ دیکھ کر یہ کلیجہ مسوس کے رہ جاتا ہے۔ وہ چھکڑوں اور بیل گاڑیوں اور تانگوں اور بگھیوں کی صحبت ناجنس پر کڑھتا ہے، مگر اس ماحول میں وہ بڑا احساس برتری اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ کہاں چھکڑے اور کہاں موٹر! اسے اُن فلسفی موٹروں سے بڑا اختلاف ہے جو آج کل ارتقاء کا نظریہ پیش کرتے پھرتے ہیں۔ اِن فلسفی موٹروں کی تحقیقات یہ ہے کہ پہلے چھکڑے پیدا ہوئے، پھر بگھ چھکڑے بنے، پھر چھکڑ بگھے، پھر ان کی نسل بگھیوں میں بدل گئی، پھر بگھیوں سے موٹر بگھے پیدا ہوئے، موٹر بگھوں نے ارتقا کیا تو بگھ موٹرے بن گئے اور بگھ موٹروں کی نسل نے ایک جست کی تو موٹر بن گئے۔ مسٹر کا موٹر اس نظریئے کا کٹر مخالف ہے، کیونکہ اس طرح اس کی نسل چھکڑوں سے جا ملتی ہے اور وہ چھکڑوں کو اپنے آباؤ اجداد ماننے پر تیار نہیں۔ وُہ تو ان سے نفرت کرتا ہے۔ اپنی نسل الگ مانتا ہے اور اپنا شجرہ نسب سیدھا مغرب کے موٹروں کے خاندان سے ملاتا ہے اور اس خاندان ہی سے وہ اپنی ساری نسل کی ابتدا تسلیم کرتا ہے۔ وہ ایسے بودے نظریئے کو کیوں مانے جبکہ ابھی سلسلۂ تخلیق کی بہت سی کڑیاں گم ہیں۔ پہلے فلسفی موٹر چھکڑ بگھوں اور بگھ موٹروں کے ڈھانچے کریں، پھر مسٹر کا موٹر غور کریگا!

طوطو! تم حیران ہوگے کہ جب اس کی آنکھیں بند ہوتی ہیں تو یہ حرکت کیوں کر کرتا ہوگا؟ یہ بڑا اہم سوال ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ مولوی صاحب کا گھوڑا تھوڑا ہی ہے کہ اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اپنی بینائی کی قوت خواہ مخواہ ضائع کرتا پھرے، یہ دوسروں کی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ جو اس کے اوپر ڈرائیور بن کر بیٹھ جائے یہ اس کی آنکھوں پر بھروسہ کرتا ہے اور اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ لیکن اسے دیکھنے دکھانے کی یوں بھی ضرورت نہیں ہے۔ اس میں کوئی ایسی حکمت رکھی گئی ہے کہ اس کا منہ سیدھا مغرب کی طرف رہتا ہے۔ جیسے مقناطیسی سوئی کو تم دیکھتے ہو ناں کہ اسے جدھر بھی گھما دیا جائے وہ پھر اپنا رخ قطب تارے کی طرف کر دیتی ہے اور دکھن کی طرف دُم کو گھما لیتی ہے، اسی طرح مسٹر کے موٹر کو تم چاہے جدھر بھی گھماؤ، پھراؤ، یہ جھٹ اپنا منہ مغرب کی طرف کرلے گا دم مشرق کی طرف! مغرب کی طرف منہ کرنے سے کہیں تم یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ یہ نماز پڑھتا ہوگا۔ نماز تو مُلّا لوگ پڑھا کرتے ہیں۔ یہ موٹر ہے، اور وہ بھی مسٹر کا موٹر ہے، مُلّا نہیں ہے۔ یہ نماز نہیں پڑھتا، بلکہ جس دیس کی مٹی سے اس کا تن بدن بنا ہے یہ اس کا احترام کرتا ہے!

ہاں تو، یہ مسٹر کا موٹر ہے۔ یہ ذوالفقار علی خاں کے موٹر کی طرح خاموش نہیں رہتا۔ بلکہ گانا گاتا ہے اسے موسیقی سے فطری لگاؤ ہے، آرٹ کا خلّاق ہے اور نت نئی دھنیں ایجاد کرتا رہتا ہے۔ یہ تقریباً بھی ہے۔ بہت تقریریں کرتا ہے، بڑی جوشیلی اور دھڑلے کی تقریریں کرتا ہے، چونکہ دھواں بھی چھوڑتا ہے اس لئے تقریریں دھواں دھار بھی ہوتی ہیں۔ مگر اس کی تقریر کا ایک ہی پیٹنٹ مواد ہے، اس لئے حاضرین نہیں ملتے۔ چنانچہ اس کے لئے حاضرین جمع کرنے کا کام پولیس کے سپاہی اور مال کے پٹواری کرتے ہیں۔ مگر اب وہ بھی تنگ آگئے ہیں۔ اب مسٹر کا موٹر سڑکوں پر چلتے پھرتے حاضرین کو تقریریں سناتا ہوا گذر جاتا ہے۔

طوطو! ایک بات تم کو راز کی بتا دوں۔ مسٹر کا موٹر ہے سیکنڈ ہینڈ! اب تم پوچھوگے کہ یہ سیکنڈ ہینڈ کیا

بلا ہوتی ہے۔ لفظ واقعی نیا آگیا ہے۔ میں تم کو سمجھائے دیتا ہوں۔ دیکھو تم میں سے کوئی طوطا قلیہ کھا رہا ہو اور کھاتے کھاتے جب پیٹ بھر جائے اور اندر جگہ نہ رہے اور تم کوئی بھورا انگل دو ایک بلی لپک کر اسے اپنے منہ کا نوالہ بنا لے تو کہیں گے کہ بلی نے سیکنڈ ہینڈ بھورا کھا لیا۔ یا یوں سمجھو کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دی، دوسرے نے اس مطلقہ سے نکاح کر لیا تو محاورے میں کہا جائیگا کہ اُس کی بیوی سیکنڈ ہینڈ ہے۔ مسٹر کو سیکنڈ ہینڈ چیزوں سے بڑی دلچسپی ہے۔ وہ لنڈے بازار میں جاتا ہے اور بڑے شوق کے ساتھ امریکہ سے آئے ہوئے سوٹ خریدتا ہے۔ پھر ان کو پہن کر جب کھٹ کھٹ کرتے چلتا ہے تو اس کی خودی انگڑائیاں لے لے کر کہتی ہے کہ ویل، ڈیکھو ہم مسٹر بن گیا ہے۔ طوطو! یہاں ایک چور لنڈا بازار بھی ہے، وہ خفیہ ہے، اس میں امریکہ اور برطانیہ اور فرانس اور روس سے سیکنڈ ہینڈ فلسفے اور خیالات آکے بکتے ہیں مسٹر چپکے سے اس بازار میں جا نکلتا ہے اور اپنی پسند کے فلسفے اور خیالات لے کے تقریروں اور تحریروں میں عجب رنگ باندھ دیتا ہے۔ پھر وہ کہتا ہے کہ "ویل ہم ٹرقی پسنڈ ہے!" اسی طرح مسٹر کو موٹر کے سیکنڈ ہینڈ ہونے سے بڑا پیار ہے۔ جس موٹر پر کبھی کوئی صاحب بہادر اور ان کا میم صاحب بیٹھتا رہا ہو یہ اسے نئے موٹر سے زیادہ قیمت پر خریدنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

طوطو! مسٹر کا موٹر سیکنڈ ہینڈ ہے۔ اس لئے تم دیکھتے ہو کہ اس کا پالش ضرورت سے زیادہ چمکدار ہے پالش نت نیا ہوتا رہتا ہے۔ سیکنڈ ہینڈ چیزوں کے لئے پالش بڑی ضروری چیز ہے۔

مسٹر کے موٹر کے بریکیں بالکل نہیں ہیں۔ بریکیں آزادی کا خاتمہ کر دیتی ہیں، بریکیں ترقی کو روک دیتی ہیں، مسٹر کا موٹر ٹھہرا ترقی پسند!

طوطو! غلط فہمی نہ ہو، ترقی پسند وہ نہیں جو ترقی پسندے کھاتا ہے، وہ بھی نہیں جو نگینہ بیکری یا کافی ہاؤس یا ٹی ہاؤس میں بیٹھتا ہے۔ بلکہ . . . . صحیح معنوں میں ترقی پسند وہ ہوتا ہے جو اپنے اوپر خارج کی کسی رہنمائی کو مستقل طور پر مسلط نہ ہونے دے۔ مسٹر کا موٹر بھی سڑکوں پر لگے ہوئے سرحدی نشانات کو نہیں مانتا، یہ نشانات پرانے ہو گئے ہیں، یہ ٹریفک کے سپاہیوں کے اشارات کو بھی نہیں مانتا، یہ قانون سے بالاتر ہے۔ نتیجہ یہ کہ "حادثات" ہو جاتے ہیں۔ مگر مسٹر کا موٹر ایک کامیاب زندگی کے لئے حادثات کو ضروری سمجھتا ہے حادثات کے بغیر ترقی نہیں ہو سکتی۔ مسٹر کا موٹر ترقی کر رہا ہے!

ہاں ہاں! خوب یاد آیا، طوطو! مسٹر کا موٹر کرائے کا بھی ہوتا ہے۔ جس طرح ایک قلی اپنی محنت کرائے پر دیتا ہے جس طرح ایک ٹٹو اپنا بدن کرائے پر چڑھا دیتا ہے، اور جس طرح آج کل اخبار نویسوں کا ایک گروہ دماغ اور قلم کرائے پر پیش کرتا ہے، مسٹر کا موٹر بھی ہر کام کے لئے کرائے پر مل سکتا ہے۔

مسٹر کے موٹر کی ناک پر سبز جھنڈی لگی ہے، اس پر چاند تارہ بنا ہوا ہے، یہ جھنڈی بتاتی ہے کہ مسٹر کا موٹر مسلم لیگی ہے اور جانتے ہو مسلم لیگ کی تعریف؟ جس میں نہ اسلام ہے، نہ لیگیت! بلکہ صرف وزارتیں صدارتیں اور لائسنس ہیں!

مسٹر کا موٹر پاکستان میں رہتا ہے لیکن پاکستان کی زبان اس کی مادری زبان نہیں ہے۔ اس کی مادری

زبان انگریزی ہی ہے۔ تم دیکھو گے کہ ایک تختی اس کے ماتھے پر ایک اور پیچھے پر لگی ہے اور اس پر انگریزی میں چند حروف اور چند ہندسے لکھے ہیں۔ یہ اسی لئے لکھے ہوتے ہیں کہ ہر کوئی جان لے کہ مسٹر کے موٹر کی زبان انگریزی ہے۔ چاہیے آنے کو یہی چند حروف اور چند ہندسے ہی آتے ہوں مگر مسٹر کا موٹر ان کو خوب نمایاں کرکے رکھتا ہے تاکہ اسکی انگریزی دانی کا جمہور پر رعب جمارہے۔

بڈھے طوطو! مسٹر کے موٹر کی سیرت کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ مولوی کے گھوڑے سے اس کو بڑی چڑ ہے۔ لیکن جب سے مولوی صاحب موٹر کے مقابلے پر آگئے ہیں تو یہ بہت زچ ہو رہا ہے اب کیا کرے!

اچھا طوطو! آج کا سبق ختم ہوا! سوالات لکھ لو:-

(۱) مولوی صاحب کے گھوڑے اور مسٹر کے موٹر میں مقابلہ کرو۔

(۲) وجہ بتاؤ کہ مسٹر کو سکینڈ ہینڈ چیزیں کیوں پسند آتی ہیں؟

(۳) مسٹر اور "مسلمان" کے درمیان کتنا فاصلہ ہے۔ اور یہ فاصلہ مولوی صاحب کا گھوڑا کتنی دیر میں طے کر سکتا ہے اور مسٹر کا موٹر کتنے وقت میں!

بقیہ جزیرۂ زندہ دلاں صفحہ ۱۹۸

کہیں عندلیب چوہدری اسلامستاں کے مُلّا ازم کے کردار کو تاریخ کے سانچے میں ڈھالنے کی مشق میں مصروف نظر آئے۔ ایک کونے میں محکمہ نفسانیات کا غذ قلم لئے جزیرۂ زندہ دلاں میں اپنے پرچے کی پہلی اشاعت پیش کرنے کے لئے مواد کی نظرثانی فرمارہے تھے۔ ایک شامیانے کے پیچھے اونچے طبقے کی کچھ "بیگمات" غراروں کے لئے ڈیزائن سوچ رہی تھیں جن کو پہن کر جزیرے کی زندگی کا افتتاح کیا جائے۔ بڑے بڑے ستار اپنے ہونے والے وطن کے لئے ترانہ (؟) دُھنیں ایجاد کرنے کی فکر میں تھے۔ غرض ایک عجب چہل پہل تھی۔ اخبارات کے رپورٹر آ آکر آنکھوں دیکھا حال نوٹ کر رہے تھے اور بعض بڑے بڑے لوگوں سے انٹرویو لے رہے تھے۔ عام شہریوں کو اس کیمپ کے قریب پھٹکنے کی اجازت نہ تھی۔ فوجی پہرہ قائم تھا۔

ساحل اسلامستان کو خیرباد کہنے کے لئے ۲۰۔ ستمبر کی تاریخ مقرر کی گئی تھی۔ کیمپ اپنی بعض نامور ہستیوں کا بڑا منتظر تھا، کیونکہ جزیرے کی زمام حکومت انہی کو سونپنا پہلے سے زیر تجویز تھی۔ یہ لوگ ساری داستانِ انقلاب کے ہیرو تھے۔ ان کے خلاف نئی حکومت نے کچھ خیانت کاریوں اور کچھ مظالم کے الزامات لگائے تھے —— اور ایسے موقعوں میں یہی ہوتا ہے۔ عین آخری وقت یعنی ۱۹۔ ستمبر کو اسپیشل ٹریبونل کے سامنے ان کے خلاف لگائے ہوئے اکثر الزامات پایۂ ثبوت کو پہنچا دئے گئے اور نتیجۃً ان کی جائدادوں اور املاک کو ضبط کر لیا گیا۔ مگر چونکہ ان لوگوں کے سرمائے باہر محفوظ تھے —— آخر کشمکش کے حالات میں ہر کوئی برے انجام کے لئے فکر کر ہی لیا کرتا ہے —— اس لئے یہ چوٹ زیادہ کاری نہ ثابت ہوئی۔

۲۰۔ تاریخ کو حکومت کی فراہم کردہ اسپیشل بسوں میں یہ کاروانِ زندہ دلی بندرگاہ کو روانہ ہوا۔ سڑکوں پر شائقین کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے تھے اور بندرگاہ پر وہ ہجوم تھا کہ سمندر کی لہروں نے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ بندرگاہ پر گنتی ہوئی تو معلوم ہوا کہ کل نفری پانچ ہزار ہے۔ دو بڑے جہاز سامنے کھڑے تھے۔ ہم قطار در قطار اپنے اپنے آلات و اوزار لئے ان میں سوار کئے گئے اور جہازوں نے حرکت شروع کی۔ یہ سماں ایسا تھا کہ آباؤ اجداد کا وطن ہمیشہ کے لئے چھوڑتے ہوئے بہر حال رقت طاری ہو گئی۔ اپنے جدا ہونے سے زیادہ اس قوم کی بدقسمتی پر دل بھر آیا جو اب تیرہ صدی پرانے ایک مضحکہ انگیز نظام کا تختۂ مشق بننے والی تھی۔ آخر کچھ بھی ہو اپنی قوم کی محبت انسان کے دل پر اثر ڈالتی ہے! بہر حال ہم پرانی دنیا سے نجات پا کر ایک نئی دنیا کے بانی ہونے کا شرف حاصل کر چکے ہیں۔

جزیرۂ زندہ دلاں! زندہ باد! زندہ دلی! زندہ باد! اسلام! زندہ باد! ۔

اِسلام ——— ایک انفرادی مت اور دھرم نہیں —— !

یہ ایک اجتماعی تحریک ہے یہ ایک تاریخی قوت ہے!

اِس تاریخی قوت نے بار بار اُٹھ کر باطل کے اقتداروں سے ٹکر لی ہے!

دُور کیوں جائیے ، خود پاکستان کی سرزمین اس قوت کا ایک ظہور دیکھ چکی ہے!

بھولیے نہیں!

تحریکِ مجاہدین

نے

خون کے کچھ قطرے یہاں بہائے تھے —!

وہ رائگاں نہیں گئے

بلکہ

تحریکِ نظامِ اسلامی

کی شکل میں

برگ و بار لا رہے ہیں

یہ

داستانِ جذب و شوق

جسے انگریز کے سیاسی تدبر نے

برعظیم ہند کی تاریخ کے اوراق سے

بظاہر محو کر کے چھوڑا تھا

ہم

اِس داستان کو سامنے لا رہے ہیں

آپ کی تاریخ کا وہ گم شدہ ورق جو

سیّد احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ

نے اپنے خون کی روشنائی سے لکھا!

ہندوستان کی

پہلی اسلامی تحریک

مولانا مسعود عالم ندوی کے

کے

—— مورخانہ قلم سے ——

صفحات ۱۸۲

قیمت دو روپے آٹھ آنے

مکتبہ "چراغِ راہ" کراچی

آج آپ اسلام کی دعوت لے کر اُٹھیں تو آپ کو کیا کہا جائے گا ؟

________ "ملّا"

آج سے کچھ مدت پہلے اس جرم پر جو گالی دی جاتی تھی ۔ وہ تھی ـ

________ "وہابی"

یہ گالی تو آپ نے بارہا سُنی ہوگی ؟
اس گالی میں محمد بن عبدالوہاب سے نسبت دی جاتی ہے !

کیا

آپ کو معلوم ہے کہ

محمد بن عبدالوہاب کی شخصیت کیا ہے

~~~ یہ تھا ~~~

● ایک خادم اسلام ● ایک داعیٔ توحید ● ایک مصلحِ امت

اس شخصیت کے کارنامے پر سب سے پہلے انگریزی ڈپلومیسی نے تارکول پھیرا تھا

اَب

ہم اس کارنامے کو اصلی شکل میں پیش کرتے ہیں

تاریخِ اسلامی کے مشہور محقق

مولانا مسعود عالم ندوی کے قلم سے ـــــ محمد بن عبدالوہاب

صفحات : ۲۰۸ قیمت :- دو روپے بارہ آنے

مکتبہ "چراغِ راہ" ـــ کراچی
~~~

غزلیں

- عاصی کرنالی
- ضیا محمد ضیا
- عبدالکریم ثمر
- کوثر نیازی
- ارشد کاظمی
- احمد پرویز
- ابو ظہیر انصاری
- ظہور الحق صدیقی
- شاکر تسلیم
- ضیغم صدیقی

عاصی کرنالی

تری اک اک نگہِ ناز نے پھونکے ہیں فسوں
اِس قیامت میں بھی خوابیدہ ہیں اربابِ جنوں

ہے مرے ذہن میں سہمے ہوئے انجم کا پیام
آپ تفریح سے کچھ وقت نکالیں تو کہوں!

سوز کا علم کتابوں میں کہاں ہوتا ہے
قولِ سقراط ہو، یا فلسفۂ افلاطوں

وقت، کہتے ہیں، کہ ہر زخم کو بھر دیتا ہے
یہ اگر سچ ہے تو آنکھیں مری نمناک ہیں کیوں؟

محفلِ لالہ و گُل، انجمنِ ماہ و نجوم
یہ نظارے ہی سکھا دیتے ہیں آدابِ جنوں

رُخِ لیلےٰ ہی کو چاہیں، یہ کوئی شرط نہیں
اپنے مقصد کا جو عاشق ہے وُہی ہے مجنوں

یہ مرا عزم الٹ دیگا ستاروں کی صفیں
یا مرے حکم کو مانے گا نظامِ گردوں

دلِ احباب کو کچھ آنچ تو ہوگی محسوس
کہ مرے شعر میں آتش کدۂ سوزِ دروں

ضیا محمد ضیا

مسلماں چشمِ بیدارے ندارد — دلِ دانائے اسرارے ندارد
ز فقرِ خانقاہی ناامیدم — بہ تن جز روحِ بیمارے ندارد
جنوں افزوں کند جوشِ عمل را — خرد جز گفت و گو کارے ندارد
کسے کو مرگ را آساں گرفت است — دگر در پیش دشوارے ندارد
زمامِ رہبری برگیر از وے — کسے کز رہزنی عارے ندارد
دلم کز سوزِ عشقش داغ داغ است — ہوائے سیرِ گلزارے ندارد
کشیدم دامن خود زاں گلستاں — کہ گلہا دارد و خارے ندارد
بہ بزمِ خیر و شر مردانہ جستم — دلم اندیشۂ دارے ندارد
بعالم بے نیازِ این و آنم — کسے با من سروکارے ندارد
نباشد یار کس افتادہ را — غمے دارم کہ غمخوارے ندارد
بہائے نیست کالائے ہنر را — متاعِ من خریدارے ندارد

ز من گو ماہرِ شیریں سخن را
ضیا جز شوقِ دیدارے ندارد

نومبر کے "فاران" میں ماہرالقادری مدیرِ فاران کی ایک نظم نما غزل نظر سے گزری۔ راقم کو بھی کسی زمانے میں فارسی سے شغف رہا ہے۔ آج برسوں بعد یہ شوق پھر عود کر آیا۔ قافیہ کے معمولی تغیر کے ساتھ اُسی بحر اور ردیف میں اپنے افکار جناب ماہر کے ذوقِ سخندانی کی نذر کرتا ہوں۔ (ضیا)

عبدالکریم قمر

قدم قدم پہ نئے انقلاب کیا معنی نفس نفس پہ مرے احتساب کیا معنی

خدا بھی ایک ہے ملت بھی ایک ملک بھی ایک بہم دگر ہے مگر اجتناب کیا معنی

دلوں میں نورِ حقیقت کا جب نہ ہو احساس لبوں پہ نغمۂ اُم الکتاب کیا معنی

لہو سے وادیٔ نیل و فرات ہے رنگین اُٹھے نہ بحرِ عجم میں حباب کیا معنی

بنامِ امن بجا ہے تحفظِ کشمیر جوارِ خلد میں یہ التہاب کیا معنی

سپہرِ شوق میں تیری بلندیاں تسلیم مگر یہ زاغ و زغن ہمرکاب کیا معنی

تری ادائے سیاست میں التفات سہی تری نگاہ میں لیکن عتاب کیا معنی

چمن میں برگ و ثمر بھی تھے سرو سوسن بھی یہ خار و خس سے مرا انتساب کیا معنی

ہنوز ضربتِ زخمہ کی منتظر ہے نوا گسستہ تار ہیں چنگ و رباب کیا معنی

فرشتے میری شرافت پہ ناز کرتے ہیں مری دعا نہ ہوئی مستجاب کیا معنی

اگر نہ دل میں عقیدت ہو والہانہ قمر
زباں پہ ذکرِ رسالتمآب کیا معنی

کوثر نیازی

دل کو آغاز میں انجام کی یاد آتی ہے
جیسے ہنگامِ سحر شام کی یاد آتی ہے

ساقیا! آج بھی اِس دَور میں کچھ رندوں کو
تیرے میخانۂ الہام کی یاد آتی ہے

ہم نشیں! چھیڑ نہ آغازِ وفا کی باتیں
مجھ کو بیتے ہوئے ایّام کی یاد آتی ہے

جب بھی سُنتا ہوں کبھی جور و جفا کے قصے
مجھ کو مظلومیٔ اسلام کی یاد آتی ہے

ہم نشینو! مجھے بتلاؤ! یہ آزار ہے کیا؟
ہر گھڑی ایک حسیں نام کی یاد آتی ہے

جب بھی احساس یہ ہوتا ہے کہ آزاد ہیں ہم
اُجڑے اُجڑے سے در و بام کی یاد آتی ہے

آدمیت ہے اُدھر امن و سکوں کی طالب
تجھ کو مینا و مے و جام کی یاد آتی ہے

ارشد کاظمی

ہمارا کربِ مسلسل ہے زندگی کا مآل — یہ اشکہائے تمنا کہ آتشِ سیّال!
اُلجھ گئے ہیں وہ اب آپ اپنے حلقوں میں — بچھا رہے تھے جو نادان میرے واسطے جال
بہ خود فریبِ قیادت ہو لرزہ براندام — بیاں کروں میں اگر قصۂ عروج و زوال
نوائے نیم شبی کا فروغ کیا کہیے! — ہے قدسیوں کے لیے خیرہ کن ہمارا جمال

ہجومِ رنج و الم میں بھی مُسکراتے ہیں!
ہمیں خدا کی ودیعت ہے عزم و استقلال

حُسن جب بے نقاب ہوتا ہے — رشکِ صد آفتاب ہوتا ہے
بوالہوس شادکام رہتے ہیں — اور عاشق خراب ہوتا ہے
خونِ مظلوم اے ستم پرور — باعثِ انقلاب ہوتا ہے
تیری صحبت میں ایک اک لمحہ — حاصلِ انتخاب ہوتا ہے
زندگی کروٹیں بدلتی ہے — موت کو اضطراب ہوتا ہے

اس عدالت کی داد کیا دیجے!
بے گنہ پر عتاب ہوتا ہے

احمد پرویز

مضطرب، مضطرب ہے فضا ان دنوں
ڈوبی ڈوبی ہے نبضِ صبا ان دنوں

آپ نسخوں پہ نسخے بدلتے تو ہیں
درد کی ہو چلی انتہا ان دنوں

بن گیا پا کے، دستور سازی کا فن!
آدمی، آدمی کا خدا ان دنوں

دیدہ و دل کی پستی کا عالم ہے یہ
ہے ترقی پہ حرص و ہوا ان دنوں

معتبر دینِ افرنگ ان کے یہاں
مشتبہ دینِ احمد ہوا ان دنوں

کون، گُل کر گیا، راہ کی مشعلیں
کون، گُم کر گیا راستا ان دنوں

لب پہ نامِ خدا، دل میں عشقِ بتاں
کتنے ارزاں ہیں مکر و ریا ان دنوں

جاگ اٹھی ہیں لو، قوم کی بیٹیاں
سو گئی رُوحِ شرم و حیا ان دنوں

اپنی منزل تو پرویز، اسلام ہے!
بڑھ چلے ہیں کدھر رہنما ان دنوں

ابو ظہیر انصاری

دلِ بے تاب سینے میں اگر لے کر شباب آئے
زمانے کی روش میں خود بخود اک انقلاب آئے

اُدھر فرمانِ داور، اس طرف ہو سر بکف مومن
نہ ماتھے پر شکن آئے، نہ دل میں پیچ و تاب آئے

مسلماں ہاتھ اٹھاتے بارگاہِ ربِ اکبر میں
غضب ہے عرشِ اعظم سے نہ پھر کوئی جواب آئے

جو شمشیر و سناں سے زندگی کا معرکہ جیتے
تعجب ہے پسند اب ان کو طاؤس و رباب آئے

الٰہی پھر عطا کر وہ قلندر اس زمانے کو
جو سمجھانے کو اسرار و رموز "الکتاب" آئے

شاکر تسلیم

دل بے نیازِ لطف و عنایت ہے ان دنوں
اے شاہدِ حیات نہ یوں مسکرا کے دیکھ

خورشید سے تو ڈھل نہ سکے تیرگی کے داغ
اب اپنی چشمِ ناز کی شمعیں جلا کے دیکھ

ہر زخمِ دل ہے موجِ تبسم لئے ہوئے
اک جنبشِ نظر سے ذرا گدگدا کے دیکھ

اس دورِ ارتقا کے مناظر جواں سہی
لیکن خیال و فکر کی وسعت پہ چھا کے دیکھ

دیکھیں کسے ملے وہ حیات آفریں سرور؟
سجدہ کروں میں، اور تو ساغر اٹھا کے دیکھ

حالات کتنے سخت ہوں شاکر گلہ نہ کر!
آزادیٔ حیات کا پرچم اڑا کے دیکھ

ظہور الحق صدیقی

آپلٹ دیں ورقِ قطعۂ گلستاں اے دوست
ایک بار اور ہو تجدیدِ بہاراں اے دوست
سر نظر آتے ہیں اکڑے ہوئے جباروں کے!
تو بھی ہو اُن کے لئے خنجر براں اے دوست
چھوڑ دے جام و سبو توڑ بھی دے چنگ و رباب
حشر سے پہلے نکل حشر بداماں اے دوست
یہ جو آکاش کے سینہ سے سویرا پھوٹا
ہے نئے دور کے آغاز کا عنواں اے دوست

جالب سلیمی

عبث بدگماں ہے زمانے کو دیکھو
کوئی تنگ بھی ہوتی۔ کہاں تم کہاں ہم
بہت در بدر ٹھوکریں کھا کے پہنچے   نہ چھوڑیں گے اب تو ترا آستاں ہم
زباں چند لفظوں میں کیا کیا کہے گی
کریں گے نگاہوں کو اب ترجماں ہم

نعیم صدیقی

کشتی تو ہے بھنور میں کنارے کہاں گئے؟
امید! اب وہ تیرے سہارے کہاں گئے؟

مے تو سہی! مگر مرے ساقی کی چشم ناز
وہ تیرے حشر خیز اشارے کہاں گئے؟

ظلمات نے زمیں کے دیوں کو نگل لیا
اے چرخ! تیرے چاند ستارے کہاں گئے؟

کیسی یہ بندگانِ زمانہ! خدا کی یاد
جو پُج رہے تھے، بُت وہ تمہارے کہاں گئے؟

دنیا کو عقل آئی تھی جن کے طفیل کل
کیا جانیے! جنوں کے وہ مارے کہاں گئے؟

اللہ منیوں پہ مری طنز کیوں بتو؟
تم تو کہو کہ وعدے تمہارے کہاں گئے؟

وہ جن سے کھیلتے ہوئے گذری ہے نصف عمر
اے ذوق و شوق! اب وہ غبارے کہاں گئے؟

نعیم صدیقی

○

سرابِ شوق میں موج و حباب دیکھے ہیں!　　تمام عمر یونہی ہم نے خواب دیکھے ہیں!
عجب مقامِ خرابات ہے کہ رند تو رند　　یہاں شیوخ بہ حالِ خراب دیکھے ہیں!
تمام عمر جہنم میں کٹ گئی، لیکن　　تمام عمر ہی جنت کے خواب دیکھے ہیں!
غریب ذرّے پریشاں رہیں تو کیا شکوہ!　　کہ سرگراں فلک و آفتاب دیکھے ہیں!
بس اک نگاہ میں لٹتے جمال پائے ہیں　　بس اک نگاہ میں گھلتے شباب دیکھے ہیں!

نقاب اوڑھی بھی ذوقِ مظاہرہ کی دلیل!
نقاب اوڑھے ہوئے بے نقاب دیکھے ہیں

○

اِن وفا کوشیوں کو چھوڑ دو بھی　　ایک دل توڑنا ہے، توڑ دو بھی!
آبگینے اٹھائے پھرتا ہوں　　اِن کو سنگِ جفا سے پھوڑ دو بھی!
جی! یہ ذرّہ نوازیاں معلوم!　　رہنے دو، جاؤ جاؤ، چھوڑ دو بھی
دربدر سجدہ پاشیاں کیسی!　　سر کسی آستاں پہ چھوڑ دو بھی
آس توڑی، بڑا کمال کیا!　　جانیں جب آسکے اس کو جوڑ دو بھی
محض ناموں کا یاں اثر معلوم!　　زندگی کو ذرا جھنجھوڑ دو بھی

اب زمانے کی پیروی چھوڑ دو
اب زمانے کی باگ موڑ دو بھی

نعیم صدیقی

جو آنسو میری آنکھوں سے راتوں کو ٹپکنے والے ہیں
وہ تارے بن کے گردوں پر، دیکھو کہ چمکنے والے ہیں

وہ اور چہکنا ہے جس کا انجام اسیری ہوتا ہے
چڑیاں بھی چہکتی رہتی ہیں، بلبل بھی چہکنے والے ہیں

ہر آنکھ میں کھُبنے والے تم! ہر بزم میں سجنے والے تم!
کیوں چبھتے ہیں ہر آنکھ میں ہم! ہر دل میں کھٹکنے والے ہیں

واعظ نے بہت کچھ کہہ ڈالا، منبر سے مگر آگے نہ بڑھا
اک ہم کہ فقط دو لفظوں میں سُولی پہ لٹکنے والے ہیں

غیرت نے نہ جن کی یہ مانا، پوچھیں کہ کدھر کو ہے منزل؛
اے راہ برو! اے راہ زنو! ایسے بھی بھٹکنے والے ہیں!

اس فصلِ خزاں کے قدموں میں گو روحِ چمن پامال سہی؛
کچھ باغیِ فطرت غنچے ہیں جو پھر بھی چٹکنے والے ہیں

بیڑا تو اٹھاتے ہو لیکن، یہ حق کی محبت کھیل نہیں!
کچھ خون بھی گردش کرتا ہے؟ کچھ دل بھی دھڑکنے والے ہیں

نعیم صدیقی

○

کل رات پرانی کچھ یادوں پر اشک بہاتے بیت گئی
اشکوں کی شبنم سے سینے کی آگ بجھاتے بیت گئی!

بس ایک ذرا بہکی تھی نظر! برسوں میں سنبھلنا مشکل تھا
بگڑی تھی ذراسی بات کہ پھر، بگڑی کو بناتے بیت گئی!

اِک بُت کا یہ پاسِ خاطر تھا ہم لوگ خدا کو بھول گئے
کعبے کی مقدس مٹی سے بُت خانے بناتے بیت گئی

بس ایک ذراسی شوخی پر وہ رُوٹھ گئے تو رُوٹھ گئے
پھر عمر یہ ساری کی ساری روٹھوں کو مناتے بیت گئی!

اک عمر تھی جس کو کاٹ چلے، پر، جانے کیسا جینا تھا!
کچھ غیروں کی، کچھ اپنوں کی بس چوٹیں کھاتے بیت گئی!

ہم کہتے رہے اک افسانہ، شب بھر میں وہ ٹس سے مس نہ ہوئے
اک پتھر کا بت تھا جس کو احساس دلاتے بیت گئی!

آدھی تو کٹی یوں، محنت سے خوابوں کے محل تعمیر کئے
اور باقی ان محلوں کو اپنے ہاتھوں ڈھاتے بیت گئی

نعیم صدیقی

○

جال ہیں، پنجرے ہیں، دانے ہیں! — زندگی کے یہی فسانے ہیں!
کب تقاضائے حق وہ مانے ہیں — خوئے بد ہو تو سَو بہانے ہیں
مُجھ سے وہ بدگماں ہیں، خیر یہی! — جانے پہچانے ہیں، یگانے ہیں!
دل میں ہیں داغ! آنکھ میں آنسو! — دونوں ہی بیکراں خزانے ہیں!
تم عبث میری فکر کرتے ہو — میرے دُکھ تو بڑے پرانے ہیں

مَیں ہُوں ایسا مسافرِ تنہا
جس کے پیچھے کئی زمانے ہیں

○

رَس بھرے لفظ ہیں، معنی ہیں بڑے زہریلے — مئے تو ظلمات کی ہے، نُور کا پیمانہ ہے!
آبِ زر سے تو لکھے جاتے ہیں عنوان لیکن! — زندگی کو جو پڑھیں، موت کا افسانہ ہے

○

بُت گری عام ہے، بُت توڑنے والے نہ رہے
ظلمتوں سے جو لڑیں، ایسے اجالے نہ رہے!

- قرآن کس اعتبار سے آسان ہے ؟
- قرآن کس اعتبار سے مشکل ہے ؟
- قرآن میں تدبر کرنے کا طریقہ کیا ہے ؟
- اس کام میں کن آداب و شرائط کا اہتمام ضروری ہے ؟
- تفسیر کی کتابوں میں سے کون سی کتابیں کس حد تک مفید ہیں ؟
- عربی ادب کی کس درجہ کی استعداد قرآن فہمی کے لیے ضروری ہے ؟
- لغت کی کونسی کتاب مطالعہ قرآن کے وقت پیش نظر رکھنی چاہیے ؟
- نحو، بلاغت، تاریخ اور حدیث سے قرآن مجید کو کس حد تک تعلق ہے ؟
- تفسیر کے جدید و قدیم اصول کیا ہیں ؟

ان سوالوں کے جوابات

مولانا امین احسن اصلاحی

کی علمی و تحقیقی تصنیف

تدبرِ قرآن

میں مطالعہ فرمائیں

دوسرا ایڈیشن مع ترمیم و اضافہ - قیمت تین روپے چار آنے

مکتبہ چراغِ راہ کراچی

جشنِ پاکستان

آزادی کے ۵ سال

- ضیا محمد ضیا
- مولانا محمد عبدالرحیم • س۔ا۔ظفر • ابو سلیم ایم اے
- محمد عزیز ایم اے • پروفیسر عبدالحمید ایم اے • پروفیسر اے۔ آر رحیم ایم اے • سید صدیق الحسن گیلانی
- حکیم محمد سعید دہلوی • منظور احمد • مولانا مسعود عالم ندوی • سردار محمد خان صواتی

ظہورِ پاکستان اور اُس کا پس منظر

ضیاء محمد ضیا

اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آتی ہے کہ اس سرزمین میں اسلام ایک تحریک اور ایک نظامِ زندگی کی حیثیت میں داخل نہیں ہوا۔ اور نہ اس کے نظریۂ سیاسی اور فلسفۂ اجتماعی کو براہِ راست اِس ملک کے باشندوں کو متاثر کرنے اور ان میں فکر و عمل کا انقلاب پیدا کرنے کا موقعہ ملا۔ بلکہ یہاں اسلام فاتحوں اور کشور کشاؤں کے واسطے سے آیا۔ جو یا تو نئے نئے حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے تھے اور اپنی فکر و نظر اور اخلاق و سیرت میں پختہ نہ ہو پاتے تھے، یا پھر اُن کے سامنے اقامتِ دین اور اعلائے کلمۃ اللہ سے زیادہ عزیز مقصد تحصیلِ خراج اور توسیعِ مملکت کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ ان کو فتوحات کے جوش میں اس بات کا اہتمام کرنے کی کوئی ضرورت نہ محسوس ہوتی تھی۔ کہ اسلام کے سیاسی مقاصد اور جنگی قواعد و ضوابط کیا ہیں۔ اور یہ کس قسم کا نظامِ تمدن و سیاست قائم کرنا چاہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی ہزار سالہ قومی حکومت کے اس طویل دور میں ہندوستان میں کبھی بھی حقیقی معنوں میں اسلامی حکومت قائم نہ ہوئی۔ نہ یہاں تمدن خالص اسلامی اصولوں پر اُستوار ہُوا۔ نہ یہاں صحیح اسلامی تہذیب وجود میں آئی۔ اور نہ ہی اسلام کے اجتماعی تصورات کو مُلکی زندگی کے تمام گوشوں میں کارفرمائی کا پُورا پُورا موقعہ ملا۔ نتیجۃً یہ مُلک اسلام کے سیاسی اقتدار کے فیوض و برکات سے کبھی بھی صحیح طور پر رُوشناس نہ ہُوا۔ بلکہ اس کے مقابلے میں ان نفس پرست فرمانرواؤں اور اقتدار پسند حکمرانوں نے اپنی عملی زندگی اور اپنے سیاسی طرزِ عمل سے اسلام کے متعلق ایسی بیشمار غلط فہمیاں پیدا کر دیں۔ جو آج تک دُور نہیں ہو سکیں۔

المختصر ہندوستان کے باشندوں نے مسلمانوں کی حکومت کو خلافتِ الٰہی اور نیابتِ خداوندی کے رنگ میں نہیں بلکہ شخصی آمریت یا خاندانی بادشاہت کی صورت میں دیکھا۔ بلاشبہ ان بادشاہوں میں بعض ایسی شخصیتیں بھی ہیں۔ جنھوں نے اپنے طور پر حکومت کا کاروبار چلانے میں خدا ترسی سے کام لیا۔ لیکن شخصی نظامِ حکومت میں جزوی اصلاح اور چیز ہے اور مُلکی زندگی کے تمام شعبوں پر اسلامی قانون کا نفاذ و اجرا چیزے دگر۔ لہٰذا اسلام کا مفہوم آخر وقت تک بادشاہت سے وابستہ رہا۔

ان سلاطین و اُمرا کی بداعمالیوں اور دُنیا پرستیوں سے ہر چند کارِ ملک و دیں میں برابر رخنے پڑتے رہے اور اسلامی نظامِ حیات کے کاخِ عظیم میں شگاف پر شگاف آتے رہے لیکن ابھی تک کسی کو یہ جُرأت نہ ہوئی تھی۔ کہ اس قصرِ رفیع کے مکمّل انہدام پر تُل جائے یہاں تک کہ اکبر کا دورِ پُرفتن آ پہنچا۔ یہ دسویں صدی ہجری کے اختتام کا زمانہ تھا۔ جب کہ ایک نئے دین اور نئی شریعت کی طرح عین شاہی سرپرستی میں ڈالی گئی اور اس دین کا نام "دینِ الٰہی" رکھا گیا۔ قرآن کے محکمات اور اسلام کے مسلّمہ اصول و احکام کی اتنے بڑے پیمانے پر کافرانہ جسارت کے ساتھ خلاف ورزی اس سے پہلے کسی فاسق سے فاسق بادشاہ نے بھی نہ کی تھی۔ خدا و رسول کا استحقار و استخفاف اور شعائرِ دینی کی توہین و تذلیل جیسی اس مسلمان بادشاہ کے ہاتھوں ہوئی۔ کسی غیر مسلم کے ہاتھوں کیا ہوئی ہوگی اس غلط کار شہنشاہ نے ہندوستان میں پہلی بار باقاعدہ طور پر متحدہ قومیت اور مشترکہ تہذیب کی بنا ڈالی۔ لیکن قدرت اپنے بندوں کی ہدایت و رہنمائی کا انتظام ہمیشہ سے کرتی چلی آئی ہے۔ چنانچہ اس بادشاہت کے مفاسد کا ردِّ عمل بعض صوفیاء اور علماء کی مساعی کی صورت میں

نمودار ہوتا رہا۔ متعدّد علماء و محدثین انفرادی طور پر تبلیغ و دعوت کا کام کرتے رہے۔ اَور یہ انہی بزرگوں کی خاموش دعوت کا اثر ہے کہ اِس ملک میں اسلام کے آثار آج تک باقی ہیں۔ شرک و بدعت اَور فسق و ضلالت کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں انہوں نے اخلاق و روحانیت کے جو چراغ روشن کئے۔ آج بھی لَو دے رہے ہیں۔ مگر جو گمراہی صدیوں سے حکومتوں کے زیرِ سایہ پھیل رہی ہو۔ انفرادی کوششوں سے اُس کا سدِّباب کیسے ممکن ہے۔

جب اکبری دَورِ ضلالت کی فتنہ سامانیاں حد سے بڑھ گئیں تو اللہ نے حضرت امام ربّانی مجدّد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کو گیارہویں صدی ہجری کے آغاز میں خلعتِ تجدید سے سرفراز کیا۔ حضرتِ امام نے فتنۂ اکبری کی کمال حد تک بیخ کنی کی اَور افضل الجہاد کی سُنّت کو ایک بار پھر تازہ کر دیا۔ حکومت کی سختیوں اَور اقتدار کی قہرمانیوں کے علی الرغم کتاب و سنت کا علم آخر وقت تک تھامے رکھا۔ اَور بالآخر ایک بار پھر اِس مُلک میں اسلام کو سربلندی حاصل ہوئی۔ آپ کے انتقال کو زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا۔ کہ اسی صدی کے اواخر میں اورنگ زیب جیسا خدا پرست اَور دیندار بادشاہ تختِ نشین ہوُا۔ جس نے اپنی حد تک بہت کچھ اصلاح کی اَور مملکت کا نظم ذمہ داری اَور خدا ترسی سے چلانے کی کوشش کی۔ اورنگزیب کی وفات کے متصل بعد ہی بارھویں صدی کے شروع میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کو قدرت نے تجدید و اصلاح کے لئے اُٹھایا۔ اَور غالباً اسلامی ہند میں یہ پہلے شخص ہیں۔ جنہوں نے اسلامی حکومت کا تصور واضح کیا اَور اس کی خصوصیات اُجاگر کیں۔ یُوں ایک کڑی کے بعد دُوسری کڑی آتی رہی اَور احیائے اسلام کا یہ سلسلہ آگے چلتا رہا۔

مسلمان اگرچہ عملی طور پر صدیوں سے تنزّل کی طرف جا رہے تھے۔ اَور اعتقاد و عمل کے لحاظ سے اُن کی حالت روز بروز پست سے پست تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ لیکن غنیمت ہے کہ بہ حیثیت مجموعی اُن میں یہ احساس ہمیشہ موجود رہا ہے کہ مسلمان وُہ نہیں ہیں جیسے اسلام چاہتا ہے اَور زندگی کا اجتماعی نظام بھی وُہ نہیں ہے۔ جو کتاب و سُنّت کی رُو سے ہونا چاہئے۔ یہ احساس اُس وقت خُوب اچھی طرح اُبھر آیا۔ جب انگریزی امپیریلزم نے مسلمانوں کی قومی سلطنت کو آکر ٹھوکر لگائی۔ بالآخر یہ احساس پُورے شعور اور جذبے کے ساتھ آکر تحریکِ مجاہدین میں ڈھل گیا۔ اَور یہی تحریک اس برِّ عظیم میں اسلام کو بہ حیثیت نظام قائم کرنے کی پہلی باقاعدہ اور منظم کوشش تھی۔ جس کا نصب العین اول روز ہی سے تاسیسِ حکومتِ الٰہیہ تھا۔ حضرتِ سید شہیدؒ ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"ربِّ غفور جو کہ دلوں کا حال اچھی طرح جانتا ہے اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہے کہ اس منصب (امامت) کے قبول کرنے سے اس کے سوا میری کوئی دوسری نفسانی غرض نہیں کہ جہاد کو شرعی طریقے پر قائم کیا جائے۔ اَور مسلمانوں کی فوجوں میں نظم قائم ہو۔ ہاں اس قدر آرزو رکھتا ہوں۔ کہ اکثر افرادِ انسانی بلکہ تمام ممالک میں ربّ العالمین کے احکام جن کا نام شرعِ متین ہے بلا کسی کی مخالفت کے جاری ہو جائیں[1]"

اس تحریک کا عملی اقدام اور انقلابی حرکت اگرچہ بالاکوٹ کے مقام پر آ کر رک گئی۔ اَور بظاہر ناکام ہو گئی۔ لیکن اس کی مادی ناکامی اپنے پیچھے تجدید و احیائے اسلام کا ایک جذبہ و رواثۃً مسلمان ذہن کے لئے چھوڑ گئی۔ چنانچہ یہ جذبہ مسلمانوں کی کم و بیش تمام سیاسی تحریکوں میں شعوری یا غیر شعوری طور پر کارفرما رہا ہے۔ بعد میں آکر جب اس جذبے کو عمل میں راستہ نہ مل سکا تو اس نے فکر و تخیل اَور ادب و صحافت میں اپنا راستہ نکالا۔ اَور اپنے بیج افکار کی کھیتی میں ڈالے۔ ان بیجوں کو سب سے زیادہ خوبی کے ساتھ جس شخص نے اپنی کشتِ فکر میں

---

[1] سیرت سید احمد شہید ص۱۱۰-۱۱۱

منور کیا اور جس کی فن کاری نے اِن کی بہترین طور پر آبیاری کی وُہ اقبال تھا۔ اقبال کے ہاں جب یہ بیج شعر و حکمت اور فکر و فلسفہ کی صُورت میں پھوٹتے ہیں تو اس کے ہاں وُہ شجرۂ تخیل پروان چڑھا جسے تخیلِ پاکستان کا نام دیا جاتا ہے۔

اقبال کے تخیلِ پاکستان کے دو اجزا تھے:۔

اوّل۔ یہ کہ اسلام بحیثیت نظامِ زندگی برسرِ عمل آ جائے اور یہی اصل مطلوب تھا۔

دوم۔ یہ کہ برِعظیم ہند میں ایک الگ خطّہ اس مقصد کے لئے مسلمانوں کو حاصل ہو جائے۔

جہاں تک جُزوِ اول کا تعلق ہے۔ علامہ نے اپنی نظم و نثر میں بیشتر مقامات پر اس کی طرف خفی و جلی اشارے کئے ہیں۔ آپ کے لٹریچر کا مطالعہ کرنے سے یہ بات تو بدیہی طور پر معلوم ہو جاتی ہے۔ کہ اُن کے ذہن میں اسلام کا جامع اور ہمہ گیر تصور تھا۔ اُنھوں نے اسلام کو ایک عالمگیر انقلابی تحریک سمجھا' دین و دنیا کی تفریق اور مذہب و سیاست کی جُدائی کو ہمیشہ غلط اور فساد انگیز کہا ؎

ہوئی دین و دُنیا میں جس دم جُدائی	ہوس کی امیری ہوس کی وزیری
دُوئی مُلک و دین کے لئے نامُرادی	دُوئی چشمِ تہذیب کی نابصیری

اور ع جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی۔ اس قسم کے بہت سے فکری جواہر اُن کے کلام میں جا بجا بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ اسلام کی جو حقیقت آپ نے اپنی مشہور انگریزی کتاب "اسلام کی تشکیلِ جدید" میں پیش کی ہے۔ لگے ہاتھوں اُس کا ایک اقتباس بھی مُلاحظہ فرما لیجئے:۔

"اسلام عام مروجہ معنوں میں ایک مذہب نہیں بلکہ ایک تہذیب ہے۔ اس کے اصول دائمی اور ابدی ہیں۔ اور اس تہذیب کی اساس توحید ہے۔ انسان کو صرف خُدا کا وفادار ہو جانا چاہئے۔ خُدا ہی تمام زندگی کی آخری اور روحانی اساس ہے۔ ...... اور اسلام کی سوسائٹی متحرک اور وُسعت پذیر ہے۔"

اسلام کا یہ تصور ذہن میں رکھتے ہوئے اقبال نے دوسرے تمام نظام ہائے زندگی پر جس جس طرح تنقید کی ہے اور اُنکے مفاسد کو گنایا ہے اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ آپ اُن کے مقابلے میں اسلام ہی کے نظام کو دردِ آدمیت کا مداوا اور عالمِ انسانی کی تمام مشکلات کا حل سمجھتے تھے۔ اس سے بڑھ کر ایک عالم گیر معاشرہ اور ایک اجتماعی برادری وجود میں لانے کے لئے بھی علامہ کی نگاہ میں اسلام کے سوا پائدار اور محکم اساس اور کوئی نہیں تھی۔ اسلام کے اُبھرنے اور بحیثیت نظامِ زندگی دُنیا پر غالب آنے کے آثار آپ کی نظروں میں بہت واضح ہیں کیونکہ اجتماعی زندگی کی دوسری تمام سکیمیں ناکام ہو چکی ہیں۔ اور اب یہ اسلام ہی ہے جو زندگی کا ایک بہترین نقشہ پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کی صاف جھلک "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" میں دیکھی جا سکتی ہے موجودہ "جہانِ پیر" کے مرنے اور ایک دوسرے زندہ و توانا "جہانِ نو" کے پیدا ہونے کی اُنھوں نے پکار پکار کر خبر دی ہے۔ اور نہ صرف خبر دی ہے بلکہ اِس نئے نظام اور اس نئے جہان کی تعمیر میں انھوں نے فکری طور پر حصّہ بھی لیا ہے۔ اُن کی غایتِ تمنّا ہے کہ اس نئے جہان کی بنیاد اسلام کی اساسات پر اُٹھے۔ اقبال نے اس عالمِ قرآن کا نقشہ پیش کیا ہے۔ ایک اسلامی مملکت کی صحیح تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے:۔

عالمے بے امتیازِ خون و رنگ	شامِ او روشن تر از صبحِ فرنگ
عالمے پاک از سلاطین و عبید	چوں دلِ مومن کرانش ناپدید
عالمے رعنا کہ فیضِ یک نظر	تخمِ او افگند در جانِ عمرؓ
لایزال و واردانش نو بنو	برگ و بارِ محکماتش نو بنو

باطنِ او از تغیّر بے غمے　　　ظاہرِ او انقلابِ ہر دمے

اقبال کے اِس عالمِ نو کی عمارت کن بنیادوں پر اُٹھنی چاہیئے۔ دوسرے لفظوں میں وہ اپنے مجوّزہ پاکستان میں کس قسم کا نظامِ حکومت قائم کرنا چاہتا ہے۔ اِس کے مندرجہ ذیل چار بُنیادی ارکان متعین طور پر اُس نے جاوید نامہ میں محکماتِ عالمِ قرآنی کے نام پیش کر دیئے ہیں۔

(۱) خلافتِ آدم:-

انسان زمین پر خدا کا نائب ہے اَور یہ بشریت کی فضیلت اَور آدمیت کے احترام کی انتہا ہے ؎

برتر از گردوں مقامِ آدم است　　　اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

لہٰذا انسان کو اپنے منصبِ نیابت کا پاس کرتے ہوئے ہر قسم کے نسلی و وطنی، لونی و لسانی تعصّبات سے پاک رہنا چاہیئے۔ تمام عالمِ انسانیت اس کی نگاہ میں یکساں حیثیت رکھتا ہو۔ نیز شرفِ انسانی میں عورت مرد کے برابر ہے۔ مرد کو اُس کے تقدس امومت کا پُورا پُورا احترام ملحوظ رکھنا چاہیئے ؎

حق ترا داد است اگر تابِ نظر　　　پاک شو قدسیّت او را نگر

(۲) حکومتِ الٰہی:-

حاکمیت ربّ العالمین کے لیئے مخصوص ہے۔ وُہ سلطانِ کائنات ہے۔ آدمی نہ کسی پر حاکم ہے نہ کسی کا محکوم ہے ؎

بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام　　　نے غلام اُو را نہ اُو کس را غلام

خدا کی حکومت میں انسان کی سلطانی اَور ملوکیت کا وجود پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ مُلک اَور دین عطیۂ الٰہی ہے۔ آئین و قانون کا مبدأ ذاتِ خداوندی ہے۔ یعنی قانون سازی کا حق سوائے خُدا کے اَور کسی کو نہیں ؎

بندۂ حق مردِ آزاد است و بس　　　مُلک و آئینش خداداد است و بس

رسم و راہ و دین و آئینش ز حق　　　زشت و خوب و تلخ و نوشینش ز حق

انسانی عقل ناقص اَور محدود ہے۔ اِس لیئے انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین و دساتیر بھی ناقص ہوتے ہیں۔ یہ خود غرضی سے پاک نہیں ہو سکتے۔ بلکہ کسی خاص طبقہ، گروہ، مُلک یا قوم کے مخصوص اغراض و مفاد پر مبنی ہوتے ہیں۔ صرف وحیٔ الٰہی ہی سب کا سُود و بہبود دیکھ اَور بھ سکتی ہے۔ کیونکہ ذاتِ خداوندی ان تمام عصبیتوں سے منزّہ ہے۔ خدائی قوانین تمام انسانیت کی فلاح کے ضامن ہیں ؎

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر　　　سُودِ خود بیند نہ بیند سُودِ غیر

وحیٔ حق بینندۂ سودِ ہمہ　　　در نگاہش سُود و بہبودِ ہمہ

. . . .　　　. . . . .

غیرِ حق چوں ناہی و آمر شود　　　زورور بر ناتواں قاہر شود

زیرِ گردوں آمری از قاہری ست　　　آمری از ما سوا اللہ کافری ست

اِسی ضمن میں علامہ نے مغرب کی مادی جمہوریت کے مفاسد بھی کھول کر بیان کئے ہیں۔ اَور اِس کی ناخدا شناس تہذیب کے چند مظاہر پر گرفت کی ہے اَور یہ تلقین فرمائی ہے کہ ؎

اے کہ تقلیدش اسیر آزاد شو

دامنِ قرآں بگیر آزاد شو

(۳) ارض ملکِ خدا ست :-

زمین خدا کی ملکیت ہے۔ یہ کسی خاص طبقے کا اجارہ نہیں۔ تمام انسانوں کو اس پر تصرف کا یکساں حق ہے۔ آج قومیں جوع الارض میں بدحواس ہو کر ایک دوسرے پر درندوں کی طرح جھپٹ رہی ہیں۔ توسیعِ مملکت کا بھوت بڑی بڑی متمدن و مہذب قوموں کے سر پر سوار ہے۔ جس کے نتیجہ میں تمام دنیا میدانِ جنگ بنی ہوئی ہے۔ حالانکہ اس زمین کی حیثیت متاعِ غرور سے زیادہ نہیں ؎

دل بِرنگ و بو و کاخ و کو مدہ   دل حریمِ اوست جز با او مدہ

لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ انسان دُنیا کے کاروبار سے الگ ہو بیٹھے۔ اور زمین اور اس کے خزائن سے تمتّع کے حق سے دست کش ہو جائے۔ اسلام رہبانیت اور ترکِ دنیا کی تعلیم نہیں دیتا ؎

فقرِ جوع و رقص و عُریانی کجاست   فقرِ سلطانی ست رہبانی کجاست

(۴) حکمت خیرِ کثیر ست :-

حکمت کو خیرِ کثیر کہہ کر اللہ تعالیٰ نے اس کا حصول مسلمانوں پر واجب کر دیا۔ فلسفہ و سائنس، علم اشیاء کا حصول، عناصرِ فطرت کی تسخیر، طبیعات اور مابعد الطبیعات کے حقائق و اسرار کو سمجھنا عین جائز، فرض اور مستحسن ہے۔ کیونکہ یہ تو صاف بات ہے کہ وقت کے علوم و فنون اور کائنات کی دریافت شدہ قوتوں سے صرفِ نظر کر کے کوئی نظامِ مملکت ایک دن بھی نہیں چل سکتا۔ لیکن یہ سب کچھ سوزِ دل کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ ورنہ یہی علم انسانیت کی تباہی کا باعث ہو سکتا ہے۔ اور اس کی قوت ابلیس کی یار و مددگار بن جاتی ہے علامہ نے علم و حکمت کو مسلمان بنانے کی ہدایت کی ہے ؎

خوشتر آں باشد مسلمانش کنی   کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی

اور اگر انسانی علوم اور آرٹ کو ہدایتِ الٰہی کا پابند نہ کیا جائے تو پھر اس کے طاغوتی طاقت بننے اور بولہبی اور چنگیزی اختیار کرنے میں کوئی چیز حائل نہیں ہو سکے گی۔

یہ تھے وہ چار محکمات جن پر دورِ حاضر کی ایک ترقی پذیر اور ترقی یافتہ اسلامی مملکت قائم کی جا سکتی ہے اس مضمون کو علامہ نے نامکمل نہیں چھوڑا ہے۔ بلکہ اس ریاست کو چلانے کے اپنے "انسانِ مطلوب" کا خاکہ بھی دیا ہے۔ "خطاب بہ جاوید" میں اس مجوزہ اسلامی ریاست کے صدر یا امیر کی سیرت کے خد و خال پوری طرح نمایاں کر کے دکھا دیئے ہیں۔ یعنی اس سے وسیع تر مفہوم میں وہ تمام اوصاف و خصائص بیان کر دیئے ہیں۔ جن سے ایک مسلم قیادت کو متصف ہونا چاہیئے۔

اقبال نے اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور اس کے بہ حیثیت نظامِ زندگی غالب آنے کے امکانات تو واضح کر دیئے اور اس مقصد کے لئے ایک الگ خطۂ ارضی حاصل کرنے کا نصب العین بھی مسلمانانِ ہند کے سامنے رکھا۔ لیکن حقیقی معنوں میں دعوت و تحریکِ اسلامی کا وہ ڈھنگ سوچ نہ سکا۔ جس کے تحت پورے ہندوستان کو نظامِ اسلامی کا میدان بنانے کا منصوبہ تیار کیا جاتا۔ اور اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ اقبال مسلم نیشنلزم کے دور میں پیدا ہوا ہے۔ اور مسلم نیشنلزم کے کچھ نہ کچھ اثرات اس کے اندر آخر وقت تک موجود رہے ہیں۔ وہ ایک اصولی دعوت کا صحیح موقف نہ پا سکنے کی وجہ سے مجبور رہا ہے کہ قومیت کے زاویۂ نگاہ سے سوچے۔ اسلامی نظام اور مسلم نیشنلزم کے دوگونہ تاثرات کے مل جانے سے اس کے اندر پاکستان کا تخیل ابھرا ہے۔ لیکن بہرحال اس کا پاکستان محض ایک قومی وطن نہ تھا۔ بلکہ اسلامی نظامِ زندگی کے لئے قالب تھا۔ وہ قالب بے قالب کا قائل نہیں۔ بلکہ قالب کو ایک روح کے لئے چاہتا ہے

تاکہ ایک زندہ پیکرِ وجود میں آسکے اُس نے صاف صاف کہا تھا کہ ؎

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارہ

تخیلِ پاکستان کے اِن دو اجزاء کے ساتھ ایک تیسرا جزو جو شامل تھا۔ وہ بین الاقوامی انقلاب کا منصوبہ تھا۔ وہ پاکستان کو صرف مسلمانانِ ہند کی قومی فلاح کے لئے نہیں چاہتا تھا۔ بلکہ پوری انسانیت کی خدمت اور اقوامِ عالم کی اصلاح کے لئے ایک مرکز پیدا کرنا چاہتا تھا ؎

ملتے سے خواہد ایں دُنیائے پیر آں کہ باشد ہم بشیر و ہم نذیر

یہ دَور اپنے ابراہیم کی تلاش میں ہے صنم کدہ ہے جہاں لاالٰہ الا اللہ

یعنی اقبال کا تخیلِ پاکستان جن اجزاء سے مرکب تھا۔ وُہ یہ تھے :۔

۱۔ نظامِ اسلامی کے لئے ارضی قالب کی فراہمی۔

۲۔ نظامِ اسلامی کا قیام و نفاذ۔

۳۔ بین الاقوامی دعوت و اصلاح کی مُہم۔

وہ چاہتا تھا۔ نیا وطن، نیا نظام، نیا انسان۔ نیا دَورِ تہذیب۔

لیکن بین الاقوامی دعوت و اصلاح کا کام تو نظامِ اسلامی کے قیام کا لازمی نتیجہ ہونا تھا۔ اصل کرنے کے کام اُس کے نزدیک دو ہی تھے :۔

(۱) نظامِ اسلامی کے لئے پاکستان کا ارضی قالب۔ (۲) پاکستان کے ارضی قالب میں نظامِ اسلامی کی رُوح جاری و ساری کرنا۔

اقبال کے منصوبۂ پاکستان کے یہ دونوں پروگرام ایک ہی قیادت، ایک ہی نظامِ جماعت اور ایک ہی تحریک کی صُورت میں چلنے چاہئیں تھے۔ مگر افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔ بلکہ منصوبہ کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ نیشنلزم کا اثر چونکہ اسلامیت کے مقابلے میں زیادہ گہرا ہو چکا تھا۔ اِس لئے اقبال کے اصل مطلوب کو مؤخر کر کے قوم نے ساری توجہ پہلے جزو پر صرف کر دی اور پاکستان کے قالب کی تعمیر کا سہرا قائدِ اعظم محمد علی جناح کے سر بندھا۔

قریب قریب اُس کے متوازی ہی احیائے نظامِ اسلامی کی فکری تحریک سید ابوالاعلیٰ مودودی کے ذریعہ شروع ہو چکی تھی۔ یہ دونوں تحریکیں فکری اختلافات کے باوجود میدانِ عمل میں کسی طرح کے تصادم کے بغیر چلیں۔ بلکہ مؤخر الذکر تحریک ایک نازک مرحلے میں اول الذکر کے آڑے آئی۔ اور تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ کانگرس جو مسلمانوں کی قومی حریف تھی سیاسی لحاظ سے قائدِ اعظم کی قائم کردہ جماعت مسلم لیگ سے زیادہ طاقت ور تھی۔ نہ صرف کثرت تعداد اور مالی قوت کے لحاظ سے، بلکہ ذہنی، فکری، علمی اور انگریزی حکومت پر اثر ڈالنے کے لحاظ سے بھی۔ چنانچہ جب کانگرس نے متحدہ قومیت اور ماس کنٹیکٹ کی مُہم شروع کی تو مسلمانوں نے اپنے آپ کو بہت کمزور پایا۔ حریف مسلمانوں کی طاقت کو برابر توڑ رہا تھا۔ اور مسلمان اگرچہ محسوس کرتے تھے کہ یہ جو کچھ ہے غلط ہے۔ لیکن اس کے مقابلے کے لئے دلائل کے ہتھیار نہیں رکھتے تھے۔ جواہر لال نہرو نے اس دوران میں جب اُن کے سامنے یہ سوال رکھا کہ ذرا بتایا تو جائے کہ بولے اور پاجامے کے سوا مسلمانوں کی جداگانہ تہذیب کیا ہے۔ تو ایسے سوال کا جواب دینے کے لئے مسلمان چاروں طرف اپنے ذہنی عناصر پر بے بسی کی نظر ڈال کر رہ گئے۔

اس نازک وقت میں احیائے نظامِ اسلامی کی تحریک آگے بڑھی اور متحدہ قومیت کے طوفان کا مقابلہ فکری میدان میں کرنے کے لئے اُس نے زوردار لٹریچر مہیا کر دیا۔ ورنہ اس سے پہلے اور اس سے بعد مُسلم لیگ کی پُوری تحریک کا کبھی کوئی لٹریچر تھا ہی نہیں۔ اِس واقعہ کی مثال بالکل ایسی ہی تھی۔ جیسے ایک فوج محاذ پر جا کر بالکل بے اسلحہ ہو کر رہ گئی ہو اور چاروں طرف سے کسی کمک آنے کے لئے چشم براہ ہو۔ یکایک کوئی طاقت آگے بڑھے۔ اور اسلحہ کے انبار بہم پہنچا دے چنانچہ مولانا مودودی نے تحریکِ پاکستان کو اس موقعہ کے لئے فکری اسلحہ دیا۔ اور اس اسلحہ کی بہم رسانی کے بعد وُہ پھر اپنے دوسرے محاذ پر جا کر خاموش تعمیری و تربیتی کام میں مصروف ہو گئے۔

اس لٹریچر کو جو آج بھی سیاسی کشمکش حصہ اول، دوم اور مسئلہ قومیت وغیرہ کے نام سے ہر جگہ دستیاب ہو سکتا ہے۔ مسلم لیگ کے اکابر نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور بہت بڑی تعداد میں مُفت تقسیم کیا۔ یہاں تک کہ ذہن یکسو ہو گئے۔ اور متحدہ قومیت کا سیلاب مسلمانوں کو بہالے جانے میں ناکام ہو گیا[۱]۔ یہی وُہ زمانہ ہے جس میں مسلم لیگ کی تحریکِ پاکستان نے باقاعدہ جڑیں پکڑی ہیں۔ اور جس میں اس حرکت نے زور دکھانا شروع کیا ہے

جب مسلمان متحدہ قومیت کے خطرے سے نکل گئے۔ تو مولانا مودودی نے سیاسی کشمکش حصہ سوم میں مسلمانوں کی قومی تحریک، اصُولِ تنظیم، نظامِ جماعت، طریقِ کار اور اُن کی لیڈرشپ پر تعمیری تنقید کر کے بتایا کہ دعوتِ اسلامی اور نظامِ اسلامی کی کوششوں کو ملتوی کر کے اس کے لئے محض قالب بنانے کی قوم پرستانہ تحریک کو لے کر چلنے کے نتیجے میں اسلامی نظام کبھی قائم نہ ہو سکے گا۔ لیکن یہاں کون سُنتا تھا۔ اسلامی اصولِ تنظیم، تربیت و اصلاح اور قیادتِ صالحہ کی باتیں اُنہیں اُس وقت غیر ضروری اور قبل از وقت معلوم ہوتی تھیں۔ قوم کا ہر چھوٹا بڑا قومیت کے نشے میں سرشار تھا۔ اور وہ پاکستان کی دُھن میں کسی اور طرف دھیان دینے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتا تھا۔ لہٰذا طوطی کی آواز نقار خانے میں گم ہو کر رہ گئی۔

مارچ ۱۹۴۰ء میں لیگ کے اجلاس لاہور میں پاکستان کی قرارداد منظور ہوئی۔ پاکستان قومی مطالبہ اور قومی جدوجہد کا مرکز قرار پایا۔ مسلمانوں کی اکثریت جداگانہ قومیت کا پرچم اُٹھائے پاکستان کی اَن دیکھی منزل کی طرف بڑھنے لگی۔ ۱۹۴۲ء میں سر سٹیفورڈ کرپس عارضی حکومت کی سکیم لے کر برطانیہ سے ہندوستان آئے۔ لیکن ناکام لوٹے۔ ۱۹۴۶ء میں برطانیہ کا وزارتی مشن کچھ اس قسم سے مختلف قسم کی عارضی حکومت کا پلان لے کر آیا۔ گو لیگ اور کانگرس نے اسے مان تو لیا۔ لیکن آگے چل کر عملی میدان میں یہ سکیم بھی زیادہ دیر تک نہ چلی۔ بالآخر فروری ۱۹۴۷ء میں وزیر اعظم برطانیہ نے ہندوستان کو جون ۱۹۴۸ء تک آزاد کر دینے کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی لارڈ ویول کی جگہ لارڈ موئنٹ بیٹن کو ہندوستان کا وائسرائے بنا دیا گیا۔ اسی وائسرے کے عہد میں تقسیمِ ہند کا عظیم الشان واقعہ عمل میں آیا۔ اور اس طرح اگست ۱۹۴۷ء میں دنیا کے نقشے پر ایک نئی ریاست کا ظہور ہوُا۔ مسلمانوں کی آرزوئیں پوری ہوئیں۔ اُنہیں اپنا کعبۂ مقصود مل گیا۔ اور اقبال کے منصوبہ کا نصف حصّہ تکمیل پا گیا۔ اب

---

[۱] جس شخص کے لٹریچر سے کل مُسلم لیگ کے رہنماؤں نے متحدہ قومیت کے خلاف اتنا کام لیا تھا۔ آج وُہ اُسی پر متحدہ قومیت کی علمبرداری کا الزام لگاتے ہیں اور احسان شناسی کی یہ مثال قائم کرتے ہوئے ذرا نہیں شرماتے [۲] چنانچہ یہی ہوُا کہ مُسلم لیگ کے لیڈر پاکستان بننے کے بعد نظامِ اسلامی کی ہر آواز کے دشمن ہو گئے۔ حالانکہ وہ کہا کرتے تھے کہ پہلے پاکستان بن لینے دو۔ پھر یہی کام ہم کریں گے۔ اور اُس وقت یہ مطالبہ پُورا کریں گے۔

مسلمان اس امر کے لئے آزاد تھے۔ کہ پاکستان کی اس ریاست میں اسلامی تہذیب کے احیاء کی کوشش کریں۔ جس کا اعلان وادّعا وُہ بڑے زور شور سے دُنیا کے سامنے کیا کرتے تھے۔ اَور اُس نظامِ زندگی کو کِسی پس وپیش کے بغیر قائم کرنے کی سعی شروع کر دیں جس کا وعدہ انہوں نے اپنے مسلمان بھائیوں سے بارہا کیا تھا۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوّا۔ بلکہ پاکستان کا قالب ہاتھ آجانے کے بعد قالب گردں کی طرف سے پہلا ہی اعلان یہ ہوّا۔ کہ یہ لادینی ریاست (Secular State) ہوگی۔ گویا اقبال کے اصل مطلوب کی جڑ کاٹ دی گئی۔

قالب بنانے کا نسبتۃً آسان کام جب تکمیل پا چکا۔ تو اس میں اسلام کی رُوح پھونکنے کا کام کرنے والی طاقت —— تحریکِ اسلامی —— سے حالات نے مطالبہ کیا کہ وُہ آگے آجائے۔

بُلبُل کو دیا نالہ تو پروانے کو جلنا   غم ہم کو دیا سب سے جو مشکل نظر آیا

اَور یہ طاقت لبیک کہتی ہوئی آگے بڑھی۔

چاہیئے تو یہ تھا۔ کہ مُسلم لیگ کی تحریک جماعتِ اسلامی کی تحریک سے اول روز ہی سے اسلامی اصولوں پر متعاون ہوتی اور اگر حالات نے یہ صورت پیدا نہ ہونے دی تھی۔ تو کم از کم پاکستان بننے کے بعد مسلم لیگ آگے بڑھ کر جماعتِ اسلامی کا تعاون حاصل کر لیتی۔ لیکن تین وجوہ سے اِس تعاون کے امکانات ختم ہو گئے اَور آہستہ آہستہ تصادم کی کیفیت پیدا ہو گئی۔

ایک یہ کہ مسلم لیگ کے اکابر شروع سے اسلام سے آزاد ہو کر چلے تھے۔ اَور انہوں نے نہ اپنے کردار کو اَور نہ اپنے افکار کو مسلمان بنانے کی کوشش کی۔ بلکہ سرے سے اِس کا ارادہ ہی موجود نہ تھا۔ بنابریں اِن کو تحریکِ اسلامی سے جو اختلاف بھی ہوا۔ وہ بالکل اصولی تھا اَور اس لئے وُہ تعاون میں ایک مستقل روک بنتا گیا۔

دوسرے یہ کہ ان سے جس کسی نے اختلاف کیا تھا (بلا لحاظ اس کے کہ وُہ کتنا ہی مخلصانہ ہو) اقتدار پا کر اُنہوں نے اس سے انتقام لینے کی فکر کی۔ اَور اس کو میدان سے باہر دھکیلنے کے لئے پُورا پُورا زور صرف کیا۔ چنانچہ خدائی خدمت گاروں، اَور جماعت احرار اَور بعض دوسری جماعتوں کو یہ باہر دھکیل دینے میں کامیاب ہو گئے۔ مگر جماعت اسلامی کوئی مفاد پرست گروہ تو تھا نہیں، ایک اُصولی تحریک تھی۔ لہٰذا اسے میدان سے نکالنے کے لئے ان کو بہت زور لگانا پڑا اَور ہر دفعہ زور لگانے پر ان کے اندر جذبۂ انتقام مزید بھڑکتا گیا۔ لیکن ہر بار اِن کو ناکامی ہوئی۔ اَور اب وُہ یہ سمجھ چکے ہیں۔ کہ اس روڑے کو راستے سے ہٹایا نہیں جا سکتا۔ اس احساس نے انتقامی جذبے کو زیادہ گہرا کر دیا ہے۔

تیسرے یہ بھی کہ جب حالات نے پاکستان کے اماموں کے متعلق کھُلی کھُلی شہادت دے دی کہ یہ حضرات اپنے اقتدار کو دوامی بنانے کے سوا اَور کسی مقصد کے لئے مخلص نہیں ہیں اَور یہ تحریکِ اسلامی کو بہرحال گوارا نہیں کر سکتے۔ اَور یہ کہ اسلام کا نام لے لے کر امریکہ و برطانیہ کے زیرِ سایہ ایک نیا ٹرکی ہی بنانے پر تُل گئے ہیں۔ اَور ان کے قول و عمل میں میلوں کے فاصلے ہیں۔ تو جماعتِ اسلامی کو مجبورًا انقلابِ قیادت کا پروگرام سامنے رکھنا پڑا۔ پس جونہی انقلابِ قیادت کی آواز بلند ہوئی۔ امامانِ پاکستان غیظ و غضب سے بھڑک اُٹھے۔

اَور اب اقبال کے تخیلِ پاکستان کا قالب بنانے والوں نے اس قالب کے اندر اقبال کی مطلوبہ روحِ اسلام دوڑانے والوں کے خلاف اپنے سارے ذرائع و وسائل سے جہاد شروع کر رکھا ہے۔ اَور یہ خُدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ کس چیز پہ منتج ہوگا۔!

بہرحال اقبال جِس خطّۂ ارضی کا طالب ہے۔ وُہ بہم پُہنچ چکا۔ لیکن وُہ جِس نئے نظام کا، جِس نئے انسان کا اَور جِس نئے دَورِ تہذیب کا داعی تھا۔ اسکے لئے جماعتِ اسلامی مصروفِ جدوجہد ہے اَور ابھی اقبال کا پیش کردہ نصب العین ادھورا کیا ادھورے سے بھی کم حد تک پورا ہوا ہے۔

کارنامے

مالیاتِ قومی — حسابی جادوگری

صنعت — منصوبے!

اسکیمیں

جمہوریت کا قیام — جعلی انتخابات

شہری آزادی کا تحفظ — سیفٹی ایکٹ

سیکورٹی ایکٹ

بنگال ریگولیشن ایکٹ

فرنٹیئر کرائمز ریگولیشن ایکٹ

حزب اختلاف پر غداری کے الزامات

تعمیرِ معاشرت — مینا بازار دل کا قیام

بلبل چوہدری کا ناچ

ریڈیو سے فلمی گانوں کی اشاعت

ذہنی اصلاح — "یقین، اتحاد، تنظیم" کے نعرے

بین الاقوامی روابط — کامن ویلتھ کی حلقہ بگوشی

سفید بلاک کی وفاداری

ترکی میں زنانہ وفد کی ترسیل

کشمیر — یو، این، او پر محکم ایمان

ظفر اللہ خاں کی آٹھ آٹھ گھنٹے کی تقاریر

لے کے رہیں گے کشمیر کے عزم کا بار بار اظہار

مہاجرین — پہلا مرحلہ: اندھا دھند آبادکاری

دوسرا مرحلہ: اکھیڑ پچھاڑ

تیسرا مرحلہ: عارضی آبادکاری

چوتھا مرحلہ: دوسری اکھیڑ پچھاڑ

پانچواں مرحلہ: عارضی مستقل آبادکاری

چھٹا مرحلہ: ؟

قومی زبان — لاہور، راولپنڈی اور کراچی کے درمیان اردو زبان میں تار قبول کرنے کا فیصلہ

رفاہِ عامہ — افتتاح کاریاں!

اقتصادی تعمیر — امریکی پوائنٹ فور کی امداد کی قبولیت

غذائی بحران — اعلان — "ہم کسی کو بھوکوں نہیں مرنے دیں گے"

مسائل محنت — طفل تسلیاں

اصلاحِ تعلیم — "دینیات" کے چند اوراق کا نصاب میں اضافہ

دستور سازی — "قرار دادِ مقاصد"

شاندار دستوری سفارشات جو ردی کی ٹوکری میں پہنچ گئیں

التوا — التوا — التوا

اسلامی نظام — تقریریں — پرجوش تقریریں — وجد آفریں تقریریں!

ادارہ

قرارداد مقاصد

کے

سائے میں

سنہ ۵۲-۱۹۵۱ء میں

صرف پاکستان کے مرکز — کراچی — میں

دیسی شراب	گیلن	٢٦٦٧١
اسپرٹ	بوتلیں	٢٧٧٨٨

اور

غیر ملکی شراب	بوتلیں	٢٤٣١٤٤
بیئر	″	١٣٦٦٨٩٢

بلوچستان میں

دیسی شراب	گیلن	٥٤٢٥
اسپرٹ	″	٤٥٩٥
غیر ملکی شراب	″	٥٩٠
بیئر	″	٢١٧٣٠

— اُڑائی گئی

غریب ملّا کے اسلام میں یہ مزے کہاں

؟

— ملّا ازم مُردہ باد —

مشرقی پاکستان

مولانا محمد عبد الرحیم

اللہ کی مشیت سے مسلم عوام کا مطالبہ تخلیق پاکستان کی شکل میں جب پورا ہوا تو ہمارے انگریز آقاؤں نے مجبور ہو کر اقتدار حاکمیت ہمیں سونپ دیا۔ مسلم عوام کی تسلیم شدہ جماعت ہونے کی حیثیت سے اقتدار مسلم لیگ کو سونپا گیا۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو لیگ کے رئیس اعلیٰ کی حیثیت سے قائد اعظم محمد علی جناح مرحوم نے اقتدار خود سنبھالا، اپنی پسند اور بھروسے کے لوگوں کو چن کر مرکزی کابینہ بنائی اور جب تک زندہ رہے اپنی خاص نگرانی اور ہدایت کے مطابق مرکزی کابینہ کو چلاتے رہے۔ انگریز آقاؤں نے ۱۹۳۵ء کے قانون حکومت ہند میں ترمیم کر کے ۱۹۴۷ء کے قانون آزادی ہند کے ماتحت طاقت اور حکومت سونپی تھی۔ اس قانون کی رو سے مرکز کے ماتحت مگر مرکز ہی کی طرح صوبوں میں بھی حکومتیں بنیں۔ چنانچہ پنجاب، سرحد، سندھ اور مشرقی پاکستان کے صوبوں میں بھی مقامی لیگی لیڈروں نے اپنی اپنی وزارتیں بنائیں، آج اگست ۱۹۵۲ء ہے۔ پانچ سال کی اس مدت میں مرکز اور صوبے دونوں میں اقتدار اسی طرح مسلم لیگ کے ہاتھوں میں چلا آ رہا ہے۔

طاقت اور حکومت مسلم لیگ کے قبضے میں آئی تو لیگی رہنماؤں کو اقتدار پر اپنا قبضہ جمانے کی ہوس ہوئی اور یہ خیال ان کے دلوں میں چٹکیاں لینے لگا۔ اس کے لئے لیگ کی اپنی صفوں میں اقتدار حاصل کرنے کے لئے جوڑ توڑ اور رسہ کشی شروع ہوئی اور اب تک جاری ہے۔ یہ کشمکش کم و بیش اقتدار کے دونوں گہوارے ——— مرکز اور صوبوں میں ہوئی، ان دونوں میدانوں میں اقتدار کی جنگ لڑی گئی اور اب تک لڑی جا رہی ہے۔ ان دونوں میدانوں میں مشرقی پاکستان کے زعما مملکت پاکستان کے کسی دوسرے صوبے کے لیگی رہنماؤں سے پیچھے نہیں کہے جا سکتے۔ ذیل کی سطروں میں مشرقی پاکستان کے تعلق سے اقتدار کی اس جنگ کا سرسری جائزہ لیا جاتا ہے۔

مرکز میں محمد علی جناح مرحوم جیسی مقتدر اور بارعب ہستی کی موجودگی اور مسلم لیگ میں صف اول کے لیڈروں کے فقدان کے باعث مرکزی اقتدار کے لئے رسہ کشی بہت دشوار کام تھا اور اس کشمکش میں کامیابی کا امکان بہت کم ہونے کے باعث اس کا خیال محال سمجھا جاتا تھا، اسی لئے لیگ کے اندرونی حلقے سے کوئی لیڈر اپنے قائد اعظم کا حریف بننے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا، یہی سبب ہے کہ مشرقی پاکستان سے اس میدان میں تگ و دو کرنے والے وہ لوگ نظر آتے ہیں۔ جن کا شمار پہلے لیگ کے قائدین میں تھا مگر اب وہ لیگ کی صف سے باہر ہیں۔

پاکستان بننے کے بعد ہی مرکزی اقتدار پر قبضہ جمانے کے لئے میدان تیار کرنے کا خیال مشرقی پاکستان کے پرانے لیگی لیڈر جناب ابو القاسم فضل الحق صاحب کو ہوا یہ وہی فضل الحق صاحب ہیں جنہوں نے تخلیق پاکستان سے چند سال پہلے لیگ کے نعروں کو بہت ہی بلند آواز میں پکارنے اور لیگ کے پلیٹ فارم سے ہندو لیڈروں کو زور زور سے للکارنے کے انعام میں شیر بنگال کا باعزت خطاب پایا تھا، ایک عرصہ تک غیر منقسم بنگال کے وزیر اعظم بھی رہ چکے تھے اور مسلم لیگ کے اندر اور خاص طور

پر صوبہ بنگال میں طاقت و اقتدار، اثر و رسوخ کے اس بلند مینار پر پہنچ چکے تھے جہاں سے اِن کے دل میں لیگ کے اقتدارِ اعلےٰ پر خود قابض ہو جانے کی تمنا کا غلبہ ہوا تھا اور اپنی اس آرزو سے مغلوب ہو کر انہوں نے لیگ کے اندر رہ کر اپنے قائدِ اعظم محمد علی جناح مرحوم کے اقتدار اعلےٰ کو چیلنج دے دیا تھا، مگر اس جرأت پر اِن کو لیگ کے باغی کی حیثیت دے دی گئی، اس کے بعد ہی مسلم لیگ کی سمت سے ہوا کے تند و تیز جھونکے چلے جن سے فضل الحق صاحب کے اقتدار کی کشتی ڈگمگانے لگی۔ اس وقت فضل الحق صاحب کی طرفہ تماشا طبیعت نے ایک نئی راہ نجات دکھائی۔ اقتدار اور اپنی وزارت عظمیٰ بچانے کی بوکھلاہٹ میں انہوں نے مسلم دشمن ہندو لیڈر، ڈاکٹر شیاما مکھرجی سے گٹھ جوڑ کر لیا۔ اس اقدام کے باعث اقتدار بھی ان کے ہاتھوں میں نہ رہ سکا اور وہ مسلم عوام کی نگاہ میں اپنی عزت و وقعت اور اپنا اعتبار بھی کھو بیٹھے۔ مختصر یہ کہ یہ وہی فضل الحق صاحب ہیں جنہوں نے اپنے قائدِ اعظم مرحوم سے تخلیق پاکستان کے پہلے بھی ایک ٹکر لی تھی اور فاش شکست کھائی تھی۔ لیکن ان کو شیرِ بنگال کا خطاب مل چکا تھا اور شیر کی ایک خاصیت یہ ہے کہ وہ کبھی ہار نہیں مانتا۔ سابق شیر بنگال جناب فضل الحق صاحب نے بھی اقتدار کی جنگ میں دل سے ہار نہ مانی تھی۔ مجبوراً چپ بیٹھ گئے تھے۔ مناسب وقت آنے پر پھر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ مشرقی پاکستان کا پس ماندہ علاقہ، اس سر زمین کے مسلمانوں کی المناک حد تک اقتصادی بدحالی اور درماندگی، علم و ہنر تجارت اور صنعت و حرفت سے محرومی، بنگلہ زبان سے جذباتی لگاؤ اور مملکت پاکستان کے دوسرے صوبوں کی مجموعی آبادی کے مقابلے میں اکیلے مشرقی پاکستان کی آبادی کا تقریباً برابر ہونا اور مرکز سے مشرقی پاکستان کی دوری اور افتادگی وغیرہ ایسے ہمت افزا اسباب تھے جنہوں نے بوڑھے مگر بلند حوصلہ فضل الحق صاحب کو ابھار کر اقتدار کی جنگ کے لئے میدان میں لا کھڑا کیا۔ فضل الحق صاحب گوشہ تنہائی سے نکلے، مزدوروں کے جلسوں میں شریک ہوئے، جوشیلی تقریریں کیں اور اپنے اندر مزدوروں کے درد دکھ کے احساس کی شدت کا اظہار اپنے زورِ بیان کے ساتھ ساتھ اپنے عمل سے یوں کیا کہ ایک بھرے جلسے میں اسٹیج پر کھڑے ہوئے اور اپنی قیمتی شیروانی کا اپنے ہاتھوں سے یہ کہہ کر چاک کر دیا کہ وہ اپنے مزدور بھائیوں کو پھٹے پرانے کپڑے میں دیکھ کر اپنے جسم پر قیمتی شیروانی کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتے۔ پھر کیا تھا فضل الحق زندہ باد کے نعروں سے پورا مشرقی پاکستان گونج اٹھا۔ پرانے داغ دھبے سب دھل گئے اور بطور کفارہ صرف ایک شیروانی کی قربانی دے کر فضل الحق صاحب ایک بار پھر مشرقی پاکستانیوں کے ہر دلعزیز لیڈر بن گئے۔

تخلیق پاکستان کے بعد سرکاری زبان کا مسئلہ چھڑا تو محمد علی جناح مرحوم نے اعلان کیا کہ مملکت پاکستان کی سرکاری زبان اُردو ہو سکتی ہے اور اُردو ہی ہوگی۔ فضل الحق صاحب نے جناح مرحوم کے اِس اعلان کو چیلنج کیا اور یہ نعرہ بلند کر کے اٹھ کھڑے ہوئے کہ وہ بنگلہ کو مملکت پاکستان کی سرکاری زبان بنائیں گے۔ یہ نعرہ بر وقت لگایا گیا تھا۔ فضل الحق صاحب کے طوفانی دوران اور جذباتی تقریروں سے ایک جم غفیر ان کے گرد جمع ہو گئی، مشرقی پاکستان کے کاشتکاروں، مزدوروں، طالب علموں اور روزگار خواہوں کا ایک سیلاب اُمنڈ آیا جس کے مقابلے میں اس وقت کے وزیر اعلےٰ مشرقی پاکستان خواجہ ناظم الدین صاحب اور اس صوبہ کے دوسرے مقامی لیڈر معذور اور بے بس ہو گئے۔ چنانچہ اس سیلاب کو روکنے کے لئے محمد علی جناح مرحوم کو بذاتِ خود مشرقی پاکستان تشریف لانا پڑا۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح مرحوم مملکت پاکستان کے گورنر جنرل، پاکستان مسلم لیگ کے صدر اعظم اور ریاست پاکستان کے اقتدار اعلےٰ کی حیثیت سے ڈھاکہ تشریف لائے۔ اِن کے پاس پروپیگنڈے اور سیاسی داؤ پیچ کا جواب پروپیگنڈے اور سیاسی داؤ پیچ سے دینے کے لئے وقت بہت کم تھا۔ اس لئے انہوں نے فضل الحق صاحب کو ملاقات اور بات چیت کے لئے بُلایا اور صاف لفظوں میں ان کے گوش گذار کر دیا کہ فضل الحق صاحب کو یہ حقیقت نہ بھولنی چاہئے کہ اب وہ اس جناح کا مقابلہ کرنے

کے لئے کھڑے ہوئے ہیں جو نہ صرف سیاسی جدو جہد کرنے والی عوام کی ایک نمائندہ جماعت کا صدر ہے بلکہ اب وہ ایک مقتدر خود مختار حاکم اور رئیس ریاست مملکت پاکستان اور اقتدار اعلیٰ بھی ہے اور پہلے کی طرح ان کو جماعت سے منحرف قرار دے کر اس سیاسی جماعت سے نہ صرف نکالا جا سکتا ہے بلکہ اب پوزیشن یہ ہے کہ ریاست کا باغی قرار دے کر ان کو پھانسی کے تختے پر بھی لٹکایا جا سکتا ہے۔ فضل الحق صاحب خوب جانتے تھے کہ جناح مرحوم کسی کو صرف دھمکانے کے لئے کچھ نہیں کہا کرتے بلکہ جو کچھ کہتے تھے وہی کرتے بھی تھے ان کا کلیجہ دہل گیا اور پھر وہ گوشۂ عافیت میں چپ سادھ کر بیٹھ گئے۔ اس کے ساتھ ہی بنگالی مخالفت بھی ختم ہو گیا اس واقعہ کے دوسرے ہی دن جب محمد علی جناح مرحوم نے ڈھاکہ ریس کورس میدان کے اجتماع عظیم میں مشرقی پاکستان کے باشندوں کو مخاطب کرکے واضح اور غیر مبہم الفاظ میں کہا کہ اُردُو ہی مملکت پاکستان کی سرکاری اور قومی زبان ہوگی تو مخالفت ایسی کافور ہوئی کہ اس کے خلاف ایک آواز بھی نہ سنی گئی۔

محمد علی جناح مرحوم کی وفات کے بعد اقتدار لیاقت علی خاں مرحوم کے ہاتھوں میں آیا تو انہوں بھی ڈھاکہ آکر مسلم لیگ کے اقتدار کی مخالفت کو طاقت سے کچل دینے کا صاف صاف اعلان کر دیا۔ اس لئے فضل الحق صاحب نے خاموش بیٹھے رہنے ہی میں سلامتی دیکھی۔ اب لیاقت علی مرحوم کی موت کے بعد فضل الحق صاحب پھر ہاتھ پاؤں نکال رہے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں ۱۹۵۴ء کے شروع میں نئے انتخابات کئے جانے کا اعلان ہو چکا ہے۔ اقتدار کی جنگ لڑنے کی تمنا بنگال کے اس بوڑھے شیر کے دل میں پھر گدگدانے لگی ہے، وہ اپنی کامیابی کے منصوبے سوچ رہے ہیں، مشرقی پاکستان کے ایڈووکیٹ جنرل کا سرکاری عہدہ قبول کرنے کے بعد اور اس بلند مرتبت اور ذمہ دار عہدے پر فائز رہتے ہوئے بھی حال ہی میں انہوں نے کئی پبلک جلسوں میں تقریریں کیں اور لوگوں کو بتایا کہ وہ عنقریب میدان سیاست میں پھر اترنے والے ہیں۔ دیکھئے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے!

فضل الحق صاحب کے خاموش بیٹھ جانے پر بھی لیاقت علی خاں مرحوم کو مرکزی اقتدار کی جنگ کے لئے میدان میں ایک نیا حریف نظر آیا۔ مسلم لیگ کے پرانے زعیم ملت اور شہید ملت بنگال میں قائد اعظم کے لفٹیننٹ جناب حسین شہید سہروردی پرانی مسلم لیگ سے ناطہ توڑ کر اور ایک نئی آل پاکستان مرکزی سیاسی جماعت عوامی مسلم لیگ کے داعی کی حیثیت سے مرکزی اقتدار پر قبضہ جمانے کی غرض کے ماتحت اقتدار کی جنگ کے لئے میدان میں اترے ہوئے تھے۔ یہ حسین شہید سہروردی مدناپور بنگال کے ایک سربر آوردہ، ذی علم، ذی اثر، خوشحال خاندان کے چشم و چراغ، لندن گھومے ہوئے، چالاک اور طرار بیرسٹر، کلکتہ کی میلس یونین اور کئی دوسری مزدور یونینوں کی لیڈری کا تجربہ حاصل کئے ہوئے، زمانہ سازی اور زمانہ ستیزی دونوں طریقوں کے ماہر ۱۹۳۵ء میں غیر منقسم بنگال کی پہلی فضل الحق کابینہ کے وزیر مزدور پھر غیر منقسم بنگال کی ناظم الدین کابینہ کے کئی کئی محکموں کے تنہا وزیر اور اس کے بعد سیاسی داؤ پیچ کی مہارت سے کام لے کر غیر منقسم بنگال کے وزیر اعظم اور بنگال لیگ حلقہ کے تنہا اقتدار اعلیٰ بن چکے تھے جو قیام پاکستان کے قبل یعنی اگست ۱۹۴۷ء تک اس بلندی پر برقرار تھے۔ وہ سیاسی زور آزمائی کے اکھاڑے میں فضل الحق اور خواجہ ناظم الدین جیسے دو زبردست حریفوں کو پچھاڑ چکے تھے۔ جب فضل الحق صاحب نے محمد علی جناح مرحوم سے ٹکر لی تو حسین شہید سہروردی ہی کے سیاسی جوڑ توڑ نے ان کو ان کے اپنے گھر بنگال ہی میں بے بس اور بے اثر بنا کر چھوڑ دیا۔ فضل الحق صاحب تو قائد اعظم مرحوم اور سرکاری مسلم لیگ کے معتوب تھے۔ اس لئے ان کو پچھاڑ دینا بڑا کمال نہ تھا۔ مگر شہید صاحب تو محمد علی جناح مرحوم کے منظور نظر اور مرکزی مسلم لیگ کے اعلیٰ حلقوں میں ہر دلعزیز خواجہ ناظم الدین صاحب کو بھی غیر منقسم بنگال کی وزارت عظمیٰ اور بنگال مسلم لیگ کی لیڈری سے برطرف کرکے خود اقتدار کی مسند پر متمکن ہو گئے تھے اور خواجہ صاحب کو اس بات پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ مسلم لیگ میں تنہا

چاہیں تو اس کی مرکزی مجلس عاملہ کے ایک بے اقتدار رکن کی حیثیت سے رہیں۔ یہ کارنامہ ایسا تھا جو مسلم لیگ کے حلقوں میں سیاسی داؤپیچ، جوڑ توڑ اور کاٹ چھانٹ کے فن میں حسین شہید سہروردی کو مسلم الثبوت ماہر تسلیم کرا چکا تھا۔ لیاقت علی مرحوم کو ایسے جگردار حریف سے مقابلہ درپیش تھا۔ حسین شہید سہروردی کے مقلدوں اور ان کی سیاسی صلاحیتوں کے معترف لوگوں کی بڑی اکثریت مشرقی پاکستان ہی میں ہے۔ اس لئے دوسرے صوبوں کے مقابلے میں عوامی مسلم لیگ نے مشرقی پاکستان میں زیادہ مقبولیت حاصل کرلی۔ اس کا زور دیکھ کر لیاقت علی خاں مرحوم مشرقی پاکستان تشریف لائے اور ڈھاکہ پرانا پلٹن میدان کے عظیم اجتماع عام میں بڑے جوش و خروش سے اعلان کر دیا کہ وہ مسلم لیگ کی مخالفت کو طاقت سے کچل دیں گے۔ لیاقت علی مرحوم کے قول پر عمل بھی کیا گیا۔ مشرقی پاکستان میں عوامی مسلم لیگ کا زور توڑنے کے لئے مشرقی پاکستان میں حسین شہید سہروردی کے داخلے اور اس کے بعد سیاسی دورے اور تقریر کرنے پر پابندی لگائی گئی۔ مشرقی پاکستان عوامی مسلم لیگ کے صدر مولانا عبدالحمید بھاشانی صاحب اور اس کے ادارے کے دوسرے ضلعی لیڈروں کو مختلف بہانوں سے جیلوں میں بند کیا گیا اور وہ سب کچھ کیا گیا جو مخالفت کو طاقت سے کچلنے کے لئے برسراقتدار پارٹی کرسکتی ہے۔ ان سب کے باوجود مشرقی پاکستان کے سرکاری مسلم لیگی حلقوں میں یقین کی حد تک اس امر کا احساس پہلے بھی تھا اور اب بھی اسی طرح باقی اور موجود ہے کہ اگر شہید سہروردی کو دورے اور تقریر اور عوام تک بے روک ٹوک پہنچنے کی مہلت دے دی جائے تو وہ اپنی عوامی مسلم لیگ ہی کے ذریعہ مشرقی پاکستان سرکاری مسلم لیگ کو زک دینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ڈھاکہ ارمنی ٹولہ میدان میں حسین شہید سہروردی کے نام پر عوامی مسلم لیگ کی طرف سے بلائے ہوئے جلسۂ عام میں سرکاری مسلم لیگ کی طرف سے لیاقت علی مرحوم کے لئے ڈھاکہ پرانا پلٹن میدان میں بلائے ہوئے جلسۂ عام سے زیادہ ہجوم جمع ہوا تھا۔ لوگوں نے زیادہ شوق اور انہماک سے شہید سہروردی صاحب کی تقریر سنی تھی اور اس کا زیادہ اثر لیا تھا۔ اسی لئے پابندی اٹھائے جانے کے بعد شہید سہروردی سیاسی دورے پر پھر مشرقی پاکستان تشریف لائے تو مشرقی پاکستان سرکاری لیگ بوکھلا گئی۔ اس کی طرف سے صوبائی مسلم لیگ کے جوائنٹ سیکرٹری شاہ عزیز الرحمٰن صاحب وغیرہم نے ایک انوکھی ترکیب سے ڈھاکہ میں شہید صاحب کے جلسوں پر پھر پابندی لگوادی۔ یہ انوکھی ترکیب قابل ذکر اور دلچسپ ہے۔ ہوا یہ کہ شہید صاحب بذریعہ طیارہ کراچی سے ڈھاکہ پہنچنے والے تھے اور یہاں کی عوامی مسلم لیگ کی طرف سے تیج گاؤں کے ہوائی اڈے پر ان کے شاندار استقبال اور ڈھاکہ ارمنی ٹولہ میدان میں جلسۂ عام کا بندوبست کیا گیا تھا۔ صوبائی مسلم لیگ کے جوائنٹ سیکرٹری شاہ عزیز الرحمان اور ان کے چند دوسرے ساتھیوں نے بیڑا اٹھایا کہ وہ اس مرتبہ شہید صاحب کو ڈھاکہ میں عوام کے سامنے ہونے ہی نہ دیں گے۔ اس مقصد کیلئے وہی ہتھکنڈے استعمال کئے گئے جو کسی زمانہ میں خود شہید صاحب کے فداکار استعمال کیا کرتے تھے۔ ڈھاکہ شہر کے محلہ سرداروں کی مدد سے "کام کے آدمی" چنے گئے۔ ڈھاکہ موٹر ٹرانسپورٹ ایسوسی ایشن کو جو ان ہی لوگوں کی کوشش سے قائم ہے اور جس کا دفتر ڈھاکہ سٹی مسلم لیگ کے صدر نواب بہادر ڈھاکہ کی کوٹھی کے اندر ہے، حکم دیا گیا کہ اس کے سب ممبر اپنی اپنی لاریوں کے ساتھ صبح سویرے صدر گھاٹ میں جمع ہو جائیں، صدر گھاٹ ہاکرس ایسوسی ایشن کو جو نواب صاحب اور شاہ عزیز الرحمٰن صاحب وغیرہم کے طفیل قائم ہوگیا ہے، حکم دیا گیا کہ صبح نور کے تڑکے ہاکرس ایسوسی ایشن کے سب ممبر صدر گھاٹ پر جمع ہو جائیں۔ صبح ہوئی لاری والے سب موجود تھے، اس لئے کہ مسلم لیگ کے کرتا دھرتا ناراض ہوں گے تو روڈ پرمٹ پر آفت آسکتی تھی، صدر گھاٹ کے سب مہاجر ہاکر موجود تھے اس لئے کہ شام کے وقت صدر گھاٹ کے فٹ پاتھ پر بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر وہ جو کچھ روزگار کر لیتے ہیں اس کے بند کر دئے جانے کا احتمال تھا۔ سب لاریوں میں بٹھائے گئے۔ ایک پُر اثر جوشیلی تقریر کے ذریعہ ان سب کو ان کے کام سمجھا دئے گئے، لاریاں دوڑنے لگیں۔ ڈھاکہ کی چھوٹی بڑی شاہراہوں پر "سہروردی مردہ باد، سہروردی واپس جاؤ" وغیرہ نعرے گونجنے لگے

پھر یہ سب دستے وقت مقررہ پر شاہ عزیز الرحمٰن صاحب جوائنٹ سیکرٹری مسلم لیگ کی سرکردگی میں ہوائی اڈے پر پہنچے اور وہاں ایسی اودھم مچی کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ صاحب نے نقص امن کا احتمال ظاہر کر کے تیج گاؤں ہوائی اڈے کے اردگرد اور ڈھاکہ شہر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دیا۔ جلسے جلوس پر پابندی لگ گئی، اس طرح ہوائی اڈے پر نہ تو شہید سہروردی کا پبلک استقبال ہو سکا اور نہ ارمنی ٹولہ میدان میں عوامی مسلم لیگ کا بلایا ہوا جلسہ ہی ہو پایا۔ مسلم لیگ کے فراہم کردہ فداکاروں کی ٹولی دفعہ ۱۴۴ نافذ کرنے کے بعد تیج گاؤں ہوائی اڈے سے واپس ہوئی۔ ارمنی ٹولہ میدان میں عوامی مسلم لیگ کے پنڈال کو توڑ پھوڑ دیا اور جلسہ گاہ کی صورت بگاڑ کر رکھ دی۔ اس پر بھی کچھ لوگ شہید سہروردی کی تقریر سننے جلسہ گاہ میں ٹھہرے ہی رہے۔ چنانچہ مسٹر شہید سہروردی کو جلسہ گاہ کے پاس آکر لوگوں کو کہنا پڑا کہ مسلم لیگی حکومت نے تقریر کرنے سے ان کو روک دیا ہے۔ اس طرح شہید سہروردی عوام کو مخاطب تو نہ کر سکے لیکن ڈھاکہ میں عوام الناس کے سنجیدہ طبقہ نے صوبائی مسلم لیگ اور صوبائی مسلم لیگی حکومت کے متعلق یہ رائے قائم کر لی اور یہ سمجھ لیا کہ وہ اب اس قابل بھی نہیں رہی کہ کسی سنجیدہ نکتہ چینی کو خود سن سکے یا عوام کو اس کے سننے کا موقع دے اور پھر اس کا سنجیدہ اور منہ توڑ جواب دے سکے۔ مسلم عوام کی نمائندگی کی دعویدار جماعت مسلم لیگ کے متعلق ایسی رائے کا قائم ہونا اس جماعت کے بودے پن اور زوال کی بیّن علامت ہے۔ ڈھاکہ کی پابندی کے بعد شہید سہروردی نے مشرقی پاکستان کے کئی دوسرے مقامات کا محدود دورہ کیا اور کئی جگہ تقریریں کیں۔ ان محدود دوروں اور تقریروں کا بھی اتنا اثر ہوا کہ جلد ہی آل پاکستان مسلم لیگ کے صدر اور پاکستان کے موجودہ وزیر اعظم الحاج خواجہ ناظم الدین صاحب کو بذات خود ڈھاکہ تشریف لانا پڑا۔ خواجہ صاحب نے ڈھاکہ پرانا پلٹن میدان میں معرکۃ آلارا تقریر کی اور شہید سہروردی کا کچا چٹھا کھول کر بیان کر دیا۔ اپنی اسی تقریر میں خواجہ صاحب نے مذاح کے انداز میں شہید سہروردی کی ایک نکتہ چینی کا جواب دیتے ہوئے اردو کو مملکت پاکستان کا قومی اور سرکاری زبان بنانے سے متعلق اپنے مرحوم قائد اعظم کا پرانا قول بھی دہرایا۔ یہ ایک بالکل غیر ضروری، بے محل اور غیر متعلق بات تھی۔ ظاہر ہے ایک قول یا ایک اشد ضروری مسئلہ پر عمل کرنے کے بجائے اسے صرف زبان سے بار بار دہرایا جائے اور وہ بھی ان لوگوں کے سامنے جن کو اس میں اعتراض یا کلام ہو تو ایسے فعل کا ضد اور چڑھ کی صورت میں ردعمل ہونا لازمی امر ہے۔ خواجہ صاحب کے اس فعل کا ردعمل بھی وہی ہوا۔ ان کی معرکۃ الآرا تقریر کا یہ فقرہ ایک خوفناک حربہ بن گیا۔ مسلم لیگ کے مخالفین اور پاکستان کے بدخواہ سبھوں نے اس حربہ کو استعمال کیا جس سے ایسی اودھم مچی کہ جناب نورالدین صاحب اور ان کی کابینہ کے حواس باختہ ہو گئے اور اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس موقع پر عملاً ایک ہفتہ تک مشرقی پاکستان میں مسلم لیگی حکومت کی چولیں ڈھیلی رہیں۔ ان ایام میں ڈھاکہ شہر میں اور اسی طرح مشرقی پاکستان کے تقریباً تمام دوسرے شہروں میں سرکاری مسلم لیگ کا کوئی صوبائی یا مقامی لیڈر سڑکوں پر یا موٹروں میں چلتا پھرتا نہیں دیکھا گیا اور دو ایک نے کہیں ایسی جرأت بھی کی۔ تو اس کی بڑی درگت ہوئی ڈھاکہ شہر کے قلب میں اصفہانیوں کا جوبلی پریس محض اس قصور میں جلا کر خاک کر دیا گیا کہ اس میں مشرقی پاکستان کا مقبول مسلم لیگی آرگن انگریزی روزنامہ مورننگ نیوز جو قوم کی آواز کہلاتا ہے، چھپتا تھا۔ مورننگ نیوز دوسرے پریس میں چھپنے لگا تو ڈھاکہ شہر میں جہاں صوبائی حکومت کی ساری طاقت اکٹھا تھی، ہاکروں کو اس اخبار کو کھلے بندوں پبلک میں فروخت کرنے کی ہمت نہ ہوسکی اور جس کسی نے اس کی ہمت کی اس کے ہاتھوں سے اخبار کے بنڈل چھین کر دیں کسی چوراہے پر جلا دیئے گئے۔ اس بے ہنگم ہنگامے میں پاکستان کے دشمنوں کا بھی ہاتھ ہو سکتا ہے لیکن اس امر سے انکار کرنا حقیقت کو جھٹلانا ہے کہ یہ ہنگامہ سرکاری مسلم لیگ اور مسلم لیگی حکومت کے ساتھ مشرقی پاکستان کے سادہ لوح عوام کی دلی بیزاری کی کارفرمائی کا نتیجہ ہے۔ عوام کی بیزاری کا سبب ظاہر

ہے۔ لیگ کے مسلسل دورِ حکومت کے پانچ سالوں کی طویل مدت میں قول اور صرف قول کے سوا عمل کہیں دکھائی نہیں پڑتا ان پانچ سالوں کے دوران میں لیگی سرکار قومی فلاح و ترقی کے میدان میں بڑے بڑے منصوبوں پر غور و خوض کی منزل سے آگے قدم نہیں بڑھا سکی' انگریز آقاؤں نے جنہیں اکثر اہم معاملات میں غور و خوض کے لئے بڑی طویل مدت درکار ہوا کرتی ہے' آزادئ ہند جیسے مشکل اور پیچیدہ معاملے کے لئے چند مہینوں کے اندر قانون مرتب کرکے اسے برطانوی پارلیمنٹ میں پاس کرالیا اور اس کی رو سے برعظیم ہند کو دو حصوں میں تقسیم کرکے اور ان دونوں حصوں کو علیحدہ علیحدہ اقتدار سونپ کے اتنا بڑا کارنامہ انجام دیدیا جو قوموں کی تاریخ کے اوراق میں حیرت کی نظر سے دیکھا جاتا رہے گا لیکن مسلم لیگی آقاؤں سے پورے پانچ سال گذر جانے پر بھی آج تک مملکت پاکستان کا دستور مرتب نہ ہوسکا۔ آزادی اور خود مختاری ملی۔ لیکن جن ہاتھوں کو اقتدار بخشی گئی ان سے کاشتکاروں کے لئے کاشتکاری کے کام میں کوئی نئی سہولت بہم نہیں پہنچی' برسر روزگار مگر کم اجرت مزدوروں کے لئے گذر اوقات کی حالت میں کوئی بہتری پیدا نہیں ہوئی۔ بے روزگاروں کے لئے نئے روزگار کا سامان نہیں ہوا۔ جنگِ تخلیقِ پاکستان کے کم مقدست اُجڑے لٹے اور برباد شدہ مہاجرین کی امداد پر کروڑوں روپے کا خرچ بتایا گیا لیکن مہاجرین کی اکثریت غیر آباد بے خانماں' بے روزگار اور بے سہارا ماری ماری پھرتی نظر آرہی ہے۔ عوام الناس کی ضروریات زندگی زمانہ جنگ سے بھی زیادہ کم یاب اور مہنگی ہوتی چلی جارہی ہیں۔ غلہ کی قلت اور اس کے باعث گرانی کی شکایت جوں کی توں موجود ہے۔ نئی صنعت و حرفت' نئی تجارت اور نیا کاروبار جن سے روزگار کی نئی راہیں نکل سکیں' قائم ہوتے دکھائی نہیں پڑتے۔ تعلیم و تربیت کا وہی پرانا طریقہ رائج ہے۔ جو انگریز آقاؤں کے دورِ حکمرانی میں رائج تھا اور جسے انگریز آقاؤں کی ضرورت پوری کرنے کے اصول کے ماتحت رواج دیا گیا تھا۔ گویا کہ تعلیم و تربیت کے معاملے میں یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ ہماری ضرورت بھی وہی ہے جو انگریز آقاؤں کی ضرورت تھی۔ حالانکہ یہ تعلیم نہ تو ہمیں دنیا کے لئے تیار کرتی ہے اور نہ ہی دین کے کام کا بناتی ہے۔ دین سے بڑھتی ہوئی بے تعلقی اور عورتوں کی بے شرمی اور بے پردگی' جائے رہائش کی قلت' صفائی' علاج معالجہ اور رفاہ عام کے کاموں کی ابتری اور بد حالی سے مشرقی پاکستان کے عوام کے دل رو رہے ہیں زبوں حالی کے ضمن میں مثال کے طور پر ڈھاکہ شہر کی حالت کا ذکر کیا جاسکتا ہے مشرقی پاکستان ایک پس ماندہ علاقہ ہے اس اس صوبے میں شہر بہت ہی کم ہیں۔ ڈھاکہ یہاں کے شہروں کی ناک اور اس صوبے کا صدر مقام ہے اسکی زبوں حالی سے اس صوبے کے دوسرے شہروں کی زبوں حالی اور دوسرے معاملات کی ابتری کا اندازہ کیا جاسکتا ہے صوبے کے گورنر وزراء' اعلیٰ عہدے دار اور حکام کی جائے رہائش اور سرکاری دفاتر ڈھاکہ کے ایک خاص حصے میں ہیں جو رمنا کہلاتا ہے یہ حصہ چمن زار بنا ہوا ہے ایسے چمن زار رکھنے کا بندوبست بھی خاص ہے اس خاص سرکاری علاقہ کا ذکر نہیں عوام کے شہر ڈھاکہ کا ذکر ہے۔ اس شہر میں ایک الیکٹرک سپلائی کمپنی ہے جس سے کسی نئی مشین کے لئے بجلی کی طاقت کا نیا کنکشن حاصل کرنا ناممکن ہے۔ کسی مکان یا دکان میں بجلی کا کوئی نیا کنکشن نہیں لگایا جاسکتا۔ جن مکانوں اور دکانوں میں بجلی کا کنکشن پہلے سے موجود ہے ان کو حسب ضرورت بجلی کی سپلائی نہیں ملتی۔ سڑکوں پر بجلی کے کھمبے نصب ہیں۔ لیکن ان میں بجلی کے قمقمے بہت کم جلتے ہیں۔ اس لئے عام طور پر سڑکوں پر اکثر اندھیرا رہتا ہے' ڈھاکہ شہر کے سب سے زیادہ بارونق بازار نواب پور اور اسلام پور ہیں' شام سے لے کر دس گیارہ بجے رات تک جب عام طور پر دکانیں کھلی رہتی ہیں' ان میں بجلی روزانہ بیسیوں بار جلتی اور بیسیوں بار بجھتی ہے' گویا ہر شام اور ہر رات کو بجلی کمپنی آنکھ مچولی کا کھیل کھیلتی ہے۔ بجلی بتی والے ہر مکان اور دکان میں بجلی کے ساتھ ساتھ موم بتی کے بنڈل' ڈے لائٹ یا لالٹین کا بھی ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ ان سے روزانہ کام لینے کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ یہ صورت اگست ۱۹۴۷ء سے آج اگست ۱۹۵۲ء تک مسلسل قائم ہے۔ شکائتیں اور نکتہ چینیاں ہوتی ہیں۔ لیکن شنوائی نہیں ہوتی۔ اس شہر کے اندر بوڑھی گنگا نام کا دریا بہتا ہے' اس پر بھی پینے کے پانی کی بڑی قلت ہے۔ اور قلت

یوں ہے کہ نلوں کی کمی ہے، پینے کے پانی کو فلٹر کرنے کے لئے مشین کی کمی ہے اور مشین کو چلانے کے لئے بجلی کی طاقت کی کمی ہے اور یہ کمی اگست ۱۹۴۷ء سے آج ۱۹۵۲ء تک جوں کی توں برقرار ہے۔ ڈھاکہ کی اکثر و بیشتر سڑکوں کا یہ حال ہے کہ ان میں ایک ایک گز کے فاصلے کے اندر کئی کئی انچوں سے لے کر کئی کئی فیٹ تک کی گہری چھوٹی بڑی کئی کئی خندقیں ملتی ہیں، ان خندقوں کے اتار چڑھاؤ میں رکشا اور موٹر بسوں میں سفر کرنے والوں کا جسم چور چور ہو جاتا ہے۔ ان خندقوں کے جھنجھوڑ کی شدت کی یہ کیفیت ہے کہ رکشا پر چلنے والی حاملہ عورتوں کے حمل تک گر جاتے ہیں۔ خدا کی پناہ! موٹر گاڑیوں کی آمد و رفت سے گرمیوں میں ان سڑکوں پر گرد و غبار کے بگولے اڑتے رہتے ہیں اور میل آدھ میل پیدل چلنے والے مسافروں کے پیٹ میں چھٹانک، آدھ چھٹانک گرد و غبار منہ اور ناک کے راستوں سے پیٹ میں اتر جاتی ہے۔ یہ حال بھی اگست ۱۹۴۷ء سے آج اگست ۱۹۵۲ء تک علیٰ حالہ قائم ہے اگست ۱۹۴۷ء میں جب آزادی ملی اور ڈھاکہ مشرقی پاکستان کا صدر مقام بنا تو اس شہر کے اکثر و بیشتر مکانوں میں کھڈی کے پاخانے تھے ان پاخانوں کی صفائی ہاتھ سے ہوتی تھی، لکڑی اور ٹین کی چادروں کے گول ڈراموں والی بیل گاڑیاں شہر کی چھوٹی بڑی سڑکوں سے گذرتی ہوئی نجاست باہر لے جایا کرتی تھیں، کھلی بیل گاڑیوں میں کوڑے اکٹھے کر کے باہر لے جاتے تھے، کوڑے کرکٹ ڈالنے کے لئے سڑکوں کے کنارے ٹین کے ڈرام نہیں تھے لوگ مجبوراً کوڑا کرکٹ سڑکوں کے کنارے ڈال دیا کرتے تھے۔ میونسپلٹی کی کھلی بیل گاڑیاں دو چار دنوں میں آتی تھیں اور کوڑوں کے انبار کو اٹھا کر لیجایا کرتی تھیں۔ آج پانچ سال گذر جانے کے بعد بھی اسی طرح بلکہ انہی پرانی بیل گاڑیوں کے ذریعہ شہر کے کوڑے اور نجاست کی صفائی ہو رہی ہے۔ نہ سڑکوں کے کناروں پر کوڑے کرکٹ ڈالنے کے لئے ٹین رکھے گئے ہیں، نہ کوڑے کرکٹ ڈھونے کے لئے بند ٹرک خریدے گئے ہیں اور نہ نجاست کی صفائی کے لئے زمین دوز نالے تیار کئے گئے ہیں کہ کھڈیوں کے تکلیف دہ پرانے طریقے سے نجات مل سکے۔ اگست ۱۹۴۷ء میں اس شہر کی شاہراہوں، سڑکوں اور گلیوں کی اکثر نالیاں اور موریاں مرمت طلب تھیں، ان کی خستہ حالی کے باعث ان میں نجس پانی سڑی گلی نجاست جمع ہو کر بدبو پیدا کرتی تھیں، آج پورے پانچ سال کی مدت گذر چکنے کے بعد بھی ان کی جدید تعمیر اور مرمت نہیں ہو سکی ہے اور اس وقت بھی یہ حالت ہے کہ کم چالو سڑکوں اور پچھواڑے کی گلیوں ہی میں نہیں بلکہ خاص خاص شاہراہوں کے کنارے اور بڑی فینسی دکانوں کے بالکل سامنے گلے سڑے کوڑے کرکٹ کے علاوہ غلاظت اور نجاست تک کے نالے بہتے رہتے ہیں اور اس کی ناقابل برداشت بدبو سے دکاندار گاہک اور راہگیر سب پناہ مانگتے ہیں۔ انسانی تمدن اور ترقی کے اس دور میں مشرقی پاکستان کے سب سے بڑے اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ شہر اور اس صوبہ کے صدر مقام ڈھاکہ میں میونسپل انتظامات کی ابتری اور زبوں حالی اس امر کے باوجود ہے کہ تخلیق پاکستان کے چند مہینوں کے بعد سے آج تک ڈھاکہ کی شہری میونسپلٹی براہ راست صوبائی حکومت کے محکمہ صحت عامہ کے ماتحت اور حکومت کے دوسرے محکموں کی طرح ایک انگریزی کیوٹو افسر کی نگرانی میں جا رہی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ شہری ضروریات پہلے کے مقابلے میں کئی گونہ بڑھ گئی ہیں، یہ سچ ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی سچ ہے کہ میونسپلٹی کی آمدنی بھی کئی گونہ بڑھ چکی ہے اور ترقی اور بہتری کی غرض سے سامان کی فراہمی بھی اور کام کی انجام دہی کیلئے پانچ سال کی مدت کم نہیں ہوتی ہے صدر مقام اور اُس ڈھاکہ شہر کا ہے۔ جس پر گورنر، وزراء، زعما، قائدین، اہل علم اور نکتہ چین، اپنے اور غیر، ملک والے اور باہر والے، سرکاری اور عوامی سب طرح کے آدمیوں کی نظریں روزانہ پڑتی رہتی ہیں۔ تو اس صوبہ میں نظروں سے اوجھل اور دور افتادہ شہروں، پس ماندہ قصبوں اور دیہاتوں کی تصویر کیسی بھیانک ہو گی؟ عوام کچھ کر نہیں سکتے تو دیکھتے اور سوچتے ضرور ہیں۔ اسی دیکھنے اور سوچنے کا نتیجہ ہے۔ کہ مشرقی پاکستان کے عوام کے دل یہاں کی سرکاری مسلم لیگ اور مسلم لیگی حکومت سے بیزار ہو گئے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اس صوبہ کی مسلم لیگ اور مسلم لیگی حکومت اتنی غیر مقبول، بودی، کمزور اور بے دم

ہے کہ اگر مخالف جماعتوں کے لئے سچائی سے جمہوری آزادی کے مواقع فراہم کردئے جائیں تو آنے والے کسی مقابلے میں اس کی ہار یقینی ہے۔

مشرقی پاکستان مملکت پاکستان کا پس ماندہ علاقہ ہونے کے باوجود سب صوبوں سے زیادہ باوسائل صوبہ ہے۔ اس صوبے میں تعمیر اور ترقی کا کام تخلیق پاکستان کے روز اول سے شروع ہونا چاہئے تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ گذشتہ پانچ سال کی طویل مدت میں نہ یہاں مرکز نے تعمیر و ترقی کا قابل ذکر کام کیا نہ صوبائی حکومت ہی تعمیر و ترقی کا کوئی قابل تعریف کام انجام دے سکی کیونکہ صوبائی کابینہ کے وزراء کو بھی داخلی کشمکش، آپس کی زور آزمائی اور رسہ کشی سے مہلت کہاں مل سکی جو وہ کوئی تعمیری اور ترقیاتی کام شروع کر سکتے۔ تخلیق پاکستان کی ابتداہی سے بلکہ تخلیق پاکستان کا اعلان سن لینے کے بعد ہی سے اس صوبے کے مسلم لیگی قائدین اقتدار کی جنگ کے سلسلے میں ریشہ دوانی، سازش، ... بازی اور رسہ کشی میں مصروف ہیں۔ ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو آزادی ملنے کے بعد ڈھاکہ میں مسلم لیگ کی جو صوبائی کابینہ بنی اس کی تشکیل بھی مسلم لیگ کے صوبائی زعما کے درمیان آپس کی شدید کشمکش کے بعد ہوئی تھی اگست ۱۹۴۷ء میں غیر منقسم بنگال کے وزیر اعظم جناب حسین شہید سہروردی صاحب تھے۔ ان کا اثر اقتدار اتنا بڑھا ہوا تھا کہ اعلےٰ مسلم لیگی قلعوں میں بھی یہ خیال قائم ہو گیا تھا کہ شہید صاحب ہی بنگال کو سنبھال سکتے ہیں۔ اس لئے گمان تھا کہ مشرقی پاکستان اسمبلی پارٹی کے لیڈر وہی چنے جائیں گے اور اس حیثیت سے ڈھاکہ تشریف لاکر یہاں کی پہلی صوبائی کابینہ بنائیں گے۔ مگر ہوا اس کے برخلاف۔ یہ کیسے اور کیوں کر ہوا اس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں۔

شہید سہروردی کے انتہائی عروج واقتدار کے زمانے میں بنگال میں ایک کمزور عنصر ایسا بھی موجود تھا جو ان کی خود سری کی وجہ سے ان سے ناراض رہا کرتا تھا۔ فضل الحق صاحب بھی پردے کے اندر سے جو کچھ ہو سکتا تھا۔ شہید صاحب کی جڑ کھودنے کیلئے کرتے ہی رہتے تھے۔ لیکن مسلم لیگ سے خارج کردئے جانے کے باعث وہ ان پر کوئی براہ راست ضرب لگا سکتے تھے۔ شہید سہروردی کو زوال اس طرح آیا کہ تقسیم ہند اور تخلیق پاکستان کی تجویز پر غور و خوض کرنے کے لئے نئی دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کی جنرل کونسل کا جلسہ بلایا گیا۔ اس جلسے میں شہید سہروردی نے بنگال کی تقسیم تسلیم نہ کرنے کے حق میں ایک زوردار بے باک اور شوخ تقریر کی جو گرم اور تیز بھی تھی۔ لیاقت علی خاں مرحوم اور قائد اعظم مرحوم کو ان کی یہ شوخی اور تیزی ناگوار گذری، بھانپنے والوں نے بھانپ لیا کہ شہید صاحب قائد اعظم کی نظر میں گر چکے ہیں۔ اس موقع پر اگر چالاکی اور ہوشیاری سے ایک ایسی جتھا بندی کرلی جائے جو مشرقی پاکستان کی زمام حکومت سنبھال لینے اور شہید سہروردی کے بغیر کام چلا لینے کی حامی بھر لے تو شہید صاحب اقتدار کی مسند سے گرائے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ شہید صاحب سے بددل اور اقتدار حاصل کرنے کے لئے قسمت آزمائی کا حوصلہ رکھنے والے لوگوں کا ایک جتھا بن گیا۔ اس گروہ کے قابل ذکر اشخاص کے نام یہ ہیں:- چودھری حمید الحق نور الامین۔ حبیب اللہ، معظم الدین۔ چودھری عرف لال میاں کے چھوٹے بھائی یوسف علی۔ چودھری عرف موہن میاں غیاث الدین پٹھان۔ مولانا اکرم خاں۔ مولانا عبداللہ الباقی وغیرہم اس گروہ کی طرف سے محتاط مگر حسب موقع بیانات شائع ہونے لگے، اسمبلی کے ارکان میں کنویسنگ شروع ہو گئی۔ لیاقت مرحوم اور قائد اعظم مرحوم تک دوڑ دھوپ ہونے لگی۔ ہر کوشش کا کچھ نتیجہ نکلتا ہے، جتھا بن گیا اور کامیابی کی امید بھی بندھی لیکن شہید سہروردی کے مقابلہ کا کوئی لیڈر اس صف میں موجود نہ تھا۔ خواجہ صاحب کو قائد اعظم مرحوم نے پاکستان دستور ساز اسمبلی کی صدارت کے لئے نامزد کیا تھا

سب کی نظر انہی کی طرف اٹھی، معاملے کی نزاکت، موقع کی اہمیت اور وقت کی ضرورت جتا کر یہ جتا خواجہ ناظم الدین صاحب کو پاکستان دستور ساز اسمبلی کی صدارت کے نامزد عہدے سے الگ کر کے مشرقی پاکستان مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کا لیڈر بنا کر کراچی سے ڈھاکہ لے آیا۔ حالانکہ خواجہ صاحب بنگال اسمبلی کے رکن بھی نہ تھے۔ خواجہ صاحب نے ۱۴ راگست ۱۹۴۷ء کو مشرقی پاکستان کی صوبائی کابینہ بنائی، نورالامین، حمید الحق چودھری دونوں حضرات خواجہ صاحب کی کابینہ میں اہم وزراء کی حیثیت سے شامل کئے گئے۔ نورالامین وزیر سپلائی بنائے گئے اور حمید الحق چودھری کو مالیات کا محکمہ دیا گیا جو سپلائی سے زیادہ اہم محکمہ سمجھا جاتا ہے۔ ایک سال سے زیادہ عرصہ تک خواجہ صاحب مشرقی پاکستان کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے اس صوبے کا نظم و نسق چلاتے رہے اور نورالامین صاحب اور حمید الحق چودھری صاحب دونوں اپنے اپنے طور پر ان کے ماتحت کام کرتے رہے۔ اسی دوران میں محمد علی جناح مرحوم کی وفات کا سانحہ پیش آیا۔ اقتدار لیاقت علی خاں مرحوم کے ہاتھ میں آیا۔ لیاقت علی خاں مرحوم کو مملکت پاکستان کے گورنر جنرل کے عہدے کے لئے ایک وفادار آدمی کی تلاش ہوئی۔ گورنر جنرل کا عہدہ وزیر اعظم کے عہدے سے قانونی حیثیت سے بڑا تھا مگر اثر و رسوخ استعمال کئے جانے کی صورت میں عملاً بے اثر تھا۔ لیاقت علی خاں ایک ایسا شخص ڈھونڈتے تھے جو گورنر جنرل کے بڑے عہدے پر برائے نام فائز رہے اور کاروبار مملکت میں ٹانگ نہ اڑائے۔ لیاقت علی خاں مرحوم کی نظر خواجہ ناظم الدین پر پڑی۔ وہ راتوں رات بذریعہ خاص طیارہ ڈھاکہ سے کراچی بلائے گئے اور گورنر جنرل پاکستان کے بلند مرتبت عہدے پر فائز کر دیے گئے۔ لیاقت علی خاں مرحوم کی نگاہ میں حمید الحق چودھری سے زیادہ نورالامین صاحب مشرقی پاکستان کی وزارت عظمیٰ کے لئے موزوں آدمی معلوم ہوئے اس لئے انہی کی طرف اشارہ ہوا اور وہ پارٹی لیڈر بنا لئے گئے۔

جناب نورالامین مشرقی پاکستان کے ضلع میمن سنگھ کے رہنے والے، عمر کے اعتبار سے معمر آدمی، علم کے اعتبار سے ایک معمولی وکیل، مسلم لیگ کے پرانے رکن، مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب غیر منقسم بنگالی اسمبلی کے رکن اور شہید سہروردی کے دور حکومت میں بنگال اسمبلی کی اسپیکری کا تجربہ رکھتے تھے۔ طبیعت کے سنجیدہ، نماز و روزہ کے پابند اور ظاہری اور باطنی نیک اوصاف میں حمید الحق چودھری پر ترجیح کے قابل تھے۔

حمید الحق چودھری مشرقی پاکستان کے ضلع نواکھالی کے خیلی علاقہ کے رہنے والے، عمر کے لحاظ سے جوان، علم کے اعتبار سے ایک تیز اور چالاک وکیل، اور کلکتہ ہائی کورٹ میں نائب ناظم قانون کے عہدے پر ملازم تھے۔ سابق بنگال کونسل کے رکن ہو گئے تھے۔ وہ بنگال اسمبلی کے رکن بھی نہ تھے بلکہ وزیر بنا لئے جانے کے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی کے علمی حلقہ سے مشرقی بنگال اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ آل انڈیا مسلم لیگ یا بنگال مسلم لیگ میں ان کا کوئی قابل لحاظ ریکارڈ بھی نہ تھا۔ مگر وہ طبیعت کے اعتبار سے تیز اور چالاک، جتھا بندی کے فن میں ہوشیار اور سیاسی داؤ پیچ میں ماہر اور اس کام میں زیادہ لگے رہتے تھے، اسی لئے مشرقی پاکستان مسلم لیگ کے لیڈروں اور یہاں کی اسمبلی پارٹی کے ارکان اور وزراء کے دلوں پر نورالامین صاحب وزیر اعلیٰ سے زیادہ حمید الحق چودھری کا رعب اور اثر تھا۔ لیکن مشرقی پاکستان کی وزارت عظمیٰ کا موقع ایسی سرعت سے آیا اور اس تیزی سے نکل گیا کہ حمید الحق چودھری دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے حمید الحق چودھری کی ناراضی نورالامین صاحب کے لئے بڑے خطرے کی بات تھی اس لئے نورالامین صاحب نے حمید الحق چودھری کا نقصان اس طرح پورا کیا کہ مالیات کے علاوہ اور کئی اہم عہدے ان کو سونپ دئے اور اس طرح انہیں منایا۔ حمید الحق چودھری نورالامین کی کمزور طبیعت سے خوب واقف تھے اور جانتے تھے کہ اختلاج قلب کا جو دورہ نورالامین صاحب پر پڑتا رہتا ہے اس کے باعث وہ سہولت پسندی کو ترجیح دیں گے اس لئے اصل اقتدار انہی کے ہاتھوں میں رہے گا، اسی خیال کے ماتحت زیادہ تگ و دو کے بغیر ہی وہ مان بھی گئے۔

مشرقی پاکستان

حمید الحق چودھری مشرقی پاکستان کا کھوڑو بننا چاہتے تھے۔ وہ اپنا اثر و اقتدار اور زیادہ بڑھانے اور مضبوط کرنے کے کام میں لگ گئے۔ سب سے پہلے انہوں نے ہندو سرمایہ کی مدد اور سرکاری اختیارات سے کام لے کر ڈھاکہ میں تیجگاؤں ایک بڑا چھاپہ خانہ قائم کرلیا اور یہاں سے مشرقی پاکستان کا پہلا انگریزی روزنامہ "پاکستان آبزرور" بڑے طمطراق سے جاری کردیا۔ سہولت اور مراعات کے لالچ بڑے بڑے کاروباریوں سے اخبار کا حصّہ خریدنے کے نام سے کھلے بندے بڑی بڑی رقمیں مانگنے اور وصول کرنے لگے۔ برلا کی ایک بھارتی کمپنی ایلن بیری کو، اس زمانے میں جب کہ بھارتی حکومت نے پاکستان کو دق کرنے کیلئے کسٹم کی پابندی لگا دی تھی، ہزاروں ہزار کی تعداد میں اسٹیل کے بڑے بڑے ڈرام جن کی خود مشرقی پاکستان میں بڑی ضرورت اور مانگ تھی، ڈھاکہ سے کلکتہ لے جانے کی اجازت دے دی یہ اور اس طرح کی دوسری بہت سی بدعنوانیاں وہ کھلے بند کرنے لگے، اس لئے کہ ان کے ہاتھ میں ایک روزنامہ اخبار تھا۔ اسمبلی کے ارکان ان کے رعب اور اثر میں تھے، کئی اہم محکموں کے وہ تنہا وزیر تھے اور نورالامین صاحب وزیر اعلیٰ ان کی ناراضی مول لینے کے خیال تک سے گھبراتے

لیکن وہ جو کہا گیا ہے کہ ہر فرعونے را موسیٰ۔ خواجہ ناظم الدین صاحب کے سالے خواجہ نورالدین صاحب کو جو کلکتہ میں اخبار مورننگ نیوز نکالتے تھے اور پاکستان بننے کے بعد اپنا اخبار بند کرکے ڈھاکہ چلے آئے تھے اور ڈھاکہ سے مارننگ نیوز نکالنے کی فکر میں لگے ہوئے تھے۔ حمید الحق چودھری کا پاکستان آبزرور پہلے نکل جانے پر ان کے حریف بن گئے۔ خواجہ نورالدین صاحب نے عجلت سے ہفتہ وار مورننگ نیوز نکال ڈالا اور اپنے پرچے کی مقبولیت کے لئے حمید الحق چودھری پر براہ راست نکتہ چینی شروع کردی۔ خواجہ نورالدین صاحب ہفتہ وار مورننگ نیوز کے برائے نام ایڈیٹر بنے اور مقالات اور مضامین لکھنے کے لئے انہوں نے مشرقی پاکستان میں اخبار ڈان کے نمائندہ اور تخریبی تنقید کے فن میں بڑی مہارت رکھنے والے اخبار نویس جناب عزیز الرحمٰن صاحب کو مقرر کیا۔ عزیز الرحمٰن صاحب نے حمید الحق چودھری کی بدعنوانیوں کا پول کھولتے ہوئے ہفتہ وار مورننگ نیوز میں دھواں دھار مضامین، مقالات اور اداریے کا سلسلہ شروع کردیا۔ حمید الحق چودھری اور خواجہ نورالدین صاحب میں علی الاعلان جنگ چھڑ گئی۔ حمید الحق چودھری نے خواجہ نورالدین صاحب پر اپنی ہتک عزتی کا مقدمہ قائم کرکے پچاس ہزار روپے کا دعویٰ عدالت میں دائر کردیا۔ وہ مقدمہ ابھی تک عدالت میں زیر سماعت ہے۔ اب حمید الحق چودھری کا اقبال گرنے لگا۔ عزیز الرحمٰن صاحب کی نکتہ چینیوں کا سلسلہ ڈھاکہ کے ہفتہ وار مورننگ نیوز سے آگے بڑھ کر کراچی کے ڈان میں اس کے اپنے نامہ نگار کے مراسلات کی حیثیت سے چھپنے لگا۔ اور اس کا زور اور اثر مرکزی حکومت پر بھی پڑا لیاقت علی مرحوم متوجہ ہوئے۔ حمید الحق چودھری پر الزامات کی جانچ پڑتال کے لئے مرکزی پولیس حرکت میں آئی اور قانون پروڈا کے ماتحت ہائی کورٹ کے ججوں پر مشتمل ایک تحقیقاتی ٹرائی بیونل قائم کئے جانے کا اعلان ہوگیا۔ حمید الحق چودھری کو مجبوراً وزارت سے مستعفی ہونا پڑا۔ اقتدار سے محروم ہونے کے بعد حمید الحق چودھری نے صوبائی مسلم لیگ میں زور آزمائی کی لیکن اس میں بالآخر ناکام ہوئے۔

حمید الحق چودھری کے قابل گرفت معاملات کی چھان بین کے لئے اعلیٰ طاقت کا تحقیقاتی ٹرائی بیونل ڈھاکہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس آنریبل شہاب الدین صاحب کی سرپرستی میں قائم ہوا۔ ٹرائی بیونل نے طویل سماعت کے بعد اپنی سفارشات مرکزی حکومت کے سامنے پیش کردئے۔ ٹرائی بیونل کی سفارشات پر غور و خوض کرکے پاکستان کے گورنر جنرل ہز ایکسیلنسی غلام محمد صاحب نے حمید الحق چودھری کو پروڈا کے قانون کے ماتحت آئندہ چھ سال تک کے لئے کسی پبلک عہدے کیلئے نااہل قرار دیدیا۔

(بقیہ دستور پاکستان بر صفحہ ۲۴۹

دستورِ پاکستان

س۔ا۔ظفر

[از: س۔ا۔ظفر ۔ 1599/4 پیر الٰہی بخش کالونی، کراچی ۵، آرگنائزنگ سکریٹری آل پاکستان دستور پارٹی]

دستور بذات خود نصب العین نہیں ہوتا بلکہ کسی نصب العین تک پہونچنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ پاکستان کے سامنے کونسا نصب العین ہونا چاہئے جہاں تک پہونچنے کے لئے ہمارے دستور کی تشکیل کی جائے۔

عام طور پر دستور سازوں کے پیش نظر اپنے ملک کی حکومتی اور انتظامی مشینری کی چستی اور ادا دیت ہوتی ہے۔ عموماً دساتیر صرف یہ متعین کرتے ہیں کہ حکومت کیسے، کس طرح اور کس حد تک سپرد کی جائے گی۔ با لفاظ دیگر حاکمیت اعلیٰ کس کی ہے۔ حاکم کے انتخاب کا طریقہ کار کیا ہے، حاکم کے اختیارات کیا ہیں اور محکوم کے اختیارات کیا؟ دونوں کی ایک دوسرے کے حق میں ذمہ داریاں کیا کیا ہیں، اور دونوں اپنے اپنے اختیارات کس طور پر استعمال اور اپنے اپنے حقوق کس طور پر محفوظ کر سکیں گے۔

فلاطون اور ارسطو سے لے کر ہمارے دستور سازوں تک (الّا پیغمبر اسلام) دستور کا مقصد اس سے زیادہ نہیں سمجھا گیا کہ یہ وہ حد فاصل ہے جو راعی اور رعایا کے حلقہ ہائے اثر کو ممیز کرتا ہے اور ضمنی طور پر حسن انتظام کا ضابطہ۔

لیکن وقت آگیا ہے کہ ہم دستور سازی کی تاریخ اور سائنس میں دخابت اور رہابت ہیں، مسئلہ کی ذہنی اور فکری طرز گرفت میں ایک انقلاب برپا کردیں۔

ہمارے دستور کا سب سے بڑا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ ہم اپنے ملک میں وہ اقدار رائج کریں جن سے نہ صرف مالی، دینی اور معاشرتی بلکہ ذہنی، کرداری اور روحانی طور پر بھی اقوام عالم میں جلد از جلد ہم اعلیٰ ترین حیثیت حاصل کرلیں تاکہ اقوام عالم (اپنے اپنے مادی مفاد کے نقطۂ نظر سے سہی) ان ہی اقدار کو رائج کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ اور اس طرح ساری دنیا میں اعلیٰ ترین قدریں رواج پا جائیں۔ اگر ہم نے دستور سازی میں اپنا منتہائے نظر صرف حکومتی مشینری پر موقوف رکھا تو کوئی وجہ نہ ہوگی کہ دنیا اپنے درد دکھ کے مداوا کے لئے ہماری طرف دیکھے۔ اگر ہمارا دستور صرف ہمارے ملکی معاملات کے لئے محدود کرایا گیا تو ہمارے اور اغیار کے دساتیر میں کیا فرق رہ گیا؟ اگر ہم نے اپنا منصب امامت اقوام عالم نہ پہچانا اور اپنے یہاں اس نظام کو رائج نہ کیا جس کے اختیار و قبول پر دنیا مجبور ہو جائے تو پھر ہم سے زیادہ بدقسمت کون ہوگا؟

یہ قدریں جو اسلام نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مقرر کردی ہیں ایک بار تاریخ میں تجربہ میں لائی جا چکی ہیں۔ نتائج روز روشن کی طرح سامنے ہیں۔

ہمارے دستور کا مقصد احیاء اسلام ہونا چاہئے۔ چھوٹے چھوٹے مقاصد مثلاً حاکم و محکوم کے اختیارات و حقوق کا تعین، حکومتی حسن انتظام وغیرہ خود بخود حاصل ہو جائیں گے۔ جو ملک اپنا مقصد احیاء اسلام بنائے گا وہ قرون اولیٰ کی طرح دنیا کی امامت کرے گا۔

کتابوں، تقریروں اور تلقینوں سے ہزار درجہ بہتر صورت اسلام کی خوبیوں کو تسلیم کرانے کی یہ ہے کہ عملی طور پر انہیں دنیا کے سامنے پیش کیا جائے اور ان اقدار کو حتی المقدور زندہ کردیا جائے جنہیں ہم سوا ہزار سال سے کھوئے بیٹھے ہیں۔ رسول مقبول کے نقش قدم پر چلنے والی اگر ایک حکومت آج دنیا کے کسی خطہ میں قائم ہو جائے تو اس کی خوبیاں خود بخود آفتاب کی شعاعوں کی طرح سامنے آجائیں گی۔ اگر پاکستان نے تجربہ گاہ (لیبوریٹری) میں ہم نظام اسلام کا عملی

مظاہرہ کریں تو دو فائدے بلاشبہ حاصل ہوں گے۔ اول یہ کہ اسلامی نظام کے متعلق جو غلط فہمیاں دنیا میں پھیل گئی ہیں یا پھیلا دی گئی ہیں وہ خود بخود رفتہ رفتہ دور ہوتی جائیں گی۔ جس طرح آفتاب کی کرنوں کے سامنے تاریکی نہیں ٹھہر سکتی، اسلامی حکومت کے نور کے سامنے غلط فہمیاں اور غلط گمانیاں نہیں ٹھہر سکیں گی۔ دوئم ہر ملک و قوم، ہر طبقہ، ہر معاشرہ اسے اخذ کرنے پر خود بخود مجبور ہوگا۔ دنیا کے پاس اب بھی عقل موجود ہے، بصیرت اگر نہیں تو کم از کم بصارت ضرور موجود ہے، فائدہ کی تلاش کا مادہ موجود ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ رفتہ رفتہ دنیا میں اسلام نہ پھیل جائے۔ خدا کرے کہ یہ سہرا ہمارے سر ہو۔

جہاں تک اخذ و قبول کا مسئلہ ہے، میں دو تین مثالیں بھارت کے ملکی معاملات سے دینا چاہتا ہوں۔ ہندوؤں کو مسلمانوں کے مذہب اور کلچر سے عظیم الشان تعصب ہے اور ان دنوں چشم بد دور وہ صاحب حکومت بھی ہیں لیکن انہوں نے بھی اپنے سارے وید، قوانین منو، پرانا ؤں اور شاستروں کے خلاف عورتوں کو حق وراثت اور حق ملکیت دیا ہے انہوں نے عملی طور پر ستی بند کر دیا ہے۔ انہوں نے بیوگان کی شادی کا رواج شروع کر دیا ہے۔ بھارتی پارلیمان میں شوہروں کو زوجین سے علیحدہ کرنے کے متعلق بیویوں کے حقوق پر خوب خوب بحثیں رہی ہیں اور زن و مرد، پیر و جوان ممبروں میں سے کسی نے اس کی مخالفت نہ کی چھوت چھات کی اصلاح بھی شروع ہو رہی ہے۔ پنڈت نہرو اور پنڈت رادھا کرشن جیسے کٹر برہمن بھی سمندر پار سفر کرنے لگے ہیں اور کوئی انہیں پنڈت یا برہمنیت سے خارج کرنے کے متعلق تصور بھی نہیں کرتا۔

جہاں تک تعصب اور غلط گمانیوں کا تعلق ہے، خود پاکستان کے قیام کے متعلق بہت سے پُرخلوص اور جہاندیدہ داعیوں میں ہزاروں شبہات مروج تھے۔ کیا پاکستان اقتصادی طور پر آزاد رہ سکے گا؟ کیا یہ کبھی ممکن ہوا ہے کہ ایک ملک دو بالکل الگ حصوں میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں میل کی دوری پر واقع ہو؟ خصوصاً جبکہ درمیان میں ایک دشمن ملک ہو؟ دونوں دور و دراز حصوں میں ربط و ضبط کیسے قائم رہ سکے گا؟ ہزاروں میل کی سرحدیں بٹھائی جاسکیں گی یا نہیں؛ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن پاکستان کے چھ سال کے قیام نے بہت سے شکوک شبہات رفع کر دیئے۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ پاکستان، بھارت کے ہر جارحانہ اقدام کے باوجود آزاد رہ سکتا ہے پاکستان دو حصوں کے درمیان ربط و ضبط قائم رکھ سکتا ہے۔ پاکستان اقتصادی طور پر اپنی کفالت آپ کر سکتا ہے۔

اسی طرح جب ہم پاکستان میں اسلامی نظام قائم کر لیں گے تو چند سال کے بعد وہ سارے مغالطے چھٹ جائیں گے جو متعصب غیر مسلموں نے اسلام کے متعلق پھیلائے ہیں۔ ہر ملک مجبور ہو جائے گا کہ محض اپنے قیام و بقا کی خاطر، اپنے مادی اور مالی نفع کی خاطر، اپنی ذہنی اور اخلاقی سربلندی کی خاطر، اسلامی نظام کو قائم کرے۔

احیاء اسلام کے لیے یہ وقت نہایت موزوں بھی ہے۔ دو عظیم جنگوں نے دنیا کو چکنا چور کر دیا ہے۔ فتح و شکست کسی طور کسی کو جنگ مفید ثابت نہیں ہوئی۔ یورپ، امریکہ اور روس تینوں کو یقین ہے کہ تیسری جنگ عظیم کی صورت میں وہ اور بھی تباہ و برباد ہو جائیں گے لیکن ایک طاقت کی برتری کے ڈر سے دوسری طاقت بھی اپنے ذرائع و وسائل کو جنگی آلات تیار کرنے میں صرف کرنے پر مجبور ہے۔ قومی اور وطنی سربلندی کا فلسفہ جس کا انحصار ہی دوسری قوموں کی کمزوری اور شکست پر ہے، سرنگوں ہو چلا ہے۔ دنیا کو معلوم ہو گیا ہے کہ قومی اور بین الاقوامی زہروں کا تریاق اب جنگ نہیں بلکہ قلبی اخوت و وحدت ہے سرمایہ داری — — جس میں اقتصادی وسائل مرکوز تر ہوتے جاتے ہیں، اور عوام الناس لازماً مفلس تر — — اور کمیونزم — — جس میں انفرادیت اور شخصیت ملیا میٹ ہو جاتی ہے — — اپنے اپنے خطہ ہائے اثر و نفاذ میں ناپسندیدہ تر ہوتی جا رہی ہیں۔ عیسائیت، ہندوازم، بدھ ازم وغیرہ کے فلسفوں اور اقدار کی دھجیاں سائنس، موجودہ تحقیقی ہوش و گوش اور مسائل حاضرہ نے بکھیر دی ہیں۔ یہاں تک کہ اُن کے ارباب فکر و نظر بھی سمجھنے لگے ہیں کہ یہ مذاہب توہمات کا پشتارہ ہیں اور ملکی اور معاشرتی دردوں کا درمان ہونا تو درکنار مجسم درد بلکہ درد آفریں ہیں۔

اس لئے چہار دانگ عالم سوجھ بوجھ والے اپنے اپنے نظام و مذہب سے برگشتہ خاطر ہو رہے ہیں۔ وہ ایک ایسے نظام و مذہب کی تلاش میں ہیں جو ہر درد کا علاج ہو، جس سے ہر طبقہ بلکہ ہر فرد خوش ہو، جو انفرادی اور اجتماعی دونوں ترقیات کی ضامن ہو۔ اور جس کی طرف رشد و ہدایت، تعمیر و تسکین اور واسطہ عبدیت و ربوبیت کے لئے انسانی ذہن و فکر و روح رجوع کرے۔ اسلام سے وہ بدظن ہیں اور مختلف حوائل (مثلاً مجہورتے تاریخی حوالے

بہت سے ضابطے وضع کر سکتے ہیں۔ اگر آج عمل و نفاذ میں اسلام ان کے مطالعہ اور مفاہمہ کے لئے پیش کر دیا جائے تو بعید نہیں کہ ایک عالم اسلام قبول کر لے۔

پاکستان میں اسلامی دستور کے قیام کے اور بھی مقتضیات ہیں۔ دنیا میں اب تک جتنے دساتیر رواجی یا دستاویزی طور پر وجود میں آئے ہیں ان میں نہ صرف اسلامی دستور کو یکہ و تنہا درجہ کمال حاصل ہے بلکہ کوئی دوسرا دستور اُس کی گرد کو بھی نہیں پہونچتا بلکہ نہیں پہونچ سکتا۔ اسلام اور غیر اسلام میں رب معبود کی ذات و صفات کے تصور کے بنیادی فرق ہی سے دونوں کے نظام ہائے معاش و معاشرت، حکومت، سیاست، تجارت، عمرانیات، مالیات، عدل، جنگ و صلح، بین الاقوامیات، آئین و دستور وغیرہ وغیرہ کے تصورات میں زمین و آسمان کا فرق پیدا ہو گیا ہے بلکہ زیادہ۔ سب سے بین فرق جو ہمیں نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی دستور میں حاکمیت اعلیٰ خدا کو حاصل ہے اور ایک غیر اسلامی دستور میں حاکمیت اعلیٰ غیر خدا کو۔ جو ناقص بھی ہے، متعدد بھی ہے اور ستم بالائے ستم غیر متعین بھی۔ غیر اسلامی دستور میں حاکم اعلیٰ اگر بادشاہ یا صدر یا وزیر اعظم ہے تو اُسے منتخب کرنے والے، اختیارات بخشنے والے اور اس کا احتساب کرنے والے کوئی اور ہیں۔ یہ منتخب کنندہ اور محتسب اگر جمہور ہیں تو نہ صرف وہ صدر یا وزیر اعظم کے ماتحت ہیں جو من مانی الیکشن کرا سکتے ہیں (اور اکثر و بیشتر کراتے ہیں) بلکہ یہ جمہور جذبات و تعصبات و جہالت و حماقت کے بیسیہ زبول ہیں۔ پھر گویا یہ جذبات و تعصبات اور جہالت و حماقت حاکم اعلیٰ ہیں؛ غرض یہ کہ یہاں حاکم اعلیٰ ناقص، متعدد و غیر متعین ہے۔ اور جب حاکم اعلیٰ ناقص ہے تو اس کے بعض احکام بھی ناقص ہوں گے اور اجتماعی مفاد کے حق میں مضر۔ چنانچہ ایسے دستور سے رعایا کو نقصان بھی پہونچتا ہے اور ہوتا رہتا ہے۔ اس طرح دستور کا بنیادی مقصد ہی فوت ہو گیا۔ اگر حاکم اعلیٰ متعدد ہیں اور مستزاد یہ کہ غیر متعین، تو اور بھی آفت سخت ہے۔ لیکن اسلام میں حاکم اعلیٰ یعنی اللہ تعالیٰ کامل و اکمل ہے، واحد لاشریک ہے اور متعین۔ اس کے احکام دستاویزی ہیں اور دوسرے غیر الٰہیہ احکام کی طرح بار بار نہیں آتے اور نہ ایک بار ترمیم و تنسیخ قبول کرتے ہیں۔

دوسرا اہم فرق اسلامی اور غیر اسلامی دساتیر کے درمیان یہ ہے کہ اسلام ایک مکمل دین، ضابطہ حیات، اخلاقی اور روحانی اقدار کا مجموعہ ہے اور اس کا دستور اس ہی کی اقدار منصوص حیات کا ایک جزء۔ غیر اسلامی دستور کسی مذہب کا جزو لاینفک نہیں ہوا کرتا اس لیے اس کی تعمیل ویسی نہیں ہوتی جو عقائد و ایمان کی ہوتی ہے۔ غیر اسلامی دستور چونکہ انسان کا بنایا ہوا ہوتا ہے، اس کے چلانے والے اور احتساب کرنے والے بھی انسان ہی ہوتے ہیں، اس سلسلہ اس کے چور دروازوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے والوں کی کوئی اخلاقی یا ضمیری قدر مجروح نہیں ہوتی۔ یعنی ایسے دستور کی وہ قلبی قدر و منزلت نہیں ہو سکتی جو مذہب کے بناتے ہوئے دستور کی ہو سکتی ہے۔ اسلامی دستور کی تعمیل و عدم تعمیل سے اُس خدا کے یہاں سزا و جزا کا یقین ہے جس کی نگاہوں سے کچھ اوجھل نہیں۔ اس کے برخلاف غیر اسلامی دستور کی تعمیل پر کوئی انعام نہیں، اور عدم تعمیل پر زیادہ سے زیادہ اُس پولیس کا خطرہ جس کے لیے ہر قصور قابل دست اندازی نہیں، جس کی نگاہوں سے بہت کچھ اوجھل رہتا ہے اور بہت کچھ اوجھل کیا جا سکتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ خود حکومتی مشنریاں اپنے اپنے دساتیر کی تعمیل اپنے حاکموں کی مرضی کے مطابق توڑ مروڑ کر کرتی ہیں اور سوسائٹی کو بھی اسی طرح توڑ مروڑ کر تعمیل کرنے پر شہہ دیتی ہیں یا مجبور کرتی ہیں۔ امریکہ میں حبشیوں، بھارت میں مسلمانوں اور کمیونسٹ ممالک میں جمہوریت اور انفرادیت کی جو درگت بنائی جا رہی ہے، وہ وہاں کے دستاویزی دساتیر کی بین خلاف ورزی اور میرے دعوے کا ثبوت ہے۔

تیسرا فرق یہ ہے کہ زمان و مکان کے نقطہ نظر سے اسلامی دستور ہمہ گیر اور عالمگیر ہے۔ چونکہ اس کا بنانے والا وہی ہے جس نے نظام فطرت اور بشریت کو بنایا ہے، اس لئے اسلامی دستور کو فطرت و بشریت سے جو دوامی مطابقت حاصل ہے، اُس کا شمہ بھی کسی اور دستور کو نصیب نہیں ہو سکتا جس طرح ہر ملک و قوم میں دوا اور دارو ازل سے جاری ہوا کئے ہیں اور ابد تک جاری ہوا کریں گے، اس طرح وہ دستوری ڈھانچہ جو قرآن و سنت نے پیش کیا ہے زمان و مکان میں اٹل ہے۔ غیر اسلامی دساتیر کی طرح کسی خاص جغرافیائی خطہ یا کسی خاص قوم یا طبقہ کی مزاج داری یا کسی تاریخی اور اقتصادی پس منظر کے تحت یہ اسلامی دستوری ڈھانچہ نہیں بنایا گیا۔ یہ ڈھانچہ تمام عالم کے لئے اتنا ہی موزوں ہے جتنا کسی ایک ملک کے لئے۔ البتہ اس ڈھانچہ کے اندر ہر ملک و معاشرہ کی اجازت ہے کہ وہ اپنے اپنے مقتضیات، اپنے اپنے حالات اور اپنے اپنے زمانہ کے مطابق

ترتیب کرے اوران تفاصیل میں ہی ترمیم وتنسیخ اوراضافہ وتفریق کی گنجائش ہے، اصل اصول میں ہرگز نہیں۔
یا دستور کے داخلی تقاضوں کے علاوہ پاکستان میں اسلامی دستور کے لئے خارجی تقاضے بھی بہت ہیں۔ اول تو یہ ملک حاصل ہی ان کے لئے اوران ہی کو اعیدپر ہوا ہے۔ دوئم اس ملک کی چھوٹی چھوٹی لسانی اورعلاقائی قومیتیں اسی ایک رشتۂ اسلام میں منسلک اور متحد ہیں۔ اس انسلاک اورانضباط کی ضرورت اور بھی زیادہ ہے کیونکہ پاکستان دو جدا جدا دور دراز حصوں میں منقسم ہے۔ سوئم باشندگان جس قدر زیادہ اسلام کو عزیز رکھتے ہیں کسی اور مقصدِ حیات کو نہیں رکھتے۔ اسی کے لئے انہوں نے حصول پاکستان اور حصول کشمیر کی جنگ میں جان کی بازی لگائی اور آج اگر ہندوازم، کیمونزم یا کسی غیر اسلامی "ازم" کے خلاف انہیں معرکۂ جنگ وجہاد میں آنا پڑا تو اسی مقصد کے لئے آئیں گے، قومیت اور وطنیت کے ڈھونگ کے لئے نہیں۔ اگر کسی اور مقصد پر انہیں جمع کرنے کی کوشش کی گئی تو نہ صرف یہ کوشش رائگاں جائے گی بلکہ اللہ کی امانت میں خیانت ہوگی اور اسلام سے عبرتناک منافقت۔

آج معاشی خوش حالی یا ملکی آزادی وغیرہ کے نام پر ہمیں طفل تسلی دینے کی کوششیں جاری وساری ہیں۔ اگر ہمارے ارباب بست وکشاد کو اسلام اور اسلامی نصب العین (زبانی دعووں سے قطع نظر) سے زیادہ دلچسپی نہیں تو کم ازکم پاکستان کے بقاء واستحکام ہی کے لئے اس طرح کا دستور بنانا چاہیئے۔ اگر پاکستان کو امامت عالم کی عزوجاہ حاصل کرنی ہے تو جلد ازجلد اسلامی دستور بنایا جائے اور نافذ کیا جائے۔ کسی تعویق، تاخیر اور عذر تراشی کا ہرگز موقع نہیں لیکن اگر اپنی خدمت اور اپنے اقربا کی خدمت، خلق اور خدا کی خدمت سے زیادہ عزیز ہے تو ہم سب کا اللہ حافظ!

بقیہ مشرقی پاکستان صفحہ ۲۴۵

بداقبالی شروع ہوئی تو حمید الحق چودھری کے سب کام بگڑنے لگے، اخبار پاکستان آبزرور کے ایڈیٹر نے ایک نئی شامت لائی اس نے ایک اداریے میں خواجہ ناظم الدین وزیراعظم مملکت پاکستان کی ذات پر تنقید کرتے ہوئے اپنی جہالت اور کم علمی کے باعث کچھ ایسے ناشائستہ الفاظ استعمال کئے جو خلیفہ سوم حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان گرامی کے خلاف تھے۔ اقتدار سے محروم کر دیئے جانے کے بعد حمید الحق چودھری صاحب اوران کی وجہ سے ان کا اخبار پاکستان آبزرور دونوں نورالامین اور خواجہ ناظم الدین دونوں کے مخالف بن گئے تھے۔ دینی معاملات میں بے ادبی کی وجہ سے مشرقی پاکستان کے دینی حلقے میں اس اخبار کے برخلاف نفرت اور حقارت کا جذبہ بھی پیدا ہوگیا تھا۔ اس لئے اس کے اس جرم شدید پر سرکاری حکم کے ماتحت اسے ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا اور الہلال پریس میں جہاں یہ اخبار چھپتا تھا تالے ڈال دیئے گئے۔ اس طرح حمید الحق چودھری کا عوام سے وہ رابطہ بھی ٹوٹ گیا۔ جس پر ان کو ناز تھا۔ اب وہ خاموش بیٹھنے پر مجبور ہو گئے ہیں اس لئے کہ وہ در پردہ دوسرے مخالفین کو مدد تو دے سکتے ہیں لیکن خود اپنے لئے اس وقت کچھ مفید مطلب کام نہیں کر سکتے۔ اب مشرقی پاکستان مسلم لیگ کے میدان میں جناب نورالامین صاحب کا کوئی دوسرا شخص حریف نظر نہیں آتا۔

نورالامین صاحب طبیعت کے کمزور، حوصلے کے پست اور اختلاج قلب کے مریض ہیں جب حمید الحق چودھری ان کی کابینہ میں شامل تھے تو زیادہ اختیارات انہی کے ہاتھوں میں تھے۔ فلاح وترقی کے کاموں کے اکثر محکمے انہی کے ماتحت تھے۔ چودھری صاحب کو اپنا پوزیشن مضبوط بنانے کی فکر اور سیاسی جوڑ توڑ سے فرصت کب ملی جو وہ عوام کی فلاح وترقی کے لئے کچھ کرتے۔ نورالامین صاحب کو پہلے تو حمید الحق چودھری کی موجودگی نے کچھ کرنے نہ دیا اور اب عنقریب ہونے والے صوبائی انتخابات میں نورالامین مسلم لیگ پارٹی اور اپنے آدمیوں کو کامیاب بنانے کا عظیم الشان کام ان کے سامنے ہے جس سے کامیابی سے عہدہ برآہو جانے کے بعد ہی وہ صوبے کے عوام کی فلاح وترقی کے لئے کچھ کرنے کرانے کی بات سوچ سکتے ہیں۔

۴ لاکھ ۲۰ ہزار روپے

خرچ کرکے

۳ ماہ کی عرق ریزیوں کے بعد

ہماری دستوریہ نے بنیادی حقوق کی رپورٹ پاکستان کو بہم پہنچائی ہے

اور اس رپورٹ میں کا حال یہ ہے

کہ

- یہ بھارت کے بنیادی حقوق کی لفظ بلفظ نقل ہے صرف کہیں کہیں نمبروں کی ترتیب بدل گئی ہے ——
(مثلاً:- جس سیکشن کا نمبر بھارتی رپورٹ میں ' ۱۰ ' تھا اسے پاکستانی رپورٹ میں ' ۳ ' کر دیا گیا ہے)
کہیں فقرے کی ترتیب کو بدل دیا گیا ہے (مثلاً ایک جگہ Except according to NDTD
کو ہمارے دستورگروں نے Save in accordance with WITH سے بدل دیا ہے)
- اس پر زیادہ سے زیادہ ایک معمولی کلرک کی دو گھنٹے کی محنت کافی تھی۔
تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو ذیل کا پمفلٹ :-

Searchlight on the Constituent Assembly of Pakistan

—— شائع کردہ :- دفتر جماعت اسلامی ، کراچی ——

کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم یہ رپورٹ ارکان دستوریہ کو عطائے تو بلقائے تو ۔ کہہ کر واپس کردیں

اور

اُن سے اپنے خزانۂ ملی کی صرف شدہ گراں بہا رقم واپس طلب کریں

ورنہ یہ سودا تو —— بڑا مہنگا ہے ؟

اشاعت خاص —— ۲۵۰

پاکستان کی تعلیمی حالت کا جائزہ

ابو سلیم ایم اے

کسی ملک کی حقیقی دولت اس کے وسائل پیداوار، اس کے معدنیات کے ذخیرے اور اس کی فیکٹریاں اور کارخانے نہیں ہوتے بلکہ اس کے وہ نوجوان ہوتے ہیں جو اپنی علمی اور عملی قوتوں اور دماغی صلاحیتوں کو اپنے ملک کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لئے وقف کر دیتے ہیں اور جو اپنی پاکیزہ سیرت، اپنی بالغ نظری، اپنی بلند حوصلگی اور اپنی بے لوث خدمت سے اُسے دُنیا کے مہذب اور ترقی یافتہ ممالک کی صفِ اول میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ مگر ایسے نوجوان آپ سے آپ نہیں پیدا ہو جاتے بلکہ یہ کام تعلیم و تربیت کے ایسے سوچے سمجھے ہوئے نظام کے ذریعے انجام پا سکتا ہے جو اُن نوجوانوں کی خداداد قابلیتوں اور فطری صلاحیتوں کو اجاگر کر کے اُنہیں فکر و عمل کی صحیح راہوں پر ڈال دے یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کسی ہوش مند انسان کو انکار کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ دنیا کی ہر ترقی پذیر مملکت ایک صالح نظامِ تعلیم و تربیت کے قیام کو اپنا بنیادی فرض سمجھتی ہے۔ اس فرض کی انجام دہی میں ذرا سی غفلت اور کوتاہی مملکت کے لئے مہلک اور تباہ کن ثابت ہوتی ہے۔ گذشتہ عالمگیر جنگ میں جب برطانیہ کو جرمنی کے مقابلہ میں پے در پے شکستیں ہوئیں اور برطانوی افواج کو متعدد مقامات پر پسپا ہونا پڑا تو اخبار اسٹیٹسمین نے ایک افتتاحیہ میں اپنی قوم کی مصیبت اور بدبختی کا رونا رویا اور ملک کی درس گاہوں کو اس کا ذمہ دار ٹھیرایا۔

ایک اسلامی مملکت کے لئے تعلیم و تربیت کی ضرورت اور اہمیت کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے عہدِ رسالت کا ایک واقعہ خاص طور پر توجہ اور غور و فکر کا مستحق ہے۔ ہجرت کا نواں سال تھا کہ حضور اکرم صلعم نے اسلامی مملکت کے استحکام کے پیش نظر قیصرِ روم کی عظیم الشان طاقت سے ٹکر لینے کا فیصلہ کیا۔ دنیا کی دو سب سے بڑی طاقتوں میں سے ایک سے مقابلہ ہونے والا تھا۔ اس لئے ہر قابلِ جنگ مسلمان کے لئے لشکر میں شامل ہونا ضروری تھا۔ مگر موقع کی اِس نزاکت کے باوجود بعض مسلمان جہاد میں شریک نہ ہوئے اس واقعہ کی بدولت اسلامی جماعت کی ایک بہت بڑی کمزوری کھل کر سامنے آ گئی۔ اللہ تعالےٰ نے اِس کمزوری کی نشان دہی کی اور اس کا سبب یہ بتایا کہ مملکت کے اکثر لوگ جہالت میں مبتلا ہیں اور علم سے محروم ہونے کی وجہ سے اللہ کے دین کے حدود ان کو معلوم نہیں۔ اس کے ساتھ ہی تنبیہ کی گئی کہ لوگوں کو اس حالت میں پڑا نہ رہنے دیا جائے بلکہ ان کی جہالت کو دور کرنے اور ان کے اندر اسلامی شعور پیدا کرنے کا باقاعدہ انتظام ہونا چاہئے ورنہ معاشرے کے اندر ایسے عناصر بکثرت موجود رہیں گے۔ جو مملکت کے مفاد پر اپنے ذاتی مفاد کو ترجیح دیں گے اور اس قسم کے عناصر کی موجودگی میں کسی مملکت کی ترقی اور استحکام تو درکنار مملکت کا بقا بھی معرضِ خطر میں پڑ جاتا ہے۔ اس واقعہ سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ایک اسلامی مملکت کے لئے صحیح نظامِ تعلیم و تربیت بمنزلہ روح کے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض کیا گیا ہے اور دوسری طرف تعلیم عمومی

کا انتظام اسلامی مملکت کا اولین فرض قرار دیا گیا تاکہ مسلمانوں کی پوری آبادی میں اسلامی شعور پھیل جائے۔ اور وہ صحیح معنوں میں مملکت کی خدمت کر سکیں۔

اسلامی نظام زندگی میں تعلیم کو جو اہمیت حاصل ہے اس کے پیش نظر چاہئے تو یہ تھا کہ تعلیم کے حاصل کرنے اور تعلیم کے پھیلانے میں مسلمان دوسری قوموں کے مقابلے میں زیادہ سرگرمی اور شوق ظاہر کرتے اور اسلامی مملکتیں جہالت کو اپنا بدترین اور خوفناک ترین دشمن سمجھ کر اس کا قلع قمع کرنے کے لئے اپنے پورے ذرائع اور وسائل صرف کر دیتیں' مگر افسوس ہے کہ اس سلسلہ میں عموماً کوتاہی برتی گئی بلکہ مجرمانہ غفلت کا ثبوت دیا گیا ہے۔ اس کوتاہی اور غفلت نے مسلمانوں کو ترقی اور عروج کی بلندیوں سے تنزل اور انحطاط کے گڑھے میں گرایا۔ مگر پھر بھی اِن کی آنکھیں نہیں کھلتیں اور وہ صحیح قسم کی تعلیم پھیلانے کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ اس مضمون میں صرف اِن کوتاہیوں کا جائزہ لیا جائے گا جس کی ذمہ داری پاکستان کی قیادت پر عائد ہوتی ہے۔

۱۹۴۶ء کے بعد اس بات کے آثار بالکل نمایاں ہو گئے تھے کہ ہند و پاکستان میں برطانوی اقتدار اور تسلط کا دور ختم ہونے والا ہے اور زود یا بدیر زمام کار باشندگان ملک کے ہاتھ میں منتقل ہونے والی ہے۔ گاندھی جی کی قیادت اور رہنمائی نے ہندو قوم میں ایک نئی روح پھونک دی تھی اور وہ قدیم ہندو تہذیب و تمدن کے احیا کے خواب دیکھنے لگے تھے۔ انہوں نے آنے والے حالات کا اندازہ لگا کر اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے پہلے ہی سے منصوبے تیار کر لئے۔ ظاہر ہے کہ ملک میں ایک تہذیبی اور تمدنی انقلاب برپا کرنے کا سب سے مؤثر ذریعہ تعلیم ہے۔ چنانچہ انہوں نے ماہرین تعلیم کی مدد سے ایک ایسا نظام تعلیم بنا لیا جو ان کی زندگی کے نصب العین کے مطابق تھا۔ اور جو ہندو تہذیب و تمدن کا خدمتگار بن سکتا تھا جو نہی گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت صوبوں کو خود اختیاری ملی اور اکثر صوبوں میں کانگریسی وزارتیں قائم ہوئیں انہوں نے فوراً ودیا مندر سکیم اور وردھا سکیم جیسی تعلیمی سکیمیں نافذ کر دیں۔ ملک پر بدستور برطانوی اقتدار و تسلط قائم تھا۔ باشندگان ملک کا بہت بڑا طبقہ اور خصوصاً مسلمان اِن تعلیمی اسکیموں کے سخت مخالف تھے۔ مگر ہندو رہنماؤں نے اِن محدود اختیارات سے' جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی مدد سے صوبائی وزارتوں کو حاصل ہوئے تھے' پورا پورا فائدہ اٹھایا اور ہندو تہذیب و تمدن کی نشاۃ ثانیہ کی داغ بیل ڈال دی۔

یہ تو تھا ہندو قیادت کا کارنامہ۔ اب ذرا مسلمانوں کی قیادت کا حال سنئے۔ وہ مروجہ مغربی نظام تعلیم کی خامیوں اور مضرتوں سے بے خبر نہ تھے۔ وہ آنے والے انقلاب سے بھی بے خبر نہ تھے۔ بلکہ یہی آنے والا انقلاب مسلم لیگ کی نئی تنظیم کا محرک ہوا۔ اسی انقلاب کے متوقع نتائج نے ساری قوم کو لیگ کے جھنڈے تلے لا کھڑا کیا۔ پاکستان کے مطالبہ کا سب سے بڑا محرک یہی بات تھی کہ متحدہ ہندوستان میں ہندو اپنی عددی اکثریت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ملک میں ایک ایسا نظام حکومت قائم کر لیں گے جو ان کی مخصوص تہذیب و تمدن کا خادم ہو گا۔ اِس طرح ہندی مسلمان برطانیہ کی غلامی سے نجات پا کر ہندو کی غلامی میں گرفتار ہو جائیں گے۔ وہ اپنے آپ کو اسی صورت میں آزاد سمجھ سکتے ہیں کہ وہ اپنے عقیدہ اور نصب العین کے مطابق زندگی بسر کر سکیں اور اسلامی تہذیب اور اسلامی روایات کو پھر سے زندہ کر سکیں۔ لیگی رہنما یہ بھی جانتے تھے کہ اسلامی تہذیب اور اسلامی روایات کے احیا کے لئے نظام تعلیم کو لازماً بدلنا پڑے گا۔ چنانچہ انہوں نے مختلف موقعوں پر تحریر اور تقریر کے ذریعے مغربی تعلیم کی خرابیوں اور خامیوں کی نشان دہی کی۔ انہوں نے واردھا اسکیم اور ودیا مندر اسکیم کی پورے زور سے مخالفت کی۔ لیکن اس کے باوجود انہیں اس بات کی توفیق حاصل نہ ہوئی کہ وہ اپنے لئے کوئی مناسب اور موزوں نصاب تعلیم اور نظام تعلیم تجویز کر لیں۔ ۱۹۳۷ء میں صوبائی خود اختیاری کے تحت جن صوبوں کی زمام کار

مسلم لیگ کے ہاتھ میں آئی، وہاں بدستور وہی مغربی نظام تعلیم قائم رہا جس کی خامیوں کو طشت از بام کرنے میں وہ کسی سے پیچھے نہ تھے اور کانگریسی صوبوں میں انہوں نے کانگریس کے لائے ہوئے نظام تعلیم اور نصاب تعلیم کی مخالفت پر اکتفا کی۔

کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت مسلمان ایک نہایت نازک اور پر آشوب دور سے گزر رہے تھے۔ وہ زندگی اور موت کی کش مکش میں مبتلا تھے اِس لئے اس زمانے میں مخالف قوتوں کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرکے قوم کو ان کے تباہ کن اثرات سے بچا لینا ہی بہت بڑا کام تھا۔ اس بحرانی دَور میں کسی تعمیری کام کے لئے منصوبہ بندی کی مہلت کیسے مل سکتی تھی: یہ کارنامہ کیا کم ہے کہ ایک بکھری ہوئی قوم کے افراد کو سمیٹ کر ایک مرکز پر جمع کر لیا گیا اور ہم وطنوں اور غیر ملکی فرمانرواؤں کی مخالفت کے باوجود قیام پاکستان کی تحریک کو کامیابی کی منزل تک پہنچا دیا گیا۔ بحث کو مختصر کرنے کے لئے ہم اِس عذر کو معقول تسلیم کر لیتے ہیں اور اِس بات کی تصدیق کر دیتے ہیں کہ واقعی تعمیری منصوبے تیار کرنے سے پہلے ایک ایسا خطۂ زمین حاصل کرنا ضروری تھا جہاں ان منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا جا سکے۔ ورنہ اگر زمین کے کسی گوشے میں بھی اقتدار حاصل ہوتا تو ساری سکیمیں دھری کی دھری رہ جاتیں لیکن واقعات اس کی صداقت کی تصدیق نہیں ہوتی۔ تعلیم اور اس قسم کے دوسرے اہم مسائل کی طرف سے ہماری قیادت کی بے اعتنائی اگر واقعی کسی مصلحت کی بنا پر ہوتی تو قیام پاکستان کے بعد فوراً ان کی طرف توجہ کی جاتی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ استقلال پاکستان کے بعد ہماری قیادت نے یک لخت رنگ بدلا۔ انہیں یہ تک یاد نہ رہا کہ پاکستان کا مطالبہ اس لئے کیا گیا تھا کہ یہاں اسلامی نظام حکومت قائم کیا جائے۔ چنانچہ پاک دستور یہ کے پہلے اجلاس میں یہ حیرت انگیز اعلان کیا گیا کہ "آپ دیکھیں گے کہ اس مملکت کے شہری ہونے کی حیثیت سے، مذہبی حیثیت سے نہیں، بلکہ سیاسی حیثیت سے رفتہ رفتہ نہ ہندو ہندو رہیں گے اور نہ مسلمان مسلمان"

لیکن قوم کی یادداشت اتنی کمزور نہ تھی۔ اُسے خوب یاد تھا کہ اس نے یہ عدیم النظیر قربانیاں اِس لئے نہیں دی تھیں کہ دُنیا کی لادینی مملکتوں میں ایک نئی مملکت کا اضافہ ہو جائے۔ بلکہ اس کی ساری دوڑ دھوپ اس لئے تھی کہ دنیا میں ایک مثالی اسلامی مملکت قائم ہو جائے جہاں سے اسلام کا نور چار دانگِ عالم میں پھیلایا جا سکے۔ چنانچہ اس اعلان پر پاکستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اضطراب کی لہر دوڑ گئی اور اربابِ اقتدار سے مطالبہ کیا گیا کہ مملکتِ پاکستان کی غرض وغایت کا صاف الفاظ میں اعلان کیا جائے۔ عامۃ الناس کے اس متفقہ مطالبہ پر ہماری قیادت نے قیام پاکستان کے ایک سال سات ماہ بعد قرار دادِ مقاصد پاس کی۔ ایک آزاد مملکت کی غرض و غایت کی تکمیل کا مؤثر ترین ذریعہ اس کا نظام تعلیم ہوتا ہے۔ اِس لئے نظام تعلیم مملکت کے اغراض و مقاصد کا تابع ہوتا ہے۔ ہماری قیادت چونکہ بعض مصالح کی بنا پر اب تک پاکستان کو ایک لادینی ریاست بنانے کے منصوبے سوچ رہی تھی اور ایک لادینی ریاست کی خدمت کے لئے مغربی نظام تعلیم سب سے زیادہ موزوں ہے۔ اِس لئے موجودالوقت نظام تعلیم کو بالکل بدل دینے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔ پاکستان کے ایک آزاد ریاست بن جانے کی وجہ سے چند جزئی تبدیلیاں کر لینے سے مقصد پورا ہو سکتا تھا۔ چناں چہ اس مقصد کے پیشِ نظر حکومت کے بعض ذمہ دار ارکان اور عہدے داروں نے یورپ اور امریکہ کے دورے کرکے وہاں کے نظامِ تعلیم کا مطالعہ کیا۔ اِس کے بعد اساتذہ اور محکمہ تعلیمات کے عہدہ داروں اور طلبہ کے گروہ ان ممالک میں بھیجے جانے لگے اور دن بدن یہ سلسلہ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ ان وجوہات کی بنا پر قرار دادِ مقاصد کے پاس ہو جانے سے پہلے اِس بات کا کوئی امکان نہ تھا کہ حکومت، پاکستان میں ایک اسلامی نظام تعلیم نافذ کرنے کے مسئلہ پر غور کرتی۔ مگر قرار داد مقاصد کی منظوری کے بعد صورت حال بالکل بدل گئی۔ قرار دادِ مقاصد کی ایک دفعہ یہ بھی ہے کہ "مملکت پاکستان کے لئے ایک ایسا دستور مرتب کیا جائے جس کی رو سے مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات و مقتضیات کے مطابق، جو قرآن مجید اور سنت رسول میں متعین ہیں، ترتیب دے سکیں"۔

اس دفعہ کی تشریح کرتے ہوئے پاکستان کے وزیر اعظم مرحوم لیاقت علی خان نے فرمایا تھا کہ :-

"جناب والا۔ آپ اس امر کو بھی مدنظر رکھیں کہ حکومت ایک غیر جانب دار تماشائی کی حیثیت سے اس امر پہ اکتفا نہیں کرے گی کہ مسلمانوں کو اِس مملکت میں صرف اپنے مذہب کو ماننے اور اس پر عمل کرنے کی آزادی حاصل ہو کیونکہ حکومت کے اس طریق عمل کا مطلب یہ ہوگا کہ جو مقاصد پاکستان کے مطالبہ کے محرک تھے انہی کی خلاف ورزی ہو، حالانکہ یہ مقاصد اِس مملکت کا سنگِ بنیاد ہونے چاہئیں جسے ہم تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ یہ مملکت ایک ایسا ماحول پیدا کرے گی جو ایک حقیقی اسلامی معاشرہ کی تعمیر میں ممد و معاون ہو۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ مملکت کو اپنی مساعی میں مثبت پہلو اختیار کرنا ہوگا۔ جناب والا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ قائد اعظم اور مسلم لیگ کے دوسرے رہنماؤں نے ہمیشہ یہ واضح اور غیر مبہم اعلانات کئے ہیں کہ پاکستان کے قیام کے لئے مسلمانوں کا مطالبہ اس حقیقت پر مبنی ہے کہ مسلمانوں کے ہاں اپنا طریقِ زندگی اور ضابطۂ اخلاق موجود ہے انہوں نے بارہا اس امر پر بھی زور دیا کہ اسلام کا مطلب صرف یہ نہیں کہ خدا اور بندے کے درمیان ایک ایسا تعلق قائم ہو جسے مملکت کے کاروبار میں کسی قسم کا دخل نہ ہو۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں عمرانی اخلاق کے متعلق مخصوص ہدایات ہیں اور اسلام روزمرہ پیش آنے والے مسائل کے متعلق معاشرہ کے طرز عمل کی رہنمائی کرتا ہے۔ اسلام ذاتی عقائد اور اخلاق کا نام نہیں بلکہ اپنے پیروؤں سے توقع کرتا ہے کہ وہ ایک ایسے معاشرہ کی تعمیر کریں جس کا مقصد حیات صالح ہو۔"

قرارداد مقاصد کے پاس ہو جانے کے بعد خیال پیدا ہوا تھا کہ اب اس بات کی طرف توجہ کی جائے گی کہ موجودالوقت مغربی نظام تعلیم کی بجائے اسلامی نظامِ تعلیم نافذ کیا جائے اِس لئے کہ ایک اسلامی نظام تعلیم ہی حقیقی اسلامی معاشرے کی تعمیر میں ممد و معاون ہو سکتا ہے لیکن ؎

خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قراردادِ مقاصد کے پاس کرنے سے مقصد یہ تھا کہ عامۃ المسلمین کو اس بات کا یقین آجائے کہ پاکستان میں واقعی اسلامی نظام حکومت قائم کیا جائے گا۔ اور رفتہ رفتہ حکومت کی مشینری صحیح نہج پر چلنے لگے گی اور وہ دن دور نہیں جب پاکستان ہر پہلو سے ایک اسلامی مملکت بن جائے گی۔ اس کے بعد لازماً وہ حکومت کے اعمال کا احتساب چھوڑ دیں گے اور کہیں گے کہ اب ہمیں اربابِ اقتدار کو مہلت دینی چاہئے کہ وہ اطمینان کے ساتھ اسلامی انقلاب کے مختلف مراحل طے کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ادھر مطالبہ کی مہم کامیابی کے ساتھ ختم ہونے سے ملک کی سیاسی فضا میں سکون پیدا ہوا، اُدھر اربابِ اختیار قرارداد مقاصد کو دفن کر دینے کے منصوبے سوچنے لگے بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ کے منظر عام پر آجانے سے ان کے خوفناک ارادے طشت از بام ہو گئے اور سارے ملک میں ایک بار پھر بے چینی کی لہر دوڑ گئی اور ہر طرف سے احتجاج کا طوفان اٹھا۔ ارباب کار نے ہوا کا رخ دیکھا تو ؎ نرخ ارزاں بود کالا در دکان انداختم، کے اصُولِ پر عمل کرتے ہوئے اس رپورٹ کو کچھ عرصے کے لئے طاقِ نسیان پر رکھ دیا۔ اور اب کسی مناسب موقع کی تاک میں ہیں تاکہ حالات سازگار ہوں تو ایک ایسا دستور پاس کرالیا جائے جس پر لیبل تو چاہے اسلامی دستور کا لگا ہوا ہو مگر اس کے اندر صرف وہی کچھ ہو جو ان کی خواہشات نفس کا تقاضا ہے، چاہے وہ اسلام کے مطابق ہو یا مخالف۔

اس طول طویل بحث سے مقصد یہ ہے کہ نظام تعلیم ہمیشہ اس مقصد کا تابع اور خادم ہوتا ہے، جس پر کسی مملکت کی عمارت اٹھائی جاتی ہے۔ برطانوی حکومت کا مقصد برعظیم ہند و پاکستان میں اپنے اقتدار کو قائم رکھنا تھا۔ اس کے لئے ضروری تھا

تعلیمی حالت کا جائزہ

کہ باشندگانِ ملک کو اپنی مخصوص تہذیبوں اور روایات سے بدظن کر کے مغربی تہذیب اور مغربی طرزِ فکر و عمل کا گرویدہ بنا دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے ایک ایسا نظام تعلیم قائم کیا جس نے اس مقصد کو باحسن وجوہ پورا کر دیا۔ ان کے قائم کئے ہوئے نظام تعلیم کی برکت سے ملک کے اندر ہی سے ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جس نے انگریزی اقتدار اور تسلط کو قائم رکھنے اور مغربی تہذیب و تمدن کو پھیلانے کے لئے اپنی ساری جسمانی اور دماغی قوتوں کو وقف کر دیا۔ اب جب ہمارے اربابِ اقتدار کو ابھی تک یقینی طور پر یہ بات معلوم نہیں ہو سکی کہ اس مملکت میں کس قسم کا نظام حکومت قائم ہونے والا ہے تو نظام تعلیم و تربیت کے بارے میں وہ کوئی فیصلہ کیونکر کر سکتے ہیں۔ جس طرز کا نظام حکومت وہ قائم کرنا چاہتے ہیں قوم اسے قبول کرنے کیلئے تیار نہیں۔ اور قوم جس طرز کے نظام حکومت کا مطالبہ کر رہی ہے اسے نافذ کرنے کے لئے وہ اپنے آپ کو تیار نہیں پاتے۔ اس لئے تعلیم کا مسئلہ بظاہر کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اب تک اس راہ میں کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا اور اگر کوئی قدم اٹھایا بھی گیا ہے تو غلط سمت میں اٹھایا گیا ہے۔ البتہ اربابِ اقتدار جس طرح قرار داد مقاصد کے منشاء اور مقتضیات کے خلاف معاشرہ اور دستور بنانے کے لئے پورا زور لگا رہے ہیں اسی طرح نظام تعلیم میں بھی چپکے چپکے ایسی تبدیلیاں کرتے جا رہے ہیں جن سے وہ بجائے حقیقی اسلامی معاشرے کی بجائے اپنا ہم خیال اور ہم نوا معاشرہ تیار کر سکیں۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کی تعلیمی حالت کی کہانی خود حکومت کی زبانی بھی بیان کر دی جائے تاکہ لوگ خواہ مخواہ کسی بدگمانی کے مرتکب نہ ہو جائیں۔ حکومتِ پاکستان نے حال ہی میں پاکستان کی تعلیمی ترقی کے لئے ایک شش سالہ منصوبہ تیار کیا ہے جس میں ملک کی موجودہ تعلیمی حالت کا تفصیلی جائزہ لے کر آئندہ کے عزائم اور امکانات کا ایک خاکہ پیش کیا ہے۔ اس منصوبہ کی تمہید میں لکھا گیا ہے کہ "پاکستان کے حصول کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ ہندوستانی مسلمان آزادی سے اپنی زندگیوں کی تشکیل اسلامی اصولوں کے مطابق کر سکیں۔ اس لئے پاکستان کے معماروں کے لئے ناگزیر تھا کہ وہ اس مقصد کی روشنی میں مملکت کی زندگی کے ہر ہر شعبہ کا جائزہ لیں اور اس کی اصلاح اور درستی کے لئے مناسب تدابیر اختیار کریں۔ جیسا کہ ہونا چاہئے تھا اس کام کی ابتدا تعلیمی حالت کے جائزے سے کی گئی۔ چنانچہ نومبر ۱۹۴۷ء میں وزیر تعلیمات آنریبل فضل الرحمن نے ملک کے ماہرین تعلیم کی ایک کانفرنس منعقد کی تاکہ مملکت کے موجود الوقت تعلیمی حالات اور آئندہ کے امکانات کا جائزہ لے کر پاکستان کی مخصوص ضروریات کے پیش نظر نظام تعلیم کی اصلاح کے لئے مناسب اور موثر انتظامات کئے جائیں۔ اس کانفرنس نے مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا بغور مطالعہ کیا اور منجملہ دیگر سفارشات کے ایک سفارش یہ تھی کہ پاکستان میں تعلیم کا مقصد اور پاکستان کی قومی زبان کا تعین کر کے کوئی تعلیمی پالیسی وضع کی جائے۔ کانفرنس نے محسوس کیا کہ موجودہ نظام تعلیم کو نہ تو باشندگانِ ملک کے مزاج سے کوئی مناسبت ہے اور نہ اس میں ایک جدید مملکت کی ضروریات کو پورا کرنے کی صلاحیت ہے۔ کانفرنس نے صاف الفاظ میں سفارش کی کہ ہمارے نظام تعلیم کی عمارت اسلامی اصولوں کی بنیادوں پر کھڑی ہونی چاہئے اور انگریزی کی جسے اب تک نصاب تعلیم میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل رہی ہے اور جس کی وجہ سے ملکی زبانوں کو نشوونما اور ارتقا کا موقع نہیں مل سکا، اسے اب یہ بلند مقام اردو کے لئے خالی کر دینا چاہئے اور اردو زبان کو پاکستان کی ملکی زبان قرار پا جانا چاہیئے۔"

کانفرنس کی سفارشات پر ایک نگاہ ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کم از کم ۱۹۴۷ء کے اواخر تک حکومت کو تعلیم کے مسئلہ کی اہمیت کا پورا پورا احساس تھا۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کے بے شمار شعبوں میں سے انہوں نے سب سے پہلے اسی شعبہ کی طرف توجہ فرمائی۔ پاکستان کے قیام کا حقیقی مقصد بھی ابھی ان کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہوا تھا۔ انہیں اس بات کا

احساس بھی تھا کہ ہمارے ملک کا نظام تعلیم اسلامی اصولوں کا تابع ہونا چاہئے کیونکہ اسی قسم کا نظام تعلیم پاکستان کے مقصد کی تکمیل میں ممد اور معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ مروجہ مغربی نظام تعلیم کی خامیاں اور خرابیاں بھی ان پر واضح تھیں اور وہ اس بات کو محسوس کر رہے تھے کہ ایک اسلامی مملکت تو درکنار، ایک آزاد جمہوری ریاست کی ضرورتیں بھی اس نظام سے پوری نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے اسے جلد سے جلد ختم کر دینا چاہئے اور نئے حالات کے تقاضوں کے پیش نظر تعلیمی پالیسی وضع کرکے ایک نیا نظام تعلیم ملک میں نافذ کرنا چاہئے۔ لیکن یہ ساری باتیں اس وقت کہی گئیں جب کہ پاکستان ابھی نیا نیا قائم ہوا تھا۔ اور بہت سے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اسلامی نظام حکومت کے قیام کے بارے میں جو وعدے کئے گئے ہیں، ان کو پورا کرنا ہمارا اخلاقی فرض ہے۔ اور جو لوگ ان وعدوں کی آڑ لے کر اپنے سیاسی اغراض پورا کرنا چاہتے تھے ابھی انہوں نے اپنے ارادوں اور خواہشوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے منظم جدوجہد نہیں شروع کی تھی۔ مگر حالات بدلتے گئے اور خود غرض لوگوں نے ہر طرف اپنا جال پھیلانا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ اسلامی حکومت کا قیام، اسلامی طرز زندگی کی ترویج، اسلامی معاشرے کی تشکیل اور اسلامی نظام تعلیم محض نمائشی پردے بن کر رہ گئے جن کے پیچھے ایک دوسری قسم کا کھیل شروع ہو گیا۔ جسے اسلام سے شاذ و نادر کا بھی واسطہ نہ تھا۔ آنریبل فضل الرحمن کی مقدس آرزوئیں اور ان کی بلائی ہوئی کانفرنس کی گراں قدر سفارشات پورے اہتمام کے ساتھ کسی سرد خانے میں ڈال دی گئیں۔ مہینے اور سال گزرتے گئے اور منزل مقصود کی طرف کوئی قدم نہ اٹھایا گیا۔ بلکہ دن بدن منزل مقصود سے دوری بڑھتی گئی ؎

چشمہ نزدیک تھا منبع سے تو تھا عین صفا
جتنا بڑھتا گیا ہوتا گیا پانی گدلا

مذکورہ بالا کانفرنس کی سفارشات کا نتیجہ صرف یہ نکلا کہ تعلیمی مسائل پر غور و فکر کرنے کے لئے تین مستقل کمیٹیاں قائم کر دی گئیں۔ ایک ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن، دوسری انٹر یونیورسٹی بورڈ اور تیسری کونسل آف ٹیکنیکل ایجوکیشن ہمیں بتایا گیا ہے کہ ان کمیٹیوں کے اجلاس وقتاً فوقتاً ہوتے رہے۔ جن میں بہت سے ابتدائی مسائل طے کرکے تعلیمی منصوبہ بندی کے لئے زمین ہموار کی گئی۔ مگر اس کانفرنس کے انعقاد کے چار سال بعد تک ان مستقل کمیٹیوں کی نشستند و گفتند و برخاستند سے کوئی قابل ذکر نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ یہاں تک کہ مرکزی حکومت نے فیصلہ کیا کہ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۳ء تک اجتماعی فلاح و بہبود کے کاموں پر اٹھارہ کروڑ روپے کی رقم صرف کی جائے اور اس میں سے نصف رقم تعلیمی کاموں کے لئے مخصوص کر دی۔ اسی طرح کولمبو پلان کے تحت پاکستان کے ترقیاتی پروگرام پر ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۷ء تک دو ارب ساٹھ کروڑ روپے کی گراں قدر رقم صرف کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور اس رقم میں سے بھی انیس کروڑ روپیہ تعلیمی کاموں کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔ ترونہ یہ تعلیمات آنریبل فضل الرحمن نے جولائی ۱۹۵۱ء میں صوبوں کے تعلیمی وزیروں، ڈائرکٹروں اور یونیورسٹیوں کے وائس چانسلروں کی ایک کانفرنس بلائی۔ اس کانفرنس نے غور و فکر کے بعد متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ مرکزی حکومت کا شعبہ تعلیمات، صوبائی اور ریاستی حکومتوں کے تعاون اور مشورے سے پاکستان کی تعلیمی ترقی کے لئے ایک شش سالہ منصوبہ تیار کرے۔ اس فیصلہ کے بعد مرکزی حکومت کے شعبہ تعلیم کے ذمہ دار عہدے داروں نے پاکستان کے دورے شروع کئے تاکہ شش سالہ منصوبہ بندی کے لئے ضروری معلومات فراہم کی جائیں۔

سوال یہ ہے کہ نومبر ۱۹۴۷ء کی کانفرنس کے بعد ہی یہ کام کیوں نہ شروع کر دیا گیا۔ اور یہ پورے چار سال کیوں ضائع

کر دیئے گئے۔ خود شش سالہ منصوبہ میں بھی یہ سوال اُٹھایا گیا ہے اور اس کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ :۔

"بجا طور پر سوال کیا جا سکتا ہے کہ جب مذکورہ بالا کمیٹیوں (ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن، انٹر یونیورسٹی بورڈ اور کونسل آف ٹیکنیکل ایجوکیشن) نے ابتدائی مراحل کو طے کر کے منصوبہ بندی کے لئے زمین ہموار کر دی تھی تو مرکزی حکومت منصوبہ بندی کا کام اس سے پہلے کیوں شروع نہ کر سکی ؟ اس سوال کا جواب یہ ہے۔ کہ تقسیم ہند کے بعد جو ابتری اور تباہی پھیلی اور اس کی وجہ سے جو پیچیدہ مسائل پیدا ہو گئے، مرکزی، صوبائی اور ریاستی حکومتیں ان کو سلجھانے میں اس قدر منہمک تھیں کہ انہیں اس مسئلہ کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ہی نہیں مل سکی۔ دوسرے انہیں اپنے محدود مالی ذرائع ملکی دفاع کے استحکام، مہاجرین کی آباد کاری اور ملک کی معاشی زندگی کی بحالی کے لئے وقف کرنے پڑے"

ملکی دفاع کا مسئلہ تو ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جس کی طرف سے کوئی ترقی پذیر مملکت کبھی بھی مطمئن نہیں ہو سکتی اور موجودہ بین الاقوامی سیاسی پیچیدگیوں کے پیش نظر تو اس کی طرف پہلے سے بھی زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔ مہاجرین کی آباد کاری کا کام بھی ابھی تک پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچا اور معاشی صورت حال تو دن بدن نازک تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ غرض تقسیم ہند سے پیدا شدہ مسائل بدستور باقی ہیں اور مرکزی، صوبائی اور ریاستی حکومتوں کی توجہ کے محتاج ہیں۔ اِس لئے معلوم نہیں کہ اب بھی نظام تعلیم کی اصلاح اور ترقی کے لئے وقت نکالا جا سکے گا یا نہیں۔ بہرحال شش سالہ منصوبہ تیار ہو چکا ہے۔ اور اس میں ایک بار پھر اعلان کیا گیا ہے کہ "پاکستان کا نظام تعلیم اسلامی اصُولوں پر مبنی ہو گا۔ کیونکہ اِس کے بغیر پاکستان میں نیا معاشرتی نظام معرض وجود میں نہیں آ سکتا اور نہ اس کے بغیر پاکستان دنیا کے امن اور ترقی کے لئے کوئی قابلِ ذکر خدمت انجام دے سکتا ہے"۔ اربابِ کار کو اس کام کی عظمت اور مشکلات کا بھی اندازہ ہے۔ چنانچہ منصوبہ میں کہا گیا ہے کہ "یہ کوئی معمولی کام نہیں اِس کی تکمیل کے لئے موجودہ نظام تعلیم میں اصولی اور بُنیادی تبدیلیاں کرنی پڑیں گی۔ اس کے لئے نہ صرف تعلیم کے موجودہ ڈھانچے اور نصاب کو بدل دینا ہو گا بلکہ والدین، اساتذہ، ناظمین تعلیمات اور عامتہ الناس کی ذہنیتوں کو بھی بدلنا پڑے گا"۔

اس عظیم الشان کام کو کرنے کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں ؟ اس سوال کا جواب بھی شش سالہ منصوبہ کے الفاظ میں سُنیئے :۔

"اس سلسلہ میں اس بات کا ذکر کر دینا کافی ہے کہ مرکزی اور صُوبائی حکومتیں اور یونیورسٹیاں، نصاب تعلیم کو از سرِ نو ترتیب دینے میں مصروف ہیں۔ اساتذہ کے تربیتی نصاب پر بھی نظرِ ثانی کی جا رہی ہے۔ امید ہے کہ اس کے بعد پاکستان کا نظام تعلیم کم و بیش اس مقصد کے بالکل مطابق ہو جائے گا۔ جو پاکستان کے قیام کا باعث ہوُا"

اِسی سلسلے میں ایک اور دلچسپ بات کہی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ :۔

"قومی نظام تعلیم کے لئے سب سے پہلی ضروری شرط یہ ہے کہ وہ ملک کے تمام حصوں میں یکساں ہو، اس کے مختلف تعلیمی مدارج باہم مربوط اور متوافق ہوں اور ہر درجہ کے لئے مسلمہ اصولوں کے مطابق طلبہ کی عمر کی حد بندی کر دی گئی ہو"

چنانچہ اِس سلسلے میں مختلف تعلیمی اداروں، بورڈوں اور کمیٹیوں کی طرف سے مختلف تجویزیں پیش کی گئی ہیں۔ مرکزی حکومت

نے بورڈ آف سکینڈری ایجوکیشن کراچی کے صدر کی ایک یادداشت صوبائی اور مرکزی حکومتوں اور یونیورسٹیوں کے پاس استصواب رائے کے لئے ارسال کی ہے۔ اس یادداشت میں موجودہ تعلیمی ڈھانچے اور ثانوی مدارس کے نصاب تعلیم کے بارے میں کچھ تجاویز پیش کی گئی ہیں۔

جہاں تک تعلیمی ڈھانچے کی از سر نو تنظیم کا تعلق ہے بورڈ کے صدر کی رائے ہے تعلیم کے مندرجہ ذیل نمایاں اور باہم مربوط مدارج ہونے چاہئیں۔

ا۔ ابتدائی تعلیم سے پہلے — دو سال۔ عمر + ۳ سال سے + ۵ سال تک

ب۔ ابتدائی تعلیم — پانچ سال۔ عمر + ۵ سال سے + ۱۰ سال تک

ج۔ ثانوی تعلیم

۱۔ ادنیٰ ثانوی — تین سال۔ عمر + ۱۰ سال سے + ۱۳ سال تک

۲۔ ثانوی — تین سال۔ عمر + ۱۳ سال سے + ۱۶ سال تک

۳۔ اعلیٰ ثانوی — دو سال۔ عمر + ۱۶ سال سے + ۱۸ سال تک

د۔ یونیورسٹی —

انڈر گریجوایٹ — تین سال۔ عمر + ۱۸ سال سے + ۲۱ سال تک

کراچی بورڈ کے صدر کی ان تجاویز کو منظور کر لینے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پاکستانی نوجوانوں کو اپنی عمر کا بیشتر اور بہترین حصہ درسگاہوں کی نذر کر دینا پڑے گا۔ اکیس سال کی عمر تک تعلیم میں مشغول رہنے کے بعد بھی وہ انڈر گریجویٹ ہی رہیں گے اور ڈگری حاصل کرنے کے لئے مزید دو تین برس تک کوہ کنی کرنی پڑے گی۔ نصاب تعلیم کے بارے میں جناب صدر نے کیا تجاویز پیش فرمائی ہیں شش سالہ منصوبہ میں اس کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ مگر اس کا اندازہ اس نصاب تعلیم سے لگایا جا سکتا ہے جو بورڈ آف سکینڈری ایجوکیشن کراچی نے ۱۹۵۲ء سے اپنے مدارس میں نافذ کیا ہے۔ اس نصاب تعلیم کا سب سے بڑا شاہکار یہ ہے کہ عربی اور فارسی زبانوں کو گویا نصاب تعلیم سے خارج ہی کر دیا گیا ہے اور اس کے اسلامی ہونے کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ سکینڈری اسکولوں کی اعلیٰ جماعتوں میں بھی ہفتہ میں ایک پیریڈ مذہبی تعلیم کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔

ہاں تو چونکہ ابھی تک تعلیم کے مختلف مدارج اور ہر درجہ کی مدت تعلیم کے بارے میں کوئی متفقہ فیصلہ نہیں ہو سکا۔ اس لئے فیصلہ کیا گیا ہے کہ فی الحال صوبائی حکومتیں اپنے اپنے صوبوں کے لئے موجودہ نظام تعلیم کی بنیاد پر تعلیمی ترقی کی شش سالہ سکیمیں تیار کر لیں۔ جب نئے نظام تعلیم کے بارے میں کوئی آخری اور قطعی فیصلہ ہو جائے تو ان اسکیموں میں ضروری مناسب ترمیمیں اور تبدیلیاں کر لی جائیں گی۔

آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک　　　کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پاکستان کی موجودہ تعلیمی حالت کا مختصر سا جائزہ لے لیا جائے۔ تاکہ اس مسئلہ کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ ہو سکے۔

ماہرین تعلیم کا اتفاق ہے کہ بچے کی باقاعدہ تعلیم و تربیت زیادہ سے زیادہ تین برس کی عمر سے شروع ہو جانی چاہئے۔ تعلیمی نقطہ نظر سے تین برس سے چھ برس تک کی عمر کا زمانہ نہایت اہم زمانہ ہے۔ اس زمانے میں جو نقوش بچے کے ذہن پر مرتسم ہو جاتے ہیں

تعلیمی حالت کا جائزہ

بعد کی پوری زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ترقی پذیر مملکت میں اس زمانے کی تعلیم و تربیت کے لئے خاص اہتمام کیا جاتا ہے اور یہ کام اعلٰے تعلیمی استعداد رکھنے والے اساتذہ کے سپرد کیا جاتا ہے۔ مگر پاکستان میں اس عمر کے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے سرکاری اداروں کی تعداد ناقابل ذکر ہے۔ ہاں بڑے بڑے شہروں میں چند پرائیویٹ ادارے ضرور قائم ہیں۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق صرف کراچی، سندھ، مشرقی بنگال اور صوبہ سرحد میں اس عمر کے بچوں کی تعداد ۲۷ لاکھ سے زیادہ ہے۔ اس میں سے صرف ایک ہزار کے قریب بچے مختلف اداروں میں زیر تربیت ہیں۔ باقی اپنی عمر کے ان قیمتی سالوں کو ضائع کر رہے ہیں۔

اس کے بعد ابتدائی تعلیم کی باری آتی ہے۔ جس کے لئے عام طور پر چھ برس سے لے کر گیارہ برس تک کی عمر کا زمانہ مخصوص ہے۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق پاکستان میں اس عمر کے بچوں کی کل تعداد کوئی ۹۵ لاکھ ہوگی۔ اس وقت جو طلبہ ابتدائی مدارس میں زیر تعلیم ہیں ان کی مجموعی تعداد کوئی ۳۲ لاکھ ہے۔ گویا دو تہائی پاکستانی بچے ابتدائی تعلیم تک سے محروم ہیں۔ شش سالہ منصوبے کے بیان کے مطابق بہت کم ابتدائی مدارس ایسے ہیں جو ان اوصاف کے حامل ہیں جن کا وجود ایک اچھے ابتدائی مدرسے کے لئے لازمی اور ضروری سمجھا جاتا ہے۔ ابتدائی مدارس کی مجموعی تعداد چالیس ہزار کے قریب ہے اور اساتذہ کی مجموعی تعداد تقریباً نوای ہزار ہے جن میں سے ۳۴ ہزار اَن ٹرینڈ ہیں۔ گویا ہر ابتدائی مدرسے میں اوسطاً ایک ٹرینڈ استاد ہے۔ بلکہ بہت سے مدارس میں تو لے دے کے بس ہی ایک استاد اور وہ بھی بعض صورتوں میں اَن ٹرینڈ۔ اکثر مدارس کی عمارتیں ایسی ہیں جن میں روشنی اور ہوا کی آمد و رفت کا کوئی انتظام نہیں بہت کم مدرسے ہوں گے جن کے ساتھ کھیل کا میدان بھی ہے۔ سامان تعلیم یعنی نقشے چارٹ، لائبریری وغیرہ یا تو سرے سے ہیں ہی نہیں، ورنہ ناقص اور ناکافی ہیں۔ اکثر سکولوں میں طلبہ کے لئے ٹاٹ اور چٹائیوں کے سوا کوئی فرنیچر نہیں۔ غرض موجودالوقت ابتدائی مدارس کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔

اب ثانوی تعلیم کا حال سنئے۔ پورے پاکستان میں لوئر مڈل، اپر مڈل اور ہائی اسکولوں کی کل تعداد ساڑھے چھ ہزار کے لگ بھگ ہے۔ جن میں کم و بیش ساڑھے گیارہ لاکھ طلبہ تعلیم پا رہے ہیں۔ ابتدائی مدارس کے طلبہ کی مجموعی تعداد کے مقابلے میں یہ تعداد تقریباً ایک تہائی کے برابر ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جو طلبہ ابتدائی مدارس میں زیر تعلیم ہیں ان میں سے دو تہائی طلبہ ثانوی تعلیم سے محروم رہتے ہیں۔ ثانوی مدارس کے اساتذہ کی مجموعی تعداد تقریباً چوالیس ہزار ہے جن میں چوبیس ہزار ان ٹرینڈ ہیں اور صرف بیس ہزار ٹرینڈ ہیں گویا ہر ثانوی مدرسے میں اوسطاً تین ٹرینڈ استاد ہیں۔ عمارت، سامان تعلیم اور کھیل کے میدان کے لحاظ سے ثانوی مدارس کی حالت ابتدائی مدارس سے بھی بدتر ہے۔

موجودہ نظام تعلیم کا ایک افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ سرکاری درس گاہوں کی تعداد بہت قلیل ہے اس لئے ملک کے گوشے گوشے میں غیر سرکاری درس گاہیں قائم ہیں جو بالکل تجارتی اصولوں پر چلائی جا رہی ہیں۔ ان درس گاہوں میں قوم کے نونہالوں کی تعلیم و تربیت کا کام جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے ان میں سے اکثر اس کام کے لئے کوئی اہلیت اور صلاحیت نہیں رکھتے۔ چنانچہ ان مدارس کے طلبہ کی تعلیمی حالت نہایت قابل رحم ہے۔ ان درس گاہوں کی بدولت تعلیم بھی چور بازاری کی لعنت کا شکار ہو گئی ہے۔ طلبہ سے ناقابل برداشت فیس وصول کی جاتی ہیں اور بعض صورتوں میں داخلہ کے لئے بڑی بڑی پگڑیاں بھی دینی پڑتی ہیں۔

ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا حال آپ نے سُن لیا۔ اس کے بعد اعلٰے تعلیم کی حالت بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ شش سالہ منصوبہ میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے بارے میں تو یہ امید دلائی گئی ہے کہ پانچ چھ سال کے بعد حالت کافی حد تک قابل

اطمینان ہو جائیگی۔ مگر اعلیٰ تعلیم کے بارے میں وہاں بھی یہ اندیشہ ظاہر کیا گیا ہے کہ مستقبل قریب میں اس کی حالت کے روبا صلاح ہونے کی چنداں امید نہیں۔

پاکستان کی تعلیمی حالت مختصر طور پر یوں بیان کی جاسکتی ہے کہ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق یہاں کی آبادی کا ۱۴ء۸ فی صدی حصہ تعلیم یافتہ ہے اور ۸۶ء۲ فیصدی ان پڑھ اور جاہل ہے۔ یہ صورت اس وجہ سے اور بھی زیادہ قابل افسوس ہے کہ پاکستان دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت ہے اور اسلام کی رو سے تعلیم حاصل کرنا ہر مرد اور عورت پر فرض ہے۔ خود حکومت کو بھی اعتراف ہے کہ یہ صورت حال نہایت افسوس ناک ہے۔ اور اسی کی اصلاح کے لئے شش سالہ منصوبہ تیار کیا گیا ہے۔ اس منصوبہ کی رو سے ۱۹۵۶ء کے آخر تک قریباً چوبیس ہزار نئے پرائمری اسکول کھولے جائیں گے۔ جن میں کوئی اٹھتیس لاکھ طلبہ تعلیم پا سکیں گے اندازہ لگایا گیا ہے کہ ان نئے سکولوں کے کھل جانے کے بعد پاکستان کے دو تہائی بچے ابتدائی تعلیم پا سکیں گے۔ اسی عرصہ میں کوئی سواسات سو نئے ثانوی مدارس کھولے جائیں گے جن میں قریباً ڈھائی لاکھ طلبہ کے لئے تعلیم کا انتظام ہو گا۔ ابتدائی اور ثانوی مدارس کے علاوہ اور بہت سے تعلیمی ادارے قائم کئے جائیں گے۔ اخراجات کا تخمینہ (۱۱۵۳۹۰۰۵۱۵) تقریباً ایک ارب پندرہ کروڑ روپے لگایا گیا ہے۔ مستقبل ہی بتائے گا کہ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنایا جائے گا یا نہیں۔ اگر حسن ظن سے کام لیکر یہ سمجھ لیا جائے کہ شش سالہ منصوبہ معین وقت کے اندر اندر پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گا تو اس سے صرف یہ ہوگا کہ ملک کی اکثر و بیشتر آبادی کو مغربی نظام تعلیم سے فیض یاب ہونے کے مواقع فراہم ہو جائیں گے۔ لیکن اس سے ایک آزاد مملکت کی ضرورتیں بھی پوری نہیں ہو سکتیں چہ جائیکہ ایک اسلامی مملکت کی ضرورتیں پوری ہو سکیں۔ ایک اسلامی مملکت کی ضرورتوں کو وہ نظام تعلیم پورا کر سکتا ہے جو کم سے کم مندرجہ ذیل خصوصیات کا حامل ہو:۔

اوّل۔ نظام تعلیم ایسا ہونا چاہئے جس کے تحت ہر بچے کو بنیادی تعلیم دینے کا انتظام ہو۔ کوئی بچہ محض اس وجہ سے بنیادی تعلیم سے محروم نہ رہ جائے کہ اس کے والدین یا سرپرست افلاس اور تنگ دستی کی وجہ سے تعلیم کے اخراجات کا بار نہیں اٹھا سکتے۔ حکومت کو اختیار ہے کہ اگر وہ ضرورت محسوس کرے تو امرا اور اہل ثروت پر تعلیمی ٹیکس عائد کر دے۔ مگر غریب اور نادار بچوں کے لئے کم از کم بنیادی تعلیم کا انتظام مفت ہونا چاہئے ایسے بچوں سے کسی قسم کی تعلیمی فیس کا مطالبہ درست نہیں، انہیں کو سامان تعلیم بھی حکومت کی طرف سے ملنا چاہئے۔ غرض نظام تعلیم ایسا ہونا چاہئے کہ جس کے ذریعے مملکت کی پوری کی پوری آبادی کو جہالت کی لعنت سے نجات دلائی جاسکے۔

دوم۔ بنیادی تعلیم جو ایک اسلامی مملکت کے ہر بچے کا پیدائشی حق ہے اور جس کا انتظام کرنا ایک اسلامی مملکت کا اہم ترین فریضہ ہے اس کا مقصد عوام الناس میں نوشت و خواند اور حساب (Arithmatic) کا علم پھیلانا نہیں۔ بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں میں دین کی سمجھ بوجھ پیدا ہو اور ان کو اس حد تک ہوشیار و خبردار کر دیا جائے کہ وہ غیر مسلمانہ رویۂ زندگی سے بچنے لگیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت واضح الفاظ میں فرمایا کہ:۔

اَلْعِلْمُ ثَلَاثَةٌ وَمَا سِوٰی ذٰلِکَ فَهُوَ فَضْلٌ؛
آيَةٌ مُحْكَمَةٌ اَوْ سُنَّةٌ قَائِمَةٌ اَوْ فَرِيْضَةٌ عَادِلَةٌ

یہ ہے وہ بنیادی تعلیم جس کا حاصل کرنا ہر بچے کا فرض ہے اور جس کا پھیلانا ہر اسلامی مملکت پر لازم ہے ایک اسلامی مملکت کے نظام تعلیم کو اسی لحاظ سے جانچا جائے گا کہ وہ اس مقصد کو کہاں تک پورا کرتا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسلام لوگوں میں نوشت و خواند اور دنیوی علوم کی واقفیت پھیلانا نہیں چاہتا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام لوگوں میں ایسی تعلیم پھیلانا چاہتا ہے۔ جو لوگوں میں صحیح اسلامی طرز فکر و عمل پیدا کرے ورنہ اگر ایک ایک شخص اپنے وقت کا آئن سٹائن ہو جائے لیکن دین کے فہم سے عاری اور غیر مسلمانہ رویہ زندگی میں بھٹکا ہوا ہو تو اسلام ایسی تعلیم پر لعنت بھیجتا ہے۔

تعلیم اگر صحیح اور درست بنیادوں پر نہ دی جائے تو مفید ہونے کی بجائے مضرت رساں ثابت ہوتی ہے۔ مغربی ممالک میں تعلیم عام ہے مگر اس کی عمارت غلط بنیادوں پر اٹھائی گئی ہے۔ اس لئے اس تعلیم عمومی میں سے ظلم، فساد، بین الاقوامی کشمکش، خوفناک اور تباہ کن جنگوں کے سوا کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور بجائے اس کے کہ دنیا کو اس علم کی روشنی سے کوئی فائدہ پہنچتا الٹا اس پر ایک پیہم بے چینی، اضطراب اور خطرے کی حالت طاری ہو گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت وضاحت کے ساتھ صحیح بنیادی تعلیم کی اہمیت بیان فرمادی ہے۔ یہ مقصد موجودہ نصاب تعلیم میں محض چند جزوی تبدیلیاں کر دینے یا دینیات اور اسلامیات کو نصاب تعلیم میں داخل کر لینے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کے لئے ایک طرف تمام علوم کو اسلامی سانچوں میں ڈھالنا پڑے گا اور دوسری طرف پرانے نظام تعلیم کی بجائے ایک نیا نظام تعلیم قائم کرنا پڑے گا۔ وہ جو علامہ اقبال مرحوم نے فرمایا ہے کہ ؎

بولہب را حیدرِ کرار کن

تو اس کا مطلب یہی ہے۔ جب تک پاکستان کا نظام تعلیم ان خصوصیات کا حامل نہ ہوگا اس کے اداروں سے ایسے نوجوان پیدا نہیں ہو سکتے جن کے بغیر ایک اسلامی مملکت کی بقا اور اس کا ارتقا ممکن ہو اور یہ ایک ناقابلِ انکار مگر افسوس ناک حقیقت ہے کہ اب تک اس راہ میں کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔

ان تفصیلات سے ایک بات بالکل واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جس طرح پاکستان کا نیا دستور بنانے کے کام کو کسی نہ کسی بہانے سے مسلسل معرضِ التوا میں ڈالا جا رہا ہے اسی طرح پاکستان میں ایک صحیح نظام تعلیم کے مسئلہ کو بھی کھٹائی میں ڈالا جا رہا ہے بات یہ ہے کہ دستور حکومت اور نظام تعلیم میں چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ بلکہ نظام تعلیم، دستور حکومت کا خادم ہوتا ہے۔ اس لئے مملکت کے نظام تعلیم اور اس کے دستور حکومت کے درمیان کامل ہم آہنگی اور توافق کا پایا جانا ضروری ہے ہمارے ارباب اقتدار اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ دستور حکومت کے بارے میں ان کا رویہ یہ ہے کہ وہ اعلان تو کرتے ہیں خالص اسلامی دستور بنانے کا مگر ساری کوششیں اس بات پر صرف کر رہے ہیں کہ کسی طرح ایک ایسا دستور تیار ہو جائے جس کی بدولت وہ اقتدار کی گدیوں سے بدستور چمٹے رہیں۔ تعلیم کے معاملے میں بھی وہ اسی قسم کی روش اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ ان کی طرف سے بار بار یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ پاکستان کا نظام تعلیم اسلامی بنیادوں پر قائم کیا جائے گا۔ مگر عملاً صرف اس بات کی کوشش کی جا رہی ہے کہ موجودہ مغربی نظام تعلیم کو چند جزوی تبدیلیوں کے بعد قائم رہنے دیا جائے۔ جب تک پاکستان کے دستور کا مسئلہ طے نہیں ہو پاتا تعلیم کا مسئلہ بھی کھٹائی میں پڑا رہے گا۔ بلکہ تعلیم کے میدان میں ہمارے اربابِ اقتدار کو اپنی من مانی کرنے کے زیادہ مواقع حاصل ہیں۔ قوم کی ساری توجہ دستور کی طرف لگی ہوئی ہے۔ اور اُسے ہمارے ارباب اقتدار نہایت ہوشیاری کے ساتھ ٹالتے چلے جا رہے ہیں۔ اس طرح انہیں زندگی

(بقیہ بر صفحہ ۳۱۱)

ہماری صنعتیں

محمد عزیز ایم اے

آج کی دنیا میں کوئی ملک اسی وقت باعزت اور کامیاب ہو سکتا ہے جبکہ وہ محض زراعت کے بجائے صنعت وحرفت کی طرف توجہ کرے۔ دراصل سیاسی وقار اور حیثیت بھی اب صنعتی ترقی پر منحصر ہے۔ پاکستان جسے ایک زندہ قوم نے حاصل کیا ہے اب تک ایک زراعتی ملک ہی رہا ہے۔ ہمسایہ ملک ہندوستان صنعتی میدان میں ہم سے کہیں آگے ہے۔ اور اپنی روزمرّہ کی ضروریات کے لئے ہم یو۔ ایس۔ اے اور یوکے ہی کے محتاج نہیں بلکہ اکثر صورتوں میں ہندوستانی مصنوعات میں خاص اہمیت رکھتی ہیں ظاہر ہے یہ صورت حال اطمینان بخش نہیں۔ کسی ملک میں صنعتی توسیع کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے وہ یہ ہیں۔ خام مواد۔ محنت کشی لیبر ماہرین مشین اور سرمایہ اور یہ ساری چیزیں اسی وقت کامیابی سے کام آسکتی ہیں جبکہ عوام میں بیداری اور حوصلہ (Enterprise) موجود ہو۔ اور دوسری طرف حکومت کی طرف سے حوصلہ کو ترقی دینے کے لئے کام ہو اور مندرجہ بالا وسائل کی فراہمی میں تعاون ہو۔

پاکستان بلاشبہ ایک زراعتی ملک ہے اور اب تک بدقسمتی سے اس کا شمار انہیں ممالک میں ہے جن میں تمام مواد کی فراہمی ہی ایک تجارت ہو سکتی ہے لیکن چونکہ خام مواد کی موجودگی صنعتی ترویج میں ایک اہم عامل ہے۔ اس لئے یہاں کے عوام میں صنعتی ترویج کی خواہش بیدار ہو رہی ہے اور حکومت کے پلانوں میں اس قسم کے منصوبے موجود ہیں۔ پھر خام مواد کے علاوہ ملک میں نہ سرمایہ کی کمی ہے نہ محنت کشوں اور ماہرین کی۔ تقسیم ہند کے بعد سے جتنے لوگ یہاں منتقل ہو کر آئے ہیں وہ کھانے کے لئے "منہ" لے کر ہی نہیں آئے بلکہ کام کرنے کے لئے دو دو ہاتھ بھی لائے اور سدھے ہوئے ہاتھ بھی لائے اور دماغ بھی لائے اور جیبیں بھی۔ مزدور ہی نہیں بلکہ مشینی کام سے واقف لوگ بھی آئے۔ زردار بھی آئے اور تجربہ اور ذہانت رکھنے والے لوگ بھی۔ جو کمی تھی وہ یہ تھی کہ لوگ نئی جگہ اور نئے حالات میں "حوصلہ" (Enterprise) نہ رکھتے تھے۔ صنعت کی ترویج کا راز ہی حوصلہ میں مضمر ہے۔ روایاتی پس منظر بھی اس قسم کی توسیع میں خاصا اہم پارٹ ادا کرتے ہیں۔ اس نئے ملک میں اس سے قبل صنعتی روایات بہت تھیں اور جو تھیں وہ بیشتر ہندوؤں کے قبضہ و ملک میں تھیں اور تقسیم کے بعد ایک ہیجانی کیفیت سی رونما ہوئی۔ کچھ فیکٹریاں تو تبادلہ کے ذریعہ سے قائم رہ سکیں بعض ایک عرصہ سے معطل رہیں اور بعد میں کسی طرح ان کا احیاء عمل میں آیا۔ لیکن اس کے باوجود ایسی فیکٹریوں کی ایک تعداد رہ گئی۔ جن کا احیاء نہ ہو سکا۔ البتہ مہاجرین کی آمد کی وجہ سے بعض بالکل نئی فیکٹریاں قائم کی گئیں۔ اگرچہ اس طرح تعداد ایک بڑی حد تک پوری ہو گئی لیکن ایک مدت تک ہیجانی اور غیر یقینی صورت حال قائم رہی اور اس کے مضر اثرات ظاہر ہو کر رہے۔

اس ملک کی صنعتی ترویج میں لازماً اس بات کا خیال رکھنا ہے کہ یہاں ایک عظیم [illegible] ایک زندہ قوم بستی ہے اور قدرت نے ایسے ذرائع و وسائل بھی وافر ہی بخشتے ہیں۔ اس توسیع میں سمت سفر کا تعین ہمارے سابق وزیر صنعت چودھری

ظہور احمد صاحب نے بہت صحیح فرمایا ہے "..... اس صورت حال میں کہ ہماری قوم کی اقتصادی زندگی میں روایاتی طور پر زرعی پیشوں کو ہی اساسی اہمیت حاصل رہی ہے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ مستقبل کے لئے فوری طور پر یہی پروگرام مفید ہوگا کہ ہم یہاں تین قسم کی صنعتیں قائم کریں۔

(الف) اساسی، ضروری یا کلیدی صنعتیں۔ (ب) ملک میں پائے جانے والے خام مواد پر مبنی صنعتیں۔ (ج) ہماری گھریلو صنعتیں....." [1]

سمت سفر کا اس سے بہتر تعین ممکن نہیں۔ اس ملک کی بنیادی ضروریات بہت اہم ہیں اور خصوصاً سیاسی اور جغرافی اسباب کے بنا پر ضروری ہے کہ روزمرہ کی ضروریات کی چیزوں میں ہم خود کفیل بن سکیں۔ پھر یہ ملک میں قدرت کی طرف سے جو خام مواد ہمیں میسّر ہے اسے فروخت کرنے کے بجائے ان پر مبنی صنعتیں قائم کرنا ضروری ہے۔ پاکستان میں اس وقت جو حصے ہیں ان میں دستکاروں کی کمی نہیں۔ بہت سی ایسی مصنوعات ہیں جن کی ساکھ اس برّصغیر بلکہ دنیا میں قائم ہے۔ اور اس سابقہ شہرت اور ساکھ سے فائدہ اُٹھا کر ان کی توسیع اور ترقی میں کوشاں نہ ہونا سخت کفرانِ نعمت ہوگا۔ تفصیلی جائزہ کے لئے بہتر ہے کہ ہم صنعتوں کو تین کے بجائے دو حصّوں پر تقسیم کریں۔ پہلا حصّہ بڑی صنعتوں کا اور دوسرا حصّہ چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کا۔

بڑی صنعتوں میں تقسیم کے بعد ہندو سرمایہ داروں کے چلے جانے کی وجہ سے بلاشبہ کارخانوں کی تعداد میں کمی واقع ہوئی چنانچہ مغربی پنجاب میں ۴۷ء میں ۵۰۶ مستقل کارخانے تھے۔ اور ۲۱۷ موسمی اور عارضی کارخانے [2] ۴۹ء میں ۳۱ [3] مستقل کارخانے تھے اور ۱۳۵ موسمی اور عارضی کارخانے تھے۔

مہاجرت کرکے آنے والوں میں اکثر صنعت کار بھی تھے لیکن حالات کی نامساعدت نے ان میں "حوصلہ" نہ پیدا ہونے دیا ملک کی خاص چیزیں جوٹ اور کپاس تھیں اور بین الاقوامی بازار میں ان کی خاص اہمیت ان میں سے کپاس ایسا خام مواد ہے جسے ہم ملک کی اساسی ضروریات میں سے کپڑے کی ضروریات کے لئے استعمال کر سکتے ہیں - اور جوٹ ایسی چیز ہے جس میں پاکستان کو تقریباً اجارہ سا حاصل ہے۔ یعنی اتنی بہتر جوٹ اور اس قدر وافر جوٹ دوسرے ممالک کو حاصل نہیں اس لئے اس کا فروخت کرنا اور خود صنعت کو ترویج نہ دینا فاش غلطی ہے۔ اس سلسلہ میں حکومت پاکستان نے کچھ اقدامات کئے ہیں اور یوں بھی کپڑے کی صنعت چونکہ اچھا بازار رکھتی ہے اس لئے بڑھ رہی ہے اس وقت تک ملک میں پنتیس [35] کارخانے بتائے جاتے ہیں۔ کارخانوں کی مدّت کارکردگی اور پیداوار کا اندازہ حسب ذیل اعداد سے کیا جا سکتا ہے :-

۴۷ء تقسیم کے وقت	۴,۸۲۴ کرگھے	۱۸۴,۷۷,۱ تکلے
مارچ ۵۱ء	۵,۳۳۰ "	۲,۱۵,۰۰۰ "
ابتدائے ۵۲ء	۷,۶۸۸ "	۵,۳۲,۸۱۸ تکلے

ان کی پیداوار کا تخمینہ یہ ہے۔ سالانہ پیداوار۔

۴۹ء ۵۸,۷۰۰۵ گانٹھ کپڑا ——— ۱۵,۵۰۶ گانٹھ فالتو دھاگا

---

[1] Industry of Pakistan صفحہ ۵ (سرکاری اشاعت)

[2] Economy of Pakistan صفحہ ۱۵۲

۱۹۴۹ء	۶۱،۹۳۲ گانٹھ کپڑا ———	۲۳،۱۵۰ گانٹھ فالتو دھاگا
۱۹۵۰ء	۷۰،۴۴۳ " " ———	۲۷،۸۶۱ " " "
مارچ ۱۹۵۱ء	۹۳،۰۰۰ " " ———	۵۹،۰۰۰ " " "

[نوٹ:- کپڑے کی گانٹھ ۱۵۰۰ گز ——— دھاگے کی گانٹھ = ۴۰۰ پونڈ]

معلوم ہوا ہے کہ مرکزی حکومت نے مزید پانچ کارخانوں کے قیام کا فیصلہ کیا ہے اور مشینیں منگوائی گئی ہیں۔ ان پانچ کارخانوں میں ۲۰۰۰۰ تکلے اور ۴۰۰ کرگھے ہونگے۔ نیز تین اور کارخانوں کے لئے مشین خریدنے کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے ان میں ۷۵۰۰۰ تکلے اور ۱۵۰۰ کرگھے ہونگے،[۲] کہا جاتا ہے کہ اگر کارخانوں کی تعداد میں اسی طرح اضافہ ہوتا رہا تو بہت جلد پاکستان کپڑوں کے معاملہ میں خود کفیل ہو جائیگا۔ اور اس طرح ایک خام مواد ملک کے اندر ہی مصنوعات میں مبتدل ہو کر زیادہ قدر و اہمیت حاصل کرے گا۔ اگرچہ اس میں کوئی یقینی خوش فہمی ممکن نہیں کیونکہ جب تک خواص و عوام اور سرکاری حلقوں میں اپنی مصنوعات کی سرپرستی اور ہمت افزائی کا جذبہ پیدا نہ ہو جائے۔ پھر یہ کہ اگر مقامی کپڑے کی کوالٹی وغیرہ پسند عام کے قریب آسکے۔ اسی وقت یہ امید کی جا سکتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ توسیع کے یہ منصوبے کاغذوں سے ہٹ کر عملدر آمد تک آسکیں۔ توسیع و ترقی کے منصوبے ملک میں بہت ہیں اور ملک کا شش سالہ منصوبہ ان سب کے سر فہرست ہے۔ اسی طرح جوٹ کی صنعت کے لئے ملک میں سنجیدہ طبقہ فکر کر رہا ہے۔ پاکستان نرائن گنج میں میسرز آدم جی اینڈ کو کے ذریعہ تین جوٹ مل قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ جوٹ کی مقامی مصنوعات یقیناً بیرونی ممالک میں زیادہ مقبول ہونگی اس لئے کہ اولاً تو پاکستان کی جوٹ کوالٹی کے اعتبار سے بہتر اور مقدار میں وافر ہے۔ جسکی وجہ سے ساکھ اور شہرت کا فائدہ حاصل ہوگا ثانیاً یہ کہ ہندوستان (جو ہمارا بقیہ رقیب ہے) میں جوٹ ملیں سب پرانی ہیں۔ اور کثیر ہیں اور بڑی حد تک از کار رفتہ ہیں ثالثاً مقامی خام مواد ہونے کی وجہ سے لاگت معقول ہوگی۔ رابعاً یہ کہ اپنے نئے بندرگاہوں میں چالنگام اور چالنا کا فائدہ پہنچے گا جوٹ میں اس خود کفیلی کے میدان میں پاکستان تنہا نہیں ہے۔ ہندوستان بھی روز بروز خام جوٹ کی کاشت بڑھا رہا ہے اور ملوں میں کام کرنے کے گھنٹے کم کر رہا ہے۔ تاکہ جوٹ کی ساری مصنوعات مقامی مواد سے ہی تیار ہوں۔ اس عالمی صورت حال نے ڈنڈی میں جوٹ تاجروں کے حلقے میں ایک تشویش پیدا کر دی ہے۔ اور پاکستان سے سابقت کے امکانات پر غور و خوض کیا جا رہا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ بہ حیثیت مجموعی دنیا میں جوٹ اور اس کی مصنوعات کی طلب گھٹ رہی ہے۔ ان کے بدل روز بروز دریافت کئے جا رہے ہیں۔ اور استعمال میں لائے جا رہے ہیں چنانچہ گذشتہ فصل (۱۹۵۱ء - ۱۹۵۲ء) میں پاکستان کے پاس سب سے زیادہ سیلک (Carryover) رہا ہے۔ یعنی تقریباً ۱۵ لاکھ گانٹھیں۔[۱] بہرحال اس عالمی منظر کے پیش نظر بہت دُور اندیشی کے ساتھ پالیسی متعین کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں مشرقی پاکستان کی حکومت کا یہ اقدام بہت مناسب ہے کہ جوٹ کی کاشت کم کی جائے اور اس طرح جو زمین حاصل ہو وہاں میں دھان کی کاشت ہو۔ تاکہ غذائی مسئلہ بھی حل ہو اور جوٹ کی عالمی طلب گھٹنے کے ساتھ ہی ہم خام جوٹ کم پیدا کریں

---

[۱] اخبار Dawn شمارہ ۱۱ فروری ۱۹۵۲ء۔

[۲] کراچی کاموس = ۲۱ جون ۱۹۵۲ء۔

اور جو پیدا ہو اس کا بیشتر حصہ ہم رفتہ رفتہ خود اپنی ملوں میں استعمال کریں۔ لیکن اس سلسلہ میں فوری اور مؤثر اقدامات کی ضرورت ہے ورنہ فصل سال کے ختم پر اس طرح فاضل ذخیرہ قیمتوں پر اور بھی برا اثر ڈالے گی۔ جو کہ یوں بھی گرتی جا رہی تھیں۔ کپاس اور جوٹ کے علاوہ دوسری صنعتوں کی ترقی اور توسیع کے لئے اتنا نمایاں کام نہیں ہوا ہے۔ البتہ شش سالہ منصوبے میں ان کے لئے گنجائش رکھی گئی ہے اور یوں متفرق کوشش بھی کی گئی ہے ملک کو صنعتی رنگ دینے کا مطلب یہ ہے کہ کم از کم وہ ضروری اور چھوٹی چیزیں جو روزمرہ استعمال میں آتی ہیں ملک کے اندر ہی پیدا ہوں۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا ہے۔ پھر یہ کہ اس قسم کی چیزیں ایسے مراکز میں تیار ہوں کہ ہر حصہ میں مقامی مصنوعات پہنچ سکیں صورت حال یہ ہے کہ صرف مشرقی پاکستان میں ۲۵ لاکھ دیا سلائیوں کی ڈبیاں درکار ہیں۔ لیکن مقامی طور پر مشرقی پاکستان میں ۴۲ لاکھ ڈبیاں تیار ہوتی ہیں۔ اور یہی حالت صابون کی ہے۔ دھونے کا صابن جو عموماً مقامی طور پر بنا کرتا ہے۔ یہاں اس کا صرف چھ لاکھ ٹکیاں ہیں، لیکن صرف ۵ یا ۳ لاکھ ٹکیاں بنتی ہیں[1] نیز اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ترقی اور توسیع میں ساری چیزوں میں متوازن اور متساوی اضافہ نہیں ہوا ہے ذیل میں بعض صنعتوں کی رفتار ترقی دی گئی ہے[2]۔

صنعت	قوت کار کردگی (۱۹۴۹ — ۵۰	۱۹۵۰ — ۵۱)	پیداوار ۱۹۴۹ — ۵۰	۱۹۵۱ — ۵۱
سیمنٹ (تعداد ٹنوں میں)	۶۷۰۸۰۰	۶۷۰۸۰۰	۳۲۰۰۰۰	۴۰۰۰۰۰
بجلی کے پرزے (قیمت روپوں میں)	۵۰۰۰۰۰	۵۰۰۰۰۰	۴۰۰۰۰۰	۳۰۰۰۰۰
صابون (وزن ٹنوں میں)	۵۳۰۰۰	۵۳۰۰۰	۵۳۰۰۰	۵۳۰۰۰
لوہے کی چادریں (" ")	۴۰۰۰۰	۸۰۰۰	۱۸۰۰۰	۱۲۰۰۰
اوزار وغیرہ (قیمت روپوں میں)	۵۰۰۰۰۰	۵۰۰۰۰۰	۳۰۰۰۰۰	۱۰۰۰۰۰
تیل کی مشین (" " ")	۸۸۰۰۰۰	۸۸۰۰۰۰	۱۰۰۰۰۰	۵۰۰۰۰۰
شکر " " (" " ")	۵۰۰۰۰۰	۵۰۰۰۰۰	۳۰۰۰۰۰	۱۰۰۰۰۰
شکر (وزن ٹنوں میں)	۵۲۰۰۰	۱۰۳۰۰۰	۴۱۰۰۰	۲۷۰۰۰
کپڑا (گانٹھوں میں)	۶۰۰۰۰	۷۹۵۰۰	۵۱۰۰۰	۶۵۰۰۰
دھاگا (" ")	۹۰۰۰	۵۵۵۱۲	۹۰۰۰	۲۷۰۰۰
تمباکو (تعداد سگریٹ)	۳۶۰۰۰۰۰۰۰	۲۸۵۰۰۰۰۰۰	۳۶۰۰۰۰۰۰۰	۱۸۰۰۰۰۰۰۰

ان اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک میں روزمرہ استعمال کی بعض ضروری چیزوں کی پیداوار کس طرح گر رہی ہے۔ اور اس تشویش ناک صورت حال کا کوئی علاج نہیں کیا جا رہا ہے۔ صنعتی توسیع کے پروگرام میں یہ خبر ملحوظ رکھنی ضروری ہے کہ ملک میں صحت مند اور ضروری اشیاء کی پیداوار میں اضافہ ہو اور اس کے لئے ہر ممکن کوشش کی جائے لوگوں کو ترغیب دی جائے کہ وہ ان ضروریات کے لئے مقامی مصنوعات استعمال کریں نیز بیرونی مصنوعات پر کچھ پابندیاں لگی جائیں۔ غیر صحت مند اشیاء کی پیداوار میں

---

[1] اخبار " Dawn " ۱۴ اپریل ۱۹۵۲ء

[2] ماخوذ از نقشہ نمبر ۵ صفحہ ۱۱۵ - Economy of Pakistan

ـــــے منصوبوں میں گنجائش رکھی گئی ہے۔ تقسیم کے وقت صرف ایک سگریٹ
کی کمپنی تھی۔ اور ١٩٤٩ء میں باقاعدہ پاکستانی کمپنی میسرز پاکستان ٹوبیکو کمپنی لیمیٹڈ نے کراچی میں کام
شروع کیا۔ اور مارچ ۱۹۵۱ء میں ویسٹ وارف میں سگریٹ سازی شروع کی اس وقت اس کارخانہ کی ماہوار پیداوار ۵۰۰۰۰۰
سگریٹ تھی۔ اس کے بعد مرکزی حکومت کے شعبہ توسیع (Devolopment Directorate) کی مدد سے اس فرم نے ایک
اور شاخ مارچ ۱۹۵۲ء میں ماڑی پور کے مقام پر کھولی۔ ان دونوں شاخوں کی مجموعی پیداوار ملک کی طلب کی ۱۰.۴ ہے ملک میں سگریٹ
کا صرف ۳۰۰۰ ملین کا ہے)

میسرز پاکستان ٹوبیکو اینڈ کمپنی نے ملک میں ورجینیا کوالٹی کی عمدہ تمباکو کی کاشت شروع کر دی ہے۔ جس میں روز افزوں اضافہ ہو رہا
ہے۔ نیز دوسری کمپنیاں کھل رہی ہیں۔

الکحل[۱] کا بھی یہی حال ہے۔ تقسیم کے وقت ملک میں چار کارخانے تھے۔ ایک روالپنڈی میں اور دوسرا کوٹری میں تیسرا کوئٹہ میں اور چوتھا
درشنہ (مشرقی بنگال) میں۔ ان سے پیداوار کا اندازہ تین لاکھ گیلن ہے۔ تقسیم کے بعد اس میں کمی ہونے کا تو امکان ہی نہ تھا اور نئی فرمیں
بھی ان خطوط پر سوچ رہی ہیں کہ الکحل کی پیداوار شروع کی جائے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں اقتباس ہی دیدینا بہتر ہے۔

"امتناع شراب نوشی کی وجہ سے اور یوں پاکستان میں اس کا بازار کم ہونے کی وجہ سے اس صنعت کو سخت صدمہ پہنچا۔ لیکن ان
سارے مصائب کے باوجود ان صنعت کاروں نے اس کی پیداوار کو قائم رکھنے کی کوشش کی۔ میسرز فرینٹر شوگر ملز لیمیٹڈ تخت بھائی نے
ایک کارخانہ کھولنے کا انتظام کیا ہے۔ ضروری مشینوں اور دوسری اشیا کے لئے آرڈر دئے جا چکے ہیں میسرز بریٹر شوگر ملز لیمیٹڈ مردان
بھی اس امکان پر غور کر رہے ہیں کہ ایک کارخانہ قائم کیا جائے پیداوار ۔۔۔۔ اگیلن الکحل فی یوم ہو۔ جب یہ کارخانے قائم ہو چکینگے تو
ملک کی طلب ان سے پوری ہو سکیگی ۔۔۔۔"[۲]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک میں عوام کی طرف سے جو کچھ توسیع کی کوشش ہوتی ہیں ان میں مقام اور ضرورت کے لحاظ سے
توازن قائم نہیں رہ پاتا ہے۔ اور حکومت کے سرکاری منصوبوں میں بھی یہ پہلو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ کن صنعتوں کا فروغ ملک
کے لئے واقعی مفید ہے اور کن صنعتوں کی ضرورت نہیں کیونکہ ان کے مضر اثرات آ کر رہیں گے۔ پھر یہی نہیں کہ توسیع غیر متوازن اور
غیر مناسب طرف پر ہو رہی ہے۔ بلکہ بحیثیت مجموعی توسیع و ترقی کی رفتار وہ نہیں ہے جو ایسے کثیر الوسائل اور ذہنی اور جسمانی
صلاحیتیں رکھنے والے ملک میں ہونی چاہئے۔ اس کے باعث چند در چند عوامل ہیں۔ جن میں سے سب سے نمایاں سبب دفتری
کام کی کثرت اور اصل احساس ذمہ داری کا فقدان ہے۔ لیکن عوام میں مقبولیت کے لئے منصوبہ سازی ضروری ہے۔ بقول ہمارے
ایک معاصر کے:۔

"ان منصوبوں کی خوب اشاعت کی گئی۔ شاید اسوجہ سے ذمہ دار احکام سمجھتے تھے کہ اگرچہ ان سے مسائل اور مشکلات
کا حل نہ ہو سکے جن کے لئے یہ منصوبے وجود میں آتے ہیں تو کم از کم ان سے منصوبہ سازوں کو یہ فائدہ تو ہوا کہ لوگوں پر اثر پڑا کہ
یہ نہایت سرگرم اور مستعد ہیں اور عوام کی ضروریات اور اپنی ذمہ داریوں کا شدید احساس رکھتے ہیں[۳] ان غیر ضروری دفتری دھوم

۱ے Industry of Pakistan صفحہ ۶۸ ۲ے کراچی کامرس اڈریسی نوٹ شمارہ ۱۹ اپریل ۱۹۵۲ء

۳ے کراچی کامرس ۲۱ جون ۱۹۵۲ء

وعام کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ منصوبوں اور اسکیموں سے بجائے فائدہ کے نقصان پہنچتا ہے مثلاً یہ کہ باقی امداد کے انتظار میں کام میں تعطل واقع ہو۔ اور ضروریات پوری نہ ہوسکنے کی صورت میں پیداوار کم کرنے کی کوشش کی جائے۔ مزدوروں کی تخفیف کی جائے۔ بٹالہ انجینئرنگ کمپنی کے ساتھ اس قسم کا واقعہ پیش آیا۔ جس کی وجہ سے مزدوروں کو تخفیف کی نوٹس دینی پڑی اور خاصہ انتشار برپا ہوا ایک اقتباس پیش ہے۔

"مسٹر سی۔ ام لطیف نے شکایت کی کہ حکومت پاکستان کی وزارت صنعت نے بٹالہ انجینئرنگ کمپنی کی توسیع و ترقی کے لئے مئی ٭ء میں ۲۵ لاکھ روپیہ کا قرضہ منظور کیا۔ لیکن فنانس ڈپارٹمنٹ نے ہمیں صرف پانچ لاکھ روپیہ دیا اور باقی ماندہ بیس لاکھ کے متعلق کہا کہ وہ انڈسٹریل فنانس کارپوریشن سے لے لینا۔ لیکن کارپوریشن سے یہ قرضہ مجھے آج تک نہیں مل سکا..." (روزنامہ آفاق ۲۶ر جون ٭ء)[1]

توسیع کی مجموعی سست رفتاری کے اسباب کا تفصیل سے جائزہ لینا ضروری ہے اس سلسلہ میں ہم کراچی کے مسٹر جی علانہ کے ایک بیان سے ابتدا کریں گے[2] آپ نے آل پاکستان اکنامک کانفرنس میں آزاد انفرادی ملکیت و حوصلہ پر ایک مذاکرہ میں ۱۱ر فروری ٭ء کو جو تقریر کی اس کے مطابق اس سست رفتاری کے وجوہ یہ ہیں

۱- تجارت نیز صنعت دونوں میں ٹیکسوں کی موجودہ صورت حال۔

۲- ملک کی صنعتی پالیسی کے بیان میں ابہام خصوصاً قومی ملکیت کے مسئلہ پر۔

۳- زمین بجلی اور مواصلات کے حصول میں دقتیں۔

۴- بینکنگ کی معقول سہولتوں کا فقدان۔

۵- ٹیکنیکل کاموں سے واقف لوگوں کی کمی۔

مسٹر علانہ نے اس تجزیہ میں دو قسم کے وجوہ ہیں۔ آخر کی تین وجوہ تو ایسی ہیں جن کا تعلق عملی دقتوں سے اور انتظام سے متعلق ہیں ان کے متعلق زیادہ کہنا ضروری نہیں تاہم ان پر ہم بعد میں روشنی ڈالیں گے۔ اوّل الذکر دو وجوہ ایسی ہیں جن کا تعلق صنعتی پالیسی سے ہے اور اس کے متعلق ہم قدرے تفصیل سے گفتگو کرنا چاہیں گے۔ جیسا کہ شروع میں عرض کیا جا چکا ہے۔ اس ملک میں خام مواد، سرمایہ، مزدور، ماہرین ان ساری چیزوں کی کوئی دقت نہیں ہے۔ اصل دقت صرف حوصلہ کی ہے۔ اور حوصلہ صنعتی پالیسی پر منحصر ہے۔

حوصلہ کی دقتوں کے سلسلے میں حسب ذیل عوامل ہیں:-

(۱) ٹیکسوں کا غلط نظم اور ان کا بار۔ صنعت کاروں پر ٹیکسوں کا بار کس حد تک ہے وہ پبلک انوسٹمنٹ انکوائری کمیٹی رپورٹ میں درج کئے ہوئے اعداد و شمار سے معلوم پڑتا ہے[3]

آمدنی	بزنس ٹیکس	انکم ٹیکس	سپر ٹیکس	میزان
۱،۱۰۰،۰۰۰	------	۲۷،۲۵۰	۲۴،۲۱۹	۵۱،۴۶۹

---

[1] بحوالہ "وزارت صنعت کی کارگزاری پر ایک نظر"

[2] اخبار ڈان ۱۴ر فروری ٭ء

[3] رپورٹ ہذا شائع شدہ پاکستان ٹریڈ شمارہ ستمبر ٭ء صفحہ ۱۶

[illegible]	[illegible]	[illegible]	سپرٹیکس	میزان
۱,۵۰,۰۰۰	۸,۳۰۳	۴۰,۲۷۱	۴۸,۴۹۸	۹۷,۳۰۲
۲,۰۰,۰۰۰	۱۹,۹۹۷	۵۳,۳۹۲	۷۵,۷۸۱	۱,۴۵,۸۴۰
۲,۵۰,۰۰۰	۲۵,۰۰۰	۶۶,۳۱۳	۱,۰۳,۱۲۵	۱,۹۴,۴۳۸
۳,۰۰,۰۰۰	۳۳,۳۳۳	۷۹,۳۳۳	۱,۳۰,۴۹۹	۲,۴۳,۱۳۵
۳,۵۰,۰۰۰	۴۱,۶۶۷	۹۲,۳۵۴	۱,۵۷,۸۱۱	۲,۹۱,۸۳۲
۴,۰۰,۰۰۰	۵۰,۰۰۰	۱,۰۵,۳۷۵	۱,۸۵,۱۵۶	۳,۴۰,۵۳۱

ان اعداد کے ساتھ ہی رپورٹ کی عبارت ہے "ہمیں یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ ٹیکسوں کا موجودہ نظام جسے پاکستان نے غیر منقسم ہندوستان کی حکومت سے ورثہ میں پایا ہے وہ پاکستان کی موجودہ اقتصادی حالت کے لئے قطعی ناموزوں ہے اور یہ سرمایہ اندوزی اور صنعتی انوسٹ منٹ کے لئے ایک سدِّراہ ہے . . ." [1]

پھر محصولات کا سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ بعض صنعتی ضروریات پر درآمدی محصول اس قدر لگایا گیا ہے کہ ان سے فائدہ نہیں اُٹھایا جا سکتا اور لوگوں کو اس صنعت کی طرف توجہ کرنے کے لئے "حوصلہ" میسّر نہیں آتا۔ حال ہی میں ٹیرف کمیشن نے کپڑے دھونے کے صابون کی صنعت پر جو انکوائری کی ہے اس میں اس قسم کے معلومات حاصل کئے ہیں۔ معلوم ہوا کہ خام مواد یعنی ناریل کے تیل پر ۳۸ سے لے کر ۴۸ فی صدی تک درآمدی محصول ہے۔ اور اسی طرح کاسٹک سوڈا پر ۲۶ سے لے کر ۳۶ فی صدی تک درآمدی محصول میں تخفیف کا مطالبہ پیش کیا ہے۔ پیکنگ کے کاغذ پر ۴۰ فی صدی اور ردفتی پر ۳۵ فی صدی [2]

ٹیکسوں کے اس بار کو ہلکا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ چنانچہ پبلک انوسٹ منٹ انکوائری کمیٹی رپورٹ کے بعد گورنمنٹ رزولیشن شائع شدہ ۱۶ رجولائی ۱۹۵۱ء میں ٹیکسوں میں ترمیم کی گئی ہے۔ بعض صورتوں میں درآمد کردہ مشینری پر سے محصول اٹھا لیا گیا ہے۔ انکم ٹیکس اور سپر ٹیکس میں کچھ تخفیف کی گئی ہے۔ لیکن تاہم ان ٹیکسوں کے بار نے حوصلہ کو روکنے میں خاصا پارٹ ادا کیا ہے اور یہ صنعتی توسیع کی سست رفتاری کی ذمہ دار ہے۔

(۲) صنعتی پالیسی میں ابہام :-

ٹیکسوں کے بار کے بعد مبہم اور غیر واضح پالیسی بھی شخصی حوصلہ کے روکنے میں ایک اہم باعث ہے۔ جب تک صنعت کاروں کو اس بات کا یقین نہ ہو کہ جو کچھ وہ پیداوار تیار کرائینگے وہ ہمیشہ انہیں کی ملکیت رہے گی اور یہ کہ ساری آزادیاں حاصل ہونگی اس وقت تک لوگ نئی صنعتیں کھڑی کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ ملک میں قومی ملکیت کا رجحان بڑھ رہا ہے اور اب تک حکومت نے کوئی واضح پالیسی اور مستقل رویہ پیش نہیں کیا ہے۔

مسٹر عباس خلیلی لکھتے ہیں :-

"حکومت کی ہمیشہ سے یہ رائے رہی ہے کہ سرکاری شعبوں کے بہت سے قواعد اور پابندیوں سے آزاد اور پورے آزاد

---

[1] پاکستان ٹریڈ شمارہ ستمبر ۱۹۵۱ء صفحہ ۱۵۔

[2] کراچی میٹنگ ۸ رجولائی شدہ زیر صدارت مسٹر شمس الضحیٰ احمد "اخبار مارننگ نیوز ۱۱ رجولائی ۱۹۵۱ء

ماحول میں صنعتوں کو اپنی پوری امکانی حد تک بڑھنے دیا جائے . . . ."[1]

اس طرح کے اور بھی بہت سے بیانات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت آزاد شخصی ملکیت اور حوصلہ کی قائل ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اکثر غیر ذمہ دارانہ طور پر ایسے بھی بیان دیئے گئے جس سے صنعتی حلقوں میں انتشار رہا رہا۔ اور حوصلہ ایک ایسی چیز ہے کہ صنعت کاروں کو جب تک بلا شائبہ شک یقینی طور پر اطمینان حاصل نہ ہو وہ کسی صنعت کو ہاتھ نہیں لگاتے مثال کے طور پر بٹالہ انجینئرنگ کمپنی لمیٹڈ کو ایک موقع پر وزیر صنعت مرکزی حکومت نے قومیانے کی بھی دھمکی دی۔ ایک اخبار کا اقتباس ہے:۔

"لاہور سے ۱۱ر جولائی ۵۱ء پنجاب مسلم ٹریڈرز فیڈریشن کی مجلس نمائندگان کے آراکین نے مندرجہ ذیل بیان پریس کو بغرض اشاعت روانہ کیا ہے۔

قومی بنانے کے متعلق چودھری نذیر احمد صاحب کے حالیہ ارشادات نے صنعتی حلقہ میں سخت بےچینی پیدا کر دی ہے جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ اگر حالات تسلی بخش نہ رہے تو ایک پرانی صنعت کو قومی بنانے سے بھی دریغ نہ کیا جائے گا! جو صورت حال اس بیان سے پیدا ہوئی ہے وہ خطرناک ہے۔ اس لئے نہیں کہ ایک معزز وزیر کو اپنی ذاتی رائے کے اظہار کا حق نہیں بلکہ ایک وزیر جب انفرادی حیثیت سے اپنی ذاتی رائے کا کھلے بندوں اظہار کرتا ہے تو وہ رائے حکومت عالیہ کے ایک وزیر کی ذاتی رائے ہے۔ وزرائے کرام کو چاہیئے کہ وہ ہر چیز کا نظر عمیق مطالعہ کریں۔ مگر اس وقت تک کچھ نہ کہیں جب تک انہیں اس بات کا یقین نہ ہو کہ جو وہ کہہ رہے ہیں وہی ان کا مطلب ہے۔ جو ان کا مطلب ہے اسی کا اظہار کر رہے ہیں" (احسان[2] لاہور ۱۲ر جولائی ۵۱ء)

الغرض واضح اور مستقل پالیسی کے فقدان پر بھی حوصلہ کی کمی ذمہ دار رہی ہے۔ اس کے بعد تیسری چیز جو حوصلہ کو روکتی ہے وہ سرپرستی کی کمی ہے۔

(۳) سرپرستی کی کمی۔ جب تک ملک میں ایسی مصنوعات کو روک نہ دیا جائے جن کی وجہ سے عہد طفولیت سے گذرنے والی مقامی صنعتیں خسارہ میں پڑ جاتی ہیں اور مسابقتی دوڑ میں پیچھے رہ جاتی ہیں۔ اس وقت تک ملک میں صنعتی ترقی اور توسیع بہتر طریقہ پر ممکن نہیں۔ جبکہ کہ سرپرستی میں صحت مند اور غیر صحت مند، اخلاقی حالت پر اثر ڈالنے والی تعلیات کی طرف مائل کرنے والی ان سارہ ی قسموں کا خیال نہ رکھا جائے۔ ملک کی مجموعی ترقی اور خوشحالی متاثر ہوگی سرپرستی (Protection) کے سلسلہ میں پاکستان ٹیرف کمیشن کے چیئرمین ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کے بیان[3] کے مطابق حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ سرپرستی کے لئے کسی صنعت میں حسب ذیل چیزیں ہونی ضروری ہیں:۔

(۱) صنعت مستحکم بنیادوں پر قائم ہے اور عمدگی کے ساتھ چل رہی ہے۔

(۲) (الف) امکانات اور صلاحیتوں کے اعتبار سے توقع ہے کہ مناسب مدت کے اندر وہ سرپرستی کی محتاج نہ رہے گی۔

---

[1] موصوف کا مقالہ Industry of Pakistan & Free Enterprise

[2] حوالہ نقل کردہ "وزارت صنعت کی کارگزاری پر ایک نظر"

[3] موصوف کا مقالہ

Protective Tariffs with special reference to work of the Pakistan Tariff Commission

شائع شدہ "پاکستان کامرس" چاٹگام شمارہ دسمبر ۵۱ء

(ب) پاکستان کی دفاعی اور اقتصادی بہتری کے لئے وہ صنعت ضروری ہے۔
(۳) اس صنعت کی سرپرستی کسی بین الاقوامی معاہدہ کی خلاف ورزی نہ ہو۔

اس سلسلہ میں حکومت کے ریزولیوشن کے مطابق کنیں (۱) صارفین Consumers کا اور (۲) دوسری صنعتیں جن میں اس صنعت کی مصنوعات کام آتی ہیں انکا بھی خیال رکھے۔

ان شرائط کی جامعیت یا محدودیت سے قطع نظر عملاً یہ شرائط پوری کرنے والی صنعتیں بھی اکثر سرپرستی سے محروم رہ جاتی ہیں۔ ملک میں ایسی صنعتیں ہیں جو لوہے کی مصنوعات تیار کراتی ہیں۔ مثلاً انجینئرنگ کی صنعتیں جہاں مشینیں بنتی ہیں۔ نیز دفاعی ضروریات کی بہت سی چیزیں لیکن ان مقامی صنعتوں کی اس حد تک سرپرستی نہیں کی جاتی کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکیں اور ٹیرف کمیشن کے دوسرے شرائط کے مطابق دفاعی اور اقتصادی بہتری کا امکان پورا ہو سکے۔ ایسی صنعتیں اب بھی سرپرستی سے محروم ہیں۔ مینجر بٹالہ انجینئرنگ کمپنی کا بیان ہے۔

"اگر حکومت کسی کے مال کی اندرون ملک میں کھپت کے لئے باہر سے ایسے مال کی درآمد کلیتہً ختم کردے جو کمپنی میں تیار ہوتا ہے اور ساتھ ساتھ فالتو مال کے لئے بیرونی ممالک میں منڈیاں تلاش کرنے کے کام میں کمپنی کو مناسب سہولتیں مہیا کرے تو کمپنی نہ صرف اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکتی ہے۔ بلکہ مجوزہ توسیعی منصوبوں کو کم سے کم عرصہ میں عملی جامہ پہنانے کے قابل بھی ہو سکتی ہے .. (آفاق ۲۶ جون ۱۹۵۸ء) لہ

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض ضروری صنعتوں کو کس طرح سرپرستی سے محروم رکھا جاتا ہے اور یہ تو شاید کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ ملک میں تمام غیر ضروری تعیشات کی درآمد کھلے بندوں ہو رہی ہے۔ غیر صحت مند اور مخرب اخلاق اشیاء کی درآمد کا سلسلہ جاری ہے۔ اس سلسلہ میں حکومت کو چاہئے کہ سیاسی دفاعی، سماجی اور اخلاقی سارے ہی پہلوؤں کے ساتھ اقتصادی نقطۂ نظر سے غور کر کے ایک واضح اور معین پالیسی اختیار کرے۔

حوصلہ کی کمی اور صنعتی سست رفتاری کے اسباب میں یہ تین خاص تھے۔ لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا ہے انتظامی خرابیاں بھی بڑی حد تک ذمہ دار ہیں۔

تعمیری ضروریات کی چیزوں میں دفتری ڈھیل، رشوت خوری۔ اقربا نوازی اور ان چیزوں کی فراہمی اور تعداد میں اضافہ کے سلسلے میں حکومت کی عدم توجہی یہ ایسی چیزیں ہیں جن سے ہر شخص واقف ہے۔

صنعتی سست رفتاری میں حوصلہ کے بعد سرمایہ کا سوال بھی کافی اہم ہے۔ اس سلسلہ میں حکومت نے جو خاص اقدامات کئے ہیں وہ نیشنل بینک کا قیام ہے (جس کی آٹھ شاخیں ہیں مجملہ ان آٹھ کے چھ مشرقی پاکستان میں ہیں) اور انڈسٹریل فنانس کارپوریشن کی تشکیل ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی اس قسم کے ادارے قائم کئے گئے ہیں۔ ان اداروں سے کاغذی طور پر تو رقمیں بہت جلد منظور ہو جایا کرتی ہیں لیکن اصل ادائیگی میں تاخیر تعویق کا سلسلہ عموماً اس قدر دراز ہوتا ہے کہ ع کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک۔

ضرورت اس کی ہے کہ ملک میں سرمایہ اندوزی کے لئے ہر شخص کے پس اندوختہ کو استعمال کیا جائے اس سلسلہ میں نیشنل سیونگ سرٹیفیکٹس کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ کچھ مفید ثابت نہیں ہو رہا ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ سودی اداروں کے بجائے نئے قسم کے ادارے قائم کئے جائیں جہاں متوسط طبقے کے لوگوں کو پس انداز کرنے کی سہولتیں ہوں۔ انہیں معین شرح سود کے بجائے اسلامی

لہ حوالہ نقل کردہ: "وزارت صنعت کی کارگزاری پر ایک نظر"

اصولوں کے مطابق نفع نقصان میں شرکت کی دعوت دی جائے اس طرح ملک میں عام طور پر حوصلہ کی کمی اور تجارتی رجحان دور ہو سکیں گے۔ وزیر مال نے امسال لازمی بچت کا ذکر کیا ہے وہ بہت ہی عجیب چیز ہے۔ اس لئے کہ متوسط طبقہ پر اس کا اثر پڑتا ہے اور ماہرین معاشیات اس کے مضر ہونے میں تقریباً متفق ہیں۔ پھر یہ کہ بقول معاصر "کراچی کامرس" ہمارے ہاں خود رضاکارانہ طور پر اپنی آمدنیوں میں سے پس انداز کرنا شروع کر دیں نرے وعظ و نصائح اب سرمایہ اندوزی نہ

سرمایہ کے سلسلہ میں بیرونی سرمایہ کا مسئلہ بھی اہم ہے۔ اگر ہم ملک کے اندر سرمایہ اندوزی کے سارے معقول اور مناسب ذرائع اختیار کریں۔ اور اس قسم کے ادارے اور ان کے منصوبے بنائے جائیں۔ جو عوام اور متوسط طبقہ کے لوگوں میں پس اندازی کے لئے تجارتی طرز پر کام کریں تو امید ہے کہ بیرونی سرمایہ کی ضرورت بہت کم ہو جائے گی۔ اور پھر یہ کہنے کی ضرورت نہ پڑے گی۔

"اگر ہم اسے مان لیں کہ سرمایہ میں روانی کی کمی کے بہت سے اسباب چند سالوں میں دفع ہو جائیں گے تو بھی سرمایہ کی قلت باقی رہے گی اور خواہ مخواہ چار و ناچار پاکستان کو بیرونی ممالک سے سرمایہ کو دعوت دینی ہی ہو گی اگر ہم چاہتے ہیں ملک حسب دلخواہ صنعتی ترقی کر سکے"۔۔ لے

"ہم یہ جانتے ہیں کہ ملک میں بیرونی ممالک کے صنعت کاروں کا داخلہ بعض لحاظ سے ضروری ہے۔ مثلاً بقول مسٹر کرشنا چاری وزیر تجارت ہندوستان۔ انگریزوں کی صنعتوں میں مزدوروں سے بہتر سلوک کیا جاتا تھا"

وہ اپنے حسابات بہتر رکھتے تھے۔ انہیں معلوم تھے کہ کس طرح ٹیکسوں سے بچ سکیں۔ لیکن وہ ایسا نہیں کرتے ہیں نہ جعلی دوہرے حسابات رکھا کرتے ہیں"۔۔ ے

یہ بھی صحیح ہے کہ ایک مدت تک مقامی طور پر لوگوں میں حوصلہ نہ پیدا ہو لیکن بیرونی سرمایہ کا لگنا پھر کسی ایسے ملک میں جو اب تک بیشتر زرعی ملک ہی رہا ہے کچھ خوش آئند نہیں ہے سیاسی طور پر اس کے اثرات نفسیاتی طور پر ملک میں اس کا اثر اور پھر معاشی استحصال ان ساری چیزوں کو روکا نہیں جا سکے گا کیا ہمارے سامنے پچھلی تاریخ اور ایران و مشرق وسطیٰ کے ممالک کے درس ہائے عبرت کافی نہیں ہیں۔ بیرونی سرمایہ کی اجازت بہت ہی غور و خوض کے بعد دینی چاہئے اور اسی وقت جبکہ باقی سارے ذرائع عملاً ناکام ہو چکے ہوں محض قیاس و مفروضہ اور امکان کی بنا پر ملک کو تختۂ مشق کر لینا کوئی دانائی نہیں۔ بیرونی سرمایہ کے بعد معاشی سیاسی اور ذہنی غلامی یا نیم غلامی کو دیکھتے ہوئے ہم تو بعض وقت اسے بھی گوارا کر لیں گے کہ "ملک حسب دلخواہ صنعتی ترقی نہ کر سکے" بقول معاصر کراچی کامرس کے ے

"اگر ہمیں انتخاب کرنا ہو تو ہم اپنی توسیع و ترقی میں سست رفتاری ہی کو ترجیح دینگے۔ اگر یقین ہو کہ اس طرح کی ترقی بیرونی سرمایہ سے آزاد ہے کے بعد ملک میں غلام قوم کے بجائے ایک آزاد و خود مختار بستی ہو گی"۔

ملک میں متوسط طبقے میں سرمایہ اندوزی رائج کرنے کی ضرورت اس وجہ سے اور بھی زیادہ ہے کہ اسطرح ملک میں مستقل سرمایہ دار طبقہ نہ بن پائے جس کی وجہ سے اکثر لوگوں

لے Economy of Pakistan صفحہ ۱۹۹

ے Amrita Bazar Patrika الہ آباد شمارہ ۲۰ جون ۱۹۵۲ء

ے ادارتیہ شمارہ ۱۹ اپریل ۱۹۵۲ء

کو اصل صنعت اور مزدوروں اور صارفین سے براہِ راست تعلق اور دلچسپی کے بجائے محض نفع اندوزی ان کے پیش نظر رہ جائے ملک میں مینجنگ ایجنسی سسٹم نے اس طبقاتی تقسیم کو اور بھی ہوا دے رکھی ہے بیرونی سرمایہ کی تدویم سے اور بھی اس تقسیم اور تفریق کا اندیشہ ہے۔ ہمیں بلاشبہ ترقی و توسیع محبوب ہے لیکن اس توسیع کے سیاسی۔ سماجی۔ نفسیاتی اور اخلاقی سارے ہی گوشوں کو ملحوظ رکھنا ہے۔

ان بڑی صنعتوں کے ساتھ ساتھ ملک میں گھریلو اور چھوٹی صنعتوں کا بھی اچھا فیلڈ ہے۔ ہمارے سابق وزیر صنعت نے سمت سفر میں ان کو بھی اہمیت دی تھی۔ اب یہاں ہم تفصیل سے تو گفتگو نہ کر سکیں گے۔ لیکن یوں کچھ روشنی ڈالنی ضروری ہے۔ پاکستان میں اس وقت جو خطے ہیں۔ اتفاق سے ان میں چند بہت ہی معروف دستکاریاں اور گھریلو صنعتیں ہیں۔ ان کی سابقہ شہرت اور ساکھ (Reputation) بہت بڑی تھی۔ خاص طور پر سیالکوٹ کے کھیلوں کے سامان کی صنعت اور آلات وغیرہ۔ نیز ضلع گجرات کے مٹی چینی کے برتن اور وزیرآباد کی کٹلری۔ لیکن تقسیم کے بعد سے اب تک یہ ساری چیزیں نہایت ابتر حالت میں ہیں۔ بہت سے صناع اور دستکار ہندوستان چلے گئے اور ہندوستان نے ان کاریگروں سے بھی فائدہ اٹھایا۔ اور سابقہ شہرت سے بھی چنانچہ "نیا سیالکوٹ" بنا کر انہوں نے کھیل کا سامان تیار کرانا شروع کر دیا ہے پھر یہ کہ ملک کی تقسیم کے بعد ہندوستان سے جو دستکار اور کاریگر آئے ان سے بھی پوری طرح فائدہ نہ اٹھایا گیا وہ سب کے سب نہایت ابتر حالت میں ہیں۔ ان کے مسائل یہ ہیں:۔

(۱) سکونتی جگہ (۲) اوزارات وغیرہ (۳) ان کی مصنوعات کی فروخت[۱]

لیکن اب تک اس سلسلہ میں جو اقدامات کئے گئے ہیں وہ بعض دوسرے منصوبوں کی طرح یا تو کاغذ پر ہی رہ گئے یا رشوت خوری اقربا نوازی میں گم ہو کر رہ گئے۔ چنانچہ قائدآباد کالونی لانڈھی کا قبضہ ابھی بھولا نہیں ہے۔ ان مہاجر دستکاروں کے لئے علیحدہ فنانس کارپوریشن بھی قائم کیا گیا ہے۔ اور سالانہ بجٹوں میں ان کے لئے انتظام کیا گیا۔ لیکن یہ ساری چیزیں ان مسائل کو حل نہ کر سکیں۔

آباد کاری اور دستکاری کے احیاء کا یہ واحد طریقہ تھا کہ انہیں رہنے کے لئے جگہ اور اوزارات مستعار طور پر یا نقد قرضہ کے ذریعہ مہیا کئے جاتے اور اس کے بعد ان کی مصنوعات کی مارکٹنگ کے لئے اہتمام کیا جاتا۔ مرکزی حکومت کے وزیر صنعت نے مسٹر گردیزی وزیر ترقیات پنجاب کو اس کی اجازت دی ہے کہ وہ اپنے صوبہ میں علیحدہ فنانس کارپوریشن قائم کر لیں گھریلو صنعتوں کی مصنوعات کو فروخت کرانے کے لئے انتظامات کریں۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اس سے کہاں تک فائدہ پہنچے گا۔

مارکٹنگ کے لئے اب تک جو کچھ کیا گیا وہ یہ ہے کہ مختلف شہروں میں اور بیرون ملک میں اہم مقامات پر بہت سے شوروم کھول دیئے گئے ہیں۔ اور صنعتی میلوں کے کہیں اسٹال لگائے گئے۔ اس طرح کے بین الاقوامی اور مقامی اسٹالوں پر تقسیم کے بعد سے وسط ۱۹۵۱ء تک ۲۶٫۷۲ لاکھ روپیہ خرچ کئے گئے[۲] لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ یہ وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں۔

نہیں سمجھ میں آتا کہ صرف شوروم اور اسٹالوں پر کیوں اکتفاء کی گئی ہے۔ موجودہ فن اشتہار کے سارے جائز اور (بقیہ بر صفحہ ۲۷۷)

۱؎ کراچی کامرس شمارہ ۲۳ نومبر ۱۹۵۱ء۔

۲؎ پاکستان ٹریڈ شمارہ دسمبر ۱۹۵۱ء صفحہ ۱۴۔

پاکستان کا

پنج سالہ معاشی جائزہ

پروفیسر عبدالحمید ایم اے

یوں تو معاشیات قومی زندگی کا صرف ایک شعبہ ہے۔ مگر اس پر غور و فکر کرنے سے ہم پوری زندگی کے متعلق بہت کچھ قیمتی معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ "پیدائش دولت کے مختلف طریقے" اور "تقسیم دولت کی مختلف شکلیں" حکومت کے عزائم کو آشکارا کرتی ہیں۔ اول الذکر اس حقیقت کے آئینہ دار ہوتے ہیں کہ کیا حکومت اپنے سامنے کچھ حدود و قیود رکھتی ہے یا وہ ہر شعبۂ حیات میں اور ہر راہِ عمل میں مکمل آزاد ہے۔ ہر خارجی رکاوٹ سے، ہر رسمی قید سے، ہر مذہبی و اخلاقی بندش سے اور ہر قانونی یا اجتماعی مداخلت سے۔ اسی طرح تقسیم دولت کی طرز بھی اس راز کو بے نقاب کرتی ہے کہ کیا کارپردازانِ قوم "مسندِ اقتدار" پر محض اس لئے جلوہ افروز ہیں کہ دوسروں کی گاڑھے پسینے سے کمائی ہوئی دولت کو اپنے ذاتی آرام و آسائش پر صرف کریں یا اُن کا عنانِ حکومت سنبھالنے کا مقصدِ وحید یہ ہے کہ سماج میں ظلم و استبداد کو ختم کیا جائے۔ لاوارثوں، یتیموں، بیواؤں کو ان کے حقوق دلوائے جائیں اور امراء کی سرد مہری سے دولت کا جو حصہ منجمد ہو کر رہ گیا ہے اس کو گرما کر متحرک کیا جائے اور وہ اس نہج پر گردش کرنے لگے جس سے اُس کا کچھ حصہ سربفلک محلات اور رفیع الشان عمارات سے گذر کر غریبوں کی جھونپڑیوں تک بھی پہنچ جائے۔ اور اس طرح ان مفلوک الحال لوگوں کو بھی سامانِ زیست مہیا ہو۔ پھر پاکستان کا معاشی جائزہ ایک اور پہلو سے بھی جاذبِ نظر ہے اور وہ یہ کہ یہ ایک ایسے ملک کا جائزہ ہے جس پر کسی ایک طبقہ کی حکومت نہیں بلکہ خدا کی حکومت ہے یہ ایک ایسا معمل ہے جس میں اسلام کے قوانین کی آزمائش مقصود ہے۔ اور اسلامی اقدار کی برتری مطلوب ہے۔ یہ وہ ملک ہے جس کے نظامِ حیات سے اشتراکیت اور سرمایہ داری سے تنگ آئی ہوئی مخلوق کو راہِ ہدایت ملتا ہے۔ الغرض یہ ایک ایسا خطۂ ارضی ہے۔ جس میں سرورِ دو عالم صلعم کے پیش کردہ نظامِ حیات کو نافذ کرنا ہے۔ اور پھر اس کی "زندگی بخش کرنوں" سے پوری دنیا کو منور کرنا ہے۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ۱۵ اگست کو جب آزادی کا آفتاب اس ملک میں طلوع ہوا تو ہمارے کیا حالات تھے، کون کون سی دقتیں ہمارے راستے میں حائل تھیں۔ تقسیم ملک کے وقت سارا معاشی نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ وہ جن کے ہاتھوں میں معیشت کی کنجیاں تھیں وہ اس ملک کو خیرباد کہہ چکے تھے۔ صنعت و حرفت، تجارت و زراعت غرض زندگی کے سب شعبوں میں تعطل تھا۔ بلکہ سب کو ایک سخت دھچکا لگا۔ ادھر ہندوؤں سے ستائی ہوئی مخلوق ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں ملک میں آ رہی تھی۔ یہ لوگ اپنا وطن، دولت، عزت سب کچھ لٹا کر نہایت ہی خستہ حالی کے عالم میں پاکستان کی حدود میں داخل ہو رہے تھے۔ اور یہ ایسا سیل بے پناہ تھا جو رکتا نظر نہ آتا تھا۔ پھر کشمیر کے جھگڑے نے صورت حال کو اور بھی نازک بنا دیا تھا جونا گڑھ اور حیدر آباد پر ہندوستان کے جارحانہ اقدام نے اُس کو اس زعمِ باطل میں مبتلا کر دیا تھا کہ وہ ایشیا کا لیڈر بنے۔ ادھر ملک کے اندر ہر طرف ایک خوف و ہراس کا عالم چھایا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ انگریز کی غلامی سے ہمیں وہ معاشی نظام ورثہ میں ملا جو سراسر ناانصافی پر مبنی تھا۔ اس "سفید فام" نے اپنی استعماریت کی بنیادیں مستحکم کرنے کے لئے ملک کی زمینوں کو چند ایسے نفوس کے حوالے کر دیا تھا جو اس حد تک بے ضمیر تھے کہ پوری ملت اسلامیہ کو چند کھنکھناتے ہوئے سکوں کے عوض بیچنے کے لئے رضامند ہو گئے۔ چونکہ انگریز کا مفاد ان سے وابستہ تھا اس لئے دل کھول کر اُن کی حمایت کی۔ قانون کی پوری مشینری ان کی پشت پناہ رہی۔ اور عوام جن کے سینوں میں ابھی تک آزادی کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں ان کو مجبور کیا گیا۔ کہ وہ اپنے خون کو جلا کر ان ظالموں کے شبستانوں کو روشن کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان آقاؤں کے چراغ تو روشن رہے مگر ان مفلوک الحال لوگوں کی زیست کی ٹمٹماتی ہوئی شمع بجھنے لگی۔ وہ جیتے نہیں تھے بلکہ سانس لیتے اور ان کی ہر سانس ایک آہ تھی استعماریت کے خلاف۔

معاشی جائزہ

ان حالات میں ہمیں آزادی کا سانس لینا نصیب ہوا۔ مگر ان نقصانات کے ساتھ ہمیں کچھ فوائد بھی حاصل تھے۔ اور نفع کے پلڑے میں سب سے وزن دار جو چیز تھی وہ پاکستانیوں کا اسلام کے لئے "ملک اور قوم کے لئے نہایت ہی سچا جذبہ تھا۔ چند افراد کو چھوڑ کر پوری قوم کے سینے میں دین اور وطن کے لئے نہایت ہی پاکیزہ جذبات موجزن تھے۔ اس وقت ایک ایک فرد اسی تڑپ میں تڑپ رہا تھا۔ وہ خون کے سمندر سے گذرے۔ مگر ان کی ہمتیں پست نہ ہوئیں۔ وہ آگ کے شعلوں سے کھیلے مگر ان کے عزائم متزلزل نہ ہوئے۔ انہوں نے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرایا۔ اور یہ سب کچھ صرف ایک "بات" کی خاطر کہ اس آزاد ملک میں اسلام کے نظام حیات کے مطابق انہیں بھی چین اور سکھ نصیب ہوگا ظالموں کے پنجۂ استبداد سے رہائی ملے گی۔ انہیں بھی زیست کے لئے اتنا سامان تو ضرور میسر ہوگا جس سے وہ جسم و روح کے رشتہ کو بآسانی قائم رکھ سکیں۔

ممکن ہے۔ اس صبر و تحمل، اس ایثار و محبت کو ترازو کے پلڑوں میں وزن نہ کیا جا سکے۔ اور سکوں کے عوض اُن کی قیمت کا اندازہ نہ لگ سکے لیکن آزاد قوموں کی زندگی میں یہ وہ گوہر نایاب ہے۔ جسے نہ تو محسوسات کے پیمانوں سے ناپا جا سکتا ہے اور نہ ہی دنیا کی تمام بیجان دھاتیں بھی مل کر اس کو خرید سکتی ہیں۔ یہ دراصل اقوام کی روح ہوتی ہے۔ اور یہی وہ اصل جوہر ہے جس سے قومیں کامیابی اور عظمت حاصل کرتی ہیں۔ منافع کے پہلوؤں میں یہ پہلو میرے نزدیک سب سے زیادہ اہم ہے۔ پھر یہ ملک کسی ملک کا مقروض نہیں تھا۔ تقسیم کے وقت انگلستان ہندوستان کا بہت زیادہ زیر بار تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں جو مال ہندوستان کی طرف سے برآمد ہو رہا تھا اُس کی قیمت گیارہ ہزار ساٹھ ملین پونڈ تک پہنچ چکی تھی۔ اور اس سے پاکستان کو حصہ ملنا تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے مالیاتی معاہدہ کے مطابق جو کہ انگلستان اور پاکستان کے درمیان تقسیم ملک کے وقت اگست ۱۹۴۷ء میں ہوا اس کی رو سے ۳۱ دسمبر ۱۹۴۷ء تک پاکستان ۶۰ لاکھ پونڈ حاصل کرنے کا استحقاق رکھتا تھا۔

اس کے علاوہ غذائی صورت حال نہایت تسلی بخش تھی اگرچہ پاکستان کی زیر کاشت زمین کی اوسط ہندوستان کے مقابلہ میں کم ہے۔ مگر یہاں پیداوار اُس سے زیادہ ہے کیونکہ اس ملک کی زمین ہندوستان کی نسبت زیادہ زرخیز ہے جہاں تک گندم کا تعلق ہے۔ پاکستان ... ۲۲۶۵ ٹن سالانہ گندم پیدا کرتا ہے۔ لیکن اس کی خانگی ضروریات ۴۲ لاکھ ٹن سے پوری ہو جاتی ہیں اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ پاکستان ۸ لاکھ ٹن سالانہ گندم فالتو پیدا کرتا ہے۔ جو دوسرے ممالک کو برآمد کی جا سکتی ہے۔ چاول کی پیداوار ۶۷ لاکھ ۲۵ ہزار ٹن ہے ہماری ضروریات ۸۰ لاکھ ٹن سے پوری ہو سکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا۔ کہ ۵ لاکھ ٹن چاول ہمیں باہر سے درآمد کرنا پڑتا ہے۔

پاکستان میں اناج کی افراط کے علاوہ ایک ایسی قیمتی شئے بھی قدرت کی فیاضی کے ہاتھوں پاکستان کو عطا ہوئی ہے۔ جسے پٹ سن کہا جاتا ہے۔ اس وقت دنیا کو جتنے ریشوں کا علم ہے ان میں غالباً یہ ریشہ جو پاکستان کے لئے سنہری ریشہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ سب سے زیادہ کارآمد ہے۔ تقسیم ہند سے قبل ہندوستان میں پٹ سن کی صنعت دنیا میں ٹیکسٹائل صنعت میں دوسرے درجہ پر تھی۔ تقسیم کے بعد غیر منقسم ہندوستان کے پٹ سن پیدا کرنے والے علاقہ کا ۸۰ فی صدی حصہ پاکستان کے حصہ میں آیا۔ بالفاظ دیگر متحدہ ہندوستان جتنا پٹ سن پیدا کرتا تھا اب اس کا ۸۰ فی صدی حصہ پاکستان میں پیدا ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ پاکستان کو دنیا میں پٹ سن کی سو فی صدی اجارہ داری حاصل ہے۔

پٹ سن کے بعد پاکستان کی دوسری اہم فصل کپاس ہے۔ ۱۹۴۷ء کے اعداد و شمار کے اعتبار سے اس ملک میں ۲۰۸۱۲۶۴۸ من کپاس پیدا ہوئی۔ اس کے مطابق متحدہ ہندوستان میں جس قدر کپاس پیدا ہوتی تھی اب اس کا ۲۵ فی صدی حصہ پاکستان میں پیدا ہوتا ہے۔ متحدہ ہندوستان میں امریکی کپاس اور بڑے ریشے والی کپاس (نرما) کے لئے جو علاقے مشہور تھے اب وہ تمام کے تمام پاکستان میں ہیں۔ پاکستان کی کپاس کی مانگ دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ اور ایسٹرن ایکانومسٹ (دہلی) کے بیان کے مطابق ہندوستان کے صرف ایک کارخانہ ——— دہلی ٹیکسٹائل ملز۔ کو ہی پاکستانی کپاس کی کم از کم دس لاکھ گانٹھیں مطلوب ہیں۔ پاکستان میں جو کپاس پیدا ہوتی ہے اس کی مالیت کا اندازہ پچاس کروڑ روپیہ ہے۔ مصر بھی جو کپاس

معاشی جائزہ

کی پیداوار کے لئے مشہور ہے۔ اور جس کی کپاس کوالٹی کے لحاظ سے دنیا بھر میں واحد ہے۔ اتنی رقم کی کپاس پیدا نہیں کرتا ہے[1]۔
ان فوائد اور نقصانات کے ساتھ پاکستان نے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔

تقسیم کے فوراً بعد ہی حکومت نے نومبر ۱۹۴۷ء میں صنعتی کانفرنس بلائی اور اپنی صنعتی پالیسی کا مارچ ۱۹۴۸ء میں اعلان کیا اور منصوبہ بندی کے لئے انتظامی مشینری کو وجود میں لایا گیا ۱۹۴۹ء کے آغاز میں پانچ سالہ پلان کا نقشہ تیار کیا جا رہا تھا اور ۱۹۵۰ء میں اسے کولمبو پلان میں مدغم کر دیا گیا جس کی معیاد چھ سال کی تھی (یعنی جولائی ۱۹۵۱ء سے جون ۱۹۵۷ء تک) ۱۹۵۱ء میں ایک چھوٹا پلان کوریا کی جنگ سے پیدا شدہ حالات پر قابو پانے کے لئے مرتب کیا گیا۔

ڈاکٹر اختر صاحب کے کہنے کے مطابق ۱۹۵۱ء کے آغاز تک حکومت کے منصوبہ بندی کے بورڈ نے ۵۰۔۱۱ اسکیموں کو منظور کر لیا تھا جس کے مطابق پاکستان کے معاشی حالات میں مندرجہ ذیل خوشگوار تبدیلیاں ہوں گی۔

(۱) اناج میں سات لاکھ ٹن سالانہ کا اضافہ۔

(۲) ۲۸ لاکھ ایکڑ رقبہ اور زیر کاشت لایا جائے گا۔

(۳) اور بجلی ۰۰۰۔۶۷ کلوواٹ حاصل ہوگی۔

(۴) اس کے علاوہ یہ توقع تھی کہ لوئر سندھ بیرج سے ۲۸ لاکھ ایکڑ مزید زمین سیراب کی جائے گی اور اناج میں ۔۔۔۔۔ ۴ ٹن ہر سال اضافہ ہوگا۔

ان اسکیموں کو پاس ہوئے تقریباً ۶ سال گزر چکے ہیں مگر ان میں بہت کم کاغذوں کی فائلوں سے نکل کر زندگی کے میدان میں لائی گئی ہیں۔ ہر روز ریڈیو اور پریس کے ذریعے ہم یہ خبریں سنتے ہیں کہ آج دو منصوبہ بنایا گیا ہے۔ یا یہ اسکیم تیار کی جا رہی ہے مگر ان میں سے بہت ہی کم ایسی ہیں جو پایہ تکمیل تک پہنچی ہوں۔ اور اس سے پاکستانی عوام کی حالت بہتر ہو سکی ہو۔ اس قسم کے سبز باغ دوسری حکومتوں کو متاثر کرنے کے لئے تو بہت مفید ہیں مگر پیٹ کے تقاضے کچھ اتنے بے رحم واقع ہوئے ہیں کہ وہ اعداد و شمار کی فراوانی سے پورے نہیں ہوتے۔

جہاں تک بحری تجارت کا تعلق ہے۔ ہماری درآمد میں ۱۹۴۷-۴۸ء سے لے کر ۱۹۵۱-۵۲ء تک ۱۰۱ کروڑ روپیہ کا اضافہ ہوا ہے۔ اسی طرح ہماری ان اشیاء میں جو سمندر کے ذریعے دوسرے ممالک کو بھیجی جاتی ہیں ان میں ۱۳ کروڑ روپے کا اضافہ ہے۔ مگر یہ حال پوری تجارت کا نہیں۔ اس کے لئے ہم صرف پچھلے سال کے اعداد و شمار پیش کرتے ہیں۔

	۱۹۵۰-۵۱ء دس لاکھ روپے	۱۹۵۱-۵۲ء اپریل تا دسمبر دس لاکھ روپے
کھالیں	۴۹٫۲	۳۱٫۰
چائے	۱۷٫۳	۴۳٫۲
کپاس	۱۰۱۰٫۲	۳۷۰٫۷
پٹ سن	۶۶۹٫۱	۴۸۴٫۴
اون	۶۸٫۲	۳۹٫۱
ہڈیاں	۷٫۲	۶٫۱
دیگر اشیاء	۱۳۵٫۲	۱۲۵٫۸
	۱۹۵۶٫۴	۱۱۰۰٫۳

[1] پاکستان کا معاشی جائزہ از خالد سعید صفحہ ۲۲

اس نقشہ سے صاف ظاہر ہے کہ ہماری برآمد میں معتدبہ کمی واقع ہو رہی ہے۔

پھر اس تجارت کا ایک اور قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ ہم اپنا خام مال برآمد کرتے ہیں اور ہماری درآمد کا زیادہ حصہ کپڑے اور فضول سامان تعیش پر مشتمل ہوتا ہے اور بہت تھوڑا مال ایسا ہے جس سے ملک کی تعمیر اور ترقی کی جاسکتی ہے۔ ہم اپنے قیمتی فاضلات ان بے کار چیزوں پر ضائع کر رہے ہیں۔ یہ بات ملک کے لئے کوئی نیک شگون نہیں ہو سکتی۔

ملک کی تجارت میں سب سے افسوسناک بات یہ ہے کہ ہماری کوئی واضح اور مستقل پالیسی نہیں۔ ہمارے تجارت کے اصول ہر لمحہ اور ہر لحظہ سیماب کی طرح بدلتے رہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہمیں اشیاء درآمد اور برآمد کرنے میں بہت سی دقتوں کا سامنا پیش آتا ہے اور پاکستانی اور غیر پاکستانی تاجر حکومت کی اس ہر آن بدلتی ہوئی پالیسی کی وجہ سے کسی بڑے پیمانہ پر تجارت نہیں کر سکتے۔ پھر ہمارے تاجروں کو دوسرے ممالک کی منڈیوں کے حالات سے بروقت مطلع رکھنے کا انتظام نہیں کیا جاتا۔ ان حالات کی وجہ سے کاروبار میں ایک عام تعطل ہے

ہمارے مرکزی میزانیہ میں بھی آمد و خرچ کی مدوں میں برابر اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۴۸-۴۹ء اور ۱۹۵۱-۵۲ء کے درمیان حکومت کی آمدنی ۶۶،۷ کروڑ سے بڑھ کر ۱۴۰٫۶۵ کروڑ تک جا پہنچی۔ اس اضافہ کی وجہ سے مرکز اس کے قابل ہو گیا کہ وہ صوبوں کو ان کی ترقی کے لئے کچھ رقم واپس کر دے۔ اس طرح صوبائی بجٹس میں ۱۹۴۸-۴۹ء سے ۱۹۵۱-۵۲ء تک تقریبا ، کروڑ کا اضافہ ہوا ہے۔ برسر اقتدار طبقہ ان میزانیوں پر جتنا خوش ہو ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں، عالم خیال میں بسنے والے لوگ جو باتیں چاہیں بنا لیں مگر دیکھا جاتا ہے کہ فاضل بجٹ یا خسارہ کا بجٹ سب بے معنی ہیں۔ کیا ہم نے اس لئے فاضل بجٹ پیش کئے ہیں ہمارے سب بسنے والوں کی سب ضروریات اب پوری ہو چکی ہیں؟ یا دوسروں کو مرعوب کرنے کے لئے یہ سب ہیر پھیر کئے جا رہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ بجٹ صرف اعداد و شمار کی جادوگری ہے۔ اس میں اصل فیصلہ کن چیز لوگوں کے روزگار کی ضمانت ہے۔ اگر بجٹ کے ذریعہ سے بچت اور سرمایہ کاری میں توازن کیا گیا ہے، اگر اس میں لوگوں کے معیار زندگی کو بلند کرنے کا کوئی انتظام کیا ہے، اگر افلاس کو دور کرنے کی کوئی ترکیب موجود ہے تو مبارک ہے وہ بجٹ خواہ خسارہ دیتا ہے یا بچت۔ اس کے علاوہ ہمارے مرکزی میزانیہ کی بچت کے کئی اور اسباب بھی ہیں جو بالکل عارضی ہیں۔

(۱) یہ بچت لوگوں پر کمر توڑ دینے والے ٹیکسوں کا بوجھ لاد کر حاصل کی گئی۔

(۲) جنگ کوریا کے چھڑ جانے کی وجہ سے ہم جو اشیاء برآمد کر رہے تھے اُن میں دفعتاً اضافہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ کسٹم کی مد سے بھی ہمیں غیر معمولی آمدنی ہوئی۔

(۳) مرکز نے صوبائی آمدنی کی بہت سی مدّوں کو مرکزی بجٹ میں شامل کر لیا اور اس سے نظر کو خیرہ کرنے والے اعداد و شمار حاصل ہو گئے۔

زراعت میں ہمارا جو حال ہے۔ وہ کسی شخص سے پوشیدہ نہیں۔ اس کے لئے شماریات بالکل عبث ہیں۔ وہ ملک جو ابتدا میں نہایت ہی خستہ حالی کے عالم میں بھی گندم کی درآمد کر سکتا ہے اس نے اپنے حکمرانوں کی "حوصلہ افزائیوں کے طفیل" ۵ سال میں اس قدر ترقی کر لی ہے کہ اس کے بسنے والے ایک نہیں لاکھوں روٹی کے چند نوالوں تک کے محتاج ہو گئے ہیں۔ یہ ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اس کے لئے نہ تو کسی منطق کی ضرورت ہے اور نہ کسی ماہر معاشیات یا وزیر کے بیان کی۔ اس کو ہر وہ شخص محسوس کرتا ہے جس سے اُس کا روزگار چھن گیا ہے۔ وہ کام کرنے کا خواہشمند ہونے کے باوجود کام نہیں کر سکتا۔ اس کے بچے صبح و شام روٹی کے لئے ترستے ہیں اس کی بہو اور بیٹی کو تن ڈھانپنے کے لئے کپڑا میسر نہیں آتا۔

یہ وہ سوال ہے جو اس وقت ہر پاکستانی کی نظر میں ہے کہ "ہمارے بجٹس فاضل ہیں۔ دنیا کے تمام ممالک سے ہم نے تجارتی اور سفارتی تعلقات قائم کر رکھے ہیں اسکیموں پر اسکیمیں بنتی چلی جاتی ہیں اور منصوبہ پر منصوبے مرتب ہو رہے ہیں لیکن آخر کیا وجہ ہے ان سب چیزوں کے باوجود ملک کے عوام دن بدن بلکہ ہر ساعت افلاس کی طرف جا رہے ہیں؟" اس کا آخر کوئی سبب تو ہونا چاہئے۔ سب سے پہلی بات جو اس ضمن میں ذہن نشین کرنے کے

قابل ہے وہ یہ کہ ہمارے حکمران طبقے کے سامنے اصل سوال یہ نہیں کہ لوگوں کا معیارِ زندگی بلند ہو۔ ان کے نزدیک سب سے اہم مسئلہ ان کے اقتدار کی حفاظت اور بقا کا ہے۔ اس لئے ایسی کھوکھلی باتیں کی جاتی ہیں جو یوں تو بہت زیادہ دل لبھانے والی ہوں مگر حقیقت سے بہت دور۔ وہ ہمیشہ اس قسم کے منصوبے سوچتے رہتے ہیں جن سے ان کی نمائش ہو سکے۔ اخبارات میں انکا چرچا ہو۔ ریڈیو پر اُن کے تذکرے ہوں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ غیر ملکی اخبارات اور سیاست دان ان کے حق میں کوئی "کلمہ خیر" کہہ دیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسکیمیں تو بہت سوچی جاتی ہیں مگر ان میں سے کم ہی ایسی ہیں جو پایۂ تکمیل تک پہنچتی ہوں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ طبقہ بہت سارو پیہ اپنی کبریائی کی ٹھاٹھ جمانے کے لئے نہایت ہی بے دردی سے صرف کرتا ہے غیر ملکی سفارت خانوں پر اپنی دعوتوں اور آرائش و زیبائش پر جس بے دردی سے روپیہ بہایا جاتا ہے وہ حد درجہ افسوسناک ہے۔ اور پھر غضب یہ کہ اسے ایسے راز میں رکھا جاتا ہے جس پر سے پردہ اٹھانا ناممکنات میں سے ہے۔ اصل میں یہی وہ اصلی بیماری ہے جو پاکستان کو گھن کی طرح اندر سے اندر کھائی چلی جا رہی ہے۔ ہر آنے والی صبح ہمارے لئے غربت اور بے روزگاری کا پیغام لاتی ہے۔ مگر ہمیں پتہ نہیں چلتا کہ اتنے جاذبِ نظر پروگراموں کے ہوتے ہوئے ایسا ہو کیوں رہا ہے؟

یہ خیال جو ہر پاکستانی کے ذہن میں آن ابھرتا ہے۔ اس کا جواب نہ تو معاشیات کی ناقابلِ فہم اصطلاحوں میں موجود ہے اور نہ ہی شماریات کے ہیر پھیر میں بلکہ اس کا جواب ایک سادہ لوح اور ان پڑھ مزدور سے حاصل کیا جا سکتا ہے جب وہ آبدیدہ ہو کر یہ کہتا ہے: "یوں ملک میں تو سب کچھ ہے مگر ہمارے لئے کچھ بھی نہیں"۔ یہ جواب کھلا چیلنج ہے دولت کی ناہمواریانہ تقسیم کے خلاف۔ اس میں سوچنے والوں کے لئے بہت ہی عبرت کی باتیں ہیں۔

(بقیہ ہماری صنعتیں)

مناسب ذرائع اختیار کیوں نہیں کئے گئے۔ ضرورت ہے کہ باقاعدہ لٹریچر کے ذریعہ ان کے بارے میں بیرونی ممالک تک پروپگنڈہ اور اشاعت ہو۔ مقامی طور پر یا نیم سرکاری اداروں میں ان دستکاریوں کی مصنوعات کو جبری طور پر استعمال کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ خود ملک کے اندر صارفین Consumers کو لٹریچر وغیرہ کے ذریعہ اس طرف مائل کیا جائے۔ وہ ان مصنوعات کی ہمت افزائی کریں پھر یہ کہ فلم اور ریڈیو فیچرز وغیرہ کے ذریعہ بھی ان کا بہتر اشتہار ہو سکتا ہے۔ بعض مصنوعات کو جبری طور پر سپلائی کیا جائے۔ الغرض مارکٹنگ کو فروغ دینے کے بہت سے ذرائع ہو سکتے ہیں۔ اس قسم کے شعبے اور ادارے اگر تشکیل پائیں تو بہتر ہوگا کہ سرکاری ملازمین کے بجائے امدادِ باہمی کے اصولوں پر انہیں دستکاروں سے انتظامی کام لینے کی کوشش کی جائے تاکہ یہ بے چارے چھوٹی پونجی کے لوگ تو سرکاری ملازمین کی دستبرد سے محفوظ رہ سکیں۔

مارکٹنگ کی سہولتوں کے لئے چیزیں جمع کرنے اور انہیں منڈیوں تک پہنچانے وغیرہ کے لئے مناسب اداروں کے قیام کے بعد اوزارات اور چھوٹی مشینوں کا سوال آتا ہے۔ بعض دستکاریاں ایسی ہیں جن کے پاس نئے اوزارات اور بہتر اور نئی مشینری نہ ہونے کی وجہ سے مصنوعات کی کوالٹی گرتی جا رہی ہے۔ نوبہ نو ترقی و بہتری کے امکانات ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ اس طرف بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ گجرات ضلع کی ظروف سازی میں اگر چند بہتر بھٹیاں قائم ہو جائیں تو ان کی مصنوعات چینی کے برتنوں کے ساتھ مسابقت کر سکیں گی۔ پاکستان کی گھریلو صنعتیں اپنی شہرت اور ساکھ سے نہ صرف کتنے لوگوں کو ذریعۂ معاش فراہم کرتی ہیں بلکہ خود ملک کی شہرت کا بھی باعث ہیں البتہ ان کی طرف مخلصانہ توجہ کی ضرورت ہے۔

الغرض بڑی صنعتیں ہوں یا چھوٹی سب ہی دفتری اور کاغذی دست بُرد کے ہاتھوں تباہ ہیں۔ اب تک جو ذرائع اختیار کئے گئے ہیں وہ سب بہت اخراجات چاہتے ہیں اور کم موثر ہوتے ہیں لیکن اگر واضح اور جامع سوچی بھی پالیسی ہو نیز دیانتدار انتظامیہ میسر ہو تو ملک کے وسائل اور افراد کی صلاحیتیں اس قدر ہیں کہ ملک دُنیا کی بڑی صنعتی اور تجارتی قوموں میں سرفرازی کے ساتھ شامل ہو سکتا ہے۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

پاکستان کا
معاشی بحران

پروفیسر اے۔ ڈی۔ ایم۔ اے

پچھلے دو سال سے پاکستان کا معاشی توازن بگڑا ہوا ہے جس سے ہماری زندگی کے تمام شعبے اثر پذیر ہوئے ہیں۔ اس سے اشیائے خوردنی اور دیگر ضروری چیزوں کی قیمتوں میں بہت اضافہ ہوا ہے اور مصارف زندگی بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں۔ اس کے برعکس خام اجناس کی قیمتوں میں بہت کمی ہو گئی ہے جس سے آبادی کے بیشتر حصے کی آمدنی کم ہو گئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ تمام لوگوں کی زندگی میں کافی مشکلیں پیدا ہو گئی ہیں۔ بے روزگاری بڑھ گئی ہے اور معاشی دنیا میں بے چینی اور ہلچل سی مچ گئی ہے۔ مستقبل غیر یقینی نظر آتا ہے اور اس لئے صنعت و حرفت اور تجارت میں تعطل پیدا ہو گیا ہے۔

اشیائے خوردنی اور دیگر درآمد شدہ اشیاء کے اعداد و شمار کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ متوسط طبقہ کے لوگوں کے مصارف زندگی بتدریج بڑھتے جا رہے ہیں اور ان کے لیے جینا مشکل ہو گیا ہے۔ ان کے موجودہ (۱۹۵۲ء) مصارف ۱۹۳۹ء کے مقابلہ میں چھ سات گنا اور ۱۹۴۲ء کے مقابلہ میں تین گنا زیادہ ہیں۔ اگرچہ ۱۹۴۳ء میں اشیاء کی کافی قلت تھی اور ملک بھر میں لڑائی کی وجہ سے قحط کے سے حالات تھے پھر بھی یہ مصارف ۱۹۴۶ء یعنی تقسیم ہند و پاکستان سے پہلے کے مصارف سے بھی دوگنا زیادہ ہیں اور ۱۹۵۱ء سے بھی نسبتاً بہت زیادہ ہیں۔ مصارف زندگی کا موازنہ کرنے کے لئے ۱۹۳۹ء کے مصارف کو ہم عدد ۱۰۰ سے ظاہر کرتے ہیں اور پھر دوسرے سالوں کے مصارف کو اس کی نسبت سے ظاہر کرتے ہیں۔ مندرجہ ذیل اعداد و شمار لاہور کے متوسط طبقہ سے متعلق ہیں اور مرکزی حکومت نے شائع کئے ہیں (سوائے ۱۹۵۲ کے)

سال	اعداد و شمار
۱۹۳۹	۱۰۰
۱۹۴۲	۲۲۳
۱۹۴۶	۳۴۳
۱۹۴۷	۳۹۸
۱۹۴۸	۴۴۴
۱۹۴۹	۳۸۲
۱۹۵۰	۴۱۷
۱۹۵۱	۴۳۴
۱۹۵۲ (ستمبر تک)	۷۶۰

مندرجہ بالا اعداد و شمار سے جو کہ لاہور کے متعلق ہیں آپ دوسرے شہروں اور قصبوں کے متعلق بھی بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ متوسط طبقہ کے لوگوں کے مصارف زندگی پہلے کی نسبت کس قدر بڑھ گئے ہیں۔ قیمتوں کی گرانی سے حالات روز بروز بگڑ رہے ہیں اور بے روزگاری بڑھ رہی ہے جس سے حالات اور زیادہ تشویشناک ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے جو پاکستان کے دفاتر روزگار (**Employment Exchange Centres**)

نے شائع کئے ہیں ، بخوبی ہو سکتا ہے :-

سال	درج شدہ اشخاص	ملازمت یاب اشخاص	فی صد ملازمت یاب
۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے ۳۱ دسمبر تک	۱۰۲۱۱۵	۳۳۷۰۹	٪ ۳۳
۱۹۴۸	۱۸۶۱۸۲	۵۹۴۴۵	٪ ۳۱
۱۹۴۹	۲۲۷۰۷۲	۷۱۶۸۸	٪ ۳۱
۱۹۵۰	۲۳۱۰۷۴	۴۵۸۱۹	٪ ۲۰
۱۹۵۱ جنوری سے اگست تک	۱۷۲۹۰۱	۲۴۱۲۸	٪ ۱۴

ان اعداد و شمار سے آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ بے روزگاروں کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے اور جن کو روزگار مہیا کیا جاتا ہے ان کی تعداد میں کمی ہوتی جاتی رہی ہے۔ لیکن یہ اعداد و شمار معاشی بحران کی صرف ادھوری تصویر پیش کرتے ہیں کیونکہ پاکستان میں دفاتر روزگار بہت کم ہیں اس لئے بے کار لوگ اپنا نام درج نہیں کروا سکتے مزید برآں ہمارے ملک کی بیشتر آبادی ناخواندہ ہے اور دیہات میں رہتی ہے - وہ ایسے اداروں کے فوائد سے قطعاً ان کے نام تک سے ناآشنا ہے اس لئے وہ اپنا نام وغیرہ درج نہیں کرواتے - صرف شہری آبادی جو کل آبادی کا گیارہ فیصد کے قریب ہے کے کچھ لوگ ان اداروں میں اپنا نام درج کرواتے ہیں ۔ لہذا بے روزگاری کی شدت کا صحیح اندازہ ان اعداد و شمار سے نہیں ہو سکتا ۔

اب ذرا اپنی بیرونی تجارت کو لیجئے ۔ پاکستان کی برآمدی تجارت تمام تر خام اجناس مثلاً پٹ سن ، کپاس ، تیل نکالنے کے بیج وغیرہ اور برآمدی تجارت مالہ اشیائے ضرورت وغیرہ پر مشتمل ہے ۔ جنگ ۱۹۴۷ء کے پہلے ۷½ ماہ یعنی ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے ۳۱ مارچ ۱۹۴۸ء میں ہماری کل برآمدی تجارت ۴۸ کروڑ روپے اور درآمدی تجارت صرف ۱۵ کروڑ روپے تھی یعنی توازن تجارت تقریباً ۳۳ کروڑ روپے پاکستان کے حق میں تھا اس کے برعکس ۴۹-۱۹۴۸ میں ہماری بحری تجارت کا توازن بمقدار ۳۴ کروڑ ہمارے مخالف تھا لیکن اس میں بری تجارت جو کہ زیادہ تر ہندوستان کے ساتھ تھی شامل کر کے توازن تجارت ہمارے حق میں ہو جاتا۔ ۵۰-۱۹۴۹ میں بھی بحری تجارت کا توازن بمقدار ۲۵ کروڑ روپے ہمارے مخالف رہا ۔ لیکن اگر اس میں بری تجارت شامل کر لی جائے تو پھر یہ بالکل متوازن ہو جاتا ہے یعنی برآمد اور درآمد دونوں مدیں برابر ہو جاتی ہیں - پھر چوتھے سال یعنی ۵۱-۱۹۵۰ میں بحری تجارت کو خوب ترقی ہوئی اور توازن تجارت بمقدار ۵۹ کروڑ روپے ہمارے حق میں رہا۔ لیکن ۵۲-۱۹۵۱ میں توازن تجارت بمقدار ۴۷ کروڑ روپے ہمارے مخالف رہا۔ کل برآمدی تجارت ۲۴۰ کروڑ روپے اور درآمدی تجارت ۲۸۷ کروڑ روپے کی تھی ۔

پاکستان کی بحری تجارت کے اعداد و شمار (کروڑ روپوں میں) حسب ذیل ہیں :-

سال	برآمد	درآمد	توازن تجارت
۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے ۳۱ مارچ ۱۹۴۸ء تک	۴۸	۱۵	+ ۳۳
اپریل ۱۹۴۸ سے مارچ ۱۹۴۹ تک	۱۰۲۶۳۲	۱۱۸۶۲۵	- ۱۵۹۹۳
اپریل ۱۹۴۹ سے مارچ ۱۹۵۰ تک	۹۲	۱۱۷	- ۲۵
اپریل ۱۹۵۰ سے مارچ ۱۹۵۱ تک	۱۹۵	۱۳۶	+ ۵۹
جولائی ۱۹۵۱ سے جون ۱۹۵۲ تک	۲۴۰	۲۸۷	- ۴۷

ان اعداد و شمار سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ ہماری بحری تجارت کا توازن بتدریج (۱۹۵۱ کے سوا) ہمارے مخالف رہا ہے اور اس کی مقدار بڑھتی جا رہی ہے ۔ اس کی سب سے بڑی وجہ عام اشیائے ضرورت کی بلا انتہا درآمد ہے ۔ چند سالوں سے پاکستان کی تجارتی پالیسی کچھ اس قسم کی رہی

معاشی بحران

کہ کروڑوں روپوں کے مبادلات خارجہ عام غیر ضروری اور تعیشات کی اشیاء کی درآمد پر صرف کئے جاتے رہے ہیں اور ہماری برآمدی تجارت سے کمائی ہوئی دولت کو یونہی ضائع کر دیا گیا ہے۔ پھر اس مخالف توازن تجارت کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ برطانیہ سے ہماری درآمدی تجارت جو کہ عام غیر ضروری اشیاء پر مشتمل ہوتی تھی متواتر ہماری برآمد سے زیادہ رہی ہے اور چونکہ بحری تجارت میں برطانیہ کا حصہ سب سے زیادہ رہا ہے اس لئے توازن تجارت ہمارے مخالف رہا ہے اور جو مبادلات خارجہ ہم دوسرے ممالک سے ڈالر یا اسٹرلنگ کی شکل میں حاصل کرتے رہے ہیں وہ برطانیہ کو اس مخالف توازن تجارت کی ادائیگی میں دیتے رہے ہیں۔ پھر اس کے علاوہ ہماری برآمدی تجارت تمام تر خام اجناس پر مشتمل ہے جن کی بین الاقوامی قیمتوں اور مانگ دونوں میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ جب مانگ بڑھ جاتی ہے تو برآمدی تجارت بھی بڑھ جاتی ہے اور جب مانگ کم ہوتی ہے تو برآمدی تجارت میں بھی کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اس لئے ہمارے ملک کی معیشت (Economy) غیر یقینی ہے۔ اس کا انحصار تمام تر خام اجناس کی فروخت پر ہے جو بالکل غیر مستقل اور غیر یقینی ہے اور حالات کے بدلنے سے بدلتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری برآمدی تجارت سے آمدنی گھٹتی اور بڑھتی رہتی ہے چونکہ ۵۲ - ۱۹۵۱ میں ہماری کپاس اور پٹ سن کی مانگ بہت کم تھی اس لئے اس مدت میں خام اجناس کم برآمد کی گئیں جس کی وجہ سے برآمدی تجارت میں بہت کمی ہو گئی اس کے برعکس عام اشیائے ضرورت بدستور درآمد ہوتی رہیں جس سے تجارت کا توازن ہمارے مخالف ہو گیا۔

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے ملک کی معیشت کس قدر غیر متوازن اور غیر یقینی ہے خام اجناس کی قیمتیں گری ہوئی ہیں کیونکہ ان کی زیادہ مانگ نہیں ہے۔ اشیائے خوردنی اور دیگر ضروری اشیاء کی قیمتیں باوجود ان کی کافی مقدار میں درآمد کے بڑھی ہوئی ہیں۔ بے روزگاری متواتر بڑھ رہی ہے۔ اور عوام کے لئے جینا مشکل ہو گیا ہے۔

اب ہم اس معاشی بحران کے اسباب و وجوہ کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اس کی ایک بہت بڑی وجہ تو پاکستان حکومت کی درآمدی تجارت کی پالیسی ہے جس کی وجہ سے تمام ضروری اور غیر ضروری اشیاء کو "او - جی - ایل" فہرست میں رکھا ہوا تھا۔ اس سے سرمایہ دار بلا امتیاز مختلف اشیاء درآمد کر لیتے تھے اور ملک کی تمام دولت تعیش کی ان چیزوں مثلاً کاروں، بناؤ سنگار وغیرہ پر صرف ہو جاتی رہی ہے۔ جس سے بیرونی تجارت کا توازن مخالف ہو جاتا رہا ہے۔ پھر چونکہ زیادہ تر اشیاء برطانیہ سے آتی ہیں اور اس کی چیزوں کو دوسرے ممالک کے مقابلہ میں امتیازی حیثیت حاصل ہے اس لئے وہ ہمیں نسبتاً مہنگی پڑتی ہیں۔ اگرچہ دوسرے ممالک سے وہ کافی سستی مل سکتی ہیں لیکن پاکستان چونکہ پرانی تجارتی پالیسی پر عمل کر رہا ہے اس لئے وہ اشیاء برطانیہ سے ہی خریدی جاتی ہیں اور بین الاقوامی بازار کے مقابلہ کی قیمتوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح ہمیں اپنی برآمد شدہ خام اجناس کی قیمتیں بھی نسبتاً کم ملتی ہیں یہی نہیں بلکہ ڈالر کے علاقہ سے ہم خام اجناس بیچ کر جو ڈالر کماتے ہیں ان کا بیشتر حصہ بھی برطانیہ لے جاتا ہے۔ اس کا مجموعی اثر یہ ہے کہ ہمیں اپنی برآمدی اور درآمدی تجارت سے جو کہ برطانیہ کے ساتھ ہے پورا پورا فائدہ نہیں ہوتا۔

ہماری حکومت کے معاشی منصوبے ملک کے معاشی حالات کو بالکل نظر انداز کر کے تیار کئے گئے ہیں اور ملک میں کپڑے، چینی، کاغذ اور پٹ سن وغیرہ کے چند ایک کارخانے تعمیر کر دینے کو منصوبہ بندی کا مقصد عین تصور کر لیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے معاشی حالات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی بلکہ حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کے برعکس ملک کی صنعت و حرفت اور اندرونی تجارت لوگوں کی کم قوت خرید کی وجہ سے زیادہ ترقی نہیں کر سکی جس سے ان کی معاشی حالت بہتر کی بجائے پہلے سے بھی ابتر ہو گئی ہے

سرمایہ داروں اور زمینداروں کی ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری کی وجہ سے اشیائے خوردنی اور دیگر ضروری اشیاء کی قیمتوں میں کمی ہوتی نظر نہیں آتی۔ اس کے برعکس بین الاقوامی حالات کی وجہ سے خام اجناس کی مانگ کم ہو گئی ہے جس سے پٹ سن اور کپاس کی قیمتوں میں بہت کمی ہو گئی ہے۔ ہماری خام اجناس کی قیمتوں میں کمی کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ امریکہ اور برطانیہ پس ماندہ ممالک کی خام اجناس کی قیمتوں کو گرانا چاہتے تھے تاکہ وہ اپنی ذیلی ضروریات کی پیداوار کے لئے کم لاگت پر مال تیار کر سکیں۔ اور چونکہ ہماری برآمدی تجارت کا زیادہ حصہ برطانیہ، چین، جاپان اور امریکہ وغیرہ چند

(بقیہ بر صفحہ ۳۱۱)

پاکستان کے

جبری انتخابات

سید صدیق الحسن گیلانی

(Forced Elections in Pakistan)

تقسیم کے وقت جو بوسیدہ و ناکارہ مال ہمارے حصے میں آیا اس میں انگریز کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی ہوئی اسمبلیوں کے وہ ٹکڑے بھی تھے جن میں غالب اکثریت لاٹ صاحب کے اشارۂ چشم پر ناچنے والے، قوم کو بیچنے اور بیچنے کی خاطر نمائندگی کا دم بھرنے والے ممبروں کی تھی۔ ملک نیا نیا معرضِ وجود میں آیا تھا، قوم خون کی ندیوں میں سے ابھی ابھی تیر کر نکلی تھی اس لئے عوام ان حضرات کے کمالات، ان کے عقل و فہم، ان کی دیانت و امانت، کو ناقابلِ اعتماد سمجھتے ہوئے بھی مجبور تھے کہ اس جیسے تیسے ڈھانچے کو پوری مدد دیکر چلتی ہوئی نظم و نسق کی مشنیری کو کسی طرح رکنے نہ دیں اور "بھلے دن آئینگے" کے حسین تصور میں کھوئے رہیں۔ وقت گذرتا رہا۔ مسائل الجھتے رہے عوام بدظن تھے ہی بدگمانی اور بڑھتی رہی۔ اضطراب اور بےچینی پیدا ہوئی ـــــ ادھر یہ لوگ پہلے نمائندگی کے ٹھیکیدار تھے۔ اس ٹھیکیداری سے اب حاکمیت کی طرف قدم بڑھنے لگے۔ پہلے اقتدار حاصل تھا بالواسطہ اب بلاواسطہ بلا شرکتِ غیرے حاصل ہو چکا تھا۔ یہ نشہ کچھ ایسا نشہ نہیں جسے معمولی تلخی اتار دے۔

لیکن اقتدار جب بہت سے لوگوں کو ملے تو رقابت کی گاڑی میں لد کر آتا ہے۔ پنجاب کے ایم۔ ایل۔ اے حضرات میں رسہ کشی شروع ہوئی۔ وزارتوں میں تبدیلیاں آنے لگیں لیکن ہر تبدیلی مزید پیچیدگیاں پیدا کرنے کا باعث بنی اور . . . اور گورنر جنرل نے اسمبلی کو توڑ دیا۔ اور ۱۹۵۱ء میں دو سال کے گورنری راج کے بعد دوبارہ انتخاب کر دئے گئے۔ یہاں سے ہمارے ملک میں جدید طریقے پر جبری انتخابات کا آغاز ہوتا ہے۔ پنجاب کے کامیاب تجربے کے بعد سرحد میں ممبر سازی ہوئی اور اس سال بہاولپور کے عوام کو بھی حق رائے دہندگی دیکر ان کا منہ کالا کر دیا گیا۔ یقین جانیئے کہ نئے دستور کے بننے سے پہلے پہلے سندھ اور مشرقی بنگال میں بھی اس ڈرامہ کو دہرایا جائیگا۔ اور نئے دستور کے نفاذ کے بعد صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کو یہ کہہ کر معرضِ التوا میں ڈال دیا جائیگا کہ انتخابات ابھی ابھی ہوئے ہیں۔ مرکز میں انتخابات ہونگے۔

نئی تکنیک ہمارے الیکشن میں نئی تکنیک کی ایجاد کا فخر جس کسے بھی حاصل ہوا ہو۔ اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ یہ تکنیک نہایت ہی کامیاب ہے اور نتائج کے اعتبار سے تیر بہدف نسخہ۔ اس کے دو حصے ہیں ایک منصوبہ بندی اور دوسرے طریق کار۔ اور دو نوں ایسے ہی یقینی نتائج ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ جیسے دو اور دو چار۔ ان دونوں پہلوؤں پر میں یہاں مختصر طور پر روشنی ڈالتا ہوں۔ صرف اس حد تک جو میں پنجاب۔ سرحد اور بہاولپور کے تین تجربات سے اخذ کر پایا ہوں "عالم بالا" میں ممکن ہے کیا کیا صورتیں اور تفصیلات ہوں جو میری نظروں سے پنہاں رہی ہوں یا جنہیں استعمال کرنے کی ابھی نوبت ہی نہ آئی ہو اور آئندہ چلکر ہمیں محو حیرت ہونا پڑے۔

منصوبہ بندی جبری انتخابات میں منصوبہ بندی کا طریقہ کچھ اس طرح کا ہے کہ صوبے یا ریاست کے لئے مرکزی حکومت کسی جنٹلمین سے پیکٹ کر کے اسے وزیر اعلےٰ نامزد کر دیتی ہے کاغذات پر تو نہیں لیکن وزیر اعظم اور مرکزی وزراء کی زبانوں پر وزیر اعلےٰ کا نام بار بار آتا ہے۔ اور اسے صوبے یا ریاست کا نجات دہندہ ظاہر کیا جاتا ہے۔ پھر وہ صوبے کا الاٹی اپنے ہونے والے کابینہ کا اندازہ کر کے وزارتیں الاٹ کرتا ہے۔ یہاں تک مرکز کا مشورہ اور رہنمائی ساتھ ہوتی ہے۔ لیکن اس مختصر سی پارٹی کے قیام کے بعد مرکز مطمئن ہو جاتا

ہے اور انہیں عام انتخابی لائسنس عطا کر دی جاتی ہے کہ وہ جو چاہیں کریں۔

یہ مختصر پارٹی سر جوڑ کر بیٹھ جاتی ہے اور ایسے لوگوں کی فہرست تیار کرتی ہے جو ایم۔ ایل۔ اے کے اعزاز کے مستحق ہوں۔ سرمایہ دے۔ دلا اور لگا سکتے ہوں۔ پوری وفاداری سے ہر سیاہ و سفید پر جی سرکار پکار، مٹنے والے ہوں۔ اس فہرست کی تیاری خاصا مشکل کام ہے لیکن کہیں مشورے سے، کہیں دھونس سے، کہیں بوٹے اور لاٹری سے کہیں بینک بیلنس اور بیگمات کے مقابلے سے اس مشکل پر عبور حاصل کر لیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ سارا کام نہایت خاموشی اور رازداری سے انجام پاتا ہے لیکن عوام تک یہ اطلاعات کہیں روٹھے ہوئے حواریوں اور کہیں مبارکباد قبول کرنے والے حضرات کی وجہ سے پہنچ جاتی ہیں۔ یہ کام پایۂ تکمیل تک پہنچ جانے کے بعد حکومت کی طرف سے سرکاری اعلان شائع کیا جاتا ہے کہ صوبے میں عام انتخابات کرانے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ اور سرکاری تیاریاں حلقہ بندی، فہرستوں کی تیاری شروع کر دی جاتی ہے۔ حلقہ بندی کے لئے ایک کمیٹی بنا دی جاتی ہے۔ جو صوبے میں دورہ کر کے اس غیر سرکاری فہرست میں درج شدہ ہونے والے ایم۔ ایل۔ اے حضرات سے مل کر مشورہ کر کے ان کی سہولت کے مطابق مناسب حلقے تجویز کرتی ہے۔ حلقہ بندی گویا "حلقۂ اثر بندی" کا دوسرا نام ہے۔ اس کے بعد فہرستوں کی تیاری کا کاروبار شروع ہوتا ہے اور سرکاری نقشے، پٹواری انہیں ہونے والے ایم۔ ایل۔ اے حضرات کے قدموں میں بیٹھ کر یہ خدمت سرانجام دیتے ہیں۔ یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ فہرستوں میں کیا کیا اضافہ اور حذف کیا جاتا۔ اس تکمیل اور تسلی بخش تکمیل پر ہی سرکاری گزٹ کا انحصار ہے اور جب تک یہ سلسلہ پوری طرح طے نہ ہو جائے، سرکاری اعلان ملتوی رہتا ہے۔

طریق کار

طریق کار کی بنیاد دھوکا، دھونس، دھاندلی اور دھن کے چار زریں اصولوں پر ہے اور منصوبہ بندی کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ان اصولوں پر نمبروار عمل کیا جاتا ہے۔ پھر پاکستان۔ حکومت اور مسلم لیگ ——— مسلم لیگ، حکومت پاکستان۔ اس تثلیث کا پروپیگنڈا اس طرح کیا جاتا ہے کہ سب سے پہلے وزیر اعظم۔ صدر مسلم لیگ دورے پر نکلتے ہیں مرکزی وزراء کی ٹیم پورے صوبے میں پھیل جاتی ہے۔ پھر صوبائی وزراء اٹھتے دوسرے وزراء چکر لگاتے ہیں۔ ضلعی حکام۔ ڈپٹی کمشنر۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس۔ تحصیلدار۔ پولیس انسپکٹر اور آخر میں پولیس کے سپاہی اور پٹواری۔ ڈسٹرکٹ بورڈوں کے سکول ٹیچر۔ مسلم لیگ کی مخالفت حکومت کی مخالفت اور حکومت کی مخالفت پاکستان کی مخالفت بنا دی جاتی ہے مخالفین کو غدار اور گستاخ تک کہنے میں شرم نہیں محسوس کی جاتی۔ الاٹمنٹوں کی تنسیخ کے اعلانات کئے جاتے ہیں۔ سرحد پر فوجیں بھی دنوں میں دکھائی دینے لگتی ہیں۔ سنگینوں کے اشارے ہوتے ہیں۔ اس بے پناہ سرکاری طوفان کے جلو میں کچھ مقدس جبے اور سبز عمامے بھی ہوتے ہیں جو عمل تکفیر سے ایمان اور شرافت کی تمام لطافتوں کو بخارات بنا کر اڑا دیتے ہیں اور کرسی بدی کو باقی رکھ کر رہنے والے اپنے تعویذوں سے جلا دیکر چمکاتے ہیں۔ درباری صحافت میدان عمل میں نکلتی ہے اور نیوز پرنٹ پر اپنی سڑاند بکھیرتی ہوئی آنکھوں کو اندھا کر دیتی ہے۔ پیشہ ور واعظین ——— گھنٹوں سیاسی تقریریں کرنے والے۔ سیاست سے کنارہ کش بزرگ لوگوں کے کانوں میں منتشر خیالات کی روئی ٹھونس دیتے ہیں سیفٹی ایکٹ کی تلوار حق گو زبانیں کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ ہتھکڑیاں پولیس کے سٹور سے نکل آتی ہیں..... اور ...... یوں زمین ہموار کرنے کے بعد منصوبے کے مطابق ایم۔ ایل۔ اے حضرات صحافتوں اور سرکاری ملازمین کے ضمیر و اقتدار کے مندر کی گھنٹیاں بجانے والے منتریوں کی روحانی فضیلتوں، عوام کے حقوق آزادی، مظلوموں کے دلوں، جمہوریت اور آزادی رائے، اسلامی احکام اور ملک کے مجموعی مفاد کو پاؤں تلے روندتے ہوئے کرسیوں پر براجمان ہو جاتے ہیں۔ اسمبلی اور پارلیمنٹ وزارت معرض وجود میں آ جاتی ہے..... اور لوگ یہ سوچتے رہتے ہیں کہ آخر یہ ہو کیسے گیا۔ اس اجمال کی کچھ تفصیلات پیش کرتا ہوں لیکن حق یہ ہے کہ جمہوریت کا یہ انوکھا ماڈل، انتخابات سے براہ راست واسطہ پڑے بغیر سمجھ میں آنا بہت مشکل ہے۔

جبری انتخابات

میں بیان دینے کی جرأت ہوئی اور نہ ہی پشاور کے اے۔ پی۔ پی کے
کہ صدود سے اندر سے تو تاریں اور خطوط بھی نہیں بھیجے جا سکتے
لے گئے تھے جو کچھ بیتی اس کی ہلکی سی

اِنتخابی مہم کے مختلف مراحل

انتخابی مہم کے مختلف مراحل یہ ہیں (۱) فرنچائز یعنی حقِ رائے دہندگی (۲) حلقہ بندی (۳) رائے دہندگان کی تیاری (۴) کاغذاتِ نامزدگی کا داخلہ (۵) پولنگ اور ہر مرحلہ میں جو کچھ ہونا چاہیئے۔ اس سے یہاں بحث نہیں ہے وہ سب کچھ قواعد میں موجود ہے۔ اگرچہ اس میں بھی کچھ کم خامیاں ہیں۔ یہاں صرف اس پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا کہ کیا ہوتا ہے' یہاں یہ تصریح بھی کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ عالمِ بالا میں جو کچھ طے ہوتا ہے اور جس طرح سے ڈائرکشن دی جاتی ہے' اس سے بالواسطہ یا بلاواسطہ مجھے کوئی واقفیت نہیں ہے جو نتائج میں نے اخذ کئے ہیں یہ ان کے عملی اقدامات سے اخذ کئے ہیں یا پھر کچھ اندازہ ان سرکاری افسران سے ملاقات سے ہوا جن سے انتخابات کی مہم کے دوران وقتاً فوقتاً ملنے کا اتفاق ہوا۔ بعض مواقع پر ان کے مؤقف کی کمزوری نے انہیں اپنی بے بسی کے اظہار پر بھی مجبور کر دیا تاہم مجھے ان کے سو فی صدی صحیح ہونے کا دعویٰ نہیں ہے اس میں اختلاف کی گنجائش ہے۔ بشرطیکہ اختلاف کی پشت پر کوئی مضبوط دلیل ہو۔ میں نے جو بھی رائے قائم کی ہے۔ مشاہدہ اور عملی تجربہ کے بعد قائم کی ہے۔ اس لئے کسی کی خوش فہمی' کی بنا پر میں اپنی رائے بدلنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔

(۱) فرنچائز یعنی حقِ رائے دہندگی

ہمارے ہاں انگریز کے زمانے میں محدود حقِ رائے دہندگی کا دستور تھا۔ اور دستور ساز اسمبلی اس بنیاد پر منتخب ہوئی تھی۔ اس دستور ساز اسمبلی کے فرائض میں سب سے اولین درجہ رکھتی تھی کہ وہ ملک کا دستور بنائے اور نئے دستور کے نفاذ کے بعد عام انتخابات صوبوں اور مرکز میں کرائے جا۔ اسمبلی نے دستور کے معاملے کو ٹال مٹول کی نذر کر دیا لیکن بالغ رائے دہندگی کے اصول کو نہ صرف جاری کر دیا بلکہ یہ حق خواتین کو عطا کر دیا۔ اور اسی بنیاد پر انتخابات کرانا شروع کر دیئے۔ وزیرِ اعظم خواجہ ناظم الدین صاحب نے پشاور گورنمنٹ ہاؤس میں ایک آل پارٹیز وفد سے ملاقات کے دوران میں اعتراف کیا کہ ہمارے ملک میں ابھی مرد بھی ووٹ کے استعمال کو نہیں جانتے خواتین کا تو سوال ہی نہیں ہوتا۔ وزیرِ اعظم نے مزید فرمایا کہ "ذاتی" طور پر میں خواتین کو ووٹ کا حق دینے کے خلاف ہوں اور آج نہیں بلکہ سنہ ۱۹۳۲ء سے اس کا مخالف ہوں"۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ تمام بالغ مردوں اور عورتوں کو ووٹ دینے کا حق ایک شریفانہ سازش کے ماتحت دیا گیا تھا تاکہ دھاندلی مچا کر ان لوگوں سے ووٹ لے لئے جائیں جو اس کی قدر و قیمت سے قطعاً ناواقف ہیں اور دباؤ میں آسانی سے آسکتے ہیں اور کون نہیں جانتا کہ اس سازش سے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے۔

(۲) حلقہ بندی

حلقہ بندی کا اصل مقصد تو یہ تھا کہ آبادی کو ایسے Homogeniuns حصوں میں بانٹ دیا جائے جہاں لوگوں کے زیادہ سے زیادہ مسائل مشترک ہوں اور وہ ایک دوسرے سے زیادہ سے زیادہ واقفیت رکھتے ہوں۔ تاکہ غور و فکر کے بعد کسی ویسے آدمی کو اپنا نمائندہ چن سکیں جسے لوگ جانتے بھی ہوں اور وہ ان کے مسائل سے واقفیت بھی رکھتا ہو تاکہ ان کی صحیح نمائندگی کر سکے۔ لیکن ہمارے ہاں حلقہ بندی اس نقطۂ نظر سے کی جاتی ہے کہ لوگ بالکل غافل ہوں اور باہر سے کوئی آدمی لا کر ان پر ٹھوپ دیا جائے۔ اس کی خاص طور پر ضرورت اس لئے بھی محسوس ہوتی ہے کہ لیگ کو ٹکٹ صرف ایسے لوگوں کو دینا ہوتے ہیں جنہیں لوگ جان بوجھ کر اپنے آپ پر مسلط کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے یہاں مثال کے طور پر بہاولپور کے شہری حلقوں کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس سے واضح ہوگا کہ جان بوجھ کر آبادیوں کو اس طرح اکٹھا کیا گیا ہے کہ ایک [illegible] سے قطعاً ناواقف ہوں۔

مقامات اور ان کا فاصلہ

۱- بہاول نگر شہری	منڈی صادق گنج	۳۲ میل	فاصلہ بہاولنگر سے۔
	منچن آباد	۲۶ میل	" " "
	ہارون آباد	۲۴ میل	" " "
	فورٹ عباس	۶۳ میل	" " "

....

۲- بہاولپور شرقی	بہاولپور شہر	وارڈ ۲ تا ۹	(بہاولپور شہر کو کاٹ کر رکھ دیا گیا)
	چشتیاں	۴۰ میل	فاصلہ بہاولپور سے۔
	حاصل پور	۵۴ میل	" " "
	قائم پور	۴۹ میل	" " "
	خیرپور	۴۴ میل	" " "
۳- بہاولپور غربی	بہاولپور شہر	وارڈز ۱۰ تا ۲۱	(شہر دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا)
	سمہ سٹہ	۱۲ میل	فاصلہ بہاولپور سے۔
	خانقاہ شریف	۹ میل	" " "
	الہ آباد	۵۵ میل	" " "
	ڈیرہ نواب	۳۲ میل	" " "
	اوچ شریف	۴۴ میل	" " "

....

۴- احمد پور شرقیہ۔	احمد پور شرقیہ		
	چنی گوٹھ	۱۱ میل	فاصلہ احمد پور شرقیہ سے
	چاچڑاں شریف	۱۸ میل	" " "
	خانپور	۴۵ میل	(وارڈ ۱ تا ۹) "

....

۵- رحیم یار خاں	رحیم یار خاں		
	احمد پور لمہ	۲۰ میل	فاصلہ رحیم یار خاں سے
	خانپور	۲۶ میل	(ریلوے جنکشن) "
	کوٹ سماہ	۱۳ میل	"
	صادق آباد	۱۴ میل	"

اب غور فرمائیے کہ ان پانچ حلقوں میں کیا کیا کمالات کئے گئے ہیں۔ شہر بہاولپور کے کچھ وارڈ ایک حلقے میں اور کچھ دوسرے حلقے میں شامل کر دیئے گئے ہیں یہی حرکت خانپور کے قصبے سے کی گئی ہے۔ احمد پور شرقیہ اور ڈیرہ نواب میں صرف چار پانچ میل کا فاصلہ ہے لیکن دونوں کو الگ الگ حلقوں میں شامل کیا گیا تمام حلقوں میں چھوٹے چھوٹے قصبے اس انداز میں شامل کئے گئے کہ ۸۰ سے ۱۰۰ میل کے لپیٹ میں حلقہ پھیلتا چلا گیا۔ اور قصبات جو دیہاتی آبادی کی رہنمائی عام طور پر کرتے ہیں انہیں متعلقہ دیہات سے کاٹ دیا گیا۔ اور دیہاتی آبادی "سیاسی بصیرت" حاصل کرنے کے بالکل قابل نہ رہی۔

فہرست رائے دہندگان

ہمارے ہاں شاید ہی کوئی فہرست رائے دہندگان ایسی شائع ہوئی ہو جس میں پچاس فی صدی سے کم غلطیاں ہوں۔ اندراجات کی غلطیوں کے علاوہ ہزارہا جعلی نام موجود اور اصلی نام گم ہوتے ہیں۔ پنجاب میں تصیح کے لئے جو وقت ملا تھا۔ اس میں ضلع لاہور کے صرف ایک حلقے پتوکی اور کوٹ رادھا کشن میں جماعت اسلامی کے کارکنوں نے بائیس ہزار ایسے افراد کی درخواستیں دلوائیں جن کے نام درج نہیں تھے۔ گاؤں کے گاؤں اور خاندان کے خاندان صاف اڑا دیئے گئے تھے۔ جب یہ درخواستیں پیش ہوئیں تو لیگی حضرات گھبرا اٹھے اور گورنر نے ان منظور شدہ درخواستوں کو دوبارہ چیک کرانے کے لئے احکام جاری کر دیئے اور لاہور کے ایک مجسٹریٹ مسٹر فضل نے پتوکی کے علاقے میں پہنچ کر ان پر نظر ثانی کی اور وہ تمام کی تمام صحیح ثابت ہوئیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں لیگی امیدوار کامیاب نہ ہو سکا۔ ریاست بہاولپور میں خانپور کے دو وارڈوں کے ووٹروں کے نام دو شہری حلقوں احمد پور شرقیہ اور رحیم یار خان میں شامل کر دیئے گئے۔ اور سرحد میں تو اس کا ذکر ہی فضول ہے۔

فہرستوں میں جو کوائف دیئے جاتے ہیں وہ کسی طرح بھی جعلسازی اور تلبیس کو روکنے میں مدد نہیں دے سکتے۔ ان میں قومیت۔ عمر تعلیم۔ مکمل پتہ بالکل درج نہیں ہوتا۔ اور پھر ان فہرستوں کی قیمت اتنی زیادہ رکھ دی جاتی ہے کہ صرف سرمایہ دار انتخابی کھلاڑی ہی خرید سکتے ہیں۔

کاغذاتِ نامزدگی

پچھلے مراحل تو صرف انتظامی امور سے تعلق رکھتے تھے۔ یہاں سے کامیابی کے مراحل شروع ہو جاتے ہیں اور یہاں معاملہ بہت نازک صورت اختیار کر جاتا ہے۔ سب سے بڑا یقینی قسم کا چور دروازہ یہی کاغذاتِ نامزدگی کی منظوری اور استرداد کا ہے۔ بڑے بڑے وزراء، حکام اور مردان آہن اسی دروازے سے داخل ہوتے ہیں۔ پاکستان میں یہ دروازہ اب چور دروازہ نہیں بلکہ سرکاری پھاٹک بن چکا ہے۔ اس سلسلے میں دو چار واقعات پیش کرتا ہوں۔

امروز مورخہ ۱۴ نومبر ۶۴ء میں خان غلام محمد خان لُنڈ خوڑ کے کاغذات نامزدگی کے متعلق آنکھوں دیکھا حال یوں بیان کیا گیا۔

ڈپٹی کمشنر مردان جو ان حلقوں کے ریٹرننگ افسر بھی ہیں بطلا یہ فرماتے ہیں کہ خان کے کاغذات حتمی طور پر مسترد کر دیئے جائیں گے۔

۱۰ نومبر کو ڈپٹی کمشنر کے فیصلے پر یہ کاغذات داخل کئے گئے کم از کم پچاس ساٹھ معززین یہ کاغذات داخل کرنے گئے تھے میں گھاس پر ایک طرف بیٹھا تھا اور میرے قریب ہی کرسیوں پر چند اصحاب تشریف فرما تھے ایک نے دوسرے سے کہا کہ لُنڈ خوڑ کے لئے اتنا ہجوم جمع ہوا ہے۔ دوسرے صاحب بولے اس کا فکر نہیں وہ میدان میں نہیں رہے گا۔ یہ باتیں انگریزی میں ہو رہی تھیں بعد میں معلوم ہوا کہ یہ دوسرے صاحب عبدالغنی تھے۔ جنہیں حلقہ نمبر ۱ سے مسلم لیگ کا ٹکٹ ملا تھا۔

کاغذات داخل کرنے کے بعد ہم ہتھیان پہنچے یہاں خان کے استقبال کے لئے جلسے کا انتظام کیا گیا تھا تمام علاقہ اُمڈ آیا تھا لیکن جلاوطنی کی مدت میں توسیع کی خبر سن کر بے چارے اس "جمہوریت" پر لعنت بھیجتے ہوئے واپس جا رہے تھے۔

۱۷ اور ۱۸ نومبر کو مردان میں یہ خبر گشت کر رہی تھی کہ ڈپٹی کمشنر صاحب برملا کہہ رہے ہیں کہ خان کے کاغذات رد کر دیئے

امیدواروں
جائیں گے' میں نے مخالف موافق ہر حلقہ سے یہ سنا کہ اگر خان کو مقابلہ کرنے کی اجازت دی گئی تو "قومی"
کی ضمانتیں ضبط ہو جائیں گی۔

۹ رنومبر یعنی آج پڑتال کی تاریخ تھی صبح ہی سے ہمیں معلوم ہو گیا تھا کہ خان پہ عدم رہائش اور جعلی دستخط کے اعتراضات
ہونگے میں نے خان کے وکیل سے کہا کہ اگر دستخط کا جھگڑا ہوا تو مجھے بطور گواہ طلب کر لیا جائے۔ دس بجے حلقہ نمبر ایک کے
کاغذات پیش ہوئے چند منٹ بعد مجھے آواز دی گئی مسلم لیگ کی طرف سے بغیر کاغذات نامزدگی دیکھنے کے ہی یہ اعتراض کر دیا
گیا کہ ان سب پر خان کے دستخط جعلی ہیں۔ اندر گیا تو یہ اعتراض کیا جا رہا تھا کہ لونڈ خوڑ کی رہائش خان ترک کر چکا ہے اور ڈپٹی
کمشنر صاحب یہ دریافت کر رہے تھے کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ خان کا ارادہ واپسی کا ہے میں نے آہستہ سے عرض
کیا کہ اگر خان کا ارادہ واپسی کا نہ ہو تو حکومت کیوں بار بار جلاوطنی میں توسیع کرتی اور ابھی تھوڑا عرصہ گذرا کہ آپ نے اپنے
ضلع کی سرحد پر دفعہ ۱۴۴ کے تحت اسے داخل ہونے سے روکا تھا۔ اس پر دستخط کا معاملہ پیش ہوا ڈپٹی کمشنر نے فرمایا کہ دستخط
ہونے کا کیا ثبوت ہے میں نے عرض کیا کہ درجنوں آدمی باہر ایسے بیٹھے ہیں جو یہ حلفیہ بیان دینے کو تیار ہیں کہ خان نے خود
ان کے روبرو دستخط کئے ہیں ارشاد ہوا کہ بیان حلفی پر ہمیں یقین نہیں ان پر تو بے گناہ آدمیوں کو پھانسی تک دے دی جاتی
ہے۔ عرض کیا کہ یہ بیان حلفی کی قانونی وقعت کا ثبوت ہے اور جب آپ خان کو خود آنے کی اجازت نہیں دیتے تو اس سرسری
کارروائی میں اس کے سوا اور ثبوت ہو ہی کیا سکتا ہے اس پر ڈپٹی کمشنر صاحب نے بہت جھنجھلا کر پوچھا کہ تم کون ہو عرض کیا کہ
میں پنجاب سے آیا ہوں اور خان نے ان کاغذات پر میرے سامنے دستخط کئے ہیں خان کے وکیل نے کہا بطور گواہ میں نے بلوایا
اور مسلم لیگ والوں Get out, do not want your presence
ہے بڑے تحکمانہ انداز میں حکم ملا کہ
کو کہا کہ ہمارے دفتر اور محافظ خانہ سے کوئی ایسی مثل تلاش کر کے لاؤ جن میں خان کے دستخط ہوں کوئی دو گھنٹہ بعد مسلم لیگی حضرات
محافظ خانہ سے خود ایک مثل نکال لائے جو خان لونڈ خوڑ کے متعلق تھی۔ اس اثنا میں خان کے ۱۲ تجویز کنندگان اور تائید کنندگان
نے اس مضمون کا ایک حلفیہ بیان داخل کیا کہ خان غلام محمد خان نے ان کے سامنے جملہ درخواستوں پر دستخط کئے ہیں۔ لیکن صاحب
بہادر نے کہا "کہ ہم سمجھتا ہے کہ دستخط جعلی ہیں۔ اس لئے دونوں حلقوں کے کاغذات نامنظور۔ باہر لیگ" جمہوریت مرثو (یعنی
جمہوریت مرگئی) کے نعرے لگا رہے تھے۔ ان حالات کو دیکھ کر میں وہاں سے چل دیا۔
نوشہرہ میں جناح عوامی مسلم لیگ کے دفتر میں معلوم ہوا۔ کہ عبدالقیوم خان کے پشاور کے حریف ماسٹر خان گل کے تجویز کنندہ
کو رات ہی سے پولیس نے اغوا کر لیا ہے۔ اور ضلع ہزارہ میں ان کے مخالف امیدوار کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔
ابھی ابھی ریڈیو سے معلوم ہوا ہے کہ عبدالقیوم خان دونوں حلقوں سے" بلامقابلہ کامیاب ہو گئے" "آزاد انتخاب زندہ
باد" "جمہوریت پائندہ باد"

(۲) امروز مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۵۱ء کے ایڈیٹوریل نوٹ میں سرحد کے مرد آہن کی کامیابی پر یوں تبصرہ کیا گیا ہے:۔
"لیکن جو اطلاع سب سے زیادہ اندیشہ پیدا کر رہی ہے وہ یہ ہے کہ خان عبدالقیوم خان کے مخالف امیدوار ماسٹر گل خان
کے تائید کنندگان کو رات کے وقت اغوا کر لیا گیا اور حلقہ نمبر ۱ سے علی اکبر خان نامی ایک ایسے امیدوار کو گرفتار کر لیا گیا جو
عبدالقیوم کے مقابلہ میں انتخاب کیلئے کھڑا ہو رہا تھا۔ جس انتخاب کو "بلامقابلہ" بنانے کے لئے کاغذات نامزدگی کو مسترد کرنے' اغوا کرانے
اور گرفتار کرا لینے کی ضرورت محسوس ہو اسے کس حد تک "بلامقابلہ" کہا جا سکتا ہے ——— یہ ایک ایسا سوال ہے جو پاکستا

اشاعت خاص ———

کے تمام جمہوریت پسندوں کے لئے پریشانی کا باعث بنا ہوا ہے۔ یہ واقعات ایسے ہیں جن کے سامنے دادو جری (سندھ) کا وہ ضمنی انتخاب بھی ماند پڑ جاتا ہے۔ جس میں مسٹر کھوڑو نے اپنے برادر نسبتی کو سندھ اسمبلی کا ممبر منتخب کرانے کے لئے مخالف امیدواروں کو اغوا اور گرفتار کرایا جاتا ہے۔

ہم جمہوریت، انصاف، اور دیانت داری کے نام پر مرکزی حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ان واقعات واطلاعات کی عدالتی تحقیقات کرنے کے بعد مناسب قدم اٹھائے تاکہ اندیشے اور شکوک وشبہات رفع ہوں۔

یہ واقعات اس ملک میں جمہوریت کے مستقبل پر براہِ راست اثر انداز ہو رہے ہیں۔ جن افسوس ناک رجحانات کو مسٹر کھوڑو نے سندھ میں روایت بنایا ہے اور جن کا قلع قمع کرنے کے لئے مرکزی حکومت نے کچھ نہیں کیا وہ خطرناک حد تک جڑ پکڑ چکے ہیں اور اب صوبۂ سرحد میں ان کا اعادہ ہو رہا ہے۔ ہم ملک کے تمام سنجیدہ اور ذمّے دار حلقوں کی جانب سے مرکزی حکومت کو متنبّہ کرنا چاہتے ہیں کہ اگر اس قسم کی "روایات" مستحکم ہوگئیں تو اس ملک میں جمہوریت کا خدا ہی حافظ ہے۔ اگر ہماری اجتماعی اور سیاسی زندگی اس طرح اصول۔ آئین اور قانون سے بے نیاز ہوتی چلی گئی تو ملک کے حق میں انتہائی تباہ کن نتائج پیدا ہوں گے اور آئندہ نسلیں اس کی ذمّے داری ان افراد پر عائد کریں گی جو آج برسر اقتدار ہیں"

(۳) یہاں ماسٹر خان گل کا بیان جو نوائے پاکستان مورخہ ۵ انومبر ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

میں مسٹر عبدالقیوم خاں کے مقابلہ میں پشاور چھاؤنی کے حلقے سے امیدوار تھا۔ جناح عوامی مسلم لیگ نے مجھے دو حلقوں (پشاور چھاونی اور ضلع کوہاٹ مشرق) سے انتخابات میں حصہ لینے کی ہدایت کی تھی۔ اس ہدایت کے پیشِ نظر ظاہر ہے کہ میں کاغذات نامزدگی داخل کرنے کے لئے دونوں حلقوں کے ریٹرننگ آفیسروں کے روبرو بیک وقت بذاتِ خود پیش نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں خود تو کوہاٹ چلا گیا۔ اور پشاور چھاؤنی کے حلقہ کے کاغذات نامزدگی اپنے موئید محمد بشیر کو دے گیا اس نے حسب قاعدہ ڈپٹی کمشنر پشاور کے روبرو میرے کاغذات نامزدگی داخل کر دئے۔ اس کارروائی کے بعد جب وہ اپنے گھر گیا تو مسٹر عبدالقیوم خاں کے مجوّز اور موید اس کے پاس پہنچے اور اسے دھمکی دی کہ وہ میری امیدواری کا موید رہنے سے انکار کر دے۔ بصورتِ دیگر اسے شدید نقصان پہنچایا جائے گا۔ جب محمد بشیر نے اس آمرانہ حکم کی تعمیل کرنے سے مسلسل انکار کیا تو مسٹر عبدالقیوم خاں کے نمائندے اسے کوئی بہانہ کرکے گھر سے باہر لے گئے۔ اور پھر وہ رات کو بھی گھر نہ آیا دوسرے دن معلوم ہوا کہ میرے موید کو اغوا کرکے نوشہرہ پہنچایا گیا۔ اور وہاں ایک مجسٹریٹ کے روبرو بیان دلوایا گیا کہ میں نے اپنے کاغذات نامزدگی پر اس سے دھوکہ دے کر دستخط کروائے تھے۔ اس جبری بیان کو دوسرے دن ڈپٹی کمشنر پشاور کے روبرو پیش کیا گیا۔ اور میرے کاغذات مسترد کر دئے گئے۔ ڈپٹی کمشنر نے یہ غیر قانونی کارروائی کرتے ہوئے اس حقیقت کو بھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ کہ اگر میں نے دھوکہ سے دستخط کروائے ہوتے تو محمد بشیر میرے کاغذات خود کیوں داخل کراتا۔

وزیر اعظم پاکستان کو تار

میں اس حیرت انگیز دھاندلی کے متعلق گورنر جنرل پاکستان۔ وزیر اعظم پاکستان اور تمام صوبائی گورنروں اور صوبائی وزرائے اعظم کو بذریعہ تار آگاہ کر چکا ہوں۔ قیوم وزارت کی ہدایت کے مطابق دیگر ۲۰ غیر لیگی امیدواران اسمبلی کو بھی اس قسم کی آمرانہ کارروائی کے ذریعے انتخابات میں حصہ لینے کے جمہوری حق سے محروم کر دیا گیا۔ مسٹر عبدالقیوم خاں کے سابق منشی اور حال پرسنل اسسٹنٹ مسٹر شمس الحق کے تین مخالف امیدواروں کے

اشاعت خاص

خان غلام محمد [illegible] کے کاغذات کے استرداد کی مثالیں اس آمرانہ کارروائی کی واضح مثالیں ہیں"
بہاولپور کا تو ذکر ہی کیا وہاں تو کل ۴۹ نشستوں میں ۴۴ پر لیگ نے بلا مقابلہ اپنے امیدوار منتخب کرا لئے اور ان پر ٹنگ
افسروں کے نمائندوں نے جشن کامیابی منانا شروع کیا تھا۔ کہ پوری دنیا میں اس انوکھے انتخاب پر تبصرہ شروع ہو گیا اور حکومت
پاکستان کے ایما پر نواب بہاولپور نے پچھلی تمام کارروائی کو کالعدم قرار دیتے ہوئے دوبارہ کاغذات نامزدگی طلب کئے
یہاں سرکاری افسران نے جس بے حسی۔ فرض ناشناسی اور بے ضمیری کا ثبوت دیا وہ قوم اور ملک کے دامن پر ایک بد نما داغ
اور یہ لوگ اس قابل ہیں کہ انہیں شہری حقوق سے بھی محروم کر دیا جائے۔

کاغذات نامزدگی کی منظوری میں قوانین کی بجائے مندرجہ ذیل باتوں کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔

۱۔ سرکاری امیدوار۔ بعض نہیں بلکہ اکثر صوبوں میں لیگی امیدواروں کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ صوبائی سرکار کا نامزد علاوہ مرکزی لیگ کا نامزد
مرکزی لیگ کے نمائندوں کو وہ رعایات حاصل نہیں ہوتیں جو صوبائی سرکاری نمائندہ کو حاصل ہوتی ہیں۔

۲۔ سرکاری امیدواروں کے وہ معاونین جو بعد میں دستبردار ہو جائیں۔

۳۔ ایسے آزاد امیدوار جن پر دباؤ ڈال کر دستبرداری کے لئے مجبور کیا جا سکتا ہے۔

۴۔ ایسے امیدوار جن سے مخالفین کے ووٹ تقسیم ہو جائیں۔

ریاست بہاولپور میں سید عنایت حسین شاہ (بیگم فدا حسن ایم۔ ایل۔ اے پنجاب کے والد) ایسے امیدوار تھے جنہیں
مخدوم زادہ حسن محمود ناپسند کرتے تھے لیکن مرکزی لیگ نے انہیں ٹکٹ عطا کر دیا۔ چنانچہ ان کے کاغذات نامزدگی بھی
مسترد کر دیئے گئے۔

کنویسنگ

کاغذات نامزدگی کے مرحلہ کے خاتمہ پر کنویسنگ کا دور دورہ شروع ہوتا ہے۔ لیگی امیدواروں کی کنویسنگ کا کام وزیر اعظم
سے لے کر پٹواری اور پولیس کے سپاہی تک بھی ملازمین کرتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ سرکاری ملازمین جس انداز سے یہ ذمہ داری
نبھاتے ہیں وہ کبھی قابل تعریف نہیں ہو سکتا۔ کنویسنگ کے دوران میں مخالفین کی جو گت بنائی جاتی ہے اس کا تو ذکر ہی کیا سب سے دلچسپ
منظر ان لوگوں کا ہوتا ہے۔ جنہیں مرکزی لیگ کی حمایت اور ٹکٹ بھی نصیب ہوتا ہے لیکن صوبائی سرکار ان سے بدگمان اور مخالف ہوتی
ہے۔ صوبہ سرحد میں یوسف خٹک۔ ابراہیم جھگڑا اور دوسرے اٹھارہ ایسے حضرات تھے۔ اگرچہ جھگڑا صاحب اور خٹک صاحب کی حمایت
کے لئے نور الامین مشرقی بنگال سے اور دوسرے وزراء کرام بھی تشریف لائے لیکن ان حضرات کی حالت قابل دید تھی۔

خان جھگڑا نے ۲۲ نومبر ۱۹۵۱ء کو اے۔ پی۔ پی کے نمائندے کو راولپنڈی آ کر جو بیان دیا۔ اور جسے اے۔ پی۔ پی نے نہایت ہی
محتاط انداز میں ترمیم شدہ جاری کیا اور ۲۴ نومبر کے اخبارات میں شائع ہوا وہ حسب ذیل ہے:۔

" راولپنڈی۔ ۲۲ نومبر۔ خان محمد ابراہیم خان جھگڑا نے ایک بیان میں لکھا ہے کہ سرحد لیگ کے صدر مسٹر عبد القیوم خان
ان امیدواروں کی حمایت کر رہے ہیں۔ جن کی نامزدگی منسوخ کر دی گئی تھی۔ اور وہ اب آزاد امیدواروں کی حیثیت سے انتخابات
میں حصہ لے رہے ہیں۔ ڈپٹی کمشنر اور دوسرے افسر بھی میرے خلاف بالخصوص اور دوسروں کے خلاف بالعموم کام کر رہے ہیں۔
خان جھگڑا نے مسلم لیگ ہائی کمان اور صدر پاکستان مسلم لیگ سے ان الزامات کے متعلق تحقیقات کرنے کے لئے کہا ہے
ان کا بیان ہے کہ وہ ان کو پوری طرح ثابت کریں گے۔

خان جھگڑا سرحد مسلم لیگ کے سرکاری طور پر نامزد امیدوار ہیں اور مرکزی پارلیمنٹری بورڈ نے ان کی اپیل منظور کرنے کے بعد

[redacted] پی پی کے

[redacted] بہ سرحد [redacted] سے تو تاریں اور خطوط بھی نہیں بھیجے جا سکتے

...ت وزیر پر جو سرحد میں انہی قیوم لیگی امیدواروں کی حمایت کے لئے تشریف لے گئے تھے جو کچھ بیتی اس کی ہلکی سی ... ان مورخہ ۲ دسمبر ۱۹۵۳ء کے ایڈیٹوریل نوٹ سے واضح ہو جائے گی :-

... ہم جھگڑا اس شکایت کی بنا پر انتخاب سے دست بردار ہو گئے تھے کہ خان قیوم سرکاری مشینری کو ان کے خلاف استعمال کر رہے ... ہمدردوں کو ڈرایا دھمکایا جا رہا ہے اس سے قبل پنجاب کے وہ مسلم لیگی لیڈر بھی جو مسلم لیگی امیدواروں کی حمایت ... گئے تھے۔ ان الزامات کی تصدیق کر چکے ہیں۔ پنجاب کے ان مسلم لیگی کارکنوں نے شکایت کی ہے کہ ان کی بے عزتی کی ... گیا اور دھمکیاں دی گئیں۔ پنجاب لیگ کے ایک ذمہ دار رکن کو ایک پولنگ سٹیشن سے زبردستی نکال دیا گیا۔ پنجاب کے ... صاحب کے بارے میں خود ان مسلم لیگیوں نے بیان کیا کہ وہ ایک ایسے مسلم لیگی امیدوار کے حلقہ میں جانا چاہتے تھے جسے ... لیگ نے ٹکٹ نہیں دیا تھا۔ مگر مرکزی لیگ نے اس کی اپیل منظور کر کے اسے لیگ ٹکٹ دے دیا۔ ان وزیر صاحب سے یہ کہا گیا کہ آپ وہاں نہ جائیں۔ جب انہوں نے اصرار کیا تو ان سے کہا گیا کہ سڑک ٹھیک نہیں اور ہم آپ کی ذمہ داری نہیں لے سکتے اس کے باوجود یہ پنجابی وزیر اپنے سفر پر روانہ ہو گئے تو چالیس پچاس میل کے فاصلہ پر چند اشخاص نے ان کی موٹر روک لی اور پہیوں سے ہوا نکال دی' پنجاب کے لیگی کارکنوں کا بیان ہے کہ یہ صاحب لاہور واپس تشریف لے آئے ہیں اور اب اپنے دوستوں کو جو سرحد جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ

من نکردم شما حذر بکنید

جھگڑا اور خٹک سکہ بند مسلم لیگی ہیں اور مرکزی مسلم لیگ کے لیڈر اور عہدیدار۔ ایک سیکرٹری ہے اور دوسرا ورکنگ کمیٹی اور مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کا ممبر۔ اُن کا اختلاف مسلم لیگ سے نہیں۔ صرف قیوم سے ہے اور صرف اس اختلاف کی بنا پر ان سے ور ان کے دوستوں اور حامیوں سے یہ سلوک روا رکھا جا رہا ہے'

وہ لوگ جو اہلِ غرض اور اہلِ منفعت نہیں ہیں۔ بلکہ خلوص کی بنا پر مسلم لیگ سے وابستہ ہیں سوچیں کہ جب سکہ بند مسلم لیگی لیڈروں ... معمولی اختلاف کی بنا پر یہ سلوک روا رکھا جاتا ہے تو اُن لوگوں سے کیا سلوک کیا جاتا ہوگا جو اس اصول کیلئے لڑ رہے ہیں ہمارے مسلم لیگی دوست ہمیں جی بھر ... گالیاں دیں اور بُرا بھلا کہیں لیکن ان دیوانوں کی جرأتِ ایمانی اور اخلاقی حوصلہ کی تو داد دیں۔ جو ان انتہائی ناسازگار حالات ... بھی کلمۂ حق کہے جا رہے ہیں ؎

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

پولنگ میں تمام قسم کی عیاریوں۔ دھوکہ بازیوں۔ رشوت ستانیوں۔ سرکاری دباؤ کے استعمال کے باوجود پبلک میں ردِ عمل کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے ووٹر لیگ کے مخالف امیدواروں کو ووٹ دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور اگر ... مکمل آزاد نہ چھوڑ تو لیگ کی کامیابی مخدوش ہو جاتی ہے۔ اس لئے اب معاملہ یہاں تک پہنچ چکا ہے۔ کہ بیلٹ پیپر کی کاپیاں محفوظ ... تی ہیں۔ ان پر پولنگ افسر صاحب خود ہی انگوٹھے لگا لیتے ہیں اور پرچیوں کے بنڈل سرکاری امیدوار کے بکس میں ڈال دی

جاتی ہیں۔ بعض اوقات کونٹر فائل پر انگوٹھے لگانے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی جاتی اور بندھے بندھائے بنڈل بکس میں ڈال دیئے جاتے ہیں۔ یہ حادثہ کوہاٹ کے اِس حلقے میں بھی ہوا جہاں یوسف خٹک صاحب امیدوار تھے اور قیومی امیدوار وطن بادشاہ ان کا مقابلہ کر رہے تھے۔ کرک کے پولنگ سٹیشن پر عبدالوحید خاں صاحب ایم۔ ایل۔ اے پنجاب اور میں نے یہ حرکت اپنی آنکھوں سے دیکھی پانچ سو بلیٹ پیپر ایسے ہی ڈال دیئے گئے۔ ہر جگہ ہر مقام پر یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ آپ اندازہ تو کریں کہ جب یہ حرکت آل پاکستان مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری صاحب جن کے پولنگ ایجنٹ ایم۔ ایل۔ اے حضرات تھے اور جنہیں وزراء کرام اور مرکزی لیگ کی پوری پوری تائید حاصل تھی ان سے ہو سکتی ہے تو دوسرے امیدواروں اور خصوصاً پچاتوں کے غریب نمائندوں کے ساتھ کیا کچھ نہ ہوتا ہوگا۔

بہاولپور میں جس بیباکی سے یہ حرکات سرزد ہوئی ہیں ان کی بھی دو تین مثالیں سن لیجئے:۔

کائنات مورخہ ۴ رجون ۱۹۵۲ء میں یہ خبر شائع ہوئی "بہاولپور، ۲ مئی مولوی فیض کو الیکشن میں جن غیر آئینی حربوں سے ناکام بنایا گیا اس کی قلعی حکومت بہاولپور کے پولنگ سٹاف نے کھول دی ہے۔ پولنگ سٹیشن درویش محمد کے پولنگ اسسٹنٹ محمود الدین نے مجسٹریٹ درجہ اول بہاولپور کے سامنے حلفیہ بیان دیتے ہوئے کہا ہے کہ درویش محمد کے پولنگ سٹیشن پر سو سو پرچیوں کی پانچ کاپیاں لیگی امیدوار میاں اللہ بخش کے بکس میں ڈالی گئیں اور ان کاپیوں کی کونٹر فائلوں پر پولنگ افسر غلام سرور خاں نے اپنے انگوٹھے لگائے تھے۔ محمود الدین نے اعتراف کیا ہے کہ وُہ اس سازش میں شریک تھا۔ بوہڑ والا کے پولنگ سٹیشن کے پولنگ افسر بابو محمد ہاشم اوورسیر نے عدالت میں بیان حلفی دیکر کہا ہے کہ وہاں کے پریذائیڈنگ افسر سید عباس انور شاہ ولد غلام مرتضےٰ شاہ صاحب کے ایما پر میاں اللہ بخش مسلم لیگی امیدوار کے بکس میں جعلی پرچیاں ڈالی جاتی ہیں"

بہاولپور، ۲۷ رمئی سردار محمود خاں کو احمد پور شرقیہ کے شہری حلقہ سے جن شرمناک حربوں سے ہرایا گیا اب وہ منظر عام پر آچکے ہیں۔ خانپور پولنگ سٹیشن (ہائی سکول) کے دو پولنگ اسسٹنٹ مسمی عبدالستار اور عطاء اللہ نے عدالت میں بیان حلفی دے کر اعتراف کیا ہے کہ ان کے پریذائیڈنگ افسر مسٹر رحیم شاہ صاحب نے ان سے پانچ بوگس کاپیاں پُر کرا کر لیگی اُمیدوار شیخ عبدالحق کے بکس میں ڈالی تھیں اور یہ سب کچھ مخدوم زادہ حسن محمود کے حکم کی تعمیل میں ہوا تھا۔

ان پانچ کاپیوں کی کونٹر فائلوں پر جس شخص نے اپنا نشان انگوٹھا لگایا ہے۔ اس نے بھی اپنے انگوٹھے ثبت کرنے کا اعتراف کر لیا ہے۔ احمد پور شرقیہ کے پولنگ سٹیشن پر جب دو کاپیاں لاپتہ ہوئیں تو سردار محمود خاں صاحب کے ایجنٹ کی تحریری درخواست پر پریذائیڈنگ افسر نے لکھ دیا کہ فلاں فلاں نمبر کی دو کاپیاں میرے سٹاک میں نہیں ہیں۔ لیکن شام کو رائے شماری کے وقت ان دو کاپیوں کی پرچیاں لیگی امیدوار کے بکس سے برآمد ہوئیں۔ سردار صاحب کے پولنگ ایجنٹ نے ان دو سو پرچیوں کو ردی کرنے کی درخواست کی لیکن پریذائیڈنگ افسر نے انکار کر دیا اور انہیں لیگی امیدوار کی پرچیوں میں باقاعدہ شمار کیا۔

اسی طرح خانپور کے دوسرے پولنگ سٹیشن پر تین کاپیاں مسلم لیگی امیدوار کے بکس میں ڈالی گئیں۔

پھر اس سے کہیں زیادہ شرمناک وہ حرکت تھی جس کا ارتکاب رحیم یار خاں کے اسسٹنٹ کمشنر عبدالرحمن خاں صاحب نے بطور پریذائیڈنگ افسر رحیم یار خاں کے شہری پولنگ کے سلسلہ میں کیا۔ اور وہیں پکڑے گئے۔ دو سو پرچیاں جن کے کونٹر فائل بالکل خالی تھے پھاڑ کر انہوں نے لیگی امیدوار کے بکس میں ڈال دیں۔ لیکن یہ فوراً ہی معلوم ہو گیا اور ان پرچیوں اور کونٹر فائلوں کو ایک سر بمہر لفافے میں بند کر کے پریذائیڈنگ افسر کے پاس بھیج دیا گیا۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ بجائے اس جعلسازی کو مندمل کرنے اور اس مجسٹریٹ کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کے پریذائیڈنگ

افسر صاحب نے ان ووٹوں کو لیگ کے امیدوار کے حق میں شمار کیا اور فیصلے کا اعلان کر دیا۔

آخری گنتی

یوں تو ہر مقام پر روزانہ گنتی ہو جاتی ہے۔ اور وہ باقاعدہ ریکارڈ ہوتی ہے۔ لیکن آخری فیصلہ ریٹرننگ افسر صاحب کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اور وہ آخری دفعہ گنتی فرماتے ہیں۔ اس آخری گنتی کے وقت بہت سی تبدیلیاں ہو جاتی ہیں۔ مثلاً کسی امیدوار کے ووٹ گیارہ سو پریذائیڈنگ افسر نے شمار کئے تھے تو وہ صرف ڈیڑھ سو رہ جائیں اور جہاں دو چار سو تھے وہاں چودہ پندرہ سو ہو جائیں گے۔ یہاں اس امر کی توضیح کی کوئی خاص ضرورت نہیں کہ بڑھتے صرف لیگی امیدواروں کے ہیں اور کم دوسروں کے ہوتے ہیں۔ منٹگمری کے ایک حلقے میں تو یہ اعجاز یہاں تک ترقی کر گیا کہ اخبارات کو پریذائیڈنگ افسروں کے ریکارڈ کے فوٹو تک شائع کرنا پڑے۔ لاہور کے ریٹرننگ افسر کی گنتی میں بھی سینکڑوں ووٹ منسوخ قرار دیئے گئے اور حلقہ نمبر ۴ میں لیگی مہاجر امیدوار کی کامیابی انہیں کے کمالات کی مرہونِ منت ہے۔ سرحد میں تو آخری گنتی کوئی دیکھنے والا تھا نہیں۔ بہاولپور میں دھڑلے سے تمام بکس ووٹ لیگ کے حق میں محفوظ تھے۔

عام حالات

پنجاب میں لیگ کامیاب ہوئی وزارت بن گئی۔ اور اس کے لیڈر میاں دولتانہ کو یہ دعویٰ ہے۔ کہ لیگ ہی عوام کی نمائندہ جماعت ہے۔

صوبۂ سرحد میں خان عبدالقیوم خاں صاحب کا بھی یہی دعویٰ ہے۔ ریاست بہاولپور میں حسن محمود صاحب بھی یہی فرماتے ہیں۔ لیکن :-

بے چاری مسلم لیگ کی حالت بالکل تباہ ہو چکی ہے۔ پنجاب میں مسلم لیگ کی ہردلعزیزی کی حالت کا اندازہ فراہمی غلہ کی مہم کے سلسلے کی کارگزاریوں سے ہو سکتا ہے۔ یہ روئیداد پاکستان ٹائمز نے شائع کی اور تسنیم مورخہ ۱۴ رجون ۱۹۵۲ء میں ایڈیٹوریل نوٹ میں یہ تذکرہ ان الفاظ میں آیا ہے۔ "سردار محمد صادق اور شیخ ظفر حسین شیخوپورہ گوجرانوالہ کے اضلاع کا دورہ کرنے گئے تھے کہ شیخوپورہ میں کوئی جلسۂ عام منعقد نہ ہو سکا اور گوجرانوالہ میں صرف ایک جلسہ ہوا جس میں حاضرین کی تعداد بیس ہزار؟ نہیں —— پھر کیا بیس سو؟ —— نہیں تو کیا دو سو —— جی نہیں صرف بیس۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دو بہادر لشکر جھنگ اور لائل پور پر حملہ آور ہوا تھا۔ جو خیر سے صوبہ مسلم لیگ کے جائنٹ سیکرٹری جیسے معزز عہدہ دار شیخ عنایت اللہ پر مشتمل تھا۔ شیخ صاحب صرف لائل پور میں دو جلسیاں کر کے واپس تشریف لے آئے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ لائل پور کی جلسیاں کو دیکھ کر میرا دل ٹوٹ گیا اور میں نے جھنگ کی طرف رخ کرنے کی بجائے لاہور کی طرف چل پڑنا ہی مناسب خیال کیا۔ سردار ظفر اللہ اور اقبال نسیم سرگودھا گئے تھے وہ بھی اس قسم کی داستانِ غم لے کر واپس آئے ہیں"۔

یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں

صوبۂ سرحد میں م۔ ش کے الفاظ میں عبدالقیوم خاں مسلم لیگ ہے اور مسلم لیگ عبدالقیوم خان۔ لیکن یہ مردِ آہن اور بقول محمد سرورؔ "آفاق" دبنگ آدمی پولنگ پر اپنے تمام سرکاری انتظامات اور حربوں کے آنے کی جرأت نہیں کرتا۔ بلکہ اسمبلی میں چور دروازے سے گھستا ہے۔ دو مقامات سے انتخاب لڑتا ہے اور دونوں مقامات پر اپنے مخالفین کے کاغذاتِ نامزدگی مسترد کروا دیتا ہے۔ ایک جگہ اپنے مخالف کو گرفتار کرتا ہے اور دوسرے مقام پر مخالف کے تجویز کنندہ کو اغوا کرا لیتا ہے۔ خان غلام محمد لونڈ خور کو صوبے میں گھسنے کی اجازت نہیں دیتا۔

بہاولپور میں مسلم لیگ کو کوئی نہیں جانتا۔ جمال دین والی کے پیرزادہ کے کرامات کا تو میں قائل ہوں۔ لیکن لیگ وہاں پیدا ہونے سے پہلے ہی مر چکی ہے۔ اور حکومت.. ..عوامی حکومت ...... جمہوری اور عوامی حکومت .... اس کے خدوخال اور انتخابات

کی خوبیوں کا اندازہ وزیر اعلیٰ حسن محمود گیلانی کی پہلی پریس کانفرنس سے کیجئے جو ۳۰ مئی کو بہاولپور میں منعقد ہوئی اور ۳۱ مئی کے کائنات میں شائع ہوئی۔

نمائندہ اے پی پی۔ آپ کی حکومت زمینداری اور جاگیرداری کے بارے میں کیا نظریہ رکھتی ہے۔
مخدوم زادہ۔ ہم اس معاملے میں کوئی نظریہ نہیں رکھتے۔
اے پی پی - الیکشن ٹربیونل کب قائم ہوگا۔
مخدوم زادہ - ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔
مدیر الامام - کیا آپ کی حکومت کم تنخواہ پانے والے ملازمین کی تنخواہ میں اضافہ کرے گی
مخدوم زادہ - ہاں۔
مدیر کائنات - کیا ان ملازمین کو بھی ترقی دی جائے گی جنہوں نے دیانت داری سے عدالتوں کے روبرو یہ اقرار کیا ہے کہ انہوں نے پریذائیڈنگ افسران کے حکم سے لیگی امیدواروں کے بکسوں میں سینکڑوں جعلی ووٹ ڈالے۔
مخدوم زادہ - ان کی دیانت داری کا معیار آپ کی دیانت داری کے مطابق ہے۔
مدیر کائنات - جس طرح پریذائیڈنگ افسران کی دیانت داری آپ کی دیانت داری کے مطابق تھی۔ (قہقہہ)
مخدوم زادہ - آپ کو پریس کانفرنس میں شخصی چوٹ نہیں کرنا چاہئے۔
مدیر کائنات - میں نے تو صرف آپ کی بات کا جواب عرض کیا ہے۔
اے پی پی - اپوزیشن نے انتخابی بے ضابطگیوں کی تحقیقات کا جو مطالبہ کیا ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟
مخدوم زادہ - اگر بے ضابطگیوں کا ثبوت مل گیا تو تحقیقات کرائی جائیگی۔
مدیر مسلمان - جناب کو علم ہوگا کہ تحقیقات ہمیشہ ثبوت کی فراہمی کے لئے کی جاتی ہے۔ ثبوت کے بعد تو سزا ہوتی ہے۔
مدیر کائنات - کیا پولنگ افسران کے عدالتی اقبالات جعلسازی اپوزیشن کے الزامات کا بین ثبوت نہیں؟
مخدوم زادہ - میری رائے میں گذشتہ بداعمالیوں کے لئے کسی سرکاری ملازم کو سزا نہیں دی جانی چاہئے۔ البتہ ان پر وہ مقدمات چلائے جائیں جو انتخابات کے دوران میں درج کرائے جا چکے ہیں۔
مدیر کائنات - جناب نے اپنی فتح کو عوام کی تائید کا نتیجہ بتایا ہے کیا اس فتح میں انتخابی "جھرلو" کی کرشمہ سازی شامل نہیں!
مخدوم زادہ یہ عام لوگوں کا نظریہ نہیں۔

پنجاب میں انتخابات میں دھاندلی کے متعلق عوام نے شور مچایا تو سرحد میں یہ گرہ اور زیادہ مضبوط کر دی گئی۔ وہاں تحقیقات کا مطالبہ کیا گیا تو بہاولپور میں بالکل ہی غضب ڈھایا گیا۔

خواتین کا پولنگ پنجاب میں سکولوں اور کالجوں کی لڑکیوں نے بیس بیس اور تیس تیس خاوند بدل کر نعرے۔ سلواریں اور ساڑھیاں تبدیل کر کے جس بے حیائی اور بے غیرتی کا مظاہرہ کیا تعداد ہی کیا کم تھا کہ اب باقاعدہ الیکشن لڑنے والی لڑکیوں کا ایک بہت بڑا گروہ لاہور میں تیار ہو چکا ہے جو ہر الیکشن پر باقاعدہ کرانے پر جاتا ہے۔ اور اپنی "خدمات" پیش کر کے لیگ۔ کو کامیابی سے ہمکنار

کرتا ہے۔ بہاولپور میں ڈیڑھ سو سے زیادہ ایسی لڑکیاں موجود تھیں۔ جو مختلف خدمات سرانجام دے رہی تھیں۔ ایک آزاد امیدوارہ نے بھی اپنی الگ رجمنٹ لاہور سے منگوائی تھی۔ اور مہم میں خاصی گرماگرمی رہی۔ بہاولپور میں خواتین کی نشست پر کل ووٹوں کی تعداد سے بھی ڈھائی سو ووٹ زیادہ پول کئے گئے۔ یہ اعجاز او مسیحائی صرف لاہور کی لڑکیوں کا ہی حصہ ہے۔ صوبہ سرحد بھی اس معاملے میں کسی سے پیچھے نہیں امروز ۸ نومبر میں ایک جلسے کی روئداد کا اقتباس ملاحظہ ہو:۔

اس وقت جب چائے نوشی کا دور چل رہا تھا۔ ایک آزاد امیدوار صاحبہ بمعہ چند دیگر خواتین کے آدھمکیں اور اعلان کیا کہ اس جلسے کے انعقاد کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ پس پھر کیا تھا۔ تو تو میں میں کا ایک ناگوار سلسلہ شروع ہوگیا۔ اور پھر یہ سلسلہ کچھ آگے بڑھا۔ متعدد خواتین آپس میں مشت گریباں ہوگئیں۔ کیک اور پیسٹریاں جو کھانے کے لئے رکھی تھیں۔ ایک دوسروں کے کپڑوں اور منہ پر اچھالی جانے لگیں۔ لیکن اس دھما چوکڑی میں عورتوں کا ایک گروپ ایسا بھی تھا۔ جو اس جھگڑے سے بے نیاز ہو کر پوری توجہ سے کیک پیسٹریوں کا صفایا کرنے میں مصروف تھا۔

ضمنی انتخابات

جنرل انتخابات کے علاوہ ضمنی انتخابات بھی ہوتے رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں اس کا دستور ذرا کم ہے۔ کچھ نہ کچھ آسامیاں ہمیشہ خالی رکھ لی جاتی ہیں۔ تاکہ بوقتِ ضرورت کام آئیں۔ دو معرکۃ الآرا ضمنی انتخاب عام انتخابات سے پہلے پہلے ہوئے تھے۔ ایک صوبہ سرحد میں اور دوسرا سندھ میں امیدواروں سے درخواستیں طلب کی گئیں۔ اس کے لئے گزٹ شائع ہوا لیکن جب وہ گزٹ باہر آیا تو معلوم ہوا کہ درخواست دینے کی تاریخ گذر چکی ہے۔ اول تو ایک روز کا وقفہ رکھا گیا اور پھر گزٹ تیسرے روز باہر آیا۔ جب سرکاری امیدوار کی درخواست منظور ہو چکی تھی۔ اس طرح یہ بلا مقابلہ انتخاب عمل میں آیا۔

دوسرا ضمنی انتخاب سندھ میں دادو جوہی کے حلقے میں عمل میں آیا۔ یہاں وقفہ زیادہ تھا۔ اس لئے کئی ایک امیدواروں نے پر تولنا شروع کئے۔ سرکاری امیدوار مسٹر کھوڑو کے سالا صاحب تھے۔ یہاں ایک امیدوار کو تو اس وقت گرفتار کر لیا گیا۔ جب وہ کاغذات داخل کرنے کے لئے تشریف لے جا رہے تھے اور اسی طرح دوسرے صاحبان کو بھی راستے سے ہٹا کر سالا صاحب بلا مقابلہ کامیاب ہوگئے۔ گویا ایک ضمنی انتخاب کے ڈرامے کو اگر پھیلا دیا جائے تو وہ عام انتخاب کا صحیح نقشہ پیش کر دیتا ہے۔

غنڈہ گردی

آخری چیز جسے موجودہ انتخابی نسخے کا جزوِ اعظم قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہ غنڈہ گردی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو طریق کار تجویز ہو چکا ہے اس پر کوئی شریف آدمی عمل نہیں کر سکتا اس لئے غنڈوں کی خدمات بہت ہی بڑے پیمانے پر حاصل کی جاتی ہیں اور ممبریاں اور وزارتیں غنڈوں کے جوتوں کے طفیل حاصل ہوتی ہیں۔ مجھے ایک دوست نے ایک واقعہ سنایا تھا جس سے اندازہ ہوگا کہ نوبت کہاں تک پہنچ چکی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ایک صاحب کو ایک وزیر سے ضروری کام تھا۔ وزیر کے بھائی اور دوسرے عزیزوں کی سفارشیں مہیا کی گئیں۔ لیکن کام ذرا ٹیڑھا تھا وزیر صاحب نہ مانے۔ آخر ایک دس نمبر کے غنڈے کا پتہ چلا۔ اس کی خدمت میں حاضر ہوئے اس نے صرف ستر روپے لیئے اور وزیر صاحب کے لڑکے کو ایک موٹی گالی دے کر کہا اپنے باپ سے جا کر کہہ کہ یہ کام کرا لاؤ۔ اور وہ بیٹھے بٹھائے ہوگیا۔

پنجاب۔ سرحد اور بہاولپور کے انتخابات کا حال سے گذرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ موجودہ قیادت کی موجودگی میں کسی اصلاح کی توقع بالکل عبث ہے اور قیادت نے آئینی ذرائع کے سامنے گندے کیچڑ کا بہت بڑا بند باندھ رکھا ہے۔ جسے دن بدن مضبوط کرنے کی کوشش جاری ہے۔ اور یہاں انقلاب لانے کے لئے (خواہ وہ صالح انقلاب ہو یا غیر صالح) ایک سیلِ رواں کی ضرورت ہے جو اس بند کو بہا لے جائے۔

طبِ یونانی

از
حکیم محمد سعید دہلوی

پس منظر

"علاوہ فنی کمالات کے حکیم شریف خاں صاحبؒ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ ہی طبِ یونانی کی بربادی کو بڑی حد تک روک لیا اور یہ سمجھ کر کہ اب شاہی دربار کی سرپرستی سے اُن کا فن محروم ہوگیا ہے انہوں نے سوچنا شروع کر دیا کہ بغیر اس سرپرستی کے بھی طبِ یونانی کو کس طرح باقی رکھا جا سکتا ہے۔"

شامِ سلطنتِ مغلیہ اور صبحِ سلطنتِ برطانیہ کے ساتھ برصغیر پر پھیلا فکر و تردّد اور سوچ بچار تھا جو طبِ یونانی کے لئے کیا گیا۔ یہ کوئی ۱۸۰۴ء کی بات ہے جب حکیم شریف خاں صاحبؒ کے طبّی کارنامے شہرتِ لازوال کے مالک تھے۔ اور اگرچہ وہ ۱۲۳۱ھ ہجری میں (بحوالہ قاموس مشاہیر) قطب صاحب کے مجلس خانہ کے قریب باؤلی کو جاتے ہوئے اپنی ابدی خواب گاہ میں چلے گئے لیکن انھوں نے حالاتِ طب اور اپنے خاندان کو خواب میں نہیں چھوڑا، بلکہ خدمتِ فن، بقائے فن اور ترقیٔ فن طب کی ایک ایسی شمع انہوں نے جلائی جو اب تک روشن ہے۔ اور اس سے ماحول منوّر ہے۔

جس وقت تیمور کی اولاد لال قلعے میں انگریزوں کی وظیفہ خوار تھی اور ابو النصر محمود معین الدین اکبر شاہ ثانی لال قلعے میں بجھنے والے چراغ کی طرح ٹمٹما رہے تھے۔ اس زمانے میں حکیم شریف خاں صاحب کے فرزند اور حکیم اجمل خاں صاحب کے دادا حکیم صادق علی خاں دربار سے وابستہ تھے، لیکن چونکہ دربار کمزور ہو چکا تھا اور اس میں کچھ دم باقی نہ تھے اس لئے دربار سے یہ تعلق برائے نام تھا۔ حکیم صادق علی خاں صاحب نے اپنے فن پر سب سے زیادہ توجہ کی اور اُن کے مرحوم والد جو راہ متعین کر چکے تھے اس پر انہوں نے چل کر طب کے وقار کو گرنے نہیں دیا بلکہ اپنی کئی تصانیف سے فن طب کو مالامال بھی کیا۔ بالآخر ۲۹ صفر ۱۲۶۲ھ ہجری کو ۸۰ سال کی عمر میں حکیم صادق علی خاں نے وفات پائی۔ اسی زمانے میں اکبر شاہ ثانی کا بھی انتقال ہو گیا۔ طبِ یونانی کے دربارِ شاہی سے تعلق کی یہ آخری تاریخ تھی۔

رفتہ رفتہ تحریکِ طب کے قائد حکیم اجمل خان بنے۔ طبِ یونانی شاہی سرپرستی سے بے تعلق تھی اور طب کا وقار جو بھی باقی تھا اُن حکما کے ذاتی مطبوں کا رہین منت تھا۔ خود حکیم اجمل خان صاحب اپنی غیر معمولی صلاحیتوں اور قابلیتوں سے کام نہ لیتے اور اپنی فنی اہلیت کا مظاہرہ نہ فرماتے تو طبِ انگریزی کے مقابلہ میں طبِ یونانی کا باقی رہنا ممکن ہی نہ تھا جب اور اب ہمارے عوام میں طبِ یونانی کا جو چرچا ہے اور اس سے جو لگاؤ ہے وہ انہیں حضرات کا طفیل ہے۔ یہ دیسی دواؤں کی افادیت کا مظاہرہ نہ کرتے، لوگوں کو ان کے نقش و نگار سے روشناس نہ کراتے تو اس طب کے مردہ ہو جانے میں کیا کمی باقی رہ گئی تھی! انگریز اپنے پورے ساز و سامان کے ساتھ چن چن کر ہمارے علوم و فنون کا تیا پانچا کر رہے تھے ہمارے تہذیب و تمدن کے خد و خال مسخ کر رہے تھے۔ سات سمندر پار کا سکہ یہاں چل رہا تھا اور دیس کی ہر ہر چیز کو دیس نکالا مل رہا تھا۔ نیا زمانہ آ رہا تھا

نئی روشنی آ رہی تھی۔ پرانی چیزیں فرسودہ سمجھ کر ختم کی جا رہی تھیں اور ان کی جگہ نئی نئی چیزیں خواہ وہ مفید ہوں یا غیر مفید اختیار کی جا رہی تھیں۔

یہ حکیم اجمل خاں صاحب ہی کی شخصیت تھی جنہوں نے ۱۹۰۶ء میں پہلی بار طبی کانفرنس کی بنیاد ڈالی جو مردہ اور سِسکتی ہوئی طب کے جسد کے لئے یہ اقدام حیاتِ ثانی ثابت ہوا۔ اُس وقت طب کا کیا حال تھا حکیم صاحب کی زبانی سُنئے :۔

"آج کل ہم لوگوں کو نئی روشنی کے زمانے میں ایک مقابلہ درپیش ہے۔ طبِ یونانی کی جو حالت ہمارے ہاتھوں ہو رہی ہے وہ ظاہر ہے۔ ہمارے ہاں جدید تصنیف و تالیف کا سلسلہ بالکل بند ہے۔ نصابِ تعلیم میں بہت کم کتابیں داخل ہیں جو ضروریاتِ زمانہ پر نظر کر کے بالکل "کافی نہیں" معلوم ہوتیں۔ قانون شیخ الرئیس منتہائے تعلیم سمجھا جاتا ہے۔ بہت سے نئے امراض پیدا ہو گئے ہیں اور پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کی تدوین کی سخت ضرورت ہے۔ جیلانی نے قانون شیخ کی شرح لکھتے ہوئے ہر عضو کے امراض کی تشریح ختم کر کے آخر میں بہت سے وہ امراض، اسباب و علامات و معالجات کے اپنی طرف سے اضافے کئے ہیں جو شیخ نے نہیں مکمل کئے تھے۔ چونکہ تصنیف و تالیف کا سلسلہ اب موقوف ہے اس لئے موجودہ زمانے میں اس قسم کی تدوین کا کوئی ذریعہ نہیں۔ ایک اور تاسف کی بات یہ ہے کہ طبِ یونانی کا بہت بڑا ذخیرہ برباد ہو رہا ہے اور ہم لوگوں کو اس کا احساس تک نہیں۔ جالینوس کی تمام کتابیں ہمارے نصاب سے چھوٹی ہوئی ہیں لیکن جالینوس کی قریب قریب کل کتابوں کا ڈاکٹر صاحبان نے ترجمہ کر لیا ہے۔ ۔ ۔ ۔

ہمارے ذخیرۂ ادویہ کی حالت بھی بہت کچھ اضافے اور اصلاح کی محتاج ہے۔ صرف ہندوستان میں بہت سی جڑی بوٹیاں ایسی موجود ہیں اور کوشش سے فراہم کی جا سکتی ہیں۔ جو ہر طرح کارآمد و مفید ثابت ہو سکتی ہیں لیکن ہم اس طرف مطلق توجہ نہیں کرتے۔ ہمارے مجربات کی یہ حالت ہے کہ جس کے پاس کوئی نسخہ ہوتا ہے وہ اُسے بُری طرح چھپاتا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ اسی کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ہماری طب کا بہت بڑا حصہ جا چکا ہے اور اگر ہم اتفاق اور دلی ہمدردی کے ساتھ اپنی طبِ یونانی اور ویدک کی خدمت و حفاظت پر آمادہ نہ ہوئے تو سمجھ لیجئے وہ زمانہ آ گیا ہے کہ ان کا بقیہ حصہ بھی ہمارے ہاتھوں سے نکل جائے گا ـــــــــ"

اس طرح حکیم صاحب نے اس تحریکِ طبی کا نصب العین پیش کیا اور آخر تک وہ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے سرگرمِ کار رہے۔ چنانچہ ۱۹۱۶ء میں طبیہ کالج کا سنگِ بنیاد اور ۱۹۲۱ء میں اس کا افتتاح حصولِ مقصد کی کڑیاں ہیں۔ حکیم صاحب جس مقصد کو لے کر اُٹھے تھے بڑی حد تک وہ اس میں کامیاب ہوئے۔ طبی تحریک کی اس کامیابی کی دوسری چیزوں کے ساتھ بڑی وجہ یقیناً یہ تھی کہ حکیم صاحب نے اسے سیاسی تحریکات سے منسلک کر دیا تھا اور حصولِ مقاصد کے لئے انتھک کوششیں کیں۔

اس طبیہ کالج کے قیام کے بعد ایک نئی فضا پیدا ہوئی۔ طلباء اور طالباتِ طب ایک نئے نصابِ تعلیم سے روشناس ہوئے جس نے ان کے نقطۂ نظر کو بہت بدل دیا اور زیادہ بلند کر دیا اور وہ قانونِ شیخ سے ہٹ کر دوسرے علوم کو بھی دیکھنے لگے۔ اور اس نصابِ تعلیم ہی کی وجہ

اور تجدید طب کی جو مخالفت مدرسہ لکھنؤ نے کی اس سے

تجدید طب کا وہ خواب شرمندہ تعبیر ہوا جسے حکیم شریف خانؒ نے دیکھا تھا۔ نصاب تعلیم کے تعین اور تجدید طب کی ... طبیہ کالج نے ترقی کے مدارج بہت جلد

حکیم اجمل خان کبھی متاثر نہ ہوئے اور آخر کار جمہور اطبا کو تسلیم کرنا پڑا کہ تجدید طب ضروری ہے اور نہایت ضروری ہے

جلد طے کئے۔ سرجری کے شعبے قائم ہوئے دیسی ادویہ پر ریسرچ کا شعبہ جدید تاریخ طب میں پہلی بار طبیہ کالج میں قائم ہوا۔

حکیم اجمل خانؒ کے بعد طبی تحریکیں گو مردہ نہیں ہوئیں لیکن بے جان و بے عمل ہوگئیں۔ ادھر طبیہ کالج بتدریج انحطاط و تنزل کی طرف جانے لگا اور آخر کار

غلط ہاتھوں میں پڑ کر ۱۹۴۷ء میں بڑی حد تک بے عمل سا ہو گیا۔ ذاتی اختلافات کا شکار طبیہ کالج ہی نہیں ہوا بلکہ کالج کے وہ سوتے بھی سوکھ گئے جو

دواخانہ کی صورت میں جاری تھے۔ تعلیم کا معیار گر گیا اچھے اساتذہ علیحدہ ہو گئے۔

آل انڈیا آیورویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس کے کئی جلسے ہوئے لیکن یکجہتی ان میں کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ آخر کار آزادی کی جب صبح ہوئی جس کے

لئے حکیم اجمل خان نے عظیم الشان کارنامے انجام دیئے تو ان کے جاری کردہ اداروں کی شام ہوگئی۔

آل انڈیا آیورویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس کی آخری جدوجہد

۴ مارچ ۱۹۴۶ء میں بھور کمیٹی کی رپورٹ حکومت ہند نے ایسے وقت شائع کی جبکہ ہندوستان جنگ کی ہولناکیوں اور تباہ کاریوں

سے نپٹنے کے بعد قحط اور بے روزگاری کے خطرات سے گھرا ہوا تھا جس کے باعث اس رپورٹ کے حسن و قبح دیکھنے کے لئے لوگوں کو بہت

کم فرصت ملی بالخصوص دیسی طبوں کے اطبا عام حکما اور وید صاحبان کو تو شاید ہی اس رپورٹ کی اشاعت کا علم ہوا ہو اور یہ جاننے والے پورے

ہندوستان میں اس وقت چند گنے چنے حکیم و وید تھے جنہیں اس کی اشاعت اور اس میں بیان کردہ اسکیم کا علم تھا!

بھور کمیٹی رپورٹ کی اس اشاعت کے بعد سب سے پہلے حکیم حاجی عبدالحمید صاحب دہلوی نے اس پر قلم اٹھایا اور اس کے نقائص اور دیسی طبوں

کے لئے اس کے نقصان دہ پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور صدائے احتجاج بلند کی

بھور کمیٹی رپورٹ دراصل دیسی طبوں کے لئے ایک قتل فیصل کا حکم رکھتی تھی اور طب یونانی اور ویدک کو ختم کرنے کے لئے ہی مرتب ہوئی تھی۔

اگر اس پر بروقت توجہ نہ کی جاتی تو نیم بیا طب کا وجود ختم ہو گیا ہوتا۔ بہر حال اس رپورٹ کے خلاف ۴ جولائی ۱۹۴۶ء کو یوم احتجاج ہندوستان بھر

میں منایا گیا۔ اجمل خاں کی دہلی میں ایک بہت بڑا جلسہ منعقد ہوا اور حکیم صاحبان اور وید صاحبان نے متفق ہو کر رپورٹ مذکورہ کے خلاف

صدائے احتجاج بلند کی اور ایک کمیٹی "دی انڈین میڈیسن پروڈکشن کمیٹی" کے نام سے بنائی گئی جس کے چیئرمین حکیم حاجی عبدالحمید صاحب مقرر

ہوئے اور کمیٹی کے متعدد جلسے چیئرمین کمیٹی کے دفتر میں منعقد ہوئے۔

حکیم حاجی عبدالحمید صاحب نے طب یونانی اور طب وید کے بارے میں سابقہ تمام کارروائیوں کا احاطہ کر کے اور حکومت کے دفتر صحت سے

جملہ معلومات فراہم کر کے بھور کمیٹی پر مفصل تنقید لکھنے کا کام شروع کیا۔ ابھی یہ کام جاری تھا کہ آخیر ستمبر ۱۹۴۶ء میں حکومت ہند نے اعلان کیا کہ

۱۰، ۱۱، ۱۲ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو دہلی میں ہندوستان کے تمام صوبوں کے وزرائے صحت کی کانفرنس منعقد ہوگی جس میں آئندہ ترقیات طب کی اسکیموں

پر غور ہوگا۔ مرکزی حکومت کی جانب سے یہ بالکل پہلا موقع تھا کہ اس نے طب قدیم پر غور کرنے کا فیصلہ کیا اس اعلان کے ہوتے ہی حکیم عبدالحمید صاحب

نے کمیٹی تحفظ طب ہائے قدیم کا اجلاس طلب کیا اور تقریر کرتے ہوئے تمام خدشات سے اطبا اور وید صاحبان کو آگاہ کیا۔

حکیم صاحب نے وزرائے صحت کی کانفرنس کے انعقاد سے قبل ایک میمورنڈم تیار کیا اور اسے انگریزی، اردو اور ہندی زبانوں میں چھپوایا

اور پیش کیا اس کمیٹی کی طرف سے تمام وزرائے صحت کو تار بھجوائے گئے اور انٹرم حکومت کے وزیر صحت مسٹر شفاعت احمد صاحب سے حکیم عبدالحمید صاحب

کی قیادت میں ایک وفد نے ملاقات کر کے اپنے مطالبات پیش کئے اور جب وزرائے صحت دہلی میں جمع ہوئے تو اس وفد نے تمام وزرا سے ملاقات کی

اور اپنے مطالبات پیش کئے ۔

اس جماعت کی جدوجہد کا ہی کا نتیجہ ہوا کہ مرکزی حکومت کو دیسی طبوں کے مقابلے میں مستقل اور واضح پالیسی اختیار کرنا پڑی اور وزرائے صحت کی کانفرنس کے ایجنڈے میں ترمیم کی گئی ۔

وزرائے صحت کی اس کانفرنس نے دیسی طبوں کے تحفظ اور ان کی ترقی کے لئے ذیل کی تجویز منظور کی ۔

یہ کانفرنس تجویز کرتی ہے کہ پلاننگ کمیٹی کی سفارشات کے مطابق مرکز میں اور صوبوں میں ان باتوں کے کافی اور مناسب انتظامات ہونے چاہئیں جن سے یونانی اور آیورویدک جیسے اس طریقہ ہائے علاج کی علمی تحقیق کے لئے سائنٹفک طریقے صحت کے قیام اور تحفظ اور علاج الامراض کے لئے استعمال کئے جا سکیں اور دیسی طبوں کے ڈپلوما اور ڈگری کورسوں کے لئے طبی اسکول اور کالج کھولے جائیں اور مغربی طب گریجویٹوں کے لئے دیسی طب کی پوسٹ گریجویٹ تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جائے

کانفرنس فیصلہ کرتی ہے کہ آیورویدک اور یونانی طبوں کے مطابق علاج کرنے والوں اور دائیوں کو حکومت کی طرف سے جاری کردہ صحت کی تنظیموں میں شامل کیا جائے اور جہاں کہیں ان کی ضرورت ہو مزید سائنٹفک ٹریننگ کا بندوبست کیا جائے تاکہ وہ تنظیماتِ صحت کے عملہ میں معالجین جسمانی تربیت کے ماہرین، سینیٹری اسٹاف، ولادت نرس اور دایہ گری کے فرائض انجام دے سکیں ۔

بھور کمیٹی کا قیام جن حالات میں عمل میں آیا وہ یہ تھے کہ ملک کی کم و بیش نوے فیصد آبادی علاج معالجہ کی سہولتوں سے یکسر محروم تھی اور یہ محرومی ایک ایسی بھیانک حقیقت تھی کہ اس کی موجودگی میں کوئی حکومت قوی، مہذب اور ترقی پسند ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی مگر مشکل یہ تھی کہ جب بھور کمیٹی کے سپرد کیا گیا تو اس نے ایسا امیرانہ نسخہ تجویز کیا جسے چالیس سال تک استعمال کرنا ضروری تھا اور نسخہ کی لاگت تین ارب روپیہ سے زیادہ آتی تھی اور اس کے ساتھ یہ لازم تھا کہ نسخہ کی دوا نہ کم ہونے پائے اور جو شرطیں مریض اور تیماردار کے لئے لکھ دی گئی ہیں ان میں کوئی شرط کم ہو اس پر طرہ یہ کہ اس کمیٹی نے قدیم طبوں کو سرے سے نظر انداز کر دیا گویا ملک میں ان کا کوئی وجود ہی باقی نہیں ہے ! اس قسم کی رپورٹ سے اطبا اور ویدوں کا احتجاج لازمی تھا جو حکیم صاحب کی قیادت میں پورے ملک نے کیا ۔ اس احتجاج سے متاثر ہو کر پھر حکومت نے ایک کمیٹی 'چوپڑا کمیٹی' کے نام سے مقرر کی (جس کی سفارشات تادم تحریر حکومت کی الماریوں کی زینت ہیں)

غرض اس احتجاج سے ایک بار پھر طبِ یونانی کو سہارا ملا ۔ ابھی تنظیم کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ ملک کی تقسیم عمل میں آ گئی ۔ ہندوستان میں یونانی طب مسلمان سمجھی گئی اور تعصب کا شکار ہو رہی ہے بھور کمیٹی اور چوپڑا کمیٹی کی سفارشات پاکستان بھی منتقل ہوئیں لیکن یہ سب حکومت کے طاقِ نسیاں کی زینت ہیں بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ ہماری وزارتِ صحت کو علم ہی نہیں ہے کہ یہ رپورٹیں اور سفارشات کیا ہیں اور ان پر کیا کرنا ہے ۔

یہ ہے ہماری طبِ یونانی کا پس منظر، اور ہماری جدوجہد کی سرسری تاریخ، جو دراصل موضوع نہیں ۔ لیکن ہمیں ابھی جو لکھنا ہے اس پس منظر کے بغیر اس کی اہمیت کا اندازہ مشکل تھا ۔

طبِ یونانی پاکستان میں

نام کی تبدیلی

پاکستان کے قیام کے فوراً ہی بعد طبِ یونانی میں سب سے بڑی تبدیلی یہ ہوئی کہ اس کا نام بدل دیا گیا اور قائدینِ طب نے اسے **طبِ اسلامی** کا نام دے دیا۔ پاکستان کی پوری عمارت جب اسلام کے نام پر بنی ہو تو پھر طبِ یونانی کو مسلمان اور مشرف بہ اسلام کیوں نہیں کیا جاتا۔ ہر چند کہ تاریخی شواہد اس نام کی تائید میں ملتے ہیں اور ہمارے ملک کے متعدد علماء نے طبِ اسلامی پر مدلل مضامین، پمفلٹ اور کتابیں لکھیں لیکن میں چاہتا تھا کہ جب تک صحیح اور مناسب موقع نہ آئے اس نام کے قضیے میں نہ پڑا جائے اور یہ میں اس لئے چاہتا تھا کہ بے وقت تبدیلیٔ نام سے اس طب کا دائرۂ عمل محدود سے محدود تر ہو جائے گا۔ میری رائے کو اطبا نے تسلیم نہیں کیا۔ بھارت میں اس طبِ یونانی کے لئے پہلے ہی میدان تنگ ہو رہا تھا، تقسیم کے بعد یہ میدان تنگ تر ہو گیا اور جب اس طب کو مشرف بہ اسلام کر لیا گیا تو بھارت کے رہنے والوں نے اسے مسلمان کی حیثیت سے دیکھنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بھارت میں آیورویدک کا میدان وسیع تر ہوتا جا رہا ہے اور یونانی کو گمنامی نصیب ہوتی جا رہی ہے۔ حد یہ ہے کہ حیدر آباد میں جہاں خالصاً یونانی طب کے ادارے تھے وہاں بھی چن چن کر یونانی حکیموں کو الگ کر کے ویدوں کو لگایا جا رہا ہے۔

میرا خیال نہیں یقین ہے کہ اگر ہم لوگ طبِ یونانی کو طبِ اسلامی نہ کہنے لگتے تو بھارت میں اس طب کے لئے میدان اس قدر سرعت کے ساتھ تنگ نہ ہوتا۔ بہرحال اب کم از کم اطبا نے اس کو طبِ اسلامی کہنا پسند کر لیا ہے لیکن عوام میں یہ جدید نام رائج نہیں ہے۔

طبی تحریکات

یوں تو کسی بڑے منصوبے کو بڑھانے کے لئے پانچ سال کی مدت کچھ ایسی بڑی مدت نہیں ہے پھر بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ طبِ یونانی کو اس عرصہ میں جتنا آگے بڑھنا چاہئے تھا اس کے قدم اتنے آگے نہیں بڑھے۔ ترقی کی رفتار مایوس کن نہ سہی مگر زیادہ حوصلہ افزا بھی نہیں رہی۔

ہم اس مدت میں جو کچھ کر سکے ہیں اس کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ تقسیم کے بعد ہمارے اطبا نے پہلا قابلِ تعریف کام آل پاکستان آیورویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس کی تاسیس کی صورت میں انجام دیا۔ اب تک صحیح معلوم نہیں ہو سکا کہ اس طبی ادارے کا صدر دفتر کہاں ہے۔ —— لاہور میں ہے یا کراچی میں —— ویسے لاہور کے بعض طبی رسائل میں اعلانات شائع ہوئے ہیں کہ لوگ اپنی غلط فہمیاں دور کر لیں، اس جماعت کا دفتر لاہور میں نہیں کراچی میں ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ عملاً لاہور ہی اس کا مرکز ہے۔ بہرحال اس کانفرنس کا پہلا عام سہ روزہ اجلاس کراچی میں ہوا جس میں محترمہ فاطمہ جناح نے شرکت فرمائی۔ اس اجلاس کے نتائج بلاشبہ بہت امید افزا ہیں اور اگر کارکنانِ کانفرنس مذکور اختلافِ رائے کا شکار نہ ہوتے اور ملک کے تمام اطبا کا اس پر اتفاق ہوتا تو نتائج کے اعتبار سے یہ کانفرنس اتنی زیادہ کامیاب ہوتی جس کی توقع مشکل کی جا سکتی۔

افسوس ہے کہ اس کانفرنس اور اس کے عام اجلاس سے ملک کے اطبا کا ایک بڑا اور اہم طبقہ علیحدہ رہا۔ خود پنجاب میں اطبا کے دو مستقل اور مضبوط گروہ ہیں جو آپس میں کبھی متفق نہیں ہو سکے اور تقسیم کے بعد ان کے اختلافات اور بھی زیادہ بڑھ گئے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ طبی تحریک زیادہ نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوتی۔ یہ ایک شرمناک حقیقت ہے کہ پاکستان کے اطبا کی گروہ بندیاں محض اور صرف اس لئے ہیں کہ ہر ایک عہدہ چاہتا ہے۔ خلوص ناپید ہے شہرت و نام کی خاطر جماعتیں بنتی ہیں۔ خود لاہور اور پنجاب کی گروہ بندیاں اس حقیقت کی آئینہ دار ہیں۔

اس پانچ سال کے طویل عرصہ میں اب تک ایک بھی ایسی کوشش نہیں ہوئی ہے کہ سارے اطبا ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں۔ حالانکہ کانفرنس کرنے اور جلسے کرنے سے زیادہ ضروری یہی ہے۔

آل پاکستان آیورویدک اینڈ یونانی طبّی کانفرنس نے متعدد ریزولیوشن پاس کئے (ایک ریزولیوشن میں اُن اطبا کے خلاف غم و غصہ کا اظہار بھی تھا جو کانفرنس سے علیحدہ ہیں اور جنہوں نے اس طرح طب کو "نقصان" پہنچایا) لیکن اس ہنگامہ آرائی کے مفید نتائج اس لئے بھی حاصل نہیں ہوئے کہ اس کانفرنس اور اجلاس کے ایک سال تک ایک مسلسل خاموشی طاری رہی۔

اطبائے لاہور کی کوششوں کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ کارپوریشن میں دو دیسی شفاخانوں کا قیام منظور کرایا پھر پنجاب کے سیلاب زدگان کی طبی امداد کے لئے فراخ دلی سے اپنی خدمات پیش کیں اور اس سلسلے میں پسندیدہ کام انجام دیئے خیراتی شفاخانوں کا اجراء اور اطبا کی خدمات قبول کرنے پر آمادگی بھی انہی اطبا کی سعیٔ خیر کا نتیجہ ہے۔ لاہور کے علاوہ ڈسٹرکٹ بورڈ سیالکوٹ میں بھی ۲۶ اطبا کا تقرّر منظور ہوا۔

پنجاب پراونشل طبّی کانفرنس ایک ایسا ادارہ ہے جو باتیں تو کرتا ہی ہے لیکن عمل بھی کرتا ہے۔ مذکورہ بالا خدمات کے علاوہ اس ادارہ نے اور مفید کام بھی انجام دیئے ہیں۔

(۱) پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن نے طبِ یونانی پر جو اعتراضات کئے تھے ان کے جوابات اخبارات میں شائع کرائے اور پمفلٹ کی شکل میں چھپوا کر تقسیم بھی کرائے۔

(۲) غالباً اسی ادارہ نے مسجدوں میں بعد نماز جمعہ طب یونانی کے حق میں دعائیں بھی کرائیں جس پر پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن بہت چراغ پا ہوئی تھی۔

(۳) مسلم لیگ اور پنجاب کے سربرآوردہ اور معتبر اشخاص سے یونانی طب کی سرپرستی کے لئے مرکزی حکومت کو خط لکھوائے اور قرار دادیں منظور کرکے حکومت کے پاس بھجوائیں۔

(۴) حکومت پنجاب کے مشیروں اور وزیروں کو طب یونانی کی سرپرستی کے لئے آمادہ کیا۔

(۵) مجلس علمیہ اور مجلس طبیّہ جاری کیں جن کا مقصد یہ تھا کہ اس میں اطبا باہم بحث و مذاکرہ کے ساتھ فنی تعاون میں حصہ لیتے رہیں۔ غالباً ان مجالس نے عملاً کوئی کام نہیں کیا۔

ویسے تو اور بہت سی جماعتیں ہیں لیکن ہر آدمی جس کا صدر بننے کو دل چاہتا ہے ایک جماعت بنا لیتا ہے۔ تاہم ذیل میں اُن تمام جماعتوں کے نام لکھے جاتے ہیں جو کچھ نہ کچھ صحیح غلط کر رہی ہیں۔

(۱) پاک جمعیتہ الاطبا نئی مارکیٹ۔ کراچی۔
(۲) آل پاکستان آیورویدک اینڈ یونانی طبّی کانفرنس لی مارکیٹ کراچی۔
(۳) آل پاکستان یونانی طبّی کانفرنس ۲۴۔ سرکلر روڈ لاہور
(۴) پنجاب پراونشل طبّی کانفرنس بسنت روڈ لاہور۔
(۵) پاکستان اجملی طبّی ایسوسی ایشن۔ احمر طبیہ کالج راولپنڈی
(۶) جمعیتہ اطبا، قدیم طبیہ کالج دہلی پاکستان (حیدرآباد سندھ)
(۷) سندھ طبّی کانفرنس مارکیٹ کلاک ٹاور (حیدرآباد سندھ)

مطالبات ان مطالبات پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لینا ضروری ہے جو پاکستان کے اطبا یا ان کی انجمنوں نے وقتاً فوقتاً حکومت سے کئے ہیں۔ ان مطالبات کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

(۱) یونانی اور آیورویدک طریقہ ہائے علاج کو تسلیم کیا جائے۔
(۲) اطبا کا رجسٹریشن کیا جائے۔

طب یونانی

(۳) لاہور، ڈھاکہ اور سلہٹ کے طبیہ کالجوں کو مالی امداد دی جائے ۔

(۴) یونانی ڈسپنسریاں کھولی جائیں ۔

(۵) بھارت اور پاکستان کے تسلیم شدہ طبّی درسگاہوں کے گریجویٹوں کو فوج کی میڈیکل سروسوں میں ملازمتیں دی جائیں ۔ کیونکہ یہ گریجویٹ جدید طریقۂ علاج اور سرجری سے واقف ہوتے ہیں

(۶) کراچی اور صوبوں کے تمام مستقروں پر مردانہ و زنانہ طبیّہ کالج کھولے جائیں

(۷) راولپنڈی میں سرکاری طبیہ کالج قائم کیا جائے ،

(۸) سابقہ خیراتی شفاخانے از سر نو قائم و جاری کئے جائیں

(۹) [illegible] سرکاری یونانی شفاخانے کھولے جائیں ۔

(۱۰) صوبہ سرحد میں طبیہ کالج پشاور سے متعلق جو اسکیم مرتب کی گئی تھی اُسے منظور کیا جائے اور وہاں بھی یونانی شفاخانے کھول کر طبّی امداد سے عوام کو فائدہ پہنچایا جائے ۔

جہاں تک معلوم ہو سکا یہ مطالبات بے نتیجہ نہیں رہے ۔ حکومتِ سندھ نے بہت فراخدلی کے ساتھ تعاون کیا مہاجرین کی طبّی امداد کے سلسلے میں اس حکومت نے کئی شفاخانے کھولے اور ایک سو سے زیادہ حکیم صاحبان کو یونانی دواؤں سے مسلح کر کے گاؤں گاؤں بھیجا اور حکومت سندھ پر روشن ہے کہ اطباء نے دل سوزی اور بے حد محنت سے خدمات سرانجام دیں ۔ یہ افسوس ہے کہ حکومت سندھ نے ان اطباء کی تنخواہ کا معیار بہت ہی کم رکھا ہے ۔

ادھر پنجاب اسمبلی میں پانچ سو یونانی خیراتی شفاخانوں کے قیام کے متعلق قرار داد منظور ہوئی اور صوبہ سرحد نے پشاور میں طبیہ کالج جاری کرنے کی اسکیم منظور کر لی جس کا مطلب یہ ہے کہ اس صوبے نے طب یونانی کی سرکاری سرپرستی کا عملی ثبوت دیا ۔ قیام پاکستان کے بعد صوبہ سرحد نے صحیح خطوط پر کام کیا ہے اور ترقی کے راستے پر مسلسل اقدامات کئے ہیں کاغذی تجاویز سے لوگوں کو مطمئن نہیں کیا ہے بلکہ ہر بار اور ہر موقع پر عمل کا ثبوت پیش کیا ہے اور ہمیں توقع رکھنی چاہیے کہ صوبہ سرحد میں ضرور طبیہ کالج قائم ہو گا ۔ ’ انشاء اللہ تعالیٰ ‘

اسی طرح طبیہ کالجوں کی مالی امداد میں اضافہ ہونے کی اطلاعات بھی مل رہی ہیں اس لحاظ سے یہ توقع بندھتی ہے کہ باقی صوبائی حکومتیں اور مرکزی حکومت زیادہ دیر تک طب یونانی کے مسئلے کو معرض التواء میں نہ رکھ سکیں گی ۔

لیکن، جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں طب یونانی کی موجودہ رفتارِ ترقی ہرگز ایسی نہیں ہے کہ اطباء اس پر مطمئن ہو کر بیٹھ رہیں ۔ ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے ۔ اوپر جو کچھ ہم نے لکھا ہے یہ اتنا کم ہے کہ اسے نہ ہونے کے برابر کہا جا سکتا ہے ۔ ابھی سب کچھ کرنا باقی ہے جو کچھ ہوا ہے اس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ منزل تک پہنچنے کا راستہ ضرور صاف ہو گیا ہے مگر ”ہنوز دلّی دور است“ اصل کام یہ نہیں ہے کہ حکومت نے چند سو خیراتی شفاخانے قائم کر کے اتنی کہ توجہ کر دی اور ہم خاموش ہو گئے کہ چلئے اتنا مل گیا تو سب کچھ مل گیا ۔ حقیقی کام جس پر طب یونانی کے بقا کی اساس ہے یہ ہے کہ اس فن کا جو وقار کھو چکا ہے خواہ اپنے ہاتھوں یا غیر کی چیرہ دستیوں سے ، اسے پھر بحال کیا جائے اور اگر طب جدید سے بڑھ کر نہیں تو کم از کم اس کے مماثل درجہ ضرور دلانا چاہیئے ۔ تاکہ فن شریف ایک بار پھر دنیا میں اپنی ساکھ قائم کر سکے ۔

ظاہر ہے کہ یہ بات غیر معمولی طلب و ایثار کے بغیر حاصل نہ ہو گی اور اس کے لئے بڑی محنت اور بڑی جدوجہد درکار ہے ۔

حکومت نے کیا کیا

مرحوم قائدِ اعظم محمد علی جناح نے قیامِ پاکستان سے قبل طبیہ کالج دہلی کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا ۔

طبِ یونانی

"پاکستان قائم ہو جانے پر ہم اُن تمام علوم و فنون کو رواج دینے کی کوشش کریں گے۔ جو اپنے بزرگوں سے ہمیں ورثے میں ملے ہیں اور طبِ یونانی کو پروان چڑھانے کی کوشش کی جائے گی ------"

اپنی زندگی میں قائدِاعظم نے تعمیر و ترقی کے کاموں سے ایک لمحہ غفلت نہیں برتی اور اُنھوں نے اپنے رفقاءِ کار کو بھی تعمیری کاموں میں مشغول رکھا۔ جیسا کہ معلوم ہے اُنھوں نے اپنے بہت سے دعوے پورے بھی کئے۔ لیکن افسوس ہے کہ پاکستان ایک باعمل آدمی سے محروم ہو گیا۔ اور اس کے بعد ملکی مسائل اس قدر اُلجھ گئے کہ جو کام ہونے والے تھے وہ نہیں ہوئے۔ طبِ یونانی کا بھی یہی حال رہا کہ اس طرف حکومت کوئی توجہ نہیں کر سکی بلکہ صاف لفظوں میں یہ کہنا چاہئے کہ حکومت نے اس باب میں کچھ کرنا ہی نہیں چاہا۔ گو اس سلسلے میں حکومت نے دو طبوں کے اخراجات کا بار نہ اٹھائے جانے کے بہانے کئے اور دوسری مصروفیات کا عذر کر کے اس مسئلے کو اُٹھنے ہی نہ دیا لیکن اصل چیز یہ ہے کہ اقتدار ڈاکٹروں کے ہاتھ میں رہا ہے اور حکومت ڈاکٹری نقطہ نظر سے متاثر رہی ہے اور اب بھی متاثر ہے۔ میں ذاتی طور پر صاحبِ اقتدار ڈاکٹروں سے واقف ہوں کہ وہ طبِ یونانی کو نفرت و حقارت سے دیکھتے ہیں اور حاملینِ طبِ قدیم کے بارے میں اُن کے خیالات نہایت خراب ہیں۔ ان ڈاکٹر صاحبان کی رائے حکومت کی رائے ہے نتیجہ یہ ہے کہ پانچ سال کے طویل عرصہ میں مرکزی حکومت کی جانب سے خیر خواہئ طب کے لئے کچھ بھی نہیں ہوا۔ حکومت کے اس طرزِ عمل سے صحتِ عامہ کو جو عظیم نقصانات پہنچے ہیں اس پر میں آنے والے صفحات پر روشنی ڈالوں گا۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ دلچسپ چیز یہ ہے کہ جو ڈاکٹر صاحبان حکومت میں بااثر ہیں اور طبِ یونانی کے بارے میں اظہارِ رائے سے کبھی نہیں چوکتے۔ ان کا خود یہ حال ہے کہ وہ طبِ یونانی کے بارے میں مطلقاً کوئی واقفیت نہیں رکھتے۔ غور فرمایئے کہ ایسی رائے کیا وقعت رکھ سکتی ہے جو صرف تعصب اور سینہ زوری سے دی گئی ہو۔

خود حکومت کے کارپردازان مغرب کی 'روشنی' سے راستہ دیکھتے اور چلتے ہیں۔ حالانکہ انگریز اس ملک سے رخصت ہو چکا ہے۔ اور اس کا وہ طمطراق بھی باقی نہ رہا جو اس کا طرۂ امتیاز تھا۔ یہ بڑی غور کرنے کی بات ہے کہ اگر واقعی ہم اپنی حدود میں آزادی اور خود مختاری کی نعمت سے بہرہ اندوز ہیں اور اب ہماری گردن پر کسی کی غلامی کا جوا نہیں رکھا ہوا ہے تو ہم اس ذہنی غلامی سے بھی کیوں آزاد نہیں ہو جاتے۔ ہماری موجودہ حکومت بالکل نہیں تو بڑی حد تک اپنی ہی حکومت ہے۔ پھر وہ کس لئے اتنی مجبور ہو جائے کہ انگریزی کی قائم کی ہوئی لکیر کو پیٹتی جائے۔ اب نہ وہ مجبوریاں ہیں نہ مغربی قوم ہماری قوم ہے۔ جسے ہم نوازنے کے لئے انگریز کی مفاد پرستی کا آلہ کار اب بھی بنے رہیں اور مغربی طب ہی کو اپنا نجات دہندہ اور طبیب مسیحا نفس سمجھ کر قوم اور معاشی نقطہ نظر سے ایک پست زبوں حال قوم کے گاڑھے پسینے کی کمائی سے یورپ کے زبردست سرمایہ داروں کی تجوریاں بھرتے رہیں۔

ان حقائق پر گزشتہ پانچ سال میں حکومت نے ایک بار بھی ٹھنڈے دل سے غور نہیں کیا۔ اس نے ایک بار بھی غور نہیں کیا کہ سرزمینِ پاک پر لاتعداد قسم کی بے اندازہ جڑی بوٹیاں پیدا ہو کر خشک اور تباہ ہو جاتی ہیں۔ ان جڑی بوٹیوں سے نہ صرف یہ کہ اپنے ملک کے بیماروں کو شفایاب کیا جا سکتا ہے بلکہ ان جڑی بوٹیوں سے ایک نفع بخش تجارت بھی کی جا سکتی ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ صرف مشرقی پاکستان میں صدہا قسم کے مفردات پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی دیکھ بھال کا کوئی انتظام موجود نہیں ہے۔ مشرقی پاکستان میں دیسی دوائیاں کلکتہ سے آتی ہیں اور خود اپنے ملک میں پیدا ہونے والی اکسیر جڑی بوٹیاں تباہ ہوتی رہتی ہیں۔ عدم کارکردگی اور غفلت کی بہر حال ایک حد ہوا کرتی ہے۔ افسوس ہے کہ حکومت اس حد سے بھی آگے بڑھ چکی ہے اور ضرورت ہے کہ ایک منظم تحریک شروع کی جائے کہ حکومت خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر اپنے ذخائر کے استعمال پر آمادہ ہو۔ آرام طلبی کی عادت کو چھڑا کر حکومت کو دردِ سری کے لئے آمادہ و تیار کرنے کا وقت آ چکا ہے۔

ایک اندوہناک حقیقت

کیا حکومت کی غلط راہ روی کا یہ نتیجہ نہیں ہے کہ ہمارے ملک کی پیاری آبادی کا ۹۰ فیصد حصہ علاج معالجہ کی سہولتوں سے یکسر محروم ہے؟ طبی امداد کے اس فقدان سے خطرناک نتائج نکلتے ہیں۔ ان کا اندازہ کرنا ہو تو ڈاکٹر کرنل ملک ڈائرکٹر پبلک ہیلتھ پنجاب کا یہ بیان آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہے کہ

"صرف پنجاب میں طبی امداد بہم نہ پہنچنے کی بدولت ساڑھے تین لاکھ آدمی لقمۂ اجل ہو جاتے ہیں۔"

اس کا مطلب یہ ہوا کہ پورے پاکستان میں ہر سال کم و بیش چودہ لاکھ آبادی صرف اس وجہ سے موت کی گھاٹ اتر جاتی ہے۔ کتنا عبرتناک ہے یہ حال اور کس قدر افسوس کے قابل ہے ہماری یہ بے حسی کہ چودہ لاکھ انسانوں کو صرف اس لئے مرنے دیا جائے کہ ڈاکٹر نہیں ملتے! ظاہر ہے کہ حکیموں اور طبیبوں کا شمار تو معالجوں میں ہے ہی نہیں۔ اگر حکومت ان سے یہ کام لے لے گی تو اس کی ناک کٹ جائے گی!

سچ تو یہ ہے کہ ڈاکٹروں کے مفاد کے لئے لاکھوں باشندے ملک الموت کی پناہ میں نہیں دیئے جا سکتے۔ اگر حکومت ان باشندوں کو پوری طرح امداد نہ دے سکی تو اس کی یہ کوتاہی کبھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔

اصل یہ ہے کہ اگر پنجاب یا پاکستان کا کوئی اور صوبہ طب ایلوپیتھی پر تکیہ کرے تو صدیوں میں بھی طبی امداد کا انتظام اس کے بس کی بات نہیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ پورے پنجاب میں ایک ہزار ڈاکٹر ہیں۔ جن لوگوں نے بھور کمیٹی کی رپورٹ کا مطالعہ کیا ہے اس کی سفارشات کے مطابق صرف پنجاب کو سترہ ہزار ڈاکٹروں کی اور ضرورت ہوگی۔ اگر مان لیا جائے کہ پاکستان ہر سال تین سو ڈاکٹر تیار کر سکتا ہے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ پاکستان میں طبی امداد ایک سو سال تک بھی مطلوبہ معیار کے مطابق میسر نہ آ سکے گی۔

ہمارے طبیہ کالج

افسوس ہے کہ ہمارے سامنے کوئی ایسی رپورٹ نہیں ہے جس سے معلوم ہو سکے کہ یونانی طبیہ کالجوں کی پنج سالہ سرگرمیاں کیا ہیں۔ تقسیم سے قبل انجمن حمایت اسلامیہ لاہور سے متعلق ایک طبیہ کالج قائم تھا۔ غالباً تقسیم کے بعد بھی یہ کالج مالی الجھنوں کا شکار رہا۔ مجھے اس کالج کی طرف سے پورے پانچ سال میں ایک رپورٹ بھی وصول نہیں ہوئی اور میں نہیں کہہ سکتا کہ اس پانچ سال کے عرصہ میں اس کالج سے کتنے حکیم سندیں لے کر نکلے۔ اندازہ ہے یہ تعداد دو تین سو سے زیادہ نہ ہوگی۔ دوسرا طبیہ کالج سلہٹ میں ہے۔ میں نے سال گزشتہ اس کالج کو خود جا کر دیکھا۔ یہ کالج جس کس مپرسی کی حالت میں ہے اسے دیکھ کر رونا آتا ہے۔ اس کے بارے میں کیا لکھوں۔ اس پورے پانچ سال کے عرصہ میں ہم نے حکومت پر کلیتہً بھروسا کیا۔ اگر حکومت سے بے نیاز ہو کر ہم اپنے تعلیمی اداروں کی حالت سدھا رتے تو مناسب تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ پنجاب میں بعض ذمہ دار اور کئی غیر ذمہ دار اطبا سند فروشی کرتے ہیں۔ یہ بات حد درجہ افسوسناک ہے۔ لاہور کے بعض طبی رسائل نے اس سند فروشی کے خلاف آواز بلند بھی کی ہے لیکن یہ سلسلہ بند نہیں ہوا۔ اس تجارت میں پیش پیش وہی لوگ ہیں جو طب کے قائدین میں شمار ہوتے ہیں۔ بلکہ اپنا شمار وہ قائدین طب میں کرتے ہیں۔

اس صورتِ حال نے ہماری طب کے وقار کو بہت دھکا لگایا ہے۔ مگر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو ایسا وقت آنے میں دیر نہیں ہے کہ اس طب کا رہا سہا وقار و اثر بھی ختم ہو جائے گا۔ ضرورت ہے کہ اطبا اس صورتِ حال پر بڑی سنجیدگی سے غور کریں۔

مخالفین طبِ یونانی

برطانی تسلط کے بعد کوئی دور ایسا نہیں گزرا کہ طبِ یونانی ڈاکٹروں کی مخالفت کا ہدف نہ بنی ہو۔ قیام پاکستان کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری ہے لیکن اس نے اب ذرا انداز بدلا ہے اور شدت بھی اختیار کی ہے۔ طب یونانی کا پنج سالہ جائزہ اگر ہم لیں تو اُس مخالفت اور غلط پراپگینڈا کو نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا جو پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن مغربی پنجاب نے اپنے ایک پمفلٹ "پاکستان میں جدید طبی تنظیم کی بنیاد" میں کیا ہے۔ میں اس کا ذکر اس لئے یہاں کرتا ہوں کہ اس پمفلٹ کی اشاعت

طبِ یونانی

کے بعد اطبا میں ایک عام بیداری کی لہر اٹھی۔ اس پمفلٹ میں جن خیالات بلکہ تخیلات کا اظہار کیا گیا ہے ان کا ماحصل یہ ہے کہ

(۱) طبِ یونانی میں جدید خیالات کو جذب و اخذ کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔

(۲) قومی صحت کے مسئلے سے اس طب کو کوئی لگاؤ نہیں ہے۔

(۳) اس طریقِ علاج کو "طبِ اسلامی" کہنا محض دھوکا ہے۔ یہ نام حکیموں نے محض اس لئے گھڑ لیا ہے کہ اسلام کے نام پر عوام کو اس طب کی طرف راغب کیا جائے۔

(۴) طبِ یونانی کے پاس ایکسرے، ریڈیم جیسے مؤثر ذرائع، تیز کونین، اسٹرپٹو مائی سین، سلفونامائڈس اور پینی سیلین جیسی قوی دوائیں نہیں۔ اور

(۵) طبِ یونانی اَن سائنٹیفک ہے لہٰذا جدید دور میں زندہ رہنے اور پاکستان کی طبی ضروریات میں حصہ لینے کا کوئی حق نہیں۔

دیکھ لیا آپ نے! ہمارے یہ معزز دوست اب تک کس جنت میں رہ رہے ہیں۔ مدعی سست اور گواہ چست کی مثل ان ہی پر صادق آتی ہے اُدھر مغرب میں طبِ جدید کی اصلاح کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں اِدھر مشرق میں اس (ایلوپیتھی) کے علمبردار اس کی "اکملیت" کے راگ الاپ رہے ہیں اور دیکھئے ان کی "اَن سائنٹیفک" پر آ کر ٹوٹی ہے۔ پہلے قدیم طبوں کو جو اَن سائنٹیفک کہا جاتا تھا تو اس کے ساتھ ایک آدھ بات قرینے کی اور ذرا وزنی بھی کہی جاتی تھی لیکن اب طبِ یونانی اس وجہ سے "اَن سائنٹیفک ہے" کہ اس کے پاس ایکسرے اور ریڈیم نہیں ہے اور اس لئے "اَن سائنٹیفک" ہے کہ وہ اسٹرپٹو مائی سین سلفونامائڈس اور پینی سیلین کے استعمال میں محترز ہے اور ہمارے دوست اس وجہ سے علمبردارِ سائنس ہیں کہ وہ بے دھڑک اسٹرپٹو مائی سین، سلفونامائڈس اور پینی سیلین کا استعمال کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے جب تک کہ "برٹش میڈیکل جرنل" یہ اعلان نہ کر دیگا کہ "اسٹرپٹو مائی سین" کا استعمال بند کر دو کیونکہ اس سے آٹھویں عصبِ دماغی پر زہریلا اثر ہو رہا ہے اور اس سے مریض بہرہ پن اور چکر وغیرہ میں مبتلا ہو جاتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مریض احساسِ توازن ہی سے مستقل طور پر محروم ہو جائے"

سچ تو یہ ہے کہ ہم حاملینِ طبِ قدیم تو ویسے ہی لکیر کے فقیر مشہور ہو گئے ہیں کیا لکیر کے فقیر ہونے کی اس سے اچھی مثال بھی مل سکے گی۔ کہ ان کے لاکھوں واقعی اور مشتبہ مریضوں کو اسٹرپٹو مائی سین کے انجکشن بے دھڑک لگائے جا رہے ہیں اور اس عمل میں حزم و احتیاط ان کا ذرا بھی ہاتھ نہیں پکڑتی!

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ان دوستوں کو اپنے مستقبل کی طرف سے کچھ خدشے لاحق ہو رہے ہیں اور پاکستان میں قدیم طبوں کے حق میں جو فضا پیدا ہو رہی ہے اس نے ان کو اس نازیبا پراپیگنڈا پر آمادہ کیا ہے لیکن ان کو گھبرانا نہیں چاہئے انہیں اور ہم کو مل کر اپنے ملک کی طبی تنظیم کے لئے دوش بدوش کام کرنا ہے۔ ہاں تعصبات کو خواہ وہ پرانے ہوں یا نئے ضرور دونوں کو خیرباد کہنا پڑے گا۔

اطبا پر ایک نظر

طبِ یونانی کو نقصان پہنچانے والے جہاں اور بہت سے اسباب ہیں ایک بڑا اور اہم سبب اطبا کے ذاتی اختلافات ہیں اور پھر اطبا کی جماعتوں کے باہمی اختلافات ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ باہمی تبادلِ خیالات کے مواقع کم سے کم ہوتے جا رہے ہیں۔ کوئی مشرق کی طرف جا رہا ہے تو کسی کا راستہ مغرب کی طرف جا رہا ہے۔ یکجہتی یکسر ختم ہو گئی ہے۔ ہر طبیب اپنی مرضی کا آپ مالک ہے۔ ہماری کوئی ایک ایسی انجمن نہیں ہے جو بازپرس کی مجاز ہو نتیجہ یہ ہے کہ معمولی معمولی طبی اخلاق سے ہم محروم ہوتے جا رہے ہیں اور فنِ طب کو بدنام کر رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس صورتِ حال پر سنجیدگی سے غور کیا جائے اور صحیح راہ متعین کی جائے۔ ہم متحد ہو کر ایک ایسی مضبوط جماعت کی تشکیل کر لیں کہ جو بااختیار ہو اور ہم جب بھی کوئی آواز بلند کریں تو ملک کے اس کونے سے اس کونے تک لبیک کے علاوہ کوئی دوسرا لفظ نہ سنائی دے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام ایثار چاہتا ہے۔ ہر شخص صدرِ اعظم نہیں بن سکتا عہدوں کی خواہش اور لالچ کو بالکل ختم

کر دینا ہوگا ۔ میرا خیال ہے کہ ایسا کر کے ہم اپنی طب کے لئے فضا کو بہت زیادہ ہموار کرلیں گے ۔
افسوس ہے کہ پنج سالہ تاریخ طب میں اس قسم کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے ۔

طبِ یونانی اور ایلوپیتھی

طب قدیم کی اس مسلمہ فضیلت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ طب قدیم ہی کے آثار پر طب جدید (ایلوپیتھی) کی اتنی نظر فریب اور ملمع کار عمارت کھڑی ہوئی ہے ۔ ایلوپیتھی کے نقش و نگار پر ذرا گہری نظر ڈالئے تو ممکن نہیں کہ اس کی تہہ میں طبِ یونانی کا حسن نکھرتا ہوا نہ معلوم ہو ۔ آج بھی ایلوپیتھی میں ایسی بے شمار اصطلاحات مل جاتی ہیں جو طبِ یونانی سے لی گئی ہیں اور انھیں ذرا سے رد و بدل کے بعد اپنا لیا گیا ہے ۔ اشارہ کے طور پر سنا (سینا) کافور (کیمفر) بورق (بوریکس) ، ذوسنطاریا (ڈسنٹری) قولون (کولون) قرنیہ (کارنیا) قاثاطیر (کیتھیٹر) وغیرہ کے ذکر پر اکتفا کی جاتی ہے ۔ ورنہ تفصیل کے لئے ایک جداگانہ کتابچہ درکار ہوگی ـــــ طبِ یونانی کی تقلید اور اس سے خوشہ چینی کا یہ سلسلہ طب جدیدہ علمی و عملی تمام شعبوں پر چھایا ہوا ہے ۔

جو متعدد اکتشافات ، ایلوپیتھی کا سرمایۂ فخر و مباہات بنے ہوئے ہیں طبِ یونانی میں ان سے متعلق واضح اشارات بہت پہلے سے موجود ہیں کشش ثقل ، مسئلہ ارتقاء ، مسئلہ دورانِ خون ، نظریۂ حیات نباتات اور چیچک کا ٹیکہ وغیرہ ، ایلوپیتھی کے تحقیقی کارناموں میں شمار کئے جاتے ہیں ، حالانکہ یونانی اطبا ان سب چیزوں سے اچھی طرح واقف تھے اور ڈاکٹر بھی ان کی اس حیرت ناک واقفیت کے معترف ہیں ۔

اسی طرح ایلوپیتھی کے حسب ذیل کارناموں کو بھی بہت وقعت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے ۔

(۱) نظریۂ جراثیم
(۲) آرگنو تھیراپی (ہارمون تھیراپی) یا علاج عضوی
(۳) عمل احتقان یا تحت الجلدی پچکاری ۔
(۴) نظریہ تغذیۂ امراض ۔

آئیے ذرا ان کارناموں کی حقیقت پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے ۔

(۱) نظریۂ جراثیم :- ایلوپیتھی جراثیم کو امراض کا سبب سابق قرار دیتی ہے ۔ اگر جسم میں فاسد مواد نہ ہو تو جراثیم بیماری پیدا نہیں کر سکتے ۔ یونانی اطبا کا بھی یہی خیال ہے اور بہت پہلے سے ہے کہ بیماریاں فاسد مادے اور ردی اخلاط سے پیدا ہوتی ہیں ۔ وہ امراض کی پیدائش میں مواد فاسد کو زبردست اہمیت دیتے ہیں اور سب سے پہلے اسی کو جسم سے خارج کرنا علاج کا پہلا قدم خیال کرتے ہیں ۔

ایلوپیتھی بھی طبِ یونانی کے اس مستحکم نظریئے کو نہ توڑ سکی اور موادِ فاسد کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئی ۔ ہچنگ میڈیسن کے معتقدین بھی اس قیاس کی پوری تائید کرتے ہیں اور بیماری کے صرف دو سبب قرار دیتے ہیں ۔

(۱) عفونت یا زہر کی وہ اقسام جو اندر یا باہر سے جسم میں داخل ہوتی ہیں
(۲) وہ فضلات یا خراب مادہ جو جسم کے اندر رک جاتے ہیں ۔

بعض محقق اور ماہر فن ڈاکٹروں نے بعض امراض مثلاً ہیضے کو جراثیمی مرض تسلیم نہیں کیا ان میں بایو کیمسٹری کا موجد ڈاکٹر شسلر بھی شامل ہے ۔ ایلوپیتھی میں جن بیماریوں کو جراثیمی بیماری کہا جاتا ہے ۔ ان میں سے ایمیک ، پیچش اور خناق وبائی وغیرہ چند امراض کو چھوڑ کر باقی تمام امراض کا شفا بخش علاج اب تک معلوم نہ ہو سکا ۔ نظریہ جراثیم (مائکروبک تھیری) کا کھوج اگر آپ ہماری کتابوں میں لگائیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اگرچہ وہاں جراثیم کا لفظ موجود نہیں ہے مگر اجسام خبیثہ کے نام سے ابنِ سینا نے جس چیز کا ذکر کیا ہے اس سے یہ حقیقت عیاں ہے کہ جراثیم کا نظریہ دراصل قدیم نظریے کی شرح ہے ۔

(۲) آرگنو تھیراپی یا علاج عضوی ـ کو موجودہ میڈیکل سائنس کا ایک عظیم الشان کارنامہ خیال کیا جاتا ہے ۔ تندرستی کا دارومدار اخلاط

کی باقاعدہ پیدائش اور تقسیم ہی پر ہے ۔ ہارمونس کو صحتِ جسمانی سے گہرا تعلق ہے اسے کسی طرح نظرانداز نہیں کیا جا سکتا ۔

یہ ایک حیرت انگیز حقیقت ہے کہ انسانی معالجات میں حیوانی اعضا کا استعمال زمانہ قدیم میں بھی رائج تھا ۔ قدیم مصری اطبّا حیوانی اعضا اور اندرونی تراوش سے علاج کیا کرتے تھے یونانی اطبا کے ذہن و دماغ میں بھی ہارمونس کا تصور موجود تھا ۔ وہ حیوانی غدود میں پیدا ہونے والی رطوبت کے فوائد اور ان کی اہمیت سے واقف تھے جب انسانی جسم میں ان رطوبات کی پیدائش کم ہو جاتی تھی تو وہ ان رطوبات کا مصنوعی بدل بہم پہنچانے اور متعلقہ غدود میں تحریک و خلش پیدا کرنے کے لیے حیوانی غدود استعمال کرتے تھے ۔ دماغی طاقت کم ہو جانے کی صورت میں جانوروں کے بھیجوں کا اور ضعفِ گردہ میں حیوانی گردوں کا استعمال اطبا کے یہاں بہت عام ہے ۔ اسی طرح بعض اور اعضا کے ضعف میں انہی کے مماثل حیوانی اعضا کا استعمال رائج ہے فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے اصل غدود کام میں لائے جاتے تھے ۔ اب ان کے ایکسٹریکٹس یا خلاصے تیار کئے جاتے ہیں ۔

(۳) عمل احتقان سب سے پہلے دلوانے کتے کے کاٹنے کا علاج پچکاری کے ذریعہ ایجاد ہوا اس کے بعد رفتہ رفتہ ہر مرض کا علاج تحت الجلدی پچکاری (انجکشن) سے کیا جانے لگا ۔ اور اس طریق علاج میں جو نقصانات تھے ان کو بالکل نظرانداز کر دیا گیا جو دوائیں منہ کے ذریعہ استعمال ہوتی ہیں وہ پہلے معدے میں پہنچ کر اس کی رطوبات سے متاثر ہوتی ہیں اس کے بعد خون تک پہنچتی ہیں اس فطری طریق استعمال سے ادویہ کی اکثر مضرتیں دور ہو جاتی ہیں اور معدے کی رطوبات انہیں جسم کے موافق بنا لیتی ہیں لیکن جو دوائیں و بذریعہ پچکاری براہِ راست خون میں جا ملتی ہیں ان کی اصلاح کا کوئی قدرتی طریقہ جسم میں موجود نہیں ہوتا اسی لئے ان کے نقصانات شدید اور خوفناک ہوتے ہیں اور ایلوپیتھی کے اکثر ماہرین نے اس کا اعتراف کیا ہے ۔ مثال کے لئے نیو برکلین کے استعمال کا ذکر کافی ہے جس سے نہایت خوفناک حوادث اور اموات وقوع میں آئیں اور سرسام اور التہاب قلب، ورم حنجرہ، ورم ریہ جیسے شدید عوارض پیدا ہو گئے یہی حال انجکشن کی اور مشہور ادویہ سالورسان اور نیو سالورسان وغیرہ کا ہے جن کے نتیجہ میں ازالہ بصارت اور فالج تک ہونا مشاہدہ میں آیا ہے ۔ ان امور سے واضح ہے کہ طب یونانی کا بے ضرر اور دیر اثر علاج ایلوپیتھی کے مضر اور زود اثر علاج سے بدرجہا بہتر اور عوام کے لئے زیادہ مفید ہے ۔ اس کے برعکس ویکسین تھیراپی جس کا بہت زیادہ شہرہ ہے نہایت خطرناک اور مہلک ہے ۔

درحقیقت یورپ ایک مشہور مصنف کی رائے میں صرف اس امر کی سعی کرتا ہے کہ ہنگامی طور پر اس کا مرض امراض سے نجات مل جایا کرے ۔ اسی لئے ایلوپیتھی میں نشہ آور بیہوش آفرین، سریع الاثر مگر خطرناک دواؤں کا استعمال نہایت ترقی پر ہے لیکن ایسی دوائیں مرض کا استیصال نہیں کرتیں صرف دبا دیتی ہیں ۔ مواد مرض کا جسم میں اس طرح گھٹ کر رہ جانا کبھی اچھا نتیجہ پیدا نہیں کرتا اور مریض ایک کی جگہ بہت سی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے ۔ ایلوپیتھی کا یہ طریق عمل قوانینِ قدرت سے بغاوت ہے جس کی سزا ملے بغیر نہیں رہتی ۔

(۴) تعدیہ ۔ چھوت یا ایک سے دوسرے کو بیماری لگنے کا نظریہ طب یونانی میں پہلے سے موجود تھا ۔ اس کو ایلوپیتھی کا کارنامہ قرار دینا محض ناواقفیت کی دلیل ہے ۔ طب یونانی میں متعدی امراض کا ذکر اس حقیقت کو روشن کر رہا ہے کہ اطبّا تعدیئے سے واقف تھے ۔

جب تک بدنی افعال اور جسمانی نظام میں باقاعدگی رہتی ہے جسمانی طاقت متعدی امراض کا مقابلہ کرتی رہتی ہے اور جب جسمانی طاقت کمزور ہو جاتی ہے تو جسم بیماری کی چھوت کو قبول کر لیتا ہے ۔ ایلوپیتھی کے ماہرین بھی اسے تسلیم کرتے ہیں کہ جراثیم اپنا عمل اسی وقت شروع کرتے ہیں جب جسم کی قوت مقابلہ کم ہو جاتی ہے اور فاسد مادے بدن میں جمع ہو جاتے ہیں ۔ اس سے ظاہر ہے کہ فاسد مادے کا اخراج جسے طب یونانی میں تنقیہ کہتے ہیں اس کا حقیقی علاج ہے اس کے علاوہ متعدی بیماریوں کی نہایت موثر اور کارآمد ایسی یونانی طریق علاج میں رائج ہیں ان حالات میں یہ کہنا کہ یونانی طب میں تعدیئے کا شعور موجود نہیں ایک زبردست لاعلمی کا ثبوت دینا ہے ۔

ان امور سے قطع نظر کر کے موازنہ کے دوسرے پہلوؤں کو ملحوظ رکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا ملکی ماحول اس ماحول سے بالکل مختلف ہے جس میں ایلوپیتھی کی تخلیق ہوئی ہے ۔ ایلوپیتھی مغرب یا یورپ ہی کے لئے موزوں ہے جہاں ان علاقوں کے مخصوص ماحول اور نظام معاشرت کے مطابق اور نظریہ طبیعت کو یکسر نظرانداز کر کے نہایت گرم و خشک دوائیں تیار کی جاتی ہیں اور پھر مختلف ملکوں خاص تجارتی مفاد یا اغراض نفع اندوزی کے زیرِ اثر ترجیح دی جاتی ہیں اسی لئے ان ادویہ کی تیاری میں نہ ان ممالک کی آب و ہوا کا خیال رکھا جاتا ہے نہ وہاں کی معاشرتی و مزاجی خصوصیات کی پرواہ کی جاتی ہے ۔ یہ فن برصغیر ہند و پاکستان کے لئے بالکل موزوں نہیں ہے

اور ان دونوں طبوں میں وہی بُعد ہے جو مشرق و مغرب میں ہے اور جس کے لئے بعض انگریز مفکرین کا یہ مقولہ ضرب المثل بن گیا ہے کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب یہ دونوں کبھی نہیں مل سکتے"!

ایلوپیتھی کے برخلاف یونانی طب میں ادویہ کے مزاج کا زرّیں اصول موجود ہے یونانی اطبا آنکھ بند کر کے ایک ہی لکڑی سے سب کو ہانکنے کے عادی نہیں ہیں وہ علاج کو ایلوپیتھی کی طرح صرف گرم دواؤں پر منحصر نہیں رکھتے بلکہ حسب ضرورت تفریح، تقویت، تبرید اور ترطیب کا بھی پورا لحاظ رکھتے ہیں ہر شخص کے ذاتی حالات اور مزاج کے لحاظ سے نسخہ مرتب کرتے ہیں اور ادویہ کے استعمال میں ان کے مصلحات کا بہت زیادہ خیال رکھا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے نتائج علاج عموماً نہایت بے ضرر ہوتے ہیں ایلوپیتھی کی طرح یہ نہیں ہوتا کہ مریض ایک بیماری سے نجات حاصل کرنے کے بعد کسی دوسرے مرض کا شکار بن جائے اور "درد دل جاتا رہا درد جگر پیدا ہوا" کا مصداق ہو۔

اس کے علاوہ اقتصادی حالات اور معاشی امور کے نقطۂ نظر سے بھی یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ ایلوپیتھی ہمارے درد کا درماں نہیں بن سکتی۔ ایلوپیتھک دوائیں عام طور پر بہت گراں ہیں۔ انجکشن کی ادویہ جتنی مہنگی ملتی ہیں اس سے کون واقف نہ ہوگا۔ ڈاکٹر صاحبان کا عام معمول ہو گیا ہے کہ وہ بات بات میں انجکشن تجویز کرتے ہیں خواہ اس کی شدید ضرورت ہو یا نہ ہو۔ پھر انجکشن کی دواؤں ہی پر موقوف نہیں بہت سی عام ادویہ بھی مقابلتہً بے حد گراں ہیں مثلاً ٹائیفائڈ بخار کا کورس یا اور دوسرے امراض کی دوائیں جن کی مجموعی قیمت سینکڑوں تک جا پہنچتی ہے ہمارے عوام میں ہرگز اتنی قوت خرید نہیں ہے کہ وہ سخت معاشی الجھن میں مبتلا ہوئے بغیر ایلوپیتھک علاج کے ہفت خواں کو طے کر سکیں۔ اسی طرح ان دواؤں کے لوازم دودھ، مکھن، انڈے، تازہ پھل یا ایسی ہی دوسری چیزیں مہیا کرنا ادنیٰ درجے کا شخص تو کیا ایک اوسط درجے کا شخص بھی خوشی سے گوارا نہیں کرتا مجبوری کی بات اور ہے۔ اس کے مقابلے میں یونانی ادویہ کافی ارزاں اور معتدل قسم کی ہوتی ہیں۔ ان کے دوران استعمال میں طبیب قیمتی غذاؤں کا مشورہ دینے پر مجبور نہیں ہوتا۔ اس کی تجویز کی ہوئی سستی غذائیں بھی مریض کے لئے خاصی مفید اور موثر ثابت ہوتی ہیں۔ اس اعتبار سے ایلوپیتھی صرف خواص اور دولت مند طبقے ہی کی طب کہی جا سکتی ہے۔ عوام اور غریبوں سے اس کا کوئی رشتہ اور جوڑ نہیں۔ یونانی طب کا فیضان عوام اور خواص دونوں کے لئے یکساں ہے وہ جہاں امراء کے لئے بیش قیمت مرکبات رکھتی ہے وہیں غربا کے لئے نہایت کم قیمت مفرد و مرکب دوائیں بھی اس کے خزانۂ معلومات میں بھری پڑی ہیں جن سے چند ٹکوں میں روپیوں اور اشرفیوں کے فائدے حاصل کئے جاتے ہیں۔

طب یونانی میں عام طور سے وہی ادویہ استعمال کی جاتی ہیں جو خود ہمارے ہی ملک میں پیدا ہوتی ہیں اور اسی لئے ان میں اور مریض کی طبیعت و مزاج میں موافقت اور مرض سے فاتحانہ جنگ کرنے کی خاطر خواہ صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ پھر یونانی دواسازی کا طریقہ اتنا سادہ ہے کہ ادویہ کی قوت اور ان کے جوہر حیات میں کسی قسم کی کمی نہیں آنے پاتی۔ جوشاندے، خیساندے اور تازہ تیار کئے ہوئے رس زیادہ استعمال کئے جاتے ہیں۔ جدید تحقیقات سے بھی ثابت ہے کہ اس طرح ان ادویہ میں بدن کو قوت پہنچانے والے تمام حیاتین موجود رہتے ہیں ان کے برخلاف ایلوپیتھک ادویہ پیچیدہ کیمیاوی طریقوں سے گزر کر تیار ہوتی ہیں اس لئے ان میں حیاتین کی مقدار کم ہو جاتی ہے۔

ایلوپیتھی میں عموماً تیز اور سمی اثر رکھنے والی دوائیں بکثرت استعمال ہوتی ہیں معمولی امراض بخار وغیرہ میں بھی آرسنک (سنکھیا)، اکونائٹ (میٹھا تیلیہ)، نکس وامیکا (کچلہ) جیسے مہلک زہر مصلحات کے بغیر بے تکلف کام میں لائے جاتے ہیں ایسی ادویہ کی مقدار خوراک بڑی اہمیت رکھتی ہے ذرا مقدار سے زیادہ دوا پہنچ جائے تو مریض کی جان خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں اور ہسپتالوں سے آئے دن جو رپورٹیں ملتی رہتی ہیں اور جن میں ایسے بے شمار بے بس ... (؟) ... اس کے ثبوت کے لئے کافی ہیں۔ یونانی ادویہ عموماً ہلکی اور غیر سمی ہوتی ہیں جن کا اثر گو مریض پر بعض اوقات دیر سے ہوتا ہے لیکن تیر بہدف نکلتا ہے اور فائدہ پائیدار ہوتا ہے ان کی مقدار اگر دوگنی کیا چوگنی بھی ہو جائے تو علی العموم مہلک ثابت نہیں ہوتی۔

ایلوپیتھک ادویہ کا ٹنکچر صرف اسپرٹ سے تیار کئے جاتے ہیں اور یونانی ادویہ شراب یا اسپرٹ سے عموماً پاک ہوتی ہیں۔ اسی لئے محتاط متشرع اشخاص ڈاکٹری ادویہ کے استعمال سے بہت پرہیز کرتے ہیں اور حتی المقدور ان کے مقابلے میں یونانی ادویہ کو ترجیح دیتے ہیں۔ ایلوپیتھک ادویہ کے استعمال سے شراب استعمال کرنے کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے جو جسم انسانی کے لئے نہایت مضر ہے۔

ڈاکٹروں کے لئے ایک بڑا طرۂ امتیاز یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ جدید ترین وسائل تشخیص سے واقف ہوتے ہیں، اس میں شک نہیں کہ یہ آلات عوام کو مرعوب کرنے کے لئے تو مفید ہوتے ہیں لیکن ان سے جو توقعات وابستہ کر لی جاتی ہیں۔ وہ ہمیشہ قطعی اور یقینی ثابت نہیں ہوتیں۔ بارہا ان کے ذریعے سے بھی تشخیص میں غلطیاں اور علاج میں نقصانات ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک بڑی خرابی یہ پیدا ہوگئی ہے کہ ایلوپیتھی کے ماہرین نظری طریقوں کو چھوڑ کر آلاتی تشخیص کے عادی ہو گئے ہیں۔ اب وہ معمولی سے معمولی امراض کی تشخیص کے لئے بھی آلات کا سہارا ڈھونڈتے ہیں۔ جن کا انتظام ہر جگہ ممکن نہیں ہوتا۔ خصوصاً دیہات و مضافات میں جہاں نہ بجلی ہوتی ہے نہ بڑے پیمانے پر دوسری ضروری آلات کی فراہمی کا امکان ہوتا ہے۔

ان کے برخلاف یونانی اطبا کے یہاں آلاتی تشخیص کا سرے سے کوئی وجود نہیں ہوتا۔ وہ انسانی حواس کی تربیت پر پورا زور صرف کرتے ہیں۔ اور دماغی قوتوں کو ابھار کر ان سے کام لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ذرا ذرا سی بات میں آلات کی پناہ نہیں لیتے۔ جس سے مریض کی اندرونی کیفیات اور اثرات کا علم قطعاً نہیں ہو سکتا۔ مصنوعی آلات انسان کے تربیت یافتہ شعور کی ہمہ گیری اور بے پایاں وسعت کا مقابلہ کبھی نہیں کر سکتے۔ یونانی اطبا کے یہاں نبض اور حدس و قیاس، معائنہ جلد و بشرہ و قارورہ وغیرہ کے ذریعے مرض کی تشخیص کے جو آسان طریقے معمول و مروج ہیں ڈاکٹروں میں انہی کے لئے بڑے بڑے پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں جس کام کو ڈاکٹر خاصی دقتوں کے بعد سرانجام دیتے ہیں اسی کو اطبا مقابلۃً کافی سہولت سے کر لیتے ہیں۔ انہیں تشخیص مرض کے لئے خواہی نخواہی آلات کی محتاجی نہیں ہوتی۔ وہ اگر اپنے فن میں ماہر ہیں تو ایک چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں بھی اسی آسانی سے مرض کو پہچان سکتے ہیں جس آسانی سے بڑے سے بڑے شہر میں پہچان سکتے ہیں۔

رہا ڈاکٹر صاحبان کا یہ دعوے کہ وہ میڈیکل سائنس اور سرجری میں بڑے کامل ہوتے ہیں تو اس حقیقت کی روشنی میں یہ دعوے بھی کوئی زیادہ وقیع نہیں رہتا۔ کہ اب طبیہ کالجوں میں جو کورس پڑھایا جاتا ہے۔ وہ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کے نصاب سے کسی طرح کم نہیں ہوتا۔ آج کل کے فارغ التحصیل اطبا، طب قدیم و جدید کے تمام موضوعات سے واقف ہوتے ہیں۔ انہیں تشریح پر بھی عبور ہوتا ہے۔ اور جراحیات پر بھی۔ وہ نظریات طب کے علاوہ معالجات میں بھی طب یونانی اور ڈاکٹروں دونوں طریقوں سے بہرہ مند ہوتے ہیں اس لئے حقیقت بین نگاہ سے دیکھا جائے۔ تو ایک معیاری طبیہ کالج کے فارغ التحصیل کو ایک ایم۔ بی۔ بی۔ ایس پر متعدد وجوہ سے ترجیح حاصل ہوگی۔ آخر الذکر کی نظر صرف ڈاکٹری کے دائرے میں محدود رہتی ہے۔ اور یونانی طبیب جہاں اپنے سرمائے سے استفادہ کرتا ہے دوسروں کے علمی خزانوں سے بھی فائدہ اٹھانے میں غافل نہیں رہتا۔

یہ چند دلائل ہیں جو طب یونانی یا اسلامی کی تائید میں سرسری فکر کے بلا پیش کر دئے گئے۔ عمیق غور و فکر کے بعد دوسرے وجوہ ترجیح بھی بیان کئے جا سکتے ہیں۔ مگر اب ان پر زیادہ وقت صرف کرنے کی بجائے اتنا کہنے پر اکتفا کی جاتی ہے۔ کہ طب یونانی ہی وہ طریق علاج ہے جو پاکستان میں بسنے والوں کے لئے نہایت موزوں اور نفع بخش ہے۔ رہیں خامیاں تو وہ کچھ نہ کچھ ہر فن میں موجود ہوتی ہیں۔ ایلوپیتھی کا دامن بھی کب بے داغ ہے۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ متعدد وجوہ سے مقابلہ کیا جائے تو بے لاگ رائے کی نظر میں طب یونانی ہی برتری کی حق دار ثابت ہوتی ہے۔ ہماری حکومت حق گزاری اور خلوص کے جذبے سے کام لے کر اس کی سرپرستی کرے تو یہی فن جو ناقدرشناسی کی بدولت کسمپرسی کا شکار ہے۔ کل اپنی آب و تاب سے دنیا کی نگاہوں کو خیرہ کر سکتا ہے۔

فیض روح القدس ار باز مدد فرمائید ٭ دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا می کرد

جدید تحقیقات کی حقیقت

یہاں تک پہنچکر اس کا شدت سے احساس ہونے لگا ہے کہ مضمون نے خاصی طوالت اختیار کر لی ہے، اس لئے بعض اہم موضوع پر بھی قلم اٹھانا گراں ہو گیا ہے۔ جن جدید تحقیقات کا آج شہرہ ہے اور جن کی وجہ سے ملک کے نادان ڈاکٹر بدیسی طب اور دواؤں کے مداح ہیں۔ اور گھریلو جڑی بوٹیوں کے نام پر ناک بھوں چڑھانے کو عین ثواب

سمجھتے ہیں قطعی طور پر اور مسلمہ طور پر اطبائے عرب کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ جن کو یورپ نے شرمناک طور پر اپنا لیا ہے۔ طب اور تاریخ طب پر گہری نگاہ ڈالنے والوں نے ایسی صدہا مثالیں پیش کر دی ہیں۔ اور پھر یورپ کے تعصبات کی بھی بڑی گھناؤنی مثالیں ملتی ہیں۔ اس وقت صرف ایک مثال سُن لیجئے۔ اور میری زبانی نہیں جرمنی کے ہیرشن برگ کی زبانی سنئے۔

"قسطنطین افریقی، (پرنسپل میڈیکل کالج۔ سلرنو۔ اٹلی) کی لاطینی کتاب د لاطینی زبان اس زمانے میں علمی زبان تھی، جو اس وقت یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہے۔ وہ دراصل حنین بن اسحاق کی عربی کتاب العشر فی المقالات العین کا حرف بحرف ترجمہ ہے، جس میں دسویں مقالہ کے ابتدائی اجزاء حذف کر دیئے گئے ہیں۔ جہاں حنین نے اس کتاب کی وجہ تصنیف کا تذکرہ کیا ہے۔ اور جس سے اس کتاب کی تاریخ کا سراغ لگایا جا سکتا ہے"!

دیکھ لیا آپ نے! اس قسم کی صدہا مثالیں میں پیش کر سکتا ہوں۔ حنین بن اسحٰق کی اس کتاب (العشر مقالات فی العین) وہ کتاب ہے جس سے تاریخ علم العین کی ابتدا ہوتی ہے!

یورپی تعصب کی اگر مثالیں میں لکھنی شروع کر دوں تو سینکڑوں صفحے تیار ہو جائیں گے۔ پھر بھی تشریح کی مشہور کتاب گریز اناٹمی جو ایلوپیتھی کے کورس کا ضروری جزو ہے کے مختلف ایڈیشن سامنے رکھ لیجئے۔ پرانے ایڈیشنوں میں اعضائے بدن کے بکثرت ایسے نام ملیں گے جو اطبائے قدیم کے ناموں سے منسوب ہیں۔ مثلاً (ڈی جالینوس) (گیلنز دین)، [جس سے یہ ثابت ہو رہا ہے۔ کہ اطبائے قدیم نے سرجری پر بیش بہا کام انجام دیئے ہیں] لیکن آخری ایڈیشنوں میں سے ان ناموں کو خارج کر دیا گیا ہے۔

بہرحال طوالت کے خوف سے اس باب کو یہیں ختم کر دینا مناسب ہے۔ کسی دوسری صحبت میں انشاء اللہ اس موضوع پر تفصیل سے لکھا جائے گا۔

طب یونانی سے سرکاری غفلت اور ملک کی صحت پر اس کے اثرات

جیسا کہ پچھلے صفحات میں میں نے لکھا ہے، ہمارے ملک میں انواع و اقسام کی جڑی بوٹیاں پیدا ہوتی ہیں، جن میں شفائے امراض کے خزانے ہوتے ہیں، افسوس ہے کہ ہم ان سے کام نہیں لیتے اور یہ پیدا ہو کر اپنا مقصد پورا کئے بغیر ختم ہو جاتی ہیں۔ اگر ہمارے سامنے کوئی واضح پروگرام ہو ہمارے پاس ایسے ادارے ہوں جو ان بوٹیوں کا کھوج لگائیں اور ان کو جمع کریں، ان نئی بوٹیوں پر تحقیق و تجربات کریں تو امراض کی بہت خود کشی سے ہو سکتی ہے۔ لیکن جس حکومت کو سرے سے دیسی طب سے بیر ہو اس کا کیا کیا جائے۔ اور پھر آپ جانتے ہیں کہ یہ کام سر کھپانے کے ہیں، زحمت گوارا کرنے کے ہیں، دردسر کے ہیں۔ آرام پسند لوگ آخر اس دردسر کو کیوں مول لیں؟

ملکی جڑی بوٹیوں سے فائدہ اٹھانے والے صرف حکما اور اطباء ہیں، جو بلاشبہ اپنے طور پر ملک کی ناقابل فراموش خدمات انجام دے رہے ہیں! لیکن ان کی یہ کوششیں انفرادی اور شخصی ہیں۔ ان ہی اطباء سے جو کثیر تعداد میں ملک کے حصے حصے میں پھیلے ہوئے ہیں، حکومت کام لے تو مریضوں کو امراض کے چنگل سے نکالنے میں بے حد مدد مل سکتی ہے۔ لیکن حکومت ایسا نہیں کرتی۔ حکومت کو یہ منظور ہے کہ معالجاتی سہولتیں نہ ملنے کی وجہ سے ملک میں کم و بیش سولہ لاکھ انسان ہر سال مر جائیں، لیکن طب یونانی کی سرکاری سرپرستی منظور نہیں ہے کتنی عجیب بات ہے! سمجھ میں نہ آنے والی بات!

صرف ڈیفنس کے معاملات پر غور کرنے والی حکومت ایک لمحہ کے لئے یہ نہیں سوچتی کہ لڑائی ہو جانے کی صورت میں اسے دوائیں کہاں سے ملیں گی۔ کون نہیں جانتا کہ انگریزی دواؤں کے معاملے میں پاکستان کلی طور پر مالک غیر کا محتاج ہے۔ اور اس ملک میں دوا سازی کا اس وقت کوئی بھی مکمل ادارہ نہیں ہے۔ جنگی حالات میں دوائیں کہاں سے آئیں گی؟

آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے پاکستان میں کیمسٹس اور انگریزی دوا فروش کم و بیش ۵۰ فی صدی جعلی اور ملاوٹی دوائیں فروخت کرتے ہیں۔

حکومت خود ایسے کاغذات کا جائزہ لے کر سنہ ۱۹۴۹ء میں دو کروڑ ۵۰ لاکھ، سنہ ۱۹۵۰ء میں دو کروڑ ۵۰ لاکھ اور سنہ ۱۹۵۱ء میں دو کروڑ ۹ لاکھ روپے کی جو ولایتی دوائیں اس نے درآمد کرنے کی اجازت دی ہے۔ کیا اس میں حیاتین اور حیاتین آمیز دواؤں کا بڑا حصہ نہیں ہے؟ اور باقی حصہ پینسلین اسٹریپٹو مائی سین اور سلفا ڈرگس کا نہیں ہے؟

کیا ہمارے ملک میں حیاتین سازی کا کوئی کارخانہ ہے؟ کیا اسٹریپٹو مائی سین اور پینی سلین اور سلفا گروپ کی دوائیں تیار کرنے کا پاکستان میں کوئی انتظام ہے؟ ظاہر ہے کہ ان سوالات کا جواب صرف ایک نفی میں ہے۔

اس سے آگے بڑھ کر میں یہ سوال کرتا ہوں کہ کیا مذکورہ بالا دوائیں بالکل شافی ہیں؟ کیا تم نہیں دیکھتے کہ ان کی شفابخشی یقینی نہیں ہے؟ کیا تم نے تجربہ نہیں کیا ہے کہ اسٹریپٹو مائی سین کے باوجود دق کے مریضوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے اور مرض کی حالتوں میں بھی یہ دوا کوئی یقینی علاج نہیں ہے؟ تمہارا حافظہ اگر ساتھ دے تو سوچو اس دوا کے بازار میں آنے سے پہلے اس کے بارے میں کیا کیا کہا گیا تھا۔ کیا یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ دق وسل کا یہ حتمی علاج ہے؟ اس کے بعد کیا اب تم یہ نہیں سن رہے ہو کہ ایک "ونڈر ڈرگ" تیار ہو کر آ رہی ہے۔

میں اقرار کرتا ہوں کہ مغرب نے طب کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ آج مغربی طب اور مغربی اطباء کا دائرہ عمل بہت وسیع ہے۔ دوا سازی نے پچھلا ریکارڈ مات کر دیا ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود علم و فن طب کا اصل مقصد یعنی دفع امراض اور حفظ صحت کیا ان ترقیوں سے پورا ہو گیا ہے؟ کیا دنیا سے امراض کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے میں کامیابی حاصل ہو گئی ہے؟ اور کیا انسان پرانے امراض کے علاوہ نئے نئے امراض کا شکار نہیں ہو رہا ہے؟ کیا سرطان، دق وسل اور جذام کا شافی علاج معلوم کر لیا گیا ہے؟ کیا عملیات جراحی کی فراوانی نے خود جراحی کے خلاف آواز پیدا نہیں کر دی ہے؟ اور کیا یہ طب سمی اور قوی الاثر دواؤں کا بے دھڑک استعمال کر کے انسانی جسم کی قوت مدافعت کو ہمیشہ کے لئے بے یار و مددگار نہیں چھوڑ رہی ہے؟ کیا خود اس کی وسعت ان علمبرداروں کے لئے ابتلا نہیں بن رہی ہے؟ کیا غیر ضروری تخصص نے عوام کا ناک میں دم نہیں کر رکھا ہے؟ کیا اس طب کے شاہانہ اخراجات نے حکومتوں کی کمریں نہیں توڑ رکھی ہیں؟ اور سب سے آخر میں اس طب کو مشرق سے جو حسن لطافت، جذبۂ ہمدردی اور "روحانیت" کا ورثہ ملا تھا۔ کیا وہ ان سب کو اپنی "مادیت" اور ظاہری حسن کے پیچھے لٹا نہیں چکی ہے؟

اگر طب مغربی کے ساتھ یہ تمام حقائق موجود ہیں۔ اور ان کی موجودگی میں شبہ ہی کیسے ہو سکتا ہے، تو کیا یہ لازمی نہیں ہے کہ ہماری حکومت کو اپنی آئندہ صحی اور طبی تنظیم میں نہایت غور و احتیاط کی ضرورت ہے؟

اطباء سے

میں اوپر جو کچھ کہہ چکا ہوں۔ اس سے ظاہر ہے کہ پاکستان میں اپنی طبی، صحی اور علاجاتی تنظیم میں کس قدر حزم و احتیاط کی ضرورت ہے۔ ہمارا ملک گو نوزائیدہ ہے لیکن ہماری ملت نئی نہیں ہے۔ ہم اپنی پچھلی عظیم الشان روایات رکھتے ہیں۔ اس لئے یہ ممکن ہے اور نہ مناسب کہ ہم ان روایات کو چھوڑ دیں۔ خصوصاً اس صورت میں جبکہ "تجدد" کے پاس بھی ہمارے درد کا مداوا نہیں ہے۔ طب مغربی کو ہمارے مسائل تنظیم طبی پر آزما لیا گیا ہے۔ اور اس کے نتائج بھی ہمارے سامنے ہیں۔ طب قدیم بھی گزشتہ حکومت کے ڈیڑھ سو سالہ تغافل بلکہ اس کی کاری ضربوں کے باوجود اب جس حالت میں ہے اس سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ ان عظیم ذمہ داریوں کو فی الحال سنبھال لے گی۔ جو کسی ترقی پسند حکومت کی تنظیم امداد طبی و صحی سے متعلق ہوں۔ البتہ یہ ضرور صحیح ہے کہ ہمارے طب میں یہ صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ کہ اگر حالات سازگار ہوں تو وہ دیگر رائج اور گزشتہ طبوں کے مقابلے میں زیادہ زمانہ کا ساتھ دے سکتی ہے۔ اس کی یہی وہ صلاحیت ہے جو اس کو اب تک زندہ رکھے ہوئے ہے اور یہی صلاحیت اس کے روشن مستقبل کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

میرے اوپر کے چند لفظوں سے اگر آپ کے جذبۂ تفاخر کو کوئی صدمہ پہنچا ہو۔ تو اس کے لئے مجھے معاف فرمائیے۔ تفاخر بدم سلطان بود

نعروں اور ہنگاموں کا زمانہ اب ختم ہو گیا۔ اب ہمیں ٹھوس حقیقتوں سے واسطہ ہے۔ پہلے اگر ہم ان حقیقتوں کو کسی وجہ سے نظر انداز کر کے گاہے گاہے ہنگامہ خیز باتیں کر لیا کرتے تھے تو غیر ملکی حکومت میں وہ کھپ جاتی تھیں، لیکن اب حکومت بھی اپنی ہے اور حاکم بھی اپنے ہیں۔ ان کے سامنے ہمارے عیب و ہنر بڑی حد تک آشکارا ہیں۔ اگر ہم اپنی خامیاں عارضی طور پر چھپانے میں کامیاب بھی ہو گئے تو آخر کب تک؟ اس لئے صاف اور سیدھا راستہ یہی ہے کہ اپنی خامیوں کو محسوس کر کے ان کو دور کرنے کی جد و جہد کی جائے، اور اپنی حکومت سے اس جد و جہد میں امداد کی درخواست کی جائے۔

ہم آزاد مملکت کے آزاد شہری ہیں۔ آزادی کے بعد جہاں ہم کو یہ اختیار ہے کہ حکومت پر تنقید کریں اور اس کی غلطیاں اس پر واضح کریں۔ وہاں ہم پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ حکومت کی مشکلات کو سمجھیں۔ اور ان مشکلات کو حل کرنے میں اس کی مدد کریں۔ ہماری حکومت اس وقت تنظیم امداد صحی و طبی کے پیچیدہ مسئلہ کے مناسب حل کی تلاش میں ہے۔ ایک طرف اگر اسے مغربی طب کی بعض خوبیاں نظر آ رہی ہیں۔ تو دوسری طرف طب یونانی کی بعض خصوصیات کو بھی وہ نظر انداز نہیں کر سکتی۔ ایک طرف اگر اسے تنظیم امداد صحی و طبی کے معاملہ میں بین الاقوامی ذمہ داریوں کا خیال ہے تو دوسری طرف اسے اپنے تمام متعلقہ عناصر کے واجبی حقوق کی نگہداشت کرنی ہے۔ پھر ایک طرف اگر اسے اپنی تنظیم کو اعلا اور بہتر بنانے کا خیال ہے تو دوسری طرف اقتصادی حالت کو بھی سامنے رکھنا ہے۔ غرض یہ اور اس قسم کی دشواریاں ہیں جو حکومت کے فیصلہ میں تعویق پیدا کر رہی ہیں۔ متحدہ پاکستان میں بھی تنظیم امداد طبی و صحی کا مسئلہ اس شکل میں موجود تھا۔ اس وقت بھی باوجود وسیع اقتصادی ذرائع اس بات کو ناممکن سمجھا گیا تھا۔ کہ حکومت اپنی تنظیم طبی میں ہر طریقۂ علاج کا خیال رکھے۔ اور سب کے لئے الگ الگ بندوبست کرے۔ اس لئے برعظیم کی انٹیرم حکومت کے وزیر صحت راجہ غضنفر علی خاں نے ایک کمیٹی سر رام ناتھ چوپڑا کی صدارت میں بنائی تھی۔ اس کمیٹی نے قدیم طب کی موجودہ حالت کا اچھا جائزہ لیا ہے اور حکومت کو تنظیم طبی میں ان طبوں سے فائدہ اٹھانے کے متعلق معقول سفارشات کی ہیں۔ اور سب طریقوں کو ملا کر ایک کر دینے کے مسئلے پر بہت چھان بین کی ہے۔ اور اس کے بعد یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ایسا کرنا نہ صرف ممکن ہے بلکہ قابل عمل بھی ہے۔

مجھے معلوم ہے کہ سب طریقہ ہائے علاج کے اختلاط و امتزاج کے معاملہ پر ہم میں دو مختلف رائیں کا اظہار کیا گیا ہے۔ اکثر اصحاب اس کے حق میں ہیں، اور بعض اس کے خلاف رائے رکھتے ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جن اصحاب نے مخالف خیالات ظاہر فرمائے ہیں، انہوں نے مسئلہ تنظیم طبی کے مختلف پہلوؤں پر منفرداً اور پھر مجموعی حیثیت سے غور نہیں کیا ہے۔ میں نے اس مضمون میں مسئلۂ تنظیم طبی پر ضروری اشارات لکھے ہیں، ان کے علاوہ بھی میں اس وقت یہ صاف صاف کہوں گا کہ یہ امتزاج و اختلاط کا راستہ قدیم طب کے لئے خطرہ سے خالی نہیں ہے، لیکن اس کے ساتھ میں یہ بھی دریافت کروں گا کہ پھر دوسرا راستہ ہی کونسا ہے؟ کیا ہم میں اپنے علم و فن کو حکومت کی امداد کے بغیر ترقی دینے کی سکت ہے؟ اور کیا حکومت کے اقتصادی حالات اس کی اجازت دیں گے کہ وہ مختلف طریقہ ہائے علاج کے دعووں کو تسلیم کر کے سب کے لئے علیحدہ علیحدہ اداروں، کالجوں، شفاخانوں اور ڈسپنسریوں کا بندوبست کرے؟ دونوں ہی سوالوں کا جواب ظاہر ہے نفی میں ہے۔ ایسی حالت میں ہم کو اختلاط و امتزاج کا "ایروندانہ" فیصلہ کرنا ہی پڑے گا۔ مجھے اس فیصلہ کو قبول کرنے میں ذرا بھی جھجک نہیں ہے۔ اس لئے کہ میرا یقین ہے کہ اس مقابلہ کے میدان میں ہماری طب یونانی فتح یاب نکلے گی اور ہم اپنے فن اپنے عوام اور اپنی حکومت کے لئے زیادہ مفید اور زیادہ کار آمد بن کر نکلیں گے۔

حکومت سے اب میں مسئلہ تنظیم طبی و صحی کے متعلق اپنی حکومت سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اسے اب اس مسئلہ کے متعلق گو مگو کی پالیسی کو ختم کر کے جرأت مندانہ فیصلہ کر لینا چاہیئے۔ جب ہماری حکومت نظم مملکت کے بہت سے مسائل میں اپنا خاص زاویۂ نگاہ رکھتی ہے۔ اور اقتصادی معاملات میں وہ دنیا میں کسی کی پروا کئے بغیر ایسا فیصلہ صادر کر سکتی ہے جو ملک کے لئے اس کے خیال میں مفید ہو تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ تنظیم طبی کے مسئلہ میں بھی ایسا فیصلہ نہ کرے جو ملک کی حقیقی ضروریات کی کفالت کر سکتا ہو۔ اور اپنے میں جرأت

و تازگی بھی رکھتا ہو۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ موجودہ فرسودہ تنظیم سے پاکستان جیسی مملکت سے توقع و امید مملکت کی طبی اور صحی ضروریات پوری نہیں ہو سکتیں تنظیم صحت کے مسائل بہت پیچیدہ ہیں۔ لیکن ان پیچیدگیوں ہی سے صحیح اور صاف راہ عمل نکل آتی ہے آج کوئی ملک اپنی تنظیم کی طرف Curative side کو لے کر مہذب نہیں کہلا سکتا۔ تنظیم کے Preventive side کی اہمیت کو اس حد تک تسلیم کر لیا گیا ہے کہ صحت کے بجٹ کا بڑا حصہ اسی پر صرف کیا جا رہا ہے۔ غرض یہ اور اسی قسم کی دوسری باتیں ہیں جو تنظیم طبی و صحی کے اصول موضوعہ میں شامل ہو چکی ہیں اور کسی ترقی پسند ملک کو ان سے کنارہ کش ہو کر نکلنا نہ صرف غیر ممکن بلکہ مضر بھی ہے۔

میری تجویز ہے کہ پاکستان کی وزارت صحت کو اپنے ملک کے بہترین اصحاب فن پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کرنی چاہیئے۔ جو دنیا کے تمام مہذب ممالک کی تنظیم طبی کا گہرا مطالعہ کرے اور اس مطالعہ کی روشنی میں اپنے ملک کی مختلف طبی و تنظیمی مسائل کا مناسب حل تجویز کرے اور مرکز اور صوبجاتی تعلق کو اس طور پر واضح کرے کہ تنظیم میں جھول باقی نہ رہے۔ اس کمیٹی کی ایک سب کمیٹی چوپڑا کمیٹی کی سفارشات کو سامنے رکھ کر یہ غور کرے کہ آئندہ دیسی طبوں کو حکومتی تنظیم میں کس طرح شامل کیا جائے۔ دیسی طبوں کے موجودہ تعلیمی اداروں کے معیار کس طرح بڑھایا جائے اور مزید تعلیمی ادارے کس اصول پر قائم کئے جائیں اور مغربی طب کے موجودہ تعلیمی اداروں میں قدیم طب کی ضروری تعلیم کس طرح دی جائے اور دیسی طبوں کا ایک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ جلد سے جلد کس طرح قائم کیا جائے۔ یہ اور دوسرے متعلقہ مسائل پر یہ سب کمیٹی غور کر کے ایک پنج سالہ پروگرام کی شکل میں حکومت کے سامنے رکھے۔

میری دوسری تجویز یہ ہے۔ کہ مرکزی حکومت کی وزارت صحت کو بہت جلد ایک بورڈ بنام "پاکستان میڈیکل بورڈ" بنانا چاہیئے۔ اس بورڈ کی دو خود مختار کونسلیں ہوں۔ ایک مغربی طب کی کونسل اور دوسری مشرقی طب کی کونسل۔ یہ بورڈ اور اس کی کونسلیں موجودہ تنظیمی معاملات کو سلجھاتی رہیں۔ اور جب مجوزہ ری آرگنائزیشن کمیٹی اپنی مفصل رپورٹ دے دے تو مناسب رد و بدل کی اگر ضرورت ہو تو کر دیا جائے۔

تعلیمی حالت کا جائزہ
بقیہ صفحہ ۲۶۱

کے دوسرے پہلوؤں میں اپنی مرضی کو پورا کرنے کی مہلت مل گئی ہے۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر وہ موجودہ نظام تعلیم کے ذریعے آئندہ نسلوں کو اپنا ہم خیال اور ہم نوا بنانے کی سر توڑ کوشش کر رہے ہیں۔ یہاں ان پر تنقید کر کے بے راہ روی سے روکنے والا کوئی نہیں اسلئے انہیں آزادی سے اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کا موقع مل گیا ہے۔ مگر اس سلسلہ میں وہ ایک احتیاط برت رہے ہیں اور وہ یہ ہے کہ عوام الناس کے لئے تحصیل علم کو زیادہ مشکل بنا رہے ہیں تاکہ صرف ایک محدود اور مخصوص طبقہ تعلیم سے فیض یاب ہو سکے اور اس مملکت کی حکومت اسی محدود اور مخصوص طبقے کی میراث بن کر رہ جائے۔

عذر ہائے پیرو دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

بقیہ معاشی بحران صفحہ ۲۸۰

ممالک سے ہے اس لئے وہ اپنی مانگ کو کم کر کے ہماری خام اجناس کی قیمتوں کو گرانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

ان حالات میں حکومت کو چاہیئے کہ اپنی تجارتی پالیسی کو ملک کے مفاد کے مطابق کرے پھر تمام حالات کا جائزہ لے اور اس سلسلہ میں سرکاری اور غیر سرکاری تمام تجاویز پر دیانتداری کے ساتھ غور و فکر کر کے ملک کے معاشی حالات کے مطابق ایک مکمل اور ہمہ گیر معاشی منصوبہ تیار کرے جس میں حالات اور وقت کے تقاضوں کو پیش نظر رکھا گیا ہو تاکہ لوگوں کی تمام ضروریات پوری ہو سکیں۔ ورنہ معاشی بحران بڑے خطرناک ہوا کرتے ہیں کیونکہ ان سے لوگوں میں بے چینی اور بد دلی پھیل جاتی ہے اور یہ چیز ہر معاشرہ کے لیے قاتل ثابت ہوا کرتی ہے۔

مسئلۂ کشمیر

منظور احمد

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر
آہ یہ قومِ نجیب و چرب دست و تر دماغ
ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیر گیر

دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا مسئلہ پیدا ہوا ہو جو پوری ایک صدی گذرنے پر بھی اتنا اہم رہ گیا ہو جتنا کہ مسئلہ کشمیر ہے (واضح رہے کہ مسئلہ کشمیر کو انگریز کی وفات نے ۱۸۴۶ء میں پیدا کیا تھا اور پھر پوری ایک صدی بعد ۱۹۴۷ء میں اس کی ناپاک سیاست ہی نے اس مسئلہ کو موجودہ شکل دی) پچھلے پانچ سال میں اس مسئلہ پر پاکستان کے اندر اور باہر اتنا کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے کہ اس کی اصلیت اور حقیقت سب پر واضح ہو چکی ہے۔ مسلمانانِ پاکستان اس مسئلہ کو دینی اور دنیوی دونوں ہی حیثیت سے غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں۔ کشمیر کے ساتھ اُن کا ایک شدید تاریخی اور روایتی تعلق ہے۔ پھر اس تعلق کی آبیاری وہ نفسیات و جذبات ملی کر رہے ہیں جن کا ادنےٰ کرشمہ تقسیمِ ہند تھا۔ اس جذبۂ عظیم کو سرد کرنے کی اپنوں اور اغیار نے اب تک کافی کوشش کی ہے اور کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کشمیر کو بھول گئے، لیکن یہ جذبہ کسی وقت بھی بھڑک کر اس ناپاک سازش کو پھونک سکتا ہے جو اغیار نے اپنوں سے مل کر کی ہے اور جس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان اس حل کو قبول کر لیں جو اُن کی سیاست اور ہمارے حکمرانوں کی غفلت نے اپنی اپنی مصلحتوں کی خاطر تیار کیا ہے۔ اس مضمون میں ہم پچھلی باتوں کو خواہ مخواہ دہرانا نہیں چاہتے ہیں بلکہ اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر ایک گہری نظر ڈالتے ہوئے اس مقام پر پہنچنا چاہتے ہیں جہاں اس مسئلہ کو لا کھڑا کیا گیا ہے اور پھر اس کے بعد وہ "رندانہ" حل بھی پیش کرنے کی جرأت کریں گے۔ جس کے بغیر اس مسئلہ کی گرہ کشائی ممکن نہیں۔

۱۸۴۶ء سے ۱۹۴۷ء تک

دیارِ ہند میں مسلمانوں کے سیاسی زوال کے بالکل آخری دور ۱۸۴۶ء میں رسوائے عالم ایسٹ انڈیا کمپنی نے مسلم کشمیر کو ایک ڈوگرا راجپوت کے ہاتھوں ۷۵ لاکھ کی حقیر رقم میں نیلام کر ڈالا۔ تاجرانِ فرنگ کی اس کمینگی اور احسان فراموشی کے خلاف اس وقت کی ملت مجبور نے ۱۸۵۰ء میں ایک مسلح احتجاج کیا۔ اس کی ناکامی پر سارا مسلم ہند انگریز کے جبر و استبداد کے آہنی شکنجوں میں جکڑ دیا گیا اس کے بعد کشمیر اور اہلِ کشمیر پر جو کچھ گذری وہ ظلم و جور کی ایک لمبی داستان ہے نصف صدی گذرنے پر بھی جب کبھی ۱۸۴۶ء کے اس سانحہ کی یاد آئی تو قلبِ ملت تڑپا اور یوں فریاد کناں ہوا:۔

دہقاں و کشت و جوئے و خیاباں فروختند   قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند   (اقبال)

جنگ عظیم ۱۹۱۴ء کے بعد جب دنیا نے ایک نئی کروٹ لی تو برعظیم ہند میں بھی بیداری کی ایک لہر دوڑی۔ کاشمیری مسلمانوں کے احساسات بھی جاگ اُٹھے اور وہ ڈوگرا گردی کے خلاف صف آرا ہونے کے لئے منظم ہونے لگے۔ ڈوگرا اقتدار پر وحشت طاری ہوئی اور ظلم کا نیا چکر چلنے لگا۔ کشمیر نے اس کا جواب جولائی ۱۹۳۱ء میں اپنے بیس فرزندوں کی شہادت کی شکل میں دیا۔ کشمیر کا "یوم شہداء" اسی واقعہ کی یادگار ہے۔ مسلم ہند اپنی غلامی و مجبوری کے باوجود اپنے دینی بھائیوں کی ہمدردی میں اُٹھ کھڑا ہوا اور تیس ہزار مسلمان کشمیر کی طرف دوڑ پڑے مگر غلاموں مجبوروں کی اس امداد سے محکوموں اور مظلوموں کا کیا بن سکتا تھا۔ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ مسلم کا مسئلہ جوں کا توں رہا۔ ادھر مسلم ہند کی آزادی کی تحریک کا آغاز ہوا اور مسلمانوں کی ساری توجہ قیام پاکستان پر مرتکز ہو گئی۔ ہم نے خیال کیا کہ مسلم ہند کی آزادی کے ساتھ ساتھ مسلم کشمیر کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ لیکن ؎

من درپئے رہائی و اُو ہر دم از فریب
بر سرِ گرہ زند گرۂ ناکشودہ را

اگرچہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو انگریزی غلامی کا دور ختم ہوا لیکن اس موقع پر بھی نہایت عیاری کے ساتھ ۱۸۴۶ء کی کشمیر فروشی کا ایک دوسرے انداز میں اعادہ کیا گیا ہے۔ ریڈ کلف کی مدد اور ماؤنٹ بیٹن کے اشارے پر گلاب سنگھ کی اولاد ہری سنگھ نے مسلم کشمیر کو ہندو بھارت کے ہاتھ بیچنے کی ایک ناپاک کوشش کی لیکن اس مرتبہ ملت اتنی مجبور نہ تھی اور اگر اس کے رہنما اتنے احمق اور بے غیرت نہ ہوتے تو اس ناپاک لین دین کا اسی وقت خاتمہ کیا جا سکتا تھا۔ پھر بھی پٹھانوں کی غیرت اور خود کاشمیریوں کی ہمت نے اس خفیہ منصوبہ کو پوری طرح عملی جامہ پہننے نہ دیا اور اس طرح یہ معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔

۱۹۴۷ء کے بعد اپنی اس سیاسی ناکامی پر ہندو بھارت تلملا گیا اور اہنسا و امن پسندی کے خود ساختہ اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر تمام آئینی حدود کو توڑتے ہوئے کشمیر پر حملہ آور ہو گیا اور ساتھ ہی حد درجے شری بے حیائی کے ساتھ اقوام متحدہ میں پاکستان کے خلاف مرافعہ بھی کر ڈالا۔ غضب یہ کہ آزادی کے بعد یہ پہلا مفسدانہ اقدام' اہنسا اور امن پسندی کے مہاتما کی دعاؤں کے ساتھ کیا گیا۔ بھارت کی اس دو طرفہ کارروائی کا جواب ہماری اپنی مجہول قیادت نے یہ دیا کہ خود تو آزادی کی رنگ رلیوں اور مال متروکہ کی لوٹ میں مشغول رہے اور سر ظفر اللہ خاں کو اقوام متحدہ میں مقدمہ کی پیروی کے لئے بھیج دیا۔ آں جناب نے، گھنٹہ تقریر کر کے اقوام متحدہ کا ریکارڈ توڑ دیا۔ دنیائے مغرب کے سیاسی فریب کاروں نے تعریفوں کا پل باندھ دیا اور ہماری کم ظرف قیادت اپنے حسن انتخاب پر لوٹ لوٹ گئی۔ لیکن دنیا کی تاریخ میں یہ حماقت اپنی مثال آپ ہے کہ قریب کے میدان جنگ میں فوجی کارروائی کا جواب دور اور بہت دور اقوام متحدہ کے ایوان میں ایک طول وطویل تقریر سے دیا گیا۔ بھارت کے اس چست راست اقدام کا جواب اپنی کمزور ڈپلومیسی سے دینے کے بعد ہماری قیادت اپنے اصلی کام میں مصروف ہو گئی۔ اُن کے نزدیک سب سے زیادہ اہم مسئلہ تو یہ تھا کہ ۱۹۴۷ء کے انقلاب نے محمد شاہ رنگیلے اور واجد علی شاہ کی اولاد اور جعفر و صادق کے جدید تاریخی نمونوں کو یکایک جو غوری کی عظمت اور بابر کی سطوت کا وارث بنا دیا تھا' اس مقام بلند کی محافظت کیونکر کی جائے اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ "حفاظت خود" ہر ذی حیات کا پہلا اصول حیات ہے۔ اسی اصول کے تحت ان لیڈر اور پلیڈر قسم کے لوگوں کو جب وزارت کی کرسی اور حکومت کا اقتدار حاصل ہوا تو سب سے پہلی فکر اُن کو یہی لاحق ہوئی کہ اتفاق زمانہ سے ہاتھ آئے ہوئے اس اقتدار کو قائم و دائم رکھنے کے لئے کیا تدبیریں کی جائیں اور ہر ممکن خطرہ سے اسے کیونکر بچایا جائے۔ اوّلین اہمیت اسی مسئلہ (Self Defence) کو تھی کشمیر کا مسئلہ بہرحال اس کے بعد کا تھا ہر چند کہ تو کشمیر ملک اور ملت کا اہم تھا نہیں تو نہ کشمیر پاکستان کا وجود ملک اور نہ ملت۔ اور یہ بھی آپ کچھ ڈھکی چھپی بات نہیں کہ اس وقت ان کے اقتدار کو حقیقی خطرہ کشمیر پر حملہ آور ہندوستانی فوج

سے نہیں تھا بلکہ مسلمانوں نے اس جذبہ اسلامی سے تھا جس کی انہوں نے گذشتہ دس سال آب یاری کی تھی اور جس سے اپیل کر کے انہوں نے مسلمانوں کو اس آگ اور خون کے سمندر میں کودنے پر آمادہ کیا تھا۔ جس کے نتیجہ میں پاکستان بنا اور جو اب قیام پاکستان کے بعد صرف ایک جذبہ نہیں تھا۔ بلکہ ایک جاندار تحریک کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ لہٰذا اس قیادت کی ساری توجہ اس بات پر صرف ہونے لگی کہ جس آگ کو خود بھڑکایا تھا اسے کیونکر ٹھنڈا کیا جائے ورنہ کہیں یہ ایوان اقتدار کو پھونک نہ دے اور اس ہمہ سالہ اسلامی تحریک کا گلا کیونکر گھونٹ دیا جائے جو اس آگ میں برابر ایندھن ڈالتی چلی جا رہی ہے۔ چنانچہ ایک سوچی سمجھی اسکیم اور منظم سازش کے تحت اس بزدل قیادت نے جسے کشمیر کے میدان وغا میں اترنے کی کبھی جرأت نہیں ہوئی۔ جماعت اسلامی پر شب خون مارا۔ جماعت اسلامی کے خلاف جھوٹ اور مکر کا مسلسل پروپیگنڈا اور اس کے رہنماؤں کی گرفتاری و نظر بندی جہاد کاشمیر کا ایک حصہ تھی۔ جسے ہماری قیادت اپنا فرض منصبی سمجھ کر ادا کر رہی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ جب تک عوام مسلمان اپنا خون بہاتے رہے جنگ کشمیر ایک "مقدس جہاد" تھا، لیکن جب وہ مرحلہ آیا جس میں قیادت کو خود اپنا خون پیش کرنا تھا تو وہی مقدس جہاد فساد بن گیا اور اقوام متحدہ کے حکم سے اس فساد کو بند کر کے ساری دنیا سے اپنی امن پسندی و صلح جوئی کا جھوٹا خراج لیا گیا۔ یہ سانحہ یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو پیش آیا اور اسی دن کشمیر کی قسمت پر مہر لگ گئی (فلسطین کے بعد یہ دوسرا زخم کاری تھا جو دشمنوں کی طرف سے جسم ملت پر لگایا گیا اور سانحہ در سانحہ یہ ہے کہ دونوں کارروائیوں میں اپنوں اور اُن اپنوں کو آلۂ کار بنایا گیا جو بزعم خود رہنمائی ملت کے واحد ٹھیکیدار ہیں اور اپنے مخصوص گروہ کے باہر کسی بھی شخص کو نگاہ ملت میں مشکوک بنانے اور غدار ٹھہرانے سے نہیں چوکتے) یکم جنوری ۱۹۴۹ء کی شب کے فیصلہ متارکہ جنگ کو مان لینا پاکستانی قیادت کی وہ فاش غلطی تھی جس نے دشمنوں پر یہ واضح کر دیا کہ یہ گفتار کے غازی ہیں اور عقل و خرد سے عاری ہیں اور ان کو ڈپلومیسی کے جال میں پھنسا کر کھلاتے رہنا اور کھلاتے کھلاتے بے دم کر دینا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ رہے اہل کشمیر اور سرحدی پٹھان تو آخر وہ کب تک تن تنہا بغیر کسی خاص مدد کے ایک منظم فوج کے مقابلہ میں دادِ شجاعت دیتے رہیں گے۔ اسی قیادت کی مدد سے جب ایک مرتبہ اُن کا جوش جہاد ٹھنڈا ہوا اور وہ میدان کارزار سے ہٹے، پھر مسئلہ صرف ڈپلومیسی کا رہ جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی فریب کاری سے یہ کام بھی کرا لیا اور اس کے بعد ڈپلومیسی کا چکر چلنے لگا ـــــــ کشمیر کمیشن کی رپورٹیں، میکناٹن تجویز، ڈکسن کی تجویز تقسیم، ٹرومن اٹیلی اپیل گراہم رپورٹ اور اس کے بعد اشتراکی روس کی مداخلت، اور اب جب کہ یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں جینوا مذاکرات ہو رہے ہیں، اور ابھی نامعلوم کتنی رپورٹیں تجاویز اور مذاکرات اقوام متحدہ کے جھولے میں موجود ہیں جن کے ذریعہ وہ پاکستان کی قیادت کو ایک نامعلوم عرصہ تک بیوقوف بناتی رہے گی۔

مجھ کو ڈر ہے کہ ہے طفلانہ طبیعت اِن کی
اور عیار ہیں یورپ کے شکر پارہ فروش (اقبال)

موجودہ صورت حال

اس وقت اندوہناک صورت حال یہ ہے کہ ارض کشمیر کے اکثر حصہ پر بھارت کا غاصبانہ قبضہ ہے وادی کے مسلمانوں پر ایک نیم فوجی نیم شہری حکومت قائم کر کے اُن کی روح کو کچلنے کی پیہم کوشش کی جا رہی ہے۔ بھارت سے وہ تمام ہندو عناصر درآمد کئے جا رہے ہیں جن کی مدد سے وادیٔ کشمیر کے باغیرت اور شریف عناصر کا قلع قمع کر کے عام مسلمانوں کو بے دست و پا کیا جا سکے۔ اِس بات کو فرض کرتے ہوئے کہ کشمیر بھارت ہی کا ایک حصہ ہے وہ تمام دستوری قانونی کارروائیاں کی جا رہی ہیں جو ایک ریاست اپنی ایک ماتحت اور مستقل وحدت کے ساتھ کرنے کی مجاز ہوتی ہے اور ساتھ ہی اُن اصلاحات کا بھی نفاذ کیا جا رہا ہے جو کشمیری مسلمانوں کے مستقبل پر لازماً اثر انداز ہونگے ادھر سر زمین پاکستان میں لاکھوں مہاجرین پانچ سال سے ناامیدی و نامرادی کے دن کاٹ رہے ہیں اور اب

قوماجزہ درماندہ ہو کر ہزاروں کی تعداد میں واپس بھی ہو رہے ہیں۔

تقاریر اور بیانات

پچھلے چار پانچ سال میں ہمارے اکابرین نے کشمیر کے متعلق جو بیانات دیئے ہیں۔ اُن کا خلاصہ یہ ہے:-

۱۔ کاشمیر پاکستان کا ایک اہم حصہ ہے جس کے بغیر پاکستان نامکمل ہے۔
۲۔ کاشمیر میں ہم ظلم کے آگے سرنگوں نہیں ہوں گے۔
۳۔ کاشمیری بھائیوں کے لئے ہم خون کا آخری قطرہ بہائیں گے اور جب تک اُن کو حق خود اختیاری نہ مل جائے ہم چین نہ لیں گے
۴۔ کشمیر ہمارے لئے زندگی اور موت کا سوال ہے۔

تازہ ترین تقریر وہ پیغام ہے جو پاکستان کی پانچویں سالگرہ کے موقع پر وزیر امور کاشمیر نے ۱۵ اگست کو کراچی میں مسلم کالج کے طلبا کو خطاب کرتے ہوئے دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:-

Accession of Kashmir to Pakistan is regarded as a sacred motto of the greatest importance to the Government and people of Pakistan.

اب اِن عزت مآب سے کون پوچھے کہ یہ U. N. O. Sacred motto of greatest importance کے فہرست مسائل میں A static issue of least importance کی حیثیت رکھتا ہے اور جس کے متعلق آپ پچھلے پانچ سال میں ہندوستان کی شرارت آمیز روش اور اقوام متحدہ کی مجہول کارروائیوں کو ملاحظہ فرما چکے ہیں اس کے متعلق آپ کا یہ ارشاد کہ:-

Pakistan will continue to try for a peaceful solution of Kashmir till the time there is the slightest hope that the problem can be solved by peaceful means.

"خود فریبی" ہے یا "ملت فریبی" ہے۔ اس مسلسل ملت فریبی نے جمہور پاکستان کو اب اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں پہنچ کر وہ مسئلہ کشمیر کے حل سے ناامید ہو چکے ہیں اور بڑی حسرت سے کہتے ہیں کہ کشمیر تو ہمارے ہاتھوں سے گیا۔ اب تھوڑے عرصہ بعد نفسیاتی طور پر وہ اس منزل پر پہنچ جائیں گے جہاں "امن عالم" کی دہائی دے کر اُن کو آقائے فرنگ کی اسکیم (تقسیم کاشمیر) پر راضی کرا لینا کچھ زیادہ مشکل نہ ہوگا۔ رہے ان کے غیرت مند اور زندہ دل عناصر تو اُن کی تواضع کے لئے وزارت سیفٹی ایکٹ اور قیادت سیکورٹی ایکٹ پہلے ہی سے موجود ہیں۔

فتنہ ملت بیضاء ہے امامت اُن کی
جو مسلماں کو فرنگی کا پرستار کریں[1]

مستقبل کے امکانات

تعلو مستقبل میں کیا چھپا ہے اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن فرنگی کی سیاست اس مسئلہ کو کھینچ کر جس مقام پر لے آئی ہے وہ ہمارے لئے حد درجہ تشویشناک ہے۔ اینگلو امریکن رجحان قطعی طور پر تقسیم کی طرف مائل ہے اور یہ حل ان کی اپنی عالمی پالیسی کے عین مطابق ہے۔ برطانوی اخبارات صاف طور پر تقسیم کشمیر پر اپنے خیال کا اظہار کر چکے ہیں۔ خود سر اوون ڈکسن آج سے دو سال قبل ستمبر ۱۹۵۰ء میں تقسیم ہی کو اِس مسئلہ کا واحد حل قرار دے چکے ہیں۔ اُن کی رپورٹ کے یہ الفاظ ملاحظہ ہوں:-

---

[1] یادِ نو نصرت

> At all events I have formed the opinion that if there is any chance of settling the dispnte over Kashmir by agreement between India and Pakistan it now lies in partition...

اقوام متحدہ کی مجبوریت، اکابر پاکستان کی کاسہ لیسی اور پنڈت نہرو کی اب تک کی مدافعت کو دیکھتے ہوئے ڈکسن کی مندرجہ بالا رائے سے اختلاف کرنا مشکل ہے اور آج دو برس بعد بھی یہ رائے بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے۔ پھر یہ تقسیم بھی اس طرح کرنا پیش نظر ہے کہ جس کے قبضہ میں جتنا حصہ ہے اسی پر قناعت کرے بہرحال **اینگلو امریکی سیاست کشمیر میں فلسطین کی تاریخ دوہرانا چاہتی ہے۔**

دوسرا رجحان جو اشتراکی روس کی اس مسئلہ میں مداخلت کے بعد پیدا ہوا ہے وہ یہ ہے کہ کشمیر روسی و چینی ترکستان کی طرح آزاد و خود مختار ہو گراہم رپورٹ پر بحث کے دوران میں روسی نمائندہ جیکب ملک نے اپنی تقریر مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۵۲ء میں صاف طور پر استصواب رائے عامہ کو اینگلو امریکن فریب قرار دیا ہے اور ساتھ ہی ایک خود مختار دستوریہ کے قیام اور آزادانہ انتخاب کو اس مسئلہ کا حل بتایا ہے۔ اُن کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

> Kashmir be given the right to settle its own affairs by the establishment of a Constituent Assembly and then holding of force elections.

اس طرح اشتراکی روس نے شیخ عبداللہ کو شہ دی ہے کہ وہ اپنی روش پر قائم اور دستور ساز اسمبلی کی کارروائی پر مصر رہیں اور بھارت و پاکستان دونوں کے دباؤ کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ چنانچہ اس چیز نے عبداللہ کے لئے ایک نیا راستہ پیدا کر دیا ہے اُن کی ہمت بلند ہوگئی ہے اور انہوں نے بھارت کے حکمرانوں اور لیڈروں سے اس انداز میں گفتگو شروع کر دی ہے۔

> Nobody in India need feel that we in Kashmir are dependent on and eager for Indias money, trade or armed forces.
>
> The Constituent Assembly would decide whether Kashmir would accede to India or remain independent or join Pakistan. (Srinagar Speech, April 1952)

روسی نمائندہ کی اس تقریر نے برعظیم ہند و پاک کے اشتراکیوں کی بھی رہنمائی کی ہے اور اسی کے مطابق انہوں نے کشمیر سے متعلق اپنی پالیسی میں تبدیلی پیدا کر لی ہے۔ ہندوستانی پارلیمنٹ میں کمیونسٹ ارکان کی تقریریں اس کا مظہر ہیں۔ **اس طرح سائنو سوویٹ سیاست اس برعظیم میں بھی ایران کے آذربیجان کی تاریخ دہرانا چاہتی ہے۔**

بہرحال کشمیر کا مسئلہ بھی ان دو مفسدین فی الارض گروہوں کی سیاست کا اکھاڑہ بن چکا ہے اور ان کے ارادے و منصوبے سب پر عیاں ہو چکے ہیں۔ ان دونوں میں کون کامیاب ہوتا ہے یہ تو مستقبل ہی بتائے گا، لیکن اگر ان میں سے کوئی کامیاب ہو تو ہمارے لئے وہ بہرحال ناکامی ہوگی۔

ایک رندانہ حل

آخر میں ہم اس مسئلہ کا وہ حل پیش کرنا چاہتے ہیں جسے "ایک رندانہ حل" کا نام دیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک اس مسئلہ کا اس کے سوا اور کوئی دوسرا حل نہیں اور جب تک ملت پاکستان اس کے لئے تیار نہیں ہوتی ہے، مسئلہ کشمیر کبھی حل نہ ہو سکے گا۔ ہاں فرنگی سیاست کی فضاؤں میں غائب ہو جائے تو اور بات ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ مسئلہ کشمیر اپنی موجودہ شکل میں قیام پاکستان کے ساتھ ہی پیدا کیا گیا ہے۔ اس کے پیدا کرنے میں انگریز کی "سیاست" "کانگریس کی" "شرارت" اور لیگ کی "حماقت" کو دخل تھا اور چونکہ ناپاک سیاست کے یہ عوامل ثلثہ اب تک اپنا کام کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اس بنا پر یہ مسئلہ کھٹائی میں پڑا ہوا ہے اور مستقبل قریب میں اس کے حل کی کوئی امید فریب تو ہو سکتی ہے حقائق بینی نہیں۔ وجہ ظاہر ہے جب تک شر کے عوامل کام کر رہے ہوں آپ خیر کے نتائج کی امید کیوں کر سکتے ہیں؟ یہی ملت اگر واقعی اس مسئلہ کا حل چاہتی ہے تو اسے پوری قوت صرف کر کے متذکرہ بالا عوامل میں سے کسی ایک کو تبدیل کرنا ہوگا اور جس وقت ان میں سے ایک بھی تبدیل ہوا حالات کے رخ بدلنے شروع ہو جائیں گے اور مسئلہ کے حل کی کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔

اب ذرا سوچئے کہ ان عوامل ثلثہ میں آپ کس پر جلد قابو پا سکتے ہیں اور فی الحال ان میں کون آپ کی دسترس کے اندر ہے۔ انگریز کی سیاست پر آپ اثر انداز نہیں ہو سکتے ہیں، بھارت کی شرافت پر آپ کا قابو نہیں، ہاں اپنے حکمرانوں کی حماقت و دناءت کو آپ ضرور ختم کر سکتے ہیں اور اگر وہ اس پر مصر ہوں تو ان کو بدل سکتے ہیں۔ بس یہ "تبدیلی قیادت" ہی اس مسئلہ اور اس کے ساتھ پاکستان کے جملہ مسائل لاینحل کا حل ہے۔ اور جوں ہی اپنے سینہ سے یہ سنگ گراں اٹھا پھینکنے میں آپ کامیاب ہوئے، آپ اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اور یہاں تو پورے عالم اسلام میں آپ کے "قیام" کا انتظار ہو رہا ہے۔ آپ کے اٹھتے ہی ملت اسلامیہ ایران و مصر آپ سے مصافحہ کرے گی۔ پھر کراچی، طہران، قاہرہ اور جکارتا کے سینوں میں دل ہم آہنگی سے دھڑکیں گے۔ اور یہ اتحاد عالم اسلام جو محض مشرقیت اور مسلم اقلیت کے بل پر نہیں، بلکہ ایک آئیڈیالوجی اور ایک عالمگیر مقصد کے زیر اثر نمودار ہوگا، نہ صرف مسئلہ کشمیر بلکہ سویز، سوڈان اور نیوگنی کا مسئلہ بھی حل کرے گا۔ یہ مراکش و الجزائر کی گتھی بھی سلجھائے گا اور روسی ترکستان، چینیوں اور بھارت والوں کی قسمت پر بھی اثر انداز ہوگا اور آپ کے دیکھتے دیکھتے کرۂ ارض کی تقدیر بدلنا شروع ہو جائے گی۔

طہران ہو اگر عالم مشرق کا جنیوا
ممکن ہے کہ کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے
دیکھا ہے ملوکیت افرنگ نے جو خواب
ممکن ہے کہ اس خواب کی تعبیر بدل جائے

چند غیر مُلکی شخصیتیں

مولانا مسعود عالم ندوی

اس مضمون میں صرف ان چند غیر مُلکی شخصیتوں کا ذکر کرنا ہے۔ جن سے پاکستان میں نیاز حاصل ہوا۔ یا اگر پاکستان کے باہر پہلی ملاقات ہوئی تو پھر پاکستان میں تجدید ملاقات کے مواقع ملے۔ اس مختصر سی صحبت میں کسی تفصیلی تذکرے یا سوانح حیات کے قلم بند کرنے کا موقع نہیں۔ یہاں ہم صرف ذاتی تاثرات کے بیان کرنے پر اکتفا کریں گے۔ شخصیتوں کی ترتیب میں صرف ترتیب ملاقات پیش نظر رہی ہے۔ تقدیم و تاخیر سے ترتیب درجات مقصود نہیں۔ اور نہ یہ آسان کام ہے۔ یوں تو پاکستان کی جاذبیت اور قیام دو بین الملکی کانفرنسوں کی وجہ سے غیر ملکی شخصیتوں کی بڑی تعداد سے ملاقات کے مواقع حاصل ہوئے۔ لیکن صحبت ہم صرف چند ممتاز شخصیتوں کے ذکر پر اکتفا کر رہے ہیں۔ اگر یہ سلسلہ پسند کیا گیا، تو دوسری قسط بھی لکھی جا سکتی ہے۔

ایک بات اور عرض کر دوں۔ ”غیر ملکی“ کا لفظ موجودہ سیاسی اصطلاح کے لحاظ سے استعمال کیا گیا ہے۔ ورنہ اسلامی قانون کے مطابق دار الاسلام کے کسی خطے میں کوئی مسلمان ”غیر ملکی“ نہیں شمار ہوتا، اور کم سے کم ہم تو موجودہ حالات اور قوانین کی جکڑ بندیوں کے ہوتے ہوئے بھی ان دوستوں اور بزرگوں کو جن کا ذکر یہاں کر رہے ہیں ”غیر ملکی“ نہیں سمجھتے۔

۱۔ صالح عشماوی

اخوان المسلمون کے سرگرم کارکن صالح عشماوی بڑی محبوب شخصیت رکھتے ہیں۔ ان سے ہماری پہلی ملاقات نومبر ۱۹۴۷ء میں ہوئی۔ عرب لیڈروں کے برعکس انہیں بہت سادہ، متواضع اور ملنسار پایا۔ تعلیم جدید طرز پر پائی۔ مگر مصر و عربستان کی عام روایات کے برخلاف چہرہ ڈاڑھی کے نور سے منور ہے۔ مصر میں تو بڑے بڑے علماء کے چہرے بھی ماشاء اللہ صاف و شفاف نظر آتے ہیں۔ عشماوی صاحب ایک صالح مومن اور مجاہد مسلمان ہیں۔ ان کی تحریر میں زبان و بیان کے لحاظ سے تو کوئی خاص خوبی نہیں ہوتی۔ مگر بسا اوقات پڑھ کر دل متاثر ہوتا ہے۔ عاجز نے اپنی اس کیفیت کی بارہا تحلیل کی۔ عام طور پر اپنا یہ حال ہے کہ زبان اچھی نہ ہو، تو اخبار یا مضمون کو ہاتھ لگانے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ لیکن صالح عشماوی صاحب کے افتتاحیے اس سے مستثنیٰ ہیں۔ شاید جس چیز کو اقبال نے ”نفس“ سے تعبیر کیا ہے، ان کی تحریر میں اس کا وافر حصہ موجود ہے۔ اخوان کے دورِ ابتلا سے پہلے یہ روزنامہ الاخوان المسلمون کے چیف اڈیٹر تھے اور بلاکشانِ مصیبت کی رہائی کے بعد تقریباً دو سال تک اخوان کی ساری تنظیم کے تنہا ذمہ دار رہے۔ آج کل ہفتہ وار ”الدعوۃ“ کے مالک اور اڈیٹر ہیں۔ الاخوان کی مجلس شوریٰ (مکتب ارشاد) کے بھی رکن ہیں۔ آدمی مخلص، جذباتی اور انتہا پسند معلوم ہوتے ہیں۔ ہمارے نزدیک ان کی ساری قیمت ان کے ایمان و اخلاص میں ہے۔ اور یہ وہ متاعِ گراں مایہ ہے، جو اس دور میں مشکل ہی سے کہیں کہیں نظر آجاتی ہے۔

۲۔ سعید رمضان

برصغیر ہند و پاکستان میں جب کبھی کسی ایسی شخصیت سے ملنے کا اتفاق ہوا جس کی عمر اپنے سے کم معلوم ہوئی، تو پوری ملاقات میں اس کا احساس رہا کہ میں اپنے سے چھوٹے آدمی سے بات کر رہا ہوں۔ اب تک ایک مستثنیٰ مثال، محبت عزیز علی میاں (ابوالحسن ندوی) کی تھی۔ وہ اپنے تمام علم و فضل کے باوجود عمر میں مجھ سے چار سال چھوٹے ہیں۔ آج سے چوبیس سال پہلے، جب ہم دونوں تو عمر اور عربی زبان و ادب کی تحصیل میں منہمک تھے، پہلی ملاقات ہی میں ان کی تہ پہنچ گیا [illegible]

اشاعت خاص ——

کی بلندی محسوس ہوئی، اور عمر کے تفاوت کا کوئی خیال بھی دماغ میں نہ آیا۔ دوسری مرتبہ یہ تجربہ کراچی میں سعید رمضان کے ساتھ بار بار ہوا۔ ان کی جاذب شخصیت اور ایمانی قوت کا میرے دل پر بڑا اثر ہے۔ تقریر کرنے پر آتے ہیں تو پھر کلیجہ نکال کر رکھ دیتے ہیں۔ خود بھی روتے ہیں اور دوسروں کو بھی رُلاتے ہیں۔ حسن بنا مرحوم خود ایک موہوب شخصیت کے مالک اور سیماب وش انسان تھے۔ اور یہ ان کا کمال دیکھنے میں آرہا ہے کہ ان کے خاص رفقا بھی اسی رنگ میں شرابور نظر آتے ہیں۔ اخوان کی کامیابی کا یہی بڑا راز ہے۔ تعلیم کے اعتبار سے یہ باضابطہ وکیل ہیں۔ اخوان کے دورِ ابتلا سے پہلے حسن بنا مرحوم کے دستِ راست اور ان کے رسالہ الشہاب کے مینجر تھے۔ دورِ ابتلا کے دو برس کراچی میں گزرے، جہاں وہ اپنی جاذبیت، استقامت اور قوتِ ایمانی کے پائدار نقش چھوڑ گئے ہیں۔ اب پھر قاہرہ الشہاب کے نہج پر ایک شاندار ماہنامہ المسلمون نکال رہے ہیں۔

۳۔ عمر بہاء الامیری

امیری صاحب سے غائبانہ واقفیت الفتح کے واسطے سے تھی۔ اور غالباً وہ بھی مجھ سے اِسی واسطے سے واقف تھے۔ پہلی ملاقات میں کچھ لئے دیئے معلوم ہوئے۔ لیکن بعد کی ملاقاتوں میں طبیعت کا پورا اندازہ ہوا۔ آدمی بڑے خوش مذاق اور بذلہ سنج ہیں۔ شعر و شاعری کا بھی ستھرا ذوق ہے۔ سفارت پر فائز ہونے سے پہلے تمام الاخوان المسلمون کے جنرل سکریٹری تھے۔ اعلیٰ تعلیم پیرس میں پائی ہے۔ یہ پہلے سفیر ہیں جنہوں نے یہاں آکر باضابطہ اُردو سیکھنا شروع کی۔ عزام صاحب تو پہلے سے اُردو سے آشنا تھے۔ مزید برآں وہ فارسی کے ادیب بھی ہیں۔ امیری صاحب کے لئے مشکل تھی۔ انگریزی بھی یہ نہیں جانتے مگر انہوں نے اپنی ہمت اور شوق سے یہ مشکل آسان کر لی۔ امیری صاحب نے پاکستان اور پاکستانیوں کے معاملات میں اس طرح دلچسپی لی کہ گویا وہ بھی اس ملک کے باشندے ہیں۔ سننے میں آیا ہے کہ ان کی یہ ادا ہمارے اربابِ اقتدار کو ایک آنکھ نہ بھائی۔ اِسی طرح ان کی اصول پروری اور اپنے مسلک میں شدت نے شام کے فوجی ڈکٹیٹروں کو بھی برافروختہ کر دیا اور اب وہ اپنے عہدہ سے سبکدوش ہو کر غالباً کوئی آزاد راہِ عمل تلاش کر رہے ہیں۔

۴۔ عبدالوہاب عزام

آج سے کوئی اٹھارہ اُنیس برس پہلے کی بات ہے۔ بغداد کے ہفتہ وار اخبار المدینۃ الاسلامیۃ کا رسول نمبر پڑھ رہا تھا کہ ایک مضمون میں کچھ ایسے خیالات نظر آئے جو عام طور پر عرب ادیبوں کے قلم سے نہیں نکلتے۔ الفاظ تو یاد نہیں، خلاصہ یہ ہے:۔

'یہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ (خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے) عربوں کے "لیڈر" تھے۔ آپ نے عربوں کو زندہ کیا۔ آپ کے نام سے عربوں کا بول بالا ہوا، یہ سب جھوٹے ہیں۔ آپ انسانیت کے علمبردار اور پوری نوعِ انسانی کے لئے رحمت کا پیغام لے کر آئے تھے۔ جغرافیہ اور قومیت کی تنگنائیوں میں آپ کی تعلیمات کو بند کرنا آپ کے مشن پر بڑا ظلم ہے۔ الخ' نگاہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ فہرست الٹ کر نام دیکھا۔ 'ڈاکٹر عبدالوہاب عزام' اس کے بعد سے ان کا برابر مطالعہ کرنے لگا۔ معلوم ہوا کہ اقبال کے شیدائی اور شائد مصر میں ایک ہی آدمی ہیں، جو اقبال کے کلام اور پیغام کو صحیح طور پر سمجھتے ہیں۔

ایک عرصے کے بعد غالباً ۱۹۴۸ء میں پٹھان کوٹ سے مولانا مودودی کی تصنیفات کا ایک سٹ ان کی خدمت میں ارسال کیا اور ساتھ ساتھ ایک مفصل مکتوب کے ذریعہ انہیں دعوت سے روشناس کرانے کی کوشش کی۔ اور پھر مراسلت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

پہلی ملاقات سرسری طور پر مکہ مکرمہ میں ہوئی (ذی الحجہ ۱۳۶۸ھ) اس وقت وہ سفیر کے ساتھ ساتھ امیر الحج بھی تھے اور ہوٹل میں ان کے

---

[1] عرصہ ہوا بند ہو چکا۔

کمرے پر مصری جماعت کا ہجوم تھا۔ جدہ میں تفصیلی ملاقات ہوئی۔ اپنی زندگی میں ایسا شریف النفس اور متواضع آدمی میں نے کم دیکھا۔ اب ڈیڑھ دو سال سے وہ پاکستان میں مصر کے سفیر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں مصر کی نمائندگی کے لئے ان سے بہتر شخصیت نہیں مل سکتی تھی۔ ترکی، فارسی اور انگریزی سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اِسی لئے اُردو سیکھنے اور سمجھنے میں انہیں بہت کم وقت محسوس ہوئی۔ افکار و خیالات کے اعتبار پختہ مسلمان اور تہذیب و اخلاق کے لحاظ سے مصر کی بہترین اسلامی اور عربی شرافت کے نمائندہ ہیں۔ تعلیم و تربیت کے لحاظ سے بھی وہ جدید و قدیم دونوں سرچشموں سے فیضیاب ہیں۔ اس کے علاوہ عربی انشاپردازی میں بھی اِن کا ایک خاص مقام ہے۔ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ مصر کے چار پانچ چوٹی کے اچھے لکھنے والوں میں یہ بھی ہیں۔ ان کے مضامین کا مجموعہ "الاوابد" بڑی لطیف اور "خاصہ" کی چیز ہے۔ شاعر بھی ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہے مگر علمی آدمی نہیں، داعی نہیں۔

۵۔ مصطفیٰ حسنی السباعی

غائبانہ تعارف الفتح کے واسطے سے تھا۔ آج سے پندرہ برس پہلے وہ الفتح کے خاص لکھنے والوں میں تھے لیکن ملاقات پاکستان میں گذشتہ سال ہوتا (فروری ۱۹۵۲ء) کے موقع پر ہوئی۔ بغداد میں ان کی خطابت کا شہرہ سن چکا تھا۔ کراچی میں اس کی تصدیق ہوئی۔ واقعی بے پناہ بولتے ہیں۔ خطابت اور سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے ان کا علمی رنگ دب گیا ہے۔ یہ شام میں الاخوان کی تحریک کی شروع سے روح رواں رہے ہیں۔ دمشق کے شہری حلقے سے پارلیمنٹ کے ممبر بھی منتخب ہوئے تھے۔ اور پھر نائب صدر کے عہدے تک پہنچے۔ یہ موقع تھا کہ شام میں پہلی مرتبہ اسلامی نظریہ فکر رکھنے والے پارلیمنٹ میں مؤثر نظر آتے تھے۔ مگر افسوس وہ بساط جلدی ہی اُلٹ گئی۔ مختلف تاریخی و تہذیبی روایات و حالات کے باعث عرب ملکوں میں ہماری توقعات شام سے زیادہ وابستہ ہیں۔ اور اس میں مصطفیٰ حسنی السباعی اور ان کے رفقا کی سرگرمیوں نے کافی جان پیدا کر دی ہے۔ لیکن امریکہ کے چشم و ابرو کے اشاروں پر ناچنے والے فوجی ڈکٹیٹروں کا بُرا ہو، وہ اپنے ملک و ملت کی ترقی کی راہ میں روڑے اٹکا رہے ہیں اور ان مجاہدان راہ حق کو کھل کر کام کرنے کا موقع نہیں دیتے۔

۶۔ محمد بشیر الابراہیمی

الجزائر کی جمعیۃ العلماء المسلمین کے صدر اور اس کی تمام تعلیمی اور تہذیبی سرگرمیوں کے نگران اعلیٰ شیخ محمد البشیر الابراہیمی بلند پایہ عالم عربی زبان کے بے مثال انشاپرداز اور قادر الکلام شاعر و خطیب ہیں۔ افکار و خیالات کے اعتبار سے بھی سلجھے ہوئے اور بدعات و جمود سے بالکل پاک ہیں بلکہ ایک آدھ بار تو راقم کو ان کے خیالات میں کچھ زیادہ ترقی پسندی محسوس ہوئی۔ تصوف اور صوفیوں کے بڑے مخالف ہیں۔ ان کی کوئی مجلس متصوفین کی مذمت سے خالی نہیں ہوتی۔ ان کے اعمال و افعال کی پردہ دری میں بسا اوقات برجستہ شعر بھی کہتے رہتے ہیں۔ ہفتہ وار "البصائر" میں ان کے شذرات قلم آتے رہتے ہیں۔ جہاں تک راقم کے علم و فہم کا تعلق ہے، اس وقت عربی زبان میں ایسا دوسرا انشاپرداز موجود نہیں۔ خطابت میں بھی عربوں کی قدیم روایات تازہ کر دیتے ہیں۔ پچھلے دنوں پیرس میں عرب لیڈروں کے اجتماع کے موقع پر ایسی مؤثر اور زور دار تقریر کی کہ انجمن اقوام متحدہ میں شام کے مستقل نمائندے، مشہور قوم پرست عیسائی لیڈر اور ادیب فارس الخوری بول اُٹھے:۔

"جس خطہ ارض میں ایسے خطیب موجود ہوں وہاں کم سے کم عربی زبان کا مستقبل مامون و محفوظ ہے"

شیخ بشیر ابراہیمی سے بڑی عقیدت تھی اور اسی لئے ان سے ملاقات کی خوشی بھی بہت ہوئی۔ مگر توقعات کے خلاف دعوت کی روح اور تڑپ کی کمی محسوس ہوئی شاید یہ عمر کا اثر ہو۔ جوانوں اور بوڑھوں میں کچھ تو فرق ہونا چاہیئے۔ انشاپردازی اور خطابت میں کمال کے باوجود عام بول چال کا معیار اتنا بلند نہیں تھا۔ یہ بات تو راقم نے صرف اپنے استاد ڈاکٹر تقی الدین ہلالی میں دیکھی کہ ان کے لکھنے اور بولنے میں کوئی فرق نہیں۔ ہلالی میاں کی روایت ہے کہ انہیں اپنے پورے دورۂ عرب میں صرف محمد بہجۃ البیطار اس خصوصیت میں ہلالی صاحب کے حریف نظر آئے۔ عرب ملکوں میں صدیوں سے بول چال کی عام زبان بگڑ چکی ہے اس لئے اچھے اچھے ادیبوں کی زبان پر بھی عام بول

(بقیہ بر صفحہ ۲۴۴)

میو قوم پاکستان میں

سردار محمد خاں میواتی

۱۔ قوم میو کا قدیم وطن

قوم میو ہندوستان کی آرین نسل کی پرانی قوموں میں سے ایک ہے۔ اس کا قدیم مسکن دلّی کی پہاڑیوں یعنی پہاڑگنج و قرول باغ و قطب صاحب کی لاٹھ (مہرولی) پرانا قلعہ (تغلق آباد) سے لیکر اروَلی پربت کی پہاڑیوں میں جو کوہ آبو تک پھیلی ہوئی ہیں واقع ہے۔ مشرق کی طرف یہ قوم بندرابن یعنی متھرا اور دوآبہ گنگ میں آباد تھی۔ بندرابن نند متھرا، دراآمیر نند بسے پور اور نواح اجمیر ان کے پرانے سرداروں کی راجدھانیاں تھیں۔ لیکن استداد زمانہ نے چند انقلابی دوروں میں سے گزرنے کے بعد ان کے مسکن کو سکیڑ کر تقریباً سو یا سوا سو میل لمبے چوڑے علاقے میں محدود کر دیا جس کو دَور مغلیہ میں علاقہ میوات کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ آج بھی اس کو میوات ہی کہا جاتا ہے جو ریاست ہائے الور، بھرت پور، ضلع متھرا اور ضلع گوڑگانواں کے جنوبی علاقہ پر مشتمل ہے علاوہ ازیں قوم میو کی منتشر آبادیاں یو۔پی اور مالوہ میں بھی بڑی تعداد میں پائی جاتی ہیں۔

قوم میو کے چند انقلابی دَور

میو قوم کو دہلی کے حکمرانوں سے بہت نقصان پہنچا ہے، اور جو جھڑپیں گذشتہ زمانوں میں دہلی کے حکمرانوں سے میو قوم کی ہوتی رہی ہیں ان کی وجہ سے اس کے پرانے وطن کی وسعت کو بہت بڑا نقصان پہنچا ہے۔ چنانچہ جب پرتھی راج والئے دہلی کی جے چند والئے قنوج سے لڑائی ہوئی تو قوم میو نے جے چند کا ساتھ دیکر نبرد آزمائی کی اور جے چند کی شکست کے نتیجہ پر پرتھی راج کے حکم سے دہلی کے گرد و نواح اور دوآبہ گنگ دیس کی ساری آبادی تہ تیغ کر دی گئی اور نچی کھچی آبادی برباد کر کے نکال دی گئی۔ چنانچہ چند دیہات تو دنسل کے اب بھی نواح دہلی بلب گڑھ تحصیل میں آباد ہیں۔ اس نسل کے کچھ افراد مالوہ و بھوپال (گوالیار) اور یو۔پی کی طرف ترک وطن کرنے پر مجبور کر دئے گئے یہ پہلا انقلاب تھا۔

دوسرا انقلاب جس سے میو قوم کو شدید نقصان پہنچا غیاث الدین بلبن کے زمانہ میں رونما ہوا جس میں بلبن نے تقریباً ایک لاکھ نوجوان میواتیوں کا قتل و غارت کرایا اور نواح دہلی کی آبادی کو نیست و نابود کر دیا۔ اگر غیاث الدین بلبن بجائے قتل و غارت کے میو قوم میں تبلیغاً اصلاح سے کام لیتے تو اب تک سارا مشرقی پنجاب اور ساری مغربی یوپی اور دہلی کے گرد و نواح میں میو قوم کی ٹھوس آبادی ہوتی۔ اس انقلاب نے بھی میو قوم کے وطن کی وسعت کو بڑا نقصان پہنچایا۔

تیسرا انقلابی دَور بابر بادشاہ اور رانا سانگا کی لڑائی میں رونما ہوا جس میں میو قوم نے رانا سانگا کے ساتھ تعاون کر کے بابر سے مقابلہ کیا تھا نقصان اُٹھایا۔ اور بہت سی میو آبادی گوالیار وغیرہ کی طرف منتقل ہو گئی۔

چوتھا انقلابی دور اکبر کے زمانہ میں اکبر کی فوجوں سے مُٹھ بھیڑ ہونے پر ہوا۔ جس سے میو قوم کی پاہٹ پال کو کافی نقصان پہنچا اور اُس کی معتدبہ تعداد میوات سے اُٹھ کر یوپی۔ پنجاب اور دیگر اضلاع ہند کی طرف چلی گئی۔

پانچواں انقلابی دور انگریز کی سیاسی حکمت عملی کا نتیجہ تھا کہ اُس نے قوم میو کی وحدت پارہ پارہ کر دی اور اس قوم کو چار مختلف انتظامی حصّوں میں منقسم کر دیا۔ یعنی کچھ حصّہ ضلع گوڑگانوہ پنجاب میں اور کچھ یوپی کے اضلاع متھرا۔ میرٹھ۔ بلند شہر وغیرہ میں اور کچھ راجپوتانہ کے علاقہ الور و

بھرت پور میں شامل کر دیا۔ انگریز کی سیاسی پالیسی سے میو قوم کو بڑا نقصان پہنچا ہے اور ان کی سیاسی وحدت تقریباً ختم ہو کر رہ گئی ہے۔
میو قوم کا چھٹا انقلابی دور انخلاء بھارت کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ جس سے ان کی رہی سہی سیاسی وحدت سر دست پارہ پارہ
کر دی گئی ہے۔ یعنی علاقہ میوات کی آبادی کو دو حصوں میں اس طرح تقسیم کر دیا گیا ہے کہ ایک حصہ میوات میں دم توڑ رہا ہے۔ اور دوسرا
حصہ پاکستان میں پنجاب سے لے کر کراچی تک منتشر کر دیا گیا ہے۔ میواتی اس شکست و ریخت کے لئے پاکستان کے ارباب اقتدار کو ذمہ دار
قرار دیتے ہیں۔

میوقوم کا بھارت میں موجودہ وطن

مذکورہ بالا ادوار سے گزرنے کے بعد میو قوم کا قدیم وطن سکڑ کر شمالاً، جنوباً، شرقاً، غرباً
سوا سو میل میں محدود ہو کر رہ گیا ہے جو ضلع گوڑگانوہ اور الور، بھرتپور پر مشتمل ہے
ہندوستان کے مختلف حصوں کی میو آبادیاں اس خطہ میوات ہی کو اپنا آبائی وطن کہتی ہیں۔

میوقوم کی معاشی وسیاسی تقسیم

میو قوم کے بزرگوں نے میو قوم کو مختلف بارہ بڑے اور باون چھوٹے قبیلوں اور گروہوں میں تقسیم
کرکے اپنا معاشی و سیاسی نظام مرتب کیا۔ بڑے گروہوں کو پال کہتے ہیں اور چھوٹے گروہوں کو
گوتوں کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ چنانچہ بڑے اور چھوٹے گروہ باؤن پال اور باون گوت کے نام سے مشہور ہیں۔ پال کے معنی ذمہ داری کے ہیں یعنی
آبادی کا جو حصہ اس پال کے ساتھ وابستہ اور آباد ہو گیا ہے اُس کی جانی و مالی ذمہ داریاں بلا لحاظ مذہب و ملت اس کے کندھوں پر ہیں۔ ان
کی آپس کی شادیاں بھی قدیم ہندوانی رواج کے مطابق (اسلامی رواج کے خلاف) گوت پالوں میں ہوا کرتی تھیں۔ یعنی جس گوت میں لڑکا بیاہا
جائے گا وہاں لڑکی نہیں بیاہی جا سکتی۔ اس گروہ بندی نے میواتیوں کو قبائلی پنچائتی سسٹم میں جکڑ بند کر رکھا تھا اور پال اور گوت کے چوہدری
مقرر ہوتے تھے جو اپنے گروہ کے انتظام کے ذمہ دار تھے۔ چوہدری کا فیصلہ یا حکم بمشورہ پنچایت ہر پال و گوت کے لئے ایک حتمی امر تھا
جس کی خلاف ورزی قوم کے اندر برداشت نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس تقسیم اور پنچائتی نظم اور گروہی تقسیم نے میوات کے اتحاد کو مضبوط بنا رکھا تھا۔ میو
قوم کے گوت و پال چھتری نسل کے مختلف خاندانوں یعنی سورج بنسی و چندربنسی وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ پالوں اور گوتوں کی آبادیاں عام
طور پر مسلسل اور یکجائی تھیں اور یہی قوائد آبادی مذکورہ بالا خصوصیات کا حامل ہونے میں بڑی حد تک کارفرما تھا، لہٰذا میواتی قوم کو منتشر آباد
کرنا اس قوم کو ان خصوصیات کے مفید پہلوؤں سے محروم کرنے کے مترادف ہے، حالانکہ اس قوم کی تعمیر نو کے لئے یہ مفید پہلو بہت
مدد ہو سکتے ہیں۔

میوؤں کا قبول اسلام

میو قوم نے مختلف زمانوں میں اسلام قبول کیا خاص طور پر محمود غزنوی اور محمد غوری کے حملوں
کے دوران میں مختلف بزرگوں کے ہاتھوں مشرف با اسلام ہوئے۔ یعنی سید سالار مسعود غازی
جن کا مزار بہرائچ (یو۔پی) میں ہے، شاہ بدیع الدین مدار جن کا مزار مکن پور ضلع کانپور میں ہے۔ اور خواجہ معین الدین چشتی اجمیری
وغیرہ کے دست مبارک پر اسلام قبول کیا۔ میو قوم میں دینی و دنیوی تعلیم بہت کم رہی۔ لیکن پچھلے پچاس سالوں میں قدرے
بیداری پیدا ہو گئی ہے۔ ریاست ہائے الور و بھرت پور کے حکمرانوں نے قوم میو کو دینی و دنیوی تعلیم سے محروم رکھنے کے لئے
پوری چال بازیوں سے کام لیا۔ لیکن انگریزی علاقہ میں علماء دین نے بڑی جدوجہد کر کے تعلیم کو فروغ دیا ہے۔

ملی وقومی خصوصیات

قوم میو فطرتاً اپنے گوت و پال کی تقسیم کی روشنی میں متحد، مجتمع اور منتظم رہنے کی عادی ہے۔ اجتماعیت
اور منتظم یکجائی آبادیوں نے ان میں غیرت، محبت اور ہمدردی اور شجاعت کا جذبہ بدرجہ اتم پیدا
کر دیا ہے۔ باوجود ان کی کم علمی اور جہالت کے ان میں حق پسندی، انصاف پرستی و مساوات اور دینی شعائر کا احترام پایا جاتا ہے چنانچہ

آج تک کسی میو نے قبول اسلام کے بعد برضا و رغبت تبدیل مذہب نہیں کیا۔ اور نہ کوئی میو مرتد ہوا۔
یہ بہت جفاکش۔ محنتی اور مشقت پسند ہیں اور ان کا اصلی پیشہ خصوصیت سے کاشتکاری اور فوجی ملازمت ہے۔ وقتی طور پر مزدوری
بھی کر لیتے ہیں۔ لیکن بھیک کبھی نہیں مانگتے اور من حیث القوم بھیک مانگنے کے پیشہ کو بہت ذلیل اور کمینہ خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ
پاکستان میں یہ ضرب المثل بن گئی ہے کہ میو بھیک نہیں مانگتا۔ بلکہ بان بٹ کر۔ گھاس کھود کر۔ درخت کاٹ کر اور مٹی کھود کر
اپنا اور اپنے لواحقین کا پیٹ پال لیتا ہے۔ خود داری کا بڑا عادی ہوتا ہے۔ سادہ زندگی بسر کرنے والا اور عہد کا پابند ہے معاشرتی
زندگی میں ان کی یہ خصوصیت نمایاں ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کی بہو، بہن، بیٹیوں کو عملاً اپنی بہن بیٹیاں سمجھتے ہیں اور
اُن کا اتنا ہی احترام کرتے ہیں جتنا کہ اپنی بہن بیٹیوں کا کرتے ہیں۔ چنانچہ پچھلے فسادات ہند میں ایک مثال بھی علاقہ میوات
میں ایسی نہیں ملتی جہاں کسی غیر مسلم عورت کی آبروریزی کی گئی ہو، یا کسی بچے، یا بوڑھے کو جانی و مالی گزند پہنچائی گئی ہو۔ چنانچہ
ان خصوصیات کا خاص طور پر مسٹر گاندھی اور پنڈت جواہر لعل نہرو اور دیگر بڑے بڑے لیڈروں نے بھی اعتراف کیا ہے
اور ہندوستان میں میوؤں کے اس رویہ نے ایک اعلیٰ اور بلند اخلاق کی مثال پیدا کر دی ہے۔ جس کے اندر دوسری قوموں کے
لئے درس عبرت بھی ہے۔ جہاں دوسری قوموں کے تعلیم یافتہ مہذب اور بڑے بڑے مذہبی لوگوں نے بربریت، وحشت، سفاکی
بداخلاقی اور کمینگی کا مظاہرہ کر کے عورتوں، بچوں اور بوڑھوں پر دست درازی کی ہے، وہاں ایک ان پڑھے اور اجڈ
میو قوم نے اپنی غیرت۔ حمیت۔ شجاعت۔ فراخ دلی۔ بے تعصبی اور احساس ذمہ داری اور اعلیٰ اخلاق کا ثبوت
دیا ہے۔

بھارت سے ترک وطن

قوم میو اپنے اصل وطن کو چھوڑ کر پاکستان آنے کے لئے تیار نہیں تھی کیونکہ ان کی نگاہوں
کے سامنے ماضی کا جو نقشہ تھا اس کی تکمیل کے لئے مستقبل میں جدوجہد کرنے کا جذبہ
اپنے اندر رکھتے تھے اور اس جذبے کے تحت وہ حوادث زمانہ کا مقابلہ کرنے کو تیار تھے۔ کیونکہ ان کے ماضی کی روایات خصوصیات
کا تعلق متھرا۔ اجمیر اور دہلی کی راجدھانیوں سے رہا ہے۔ لیکن بھارت کے ارباب اقتدار کی ستم رانیوں سے مجبور و مایوس ہو کر آخر اکتوبر ۱۹۴۷ء
میں فیصلہ کیا کہ حالات کے تقاضے کے تحت پاکستان کو ہجرت کرنی چاہئے۔ اس فیصلہ پر عمل کرنے سے پہلے مسٹر گاندھی سے ۲۰ ستمبر ۱۹۴۷ء
کو ایک نمائندہ وفد نئی دہلی میں ملا جس میں یہ خاکسار بھی شریک تھا۔ اس موقع پر پوری طرح اتمام حجت کرتے ہوئے اپیل کی گئی کہ ضلع
گوڑگانواں، متھرا، الور اور بھرت پور کے مسلمانوں کو پوری ذمہ داری کے ساتھ آباد رہنے دیا جائے۔ لیکن گاندھی جی کے جواب سے وفد
مطمئن نہ ہو سکا اور اس کے بعد پاکستان کی ہجرت کا فیصلہ کر لیا گیا۔ پاکستان میں آنے سے پہلے فسادی ہندوؤں اور ریاست الور اور
بھرت پور اور جے پور اور پٹیالہ کی فوجوں اور پولیس سے میوؤں کی جو جھڑپیں ہوئیں، اخبارات میں اُن کا ذکر آ چکا ہے۔ اس لئے یہاں
اُن کا ذکر کرنا ضروری نہیں۔ سردار پٹیل متوفی کی خاص خاص مہاراجگان کے مشورہ سے یہ کوشش تھی کہ علاقہ میوات کی وحدت کو توڑا جائے
اور ان کو یا تو بالکل ختم کر دیا جائے، یا ترک وطن پر مجبور کیا جائے، کیونکہ وہ نواح دہلی میں میواتیوں کے اجتماعی بلاک کو ایک خطرہ تصور
کرتے تھے۔ اس لئے جو سختیاں الور، بھرت پور اور گوڑگانواں میں فوجوں کے ذریعہ سے میواتیوں پر کی گئیں وہ بھی ایک داستان کی محتاج ہیں،
ورنہ محض قومی فسادات سے مجبور ہو کر میو قوم اپنے آباو اجداد کے وطن کو ہرگز نہ چھوڑتی، کیونکہ ان کے ماضی کے کارناموں نے ان کی سیاسی
معاشرتی حیثیت کو بہت مضبوط بنا رکھا تھا اور ان کے کارناموں سے خود ہندو قومیں کافی حد تک متاثر ہو گئیں تھیں۔ حکومت کی اپنی سوچی
سمجھی پالیسی نے میواتیوں کو پاکستان آنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ ان کا انخلاء اکتوبر کے آخر ہفتہ سے شروع ہو گیا۔ جو میواتی فسادات سے مجبور

ہوکر دہلی میں پناہ گزیں ہوئے تھے اُن کو ریلوں کے ذریعہ ستمبر اکتوبر ۱۹۴۷ء میں پاکستان بھیج دیا گیا۔ میوات کے باقی حصے کے لئے بمقام سہنہ ضلع گوڑگانواں ایک ریفیوجی کیمپ قائم کر دیا گیا' جہاں سے میواتی پیدل اور ریل کے ذریعہ پاکستان میں آنے کے لئے اکٹھے ہوتے تھے۔ چنانچہ پہلا قافلہ سہنہ سے ۴ نومبر دوسرا ۱۰ نومبر کو روانہ پاکستان ہوگیا۔ جو پیدل چلنے سے معذور تھے انہیں ریلوں کے ذریعہ پاکستان بھیجا گیا۔ ہندوستان سے علاقہ میوات کے انخلا کا جو پروگرام تیار کیا گیا تھا' اس کے رُو سے ۲۲ نومبر تک ساری آبادی کو پاکستان منتقل ہوجانا چاہئے تھا' لیکن ۱۴ نومبر کا پیدل قافلہ تیار تھا کہ اچانک مرکزی حکومت ہند نے قافلے کو روک دیا۔ جدوجہد کی گئی تو وہ قافلہ ۱۷ نومبر کو روانہ کیا گیا اور اُس کے بعد آخری پیدل قافلہ ۲۵ نومبر کو بھیجا گیا۔ یہ خاکسار اُس وقت بطور ایڈیشنل ڈسٹرکٹ ایوکیوئی آفیسر ریفیوجی کیمپ کا انچارج تھا۔ اور انخلا کے کام میں رضاکارانہ خدمات سرانجام دے رہا تھا۔ نہ معلوم کن اسباب کے تحت چوہدری محمد یٰسین خاں جو اپنے علاقہ میوات سے مشرقی پنجاب اسمبلی کے ایم۔ ایل۔ اے منتخب ہوئے ہیں' اور میواتیوں کے ممتاز لیڈروں میں سے ایک ہیں اور جن کے علاوہ بعض دوسروں کے ساتھ گرفتاری کے وارنٹ جاری تھے اور جو اپنی گرفتاری سے بچنے کے لئے دہلی میں روپوش تھے' مرکزی حکومت ہند سے ساز باز کرکے ۱۶ نومبر سہنہ کیمپ میں انخلا و میوات کو روکنے کے لئے آئے ہوؤں کو روکنے کی پوری کوشش کی گئی۔ چنانچہ میوات کے آدھے حصہ کو روکنے میں وہ کامیاب ہوگئے۔ قوم میو کی یہ تقسیم ایک خاص حکمت عملی کا نتیجہ ہے۔ جس کی تفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں!

یہ خاکسار ۱۱ فروری ۱۹۴۸ء کو بذریعہ ریل تقریباً ۵ ہزار میواتیوں کا آخری قافلہ لے کر پاکستان پہنچا اور اُس کے بعد عام مہاجرت کا سلسلہ بند ہوگیا۔

میواتیوں کا ورود پاکستان

جو میواتی فسادات کے دوران میں اپنے گھروں سے نکل کر دہلی میں پناہ گزیں ہوئے وہ ماہ ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۷ء میں بذریعہ ریل پاکستان پہنچے۔ پاکستان میں جہاں کہیں اُن کو حکومت نے چاہا' بے جگہ آباد کر دیا۔ یہ میواتیوں کا بھارت سے انخلا کا پہلا گروہ تھا۔ اور عام طور پر یہ لوگ ریاست ہائے الور و بھرت پور کے مہاجر تھے۔

میواتیوں کا دوسرا گروہ کچھ پیدل قافلوں کی صورت میں اور کچھ بذریعہ ریل ضلع گوڑگانواں کے ریفیوجی کیمپوں سے روانہ ہوکر نومبر و دسمبر ۱۹۴۷ء اور جنوری و فروری ۱۹۴۸ء میں براستہ ہیڈ سلیمان و فاضلکا پاکستان پہنچتا رہا۔ اِس گروہ کا بیشتر حصہ اضلاع لاہور۔ شیخوپورہ اور سیالکوٹ میں ڈال دیا گیا۔ باقی ماندہ حصہ منٹگمری۔ ملتان۔ لائلپور میں بکھیر دیا گیا۔

میواتیوں کا تیسرا گروہ عام انخلا کے بعد وقتاً فوقتاً کھوکھراپار (سندھ) کے راستہ سے آتا رہا اور تاحال آرہا ہے۔ اور یہ گروہ کچھ سندھ میں اور جہاں جہاں ان کے خاندان کے لوگ مغربی پنجاب میں آباد ہو رہے ہیں منتشر طور پر ٹِک گیا ہے۔

میں میواتیوں کے دوسرے گروہ کے آخری مہاجرین کے ہمراہ بذریعہ ریل پہنچا اور مجھ سے قبل میواتیوں کے بہت سے سربرآوردہ حضرات اور ہردو سابقہ ایم۔ ایل۔ اے صاحبان چوہدری مہتاب خاں صاحب اور پیرزادہ مولوی احمد جان صاحب یہاں پہنچ چکے تھے۔

میواتیوں کی پاکستان میں آباد کاری

عام طور پر پاکستان میں مہاجرین کی آباد کاری کسی خاص سوچی سمجھی سکیم کے تحت نہیں ہوئی اور نہ ہی اُس کے لئے ابتدا میں کوئی خاص منصوبہ تیار کیا گیا۔ جوں جوں مہاجرین آتے رہے اور جہاں جہاں وہ جگہ پاتے رہے' دیہات اور شہروں میں آباد ہوتے رہے اور جو نہ بیٹھ سکے اُن کے لئے مہاجرین کیمپ قائم کر دیئے گئے۔ اور میواتی بھی اِس بے منصوبہ آباد کاری کے پیدا کردہ حالات کے تحت مغربی پنجاب اور مغربی پاکستان کے دوسرے حصوں میں جگہ پکڑتے چلے گئے۔ البتہ حکومت نے ابتدا میں یہ ہدایات جاری کر دیں کہ میواتیوں اور راعوانوں کو سرحدات پر آباد کیا جائے۔ چنانچہ اِس آباد کاری کے تحت میواتی آبادی کا کثیر حصہ ضلع لاہور اور سیالکوٹ میں اکٹھا کر دیا گیا۔ باقی حصہ دیگر اضلاع میں منتشر ہوگیا۔ متعدد بار کوشش

کی گئی کہ ضلع وار آبادکاری کی جائے۔ اِس سلسلہ میں حکومت سے دوسرے مہاجرین کے ہمراہ میواتیوں نے بھی متعدد بار درخواستیں پیش کیں کہ مہاجرین کی ضلع وار اور دیہہ وار آبادی ہی میں مہاجرین اور مملکت پاکستان کا مفاد مضمر ہے' اور یہی ایک واحد حل مہاجرین اور ملک کی فلاح وبہبود کا ضامن ہے۔ لیکن حکومت نے نہ معلوم کن اغراض کے تحت اِن عرض داشتوں پر کان نہ دھرا اور مہاجرین کی آبادکاری کا یہ مسئلہ تاہنوز تشنۂ تکمیل ہے۔ حکومت کے اِس رویہ سے میواتی قوم سخت مایوس ہوئی کیونکہ میواتیوں کی اپنے سابقہ وطن میں ہزاروں سالوں کی یکجائی آبادی نے انہیں منفرد خاص اجتماعی اور قومی خصوصیات پیدا کر دی تھیں۔ اِن خصوصیات کا منتشر طور پر آباد ہونے کی صورت میں مفقود ہو جانے کا بہت زبردست امکان اور خطرہ پیدا ہو گیا' کیونکہ اس سے میواتیوں کی زندگی کے مختلف شعبوں کے علاوہ اُن کے اجتماعی اخلاق پر بھی ضرب کاری لگتی تھی۔ اِس صورتِ حال سے ناامید ہو کر قوم کے سربرآوردہ لوگوں نے پاکستان میں منتشر خاندانوں کو یکجا کرنے کی بطور خود بھی کوشش کی' لیکن اِس میں بھی کوئی کامیابی نہ ہو سکی۔ کیونکہ خلاف از توقع یہاں پر نسلی اور لسانی تعصب کی آگ بھڑک اُٹھی' جس سے حالات اصلاح پذیر ہونے کی بجائے تخریبی اور نقصان دہ شکل اختیار کرتے چلے گئے۔ میواتیوں کی آبادکاری کا تعلق زیادہ تر دیہاتی علاقوں سے ہے۔ شہری آبادکاری سے نہ اُن کو ہندوستان میں کوئی تعلق تھا اور نہ پاکستان میں ہو سکتا ہے۔ یہ لوگ عام طور پر زراعت پیشہ ہونے کی وجہ سے دیہاتی زندگی کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ دیہاتی آبادکاری صوبہ پنجاب میں حسبِ ذیل مراحل سے گزر رہی ہے۔

(۱) آبادکاری کا پہلا مرحلہ اراضی کی عارضی الاٹمنٹ کا تھا' اور گورنمنٹ کی منظور شدہ سکیم کے تحت جن لوگوں کا پیشہ کاشتکاری تھا اُن کو گزارے کے لیئے عارضی طور پر پانچ ایکڑ تا آٹھ ایکڑ فی خاندان اراضی الاٹ کرنے کی ہدایات جاری کر دی گئیں۔ اِس سکیم کے تحت دیہات کی اچھی اچھی اراضیات مقامی مزارعان کو جو ۱۹۴۷ء میں غیر مسلموں کے مزارعے تھے' آٹھ ایکڑ فی کنبہ کے حساب سے محکمہ آبادکاری کے ماتحت عملہ کی سازباز سے الاٹ کر دی گئیں۔ اس کے بعد دوسری قسم کی اچھی اراضیات اور مکانات نزدیک سے آنے والے مہاجرین نے حاصل کر لیں اور باقی ماندہ اراضیات اور مکانات میواتی مہاجرین کے حصہ میں آئیں جو قدرتی طور پر دوسری کے مقابلہ میں کمتر حیثیت کی تھیں۔ علاوہ ازیں دوسرے مہاجرین کے مقابلہ میں متروکہ مویشی اور سامان بھی اِن بعد میں آنے والے مہاجرین کے حصہ میں بہت کم آ سکے۔ متروکہ اراضیات کی اِس عارضی الاٹمنٹ اور متروکہ مویشیاں اور دیگر اشیاء کی تقسیم میں جو بے ضابطگیاں اور بدعنوانیاں اور بددیانتیاں اور ہر قسم کی حرکات ماتحت عملہ آبادکاری نے کی ہیں ان کے بیان کے لیئے ایک دفتر درکار ہے۔ یہ بداخلاقی کی ایک گندی تاریخ ہے۔ جس کا سیلاب روزافزوں رفتار سے بڑھ رہا ہے۔

(۲) آبادکاری کا دُوسرا مرحلہ یہ تھا کہ حکومت نے ہندوستان کی متروکہ جائداد کے بدلے پاکستان میں مستقل اراضی دینے کے لیئے اراضیات کے مہاجر مالکان کو اپنے استحقاق کے دعاوی داخل کرنے کی ہدایات جاری کیں اور ساتھ ہی یہ بھی احکام جاری کر دیئے کہ منتشر خاندان ایک جگہ اکٹھے ہونے کے لیئے اپنے دعاوی فارم داخل کریں۔ اصول یہ ٹھہرا کہ جس دیہی علاقہ میں کسی خاندان کے لوگ زیادہ تعداد میں آباد ہوئے ہیں اس کے بقیہ افراد وہاں زمین حاصل کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اس طرح میواتیوں نے اپنی مستقل اراضی حاصل کرنے کے لیئے عام طور سے اضلاع لاہور اور سیالکوٹ کے دیہی علاقوں کے لیئے درخواستیں دیں اور فارم داخل کیئے۔ کیونکہ انہی علاقوں میں اُن کے سابقہ علاقہ خاندان اور ان کے عزیز و اقارب آباد تھے۔ اراضیات کے اِس قسم کے دعاوی داخل کرنے کے بعد حکومت نے ہندوستان کے سابقہ دیہات کی جمعبندی منگا کر داخل شدہ فارموں کی تصدیق شروع کر دی اور یہ سلسلہ ۱۹۵۰ء سے شروع ہو کر تاہنوز جاری ہے۔ مہاجرین کو فارموں کی تصدیق کے سلسلے میں بھی بڑی زیرباری کا شکار ہونا پڑ رہا ہے۔ اور بڑی پریشانیوں اور الجھنوں میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ دعاوی فارم غلط تصدیق ہونے کی صورت میں عذرداری کر کے درستی کے لیئے واپس کیئے جاتے ہیں

جس کی وجہ سے مہینوں اور سالوں گزار جاتے ہیں۔ بعض غریب مہاجروں کے فارم تصدیق ہو کر نہیں پہنچتے اور مستقل اراضی کی الاٹمنٹ سے محروم رہتے ہیں اثر و رسوخ والے اور بڑے بڑے مالک مہاجر اپنے دعاوی فارم دنوں اور ہفتوں میں تصدیق کرا لیتے ہیں۔ اور فوراً مستقل اراضی حسب منشا جہاں چاہتے ہیں حاصل کر لیتے ہیں۔ شومئی قسمت سے محکمہ آبادکاری کے عملہ کے تغافل اور فرض ناشناسی کا شکار میواتی مہاجر عام طور پر ہو رہا ہے۔ باوجود زیرباری کے بوجہ دعاوی فارم تصدیق نہ ہونے کے ایک طرف اتنی عارضی الاٹ شدہ اراضی سے محروم ہو رہا ہے اور دوسری طرف بروئے استحقاق مزید اراضی کے حاصل کرنے میں ناکام ہے۔ مزید برآں ریاست ہائے الور و بھرت پور کی جمعبندی نہ آنے سے میواتی مہاجرین کی پوری حق رسی نہیں ہو رہی ہے۔ اور اُنکی اراضی کا تقریباً ½ بمشکل دیا جاتا ہے۔ اور نہ معلوم اُنکی سابقہ دیہات کی جمعبندی آنے پر ان کا باقی رقبہ کہاں پورا کیا جائیگا۔ کیونکہ جن دیہات میں وہ آباد ہیں اُن میں باہر سے لاکر دوسرے مہاجروں کو آباد کیا جا رہا ہے۔ یہ امر بھی میواتی مہاجروں کے لئے پریشان کن اور پیچیدہ مسئلہ بن گیا ہے۔

(۳) دیہاتی آبادکاری کا تیسرا مرحلہ۔ دعاوی فارموں کے تصدیق ہونے کے بعد شروع ہوتا ہے اپریل ۱۹۵۱ء سے اراضیات کا عارضی مستقل بندوبست تیزی کے ساتھ حکومت نے شروع کر رکھا ہے اور عارضی مستقل آبادکاری کے سلسلہ میں گورنمنٹ نے تمام ہدایات کو جمع کر کے "دستور العمل آبادکاری اراضیات" کے نام سے شائع کر کے ماتحت عملہ آبادکاری کو عملدرآمد کرنے کے لئے دے دیا ہے۔ تاکہ ان ہدایات کی روشنی میں اراضیات کی مستقل الاٹمنٹ کی جائے۔ یہ ہدایات گورنمنٹ کی اپنی شائع کردہ ہیں اور ان ہدایات کی ترتیب میں مہاجرین کے نمائندوں اور ذہین طبقے سے کوئی مشورہ نہیں لیا گیا۔ اِن ہدایات سے مہاجرین کو اگرچہ اتفاق نہیں ہے تاہم ہماری یہ رائے ہے کہ اگر حکومت کی شائع کردہ ہدایات پر آبادکاری کا ماتحت عملہ عمل کرتا تو مہاجرین کی موجودہ پریشانی اور مشکلات ایک حد تک کم ہو جاتیں۔ لیکن آبادکاری کے ماتحت عملہ نے اپنی طبع [illegible] کے زیر اثر اِن ہدایات کو یکسر نظرانداز کر دیا ہے۔ اور اپنی من مانی کارروائی کر رہے ہیں۔ اِس وجہ سے غریب مہاجر بالکل پریشان حالی میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ رشوت کا بازار گرم ہے۔ ناانصافی عام ہے' اقربا نوازی اور اثر رسوخ زوروں پر ہے۔ بڑے بڑے لوگ باہر آکر رشوت اور اپنے اثر رسوخ کے زور سے دیہات میں پہلے سے بسے ہوئے چھوٹے چھوٹے مالکوں کو اکھیڑ رہے ہیں چھوٹے مالکوں کی عارضی الاٹمنٹیں منسوخ کر کے بڑے لوگوں کو زمینوں کی مستقل الاٹ منٹ کی جا رہی ہے۔ پولیس کے ذریعہ اُن کو پٹائی بھی دلائی جاتی ہے اور ہر معاملہ میں ان کی پشت پناہی کی جاتی ہے۔ سابق آباد شدہ مہاجروں کو بجائے بسانے کے اجاڑ کر پریشان کیا جا رہا ہے۔ یہ حالت زیادہ تر لاہور کے ماجھہ کے علاقہ میں پائی جاتی ہے' نیز عام طور سے میواتی مہاجر اس ظلم اور ناانصافی کا شکار ہوتا ہے۔ ضلع لاہور کے ماتحت عملہ آبادکاری کی بداعمالیاں افسران بالا کے نوٹس میں متعدد بار دلائی جاتی ہیں۔ لیکن حالات نہیں سدھرتے۔ ماتحت عملہ آبادکاری کی غلط اور ناجائز مستقل الاٹمنٹ کے خلاف اپیلیں ہو رہی ہیں اور کامیاب ہوتی ہیں۔ لیکن پھر بھی حالات قابو میں نہیں آرہے ہیں اور غلط کار عملہ کے خلاف ابھی تک کوئی عبرت ناک قدم نہیں اُٹھایا گیا ہے اور نہ ہی اُن سے کوئی بازپرس کی گئی ہے۔ آبادکاری کے ماتحت عملہ نے میواتی مہاجرین کو اپنے اعزہ و اقارب کے پاس اکٹھا آباد ہونے کی اسکیم کو ایک حد تک ناکامیاب بنا دیا ہے۔ کیونکہ جن لوگوں نے اپنے دعاوی فارم دوسری جگہوں سے لاکر ضلع لاہور میں اپنے عزہ و اقارب کے پاس آباد ہونے کے لئے داخل کر دیئے تھے اُن کو محض اِس بہانہ سے مستقل الاٹمنٹ سے محروم کر دیا ہے کہ وہ اِس دہ میں غیرالاٹی ہیں۔ حالانکہ ضلع لاہور میں گورنمنٹ کی ہدایات کے تحت الاٹی اور غیرالاٹی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ تعجب یہ ہے کہ میواتی مہاجر کو تو اِس بہانہ سے الاٹ منٹ سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ لیکن دوسرے مہاجروں کے دعاوی دیگر اضلاع یا دیہات سے تبدیل کرا کے اُن کو مستقل الاٹ منٹ کر دی جاتی ہے۔ حالانکہ وہ بھی غیرالاٹی ہوتے ہیں اور میو مہاجر سے بعد میں اپنے دعاوی اُس دِہ میں لاتے ہیں۔ یہ قومی تعصب میواتی مہاجر کے ساتھ عام طور سے برتا جاتا ہے وہ

غریب بلا چوں و چرا اس کی بھینٹ چڑھ رہا ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس خیانت کا ساز آبادکاری کی بیل کیسے منڈھے چڑھتی ہے۔

بہر حال میواتی مہاجر عام طور سے جہاں کہیں بھی ہے پریشان و غیر مطمئن ہے اور ما تحت عملہ آبادکاری کی ہتکنڈہ بالا حرکات سے مایوس ہو چکا ہے اور وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ حالات کس طرح سے درست ہو سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں سرحدات پر میوؤں کو مستقل طور پر آباد کرنے کا جو نظریہ حکومت نے قائم کیا تھا وہ بھی بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے۔ اب سرحدات پر متفرق مہاجر باہر سے لا کر آباد کئے جا رہے ہیں، نیز مقامی لوگوں کو بھی بلا امتیاز سرحد پر بسانے کی رعایت دی جا رہی ہے۔ غرضیکہ حکومت کی آبادکاری کی موجودہ اسکیم نے دیہات میں مختلف عناصر کو ایک جا آباد کر کے اور ان کے مفاد کو باہم متصادم کر کے پیچیدہ اور مشکل تر بنا دیا ہے۔ جس کی وجہ سے دیہات میں روزمرہ کے باہمی فساد واقع ہو رہے ہیں فسادات کے زیر اثر حد درجہ ناخوشگوار ماحول پیدا ہو رہا ہے اور یہ ماحول ایسا محسوس ہوتا جا رہا ہے کہ اس میں بگاڑ پیدا کرنے والے عناصر کے لئے آسانیاں ہیں، مگر سدھار پیدا کرنے والوں کے لئے قدم قدم پر مایوس کن رکاوٹیں ہیں۔

حرف آخر یوں تو یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ مہاجروں کی آبادکاری کسی خاص نہج یا کسی خاص منصوبہ کے تحت نہیں کی گئی ہے اور انہی کوتاہیوں اور خامیوں کی وجہ سے مہاجر پاکستان میں غیر مطمئن اور پریشان ہیں اور وہ اپنا مستقبل بالکل تاریک پاتے ہیں۔ ہماری رائے میں صحیح طریق یہ ہوتا کہ:-

(۱) ابتدا ہی میں مہاجروں کے ضلع وار اور علاقہ وار نمائندوں کو اعتماد میں لے کر ایک مشترکہ بورڈ بنایا جاتا اور گورنمنٹ کے نمائندے اس میں شریک ہو کر غور و خوض کے بعد مہاجروں کی آبادکاری کے لئے ایک مخصوص تفصیلی منصوبہ تیار کرتے اور وہ اس منصوبہ کو بہ ضلع اور علاقہ کی بنیاد پر کھڑا کرتے تو موجودہ انتشار اور پریشانی ایک حد تک کم ہو جاتی۔

(۲) یہ غیر مسلموں کی متروکہ جائداد منقولہ و غیر منقولہ کی حفاظت اور اس کی مساویانہ اور منصفانہ تقسیم کے ضروری اور مناسب اقدام کئے جاتے تو یقیناً مہاجرین کی اقتصادی حالت ایک حد تک درست ہو جاتی اور موجودہ بدحالی کا انسداد ممکن ہوتا، نیز حکومت کے خزانہ عامرہ کو بھی بڑا فائدہ پہنچتا۔ اس معاملہ میں حکومت کے تغافل نے قوم کی طمع نفسانی بڑھنے میں بڑی امداد کی اور بدیں وجہ قوم کے افراد لوٹ کھسوٹ کرنے میں آزاد ہو گئے۔ اور دولت اکٹھا کرنے کے خیال میں حلال اور حرام کی امتیاز کھو بیٹھے۔ اس طرح مہاجرین کی بحالی کے کام میں دقتیں بڑھتی ہیں۔

(۳) میواتی قوم کا جو حصہ علاقہ میوات میں مجبوراً چھوڑ دیا گیا ہے اُس کا انخلا کیا جاتا اور تمام میواتی قوم کو اضلاع سیالکوٹ، شیخوپورہ اور لاہور میں اکٹھا ان کے سربرآوردگان کے مشورہ سے ان کی پرانی روایات کی روشنی میں اور اسلامی تعلیم و تنظیم کے ساتھ آباد کیا جاتا تو یہ لوگ پاکستان کے لئے بنیانٌ مرصوص ثابت ہوتے۔ نیز ہمارے دوسرے راجپوت بھائی اُن کے دوش بدوش ضلع منٹگمری اور اُس کے نواح میں آباد کئے جاتے تو مغربی پنجاب کی مشرقی سرحدات کا دماغ مضبوط ہو جاتا۔ میواتی قوم کے ہندوستان و پاکستان میں تقسیم ہو جانے کی وجہ سے پرانا نظام پنچایت بالکل درہم برہم ہو گیا ہے۔ کیونکہ اُن کی پالوں اور گوتوں کے کچھ حصہ پاکستان آ گئے ہیں اور کچھ ہندوستان میں رہ گئے ہیں۔ اور یکجہتی کی ٹوٹ پھوٹ نے اِن کے اطمینان قلب کو ضرب کاری لگا رکھی ہے۔ اور اب پاکستان میں بھی ان کو منتشر طور پر آباد کرنا۔ انہیں قومی و ملی خصوصیات سے محروم کرنے کے مترادف ہے۔

بقیہ چند غیر ملکی شخصیتیں صفحہ ۳۲۰

چال کا ایک آدھ محاورہ آ ہی جاتا ہے۔ محمد بہجۃ البیطار۔ ابراہیمی صاحب کے شاگرد ہیں اور ہلالی صاحب بھی انشاء اور خطابت میں بشیر ابراہیمی سے بہت پیچھے ہیں۔ لیکن بول چال میں ٹکسالی زبان کا دامن نہ چھوڑنا یہ ان دونوں بزرگوں کی خاص خصوصیت ہے۔ بشیر ابراہیمی صاحب کی بلند شخصیت اور انشاء و خطابت میں ان کے اعلےٰ مقام کے لحاظ سے سخن گسترانہ فقرے زبانِ قلم پر آ گئے ورنہ عربی زبان و ادب میں ان کا جو مقام ہے اس پر ان معمولی کوتاہیوں کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

تقدس بسرم

- جیسے امام احمدؒ بن حنبل نے کیا تو کوڑے کھائے ،
- جیسے امام ابو حنیفہؒ نے کیا تو لہولہان ہوئے ،
- جیسے مجدد الف ثانیؒ نے کیا تو گوالیار کے قلعے میں نظر بند کیے گئے

اسی کا ارتکاب جب کچھ سرپھروں نے پاکستان میں کیا

تو

اقتدار کے ماتھے پر بل پڑ گئے
سیفٹی ایکٹ حرکت میں آگیا
اور مجرم حوالۂ زنداں کر دیے گئے

یہ تین خطرناک آدمی تھے !

- مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی ● مولانا امین احسن اصلاحی ● میاں طفیل محمد بی اے ایل ایل بی

یہ حضرات کس جرم کے مجرم تھے ؟
کیسے ان کو گرفتار کیا گیا ، اور کہاں سے کہاں لے جایا گیا ؟
جیل میں انہوں نے کس جذبے کے ساتھ ۲۰ ماہ گذارے ؟
زمانۂ اسیری میں انہوں نے اپنے نصب العین کی کیا خدمت کی ؟
جیل سے باہر کی دنیا کو انہوں نے کیا جذبات دیے ؟

ملاحظہ فرمائیے

مکاتیبِ زنداں

صفحات ۲۰۸
مجلد مع گرد پوش
قیمت : دو روپے

یہ
پوری کی پوری
"رودادِ قفس"
تینوں نظر بندوں کے خطوط کے مجموعے کی شکل میں
مرتب ہو کر
شائع ہو چکی
ہے

مکتبۂ چراغِ راہ کراچی

زلزلے بام و در پر ہی نہیں آتے ——— دلوں اور دماغوں پر بھی آتے ہیں !

تاکہ

فرسودہ خیالات اور بوسیدہ قدریں تلپٹ ہو جائیں !

اور تعمیرِ نو کے لئے میدان ہموار ہو !

نعیم صدیقی

جو آج اسلامی ادبی محاذ کا ایک جانباز سپاہی ہے ،

اس کے دل و دماغ بھی زلزلوں سے دو چار ہوئے تھے !

ان زلزلوں کی لہروں کو جب اُس نے پورے سماج پر طاری کرنا چاہا

تو اس کے سحرِ تخیل سے وہ افسانے بن گئے

نعیم صدیقی کے انہی افسانوں کا اولین مجموعہ

"ذہنی زلزلے"

کے نام سے ۱۹۴۵ء میں پہلی بار شائع ہوا

اور مصنف کی اس ابتدائی کوشش نے دنیائے ادب میں اپنی جگہ پیدا کر لی

اب

"مکتبۂ چراغِ راہ" اس کا دوسرا ایڈیشن پیش کر رہا ہے

ضخامت ۱۸۵ صفحات

طباعتی معیار اعلیٰ

قیمت دو روپے

مکتبۂ چراغِ راہ کراچی

۳۳۰

پیہم قدم آگے بڑھا رہے ہیں

نیا پروگرام اشاعت

تفسیر

مقدمۂ تفسیر نظام القرآن (ترجمہ) ——— مولانا حمید الدین فراہیؒ

اشتراکیت

فریب نظر (ترجمہ) ——— فریدہ اٹلے

روس کے میدانوں میں (ترجمہ) ——— پیچخوف

علمیات

تخریب و تعمیر (مقالات) ——— نعیم صدیقی

معرکۂ اسلام و جاہلیت ——— صدر الدین اصلاحی

شعر و ادب

مجموعۂ کلام ——— ماہر القادری

مجموعۂ کلام ——— نعیم صدیقی

افسانوں کا مجموعہ ——— جیلانی بی اے

بہترین نظموں کا انتخاب ——— حلقۂ ادب اسلامی

عربی زباندانی

عربی کمپوزیشن ——— مولانا مسعود عالم ندوی

اس پروگرام کو عمل میں لانے کے لئے ہمارے ہاتھ مضبوط کیجیے

مکتبہ چراغ راہ کراچی

حاذق نروائن پلز

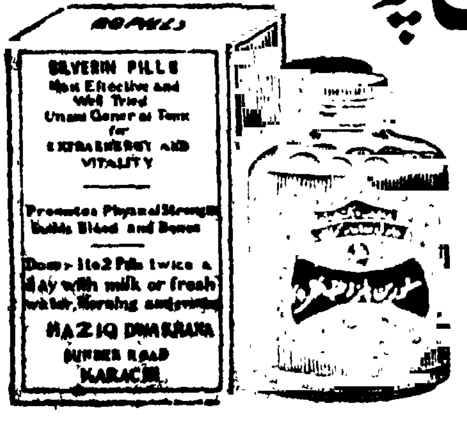


حبّ خاص

ایک جنرل ٹانک ہے جو عصبی اور دل اور دماغ کی کمزوریوں کا مجرّب علاج ہے۔ یہ گولیاں دماغی کام کرنے والے حضرات یعنی وکیل، بیرسٹر، پروفیسر اور طالب علم اصحاب کے واسطے آبِ حیات کا کام دیتی ہیں اور جسمانی کی جملہ عصبی کمزوریوں کو بحال کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ دواخانہ خاص مجربات میں سے ہیں۔

خوراک	۱۰ یوم	۲۰ یوم	۴۰ یوم
پیکنگ	۲۰ گولی	چالیس گولی	۸۰ گولی
قیمت	2/-/-	3/12/-	6/-/-

مقویاتِ سرتاج سلورین پلز



مردوں کے لئے ایک اچھا متوازن اور آج کل کا آزمودہ جنرل ٹانک ہے جو بھوک کو بڑھاتا ہے اور جسم میں تازہ اور سرخ خون پیدا ہوتا ہے۔ قوت اور طاقت پیدا کرتا ہے۔

سلورین

پر آپ بھروسہ کر سکتے ہیں۔ قیمت ۴۰ گولی چار روپے بارہ آنے۔ ۸۰ گولی ۹ روپے

تیار کردہ:- حاذق دواخانہ۔ بندر روڈ۔ کراچی

غلام محمد پرنٹر پبلشر نے ناظر پرنٹنگ پریس میکلوڈ روڈ سے طبع کرا کر شائع کیا

فروری ۱۹۵۳ء

فہرست مندرجات

دفتر ماہنامہ چراغِ راہ ۹۔ لوٹیا بلڈنگ آرام باغ روڈ۔ کراچی

ادب میں اسلامی قدروں کا علمبردار

چراغ راہ

بہ ادارت: نعیم صدیقی

جلد ۶
شمارہ ۲

چندہ سالانہ
پاکستان صہ —— بھارت ۶ر
فی پرچہ
۸ آنے

سوچ بچار :-

دستوری رپورٹ پر علمائے پاکستان کا تبصرہ اور ترمیمی تجاویز

اس مرتبہ سوچ و بچار کے صفحات کو ہم ایک نہایت ہی قیمتی تاریخی دستاویز کے لئے وقف کر رہے ہیں۔ بنیادی اصولوں کی نئی رپورٹ کا ایک ردِ عمل وہ ہے جو اس برسرِ اقتدار طبقے کی طرف سے سامنے آیا جو اپنے آپ کو ترقی پسندی کی اونچی چوٹی پر تخت نشین سمجھ کر اسلام کے نام لیواؤں پر مُلّا کی پھبتی چست کرتا رہا ہے۔

اس جدید اور ترقی پسند طبقے نے جس بے نظمی اور بے تکے پن سے رپورٹ کے بارے میں بھانت بھانت کی بولیاں بولی ہیں، اور جس نفس پرستانہ ذہنیت کے ساتھ اپنی ساری توجہ صرف ان مباحث پر مرتکز کر دی ہے جن سے اس کے مفاد کا براہ راست تعلق تھا اور جس طرح باہم دگر اختلاف بلکہ مخالفت کا مظاہرہ کیا ہے اس سے یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ ہمارے ملک کا اصل رجعت پسند، اصل مفاد پرست، اصل جھگڑالو، اصل تنگ ظرف اور کوتاہ بین، اور اصل بے نظم طبقہ یہی ہے۔ حق یہ ہے کہ اگر ملائیت کی گالی کا کوئی صحیح مستحق ہمارے ملک میں پایا جاتا ہے تو وہ یہ گروہ ہے۔

اس گروہ کی مفاد پرستی کا حال یہ ہے کہ اسے اس بات سے سرے سے کوئی غرض نہیں ہے کہ اس رپورٹ کے ذریعہ قوم پر آزادی و خوشحالی کے دروازے کھلتے ہیں یا نہیں۔ اس کے ذریعہ اسلام کے احیاء کے سامان ہوتے ہیں یا نہیں، اس کے ذریعہ باشندگانِ ملک کے انسانی اور جمہوری حقوق بحال ہوتے ہیں یا نہیں۔ اس کی توجہ ہر طرف سے منہ موڑ کر سیدھی لپکتی ہوئی جس جگہ جا کر رکی ہے وہ وفاقیہ میں پاکستان کے مشرقی و مغربی اقطاع کی مساویانہ نمائندگی (Parity) کا مسئلہ ہے۔ کیونکہ اس مسئلہ کی لپیٹ میں ان کی کرسیوں اور ان کی نشستوں کی تعداد کا اور ان کے لئے آگے بڑھنے کے مواقع کا اہم ترین سوال آتا ہے۔

اس معاملے میں بھی بے اصولی کا عالم یہ ہے کہ خود مسلم لیگ کے اجلاسِ ڈھاکہ میں یہ حضرات مل کر اسے طے کرتے ہیں، خود مسلم لیگی پارٹی کے اکابر اسے رپورٹ میں لاتے ہیں اور پھر کچھ مسلم لیگی اس کی حمایت کرتے ہیں اور کچھ اس سے اختلاف کرتے ہیں وہ بھی اس بھونڈے طریق سے کہ مشرقی پاکستان سے کچھ اور صدا اٹھتی ہے، پنجاب سے کچھ اور، سرحد سے کچھ اور، اور مرکز سے کچھ اور۔ سب سے زیادہ کمال جو دکھایا ہے تو دولتانہ صاحب نے جنہوں نے ایک ہفتہ کے اندر اندر کئی بیان دیئے ہیں جن میں سے ہر ایک دوسرے کی تردید تھا۔ ان بیانات میں موصوف نے ہر ممکن فارمولے کی حمایت بھی کر ڈالی ہے اور مخالفت بھی!

یہ مساویانہ نمائندگی کا مسئلہ نہ عوام کا پیدا کردہ ہے، نہ عوام اسے حل کریں گے بلکہ یہ ان حضرات کا اپنا پیدا کردہ ہے اور یہ خود ہی جب تک اسے حل نہ کر لیں گے اس کا کوئی حل نہیں ہے۔ صوبجاتی تعصب کی وبا ہمارے عوام میں اب تک نہیں پھیلی ہے بلکہ یہ بیماری صرف ہمارے مرکزی اور صوبائی اکابر تک محدود ہے اور اس کا سرچشمہ صرف جاہ و اقتدار کی ہوس ہے۔ چنانچہ اس سے جو مسائل پیدا ہوتے ہیں خود ان کے اندر پیدا ہوتے ہیں، اور وہ اگر حل ہوں گے تو خود ان کے درمیان سمجھوتہ ہو جانے سے حل ہوں گے۔ مساویانہ نمائندگی کا مسئلہ ہرگز عوامی نہیں ہے کیونکہ سابق رپورٹ میں وفاقیہ کی ترتیب دنیا کے عام معروف طریقے پر رکھی گئی تھی اور اس پر آج تک ملک بھر میں کوئی صدائے احتجاج بلند نہیں ہوئی۔ بغیر اس کے کہ اس کے

خلاف کوئی ایجی ٹیشن ہوا ہوتا۔ نئی رپورٹ میں اس تجویز کو لانے کے معنی یہ ہیں کہ یہ مسئلہ خود ان حضرات کے اپنے مفادات کے تصادم سے پیدا ہوا ہے
پھر ان حضرات کا عالم یہ ہے کہ یہ اپنی مفاد پرستی میں یہاں تک آگے بڑھتے جا رہے ہیں کہ ان کی مجالس میں پاکستان کے دونوں اقطاع کی نیم علیحدگی اور علیحدگی تک کی تجاویز زیر بحث آنے لگی ہیں اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ یہ طبقہ اپنی جاہ پرستی کی بساط پر پاکستان کی وحدت و سالمیت اور اس کے استحکام کو بھی داؤں میں رکھنے کے لئے بے باک ہو سکتا ہے۔
اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ کتنا خطرناک عنصر ہے اور اس سے نجات پانے کے لئے عوام کو کس قدر بے چین ہونا چاہئے۔

• • •

دوسری طرف اس ملک کا دینی عنصر تھا کہ جس نے رپورٹ کے سامنے آنے سے قبل جب ایک بار یہ فیصلہ کر لیا کہ اس رپورٹ پر منفرداً اظہار خیال نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ متفقہ طور پر ہی اس پر ناقدانہ نگاہ ڈال کر ترامیم پیش کی جائیں گی۔ تو پھر کوئی دینی گروہ اور کوئی فرد ایسا نہ تھا جو اس فیصلے کو پامال کرتے ہوئے اپنی آواز قبل از وقت بلند کرے۔ اس عنصر کے سامنے ساری بحثیں ہوتی رہیں لیکن یہ پورے صبر سے سنتا رہا۔ مگر مشترک فیصلہ ہونے سے قبل کسی نے زبان نہ کھولی۔
پھر اس عنصر کے نمائندہ علماء نے کراچی میں جمع ہو کر غور بھی کیا تو صحیح معنوں میں غور کیا۔ اور پورے اطمینان سے رپورٹ کا مطالعہ کیا اور پوری تفصیل سے ایک ایک باب اور ضمن پر اظہارِ رائے کیا۔
جانے کتنے لوگ اس انتظار میں بیٹھے رہے کہ اب علماء میں جھگڑا ہونے کی اطلاع آتی ہے اور اب کانفرنس ناکام ہوتی ہے اور پھر ساتھ کے ساتھ پروپیگنڈا ہوتا رہا کہ ملا مجوزہ بورڈوں میں جگہ پانے کے لئے بے قرار ہیں اور ان کی مجلس میں سیٹوں کی تقسیم پر سمجھوتہ نہیں ہو رہا ہے وغیرہ لیکن یہ حضرات ٹھنڈے دل سے اپنی جگہ اپنا کام کرتے رہے۔ اور آج ان کی طرف سے ایک متفقہ تبصرہ ملک کے سامنے ہے۔

• • •

اس تبصرہ میں شروع سے آخر تک جو حقیقت نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ موجودہ حکمران گروہ کے بالمقابل علماء نے جس شے کی فکر کی ہے وہ اسلام کا احیاء، دین کی تجدید اور کتاب و سنت کے قانون کے عملی نفاذ کا معاملہ ہے۔ انہوں نے اپنی کرسیوں کے لئے کوئی فکر نہ کی بلکہ جو کچھ ہے۔ نظام اسلامی کے برپا کرنے کے عوامل بہم پہنچانے اور اس کام کی رکاوٹیں دور کرنے کے لئے سوچا ہے۔ جب ہم اس حقیقت کو سامنے رکھ کر جدیدیت کے علمبردار حکمران گروہ کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ نظام اسلامی کو چلانا ہو تو موجودہ حکمران گروہ پر کوئی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا بلکہ علمائی وہ عنصر ہیں کہ جن پر کچھ امیدیں استوار کی جا سکتی ہیں دونوں کا فرق دونوں کے نقطہ نظر کے آمنے سامنے آنے سے پوری طرح کھل گیا ہے۔

• • •

علماء کا ترمیمی تبصرہ پڑھ کر یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ جن کو "ملا"، ملا کہہ کر پایۂ اعتبار سے گرانے کی کوشش کی جا رہی تھی، صرف وہی نکلے جنہوں نے صحیح معنوں میں سیاسی بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ اسلامی دستور کی قدروں کے تحفظ کے لحاظ ہی سے نہیں بلکہ جمہوریت کے بنیادی تقاضوں اور شہری حقوق کو محفوظ کرنے کے لحاظ سے بھی جن جن مقامات پر انہوں نے انگلی رکھی ہے وہاں جدید سیاست دانوں کے ماہرین کی نظر بھی نہ پہنچی تھی۔ واقعتہً ان حضرات نے بصیرت کا حق ادا کر دیا ہے، اور ملک کے دوسرے عناصر کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔
اس متفقہ ترمیمی تبصرے کے اہم خدوخال یہ ہیں :-
۱۔ باب ۳۳ میں مثبت طریق سے کتاب و سنت کے ماخذِ قانون قرار دینے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

نوٹ ضمیمہ

۲ ۔ کتاب وسنت کے خلاف قانون سازی کی روک تھام کے لئے علماء کے بورڈ کی جو تجویز کی گئی تھی اس کو رد کرکے سپریم کورٹ ہی کو اس کا ذریعہ بنانے کی سفارش کی گئی ہے اور ۱۵ سال کے لئے ایسے معاملات کا فیصلہ کرنے کے لئے سپریم کورٹ کے ساتھ ماہرین قانون اسلامی کو شامل کرنے کی تجویز پیش کی گئی ہے۔

۳ ۔ رہنما اصولوں کی بعض دفعات میں مدت کا تعین بڑھا کر ان کو (operative clauses) کے ہم پلہ بنا دیا گیا ہے۔

۴ ۔ مالی معاملات کو کتاب وسنت کے اسلامی قانون سے بالاتر رکھے جانے کے لئے جو تجویز رپورٹ میں شامل تھی، اس کو رد کرکے پانچ سال کے اندر اندر ضروری تبدیلیوں کو مکمل کرکے مالی معاملات کو بھی اسلامی قانون کے تابع کرنے کی ترمیم پیش کی گئی ہے۔

۵ ۔ ریاست کا نام "جمہوریہ اسلامیہ پاکستان" تجویز کیا گیا ہے۔

۶ ۔ ولایات وا قطاع مملکت (units) کو مملکت واحدہ کے محض انتظامی اجزا قرار دینے اور ان سے علیحدگی کا حق سلب کرنے کی تجویز پیش کی گئی ہے۔

۷ ۔ انتخابی عدالتیں مقرر کرنے کا اختیار عدلیہ کو سونپنے کے لئے تجویز پیش کی گئی ہے۔

۸ ۔ غیر منتخب اشخاص کے لئے وزیر یا وزیر اعظم بنائے جانے کے لئے جو یہ دروازہ کھولا گیا ہے اسے بند کرنا تجویز کیا گیا ہے۔

۹ ۔ مقننہ یا انتظامیہ کو خاص عدالتوں (Tribunals) کے تقرر کے اختیار سے محروم کرکے یہ اختیار بھی عدلیہ کو دینا تجویز کیا گیا ہے۔

۱۰ ۔ سپریم کورٹ کے لئے یہ اختیار بھی تجویز کیا گیا ہے کہ وہ فوجی عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف بھی اپیل سن سکے۔

۱۱ ۔ شہادت یا دستاویز طلب کرنے میں سپریم کورٹ کے اختیارات پر کسی طرح کی پابندی عائد کئے جانے کے خلاف رائے دی گئی ہے۔

۱۲ ۔ ہائی کورٹ کو یہ حق دیئے جانے کی تجویز کی گئی ہے کہ وہ اپیل سامنے آنے کے بغیر بھی ماتحت عدالتوں کے فیصلوں کا نوٹس لے سکے اور اگر انصاف کے تقاضے پورے نہ کئے گئے ہوں تو انہیں پورا کر سکے۔

۱۳ ۔ سرکاری ملازمین کے لئے عدلیہ کے مقابلے میں جو تحفظات دفعہ ۱۹۷ ضابطہ فوجداری اور دفعہ ۸۰ تا ۸۲ ضابطہ دیوانی کی رو سے چلے آ رہے ہیں۔ ان پر اثر انداز ہونے والے مسودات قوانین کو پیش کرنے کے لئے امیر مملکت یا حاکمان ولایت کی اجازت کی جو شرط عائد کی گئی تھی، اس کو اڑا دینے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

۱۴ ۔ امیر مملکت، حاکمان ولایت اور وزراء وغیرہ کو سرکاری حیثیت اور سرکاری مصارف کے ساتھ انتخابات میں اثر انداز ہونے سے روکنے کے لئے ترمیمیں تجویز کی گئی ہیں۔

۱۵ ۔ انتخابات کے لئے چیف کمشنر کے تقرر کو امیر مملکت کے اختیار میں رکھ کر انتخابی کمیشن کے ارکان کا تقرر امیر مملکت کے اختیار کے بجائے چیف کمشنر کے مشورے پر منحصر کرنا تجویز کیا گیا ہے۔

۱۶ ۔ قادیانیوں کے لئے ایک الگ اقلیت کی حیثیت سے پنجاب اسمبلی میں ایک نشست مختص کر دینے کی ترمیم پیش کی گئی ہے۔

۱۷ ۔ ہیبیس کارپس کے حق کو ہنگامی حالات میں سلب کرنے کی جو گنجائش بنیادی حقوق کی رپورٹ میں رکھی گئی تھی، اسے ختم کر دینے کے لئے ترمیم لائی گئی ہے۔

ان ترامیم و تجاویز سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دراصل ہمارے علماء نہ صرف دینی نقطہ نظر سے پیش پیش رہے ہیں بلکہ جمہوری تقاضوں کے

سوچ بچار

لحاظ سے بھی ان کی رائے زیادہ روشن اور زیادہ ترقی پسندانہ اور زیادہ افادیت آمیز ہے۔

• • •

جہاں تک وفاقیہ میں پاکستان کے ہر دو اقطاع کی مساویانہ نمائندگی (پیریٹی parity) کے جھگڑے کا تعلق ہے، علماء نے بجائے خود رائے قائم کر لی ہے لیکن اس کو انہوں نے سردست اس لئے محفوظ رکھا ہے کہ افہام و تفہیم کی جو کوششیں اکابر باہم کر رہے ہیں ان کو تکمیل تک پہنچ لینے دیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر خود قیادت اسلامی حس کو اپنے اندر اپنے مفاد سے زیادہ مقدم رکھتی اور گزشتہ پانچ سال میں اس کا عملی مظاہرہ بھی کرتی تو اس قسم کے کسی جھگڑے کے پیدا ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا بخلاف اس کے اگر عوام میں صحیح اسلامی ذہنیت ابھاری گئی ہوتی۔ تو عوام یہاں تک ترقی کر چکے کہ کتاب و سنت کے نظام زندگی کے سایۂ رحمت میں آنے کے لئے اگر مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان کے حق میں پوری سیٹوں کی قربانی کا اور اسی طرح مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان کی مستقل اکثریت کو قبول کر لینے کا مطالبہ بھی کیا جاتا تو لوگ ہنسی خوشی اسے قبول کر لیتے۔

اصل حل ذہنیت کی تبدیلی ہے نہ کہ سیٹوں کا کوئی تناسب جس پر سودا ہو جائے۔ افسوس کہ اس تبدیلی کے پیدا ہونے میں خود وہ لوگ رکاوٹ ہیں جو اسے پیدا کرنے کے ذمہ دار تھے یہ لوگ اگر خود فتنہ انگیزی سے باز آ جائیں، تو مسئلہ چٹکیوں میں حل ہو سکتا ہے۔

بہرحال اگر ان کی مساعی ناکام ہو گئیں تو انشاء اللہ یہی ۳۱ علماء اس مسئلہ کو بھی زیادہ بہتر طریق سے حل کر دکھائیں گے۔

• • •

تازہ دستوری سفارشات میں ڈرتے جھجکتے جو ادھورا قدم حکمران گروہ نے اسلام کی طرف بڑھایا ہے وہ ان ترامیم کے ذریعہ اتنا مکمل ہو جاتا ہے کہ اگر "معیاری" نہیں تو کم از کم عبوری دور کے لئے خالص اسلامی دستور بن سکے جو ذریعہ ہو معاشرے کے ایک معیاری دستور کے لئے ہموار کرنے کا۔

بہرحال اب ہماری کوششوں کے لئے میدان پہلے سے کئی گنا صاف ہو گیا ہے اور اب زیادہ دیر نہیں لگے گی کہ یہاں اسلام کے لئے چھا جانے کے لئے راستے چاروں طرف کھل جائیں۔

اب حکمران طبقہ بھی تاخیر کی پالیسی اختیار کرنے لگا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ رائے عامہ کے دباؤ سے تاخیر کی پالیسی اب نہ چلنے دی جائے۔ اور دستوریہ کو اپنی عمر بڑھانے کا موقع نہ دیا جائے۔

• • •

ان تمہیدی سطور کے ساتھ ہم ۳۱ نمائندہ علماء کی مرتب کردہ ترامیم کی تاریخی دستاویز کو ذیل میں درج کرتے ہیں:

• • •

تمہید

جنوری ۱۹۵۱ء میں تمام اسلامی فرقوں اور گروہوں کے معتمد علماء کا جو اجتماع دستور اسلامی کے

مسائل پر غور کرنے کے لئے کراچی میں منعقد ہوا تھا اس کے مرتب کردہ ۲۲ اصول "اسلامی مملکت کے بنیادی اصول" کے نام سے منظرِ عام پر آچکے ہیں اور بفضلِ خدا مسلم پبلک میں قبولِ عام بھی حاصل کر چکے ہیں۔ ابتدا میں یہ خیال تھا کہ کسی قریبی وقت میں دوبارہ یہ اجتماع منعقد کر کے ان اصولوں کے مطابق ایک دستور کا خاکہ بھی مرتب کر دیا جائے۔ لیکن بعد میں یہی مناسب سمجھا گیا کہ مجلسِ دستور ساز کی مقرر کردہ بنیادی اصولوں کی کمیٹی جب اپنی رپورٹ پیش کرے اس وقت ہی یہ منعقد کیا جائے اور اسی رپورٹ کو مدارِ بحث بنا کر جس قسم کی اصلاحات اس میں ضروری سمجھی جائیں کر دی جائیں چنانچہ ۲۲ دسمبر ۵۲ء کو جب مجلسِ دستور ساز میں مذکورہ بالا رپورٹ پیش ہوئی تو اس اجتماع کے دوبارہ منعقد کئے جانے کا فیصلہ کیا گیا اور اس میں شرکت کے لئے انہی اصحاب کو دعوت دی گئی جو جنوری ۵۱ء کے اجتماع میں مدعو تھے۔

۱۱ جنوری ۵۳ء کو کراچی میں یہ اجتماع منعقد ہوا اور ۱۸ جنوری تک ۹ اجلاس مختلف اوقات میں حسب ذیل اصحاب کی زیرِ صدارت منعقد ہوئے۔

حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب۔ حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی، حضرت مولانا ابوالحسنات صاحب، حضرت مولانا داؤد غزنوی صاحب، حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی۔

ان اجلاسوں میں پوری کی پوری رپورٹ پر غور کیا گیا۔ اگرچہ مدارِ بحث، مندرج رپورٹ کا مستند اردو ترجمہ رہا جو حکومت پاکستان کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ لیکن چونکہ ترجمہ میں بکثرت نقائص تھے اس لئے رپورٹ کے صحیح منشا سمجھنے کے لئے اصل انگریزی رپورٹ کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا۔

اجتماع کی کارروائی میں بڑی سہولت ہو جاتی اگر مجلسِ دستور ساز کے قائم کئے ہوئے تعلیماتِ اسلامیہ بورڈ کی تجاویز بہم پہنچ جاتیں۔ لیکن افسوس ہے کہ مجلسِ دستور ساز کے صدر نے اس اجتماع کو اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع دینا پسند نہیں کیا۔

الحمدللہ کہ اس اجتماع میں تمام فیصلے بالاتفاق کئے گئے ہیں جنہیں اطلاع کے لئے شائع کیا جاتا ہے

باب دوم۔ مملکت کی پالیسی کے رہنما اصول

پیراگراف ۲ شق (۲) ضمن (الف)

رپورٹ میں اس ضمن کی موجودہ عبارت سے یہ گنجائش نکلتی ہے کہ حکومت نظامِ تعلیم کو سابق انگریزی دور کی بنیادوں پر برقرار رکھتے ہوئے صرف اس امر کی کوشش کرے کہ مسلمانوں کے لئے بس قرآن مجید کی تعلیم لازم کر دے اور مسلمانوں کو یہ بتانے کے لئے کہ کس قسم کی زندگی قرآن مجید اور سنتِ رسول کے مطابق ہوتی ہے دینیات کا ایک کورس مقرر کر دے، لیکن یہ انتظام کسی طرح بھی تعلیم اور تربیت کی ان خرابیوں کو دور کرنے کے لئے کافی نہیں ہے، جو سابق ملحدانہ نظامِ تعلیم کے بدولت پیدا ہو رہی ہیں، لہٰذا ہم سمجھتے ہیں کہ اس ضمن کے موجودہ الفاظ کو حسب ذیل الفاظ سے بدل دیا جائے:

"مسلمانوں کے لئے قرآن مجید اور اسلامیات کی تعلیم لازمی قرار دی جائے اور ملک کے نظامِ تعلیم میں ایسی اصلاحات کی جائیں جن سے مسلمان اپنی زندگی کو قرآن مجید اور سنتِ رسول کے مطابق ڈھالنے کے قابل ہو سکیں"۔

پیراگراف ۲ شق (۲) ضمن (ب)

اس ضمن میں رپورٹ کی موجودہ تجویز دو لحاظ سے ناقص ہے۔ ایک یہ کہ وہ صرف شراب خوری کو ممنوع کرتی ہے نہ کہ شراب فروشی اور شراب سازی وغیرہ کو بھی۔ اور دوسرے مسکرات کے بارے میں خاموش ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ شراب، جوئے اور عصمت فروشی کے انسداد کے لئے کسی مدت کا تعین نہیں کرتی جس سے اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی مملکت پاکستان میں یہ فواحش غیر معین مدت تک جاری رہیں گے۔ لہٰذا ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس کی موجودہ عبارت کی جگہ یہ عبارت رکھی جائے:-

"ہر قسم کی مسکرات، جوئے اور عصمت فروشی کا تاریخ نفاذِ دستور سے زیادہ سے زیادہ تین سال کے اندر قانون سازی کے ذریعہ مکمل انسداد کیا جائے گا"

پیراگراف ۲ شق ۴

اس شق میں رپورٹ کے مصنفین نے موجودہ قوانین ملکی کو کتاب و سنت کے مطابق تبدیل کرنے کے لئے کسی مدت کا تعین نہیں کیا ہے جس سے یہ اندیشہ لاحق ہوتا ہے کہ نفاذِ دستور سے پہلے کے خلافِ اسلام قوانین غیر معین مدت تک ملک میں نافذ رہیں گے حالانکہ یہ قابلِ برداشت نہیں ہے، اس لئے ہم اس شق کو بدل کر حسب ذیل صورت میں رکھنا ضروری سمجھتے ہیں:-

شق ۴ ضمن (الف)

"موجودہ قوانین کو پانچ سال کے اندر کتاب و سنت کے مطابق تبدیل کر دینے کا مناسب انتظام کیا جائے گا"

شق ۴ ضمن (ب)

"قرآنِ پاک اور سنت کے وہ احکام جو قانونی صورت میں نافذ کئے جا سکتے ہیں ان کی تدوین و تنفیذ کے لئے مناسب کارروائی کی جائے گی البتہ کوئی قانون جو مسلمانوں کے شخصی معاملات سے متعلق ہو ہر فرقہ کے لئے کتاب و سنت کے اس مفہوم کی روشنی میں بنایا جائے گا جو اس کے نزدیک مستند ہو اور کوئی فرقہ دوسرے فرقے کی تعبیر کا پابند نہ ہوگا۔ نہ کوئی ایسا قانون بنایا جائے گا جس سے کسی فرقہ کے مراسم و فرائض مذہبی میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہو"

پیراگراف ۲ شق ۶

اس شق کی موجودہ عبارت کی بجائے ہمارے نزدیک یہ عبارت مناسب ہوگی۔

"مملکت کی کوشش ہونی چاہئے کہ بلا امتیاز مذہب و ملت پاکستان کے تمام شہریوں کے لئے کھانے، کپڑے، مکان، تعلیم اور طبی امداد جیسی بنیادی ضروریاتِ زندگی کا انتظام کرے خصوصاً ان کے لئے جو بے روزگاری، کمزوری، بیماری یا ایسی ہی کسی دوسری وجہ سے عارضی یا مستقل طور پر اپنی روزی کمانے کے قابل نہ ہوں"

پیراگراف ۲ شق ۷

اس شق میں اس امر کی وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ مملکت کی معاشی پالیسی اسلام کے اصولِ عدل پر مبنی ہوگی اس لئے موجودہ عبارت کی جگہ یہ عبارت ہونی چاہئے:-

"مملکت کی معاشی پالیسی اسلام کے اصولِ عدلِ عمرانی پر مبنی ہونی چاہئے اور بلا امتیاز مذہب و نسل و رنگ عوام کی بہبودی کا انتظام کیا جائے اور اس پر اس طرح عملدرآمد ہونا چاہئے کہ"

پیراگراف ۲ شق ۷ ضمن (ج)

اس شق میں اگرچہ مزدوروں اور کسانوں کے حقوق کا مفہوم بہت وسیع ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ محنت پیشہ اور زراعت پیشہ لوگوں کے معاوضوں کا معاملہ اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ اس کا الگ ذکر کر دینا۔ اور اس امر کی صراحت کرنا ضروری ہے کہ ملک میں اس طبقہ کے معاوضوں کا معیار کم از کم اس حد پر رکھا جائے گا کہ ان کی بنیادی ضروریات پوری ہو سکیں: لہٰذا ہماری رائے میں موجودہ عبارت کی جگہ یہ عبارت ہونی چاہئے—

"مزدوروں اور کسانوں کے حقوق اور معاوضوں کا ایسا منصفانہ معیار مقرر کیا جائے گا کہ وہ اپنی بنیادی ضروریات سے محروم نہ رہیں اور ان سے ناجائز فائدہ نہ اٹھایا جا سکے۔"

پیراگراف ۲ شق ۱۰

اس شق میں رپورٹ کی موجودہ عبارت ناقص ہے اور یہ نقص خصوصیت کے ساتھ نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ لسانی تعصبات کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ لہذا ہمارے نزدیک اس کو حسب ذیل عبارت سے بدلنا چاہئے :۔

"مملکت کے لیے لازم ہونا چاہئے کہ وہ پاکستانی مسلمانوں میں سے جغرافیائی، قبائلی، نسلی اور لسانی اور اس قسم کے دوسرے غیر اسلامی جذبات دور کرنے اور ان میں یہ جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کرے کہ وہ ملت اسلامیہ کی سالمیت، وحدت و استحکام اور اس طرز فکر کے لوازمات اور اس مقصد کو سب سے مقدم رکھیں جس کی تکمیل کے لئے پاکستان قائم ہوا ہے۔"

اضافے ۔

مذکورہ بالا ترمیمات کے علاوہ ہمارے نزدیک رپورٹ کے رہنما اصولوں میں حسب ذیل امور کا اضافہ بھی ضروری ہے :۔

شق ۲ ضمن (و)

"اسلامی علوم و ثقافت کے فروغ کا موثر انتظام کیا جائے۔"

شق ۷ ضمن (ط)

"حکومت کے ادنیٰ و اعلیٰ ملازمین کے معاوضوں کا تفاوت اعتدال پر لایا جائے۔"

مزید نئی دو شقیں ۔

(الف) "مملکت کے لئے اس امر کا اہتمام لازمی ہوگا کہ مسلم امیدواران ملازمت اور ملازمین حکومت کے انتخاب تقرر اور ترقی کے مواقع پر قابلیت اور کارکردگی اور دیگر متعلقہ عوامل کے ساتھ ساتھ اسلامی کردار اور شعائر اسلام کی پابندی کا موثر لحاظ رکھا جائے۔"

(ب) "تمام سرکاری ملازموں کی ٹریننگ میں خواہ وہ فوجی ہوں یا سول مسلمانوں کے لئے دینی و اخلاقی تعلیم و تربیت کا خاص انتظام کیا جائے تاکہ ریاست پاکستان کے ملازمین کا اخلاقی معیار بھی معیار قابلیت کی طرح بلند ہو۔"

(ج) "مسلمان ملازمین حکومت کو فرائض دینی کی پابندی اور شعائر اسلام کے التزام میں پوری سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔"

۲ ۔ "دہریت و الحاد کی تبلیغ اور قرآن و سنت کی توہین و استہزاء کا بذریعہ قانون سازی انسداد کیا جائے۔"

باب سوم ۔ قرآن پاک اور سنت کے خلاف قانون سازی کا سد باب

پیراگراف ۲

اس پیراگراف میں صرف سلبی حیثیت سے یہ کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ کوئی قانون سازی قرآن اور سنت کے خلاف نہ ہوگی بلکہ ایجابی طور پر اس اصولی حقیقت کو بھی دستور میں ثبت ہونا چاہئے کہ اس ریاست میں قرآن اور سنت کے احکام و ہدایات ہی قانون کا اصل سرچشمہ ہوں گے اس لئے موجودہ پیراگراف کے بعد اس عبارت کا اضافہ ضروری ہے :۔

"اور مملکت کے قوانین کے ماخذ اساسی (Fundamental source) قرآن و سنت ہوں گے۔"

پیراگراف ۴، ۵، ۶ اور ۸

ان میں قرآن اور سنت کے خلاف قانون سازی کی روک تھام کے لئے علماء کے ایک بورڈ کے قیام کی جو صورت پیش کی گئی ہے وہ نہ کسی لحاظ سے معقول ہے اور نہ اس طرح کی قانون سازی کو روکنے کے لئے موثر ہو سکتی ہے البتہ اس سے بہت سی نئی خرابیوں کے پیدا ہونے کا قوی امکان ہے ہم نہیں سمجھ سکتے کہ جس طرح دوسرے قوانین کے معاملے میں حدود دستور سے متجاوز قانون سازی کی روک تھام کے لئے تعبیر دستور کے اختیارات

سپریم کورٹ کے سپرد کئے گئے ہیں۔ اسی طرح پیراگراف ۲۰ کے معاملے کو بھی سپریم کورٹ ہی پر کیوں نہ چھوڑا جائے۔ البتہ یہ امر ضروری ہے کہ جس وقت تک ہمارے ملک میں نئے دستور کے تقاضے کے مطابق کتاب و سنت پر بصیرت رکھنے والے فاضل جج پیدا نہ ہوں اس وقت تک کے لئے کوئی ایسا عارضی انتظام تجویز کر دیا جائے جس سے سپریم کورٹ میں پیراگراف ۲۰ کے منشا کے مطابق کتاب و سنت کی صحیح تعبیر کی جاسکے لہٰذا ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ پیراگراف ۱۹ تا ۲۱ اور ان سے تعلق رکھنے والے پیراگراف ۵۸ کو حذف کر دیا جائے اور ان کی بجائے حسب ذیل پیراگراف رکھا جائے:۔

۱۔ "پیراگراف ۲ کے تحت مجالس قانون ساز کے بنائے ہوئے قوانین کے خلاف جو دستوری اعتراضات یا تعبیر دستور کے مسائل پیدا ہوں ان کا فیصلہ کرنے کے لئے سپریم کورٹ میں پانچ علماء مقرر کئے جائیں گے جو سپریم کورٹ کے کسی ایسے جج کے ساتھ جسے صدر مملکت تدین و تقویٰ اور واقفیت علوم و قوانین اسلامی کے پیش نظر اس مقصد کے لئے نامزد کرے گا مل کر اس امر کا فیصلہ کریں گے کہ قانون کتاب و سنت کے مطابق ہے یا نہیں"۔

۲۔ "ان علماء کا تقرر اس طریقے سے ہوگا جو سپریم کورٹ کے ججوں کے تقرر کے لئے بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی سفارشات میں تجویز کیا گیا ہے"

۳۔ "اس منصب کے لئے صرف ایسے ہی علماء اہل ہوں گے جو:۔

(الف) کسی دینی ادارے میں کم از کم دس سال تک مفتی کی حیثیت سے کام کرتے رہے ہوں، یا

(ب) کسی علاقے میں کم از کم دس سال تک ... سے ... رہے ہوں، یا

(ج) کسی باقاعدہ محکمہ قضا و شرعی میں کم از کم دس سال تک قاضی کی حیثیت سے کام کر چکے ہوں، یا

(د) کسی دینی درسگاہ میں کم از کم دس سال تک تفسیر، حدیث یا فقہ کا درس دیتے رہے ہوں۔

۴۔ "یہ انتظام پندرہ سال کے لئے ہوگا اور اگر ضرورت ہو تو رئیس مملکت اس مدت میں توسیع کر سکتا ہے۔"

۵۔ "ان عالم دین ججوں کے لئے مجلہ ضوابط وہی ہوں گے جو بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی سفارشات میں دوسرے ججوں کے متعلق تجویز کئے گئے ہیں۔"

حضرت مولانا ابوالحسنات صاحب، حضرت مولانا عبدالحامد صاحب بدایونی اور حضرت مفتی محمد صاحبداد صاحب نے اس کی بجائے ایک دوسری تجویز پیش کی جو ضمیمے میں درج ہے)

پیراگراف ۲۲

رپورٹ میں اس پیراگراف کو دیکھ کر ہمیں سخت حیرت ہوئی کہ جن لوگوں نے پیراگراف ۲ میں اس اصول کو تسلیم کیا ہے کہ اس مملکت میں قرآن اور سنت کے خلاف کوئی قانون نہیں بننا چاہئے ان کے قلم سے یہ بات کیسے نکلی کہ اس مملکت کے مالی معاملات قرآن و سنت کے احکام کی پابندی سے آزاد رہیں گے؟ اگر یہ ریاست خدا اور رسول کے احکام و فرامین کو بالاتر قانون تسلیم کرتی ہے جیسا کہ پیراگراف ۲ کے الفاظ سے ظاہر ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس ریاست کے مالیات خدا اور رسول کے دائرہ اثر (Jurisdiction) سے باہر ہوں۔ ہمارے نزدیک جس طرح اسلام دنیا کے ہر معاملے میں ہمارا بہترین رہنما ہے اسی طرح مالی معاملات میں بھی ہے۔ ہم اس کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں کہ ہمارے دستور کی ایک دفعہ میں مالیات کی حد تک اسلام کی رہنمائی پر صاف صاف عدم اعتماد کا اعلان کر دیا جائے۔ البتہ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ سردست کچھ مدت تک ریاست کے مالی معاملات کو اسلام کے مطابق درست کرنے میں عملی مشکلات مانع ہوں گی۔ مگر اس کے لئے صرف اتنی بات کافی ہے کہ ماؤر ... قانون بر باب سوم کے احکام کا اطلاق ہونے کے لئے پانچ سال کی مدت مقرر کر دی جائے۔ لہٰذا اس باب کا پیراگراف (ب) حذف کر کے اس کی جگہ یہ عبارت ہونی چاہئے۔

"باب ہذا" کے احکام کا اطلاق مالی مسودات قانون پر تاریخ نفاذ دستور سے پانچ سال کی مدت کے اختتام پر ہوگا"

حصہ ۲ - وفاقیہ اور اس کے علاقہ جات

پیراگراف ۹

اس دفعہ کی شق (۱) میں مملکت کا نام پاکستان تجویز کیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ کافی نہیں اس کے بجائے مملکت کا نام جمہوریہ اسلامیہ پاکستان ہونا چاہیئے۔

اس نام پر یہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ پاکستان میں غیر مسلم اقلیتوں کی موجودگی اسے اسلامی جمہوریہ کہنے میں مانع ہے۔ آخر جب روس میں کثیر التعداد غیر اشتراکیوں کی موجودگی جمہوریہ کہنے میں مانع نہیں ہے تو پاکستان کے لئے غیر مسلموں کی موجودگی اسے اسلامی جمہوریہ کہنے میں کیوں مانع ہے۔ اسلامی جمہوریہ کا مفہوم صرف یہ ہے کہ یہ ایک ایسی جمہوریہ ہے جو اسلام کے اصولوں پر قائم ہوتی ہے اور یہ وہ چیز ہے جس کا اظہار قرارداد مقاصد میں بھی کیا گیا ہے اور اس رپورٹ کا پیراگراف تین بھی اس پر دلالت کر رہا ہے:۔

علاوہ بریں اس پیراگراف میں حسب ذیل اضافے بھی ہونے چاہئیں

شق ۱ کے بعد حسب ذیل عبارت :۔

"ملک کے مختلف ولایات و اقطاع مملکت واحدہ کے اجزاء انتظامی متصور ہوں گے۔ ان کی حیثیت نسلی لسانی یا قبائلی وحدہ جات کی نہیں بلکہ محض انتظامی علاقوں کی ہوگی جنہیں انتظامی سہولتوں کے پیش نظر مرکز کی سیادت کے تابع اختیارات سپرد کئے جائیں گے۔

شق ۲ کے بعد حسب ذیل عبارت :۔

"ولایات مملکت کو مرکز سے علیحدگی کا حق حاصل نہ ہوگا" اس کے بعد موجودہ شق ۲ شق ۴ ہو جائے گی۔

حصہ سوم باب اوّل - عاملہ

پیراگراف ۲۲ شق ۲

اس میں انتخابی عدالتیں مقرر کرنے کا اختیار ان امور میں داخل کیا گیا ہے جو صدر ریاست کی صوابدید پر چھوڑے گئے ہیں۔

ہمارے نزدیک یہ درست نہیں ہے۔ انتخابات میں انصاف قائم کرنا اس ریاست کے وجود کے لئے نہایت درجہ اہمیت رکھتا ہے۔ اور انصاف کے دوسرے تمام شعبوں کی طرح یہ شعبہ بھی انتظامیہ کی مداخلت سے آزاد اور عدلیہ کے دائرہ عمل میں داخل ہونا چاہیئے۔ لہٰذا اس پیراگراف کی شق ۲ سے "اور انتخابی عدالتوں" کے الفاظ حذف کر دینے چاہئیں۔ اس کی متبادل تجویز ہم حصہ دوازدہم درباب انتخابات میں پیش کریں گے۔

پیراگراف ۲۵ شق ۲، ۳

"ان دونوں شقوں میں اس امر کا امکان رکھا گیا ہے کہ ایسے اشخاص وزیر اعظم اور وزیر بن سکیں جو مجلس قانون ساز میں منتخب ہو کر نہ آئے ہوں یا انتخاب میں ناکام ہوئے ہوں اور پھر اقتدار کی کرسی پر چھ مہینہ تک فائز رہنے کے بعد انتخاب جیتنے کی کوشش کریں۔ یہ چیز نہایت قابل اعتراض اور نقصان دہ بھی ہے۔ کسی شخص کو وزارت کی کرسی پر بٹھا کر پھر انتخاب جیتنے کا موقع دینا حکومت کی انتظامی مشینری کو اور رائے دہندوں کو سخت اخلاقی انحطاط میں مبتلا کرنے کا موجب ہوگا۔ لہٰذا اس دروازہ کو قطعی بند ہونا چاہیئے اور یہ دونوں شقیں حذف کی جانی چاہئیں"۔

اس غلطی کا اعادہ پیراگراف ۸۹ شق ۲ میں بھی کیا گیا ہے جہاں ولایات (یونٹس) میں غیر منتخب لوگوں کے وزیر اعلیٰ اور وزیر بن جانے اور پھر انتخاب جیتنے کے امکانات رکھے گئے ہیں۔ لہٰذا پیراگراف ۸۹ شق ۲ کو بھی حذف کیا جانا چاہیئے۔

باب ۲ - وفاقی مقننہ

اس باب میں ایوان ولایات (House of Units) اور ایوان جمہور (House of The people) کی ترکیب و تشکیل

جس طرح کی گئی ہے اس میں متعدد امور ایسے ہیں جو اس مجلس کے نزدیک سخت قابلِ اعتراض ہیں اور ان میں بڑی بے اصولی بھی پائی جاتی ہے مگر اس وقت مختلف صوبوں کے سیاسی رہنماؤں کے درمیان ان امور میں گفت و شنید ہو رہی ہے اور ہم اس میں خلل ڈالنا پسند نہیں کرتے اس لئے ان کے بارے میں ہم سر دست اپنی رائے محفوظ رکھتے ہیں ۔

پیراگراف ۲ شق ۱

اس میں ایوان ولایات کی نشست پُر کرنے کے لئے کسی شخص کے نا اہل ہونے کے جو چار وجوہ بیان کئے ہیں ان میں مسلم ارکان کے لئے ایک پانچویں وجہ کا بھی اضافہ ہونا چاہیئے جس کے الفاظ یہ ہوں:۔

"فرائض اسلام کا پابند اور فواحش سے مجتنب نہ ہو"

اس وجہ کا اضافہ پیراگراف ۲/۴۹ درباب ایوان جمہور اور پیراگراف ۱۰/۱۱ درباب مجالس مقننہ ولایات میں بھی ہونا چاہیئے ۔

پیراگراف ۳ شق ۱ ضمن (۴)

اس ضمن کی موجودہ عبارت قابلِ اعتراض ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ ایوان ولایات کا ہر رکن لازماً اسی ولایت کا باشندہ ہونا چاہیئے جس سے وہ منتخب ہو کر آئے ۔ یہ پاکستانیوں کے درمیان صوبائی تعصبات کو مستقل طور پر قائم رکھنے کا ایک موثر ذریعہ ہوگا لہٰذا ہم تجویز کرتے ہیں کہ اس عبارت کو یوں کر دیا جائے :۔

"مملکت کے کسی حصہ کی فہرست رائے دہندگان

میں اس کا نام درج ہو"

اس غلطی کا اعادہ پیراگراف ۲/۴۹ شق ۴ میں بھی کیا گیا ہے اور اس کی بھی مذکورہ بالا طریقہ پر اصلاح ہونی چاہیئے

پیراگراف ۲/۱۴ ضمن (۵)

اس میں ہر اس شخص کو ایوان ولایات کی رکنیت کے لئے نا اہل قرار دیا گیا ہے جسے کسی عدالت مجاز نے کسی جرم کے ارتکاب پر دو سال یا اس سے زیادہ کی سزا دی ہو۔ یہ "کسی جرم" کا لفظ بہت وسیع ہے اس کی زد میں وہ لوگ بھی آ جاتے ہیں جنہیں سیاسی اسباب کی بنا پر سزا دی گئی ہو ۔ اس کی بجائے ہم تجویز کرتے ہیں کہ اس شق میں "کسی جرم" کی بجائے "کسی اخلاقی جرم" کے الفاظ رکھے جائیں ۔ یہی اصلاح پیراگراف ۲/۴۹ شق ۵ اور پیراگراف ۱۰/۱۱ شق ۵ میں بھی ہونی چاہیئے ۔

پیراگراف ۲/۷ شق (ز)

اس شق میں ایوان ولایات کی رکنیت کے لئے ہر اس شخص کو نا اہل قرار دیا گیا ہے جو سرکاری ملازمت سے "بدا طواری" کی بنا پر برخاست کیا گیا ہو۔ یہ بداطواری بھی بہت وسیع مفہوم رکھتی ہے اور اس کی زد میں ایسے لوگ بھی آ جاتے ہیں جن کو کسی وقت کسی پارٹی کی حکومت سیاسی اسباب سے برخاست کر دے ۔ درآں حالیکہ وہ کسی اخلاقی خرابی میں مبتلا نہ پائے گئے ہوں، لہٰذا اس شق میں "بداطواری" کے بعد "جو اخلاقی جرم کی نوعیت کی ہو" کا اضافہ ہونا چاہیئے ۔

یہی اصلاح پیراگراف ۲/۴۹ شق (ز) اور پیراگراف ۱۰/۱۱ (ز) میں بھی ہونی چاہیئے ۔

پیراگراف ۵ شق (د)

اس ضمن میں ہر اس شخص کو رائے دہندگی کے حق سے محروم کیا گیا ہے جس نے کسی عدالت مجاز سے "کسی جرم" کے ارتکاب پر دو سال یا اس سے زیادہ کی سزا پائی ہو اس پر بھی ہم کو وہی اعتراض ہے جو پیراگراف ۲/۱۴ شق ۵ کے سلسلے میں بیان کیا جا چکا ہے ۔ لہٰذا "کسی جرم" کے بعد "جو اخلاقی نوعیت کا ہو" کے الفاظ کا اضافہ ہونا چاہیئے ۔

پیراگراف ۲/۶ شق ۱

اس میں تجویز کیا گیا ہے کہ مقننہ کے ہر رکن کے لئے پاکستان کی وفاداری کا حلف اٹھانا لازم ہوگا یہ بالکل مناسب ہے لیکن اس کے ساتھ ہر رکن مقننہ کو یہ حلف بھی اٹھانا چاہیئے کہ وہ مقننہ کی کارروائیوں میں اپنا ووٹ دیانت داری کے ساتھ دے گا ۔ لہٰذا اس شق میں "وہ پاکستان کی وفاداری کا حلف اٹھائے" کے بعد ان الفاظ کا اضافہ ہونا چاہیئے :۔

"نیز اس امر کا حلف اٹھائے کہ وہ اپنا ووٹ دیانتداری کے ساتھ استعمال کرے گا"

(اس فقرے کا اضافہ پیراگراف ۱۰/۱۱ شق ۱) میں بھی ہونا چاہیئے ۔

حصہ ۱۰ درباب عدلیہ

عدلیہ کے باب میں کسی مقام پر حسب ذیل ۲ دفعات کا اضافہ ہونا چاہیے:

"(۱) عدلیہ کے ہر اہل منصب کے تقرر و ترقی میں تقرر کرنے والے کے پیش نظر منجملہ دیگر عوامل متعلقہ کے تقوی و تدین اور اصل ماخذ کے ذریعہ علوم و قوانین اسلامی سے واقفیت بھی موثر عوامل اور وجہ ترجیح کی حیثیت رکھیں گے"

یہ اس لئے ضروری ہے کہ اسلام انتظامیہ اور مقننہ کے ارکان سے بھی بڑھ کر عدالت ہائے انصاف کے حکام کے تدین و تقوی کو اہمیت دیتا ہے اور جب کہ اس مملکت میں یہ اصول تسلیم کر لیا گیا ہے کہ یہاں کے قوانین اسلام کے اصول اور احکام پر مبنی ہوں گے تو یہ نہایت ضروری ہے کہ اس کے حکام عدالت قوانین اسلامی سے واقف ہوں۔

"(۲) مقننہ یا انتظامیہ کو ٹریبونلز (خاص عدالتیں) مقرر کرنے کے اختیارات نہ ہوں گے"

یہ اس لئے ضروری ہے کہ کسی خاص مقدمہ کے لئے یا خاص نوعیت کے مقدمات کے لئے انتظامیہ کا اپنی اغراض اور مصلحتوں کی بنا پر خود یا مقننہ کے ذریعہ سے خاص عدالتیں قائم کرنا انسان کے اختیارات داد رسی پر من مانی حدود یا مقننہ کے ذریعہ سے حدود و قیود عاید کرنا قطعاً خلاف انصاف ہے اور اس اختیار کو جس بے جا طریقے سے استعمال کیا جاتا رہا ہے اس کی نہایت بُری مثالیں دیکھی جا چکی ہیں۔ اس لئے خاص عدالتیں مقرر کرنے کے طریقہ کو از روئے دستور بند ہونا چاہیے اور ہر قسم کے مقدمات ملک کی عام عدالتوں ہی کی طرف رجوع کئے جانے چاہئیں۔

حصہ ۱۰ باب اوّل عدالت عظمیٰ

پیراگراف ۱۸۴

اس میں سپریم کورٹ کو اس اختیار سے محروم کیا گیا ہے کہ وہ مسلح افواج سے متعلق کسی عدالت یا ٹربیونل کے صادر کئے ہوئے کسی حکم کے خلاف اپیل کرنے کی اجازت دے۔ ہمارے نزدیک یہ قید غیر منصفانہ ہے جبکہ ہمارے دستور میں سپریم کورٹ کو آخری عدالت انصاف قرار دیا جائے گا تو کوئی وجہ نہیں کہ ملک کے کسی شخص کو خواہ وہ فوجی ہو یا سویلین یا عام شہری انصاف حاصل کرنے کے لئے اس کا دروازہ کھٹکھٹانے کا موقع نہ دیا جائے اگر فوجی عدالتوں میں کسی شخص کو بے انصافی کی شکایت ہو تو آخر کیوں وہ ملک کی آخری عدالتِ انصاف سے اپیل نہ کر سکے لہذا پیراگراف ۱۸۴ کی حسب ذیل عبارت حذف کی جانی چاہئے۔

"مگر شرط یہ ہے کہ ۔۔۔۔۔۔ خاص اجازت دے"

پیراگراف ۱۸۶

اس پیراگراف میں سپریم کورٹ کے اس اختیار کو کہ وہ انصاف کی غرض کے لئے کوئی شہادت یا دستاویز طلب کر سکے، وفاقی مقننہ کے بنائے ہوئے قوانین سے محدود کرنے کی گنجائش رکھی گئی ہے اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اگر مقننہ کوئی ایسا قانون بنا دے جس میں کسی خاص قسم کی شہادتیں یا دستاویزیں طلب کرنا ممنوع ہو تو سپریم کورٹ انہیں طلب نہ کر سکے گا خواہ انصاف کے لئے اس کا طلب کرنا کتنا ہی ضروری ہو یہ بات اسلامی اصول عدل کے قطعاً خلاف ہے اسلام کی رو سے جس شہادت کے بغیر انصاف نہ کیا جا سکتا ہو وہ جس کے پاس بھی ہو عدالت اس کو طلب کرنے کا حق رکھتی ہے اور اس شخص کے لئے کتمان حق جائز نہیں لہذا اس پیراگراف سے یہ الفاظ حذف کر دیئے جائیں:۔

"بحفظ احکام موضوعہ مقننہ وفاقی"۔

نیز پیراگراف کے اخیر حسب ذیل عبارت کا اضافہ کیا جائے:۔

"البتہ عاملہ کو حق ہونا چاہئے کہ اگر اس کے نزدیک کسی شہادت یا دستاویز کا افشا مملکت کے تحفظ و استحکام کے منافی ہو تو وہ عدالت سے استدعا کر سکتی ہے کہ اس کے اخفا کا خاطر خواہ انتظام کیا جائے"۔

حصہ ۱۰۔ باب دوم ۔ عدالتہائے عالیہ

پیراگراف ۲۰۵ شق ۲۔

اس پیراگراف میں ہائی کورٹ کے اختیارات پر یہ پابندی عائد

کی گئی ہے کہ وہ اپنی ماتحت عدالت کے ایسے فیصلوں پر اعتراض کر سکے جن کی اپیل یا نگرانی کسی اور طریقہ سے ہائی کورٹ میں نہ ہو سکتی ہو ہمارے نزدیک یہ پابندی ملا بابت کی بلند ترین عدالت کو انصاف کے تقاضے پورے کرنے سے روکتی ہے۔ ہائی کورٹ کو تو اس امر کے پورے اختیارات حاصل ہونے چاہئیں کہ جب کبھی اس کے علم میں ایسا کوئی معاملہ آئے جس میں اس کے ماتحت عدالتیں انصاف کرنے میں قاصر رہی ہوں وہ اس کا نوٹس لے اور انصاف بہم پہنچانے کی کوشش کرے لہٰذا اس پیراگراف کی یہ شق پوری کی پوری حذف کی جانی چاہئے۔

حصہ یازدہم در بابِ ملازمین و ماموریہ ملازمتِ سرکاری

پیراگراف ۲۲۲ شق ۴

اس شق میں یہ کہا گیا ہے کہ وفاقی مقننہ میں امیر مملکت کی اجازت کے بغیر اور ولایات (صوبوں) کی مجالسِ مقننہ میں حاکمانِ ولایات کی اجازت کے بغیر کوئی ایسا مسودۂ قانون نہیں پیش کیا جا سکتا جو ان تحفظات کو منسوخ یا محدود کرتا ہو جو دفعہ ۱۹۷ ضابطہ فوجداری اور دفعات ۸۰ تا ۸۲ ضابطہ دیوانی میں سرکاری ملازمین کو دیئے گئے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ شق سخت قابلِ اعتراض ہے اگر ریاستِ پاکستان کے ملازمین امیر مملکت اور حاکمانِ ولایات کے ملازم نہیں بلکہ پاکستان کی پبلک کے ملازم ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ پبلک کے نمائندے اس کے ملازموں کے حقوق، اختیارات اور امتیازات میں تغیر و تبدل کرنے کے لئے کوئی مسودہ قانون پیش کرنے میں امیر مملکت اور حاکمانِ ولایات کی اجازت کے محتاج ہوں۔ آزاد پاکستان میں تو دفعہ ۱۹۷ ضابطہ فوجداری اور دفعات ۸۰ تا ۸۲ ضابطہ دیوانی جیسی صریح غیر منصفانہ دفعات کا کتابِ آئین پر موجود رہنا ہی شرمناک ہے۔ کجا کہ دستور میں ان دفعات کو بچانے کے لئے یہ پابندی عاید کر دی جائے کہ ان میں ترمیم و تنسیخ کرنے کے لئے کوئی مسودۂ قانون نہ پیش کیا جا سکے جب تک کہ امیر مملکت اور حاکمانِ ولایات اس کی اجازت نہ دیں لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اس پیراگراف کی یہ شق حذف کی جائے۔

حصہ دوازدہم - در بابِ انتخابات

اس باب میں کسی مقام پر حسبِ ذیل عبارات کا بصورت پیراگراف اضافہ ہونا ضروری ہے:-

الف۔ امیر مملکت، حاکمانِ ولایات اور عمالِ حکومت کے لئے یہ ممنوع ہونا چاہئے کہ وہ انتخابات میں کسی شخص یا پارٹی کے خلاف یا موافق رائے عامہ کو متاثر کرنے کی کوشش کریں۔

ب۔ مرکزی اور صوبائی وزراء اعظم، وزراء مملکت، وزراء اور نائب وزراء اور پارلیمنٹری سکرٹریوں کے لئے ممنوع ہونا چاہئے کہ وہ کسی شخص یا پارٹی کے موافق یا خلاف سرکاری اثرات اور وسائل کے ذریعہ رائے عامہ کو متاثر کرنے کی کوشش کریں۔

ج۔ مرکزی مقننہ اور ولایات کی مجالسِ مقننہ میں ہر نشست جو خالی ہو گئی ہو زیادہ سے زیادہ چار ماہ کے اندر اندر بذریعہ ضمنی انتخاب پُر کرنی ضروری ہوگی۔

پیراگراف ۲۲۴ شق ۲۔

اس میں انتخابی کمیشن کے ارکان کا تقرر بھی چیف کمشنر کے تقرر کی طرح محض امیر مملکت کی صوابدید پر موقوف کر دیا گیا ہے جہاں تک چیف کمشنر کا تعلق ہے اس کے تقرر کے معاملہ میں تو اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ وہ امیر مملکت کی صوابدید پر ہو۔ لیکن انتخابات کی آزادی کے لئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پورا الیکشن کمیشن محض امیر مملکت ہی کا ساختہ پرداختہ نہ ہو۔ لہٰذا ہم تجویز کرتے ہیں کہ اس شق کے الفاظ "اور چیف کمشنر انتخابات سے کر اپنی صوابدید پر مقرر کرے گا" تک حذف کر دیئے جائیں اور ان کی جگہ یہ عبارت رکھی جائے:-

"اور امیر مملکت چیف کمشنر انتخابات کو اپنی صوابدید پر اور دوسرے انتخاب کمشنروں کو چیف کمشنر انتخابات کی سفارش پر ایسے قانون کے احکام کے تابع مقرر کرے گا جو وفاقی مقننہ اس بارے میں وضع کرے۔

نیز انتخابات کی آزادی کو محفوظ کرنے کے لئے پیراگراف ۲۲۴ شق ۲ میں یہ اضافہ ہونا چاہیئے :۔

"چیف الیکشن کمشنر کا تقرر مستقل ہونا چاہیئے اس کے سپرد مرکز اور ولایات میں نہ صرف عام انتخابات کا انتظام ہوگا بلکہ وقتاً فوقتاً خالی ہونے والی نشستوں کے لئے ضمنی انتخابات کا انتظام بھی ہوگا نیز انتخابات کے لئے رائے دہندگان کی فہرستوں کو ہر وقت تیار رکھنا بھی اس کا فرض ہوگا"

"چیف الیکشن کمشنر کا مرتبہ سپریم کورٹ کے ججوں کے مماثل ہوگا اور اس پر بھی وہ پابندیاں عاید کی جائیں جو پیراگراف ۲۲۷ شق ۲ و ۴ میں پبلک سروس کمیشن کے ممبروں پر عائد ہوتی ہیں"

"چیف الیکشن کمشنر وہی شخص مقرر کیا جائے گا جو کم از کم تین سال کسی ہائی کورٹ میں جج رہ چکا ہو۔

پیراگراف ۲۳۹ شق ۲

اس شق میں انتخابی عدالتیں مقرر کرنے کا اختیار مرکز میں امیر مملکت اور ولایات میں حاکمان ولایات کو دیا گیا ہے۔ لیکن جیسا کہ حصہ سوم کے پیراگراف ۲ میں ہم کہہ چکے ہیں یہ چیز انتخابات کی آزادی کے لئے مضر ہے لہذا اس شق کی موجودہ عبارت کی بجائے یہ عبارت ہونی چاہیئے ۔

"انتخابی عدالتیں مقرر کرنے کا اختیار مرکز میں سپریم کورٹ اور ولایات میں ہائی کورٹ کو ہونا چاہیئے"

ضمیمہ اوّل

فہرست اوّل

اس فہرست میں حسب ذیل مضامین کا اضافہ کیا جائے :۔

(۱) "مملکت کے رہنما اصول کے مطابق تعلیمی پالیسی کا تعین توافق اور رہنمائی اور علمی و تعلیمی اداروں کا قیام۔

(۲) رہنما اصول کے مطابق مملکت کی بنیادی آئیڈیالوجی اور نصب العین کا تحفظ"

فہرست اول و سوم

ان دونوں فہرستوں میں نمبر ۳ اپنی موجودہ صورت میں سخت قابل اعتراض ہے۔ احتیاطی نظربندی کے اختیارات اب تک جس طریقے سے استعمال کئے جا رہے ہیں وہ سیفٹی ایکٹ اور اس قسم کے دوسرے قوانین کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں یہ طریقے نہ صرف شریعت کے خلاف ہیں بلکہ عقل عام اور انصاف کے عالمگیر تصورات کے بھی خلاف ہیں حتیٰ کہ خود وہ لوگ جنہیں آج ان اختیارات پر اصرار ہے اپنی بے اختیاری کے زمانہ میں دوسروں پر شدت کے ساتھ یہ اعتراض کرتے تھے کہ وہ ان کے خلاف سیفٹی ایکٹ جیسے قوانین استعمال کر رہے ہیں لہذا ہمارے نزدیک یہ ضروری ہے کہ ان دونوں فہرستوں کے نمبر ۳ میں "احتیاطی نظربندی" کے بعد حسب ذیل عبارت کا اضافہ کیا جائے :۔

"بشرطیکہ جس شخص کو اس غرض کے لئے نظربند کیا جائے اُسے پندرہ دن کے اندر اندر عدالت کے سامنے پیش کیا جائے اور اس کو صفائی کا پورا موقعہ دیا جائے اور مدت نظربندی کی تعین کا اختیار عدالت کو حاصل ہوگا۔"

ضمیمہ دوم

اس ضمیمہ میں مسلم نشستوں کے عنوان کے کالم میں پنجاب کے بالمقابل ۸۸ کی بجائے ۸۷ کا عدد درج کیا جائے اور ایک نئے کالم کا اضافہ کیا جائے جس کا عنوان "قادیانیوں کے لئے مخصوص نشستیں" ہو۔ اس کالم میں "پنجاب" کے بالمقابل "ایک" کا عدد درج کیا جائے نیز ضمیمہ دوم کی تشریحات میں حسب ذیل پانچویں دفعہ کا اضافہ کیا جائے :۔

"پنجاب میں قادیانیوں کی ایک نشست پر کرنے کے لئے پاکستان کے دیگر علاقوں کے قادیانی بھی ووٹ دینے اور مذکورہ نشست پر رکن منتخب ہو سکنے کے مستحق ہوں گے"

قادیانی کی تشریح یوں کی جائے :۔

"قادیانی سے مراد وہ شخص ہوگا جو مرزا غلام احمد قادیانی کو اپنا مذہبی پیشوا مانتا ہو"

یہ ایک نہایت ضروری ترمیم ہے جسے ہم پورے اصرار کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ملک کے دستور سازوں کے لئے یہ بات کسی طرح موزوں نہیں ہے کہ وہ اپنے ملک کے حالات اور مخصوص اجتماعی مسائل سے بے پرواہ ہو کر محض اپنے ذاتی نظریات کی بنا پر دستور بنانے لگیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ملک کے جن علاقوں میں قادیانیوں کی بڑی تعداد مسلمانوں کے ساتھ ملی جلی آباد ہے وہاں اس قادیانی مسئلہ نے کس قدر نازک صورت حال پیدا کر دی ہے ان کو پچھلے دور کے بیرونی حکمرانوں کی طرح نہ ہونا چاہئے جنہوں نے ہندو مسلم مسئلہ کی نزاکت کو اس وقت تک محسوس کر کے ہی نہ دیا جب تک متحدہ ہندوستان کا گوشہ گوشہ دونوں قوموں کے فسادات سے خون آلود نہ ہو گیا۔ جو دستور ساز حضرات خود اسی ملک کے رہنے والے ہیں ان کی یہ غلطی بڑی افسوسناک ہوگی کہ وہ جب تک پاکستان میں قادیانی مسلم تصادم کو آگ کی طرح بھڑکتے ہوئے نہ دیکھ لیں اس وقت تک انہیں اس بات کا یقین نہ آئے کہ یہاں ایک قادیانی مسلم مسئلہ بھی موجود ہے جسے حل کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ اس مسئلہ کو جس چیز نے نزاکت کی آخری حد تک پہنچا دیا ہے وہ یہ ہے کہ قادیانی ایک طرف مسلمان بن کر مسلمانوں میں گھستے بھی ہیں اور دوسری طرف عقائد عبادات اور اجتماعی شیرازہ بندی میں مسلمانوں سے نہ صرف الگ بلکہ ان کے خلاف صف آرا بھی ہیں اور مذہبی طور پر تمام مسلمانوں کو علانیہ کافر قرار دیتے ہیں۔ اس خرابی کا علاج آج بھی یہی ہے اور پہلے بھی یہی تھا (جیسا کہ علامہ اقبال مرحوم نے اب سے بیس برس پہلے فرمایا تھا) کہ

"قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ ایک اقلیت قرار دیا جائے"

علاوہ بریں بنیادی حقوق کی جو رپورٹ ۱۹۵۰ء میں پیش کی گئی تھی اور بسرعت منظور کر لی گئی تھی اس کے پیراگراف ۲ کا یہ حصہ بھی حذف ہونا چاہئے۔

"ماسوا اس صورت کے جب کہ ریاست کی سلامتی کو
کوئی بیرونی یا اندرونی خطرہ لاحق ہو یا کوئی نازک ہنگامی صورت
حالات رونما ہو جائے"۔

مذکورہ بالا رپورٹ میں یہ استثنائی فقرہ حبس کارپس کے حق کو بعض صورتوں میں معطل کر دیتا ہے۔ درآنحالیکہ اسلامی شریعت کسی حالت میں بھی اس امر کی اجازت نہیں دیتی کہ کسی مسلم یا ذمی شہری کو ملک کی سب سے اونچی عدالت انصاف کے پاس حبس بے جا کے خلاف داد رسی کے لئے جانے کے حق سے محروم کر دیا جائے۔

اسمائے گرامی حضرات شرکائے مجلس

(۱) حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب مہتمم جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد لاہور
(۲) حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی صدر بورڈ آف تعلیمات اسلام
(۳) حضرت مولانا ابو الحسنات صاحب صدر جمعیۃ علماء پاکستان لاہور
(۴) حضرت مولانا داؤد غزنوی صاحب جمعیۃ اہل حدیث مغربی پاکستان
(۵) حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی سرپرست جمعیۃ علماء اسلام مشرقی پاکستان
(۶) حضرت مولانا احمد علی صاحب امیر انجمن خدام الدین و صدر جمعیۃ العلماء اسلام مغربی پاکستان لاہور
(۷) حضرت مولانا سید ابو الاعلیٰ صاحب مودودی امیر جماعت اسلامی پاکستان
(۸) حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی مہتمم دار الاسلامیہ اشرفیہ ٹنڈو اللہ یار سندھ۔
(۹) حضرت مولانا شمس الحق صاحب افغانی وزیر معارف ریاست قلات
(۱۰) حضرت مولانا محمد عبد الحامد قادری بدایونی صدر جمعیۃ العلماء پاکستان سندھ
(۱۱) حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رکن بورڈ آف تعلیمات اسلام مجلس دستور ساز پاکستان۔
(۱۲) حضرت مولانا محمد ادریس صاحب شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد لاہور
(۱۳) حضرت مولانا خیر محمد صاحب مہتمم مدرسہ خیر المدارس ملتان شہر
(۱۴) حاجی خادم الاسلام محمد امین صاحب خلیفہ حاجی ترنگ زئی المجاہد آباد ڈاکخانہ عمر زئی پشاور صوبہ سرحد۔
(۱۵) جناب قاضی عبد الصمد صاحب سربازی قاضی قلات بلوچستان
(۱۶) حضرت مولانا اطہر علی صاحب صدر جمعیۃ العلماء اسلام مشرقی پاکستان
(۱۷) حضرت مولانا ابو جعفر محمد صالح امیر جمعیۃ حزب اللہ مشرقی پاکستان
(۱۸) حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب ناظم جمعیت اہل حدیث پاکستان گوجرانوالہ
(۱۹) حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب جامعہ دینیہ دار الہدیٰ ٹھیڑی خیر پور میرس

(۲۰) حضرت مولانا محمد صادق صاحب مہتمم مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ کراچی
(۲۱) حضرت مولانا دین محمد صاحب نائب صدر جمعیۃ علماء اسلام مشرقی پاکستان۔
(۲۲) حضرت مولانا شمس الحق صاحب فرید پوری پرنسپل جامعہ قرآنیہ ڈھاکہ
(۲۳) حضرت مولانا محمد صاحب داؤد صاحب سندھ مدرسۃ الاسلام کراچی
(۲۴) حضرت مولانا پیر صاحب محمد ہاشم جان مجددی ٹنڈو سائیں داد سندھ۔
(۲۵) جناب مولانا ظفر احمد صاحب انصاری سکرٹری بورڈ آف تعلیمات اسلام مجلس دستور ساز پاکستان۔
(۲۶) جناب مولانا راغب احسن صاحب نائب صدر جمعیۃ علماء اسلام مشرقی پاکستان۔
(۲۷) جناب مولانا محمد حبیب الرحمٰن صاحب نائب صدر جمعیۃ المدرسین سرسینہ شریف مشرقی پاکستان۔
(۲۸) جناب مولانا مفتی جعفر حسین صاحب مجتہد رکن بورڈ آف تعلیمات اسلام مجلس دستور ساز پاکستان۔
(۲۹) جناب مولانا حافظ کفایت حسین صاحب مجتہد ادارہ عالیہ تحفظ حقوق شیعہ پاکستان لاہور۔
(۳۰) حضرت مولانا حافظ محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹ پنجاب۔
(۳۱) حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری شیخ التفسیر دار العلوم الاسلامیہ اشرف آباد۔ سندھ۔
(۳۲) حضرت مولانا محمد علی صاحب جالندھری مجلس احرار اسلام پاکستان۔
(۳۳) جناب پیر صاحب محمد امین الحسنات مانکی شریف سرحد۔

اس اجتماع میں حضرت مولانا حامد اللہ صاحب بوجہ علالت حضرت مولانا محمد بدر عالم صاحب بوجہ ہجرت اور پروفیسر عبد الخالق صاحب بعض نجی مصروفیات کے باعث شرکت نہ فرما سکے۔

ضمیمہ متعلقہ ترمیم پیراگراف ۴، ۵، ۶، ۸[1]

ہمارے نزدیک دفعہ ۴ کے الفاظ حسب ذیل ہوں

"ایسی صورت میں جب کہ مجلس مقننہ میں کتاب و سنت کی تعبیر و تشریح پر اعتراض ہو تو ضروری ہوگا کہ یہ سوال ماہرین قوانین اسلامی (علمائے پاکستان) کے بورڈ کے پاس بھیجا جائے۔ یہ بورڈ اپنا جو فیصلہ صادر کرے مجلس مقننہ اس کی پابند ہوگی۔"

۲۔ دفعہ نمبر ۵ کی شق نمبر ا (تشکیل بورڈ) کے متعلق ہماری ترمیم یہ ہے کہ:-

"حکومت پاکستان علماء کی ان مذہبی جماعتوں سے جو مرکزی اور صوبائی حیثیت سے قیام پاکستان کے بعد سے کام کر رہی ہیں اور جن کا نظام اس وقت تک باقاعدہ قائم ہے ان سے علماء پاکستان کے نام طلب کرے۔ اور امیر مملکت ان کا اعلان کرے"

ماہرین قوانین اسلامی سے مراد علماء دین ہی ہوں تو انہیں ایسا باوقار و بااختیار ہونا چاہیے کہ ان کا فیصلہ ناطق ہو۔ ہم علماء کے اجتماع کی اس تجویز سے کہ کتاب و سنت کی تعبیر کا فیصلہ کرنے کے لئے "سپریم کورٹ" کے ساتھ علماء منسلک ہوں بحالت موجودہ اختلاف ہے اس لئے کہ علماء کا محض کتاب و سنت کی تعبیر و معانی بتلانے کے لئے "سپریم کورٹ" کے ججوں کے ساتھ منسلک ہونا بے کار و بے معنی ہے۔ البتہ مسلمانوں کے اہم مسائل دینی کے تصفیہ کے لئے اگر علماء بحیثیت جج یعنی قاضی مقرر کئے جائیں (جن کی ضرورت نزاکت حالات کے باعث لازمی ہے) تو موزوں ہو سکتا ہے۔"

مولانا ابو الحسنات قادری، مولانا محمد عبد الحامد القادری بدایونی، مفتی محمد صاحب داد۔

---

[1] یہ ترمیم شرکائے مجلس کا اختلافی نوٹ ہے۔

ایک شرابی — بہک کر

نعیم صدیقی

کیسا پینا،
جام، پینا
اُف! یہ جینا!
رشوت دے کر
پرمٹ لے کر
مہنگے داموں
دُگنے پیسوں
آخر پائے
چند یہ قطرے
پینا ہیں یہ
چوری چوری
چھوٹ گئی سب
سینہ زوری!

٭

یہ بھی شاید
چار دنوں کا
کھیل ہے ساقی!
چند گھڑی کا
میل ہے ساقی!
یہ آزادی
جیل ہے ساقی!

٭

بھوکی نگری
چوپٹ راجا
غائب بھیا جی
غارت کھاجا

٭

ایک گھٹن ہے
ایک جلن ہے
ایک دُکھن ہے
جیل کو توڑو
دیواروں سے
ماتھا پھوڑو
جان لڑا دو
خون بہا دو
محل گرا دو!
آگ لگا دو

٭

چیخ رے ساقی!
کود رے ساقی!
شور مچا دو!
کپڑے پھاڑو

٭

رات ہے آدھی
دستک کیسی؟
پٹ مت کھولو
درز سے جھانکو
غور سے دیکھو
شاید کوئی،
"ملّا" ہوگا۔
جان کا لاگو
ہوّا ہوگا
"کالا ماضی"
آیا ہوگا!
جال بکھیرے
گال پھلائے
کندھے پر
رومال سجائے
سینے سے
قرآن لگائے!
ہاتھ میں ہوگا
چام کا کوڑا
چہرہ ہوگا
ڈاڑھی والا
آہ! یہ فتنہ
کالا کالا
ملّا ہے تو
خیر نہیں ہے
ہاتھ نہیں
یا پیر نہیں ہے
دل کی دھڑکن
توبہ! توبہ!

من کا خرمن
شعلہ باشعلہ!
جلنے کیول میں
ہانپ رہا ہوں
جیسے ڈر سے
کانپ رہا ہوں
اک خطرے کو
بھانپ رہا ہوں

★

وقت ہے ساقی!
بالکل تھوڑا
ڈھونڈھ درانتی
تھام ہتھوڑا
آج نہ اس کو
جیتا چھوڑا
مونڈی کاٹا!
آئے نگوڑا!
آنکھیں موندو
کان لپیٹو

شور مچاؤ
ساز بجاؤ
غزلیں گاؤ
جام لنڈھاؤ

★

جام ہے لیکن
بالکل خالی
واہ رے گلشن
واہ رے مالی!
بس رندوں کا
اللہ والی!

★

اچھا! اچھا!
"وہ" آئی ہیں
اوڑھ کے برقع
ڈر کے مارے
جھوٹ کا پردہ
ہونٹوں میں ہے
پنہاں خندہ

کیا فرمایا؟
کھل کر بولو
کہدو کہدو
سچ سچ واللہ!

★

قربان جانم!
ایسا مژدہ!
آپ کے منہ میں
گھی اور شکر
ملاؤں پر
برسیں پتھر

★

آہا! آہا!
چل گئی گولی
ہی ہی، ہو ہو
ہونی ہولی
باہمت ہے
اپنی ٹولی

توڑی قدغن
کر ڈالا ہے
ایجی ٹیشن

★

خون بہے گا
کام بنے گا
چل گئی گولی
ہونی ہولی

★

آج ہے جانم
رات غنیمت
کر لیں جو بھی
بات غنیمت
تم ہو گویا
مے ساقی کی
زور سے بولو
جے ساقی کی!

★

جاگو کلیو!!

نعیم صدیقی

جاگو مرے اس باغ کی سوئی کلیو!

اس باغ کے مالی کہ جو سازش میں لگے ہیں
ان پھولوں کا گلچینوں سے سودا نہ چکا دیں
رنگوں کی یہ دنیائیں، یہ نغموں کی فضائیں
یہ ان کو کہیں سیلِ خزاں میں نہ بہا دیں۔
غیروں کے لئے بھولے ہیں، اپنوں کے لئے تیز
بجلی کے تبسم پہ نشیمن نہ لٹا دیں

جاگو مرے اس باغ کی سوئی ہوئی کلیو!

ان کنجوں میں ہوتی ہیں پراسرار سی باتیں
ان سایوں میں پلتے ہیں خطرناک سے فتنے
رازوں کی نئی کونپلیں ہیں پھوٹنے والی
چھوٹیں گے نئے مکر کی شاخوں سے شگوفے
دزدیدہ سی ہیں دیکھو، شعاعوں کی نگاہیں
بوجھل سے ہیں کیوں بادِ سحرگاہی کے جھونکے!

جاگو مرے اس باغ کی سوئی ہوئی کلیو!

ڈر ہے کہ کسی خانہ برانداز چمن کا
اس صحنِ گلستاں میں گزر ہو کے رہے گا
میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ امیدوں کا فردوس
جولانگہِ طوفانِ شرر ہو کے رہے گا
خونِ مہ و انجم سے سحر کی ہوئی تشکیل
اندیشہ ہے اب خونِ سحر ہو کے رہیگا

جاگو مرے اس باغ کی سوئی ہوئی کلیو!

منصوبہ تو افساد کا سوچا ہے دلوں میں
کہتے ہیں کہ منظور ہے گلشن کا بچاؤ
پڑھنے کو پڑھی جاتی تو ہے امن کی تسبیح
ڈالیں گے یہاں جنگ کے مقصد سے پڑاؤ
یہ آج رخِ زیست پہ برساتے ہیں شبنم
کل موت یہاں آ کے جلائے گی الاؤ

جاگو مرے اِس باغ کی سوئی ہوئی کلیو !

سبزے میں یہاں دام بچھانے کی ہے تجویز
ڈال کے کوئی دم میں بکھر جائیں گے دانے
چھن جائے گی بلبل سے پرِ بال کی جنبش
لٹ جائیں گے کوئل کے یہ نغمے، یہ ترانے
اپنوں کا تو انداز ہے مسحور مزاجی
غیروں نے گھڑے ہیں بڑے معصوم بہانے

جاگو مرے اس باغ کی سوئی ہوئی کلیو !

ہونے کو ہیں نیلام یہ آزاد فضائیں
یہ لالہ و گل، سرو سمن بکنے لگے ہیں
لٹ جائیں گے سنبل کے یہ گیسوئے پریشاں
جاگو کہ یہ مرغانِ چمن بکنے لگے ہیں
مستقبلِ گلزار گرو ہونے لگا ہے
ماضی کے بھی آثارِ کہن بکنے لگے ہیں

جاگو مرے اس باغ کی سوئی ہوئی کلیو !

اندھیروں میں دب جائے گی ہر صبحِ تبسم
بھر جائے گا کانٹوں سے ہر اک پھول کا دامن
ہر اوس کے موتی پہ شرر ہوں گے نگہباں
شعلوں کی حفاظت میں چلے جائیں گے خرمن
سمجھوتوں کے الفاظ بدل دیں گے قفس میں
مرغانِ نوا سنج ہے کے آزاد نشیمن !

جاگو مرے اس باغ کی سوئی ہوئی کلیو !

کل ہوں گی چٹانوں کی فضاؤں میں اڑانیں
بن جائیں گے پھٹتے ہوئے بم رعد کے کڑکے
گیسوں کے یہاں چلتے نظر آئیں گے جھکڑ
بارود کے کل اٹھیں گے یاں تند بگولے
کٹ جائے گی جڑ نخلِ تمنائے جواں کی
امید کی ہر شاخ کے اڑ جائیں گے پرنچے

جاگو مرے اس باغ کی سوئی ہوئی کلیو !

کیا ان کا یہ بھروسہ کہ انوکھے ہیں یہ مالی !
فطرت کے یہ بے مہر طبیعت کے، یہ جلاد
گلشن سے زیادہ ہیں یہ گلچیں کے وفادار
پوری طرح دلدادۂ ہر ناوکِ صیاد
چالوں کی مہارت میں یہ چلنے ہوئے شاطر
حیلوں میں یہ پرویز کے مانے ہوئے استاد

جاگو مرے اس باغ کی سوئی ہوئی کلیو !

غفلت میں گزر جائیں جو گنتی کی یہ گھڑیاں
پھر ہوش میں آنے سے بھی یاں کچھ نہ بنے گا
اس وقت اگر کوئی تڑپ تم نہ دکھاؤ
پھر حشر اٹھانے سے بھی یاں کچھ نہ بنے گا
اس وقت اگر خون میں گرمی نہیں آتی
پھر خون بہانے سے بھی یاں کچھ نہ بنے گا

کریں یا نہ کریں

کوثر نیازی

اپنے ناشاد کا دل شاد کریں یا نہ کریں
پوچھتے ہیں کہ وہ بیداد کریں یا نہ کریں

چین اس میں ہے تو اے ہمدمو! تکلیف بھی ہے
مشورہ دو کہ انھیں یاد کریں یا نہ کریں

نگہِ یار میں مقہور تو بن جائیں گے
دل بھی مجبور ہے فریاد کریں یا نہ کریں

ہاں بتا اے دلِ ناکام! غمِ جاناں سے
تیرے ویرانے کو آباد کریں یا نہ کریں

اک دوراہے پہ کھڑے سوچ رہے ہیں مظلوم
کھوکھلی ظلم کی بنیاد کریں یا نہ کریں

ہائے! یہ بات مسلماں بھی اب سوچیں گے
اس کے احکام پہ ہم صاد کریں یا نہ کریں

کون ہیں ہم کہ کریں شکوۂ خالق کوثر
اُن کی مرضی ہے وہ دل شاد کریں یا نہ کریں

قاضی جی

ایم عبداللہ داھر

ہمارے معاشرے کا ایک اہم کردار

یادش بخیر، خدا قاضی جی کو سلامت رکھے، دشمنوں کی زبانی سنا ہے کہ شہر کے اندیشے نے انھیں بے حد لاغر کر دیا ہے۔ قوم کا غم کھا کھا کر جسم اس قدر دُبلا ہو گیا ہے کہ ہوا کے دوش پر بے تکلف اُڑتے پھرتے ہیں۔ زمانہ کی ہوا ہر آن انھیں وقت کے متعین کردہ رخ کے مطابق لئے پھرتی ہے۔ شہر کے لوگ قاضی جی کو دیکھ کر ہی ہوا کا رُخ پہچان لیتے ہیں۔ اسی لئے شہر کے بعض جوہر شناسوں نے آپ کی ذاتِ اندیشہ مآب کو از رہِ عزت افزائی مرغِ بادنما کا خطاب دے رکھا ہے۔

قاضی جی کو اب تو شہر کے اندیشوں نے محض دُبلا ہی نہیں بلکہ کچھ کچھ بوڑھا بھی کر دیا ہے خدمتِ قوم میں شب و روز کی مصروفیات نے ان کی صحت، جوانی، بانکپن، ہر چیز کو ختم کر دیا ہے مگر ایک وقت تھا کہ وہ بھی بانکے جوان تھے جدھر سے گزرتے بے شمار انگلیاں اُٹھتیں۔ دیکھنے والے دل تھام کر رہ جاتے۔ بعض منچلے دیدہ و دل فرشِ راہ بناتے۔ بعض ان کے نقشِ پا پر عقیدت و نیاز مندی کے گہر ہائے گراں مایہ نچھاور کرتے اور بعض محض ان کی شوخیٔ نقشِ پا دیکھ کر ہی دل و جان سے فدا ہو جاتے۔ مگر یہ دور کی باتیں ہیں اب تو قاضی جی کی ذاتِ اقدس سے اور شہر کے اندیشے بالان کی صحت، جوانی، بانکپن ــــــ ہر چیز آہستہ آہستہ قوم کی نذر ہوتی جا رہی ہے۔

قاضی جی کا وجود شہر کے لئے نعمتِ غیر مترقبہ کی حیثیت رکھتا ہے آپ کی تشریف آوری سے قبل شہر کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ سیاسی گھٹائیں اُٹھتیں۔ مذہبی ہوائیں چلتیں، مگر اہلِ شہر ان کا رُخ نہ پہچان سکتے اور اگر رُخ پہچان لیتے تو ان سے کوئی استفادہ نہ کر سکتے۔ بعض اوقات مفاد پرستی و مطلب پرستی کے سنہری موسم آتے، ابہام و زر سمیٹنے کی دلکش ساعتیں آتیں۔ مگر اہلِ شہر ان کی اہمیت سے یکسر بے خبر رہتے مگر قاضی جی کا فیضانِ نظر، دیکھئے کہ اس وقت شہر کا ہر فرد امیر سے لے کر غریب تک اور بچے سے لے کر بوڑھے تک سیاسی خم و پیچ سے آگاہ، مذہبی الجھنوں سے واقف، مطلب برآری میں ماہر اور دوسروں کو بے وقوف بنانے میں طاق ہے۔

مجھے پھر اپنے مطلب کی طرف لوٹنا چاہیے۔ کہنا صرف یہ ہے کہ اس بڑھاپے اور کمزوری کے عالم میں بھی بقول ع سلامت صد ہا دہ ہیکل جان عندلیب قاضی جی کو شہر کا اس قدر فکر ہے کہ اس سلسلہ میں ان کی شب و روز کی دوڑ دھوپ دیکھنے والوں کو ورطۂ حیرت میں ڈالتی ہے۔ گرمی ہو یا سردی دھوپ ہو یا برسات قاضی جی ہر وقت شہر کے تعمیری کاموں میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ان کی موجودہ تگ و دو کو دیکھ کر بآسانی اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب "آتش جوان تھا" اس وقت سفینۂ خدمتِ شہر کا رنگ کیا ہو گا۔

شہر میں کوئی سیاسی ہنگامہ ہو، کوئی مذہبی تقریب ہو، کسی بھی مجلس کا انعقاد ہو یا افتتاح ہو، الغرض کسی قسم کی کوئی تقریب ہو ــــــ یہاں تک کہ کسی دنگل کا ذکر ہو یا بٹیر لڑانے کا پروگرام بن رہا ہو ــــــ قاضی جی ہر مقام پر آپ کو پیش پیش نظر آئیں گے۔ ان کو بلانے یا نہ بلانے کا سوال ہی نہیں، ایسے مقامات پر وہ خود بخود اس طرح پہنچ جاتے ہیں جس طرح کرگس مردار جانور کے پاس ــــــ تشبیہ کی

قاضی جی

کثافت کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ مگر افسوس کہ میرا ذہن قاضی جی کے جذبۂ خدمت کی اس سے بہتر تشبیہہ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ جس طرح قاضی جی کی تشریف آوری ان کو ملنے کی مرہونِ کرم نہیں اسی طرح ان کے مفید مشوروں سے مستفید ہونے کے لئے بھی ان کی رائے طلب کرنا ضروری نہیں وہ خود بخود آپ کو ایسے ایسے مشوروں سے نوازیں گے اور آپ کے پیش آمدہ مسائل کے اس قدر الوکھے اور عجیب و غریب حل بتائیں گے کہ آپ یکسر تصویرِ حیرت بن کر رہ جائیں اور قاضی جی آپ کو جس "فریم" میں چاہیں لگالیں۔ ویسے قاضی جی کی ہمدردی، صاف دلی اور آپ سے خصوصی تعلق پر کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا وہ ہمیشہ آپ کے فائدہ کی بات کریں گے۔ اور آپ کو ایسی ایسی راہیں بتائیں گے جن پر چل کر آپ عوام کے محبوب اور فقیہہ شہر کے منظورِ نظر بن جائیں۔

دراصل قاضی جی کی ذات اہلِ شہر کے لئے قدرت کا ایک بے بہا انعام ہے اور یہی وجہ ہے کہ جس طرح قدرت کی دیگر نعمتیں مثلاً پانی ہوا، روشنی وغیرہ ہر جگہ اور ہر وقت مفت اور بلا طلب میسر آتی ہیں اسی طرح قاضی جی کی ذات اور ان کے بلند افکار اہلِ شہر کو مفت اور بلا طلب مستفید فرماتے رہتے ہیں۔

قاضی جی کے فکر و عمل کے بعض گوشے اس قدر بلند و وسیع اور حیران کن ہیں کہ عوام کے لئے ان کی حقیقت تک پہنچنا جوئے شیر لانے سے کسی طرح کم نہیں۔ بسا اوقات بعض کور دماغ جو قاضی جی کے مقام اور ان کی جامع کمالات شخصیت کی عظمت سے آگاہ نہیں ان کے کردار کے بعض زاویوں کو محلِ نظر قرار دے دیتے ہیں۔ حالانکہ اصلیت صرف یہ ہوتی ہے کہ ان کی نگاہیں ان گوشوں کی لطافت کو دیکھنے سے قاصر ہوتی ہیں۔ لہذا وہ اس لطافت کے ساتھ کچھ کثافت ملا کر جلوہ پیدا کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔

خدمتِ قوم کے تقاضہ کے طور پر آپ کو صنفِ نازک سے خاص دلچسپی ہے۔ ان کی تعلیم و تربیت، نشست و برخاست اور عادات و اطوار کی نگہداشت آپ کا خاص مسلک ہے۔ ان کو بامِ ترقی پر لے جانا، ان کی جہالت و پسماندگی کو دور کرنا اور ان کی حرکات و سکنات کو فیشن ایبل سوسائٹی کے مطابق بنانا آپ نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔ اس پر وہ لوگ جنہیں گلِ سعدی، خارِ مغیلاں" بن کر نظر آتا ہے۔ طرح طرح کی چہ میگوئیاں کرتے ہیں حالاں کہ ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ صنفِ نازک کو ہی کسی قوم کی تعمیر کا شرف حاصل ہے۔ یہ صنف جس قدر ترقی یافتہ اور مہذب ہوگی۔ اسی قدر قوم تہذیب و ترقی کی منازل طے کرتی چلی جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ قاضی جی کی کوششیں زیادہ تر اس اہم گوشہ کی اصلاح و تعمیر میں صرف ہوتی رہتی ہیں۔

قاضی جی نے اپنی ساری عمر حالتِ تجرد میں گزار دی ہے اس پر بھی بعض کوتاہ بین شکوک و شبہات کی بے بنیاد عمارت تعمیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ اس کا فلسفہ سمجھنا بھی کچھ مشکل نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کے بیوی بچے ہوں گے اس کے دل میں قوم کے دیگر افراد کی نسبت اپنے کنبہ کے لئے زیادہ جگہ ہوگی اور اس کی کوششیں بھی زیادہ تر ان کی تن پروری اور آرام و آسائش کے لئے وقف ہوں گی۔ مگر قاضی جی کو یہ کس طرح گوارہ ہو سکتا تھا کہ ان کا وہ جگر جو سارے شہر کا درد سمیٹنے کے لئے پیدا کیا گیا تھا محض چند افراد کے درد پر اکتفا کرے۔ لہذا آپ نے اس مصیبت میں پڑنا ہی گوارا نہ کیا۔

اسی طرح کے چند اور اعتراضات بھی قاضی جی کے فکر و عمل پر کئے جاتے ہیں مگر یہ سب بے حقیقت ہیں قاضی جی کی شہرت و ناموری پر ان اعتراضات کا کچھ اثر نہیں پڑ سکتا ان کی ہر دل عزیزی روز افزوں ہے۔ شہر کی کوئی تقریب کوئی پروگرام ان کی موجودگی کے بغیر سرانجام نہیں پا سکتا شہر کو فتنہ و فساد سے محفوظ رکھنا، اہلِ شہر کے دلوں کو "فقیہہ شہر" کی طرف سے صاف رکھنا آپ کے سعی و عمل کا بہت بڑا محور ہے۔ سیاسی ہنگاموں کو آپ نہایت بری نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ ان ہنگاموں سے اہلِ شہر کی نگاہیں "فقیہہ شہر" کے احوال و کوائف کا جائزہ لینے لگتی ہیں۔ مگر لطف یہ ہے کہ وہ اپنی اس نفرت کا اظہار کبھی نہیں کرتے بلکہ ہر ہنگامہ میں بذاتِ خود شامل ہو کر اس حسن و خوبی سے اسے فرو کرنے کی کوشش کرتے ہیں

قاضی جی

کہ اس تحریک کے بانی سرپیٹ کر رہ جاتے ہیں۔ باغیانہ جذبات سے بھرپور دلوں کو صہبائے اطاعت و وفاداری سے سرشار کر دینا آپ کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ان مواقع پر آپ اکثر قرآن کریم کی آیات سے بھی کام لیتے ہیں۔ اس غرض کے لئے آپ نے چند آیات یاد کر رکھی ہیں۔ اہل شہر کو آپ ان کے فرائض، حسن اخلاق، رواداری اور نظم و ضبط کا اس حد تک احساس دلاتے رہتے ہیں کہ اہل شہر کے اذہان و قلوب کسی اور بات کو دیکھنے سمجھنے اور سوچنے کی صلاحیت سے ہی محروم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ مگر اس کے باوجود مذہبی فرقہ بندی کو آپ بہت پسند فرماتے ہیں، اور ایسے گروہوں کی سرپرستی فرماتے ہیں جو اس تفرقہ بازی کو وسیع سے وسیع تر کرتے چلے جائیں۔ اس لئے کہ اس حسین شغل کی بدولت اہل شہر کی توجہات اپنے اختلافات پر ہی مرکوز رہتی ہیں اور شہر کا نظم و نسق عوام کی نکتہ چینی سے محفوظ رہتا ہے۔

مشہور ہے کہ ہر باکمال اپنے وقت کے بعد سراہا جاتا ہے موت انسان کے عیوب کو ڈھانپ لیتی ہے اور اس کی صفات کو دنیا کے سامنے آشکار کر دیتی ہے۔ زمانہ نے کبھی کسی شخص کو اس کی زندگی میں وہ مقام عطا نہیں کیا جس کا وہ مستحق ہو مگر قاضی جی اس معاملہ میں بہت خوش قسمت ہیں کہ زمانہ نے ان کی زندگی میں ہی ان کے مقام حقیقی و مرتبہ کو پہچان لیا ہے۔ قاضی جی کی فراست، قابلیت، اور خدمت قوم کے واقعات نے افسانوی شکل اختیار کر لی ہے۔ شہر کا ایک ایک فرد ان کے کردار کی بلندی اور علم و تجربہ کی وسعت سے آگاہ ہے کسی محفل میں ذرا اس ذکر کو چھیڑ دیکھئے اور پھر ان کی قومی خدمات کی غیر مختتم فہرست سنتے چلے جائیے۔

میرا خیال ہے قاضی جی کے مناقب سن کر آپ کا دل ان کی ملاقات کے لئے مچل رہا ہے، اگر واقعی ایسا ہے تو بڑی خوشی کی بات ہے یہ سعادت ضرور حاصل کیجئے۔ مگر ایک بات یاد رہے کہ اس غرض کے لئے ان کے دولت کدہ پر جانے کی تکلیف گوارہ نہ فرمائیے گا۔ شہر کے اندیشے انہیں گھر بیٹھنے کا بہت کم موقعہ دیتے ہیں اور اگر وہ اتفاق سے گھر پر موجود بھی ہوں تو ان کا ملازم آپ کو ان کی غیر حاضری یا علالت طبع سے باخبر کر دے گا۔ اس لئے اگر ان سے نیاز حاصل کرنا مقصود ہوں تو کسی جلسہ میں جائیے، یا کسی محفل کا رخ کیجئے، کسی بڑے مکان کی غلام گردش میں پڑے ہوئے بنچ پر نگاہ ڈالئے یا پھر کسی قہوہ خانہ میں جائیے اور اگر آپ شرم محسوس نہ کریں تو اچھا ہے "اس بازار" تک بھی ہو آئیے۔ ان مقامات پر کہیں نہ کہیں قاضی جی آپ کو ضرور مل جائیں گے۔

شہر کا بچہ بچہ قاضی جی کو جانتا ہے ان کے لقب قاضی جی نے اس قدر شہرت اور وسعت اختیار کر لی ہے کہ آپ کسی سے ان کا نام لے کر یعنی "صاحبزادہ خان ابن الوقت" کہکر پوچھیں گے تو وہ آپ کا منہ دیکھنے لگے گا لیکن اگر آپ قاضی جی کہکر پوچھیں گے، تو ایک شیر خوار بچہ بھی آپ کو ان کی خدمت اقدس میں پہنچا دیگا۔

قاضی جی کو قوم کا غم کھائے جا رہا ہے شہر کے اندیشوں نے ان پر دن کا چین اور رات کی نیند حرام کر رکھی ہے۔ ان کی صحت، طاقت جسمانی ہر چیز قوم کی نظر ہو چکی ہے اور جو کچھ باقی ہے وہ بھی قوم کی نذر ہے کس قدر قابل رشک ہے یہ زندگی!

خدا قاضی جی کو سلامت رکھے!

موج و حباب

★ ———— کوثر نیازی

دوائے سیم و گہر ہے علاجِ دردِ بشر
یہ اک جنونِ جہالت ہے، اک فریبِ نظر

جہان والو! یہی ہے نہالِ زر کا ثمر؟
کہ آبِ حیاتِ بشر بھی ہے موت سے بد تر

وہ ایک درد جو اشکوں میں ڈھل کے بہتا ہے
نہیں ہے اس سے زیادہ متاعِ قلب و جگر

یہ کیا مرض ہے؟ بتاؤ تو اے خرد مندو!
نہ مجھکو دل کی خبر ہے، نہ دل کو میری خبر

ضمیرِ زر کے ترازو میں تُل رہے ہیں یہاں
کہاں کا زہد و تقدس، کہاں کا علم و ہنر

بس ایک ذرۂ عہدِ قدیم کے بدلے
نہ لوں زمانۂ حاضر کے شمس اور قمر

بتانِ مشرق و مغرب کو پوجنے والو!
سکوں کی دولتِ نایاب ہے اِدھر نہ اُدھر

نہیں ہے کوئی بھی حاجت ترے فقیروں کو
بس اک نگاہِ تلطف، بس اک کرم کی نظر

بڑا لذیذ ہے اے دل منافعِ دنیا
اُٹھا سکے گا مگر تو خسارۂ محشر؟

برائے شمر و یزید آج بھی ہزار آرام
برائے شبّر و شبیر، آج بھی خنجر

حضورِ یار نگاہیں بھی ساتھ دے نہ سکیں
جہاں میں کوئی بھروسہ کرے تو اب کس پر؟

یہ رند اور زیادہ طلب نہیں کرتا
بس اک بوند عنایت ہو ساقیِ کوثر!

راحت علی خان

پیوستہ ہے درد جسم و جاں سے ۔۔۔ معلوم نہیں اُٹھا کہاں سے
اے گردشِ روزگار ہم بھی ۔۔۔ پہنچے ہیں وہیں چلے جہاں سے
ہم کو تو بہار بھی نہیں راس ۔۔۔ کیا شکوہ کریں گے اب خزاں سے
یہ روز کے ناز کون اُٹھائے ۔۔۔ تنگ آئے ہیں چشمِ خوں فشاں سے
ویرانے میں آ گئے قفس سے ۔۔۔ یہ سُود بھی کم نہیں زیاں سے
دو اور قدم اُٹھاؤ یارو! ۔۔۔ نکلے گا نہ کام کچھ فغاں سے
مل جائیں گے وہ بھی رفتہ رفتہ ۔۔۔ بچھڑے تھے کبھی جو کارواں سے
ہم دام میں اب نہ آ سکیں گے ۔۔۔ آئے ہیں یقیں تک گماں سے

راحت کو بھی کچھ نہ کچھ ملا ہے
احساس کی دولتِ گراں سے

●

نسیم

مذاقِ فکر و نظر ہو جس کا تقدس و آگہی کا محرم ۔۔۔ اُسی کے قدموں کو چومتا ہے ہمیشہ بامِ فلک کا زینہ
اُسی کے ہاتھوں سے لکھے جاتے ہیں فیصلے وقت کی جبیں پر ۔۔۔ عمل کے میدان میں اُتر کر جو ایک کرتا ہے خوں پسینہ
وہی سیاہی وہی اندھیرے وہی تلاطم وہی تھپیڑے ۔۔۔ ابھی ہے تقدیر گردشوں میں ابھی ہے گرداب میں سفینہ
نمودِ گل کی خوشی میں مالی ہزار تانیں اُڑا رہا ہے ۔۔۔ اُسے یہ احساس تک نہیں ہے کلی کا بھی شق ہوا ہے سینہ

کسی کو ساحل دکھا رہا ہے کسی کو ساحل پہ لا رہا ہے
مری سمجھ میں تو کچھ نہ آیا یہاں کے ملاّح کا قرینہ

کہیں عنادل نے باغباں سے شکایتِ گلستاں نہ کی ہو!
کلی کلی شرمساری ہے گلوں کے ماتھے پہ ہے پسینہ

نہ کیجئے ایسی تلخ باتیں بہت ہی نازک ہے دل ہمارا
ذرا سی ٹھوکر سے ٹوٹ جاتا ہے اے ستمگر یہ آبگینہ

مجھے نہ بہکائیں میرے احباب میں سمجھتا ہوں جانتا ہوں
وہی ہے انگشتری وہی ہے بدل گیا ہے مگر نگینہ

عمل اُسی کا یقیں اُسی کا خودی اسی کی خدا اُسی کا!
جو آنہ دوں کھونے پر بھی لٹا نہ دے صبر کا خزینہ

ترے گلستاں کا باغباں یہ عجیب دستور ہم نے دیکھا
کہ بلبلیں خار پر فدا ہیں، گلوں سے رکھتی ہیں بغض و کینہ

●

راشدؔ القادری

کوئی نظامِ زیست بھی مجھ سے چھپا نہیں
میری حدودِ فکر سے کچھ ماوَرا نہیں

کتنا خرد فریب ہے وہ دورِ فکر بھی
جو کہہ رہا ہے خلق کا کوئی خدا نہیں

رکھتا نہ ہو علاج جو انساں کی روح کا
وہ مادّی نظام مرا مُدعا نہیں

آزادیٔ ضمیر نہ ہو جس نظام میں
وہ منظّم آمرانہ میرے کام کا نہیں

گنجائشِ اخوتِ انساں نہ ہو جہاں
تہذیب کا وُہ دَور امینِ بقا نہیں

انساں جسم و روح کی ترکیب کا ہے نام
روحانیت حیات سے ہرگز جدا نہیں

وہ کیا سمجھ سکیں گے مقامِ خدا ہے کیا
اپنی صدائے دل ہی سے وہ آشنا نہیں

اِک اور زندگی بھی ہے اس زندگی کے بعد
دنیا کی زندگی بھی مری انتہا نہیں

موج وحباب

ہے جادۂ نجات کی راشدؔ اگر تلاش
اسلام کے سوا وہ کوئی دوسرا نہیں

●

★ ———— عزیز حمیدی

چار تنکوں کے حسیں خواب کی تعبیروں پر — برقِ سوزاں کی عنایات نے قابو پایا
میرے جذبات و خیالات و زبان و دل پر — ہاں! ازل کی اسی اک بات نے قابو پایا
مکرِ فرعون پہ شدادؔ کی عیاری پر — پسِ پردہ ہی کسی ہاتھ نے قابو پایا
حیف صد حیف کہ اب ذہن پہ فنکاروں کے
شامِ ہجراں کی حکایات نے قابو پایا

●

★ ———— نجمی اعظمی

وہ تن گئی ہیں بھنویں تیوری پہ بل آئے — الٰہی خیر! کسی پر چھری نہ چل جائے!
بہار اور خزاں رنگ، واہ کیا کہنا
کلی چٹک بھی نہ پائے کہ جھٹ مسل جائے

●

قند و نمک

"وہ"

"وہ" خلوت میں تھے!

وہ کون ؟ —— کیا بتائیں، اُن کا پردہ بھی تو رکھنا ضروری ہے! چنانچہ اسی پردہ داری کے لئے شاعروں نے اپنے معشوق کے لئے "وہ" کا ضمیر استعمال کیا ہے؛ لیکن بعد میں اس "وہ" کے پردے کے پیچھے مختلف ہستیاں چھپتی رہیں اور بٹھائی جاتی رہیں لیکن وہ سب روایتی معشوق ہی سمجھی گئیں۔ مثلاً اس وہ کا اشارہ درباری شعراء کے ہاں بادشاہ کے لئے بھی ملتا ہے، صوفی شعراء کے ہاں خدا کے لئے، نعت گوؤں کے ہاں نبی عربی کے لئے، اکبر کے ہاں انگریزی اقتدار اور مغربی تہذیب کے لئے، اور محمد علی جوہر کے ہاں کبھی برٹش پالیسی کے لئے، کبھی قانون کے لئے اور کبھی عدالت اور اورنج کے لئے "وہ" اور "اُن" کا استعمال کیا جاتا ہے۔ خود حلقۂ ادبِ اسلامی کے شعراء بھی کبھی کبھی اپنی غزلوں میں "وہ" سے مسلم لیگی قیادت مراد لیتے ہیں۔ اس لئے یہ وہ کا روایتی پردہ بے جواب اٹھایا نہیں جا سکتا، یہ تو جہاں پڑ گیا، پڑ گیا!

تو "وہ" بیٹھے تھے!

ان کو اگر ایک روایتی معشوق ہی سمجھ کر بات کریں تو یوں کہنا چاہیئے کہ بہت سے عشاقِ نامراد کو دشنۂ مژگاں سے گھائل کرنے کے بعد ایک عجیب شان سے بیٹھے تھے ایک عاشق نے حاضری کی اجازت چاہی اور مل گئی۔ عاشق صاحب اپنا غمِ دل بیان کر رہے تھے۔ ایسے موقعوں پر کچھ رقت طاری ہو سکتی ہے۔ چنانچہ آنکھیں پونچھنے کے لئے عاشق صاحب کو رومال کی ضرورت پڑی۔ رومال نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا، اور رعبِ یار کا تقاضا ہی کچھ ایسا تھا کہ رومال وہ بالکل آہستہ آہستہ نکال رہے تھے۔ معشوق صاحب کو اس انداز کے اندر کسی مجرمانہ ارادے کی جھلک نظر آئی —— اور انہوں نے شور مچا دیا!

"دوڑو —— پکڑلو —— مار ڈالا، مار ڈالا!"

اور عاشق غریب کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی اور لجاجت سے کہا:۔

"جانم! آپ کیا کر رہے ہیں، یہ دیکھئے میں تو جیب سے رومال نکال رہا ہوں!"

اور معشوق کی جان میں جان آئی۔ دربان آواز سُن کر دوڑے دوڑے دروازے تک آ پہنچے تھے۔ مگر ان کو تسلی دلائی گئی کہ "کچھ نہیں، کچھ نہیں!"

معشوق بھی عجیب لوگ ہوتے ہیں خود تو قتلِ عام کرتے پھرتے ہیں اور اپنی جان اتنی پیاری ہوتی ہے۔

• • •

ایں کتاب از آسمانِ دیگر است

"جماعتِ اسلامی پر ایک نظر" کے نام سے جو کتابِ مقدس چند دن پہلے نازل ہوئی تھی، کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اس کا نزول کس

قند و نمک

آسمان سے ہوا ہے' اس کا مصدر وحی کون تھا۔ اس کا ذریعۂ نزول کون تھا' یہ کس نبی پہ اتری' اس کا کاتب وحی کون ہے اور اب اس کو پھیلانے والے جنات کون سے ہیں؟

اس کتاب راز کے بارے میں لوگ بالکل اندھیرے میں تھے کہ لاہور کے ایک صحافی نے اعلان کیا کہ وہ اس راز کا راز داں ہے۔ اور وہ عین چوراہے میں بھانڈا پھوڑ دے گا۔ لوگوں کی توجہ اس کی طرف لگ گئی کہ یہ کتنا جری اور بے باک آدمی ہے جو غیبی حقیقتوں کو منظرِ عام پہ لانے کا کش بل رکھتا ہے۔ مگر اس کے بعد یہ بزرگ بھی پردۂ غیب میں بیٹھ گئے اور ان سے جب پوچھا گیا تو اشاروں میں فرمایا کہ:۔

إِنِّي نَذَرْتُ لِلرَّحْمَٰنِ صَوْمًا فَلَنْ أُكَلِّمَ الْيَوْمَ إِنسِيًّا

یعنی بے چاروں کو اسی آسمان سے جس سے وہ کتاب اتری تھی' روزۂ سکوت کی وحی ہو گئی تھی۔

اس پہ بعض وہمی اور تنگ مزاج لوگوں نے ہمارے جسارت مآب صحافی کے خلاف پروپیگنڈا بھی شروع کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ روزۂ سکوت کی وحی جب بھی اترا کرتی ہے تو کسی بشارتِ عطیہ کے ساتھ اترتی ہے' مثلاً جب حضرت زکریا کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی تھی کہ

أَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلَاثَ لَيَالٍ سَوِيًّا

تو اس سے قبل یہ مژدہ' فرحت زا دیا تھا کہ:۔

إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ اسْمُهُ يَحْيَىٰ

اسی طرح حضرت مریم کو روزۂ سکوت کی جب ہدایت کی گئی تھی تو اس سے قبل حضرت عیسیٰ کی بشارت کو پورا کیا جا چکا تھا۔

پس یہ آسمان مانا کہ جس سے "جماعتِ اسلامی پہ ایک نظر" نامی کتاب نازل ہوئی تھی' اسی آسمان سے اگر ایک صداقت پرست صحافی پہ روزۂ سکوت کی وحی اتری ہے تو لازماً اس کے ساتھ کوئی عطیہ بھی اترنا چاہیئے۔ دیکھیئے منطق منطق میں بھی لوگ بات کو کہاں پہنچا دیتے ہیں کہ دل اسے ماننے پہ تیار ہو جاتا ہے۔ یہ باتیں سن سن کر فوراً خیال ہوتا ہے کہ بات تو لگتی ہوئی سی ہے کہ خدا تعالیٰ کا نظام یہ ہے کہ اس کے آسمان سے وحی بھی نازل ہوتی ہے اور رزق بھی اتارا جاتا ہے تو آخر اور جن جن طاقتوں کے آسمان ہوں گے اُن سے بھی وحی اور رزق دونوں اُترتے ہوں گے۔ آخر جو کوئی وحی قبول کرتا ہو گا اس کے لئے رزق سے گریز کی کیا وجہ ہو سکتی ہے ——— یہ تو کھلا کھلا کفرانِ نعمت ہے۔ رزق کے مستحق تو وہ لوگ نہیں ہو سکتے جو وحی کو نہ مانیں۔ جس نے وحی مان لی اس کے لئے رزق حلال ہو گیا۔ دیکھیئے کیسے کیسے اُلٹے سیدھے خیالات پیدا ہونے لگتے ہیں!

تو ہاں! ذکر ہو رہا تھا اُس کتابِ راز کا! ——— اُس کا پول تو کھل ہی گیا ہے!

معاصر "جہانِ نو" کراچی حسب ذیل انکشافات کا ذمہ دار ہے کہ:۔

——— یہ کتاب ۱۹۵۰ء کے انتخاباتِ پنجاب میں جماعت اسلامی کے خلاف استعمال کرنے کے لئے لکھی یا لکھوائی گئی تھی۔

——— اس کتاب کی کتابت منشی قدرت اللہ نے اپنے ہاتھ سے کی ہے۔

——— یہ ریڈیو پاکستان کے براڈ کاسٹنگ ہاؤس میں لکھی گئی۔

——— اس کی پروف ریڈنگ ڈاکٹر اظہر علی صاحب نے کی جو ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی وزیر نشر و اشاعت و اطلاعات کے پرسنل اسسٹنٹ تھے۔

——— اس کے مسودے محکمہ اطلاعات و نشر و اشاعت سے ٹائپ شدہ کاغذ پہ آیا کرتے تھے۔

——— یہ ایک ایسے پریس میں چھپی ہے جہاں پورا کام سرکاری ہوتا ہے اور جہاں' ماہِ نو' اور آہنگ بھی چھپتے ہیں۔

فندو نمک

——— ابو رشید وحیدانی اور ملک محمد افضل کی طرح اس کے مولف کو اس نام سے نہ آج تک کوئی جانتا ہے، نہ کسی پتے پر مل سکتا ہے اور یہ حضرت یا تو صحافیوں کے غیر مرئی غول سے تعلق رکھتے ہیں۔

——— کتاب کی لاگت کا کم سے کم اندازہ (جس کی توقع سرکاری کاموں میں کبھی نہیں کی جا سکتی) ایک روپیہ ۵ آنے فی کتاب ہے۔ اس کی قیمت فروخت عہ۸ ہے اس میں سے اگر فروخت کا ۲۵ فیصد کمیشن بھی وضع کیا جائے تو عہ۲ وصول ہوتے ہیں جو لاگت سے بھی کم ہیں۔ لیکن عملاً یہ بڑے پیمانے پر مفت تقسیم کی جا رہی ہے۔

اب کسر صرف اتنی رہ گئی ہے کہ مولف کی شخصیت کو بھی بے نقاب کیا جائے۔ اس بارے میں ہمیں معلومات ضرور ہیں۔ مگر وہ چونکہ سو فیصدی قطعیت نہیں رکھتیں اس لئے ذرا تامل کیجئے۔ توقع ہے کہ سب کچھ منظر عام پر آ جائے گا۔

کیا اس انکشافِ حقیقت کے بعد کہ ایک کتاب سازش کے طور پر لکھی گئی ہے "نقابِ راز کے پیچھے بیٹھ کر لکھی گئی ہے۔ دلی جذبات سے نہیں، روپے کی خاطر لکھی گئی ہے اب یہ ساری محنت اپنے مقصد کے لئے کچھ بھی مفید ہو سکے گی جو اس پر صرف کی گئی ہے یہ روپیہ اگر کسی قصبے میں ایک شفاخانہ یا ایک مدرسہ قائم کرنے پر صرف کیا جاتا یا اس سے چند زائد رائفلیں ملک کے دفاع کے لئے حاصل کی گئی ہوتیں تو یہ ایک معقول مصرف ہوتا۔ لیکن یہاں تو ملکی دولت کو ہوا میں غبارہ بنا کے اڑا دیا گیا ہے؟

• • •

——— انھیں کچھ نہ کہو!

میں ملتان سے لاہور آتے ہوئے ایک وکیل صاحب کا ہم سفر تھا۔ یہ لاہور ہائی کورٹ سے وابستہ ہیں اور انار کلی میں رہتے ہیں۔

آپ حیران ہوں گے کہ میرے ان ہم سفر کو یہ سرے سے معلوم نہیں تھا کہ اس ملک میں جماعت اسلامی نام کی کوئی جماعت کوئی کام کر رہی ہے۔ ان کو معلوم نہیں تھا کہ دستور کے بارے میں کوئی مہم ہے جو اس جماعت کی طرف سے جاری ہے جب ان کو بتایا گیا کہ جماعت یہ ہے اور اس کا کام یہ ہے تو نہایت خیر خواہانہ انداز میں مشورہ دینے لگے کہ آپ لوگ پبلسٹی کے جدید ذرائع کو کیوں نہیں استعمال کرتے؟ ———

میں نے پوچھا کہ کون سے ذرائع؟ فرمایا کہ آپ پوسٹر چھپوائیں، ہینڈ بل شائع کریں، لاؤڈ سپیکروں کے ذریعے اپنا تعارف کرائیں! میں نے عرض کیا کہ "یہ سب کچھ تو ہم بہت بڑے پیمانے پر کرتے ہیں"۔ اب وہ اور کیا کہتے۔ مگر میں دل ہی دل میں کہتا رہ گیا کہ آپ جیسے لوگوں تک پبلسٹی کا کوئی ذریعہ ہمارا پیغام نہیں پہنچا سکتا۔ آپ کو تو خبر اس دن ہو گی جس دن دنیا بدل جائے گی۔

سوچئے کہ ہماری اپر مڈل کلاس کے یہ لوگ کس دنیا میں رہتے ہیں! ——— اور یہی اپر مڈل کلاس، ہماری زندگی کا نظام چلانے میں لگے ہوئے ہیں!

وکیل صاحب سے عبرت پذیر ہونے کے بعد خیال آیا کہ وہ پرانا مصرع یوں بدل دینا چاہئے کہ:-

"نئے وقتوں کے ہیں یہ لوگ، انہیں کچھ نہ کہو!"

• • •

یہ لیڈری

کراچی کے حادثے کا ردِ عمل لاہور کے طلبا میں نمودار ہونا چاہئے تھا اور ہوا۔

قند و نمک

اس سلسلے کی دلچسپ اطلاع یہ ہے کہ بعض لیڈر حضرات نے اس موقع پر طلبا کو مظاہرات کے لئے روپیہ دیا اور اس مقصد کے لئے دیا کہ اُن کو تقریر کرنے کا اور ذرا نمایاں ہونے کا موقع ملے۔ لیکن طلبا بھی کایاں نکلے۔ انہوں نے روپیہ بصد شکریہ قبول کر لیا۔ لیکن اس کی قیمت ادا نہیں کی۔

اس طرح کی لیڈریاں جس قوم میں پائی جاتی ہوں اور جہاں ایسی ایسی سیاستیں چلتی ہوں وہاں دین، ملک اور عوامی مفاد کی جو گت بن سکتی ہے آپ اس کا خود اندازہ لگالیں

• • •

بے چارہ مولوی ۔

ہم ایک بس اسٹینڈ پر کھڑے تھے ۔

ایک پولیس کنسٹیبل سڑک کے کنارے تانگے کھڑے کرنے والے اکّہ بانوں کا چالان کرنے کے لئے ڈیوٹی پر تھا اور قانونی شکار پر ہاتھ مار رہا تھا اتفاق سے ایک ڈاڑھی والا اِکّہ بان زد پر آگیا۔ بس اسٹینڈ کے مجمع کو سنا کر کنسٹیبل صاحب نے اس پر طنز کیا کہ " بنتا ہے مولوی اور سواریاں لادتا ہے پانچ پانچ "

مولوی بے چارہ وزرا کی جوتیں ہی نہیں کھاتا ، پولیس کنسٹیبلوں کی ٹھوکریں بھی سہتا ہے !

اس طنز پر ایک شریف آدمی نے احتجاج کیا کہ "ہر ڈاڑھی رکھنے والا مولوی نہیں ہوتا۔ تمہیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس طرح مولوی کے لفظ کو رسوا کرو" خاصی دلچسپ جھڑپ ہوئی ؟ اور کنسٹیبل کے مقابلے میں پلہ شریف آدمی کا بھاری رہا ۔

• • •

"۲۳۲"

کراچی میں جو حادثہ ہوا ہے ، یہ کوئی پہلا واقعہ تو ہے نہیں ' اس سے پہلے بھی پاکستان میں بہت کچھ ہو چکا ہے بخصوصاً چارسدہ (سرحد) اور دھیروکے (ضلع لائل پور) وغیرہ کے واقعات پولیس کے جبر و تشدد کے خوفناک نمونے تھے ۔

ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ایسے حادثات و واقعات کے لئے اُسی طرح کا ایک عدد مقرر کر لینا چاہیے ۔ جیسا کہ "۴۲۰" یا "۱۰" ہے کہ اس عدد کے بولتے ہی پورا تبصرہ ہو جاتا ہے ۔ ہم تجویز پیش کرتے ہیں کہ پولیس کے یا پولیس کے ذریعے حکمران طاقت کے جو و نا روا کو "۲۳۲" کے عدد سے موسوم کیا جائے ۔

آپ کہیں گے کہ اس عدد کے موزوں ہونے کی دلیل کیا ہے ؟ ——— لیکن اگرچہ عدد ایسا ہو کہ اس کے بارے میں دلیل و وجہ بیان کرنی پڑے تو پھر یہ مطلوبہ مدعا کے لئے موزوں نہیں ہو سکتا !

لیکن آپ اگر دلیل طلب کئے بغیر اس کی موزونیت کو پالیں تو پھر مثلاً کراچی کے حادثے پر یوں کہیں گے کہ کراچی میں حکومت نے ۲۳۲ کر دیئے یا ۲۷ جانیں کراچی میں پولیس کی " ۲۳۲ " کا شکار ہوئیں "۔

فرمائیے کہ تجویز مناسب ہے یا نہیں !

بصائر

خیال انگیز خیال افروز

لالہ صحرائی

کھلاڑی بیٹے کو باپ کی نصیحت "بیٹا! ہارو تو یوں گویا تمہیں یہی پسند تھا اور جیتو تو یوں گویا تم اس کے عادی تھے!"

●

قبل اس کے کہ آپ کسی کے نقائص پر تبصرہ کریں تھوڑا سا وقت خود اپنے نقائص کے شمار میں بھی صرف کر دیجئے ——— یونہی ذرا دم لینے کو!

●

نپولین کے پاس جب بھی اس کے فوجی سالار کسی کارہائے نمایاں کی خبر لے کر آتے تو کہا جاتا ہے کہ اس پست قد لیکن عالی ہمت انسان کے لبوں پر ہمیشہ یہی استفسار ہوتا کہ "اچھا تو اس کے بعد تم نے کیا کیا؟"

●

ایک صحت مند اور محکم متخیلہ والے شخص کے سامنے جب کوئی مسئلہ درپیش ہو تو وہ صرف ایک ہی نقطۂ نظر سے اس پر سوچتا اور بحث کرتا ہے یعنی "آیا یہ مسئلہ مبنی برحق ہے یا مبنی بر ناحق؟" ——— لیکن ایک گھٹیا اور ادنیٰ متخیلہ والا شخص اس کی بجائے ہمیشہ اس قسم کے بے شمار سوالات پیدا کرنے لگتا ہے کہ "مسئلہ زیر بحث ترقی پسندانہ ہے یا رجعت پسندانہ؟ جمہوری ہے یا فسطائی؟ اشتراکی ہے یا سرمایہ دارانہ؟"

●

آسمان کی وسعت آنکھوں کے لئے وہی حیثیت رکھتی ہے جو انسانی فکر کے لئے روح ——— عام لیکن بے حد اہم!

●

اگر بہار کا موسم ہر سال کے بجائے صدی میں ایک بار آیا کرتا یا اپنی مخصوص عالم سکون نرمی کی بجائے اگر زلزلے کی مانند لمحات میں آ دھمکے تو دنیا میں ہر سو انتظار کا کتنا طلسمی احساس پیدا ہو جاتا اس معجز نما انقلاب کی دید کے لئے تاہم ہم اسے یونہی دیکھتا ہے۔

●

کائنات کے بہت سے کاموں میں مردوں کے مقابلے میں عورتوں کے پیچھے رہ جانے میں بنیادی سبب یہ ہے کہ عورتیں بیویاں نہیں رکھتیں۔ جب تک سائنس یا اقتصادی علوم فطرت کی اس زبردست کوتاہی کی اصلاح نہیں کر دیتے مجھے ڈر ہے کہ ہم عورتیں مردوں سے کمتر ہی رہیں گی۔
(ایک مغربی عورت)

●

ایک شوخ قسم کے دوست نے اپنی لڑکی کی منگنی کا اعلان کیا!

●

امیری کی حالت میں مرنے والا شخص بے عزتی کی موت مرتا ہے!

●

بصائر

اچھی بسر کی ہوئی زندگی کی شام اپنے چراغ ہمراہ لایا کرتی ہے۔

•

دوستی کو فیصلہ دکھا دینے کے بعد ہی سچی محبت کا چراغ جلتا ہے!

•

اگر آپ کسی ایتھلیٹ کے خواہش مند ہیں تو سب سے پہلے اپنی ہی آستینوں کو اُلٹ دیجئے۔

•

زندگی ایک پیالہ نہیں ہے انڈیلنے کے لئے، بلکہ ایک پیمانہ ہے، بھرنے کے لئے!

•

بُرے یا بہتر اطوار بے معنی الفاظ ہیں۔ اچھی زندگی کا تقاضا یہ ہوگا کہ آپ تمام انسانوں کے ساتھ ایک ہی جیسے اطوار سے پیش آئیں۔

•

ہوا کے وہی جھونکے ہوتے ہیں جو ایک طرف اگر جلتی ہوئی شمعوں کو بجھا دیتے ہیں تو دوسری طرف خاکستر کی چنگاریوں کو روشن بھی کر دیتے ہیں بعد جدائی کا جھکڑ چلنے کے بعد ایک معمولی محبت تو بجھ کر رہ جاتی ہے لیکن ایک عظیم اور سچی محبت کے شعلے کو جدائی کے جھکڑ اپنا نیکھا جھیل کر زیادہ تیز اور زیادہ تاب ناک کر دیتے ہیں!

•

بہت سے لوگ موقع شناسی سے اس لئے محروم رہ جاتے ہیں کہ حضرتِ "موقعہ" عموماً محنت کا بھیس بدل کر پھرا کرتے ہیں۔

•

دنیا کے لئے تین قسم کے جھوٹ پائے جاتے ہیں۔ جھوٹ[1]، سفید جھوٹ[2] اور سرکاری ماہرین کے اعداد و شمار[3]!

•

ایک ذہنی پریشانی، خوف کے زہریلے پانی کی ایک پتلی دھار کی مانند ہے جو انسان کے دل میں اول اول بڑے مدھم انداز کے ساتھ ہو جاتی ہے لیکن اگر اُس کا بروقت سدِباب نہ کر دیا جائے تو یہ ظالم قلب کی پہنائیوں میں شگاف پیدا کر کے ایک پوری ندی کی شکل اختیار کر لیتی ہے جس میں آخر کار انسان کے سارے احساسات و خیالات غرق ہو کر رہ جاتے ہیں!

•

اچھا کاروبار وہی ہے جو گاہکوں کی بجائے دوست پیدا کرے

•

طیش گویا ایک پھٹتا ہوا حسد ہے۔

•

ڈینگیں مار کر کوئی شخص خوشی سے تو ہم کنار نہیں ہو جاتا۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ کوئی شخص بڑی مچھلی پکڑ کر گھر آتے ہوئے تنگ و تاریک راستوں سے گزرنا پسند نہیں کرتا۔

•

یہ دنیا رضاکاروں سے بھری پڑی ہے، کچھ اشخاص رضاکارانہ طور پر کام کرتے ہیں، اور کچھ اشخاص نے انہیں کام کرنے کی رضاکارانہ طور پر اجازت دے رکھی ہے!

•

ایک نصیحت: نصیحت کرنے کے انداز میں کبھی نصیحت نہ کیجئے!

•

محض عمر بڑھنے سے ہم اچھے بنتے ہیں نہ برے، — بلکہ دن بدن اپنے ہی جیسے بنتے چلے جاتے ہیں۔

•

دنیا میں دو ہی قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں، ایک راست رو اور دوسرے گم راہ۔ لیکن یاد رہے کہ اس امر کی تخصیص صرف راست رو لوگ ہی کیا کرتے ہیں!

•

کوئی شخص کسی دوسرے کی رائے سے کبھی متفق نہیں ہوتا، غور سے دیکھئے تو وہ محض اپنی رائے سے اتفاق کرتا نظر آئے گا۔

•

دیہاتی اور شہری زندگی میں یہ فرق ہے کہ دیہات میں انسان رات کو سوتے وقت کوفت کے ساتھ سوتا ہے لیکن جب صبح جاگتا ہے تو ہنگام سحر کا تروتازہ کیف اس کے باسی وجود پر سرخوشی و سرور کے سمندر انڈیل دیتا ہے — اس کے برعکس شہر میں انسان سوتے وقت نو شبانہ کیف و نشاط کے ایک جان فزا احساس سے معمور ہوتا ہے لیکن جب صبح جاگتا ہے، تو طبیعت پر ایک عجیب کوفت اور اضمحلال کے سائے موجود پاتا ہے۔

•

کیا موت کے بعد ایک غیر فانی زندگی ہونے کے لئے یہی ایک دلیل کافی نہیں کہ انسان جیسی عظیم و جلیل مخلوق کے وجود کا یہ ایک منطقی تقاضا ہے!

•

اگر آپ کسی شے کے لئے نہیں اٹھتے تو عین ممکن ہے کہ آپ کو کوئی اور شے چت کر دے!

•

دوسروں کو حسب خواہش متاثر کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے آپ خود بھی ان سے اثر قبول کریں۔

•

وہ پرانے راستے جہاں سے آمنے سامنے آنے والی دو گاڑیاں بھی ایک دوسرے سے ٹکرائے بغیر نہیں گزر سکتی تھیں اب ترقی کے ہاتھوں اتنی بڑی شاہراہوں میں تبدیل کر دیئے گئے ہیں جن میں سات آٹھ گاڑیاں بیک وقت ایک دوسرے سے ٹکرا سکتی ہیں!

•

انتڑیوں کے اندر زخم کسی ایسی چیز سے پیدا نہیں ہوتے جسے ہم کھاتے ہیں، بلکہ اس چیز سے پیدا ہوتا ہے جو ہمیں کھا رہی ہوتی ہے!

•

بڑا آدمی وہ ہے جو سب سے چھوٹے آدمی یعنی بچے کے دل پر کبھی غبار نہ آنے دے۔

•

موادِ مطالعہ

موت الاسلام (   ) ●

ایک انگریزی میگزین کا پہلا شمارہ ہمارے سامنے ہے۔ بڑے سائز کے چالیس سے زیادہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ لکھنے والوں میں اونچے درجے کے اصحابِ علم و تحقیق شامل ہیں۔

اس میگزین کا نصب العین لادین تہذیب سے تنگ آئی انسانیت کو اسلام کے اصول و نظریات سے روشناس کرانا اور مختلف تمدنی مسائل کے بارے میں علمی بحثیں پیش کرنا ہے اور پہلا شمارہ اپنے مقصد پر ایک کامیاب شمارہ ہے۔ "مذہب اور جمہوریت" "سید احمد شہید اور اصلاحِ تصوف" "اسلام میں ریاست کا تصور" "کیا بنک بغیر سود کے چل سکتا ہے" "اسلام کے انقلابی عمل کا ایک جائزہ" اور دوسرے متعدد مقالات اس قابل ہیں کہ انکو وسیع پیمانے پر پڑھا جائے۔

یہ سمجھ میں نہ آیا کہ اسلام کو، خصوصاً اس کے اجتماعی تصورات کو پیش کرنے والا کوئی جریدہ غیر سیاسی کیونکر ہو سکتا ہے اور وہ علم کو عمل سے کاٹ کیسے سکتا ہے! اور یہ بات بھی قابلِ فہم نہ تھی کہ اس جریدے کے لئے وزیر اعظم اور ایک صوبائی گورنر کے پیغامات حاصل کرنے میں تکلف کیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ جب ایک طاقت اسلام کے خلاف عملاً لڑ رہی ہے تو پھر اس سے اسلام کی ترجمانی کا کام شروع کرنے کے لئے برکت حاصل کرنا کیا معنی! ٹھوس کام کرنے والوں کو ان رسمیات سے بالاتر رہنا چاہئے!

جمعیت الفلاح کراچی کا یہ ترجمان جناب تمیز الدین خان صدر دستوریہ، علامہ سید سلیمان ندوی، مولینا فضل اللہ خاں، مولانا ظفر احمد انصاری، ڈاکٹر افضل حسین قادری، ڈاکٹر محمد عزیز احمد، محمد فضل الرحمٰن انصاری جیسے حضرات پر مشتمل ادارتی بورڈ کی نگرانی میں شائع ہوتا ہے۔ چندہ سالانہ دس روپے، فی اشاعت ایک روپیہ۔ مقام اشاعت۔ اے، ایم ۲ فریر روڈ۔ کراچی۔

ہفت روزہ مقاصد ●

جناب حسن ریاض صاحب کی ادارت میں اس جریدے کے ظہور نے پاکستان میں اسلامی نظامِ زندگی چاہنے والی عوامی اکثریت کے محاذ میں قوت کا اضافہ کر دیا ہے۔ اداریے خوشامدیت سے پاک اور حق کی ترجمانی کے مظہر ہوتے ہیں، معلومات آفریں مضامین سے کوئی شمارہ خالی نہیں ہوتا! —— کسی خاص پارٹی سے وابستگی نہیں ہے!

چندہ سالانہ آٹھ روپے - فی پرچہ تین آنے - پی، ایم، اے بلڈنگ، نکل روڈ، کراچی سے شائع ہوتا ہے!

پندرہ روزہ یقین ●

دار التصنیف لمیٹڈ کراچی کا انگریزی زبان میں یہ ترجمان فکری لحاظ سے تہذیبِ الحاد کے خلاف اسلامی فلسفہ و نظریاتِ زندگی کا ایک کامیاب محاذ ہے۔ جدید لٹریچر میں مغرب کی روح جس اضطراب کا اظہار کر رہی ہے اسکو یقین کے اوراق بڑی خوبی کے ساتھ پاکستان میں پیش کر رہے ہیں۔ اس کی روح ٹھیٹھ دینی ہے، بس ایں حرکت کی ایک ذرا سی کسر ہے! چندہ سالانہ ۸ روپے۔ فی پرچہ ۴ آنے - ۵۶ مادرن فریر روڈ کراچی سے شائع ہوتا ہے۔

اسلامی دستور کی بُنیادیں ●

نیا دستور بننے کا مسئلہ پاکستان کے بننے سے خود بخود پیدا ہوا۔ اس مسئلے نے یہ سوال بھی از خود پیدا کر دیا کہ دستور کیسا ہو؟ اور پھر اس سوال نے مُلک کو دو محاذوں میں بانٹ دیا: ایک اکثریت کا محاذ جو اسلامی دستور کے مطالبے کا علمبردار ہے، دوسرا برسرِ اقتدار مغرب زدہ اقلیت کا محاذ جو اس مطالبے کے خلاف آخری بازی لڑنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ اس اقلیت کے محاذ کی طرف سے اسلامی دستور کے بارے میں جو اشکالات، شبہات اور انتشار انگیز سوالات ابھارے گئے ہیں ان میں سے آخری یہ تھا کہ قرآن میں سرے سے کوئی دستوری بُنیاد موجود ہی نہیں ہے۔ لہٰذا ہم جو دستور چاہیں اختیار کر سکتے ہیں۔

یہ رسالہ جو ہمارے سامنے ہے، یہ اِسی چیز کا علمی اور سائنٹفک جواب ہے۔ اس میں قرآن و حدیث سے اسلامی دستور کی قطعی اساسات نکھار کر سامنے رکھ دی گئی ہیں۔ یہ کارنامہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے مؤثر قلم کا ہے جو آج اسلامی دستوریات پر ایک اتھارٹی ہے۔ یہ رسالہ اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں مل سکتا ہے۔

قیمت اُردو، برائے اشاعت عام ۲/ر طباعتی معیار اعلیٰ شائع کردہ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی۔ لاہور

عورتوں کا ڈاکٹر ●

یہ مختلف ڈاکٹروں اور خصوصاً اطباء کے ایسے فنی مقالات کا مجموعہ ہے جن میں عورتوں کے امراض اور ان کے علاج بیان کئے گئے ہیں۔ یہ مجموعہ نہایت ہی قابلِ قدر ہے اور اس سے معالجین بھی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں، مریض بھی گھروں میں اسکا موجود ہونا نفع بخش ہے

مرتبہ حکیم سید احمد عثمانی صاحب۔ شائع کردہ مکتبہ صحت، پارنس اسٹریٹ کراچی۔ قیمت ۴ روپے (جو ضخامت کے لحاظ سے زیادہ ہے)

ہفت روزہ تا بڑ آزادی نمبر ●

آزادی کے موضوع پر مقالات، نظموں اور افسانوں کا مجموعہ —— ایڈیٹروں اور ان کی بیگمات اور سرکاری تقریبات کی تصاویر سے حسب آداب مروجہ مزین۔ مقصد نامعلوم!

قیمت خاص نمبر عہ روپیہ۔ چندہ سالانہ دس روپیہ۔ فی پرچہ ۴ر۔ مکتبہ تاجر پوسٹ بکس نمبر ۱۱۸۹۔ کراچی۔

القمر ●

"لائن پبلیکیشنز" لاہور کی طرف سے یہ ماہنامہ بڑی اعلیٰ گٹ اپ کے ساتھ پہلا شمارہ سامنے لایا ہے۔ اس شمارے کے اداریات اور مضامین اسلامی فکر کے ترجمان ہیں۔ توقع ہوتی ہے کہ اسلام سے وابستگی رکھنے والے عناصر کی قوت میں یہ ایک قابل قدر اضافے کا موجب ہوگا

چندہ سالانہ ۴ روپے۔ فی پرچہ ۶ر۔ مقام اشاعت۔ لائن پریس۔ ہسپتال روڈ۔ لاہور۔

احمدیت اور اسلام ●

عقیدہ "ختم نبوت" کو مرزائیوں نے ایک مسئلہ بحث بنا دیا ہے، اور آج کل یہ مسئلہ خاص طور پر نمایاں ہو رہا ہے کیونکہ پاکستان کے عوام اِن کی حیثیت کو دستوری حیثیت سے اب آخری طور پر طے کرانے کے درپے ہیں۔ اس موقع پر ادارۂ طلوعِ اسلام نے یہ پمفلٹ عقیدۂ ختم نبوت کے اثبات میں شائع کیا ہے۔ اس میں ایک مضمون علامہ اقبال مرحوم کا ہے اور دوسرا غلام محمد پرویز صاحب کا!

علامہ اقبال کا مقالہ اور مرحوم کے اپنے بعض خطوط فلسفیانہ، سیاسی اور مذہبی تینوں حیثیتوں سے اس مسئلہ کو خوب واضح کرنے والے ہیں اور بظاہر کوئی ضرورت کسی اور شارحِ اقبال کی محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن دوسرا مقالہ شامل کر کے ادارۂ طلوعِ اسلام نے جس اصل مقصد کے لئے اسے شائع کیا ہے وہ عقیدۂ ختم نبوت کے ساتھ ساتھ احادیث پر حملہ کرنا بھی ہے۔ مثلاً ہیئتی لفظ میں فرمایا جاتا ہے کہ،

"آنے والے" کے عقیدے کی ذمہ دار خود ہماری کتب روایات ہیں، اور جو لوگ
ان روایات کو دین تسلیم کریں وہ اس سیلاب کو کس طرح روک سکتے ہیں!

اسپر ——

محترم پرویز صاحب کے تفصیلی مقالہ کے مطالعہ کے بعد یہ حقیقت بھی آپکے
سامنے آجائیگی کہ ہمارے مولوی صاحبان جس مسئلے کو پچاس برس تک روایات کی
مدد سے حل نہ کر سکے وہ خالص قرآن کی روشنی میں کس طرح چند منٹوں میں حل ہو
جاتا ہے —— یہ ہے قرآن کا اعجاز!!

لیکن علامہ اقبال کو انکار حدیث سے متہم کرنے کی جسارت بڑی بے جا ہو گی۔ ان کا مقالہ گواہ ہے کہ وہ اس قماش کے آدمی نہ تھے۔ مثلاً پر وہ ایک روایت سے اختلاف کرتے ہوئے اس کی کمزوری کو یوں بیان کرتے ہیں کہ بخاری و مسلم میں اس کا نشان نہیں ملتا۔ اور پھر ان کا یہ فقرہ کہ "تمام محدثین نے اس اصول کی پیروی کی ہے" ظاہر کرتا ہے کہ وہ محدثین کو سازشی نہیں سمجھتے تھے، قابل استناد سمجھتے تھے۔ پھر وہ "مجد دین" کی آمد کے نظریئے کے قائل ہیں، صرف ان کو تعیین مدت کے مسئلے سے اختلاف ہے ——
اور یہ اختلاف اور لوگوں کو بھی ہے جنہوں نے "مأۃ" (صدی) سے دَور یا ایک خاص زمانہ مراد لیا ہے!

قیمت دس آنے۔

● پاک بنگلہ پرائمر
● بنگلہ بول چال حصہ اول

آج بنگالی زبان سے مغربی پاکستان کے لوگوں کا واقف ہونا ضروری ہو گیا ہے اس مقصد کے لئے عربی رسم الخط میں یہ پرائمر اور بول چال کا سلسلہ حکیم محمد عبد العزیز اور مولوی نور الدین احمد صاحب نے مرتب کر دیا ہے۔ ہم نے ان کا جائزہ لیکر یہ رائے قائم کی ہے کہ معمولی ضرورت کے لئے بنگالی آسانی سے سیکھی جا سکتی ہے۔ قیمت پرائمر ۲ر۔ قیمت بنگلہ بول چال حصہ اول ۸ر ملنے کا پتہ دارالسنت، باریسال، مشرقی پاکستان۔

● کالا آدمی

یہ واشنگٹن کی امریکی کہانی ہے جسے ترقی کرنے کا ولولہ پیدا کرنے کے لئے خاص طور پر بچوں کے مطالعہ کے لئے لکھا گیا ہے۔ از قلم احتفاظ شاہد۔ شائع کردہ مکتبہ بورنس کراچی۔ قیمت ۴ر

● دودھ کا دودھ پانی کا پانی

کہانی کے پیرائے میں اسلامی تاریخ کے دَورِ سعادت کی چند جھلکیاں بچوں کے لئے پیش کی گئی ہیں۔ از قلم اختصار شاہد۔ شائع کردہ مکتبہ بورنس کراچی۔ قیمت ۶ر

● ماہنامہ تحفہ

ایک ادبی جریدہ —— نہ پورا ترقی پسند، نہ پورا جمود پسند! مقصد غیر واضح!

چندہ سالانہ ساڑھے سات روپے۔ فی پرچہ دس آنے۔ مدیران ریاض احمد، حمید احمد۔ مقام اشاعت ۸۱۔ دی مال۔ لاہور۔

● ہمارے داخلی و خارجی مسائل

یہ وہ معرکہ آرا علمی اور سیاسی تقریر ہے جو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے جماعت اسلامی پاکستان کے سالانہ اجتماع ۱۹۵۱ء میں بمقام کراچی

حادثۂ کراچی

ادارہ

کراچی فائرنگ کا سہ روزہ حادثہ جس پیمانہ کبیر کا حادثہ ہے وہ پاکستان کی پوری تاریخ میں اپنی مثال نہیں رکھتا۔ منٹگمری، چارسدہ، واہ کیمپ، ڈھاکہ اور ملتان کی فائرنگ کے واقعات کو اس نے بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ آخری اخباری اطلاعات (اور وہ بھی سنسر شدہ) کے مطابق ۲۷ جانوں کا لا اینڈ آرڈر کی بھینٹ چڑھنا، ۲۴۴ کا زخمی ہونا (جن میں سے مورخہ ۱۲ جنوری کو ایک زخمی اور جان بحق ہو گیا) اور ایک ہزار سے اوپر افراد کی گرفتاری، اور پھر اس کے ساتھ ساتھ اشتعال پذیر عوام کے گروہوں کا ایک کار کو جلا ڈالنا، دکانیں لوٹنا، اسلحہ کی دکانوں سے آتشیں ہتھیار اُڑا لینا، شہر کے مختلف حصوں میں قانون شکنی کرنا، ملکہ سامنے سامنے ہو کر پولیس سے متصادم ہونا۔ اور حالات کے بے قابو ہو جانے پر پولیس کا فوجی امداد طلب کرنے پر مجبور ہو جانا ایک ایسی صورتِ حالات کو سامنے لاتا ہے کہ جسے گہری نظر سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ حکومت اور پبلک دونوں کے لئے اس صورتِ حالات میں بڑے اہم قابلِ غور پہلو موجود ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہ پہلو بے کم و کاست نمایاں کر کے پیش کر دیں۔

• • •

طلباء ملک کے موجودہ تعلیمی حالات سے سخت غیر مطمئن ہیں، اور آج سے نہیں، پاکستان بننے کے پہلے روز سے لے کر اب تک مسلسل غیر مطمئن چلے آ رہے ہیں۔ ایک طرف انتظامات حد درجہ ناقص اور دوسری طرف مصارفِ تعلیم ناقابلِ برداشت، وہ بھی ایسے عالم میں کہ بے اندگای اور کساد بازاری کی بلائیں ہر طرف منڈلا رہی ہیں۔ تعلیم، خصوصاً وسطانی اور فوقانی تعلیم ہمارے ملک میں ایک تجارتی جنس ہے جس کا بھاؤ نا تناہ چڑھا ہوا ہے کہ اس کے لئے قوتِ خرید صرف ایک محدود طبقے میں پائی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں طلباء کے ایک مشہور جریدہ "اسٹوڈنٹس وائس" کراچی حالات کا بڑا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ اس جریدے نے ایک خاص تحقیقی سوال نامے کے جواب میں، کراچی، حیدرآباد، سکھر، لاہور، راولپنڈی نوشہرہ، پشاور اور ڈھاکہ کے کالجوں کے طلباء کے بارے میں بڑے اہم معلوماتی اعداد و شمار جمع کر کے خواجہ ناظم الدین صاحب کے نام ایک کھلے خط میں شائع کئے ہیں۔ ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:-

— ٹیوشن فیس (Tution fee) کا بار پاکستان کے طلباء پر اس تناسب سے پڑ رہا ہے کہ ان میں سے ۱۵ فیصد ۲۰۰ روپے تک، ۸۲ فیصد ۲۰۰ روپے سے ۴۰۰ روپے تک سالانہ ادا کرتے ہیں صرف ۳ فیصد طلباء وظائف پانے والے ہیں۔

— عام فیسوں، کتابوں اور خالص تعلیمی ضروریات کے مصارف کا بار ۲۵ فیصد طلباء پر ۲۵۰ روپے (یا اس سے کم)، ۵۹ فیصد پر ۲۵۰ سے زائد مگر ۵۰۰ سے کم اور ۱۶ فیصد پر ۵۰۰ روپے یا اس سے زائد

لہ واقعات درحقیقت اخبارات کی سنسر شدہ اطلاعات کے مقابلہ میں کئی گنا زیادہ تشویش ناک اور ہوش ربا انداز میں ظہور پذیر ہوئے ہیں لیکن یہاں ہم مجبوراً اخباری اطلاعات ہی کو پیش نظر رکھ کر اظہار خیال کر رہے ہیں۔ (ن ص)

سالانہ کے حساب سے پڑتا ہے۔

— ۳۰ فیصد طلباء اپنے تعلیمی مصارف کو پورا کرنے کے لئے تعلیم کے ساتھ ساتھ کسی طرح معاوضہ وارانہ محنت کرتے ہیں۔ اس محنت پر ان کے ۴ تا ۸ گھنٹے یومیہ صرف ہوتے ہیں اور ان میں سے ۱۰ فیصد طلباء ایسے ہیں جن پر اپنے گھر کے اخراجات پورے کرنے کی ذمہ داری بھی عاید ہے۔

— موجودہ تعلیمی حالات سے مطمئن طلباء کا تناسب ۵ فیصد، نیم مطمئن کا ۳ فیصد اور قطعی طور پر غیر مطمئن طلباء کا تناسب ۹۲ فیصد ہے۔

ان اعداد و شمار کو سامنے رکھ کر سوچئے کہ یہاں طلباء کی بہت ہی بڑی اکثریت تعلیمی مشکلات کی وجہ سے مسلسل غیر مطمئن چلی آ رہی ہو اور کوئی ان کو مطمئن کرنے کے لئے کچھ نہ کرے تو وہاں کراچی فائرنگ جیسے حادثے تک نوبت پہنچ جانا کچھ بھی بعید از قیاس ہو سکتا ہے؟

• • •

ایک فرض شناس حکومت اپنی ریاست کے شہریوں کو تعلیم دینے کی خود ذمہ دار ہے اور شہریوں کا اس پر یہ حق آتا ہے کہ وہ ان کو تعلیمی ترقی کے لئے زیادہ سے زیادہ سہولتیں بہم پہنچائے اور ان کے راستے سے مشکلات کو دور کرے۔

ہم پوچھتے ہیں کہ کیوں نہ ایسا ہوا کہ ان ساڑھے پانچ سال کے عرصے میں حکومت خود اس اضطراب کو محسوس کرتی جو طلباء میں پیدا ہو رہا تھا؟ کیوں نہ ایسا ہوا کہ ہمارے اکابر خود یہ جائزہ لیتے کہ طلباء کی راہ میں کون سی مشکلات حائل ہیں؟ کیوں نہ ایسا ہوا کہ ہمارے کارپردازانِ تعلیم خود مطمئن اور غیر مطمئن طلباء کا تناسب معلوم کرتے؟ کیوں نہ ایسا ہوا کہ وقتاً فوقتاً طلباء سے تعلیمی انتظامات کے بارے میں مشورے لئے جاتے اور ان کے مطالبات کو خود معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی! اس مقصد کے لئے سب کی سب اعتماد انجمنیں اور تنظیمیں موجود تھیں۔

اگر طلباء یہ محسوس کرتے، اور کسی کا عمل ان کو یہ محسوس کراتا کہ یہاں ان کی مشکلات کی فکر کرنے والے، ان کے دکھوں کا احساس کرنے والے، ان کی گتھیوں کو سلجھانے والے موجود ہیں اور وہ اپنی طرف سے حالات کو بہتر بنانے میں کوئی کوتاہی نہیں کر رہے تو یقیناً طلباء پوری طرح بے فکر ہو کر تعلیمی سرگرمیوں میں مصروف رہتے اور اپنے وقت کا ایک لمحہ بھی کسی دوسری طرف صرف نہ کرتے۔ لیکن ان کے مسائل کو کسی نے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا، ان کی مشکلات کا پانچ سال سے کسی نے ازخود احساس نہیں کیا، نتیجہ یہ کہ ان کی بے چینیاں ایک مطالبہ کی صورت اختیار کر گئیں اور مطالبے کا خیر مقدم ایسے بھونڈے طریق سے کیا گیا کہ جو اس نتیجے کے علاوہ کسی نتیجے پر پہنچ ہی نہیں سکتا تھا جو کراچی میں برآمد ہوا ہے۔

• •

آپ نے طلباء کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرنے اور ان کی مشکلات کو رفع کرنے کے لئے سوائے کاغذی اسکیموں اور "نشستند و گفتند و برخاستند" قسم کی کانفرنسوں اور کمیٹیوں کے کچھ نہیں کیا تو طلباء اگر مطالبہ کرنے نہ اٹھتے تو اور کیا کرتے؟ ایک اضطراب انگیز صورتِ حالات سے انھیں نجات دلانے کے لئے آپ ہی بتائیے کہ مطالبہ کے سوا اور کونسی معقول تدبیر اختیار کی جا سکتی تھی؟

حکومت جب اپنی ہو تو اول تو وہ اپنے فرائض کو خود محسوس کیا کرتی ہے اور مطالبات کا انتظار نہیں کیا کرتی۔ لیکن جب کوئی مطالبہ اس کے سامنے لایا جائے تو پھر وہ تغافل اور بے نیازی کا رویہ اختیار نہیں کرتی بلکہ وہ مطالبے کا خیر مقدم کرتی ہے وہ خندہ پیشانی سے ہر اس سوال پر غور کرتی ہے جو اپنے حل کے لئے اس کے سامنے رکھا جائے ... اپنے شہریوں کی شکر گزار ہوتی ہے کہ انھوں نے ایک ایسے پہلو کی طرف توجہ دلائی جو اس کی نگاہوں سے عارضی طور پر دور ہو گیا تھا، اور ہر وقت ان کی مدد کرتی ہے ... خود دعوت دیتی ہے کہ وہ اپنی بات سمجھانے اور حکومت کی مشکلات کو

حادثۂ کراچی

سمجھے۔ وہ بر التفاوان اس کے سامنے پیش کرتی ہے اور جواب میں اُس کا تعاون خود حاصل کرتی ہے۔ مطالبہ اگر معقول اور مبنی بر انصاف اور مصالح قومی کے مطابق ہو، تو اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنے میں اپنے وقار کا نقصان نہیں محسوس کرتی اور اگر مطالبے کا کوئی جزو معقولیت سے ہٹا ہوا، انتہا پسندانہ یا مصالح کے خلاف ہوتا ہے تو وہ ایک ٹھنڈی فضا میں یگانگت کے جذبات کے مظاہرے کے ساتھ دلائل کے بل پر بازی جیت لے جاتی ہے۔

ہماری حکومت جب ملک کی اپنی حکومت تھی تو اس کا کام یہ تھا کہ وہ طلبا کا مطالبہ سامنے آتے ہی اُس پر از خود متوجہ ہو جاتی، وہ طلبا کی طرف سے درخواست کئے جانے سے پہلے ہی اُن کے ترجمانوں کو اور کارپردازانِ تعلیم کو جمع کرتی اور مشاورت کی ایک تعاون افزا فضا میں بیٹھ کر طلبا کی بات سمجھنے اور اپنی بات سمجھانے کے بعد ہر قابلِ قبول چیز کو خوشی خوشی قبول کر لیتی اور اگر کوئی چیز ناقابلِ قبول ہوتی یا فی الحال جس کے عمل میں لانے میں کچھ دقتیں محسوس ہوتیں اس کے بارے میں وہ ان کو دلائل سے مطمئن کر دیتی۔ لیکن افسوس کہ یہ سیدھا طریقہ اختیار نہیں کیا گیا، بلکہ وہ الٹا طریقہ اختیار کیا گیا جو کسی پرائی حکومت کو زیب دیتا ہے۔

یہ صورت کچھ ایک طلبا ہی کے مطالبے کے مقابلے میں مخصوص طور پر اختیار نہیں کی گئی، بلکہ ہم صاف صاف کہتے ہیں کہ قوم کے ایک ایک مطالبے کا استقبال ٹھیک اسی پالیسی کے ساتھ کیا گیا ہے جو یہاں انگریزی حکومت کی پالیسی رہ چکی ہے۔ یعنی از خود عوام کے مسائل کو کبھی نہ سوچنا اور ان کی تکالیف کے ازالے کی فکر نہ کرنا، کوئی مطالبہ اُٹھے تو اسے پوری شانِ تغافل کے ساتھ نظر انداز کرنا، پھر جب عوام اسے مظاہرات کے ذریعہ پیش کرنے پر مجبور ہو جائیں تو ان پر تشدد کرنا، اور جب تشدد کے نتیجے میں اشتعال برپا ہو جائے تو قانونی انتظامی اختیارات اور مخالفانہ پروپیگنڈے کی مشینری کو حرکت میں لے آنا، لیکن اس پر بھی اگر طوفان نہ تھمے تو عوام کو اشک آور گیس، پولیس کی لاٹھیوں اور فوج کی گولیوں کا شکار بنا چکنے کے بعد مطالبے کو تسلیم کر لینا۔ یہی تکنیک حکومت نے قادیانی مسئلے کے بارے میں اختیار کی تھی، یہی اس نے مطالبۂ دستورِ اسلامی کے بارے میں اختیار کر رکھی ہے اور اسی کا ایک جامع مظاہرہ اس نے طلبا کے مطالبے کے مقابلے میں کیا ہے۔

اس غلط تکنیک کا نتیجہ یہ ہے کہ مطالبہ تو آپ کو ماننا ہی پڑا، لیکن ایسے طریقے سے کہ عوام کا اعتماد ایک رمق بھر بھی آپ حاصل نہ کر سکے، بلکہ اُلٹا اندیشہ ہے کہ اس میں مزید کمی آگئی ہوگی۔ برخلاف اس کے اگر آپ اپنی حکومت کے شایانِ شان رویہ اختیار کرتے تو آپ اس مطالبے کو منظور کر کے طلبا اور عوام دونوں کی نگاہوں میں موجودہ صورت سے زیادہ باوقار ہوتے۔ اب تو صورت ویسی ہی ہے جیسے فرانس میں لوئی شانزدہم کے طرزِ عمل سے پیدا ہو گئی تھی۔ اس سے عوام جب "د" کا مطالبہ کرتے تھے تو وہ لیت و لعل کرتے کرتے بڑی دیر سے دیا کرتا تھا، پھر جب وہ اور زیادہ زور کے ساتھ "و" کے ساتھ "ب" کا مطالبہ بھی لے کے اُٹھ کھڑے ہوتے تھے تو وہ "د" کو مان لیتا تھا اور "ب" کو ... کے لئے تشدد سے کام لیتا تھا۔ سنتے ہیں عوام "ج" کے لئے میدان میں آ جاتے تھے۔ اب وہ "ب" کے آگے سر تسلیم خم کر کے "ج" کو کچلنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ چنانچہ اس تکنیک کے ساتھ اس نے "الف" سے "ی" تک عوام کے تمام عوامی مطالبات منظور کر ڈالے۔ مگر عوام کو ہر قدم پر وہ برافروختہ کرتا گیا، یہاں تک کہ اسے موت کے گھاٹ اترنا پڑا۔

؂ افواہاً یہ بھی سنا گیا ہے کہ ہمارے مرکزی سیکرٹریٹ میں پالیسی بنانے والی طاقت کے اندر ایسا پولیس ذہنیت کا عنصر موجود ہے جس نے موجودہ ... کو مضبوط بنانے کے لئے عوام پر تشدد کرنے کا مستقل فارمولا اپنا لیا ہے اور کراچی میں اسی فارمولے کا تجربہ کیا گیا ہے۔ ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ یہ افواہ غلط نکلے ورنہ یہ فارمولا تو تدبر کے دیوالیہ پن کی آخری حد ہو سکتا ہے۔

حادثۂ کراچی

یہ طریقہ ہمارے ہاں انگریزی راج کی ایک منحوس یادگار ہے کہ آپ کسی مطالبے کے زور کا اندازہ اس پیمانے سے کریں کہ اس کے لئے کتنا بڑا طوفان اٹھایا جاتا ہے اور کتنا ہنگامہ مچتا ہے اور لوگ پولیس کی لاٹھیوں اور فوج کی گولیوں کا مقابلہ کہاں تک کرتے ہیں! آپ کو مطالبے کی اصل قوت کا اندازہ رائے عام کے پیمانے سے کرنا چاہیئے اور غور سے یہ دیکھ لینا چاہیے کہ فی الواقع اس کی بنیاد کسی ایسی بے چینی، کسی ایسی پریشانی اور کسی ایسے جذبے پر تو نہیں کہ جو اکثریت میں فروغ پائے ہوئے ہے۔ طلبا کا مطالبہ ہو یا اسلامی دستور کا مطالبہ، یا قادیانی امت کو اقلیت قرار دینے کا مطالبہ، یا کوئی اور مطالبہ، اپنی حکومت کا کام یہ ہے کہ وہ اس کے حقیقی محرکات واساسات کا جائزہ لے کر بروقت یہ اندازہ کر لے کہ اس کی قوت اتنی ہے پھر اگر وہ مطالبہ اپنی حقیقی بنیاد اور واقعی محرکات رکھتا ہو تو لوگوں کے سینے چھلنی کر کے اس کو دبانے کی کوشش کرنے کے بجائے معقول طریقے سے اسے سمجھنا اور اس کے واجب القبول حصے سے قبول کر لینا چاہیے۔

کوئی وجہ نہیں کہ آج آپ اپنے ملک کے نمائندہ حکمران ہونے کا زعم رکھتے ہوئے۔ قوم کے حالات کو محض اپنے چند افسروں کی آنکھوں سے دیکھیں اس کی آواز کو آپ سی آئی ڈی کے کارکنوں کے کانوں سے سنیں اور اس کے جذبات کا اندازہ لاٹھیوں اور گولیوں کے پیمانوں سے ماپیں۔ آپ کو ملک کی فضا کو براہ راست سمجھنا چاہیئے اور براہ راست اپنا ہاتھ رائے عام کی نبضوں پر دھر کر اس کے اتار چڑھاؤ کو معلوم کرنا چاہیئے۔

طلبار کا مطالبہ اپنے پیچھے حقیقی محرکات اور ٹھوس وجوہ رکھتا تھا۔ افسوس کہ آپ نے بروقت ان کو محسوس نہ کیا!

• • •

اندریں حالات اگر طلبا نے اپنا مطالبہ آپ کے سامنے اسی شکل میں رکھنا پسند کیا جس شکل میں آنے والے مطالبے کو آپ در خور اعتنا سمجھ سکتے تھے تو آخر کون سی قیامت آتی بات سے ٹوٹ پڑی کہ وہ اپنے مطالبے کو نمایاں کرنے کے لئے سڑکوں پر مارچ کرتے، یا وہ وزیر تعلیم کی کوٹھی تک جاتے ان کے ساتھ پولیس کو نکلنے۔ ان کے مظاہرات پر پابندی عائد کرنے اور ان کا راستہ روکنے کی کوشش کی ضرورت کیا تھی؟ آپ کو اندازہ کرنا چاہیئے تھا کہ ایک جذباتی فضا میں آپ کی حکمت عملی کا قدم ذرا پھسلا نہیں کہ ایک آتش فشاں پھٹا نہیں ——— اور قدم پھسل گیا اور آتش فشاں پھٹ گیا! یقیناً اگر طلبار کی مزاحمت کرنے کے لئے سخت اقدامات نہ کئے جاتے تو نتائج اتنے خراب کبھی نہ نکلتے۔

آپ کو یہ حقیقت بھی سامنے رکھنی چاہیئے تھی کہ کسی مطالبے کو دبانے یا اس کے مظاہرات کو روکنے میں کوئی ذمہ دار حکومت تشدد کا استعمال اگر کرتی بھی ہے تو پہلے وہ مطالبے کی نوعیت کے بارے میں خوب اچھی طرح سوچ کر یہ اندازہ کر لیتی ہے کہ آیا مطالبہ نامعقول اور شر پسندانہ اور خلاف انصاف ہے بصورت دیگر اس کا اخلاقی موقف پر کھڑے ہو کر سخت گیرانہ اقدام کرنا ایک حکومت کے خود اپنے ہی حق میں مضر ثابت ہوتا ہے۔

جہاں تک طلبار کے مطالبے کی نوعیت کا تعلق ہے بہ حیثیت مجموعی اسے پاکستان کا کوئی بھی فرد نامعقول یا شر پسندانہ قرار نہیں دے سکتا، مثلاً یہ بات کہ طلبا فیسوں کا بار کم کرانا چاہتے تھے اور کراچی کے کالجوں کو اس لحاظ سے لاہور اور ڈھاکہ کی سطح پہ لانا چاہتے تھے۔ یا یہ بات کہ وہ ہوسٹلوں کا مزید مناسب انتظام طلب کر رہے تھے، یا وہ ایک معیاری سائنس لیبارٹری کا قیام چاہتے تھے آخر ان چیزوں میں سے کون سی چیز ایسی ہے جس کے بارے میں آپ رائے عام میں یہ تأثر پیدا کر سکیں کہ مطالبے کا یہ جزو شر پسندانہ تھا۔ اس طرح کے معقول اور منصفانہ مطالبات کے حق میں ہونے والے مظاہرات کو سختی سے روکنے کی کوشش کس طرح عوامی حمایت حاصل کر سکتی ہے؟

• • •

کہا جاتا ہے کہ یہ شرارت کمیونسٹوں کی پیدا کردہ ہے۔ فرض کیا کہ آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر آخر یہ کون تھا جس نے ایک حالت اضطراب کو اس حد تک پہنچنے دیا کہ اس سے اگر کوئی فائدہ اٹھانا چاہے تو اٹھا سکے؟ یہ کون تھا جس نے اشتعال کی وہ فضا پیدا کرنے میں مثبت طور پر حصہ لیا ہے جس میں اصلاح پسند عناصر کے مقابلہ میں سرپھرے عناصر کے لئے کام کرنے کا زیادہ موقعہ ہو سکتا ہے؟ پھر یہ کون تھا جس نے وہی مطالبہ

قانون شکنی کا طوفان اُٹھنے کے بعد تسلیم کرلیا جسے وہ امن پسندانہ طریقوں سے درخورِ اعتنا نہ سمجھتا تھا ؛ امن پسندانہ طریقوں کو رد کرکے قانون شکنی کے مقابلے میں سرِ تسلیم خم کرکے درحقیقت آپ نے کمیونسٹ عنصر (وہ عملاً اس ہنگامے میں شریک ہوا ہو یا نہ) کے ہاتھ پہلے سے زیادہ مضبوط کر دیئے ہیں۔ آپ نے اصلاح پسند طاقت کو اپنے غلط طرزِ عمل کی وجہ سے پیچھے دھکیل دیا ہے اور شورش پسند طاقت کو میدان پر چھا جانے کا زریں موقع خود فراہم کیا ہے۔ کمیونسٹ تحریکوں کا تو اصول ہی یہ ہے کہ "خون بہے گا تو تحریک چلے گی" سو خون آپ نے بہا دیا، اور خوب دل کھول کر بہا دیا۔ دوسرے لفظوں میں کمیونسٹوں کو آپ نے کام کے راستے ہموار کرکے خود پیش کر دیئے۔

——— اب اس بیان بازی سے کیا فائدہ کہ شرارت کمیونسٹوں کی ہے۔

• • •

کراچی کا حادثہ ایک اور حقیقت کو بھی نمایاں کرتا ہے، ہم چاہتے ہیں کہ اسے بھی اچھی طرح محسوس کر لیا جائے؛

یہ تو ظاہر ہے کہ مظاہرات اور قانون شکنی کے ہنگامے میں طلباء سے بڑھ کر دوسرے لوگوں نے حصہ لیا ہے ——— دراں حالیکہ ابھی تک طلباء نے اپنے مطالبے کو اتنے بڑے پیمانے پر عوام کے سامنے نہیں رکھا تھا کہ عوامی تائید کی ایک مستقل رَو ان کے مطالبے کے ساتھ شامل ہو چکی ہوتی۔ پھر آخر وجہ کیا ہے کہ وہ بے شمار ایسے لوگ جو شاید طلباء کے مطالبے کو جانتے بھی نہ ہوں گے، شورش پسندانہ طوفان اُٹھانے کے لئے میدان میں آ گئے۔

یہ ایک بڑا اہم سوال ہے، اور اس کا جواب یہ ہے کہ عوام میں موجودہ حکمران طاقت کے خلاف ایک ہمہ گیر بددلی کارفرما ہے۔ یہ بددلی ایک عرصے سے جمود کی صورت اختیار کئے پڑی رہی ہے، مگر زندگی چونکہ جمود میں دیر تک رہ نہیں سکتی، بلکہ اس کا فطری تقاضا یہ ہے کہ بہاؤ جاری ہے، اس لئے آہستہ آہستہ ہمارے سیاسی سمندر کی حالت اس بظاہر ساکن نظر آنے والے سمندر کی سی ہو گئی ہے جس کی سطح کے نیچے طوفان کی لہریں سانس روکے کسی تحریک کی منتظر ہوں ——— اور ہوا کا ایک جھونکا پورے سمندر کو خوفناک ہنگاموں سے معمور کر دے۔

اس بددلی اور ہمہ گیر بددلی کو پیدا کرنے والا اصل محرک یہ تھا کہ عوام کی توقعات قیادت سے پوری نہیں ہو سکیں۔ اور وہ مطلوبہ تبدیلی جس کا خواب دیکھتے ہوئے پاکستان بنانے کی جدوجہد میں عوام نے سرفروشانہ حصہ لیا ہے ہمارے حکمرانوں کے ہاتھوں رونما نہیں ہو سکی۔ قوم اسلامی نظامِ زندگی کی طرف ہمک رہی ہے لیکن موجودہ حکمران طاقت نے اس کو مدد دینے کے بجائے اس کا راستہ روکا ہے اور اسے بالکل اُلٹے راستوں پر ڈالنے کے لئے بار بار کوششیں کی ہیں۔ پھر قوم کا معاشی مسئلہ ہے کہ جسے حل کرنے کے لئے موجودہ معاشی نظام میں جو بنیادی تغیرات کئے جانے چاہئیں تھے، ان میں سے کوئی ایک بھی نہیں ہوا۔ ان دو اسباب کے علاوہ مہاجرین کی پریشان حالی اور دفتری نظم و نسق کی خستہ حالی اور دوسرے متفرق مسائل ایسے ہیں کہ جو حکومت اور عوام میں مسلسل بُعد پیدا کر رہے ہیں۔

پھر مصیبت یہ کہ اول روز سے یہ غلط طریق کار اختیار کیا گیا کہ عوام کی طرف سے تنقید اور اظہارِ اختلاف کے جانے کے دروازے سیفٹی ایکٹوں اور سکیورٹی ایکٹوں کے ذریعے بند کئے گئے، اس کے علاوہ عوام کے جذبۂ تغیر پسندی کے لئے اظہار کا معقول راستہ جو کسی جمہوری نظام میں ہو سکتا ہے، وہ انتخابات ہوتے ہیں لیکن دھاندلی نے عوام کے جذبات کو اس راستے پر بھی بہنے نہ دیا۔

اس طرح ان کے اوپر ایک گروہ واحد نمائندگی کی جعلی فضا بنا کر حکومت کا اجارہ دار بن کر بیٹھ گیا۔ ہر طرف سے بہاؤ کے راستے بند پا کر جب عوام کے جذبات گھٹ گئے تو وہ ہمہ گیر بددلی اور مایوسی کی شکل اختیار کر گئے۔ یہ بددلی اور مایوسی اپنی سطح کے نیچے ایک ایسی بارود بھرے بیٹھی ہے کہ شر پسند عناصر کے لئے اس سے بڑی نعمت کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ اس بارود کو آپ فتیلہ چاہے کسی بھی کونے سے دکھائیں، یہ ساری کی ساری آگ پکڑ لے گی۔ یہی کراچی میں ہوا ہے۔ مطالبہ طلبہ کا تھا، لیکن شورش پسندانہ حرکات میں پیش پیش دوسرے لوگ تھے اور وہ بھی دو چار کی تعداد میں

نہیں، بلکہ اتنی تعداد میں کہ بیک وقت شہر کے مختلف حصوں میں گڑبڑ ہوتی رہی، کبھی اشتعال نے سر اِدھر سے اٹھایا، کبھی اُدھر سے اُٹھایا۔ یہاں تک کہ معاملہ پولیس کے بس کا نہ رہا۔ بلکہ ملٹری کی امداد طلب کرنا ناگزیر ہو گیا۔ سوال یہ ہے کہ آپ نے رائے عامہ کے آتش فشاں کو اس وقت بالکل بھڑک اُٹھنے سے روک لیا ہی، لیکن کیا آپ نے اس لاوے کی فکر کی جو اس کے پیٹ میں بھرا پڑا ہے، اور اگر وہ لاوا جوں کا توں ہے تو مستقبل کے متعلق کیا ضمانت ہے اس بات کی کہ یہ کبھی یہ نہ نکلے گا!

براہِ کرم اس لاوے اور اس بارود کی فکر کیجئے جو سطح کے نیچے موجود ہے، اور اہتمام کیجئے اس بات کا کہ قوم کے اندر سے آپ کے خلاف بددلی دور ہو، اور اس کی ایک ہی صورت ہے کہ پورے نظامِ زندگی میں آپ وہ تبدیلیاں جلد از جلد برپا کریں جو عوام کو مطلوب ہیں!

• • •

کراچی کے حادثے نے سب سے خطرناک حقیقت جو کھول کے ہمارے سامنے رکھ دی ہے، یہ ہے کہ ہمارے عوام کسی تحریک کے لئے شروع سے آخر تک جذباتی توازن بحال رکھ کے بمشکل ہی کام کر سکتے ہیں، وہ کسی سوچے سمجھے منصوبے پر چلنے کے بجائے یکایک اتنے مشتعل ہو سکتے ہیں کہ ان پر کسی کا کنٹرول باقی نہ رہے۔ نہ تحریک کے لیڈروں کا، نہ قانون کا، نہ دین و اخلاق کا، نہ عقل و شعور کا، نہ شہری احساسِ ذمہ داری کا ——— جو لوگ ایک تحریک کے لئے موقعۂ آزمائش پیدا ہوتے ہی توازن کھو بیٹھیں، ساری اخلاقی حدود سے بالاتر ہو جائیں اور کسی قیادت کی رہنمائی و ہدایت اور کسی جماعتی ڈسپلن سے بالکل آزاد ہو جائیں وہ ملک کے بدخواہوں اور شورش پسندوں کے لئے نہایت سستا شکار ہوتے ہیں۔ ان کو نازک مراحل پر بہکایا جا سکتا ہے ان کو کسی بھی وقت بھڑکا کر تخریبی کارروائیوں کے لئے آلۂ کار بنایا جا سکتا ہے چنانچہ کراچی میں عوام نے اشتعال پذیر ہو کر لوٹ مار اور تباہ کاری کے لئے جو مجرمانہ اقدامات کئے ہیں اُن سے خود ملک ہی کی دولت اور خود قوم ہی کی طاقت کو نقصان پہنچا ہے۔ یہ کوئی معقول رویہ نہیں ہے کہ حکمرانوں کے کسی غلط اقدام پر احتجاج کرنے کے لئے شہریوں کی املاک پر ہاتھ ڈالا جائے۔ یا کسی وزیر کے خلاف پیدا ہونے والے جذبۂ انتقام سے سرشار ہو کر معاشرے کے امن کو غارت کر ڈالا جائے۔ اس طرح کی کارروائیوں کو کبھی انگیز (encourage) نہیں کیا جا سکتا۔

عوام کو اس کمزوری سے بچا نکالنے کی صورت صرف یہ ہے کہ ملک کی تمام سیاسی تنظیمیں عوام کی ذہنی و اخلاقی تربیت کی فکر کریں۔ لوگوں کو محض حکمرانوں کے خلاف بددل کر دینا کوئی کارنامہ نہیں۔ ان کے سامنے تنقیدی تقریریں کر دینا کوئی سیاسی خدمت نہیں۔ ان کو صرف ایجی ٹیشن کرنے پر اکسانے رہنا ان کے لئے موجبِ فلاح نہیں، اس کام کے ساتھ ساتھ اُن کو ٹھوس خیالات سے آراستہ کرنا۔ ان کی ذہنی ساخت کو درست کرنا، ان کو جذبات پر کنٹرول رکھنے کا فن سکھانا، ان کو اخلاقی حدود کے احترام کا درس دینا، ان میں کسی تعمیری منصوبے کے مطابق تحریکیں چلانے کی صلاحیت پیدا کرنا اور ان کو کسی نظم کے اندر کس کر کسی قیادت کے اشاروں کے تحت کام کرنے کا ڈھنگ سکھانا درحقیقت وہ تعمیر پسندانہ سیاست کاری ہے جو کسی آزاد قوم کے شایانِ شان ہو سکتی ہے!

جب تک ہمارے سیاسی لیڈر عوام کو اتنا تربیت یافتہ نہ بنالیں کہ وہ اپنے آپ کو کسی شورش پسند طاقت کے حوالے کرنے پر تیار نہ ہوں، اس وقت تک ان کی سیاسی سرگرمیاں ساری کی ساری ہوائی رہیں گی۔

• • •

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ کراچی میں اتنا بڑا طوفان اُٹھ گیا مگر اس کی باگ ڈور کسی بھی قیادت کے ہاتھ میں نہ تھی طلباء کے لیڈروں نے اس سے بے تعلقی کا اظہار کیا ہے۔ سیاسی جماعتوں میں سے ہر ایک نے اس کی ذمہ داری لینے سے انکار کیا ہے، یہ گویا ایک بے سری فوج تھی جس نے یہاں جو چاہا کر ڈالا۔ یہ کوئی سیاسی ایجی ٹیشن نہ تھا، یہ تو انارکی کا ایک ہنگامہ تھا۔ پس یہ ہنگامہ اس واقعہ پر بھی گواہ ہے کہ موجودہ حکمران

حادثۂ کراچی

طاقت سے شاکی عوام کسی اور طرف سمٹنے کی کے بجائے بالکل خلا میں معلق ہیں یہ سیاسی خلا (vaccum) کہ عوام ایک طرف سے کٹ جائیں اور دوسری طرف جڑ نہ پائے ہوں کسی قوم کی زندگی میں خطرناک ترین مواقع پیدا کر دیتا ہے یہی مواقع ہوتے ہیں جن سے ملک کے اپنے اندر کے شورش پسند عناصر بھی ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور یہی مواقع ہوتے ہیں جن پہ بیرونی طاقتیں بھی تاک لگائے رہتی ہیں۔ آج ہم ایسے ہی ایک خطرناک موقع سے دوچار ہیں۔ اس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کوئی طریقہ اس کے سوا نہیں ہے کہ عوام کو نظم میں کسنے کی کوششیں تیز تر کر دی جائیں ——۔ ورنہ اس سیاسی خلا کا طول پکڑنا انتہائی تشویشناک ہے۔

• • •

اب دو حرف خود عوام کے نام بھی!

حالات کا تجزیہ جو اوپر کیا گیا ہے، ان میں خود تمہارے لئے بھی کچھ باتیں قابل غور ہیں۔ تم کو سوچ سمجھ کر اس امر کا فیصلہ کرنا چاہیے کہ موجودہ حالات سے اگر تم غیر مطمئن ہو تو کیا ان حالات کے ایک ایک جز کے لئے وقتاً فوقتاً الگ الگ ہنگامی جدوجہد کرنا کوئی صحیح طریق کار ہے یا ان حالات کو جڑ پیڑ سے پوری طرح بدل ڈالنے کے لئے ایک منظم کوشش کرنا زیادہ نتیجہ خیز ہے۔ —— ایک ایسی منظم کوشش جو دستور اور قیادت دونوں کو بدل کر معاشرے کی نئی تعمیر کے ذرائع و وسائل کو بروئے کار لے آئے۔ با مختلف مواقع پر جھنجھلاہٹ اور اشتعال کا مظاہرہ کر کے کبھی ایک مطالبہ اور کبھی دوسرا منوا لینے سے زیادہ بہتر طریق کار یقیناً یہی ہے کہ ہمہ گیر تبدیلی کو برپا کیا جائے۔

اگر تم واقعی ایک ہمہ گیر تبدیلی چاہتے ہو کہ جو تمہارے سارے ہی مطالبات کا جواب بن سکے تو پھر تمہارے سامنے ایک سوال یہ آتا ہے کہ کیسی تبدیلی چاہتے ہو؟ تمہاری منزل مقصود ایک خالص اور مکمل اسلامی نظام حیات ہوگا یا کوئی غیر اسلامی نظام حیات؟ اگر خدانخواستہ تمہاری نگاہ انتخاب کسی غیر اسلامی نظام حیات پر جمے تو پھر تم ہر راستے پر چلنے کے لئے اور ہر طاقت کا ساتھ دینے کے لئے اور ہر طریق کار اختیار کرنے کے لئے آزاد ہو۔ لیکن اگر تمہارا مطلوب اسلامی نظام حیات قرار پائے تو اس کو ایک بے سری فوج بن کر اور انارکی کا طوفان اٹھا کر کبھی نہیں پایا جا سکتا۔ اس کے لئے ٹھنڈے جوش کے ساتھ منظم جدوجہد کرنا ناگزیر ہے، اس کے لئے اپنے آپ کو جماعتی نظم کے حوالے کرنا ضروری ہے۔ اس کے لئے ڈسپلن میں کس جانے کے بغیر چارہ نہیں، اس کے لئے اخلاقی حدود کے احترام اور جذبات پر قابو پانے کی صلاحیت شرط اول ہے۔ بہرحال تمہارے لئے ضروری ہے کہ اپنے آپ کو نظم سے وابستہ کرو ورنہ تم مختلف طاقتوں کے آلۂ کار بن کر مختلف جزئی مطالبات منواتے رہو گے اور مجموعی طور پر صورت حالات جوں کی توں رہے گی!

• • •

چند کلمات کراچی پولیس کے نام خصوصیت سے، اور پاکستان بھر کی پولیس کے نام عمومیت سے!!

کراچی کے حادثے کی اخباری اطلاعات کے پیچھے واقعات جس حقیقی شکل میں نمودار ہوتے رہے ہیں اس کو سب سے بڑھ کر جاننے والے آپ ہیں کیونکہ آپ لوگوں کو اس کا براہ راست تجربہ ہوا ہے آپ نے بخوبی اندازہ کر لیا ہوگا کہ آزادی کے بعد اب عوام کا ذہن بدل چکا ہے۔ اور فضا دگرگوں ہو چکی ہے اور کسی آزاد ملک کی فضا میں رائے عام کو ساتھ لئے بغیر کوئی جابر سے جابر پولیس محض گولیوں اور لاٹھیوں سے لا اینڈ آرڈر کو قائم نہیں رکھ سکتی۔ بخلاف اس کے عوام کو بگاڑ کر اگر تشدد کیا جائے تو پھر تشدد کے جواب میں تشدد ابھرتا ہے اور عوامی نفرت و اشتعال کے ماحول میں نہ قانون کا بس چلتا ہے اور نہ قانون کو نافذ کرنے والی قوت کا وقار قائم رہ سکتا ہے آپ لوگ اگر اپنی قوم سے آج اس طرز پر معاملہ کریں گے جس طرز پر غیر ملکی تسلط کے دور میں کرتے تھے تو اندیشہ ہے کہ آپ کو تلخ تجربات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ —— اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سرے سے ملک کا امن

حادثۂ کراچی

ورنہ یہ بم ہو جائے گا۔
براہ کرم اپنے متھیمڈ اور اپنی تکنیک کو بدلئے!

• • •

کراچی کے واقعہ کا جو ردِ عمل فوری طور پر لاہور میں شروع ہوا تھا، اسکو بعض عناصر غلط راستے پر ڈالنے کے لئے فوراً متحرک ہو گئے تھے اور کچھ بعید نہ تھا کہ یہاں بھی کراچی کی وہی خونین داستان دوہرا دیجاتی اور پھر پنجاب کے بڑے شہروں میں طوفان اُٹھ گیا ہوتا۔ مگر لاہور کے چند ہوشیار اور ذہین طلباء نے غلط عناصر کو میدان سے ہٹا کر اور طلباء کو ان کے طلسم سے نکال کر بڑا قابلِ قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔ ان کی بے لوث خدمت نے نہ صرف چند مزید جانیں بچا لیں بلکہ پنجاب کے امن کو خطرے سے نکال لیا ہے۔

• • •

یہاں تک یہ سطور لکھی جا چکی تھیں کہ خاص ذریعہ سے ہمیں معلوم ہوا کہ کراچی کی حکومت اور ایڈمنسٹریشن کا رویہ اس حادثے کے بعد بھی بدستور غلط خطوط پر چلا جا رہا ہے اور جو توقعات وعدوں سے پیدا کی گئی تھیں، وعدہ خلافیاں اب ان کو ملیامیٹ کر رہی ہیں۔
ہم مشورہ دیتے ہیں کہ اس طرح اپنے وعدوں کی ساکھ کو تباہ نہ کیجئے، ورنہ دوبارہ اگر فتنہ اُبھرا تو پھر اس کی آگ کو تمہارے وعدوں کی شبنم بجھا نہ سکے گی۔

• • •

یہ مضمون یہاں تک کتابت ہو چکا تھا کہ آج کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ خواجہ صاحب نے طلباء کے مطالبات کو تسلیم کرنے، احکامات واپس لینے اور گرفتار شدہ طلباء کو رہا کر دینے کا وعدہ کیا ہے اور اس وعدے کے جواب میں طلباء نے اپنی ہڑتال کو روک دیا ہے۔ یہ ایک خوش آئند تبدیلی ہے اور ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

استفسارات

حدیث کی حقیقت اور شرعی حیثیت

ادارہ

• بے شک یہ بات عقلاً بھی صحیح ہے کہ محمد رسول اللہ صلعم کے وہ سب احکام وغیرہ ہمارے لئے واجب الاطاعت ہونے چاہئیں اور دین کی بنیاد میں قرآن کے ساتھ ساتھ قرآن لانے والے کے اقوال کو بھی شامل ہونا چاہئے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ رسول اللہ صلعم کے آنے کا مقصد تھا قرآن کی آیات کی تشریح کرنا اور پھر اس کے مطابق عملاً ایک نظامِ زندگی کو قائم کر کے جانا اور اس لئے ضروری ہے کہ ہم ان کے نمونے کے مطابق کام کریں یہ سب کچھ اگر درست ہے اور (خود میرے خیال میں بھی) ایسا ہونا ہی چاہئے۔ تو ایسا کیوں ہوا کہ اللہ کے رسول نے (قرآن کے علاوہ) اپنے تمام احکام، اقوال، مختلف مسائل کے فیصلوں وغیرہ کو یکجا کرنے اور اس کا ریکارڈ رکھنے کے لئے اپنی زندگی میں ہی اس کا انتظام نہ کرایا اور نہ اس کے لئے کسی کو حکم دیا (اگر ایسا ہو تو بتائیے) آخر جو چیز قیامت تک ایک دین کی بنیاد بننے والی تھی اس کے لئے اسی دین کو خود لانے والے نے ہی کوئی انتظام نہ کیا ہو یہ بات انتہائی تعجب والی ہے اور اس کے مقابلے میں ہوتا یہ ہے کہ اللہ کے رسول کی وفات کے بعد لوگ عقیدتاً ایک دوسرے سے یا صحابۂ کرام سے پوچھ گچھ کا سلسلہ شروع کرتے ہیں اور پھر کچھ مدت بعد "احادیث" کا مجموعہ وجود میں آتا ہے۔ گویا "احادیث" کو ذخیرہ کرنے کا کام "حکماً" نہیں کیا جاتا بلکہ ضرورتاً اور عقیدتاً کیا جاتا ہے مجھے اس سے بھی بحث نہیں ہے، اور میں مان لیتا ہوں کہ "احادیث" کو جمع کرنے والے حضرات نہایت مخلص اور دیانتدار اور سمجھدار تھے اور اکثر احادیث صحیح ہیں۔ مجھے صرف اس بات کا پتا چلنا چاہئے کہ "دین" کے دوسرے "جز" کو محفوظ کرنے کا کام لوگوں کی مرضی پر کیوں چھوڑ دیا گیا تھا؟ ــــ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اللہ کے رسول اپنی زندگی میں ہی اس کا اہتمام کر دیتے اور درمیان میں راویوں کے لمبے چوڑے سلسلہ کی ضرورت پیش نہ آتی۔ کیا یہ طریقہ غلط تھا۔ اور دوسرا طریقہ صحیح ہے؟

• • •

آپ کے سوال کا بالکل مختصر جواب دے رہا ہوں۔ کاش کہ یہ اختصار ہی مقصد کو پورا کر سکے۔
اسلام محض افراد بنانے نہیں آیا، وہ فرد کو معاشرہ کے نظام سے الگ کر کے نہیں رکھتا، بلکہ وہ ایک اجتماعی انسان تعمیر کرتا ہے اس مقصد کے لئے اس نے اپنی آئیڈیالوجی، تو قرآن کی شکل میں پیش کر دی، مگر اجتماعی انسان اور نظامِ زندگی کی عملی تعمیر کے لئے رسول اکرمؐ کو پوری اتھارٹی دے کر بھیجا۔ دین وہ آئیڈیالوجی بھی ہے جو قرآن کی شکل میں پیش کی گئی اور دین وہ عملی تعمیری کام بھی ہے جو رسول اللہ نے زندگی بھر انجام دیا۔ اس پھیلے ہوئے کام کو نبی صلعم نے عملی سوسائٹی کی شکل میں محفوظ کیا ہے اور پھر اسی کام کا ریکارڈ ہے کہ جو کام کے

ساتھ ساتھ شروع ہوا۔ لیکن اس کی تکمیل بعد ہی میں ہو سکتی تھی۔ ایک سوسائٹی کی تعمیر کے کام کا ریکارڈ کوئی شخص بھی کرتے ہوئے چند اہلِ قلم پیدا کرنہیں کر سکتا۔

سوال اب یہ ہے کہ ایک نیا سماج اور نئی ریاست جو نبی صلعم نے اپنی جماعتِ اسلامی کے تعاون سے تعمیر کی تو اس سارے عظیم الشان تاریخی کارنامے کا کوئی ریکارڈ ——— کوئی مستند مواد ——— ہمارے ہاتھوں تک پہنچا یا نہیں؟

اگر آپ کہیں کہ پہنچا ہی نہیں۔ تو یہ امر کتنا حیرت ناک ہوگا کہ نبی صلعم موجودہ دورِ تاریخ کے بالکل سرے پر کھڑے ہیں، اور صرف بارہ چودہ صدیاں پہلے وہ ایک عظیم اور عالمگیر پیمانے پر ہلاکت اثرات دکھانے والا کارنامہ سرانجام دیتے ہیں، اب اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کارنامے کا کوئی مستند ریکارڈ نہیں۔ ؟ ——— درآں حالیکہ آپ سے قدیم تر لوگوں کے کارناموں کا ریکارڈ ہمارے پاس موجود ہے۔

اور اگر آپ یہ کہیں کہ ریکارڈ کا مواد تو بہت ہے مگر تمام کا تمام مشکوک، اور ناقابلِ اعتماد ہے تو سوچیے کہ وہ سوسائٹی (نعوذ باللہ) کیسی گھٹیا سوسائٹی ہوگی جو اپنا ریکارڈ بعد والوں تک صحت کے ساتھ منتقل نہ کر سکی۔ گویا اس کے قلم اس کی زبانیں اور اس کے ہاتھ جو اس ریکارڈ کی حفاظت کرنے والے تھے وہ بحیثیت مجموعی ناقابلِ اعتماد ٹھہرے۔ ان ناقابلِ اعتماد ہاتھوں سے پھر اور جو جو کچھ بھی ہم تک منتقل ہوگا ہم اسے کیا وقعت دے سکتے ہیں۔ پھر تو سارا اسلام ایک کہانی ٹھہرے گا ——— چنانچہ ایک گروہ نے یہی نظریہ قائم کیا اور ساری مسلم سوسائٹی کو ناقابلِ اعتماد قرار دے کر قرآن تک کو محرف شمار کیا۔ اس گروہ کے زعم کے موجب اصل قرآن غائب ہوگیا ہے اور سازش کے طور پر دوسرا قرآن میدان میں لایا گیا ہے۔ اس گروہ کے دلائل اگر آپ پڑھیں تو وہ منکرینِ حدیث کی بحثوں سے کم فتنہ انگیز نہیں پس اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ نبی صلعم کے ایک نیا سماج اور ایک نیا اجتماعی انسان پیدا کرنے کے عظیم الشان تاریخی کارنامے کا ریکارڈ قابلِ اعتماد ذرائع سے ہم تک پہنچا ہے اور اس میں جو آمیزشیں ہوئی ہیں۔ ان کو ماہرینِ تحقیق نے قرآن کے معیار پر پرکھ کر اور اسناد و تفقہ کی چھلنیوں میں چھان کر کھرے کھوٹے کو الگ کر دیا ہے۔

اب اگر کارنامۂ نبوی کا کچھ بھی ریکارڈ ایسا ہے جو قابلِ اعتماد ہے تو سوال یہ ہے کہ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا ہم اسے امت کے دوسرے عام لوگوں کے کام کے برابر حیثیت دیں یا اس سے کچھ مختلف؟

اس کا جواب پانے کے لئے قرآن کے سامنے آئیے وہ آپ کو بتائے گا کہ الرسول کا منصب کیا ہے۔ اس کی اتھارٹی کیا ہے، وہ کس درجہ واجب الاطاعت ہے، اس کا احترام کتنے غیر معمولی درجے میں مطلوب ہے۔ اس کے لفظ لفظ اور اس کی حرکت حرکت کو کتنی اہمیت دی گئی ہے، اس کے فیصلوں اور احکام کو کیا وزن دیا گیا ہے۔ اس کو ایک عام وقتی امیر کے مقام سے کتنا اونچا رکھا گیا ہے۔ اس کی آواز پر کس طرح ہمہ تن گوش ہو جانے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اور اس کی پوری زندگی کو کس زور سے نمونہ و اسوہ ٹھہرایا گیا ہے۔ یوں جب آپ منصبِ رسالت کو متعین کر لیں گے تو خود بخود یہ نتیجہ سامنے آ جائیگا۔ کہ نبی صلعم کے کارنامے کے ریکارڈ کا جو حصہ بھی اسناد و تفقہ کے اصولوں کے لحاظ سے قابلِ اعتماد قرار پاتا ہے وہ شریعتِ اسلامیہ کا ایک ٹھوس ماخذ ہے۔

یہ بس یہ ہے ایک مختصر جواب اور ایک ذہین اور مخلص آدمی کے لئے غالباً کافی ہو سکتا ہے، اگر کافی نہ ہو تو پھر میرے اس مضمون کی تکمیل کا انتظار کیجئے جو ترجمان میں شائع ہو رہا ہے۔

بالآخر

مولانا حمید الدین فراہی

نے

اس سوال کو سامنے رکھکر کاوش کی

اور اسا

قرآن کی قسموں کی ایک سائنس مرتب کرکے رکھدی

جسے

مولانا امین احسن اصلاحی

نے

عربی سے اردو میں منتقل کیا

کیا؟

آپ نے کبھی سوچا کہ کلام الٰہی میں جابجا قسمیں کیوں کھائی گئی ہیں ـــــ؟ یہ سوال تمام مفسرین کے سامنے آیا اور انھوں نے اس پر بڑی طبع آزمائیاں کی ہیں، پھر بھی بات کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی ـــ!

قرآن کے

طالب علموں

کے لئے

ایک ٹھوس

علمی کتاب

اقسام القرآن

قیمت :ـــــ ڈیڑھ روپیہ

زلزلے بام و در پر ہی نہیں آتے دلوں اور دماغوں پر بھی آتے ہیں ـــ!

ـــــ تاکہ ـــــ فرسودہ خیالات ـــــ اور ـــــ بوسیدہ قدریں تلپٹ ہوجائیں!

ـــــ اور تعبیر نو کے لئے میدان ہموار ہو!

نعیم صدیقی

جو آج اسلامی ادبی محاذ کا ایک جانباز سپاہی ہے،

اس کے دل و دماغ بھی زلزلوں سے دوچار ہوتے تھے!

ان زلزلوں کی لہروں کو جب اُس نے پورے سماج پر طاری کرنا چاہا

تو اس کے سحر تخیل سے وہ افسانے بن گئے۔

نعیم صدیقی کے ان ہی افسانوں کا اولین مجموعہ

ذہنی زلزلے

کے نام سے ۱۹۴۵ء میں پہلی بار شائع ہوا اور مصنف کی اس ابتدائی کوشش نے دنیائے ادب میں اپنی جگہ پیدا کرلی ـــ اب مکتبہ چراغ راہ اس کا دوسرا ایڈیشن پیش کررہا ہے۔ ضخامت ۱۰۵ صفحات ـــــ طباعتی معیار اعلیٰ ـــ قیمت دو روپے

مکتبہ چراغ راہ ۔ کراچی

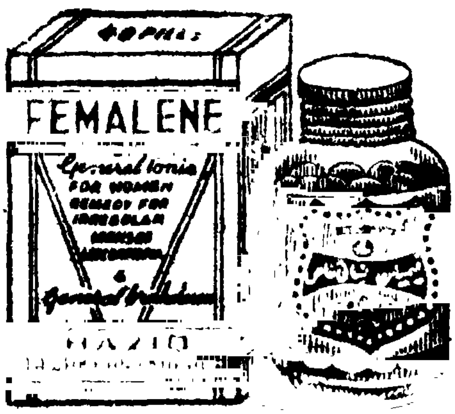
حاذق ہسٹریا پلز



یہ گولیاں خالص و کمیاب جڑی بوٹیوں سے جدید طبی اصولوں پر تیار کی ہوئی ہیں عورتوں کی مشہور بیماری ہسٹریا یا اختناق الرحم بچوں کی مرگی (ام الصبیان) کے لئے لاثانی دوا ہے۔ اس کے علاوہ کمزوری۔ ضعف ہضم اختلاج قلب (دل کی دھڑکن) کے لئے بھی بہت مفید ہے۔ یہ دواخانہ ہذا کی ایسی بے نظیر ترتیب ہے۔ جس پر طب یونانی جس قدر بھی فخر کرے بجا ہے۔

قیمت فی شیشی ــــــــ ۴۰ گولی ــــــــ پانچ روپے

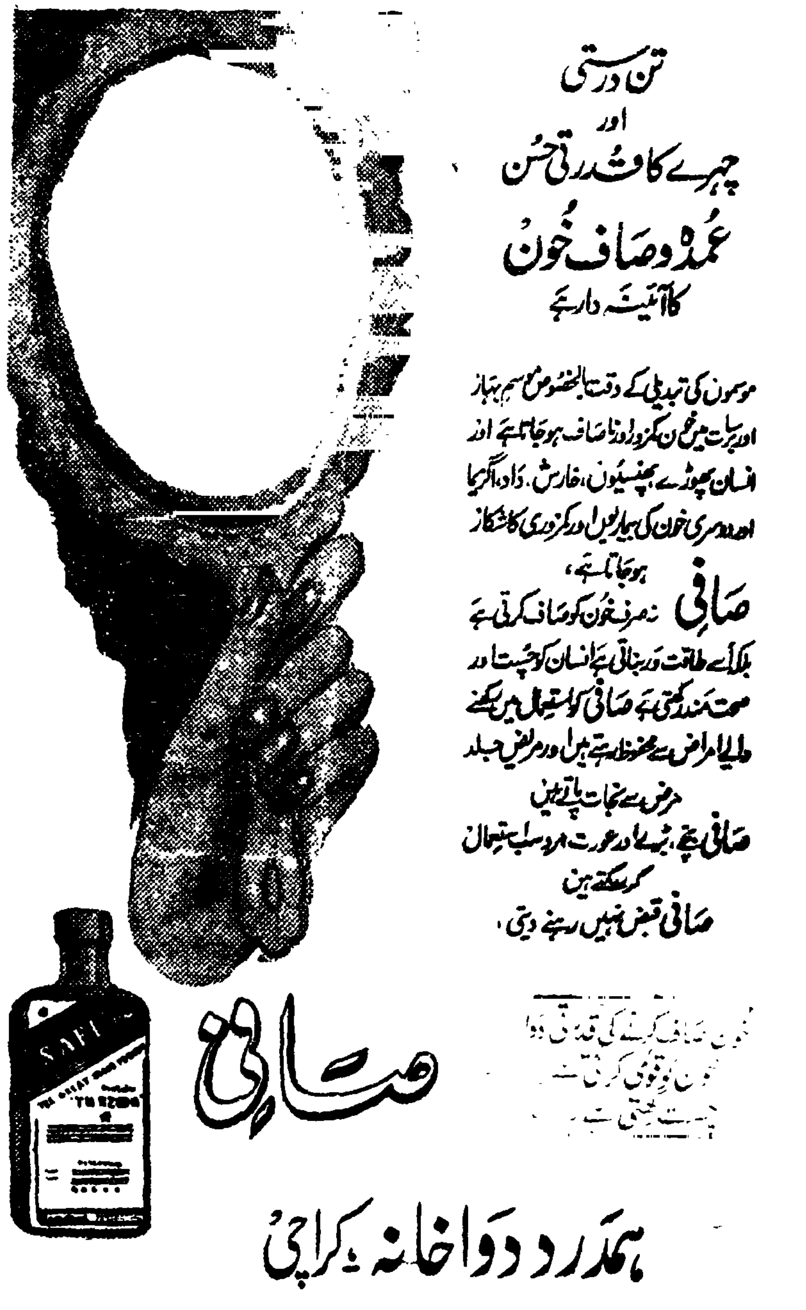
فیمیلین (نسائی خاص)



یہ گولیاں عورتوں کی جملہ پوشیدہ شکایتوں کو دور کرنے میں اکسیر ہیں۔ سیلان ماہواری کی بے قاعدگی اور اسی قسم کی دوسری زنانہ شکایتوں سے پیدا شدہ نقائص کو دور کرنے میں لاثانی ہیں۔ استقرار حمل کو مدد دیتی ہیں گویا عورتوں کے لئے ایک جنرل ٹانک ہے جس کا متواتر استعمال عورتوں کے نظام عصبی کو درست کرتا ہے۔ جن عورتوں کو اسقاط حمل کی بار بار شکایت ہوتی ہو اُن کے لئے بے حد مفید ہے۔

قیمت مکمل کورس ــــــــ ۸۰ گولی ــــــــ ۲۰ یوم کی خوراک ــــــــ دو روپے بارہ آنے (۱۲/۲)

حاذق دواخانہ۔ بندر روڈ کراچی


تن درستی
اور
چہرے کا قدرتی حسن
عمدہ و صاف خون
کا آئینہ دار ہے
موسموں کی تبدیلی کے وقت بالخصوص موسم بہار
اور برسات میں خون کمزور اور ناصاف ہو جاتا ہے اور
انسان پھوڑے، پھنسیوں، خارش، داد، اگزیما
اور دوسری خون کی بیماریوں اور کمزوری کا شکار
ہو جاتا ہے،
صافی نہ صرف خون کو صاف کرتی ہے
بلکہ اسے طاقت ور بناتی ہے انسان کو چست اور
صحت مند رکھتی ہے صافی کو استعمال میں رکھنے
والے امراض سے محفوظ رہتے ہیں اور مریض جلد
مرض سے نجات پاتے ہیں
صافی بچے، بڑے اور عورت مرد سب استعمال
کر سکتے ہیں
صافی قبض نہیں رہنے دیتی،
SAFI
صافی
ہمدرد دواخانہ، کراچی

S. No. 1047 — CHIRAGH-I-RAH KARACHI — February 1953

مکاتیبِ زنداں

——مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب، مولانا امین احسن اصلاحی صاحب اور میاں طفیل محمد صاحب کے ان خطوط کا مجموعہ جو انھوں نے اپنی اسیری کے دوران میں مرکزی جیل ملتان سے لکھے —

★——اس مجموعے میں تینوں حضرات کی زندگی کا مختصر خاکہ۔ گرفتاری کا پس منظر اور میاں محمد طفیل صاحب کی لکھی ہوئی جیل کی ڈائری (گرفتاری سے رہائی تک) بھی شامل ہے —

★——حکیم محمد شریف امرتسری (حافظ آباد۔ ضلع گوجرانوالہ) نے اس مجموعے کو مرتب کیا ہے —

صفحات ۲۰۸ - مجلد حسین گرد پوش

قیمت - ——صرف ۲ روپے

الاخوان المسلمون اور ان کی دعوت

شہید راہ حق شیخ حسن البنا کے ایک خطبہ کا ترجمہ جو آپ نے ۱۹۳۸ء میں اخوان المسلمون کے پانچویں اجلاس میں دیا تھا —

ترجمہ —— ظفر بلیغ، رفیق دارالعروبہ۔ راولپنڈی قیمت -/۴/۱

چند عنوانات

★——دو لفظ از مولانا مسعود عالم ندوی

★——عرض مترجم

★——تمہید

★——جماعت الاخوان کی تاسیس

★——الاخوان المسلمون کا اسلام

★—— ہماری فکر کی جامعیت

★——دعوتِ اخوان کی بعض دوسری خصوصیات

مولانا امین احسن اصلاحی کی گراں بہا تصنیف

تدبر قرآن

قرآن مجید میں تدبر کرنے کا طریقہ کیا ہے —— اس کام میں کن آداب و شرائط کا اہتمام ضروری ہے۔ تفسیر کی کتابوں سے کون سی کتابیں کس حد تک مفید ہیں، عربی ادب کی کس درجہ کی استعداد قرآن فہمی کے لئے ضروری ہے ۔ ۔ ۔ کی کونسی کتاب مطالعۂ قرآن کے وقت پیش نظر رکھنی چاہئے۔ نحو، بلاغت، تاریخ اور حدیث سے قرآن مجید کو کس حد تک تعلق ہے۔؟

دوسرا اڈیشن ۔ ترمیم و اضافے کے ساتھ قیمت ۔/۴/۳

مکتبہ چراغ راہ کراچی-۱

Printed at Nazir Printing Press, McLeod Road, Karachi &
Title Printed at SHAN ELECTRIC PRESS Arambaugh Road, Karachi.
Printer & Publisher Ghulam Mohammed M. Chaudhri



چراغِ راہ

ادب میں اسلامی تحریکوں کا علمبردار

مارچ ۱۹۵۳ء

بہ ادارت:- نعیم صدیقی

جلد ۶

شمارہ ۳

چندہ سالانہ

پاکستان ۵ر —— بھارت ۸ر

فی پرچہ

۸ر آنے

مندرجات

دفتر ماہنامہ چراغِ راہ ۹۔ لوٹیا بلڈنگ آرام باغ روڈ کراچی

سوچ بچار

ایک اہم تصریح

میں نے اپنے قلم اور چراغِ راہ سے حلقۂ ادبِ اسلامی کی ترجمانی و نمائندگی کی خدمت لینے کا جو تجربہ اب تک کیا ہے، اُس کے پیشِ نظر میں اس قطعی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ ذمہ داری اتنی نازک اور اتنی بھاری ہے کہ میں اپنے اور چراغِ راہ کے کندھوں کو اس کے لئے موزوں نہیں پاتا۔ یہ کام دوسرے بہتر لوگوں کے ذریعے سرانجام پانا چاہئے۔ اب سے چراغِ راہ کو حلقۂ ادبِ اسلامی کا ترجمان و نمائندہ نہ سمجھا جائے۔ البتہ اسلام اور ادبِ اسلامی کی جو خدمت وہ اب تک جس طرح انجام دیتا چلا آرہا ہے، انشاءاللہ آئندہ بھی اسی طرح انجام دیتا رہے گا۔ فرق صرف یہ ہوگا کہ اب ترجمان اور نمائندہ وہ صرف اپنا ہی ہوگا۔

اشاعتِ خاص کے سوچ بچار میں "اسلامی ادب" کے حق میں جو کچھ کہا گیا تھا، اسے بھی پہلے نہیں تو اب سے ——— صرف ان ادبی سرگرمیوں سے متعلق سمجھا جائے جو چراغِ راہ نے بجائے خود ایک مستقل ادبی اسکول ہونے کی حیثیت سے انجام دی ہیں۔ اس میں بار بار "ہم" کے ضمیر کو استعمال کیا گیا ہے، اس ضمیر میں صرف ادارہ چراغِ راہ اور اس کے قلمی معاونین کو مضمر سمجھا جائے۔ دوسرے لفظوں میں ہمارے اس اداریے کو حلقۂ ادبِ اسلامی سے متعلق سمجھ کر زیرِ غور نہ لایا جائے۔

نعیم صدیقی

موج و حباب

بیکل یزدانی

خونِ اسلاف جما جاتا ہے شریانوں میں! — اب حرارت ہی نہیں سوختہ سامانوں میں
زندگی عیش سے کٹتی ہے پریخانوں میں — رقصِ ابلیس کا منظر ہے شبستانوں میں
نفسِ بوذر و سلمان کہاں سے لائیں — ہوش مندی کی رمق بھی نہیں نادانوں میں
دیکھنے والی نگاہوں نے مسلسل دیکھا — خونِ جمہور چھلکتے ہوئے پیمانوں میں
خرمنِ ملتِ بیضا پہ شرر افشاں ہیں — عظمتِ آدمِ خاکی کہاں شیطانوں میں

اہلِ مغرب کی "تصانیف" پہ دم دیتے ہیں
اور "قرآن" ہے لپٹا ہوا جزدانوں میں

ابھی رائج ہے حکومت میں فرنگی قانون — ابھی "اسلام" کا آئین ہے تہ خانوں میں
ناظمِ قوم بھی ہیں تفرقہ پرداز بھی ہیں — یہ دورنگی بھی جنم لیتی ہے انسانوں میں
حوصلہ تنگ ہے، دل تنگ، نظر تنگ اگر — وسعتِ قلب و جگر دیکھئے اعلانوں میں
سرزمین اپنی تو سونا بھی اُگل سکتی تھی — کام کرنے کا سلیقہ بھی ہو دہقانوں میں

زہر دے دیجئے ہم خانماں بربادوں کو
اک اضافہ ہی سہی آپ کے احسانوں میں

خون سے کی ہے غریبوں نے وطن کی تعمیر — اس حقیقت کو مگر ڈھونڈیئے افسانوں میں
"شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو" — گھر کے مالک بھی گنے جاتے ہیں مہمانوں میں

بادۂ جام سے رغبت نہیں ان کو لیکن — سانس لینے کو چلے آتے ہیں میخانوں میں
اس حقیقت سے مگر کون کرے گا انکار — گھر گئے اہلِ حرم آ کے صنم خانوں میں
صبح "اپوا"[1] کی قسم شامِ کلفٹن[2] کی قسم — بے حجابی فقط انداز ہے ایمانوں میں
ڈھونڈنے والے عبث وقت نہ کھو ہوش میں آ — روحِ پاکیزگی آسودہ دل انسانوں میں

[1] پاکستان کی آسودہ حال خواتین کی ایک بزم [2] کراچی بندرگاہ کی ایک معروف "سیرگاہ"۔

بے دھڑک ملتے ہیں، بچھڑے ہوئے دل آپس میں
عشق پروان چڑھا کرتا ہے ایوانوں میں!

علم کا جہل ہے اس دورِ ترقی میں عام
نورِ ایماں ہے مگر، چاک گریبانوں میں

اپنی فطرت کو بدل سکتا نہیں ہے ہرگز!
رہ کے خورشیدِ جہاں تاب سیہ خانوں میں

آج بھی وارثِ قرآں ہیں، مفلوک الحال
آج بھی "عشرتِ حاصل" ہے پریشانوں میں

دولتِ اسلام کی سینوں سے لگائے ہیں غریب
ہوش کی پوچھو اگر ہوش ہے دیوانوں میں

آج بھی سایۂ شمشیر میں جنّت اِن کی
زندگی رقص کناں، جنگ کے میدانوں میں

نورِ ایماں ہے دہکتے ہوئے دِل میں پنہاں
شمع کا سوزِ دروں، شمع کے پروانوں میں

تیرہ سو سال کا! آئینِ کہن رائج ہو
آج یہ جذبہ ہے بیدار مسلمانوں میں

لاکھ گفتار کا غازی سہی بیکل اے دوست!
ہے شمار اِس کا "جماعت" کے سخندانوں میں

راحت علی خاں

تسلیم کہ ہیں لبوں پہ تالے
لیکن نہ رکیں گے آج نالے

اب دشتِ جنوں میں آگئے ہم
پاؤں میں پڑیں ہزار چھالے

کھو بیٹھے ہیں عقل چارہ گر بھی
بیمار سے کوئی کیا دوا لے

پھیلائیں گے نور ظلمتوں میں
سینے میں وُہ داغ ہم نے پالے

ـعام کیا متاعِ دل کو
آئے کوئی حوصلے نکالے

ـیکیٔ شب ڈرا رہی تھی
ڈستے ہیں مجھے تو اب اُجالے

ـس عہدِ خراب حال میں تو
ذہنوں کو بھی لگ رہے ہیں جالے

ہر کام بگڑ گیا ہے راحت
کوئی تو زمامِ عزم سنبھالے

آرشد بیابانی

بے خودی میں دیدۂ بیدار کی باتیں کریں
دَورِ حرص و آز میں ایثار کی باتیں کریں

کفر و ایماں کی لڑائی چھڑ گئی ہے آج پھر
تیر کی باتیں کریں تلوار کی باتیں کریں

اَبروئے خمدار اور زُلفِ پریشاں چھوڑ کر
ہم نشینو! وقت کی رفتار کی باتیں کریں

موڑ ڈالیں وقت کے بہتے ہوئے دھارے کا رُخ
انقلابِ عالمِ افکار کی باتیں کریں

ساغر و مینا و بلبل کے فسانے چھوڑ کر
آؤ اس شکلِ عالم کردار کی باتیں کریں

زکی زاکانی

جینے والے جئیں گے ہر صورت
زندگی دردِ سر سہی، پھر کیا
بہتی جائے گی کشتی مہتاب
ہر ستارہ بھنور سہی پھر کیا

شوق کی وسعتیں ہیں لامحدود
جب سے یہ راز پا گیا ہوں میں
دونوں عالم پہ ہے نظر میری
دونوں عالم پہ چھا گیا ہوں میں

شعلۂ عشق کو بجھانے کی
کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی
غم کی تابانیاں ارے توبہ!
موت کو جرأتِ نظر نہ ہوئی

جان کر خود کو بندۂ مجبور
اور مجبور ہو گیا ہوں میں
آہ فکر و عمل کی منزل سے
کس قدر دور ہو گیا ہوں میں

جب بھی کرتا ہوں ترکِ ذوقِ نیاز
دل میں وہ بے کلی نہیں رہتی
اصل میں دردِ آرزو کے بغیر
زندگی زندگی نہیں رہتی

نہ ڈر ہاں ہاں نہ ڈر کچھ بھی نہیں ہے
یہاں اے بے خبر کچھ بھی نہیں ہے
بظاہر تو بہت کچھ ہے زمانہ
حقیقت میں مگر کچھ بھی نہیں ہے

ظہور الحق صدیقی

حضور آپ کے دامن کے داغ ہیں غمّاز
چھپا سکیں گے نہ ماضی کے آپ افسانے
فلک پہ تیر چلاتے ہیں خاک کے ذرّے
کوئی بتائے یہ دیوانے ہیں کہ فرزانے
ہزار رنگ سے تو نے سجائے دار و رسن
ہزار ڈھنگ سے تو نے بنائے دیوانے
بجھا بجھا کے جلائے ہیں عفتوں کے چراغ
ہنسا ہنسا کے جلائے ہیں لاکھ پروانے
کلی کلی کا تبسّم تمہی نے لوٹا ہے
چمن چمن میں ابھارے ہیں تم نے ویرانے

جل گئیں جب کھیتیاں ابرِ بہار آیا تو کیا
صحنِ گلشن میں کوئی پھر بے قرار آیا تو کیا
پھول جو رشکِ چمن تھا نذرِ گلچیں ہو گیا
گلستاں میں باغباں اب سوگوار آیا تو کیا
ہو چکا میرے مقدر میں اگر دار و رسن
بعد اس کے پھر زمانہ سازگار آیا تو کیا

نجمی اعظمی

نازِ ہستی کے اٹھانے دو مجھے | چوٹ کھا کر مسکرانے دو مجھے
کفر و شر پامال ہوئے میرے حریف | ان سے قوت آزمانے دو مجھے
ان سے میرا روٹھنا اچھا نہیں | اپنی کمزوری چھپانے دو مجھے
خوب ہے یہ زندگی کی ہار جیت! | اب یہ بازی کھیل جانے دو مجھے
میں بھی نجمی! آدمی ہوں کام کا! | کام کچھ کر کے دکھانے دو مجھے

کوثر نیازی

پوشیدہ یہ بات نہیں ہے
عشق کی کوئی ذات نہیں ہے

دل میں لاکھوں شکوے ہونگے
لب پر لیکن بات نہیں ہے

ان کی زلفیں بکھری ہوں گی
اے لوگو! یہ رات نہیں ہے

دنیا میں سب کچھ ہے لیکن
الفت کی سوغات نہیں ہے

اب بھی مل لیتے ہیں لیکن
پہلی سی وہ بات نہیں ہے

غم دل ہی نے مول لیا ہے
اس میں ان کا ہات نہیں ہے

الفت کی بازی میں کوثرؔ
جیت سے بڑھ کر مات نہیں ہے

تبسّم

مرحوم تمنّاؤں کا ماتم کہئے
یا دل سے ابھرتا ہوا اک غم کہئے
یہ نوحۂ پنہاں۔ کہ کہیں جس کو ہنسی
انساں کا اسے گریۂ مبہم کہئے

نوید

ہے ابرِ تمنّا میں شعاعِ امید
اک صبر۔ کہ آنے ہی کو ہے ساعتِ عید
جس طرح چڑھائے کوئی تیروں پہ غلاف
اس طرح مجھے دوست سناتے ہیں نوید

سورج

اوہام کے رشتے جو ہیں سارے کٹ جائیں
کہہ دو! کہ برائی کے اندھیرے چھٹ جائیں
اسلام کا سورج ہے نکلنے والا
چمگادڑیں باطل کی فضا سے ہٹ جائیں

چُپ ہی بھلی!

نعیم صدیقی

نفیری کا نام محلے بھر میں بچے بچے کی زبان پر ہے، اس کا خیال آتے ہی جوان لڑکیوں کے ماتھے پر بل پڑ جاتے ہیں، ان کے رخسار سرخ ہو جاتے ہیں، اور ان کی کنپٹیاں تپنے لگتی ہیں، اور اس کا ذکر چھڑتے ہی بڑی بوڑھیاں کہ لعنت ایسے کپتے حرام زادے پر کہ ایک گہری تشویش میں ڈوب جاتی ہیں، اور جیسے فضا ان سے سرگوشی کرتے ہوئے کہتی ہے کہ جانے کیا ہو!

نفیری باپ پر گیا ہے! اُس کا باپ بھی کپتا تھا، اس کا خیال آنے پر بھی لوگ اسی طرح تشویش میں پڑ جاتے تھے اور "جانے کیا ہو" کا دھڑکا محلے بھر کو لگا رہتا تھا! نفیری کے باپ نے چونکہ مسلم لیگ کی خدمت کی تھی اس لئے اسے محلے کے چوہدریوں نے مسلم لیگ کا کونسلر بنوا دیا تھا۔ اس طرح کریلا نیم چڑھا ہو گیا۔ آئے دن وہ کوئی نہ کوئی واردات کرتا رہتا، لیکن کوئی اس پر ہاتھ نہ ڈال سکتا تھا، کوئی فریاد تک نہ کر سکتا تھا، پولیس تک اس کے خلاف جنبش نہیں کر سکتی تھی ——— وہ کپتا بھی تھا، برادری والا بھی تھا، اور مسلم لیگ کا چہیتا بھی تھا! کتنوں کی پگڑیاں اس نے اچھالیں، کتنے آنچل اس نے نوچ ڈالے، کتنی عزتوں پر اس نے ہاتھ ڈالا، مگر وہ جب تک جیا دندناتا پھرا۔ آخر وہ اپنے ایک حریف کے ہاتھوں چاقو کھا کر مرا۔

نفیری کی ماں پہلے ہی اپنے گھر کی گندی معاشرتی فضا کی جلتی بھٹی میں تپ تپ کر ختم ہو چکی تھی، اور اب باپ بھی چل بسا، لے دے کے دادی رہ گئی تھی جس نے لاڈ پیار سے اسے بگاڑنے میں کوئی کسر پہلے ہی نہ چھوڑی تھی، اور اب تو پانی سر سے نکل چلا تھا۔ باغبانپورے میں زمین تھی اور کشمیری بازار میں دکانیں تھیں، زمین اور دکانوں کی آمدنی گذر بسر کے لئے کافی تھی۔ نفیری کا باپ ان پڑھ تھا، لیکن وہ بیٹے کو پوری طرح تعلیم دلانے کا منصوبہ سامنے رکھتا تھا۔ لیکن اس کے مرتے ہی نفیری نے مدرسے کو خیرباد کہ دیا۔

نفیری عجب پر اسرار ہنگاموں کی فضا میں پلا تھا۔ وہ دیکھتا کہ اس کے ابا کے عجیب وغریب ملنے والے آتے تھے۔ ان کی شکلیں عجیب و غریب ہوتی تھیں۔ کسی کے گلے میں مالا ہوتی، کسی کے پٹے بڑے رومانوی سے ہوتے، کسی کے مونڈھے پر سنہرے لاکٹ میں تعویذ بندھا ہوتا، کسی کی کلائی پر نام کھدا ہوتا اور شیر کی تصویر بنی ہوتی، کسی کی مونچھیں ایسی ہوتیں جیسے دو کوے کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھے ہوں، کسی کے تہمد کا سماں یہ ہوتا کہ اس کے دونوں کونے کمر سے دو دو فٹ نیچے تک لٹک رہے ہوتے اور کنارا زمین پر گھسٹتا ———

یہ لوگ اندر اندھیری کوٹھڑی میں گھسے رہتے، وہیں چلتے اور کھانا منگاتے، گپیں لڑاتے، قہقہے لگاتے، گراموفون ریکارڈ سنتے، کبھی کبھی ان میں سرگوشیاں ہوتیں۔ بارہا وہ جوا کھیلا کرتے تھے، اور کھیلتے کھیلتے ان میں دنگا ہو جاتا تھا۔ لیکن کوٹھڑی کی کنڈی وہ اندر سے لگا کے بیٹھتے تھے اور نفیری کے لئے یہ سب کچھ پراسرار تھا، اس بچارے کو اُدھر پَر مارنے کی اجازت ہی نہ تھی۔ لیکن اسی قدغن کی وجہ سے نفیری کی توجہ چوبیس گھنٹے اسی کوٹھڑی کے اندھیرے میں بھٹکتی رہتی، وہ جب کبھی پان، چائے یا حقے کی چلم لے کے اسے جانا پڑتا تو وہ بلب کی روشنی میں ان دہشتناک الف لیلائی چہروں کو دیکھ کر بک دھک سے رہ جاتا!

ایندھن بھی اسی کوٹھڑی میں رہتا تھا، چنانچہ نفیری کو کبھی کبھی لکڑیاں نکالنے کے لئے اندر جانا پڑتا تو وہ اس کوٹھڑی میں جاتے ہوا ڈرا

کرتا تھا، لیکن جاتا تھا۔ وہ جاتا تو اِدھر اُدھر دیکھے بغیر سیدھا لکڑیوں تک جا پہنچتا۔ وہ آنکھیں اٹھاتے ہوئے ڈرتا تھا کہ کہیں کوئی موٹی موٹی مونچھوں والا اچھا اسے دبوچ نہ لے، اور کہیں کوئی اجنبی عورت چڑیل بن کر اس کا گلا نہ گھونٹ دے۔ لیکن ایک دن اس نے پوری فضا کو دیکھ لیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک کونے میں برچھی کھڑی ہے جس کا پھل بلب کی روشنی میں چمک رہا ہے۔ سامنے کے طاقچے میں سات انچ لمبا چاقو پڑا ہے۔ ایک اور کونے میں چمڑے کی پٹی کے ساتھ پستول لٹک رہا ہے۔ وہ ڈرا اور جلدی سے لکڑیاں لے کر نکل آیا۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ رات کی تاریکی میں اس کے ابا کے جلو میں کوئی عورت لپٹی لپٹائی داخل ہوتی اور پھر اسی کوٹھڑی میں گم ہو جاتی۔ ایک آدھ مرتبہ اس طرح کے حادثوں پر نفیری کی نگاہ بھی پڑ گئی اور پھر وہ سوچ میں ڈوبا رہنے لگا۔ ایسے موقعوں پر اس کی ماں کا بُرا حال ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ جب وہ کوٹھڑی میں بھیجنے کے لئے چائے یا کھانا تیار کر رہی ہوتی تھی تو اس کی آنکھیں نم آلود رہتیں، اور وہ بالکل گم سُم ہو جاتی۔ وہ پہلے بولا بھی کرتی تھی، لیکن بری طرح پٹتی، اور نفیری کے سامنے اُس نے وہ ماریں کھائی تھیں کہ کوئی اونٹ بھی نہ سہ سکے ——— نفیری کی دادی بیچ بچاؤ کے لئے کھٹیا سے لکڑی ٹیکتی اٹھتی لیکن گھبراہٹ کے مارے کئی کئی بار گر پڑتی؛ اور پھر بیٹے کا ہاتھ پکڑتے پکڑتے نفیری کی ماں کے اوپر جا گرتی اور دو چار لاتیں یا سونٹے اسے بھی پڑ جاتے، تب جا کر طوفان تھمتا۔ آخر نفیری کی ماں نے ان تجربوں کے بعد چپ ہی پکڑ لی! —— اب اس کے ہونٹوں پر آنے والے سارے الفاظ پلکوں کے آنسو بن جاتے تھے!

لیکن اب نہ آنسوؤں والی پلکیں باقی تھیں، نہ وہ مارنے والے ہاتھ ——— صرف نفیری تھا اور اس کی ایک بہن اور ایک دادی!

نفیری سے مدرسہ پتنگ بازی کی لت نے چھڑایا۔ وہ دن دن بھر کوٹھے پر پتنگ اڑاتا رہتا، اور پیچ لڑا لڑا کر ڈوریں اور پتنگ لوٹتا رہتا۔ کوئی پتنگ محلے کی فضا میں چڑھی نہیں کہ نفیری اس کے پیچھے پڑ نہیں گیا۔ ڈور آناً فاناً کاٹ کے رکھ دیتا، پتنگ گر پڑتی اور نفیری اپنی فوج کی کمان کرتا ہوا ایک گھر سے دوسرے گھر کی چھت پر کودتا، دیواروں پر چلتا، سیڑھیاں چڑھتا اترتا اپنا شکار لے کے پلٹتا۔ ایسے موقعوں پر بعض اوقات گتھم گتھا ہونے کی ضرورت بھی پیش آتی، اور نفیری اس میں طاق ہو گیا تھا۔ طاق بھی ایسا ہوا کہ محلے کے لڑکوں پر اس کا رعب چھا گیا۔ نفیری کا نام سنا نہیں کہ حریف بھاگا نہیں۔ نفیری اکیلا ہوتا تو الگ بات تھی، مگر یہاں تو نفیری کے ساتھ دسیوں نفیری اور تھے۔ فوج کی فوج تھی اور وہ اپنی فوج کا نپولین تھا۔ ایک دن نفیری کی پتنگ بھی لوٹی گئی، وہ مع اپنی فوج کے پیچھے دوڑا مگر دشمن کا پلّہ بھاری رہا۔ وہ انتقام کی آنچ سے کھول گیا۔ گھر آیا، فلترانی نیفے میں اٹکایا اور موٹا سا ایک رُول لے کر نکل گیا۔ فوج جمع کی اور جس لڑکے نے پتنگ لوٹی تھی اس کے گھر کے سامنے جا مورچہ لگایا۔ وہ لڑکا بے دھیانی میں گھر کے دروازے سے نکلا ہی تھا کہ فوج ٹوٹ پڑی، نفیری نے اس کے کندھوں پر بے تحاشا ڈنڈے برسائے، لڑکا چیخا تو شور سن کر اس کی ماں باہر نکل آئی، فوج بھاگ گئی، مگر نفیری اس کی ماں کے آنے پر بھی گتھم گتھا رہا، اب اس نے چاقو نکال لیا تھا اور اسے زخمی کرنے کو تھا۔ لیکن اس کی ماں نے نفیری کو الگ کیا۔ اِدھر اُدھر سے لوگ اکٹھے ہونے لگے۔ نفیری بھاگ گیا۔ شکایت اس کی دادی تک پہنچائی گئی۔ دادی سر پیٹ کر رہ گئی۔ وہ کہیں شام کو گھر پلٹا۔ دادی اس کے آتے ہی اس پر برس پڑی۔ لیکن وہ لاٹھی تان کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ "خبردار! جو بولی تو، میں جانوں اور میرا کام، جسے بات کرنی ہو مجھ سے کرے، میں اس سے خود نمٹ لوں گا، لاٹھی نہ کام کرے گی تو چاقو موجود ہے، چاقو کافی نہ ہوگا تو ابا کی برچھی ہے، اور برچھی بیکار نکلے گی تو پستول کی گولی سے کام لوں گا!" اور دادی بھنچ کے رہ گئی، اس پر جیسے ایک کپکپی طاری ہو گئی ہو!

اور اب چرچے ہونے لگے کہ نفیری تو بلا ہے، نفیری تو نجانے کیا کر بیٹھے گا! اور یہ چرچے جب نفیری کے کانوں تک پہنچتے تو وہ پھول

چپ ہی بھلی!

سجاتا ـــــــ وہ ماحول میں کتنا ممتاز ہو رہا تھا!

چھت سے پتنگ بازی کرتے ہوئے نفیری آس پاس کے منظر کے کچھ دوسرے پہلوؤں سے بھی آگاہ ہونے لگا تھا وہ چھتوں پر عورتوں اور لڑکیوں کو دھوپ تاپتے یا ہوا کھاتے یا کپڑے پھیلاتے دیکھتا، تو اس کا جی چاہتا کہ وہ ان سے بھی کوئی شرارت کرسکے وہ چاہتا کہ کاش کہ یہ بھی پتنگ اڑائیں اور یہ ان سے بھی پتنگ لوٹا کرے، پتنگ نہیں تو اپنے آنچلوں کو ڈور باندھ کر لہرائیں، پھر کیسی رہے! وہ کبھی کبھی پتنگ لپیٹ کر رکھ دیتا اور پھر ادھر ادھر دیکھنے لگتا، اور دیکھتے دیکھتے کسی منظر پر اس کی نگاہیں رک جاتیں۔ کہیں دو چار عورتیں اپنے دھیان میں بیٹھی سلائی بنائی کا کام کر رہی ہوتیں، سینے پروتے وہ باتیں کرتیں، ہاتھ ہلاتیں، ہنسی مذاق کر بیٹھتیں ـــــــ اور ان بچاریوں کو یہ پتہ نہ ہوتا کہ ایک چور آنکھ ان کو دیکھ رہی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ نفیری یہ بھی معلوم کرنے لگا کہ یہ کس کا گھر ہے؛ فلاں لڑکی کون ہے؟ اس کے برقعے کا رنگ اور ڈیزائن کیا ہے؟ ہوتے ہوتے وہ جاننے لگا کہ یہ جمیلو کا گھر ہے، یہ لڑکی شدّ نے کی بڑی بہن ہے، یہ ساڑھی والی مڈل اسکول کی ہیڈ ماسٹر ہے، یہ وہ ہے جس کو حلیم نے طلاق دے دی تھی!

پتنگ لوٹنے کے لئے جب وہ اپنی فوج سمیت چھتوں پر دوڑ لگاتا تو عجیب عجیب حادثات پیش آجاتے۔ ایک دن وہ بیت الخلاء پر جا چڑھا، اور ایک لڑکی "ہائے" کرکے رہ گئی۔ ایک دن وہ ایک صحن میں کود گیا اور وہاں ایک عورت جھاڑی کی اوٹ میں نہا رہی تھی۔ وہ بدک گئی اور اُس نے کپڑا لپیٹا اور پھر وہ گالیوں کی بوچھاڑ کی کہ تو یہ ہی بھلی! نفیری بھاگ کے دروازے سے نکل گیا مگر اسے بری طرح ہنسی آرہی تھی اور وہ دیر تک ہنستا رہا! اپنے یہ کارنامے جب اپنے ساتھیوں کو سناتا تو وہ اپنے اندر نت نئی تحریک محسوس کرتا!

یوں نفیری کے اندر ایک نئی حِس اور ایک نئی دلچسپی نے کروٹ لینی شروع کی۔

میلہ چراغاں ہوا تو نفیری وہاں سے ایک نیا فتنہ خرید لایا۔ یہ دوربین تھی! اور اُس نے چھت پر کی برساتی کے اندر کھڑے ہو کر کھڑکی کے پٹ اس طرح بند کئے کہ دوربین رکھنے کے لئے فاصلہ رہے۔ وہ سب کچھ دیکھ سکے مگر اسے کوئی دیکھنے والا نہ ہو۔ اور اُس نے دیکھا کہ سلیمہ اپنے کمرے کے اندر کھڑی کپڑے بدل رہی تھی، وہ اپنے آپ کو غیر آنکھوں کی دسترس سے محفوظ سمجھ رہی تھی لیکن سلیمہ کے کمرے کی کھڑکی کے ایک کھلے پٹ میں سے نفیری اس طرح جھانک رہا تھا جیسے وہ بالکل اس کے پاس کھڑا ہو۔ اُس نے بوڑھے اکبرو کو دیکھا کہ لاٹھی ٹیکتا چھت پر آیا اور بیت الخلاء کے باہر ہی استنجا کرنے بیٹھ گیا۔ اُس نے دیکھا کہ سامنے کی خالہ آئینہ رکھے بال بنا رہی ہے۔ وہ ان مناظر کو غور سے دیکھتا رہا، دیر تک دیکھتا رہا، اور جیسے بالکل ان میں گُم سُم ہو گیا۔ آج اُس کی آنکھ کو نئی قوت مل گئی تھی، وہ اب مسلح آنکھ تھی، وہ اب دور مار ہو گئی تھی، ایک نئی دنیا کے دروازے اس پر کھل گئے تھے۔ سائنس اس کی معاون بن گئی تھی ـــــــ اور سائنس جب بدکرداری میں آدمی کی معاون بن جاتی ہے تو پھر امن اٹھ جاتا ہے، شرافت کا خون ہو جاتا ہے!

شرافت کا خون ہوتا رہا، ہر روز ہوتا رہا!

نفیری اس فتنے کو اپنے لئے ایک دن بھی خاص نہ رکھ سکا اور اسے راز نہ بنا سکا؛ اس نے اپنے ساتھیوں کو بھی اس نئی دنیا کی سیر کرا دی، جس کو اس نے دریافت کیا تھا!

یہ فوج کی فوج دوربین لئے محلے کی بہو بیٹیوں کو تاکتی، پھر ان کا اتا پتا نکالتی، پھر ان کے نام دھرے جاتے، پھر گلیوں میں ان کا تعاقب ہوتا، اور اس طرح نفیری کی جوانی گل کھلا رہی تھی!

لیکن نفیری چاہتا تھا کہ جس دنیا کو اس نے دریافت کیا تھا، اسے بھی تو اپنے وجود سے باخبر کیا جاتے اور اسے اپنی طرف متوجہ کیا

جانے، بے دھیانی میں کسی کو تاکتے رہنا کیا مردانگی ہوئی۔ چنانچہ ایک دن دوربین سے وہ اور اس کے دو ساتھی انور براز کی لڑکی پروین
کو تاک رہے تھے جو صبح کے سمے چھت پر بال بنا رہی تھی ——— یکایک نفیری کو ایک شرارت سوجھ گئی، وہ دوڑا دوڑا نیچے گیا اور
بڑا سا آئینہ اٹھا لایا جو اس کے باپ کی نشانی تھا۔ اُس نے آئینے کا عکس سیدھا پروین کے چہرے پر ڈالا، اور وہ ایسے بدکی جیسے
اسے گولی ماردی گئی ہو، کنگھی اور آئینہ اس کے ہاتھ سے گر پڑے، دُور اسے نفیری اور اس کے ساتھی ہنستے دکھائی دئے، جو ہاتھ
ہلا ہلا کر اشارے بھی کر رہے تھے ——— وہ مارے شرم کے بھاگی اور پھر کبھی کوٹھے پر نہ گئی۔ اب یہ تماشا ہر روز ہونے لگا۔ دوربین
سے نشانہ بنایا جاتا، اور آئینے سے فائر کیا جاتا محلے کی شامت آگئی، اور عورت ذات کے لئے دھوپ یا ہوا بالکل حرام ہو کے
رہ گئی!

مشکل یہ کہ نفیری اور اس کی پارٹی چونکہ انتخابات میں مسلم لیگ کے کام آئی تھی، اور اس کے باپ کی خدمات کا ریکارڈ بھی تابناک
تھا، پھر برادری کی بڑی طاقت تھی، اس لئے کوئی دم نہ مار سکتا تھا!

ہوتے ہوتے وہ وقت آیا کہ نفیری کے باپ کی تاریخی کوٹھڑی اپنے سارے ہی پرانے استعمالات میں آنے لگی اور اس
کی تاریکی کی قبروں سے ایک ایک کرکے مردہ ہنگامے جی اٹھے! وہاں اسی طرح عجیب و غریب چہرے جمع ہوتے، اسی طرح تاش
کھیلی جاتی، اسی طرح جوا ہوتا، اسی طرح قہقہے لگتے، اسی طرح سرگوشیاں ہوتیں، اسی طرح ریڈیو کے گانے گونجتے، اسی طرح دارو کا
دور بھی چل جاتا، اور اسی طرح کبھی کبھار کوئی لڑکی رات کی تاریکی میں آتی اور تاریکی میں ہی لوٹ جاتی!

اکرم بوڑھا مہاجر تھا وہ مشرقی پنجاب میں جائداد لٹوا آیا تھا، زمین چھوڑ آیا تھا، اپنے جوان بیٹے کی جان کو بھینٹ چڑھا آیا تھا،
——— یہ سب کچھ اس نے اپنی جان بچانے کے لئے گوارا نہیں کیا تھا، اپنی آن بچانے کے لئے کیا تھا!

جب تقسیم ہوئی تو اس کی بیٹی سعادت جوانی کی سرحد پر قدم دھر رہی تھی۔ جب بربریت کی لہریں علاقے میں اٹھنا شروع ہوئیں
تو اکرم بڑی تشویش میں پڑ گیا۔ اسے، زمین، مکان اور اسباب کی کبھی فکر نہیں ہوئی تھی، اسے اپنی جان کی بھی کوئی فکر نہ تھی، وہ
اپنے غیور اور بہادر جوان بیٹے کی طرف سے بھی بے فکر تھا کہ وہ اگر مرے گا تو بہر حال حق وصول کرکے مرے گا۔ اسے ساری کی ساری
فکر سعادت کی تھی!

سعادت ایک ایسا خزانہ تھا جو اس کے پاس اللہ کی طرف سے ایک امانت تھی! دین کی امانت تھی، پوری تاریخ اسلام کی
امانت تھی، مسلمان قوم کی امانت تھی، پاکستان کی امانت تھی، خود اپنے خاندان کی امانت تھی! وہ اس امانت کے بچاؤ کی فکر میں
گھلا جا رہا تھا کہ اگر ملک اس طرح اندھیر گردی میں ڈوبا جا رہا ہے تو اس کا کیا بنے گا؟ کلکتے، نواکھالی، بہار اور شمالی پنجاب میں جو گندے
واقعات ہوئے تھے وہ اس کے سامنے تھے!

ایک دن، جب نازک گھڑی آگئی تو وہ اچانک رات کی تاریکی میں اپنا سب کچھ جالندھر کی ایک بدنصیب بستی میں چھوڑ
چھاڑ کے نکل کھڑے ہوئے، اکرم، اس کی بیوی، اس کا بیٹا اور سعادت! یہ چار جانیں موت کے سمندر میں سے تیرتی ہوئی جالندھر
کے کیمپ کی طرف لپک رہی تھیں۔ وہ دم سادھے جا رہے تھے کہ باجرے کی فصل میں سرسراہٹ ہوئی اور کلیجے دھڑ دھڑ کرنے
لگے! نگاہیں کبھی ادھر گھومتیں، کبھی اُدھر، اور تاریکی کو چیر چیر کر خطرے کو دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اور اچانک پیچھے سے تین سکھ کرپانیں
لئے لپکتے نظر آئے! اکرم نے "یا اللہ" کہہ کر بیٹے کی طرف دیکھا اور بیٹا بڑھتا ہوا سکھوں سے گتھ گیا۔ پہلے ہی ہلے میں اس نے ایک سکھ

سے کرپان چھین لی اور وار کھانے کے ساتھ ساتھ وار کرنے لگا! اُس نے چلا کر کہا، ابا لے جائیے، سعادت کو جلد لے جائیے، بھاگئے، میں ان کے لئے کافی ہوں!

اکرم نے بیٹے کے لئے دعا کی اور تینوں بھاگ کھڑے ہوئے، دھڑکتے ہوئے دلوں، پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ کبھی پیچھے دیکھتے، کبھی آگے دیکھتے، وہ بڑھتے چلے گئے۔۔ کبھی اکرم ٹھوکر کھا کے گرتا، کبھی اس کی بیوی گرتی اور کبھی سعادت، چوٹیں آتیں،... بدن چھل چھل جاتا، خون بہنے لگتا، مگر کسی کو کچھ پتہ نہ تھا کہ اس کے بدن پر کیا گذر رہی ہے!

اکرم کی بیوی اور سعادت دونوں کی آس پیچھے کی طرف لگی رہی کہ اسلم ابھی دوڑتا ہوا آ پہنچے گا، مگر اکرم اس سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو ہو کے چلا تھا!

اکرم نے آدھ گھنٹے تک دشمن کو مصروف رکھا۔ نہتے سکھ نے اسے پیچھے سے پکڑ رکھا تھا اور وہ اس کے فلادے میں ہونے کے باوجود شیر کی طرح دندنا کر دو مسلح سکھوں پر جھپٹ رہا تھا۔ وہ جب جنکارتا تو دونوں سکھ پیچھے ہٹ جاتے، پھر بڑھتے، پھر ہٹ جاتے۔ اسی اثنا میں اس نے موقع پا کر کرپان کا ایک وار پیچھے کی طرف جو کیا تو وار کاری پڑا۔ کرپان پہلو میں اتری تھی، سکھ کی گرفت ڈھیلی ہوئی۔ لیکن ٹھیک اسی لمحے سامنے سے ایک کرپان اس کے اپنے پیٹ میں پیوست ہو گئی۔ پھر بھی وہ لڑتا رہا، اور خون تھا کہ اس کے ایک ایک حصے سے بہہ رہا تھا۔ یہاں تک وہ گر پڑا۔ اب وہ دو خونامیوں کے قبضے میں اس طرح بے بس پڑا تھا جیسے وہ قصابوں کے قبضے میں آئی ہوئی ایک بکری ہو! —— اور بکری ذبح ہو گئی!

ادھر اکرم اس کی بیوی اور اس کی بیٹی کیمپ میں داخل ہو رہے تھے!

پاکستان میں آنے کے بعد اکرم کی زندگی کا روشن رخ ہمیشہ کے لئے اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا، اور تاریک رخ مستقل طور پر نگاہوں کے سامنے تھا۔ سرحد کے اس پار وہ جائداد والا تھا، یہاں وہ کنگالوں میں شامل ہو گیا۔ وہاں دوسرے اس کے لئے محنت کرتے تھے اور یہاں وہ ایک اسکول میں دوسروں کے لئے محنت کر کے تین جانوں کو پال رہا تھا۔ وہاں اس کے بڑھاپے کے لئے اسلم ایک مضبوط سہارے کی لاٹھی تھا، یہاں اس کی جھکتی ہوئی کمر لاٹھی کے سہارے سے محروم ہو گئی تھی۔ وہاں اس کی برادری تھی، لیکن یہاں آ کر آہستہ آہستہ برادری چھٹ گئی اور اکرم کا گھر ایک اکلوتا گھر رہ گیا۔ لیکن اس نے کبھی رنج نہیں کیا، کبھی ٹھنڈی سانس نہیں بھری —— کیونکہ وہ سب کچھ دے کر اپنی آن بچا لایا تھا، وہ خدا اور اس کے دین اور اس کے نام لیواؤں کی قوم کی ایک امانت کو صحیح سلامت لے آیا تھا!

لیکن سعادت نفیری کی دوربین کی زد پر آ گئی تھی! نفیری نے دیکھا کہ یہ گھر ایک بوڑھے مہاجر کا گھر ہے، اس کی کوئی برادری نہیں ہے، اس کے پاس روپے کی طاقت نہیں ہے، سعادت کا کوئی نوجوان بھائی نہیں ہے، تو اس کی دوربین اس گھر پر فوکس ہو کے رہ گئی۔ نفیری جیسے چوبیس گھنٹے کوٹھے پر رہتا اور جہاں سعادت بیت الخلاء جانے کے لئے چھت پر آتی، ایک دم آئینے کے عکس سے اس پر فائرنگ ہو جاتی!

نفیری کی مشق برابر بڑھ رہی تھی، وہ دوستوں کے ساتھ سینما جاتا تو وہاں بھی یہ لوگ عورتوں کو تاکتے، کبھی سیٹی بجا دی، کبھی فقرہ کس دیا، کبھی کوئی شعر کانوں پر دے مارا، کبھی بھیڑ بھڑکے میں کسی لڑکی کے چٹکی لے لی، کبھی ہال کے اندر دنگا مچا دیا، کبھی زنانہ درجے میں کاغذ کی گولیاں بنا بنا کے پھینکتے۔ پارٹی شالامار اور شاہدرے جاتی تو آوارہ لڑکیوں سے چھیڑ خانی ضرور ہوتی۔ ایک دن ایک تانگے میں چند لڑکیاں بیٹھی جا رہی تھیں تو نفیری اور اس کی پارٹی نے تانگا گھیر لیا اور لڑکیوں سے خوب خوب چھیڑ کی۔ ان کو دعوت دی گئی کہ

آیئے ہم آپ کو آئس کریم کی دعوت دیتے ہیں، اچھا آج نہیں تو پھر کب ملے گا۔

اور یہ ساری مہارتِ فن اب سعادت پر آزمائی جا رہی تھی غلیل میں باندھ کے رقعے پھینکے جاتے، مکان کے سامنے وگرد وگرد رہتی، وہ نکلتی تو پُراسرار طریق سے تعاقب کیا جاتا۔ اسکول سے چھٹی ہوتی تو نیفری چھیڑ چھاڑ کے لئے گیٹ پر موجود رہتا۔ غرض سعادت کے لئے نیفری ایک گردابِ بلا بن گیا!

مگر سعادت ایک شریف باپ کی بیٹی، ایک غیور مرحوم بھائی کی بہن اور ایک دیندار کی بیٹی تھی۔ وہ فطرۃً عفت مآب تھی۔ وہ گندگی کے ان ریلوں کو روکتی رہی اور اُس نے دل کے دروازے کبھی کسی ناپاک نگاہ کے لئے نہیں کھولے تھے۔ نیفری اس پر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس نے دوستوں سے مل کر منصوبہ بنایا کہ سعادت کے ساتھ کچھ زبردستی ہی کرنی پڑے گی۔ ورنہ از خود تو پُراسرار کوٹھڑی تک کبھی نہ آسکے گی۔

وہ ایک صبح کو اپنا منصوبہ لئے ہوئے اٹھا، دو تین ساتھیوں کو جمع کیا، اور مخبری کا نظام قائم کر کے گھات لگا کے بیٹھ رہا! کوئی آٹھ بجے کا وقت ہوگا۔ بازار کھل رہا تھا۔ کچھ دکانیں کھل چکی تھیں، کچھ ابھی بند پڑی تھیں۔ قلعی والے "بھانڈے قلعی کرا لو" کی آوازیں لگا رہے تھے، پھیری لگا کر سبزی ترکاری بیچنے والے "تازی سبزی، تازی سبزی" کا شور کر رہے تھے —— کہ سعادت کتابیں بغل میں لئے گھر سے نکلی!

معمول کے مطابق وہ چار بجے اٹھی، ضروریات سے فارغ ہو کر اس نے بال سنوارے، دھلے ہوئے کپڑے پہنے، نماز ادا کی، قرآن پڑھا، باسی روٹی چائے کے ساتھ کھائی اور کتابیں ہاتھ میں لے، برقعہ اوڑھ کر مدرسے روانہ ہو گئی!

رات کو اس نے حساب کے سوال بڑی دیر تک حل کئے، انگریزی ترجمہ کی مشق کی، اور فقرے یاد کرتے کرتے سو گئی۔ صبح تک تو رات کو یاد کئے ہوئے فقرے ذہن میں ابھر رہے تھے، وہ اپنے حافظے کا جائزہ لیتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ اس کی جیب میں کشیدہ کا وہ نمونہ بھی تھا جو اس نے خاص محنت سے تیار کیا تھا اور آج وہ یہ بھروسے کے چلی تھی کہ کشیدہ کے میدان میں اپنی واحد حریف کمال بانو کو وہ آج پچھاڑ دے گی۔ بوٹی بڑی نکھر کر آئی تھی اور کوئی ٹانکا ایسا نہ تھا جو اپنی جگہ پر ٹھیک بیٹھ نہ گیا ہو! رنگ کا انتخاب بجائے خود بہترین تھا۔

وہ اپنے خیالوں میں جا رہی تھی! —— سامنے بائیں طرف سے بازار میں ایک گلی آکر ملتی تھی اور یہ گلی سیدھی نیفری کے گھر کو جاتی تھی۔ اس کے جوڑ پر ایک کھمبا تھا۔ کھمبے سے ... کوئی سات گز آگے میونسپلٹی کا نلکا تھا۔ نلکے پر ایک بہشتی مشک بھرنے آ رہا تھا۔ دائیں طرف ایک بھنگی بدررو میں سے کوڑا نکال نکال کر ایک جگہ ڈال رہا تھا۔ تاکہ پانی کا بہاؤ ٹھیک رہے! ایک کتیا اس کوڑے کو سونگھ سونگھ کر اپنے لئے رزق تلاش کر رہی تھی۔

کھمبے کے ساتھ ہی چوہدری احسان جوتیوں اور کھال چمڑے کی دکان کھول کر فرش درست کر رہا تھا۔ اس کے ورے دودھ چائے کی دکان پر لوگ ناشتہ کر رہے تھے۔ سامنے میاں سراج الدین کی بزازی کی دکان کھلی ہوئی تھی۔ ذرا ہٹ کر شیخ امام علی اور شیخ محمد آصف کی کتابوں کی دکانیں کھل رہی تھیں۔ یہ سب کچھ معمول کے مطابق تھا!

سعادت اپنے خیالوں میں گم قدم بڑھاتی جا رہی تھی۔ وہ کھمبے کے پاس پہنچی تھی کہ گلی سے نیفری بڑھا اور جیسے مٹھ بھیڑ ہو گئی نیفری نے حملہ کر دیا:۔

"کدھر تشریف لے چلے ہو جی! —— چال غضب دی ہے سرکار! —— پر اک گل تے سُن جاؤ!"

اس گندے معاشرے میں ایک نوجوان اور ایک شریف لڑکی کی بساط ہی کیا! اس کی آبرو کانچ کی ایک چوڑی ہوتی ہے۔

یہ چوڑی ایسی نازک ہوتی ہے کہ لفظوں کی چوٹ سے ٹوٹ جاتی ہے۔ یہ ٹوٹ جائے تو پھر جڑتی نہیں۔ جوڑنے کی کوشش کیجئے تو پھر اور ٹوٹتی ہے!

یہ چوڑی تو تبھی سلامت رہ سکتی ہے کہ پورا ماحول اس کا رکھوالا ہو —— اور ماحول اگر زندہ ہوتا تو نفیری کی جرأت پر کپکپا اٹھتا، وہ مٹھیاں بھینچ کے اٹھ کھڑا ہوتا، وہ نفیری پر ٹوٹ پڑتا، اس کی آنکھیں نکال لیتا، اس کی زبان گدی سے کھینچ لیتا، اس کے ہاتھ توڑ ڈالتا، اس کے پاؤں کاٹ دیتا۔

مگر ماحول الٹا دبک گیا تھا، اُس نے جیسے سانس روک لی ہو، اس نے جیسے آنکھیں بند کرلی ہوں، اُس نے جیسے کان لپیٹ لئے ہوں! —— نہیں نہیں! ماحول پھٹے دیدوں دیکھ رہا تھا! کھلے کانوں سے سُن رہا تھا! وہ بالکل سُن تھا۔ اس پر فالج گر گیا تھا! سقہ مشک کا منہ تھلکے سے باندھے کھڑا تھا —— بھنگی نے کوڑا ڈالتے ڈالتے ادھر پلٹ دیکھ لیا اور پھر کام میں لگ گیا —— کتیا بدستور کوڑا سونگھ رہی تھی —— چوہدری احسان اب گدی پر بیٹھ گیا تھا۔ میاں سراج الدین اپنی دکان کے چبوترے پر تنا کھڑا تھا —— شیخ امام علی اور شیخ محمد آصف نے کچھ سنا ہی نہیں! —— اور کھمبا بھی جہاں کا تہاں کھڑا تھا۔

ان میں سے کوئی نہیں بولا!

سعادت کی نگاہوں میں اسلم کا سراپا پھر گیا، اُس نے محسوس کیا کہ جیسے وہ ایک سکھ کی زد پر آگئی ہے، اور کرپان سے اس نے حملہ کر دیا ہے، اور اب اسلم یکایک کہیں سے آ کودے گا اور اس مسلمان سکھ سے گتھ جائے گا اور پھر چلا کر کہے گا "سعادت بھاگ جا، جلدی بھاگ! میں اس سکھ کے لئے کافی ہوں!" مگر اسلم ایک ہی تھا جو ایک بار کام آچکا تھا۔ اب وہ کہاں!

ماحول نے مدافعت کی ساری ذمہ داری سعادت کے اپنے کندھوں پر ڈال دی تھی! وہ کمزور تھی مگر مظلومیت کی حس نے اس میں ایک جسارت پیدا کر دی، اس کا خون کھول گیا، اس کے ذہن کی چولیں ہل گئیں، اس کے ہونٹ کپکپا گئے —— پورا ماحول اسے کہ رہا تھا کہ "دیکھ سعادت! بولنا نہیں!" اور کھمبا بھی چیخ رہا تھا کہ "پیاری سعادت! زبان بتیس دانتوں میں دبا کے رکھ! شریف بیٹیوں کی زبان بولنے کے لئے نہیں ہوتی" —— مگر سعادت کے کانوں میں ایسی دھائیں دھائیں ہو رہی تھیں کہ وہ کچھ نہ سُن سکی! اور بے اختیار اس کی زبان سے نکل گیا:۔

"جا گنڈے! اپنی ماں بہین نوں گل سُنا! کمینے، بدمعاش!"

یہ آخری ضرب تھی جو کوئی سعادت لگا سکتی تھی اور یہ وہ گہرے سے گہرا گھاؤ تھا جو ایک شریف لڑکی کسی آدمی کے بچے کو دے سکتی تھی۔ مگر آدمی کا بچہ جب بھیڑیا بن جائے تو ——!

پاس کے کھمبے نے سعادت کے اس احتجاجی جملے پر ایک جھرجھری لی!

اور بھیڑیا جھپٹ پڑا، گالیاں بکتے ہوئے اُس نے سعادت کا برقعہ نوچ کر پرے پھینک دیا —— اور ایک معصوم چہرہ، شرم اور غصے اور نفرت کی سرخی میں رنگا ہوا ماحول سے فریاد کرتا رہ گیا! سعادت نے محسوس کیا جیسے اُس کے کپڑے سر بازار اتار ڈالے گئے ہیں، جیسے اس کی امی کا چونڈا اکھیڑ دیا گیا ہے، جیسے اس کی باپ کی داڑھی نوچ ڈالی گئی ہے! —— زمین و آسمان اس کے سامنے گھوم رہے تھے، اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھی، وہ سنبھل نہ پائی تھی کہ ایک گھونسہ اس کی گردن پر پڑا اور وہ جھنا گئی! کھمبے نے کپکپا کر کہا "دیکھا سعادت! میں نہ کہتا تھا کہ نہ بولیو!"

سعادت سمجھی کہ اب تو پورا ماحول نفیری پر ٹوٹ پڑے گا، اب کوئی پتھر بھی اپنی جگہ پر ٹکا نہیں رہ سکتا —— لیکن سقہ اطمینان

سے اپنی آدھ بھری مشک کے پاس کھڑا یہ رومانس دیکھ رہا تھا! بھنگی کوڑے کا ڈھیر لگائے اور بیلچے کے بانس سے ٹیک لگائے ٹک ٹک تماشا کر رہا تھا! کتیا بھی ایک ہڈی چچوڑتی ہوئی گھور رہی تھی، چوہدری احسان بھی گدّی پر بیٹھا لطف اندوز ہو رہا تھا، میاں سراج الدین بھی دکان کے کنارے پر مجسمے کی طرح کھڑا تھا، شیخ امام علی اور شیخ محمد آصف بھی دور ہی دور سے جھانک رہے تھے! ——— اور چائے کی دکان پر لوگ مزے سے چائے پی رہے تھے!

مانا کہ یہ لوگ بڑے شریف لوگ تھے ——— چوہدری احسان یتیم خانے میں ہر ماہ باقاعدگی سے چندہ دیتا ہے! میاں سراج الدین ہر سال مسجد کی سفیدی اپنی گرہ سے کراتا ہے، شیخ محمد آصف اسلامی لٹریچر کی علمی خدمت کر رہا ہے اور شیخ امام علی نے پوری عمر قرآن کی خدمت میں گذار دی ہے۔ مگر وہ تو یہاں دکانداری کرنے آئے تھے، پرائے پھٹے میں ٹانگ اڑانے کے لئے نہیں!

اور سعادت نے بے بس ہو کر اپنی کتابیں نفیری کے منہ پر کھینچ ماریں، بلکہ درحقیقت اس نے سماج کے منہ پر ضرب لگائی تھی ——— اور وہ اگر ایسا نہ کرتی تو شاید اس کا بدن پھٹ کر ہوا میں تحلیل ہو جاتا!

نفیری پوری طرح مشتعل ہو گیا تھا، اُس نے سعادت کو اٹھا کر ایک دکان کے پھیلے ہوئے تختے کے اوپر پٹخ دیا اور لٹا کر اس کے سینے، اس کی گردن اور اس کے پہلوؤں میں پورے زور سے گھونسے مارے! آخر جوان خون تھا، غیرت تھی، جذبہ تھا، خاندانی عزت کا خیال تھا، شجاعت کے ارمان تھے، اس کے سوا وہ اور کیا کرتا!

وہ سعادت کو بے حال کر کے ہٹا تو سعادت پھر اٹھی اور اس کے پیچھے بھاگی، اُس نے اپنا جیومیٹری بکس اٹھا کر پیچھے سے مارا۔ نفیری پھر پلٹا اور سعادت کے گال پر اس نے تھپڑ مارے وہ پھر چلا تو سعادت پھر لپکی، مگر لڑکھڑا کر گری اور بے ہوش ہو گئی!

یہ حادثہ ایک لڑکی کے ساتھ پیش نہیں آیا تھا، یہ واردات ایک سعادت کے ساتھ نہیں ہوئی تھی، درحقیقت آج بھرے بازار میں انسانیت کے لتّے سیئے گئے تھے، شرافت کا گریبان پھاڑا گیا تھا، عصمت سے کھیلا گیا تھا، نعرۂ تکبیر کے ساتھ غنڈہ گردی کی گئی تھی۔ آج اسلام زندہ باد کا منہ نوچا گیا تھا، پاکستانی پرچم کے چاند تارے کو مجروح کیا گیا تھا۔ قائدِ اعظم کا مقبرہ اکھیڑ ڈالا گیا تھا!

بہرحال میدان نفیری کے ہاتھ رہا!

اب میاں سراج کے مجسمے میں حرکت آ گئی تھی، اب چوہدری احسان کا لاشہ بھی جنبش کرنے لگا تھا، اب شیخ امام علی اور شیخ محمد آصف نام کی چٹانیں بھی جی اٹھی تھیں، اب کئی کھمبے سانس لینے لگے تھے۔ سعادت کو اٹھا کر دکان کے اندر لٹایا گیا اور پانی لا کر اس کے منہ سے لگایا گیا۔

سعادت کو اکرم اور اس کی امی سہارا دے کر گھر لائے۔ وہ ہوش میں آ چکی تھی، مگر وہ دیر تک نیم بے ہوشی کی حالت میں رہی۔

اسی نیم بے ہوشی میں اُس نے خواب کا سا سماں دیکھا کہ شہر کے شرفا جائے وقوعہ پر جمع ہو گئے ہیں پولیس پاکستان بھر کے تھانوں سے گروہ در گروہ اُمڈی چلی آ رہی ہے، وزیر اعظم پنجاب موٹر لئے آ گئے ہیں، اخبارات کے ایڈیٹر موجود ہیں، دین کے علما چلے آ رہے ہیں، کراچی سے گورنر جنرل اپنے ڈیکنگ میں سوار ہو کر روانہ ہو گئے ہیں اور ایک تہلکہ مچ گیا ہے! اس نے خواب میں دیکھا کہ نفیری ہتھکڑیوں میں جکڑا ہوا لایا گیا ہے، بازار کے بیچ بیچ میں عدالت لگ گئی ہے اور قائدِ اعظم خود مقدمہ سن رہے ہیں۔ وہ روتے ہوئے بیان دے رہی ہے، اس کے منہ سے بات نہیں نکل رہی، اور قائدِ اعظم اٹھ اٹھ کر اسے چمکار رہے ہیں۔ وزیر اعظم پنجاب اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہے ہیں، ——— اور پھر اس نے دیکھا کہ مقدمے کی کارروائی آناً فاناً مکمل ہو گئی ہے اور جج اٹھ کر فیصلہ سناتا ہے۔

اور پھر اس کے سامنے ٹکٹکی لگائی جاتی ہے اور پاکستان کے گورنر جنرل خود اپنے ہاتھ میں ایک تازیانہ لے کر نفیری کے پیٹھ پر ضرب

چپ ہی بھلی!

لگا رہے ہیں — ایک — دو — تین — دس، گیارہ، بیس — اور پھر وہ گن نہیں سکی۔ گورنر جنرل کا ہاتھ تھک جاتا ہے تو پھر کوڑا وزیر اعظم پنجاب کے ہاتھ میں نظر آتا ہے — پہلے نفیری کی آواز مدھم ہو جاتی ہے، پھر وہ بالکل چپ ہو جاتا ہے، صرف ہاتھ پاؤں جنبش کرتے رہتے ہیں، پھر یہ جنبش بھی ختم ہو جاتی ہے، اور نفیری دم توڑ دیتا ہے!

پھر نفیری کو ٹکٹکی پر سے کھولا جاتا ہے اور اس کی لاش ایک گاڑی پر ڈال کر شہر بھر میں گھمائی جاتی ہے۔ آگے آگے منادی لاؤڈ اسپیکر سے اعلان کرتا ہے کہ "یہ پاکستان ہے! یہ اسلامی ریاست ہے، اس میں غنڈہ گردی کرنے والوں کے لئے کوئی جگہ نہیں، غنڈوں کا حشر یہاں وہی ہوگا جو نفیری کا ہوا ہے"۔ اور پیچھے پیچھے گاڑی ہے اور اس کے جلو میں ایک بے پناہ ہجوم مارچ کر رہا ہے۔

مگر خواب ہی خواب میں سعادت نے دیکھا کہ منادی کی آواز رک گئی ہے، سارے کا سارا ہجوم زندہ انسانوں کے بجائے کچھ پتلیوں اور سل پتھروں میں بدل گیا ہے، اور تنہا ایک سعادت اپنی حالت پر برقرار رہ گئی ہے۔ وہ مبہوت ہو جاتی ہے، اور اچانک دیکھتی ہے، کہ نفیری کا لاشہ آنکھیں پھاڑے اور دندیاں نکالے اٹھ کھڑا ہوا ہے اور اس کی طرف لپکا چلا آ رہا ہے — وہ چیخنا چاہتی ہے تو آواز نہیں نکلتی، بھاگنا چاہتی ہے تو قدم حرکت نہیں کرتے — اور اس نے آنکھیں کھول دیں — "ابا! ابا!"

اس کی امی دوڑی دوڑی آئیں۔ "میری بچی! کیا ہے"۔

"ابا کہاں ہیں"؟

"وہ تو باہر بیٹھک میں ہیں!"

"باہر کیوں بیٹھے ہیں، ان کو باہر نہ جانے دو — باہر غنڈے ہیں!"

"بٹیا! محلے کے لوگ باہر آ رہے ہیں!"

"امی! کیا اس محلے کے لوگوں میں کوئی زندہ ہے بھی!"

"سعادت! یہ کیسی باتیں کر رہی ہو، ابھی تمہاری طبیعت سنبھلی نہیں شاید!"

"میں پوچھتی ہوں، باہر کون لوگ ہیں؟"

"بڑے بڑے چوہدری اور شیخ اور میاں آ رہے ہیں بچی!"

"غنڈے — بزدل غنڈے!"

جس معاملے میں انسانیت انصاف نہ کر سکی، وہ اب قانون کے سامنے پیش کر دیا گیا!

اکرم، اس کی بیوی اور سعادت تھانے کو چلے — جیسے آج وہ ایک مرتبہ پھر جالندھر کی ایک بستی سے کیمپ کی طرف جا رہے تھے! جیسے وہ ہندوستان سے پاکستان کی طرف مارچ کر رہے تھے!

سعادت اور اس کی امی گیٹ کے باہر ایک درخت کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئیں، اور اکرم کچھ جھجکتا ہوا اور فرطِ جذبات سے نڈھال اندر داخل ہوا۔ اور برآمدے میں بیٹھے ہوئے منشی کو سلام کر کے کھڑا ہو گیا۔ وہ اس انتظار میں تھا کہ منشی اب اس سے پوچھے گا کہ کہو تم کون ہو، تم کیسے آئے ہو؟ مگر وہ کھڑا رہا، کھڑا رہا۔ اور کھڑے کھڑے تھک گیا، لیکن اس سے منشی نے کچھ نہ پوچھا! آخر اس نے جی کڑا کر کے خود ہی عرض کی کہ جناب مجھے رپٹ لکھانی ہے .... میری لڑکی! بابا! ٹھہر، یہاں کوئی تمہارے باپ کے نوکر نہیں بیٹھے ہیں کہ جن کی تنخواہ ملتی ہو، چل راستہ ناپ! اور بابا مرجھا کر رہ گیا — آہ! نفیری ہر جگہ موجود تھا! لیکن اکرم اصل بات کو سمجھ گیا، اس نے پانچ روپے کا نوٹ گرہ سے نکالا اور آگے

بڑھ کر منشی جی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اب منشی ہمہ تن توجہ تھا۔ اس نے چوکیدار کو پکار کر بڑے میاں کے لئے جلد کرسی لاؤ۔ اب اکرم نے اپنے اندر پوری جرأت محسوس کی اور اپنا دکھڑا سنا دیا۔ منشی اسے اندر سب انسپکٹر صاحب کے سامنے لے گیا۔ یہ سب انسپکٹر بھی اگرچہ سب انسپکٹر ہی تھا لیکن جب اس نے پوری داستان سُنی تو اس کے ضمیر کے اندر جیسے شریفانہ جذبات جاگ اٹھے۔ اُس نے پوری ہمدردی سے رپورٹ درج کی اور حقیقی جذبے کے ساتھ تحقیقات کا ارادہ کیا۔ سعادت کو بھی بلایا گیا اور اس کا بیان بھی لیا گیا، پھر اس کی امّی کا، اور پھر اکرام کو گواہ لانے کے لئے بھیجا گیا۔

سعادت نے جن جن دکانداروں کے پتے دئے تھے، اکرم ان تک پہنچا۔ مگر اُن میں سے بعض تو وہ تھے جو نفیری کے برادری کے لوگ تھے اور بعض وہ جو ازلی ڈرپوک تھے۔ ان میں سے ایک ایک نے قسمیں کھائیں کہ وہ تو وقوعہ کے بعد دکان پر پہنچا تھا۔ —— وہ تو سارا دن آیا ہی نہیں تھا، وہ تو کچھ نہیں جانتا ہے۔ اور ایک آدھ نے صاف صاف کہا کہ میاں صاحب ہم جانتے تو ہیں مگر گواہی نہیں دیں گے!

اکرم بہت افسردہ خاطر ہو کر لوٹا —— بازار میں سے گذرتے ہوئے محسوس ہوا کہ کچھ ہاتھ اور کچھ آنکھیں اس کی طرف پر اسرار اشارے کرتے ہیں۔ ان اشاروں، اور سرگوشیوں کے کانٹوں میں سے وہ آنکھیں جھکائے گذر رہا تھا! چلتے چلتے ایک آواز اس کے کانوں میں پڑی:

"لڑکی کا بھی کوئی قصور تو ہوگا ہی، تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجا کرتی"۔

گویا جیسے کی گرم سلاخ تھی جو اکرم کے کانوں میں گھسیڑ دی گئی! وہ اور تیزی سے گھر کی طرف لپکنے لگا۔ پھر ایک جانے فاصلے سے اسے ایک اور آواز سنائی دی:۔

"پہلے یاری لگاتی ہیں، اور پھر کتا ہیں منہ پر مارتی ہیں"

جیسے پیچھے سے کسی نے لٹھ کھینچ مارا ہو، جیسے نفیری نے اکرم کی گردن پر گھونسہ مار دیا ہو، وہ بچارا اور تیزی سے آگے نکل گیا اور دل ہی دل میں افسوس کر رہا تھا کہ نفیری کے فقرے پر اگر سعادت چپ رہ جاتی تو یہ سب نہ ہوا ہوتا! اکرم کے دل کی بات جیسے بے تار برقی کے ذریعے جائے وقوعہ پر کھڑے کھمبے نے سُن لی، اور اُس نے کہا، "میاں صاحب! میں نے بھی سعادت کو یہی مشورہ دیا تھا کہ وہ چپ رہے، مگر وہ نہ مانی! —— بہتر یہ ہے کہ آپ بھی چپ رہیئے!" لیکن اکرم یہ نہ سُن سکا!

سعادت کو اس کی امّی نے بتایا کہ کوئی گواہی دینے کو تیار ہی نہیں۔ سعادت یہ سن کر سکتے میں آگئی۔ اور اسے محسوس ہوا کہ جو کچھ ہوا غلط ہوا ہے۔ آخر پتھر اور کھمبے اور لاشے اور کھمبے کیسے گواہی دیں گے!

ساتھ ہی ساتھ اسے ایک اور خیال آیا، اور اس کے ذہن پر چھا گیا۔ اور وہ دل ہی دل میں امّی سے کہنے لگی، امی گواہیاں دینے والوں کی کمی نہیں! وہاں کی اینٹ اینٹ گواہی دے گی۔ نہ دے گی تو پھٹ پڑے گی! بدررو کا بہتا ہوا گند، پانی بول اٹھے گا، نہ بولے گا تو اپنی جگہ پر تنخ ہو کر رہ جائیگا، اس کا بہاؤ رک جائے گا اور تعفن پھیلے گا! امی تم نہیں جانتی، شیخ امام علی کی دکان میں جو قرآن شریف بھرے پڑے ہیں وہ اٹھ اٹھ کر گواہی دیں گے اور نہ دیں گے تو ان کے صفحوں پر سے اللہ کا کلام اٹھ جائے گا اور وہ کورے کے کورے رہ جائیں گے! امّی شیخ آصف کا شائع کردہ اسلامی لٹریچر چیخ چیخ کر میری مظلومی کا بیان دے گا! ہاں ہاں یقین جانو پاس کی مسجد بول اٹھے گی، اس کی چٹائیاں بولیں گی، اس کے لوٹے بولیں گے، اس کا منبر بولے گا، نہیں تو پھر اس کے مینار گر جائیں گے، وہ شہید ہو جائے گی! —— امّی وہاں ایک کھمبا میرے پاس کھڑا سارے حادثے کو غور سے دیکھتا رہا ہے کیا وہ بھی اتنا بے غیرت ہوگا کہ حق کی حمایت اور ظلم کی مخالفت میں اس کا ذرہ ذرہ نہ چلا اٹھے؟ زمین و آسماں گواہ ہیں، بھرا بازار گواہ ہے، دکان کا وہ تختہ گواہ ہے کہ جس پر مجھے لٹایا گیا تھا!

چپ ہی بھلی!

آدمی زبان اور ہونٹ پاکر اگر اتنا طوطا چشم ہو گیا ہے؟ اگر وہ اتنا اکڑ گیا ہے، اگر اس کا خون اتنا سفید ہو گیا ہے کہ جس زبان اور جن ہونٹوں کو جا و بے جا لترا لترا استعمال کرتا رہتا ہے، ان کو ٹھیک وہیں استعمال کرنے سے انکار کرتا ہے جہاں استعمال کرنا چاہئے تو ایسے گونگے آدمی سے گواہی کی بھیک مانگنے کی ضرورت نہیں ہے —— آدمی نہ بولے گا تو وہ پوری فضا بولے گی جو زبان اور ہونٹ نہیں رکھتی مگر سچ سچ سب کچھ کہہ دیتی ہے!

لیکن گواہ پیدا ہو گئے تھے۔ خود بخود چند آدمیوں نے رضاکارانہ طور پر تھانے میں جاکر اپنے بیانات قلمبند کرا دئے تھے۔

اکرم، اس کی بیوی اور اس کی بیٹی نے سمجھا کہ خیر ابھی ماحول زندہ ہے!

اور نفیری گرفتار ہو چکا تھا۔ تھانے میں آج اس کی پہلی رات تھی۔

اس کے سفارشی یکے بعد دیگرے تھانے پہنچ رہے تھے۔ روپیہ اسے چھڑا لانے کے لئے دوڑ رہا تھا، برادری تگ و دو کر رہی تھی۔ مگر سب انسپکٹر کے دل میں کچھ ایسے جذبات جاگ اٹھے تھے کہ اس نے ہر ایک کو صاف صاف جواب دے دیا۔

رات کے دس بجے ہوں گے کہ سب انسپکٹر کے نام ایک بڑے افسر کا فون آیا کہ نفیری ہمارا آدمی ہے، اسے چھوڑ دیا جائے۔ مگر سب انسپکٹر نے اپنے آپ کو قانون سے مجبور بتایا۔ بارہ بجے پھر کال ہوئی۔ یہ ڈی سی کے دفتر کا فون تھا۔ نفیری کو رہا کردو۔ سب انسپکٹر نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا، جب اصرار کیا گیا تو اس نے کہا کہ اچھا ملزم کو آپ کی تحویل میں بھیجتا ہوں، آپ خود جو چاہیں کریں، اور ملزم راتوں رات منتقل کر دیا گیا، ڈی سی کے دفتر میں اس کی پیشی ہوئی اور راتوں رات رہا ہو کر گھر آگیا۔

میاں اکرم صبح دودھ لینے نکلے تو دیکھا کہ نفیری سامنے چلا جا رہا ہے! —— بے بسی!

وہ تھانے پہنچے تو سب انسپکٹر نے ان کو سارا ماجرا بتایا۔ اس نے پولیس کی بے بسی کا سارا حال کھول کر سامنے رکھ دیا کہ ہمارے اوپر کتنے ہی نفیری اور نفیریوں کے سرپرست بیٹھے ہیں جو ہمارے ہاتھ باندھ دیتے ہیں۔

پھر سب انسپکٹر نے ان کو یہ بھی بتایا کہ مقدمے کو بگاڑنے کے لئے نفیری کے حمایتی گواہ بن بن کر آ رہے ہیں، اور اپنے اپنے بیان درج کرا رہے ہیں۔ ان لوگوں نے واقعہ کی شکل یہ بنائی ہے کہ لڑکی کے ساتھ نفیری کے پہلے سے کچھ تعلقات تھے، وہ اس کے گھر آتی جاتی تھی، اور اب وہ چونکہ اس کے ساتھ اغوا ہو جانے کے لئے تقاضا کر رہی تھی اور وہ نہیں مان رہا تھا، اس لئے لڑکی نے اسے گالی دی اور سر بازار اس پر جھپٹ پڑی

سب انسپکٹر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اس نے کہا، آپ میرے باپ کی جگہ ہیں، اور سعادت کو میں اسی نگاہ سے دیکھتا ہوں جس سے اپنی بہن فیروزہ کو دیکھتا ہوں، مگر اپنی ساری ہمدردی کے باوجود میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ چپ ہو جائیں، اور صبر کر کے بیٹھ رہیں۔ جتنا آگے چلیں گے، اتنا ہی زیادہ گندگی میں دھنستے چلے جائیں گے اور نکلنے کی سبیل کوئی بھی نہ رہے گی!

اور اکرم نے معاملہ ختم کر دیا۔

گھر آکر اکرم نے بجھے ہوئے چہرے کے ساتھ جب یہ خبر سنائی کہ میں نے جھگڑے سے دست برداری کر لی ہے تو سعادت یہ کہے بغیر نہ رہ سکی، "ابا! یہ کیا کر دیا آپ نے؟" اکرم نے پیار سے سمجھایا کہ بیٹی کچھ بنتا بناتا نہیں، اس طرح ہم اور خراب ہوں گے" "مگر پھر کیا جو کچھ بھی ہو جائے ہم چپ ہو رہیں گے ابا؟"

"ہاں بیٹی! چپ ہی بھلی!"

یہ کہہ کر اکرم گر پڑا اور اس کا دل آخری بار دھڑک کر ہمیشہ کے لئے رک گیا! اب اس نے چپ سادھ لی تھی!

زمانہ نازک ہے

نعیم صدیقی

ہر اک نگہ میں ہے داؤ! زمانہ نازک ہے
ہر ایک ضمیر میں گھاؤ! زمانہ نازک ہے

نظر نظر ہے شکاری، مری رفیقِ حیات!
چھپاؤ چہرہ چھپاؤ! زمانہ نازک ہے

تقاضے سارے مسلّم ضمیر و ایماں کے
مگر زباں نہ ہلاؤ! زمانہ نازک ہے

جو حرف دل میں ہے، ہو گرچہ عین الہامی
پر اس کو لب پہ نہ لاؤ! زمانہ نازک ہے

قصیدہ خواں رہو گلچیں کی بلبلانِ چمن!
خودی کے گیت نہ گاؤ! زمانہ نازک ہے

یہ با اصول سپنے کا جنون رہنے دو
کسی طرح سے نبھاؤ! زمانہ نازک ہے

اڑاؤ ٹانگ نہ بڑھ کر پرائے پھڈے میں
بس اپنی آن بچاؤ! زمانہ نازک ہے

کرو کنارہ کہ دریا ہے سخت طوفانی
نہ لاگ ہو، نہ لگاؤ! زمانہ نازک ہے.

خدا تو خیر خدا ہے! صنم بھی کیا کم ہے
ادھر بھی ربط بڑھاؤ! زمانہ نازک ہے

متاعِ زیست کی لٹ مچی ہے منڈی میں
نہ ماپ تول، نہ بھاؤ! زمانہ نازک ہے!

اَن کہی

نعیم صدیقی

لفظ ہونٹوں کے اندر سِلے رہ گئے — دل میں احساس کچھ کھولتے رہ گئے
کاروانِ بہاراں تو جا بھی چُکا — کتنے غنچے ابھی بِن کِھلے رہ گئے
ہم نے وہ بات کہہ دی جو تھی اَن کہی — کِتنے ہی منہ کُھلے کے کُھلے رہ گئے
زندگی کا مسافر بھٹک بھی گیا — چاند تارے تو بس دیکھتے رہ گئے
جیسے آنسو ہو پلکوں پہ اوقتِ وِدَاع — ایسے دہلیز پر وہ کھڑے رہ گئے
آپ کی اِس نقابِ ریا کے سبب — شرم سے یار ہم سب گڑے رہ گئے
پہلے خود ہی لُٹایا تھا دل کا سکوں — عمر بھر پھر اسے ڈھونڈتے رہ گئے
معرکوں کا بلاوا ہوا تھا، مگر — لوگ سجدوں کے اندر پڑے رہ گئے
عشق ایمان کی بات کہہ کر رہا — اور خنجر فضا میں تنے رہ گئے
آپ کر بھی گئے گُل فشانی تو کیا — دل میں کانٹے ہزاروں چُبھے رہ گئے
میں نے جب جھُوم کر لاالہ کہہ دیا — اُن کو دیکھا کہ بس بُت بنے رہ گئے

دیس بھر میں چراغاں ہوئے یار ہا
کیوں دلوں کے دِیئے ہی بُجھے رہ گئے

اسلامی نظام میں فکر و ادب کی بنیادیں

محمد عزیز

کائنات کی ساری اشیاء کی تخلیق ان کی حرکت اور نظم میں جو باقاعدگی اور جمال ہے وہ بہرحال مخفی نہیں۔ چنانچہ اس نے
انگریزی ادب میں ایک خاص دور فطرت پسندی یا (Naturalism) کا قائم کیا۔ اور ہر دور ہر زمانہ ہر ملک اور ہر خطۂ زمین
میں کچھ نہ کچھ لوگ ایسے ہوتے رہے ہیں جو فطرت کی رنگینیوں اور جمال سے متاثر ہوتے رہے اور پھر اس رنگینی اور جمال کی جھلک ان
کی اپنی زندگی میں بھی آتی رہی۔ چونکہ زندگی میں معاملات اور گفتگو دو اہم چیزیں ہیں اس لئے اس رنگینی نظم و جمال کا اثر ان کے
کلام پر بھی پڑا۔ اب فطرت کے آثار و مظاہر میں مختلف پہلوؤں سے غور و خوض اور فکر ممکن ہے۔ اور سچ مچ مختلف پہلوؤں سے
ہی انہوں نے کائنات کو دیکھا بھی جس کا نتیجہ لازماً یہ ہوا کہ ان کی زندگی کے اہم حصوں یعنی معاملات (Behaviour
رویوں (Attitude) اور کلام (Speech) کو مختلف جھکولے آتے رہے۔ تاہم لوگوں کی گفتگو کے انداز اور
طرز کلام مختلف رہے۔ ہر شخص دوسرے سے جدا اور ہر ایک کی فکر دوسرے سے مختلف۔ خود انسان کا ذہن مختلف سمتوں
میں کام کرتا رہا۔ یہ بحث بہت ہی پرانی اور طویل ہے کہ مادہ ذہن کو متاثر کرتا ہے یا ذہنی کیفیت انسان کے مادی حالات
کو ڈھالتی ہے۔ پھر یہ کہ انسان نے فطرت کے مظاہر کو دیکھ کر اس سے نتیجہ نکالا کہ کچھ فوق البشری قوتیں بھی دنیا میں کام کر رہی
ہیں۔ اور اس سے "خدا" اور "مذہب" کے تصورات کی ابتدا ہوئی۔ یا یہ کہ انسان نے خود اپنے ذہن اور ہیولیٰ سے "خدا" اور "مذہب"
کا تصور فرض کر کے اس کے مطابق مظاہر کائنات اور آثار فطرت کی توجیہ کر ڈالی پھر یہ کہ انسان کی ابتدا بحیثیت انسان ہی کے
ہوئی یا یہ کہ وہ خود بخود گذشتہ شکلوں سے ارتقاء کر کے آگیا۔
قطع نظر اس سے خود سائنس کسی نتیجہ پر حرف آخر کی حیثیت سے نہیں پہنچ سکی ہے۔ اور نو بہ نو تحقیقات و انکشافات نے
خود اس کے پیش کئے ہوئے نتائج و اصول میں صد گونہ اختلاف پیدا کر رکھا ہے۔ ہم اس موقع پر مختصراً عرض کریں گے کہ ان مباحث
کا اسلامی جواب کیا ہے۔ کیونکہ اس پر اس سوال کا جواب منحصر ہے کہ اسلامی نظام میں فکر و ادب کی بنیادیں کیا ہوں گی۔
کائنات اور انسان کے متعلق اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ کائنات میں جتنی بھی اشیاء ہیں سب کو ایک مقتدر علیم و حکیم ہستی نے پیدا
کیا ہے۔ اور وہ سب کا تنہا جائز اور بلا شرکت غیرے مالک اور حاکم ہے۔ اس نے اس کائنات کو پیدا کیا ہے۔ وہی اس
ساری مشینری کو حرکت دے رہا ہے۔ اور اس کے بنائے ہوئے قوانین فطرت (Laws of Nature) کے
مطابق کائنات کے سارے شعبے کام کر رہے ہیں۔ اور اسی کے قانون کے مطابق انسان کی زندگی کے اختیاری شعبے بھی چلنے
چاہئیں۔ رہا انسان کا مقام تو اس سے ہمیں کوئی بحث نہیں کہ انسان کی آفرینش سے قبل اس کائنات میں کیا تھا۔ ارتقاء
کس شکل میں ہوا وغیرہ وغیرہ۔ اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ انسان بہرحال انسان ہی بنا کر پیدا کیا گیا اور انسان پیدا اس لئے ہوا ہے
کہ وہ اس کائنات کے ان شعبوں پر جو اختیاری ہیں وہ قوانین فطرت اور وہ دستور حیات نافذ کرے جو اس حکیم و علیم ہستی نے

اسلامی نظام میں شعر و ادب کی بنیادیں

پہلے انسان کو ہی دنیا شروع کیا تھا۔ پہلا انسان اس برگزیدہ حیثیت سے ہی پیدا کیا گیا۔ سخت ظلم ہوتا کہ کسی کارکن کو ایک نئی فیلڈ

بھیجتے وقت اس کے پاس قواعد و ضوابط کی فہرست نہ موجود ہو۔ انسان کی اس حیثیت کو اور اس کے اس مقصد حیات کو اسلام

نے خلافۃ اللہ فی الارض (Vicegerecy of God on Eearth) سے تعبیر کیا ہے۔

ہر انسان جو پیدا ہوا ہے وہ اپنے ساتھ فکری و ذہنی صلاحیتیں لے کر پیدا ہوا ہے۔ قوتِ ارادہ اور حسِ امتیاز اسے

ودیعت کی گئی ہیں۔ کہ ان کی مدد سے وہ خود پوری آزادی سے فیصلہ کرلے کہ وہ کائنات کے مظاہر اور فطرت آثار کو دیکھ

اور اس ہستی کے ان برگزیدہ اشخاص کے پیش کردہ نظام حیات کے باوجود اپنی اصلی حیثیت یعنی خلافت فی الارض پر آتا ہے

اپنی من مانی خدائی قائم کرتا ہے یا یہ کہ رسم و رواج اجداد پرستی یا زمانہ کی لہر کی غلامی میں اپنا سرِ اطاعت خم کر دیتا ہے۔ ساتھ

انہی، برگزیدہ اشخاص کے ذریعہ انسان کو یہ علم بھی عطا کر دیا گیا کہ اس خلافت کی حیثیت اختیار کرلے اور اپنی رضا پسند اور اپنے

ذہن و فکر کو اس ہستی کے عطا کردہ نظام کے تحت کر دینے سے کیا نتائج مرتب ہوں۔ اور ان کی خلاف ورزی کرنے

سے اسے کن نتائج سے دوچار ہونا ہوگا۔ الغرض ان ساری چیزوں کا اسے علم دے کر اسے آزاد چھوڑ دیا گیا کہ وہ خود اپنی فہم

اور اپنے ارادہ کو جس راہ پر چاہے صرف کرے۔ نتائج کا اسے علم تھا۔ یہ تھا مختصراً کائنات اور انسان کے متعلق اسلام کا نظریہ۔

اب یہ سوال کہ انسانی فکر اور ذہن مادّی حالات سے متاثر ہوتے ہیں یا وہ خود مادّی حالات کو ڈھالتے ہیں اس کے

متعلق بھی مختصراً اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ پہلے انسان کو ہی کائنات کی حقیقت اور انسان کی اصل حیثیت سے مطلع کر دیا گیا

تھا۔ نیز یہ کہ اسلام اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ کسی بھی ذہنی حالت اور کسی بھی رجحان فکر کے لئے سازگار مواقع مخصوص ماحول

اور حالات سے ہی ممکن ہیں۔ چنانچہ اسلام نے صرف نظری طور پر انسان کے ذہن میں کائنات کا تصور بٹھانے کے لئے اللہ کی حاکمیت

اور انسان کی خلافت کے متعلق صرف احکام ہی نہیں نازل کئے بلکہ یہ حقیقت اس نے خود واضح کر دی ہے کہ کسی نہج پر ذہن انسانی

کو چلانا کسی محور پر فکر آدمی کو چلانا اور کسی نقطہ پر انسان کے جذبات و حسیات کو قائم رکھنا بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ اس

بنیادی اصول کے مطابق ایک سماج کی تعمیر ہو۔ اور ایک اسٹیٹ کی بنا ہو جو اس قسم کے ماحول اور حالات پیدا کرے جن

میں یہ ممکن ہے کہ انسانی فکر اس مذکورہ نقطہ اور محور پر قائم رہ سکے۔ ایک طرف اسلام نے ذہن انسانی کو اس طرح ڈھالنے

(mould) کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ اشیاء کے متعلق وہی سوچے جو حق ہے۔ انہیں اس طرح استعمال کرے جو اس کی

ہدایات کے مطابق ہے۔ کیونکہ اس طرح انسانیت، کائنات اور کائنات کی ساری چیزوں کا بھلا ممکن ہے۔ دوسری طرف

اسلام نے اللہ کے بتائے ہوئے سماج اور اسٹیٹ کے قیام پر اصرار کیا ہے کیونکہ اس کے بغیر انسانی فکر کو کس راہ پر لگانے کا امکان نہیں۔

ہم اس مقالہ میں اس پر کچھ روشنی ڈالنی چاہیں گے کہ کس طرح اسلام ایک مخصوص فکر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اوپر کائنات اور

انسان کے بنیادی نظریہ کی تشریح کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ انسان دنیا میں اللہ کے مرضی کے مطابق نظام حیات کو رائج کرنے

کے لئے آیا ہے۔ ذہنی طور پر اس حقیقت کو جاگزیں کرنے کے لئے ہی پہلا انسان دنیا میں اس فرض منصبی کے ساتھ پیدا ہوا ہے

کہ وہ لوگوں کو بتلائے گا کہ اس دنیا کے معاملات کس طرح فیصل کریں اور کس طرح ان کی زندگی میں سکون اور شانتی ممکن ہے۔

اور اس پہلے انسان کے بعد اور لوگ آتے رہے اور ان کے سپرد بھی یہی منصب تھا۔ یہ لوگ غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک ہوتے

تھے۔ چونکہ ان کے سپرد یہ مقصد عظیم تھا جو کہ بنائے کائنات ہے۔ اس لئے یہ اپنی جو باتیں لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے وہ

بہترین اور مؤثر ترین پیرائے اور الفاظ میں ہوتیں۔ چنانچہ اس قسم کی جتنی بھی برگزیدہ ہستیاں تشریف لائیں ان کے کلام ہی

میں بہترین ادب ہوتا ہے اور دنیا آج بھی اس کی معترف ہے۔ اس ادب میں ذہن انسانی کو معنوی اعتبار سے مرعوب کرنے کے ساتھ ہی عقلی اور ادبی طور پر مرعوب کرنے کی بھی صلاحیتیں ہوتی تھیں اور اس طرح اگر دیکھا جائے تو پہلا انسان ہی پہلا ادیب بھی تھا۔ اس کے بعد بھی جتنے انبیاء آئے اور جن کے منہ سے نکلے ہوئے کلمات ہم تک پہنچے ہیں وہ بہترین ادب پارے ہیں۔ قطع نظر ان الفاظ سے جو کہ براہ راست وحی ایزدی ہوتے تھے۔ خود اس نبی کے اپنے خطبات و کلمات بھی ایک بلند ترین ادبیت کے حامل ہوتے۔ حضرت مسیحؑ کی انجیل اب بھی بہترین ادب ہے۔ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور خطبات میں بہترین ادبیّت ہے۔ اس گفتگو سے مراد یہ ہے کہ اسلام کے نزدیک انسان کی معاش، انسان کا سماج، انسان کی خلافت اور اسٹیٹ انسان کا ذہن و دماغ اور انسان کی زبان اور اس کا ادب یہ ساری چیزیں علٰحدہ علٰحدہ بنیادوں پر مبنی نہ ہوں ان سب کے معیار الگ الگ نہ ہوں اور ان سب کے اصول و قواعد جدا جدا نہ ہوں بلکہ کائنات کی حقیقت انسان کی آفرینش سے لے کر انسان کی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے جزو اور شعبے تک کی ایک ہی بنیاد ہو اور ہم جس شعبہ کے متعلق سوال کریں اور غور و فکر کریں ہمیں ایک ہی جواب ملتا وہ ہے خالق کائنات اور اللہ کی کامل اطاعت۔ سو وہ مثالی سماج اور اسٹیٹ اسی بنیاد پر ہو انسان کا رجحان فکر اور ذہنی توازن اسی اساس پر ہو اور انسان کی زبان اور اس کے ادب کا مصرف اسی مقصد کے لئے ہو جس طرح کائنات کی چیزیں استعمال کرنے کا حق انسان کو اسی لئے اور اسی بنیاد پر حاصل ہے کہ وہ انہیں اللہ تعالیٰ کی مرضی قائم کرنے میں استعمال کرے گا اسی طرح اپنی زبان سے وہی کچھ کلام کرے گا اور اپنے ذہن سے وہی کچھ سوچے گا۔ دوسرے الفاظ میں انسان کا ادبؔ اور انسان کی فکر اس بنیاد یعنی خدا پرستی پر قائم ہو۔ یہ ہے مختصراً وہ نظریۂ ادب اور وہ بنیاد فکر جو اسلامی نظام پیش کرتا ہے۔ کیونکہ اسلام کا منشا یہی ہے کہ انسان کی زندگی کے مختلف شعبوں میں یکسانیت اور یک رنگی (Hormony) پیدا کرے۔ اور سارے اقوام و ملّل کے مذاق و مقاصد میں توازن قائم کرے۔ اور پھر اس سے بڑھ کر کلمۂ جامعہ اور اس سے زیادہ اچھا نقطۂ اتفاق اور کیا ہو سکتا تھا۔ یہی وہ بنیاد ہے جو نظام اسلامی میں سارے ادیبوں سارے مفکروں اور سارے فن کاروں کو ایک بنیاد پر متحد کر دیتی ہے۔ دنیا کے سارے ممالک میں توازن مقصد اور تناسب فوق پیدا کر سکتی ہے۔

اس سلسلہ میں نامناسب نہ ہوگا اگر ہم مختصراً رائج الوقت نظریہ ہائے ادب پر ایک نظر ڈالیں۔ اس وقت دوؔ نظریے رائج ہیں۔ "ادب برائے ادب" اور "فن برائے فن" اور دوسرا نظریہ یہ ہے "ادب برائے زندگی"۔ دنیا اب "فن برائے فن" کو مہمل سمجھتی ہے لیکن دوسرے نظریہ یعنی ادب برائے زندگی کی بھی عجیب عجیب تعبیریں اور تشریحیں کی جاتی ہیں۔ کہیں لوگ اسے عملاً اس معنے میں ادب برائے زندگی سمجھتے ہیں کہ وہ ہمیں روٹیاں دلا سکے۔ نظری طور پر ادب برائے زندگی سے یہ مراد لی جاتی ہے کہ ادب ہمیں زندگی کے تلخ حقائق سے روشناس کرے۔ بغیر کسی رُو رعایت اور پردہ داری کے زندگی کے اصل واقعات سماج کے ناسوروں اور گھاوؤں کی جھلک ہمارے سامنے پیش کرے۔ تاکہ سوسائٹی کو معلوم ہو کہ اس نے خود کن چیزوں کو جنم دیا ہے۔ اور وہ خود ذمہ دار ہے کہ ان کی اصلاح کرے یا علاج ڈھونڈھے۔ یہیں سے ایک نیا ترقی پسند ادب شروع ہوتا ہے اس نے ہمارے سماج کے مصائب کی عکاسی کی اس عکاسی میں اس نے تین پیسے کی چھوکری لحافوں اور کالی شلواروں کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس میں اس نے پوٹیں بھی دکھائی ہیں اور پکی تماشبینیاں بھی۔ اس میں اس نے ہمنوری بھی دکھائے ہیں اور دھونیں بھی۔ اس میں اس نے یہ ثابت کیا ہے کہ ہم وحشی ہیں اور یہ بھی دکھلایا ہے کہ کسی پر کچھ بھی بیتا کرے مگر ڈان یوں ہی بہتا رہا۔

یہ ساری چیزیں انہوں نے ادب میں اس لئے پیش کی ہیں کہ ادب زندگی کے لئے ہے اس کا عکاس و ترجمان ہے۔ یہ تو اب

مخفی نہیں رہا ہے کہ اس کا مقصد انقلاب لانا نہ تھا اور اس کی خاطر زندگی کے اعلیٰ مقاصد نہ تھے اس کی بنیادیں اعلیٰ فکری اور اخلاقی اقدار نہ تھیں بلکہ اس کا مقصد صرف سماج کے ناسوروں اور گھاوؤں کی جھلک دکھانا ہی تھا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی ابتدا کرنے والوں کے مقاصد کتنے بلند تھے۔ لیکن خود ادیبوں اور شعراء جنہوں نے اس میدان میں داد مردانگی دی ان کے متعلق تو بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح لذتیت کا یہ ایک عمدہ طریقہ ہاتھ آیا۔ اگر مقصد کا لیبل نہ چپکا دیا جاتا تو شاید کوئی اس طرح چوٹیں نہ کرنے دیتا اور شاید کوئی کالی شلواریں سامنے لانے کی اجازت نہ دیتا اور شاید کوئی اندرون لحاف کے مناظر دیکھنا نہ چاہتا۔ اگر چاہتا تو اس طرح علی الاعلان دیکھنے کی جرأت نہ کر سکتا۔ اس طرح نہ صرف اس کا موقع ملا کہ لکھنے والا جسے شاید سماج نے جام صنعت سے سرشار ہونے کا موقع دیا یا شاید ظرف نہ دیکھنے کی وجہ سے بہت پلا پلا کر بلا نوش اور چھلکا دیا۔ ان لوگوں کو علی الاعلان صفحۂ قرطاس پر اپنی شہوتیت اور لذتیت کی تسکین کا موقع ملا اور قارئین جن کی سیری پردۂ سیمیں اور حسن رہ گذراں سے نہ ہو سکتی تھی اور اگر ہوئی بھی تو صرف نظر بازی کی حد تک ان کے لئے زیادہ گہرائی تک جانے یا اس کے تصور کرنے کا امکان پیدا کیا۔ بعض زمیندار قسم کے شاعر اور ادیب جو شاید اب اصل دیہات سے علیحدہ ہونے کے باعث جامن والیوں اور مہترانیوں سے محروم ہو گئے ان کی عکاسی اپنے کلام میں کر کے دوبارہ اس قند مکرر سے ذہنی طور پر لطف اندوز ہوں اور اپنے قارئین کو بھی اس دعوت ملیحی میں شریک کریں۔ چونکہ سماج کی تعمیر ہی غلط بنیادوں پر تھی۔ سوسائٹی بے اصولی کے ڈگر پر چلی جا رہی تھی اس لئے اس ادب برائے زندگی کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اور نہ صرف مخلقین ادب اسے مقصدیت سے تعبیر کرتے رہے بلکہ پڑھنے والے انقلاب کی تیاری اور جنت زاد اشتراکیت تک پہنچنے کی تیاری سمجھتے رہے۔ پہلی بھوک سے زیادہ دوسری یعنی جنسی بھوک کی شدت محسوس کی جانے لگی۔ اور لوگ یہ سمجھتے رہے کہ اس ادب کی پشت پناہی جو نظام کر رہا ہے اس میں نہ صرف یہ کہ حکومت ہر شخص کو روٹی دے گی بلکہ اس مثالی سماج میں ہمیں مہترانی سے لے کر رانی تک ہر ایک کی مسکراہٹ مل سکے گی۔ اور ہفت Water-glass- theory کی قدر دانی کی گئی۔ اور اس ترقی پسند ادب کی وجہ سے عوام میں جو ذہنی انحطاط ہوا وہ ہمارے سامنے ہے چھ سال کا بچہ فلم ایکٹرس پر فریفتہ ہوتا ہے اور مرن برت اور خودکشی کے لئے تیار ہے۔ اگر ظالم سماج نے اس کی یہ خواہش پوری نہ کی۔ یہ تھی مختصر روداد ادب برائے زندگی کی۔ —————— (باقی آئندہ)

بقیہ نقل و عیاں

کیا جا سکتا ہے۔ "الحمد للہ" ایک ایسا افسانہ ہے جس میں ایک دیہاتی زندگی کا صحیح کردار پیش کیا گیا۔ مولوی ابل ہمارے دیہاتوں کے ہزاروں مولویوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ ہمارے دیہاتوں کے "پیش امام" ہمارے رہنما۔ ہمارے خطیب۔ ہمارے سرپرست۔ کیسی کس مپرسی کی زندگی بسر کرتے ہیں؟ یہ کچھ وہی شخص جان سکتا ہے۔ جس نے دیہاتی ماحول دیکھا ہو۔ یا جس کا دائرہ معلومات وسیع ہو۔ یا جس میں سمجھ بوجھ کا تھوڑا بہت مادہ ہو۔ یہ آپ کے بس کا روگ نہیں۔ مولویوں کی حمایت کرنے والو۔ مولویوں کی سسکتی ہوئی زندگی کو منظر عام پر کیوں نہیں لاتے کبھی دیہاتی مولوی سے پوچھو وہ بتائے گا کہ "الحمد للہ" کس حد تک صحیح عکاسی کر رہا ہے وہ افسانہ مذہب کو بدنام نہیں کر رہا۔ بلکہ آپ ایسے مذہب کے جھوٹے پجاریوں کی بے راہ روی کو بے نقاب کرتا ہے۔ جو مذہب کی آڑ لے کر شکار کر رہے ہیں۔

بقیہ جیلانی کا افسانہ عظیم کیوں ہوا

سوائے خلاء کے کچھ دکھائی نہ دیتا۔ جب وہ حس کے ابر کو ہٹا کر خیال کے سانچے کو ٹٹولتا تو وہ بالکل خالی ہوتا۔"

ذرا سوچ کر اور جیلانی کے فنی کمال کو ٹٹول کر بتائیے اور خدارا انصاف سے بتائیے کہ "کمال" اس کے سوا اور کس شے کا نام ہے، "عظمت" اور کسے کہتے ہیں، فنی چابک دستی اور ہوتی کیا ہے؟ (باقی آئندہ)

جیلانی کا افسانہ عظیم کیوں ہوا؟

نعیم صدیقی

کیا یہ کوئی خطرناک حادثہ ہے کہ جیلانی بی نے ایک عظیم افسانہ لکھ ڈالا اور چراغِ راہ نے اس کی عظمت کو محسوس کیا؟ نہیں سیدھا سادہ واقعہ ہے، ایسا ہو سکتا ہے، ایسا ہونا چاہئے اور ایسا ہو گیا!

تنقید کا فرض اکہرا نہیں کہ وہ کھوٹے کو کھوٹا کر دے، بلکہ اس کے ذمے یہ فرض بھی عاید ہوتا ہے کہ وہ کھرے کو کھرے کی حیثیت سے نمایاں کرے، اس کا کھرا ہونا منوائے! تنقید وہ بھی ہے کہ ابطالِ باطل کیا جائے اور تنقید یہ بھی ہے کہ احقاقِ حق کیا جائے۔ تنقید عیب چینی کا نام نہیں، تنقید ایک تخریبی کارروائی نہیں، تنقید تو ایک تعمیری معاملہ ہے۔ ایک ترازو کا جس طرح یہ فرض ہے کہ وہ کسی شے کی کمی وزن کو ٹھیک ٹھیک بیان کر دے، اسی طرح اس کا یہ فرض بھی ہے کہ وہ ایک شے کی زیادتیٔ وزن پر بھی شہادت دے۔ کسوٹی جیسے اس بات کی ذمہ دار ہے کہ رانگے کا رانگا ہونا واضح کرے، اسی طرح اس کی ذمہ داری بھی ہے کہ وہ سونے کا سونا ہونا بھی پوری طرح پیش کر دے۔ آئینہ اگر پابند ہے اس کا کہ وہ سامنے آنے والے چہرے کے قبح کو اس کی آنکھوں کے سامنے لے آئے تو وہ پابند اس کا بھی ہے کہ ایک جمیل چہرے کے جمال کو بھی اس کی نگاہوں پر آشکار کر دے۔ ترازو اور کسوٹی اور آئینہ نہ اُدھر مبالغہ کرتے ہیں، نہ اِدھر انکسار! وہ نہ اُس پہلو سے افراط دکھاتے ہیں، نہ اِس پہلو سے تفریط۔ وہ نہ تردید میں بزدل ہوتے ہیں، نہ اعتراف میں بخیل!

تنقید کا منصب جج کا منصب ہوتا ہے جو قانون کو جانتا ہے، مصلحتوں کو نہیں جانتا، عدل کے اصولوں کو تسلیم کرتا ہے یگانگت اور غیریت کے تعلقات پر نظر نہیں رکھتا، حقائق پر فیصلہ دیتا ہے، ذاتی رجحانات کو حکم نہیں بناتا، دلائل سنتا ہے اور اپنی ذاتی محبت اور ذاتی نفرت کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔ تنقید کا جج ادیب کو دو طرفہ خطروں سے بچاتا ہے، اپنوں کی بے جا تعریف کے خطرے سے، اور غیروں کی بے جا تعریض کے خطرے سے!

ہمارے ہاں اپنوں کی تعریف ہوتی رہی ہے، مگر بے جا تعریف کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں، تاہم ہمارے ناقدین نے اس خطرے سے ادب کو بچانے میں شاید کوتاہی نہیں کی ہے۔ لیکن غیروں کی تعریض کا نشانہ ہمارا ادب روزِ اول سے ہے اور یہ تعریض کا طوفان ہماری پیش قدمی کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ چنانچہ ہمارے ہاں کی نگارشات پر بحیثیت مجموعی جو اظہارِ رائے بیرونی حلقوں کے اونچے اور نیچے ہر طرح کے لوگوں نے کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

یہ ملائیت ہے! رجعت پسندی ہے! ترقی دشمنی ہے! یہاں ادبی سلیقہ نہیں! ذوق نہیں! شئے لطیف کی کمی ہے! وغیرہ

تعریض اور استخفاف آمیز تعریض کا یہ مسلسل حملہ اُس سے کم درجے کا خطرہ نہیں ہے جتنا کہ اپنوں کی بے جا تعریف میں پایا جاتا ہے۔ اس سے ہمارے لکھنے والوں کی خود اعتمادی کو نقصان پہنچتا ہے، اس کے ذریعے درحقیقت احساسِ کمتری پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ——— اور اس حملے کے مقابلے میں اگر انکسار کا رویّہ اختیار کر لیا جائے اور جو کچھ بھی بیرونی حلقوں کی طرف سے کہہ دیا جائے

اس پر صوفیانہ انداز سے سر جھکا کر کہہ دیا جائے کہ جی ہاں! بجا فرمایا! "ہم لوگ تو صرف کمزور ادب ہی پیدا کرنے والے ہیں" تعصلا جبتیں ٹھٹھر کے رہ جائیں گی۔ لہٰذا جہاں ہمیں اپنوں کی بے جا تعریف کے جواب میں کچھ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے، وہاں غیروں کی بے جا بلکہ ذلیل قسم کی تعریض کے جواب میں بھی بہت کچھ کہنا اشد ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں کے اربابِ تنقید کا فرض ہے کہ وہ تعریض کے حملوں کا جواب بھی دیں اور اپنی قابلِ قدر نگارشات کو نمائش گاہِ ادب میں وہ مقام دلوائیں جس کی وہ مستحق ہیں۔ ہمارے ناقدین اگر اپنے ہاں کی اچھی نگارشات کو کوڑے کباڑ میں جگہ دینے والے ہاتھوں کی حرکت کو ٹک ٹک دیکھتے ہیں اور اس پر کوئی احتجاج نہ کریں، بلکہ صرف اپنوں کی تعریف کے خطرے کے پیچھے پڑے رہیں تو وہ فرض شناس ناقد نہیں ہوں گے وہ جج بڑا انوکھا جج ہوگا جو اپنی حدودِ عدالت کے باشندوں کو حق سے زائد کچھ لینے تو نہ دے، لیکن اگر ان کا حق کوئی دوسرا مارے جائے تو اس کی عدالت اس کے خلاف کوئی اقدام کرنے پر تیار نہ ہو۔

یہی وہ فرض تھا جسے چراغِ راہ کی اشاعتِ خاص کے سوچ بچار میں ادا کیا گیا کہ باہر کی بے جا تعریض کے جواب میں یہ حقیقت پیش کی گئی کہ اسلامی ادب طائیت کا مظہر نہیں ہے، وہ ایک نظریۂ زندگی کا عکس لے کر نمودار ہو رہا ہے، اس میں مقصدیت ہے، اس میں جمال ہے، اس میں فن کاری ہے اور وہ کچھ نہ کچھ نگارشات ایسی سامنے لا چکا ہے جو قابلِ اعتراف قدر و قیمت کی حامل ہیں۔

کیا یہ کوئی ایسی بات ہے جس پر اضطراب دکھایا جائے، جس پر واویلا مچا دیا جائے، جس پر نفرین بھیجی جائے، جس کو تباہ کن خطرہ قرار دیا جائے؟ کیا واقعی ہمارے ہاں صرف کوڑا کباڑ ہی جمع ہوا ہے؟ کیا ہماری تخلیقات واقعی قدر و قیمت سے خالی ہیں؟ کیا ابھی تک دو چار دس اچھی کہانیاں اور جو ہر دار نظمیں ہمارے خزانۂ ادب میں داخل نہیں ہو سکیں؟ کیا اپنے کسی ایک آدھ افسانے کو ہم ابھی عظیم افسانہ کہنے کے قابل نہیں ہیں؟

اگر ان حالات کا جواب اثبات میں ہے تو یہ کیسا استدلال ہے کہ ہمارا ادب زرخیز ہے اور اگر اس حالت میں کسی چیز کی تعریف کر دی گئی تو ترقی رُک جائے گی! اس طرح کی بودی باتیں شہادت دیتی ہیں کہ ذہنی پس منظر میں کوئی ایسی چیز موجود ہے جو ظاہر کرنے کی نہیں، لیکن اس کا پرتو بہرحال تکلف کے پردوں سے چھن چھن کے باہر پڑ رہا ہے۔ ہمارے رفقا کو اپنے ذہنوں میں ایسی چیزیں رکھ کر نہ زبان کھولنی چاہئے، نہ قلم ہاتھ میں لینا چاہئے!

ایک مدت سے ہم لکھ رہے ہیں، لیکن آج تک ہم نے کسی کہانی کو عظیم کہانی نہیں کہا۔ اس لئے کہ ایسا کہنے کے لئے کوئی چیز موجود نہ تھی۔ آج ہمارا ایک ادیب ایسی ایک چیز اگر لکھ کر لے آیا ہے تو آخر کیا ہم اس کی عظمت کے روشن چہرے پر اس اندیشے سے خواہ مخواہ تھوڑی سی کیچڑ ڈال دیں کہ یہ عظمت اگر محسوس ہونے لگی اور اس کا اعتراف کیا جانے لگا تو ترقی رُک جائے گی؟ جی نہیں! ترقی جس طرح بے جا تعریف کرنے سے رُکتی ہے اسی طرح جب تعریف واجب ہو جائے تو اس کے نہ کرنے سے بھی رکتی ہے!

جیلانی کے کسی افسانے کا عظیم افسانہ بن جانا کچھ بھی تعجب انگیز نہیں ہے۔ اس کا مطالعہ وسیع ہے، اس کا مشاہدہ قابلِ اعتماد ہے، اس کی فکر کے چراغ بجھے ہوئے نہیں ہیں، اس کے تخیل کے پروں میں جنبش ہے، وہ اسالیب پر قدرت رکھتا ہے، وہ زبان ——— اگرچہ اس میں پنجابیت کے اثرات کہیں کہیں نمایاں ہوتے ہیں ——— جاندار استعمال کرتا ہے، وہ ایک مدت سے لکھتا ہے، اور سوچ سمجھ کر وقفوں وقفوں کے بعد لکھتا ہے، اور ان اوصاف کو رکھنے والے لوگ ہی عظیم افسانے لکھا کرتے ہیں۔ وہ اگر آج اپنے مقام کو نہ پہنچتا تو کل پہنچ جاتا، بہرحال اس کا مقام اوّل روز سے اس کا منتظر تھا۔

تعظیم کہانی' کوئی معجزہ نہیں ہوتی، انسان ہی عظیم کہانیاں لکھتے ہیں۔ اور عظیم کہانیوں میں کوئی غیر معمولی الجھن نہیں ہوا کرتی، بلکہ
بسا اوقات وہ بڑی سیدھی سادی ہوتی ہیں۔ وہ دیوں اور جنوں پریوں کی دنیا سے یا حوروں اور فرشتوں سے متعلق نہیں ہوتیں،
خاکی دنیا کے خاکی انسانوں سے متعلق ہوتی ہیں۔ اور عظیم کہانیاں لکھنا صرف مغرب کے ارباب فن یا صرف اشتراکیت زدہ ادیبوں
کی اجارہ داری نہیں ہے، لائل پور کا ایک مسلمان دیہاتی نوجوان بھی اپنے قلم سے عظیم کہانی کی تسخیر کر سکتا ہے! اس کی عظیم کہانی اس
لئے عظیم نہیں کہ وہ کسی قدر طویل ہے، بلکہ اس لئے عظیم ہے کہ وہ عظیم ہے۔ "چراغ راہ" نے کہانی میں استعمال ہونے والے لفظوں کی
گنتی پر فیصلہ نہیں دیا، اس نے معنویت کو دیکھا ہے!

ہاں یہ سوال ضرور بجا ہے کہ جیلانی بی اے کی کہانی بلم بن باعور عظیم کیوں ہے؟ کاش کہ یہ سوال خود کہانی سے پوچھا گیا ہوتا، مگر کہانی کی
آنکھوں سے آنکھیں ملانا اور کہانی سے براہ راست مکالمہ کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ جرأت صرف ایک بے لوث جج ہی کر سکتا
ہے۔ لیکن بہرحال اب، اس "کیوں" کا کچھ جواب تو ہونا چاہئے، کوئی اور نہ دے گا تو چراغ راہ دے گا، کیونکہ وہ کہانی سے انٹرویو کر چکا ہے۔
تو آئیے ہم آپ کو اس کہانی کی کہانی سنائیں!

ایک زمانہ تھا کہ کہانی میں اصل اہمیت پلاٹ کی ہوتی تھی۔ پلاٹ، حیرت انگیز، وحشت افزا، غم خیز، اور مسرت افروز واقعات کا
ایک ہجوم ہوتا جو سیلاب کی طرح کہانی کی ساری زمین پر پھیل جاتا تھا، اور اس سرزمین کی بستیاں، مکانات، درخت، سبزہ، پگڈنڈیاں،
کھیت، سب کچھ اس کی موجوں کے نیچے گم ہو جاتا تھا۔ لیکن کہانی جدید دور میں داخل ہوتے ہوئے جس انقلاب سے گذری ہے اس کا ایک
بڑا عمل یہ ہے کہ پلاٹ کی وہ غیر معمولی اہمیت ختم ہو گئی ہے اور کہانی میں دوسرے عناصر بھی اپنے اپنے حصے کی اہمیت حاصل کر چکے ہیں چنانچہ
اس انقلاب سے گذرنے کے بعد کہانی مطالعۂ زندگی کا ذریعہ بن گئی ہے۔ دور قدیم کا ادیب وہ کچھ دیکھتا اور دکھاتا تھا جو موجود نہیں ہوتا تھا
اور اس کی کہانیاں متخیلہ کے شعبدوں پر مشتمل ہوتی تھیں جن میں کہیں کہیں واقعیت زبردستی اپنے اظہار کے لئے راستے بنا لیتی تھی۔ لیکن آج
کا ادیب حاضر و موجود کو دیکھتا اور دکھاتا ہے اور اس کا اصل مواد مشاہدہ کا فراہم کردہ ہوتا ہے، اور وہ واقعیت میں تخیل کی رنگ آمیزی اس
طرح کرتا ہے کہ واقعیت کی درزوں میں سے ایک امید کی دنیا، ایک خوابوں کی جنت، ایک مستقبل مطلوب کچھ کچھ جھلکنے لگے۔ وہاں زندگی سے
فرار تھا، یہاں اس کی تسخیر کا ولولہ ہے۔ وہاں سر تسلیم خم تھا، یہاں انقلاب و تغیر کے ہمہمے ہیں! تو ہاں آج کی کہانی زندگی کو دیکھتی اور دکھاتی ہے
—— اس کے اجتماعی ماحول کو یا اس کے انفرادی کرداروں کو! انفرادی کرداروں کو اجتماعی ماحول میں رکھ کر، اور اجتماعی ماحول کو انفرادی
کرداروں پر محیط دکھا کر!! آج پلاٹ صرف ایسا اور اس حد تک لیا جاتا ہے جو ماحول یا فرد کے مطالعہ کے لئے ضروری ہو۔ پلاٹ اگر اس
حد سے بڑھ جائے تو وہ ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔

آپ اگر جیلانی کی کہانی کے پلاٹ کو تنقید کی کسوٹی پر رکھیں گے تو اعتراف کریں گے کہ مطالعۂ زندگی کے لئے افسانہ لکھتے ہوئے
پلاٹ کو جن حدوں میں محدود رکھنا چاہئے تھا اُن کی جیلانی نے پوری پاسداری کی ہے۔ پلاٹ اس کے ہاں بالکل ثانوی حیثیت لئے
ہوئے ہے، جو دور حاضر کی مطالعاتی کہانیوں کا لازمہ سا ہے۔ لیکن جتنا کام اسے پلاٹ سے لینا تھا وہ اس نے پوری طرح لیا بھی ہے۔ جیلانی
کی کہانی کے پلاٹ کے تناسب پر ایک ناقد بہرحال اطمینان ہی ظاہر کرتا ہے۔

انفرادی کرداروں کا مطالعہ بھی دو طرح کیا جاتا ہے، ایک خارج سے، ایک داخل سے۔ پہلی صورت میں دیکھا اور دکھایا یہ جاتا
ہے کہ سماج کے سمندر میں عمل کی کونسی لہریں ہیں جو ایک کردار پیدا کر رہا ہے، اور دوسری صورت میں یہ مطالعہ کرنا ہوتا ہے کہ عملی زندگی
کی لہروں کے پیچھے خیالات، جذبات، احساسات اور اخلاقی داعیات کونسے ہیں جو کام کر رہے ہیں۔ ایک کردار کی نفسیاتی کیفیت

کہ دیتا ہے، اس کے باطن کے سمندر میں کیا ہو رہا ہے! خیال اور عمل کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا، جذبے اور اقدام کو منفک کرنا ممکن نہیں، احساس اور اظہار میں گہرا رشتہ ہے، ضمیر اور اعضا کی حرکات میں بنیادی ربط ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کا سارا تانا بانا خیال، جذبے، احساس اور اخلاقی تقاضوں کے تاروں سے بنتا ہے۔ چنانچہ جدید ادب نے خارج سے داخل کی طرف، ظاہر سے باطن کی طرف، کردار سے ذہن کی طرف اور حرکات و سکنات سے نفسیاتی عمل کی طرف تیزی سے مارچ کیا ہے۔ ہمارے اس دور کے افسانے میں انسان کے داخلی مطالعہ کا عنصر نمایاں طور پر زیادہ ہے، اور اس دور کے عظیم افسانوں میں ایک بڑی تعداد ایسے ہی افسانوں کی ہے جو اسی داخلیت کی مظہر ہیں۔

جیلانی کا افسانہ بھی ایک تاریخی انسانی کردار کے مطالعے پر مشتمل ہے، اور یہ مطالعہ داخلی و خارجی دونوں ہی پہلوؤں کو محیط ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ مطالعہ خارجی سے زیادہ نفسیاتی ہے۔ بظاہر جیلانی پیش نظر کردار بعلم کے پورے خارجی ڈھانچے کو ہمارے سامنے رکھ دیتا ہے اور اس میں بڑا وقت صرف کرتا ہے اور بے شمار سطریں اسی کے لئے وقف کرتا ہے، لیکن اس کے افسانے کا مرکزی تقاضا ہے ہی داخلی مطالعہ کا! اور اس نے یہ کام حدِ تکمیل تک کیا ہے۔

بظاہر یہ تاریخی افسانہ معلوم ہوتا ہے اور ہماری روزمرہ زندگی سے اس کی فضا الگ الگ نظر آتی ہے، لیکن وہ اس زندگی سے درحقیقت دور نہیں ہٹا ہے، بلکہ اس نے ایک ایسے ہمہ گیر اخلاقی اصول یا نفسیاتی مسئلے کو افسانے کی بنیاد میں رکھا ہے جو جتنا ماضی کا مسئلہ تھا اتنا ہی حال کا مسئلہ ہے۔ جیلانی تاریخ میں مستقل قدروں کو ماننے والا ہے، چنانچہ اس نے ایک مستقل قدر پیش نظر رکھ کر سوچا ہے اور لکھا ہے۔ اس بنا پر یہ افسانہ ہمارے حال سے پوری طرح وابستہ ہے اور اُن ان گنت کرداروں پر بحث کرتا ہے جو اپنے ضمیر میں برائی کے ناسور چھپا چھپا کر رکھتے ہیں اور باہر عملی زندگی کا ایک نمائشی خول ریشم کے کیڑے کی طرح تیار کرتے جاتے ہیں ——— لیکن نہ وہ اپنے ناسوروں کی ٹیسوں سے بچ سکتے ہیں اور نہ اس کے رستے ہوئے مواد سے اپنے نمائشی خول کو داغ پذیر ہونے سے بچا سکتے ہیں ——— یہاں تک کہ ایک دن یہ سارا خول پیپ سے متعفن ہو کر گل جاتا ہے اور بھیر بھیر ہو کر ختم ہو جاتا ہے۔

اس حقیقت کو کھولنے کے لئے اس نے بعلم بن بعور کا کردار پسند کر کے اس پر بڑا احسان کیا ہے۔ بعلم بن بعور ایک عجیب کردار کی حیثیت سے اسرائیلی تاریخ میں یقیناً موجود تھا، لیکن وہ ایک پرمعنی، ایک ادبی اور افسانوی کردار ہونے کے مرتبے سے فروتر تھا۔ جیلانی کو تاریخ اس کا صرف ایک خاکہ ——— اور وہ بھی شکستہ لکیروں کا ناتمام خاکہ ——— دے سکی، لیکن جیلانی کا کمال یہ ہے کہ اس نے نہ صرف اس خاکے کو مکمل کر لیا، بلکہ اس میں رنگ بھرا تو اس طرح کہ وہ ایک مکمل کردار بن گیا۔ تاریخ کے قبرستان کی مٹی میں پڑے ہوئے ہڈیوں کے ڈھانچے پر جیلانی نے ادب کا وہ افسوں پڑھا ہے کہ آج وہ ایک جیتے جاگتے وجود کی حیثیت سے ہمارے سامنے ہے اور ہم فتورا کے ہیکل سے لے کر دریائے اردن کے کنارے تک اس کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہیں اور اس کو گوناگوں مراحل سے گذرتا دیکھتے ہیں۔

جیلانی اپنے اس تاریخی افسانے میں اگر مؤرخ کی حیثیت اختیار کر لیتا تو یہ اس کے قلم کا کوئی بڑا کارنامہ نہ ہوتا، لیکن اس کا اصل کمال یہی ہے کہ اُس نے اپنی کہانی کو لکھتے ہوئے اپنے آپ کو افسانہ نگاری کے مقام پر رکھا ہے۔ یعنی اُس نے یہ بیان نہیں کیا کہ "یوں ہوا"، بلکہ یہ بیان کیا ہے کہ "یوں ہونا چاہئے تھا"۔ اس کے افسانے کی عظمت کا اصل راز یہ ہے کہ "یوں ہونا چاہئے تھا" کو اس نے ہمارے سامنے اس شان سے رکھا ہے کہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ "یوں ہوا تھا"۔ تاریخ کا ایک خلاء ہے جسے پورا کرنا کسی مؤرخ کے بس میں نہیں، اسے ایک ادیب ہی پورا کر سکتا تھا اور ایک ادیب نے اسے پورا کر دیا۔ اب اگر جیلانی اس خلاء کو کسی ایسے بھدے

طریقے سے پُرکر دیتا کہ واقعیت پر خیالیت کا پیوند بے جوڑ ہو کر لگتا تو افسانہ عظیم تو کیا ہوتا، الٹا ہم اسے ایک ناکام افسانے کی حیثیت دیتے۔ مگر جیلانی نے تاریخ اور افسانے کو، واقعیت اور تخیل کو باہم دگر اس طرح جوڑا ہے کہ ٹانکا تک نظر نہیں آتا۔ جیسے تاج محل کی سنگ مرمر کی سلوں کا جوڑ ناخن پھیرنے سے بھی محسوس نہیں کیا جا سکتا، بالکل اسی طرح جیلانی کی کہانی میں واقعیت اور تخیل کے جوڑ کو نگاہوں کی سوئیوں کو پھیر کر بھی معلوم نہیں کیا جا سکتا۔

اس نے بعلم کے دور کو ٹھیک ٹھیک سمجھا ہے، اُس نے اُس وقت کے ماحول کو اپنے کردار کے ارد گرد آراستہ کر دینے میں واقعتہً بڑی چابکدستی دکھائی ہے، اُس نے زبان وضع کرنے میں افسانے کی تاریخی فضا کا لحاظ رکھا ہے۔ اُس نے وہ روایات نوٹ کی ہیں جو بعلم کے ارد گرد دبائی جانی چاہئیں، اُس نے اُس دور کے مذہبی تصورات اور فتورا کی کہانت اور پروہتی کا سماں باندھ دیا ہے، اُس نے وقت کے تمدن کے مظاہر کو اپنا کر کہانی بنائی ہے۔ ان حقیقتوں کو سوچئے تو اندازہ ہوگا کہ کتنی بھاری ذمہ داری جیلانی نے اپنے سر لی تھی اور جس تاریک وادی میں اُس نے قدم رکھا ہے اس میں گام بہ گام ٹھوکریں کھانے کے اسباب موجود تھے۔ لیکن آپ کا یہ افسانہ نگار۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اپنے مطالعے کی روشنی لئے اس سبک گامی سے سفر طے کرتا ہے کہ کہیں ایک جگہ بھی ٹھوکر نہیں کھاتا ———
پھر کیا وجہ ہے کہ اس کی نگارش کو عظیم نہ قرار دیا جائے۔ کوئی اناڑی ہوتا تو قدم قدم پر منہ کے بل گرتا، لیکن یہ شخص کسی لغزش یا ہکے بغیر اس سرے سے اُس سرے تک نکل گیا ہے۔ آپ کہتے ہیں اسے عظیم نہ کہو۔ تو آخر پھر عظیم کن لوگوں کو کہیں؟ کیا عظیم لوگوں کے سر پر سینگ ہوتے ہیں؟ عظیم ایسے ہی فن کاروں کو کہا جاتا ہے جو فن کے نازک مراحلوں سے استقامت کے ساتھ نکل جاتے ہیں، اور عظیم ایسے ہی فن پاروں کو کہا جاتا ہے جن میں مشاہدے کی آنکھوں کا کھلا ہونا اور مطالعے کے دیوں کا جلتا ہوا محسوس کیا جا سکے!

جیلانی کا کردار بعلم ایک عجیب نفسیاتی گرہ لئے ہوئے جوان ہوتا ہے، وہ اس گرہ کو ایک طرف سے کھول لیتا ہے تو معاً دوسری طرف پڑ جاتی ہے، وہاں سے کھولتا ہے تو وہ گرہ ایک اور جگہ جا پڑتی ہے۔ یہ گرہ اس کے اندر اس کے نظر فریب خارجی قالب اور اس کے مکروہ باطن کی کشمکش کی ڈالی ہوئی ہے، اس کی سیرت کے تاگے میں بل تھا اور جب اس تاگے کا ایک سرا خارج نے اور ایک سرا باطن نے کھینچا تو گرہ تو پڑنی ہی تھی، بعلم اس گرہ کو ڈھیلا کرتا تو اسی تضاد کی کھینچا تانی اس گرہ کو کسی دوسری جگہ منتقل کر دیتی، لیکن وہ کھل نہ سکی، آخر دم تک نہ کھل سکی ——— کیونکہ بعلم کو اپنا نظر فریب خارج بڑا عزیز تھا، اور اپنے مکروہ باطن پر اسے قدرت نہ تھی۔ وہ زندگی کا تار نہ اس کے ہاتھ سے چھڑا سکا، نہ اُس کے ہاتھ سے، اس لئے اس کی ساری عمر ان دونوں کی کھینچا تانی کے اندر کٹ گئی۔ بعلم کے ضمیر میں ایک ناسور تھا، لیکن اس نے اس ناسور سے نجات پانے کے بجائے اس سے تغافل اختیار کرنے اور آنکھیں چرانے کا طریقہ اختیار کیا۔ اس نے اپنے نفس کو ایک زندگی گیر فریب میں ڈالا، اور اس فریب کو ایک شکل میں جب اس نے ناکام ہوتے دیکھا تو جھٹ اسے دوسری شکل دے دی، پھر تیسری، اور اسی طرح وہ اپنے آپ سے جوا کھیلتا رہا! بعلم کی اس نفسیاتی الجھن نے اس کے کردار میں جس طرح کام کیا ہے، اس بس کی گانٹھ اور اس فساد کی جڑ نے جس طرح نت نئے شگوفے چھوڑے ہیں، ان کو اگر ایک ادیب افسانے میں پوری طرح منعکس کر گیا ہے تو اسے آپ اگر عظیم کہتے ہوئے ہچکچاتے ہیں تو آخر اس لفظ کو آپ نے کس مصرف کے لئے دماغ کی زینت بنا رکھا ہے۔

جیلانی کا کردار پے در پے تحولات سے گذرتا ہے۔ اس کی نفسیاتی گرہ اس سے کتنے ہی کنوئیں جھنکواتی ہے، اسے گھاٹ گھاٹ کا پانی پلاتی ہے، اسے کبھی اس کوچے میں لے جاتی ہے اور کبھی اُس کوچے میں۔ ماں کی ممتا سے محرومی اور اس کی سوتیلی ماں

کے لئے باپ کی زن مریدی کی بنائی ہوئی فضا نے اس کے صنفی جذبے پر گہرے اثرات ڈالے تھے، اس کے ساتھ ساتھ گھر کے ماحول کی گھٹن نے اس کے اندر ماحول سے ابھر کر رہنے کا ایک زوردار رجحان بھی پیدا کر دیا تھا۔ یہ غیر معمولی صنفیت اور برتری کی دبی ہوئی تمنا دونوں مل کر اس کے ضمیر کی بس کی گانٹھ بنی تھیں۔

ایک نے اسے معیاری کاہن ——— باپ سے زیادہ اونچا کاہن ——— بننے کے لئے ایک راستے پر ڈالا، اور دوسری بدیلا وہ تھی جس نے ڈونگے میں بیٹھی ہوئی تاجر کی بیوی پر اس کی نگاہ پڑتے ہی اسے دم بخود کر دیا۔ اب ایک نئے فہم کی سحر اس پر طلوع ہو رہی تھی۔ اب مراقبوں میں اس کے تصور کے جذب و انہماک میں خلل آنے لگا تھا۔ اور اس کو ایسا محسوس ہونے لگا، گویا ہیکل سے باہر کی دنیا اسے پکار رہی ہے!

بعلم نہ اُسے رد کر سکتا تھا، نہ اِسے! وہ ان دونوں ہی چور جذبوں کے بلاوے پر لبیک کہنا چاہتا تھا، اور دونوں کو بیک وقت مطمئن رکھنے کی کوشش میں اس نے ساری زندگی ہار دی۔

پھر اس نے گھوڑ دوڑ کی بازی جیتنے والے آدمی کو جب اس مقام مسرت پر دیکھا کہ سفیر رقیم کی پیکر جمال بیوی اس کے گلے میں اپنا موتیوں کا ہار ڈال رہی ہے تو ایک میٹھی ٹیس اس کے پہلو سے اٹھتی ہوئی احساس دلاتی ہے کہ گویا آرامی شہسوار اس کا رقیب ہے۔ یہاں اس نے حقیقت کو مسابقت کی صورت میں دیکھا اور وہ اسے ہیکل کی دنیا کے مقابلے میں زیادہ واضح نظر آئی۔ اور اس کے دل میں ایک نئے جذبے نے کروٹ لی "اگر میں بھی شہسوار ہوتا اور عوریب کی طرح گھوڑ دوڑ جیت لیتا تو سفیر رقیم کی حسین بیوی خوشی سے چمکتی ہوئی نگاہوں سے یونہی مجھے دیکھتی"۔ یہ درحقیقت کوئی نیا جذبہ نہ تھا، بلکہ یہ جذبہ اس کے دونوں چور جذبوں کے یکجا جمع ہو جانے سے نمودار ہوا تھا، ان دونوں کو اکٹھے ہو کر اس میدان میں کام کرنے کا موقع مل سکتا تھا۔ یہاں ایک طرف مسابقت کے زینے کے ذریعے برتری ملتی تھی، دوسری طرف سفیر رقیم کی بیوی کی چمکتی ہوئی نگاہیں۔ دونوں باہم دگر لڑتے ہوئے جذبوں نے مصالحت کر لی۔ بعلم نے سمجھا یہ اس کے اندر سے کوئی نئی چیز ابھری ہے، وہ ہر مرتبہ اسی طرح دھوکا کھاتا رہا!

لیکن ان دو جذبوں کے مصالحت کر لینے کے باوجود وہ کشمکش سے نجات نہ پا سکا، اس کے ذہن میں اب ہیکل کی دنیا اور ہیکل سے باہر کی یہ دنیا باہم دنگل لڑ رہی تھیں! اس کا حل اس نے یہ نکالا کہ ہیکل کی حاضری کے ساتھ ساتھ گھوڑ سواری کی تربیت بھی حاصل کرنی شروع کر دی۔ وہ اس میدان میں جس سرگرمی کا اظہار کر رہا تھا اس سے لوگوں کا گمان یہ تھا کہ یہ اگلے مقابلے میں ضرور شریک ہوگا۔ لیکن یکایک اس کا یہ جوش سرد ہو کے رہ گیا۔ کیوں؟ عوریب پر اسرار طور پر قتل کر دیا گیا تھا۔ اور بعلم کا اس واقعہ سے تاثر عجیب تھا۔ یہ کہ "وہ جس دنیا کی جانب کھنچا جا رہا تھا اس کی حقیقت بڑی دردناک تھی، اس کا آغاز اگرچہ پر بہار تھا لیکن اس کا انجام خزاں دیدہ تھا" ——— "وہ حقیقت سے شکب چاہتا تھا لیکن ایسی نہیں جس کے ساتھ یہ انجام منسلک ہو"۔

اور اب! ——— "وہ زندگی کے چوک میں وحشت زدہ اور سراسیمہ کھڑا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ کدھر جائے کیا اس زندگی میں کوئی شے ابدیت رکھتی ہے؟ اس زندگی میں کہیں سے ایسی بہار مل سکتی ہے جس کو خزاں کا خدشہ نہ ہو"؟

وہ ہیکل کی زندگی کو "مرجھائی ہوئی پنکھڑی" کی شکل میں اور اس کی باہر کی دنیا کو "خاردار پھولوں کی کیاری" کی شکل میں دیکھ رہا تھا، "جس کی اٹھان سفیر کی بیوی کی خوشی سے چمکتی ہوئی آنکھوں سے ہوئی ہے لیکن اس کا انجام عوریب کی برہنہ نعش ہے" ——— اور وہ سوچ رہا تھا "لیکن اس میں اتنی کشش کیوں ہے"؟

افسانہ نویس کس چابکدستی سے اپنے کردار کو منزل بہ منزل آگے لے جا رہا ہے، کس طرح اس کے احساسات کی کڑیوں سے

کڑیاں ملاتا جا رہا ہے، اور یہاں پہنچ کر اس نے اس کی نفسیاتی کیفیت کی کتنی مکمل تصویر بنا کے سامنے ڈال دی ہے "لیکن اس میں اتنی کشش کیوں ہے"؟ کا سوال ایسی جگہ ٹکایا ہے اور اس خوبی سے ٹکایا ہے کہ ہم بعلم کو جھکے ہوئے اعصاب کے ساتھ سوچتا ہوا پاتے ہیں بلکہ اس کی کنپٹیوں کی دھکن کو، اس کی نگاہوں کے مجہول پنے کو، اور اس کے فکری تعطل کو پوری طرح محسوس کرتے ہیں۔

یہ ہے جیلانی کی چابک دستی، اور یہی چیزیں افسانوں کو عظیم بنا دیتی ہیں۔

ذرا اور آگے چلیئے ——

"وہ اس سوال کا جواب نہ دے سکتا تھا۔ جب وہ اس دنیا سے منہ موڑنا چاہتا تو اس کے نہاں خانۂ دل سے آواز آتی، اسے مت چھوڑ! شبنم کی سی آنکھیں، گھنٹیوں کی سی نقرئی جھنکار، چاندنی رات میں دریا کی جھلملاتی لہریں، اور سپیدۂ سحر کی سی گداز باہیں پُرفریب نہیں ہو سکتیں! اتنی حسین چیزیں تکلیف دہ نہیں ہو سکتیں"!

ان چند الفاظ کو پڑھیئے، ایک بار پھر پڑھیئے، ان میں انسان کا مطالعہ کرنے اور مطالعہ کراتے کے جس کمال سے کام لیا گیا ہے، ان میں "جمال" کے حملے کے زور کو جس طرح دکھایا گیا اور اس کے مقابلے میں ایک انسانی کردار کا سفینہ گرداب میں جس طرح گھومتا دکھایا گیا ہے، کیا یہ ہر قلم دان کے بس کی چیز ہے!

بعلم جمال کے حملے کے سامنے بے بس نہ ہوتا تو کیا کرتا؟ "اس کی زندگی کی شاخ پر کونپل پھوٹ چکی تھی، وہ رجعت نہ کر سکتی تھی"! آپ کی کشتِ نفسیات میں جب باہر سے آکر کوئی بیج اول اول پڑتا ہے تو آپ اگر اسے فوراً اٹھا نہیں پھینکتے ہیں تو وہ جگہ پکڑ لیتا ہے، پھر وہ اُگتا ہے، اور ایک جوان پودا بن جاتا ہے۔ اس پودے کو اگر نوچا نہ گیا ہو تو پھر اس کی شاخ سے جو کونپل بھی پھوٹے گی وہ شاخ میں واپس لوٹ نہیں سکتی۔ بعلم کے ضمیر میں فتنہ کا ایک درخت جوان ہو چکا تھا اور اس سے پے در پے کونپلیں پھوٹ رہی تھیں، یہ کونپلیں اسے تنگ کرتی تھیں، مگر ان کو شاخ کے بطن میں واپس نہیں بھیجا جا سکتا تھا۔ فرمایئے ہمارے افسانہ نگار کا یہ مطالعۂ نفس اونچے درجے کی متاع ہے یا نہیں؟ کیا ہم اسے تیسرے درجے کی کباڑ میں ڈال دیں؟ ہم اس کی قدر نہ کریں؟ ہم اسے سینے سے نہ لگائیں؟ —— اور ایسا کر دیں تو ہماری ترقی رک جائے گی؟ اگر اس سے ترقی رکتی ہے تو اسے ضرور رک جانا چاہیئے!

بعلم کو اس کی بیماریٔ دل ایک نئے دور میں داخل کرتی ہے۔ اس نے نئے ہیکل کے لئے پتھروں کو تراشتے دیکھا تو وہ ٹھٹھک کر رہ گیا۔ اسے شمس کے نامکمل مجسمے کے ذریعے صورت گری کے سحر سے اولیں تعارف ہوا۔ اس سحر کی روشنی میں اسے حقیقت ایک ایسی شکل میں نظر آئی جو ہیکل کے باہر کی دنیا سے زیادہ .... حسین تھی اور اس میں پائیداری تھی —— "اس میں مایوسی نہ تھی، ہر آن امید تھی"! —— اور وہ دیکھتا تھا کہ "سنگتراش اپنی چھینی اور تیشہ لئے عدم و وجود کی سرحدوں پر کھڑا عدم کو وجود میں لا رہا تھا"! بعلم بچارے کی کیا بساط کہ وہ فن کی حقیقت کو اس بلند نگاہی سے محسوس کرتا، یہ جیلانی ہے جو اس کی ذہن کے سامنے چھینی اور تیشہ لئے عدم و وجود کی سرحدوں پر کھڑا ایک ایسی مہم میں مصروف ہے جس میں مایوسی نہیں، ہر آن امید ہی امید ہے! اس کی عظمت اس سے بہت بلند نظر آتی ہے کہ کوئی اس کا اعتراف کرے!

بعلم نے ایک روز سنگتراشی کے عمل کا مطالعہ کرتے ہوئے راز پالیا۔ اس نے بوڑھے سنگتراش کے ماتھے سے پسینے کے ٹپکتے ہوئے قطروں کے جھرمٹ میں اُن نگاہوں کو دیکھ لیا جو اپنے زیرِ عمل پتھر سے گذر کر "کہیں اور دیکھ رہی تھیں" —— "اور نقوش صورت اختیار کر رہے تھے اور صورت میں زندگی رچ رہی تھی"۔ اور اس نے محسوس کر لیا کہ "اس عملِ خلاقی میں عظمت بھی تھی اور حقیقت بھی"! اس نے یہ راز معلوم کر لیا کہ "آدمی دیوتا بن سکتا ہے لیکن صلاحیت تخلیق سے"! آدمی کے خیالات میں ایسی قوت تھی جس کے سامنے

آسمانوں کے طوفان ہیچ تھے"! اور یہاں پہنچ کر جیلانی کہتا ہے کہ "اس نے راہ پالی تھی" لیکن درحقیقت یہ بات جیلانی نہیں کہتا، بلکہ بعلم ہی کے ایک احساس کو بیان کرتا ہے، اور اس طرح بیان کرتا ہے کہ اس کے پیچھے جیلانی کے ہونٹوں پر یہ جملہ رقصاں نظر آتا ہے کہ "اس نے ایک اور فریب کھالیا تھا"ـــــ یہ ایک اور فنی کمال ہے اور اس کا پرتو کہانی میں کئی مقامات پر نظر آتا ہے۔

اور وہ معاً ایک سنگتراش بن گیا۔ اور پتھر نے اسے وہ کچھ دیا جو گوشت پوست کے دیوتا نہ دے سکے"، کیونکہ حقیقت کے مقابلے میں "خیال زیادہ حقیقی، سکون دہ اور لذت بخش تھا، جب یہ سانچے میں ڈھلتا ہے تو اس میں جادو پیدا ہو جاتا ہے"۔ "جب وہ خود تیشہ لے کر پتھروں میں جان ڈالنے لگا" تو اسے ایک انوکھا تجربہ ہوا کہ "اڑتے ہوئے نغمے یہاں زیر دام کئے جا سکتے تھے، بہتے ہوئے وقت کو بند لگایا جا سکتا تھا"ـــــ یہاں جیلانی پھر وہی اپنا ہتھکنڈہ استعمال کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "یہیں سچائی تھی، یہیں کمال تھا اور یہیں حقیقت تھی"! اب فرمائیے کہ سچائی، کمال اور حقیقت سے جیلانی نے ایک بڑا حصہ پالیا ہے یا نہیں؟

بعلم نے اس تبدیلی سے محسوس یہ کیا کہ جیسے اس کی گرہ ہمیشہ کے لئے کھل گئی ہے، جیسے اس کے ناسور کو مرہم مل گیا ہے۔ جیسے اس نے جو کچھ کھویا تھا وہ پالیا ہے، مگر یہ دھوکا تھا، ضمیر کا کانٹا پھر کھٹکنے لگا تھا، امولک کا مجسمہ بناتے ہوئے "جب وہ تھک کر ذرا سستانے بیٹھ جاتا تو معاً اسے خیال گزرتا، وہ کیا کر رہا ہے، وہ کہاں جا رہا ہے"؟

اہلِ قنوراب اسے بڑی تعظیم کی نظروں سے دیکھتے تھے اور اس کے باپ کے دل میں بھی اس کے لئے ایک نئی محبت ابھر آئی تھی۔ اور اپنے آپ کو اس مقام برتری پر پاکر بعلم ایک تسکین محسوس کرتا تھا۔ لیکن وہ یہ بھی محسوس کرتا تھا کہ "گویا وہ اپنا سب کچھ امولک کی بھینٹ چڑھا بیٹھا ہے، اور اب وہ بالکل خالی رہ گیا ہےـــــ بالکل خالی"! "اس بھینٹ سے اس کی روح و زندگی کے سوتے پھوٹنے چاہئیں تھے، نہ کہ بند ہونے چاہئیں تھے"!

اور پھر وہ بڈھا دیہاتی اس کی زندگی کے اسٹیج پر نمودار ہوتا ہے جو اس کا راستے میں گرا ہوا موتیوں کا ہار ہاتھ میں لئے آتا ہے، بعلم کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں، وہ پوچھتا ہے: "تم کون ہو ایسے بیش بہا موتی لوٹانے والے، جبکہ مدین کی بر شاہراہ رہزنوں سے اٹی پڑی ہے" اور جواب ملتا ہے "بعور کے بیٹے! ہر چیز سیاہ نہیں ہوتی"! دیکھئے تھوڑے سے لفظ ہیں لیکن ہیں موتی اور جیلانی موتیوں کا یہ ہار آپ کو پہنچانے آیا ہے۔ یہ مختصر سا جملہ پتھر کو تو نہیں، انسانی کلیجے کو ضرور چھید سکتا ہے، بشرطیکہ اس میں کچھ بھی جان ہو! ضمیر کو جھنجھوڑ سکتا ہے۔ بوڑھے نے دراصل یہ تیشہ چلایا تھا، یہ گویا چھینی کی ایک ضرب لگائی تھی لیکن پتھر ناکارہ تھا وہ ایک پیکرِ حیات میں ڈھلنے کا اہل ثابت نہ ہوا۔ وہ بڈھا دوبارہ آتا ہے، لیکن جب بعلم دیکھتا ہے کہ اس نے "بعلم کی جانب ملائم لیکن بت کی جانب کرخت نگاہوں سے دیکھا" تو اس نے سمجھ لیا کہ "یہ بوڑھا ضرور کوئی بے دین ہے جیسا کہ مدین میں بے دینی کی ایک رو پھیل رہی تھی"۔ بعلم کا آرٹ ایک پتھر کا مجسمہ تھا، اور بڈھے کا آرٹ ایک اخلاقی مظاہرہ! یہاں بت گری تھی، وہاں آدم گری! یہاں تخیل سے کھیلا جا رہا تھا اور وہاں حقیقت کا پرتو جلوہ افگن تھا، دو جوہر آمنے سامنے آگئے تھے مگر بعلم کی کسوٹی نے بڈھے کے جوہر کو کھوٹا کر کے پرے رکھ دیا!

یہاں جیلانی فن پرستی کا کھوکھلا پن چار لفظوں میں جس طرح بیان کر گیا ہے اور بے مقصد آرٹ کی حقیقت کو وہ جس چیرہ دستی سے بے نقاب کر گیا ہے، وہ اس کا حصہ ہے۔ بعلم سنگتراشی کی منازلِ کمال طے کرنے کے بعد اپنے آپ سے یہ سوال کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ "تو نے اس خلاقی سے کیا پایا؟" تو اسے اس کے سوا کوئی جواب نہ ملتا کہ تصور کی تصویر کشی! خیال کو محسوس کے سانچے میں ڈھالنے کی مہارت"! یہاں پہنچنے کے بعد جیلانی نے اس کی فن پرستی کے بے باطن ہونے کو کس خوبی سے نمایاں کیا ہے اسے ملاحظہ فرمائیے۔ وہ کہتا ہے: "لیکن جب وہ تصویر کا پردہ اٹھا کر تصور میں جھانکتا تو اسے (بقیہ بر صفحہ ۲۳)

نقد و عیار

(اشاعتِ خاص کے متعلق تعریف، تعریض اور تنقید)

تادمِ تحریر اشاعتِ خاص کے متعلق سوائے تسنیم کے سرسری تبصرے کے، معاصرین نے باقاعدہ اظہارِ رائے نہیں کیا ہے۔ چند رفقاء نے ذاتی تاثرات قلمبند کر کے بھیجے ہیں۔ ان میں ہمارے اہلِ قلم اور قارئین دونوں کے لئے بڑی افادیت ہے جگہ کی کمی کے پیشِ نظر مجبوراً عبارتوں کے زائد حصے بعض مواقع پر حذف کئے گئے ہیں۔ ادارہ اس کے لئے معذرت چاہتا ہے۔

محمد یعقوب طاہر ———

ورق الٹنے کے ساتھ ہی جو چیز سب سے پہلے آنکھوں کو لبھاتی ہے۔ وہ ہے "ہمارا کلمۂ ادب"۔ ایک خدا۔ ایک انسان ایک نظام۔ اگر کوئی شخص دنیا کے مختلف ادبی اسکولوں پر نگاہ رکھتا ہے۔ تو وہ انصاف سے ہمارے اس کلمۂ ادب کو دیکھے۔ اور بتائے۔ کہ اس سے زیادہ مختصر مگر جامع و ہمہ گیر کلمہ اس نے کبھی دیکھا ہے؟ اور پھر حقیقت نفس الامری کے اعتبار سے بھی اس سے زیادہ مختصر مگر حق بات کوئی اور ہو سکتی ہے؟ اس کلمے کو دنیا کی عملی سیاسیات کے چوکھٹے میں فٹ کر کے دیکھئے کہ کیا کہیں بھی کوئی ٹیڑھ باقی ہے؟ اور کیا اس ایک کلمہ کو پھیلانے سے زندگی کے سارے دکھ ختم نہیں ہو جاتے؟

چند یارانِ حلقہ میں مرتب نے ان چند ادیبوں کے قلمی خد و خال پیش کئے ہیں جو حلقہ ادب اسلامی کے نمایاں ادیب ہیں۔ اگرچہ یہ قافلہ ابھی راہروؤں پر مشتمل نہیں ہے۔ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ میدانِ ادب میں شہسواری بھی رفتہ دکھا رہے ہیں۔ (نہیں ایسا نہیں ہے! مرتب) البتہ عبدالکریم ثمر صاحب کو اس صف میں شامل کرنا کم از کم میرے لئے تو مشکل ہے۔

اب موضوعات ادب سامنے آتے ہیں۔ سب سے پہلے مرتب کی "سوچ بچار" ہے۔ جس میں "چراغِ راہ" کا مقصد واضح بتاتے ہوئے دراصل مرتب نے "ادب اسلامی" کی واضح اور غیر مبہم تعریف بیان فرمائی ہے۔ اور خوب بیان فرمائی ہے۔ اسلامی ادب جن جن مشکلات سے دوچار ہے ان سب کا کامیاب تجزیہ کیا ہے۔ لیکن جہاں "ترقی پسندوں" کی پھبتیوں کا جواب دیا ہے۔ وہاں احساس کمتری[1] بہت نمایاں ہو گیا ہے۔ بلکہ جیسا کہ بعض آئندہ نگارشات کے سلسلے میں عرض کیا جائے گا۔ مرتب نے نہایت کامیاب نگارشات پیش کرنے کے بعد جگہ جگہ فوراً ہی احساسِ کمتری کا بھی مظاہرہ شروع کر دیا ہے۔ یہ بات انتہائی غور و فکر کے باوجود میری سمجھ میں نہیں آ سکی۔ کہ انہیں اپنے آپ کو ترقی پسندوں کے ہاں سے سکہ بند ادیب منوانے کا شوق اندر ہی اندر کیوں کھائے جا رہا ہے۔ کیا ہانکے پکارے سے بھی کوئی بات کبھی مانی گئی ہے۔ آپ اللہ کے دین کو سربلند کرنے اٹھے ہیں۔ اپنی امکانی کوششوں کو امکانی استعداد سے پیش کرتے جائیے۔ اگر وہ فی الواقع حق کی

---

[1] یہ انکشاف بہت دلچسپ انکشاف ہے! — رفیقم! ترقی پسندوں سے منوانے کی کوشش نہیں کی گئی، رائے عام کو ان کی دعاوی سے آگاہ کیا ہے! روئے سخن کے کسی طرف ہونے کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ مخاطب بھی وہی ہے۔ یہ بالکل ویسا ہی ہے جیسے آپ موجودہ قیادت کی طرف روئے سخن کر کے کچھ باتیں کہتے ہیں، لیکن ان سے مقصود پبلک کا ذہن بنانا ہوتا ہے۔ یہاں کہاں سے آپ نے احساسِ کمتری کھود نکالا! (مرتب)

ترجمان ہیں۔ اور حق ہی کے لئے ہیں۔ تو پھر یہ فکر گھن کی طرح کیوں کھائے جا رہا ہے۔ کہ فلاں گروہ پھبتیاں کس رہا ہے۔ آپ یقین کریں جب تک آپ ان کے پورے کے پورے "دین" کو اختیار نہیں کر لیتے۔ وہ آپ کی کسی بات کو بھی مان کر نہ دیں گے۔

.... کہ فرصت اندک و کردوں دو رنگ است

حکیماں را دریں اندیشہ بگذار   شرر از تیشہ خیز دیا ز سنگ است   (اقبالؔ)

اس کے بعد ادبی و تنقیدی مقالات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اور سب سے پہلا مقالہ بعنوان پاکستان بننے کے بعد ادبی رفتار و رجحانات" جناب عاصی ضیائی صاحب کا ہے۔ عاصی ضیائی ہمارے حلقے میں صف اول کے ادیب اور نقاد ہیں۔ آپ نے بعد تقسیم کے ادبی رجحانات کا جائزہ لینے کے لئے بجا طور پر لفظ "پاکستان" کا پس منظر بھی واضح کیا ہے۔ چونکہ ادب زندگی کے بغیر محض بے جان ڈھانچہ ہے۔ لہذا زندگی جو جو رخ بھی اختیار کرتی جائے۔ ادب بہر حال اسی رخ مڑتا چلا جائے گا۔ اس نقطۂ نگاہ سے متحدہ ہندوستان میں حالات نے جو جو کروٹیں لیں۔ سرکار پرستی۔ ہندو۔ کانگرس۔ مسلم لیگ۔ کانگرس کی متحدہ قومیت کا نظریہ۔ ہمارے حقوق۔ ہمارے عہدے۔ ہماری روٹی۔ دو قومی نظریہ۔ شعوری اسلام۔ غیر شعوری اسلام۔ جارحانہ ہندوازم۔ غرض جتنے نظریے بھی بنتے رہے۔ ادب اسی نہج پر مڑتا رہا۔ لہذا ادبی رفتار و رجحانات کا جائزہ لینے کے لئے ناگزیر تھا۔ کہ وقت کے سیاسی رجحانات کا بھی محققانہ جائزہ لیا جاتا۔ سو عاصی صاحب نے خوب کیا۔ کہ ادبی جائزہ لینے سے پہلے مختصر سیاسی جائزہ لیا۔ اور پھر اسی جائزہ کی عین کوکھ سے ادبی رجحانات کو نکال کر لا کھڑا کیا۔ افسوس ہے کہ جائزہ کچھ مختصر ہے۔ آخر میں جو نپی تلی رائے دی گئی ہے۔ وہ "ترقی پسند" ادیبوں کے لئے سرمۂ چشم بصیرت ہے۔ "لیکن ضرورت ہے کہ اسلامی ادب کو قوم پھر فروغ دینے پر متحد ہو جائے۔ ورنہ ...... (غفلت کی صورت میں) اس ادب کا انجام بھی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے"۔ اس قسم کی خیرات اور زکوٰۃ کے سہارے ڈھونڈنے سے خدا جانے کیا حاصل ہو جائے گا۔ اگر آپ حضرات معاشرے کے دل کی دھڑکنوں کا صحیح علاج پیش کرتے رہیں۔ اور اس میں ادبیت اور رجحان بھی ہو۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ انسانیت آپ کو چھوڑ کر "گندگی" کی طرف ہی لپکے۔

مشرقی پاکستان میں ادبی و سماجی رجحانات کیا ہیں۔ پاکستان کے نصف حصے میں زندگی کا ہنجار کیا ہے۔ وہاں اسلامی ادب بھی ہے یا نہیں۔ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب کے لئے دل میں بہر حال ایک خلش تھی۔ الحمد للہ جناب فروغ احمد بی اے (علیگ) نے اس الجھن کو بھی دور کر دیا۔ آپ نہایت ہی مفید خدوخال مشرقی پاکستان کے ہمارے سامنے لائے ہیں۔ اور ادبی کے ساتھ ساتھ وہاں کے ہر جہتی حالات کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اسلامی ادبی نقطۂ نگاہ سے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا دیکھ کر دل کچھ غمگین سا ہوتا ہی ہے کہ فروغ صاحب یہ مژدۂ جانفزا سناتے ہیں۔ کہ "یہاں صالح عنصر بھی موجود ہے۔ جسے ملک کی ہمہ گیر اسلامی تحریک نکھار کر اوپر ابھار رہی ہے۔ اور اس تحریک کی آواز اب آہستہ آہستہ اسی صوبے کے دور دراز اندرونی گوشوں تک بھی پہنچ رہی ہے"۔ اور ڈھاکہ۔ چاٹگام، سید پور وغیرہ شہروں میں تو خاصے اثرات محسوس کئے جا رہے ہیں۔

اس کے بعد جناب حمید اللہ صدیقی بی اے کا مقالہ بعنوان "پاکستان کے ترقی پسند ادب کا ایک سرسری جائزہ" سامنے آتا ہے۔ مقالہ نگار کی کسر نفسی کی داد دیجئے۔ کہ ترقی پسند ادب کو بالکل عریاں کر کے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ مگر پھر بھی اسے "سرسری جائزہ" ہی فرما رہے ہیں۔ اور نعیم صاحب کا بھولپن بھی خوب ہی ہے کہ جہاں کہیں حمید اللہ صاحب کے ہاتھ سے خنجر گر گیا ہے۔ وہاں جھٹ سے نیزہ بھالا ان کے ہاتھ میں تھما دیا ہے۔ یا جہاں کہیں ترقی پسندوں نے ( ) کیا ہوا تھا۔ نعیم صاحب نے مقالہ نگار کا قلم پکڑ کر عین اسی جگہ دے مارا ہے۔ اور پھر بھی "معذرت" کر رہے ہیں۔ (اور اس "بھولپن" اور "معذرت" کی جو داد مجھے ملی ہے، وہ بس میرے ہی لئے خاص ہے۔ مرتب)

اس مقالہ میں مجھے صرف ایک جگہ مقالہ نگار کی رائے سے اختلاف ہے۔ ورنہ بحیثیت مجموعی یہ کامیاب ترین مقالہ ہے۔ مقالہ نگار نے

ترقی پسندوں کی چند اچھی نظمیں بھی پیش کی ہیں۔ صفحہ ۲۶ پر مجھے ۱۵ اگست والی نظم سے اختلاف ہے۔ نفس مضمون کے لحاظ سے نظم واقعی اچھی نظم ہے۔ لیکن اگر فن کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اس کے کئی اشعار وزن کے لحاظ سے بالکل ناقص ہیں (اغلباً سہو کتابت ہے مرتب) ملاحظہ فرمایئے:۔

وہی کس مپرسی وہی بے حسی آج بھی ہر طرف کیوں ہے طاری	وہی کس مپرسی وہی بے حسی آج بھی ہر طرف کیوں جہاں میں ہے طاری
مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے یہ میری محنت کا حاصل نہیں ہے	مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے ہمدم کہ یہ میری محنت کا حاصل نہیں ہے
ابھی تو وہی رنگ محفل، وہی جبر ہے، ہر طرف زخم خوردہ ہے انسان	....
جہاں تم مجھے لے کے آئے ہو یہ وادیٔ رنگ بھی میری منزل نہیں ہے	....
شہیدوں کا خون اس حسینہ کے چہرے کا غازہ نہیں ہے	شہیدوں کا خوں اس حسینہ کے ۔!!!؟ چہرے کا غازہ نہیں ہے
جسے تم اٹھائے لئے جا رہے ہو۔ یہ اندھیری شب کا جنازہ نہیں ہے	....

اسی طرح احمد ندیم قاسمی صاحب کی نظم صفحہ ۲۶ کا ایک مصرع "کونپلوں کے آگے ہیں انگارے اجن کی حدت سے تپ رہا ہے چمن یہاں کونپلوں کے آگے پڑھا جائے تو وزن گرتا ہے۔ اگر اُگے پڑھا جائے تو وزن ٹھیک رہتا ہے۔ اور "آگے" سہو کتابت بن جاتی ہے۔

اس کے بعد جناب ماہر القادری صاحب نے "پاکستان میں مشاعرے" میں مشاعروں کی تاریخ خوب بیان کی ہے۔ لیکن اس بحر کے غواص ہونے کی حیثیت میں ان کا مقام یہ بھی تھا۔ کہ وہ مشاعروں کو ملک و ملت کے لئے مفید بنانے کے سلسلے میں کچھ مشورے بھی دیتے۔ لیکن انہوں نے صرف "واقعہ نگاری" ہی کو کافی سمجھا ہے۔ اور اس طرف توجہ نہیں دی۔

اب ہمارے سامنے جناب اصغر علی عابدی صاحب کا مقالہ بعنوان "افسانہ کی بنیادی قدریں" آتا ہے۔ فاضل مقالہ نگار نے اس مقالے کے ذریعے جہاں اس حقیقت کو اجاگر کیا ہے کہ افسانہ کے قدیم، جدید اور جدید ترین تصورات و رجحانات صدیوں کی کاوشوں کے بعد اب آہستہ آہستہ اپنی عمر کے آخری دور میں پہنچ کر ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ اور "جدید ترین" نظریات یعنی کمیونزم اور مغربی سیکولرزم کے خود اپنے اندر سے بغاوت پھوٹ پڑی ہے۔ وہیں انہوں نے یورپ اور بعض دوسرے ممالک کے فنکاروں کی تازہ تخلیقات پیش کر کے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ اب دنیا کے مختلف گوشوں سے صحیح الفکر ادیب بالکل غیر شعوری طور پر ایک ہی قسم کی افسانوی قدریں —— جو عالمگیر بھی ہیں۔ اور سچی تعمیر و اصلاح کا جذبہ بھی لئے ہوئے ہیں —— ابھار ابھار کر سامنے لا رہے ہیں۔

اس کے بعد نعیم صدیقی کا مقالہ بعنوان "اسلامی ادب کا فلسفیانہ پس منظر" ہے۔ جس میں فاضل مقالہ نگار نے مادہ پرستانہ ادب کی نظریاتی بنیاد کی نشاندہی کرتے ہوئے بتایا ہے کہ کس طرح انسان نے خدا کو عملی زندگی سے خارج کر کے ایک ایسا نظریہ ادب پیدا کیا ہے جس نے بالآخر انسانیت کے مقصد عظمیٰ کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی ہیں۔ اور آج دنیا کو ایسے مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔ جہاں سے قحط اور افلاس کے سوتے پھوٹتے ہیں جہاں سے بہیمیت اور چنگیزیت پروان چڑھتی ہے۔ اور جہاں سے دکھی دنیا کے لئے جنگوں کے مہلک پھل مہیا ہوتے ہیں۔ اس کے بعد دورِ حاضرہ کے اربابِ دانش و خدایانِ شعر و ادب کے فکری دیوالیہ پن کا ماتم کرتے ہوئے کیا خوب کہا ہے۔ کہ "وہ لوگ بڑے ہی قابلِ رحم ہیں جو موجودہ چلتے ہوئے مرکب نظاموں میں سے کچھ کسی کے فریب خوردہ ہیں۔ اور کچھ کسی کے سحر زدہ! ان کے لئے اپنے دورِ تہذیب سے بالاتر ہو کر سوچنا ممکن ہی نہیں۔ یہ مرعوبیت کے مقام سے اوپر ہو کر تنقید کی نگاہ ڈالنا چاہتے ہی نہیں ہیں۔ یہ بجز اس کے کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ کہ اپنے دورِ تہذیب کی منڈی میں جا کر ایک مال کے مقابلہ میں دوسرا مال پسند کر لیں —— آہ! ایک نئی متوازی منڈی قائم کرنے کے لئے جو اونچے درجے کی فکر مطلوب ہے۔ وہ ان کو قدرت کی طرف سے ارزانی ہی نہیں ہوئی"۔..... اس کے بعد اسلامی ادب کا نہایت واضح نقشہ کھینچتے ہوئے کہا ہے "خوب سمجھ لیجئے! اسلامی ادیب کیا کرنے چلا ہے۔ وہ افسانہ و نظم میں فقہ کے مسائل بیان کرنے نہیں اٹھا۔ وہ

اسلام کے قوانین وضوابط کو ادبی جامہ پہنانے نہیں لگا۔ وہ اسلام کے سائنٹفک سماجی تصور کو اپنی ادبی فکر کے لئے سانچے کے طور پر استعمال کرنے کا تجربہ کر رہا ہے۔ اس کے بعد پھر وہی احساس کہتری نمایاں ہو جاتا ہے۔ فرماتے ہیں، کیا اسلامی ادیب کو یہ حق نہیں پہنچتا۔ کہ وہ مارکس کے سماجی تصور کو ادب میں سمونے والے ادیبوں کے بخلاف محمد صلعم کے دئے ہوئے سماجی تصور کو ادب کی رگوں میں خون بنا کر دوڑا دے؟

جناب عاصی ضیائی نے "شکار یہود" نامی تمثیلیے میں یورپ کی انفرادی مذہبیت اور اور اس کے تقاضوں سے انسانی فرار کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے

اب مجھے نظموں اور غزلوں کے متعلق بھی کچھ عرض کرنا ہے۔ تفصیلی گفتگو سے پہلے اگر ایک عمومی بات گوش گذار کر دی جائے۔ تو شاید بیجا نہیں ہوگا۔ نعیم صاحب نے نثر کے سلسلے میں جو افسانے، خاکے اور مقالے اس "اشاعت خاص" میں پیش کئے ہیں۔ وہ نہایت ہی قابل قدر ہیں۔ مگر افسوس کہ منظومات کا معیار اتنا بلند نہیں ہے۔ جتنا کہ اس اشاعت کا تقاضا تھا۔

سب سے پہلی نظم ضیا محمد ضیا کی "منزلیں وہ راہ دشوار" پر نگاہ ڈالئے۔ پہلے حصے میں کسی قدر بے جا تعلی سے کام لیا گیا ہے۔ گویا اسلامی ادیبوں نے فکری دنیا کو زیر و زبر کر کے رکھ دیا ہے۔ بلاشبہ انہوں نے کچھ کام کیا ہے۔ لیکن اس کے اظہار کے لئے آخر یہ کیا طرز بیان ہے۔ کہ تم نے یہ کر دیا وہ کر دیا۔ جبکہ خود فاضل مرتب (فاضل مرتب کی ترکیب کی روح تکلف بلائے جان ہو کر رہ گئی ہے۔ مرتب) جگہ جگہ ابھی یہی رونا روتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں کہ ہم ایک نیا تجربہ کر رہے ہیں۔ ہم سے غلطیاں بھی سرزد ہو رہی ہیں۔ ہم پر پھبتیاں کیوں کسی جا رہی ہیں۔ اور پھر عاصی ضیائی اور دوسرے ادیب بھی ابھی یہی کہہ رہے ہیں۔ کہ اسلامی ادب ابھر ضرور رہا ہے۔ مگر ابھی وہ اپنی ابتدائی منزل میں ہے۔ پھر ایک شعر میں محترم ضیا صاحب کتنی بڑی اور فاش غلطی کر گئے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

تم نے محسوس جو کچھ دلوں میں کیا پوری جرأت سے تحریر کرتے رہے
ماسوٰی کی غلامی کے احساس کو زندہ کرنے کی تدبیر کرتے رہے

یہاں "ماسونی سے بغاوت کے احساس کو" ہونا چاہئے تھا۔ لیکن "ماسونی کی غلامی کے احساس کو" کہہ کر بات کو کیل سے کیا بنا دیا ہے[1]۔ اسلامی ادیبوں کو اتنا کچھ دکھانے کے بعد یکایک ان کے "سو جانے" کا ماتم شروع کر دیا گیا ہے۔ پھر آخر میں خودی کے بلند پرواز شاہین گرنے پر آتے ہیں۔ تو آکر کہاں گرتے ہیں۔

اسعدؔ نکتہ داں کی ادائے حیلہ ماہر خوش زباں کا بیاں لے چلو
ہمرابِ نعیمؔ سخنداں ہوں ہیں، مجھ کو بھی ہمرہِ کارواں لے چلو

معاف کیجئے۔ اسلامی ادیب کو اس سے بہت بلند ہونا چاہئے[2]۔ پھر انہی ضیا صاحب کی دوسری نظم "ساقی سے" ایک شعر ملاحظہ ہو جہاں تہذیب کی بنیاد ہو الحاد پر قائم وہاں دل کی صفائی اک خیالِ خام ہے ساقی" اس میں الحاد کی بنیاد پر قائم ہونیوالی تہذیب اور دل کی گندگی کو ایک عام قاعدہ وکلیہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ واقعہ کے خلاف ہے۔ تحریک اسلامی میں جو لوگ دوسری تحریکوں سے کٹ کٹ کر آئے ہیں۔ وہ بھی بطور ثبوت پیش کئے جا سکتے ہیں۔ اور پھر یورپ کی الحاد زدہ فضاؤں سے یہ جو انسانیت عظمیٰ اور مذہب و اخلاق کے احیا کی آوازیں بہت سے مغربی فلاسفہ و مفکرین کی طرف سے آ رہی ہیں۔ جن کا ادنیٰ سا خاکہ جناب اصغر علی عابدی صاحب نے اپنے مقالہ "افسانہ کی بنیادی

---

(1) مرض کا احساس وہ نا، پستی کا احساس پیدا کرنا اور اس طرح کسی کی غلامی کا احساس زندہ کرنا اسی مقصد کے لئے ہوتا ہے کہ اس سے نجات کی فکر پیدا ہو۔ پہلے نامرغوب حالت کا احساس ہوتا ہے، پھر اس سے نجات یا بغاوت کے لئے اقدام (مرتب)

(2) یہ گرفت نہایت اہم ہے۔ رفقا کو باہم محبت ہو سکتی ہے اور بالکل مخلصانہ ہو سکتی ہے، مگر وہ تو بس دل میں رکھنے کی چیز ہے، اشتہار دینے کی نہیں (مرتب)

قدیں" میں پیش کیا ہے۔ وہ آخر کیا ہے (شاعر کا مدعا شاید یہ ہو کہ تقویٰ کی حالت کمال ایک فاسد ماحول میں انسان کی دسترس سے بالاتر رہی ہے۔ (مرتب)

جناب ماہر القادری نے اپنی نظم "قرآن کی فریاد" میں ہمارے معاشرہ اور اس میں قرآن کی مظلومی کا نقشہ کچھ ایسے انداز میں پیش کیا ہے کہ دل پر ایک گہری چوٹ لگتی ہے جو مایوسی کے بجائے ایک حساس مومن کی غیرت دینی کے لئے تازیانے سے کم نہیں۔ لیکن ماہر جیسے ماہر فن سے زیادہ اس حقیقت کو کون سمجھ سکتا ہے کہ نظم نفس مضمون کی واقعیت کے ساتھ ساتھ شعریت سے بالکل خالی ہے جناب علی منظور کی "الدین کلہٗ ادب" شمیم جاوید کی "موسٹ ارجنٹ" اور کوثر نیازی کی "ایک رفیق کے نام" کامیاب نظمیں ہیں۔ جن میں تینوں حضرات نے تین کردار پیش کئے ہیں۔ صوفی، جاہ پسند لیڈر اور عزیمت و اخلاص سے ڈر کر راہ حق سے فرار اختیار کر جانیوالا حق کا سپاہی جناب مظفر گجراتی صاحب کی نظم "ذخیرہ اندوزوں سے" صفحہ ۱۲۴ جناب ابوسعید حیرت کی نظم "منشور آزادی" صفحہ ۱۳۵ اس قابل نہ تھیں کہ انہیں اس خاص اشاعت میں شامل کیا جاتا۔ ان میں ادبیت اور شعریت کے بجائے محض واقعات کو نظم کر دیا گیا ہے۔ نعیم صدیقی صاحب کی نظم "کیوں" کا ایک شعر یہ شفاخانے، یہ جراحی کدے۔ "یہ جراحی کدے" کی ترکیب آج پہلی بار نظر سے گذری۔ ذوق اجتہاد بھی کیا کیا گل کھلاتا ہے۔ پھر یہ دوائیں۔ یہ اطبا الاماں۔ آدمی بے وقت پھر مرتا کیوں؟ حیران ہوں کہ نعیم صاحب اس "بے وقت" کی رو میں کس طرح بہ گئے۔ "چاند تاروں کی یہ صیادی کا عزم" جلاد کی جلادی ملاحظہ کیجئے۔ "صیاد کی صیادی یہ رنگ لائی"۔ اس مفہوم پر غور کیجئے۔ اور پھر نعیم صاحب کا مندرجہ بالا مصرعہ دوبارہ پڑھئے۔ شاعر "چاند اور ستاروں کا شکار کرنے کا عزم" کہنا چاہتا ہے۔ مگر مصرعہ کا مفہوم کچھ اور ہی ہو گیا ہے۔ پھر بحیثیت مجموعی یہ نظم نظم نہیں۔ ایک مختصر مقالہ ہے۔ جس کے (hints) نوٹ کئے گئے ہیں۔ لیکن الفاظ کا دروبست نہ مقالہ کے لئے موزوں ہے۔ اور نہ نظم کے لئے۔ نعیم صاحب کی دوسری نظم "مرے احوال" نفس مضمون کے لحاظ سے کامیاب ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ فنی خامیاں بھی رکھتی ہے۔ مثلاً:۔

وہاں جہاں کہ شعاعوں سے شعر ڈھلتے ہیں — تو شعر ڈھلتے ہیں، پھر بھی سکوں نہیں ملتا! — تو محض تکلف[1] اور غیر ضروری

ایک اور شعر — "میں اپنی جان کا سارا سکوں لٹاتا ہوں — سکوں لٹاتا ہوں، پھر بھی سکوں سا ملتا ہے!

"یہ سکونس" ملتا ہے خدا جانے کیا بلا ہے[2] اگر سیدھی طرح "سکون ملتا ہے" کہ دیا جاتا۔ تو شعر پر آخر کونسی قیامت ٹوٹ پڑتی؟ پھر آپ کی نظم "چڑیل" سامنے آتی ہے صفحہ ۱۲۷۔ یہ کامیاب ترین نظم ہے۔ اور میرے خیال میں "اشاعت خاص" کی ساری نظموں کی جان ہے۔ اس میں ایک ٹرام کی "بچی کی لاش" کو دیکھ کر فاضل شاعر نے اس فاسد اور خبیث تہذیب کا نقشہ کچھ ایسے انداز میں پیش کیا ہے۔ اور پھر حساس انسانوں کے دلوں میں اس ماحول کو بدلنے کے لئے احساس کے تاروں کو کچھ اس طرح جھنجھوڑا ہے کہ ان کے لئے دل سے بے اختیار دعائیں نکل رہی ہیں۔

جناب ابوسعید حیرت صاحب کی نظم "منشور آزادی" میں فنی غلطیاں بھی ہیں۔ ملاحظہ کیجئے۔ "مقدر پھر گئے چشم زدن میں فاقہ مستوں کے" اصل لفظ چشم زدن ہے چشم زدن نہیں۔ پھر دو شعر اور ملاحظہ فرمائیے:۔

سمجھتے ہیں کہ اس میں بادشاہی مل نہیں سکتی — سمجھتے ہیں کہ بندوں کو خدائی مل نہیں سکتی

اسی خاطر مجھے لایا گیا ہے اک دوراہے پر — خداوندا تو اس مشکل میں مری رہنمائی کر

ان میں شاعر کہنا کچھ اور چاہتا ہے مگر کہہ کچھ اور ہی گیا ہے۔ اب میرے محترم دوست طالب حجازی کی نظم "کربلا" ملاحظہ فرمائیے۔ ایک شعر

---

[1] نہیں جناب! بند میں پہلے ذکر ان فضاؤں میں اڑنے کا کیا گیا ہے جہاں شعاعوں سے شعر ڈھلا کرتے ہیں اور یہاں بتایا گیا ہے کہ ماضی پھر وہاں شعر ڈھلنے لگتے ہیں، لیکن پھر بھی سکون نہیں ملتا یہاں "تو" وہی کام کرتا ہے جو عربی میں حرف "ف" کرتا ہے (مرتب)

[2] خدا جانے آپ نے کس پیمانے سے وزن کیا ہے۔ "سکونس" کی شکل پیدا نہیں ہوتی بلکہ "سکوں سا ملتا ہے" کی شکل بنتی ہے! پھر جانچئے (مرتب)

ٹرٹ گیا خانوادۂ حضرت حیدر کے دین پر ہے کوئی اللہ کا بندہ ؟ میں نے خانوادہ کی بجائے خاں وادہ کی ترکیب کبھی دیکھی ہو۔ کیا خانماں کو کسی نے کبھی خاں ماں باندھا ہے ؟ ایک اور شعر بھی ملاحظہ کیجئے آن کے ہاتھوں سے لٹی بارِ رسالت کی بہار جو نمازوں میں ادا کرتے رہے صلِّ علیٰ" اگر یہاں "سدا کہتے رہے صلِّ علیٰ" ہوتا۔ تو زیادہ موزوں بھی ہوتا اور زیادہ فصیح بھی۔

جناب جیلانی بی اے نے قصصِ قرآنی میں سے بلعم بن بعور کا قصہ (سورۂ اعراف) افسانوی رنگ میں لکھ کر ایک نہایت ہی اہم حقیقت پر سے پردہ اٹھایا ہے۔ جیلانی صاحب نے یہ افسانہ لکھ کر انسانی نفسیات کا کتنا گہرا تجزیہ کیا ہے، اور اس کے نفس کے کیسے کیسے مقامات دکھائے ہیں۔

نعیم صدیقی نے "میرا گاؤں" میں دیہاتی زندگی کے مختلف گوشے اجاگر کئے ہیں۔ اور سعادت حسن منٹو کی طرح مختلف پہلوؤں کی صرف عکاسی کی ہے۔ یعنی "جو کچھ ہو رہا ہے" واضح کیا ہے۔ "جو کچھ ہونا چاہئے" کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔ کسی جگہ بھی فطری طور پر اصلاح کی طرف کوئی رہنمائی نہیں کی گئی ہے۔ صرف فسادات کے سلسلے میں ایک امیر خان کے کردار کی بہت ہلکی سی جھلک دکھائی ہے۔ لیکن وہ بھی صرف گھر میں ہی بڑا پیچ و تاب کھاتا دکھایا ہے۔ حالانکہ اسے تنہا ہونے کے باوجود سر دھڑ کی بازی لگا دینے والا دکھانا چاہئے تھا، جبکہ ایسے کردار فی الواقع موجود بھی ہیں[1]۔ اور انہوں نے ان دنوں میں تعجب انگیز حد تک کام بھی کیا تھا[2]۔

اس کے بعد نعیم صاحب ایک بالکل نئے اور اچھوتے انداز کی "رپورتاژ" سامنے لاتے ہیں۔ "بھوکا ہے پنجاب" گندم کے سلسلے میں جو جو کچھ ملت پر گذری ہے۔ اور ارباب اقتدار نے جس جس انداز میں اس مسئلہ کو اپنی نااہلی اور ناعاقبت اندیشی سے الجھایا ہے۔ وہ سب کچھ اخبارات کے صفحات میں آتا رہا ہے۔ نعیم صاحب نے اخباری واقعات کو خطوط کے رنگ میں ارباب اقتدار ہی کو مخاطب کر کے ان کا کیا دھرا انہی کے منہ پر دے مارا ہے۔ نعیم صاحب نے آخری بچ تو ایسا دیا ہے کہ اگر یہی بیل دیہاد رہے۔ تو ارباب اقتدار کے بڑے سے بڑے مداح اور "جی حضوری" بھی ایک نہ ایک دن چیخ اٹھنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ شاید ان "ایک نو سوال" تک بھی یہ الفاظ پہنچیں گے یا نہیں ؟ واقعات کی ان کڑیوں میں نعیم صاحب ایک کڑی بھول گئے ہیں۔ اور وہ مرکزی وزیر خوراک پیرزادہ عبد الستار کا وہ اعلان ہے۔ جو انہوں نے ریاست بہاولپور اور سندھ کے راستے چھ کروڑ روپے کی ناجائز برآمد کی جانے والی گندم کے سلسلے میں کیا تھا۔ اور یہ رونا رویا تھا۔ کہ حکومت تقریباً سات سو ناجائز برآمد کے مقدمات رجسٹر کرنے کے باوجود مقدمات میں "خاطر خواہ" کامیابی حاصل نہیں کر سکی۔

جناب فضل من اللہ صاحب کا افسانہ مالِ حرام صفحہ ۱۹۰ اس قابل نہ تھا۔ کہ اسے اس "اشاعت خاص" میں شامل کیا جاتا۔

"جزیرۂ زندہ دلاں" پاکستان کی تقریباً ساری ہی آبادی کے لئے سرمۂ چشمِ بصیرت ہے۔ ان کے لئے بھی جو یہاں تحریک اسلامی کو ملائیت اور پاپائیت کے مہیب نام دے دے کر بے حیائی، عریانی، بدکاری اور مغرب کی ہر وہ برائی یہاں جاری و ساری کرنا چاہتے ہیں اور ان کے لئے بھی جو یہاں فرنگیت اور فسق و فجور کے اس سیلاب کے مقابلہ میں سر دھڑ کی بازیاں لگا کر اللہ کے دین کو عملاً برپا کرنے کی جد و جہد کر رہے ہیں۔

جلال صاحب کا "مسٹر کا موڑ" نامی طنزیہ (صفحہ ۱۹۰) بالکل بے معنی سا اور زبردستی سے لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ بھلا یہاں طوطوں کی کیا تک تھی۔ پھر طنز بھی بالکل عامیانہ ہے۔ اور ان میں بھی پوری عکاسی نہیں کی گئی ہے۔ ایسے "نو مشقی" مضامین خاص اشاعتوں میں ہی نہیں

---

[1] یہ حق تو بہر حال آپ افسانہ نگار کو دیں گے ہی کہ وہ کردار اپنی مرضی سے لے۔ پھر کیا امیر خاں کا کردار بھی واقعی نہیں ہے ؟ اور اس کی کمزوری کو اجاگر کر کے افسانہ نگار نے اپنے مقصد کی کیا کوئی خدمت نہیں کی ؟ (مرتب)

[2] میں اپنے افسانے کا ڈیفنس کرنا نہیں چاہتا، لیکن اگر یہ کسی اور کے قلم سے ہوتا تو پھر میں بتاتا کہ مقصدیت اسمیں کس حد تک ہے، لیکن اب تو چپ ہی بھلی! (مرتب)

آنے چاہئیں۔

غزلیات میں مندرجہ ذیل اشعار پسند آئے۔

(عاصی کرنالی) مسخ لیلیٰ ہی کو چاہیں، یہ کوئی شرط نہیں — اپنے مقصد کا جو عاشق ہے وہی مجنوں

(احمد پرویز) بن گیا پاکے دستور سازی کا فن — آدمی، آدمی کا خدا ان دنوں

(ضیاء) زمامِ رہبری برگیر از دے — کسے کز رہزنی عارے ندارد

(ابو ظہیر) الٰہی پھر عطا کر وہ قلندر اس زمانے کو — جو سمجھانے کو اسرار و رموزِ الکتاب آئے

(شاکر تسلیم) برزخمِ دل ہے موجِ تبسم لئے ہوئے — اک جنبشِ نظر سے ذرا مسکرا کے دیکھ
دیکھیں کسے ملے وہ حیات آفریں سرور — سجدہ کروں میں اور تو ساغر اٹھا کے دیکھ

جناب ظہور الحق صدیقی اور جالب سلیمی کی غزلیں (صفحہ ۲۱) اشاعتِ خاص کے قابل نہ تھیں۔ اگر یہی اشعار کسی ترقی پسند رسالے میں ہوں تو کوئی قبول کر بھی لے لیکن یہاں "صالحیت" کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا۔ ظہور الحق کی غزل میں "سینے سے سویرا پھوٹنا" اور "نئے دور کے آغاز کا عنوان" پڑھ کر تعجب ہوا۔ ظہور الحق صاحب کی غزل میں تو پھر بھی معنویت تو کم از کم موجود ہے۔ جالب سلیمی صاحب کے تینوں شعر بالکل بے معنی ہیں مفہوم اور فن دونوں کے لحاظ سے "بہت در بدر ٹھوکریں کھا کے پہنچے" کی بجائے اگر "بڑی ٹھوکریں کھا کے ہم یاں ہی پہنچے" ہو۔ تو زیادہ وضاحت ہو جاتی ہے۔ نیم صاحب کی غزل (۴۴) میں امید! اب وہ تیرے سہارے کہاں گئے۔ یعنی اے امید! اس طرح کی ندا کا مورد صرف اسم معرفہ ہی ہو سکتا ہے[1]۔

---

[1] خدا جانے آپ یہ قاعدہ کہاں سے اُڑس لائے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے اساتذہ کے نظائر:۔

مطرب! بیک دو نغمہ غنی کن دلِ فقیر! — ساقی! بیک دو جرعہ سخی کن لئیم را
عزیزاں! جاں فدا کردم، سر و ساماں ہبا کردم — بنرزم گوشۂ چشمے! بنازم بے نیازی را
بادِ صبا! اگر بہ مدینہ گذر کنی!

صیاد! اسیرِ تارِ رگِ گل ہے عندلیب — چھپ کر دکھا رہا ہے اُسے آب و دانہ کیا!
تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو — دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں
تو کہاں جائیگی؟ کچھ اپنا ٹھکانہ کر لے — ہم تو کل خوابِ عدم میں شبِ ہجراں! ہونگے!
ہاں برس! ابرِ کرم! دیر نہیں ہے ابھی — کہ نہ ہونے کے برابر ہوا ہونا اپنا
نسیمِ صبح! تیری مہربانی!

حریفِ کاوشِ مژگانِ خونریزش نئی ناصح! — بدست آور رگِ جانے و نشتر را تماشا کن
مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ! تو نہ مر جائے — کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے
در مجلسِ ما زاہد! زنہار تکلف نیست — البتہ تو می گنجی، عمامہ نمی گنجد
جوانی میں سفر کے واسطے سامان کر غافل! — مسافر شب سے اٹھتے ہیں جو جانا دور ہوتا ہے
اے عندلیب! مل کر کریں آہ و زاریاں — تو ہائے گل پکار، پکاروں میں ہائے دل!
مشکل نہیں یارانِ چمن! معرکۂ باز — پر سوز اگر ہو نفسِ سینۂ دُرّاج

(باقی [illegible] پر)

مثلاً

اقبال! اب وہ تیرے سہارے کہاں گئے

دوسرا شعر: کیسی یہ بندگانِ زمانہ اخدا کی یاد۔ یہاں بھی وہی ابہام ہے یعنی شاعر کہنا چاہتا ہے۔ کہ اے بندگانِ زمانہ اب یہ خدا کی یاد کیسی ہے؟ مگر شعر میں وہ بات نہیں بنتی۔

تیسرا شعر: اللہ مستیوں پہ مری طنز کیوں بتو۔ اللہ مستیوں کی عربی فارسی ترکیب بے جوڑ بنی ہے[1]۔

نعیم صاحب: تمام عمر جہنم میں کٹ گئی، لیکن۔ تمام عمر ہی جنت کے خواب دیکھے ہیں۔ (صفحہ ۲۱۹) بڑا خوب شعر ہے۔ اور انحطاط زدہ ملت اسلامیہ اور دوسری تمام قوموں کے ماضی و حال کی سو فیصدی عکاسی کی گئی ہے۔

در بدر سجدہ پاشیاں کیسی! سر کسی آستاں پہ پھوڑ دیجی۔ خوب شعر ہے۔

صفحہ ۲۲۰ اور ۲۲۱ کی دونوں غزلیں خوب ہیں۔

صفحہ ۲۲۲: جال ہیں پنجرے ہیں دانے ہیں۔ خدا جانے یہ "تپن بھرے" کس لغت کے لحاظ سے باندھا گیا ہے؟

ظہور پاکستان اور اس کا پس منظر" میں ضیا محمد صاحب نے پاکستان کا پس منظر خوب بیان کیا ہے۔ زیادہ تفصیلات سے بچتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ مقالہ کامیاب ہے۔ اس کے بعد ایک صفحہ ادارہ کی طرف سے "کارنامے" کے عنوان سے شامل اشاعت ہے۔ یہ ایک صفحہ کیا ہے۔ مسلم لیگی قیادت کے ساڑھے پانچ سالہ دورِ حکومت کی بہترین عکاسی ہے۔

مولینا محمد عبدالرحیم صاحب نے "مشرقی پاکستان" صفحہ ۲۳۷ میں مسلم لیگی سیاست کو اتنے اچھے پیرائے میں اجاگر کیا ہے۔ کہ اس سے قبل اس انداز میں نصف پاکستان یعنی مشرقی پاکستان کے سیاسی حالات سے مغربی پاکستان کے لوگوں کو کسی اور شخص نے روشناس نہیں کرایا تھا۔

دستور پاکستان کیسا ہونا چاہیئے۔ اگر وہ مادہ پرستانہ اور لادینی ہو تو اس دنیا میں امن کی بجائے ایک اور مفسد گروہ کا اضافہ ہو سکتا ہے۔ اور اگر وہ اسلامی ہو تو خود پاکستانی قوم اور پھر ساری دنیا —— سارے "ازموں" کی ستائی ہوئی دنیا —— کو کیا کیا فوائد حاصل کرائے جا سکتے ہیں۔ اس پر س۔ ل۔ ظفر صاحب نے "دستور پاکستان" نامی مقالہ میں نہایت اچھی اور مدلل روشنی ڈالی ہے۔ مگر افسوس کہ مقالہ مختصر بہت ہے۔

جناب ابو سلیم ایم اے "پاکستان کی تعلیمی حالت کا جائزہ" ایک کامیاب جائزہ ہے۔ جس میں ارباب اقتدار کے عزائم اور اسلامی نظامِ تعلیم کی ضرورت اور اہمیت کو نہایت اچھے انداز میں اجاگر کیا گیا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صـــ؛

جاگ سوزِ عشق جاگ!

بہار! از بادہ در ساغر نمی کردم چہ می کردم   ز ساغر گرد ماغرہ تر نمی کردم چہ می کردم

ارشاد فرمائیے کیا یہ سب معرفہ استعمال ہوتے ہیں؟ (مرتب)

[1] یہاں پھر آپ نے ایک اور ایسی بات کر دی جو بالکل بے بنیاد ہے۔ فارسی اور ہندی یا عربی اور ہندی کی ترکیب نہیں بنائی جا سکتی (بجز چند خاص مروج تراکیب کے) لیکن عربی و فارسی کی تراکیب تو بڑی ہی کثرت سے بن چکی ہیں اور بنتی رہتی ہیں۔ مثلاً آپ نے نور افشانی، غم انگیزی، حکمرانی، تبسم افشانی، ترنم ریزی، عَلَم افرازی، صبح خیزی، حق پرستی، جمال افزائی، غریب نوازی، بندہ پروری وغیرہ تراکیب ملاحظہ فرمائی ہونگی۔ آیئے اب کم سے کم اقبال کے ہاں سے سند پیش کر دوں:۔

(۱) تن بدن ہوش و حواس اللہ مست   (۲) بیقین اللہ مستی، خود گزینی! (مرتب)

جناب محمد عزیز ایم اے کا "ہماری صنعتیں" ایک کامیاب مقالہ ہے۔ جس میں ارباب اقتدار کی کوتاہیوں سے ہماری صنعتوں کو جو نقصان پہنچ رہا ہے۔ اس کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ نہایت اچھے مشورے بھی دئیے ہیں۔ پروفیسر عبدالحمید ایم اے کا مقالہ "پاکستان کا پنج سالہ معاشی جائزہ" نفسِ مضمون کے لحاظ سے بہت تشنہ ہے۔ پروفیسر اے آر ایم اے کا "پاکستان کا معاشی بحران" نسبتہً اچھا اور واضح مقالہ ہے۔ لیکن اس میں اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی کہ معاشی میدان میں ہمیں جو مشکلات درپیش ہیں۔ ان پر قابو کس طرح پایا جائے۔ پھر مواد کے لحاظ سے بھی یہ مقالہ بہت مختصر ہے۔

پاکستان میں چونکہ ہر چیز ہی نرالی ہو رہی ہے۔ اس لئے یہاں کے انتخابات بھی نرالے ہی ہونے چاہئیں تھے۔ انتخابات کے دلچسپ حقائق کو تحریکِ اسلامی کے "خوش باش" ادیب جناب سید صدیق الحسن گیلانی نے اپنے مخصوص "پھپھوندیانہ" رنگ میں اجاگر کیا ہے۔ اربابِ اقتدار نے انتخابات کو ایک "ڈھونگ" بنانے کے لئے آج تک جو جو کچھ کیا اور کرایا ہے۔ اس سے صرف وہی شخص واقف ہو سکتا ہے جو ان کے مختلف مراحل سے خود گزرا ہو، اور "درونِ پردہ" کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہو۔ چنانچہ شاہ صاحب اس کوچہ سے نہ صرف یہ کہ واقف ہیں بلکہ وہ یہاں "بہت سے رنگین دن اور بہت سی رنگین راتیں" گزار چکے ہیں۔ اور آخر میں آپ نے جبری انتخابات سے ملک اور قوم کو بچانے کا جو نسخہ تجویز کیا ہے۔ وہ گویا میرے دل کی آواز ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

"اور یہاں انقلاب لانے کے لئے (خواہ وہ صالح انقلاب ہو یا غیر صالح) ایک سیلِ رواں کی ضرورت ہے جو اس بند کو بہالے جائے" صفحہ (۲۹۳)

حکیم محمد سعید دہلوی کا مقالہ "طب یونانی" بڑا معلومات افزا مقالہ ہے۔ کاش ہمارے اربابِ اقتدار اس مفید خلائق فن کی طرف توجہ دیں۔

جناب منظور احمد صاحب نے مسئلہ کشمیر (صفحہ ۳۱۲) پر اشاروں اشاروں میں وہ کچھ کہہ دیا ہے کہ دوران مطالعہ میں مجھے ہر طرف سیفٹی ایکٹ ہی سیفٹی ایکٹ کی تلواریں چمکتی نظر آتی ہیں۔ اور آخر میں اس سو سالہ پرانی گتھی کے حل کے لئے "تبدیلی قیادت" کا جو نسخہ تجویز کیا ہے وہ اس قدر زود اثر اور "مقوی" ہے۔ کہ اگر ملت اسلامیہ واقعتہً یہ نسخہ استعمال کر ڈالے تو بقول فاضل مقالہ نگار ایک مسئلہ کشمیر ہی نہیں، صرف پاکستان کے مسائل ہی نہیں، بلکہ پوری دنیائے اسلام کے سارے ہی لاینحل مسائل دیکھتے دیکھتے حل ہو سکتے ہیں۔

مولینا مسعود عالم ندوی نے "چند غیر ملکی شخصیتیں" (صفحہ ۳۱۸) میں عالم اسلام کے ان اکابر سیاسئین کا مختصر تعارف کرایا ہے۔ جو اس پرفتن دور میں اعلائے کلمۃ الحق کے لئے کام کر رہے ہیں۔ سب سے آخر میں تحریک اسلامی کے معمر لیکن بھاری بھر کم میو بزرگ چودھری سردار محمد خاں میواتی کا مقالہ بعنوان "میو قوم پاکستان میں" (صفحہ ۳۲۱) ہے جس میں انہوں نے اپنی قوم کی پوری تاریخ بیان کی ہے۔ پھر ان کے پاکستان میں ورود اور مشکلات کا خاکہ پیش کیا ہے۔ یہ مقالہ پڑھ کر پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ یہ قوم ایک تاریخی قوم ہے

اب آخر میں مجھے اپنے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ سطور بالا میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے نہ کسی کی دل شکنی مقصود ہے اور نہ اپنی "ادب شناسی" کی تشہیر۔ بلکہ جو خامیاں رفقاء کے مضامین و مقالات میں محسوس کیں انہیں بغیر کسی لاگ لپیٹ کے اس مقصد سے سپردِ قلم کر دیا کہ آئندہ کے لئے احتیاط لازم ہے۔

سید نقی علی ———

چند یاران حلقہ کے لئے مبارکباد قبول کیجئے۔ اس لئے نہیں کہ آپ کی قلمی تصاویر سے مجھے کلیتاً اتفاق ہے، بلکہ اس لئے کہ یہ آپنے نے

لہ آپ نے جس اخلاص سے یہ سطور رکھی ہیں اس کی توہین ہے کہ آپ ایسی معذرت کریں۔ جو لوگ اپنے اندر اخلاص کے سوا کچھ اور پنہاں رکھتے ہیں، وہ تو سو معذرتیں کر کے بھی دامن کو دھو نہیں سکتے۔ آپ کو اس معذرت بازی سے بالاتر رہنا چاہئے تھا۔ (مرتب)

بڑے اچھے سلسلے کی ابتدا کی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو بعض "شیش محل" چکنا چور ہوتے نظر آئیں لیکن آپ اس کی فکر نہ کیجئے گا فولادی سیرت رکھنے والے اس سے گھبرائیں گے نہیں بلکہ اس کو خوش آمدید کہیں گے۔ البتہ ایک شکایت ہے۔ ملک نصر اللہ خاں عزیز یعقوب طاہر، آباد شاہ پوری، مصطفیٰ صادق اور لالہ صحرائی نے آخر کیا قصور کیا تھا؟

"مشرقی پاکستان میں نئے ادبی اور سماجی رجحانات" قابل مطالعہ ہے۔ فروغ احمد صاحب نے بڑی عمدگی سے حالات کو پیش کیا ہے۔

"پاکستان کے ترقی پسند ادب کا سرسری جائزہ" بڑی محنت سے لکھا گیا ہے اور قابل داد ہے۔ حمید اللہ صدیقی صاحب نو آموز سہی لیکن اپنے اندر بڑی صلاحیتیں رکھتے معلوم ہوتے ہیں۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو اس مضمون کو تنزل پسند ادب (کیونکہ جو ادب انسان کو انسانیت کے درجے سے گرائے وہ ترقی پسند کہلانے کا مستحق نہیں) کے ہر ہر رسالے میں چھپوا دیتا تاکہ نادان رہرو ہشیار ہو جائیں اور اگر غلط راستے پر جانا ہی چاہیں تو سوچ سمجھ کر جائیں۔ محض جذبات کی رو میں بہہ کر نہیں بلکہ عقل کی آنکھوں سے دیکھ کر۔ مجھے یقین ہے کہ حمید اللہ صدیقی صاحب اپنی مشق کو جاری رکھتے ہوئے چراغ راہ میں مزید نگارشات پیش کرتے رہیں گے۔

"مشاعروں" پر ماہر کے قلم سے نکلی ہوئی بات کے مستند ہونے میں کیسے شبہ ہو سکتا ہے۔ گھر کے بھیدی سے بہتر اور کون ہو سکتا تھا۔ لیکن ماہر سے میں تو کچھ اور توقعات رکھتا ہوں۔ اگر وہ پاکستان کے پانچ سال میں نعوت گریز رجحانات پر لکھتے تو آپ کی رائے میں کیسا رہتا؟

عاصی ضیائی صاحب کا مقالہ "پاکستان بننے کے بعد ادبی رفتار و رجحانات" ایک تاریخی مقام رکھتا ہے اور اس کی قدر مستقبل کا مورخ ہی کرے گا۔ آپ نے اسلامی ادب کے فلسفیانہ پس منظر کے ذریعے اسلامی ادیبوں کو بھی راہ دکھائی ہے اور اسلامی ادب کے نقادوں کو بھی دعوتِ فکر دے دی ہے۔ عابدی صاحب نے افسانہ پر جو کچھ لکھ دیا ہے فی الوقت غنیمت ہے۔

"شکار چور" کے ذریعے عاصی ضیائی صاحب نے ان لوگوں کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے جو بظاہر سوسائٹی کے شرفا میں شمار ہوتے ہیں لیکن عاصی صاحب سے "بصد ادب" عرض ہے کہ ہر چیز کے چور اور خصوصاً "ملک چور" تو خاص طور پر اسی طبقہ میں برآمد ہوتے ہیں۔ ذرا ایک نظر ادھر بھی ——— ارے! حصہ تمثیل ختم! بس ایک ہی تمثیل؟ اسلامی ادب کے علمبردار اس طرف سے غافل کیوں ہیں؟

نظمیں تین قسم کی ہیں — اچھی، غنیمت اور گوارا۔ ضیا محمد ضیا کی نظم "منزلیں دور راہ دشوار" اچھی چیز ہے وہ سچ کہتے ہیں کہ

"جن کو دنیا میں کچھ کام کرنا ہو، یوں خوابِ غفلت میں مدہوش ہوتے نہیں
جن کو احساس ہوتا ہے اپنے نصب العین کا اس طرح خاموش ہوتے نہیں"

ضیا کی دوسری نظمیں آپ نہ دیتے تو اچھا تھا۔

ماہر کے متعلق ایک دفعہ ایک (نام نہاد) ترقی پسند نے کہا تھا کہ ماہر مذہب کے چکر میں پڑ کر بے کار ہو گیا۔ نہ فن کا خیال نہ زبان کا اور نہ بلندی تخیل کا۔ ماہر نے اپنی بے شمار نظموں میں اس الزام کو جھٹلا دیا۔ لیکن شاعر پھر شاعر ہے۔ رقیبوں اور مخالفوں کا دل رکھنے کی بھی بلا ارادہ ہی سہی کبھی کبھی کوشش کر ہی لیتا ہے۔

شمیم جاوید کے سلسلے میں نے ایک بلند مقام بنا رکھا ہے لیکن جلدی کام شیطان کا! "توسٹ ارجنٹ" میں وہ اپنے معیار سے بہت گرے معلوم ہوتے ہیں، کم از کم مجھ کو! کوثر نیازی کی دونوں چیزیں اچھی ہیں۔ کتنی اچھی بات کہتے ہیں:

ہائے اس بات سے بھی تجھ کو نہ تھی آگاہی — رزق اس دہر میں کتوں کو بھی مل جاتا ہے

اور دل کی جلن اور تیز ہوتی ہے تو اپنے رفیق سے یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ

ہائے بے وقت جو دیکھا ہے ترے ایماں نے — کاش اس وقت سے پہلے تجھے موت آ جاتی

دکو ثر صاحب! آپ کیلئے تو وہ مر چکا۔

آپ نے تو بہت کچھ لکھا ہے۔ کئی رستے ہوئے ناسوروں کی طرف توجہ دلائی ہے لیکن آپ کی۔ آپ کے اپنے رسالے[1] ہیں۔ کیا تعریف کروں۔ چڑیل، کیوں اور اے نیل کی موجو علی الترتیب مجھے پسند آئی ہیں۔ ہاں ایک بات کی طرف توجہ دلا دوں۔ آپ کی نظمیں اگر عوام میں جانے کے لئے ہیں تو بعض ثقیل الفاظ کی جگہ عام فہم الفاظ لائیے۔

جیلانی بی اے نے "فضل کریم" اور "اذہان" میں ہم جیسے عامیوں کا خیال رکھا تھا لیکن "نعلم بن بعوز" تو اونچے لوگوں کے لئے ہے۔ خود جیلانی کی طرح الگ الگ کھنچا کھنچا۔ آپ شوق سے ان کو بڑے پائے کے ادیبوں کے زمرے میں شمار کر دیں۔ آپ کو بھی مبارک اور جیلانی صاحب کو بھی۔ ہم بھی ان کا رتبہ اور بلند دیکھنے کے متمنی لیکن اسی مقام بلند سے سہی کچھ عام آدمیوں کے لئے بھی تو پھینکیں۔

"بھو کا ہے پنجاب" اس حصے کی بہترین چیز ہے۔ معلوم ہوتا ہے آپ نے ڈائری لکھنے کی اچھی مشق بہم پہنچائی ہے۔ کاش ہمارا حکمراں طبقہ بھی اس ڈائری کو دیکھ سکتا۔ کم از کم صوفی و پیرزادہ تو دیکھتے کہ آخر انہی کے کارندۂ خاص کی ڈائری تو ہے

"فضل الرحمٰن" صاحب نے "تجزیہ زندہ دلاں" لکھ کر پوری پاکستانی قوم پر ایک احسان عظیم کیا ہے۔ ہمارے ارباب اقتدار اور اسلام پسند عوام دونوں اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔ البتہ کئی شکایتوں میں سے چند درج کرتا ہوں۔ "خاتون بہادر" سخت توہین آمیز خطاب ہے۔ یا تو مساوات کے لحاظ سے خان بہادر کہیے نہیں تو خاتون بہادرنی کہیے۔ اس امراضِ خبیثہ والے کے لئے "سر" کا خطاب اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ یہ خطاب تو "امراضِ طیبہ" والے کا ہونا چاہئے۔

"مسٹر کا موٹر" اچھی تخلیق ہے۔ جلال صاحب قفقس کی قسم کے کوئی انسان معلوم ہوتے ہیں۔ ان سے ہم کو بڑی توقعات ہیں مشق جاری رکھنا شرط ہے۔

غزل کے میدان میں گھوڑے تو بہت سوں نے دوڑائے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ سب کے سب اوّل تو نہ آئے اور نہ آ سکتے تھے۔ یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا۔ اچھے اشعار ہیں تو بہت سے لیکن چند مجھے پسند آئے، انہی سے میری رائے کے متعلق رائے قائم کریجئے۔

لہو سے وادیٔ نیل و فرات ہے رنگین — اٹھے نہ بحرِ عجم سے حباب! کیا معنی؟
سپہرِ شوق میں تیری بلندیاں تسلیم! — مگر یہ زاغ و زغن ہم رکاب! کیا معنی؟
ہم نشیں چھیڑ نہ آغازِ وفا کی باتیں — مجھ کو بیتے ہوئے ایام کی یاد آتی ہے
جب بھی سنتا ہوں کبھی جور و جفا کے قصے — مجھ کو مظلومیٔ اسلام کی یاد آتی ہے
خونِ مظلوم اے ستم پرور — باعثِ انقلاب ہوتا ہے
زندگی کروٹیں بدلتی ہے — موت کو اضطراب ہوتا ہے
آپ نسخوں پہ نسخے بدلتے تو ہیں — درد کی ہو چلی انتہا ان دنوں
لب پہ نامِ خدا، دل میں عشقِ بتاں — کتنے ارزاں ہیں مکر و ریا ان دنوں
ہر زخمِ دل ہے موجِ تبسم لئے ہوئے — اک جنبشِ نظر سے ذرا گدگدا کے دیکھ
سر نظر آتے ہیں اکڑے ہوئے جباروں کے — تو بھی ہو ان کے لئے خنجرِ براں اے دوست
یہ جو آکاش کے سینے سے سویرا پھوٹا — ہے نئے دور کے آغاز کا عنواں اے دوست

---

[1] آپ سے زیادہ بہتر سلوک شاید کسی نے مجھ سے نہیں کیا ——— اور پھر یہ خلوص! (مرتب)

نقد و عیار

بہت در بدر ٹھوکریں کھا کے پہنچے — نہ چھوڑیں گے اب تو ترا آستاں ہم
ان وفا کوشیوں کو چھوڑ و بھی — ایک دل توڑنا ہے توڑ دو بھی
وہ اور چہکنا ہے جس کا انجام اسیری ہوتا ہے — چڑیاں بھی چہکتی رہتی ہیں بلبل بھی چہکنے والے ہیں
اس فصل خزاں کے قدموں میں گو درد چمن پامال سہی — کچھ باغی فطرت غنچے ہیں جو پھر بھی چٹکنے والے ہیں
بس ایک ذرا بہکی تھی نظر ا برسوں میں سنبھلنا مشکل تھا — بگڑی تھی ذرا سی بات کہ پھر بگڑی کو بناتے بیت گئی

جائزہ پاکستان کا حصہ پورے رسالہ کا سب سے اچھا اور معلومات آفریں حصہ ہے۔ ٹھوس علمی مقالات کی وجہ سے یہ اپنی ایک خاص قدر و قیمت رکھتا ہے۔

ضیا محمد ضیا نے ظہور پاکستان "میں حالات کا اچھا تجزیہ کیا ہے۔ تحریک اسلامی کے سلسلے میں ذرا زیادہ حالات آجاتے تو بہتر تھا (اس کے لئے ایک مستقل مقالہ کی ضرورت تھی، مگر کوئی اس ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کے لئے تیار نہ ہوا۔ مرتب)

مولانا عبدالرحیم صاحب نے مشرقی پاکستان کے حالات لکھ کر پورے پاکستان کے خیر پسند حضرات کے شکریوں کی وصولی کا سامان کر لیا ہے۔ انہوں نے بہت سے ان چہروں پرسے نقاب الٹ دی ہے جو چھپے ہونے کی وجہ سے بظاہر نظر فریب معلوم ہوتے تھے۔ اس مقالے سے کچھ کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ اس حمام میں کون کون ننگا ہے۔

ابو سلیم صاحب کا تعلیمی جائزہ، عزیز صاحب کا ہماری صنعتیں، اور پروفیسر عبدالحمید صاحب کا معاشی جائزہ بڑے اچھے اور تحقیقاتی مضامین ہیں۔ خدا کرے کہ اس رسالے کے حلقہ تربیت سے اچھے لکھنے والے ملت کی صحیح رہنمائی کرنے کے لئے اٹھ سکیں۔

صدیق الحسن صاحب "جبری انتخابات" میں "جبری بھرتی" کئے گئے تھے اسی وجہ سے شاید جائزہ لینے کے لئے بہترین اسامی ثابت ہوئے۔ بھلا جبری بھرتی نہ ہوئی ہوتی تو کام چھوڑ کر "مواد" کا ریکارڈ رکھنے کی فکر کرتے؟

حکیم محمد سعید صاحب نے طب یونانی پر بڑا پر از معلومات مقالہ لکھا ہے۔ مجھے ڈاکٹروں کا مسئلہ اس میں گڑبڑ نظر آتا ہے۔ جب حکومت کے سوتیلے سلوک کے باوجود اس کا یہ حال ہے تو اگر کہیں واقعی سچے دل سے حکومت نے اس کو کم از کم مساوات (مغربی طب کے مقابلے میں) دے دی تو پھر تو اس کے مقابلے کی تاب کسی کو نہ ہوگی۔

مولانا مسعود عالم صاحب کا شکریہ ہم سب کو ادا کرنا چاہئے۔ انہوں نے عالم اسلام کی ان شخصیتوں سے ہم کو متعارف کرایا ہے جو ہمارے لئے بڑی عزیز ہونی چاہئیں۔ مجھے ان شخصیتوں کے تعارف سے بڑی حد تک اتفاق ہے۔ میں نے خود بھی ان سب حضرات سے فرداً فرداً ملنے کے بعد یہی اثر محسوس کیا ہے۔ خصوصاً سعید رمضان اور عمر بہاؤ الا میری تو واقعی دوست بنائے جانے کے قابل ہیں۔ اور ہمارے نوجوان ان سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

میو قوم کے متعلق سردار محمد خاں صاحب سے زیادہ ماہرانہ رائے رکھنے والا کوئی شخص پاکستان میں موجود نہیں۔ ان کا مقالہ قابل مطالعہ ہونا ہی چاہئے۔

اب چند لفظ آپ خود بھی سنئے اور چودھری غلام محمد صاحب کو بھی اس میں شریک کیجئے۔ پہلی چیز کتابت ہے۔ جو معیار سے اچھی ہونے کے باوجود مختلف جگہ مختلف قلموں اور مختلف اشخاص کی معلوم ہوتی ہے۔

دوسری چیز کتابت کی بے شمار غلطیاں ہیں۔ کاپی دیکھنے اور پروف پڑھنے والوں سے مشورہ کیجئے۔

سرورق معمولی آرٹ پیپر کا ہے حالانکہ اتنے ضخیم رسالے کے لحاظ سے اس کو زیادہ دبیز ہونا چاہئے تھا۔

اس سے بھی بڑا نقص جلد بندی کا ہے۔ اتنا ضخیم رسالہ اور جلد بندی اتنی ناقص۔ خدا کے لئے اسلامی ادب کے علمبرداروں کو ایسے کچے دھاگے

سے نہ باندھیئے گا۔ اچھا اب رخصت۔

کوثر نیازی ——

چراغِ راہ کی اشاعتِ خاص کے متعلق۔ مختصراً میری رائے یہ ہے"۔ کہ یہ نمبر اکیلا۔ اب تک کے سارے نمبروں پر بھاری ہے"۔ اور چند خامیوں کے باوجود۔ اس کے "حُسنِ ترتیب" کی داد دئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

نمبر کا سب سے زیادہ جاندار حصہ مقالات کا حصہ ہے۔ اور اس میں بھی حمید صدیقی۔ فروغ احمد۔ محمد عزیز۔ اصغر علی عابدی اور (کسی حد تک) ماہر القادری کے مقالے کافی محنت سے لکھے گئے ہیں۔ حمید صاحب کا مقالہ پڑھ کر طبیعت بہت خوش ہوئی۔ آپ نے اچھا کیا۔ کہ اپنے مشوروں اور تعریفی کلمات سے ان کی ہمت بندھائی۔ ایسے جوہرِ قابل کی صحیح قدر و قیمت متعین کرنے میں کبھی بخل نہیں برتنا چاہئے۔

افسانوں کے حصے میں جیلانی صاحب کا افسانہ سب سے پہلے پڑھنے کی کوشش کی۔ انسان کی جنسیاتی اور نفسیاتی الجھنوں کو جس عمدہ طریق سے جیلانی نے اپنے افسانے میں اجاگر کیا ہے۔ اس کے لئے وہ قابلِ داد ہیں۔ لیکن ایک دو جگہوں پر پاکیزگیٔ ذوق بری طرح مجروح ہوئی۔ کاش! جیلانی صاحب ان مقاماتِ خاص میں کچھ اور احتیاط برت سکتے۔ مثلاً:۔

"بعلم نے کانپ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی چھاتیاں دریا کی لہروں کی طرح متلاطم تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اور ان سے آنسوؤں کی دو لڑیاں رخساروں سے بہہ کر ٹھوڑی تک جا پہنچی تھیں۔ اس کے سرخ ہونٹ نیم وا تھے۔ اس کی آ ... کی سی لالم گھوں میں آتشیں موتیوں کا ہار بیٹھے ... ہاتھ ... واقعی اس کے گورے بدن کی گرم گرم آنچ محسوس کر رہا تھا"۔

ان تین چار فقروں کو سمیٹ کر، ایک ہی دو بے ضرر جملوں میں مطلب ادا ہو سکتا تھا، اگر اس کی کوشش کی جاتی —— افسانے کے آخری ٹکڑے کو بھی جیلانی صاحب چابکدستی سے پہلے حصے سے جوڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکے —— لیکن ان باتوں کے باوجود افسانے کی جو ایک نئی راہ وہ نکال رہے ہیں، اس کا قدر دان ہوں۔ نئے نئے راستوں پر چلنے میں ذرا سی لغزش پا ہو جانا کوئی معیوب بات نہیں ہے۔

آپ کا افسانہ میرا گاؤں فنی حیثیت سے اب تک کے آپ کے سارے افسانوں سے زیادہ پسند آیا۔ حیران ہوں کہ آپ ایسا پنجابی جو مدت ہوئی اپنی "پنجابیت" نذرِ اردو کر چکا ہے اور جسے پنجابی کلام کے نام پر لکھنا بھی نہیں آتا (نہیں جناب! ایسا نہیں ہے۔ مرتب) کیسے پنجاب کے اتنے گرد و پیش پھرتے سے محسوس کرانے میں کامیاب ہو گیا! جیلانی کا افسانہ ہر ملک میں یکساں طور پر پڑھا جا سکتا ہے۔ اور غیر ملکی ادب بھی ہے اور ملکی بھی۔ لیکن آپ کا افسانہ خالص ملکی روح اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ اور اس لحاظ سے یہ ہمارے سارے اردو ادب میں ایک خاص مقام رکھتا ہے —— اور ہاں خوب یاد آیا، ایک بات افسانے میں کھٹکی بھی۔ آغازِ افسانہ میں حال کے صیغے استعمال کرتے کرتے ماضی کے صیغوں پر جانے سے قاری کو ہلکی سی ایک ٹھوکر لگتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

"جمعدار اللہ یار حافظے سے بھولی ہوئی کہانیاں کرید کرید کر دہرانے لگتا ہے۔ جمعدار کے چہرے پر لمبی لمبی۔ گہری گہری سلوٹیں ہیں۔ سلوٹیں کیا ہیں۔ جیسے واقعات کے کارواں کے نقوشِ قدم ہیں۔ نہیں۔ بلکہ جیسے لڑائی کے مورچے ہیں —— ویران مورچے —— جن میں اب کہانیوں کی نعشیں دبی پڑی ہیں۔ یہ نعشیں کبھی کبھی کروٹ لیتی ہیں۔ اور جمعدار اللہ یار کی گہرائی میں اتری ہوئی آنکھوں کی بوڑھی پتلیاں چمک اٹھتی ہیں اور وہ کہنے لگتا ہے"۔

اور پھر —— کافی آگے تک اسی طرح لکھتے لکھتے ——

جمعدار ترنگ میں کہانیاں سنا رہا تھا۔ کہ اچانک شور ہوا۔ سارے چوپالی اٹھ کر لپکے" حالانکہ قاری متوقع ہوتا ہے۔ آپ آگے بھی اس طرح لکھیں گے

تمعدار ترنگ میں کہانیاں سنا رہا ہوتا ہے۔ کہ اچانک شور ہوتا ہے۔ سارے بچے بالی اٹھ کر لپکتے ہیں —— وغیرہ وغیرہ۔
شکار پور۔ (عاصی ضیائی) بھوکا ہے پنجاب (نعیم) مسٹر کا موٹر۔ (جلال) بھی کافی اچھی تخلیقات ہیں۔ "مال حرام" البتہ کوئی قیمت نہیں رکھتا۔
حصۂ نظم میں آپ کی نظمیں چڑیل اور اے نیل کی موجو۔ ضیاء کی شاعر نوجوان کے نام۔ شمیم جاوید کی موسٹ ارجنٹ۔ اور سادہ زبان میں ماہر کی قرآن کی فریاد بہت عمدہ نظمیں ہیں۔ لیکن ان کے ساتھ یہ جو کربلا (طالب مجازی) ریز (ابوالبیان حماد) ذخیرہ اندوزوں سے (مضطر) اور منشور آزادی (ابوسعید حیرت) جیسی نظمیں چپکا دی گئی ہیں ان سے طبیعت نے کوئی اچھا اثر نہیں لیا۔ غزل میں بھی بجز آپ کی ایک آدھ غزل کے، اور سوائے عاصی کرنالی کے ایک غزل کے کوئی کام کی چیز نہیں ملتی۔ ہمارے شعراء نے تو اس صنفِ شعر کا بائیکاٹ ہی کر رکھا ہے اور اس سے جتنے تعلقات وابستہ کئے ہوئے ہیں، وہ بھی کچھ زیادہ مستحسن نہیں۔

بہرحال۔ مجموعی طور پر —— اسلامی ادب کے ترجمان جرائد نے جتنے بھی خاص نمبر نکالے ہیں، ان سب میں آپ کا یہ نمبر مثالی ہے۔

فضلٌ من اللہ ——

خاص نمبروں سے طبیعت قریب قریب سیر ہو گئی ہے۔ باطنی کمیوں کو ظاہری محاسن سے پورا کرنے کی جو کوشش عام طور پر کی جاتی ہے وہ رائیگاں نہیں جاتی اور اس سے ایک کشش تو پیدا ہو جاتی ہے مگر نظر جب ظاہر سے گزر کر باطن پر پڑتی ہے تو ایک بڑی حد تک مایوسی ہی ہوتی ہے۔ خدشہ تھا کہ یہی حال "چراغ راہ" کے خاص نمبر کے مطالعہ سے نہ ہو مگر الحمد للہ ایسا نہیں ہوا یہ اشاعت خاص اپنے اندر بہت کچھ سمیٹے ہوئے ہے اور اپنے قاری کی ہمت بندھاتی ہے، ہمت توڑتی نہیں۔

سب سے پہلے میں نے افسانے پڑھے۔ افسانوں میں "میرا گاؤں" بڑی عمدہ پیشکش ہے "نقطے اور لکیریں" کے بعد یہ دوسرا شاندار افسانہ ہے جسے نعیم صاحب نے اب پیش کیا ہے اس افسانے میں نعیم کا فن ارتقا کی چند اور منزلیں طے کرتا نظر آتا ہے۔ مدیر "چراغ راہ" کی تعریف کے باوجود "تعلیم بن بعوذ" مجھے پسند نہیں آیا اگرچہ سب سے پہلے میں نے اسے ہی پڑھا۔ "تمہید" جو کچھ کہا گیا ہے وہ ایک قاری کے سامنے ایک شخص کو مجرم بنا کر پیش کرتا ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ اسی شخص کو آگے چل کر افسانے میں مجرم ثابت کر دیا جاتا ہے۔ دوسری بار پڑھنے پر یہ عیب ذرا دب گیا اور یہ تمہیدی حصہ افسانے کا ہی ایک حصہ معلوم ہوا مگر افسانے کا خاتمہ بھی اچھا نہیں اور یہ قاری کو ایک تاثر دینے میں مانع واقع ہوا ہے۔

"بھوکا ہے پنجاب" کا موضوع ہنگامی اور پروپیگنڈا کا تھا اور یہاں لغزش کا احتمال تھا، اس لئے میں نے اسے بڑی جھجک سے پڑھنا شروع کیا مگر مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ مصنف کے قلم نے لغزش کا کوئی مظاہرہ نہیں کیا۔ "جزیرہ زندہ دلاں" اپنے مصنف کی ذہنی اپج کو پیش کرتا ہے اور داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ "مسٹر کا موٹر" بھی بہت خوب ہے خصوصاً "عید میلاد النبی کے موقع پر گول باغ بہت سجی ہوئی تھی" والا ٹکڑا تو مزاح کا خاصا سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔

ادبی مقالات میں فروغ احمد صاحب اور نعیم صاحب کے مقالات اول درجہ کے مقالات ہیں۔ حمید اللہ صدیقی کا مقالہ بھی بحیثیت مجموعی اچھا ہے اور اس کی تصنیف میں محنت سے کام لیا گیا ہے۔ کہیں کہیں خامیاں ضرور ہیں اور بعض خامیاں تو ایسی ہیں کہ حیرت ہوتی ہے مثال کے طور پر صاحب مقالہ ارشد کی نظم کے مفہوم کو نہ پا سکے۔ "الحمد للہ" کے ساتھ بھی یہی گزری ہے۔ اس افسانے میں واضح طور پر تو کچھ نہیں پیش کیا گیا مگر ایک پیش امام کے افلاس کو پوری طرح پیش کر دیا گیا ہے، اور احمد ندیم قاسمی نے ہمیں بتایا ہے کہ ہمارے ہاں مذہبی فرائض بجا لانے والا شخص (افسوس کہ اسلام میں اس "پادری" کے لئے کہیں گنجائش نہیں نظر آتی مگر اسلام کو جب مذہب بنا لیا گیا تو ایسا ہونا ناگزیر تھا) جسے "پادری" ہی کہنا چاہئے کس طرح زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کے ہاں افلاس کی کس قدر شدت ہوتی ہے، اس کا گزارا کس

طرح ہوتا ہے اس کی بیٹی کو محض اپنے والدین کے افلاس کی وجہ سے اپنی ساس سے کیا کچھ سننا پڑتا ہے اور ایک بیٹی کی شادی کے بعد اُسے اپنی دوسری بیٹی کے جوان ہو جانے کا احساس کس طرح کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ ان تمام باتوں کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ مصنف نے مذہب کی تضحیک کہیں بھی نہیں کی۔ مولوی ابل جہاں توکل توکل پکارتا ہے وہاں واضح طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایسے کلمات کہہ رہا ہے جس پر اُسے خود بھی یقین نہیں مگر خود فریبی کی وجہ سے وہ ایسا کہنے پر مجبور ہے۔

یہی حال "بغداد کی ایک رات" کا ہوا ہے۔ یہ نظم ابن انشا کی بہترین نظم شمار کی جاتی ہے، میرے خیال میں اگر وہ اشعار جنہیں صاحب مقالہ پروپیگنڈہ خیال کرتے ہیں، نظم سے الگ کر دئے جائیں تو اس کا حسن غارت ہو جائے گا بلکہ وہ لنگڑی ہو جائے گی۔ اور اس کے ساتھ وہ امید بھرا پیغام جو شاعر دینا چاہتا ہے نہ دیا جا سکے گا۔

"رئیس خانہ" کے متعلق جتنے اعتراض اٹھائے گئے ہیں ان کی حیثیت ضمنی ہے۔ اس قسم کے افسانوں میں (بلکہ تمام افسانوں میں) حقیقت نگاری کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ آیا ایسا ہو سکتا ہے؟ یا جو کردار جن حالات کے تحت پیش کیا گیا ہے وہ وہی پارٹ ادا کرتا، اگر فی الواقع اُسے وہ حالات پیش آتے جن سے افسانے میں اسے دوچار دکھایا گیا ہے۔ اس کے باوجود بھی ان سوالات کی حیثیت ضمنی ہوتی ہے اور آپ اعتراف کریں گے کہ "رئیس خانہ" پڑھنے کے بعد قاری کو ایک تاثر — شدید تاثر — ملتا ہے کہ انسان غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر عصمت کے سودے بھی چکا دیتا ہے۔ اس نظریہ پر بحث ہو سکتی ہے، مگر رئیس خانہ کے اس تاثر کو بہرحال جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

ناولوں کے ذکر میں عزیز احمد کے ناول "ایسی بلندی ایسی پستی" کا تذکرہ نہ کرنا زیادتی ہے۔ اسی طرح اشفاق کے ناولٹ "مہمان بہار" کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ایک بات مقالے سے نہیں فٹ نوٹ سے متعلق ہے اور وہ یہ کہ ڈاکٹر سلامت اللہ نے فرائڈ پر بھی تنقید کی تھی اور ان کا ایک تنقیدی مقالہ غالباً مکتبہ شاہراہ دہلی کے پیش کردہ بہترین ادب (۱۹۴۹) میں شائع ہوا تھا، نعیم صاحب کی بات یہاں تک ویسے درست ہے کہ مجموعی طور پر ترقی پسند فرائیڈی نفسیات کے پیرو ہیں اور ان کے ہاں تنقیدی روح (اس سلسلے میں) مفقود ہے۔

عاصی ضیائی صاحب کا مقالہ قلم برداشتہ معلوم ہوتا ہے، ماہر صاحب کا مضمون معلوماتی زیادہ ہے یوں اسے مشرف باسلام کرنے کے لئے وہ پاکستان کے موجودہ حالات پر جذباتی تنقید کر دیتے ہیں مگر اس موضوع سے تعلق نہ رکھنے کی وجہ سے طبیعت پر ایک بار سی محسوس ہوتا ہے۔

عابدی صاحب کا مقالہ ایک قابل قدر کوشش کی حیثیت رکھتا ہے۔ کچھ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے انہوں نے دنیا بھر کی بہترین کہانیوں کو سامنے رکھ کر اس مقالہ کو مرتب کیا ہے، بعض مقامات پر تنقید کی گنجائش بھی نکلتی ہے۔ بہرحال پہلی کوشش کے لحاظ سے اسے قابل قدر ہی کیا جائے گا۔

حصہ نظم میں "منزلیں دُور اور راہ دشوار" "مقبرے"، "چڑیل"، "اے نیل کی موجو" اور "موسٹ ارجنٹ" بہت پسند آئیں۔ ضیا کی اس نظم میں جدید اسٹائل اور تفکر ہے، اسی طرح کوثر نیازی کی نظم اپنے اندر گہرائی رکھتی ہے۔ افسوس کہ "ایک رفیق کے نام" میں اُن پر جذبات غالب ہو کر رہ گئے ہیں اور یہ نظم جذبات کا مجموعہ ہو کر رہ گئی ہے۔ "کیوں" سے پہلے نعیم نے اسی انداز کی ایک نظم لکھی تھی، اس لئے یہ نظم کچھ بے کیف سی محسوس ہوئی۔ یتیمہ نظموں کا انداز بوسیدہ اور فرسودہ ہے۔ اور ماہر صاحب کی نظم کو پڑھ کر کوفت ہوتی ہے۔ برسوں سے بات جس انداز سے کہی جا رہی ہے، فرسودگی سے ماہر صاحب نے ایک بار پھر کہہ دی ہے اور بس!

"جائزہ پاکستان" کے حصہ میں ضیا اور منظور احمد صاحب کے مضامین سطحی درجہ کے ہیں، مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کے رشحات کے لئے اس عنوان کے تحت نہ معلوم کس بنا پر گنجائش نکالی گئی۔ میوتوم کے متعلق مضمون کا شریک اشاعت خاص ہونا زیادتی ہے۔ (دراصل

ہم مہاجرین کے حالات پر ایک مقالہ چاہتے تھے۔ اس کے لئے جب کوئی مقالہ نگار نہ ملا تو یہ خلا اس مقالے سے پُر کیا گیا ہے، اور ایک حد تک یہ مہاجرین کے مسائل کو بھی سامنے لاتا ہے۔ مرتب) باقی مضامین شگفتہ ہیں البتہ صدیق الحسن صاحب کا مضمون قابلِ توجہ ہے، اور مجھے ان کے مضمون سے ان کی وہ رائے عزیز ہے جس کا اظہار انہوں نے مضمون کے آخری حصہ میں کیا ہے۔

"یارانِ حلقہ" ایک خوشگوار اضافہ ہے، اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ بہت جلدی میں لکھا گیا ہے اس لئے اس میں وہ کیفیت ناپید ہے جسے پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور جو نعیم کے بیشتر اداریوں کا خاصا ہے۔

اشاعت خاص ایک کامیاب کوشش ہے جس کے لئے ہدیہ تبریک کی جگہ ہدیہ دل پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔ خدا کرے کہ یہ اشاعت خاص چراغِ راہ کے ایک نئے دور کی نقیب ثابت ہو۔

آثم میرزا ——

چراغِ راہ کا خاص نمبر مطالعہ میں آیا۔ بعض مرتبہ ہم کسی چیز سے اس قدر اونچی امیدیں وابستہ کر لیتے ہیں کہ ان کا پورا ہونا آسان نہیں ہوتا۔ لیکن الحمد اللہ اس خاص نمبر سے جو امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں وہ نہ صرف بدرجہ اتم موجود ہیں بلکہ اسے اپنی امیدوں سے بڑھ چڑھ کر پایا۔ اس بزم شعر و ادب میں شعلے بھی ہیں، اور شبنم بھی۔ پھولوں کی مہک بھی ہے اور تلواروں کی چمک بھی۔ اس گلدستہ میں سجے ہوئے ہر پھول کا رنگ۔ دیدہ زیب اور پائدار ہے۔ جناب حمید اللہ صدیقی نے ترقی پسند تحریک کے آغاز و انجام اور اس کے نتائج کو بڑی خوش اسلوبی اور دیانت داری سے بیان کیا ہے۔ اور تعمیر پسند مصنفین بھی اس کے مطالعہ سے بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ جناب اصغر علی عابدی نے "بہترین افسانوں" پر بڑے سلجھے ہوئے انداز سے تبصرہ کیا ہے۔ اور ہمیں دوسرے ممالک کے ادیبوں کی ذہنی الجھنوں کے متعلق بہت کچھ واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ جناب عاصی ضیائی صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں کامیاب تمثیل پیش کی ہے۔ جناب جیلانی۔ بی۔ اے کو نفسیات پر کافی عبور حاصل ہے اور وہ اپنے افسانوں میں نفسیات کو اس طریقے سے پیش کرتے ہیں کہ زندگی اپنے ہر پہلو کو لئے سامنے آجاتی ہے۔ اور ان کی تحریر پر کوئی بدگمانی پیدا نہیں ہوتی۔ "بعلم بن بعور" کو تاریخی اعتبار سے خواہ کوئی اہمیت حاصل ہو یا نہ، لیکن ادب میں یہ ایک یادگار مثالی کردار بن کر ہمیشہ زندہ رہے گا۔ جناب فضل من اللہ کے افسانے کے انجام نے اپنے آغاز کو سنبھال لیا ہے۔ اور آپ کا افسانہ "میرا گاؤں" ان کی نظر میں جو آج بھی افسانے کو مدتوں پہلے کے قائم کئے ہوئے معیار پر پرکھنے کی کوشش کریں، ایک ناکام کوشش ہو تو ہو، لیکن آج کا نقاد اس افسانے کی افادیت کو کسی حالت میں بھی نہیں جھٹلا سکتا۔ گاؤں کی نفسیات کے متعلق آپ کا مشاہدہ بہت گہرا ہے۔ جزو بات کو آپ نے جس سادگی اور بے تکلفی سے پیش کیا ہے۔ وہ قابلِ داد ہے۔

ابو البیان حماد ——

شعر نمبر کے بعد اشاعتِ خاص پیش کر کے آپ نے اس امر کا ثبوت فراہم کیا ہے کہ تحریک ادب اسلامی منزلِ مقصود کی جانب محوِ خرام ہے۔ انشاء اللہ یہ مجموعہ کاروانِ ادب اسلامی کے لئے ایک سنگِ میل ثابت ہوگا۔

ظفر اقبال (لائل پور) ——

چراغ راہ بہت غور و فکر اور ذوق و شوق کے ساتھ مطالعہ کر چکا ہوں، ماشاء اللہ بہت کامیاب نمبر ہے۔

آپ کا "سوچ بچار" بہت جاندار اور خیال افزا ہے۔ تنقیدی مقالات ہیں ویسے تو سبھی مقالات معیاری ہیں لیکن آپ کا مقالہ "اسلامی ادب کا فلسفیانہ پس منظر" بہت پُرمغز ہے۔ عابدی صاحب نے "افسانہ کی اصل بنیادی قدریں" بہت کام کی چیز لکھی ہے۔ حمید اللہ صاحب نے ترقی پسند تحریک کا خوب تجزیہ کیا ہے۔ مقالہ نہایت محنت سے تیار کیا گیا ہے۔

حصۂ نظم بھی خوب ہے۔ "چڑیل" اور اسے نیل کی موجو" بہت اعلیٰ درجہ کی نظمیں ہیں۔

افسانہ و طنز میں "تعلم بن بعوز جیلانی صاحب کا نفسیاتی افسانہ کمال کی انتہائی سرحدوں کو چھو رہا ہے۔ غزلوں میں عاصی کی غزل بہت ہی اعلیٰ ہے۔ "شغل بلبلی ہی کو چاہیں یہ کوئی شرط نہیں" یہ بات بہت سوچنے سے تعلق رکھتی ہے۔ آپ کی یہ غزل کہ ایک ہم کو فقط دو لفظوں میں"..... بہت اچھی ہے۔

جائزہ پاکستان میں خاصا مواد مطالعہ ہے۔

ہم اللہ تعالیٰ کے ممنونِ صد التفات و کرم ہیں۔

اسعد گیلانی ـــــــ

بھئی! یہ تازہ چراغ راہ کے نمبر پر تو کراچی کا حلقۂ ادب سخت چراغ پا ہے کہ اس میں اسلامی ادب کی غلط نمائندگی کی گئی ہے، حصۂ افسانہ غیر اسلامی ہے، مقالے کمزور ہیں، اور بعض رفقا کی ذات کی تضحیک کی گئی ہے۔

ح۔ک صاحب" ـــــــ

مجھے آپ لوگوں کی پست ذہنیت اور گھٹیا روش نے آپ سے اور آپ کے ادب سے متنفر کر دیا ہے۔ آپ ترقی پسند ادب اور ترقی پسند ادیبوں کو محض اس لئے گالیاں دیتے ہیں کہ آپ بھی ان کی طرح پاپولر ہو جائیں۔ حالانکہ آپ اُن کی فنکارانہ صلاحیتوں کے قائل ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اردو ادب میں ترقی پسند نہ ہوتے تو ادب ختم ہو جاتا ـــ میں نے اس سے پہلے بھی چراغ راہ کا ایک نمبر پڑھا تھا۔ جس میں دل کی بھڑاس نکال کر ترقی پسندوں کو گالیاں دی گئی تھیں۔ مگر کیا کہیے ستم ظریفی کو۔ کہ اُسی نمبر میں ترقی پسندوں کی تحریریں سرقہ کی گئیں تھیں۔ اور ان کی چھپی ہوئی نظمیں چھاپی گئی تھیں۔ جن میں سے ایک نام مجھے احمد ریاض کا یاد ہے۔ اور ہو سکتا ہے اس ایک نام کی وجہ سے آپ کا آدھا پرچہ بک گیا ہو۔ حال ہی میں یہاں کا ایک پرچہ مشیر (غالباً ادبی ہے) نے ترقی پسند شاعر قمر اجنالوی کی نظم سرقہ کر کے چھاپی، مگر پرچہ اپنی ذلت لئے ہوئے ہے وہی ترقی پسندوں کو گالیاں۔ آپ ہزار گالیاں دیجئے ہزار گندگی میں پتھر ماریں گے۔ مگر وہ آپ کو جواب نہیں دیں گے ان کا کردار بہت اونچا ہے۔ اور آپ کا ادب اور ادبی پرچے میرے خیال میں زیادہ پائدار نہیں۔ آپ "سویرا" "ادب لطیف" اور "نقوش" کی دیکھا دیکھی۔ تین روپے چار آنے کا چراغ راہ تو نکال سکتے ہیں۔ مگر کوئی باشعور اُسے چار آنے میں خرید نا بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ (جیسے میں خرید کر پچھتا رہا ہوں[1]) آپ لوگوں کے ایڈریس تلاش کر کر کے وی پیال بھیجتے جائیے، مگر چھڑائے گا نہیں کوئی۔ اس لئے کہ آپ میں ادبی پرچہ نکالنے کی سمجھ بوجھ نہیں۔ آپ نیم مُلا ضرور ہیں مگر ادیب نہیں۔ مثلاً چراغ راہ میں احمد ندیم قاسمی کے ایک افسانے "الحمد اللہ" پر تبصرہ کرتے ہوئے مصنف لکھتا ہے کہ آخر اس افسانے کا مقصد کیا ـــــ جس پر آپ کی کُند ذہنی نے یہ حاشیہ کھینچا کہ "برادرِ من! اس افسانے کا مقصد یہ ہے کہ مذہب کو بدنام کیا جائے ......" اگر آپ میں ذرا بھی سمجھ بوجھ کا مادہ ہوتا تو آپ مصنف پر یہ حاشیہ کھینچتے "برادرِ من معلوم نہیں آخر آپ کا مقصد کیا ہے؟" مگر یہ آپ کا قصور نہیں۔ آپ کو ایک بے علم بچہ سمجھ کر بھی معاف (بقیہ بر صفحہ ۲۳)

[1] ان صاحب کو پچھتاوے سے نکالنے کے لئے ان کو لکھ دیا ہے کہ آپ ہمارے کراچی کے دفتر میں پرچہ واپس کر کے تین روپے چار آنے نقد وصول کر سکتے ہیں (مرتب)

قیادت نمبر ــــ اور ــــ شعر نمبر

کے بعد

چراغِ راہ کراچی

اپنی معرکہ آرا اشاعتِ خاص جنوری ۱۹۵۳ء

پیش کر چکا ہے

●

یہ ہے اس کے مندرجات کی فہرست :-

ادبی و تنقیدی مقالات ــــ پاکستان بننے کے بعد ادبی رفتار و رجحانات (عاصی ضیائی) مشرقی پاکستان میں نئے ادبی و سماجی رجحانات (فروغ احمد) پاکستان کے ترقی پسند ادب کا جائزہ (حمید اللہ صدیقی) پاکستان کے مشاعرے (ماہر القادری) افسانہ کی اصل بنیادی قدریں (اصغر علی عابدی) اسلامی ادب کا فلسفیانہ پس منظر (نعیم صدیقی)

تمثیل ــــ شکار چور (عاصی ضیائی)

نظمیں ــــ منزلیں دور، راہ دشوار، ساقی سے، شاعرِ نوجوان کے نام (ضیا محمد ضیا) قرآن کی فریاد (ماہر القادری) الدین کلہٗ ادب (علی منظور) موت اور جنت (شمیم جاوید) مقبرے ــــ ایک رفیق کے نام (کوثر نیازی) ذخیرہ اندوزوں سے (مضطر گجراتی) مرے احوال، جبرئیل کیوں، ہائے نیل کی موجو (نعیم صدیقی) منشورِ آزادی (ابو سعید حسرت) کربلا (طالب حجازی) رجز (ابو البیان حماد)

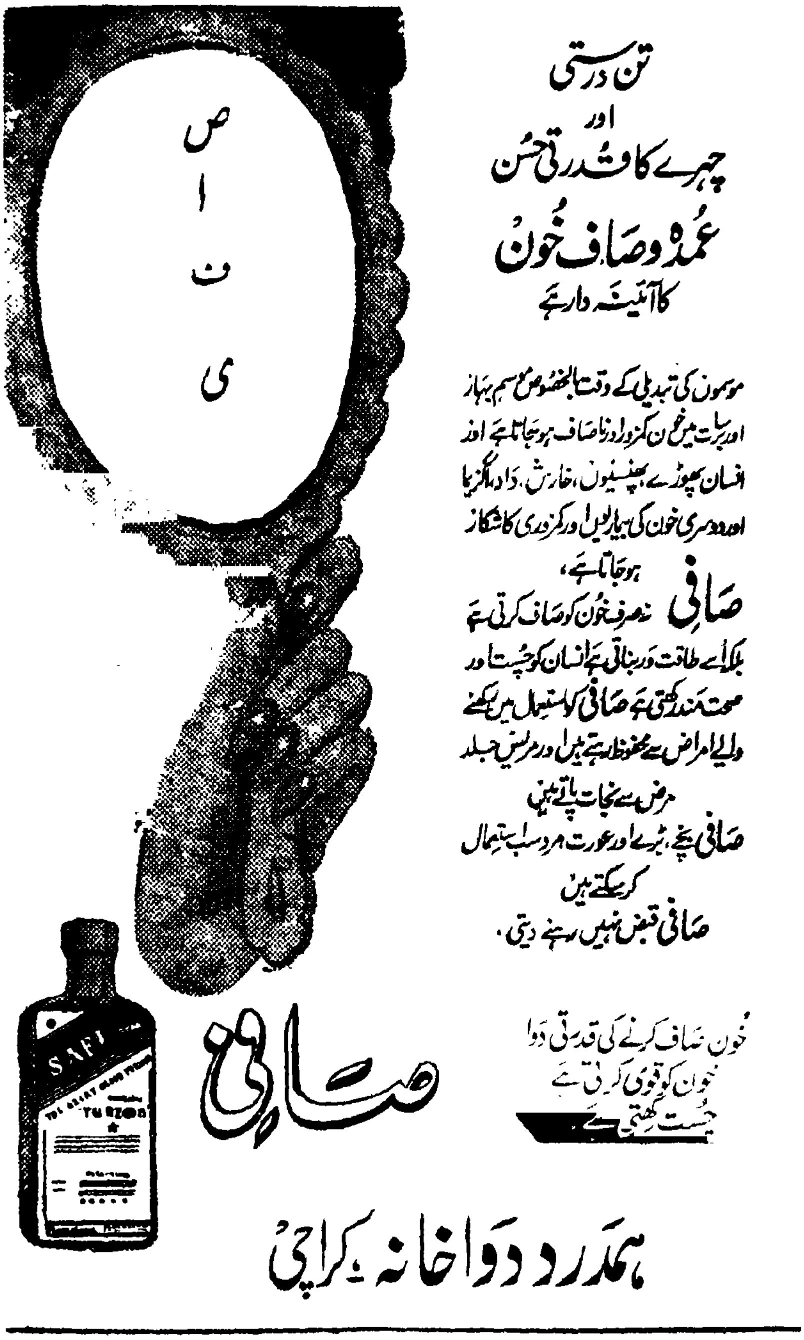
افسانہ و طنز ــــ بعلم بن بعور (جیلانی بی اے) میرا گاؤں (نعیم صدیقی) بھوکا ہے پنجاب (نعیم صدیقی) مالِ حرام (فضل من اللہ) جزیرہ زندہ دلاں (فضل الرحمن) مسٹر کا موٹر (جلال)

غزلیں ــــ عاصی کرنالی، ضیا محمد ضیا، عبد الکریم ثمر، کوثر نیازی، ارشد کاظمی، احمد پرویز، ابو ظہیر انصاری، ظہور الحق صدیقی، نعیم صدیقی

جائزہ پاکستان ــــ ظہورِ پاکستان اور اس کے پس منظر (ضیا محمد ضیا) مشرقی پاکستان (مولانا محمد عبد الرحیم) دستورِ پاکستان (ن ، ظفر) تعلیمی حالت کا جائزہ (ابو سلیم ایم اے) پنج سالہ معاشی جائزہ (پروفیسر عبد الحمید) معاشی بحران (پروفیسر اے آر ہیم) جبری انتخابات (سید صدیق الحسن) الطب الیونانی (حکیم محمد سعید دہلوی) مسئلہ کشمیر (محمد منظور احمد) چند غیر ملکی شخصیتیں (مولانا محمد مسعود عالم ندوی) میو قوم پاکستان میں (سردار محمد خاں میواتی)

یہ اشاعتِ خاص درحقیقت علم و ادب کی دنیا کا ایک سنگِ میل ہے۔ صفحات ۲۳۶ ۔ قیمت ۲/۴ روپے

اس اشاعت سے سال بھر کی خریداری قبول کرنے والوں کو کل سات روپے ادا کرنے ہوں گے۔ مینجر چراغِ راہ


ص
ا
ف
ی
تن درستی
اور
چہرے کا قدرتی حسن
عمدہ وصاف خون
کا آئینہ دار ہے
موسموں کی تبدیلی کے وقت بالخصوص موسم بہار
اور برسات میں خون کمزور اور ناصاف ہو جاتا ہے اور
انسان پھوڑے، پھنسیوں، خارش، داد، ملیریا
اور دوسری خون کی بیماریوں اور کمزوری کا شکار
ہو جاتا ہے،
صافی نہ صرف خون کو صاف کرتی ہے
بلکہ اسے طاقت ور بناتی ہے انسان کو چست اور
صحت مند رکھتی ہے صافی کو استعمال میں رکھنے
والے امراض سے محفوظ رہتے ہیں اور مریض جلد
مرض سے نجات پاتے ہیں
صافی بچے، بڑے اور عورت مرد سب استعمال
کر سکتے ہیں
صافی قبض نہیں رہنے دیتی۔
SAFI
صافی
خون صاف کرنے کی قدرتی دوا
خون کو قوی کرتی ہے
چست رکھتی ہے
ہمدرد دواخانہ، کراچی

Printed at Nazir Printing Press, McLeod Road, Karachi &
Title Printed at SHAN ELECTRIC PRESS Arambaugh Road, Karachi.
Printer & Publisher Ghulam Mohammed M. Chaudhri

چراغ راہ

چند طالب علم جامعہ ملیہ اسلامیہ
جامعہ نگر دہلی

مرتب
نعیم صدیقی

اپریل ۱۹۵۳ء
قیمت -/۸/-

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَى نَصْرُ اللَّهِ؟ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ

ناظرین کرام تک اس پرچہ کے پہنچنے سے پیشتر انھیں اس کا علم ہو چکا ہو گا کہ امیر جماعت اسلامی پاکستان مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور جماعت کے کم و بیش ۳۵ سرکردہ و ذمہ دار حضرات کو لاہور و دیگر مختلف اضلاع پنجاب سے گرفتار کر لیا گیا ہے، ان اصحاب میں مرتب رسالہ ہٰذا جناب نعیم صدیقی بھی ہیں۔ یہ واقعہ ہمارے لئے غیر متوقع نہیں اور نہ اُن صاحبانِ بصیرت کے لئے ناقابل فہم ہے۔ جو سنت اللہ پر نظر رکھتے ہیں اُن پر یہ حقیقت واضح ہے کہ داعیانِ حق کے لئے دورِ ابتلا آتا ہے جو اربابِ باطل کے لئے دورِ مہلت ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ دور آیا، اسے آنا چاہیئے تھا یہ زمانۂ ابتلا اقامت دین کی خاطر اپنی زندگی کو وقف کرنے والوں کے خلوص و صداقت کے پرکھے جانے کا ہے اور حق سے برسرِ پیکار معاندین کی مہلت کو اس منزل تک لے جانے والا جہاں اللہ کی حجت پوری ہو جاتی ہے، البتہ ہم ہمیشہ یہی دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اور ہمارے تمام محبوس رفقا کو صبر و ثبات کی توفیق عطا فرمائے، ساتھ ہی جو لوگ اس فریب میں مبتلا ہیں کہ ان اسلحہ سے حق دم توڑ دے گا۔ یا جماعت اسلامی میں اشتعال اور جھنجلاہٹ کی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ یا نظم جماعت درہم برہم ہو جائے گا، ان لوگوں کو ہم صاف صاف بتا دینا چاہتے ہیں کہ حق غالب ہونے ہی کے لئے ہے اور باطل کو بالآخر مغلوب ہی ہونا ہے اور بحمد اللہ اس جماعت کا اعتماد نہ پہلے فانی انسانوں پر تھا اور نہ اب ہے، اور نہ یہ جماعت اس غلط اندیشی کا شکار ہے۔ کہ حق کی سربلندی چند مخصوص ہاتھوں ہی پر موقوف ہے، بلکہ اس جماعت کا بھروسہ اپنے یوم تاسیس ہی سے خدائے عزیز و حکیم پر رہا اور ہے اور اس کے فضل و کرم اور اسی پر اعتماد کے سہارے یہ جماعت اٹھی۔ اور اس مقام تک پہنچی ہے، اور انشاء اللہ آئندہ بھی اللہ ہی کے بھروسہ پر اپنے اسی سابقہ روایتی نظم و ضبط، اسی سرگرمی اور اسی عزم و ہمت کے ساتھ اخلاق و شریعت کے حدود میں رہتے ہوئے اپنی اصلاحانہ جد و جہد جاری رکھے گی۔

چراغ راہ دعوتِ حق کے نقیب کی حیثیت سے بتوفیق الٰہی انشاء اللہ اپنا فرض اسی طرح ادا کرتا رہے گا۔ جس طرح آج تک انجام دیتا رہا ہے، البتہ اگر نامساعد حالات کے سبب چراغ راہ اپنے خریداروں کے واجبات کی تکمیل سے معذور ہوئے — تو اس معذوری کو ہمارے اسلام پسند ناظرین و خریدار حضرات اللہ کے دین کی ایک حقیر سی خدمت تصور کریں گے۔

اس موقع پر ہم ملک کے تمام اسلام پسند حضرات سے یہ بھی کہنا چاہتے ہیں کہ اب زمانے نے آپ کو اُس مقام پر لا کر کھڑا کر دیا ہے، جہاں حق و باطل کا آخری اور فیصلہ کن معرکہ ہو رہا ہے، اللہ پر اعتماد، حدودِ اخلاق و شریعت کے اہتمام اور خدا کی رحمت کو حرکت دینے والے کردار کے ساتھ پورے عزم و ثبات کو کام میں لاتے ہوئے سرگرم جد و جہد رہیں، اور یقین رکھیں کہ جلد — بہت جلد اللہ کی رحمت و نصرت کا نزول ہونے والا ہے۔ **بہت جلد اللہ کی رحمت و نصرت کا نزول ہونیوالا ہے**

رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا

غلام محمد

ناظم ادارہ چراغ راہ — ۳۰ مارچ ۵۳ء

ـه کیا تم نے گمان کر رکھا ہے کہ جنت میں پہنچ جاؤ گے؟ حالانکہ ابھی تمھارے سامنے اس طرح کے حالات نہیں آئے جس طرح کے حالات اُن لوگوں کو پیش آئے جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں، ان کو تنگی و اذیت کے سارے احوال سے دوچار ہونا پڑا اور پوری طرح جھنجوڑے گئے۔ یہاں تک کہ رسول اور وہ لوگ جو اُن کے ساتھ ایمان لائے، پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی —؟ اطمینان رکھو کہ اللہ کی مدد قریب ہے۔

چراغِ راہ

ادب میں اسلامی قدروں کا علمبردار

بہ ادارت: نعیم صدیقی

جلد ۶

شمارہ ۴

چندہ سالانہ

پاکستان ۵ — بھارت ۶ عہ

فی پرچہ

۸ آنے

اپریل ۱۹۵۳ء

مندرجات

دفتر ماہنامہ چراغ راہ ۹ - لوٹیا بلڈنگ آرام باغ روڈ کراچی

سوچ بچار

اُردو بنگالی قضیہ

تاریخ کے موضوع پر جو علمی کانفرنس پچھلے دنوں ڈھاکہ میں ہوئی تھی اُس میں ایک ایسا ناخوشگوار واقعہ پیش آیا کہ جس پر ہر حساس بنگالی کا سر شرم کے مارے جھک گیا ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی ہمارے ملک کی ایک نمایاں علمی شخصیت ہیں۔ آپ نے کانفرنس میں جو خطبۂ صدارت دیا وہ تمام تر تحقیقی نوعیت رکھتا تھا۔ اس خطبے میں بنگالی زبان اور رسم الخط کے بارے میں بھی سید صاحب نے اپنے نتائج تحقیق بیان فرمائے۔ ان نتائج تحقیق سے کوئی دوسرا محقق علمی حیثیت سے اختلاف کرنے کا حق رکھتا ہے، مگر ان کے خلاف جو ہلڑ نوجوان طلبا نے کانفرنس میں برپا کیا وہ حد درجہ افسوسناک ہے اور کوئی ایک معقول آدمی بھی، چاہے وہ بنگالی ہو یا غیر بنگالی اس حرکت کی تائید نہیں کرسکتا۔ زبان کا جھگڑا اپنی سیاسی حیثیت میں بالکل الگ چیز ہے اور تاریخ کے موضوع پر ایک علمی کانفرنس اور اس کا ایک محققانہ خطبۂ صدارت بالکل ایک الگ دائرۂ عمل ہے۔ اس دائرہ میں اظہارِ اختلاف کرنا سید صاحب کے پائے کے علماء و محققین کا کام ہے اور اس دائرے میں اظہارِ اختلاف کا انداز انتہائی معقول اور علمی و تحقیقی ہی ہونا چاہئے۔ بلکہ خود سیاست کے دائرہ میں بھی یہ کوئی قابلِ برداشت صورت نہیں ہے کہ کسی مسئلے کو اتنا جذباتی بنا دیا جائے کہ اس پر جہاں آپ سے مختلف نظریہ رکھنے والے نے بات چھیڑی تو آپ بھڑوں اور تتیّوں کی طرح بھنبھنا کر اس پر ٹوٹ پڑے۔ اپنی کہو تو دوسروں کو بھی کہنے دو۔ خود سناتے ہو تو دوسروں کی بھی سنو۔ مسائل کو نمٹانے کا شریفانہ طریقہ یہی ہے۔ جلسوں اور علمی مجلسوں میں ہلڑ مچا مچا کر دوسروں کو اظہارِ خیال کرنے سے روکنا عملاً ایک طرح کا "مجلسی سیفٹی ایکٹ" ہے کہ بس جو کوئی زبان کھولے وہ آپ کی حمایت ہی میں کھولے، ورنہ مہر بر لب رہے۔

اس افسوسناک اور غیر اخلاقی حادثے نے ایک بار پھر ملک کو زبان کے مسئلے پر متوجہ کر دیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس مسئلے پر مختصراً اظہارِ خیال کریں کہ یہ مسئلہ کیا ہے اور اُسے حل کرنے کا صحیح راستہ کونسا ہے۔

ہماری اشاعتِ خاص جنوری ۱۹۵۲ء میں "مشرقی پاکستان کے سماجی و ادبی رجحانات" پر جو بصیرت افروز مقالہ شائع ہو چکا ہے اسے ذہن میں رکھ کر ذرا حالات پر غور کیجئے۔ اسلام چونکہ ایک نظامِ زندگی کی حیثیت سے اُبھرا تھا اسلئے وہ اپنے نظریۂ زندگی، اپنی قدروں، اپنے تصورات اور اپنی روایات کے لئے ہر اس زبان کو سازگار کرتا گیا ہے جس سے اس کے علمبرداروں کو سابقہ پڑا ہے۔ بعض ملکوں میں تو اُس نے آناً فاناً بغیر کسی سیاسی جبر کے مقامی زبان کو یکسر ختم کر کے اس کی جگہ عربی کو دے دی ہے۔ بعض ملکوں میں زبان کا مزاج بدل ڈالا ہے، اور بعض علاقوں میں مقامی بولی کے متوازی ایک نئی بولی پیدا کر دی ہے۔ یہی آخری صورت ہندوستان میں پیدا ہوئی۔ یہاں جو نئی زبان اردو کے نام سے پیدا ہوگئی ہے وہ یہاں کی ہندی اور بھاشا ہی کی ایک نئی صورت ہے۔ ذخیرۂ الفاظ بڑی حد تک جوں کا توں لے لیا گیا ہے، گرامر بیشتر وہی ہے جس پر ہندی اور بھاشا کی ساخت ہوتی ہے، لیکن اردو کا مزاج ہندی اور بھاشا سے بالکل الگ تھلگ ہے۔ ہندی اور بھاشا ہندو کلچر کی ترجمان تھیں، لیکن اردو مسلم کلچر کی ترجمان ہے۔ اردو میں تمہیدِ کلام کی روایات، محاورے اور ضرب الامثال، اصطلاحات اور تاریخی و دینی تلمیحات اور تشبیہات و استعارات کا اگر جائزہ لیا جائے تو ماننا پڑتا ہے کہ اردو کو اسلامی تہذیب نے اپنے اظہار کے لئے تشکیل دی ہے۔

وہ تمام زبانیں جن کو اسلام نے اپنی تہذیبی قدروں اور اپنے نظریۂ حیات کے اظہار کے لئے متاثر کیا ہے، ان کا رسم الخط بھی اس نے بدل

ڈالا ہے۔ جہاں جہاں بھی مسلمان تہذیب فاتح بن کر پہنچی ہے، وہاں کی بولی کو عربی رسم الخط کے خلعت سے اس نے سرفراز کیا ہے۔ رسم الخط کی
یہ تبدیلی درحقیقت زبان کے مزاج کی تبدیلی کے لئے ناگزیر تھی۔ مزاج کو بدلنے کیلئے صوتی ذوق اور صوتی ذوق کو بدلنے کے لئے اشکال حروف کا بدلنا
بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ چنانچہ ہندی جب اردو کے سانچے میں ڈھلی تو اس نے عربی رسم الخط کا لباس زیب تن کیا۔
بنگال کی علاقائی بولی اپنے موجودہ علمی و ادبی مرتبے کو ماضی قریب ہی میں پہنچی ہے جیسا کہ ہمارے مقالہ نگار مولینا عبدالرحیم صاحب نے اپنے
مقالے میں وضاحت کی ہے۔ ورنہ مسلم سلطنت کے دور میں بنگال اسی طرح عام بول چال کی ایک ابتدائی زبان تھی جیسے بہاری، پنجابی، سندھی،
دکھنی وغیرہ زبانیں ہندوستان کے مختلف حصوں میں رائج تھیں۔ مسلم سلطنت کے زیر اثر برعظیم ہند کی مختلف علاقائی بولیاں آہستہ آہستہ اردو
زبان کی شاخیں بن گئیں اور انہوں نے بلامزاحمت عربی رسم الخط کا جامہ پہننا قبول کر لیا۔ لیکن بنگالی اس تاخت سے بچی رہ گئی۔ کیوں بچی رہ گئی؟
اس کا جواب مطالعۂ تاریخ ہی سے حاصل کیا جا سکتا ہے اور یہی جواب سید سلیمان ندوی صاحب نے اجمالاً اپنے خطبۂ صدارت میں دیا بھی ہے۔
بنگالی مسلم اثر سے بالکل ہی محفوظ نہیں رہی، بلکہ اسلام نے اس پر اپنا دھندلا سا پرتو ضرور ڈالا ہے۔ بس اتنا ہی دھندلا سا پرتو، جتنا کہ مسلمانوں کی
زندگی میں باقی رہ گیا تھا۔ مسلمانوں کے خواص جو اپنی صنعتی و تجارتی سرگرمیوں یا اپنی درباری وابستگیوں کی وجہ سے مرشد آباد اور ڈھاکہ جیسے مرکزی شہروں
میں سمٹے رہے، وہ بلاشبہ درباری تمدن کے علمبردار رہے۔ لیکن بنگالی عوام ان تمدنی مراکز سے دور اپنے انہی ٹوٹے پھوٹے آبائی گیتوں اور دوہوں
میں مگن رہے جو انہیں کچھ تو مناظرِ فطرت نے، کچھ سماجی زندگی کی ابتدائی ہماہمیوں نے اور کچھ قدیم مذہبی روایات نے بہم پہنچا دئے تھے۔ ان میں اضافہ
اگر کچھ ہوا تو بس مسلم تصوف کے اسرار و رموز کا، یا ملائی اوہام کا! بقول مولینا عبدالرحیم صاحب لے دے کے مسلمان پیروں کی پنتھیاں (کہانیاں)
اور ملاؤں کی پوتھیاں (قصص الانبیاء، سکندر نامہ، میلاد نامہ وغیرہ) بنگالی میں مسلم کلاسیکل ادب کی کُل کائنات ہیں۔
اب انگریزی راج کا دور آتا ہے۔ یہ دور وہ ہے جبکہ ایک طرف انگریز نے تحریک جہاد کے اثرات کی جڑیں کھودنے کے لئے اور ہندوستان
کی صنعتی قوت کو پاش پاش کرنے کے لئے بالعموم اور خصوصاً بنگالی مسلمانوں کو دبانے کے لئے ہر ممکن تدبیر اختیار کی، پھر اس نے بندوبست دوامی
کے ذریعے مسلم عوام کی باگ ڈور ہندو جاگیرداروں کے حوالے کر دی۔ گویا مسلم بنگال ہندو جاگیرداری اور برطانوی اقتدار کی دو چٹانوں کے نیچے دب
کر رہ گیا۔

پھر اسی انگریزی دور میں جب عیسائی مبلغین نے سیرامپور اور کلکتہ کو مرکز بنا کر مقامی زبان میں کام شروع کیا تو اس مبینہ حملے سے اپنے مذہبی
و سماجی عقاید کو بچانے کے لئے ہندوں میں ایک ردعمل رونما ہوا۔ اس ردعمل نے بنگالی زبان میں ہندو کلچر کے اثرات کو پوری طرح ابھار دیا۔ دوسری
طرف ملک میں چونکہ سیاسی حرکت بھی شروع ہو چکی تھی اور بنگالی ہندو مسلمانوں کے مقابلے میں اس میں حصہ لینے کے لئے زیادہ بہتر حالات رکھتے
تھے، اس لئے بنگالی زبان سیاسی اثرات کے تحت اپنے ادب کو تیزی سے نشو و نما دینے پر قادر ہو گئی۔ چنانچہ بنکم چندر چٹرجی نے انتہا پسندانہ
جذبۂ وطنیت کے ساتھ مذہبیت کو ترکیب دے کر نو ہندوئیت (
) کو بنگالی ادب کی روح بنا دیا۔ دوسری طرف
ٹیگور اگرچہ بنگالی ادب کے دربار میں آفاقیت کا علمبردار بنا کھڑا نظر آتا ہے۔ لیکن بنکم کا طوفانِ نفرت اور ٹیگور کی شانتی کی پرسکون لہر ہندو کلاسیکیت
کے سنگم پر ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔
بنگال میں مسلمان ہندوؤں کے مقابلے میں جس طرح ہر دوسرے میدان میں پسے ہیں، اسی طرح وہ ادب کے میدان میں بھی بالکل چور چور کر دئے
گئے ہیں۔ ان کو ملازمتوں کے میدان میں پیچھے دھکیلا گیا ہے، ان کو تعلیم کے میدان میں آگے بڑھنے سے روکا گیا ہے، ان کو سیاسی اسٹیج پر سر
اٹھانے نہیں دیا گیا، ان کو معاشی دائرے میں اقدام کرنے نہیں دیا گیا، بالکل اسی طرح ان کو ادب میں بھی منہ کی کھانی پڑی ہے
بنگالی ادب کی وہ مسلم شاخ جس کا ابتدائی سرمایہ چند دیہاتی گیت اور پنتھیاں اور پوتھیاں تھیں، اور جو عربی رسم الخط کو قبول کر سکتی ہے اس

شاخ نے اگرچہ نشوونما کی کوشش اس لمحے تک بھی جاری رکھی ہیں، لیکن وہ ہندوانہ ادب کی روز بروز پھیلتی ہوئی شاخ کے نیچے اس طرح دب گئی ہے کہ آج اس کا وجود تک محسوس نہیں ہوتا۔ بنگالی ادب میں آج بھی مسلم کلچر کی ترجمانی کرنے والے ادیب موجود ہیں مگر ان کی کوئی آواز نہیں اور ان کو کوئی جانتا تک نہیں۔

آئیے اب اس پس منظر کو سامنے رکھ کر حسب ذیل نکات کی روشنی میں زبان کے مسئلے کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

۱۔ مشرقی پاکستان میں غیر مسلم آبادی ایک نمایاں تعداد میں پائی جاتی ہے۔ اور یہ آج بھی تعلیم، معیشت اور سیاست کے میدان میں پیش پیش ہے۔ یہ سماجی حیثیت سے بڑا اثر رکھتی ہے۔ یہ عنصر چونکہ ہندو کلچر کی بقا اور نشوونما کا فطری طور پر تمنائی ہے اس لئے اسے کسی حال میں بھی یہ گوارا نہیں کہ بنگالی کی وہ شاخ فضا میں بڑھے جو مسلم کلچر کی ترجمانی کے لئے سازگار ہو سکتی ہے۔

۲۔ سیاسی نقطۂ نظر سے یہ عنصر مغربی بنگال کی ہندو اکثریت کے ساتھ اس سیاسی فکر میں ہم آہنگ ہے کہ حالات کو آہستہ آہستہ اس رخ پر ڈھالا جائے کہ بنگال کو از سر نو متحد کیا جا سکے۔ اس مقصد کے لئے ایک طرف یہ ضروری ہے مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان کے مقابلے میں ایک جداگانہ حیثیت برقرار رکھنے کے جذبے سے آراستہ رکھا جائے، اور دوسری طرف مشرقی بنگال اور مغربی بنگال میں جوڑ لگانے کے لئے کوئی نہ کوئی ربط بحال رہے۔ یہ دونوں ضرورتیں زبان کا مسئلہ پوری کرتا ہے۔

۳۔ بنگال کے دونوں خطوں میں جو کمیونسٹ عنصر پایا جاتا ہے، وہ اراکان اور بنگال کے علاقوں کو ایک کر کے ایک جداگانہ کمیونسٹ اسٹیٹ بنانے کا منصوبہ پیشِ نظر رکھتا ہے۔ اس منصوبے کو عمل میں لانے کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ مشرقی پاکستان میں علیحدگی کا احساس قائم کرنے کے لئے زبان کا مسئلہ چھیڑا رہے۔

چنانچہ زبان کا مسئلہ کوئی سیدھا سادہ سا مسئلہ نہیں ہے ایک بڑا پرابلم ہے۔ لیکن کوئی پرابلم کتنا بھی پیچیدہ کیوں نہ ہو لاینحل نہیں ہو سکتا۔ شرط صرف یہ ہے کہ اسے حل کرنے کی خواہش واقعتہً موجود ہو اور معقولیت کے ساتھ اس پر غور کرنے کے لئے اس سے دلچسپی رکھنے والے تمام فریق تیار ہوں۔ اس مسئلے کو معقولیت کے ساتھ حل کرنے کے لئے شرط اول یہ ہے کہ کسی پر اس کی مرضی کے خلاف کوئی زبان ٹھونسنے کا طرزِ عمل بالکل ختم کر کے افہام و تفہیم کو رہنما اصول مانا جائے۔ مشرقی پاکستان کی رضامندی کے بغیر اس مسئلے کو حکومت کے جبر یا سیاسی چالوں سے حل کرنے کا طریقہ یکسر ناقابل عمل قرار دے کر آگے چلیئے! اندر اندر کھچڑیاں پکانے کے بجائے صاف صاف طریقے سے باہمی تبادلۂ دلائل ہونا چاہیئے۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ مشرقی پاکستان کے جو لوگ زبان کے مسئلے کے علمبردار ہیں، وہ بھی جھگڑا چکانے کے لئے کوئی معیارِ فیصلہ سامنے لائیں۔ تاکہ ہر استدلال اور مطالبے اور تجویز کو اُس معیارِ فیصلہ پر پرکھ کر دیکھا جا سکے اور رائے عام بن کر کوئی حکم لگا سکے۔ افسوس یہ ہے کہ ہمارے حکمراں گروہ، اور ہمارے بنگالی بھائیوں اور دوسرے عناصر نے معیارِ فیصلہ تجویز کئے بغیر ایک کشمکش چھیڑ رکھی ہے۔ اس طرح کی کشمکش کبھی بھی بخیر و خوبی ختم نہیں ہو سکتی، بلکہ اس کا انجام لازماً ناخوشگوار ہی ہو سکتا ہے۔

ہمارے نزدیک معیارِ فیصلہ حسب ذیل دو امور ہیں:۔

۱۔ اسلام کو بہ حیثیت ایک نظامِ زندگی کے زندہ کرنے اور عملاً برپا کرنے میں کونسی صورت مفید ہوگی۔

۲۔ پاکستان کی وحدت و سالمیت اور ہم آہنگی کس شکل میں حاصل ہو سکتی ہے

بحث اس معیارِ فیصلہ میں ہو سکتی ہے۔ لیکن اس معیارِ فیصلہ کے تحت جو چیز خیر و فلاح کا ذریعہ قرار پاتی ہو، پھر اس کے متعلق ضد ثم ضد کا مظاہرہ کرنا کسی طرح معقول نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس معیارِ فیصلہ میں کوئی بحث کیا کرے گا۔ پاکستان ایک ایسی سلطنت ہے جو اسلام کے احیاء و قیام ہی کے لئے وجود میں آئی ہے اور تقسیم ملک ہو، یا تقسیم پنجاب یا تقسیم بنگال، اس کا اصل محرک تھا ہی یہی کہ مسلمان ہند و کلچر کے تسلط میں نہیں

رہنا چاہئے بلکہ وہ الگ ہو کر اپنے مسلم کلچر کو نشوونما دینا چاہتے ہیں۔ تقسیم کے سارے واقعے کے لئے واحد وجہ جواز یہی ہے۔ دوسری طرف پاکستان کے صوبے پاکستان میں اس لئے شریک نہیں ہوتے کہ یہاں وہ اپنے جداگانہ وجود کو زیادہ اچھی طرح نشوونما دے سکیں گے، بلکہ اس لئے کہ وہ دوسرے صوبوں سے مل کر پاکستان کو ایک اسلامی سماج کا گھر بنا سکیں گے۔

اس معیار فیصلہ کو سامنے رکھ کر ٹھنڈے دل سے مشرقی پاکستان کا جو مسلمان بھی غور کرے گا، وہ یہ تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ایک اردو زبان ہی ایک ایسی زبان ہے جو پورے ملک کی قومی زبان بننے کی خصوصیات رکھتی ہے۔ وہ خصوصیات یہ ہیں جو ہماری کسی دوسری زبان کی نہیں ہیں:-

ا- یہ اتنی ترقی کر چکی ہے کہ ہماری ساری کی ساری ضروریات پوری کر سکے۔

ب- یہ ہمارے ہر علاقہ میں بات کرنے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

ج- یہ رسم الخط کے لحاظ سے ہمیں مسلم ممالک کے قریب کرتی ہے۔

د- یہ کسی صوبے کی مخصوص بولی نہیں ہے۔

لیکن پاکستان —— بلکہ کہنا چاہئے "اسلامی پاکستان" کی قومی یا ریاستی زبان بننے کے لئے اردو اصل میں اس بنا پر واحد موزوں زبان قرار پاتی ہے کہ یہ اسلامی کلچر کے اظہار کے لئے پیدا ہوئی تھی اور اُس نے ایک صدی بھر میں اپنے آپ کو اس صلاحیت کے لحاظ سے بڑی ترقی دی ہے۔ یہ ہمارے دینی لٹریچر سے مالا مال ہے۔ اور ہر طرح کی دینی اصطلاحات اور دینی اسالیب بیان کے موتیوں سے اس کا دامن بھرا ہوا ہے۔ یہ زبان جس مقصد سے وجود پذیر ہوئی ہے، آج اس سے وہ مقصد حاصل کرنے کا وقت آیا ہے تو کیا آج یہ موزوں ہوگا کہ ہم اپنی محنتوں کے اس حاصل کو دریا برد کر دیں اور از سر نو کسی دوسری بولی کو اُس مقصد کے لئے تیار کرنے لگیں؟

پس جن لوگوں کے نزدیک اصل مقصود پاکستان بنائے اسلام ہے، وہ چاہے سرحدی ہوں، یا سندھی، پنجابی ہوں یا بنگالی، ان کو اس پر تو متفق ہونا پڑے گا کہ ہماری ملکی زبان اردو ہوگی۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی محسوس کر لینا چاہئے کہ اردو سے مشرقی پاکستان کا ذہن اتنا زیادہ قریب نہیں ہے جتنا کہ پاکستان کے دوسرے صوبوں کا ذہن ہے۔ مشرقی پاکستان کے ذہن کو اردو سے قریب ہونے میں کچھ دیر لگے گی۔ ایسی خاص صورت میں آخر اس میں ہرج کیا ہے کہ مشرقی پاکستان کی حد تک بنگالی کو بھی ثانوی حیثیت سے پوری پوری اہمیت دی جائے۔ کیوں نہ کچھ عرصے کے لئے بنگالی کو صوبائی حد تک دوسری سرکاری زبان کا مقام حاصل ہو۔ اسمبلی کی کارروائیوں میں، عدالتی اور دفتری کاموں میں، سرکاری اعلانات اور مطبوعات میں بنگالی کو اردو کے ساتھ ساتھ لے کے چلا جائے۔ بلکہ ہم اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ تک مشورہ دیں گے کہ نوٹوں اور سکوں اور ڈاک کے ٹکٹوں پر اور مرکزی اعلانات اور مطبوعات میں بھی اگر بنگالی کو اہمیت دی جائے تو یہ مناسب ہوگا۔

لیکن بنگالی کے بارے میں دو تبدیلیاں مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کو قبول کر لینی چاہئیں:-

ایک یہ کہ بنگالی زبان و ادب کی مسلم شاخ جو سوکھ کر رہ گئی ہے اسے از سر نو زندہ کیا جائے اور مختلف ذرائع سے اسی کو فروغ دیا جائے، نہ کہ ہندو کلچر کی ترجمانی کرنے والی شاخ کو۔

دوسرے یہ کہ بنگالی کے لئے عربی رسم الخط کو قبول کر لیا جائے تاکہ یہ رسم الخط اردو اور بنگالی کو قریب کرنے کا ذریعہ بھی ہو، اور بنگالی کے مزاج کو اسلام سے ہم آہنگ کرنے میں بھی اثر دکھا سکے۔ علاوہ بریں غیر بنگالی لوگوں کے لئے بنگالی کا سیکھنا بھی آسان ہو جائے۔

ان تجاویز پر براہ کرم اشتعال بھی نہ آئیے۔ بلکہ ایک مرتبہ پھر اپنے معیار فیصلہ کو سامنے رکھئے اور انصاف سے کہئے کہ وہ معیار فیصلہ ان تجاویز کے حق میں ہے یا ان خلاف!

ان نکات پر اگر افہام و تفہیم ہو تو ہم توقع رکھتے ہیں کہ یہ عقدہ وا ہو سکتا ہے۔ پھر اگر کسی طرح سمجھوتہ ہو جائے تو اس کے بعد حکومت کو بنگالی کی مسلم شاخ کے احیاء کے لئے منصوبہ بنا کر اپنی وہ ذمہ داریاں ادا کرنی چاہئیں جن سے اُس نے ساڑھے پانچ سال برابر تغافل برتا ہے۔ اس سلسلے میں دارالاشاعت کا قیام ہونا چاہئے، سرکاری و نیم سرکاری جرائد کا اجرا عمل میں لایا جانا چاہئے، مسلم بنگالی میں شائع ہونے والے نجی جرائد کو گرانٹ دینے اور مسلم بنگالی میں لکھی جانے والی کتابوں پر انعامات تقسیم کرنے کا انتظام ہونا چاہئے، ریڈیو کے نشریات کے ذریعے مسلم بنگالی کو پرورش دی جانی چاہئے، قرآن اور دینی لٹریچر اور اردو کے اسلامی ادبیات کو ترجمہ کرانے کے لئے منصوبہ بندی ہونی چاہئے، اور ذہین مسلم نوجوانوں کے ذریعے ادبی مجالس اور ادارات کا قیام ہونا چاہئے۔

اس کے ساتھ ساتھ بنگالیوں کو اردو سیکھنے کی ترغیب دلانے کے لئے ابتداءً اس امر کا انتظام ہونا چاہئے کہ اردو زبان کو امتحانی مضمون کے طور پر لینے والے طلبا کو خاص وظائف دئے جائیں، اور اسی طرح اردو جاننے والے افسروں اور ملازمین کو خاص الاؤنس دیا جائے۔

بہرحال یہ مسئلہ جبر اور ضد م ضدا سے حل ہونے کا نہیں، اسے حل کرنے کے لئے افہام و تفہیم ناگزیر ہے!

ہمارے طلباء

گذشتہ جشن آزادی کے موقع پر پہلی مرتبہ یہ چھپی ہوئی حقیقت بالکل عریاں ہو کر سامنے آگئی کہ ہمارے طلباء اخلاقی حیثیت سے انتہائی خطرناک حد تک روگی ہیں۔ انہوں نے راولپنڈی میں "لال دوپٹہ ململ کا" جیسا مکروہ نغمہ الاپتے ہوئے مارچ کیا ہے۔ انہوں نے لاہور میں اپنی بہنوں کے اوپر یورش کر کے ان کے ازار بند کاٹے ہیں۔ انہوں نے کراچی میں لڑکیوں کے برقعے نوچے ہیں، اور انہوں نے ڈھاکہ میں اپنے سفلہ پن کے مظاہرے کئے ہیں۔

ابھی حال ہی میں پنجاب یونیورسٹی کے تحت امتحانات میں بیٹھنے کے لئے کراچی سے نوجوان طلباء کے جو گروہ لاہور آئے ہیں، انہوں نے پاکستان ایکسپریس پر آتے ہوئے مسلسل تین روز تک اپنی جن صلاحیتوں کو ملک کے سامنے پیش کیا ہے وہ ہر طرف سے خراجِ لعنت لے رہی ہیں۔ انہوں نے عورتوں کے ڈبوں پر یورش کی ہے، انہوں نے ماؤں بہنوں سے مذاق کئے ہیں، ایک عورت کا برقعہ نوچ لیا ہے، ایک معمر آدمی کو پیٹا اور ننگا کیا ہے، ریلوے کے عملے کو سخت پریشان کیا ہے، گاڑی کو جا بجا روکا ہے، ریلوے لائن کے متصل جو باغات تھے ان میں گھس کر پھلوں کی لوٹ مچائی ہے، ڈائننگ کار میں برتن توڑے ہیں، اور کوئی حرکت ایسی باقی نہیں چھوڑی ہے جس پر انسانیت نفرین نہ بھیجتی ہے۔

ادھر ۲ - مارچ کا یہ واقعہ ہماری تشویش میں مزید اضافہ کرتا ہے کہ لاہور میں چھ طلباء طالبات کو چھیڑنے کے الزام میں گرفتار کئے گئے ہیں۔
یہ ہیں وہ لوگ جو کل ہماری زندگی کی باگ ڈور تھامنے والے ہیں۔ ان کے ذریعے کل ہمارا نظام سیاست و معیشت چلے گا، یہی کل ملک و قوم کے نفع و نقصان کا فیصلہ کرنے والے ہوں گے۔ انہی کے ہاتھوں کل اسلام کی قسمت بنے گی۔

بلاشبہ یہ نوجوان اپنی ان حرکات کے ذمہ دار ہیں اور قابل ملامت! لیکن ان کی اخلاقی حالت اُس نظامِ تعلیم اور اُس ماحول کے فساد کو بھی تو سامنے لاتی ہے جس کے سانچوں میں ان کے ذہن اور ان کی سیرتیں ڈھل رہی ہیں۔ ہمارا نظامِ تعلیم کتابیں تو طلبا کے کندھوں پر لادتا ہے، لیکن ان کو اخلاق سے آراستہ نہیں کرتا۔ وہ سند تو دیتا ہے انسانی روح نہیں دیتا، وہ حیوانی احساسات کو تو جگاتا ہے انسانی جذبات کو بیدار نہیں کرتا، وہ خواہش پرستی کا درس دیتا ہے لیکن خدا پرستی کا نہیں دیتا، وہ عہدوں پر نگاہیں مرتکز کراتا ہے مگر کسی بلند نصب العین کی

(بقایا صفحہ ۲۹ پر)

اسلامی نظام میں فکر و ادب کی بنیادیں

محمد عزیز ایم۔اے

قبل اس کے کہ ہم اسلامی نظام میں ادب کی حیثیت اور اس کے مقام پر کچھ عرض کریں۔ ایک نظر اشتراکی نظام کے ادب پر بھی ڈالنی ضروری ہے۔ اشتراکی نظام میں افراد کو سوائے اس کے ہر بات کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی آزادیٔ ضمیر سے متمتع ہوں۔ انہیں وہی کچھ لینا ہے جو ان کی اپنی ذات اور ان کے اپنے رومان سے متعلق ہوں۔ یا خوبصورت الفاظ میں یوں کہئے کہ انہیں اپنے ذوقِ جمال کو پورا کرنے کی پوری آزادی ہے۔ رائج الوقت نظام کی خلاف ورزی میں کچھ لکھنا، حکامِ بالا پر تنقید وغیرہ اس کا امکان نہیں اور یہاں ایک معمولی سی بات یہ بھی ہے کہ آپ کو خود کچھ شائع کرنے کا حق نہیں کیونکہ حقِ ملکیت تو صرف اسٹیٹ کو حاصل ہے۔ اس کے شعبوں کے ذریعہ جو ادب شائع ہوگا وہی شائع ہو سکتا ہے۔ آپ چاہیں تو اسے یوں بھی محمول کر لیجئے کہ ادب صرف اسٹیٹ کا ہوگا یا اسٹیٹ کے ہاتھ بکا ہوا ہوگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس طرح ادب میں یکسانی اور مقصدیت لازمی طور پر پیدا ہو جاتی ہے جو جمہوری نظام میں نہ تھی نیز یہ کہ فکر انسانی کو ایک سماج میں ایک متعین سمت میں چلانا بھی ممکن ہو گیا۔ لیکن آزادیٔ ضمیر جیسی گراں قیمت پر تنقید کے حق سے دست بردار ہونے کے صلے میں ملکیت ریاست پر راضی ہو جانے کے انعام میں جنسی آزادی البتہ ... جنس ارزاں ہے کیونکہ اس نظام کی بنیاد ہی مخالفتِ اخلاق قائم پر ہے اور اس کا بقا اسی پر منحصر ہے کہ اعلیٰ اخلاقی اقدار اور علوئے فکر روحانی بلند تصورات کے مخالف رجحان فکر ہو۔ یہ ہے مختصراً اس نظام میں ادب کی حیثیت۔

اب ہم آخر میں یہ بھی بتا دینا چاہیں گے کہ اسلامی نظام میں افراد کی کفالت بدرجۂ آخر ریاست کے ذمہ ہے اور وہ ریاست ایک کلی ریاست ہے۔ ان معنوں میں کہ نظریہ حکومت اور نظامِ معاش سے لے کر نظریہ ادب اور فکری بنیادوں تک سب ایک ہی واحد اساس پر قائم ہے۔ اور وہ ہے اطاعتِ الٰہی کی بنیاد۔ اسلامی ریاست میں حکومت اللہ کی ہے اور خلافت جمہور کی۔ ادب کا مقصد صرف یہی ہے کہ وہ لوگوں کو اس نظام پر قائم رکھے اور اسی کے متعلق اور اس کے مبنی حسیات کو اجاگر کرے یہ تو ہے اسلامی نظام کا اصل اور مطلوبہ ادب اور اس میں یہ اشتراکی نظام سے مماثل ہے لیکن فرق یہ ہے کہ یہاں آزادیٔ ضمیر حاصل ہے، اشتراکی نظام میں کوئی غیر اشتراکی فکر کے ساتھ زندہ بھی نہیں رہ سکتا۔ اپنے اس قسم کے خیالات کا اظہار بھی نہیں کر سکتا ہے۔ اگر وہ حکام پر تنقید کرے تو قید سخت جھیلے اگر وہ سماج کی بیچارگی دکھائے تو لینن کو پیارا ہو جائے یا میدان سائبیریا کو آباد کرے لیکن اسلامی نظام میں ایسا نہیں ہے۔ علاوہ ازیں اسلامی نظام میں حکومت حقِ ملکیت افراد سے سلب نہیں کرتی اس لئے ادب نواز حکومت یا ریاست نہ ہوگی۔ افراد کو ادب کی بھی ملکیت حاصل ہوگی اور اشاعت کے ذرائع کی بھی لیکن وہ اصول اپنی جگہ پر قائم کہ اس کا مقصد سماج کی تخریب نہ ہو اس کا مقصد ریاست [illegible] اور ... کا ... ہو ... مگر ... کی یہ تخریب ہے اور نظام اسلامی میں جو چیز سب نہیں ... بقا کے ... اور ... کوشاں ہوگا تو ظاہر ہے وہ وہاں پنپ نہیں سکتا۔ ادب وہاں تخریب اور Diservice نہیں کر سکتا یعنی طور پر گمراہی اور انحطاط کی طرف دھکیل دینے والا ادب وہاں پروان نہیں چڑھ سکتا۔ وہاں ہر وہ چیز کامیاب ہو سکتی ہے جس کا مقصد خدا پرستی کی خلاف ورزی نہ ہو۔ ریاست کے افراد پر صحیح تنقید وہاں محبوب چیز ہوگی بلکہ لوگ اس کے لئے شکر گذار ہوں گے نہ کہ چیں بہ جبیں یہ ہے آزادیٔ خیال و فکر کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر۔

اسلامی نظام میں فکر و ادب کی بنیادیں

معاشرہ کی بنیادوں اور معاشی حالت کا ادب پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔ اگر کسی سماج میں افراد کے کھانے پینے کے مسائل ابتر حالت میں ہوں اگر کسی نظام میں ہر شخص کی فکری صلاحیتیں صرف گتھی کے سلجھانے میں مصروف رہتی ہوں کہ آج پیٹ خود و باعدا فرزندم تو ظاہر ہے وہاں کس مسخرہ کو اعلیٰ اقدار کی پروا ہو سکتی ہے۔ اور کیسے فرصت ہو گی کہ وہ اپنی حیثیت کو اس کائنات میں سمجھنے کی کوشش کرے۔ اور اپنی فکری اور ادبی صلاحیتوں کو کسی ٹھوس اور تعمیری ادب کی تیاری میں صرف کرے۔ جس نظام میں لوگوں کے لئے ذرائع معاش مسدود ہوں اور پھر جس بازار میں جنس و صنف جنس رائج ہو پھر وہاں سوائے اس ترقی پسند ادب کے اور کیا وجود میں آسکتا تھا۔ لیکن اسلامی حکومت حق ملکیت افراد سے سلب کئے بغیر ان کی معاش کی ذمہ دار ہے۔ وہاں کوئی اس پر مجبور نہیں کہ خواہ مخواہ اپنے جسم کی نمائش اپنی، دیدہ زیب مسکراہٹوں اور اپنی ادبی صلاحیتوں کو لوگوں کے پست جذبات کی تسکین کے لئے فروخت کر کے روٹیاں کھائیں۔ وہاں اول تو کوئی شخص معاشی طور پر اتنا مجبور نہیں ہو سکتا پھر یہ کہ اس سماج میں یہ جنس فروخت ہو ہی نہیں سکتی۔ وہاں تو جنس کے لئے بھی خدا پرستی کے نظریہ کے مطابق ہی ایسا حل موجود ہے کہ کسی کو خواہ مخواہ اس جنس کی طلب بھی نہیں ہو گی۔ وہاں جنس کے بہ بلیک مارکٹ نفع اندوزی ممکن نہیں۔ وہاں نہ کسی کو ضرورت ہے کہ نا سودوں اور گھاوؤں کی جھلک دیکھنے کی آڑ میں لطف اندوز ہوتا رہے۔ اور نہ کوئی ایسا کر ہی سکتا ہے۔ وہاں تو ایک ایسا ستھرا سماج ہو گا جس میں پہلی بھوک اور دوسری بھوک دونوں کے مسائل بوجہ احسن حل ہو چکیں گے۔ اور لطف یہ ہے کہ ملکیت عام بنائے بغیر۔

انسان کی فکر چونکہ اس سماج اور نظام میں صرف فکر معاش پر مرتکز نہیں ہو گی بلکہ بلند روحانی اقدار تو خود وہ نظام مہیا کرتا ہی ہے ان کے ساتھ ہی اس نظام کا تقاضا یہی ہے کہ انسان کی فکری صلاحیتیں اس خدا پرستی کے خطوط پر صرف ہوں۔ اس لئے یہ نظام انسان کی فکر کو ایک صاف سیدھا اور متعین راستہ بھی دکھا دیتی ہے جس پر اس کا ارتقا ہو۔ وہاں قانون سازی بنیادی طور پر اللہ کا حق ہے اور اسی بنیاد پر علوم کا ارتقاء ہو گا اس طرح ہر فیلڈ میں اس نے بنیادیں فراہم کر کے انسان کی فکر کو ایک راہ بتا دی ہے اسلامی نظام کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے زندگی کے سارے شعبوں میں ایک ہی بنیاد فراہم کر دی ہے۔ اشتراکیت نے پہلی بھوک یعنی روٹی کپڑے کے لئے آزادیٔ معاش اور آزادیٔ ذرائع نہیں دی ہے۔ مکمل راشننگ اور تعین ہے لیکن دوسری بھوک یعنی جنسی بھوک میں مکمل آزادی اور تاراج قائم کیا ہے۔ لیکن اسلام نے پہلی بھوک میں ریاست کی ملکیت کے بغیر ہی ایک ایسا متوازن نظام قائم کیا ہے جس میں نہ افراد سے آزادیٔ ضمیر سلب ہوتی ہے نہ انہیں راضی برضائے اسٹیٹ ہونا پڑتا ہے اور دوسری بھوک کے لئے اس نے البتہ انتہائی حد بھی مقرر کر دی ہے اور اس پر مصر ہے کہ ابتدائی کم از کم حصہ ہر شخص کو بھوک کے پیدا ہوتے ہی ملنا چاہئے۔ اور اس کے لئے ترک و اختیار کا بھی امکان رکھا ہے۔ اور ان پہلی اور دوسری بھوکوں کے علاوہ تیسری بھوک یعنی روحانی ارتقاء اور فکری بلندی کا بھی اہتمام کیا ہے۔ بلکہ یہی اس کا کمال ہے اس طرح اسلامی نظام نہ صرف ہمارے مادی تاریخ کا بہترین حل پیش کرتا ہے بلکہ فکر و ادب کے لئے بھی وہ بہترین بنیادیں پیش کرتا ہے۔

ختم سے پہلے یہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ادب کے متعلق اور اسلامی نظام میں فکر و ادب کے متعلق چند غلط فہمیوں کا ازالہ کر دیا جائے عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسلامی نظام اور اسلامی سماج میں ایروپلین کی جگہ اونٹ گاڑیاں ہوں گی۔ میز کرسی کے بجائے ٹاٹ پر نشست و برخاست ہو گی۔ اور ذوق جمال کا تو شاید گذر بھی نہ ہو گا۔ ادب کی مختلف صنفیں سب ختم ہو جائیں گی لوگوں کی دلچسپی اور تفنن کے لئے کوئی گنجائش نہ نکلے گی لیکن کہیں تو یہ باتیں سراسر لاعلمی اور ناواقفیت کی وجہ سے کہی جاتی ہیں اور کہیں خواہ مخواہ بغض اور عناد کی وجہ سے۔ جہاں تک اس کا تعلق ہے کہ اسلامی نظام میں ادب کی رنگینی اور جمال کا کوئی امکان نہ ہو گا اس کے متعلق تو شروع

ہی میں عرض کیا جا چکا کہ اسلامی نظام میں ادب کے مقام کا اندازہ اس سے کیجئے کہ سارے انبیاء بہترین خطیب تھے ۔ ان کے اقوال بہترین ادب پارے ہوتے ان میں نادر سے نادر تشبیہیں ہوتیں نہایت ہی اچھوتے استعارے ہوتے اور ہر صورت سے بہترین پیرایۂ بیان اختیار کیا جاتا۔ ظاہر ہے یہ کہنا بالکل مہمل ہے کہ اسلام میں ادب کی گنجائش نہیں خود اللہ تعالیٰ کی وحی بہترین مکالموں اور مقالوں کی شکل میں نازل ہوئی ہے ۔ بہترین مسجع عبارتیں خود قرآن اور دوسری آسمانی کتابوں میں موجود ہیں ۔

خود رسولؐ کے زمانہ میں حسان بن ثابت جیسے بہترین شاعر وقت کی ہمت افزائی ہوتی تھی ۔ آنجنابؐ اور آپ کے صحابہؓ بہترین خطبے ارشاد فرماتے تھے اور آپ کا بیان ہے کہ بسا اوقات شعر میں حکمت ہوتی ہے اور خطابت میں سحر۔ تعجب ہے کہ ان شواہد کے علی الرغم لوگ یہ کہنے کی جرأت کیونکر کرتے ہیں کہ اسلامی نظام میں ادب کی گنجائش نہیں اس میں ذوق جمال کی سیری نہیں ۔ اس میں تو بس "ملا بیٹھا اونگھ رہا ہے" لیکن یہاں پر یہ ضروری ہے کہ ہم اسلام کے نظریہ حیات کو پیش نظر رکھیں ۔ وہ نظریہ حیات جو انسان کی ساری زندگی میں یک رنگی پیدا کرتا ہے ۔ ادب کی وہی بنیاد ہے فکر کی وہی اساس ہے ۔ معاش کا وہی نظام ہے ۔ اور اسی کے مطابق اسٹیٹ کا قیام ہے یعنی خدا پرستی ہماری ہر چیز اس کے تابع میں ہوگی ہماری فکر اس نہج پر ہوگی ۔ ہمارا ذوق جمال انہیں خطوط پر ہوگا خود قرآن نے لوگوں کو مظاہر فطرت کے نظم اور جمال کے نظارہ کی دعوت دی ہے اور صرف دعوت نظارہ ہی نہیں بلکہ دعوت فکر بھی ۔ اسلامی نظام میں آرٹ ہوگا تو اسی مقصد کے مطابق ہوگا یا کم از کم خلاف تو نہ ہو سکے گا ۔ ذوق جمال سے مراد اگر صرف رخ رنگیں سے آنکھیں سینکنا ہے تو ظاہر ہے وہ ممکن نہیں ۔ اگر حسیات لطیف سے مراد حسن رہ گذر سے کی چوٹیں کھانا ہے اور اگر جذبات محبت سے مراد صرف اغیار سے شہوانی پینگیں بڑھانا ہے تو ظاہر ہے اس کا سدِّ باب ہوگا ۔ جس طرح اسلام پہلی بھوک کے لئے ایک متوازن نظام پیش کرتا ہے اور ایک مثالی سماج کی تعمیر کرتا ہے اور ریاست نہ صرف آزاد و پاک معیشت کے اسباب فراہم کرتی ہے بلکہ نگراں رہتی ہے کہ کسی کی حق تلفی نہ ہو اور ہر شخص کو اس کی ضروریات کے مطابق اسباب معیشت مل ہی جائیں اور اگر نہ مل سکیں تو ریاست خود اس کی ذمہ دار اور کفیل ہوگی اس کے باوجود کوئی پاک کھلے ہوئے اور جائز طریقوں کے خلاف ناجائز گندے اور سماج کے لئے مضر ذرائع اختیار کرتا ہے ۔ اگر کوئی شخص بلکہ کوئی ہاتھ اس قدر گیا گزرا ہے تو وہ اس پاک اور مثالی سماج میں گھن ہے اور ناسور ہے جس کا خاتمہ ہی سماج کے لئے بہتر ہے چنانچہ ہر ایسے ہاتھ کو جس سے چوری کا جرم سرزد ہو اسے کاٹ پھینکنا ہی ناگزیر ہے بالکل اسی طرح اس نظام کا دباؤ اور اصرار ہے کہ ہر شخص دوسری بھوک کے محسوس کرتے ہی اس کا حقدار ہے بلکہ یہ اس کا فرض ہے کہ فوراً جائز ذریعہ سے اس کی تسکین کرے ۔ اس کے لئے کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ۔ اونچ نیچ کا امتیاز نہیں رسوم کی ادائیگی ضروری نہیں بلکہ ناپسندیدہ ہے اور اس کے علاوہ کسی قسم کی مالی دشواری نہیں اگر وہ کچھ نہیں صرف کر سکتا تو وہ صرف بیوی کو چند آیات پاک یا کھجوروں کا ایک طبق دے کر رشتۂ ازدواج میں داخل ہو سکتا ہے ۔ اسے آزادی ہے کہ منگیتر کو دیکھ لے اس کی بھی اسے آزادی ہے کہ اگر ایک پر اکتفا نہیں کر سکتا تو بیک وقت چار تک بیویاں رکھ سکتا ہے ۔ اگر اسے محسوس ہو کہ نباہ ناممکن ہے تو اسے چھوڑ بھی سکتا ہے ۔ دوسری بھوک کی تسکین کے لئے ان ذرائع کے باوجود اگر کسی کو خواہ مخواہ اس کی لت پڑ جائے کہ ناجائز ذرائع استعمال ہی کرے گا تو اس کا وجود ننگ انسانیت ہے ۔ سماج کے دامن پر ایک بدنما داغ ہے جس کا دور ہونا اشد ضروری ہے اور ایسا ہی کیا جاتا ہے ۔ اس دوسری بھوک کے متعلق اگر ادب بھی صنفی انارکی پھیلانے میں کوشاں ہوتا ہے اگر وہ بھی اسی "نظارہ حسن رہ گذراں" کی دعوت دیتا ہے یا اگر ادب نوجوانوں کو قبل از وقت (Mature) کر دینے والے بھنور اور دھوئیں پیش کرتا ہے اگر وہ ان نوخیزوں کے سامنے کچی ناشپاتیاں پیش کرتا ہے تو ظاہر ہے اس کی کوئی گنجائش تو درکنار سخت ترین تعزیر بھی اس کے لئے کافی نہیں ۔ کیونکہ یہ سماج کو پھر غلط بنیادوں کی طرف

بقیہ بر صفحہ ۴۲

جیلانی کا افسانہ عظیم کیوں ہوا؟

نعیم صدیقی

یہاں جیلانی کی مقصدیت نے ایک نادر موقع دیکھ کر بات کو کچھ بڑھا دیا ہے۔ وہ کھل کر یہ کہہ گیا ہے کہ "وہ ماہرِ فن ہونے کے باوجود ان سوالوں کا جواب نہ دے سکتا تھا کہ دنیا کے سب انسان کس لئے اتنا ہنگامہ برپا کر رہے تھے! اور اس انبوہِ آدم میں اس کا مقصدِ وجود کیا تھا؟" یہاں درحقیقت اس نے اپنے افسانے کے قاری کے ذہن میں ایک سوال ابھارنا چاہا ہے، اور اس سوال کے پیچھے وہ کھرا صاف صاف کہتا سنائی دیتا ہے کہ جو فن اس سوال کا جواب نہیں دیتا جو انسان کو اس کے مقصدِ وجود سے وابستہ نہیں کرتا اس کے پردۂ تصویر کی رنگینیوں کے پیچھے جب جھانکو گے تو خلا ہی خلا پاؤگے!

اور وہی دیہاتی بوڑھا بعلم کے اوپر ایک مرتبہ اور چھینی اور تیشہ چلاتا ہے۔ وہ اس سے پوچھتا ہے کہ "اچھا تو اس امولک سے تجھے کیا ملا؟" بعلم کھٹ سے جواب دیتا ہے "اطمینانِ قلب"! اور جب بڈھا تعجب سے اس جواب پر پھر پوچھتا ہے "واقعی سچ کہتے ہو؟" تو گویا وہ امولک کے سامنے اس کے اندر کا سارا جھوٹ ایک صفحۂ کاغذ کی طرح پھیلا کے رکھ دیتا ہے۔ اسے اطمینانِ قلب اپنے کسی تجربے سے نہیں مل سکا تھا، وہ تو سب بقولِ جیلانی دل بہلاوے تھے۔ بڈھا پوچھتا ہے "امولک نے تمہیں زندگی کے معنی بتائے ہیں؟ تم یہاں کیوں پھینکے گئے ہو؟" بعلم کی جھوٹی فطرت ہمک کر اس کا جواب دیتی ہے "ہاں"! وہ پھر پوچھتا ہے "تمہیں حقیقت معلوم ہوئی؟ وہ کیا ہے؟" اور بعلم کی زبان لڑکھڑا جاتی ہے، جھوٹ کی بیساکھیاں ٹوٹ کر گر جاتی ہیں اور بعلم کا نطق محسوس کر لیتا ہے کہ بڑے بڑے الفاظ بالکل بنجر اور ویران تھے!

بڈھے کا اٹھایا ہوا سوال بعلم ہی کے لئے نہیں ہے، جیلانی اسے درحقیقت اپنے قاری کے سامنے، اپنے سماج کے سامنے رکھ رہا ہے۔ وہ مقصدی ادیب ہے اور اپنے مقصد کی مشعل ہاتھ میں لئے چل رہا ہے۔ وہ مقصد کی طرف جابجا اشارے کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ چنانچہ یہاں وہ بڈھے کی زبان سے اُس حقیقتِ مطلوب کا تعارف کرائے بغیر آگے نہیں چلتا جس کو ایک سوال بنا کر اس نے سامنے رکھ دیا ہے۔ بڈھا بعلم کو خطاب کر کے کہتا ہے —— یا جیلانی اپنے اردگرد کے ہزاروں بعلموں سے مخاطب ہو رہا ہے کہ "حقیقت وہ ہے جو زندگی کے پُرخار جنگل میں تمہاری اس طرح رہبری کرے کہ تمہارے پاؤں میں ایک کانٹا بھی چبھنے نہ پائے اور تم سلامتی سے پار پہنچ جاؤ۔" افسانے کی دنیا میں اُس مسلکِ تقویٰ کی تعریف اس سے بہتر کسی اور طرح کی جا سکتی ہے جسے اسلام پیش کرتا ہے؟

اس مقام پر جیلانی اور کھلتا ہے اور توحید و رسالت کی دعوت پوری طرح بڈھے کی زبان سے دلواتا ہے۔ یہ چیز اندیشہ تھا کہ کہانی کی فضا کے لئے بوجھل ہو جائے گی۔ مگر جیلانی نے اس کا سدِباب پہلے سے کر لیا ہے۔ اُس نے افسانے کا ماحول ہی ایسے طرز کا لیا ہے کہ اس میں یہ بوجھل چیز بالکل کھپ گئی ہے۔ کوئی اجنبیت، غرابت اور تصنع اس میں نظر نہیں آتا۔ ورنہ افسانے کا ماحول اگر ذرہ بھر بھی مختلف ہوتا تو یہ دعوتِ حقیقت افسانے کے جمال کو غارت بھی کر سکتی تھی۔

بوڑھا گڈریا جس دعوتِ حقیقت کو بعلم کے سامنے پیش کر رہا تھا اس کی لہریں مدین سے پے در پے آ رہی تھیں اور اس

ہوئی کی انقلابی تحریک کی شعاعوں کے غول کے غول بعلم کے دل پر حملہ آور ہوتے رہتے تھے۔ اسے اس میں کشش بھی معلوم ہوتی
لیکن وہ سارے ہیکلوں اور بتوں کو پیوندِ خاک ہوتے دیکھنے کا تصور نہ لاسکتا تھا۔ کوئی منطق اور کوئی دلیل اسے اس پر آمادہ
نہ کرسکتی تھی" کیا یہ واقعہ نہیں کہ جیلانی نے منکرینِ حق کی ایک بڑی قسم کی نفسیات سے یہاں پردے اٹھا دیئے ہیں۔ جیلانی بعلم کے
کردار کے آئینہ میں کیا اپنے دور کے ان ہزاروں ذہنوں کا عکس نہیں دکھا رہا جو اپنے ماضی، اپنی عادات، اپنی خواہشات، اپنی
دلچسپیوں، اپنے آباد کی روایات کے ہیکلوں اور بتوں کی قربانی نہ دے سکنے کی وجہ سے دعوتِ حق کی فطری کشش کو محسوس کر
لینے کے باوجود اس پر لبیک نہیں کہہ سکتے اور ان کو کسی دلیل اور منطق سے فتح نہیں کیا جاسکتا! یہ ایسے ہی ذہنوں کا تجزیہ ہے!
بعلم نے کہا تھا کہ اس نے اطمینانِ قلب پالیا ہے۔ مگر اس نے جھوٹ بولا تھا۔ اطمینانِ قلب اسے کبھی نہ مل سکا۔ وہ مدین
کی تحریک اسے اطمینانِ قلب دینا چاہتی تھی مگر وہ اس کی خاطر اپنے بہت سے بتوں کا ایثار کرنے پر راضی نہ ہوا۔ اس نے
شعورِ حق کے بعد اس سے منہ موڑ لیا۔ اور وہ پھر اضطراب کے طوفان کی لہروں میں گھرا ہوا تھا۔ وہ کوئی سہارا چاہتا تھا اور سہارا نہیں
مل رہا تھا۔ اس اضطراب کا لاوا ایک روز اچانک پھٹ پڑا۔ اس نے جب اپنے بنائے ہوئے بت پر نظر ڈالی تو اس کے
خلاف اس کے اندر ایک وحشت اور بیزاری سی ابھر آئی۔ اس کے دل نے پشیمانی اور ناامیدی کی کیفیت سے کہا "تو
کاری ہے جس کے لئے تو نے اتنے برس کھوئے" ——— لیکن وہ تو برس کھونے کے سوا کبھی اور کچھ کر ہی نہ سکا تھا!
اور اس نے اسی ذہنی کیفیت میں گھرے ہوئے کی حالت میں ایک لڑکی کو پالکی میں بیٹھے دیکھا۔ بے اختیار نگاہیں اس
کی طرف اٹھ گئیں، اور اس کے گذر جانے کے بعد دیر تک وہ دل میں ایک درد سا محسوس کرتا رہا! بعلم سوچتا ...
تھی جو ہر ایک کا دل کھینچ رہی تھی، اور پھر اس کے اندر سے آواز آئی کہ دیوتا وہ تھی، نہ کہ یہ بھیانک شکل کا پتھر!" ...
سطح پر آگیا تھا جسے بعلم فریب دینے کے لئے سارے پاپڑ بیلتا رہا تھا! ہزاروں میل چلنے اور تھک کر چور چور ہو ... کے بعد
آج اس نے دیکھا کہ وہ وہیں ہے جہاں سے چلا تھا! اس نے سمجھ لیا کہ وہ راہ گم کرکے دور نکل آیا ہے اور پیچھے پلٹ جانے کے سوا
اور کوئی چارہ نہیں۔ ورنہ وہ ڈھیر ہو کر رہ جائے گا! چنانچہ وہ تلاطمِ جذبات کی کیفیت ذہن میں لئے تیشہ پھینک کر چل دیا
——— اس نے گھر چھوڑ دیا، فتورا چھوڑ دیا، ہیکل چھوڑ دیا، تبدیلی کے لئے بسا اوقات ہجرت ناگزیر ہوتی ہے، لیکن جس جسمانی
ہجرت کے اندر دل اپنے غلط موقف سے صحیح موقف کی طرف ہجرت نہ کر پایا ہو تو اس سے پاؤں تو تھکتے ہیں لیکن ہاتھ کچھ نہیں
آتا۔ آدمی اپنے اندر جو دنیا لئے ہوئے ہے اسے اگر وہ نہ بدل سکے تو باہر کی دنیا کے بدل ڈالنے سے کوئی تبدیلی واقع
نہیں ہوتی بلکہ اندر کی دنیا باہر کی دنیا کو پھر اپنے رنگ میں رنگ لیتی ہے۔ آدمی کی نحوست اور بدبختی اس کے باہر نہیں، اس
کے اندر ہے، اس کے اپنے ساتھ ہے، اس کی اپنی گردن کا طوق بنی ہوئی ہوتی ہے! اور بعلم اپنی بدبختی کا سرچشمہ اپنے ضمیر میں
لئے ہوئے فتورا سے نکلا تھا، اسے فتورا میں چھوڑ نہیں گیا تھا!
دریائے اردن کے کنارے کی پہاڑیوں میں وہ ایک راہب، ایک صوفی، ایک سادھو، ایک تارک الدنیا بن کر نمودار
ہوتا ہے۔ ایک چرواہا اسے خدارسیدہ سمجھ کر اس کی خدمت کرتا ہے۔ پھر اس چرواہے کی مفلوج بیوی اس کی دعا سے شفایاب
ہوتی ہے۔ اور وہ مرجع خلائق بن جاتا ہے۔ مرجع خلائق نہیں، دیوتا بنایا جا رہا تھا، نہیں نہیں! خداوند بنایا جا رہا تھا! اس کی پوجا
اور عبادت شروع ہوگئی تھی۔ اور یہ پوجا اور عبادت اس کی ہوسِ برتری کی جڑوں کو سیراب کرنے لگی تھی۔ جب وہ اس فتنے
کو محسوس کرے گا تو اس کے اندر چھپا ایک دو رجحان آمنے سامنے آگئے اور ان میں بحث ہونے لگی! ایک نے کہا "تم زندگی کا

جیلانی کا افسانہ علیم کیوں ہوا

مقصد سمجھنے اور سمجھانے آئے ہو، ایسے شعبدے دکھانے تو نہیں آئے" دوسرے نے جواب دیا "اس کار خیر سے تمہارے مقصد کو فائدہ ہی پہنچے گا۔ اور، تو وہ جب شفایاب مریضوں کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلکتے دیکھتا" تو وہ مطمئن ہو جاتا۔

لیکن اس سکون میں تلاطم پیدا کرنے والی ایک چیز باقی تھی، یہ کہ "وہ جب کبھی کسی عورت کے اعضاء پر ہاتھ پھیرتا تو اس کے بدن میں ایک برق سی کوند جاتی" اور حد یہ کہ "وہ اس لمس کی سرسراہٹ اپنے مراقبے تک میں محسوس کرتا" دیکھئے، جیلانی اس لمس کے تعاقب میں مراقبے کی نفسیاتی گہرائیوں میں کس پھرتی سے جا پہنچا ہے۔ گویا علیم آج بھی اسی مقام پر تھا جس پر تا... کی بیوی کو دیکھتے وقت تھا اور عورت کی رفاقت کا جذبہ اپنے اندر محسوس کرتے وقت تھا۔ جو کونپل ضمیر سے پھوٹ چکی تھی وہ دا... بن لوٹ نہیں سکتی تھی! یہاں وہ ایک خواب دیکھتا ہے جس کی ہیروئن چرواہے کی بیوی تھی اور یہ خواب اسے چوکنا کر دیتا ہے کہ وہ ابھی پستی میں رینگ رہا ہے۔ چنانچہ علیم نے اپنی اس خواہش کے خلاف مجاہدہ شروع کر دیا۔ ایک دن تو وہ اس نئے ماحول سے ایک اور ہجرت کر جانے کے ارادے سے عصا لے کر اٹھ کھڑا ہوا، لیکن اس کے اندر ایک آواز پکاری "ہزاروں بے کس مریضوں کو چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو؟" اور علیم جاتے جاتے رہ گیا! یہاں افسانہ نگار اس کے فریب نفس کا لطیف سا پردہ ... س طرح ہلا دیتا ہے کہ باطنی حقیقت کی ایک دھندلی جھلک نگاہوں میں کوند جاتی ہے۔

ایک بجرے میں متھرا کے عظیم تاجر اور کی بیوی علیم کی قدم بوسی کے لئے آتی ہے۔ اس کا غلام علیم سے درخواست کرتا ہے ... اپنہ حرکت کے قابل نہیں، لہذا وہی بجرے تک تکلیف کرے۔ علیم جاتا ہے اور حسن اور دولت کی ا... تیرتی جنت میں وہ چ... نے اُس چہرے کو دیکھتا ہے جسے پالکی میں دیکھ کر اُس نے چوٹ کھائی تھی، اور معاً اس چوٹ کی لذت اسی تازگی کے ... ابھر آئی!" یہاں اسے بڑی کشمکش کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک طرف اس ہوس کا شدید ترین حملہ تھا جس سے وہ آزاد ہونے ... ہاتھ پاؤں مار رہا تھا، دوسری طرف اپنے تقدس کو بچانے کا جذبہ تھا۔ لیکن وہ زوردار ہوس ... رکھنے کے باوجود ہوس کے بلاوے پر لبیک کہنے کی طاقت اپنے اندر نہیں رکھتا...... اس کا تقدس بیرونی خول زوردار نکلا ... اس کے تقاضے نے اسے جنونانہ وار اٹھ کر بھاگ کھڑے ہونے پر مجبور کر دیا اور وہ اسی عدم توازن کی حالت میں کشتی سے ... گیا ... گرا اور بے ہوش ہو گیا، اسے اٹھا کر جھونپڑی میں لے جایا گیا۔ بہت دیر اس میں لگی کہ اس کے جسم کی بحالی کے ساتھ ساتھ اس کی ... کا تلاطم سکون میں بدل سکے۔

لیکن اس کے چوٹ کھائے ہوئے پاؤں کو چرواہے کی بیوی کئی راتوں سے داب رہی تھی۔ انہیں راتوں میں ایک رات ایسی آئی کہ وہ ضمیر کا چھالا بالکل پھٹ پڑا، مواد بہ نکلا اور تقدس کی ساری ردا گھناؤنے دھبوں سے بھر گئی۔

اب کیفیت یہ تھی کہ علیم کا ضمیر اسے کاٹتا اور وہ اپنے آپ پر لعنت بھیجتا۔ وہ خداؤں سے ... استمداد کرتا، لیکن جونہی رات کا اندھیرا چھاتا اس کے دائیں پاؤں میں درد سا اٹھنے لگتا اور وہ اس وقت تک رفع نہ ہوتا جب تک کہ چرواہے کی ماں اسے نہ دباتی"۔ اس سے زیادہ بہتر عکاسی اس کے ذہنی دوتا کی کوئی اور کیا کرے گا کہ دن کے اجالے میں ا... کی روح اس پر حکومت کرتی لیکن "دریا کا سنسان کنارا اور کائنات کا شور جب دریا کی سرسراہٹ میں تحلیل ہو جاتا تو اس کا بدن اپنے پھار... شیر کی طرح انگڑائیاں لیتا ہوا نکلتا" نفسیاتی تجزیہ کا کیا یہ کمال نہیں ہے؟ اور پھر ہر روز اس کی روح و بدن ... میں یہ آنکھ مچولی کھیلی جاتی۔ روح و بدن کی آنکھ مچولی کا یہ شعور جس ذہن کو ہوا ہے، جس نے ایک نفسیاتی حقیقت کو اس صفائی سے جانا ہے اور ... پیش کیا ہے کہ انسانیت کے ہزاروں فرزندوں — شہرت پانے والے فرزندوں، اور تقدس مآب فرزندوں، اور ... اقتدار فرزندوں —

کے ضمیروں کے چہرے اس میں منعکس ہوگئے ہیں۔ اس کی بڑائی کا انکار کرتے ہوئے دل مچلتا ہے۔ اگر یہی عظیم چیز کی تخلیق نہ کر سکا تو چھوٹی کرے گا!
بعلم ایک دور سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے میں منتقل ہوتے ہوئے ہمیشہ یہ سمجھتا رہا ہے کہ اب وہ ایک نئی ہستی بن گیا ہے، اب اس کے اندر سے ایک نیا انسان ابھر آیا ہے، مگر درحقیقت وہ محض چولے بدلتا رہا اور بہروپ بھرتا رہا ہے، وہ بہ حیثیت انسان شروع سے آخر تک ایک ہی جگہ جما کھڑا رہا ہے۔
یوں ایک کردار کا تفصیلی مطالعہ کرانے کے بعد افسانہ نگار یہ ثابت کرتا ہے کہ۔۔۔ وہ اپنی مثالی تقدس مآبی سے یکایک جست لگا کر بنی اسرائیل کے لشکر کے خلاف موآب کے سرداروں کی خوشنودی کے لئے بددعا کرنے نہیں کھڑا ہو گیا تھا بلکہ اس کی تقدس مآبی اول روز سے جاذب فریب تھی جس کی آئینوں میں وہ انتہائی گھناؤنے ہوس کے بت چھپائے ہوئے تھا!
کہانی کی ایک جھلک کسی قدر تجزیہ کے ساتھ پیش کرنے سے ہمارا مدعا یہ ہے کہ جیلانی کے اس کمال کو محسوس کیا جاسکے کہ اس نے اپنے کردار کو نفسیاتی تحول کے کئی ادوار سے گذارا ہے اور ہر دور کی ہیئت کو بڑی خوبی سے اس کے فطری تقاضوں کے مطابق تعمیر کیا ہے، اور پھر بعلم کی نفسیاتی کیفیات کو مختلف ادوار میں ایک نئے انداز سے نکھار کر کہانی میں رکھ دیا ہے۔

اس کا کردار جنسی جذبے کے فساد سے کیا بچ نہیں سکتا تھا؟ بچ سکتا تھا لیکن اس میں اس جذبے کے غیر فطری زور کے ساتھ چند دوسری کمزوریاں ایسی موجود تھیں جنہوں نے اس کو بچ نکلنے کی ہمت سے کام نہ لینے دیا! جنسی جذبے کا علاج ازدواج ہے۔ لیکن بعلم اس فطری راستے پر پڑنے سے محروم رہ گیا۔ عہدِ شباب میں وہ ایک بار ایک لڑکی کو کنوئیں سے پانی کھینچتے دیکھ کر اس پر فریفتہ ہوا تھا، اس کی تصویر اس کے ذہن میں دیر تک بسی رہی، وہ ہر وقت غمگین سا رہتا، وہ اس کو پہلو میں بٹھا کر باتیں کرنا چاہتا، لیکن جب بھی اس سے بات کرنے کا ارادہ کرتا تو اس کی حیا آڑے آجاتی۔ پھر اس نے شادی کا ارادہ بھی کیا اور باپ کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کرنے پر تل گیا، لیکن اسے جب یہ معلوم ہو گیا کہ وہ ایک کاشتکار کی لڑکی ہے اور اس کا باپ سماجی معیار کے لحاظ سے اسے قبول نہ کرے گا تو اس کا ارادہ مضمحل ہو کر رہ گیا۔ یہاں تک کہ وہ لڑکی ایک گھوڑ سوار کے ساتھ نکل گئی، اور وہ کلیجہ مسوس کر رہ گیا۔ جیلانی بتاتا ہے کہ "دراصل وہ حیادار نہ تھا، بزدل تھا!" یہ ایک فقرہ ساری کہانی کو سمجھنے کی کلید ہے۔ وہ شریف جو گناہ سے محض بزدل ہونے کی وجہ سے بچتے رہتے ہیں، بعلم کا کردار انہیں کا ترجمان ہے!
جیلانی کو اس کہانی میں اپنے کردار کے تحولات کی وجہ سے بے شمار موضوعات کو چھیڑنے کا موقع ملا ہے۔ وہ مذہبیت، فن کاری، معاشقے، جمالیت، حقیقتِ حیات، مقصدِ زندگی، خدمتِ خلق، مسابقت، معصیت وغیرہ میں سے ہر گوشۂ فکر سے تعرض کرتا ہے اور ایسے نقوش پیدا کر دیتا ہے جو امٹ اور لازوال ہیں۔ کہانی نے اس کے سامنے اظہار کا ایک میدان کھول کر رکھ دیا ہے۔ اور جب کوئی کہانی مصنف کے سامنے اس طرح اظہار کا میدان پھیلا دے تو مصنف کی صلاحیتوں کی آزمائش کا موقع پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر یہ حقیقت کھل جاتی ہے کہ مصنف کے دل میں اظہار کے لئے کوئی چیز ہے یا نہیں؟ ہے تو سطحی ہے یا گہرائی رکھنے والی؟ عظیم یا معمولی؟ نادر ہے یا پامال؟ وقتی ہے یا مستقل؟ وہ سوچنے والا یا احساس سے کام لینے والا ہے یا نہیں؟ اس کے پاس کوئی نظریۂ حیات ہے یا نہیں؟ کوئی قدریں اس کے سامنے ہیں یا نہیں؟ کوئی رائے رکھتا ہے یا نہیں؟ پھر وہ دل کی بات کو کہنے پر کتنی قدرت رکھتا ہے؟ وہ اپنی بات کو افسانے کے اندر پوری طرح تحلیل کر کے پیش کر سکتا ہے یا وہ اتنی ثقیل ہوتی ہے کہ کہانی کی فضا اس کو ہضم کر نہیں پاتی —— اور مصنف اپنی کہانی میں اپنی بات

کہنے کے لئے خود ہی تو نہیں آ کودتا ؟ آپ کہانی کو جب ان سوالات کی روشنی میں پڑھیں گے تو محسوس کریں گے کہ واقعی جیلانی میں اظہار کے مواقع سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت تھی ، اس کے پاس کہنے کی گہری باتیں تھیں اور ان باتوں کو کہنے کا اور افسانوی ہیئت کے سانچے میں ڈھالنے کا فن بھی اسے آتا ہے ۔ کم از کم میں نے یہ محسوس نہیں کیا کہ اس آزمائش میں جیلانی ناکام رہا ہو !

جیلانی کی کہانی کسی وقتی سماجی قضیے کے بجائے انسان اور زندگی کی ایسی حقیقتوں سے بحث کرتی ہے جو ہر زمانے میں موضوع فکر رہی ہیں اور جن سے ہر انسان کا تعلق ہے ۔ یہ کہانی کسی ایک سماج کی کہانی نہیں ہے ، کسی ایک ملک و قوم کی کہانی نہیں ہے کسی ایک صدی کی کہانی نہیں ہے ، بلکہ یہ کہانی دنیا بھر کی ہے ، سارے زمانوں کی ہے ، یہ کہانی خود انسان کی کہانی ہے ، اس میں فطرت انسانی کا مطالعہ کیا گیا ہے ۔ کہانی اپنے مصنف کے انتخاب کردہ کردار کے آئینے میں خود اسی کردار کو نہیں دکھاتی بلکہ وہ انسانی فطرت کی پر اسرار آیات سے پردہ اٹھاتی ہے ، اس لئے وہ تعلیم کی کہانی نہیں ہے بلکہ ابن آدم کی کہانی ہے ۔ کہانی کی یہی وہ خصوصیت ہے جس کی بنا پر ہم نے اسے عالمگیر کہانیوں کی صف میں مقام حاصل کرنے کا مستحق قرار دیا ہے ۔

یہ ساکن کہانیوں میں سے نہیں ہے ، بلکہ بہاؤ رکھنے والی کہانیوں میں سے ہے ۔ بہاؤ رکھنے والی کہانی میں دیکھنے کی چیز یہ ہوتی ہے کہ بہاؤ فطری ہے یا نہیں ؟ اس میں رکاوٹیں تو نہیں حائل ہوتیں ؟ اس کا بہاؤ رک تو نہیں جاتا ؟ اس کی رفتار اچانک کبھی طوفانی اور کبھی سست تو نہیں ہو جاتی ؟ اس لحاظ سے جب ہم ناقدانہ نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمارے لئے اس اعتراف سے گریز کرنے کی کوئی راہ کھلی نہیں ملتی کہ جیلانی کی کہانی کا بہاؤ شروع سے آخر تک فطری ہے اور یکساں ہے ۔ یہ بہاؤ یہاں سے وہاں تک ایک سبزہ زار کی ندی کا سا بہاؤ ہے ، یہ برساتی نالے اور طوفانی دریا کا سا بہاؤ نہیں ہے ، اس بہاؤ کی یکسانی پر کوئی رکاوٹ اثر انداز ہوتی ہے اور نہ کہانی کا کوئی انقلابی موڑ اس کی رفتار کو یکایک طوفانی بناتا پایا جا سکا ہے ۔ واقعات چھوٹی چھوٹی لہروں کی صورت میں یکے بعد دیگرے آگے بڑھتے ہیں ۔ ساتھ کے ساتھ قاری کا شوق قدم بہ قدم حرکت کرتا ہے اور توجہ از اول تا آخر یکساں مرتکز رہتی ہے ۔

ناقد کے سامنے ایک بڑا سوال مقصدیت کا ہے ! جیلانی خود ہی اپنی کہانی میں اپنے نظریۂ فن کا تعارف کرا چکا ہے ۔ اس کے نزدیک بے مقصد فن پر انسانیت جتنی محنت کرتی ہے اس کا صلہ اسے لوٹ کر کچھ بھی نہیں ملتا ، وہ اپنا سب کچھ اس پردے پر بیٹھتی ہے ۔ لیکن کچھ پاتی نہیں ۔ بے مقصد فن کی تصویر ایک پردہ ہی پردہ ہوتی ہے جسے اگر الٹ کر دیکھا جائے تو سامنے ایک خلا ہوگا ، اور کچھ نہیں ! کہانی گواہی دے رہی ہے کہ اس کا لکھنے والا بے مقصد فن پر اپنا ایک لمحۂ فکر ، اپنی ایک جنبشِ قلم اور اپنی ایک ذہنی قوت بھی صرف نہیں کر سکتا !

تو پھر اس کہانی کا مقصد ہے کیا ؟

مجھ جیسا ایک اسلامی ادیب یا ناقد تو فن کو جب بھی دیکھے گا ، مقصدیت کے اسی معیار سے دیکھے گا جو اسلامی نظریۂ حیات سے پیدا ہوتا ہے ۔ مگر بات کھل جانی چاہئے کہ مقصدیت کا تقاضا کہاں تک وسیع ہو سکتا ہے ؟ بالفاظِ دیگر کسی کہانی کو با مقصد کس صورت میں کہا جا سکتا ہے ؟ یا ہم مسلم ادیب کیسی کہانی کو اسلامی نقطۂ نظر سے ایک کامیاب کہانی کہہ سکتے ہیں ؟ ہمارے بعض رفقاء ادب میں مقصدیت کا ایک عجیب و غریب تصور رکھتے ہیں ۔ ان کا خیال یہ ہے کہ ادب میں مقصدیت کا تقاضا

اس وقت پورا ہو سکتا ہے جب کہ ایک شاعر اپنی نظم میں، یا ایک افسانہ نگار اپنی کہانی میں کسی نہ کسی طرح اپنا پورا نظریۂ حیات صاف، صاف بیان کر دے، اپنی دعوت پیش کر دے، تحریکِ اسلامی کی سرگرمیوں کا نقشہ کھینچ ڈالے[1]، اس سے وسے ورے ان کے نزدیک مقصدیت کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ وہ شاعر و افسانہ نویس سے داعی اور واعظ کا کام لینا چاہتے ہیں۔

داعی اور واعظ کی دنیا صراحت کی دنیا ہے، لیکن شاعر اور افسانہ نویس کی دنیا کنایت اور استعارہ کی دنیا ہے۔ وہ میدان استدلال کا میدان ہے، اور یہ میدان جذبہ و تخیل کا میدان ہے۔ اُدھر فلسفے پیش کئے جاتے ہیں اور ادھر صرف قدریں نکھار کر لائی جاتی ہیں۔ داعی و واعظ کا کام قائل کرنا ہے اور شاعر و ادیب صرف ایک تأثر چھوڑ دینے سے آگے نہیں بڑھتا۔ ایک نظریۂ زندگی بہت سے خیالات، بہت سے جذبات، اور بہت سی اخلاقی قدروں کا جامع ہوتا ہے۔ دوسری طرف بہت سے خیالات، جذبات اور قدریں اس کے متضاد ذہنی فضا میں موجود ہوتی ہیں۔ ادیب اپنے نظریۂ زندگی کی خدمت اس طرح کرتا ہے کہ وہ آہستہ آہستہ ایک ایک خیال، ایک ایک جذبہ اور ایک ایک قدر میدان میں لاتا ہے اور اس کے لئے فضا کو سازگار بناتا ہے، اور دوسری طرف وہ اپنے نظریے کے مخالف خیالات و جذبات اور اخلاقی قدروں میں سے ایک ایک کو آہستہ آہستہ اس طرح راستے سے ہٹاتا ہے جیسے کوئی کانٹے چنتا ہے۔ وہ اپنے شعر و افسانہ کے ذریعے چھوٹا سا ایک خیال، ذرا سا ایک جذبہ اور ننھی سی ایک اخلاقی قدر اپنے مخاطب کے ذہن میں اس طرح اتار دیتا ہے کہ اس کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ وہ بحث سے دلیل بازی بالکل ہی نہیں کرتا، کیونکہ دلائل کے لئے ذہن میں داخلہ کا جو دروازہ مخصوص ہے اس پر پہرہ بھی کڑا ہوتا ہے، لیکن دلیل کو ادیب جب خیال، جذبے اور قدر کی شکل میں ڈھال دیتا ہے تو پھر اس کے لئے ہزاروں دروازے کھلے موجود ہوتے ہیں جن پر کوئی پہرہ بھی نہیں ہوتا۔ واعظ اور داعی اپنی دلیل کے ساتھ ساتھ خود موجود رہتا ہے لیکن ادیب اپنے کسی خیال اور جذبے اور قدر کو جب افراد یا سماج کی طرف منتقل کرتا ہے تو خود ساتھ نہیں جاتا، بلکہ خود الگ ہو جاتا ہے۔ اُس کا دیا ہوا خیال، جذبہ یا قدر غیر شعوری طور پر انفرادی یا اجتماعی ذہن میں اترنے کے بعد اپنے لئے جگہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، باقاعدہ کسر و انکسار کا عمل واقع ہوتا ہے، اور چونکہ ایک مقصدی ادب خیالات، جذبوں اور قدروں کی لہریں پے در پے اٹھاتا ہے اس لئے ذہنی کشمکش کا یہ عمل انفرادی اور اجتماعی ذہن میں مسلسل جاری رہتا ہے۔ تاآنکہ ایک نظریۂ زندگی اپنے سے تضاد رکھنے والی ذہنی فضا پر فاتح کی حیثیت سے جھنڈا گاڑ دے۔ داعی یا واعظ مخاطب میں تبدیلی کو یک دم پیدا کرنا چاہتا ہے مگر شاعر یا ادیب ایک لمبا منصوبہ بنا کر کام کرتا ہے۔ اُس کی لڑائی آتشیں جنگ ہوتی ہے اور اس کا معرکہ ٹھنڈی لڑائی (Cold war) کی نوعیت کا ہوتا ہے۔

افسانے میں مقصدیت کے تقاضے دو طرح پورے ہوتے ہیں ایک یوں کہ کہانی کے مرکزی خیال کو دیکھا جاتا ہے یعنی کہانی نے بہ حیثیت مجموعی کیا خیال دیا ہے؟ کس حس کو پیدا کیا ہے؟ کس جذبے کو اکسایا ہے؟ کونسا سا سوال ہے جو دلوں میں پیدا کر دیا ہے؟ کونسا نیا شعور ہے جو ابھار دیا ہے؟ کونسی اخلاقی قدر ہے جس کی منادی ہے؟ دوسرے یوں کہ کہانی کے بیچ بیچ میں جا بجا ایسے مواقع آتے ہیں جہاں ادیب کو مخاطب کے حسیات کو چھیڑنے، دلوں پر نشتر چلانے،

---

[1] بلکہ پاکستان کی جماعت اسلامی کی ترجمانی کا حق ادا کر دے۔ حالانکہ مسلم ادیب ادب میں صرف اسلام کا ترجمان ہو سکتا ہے!

خیالات کے نقوش ابھارنے اور اخلاقی قدروں کو اجاگر کرنے کے مواقع ملتے ہیں۔ ناقد جب مقصدیت کا جائزہ لینے بیٹھے گا تو وہ کسی کہانی
کہ ان دونوں ہی پہلوؤں سے زیر نظر رکھے گا۔ اب اگر ہم مقصدیت کے صحیح تصور کے ساتھ جیلانی کے عظیم افسانے کو دیکھنے چلیں
تو پہلی نگاہ ہم اس کے مرکزی خیال پر ڈالیں گے۔ اپنے مرکزی خیال کو اُس نے خود ہی بیان کر دیا ہے۔ وہ اگر اسے بیان نہ کرتا تو
بھی ہم اسے پالیتے، لیکن ایک قدیم تاریخی کردار کے گرد کہانی کا تانا بانا بنتے ہوئے اُس کے لئے ضروری تھا کہ وہ ایک تمہید سے چلے
اور ایسے تماشے پر جا رکے جو تمہید کے ساتھ جڑ کر کہانی لکھنے کے محرک کو واضح کر دے۔ یہ ایک خاص اسٹائل ہے جو بعض بڑے بڑے
لکھنے والوں کے ہاں ایسی کہانیوں میں استعمال کیا گیا ہے۔
تو وہ مرکزی خیال کیا ہے؟
ہم یوں تو اسے اوپر بیان کر آئے ہیں، لیکن یہاں پھر اُس پر گفتگو کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جیلانی کی کہانی ہم و رس حقیقت
دیتی ہے وہ یہ ہے کہ کامیاب سیرت وہ ہوتی ہے جو انسانی ضمیر کے سرچشمے سے نمودار ہو کر اپنا پرتو آدمی کی ساری حرکات و سکنات
پر ڈال دیتی ہے۔ بخلاف اس کے وہ مصنوعی سیرت جو سوسائٹی کی روایات کی اندھی غلامی اور برتری کے غیر شعوری جذبے کے تحت
ریا کے مسالے سے ضمیر کی بنیادوں کے بغیر تعمیر کر دی جاتی ہے وہ ریت کا ایک بودا قلعہ ثابت ہوتی ہے اور ہر معمولی حادثہ
اسے برباد کر کے رکھ سکتا ہے۔ ایسی سیرت کے معمار ساری عمر بار بار گرتی ہوئی دیوار کو نئے نئے نقشوں پر اٹھانے میں لگے
رہتے ہیں لیکن آخر کار کسی حادثے کی چوٹ پھر اسے ملبے میں بدل دیتی ہے۔ جیلانی کی کہانی بتاتی ہے کہ ضمیر میں جب کوئی گرہ
موجود ہو تو اس سے آنکھیں چرانے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، وہ جب تک موجود رہتی ہے تو دکھ دیتی رہتی ہے، اس گرہ کو لاشعور
کی تاریکی میں چھپا چھپا کر رکھنے کے بجائے شعور کی روشنی میں لا کر تدبیر کے ناخن سے جتنا جلد ممکن ہو کھول لینا چاہئے۔ صرف یہی
ہے راہ نجات! جیلانی کی کہانی بتاتی ہے کہ جن لوگوں کے روح و بدن آنکھ مچولی کھیلتے رہتے ہیں، وہ کامیاب زندگی نہیں پا
سکتے۔ وہ بتاتی ہے کہ جس گناہ سے آدمی خیال کی دنیا میں لذت لیتا ہے، اُس سے عمل کی دنیا میں اُس کا محض بزدلی کی وجہ سے
بچے رہنا اسے کبھی بھی ایک شریف آدمی میں نہیں بدل سکتا۔ جس سیرت کا حال یہ ہو کہ دن کو روح اُس پر حکومت کرے اور
رات کی تاریکی چھاتے ہی بدن کا شیر اپنے کچھار سے دھاڑتا ہوا درندگی کے لئے نکل کھڑا ہو وہ ایک فریبِ نفس ہے، حقیقت
نہیں ہے اور کہانی یہ بتاتی ہے کہ آدمی کی سیرت کمال یا زوال کی طرف، غیر متوقع طور پر جست کبھی نہیں لگاتی، بلکہ جدھر بڑھتی
ہے تدریجی طور پر بڑھتی ہے۔
جیلانی نے یہ نظریہ کہاں سے لیا؟ کیا اس کا سرچشمہ (Source) اسلامی نظریہ کے سوا کوئی اور نظریہ ہے؟
یہاں ہم جیلانی کے قلم کی اُن جنبشوں کا دوبارہ تذکرہ نہیں کرنا چاہتے جن کے ذریعے اُس نے کہانی کے دوران میں ہر موقع
اظہار پر اپنے قاری کو کوئی خیال یا جذبہ دیا ہے۔ کہانی ان جنبشوں کے پیدا کردہ قیمتی نقوش سے پوری طرح مالا مال ہے۔ یہ خیالات
وجذبات جتنے بھی اس کہانی میں پھیلے ہوئے ہیں اُن میں سے ایک ایک مسلم فکر کا پرتو لئے ہوئے ہے!
بہرحال کہانی کا مرکزی خیال دیکھئے تو، اور اس کے اندر کے مواقع اظہار میں ادیب کے قلم کی جنبشوں کا جائزہ لیجئے تو، یہ حقیقت
بالکل واضح ہے کہ کہانی اسلامی نقطۂ نظر سے مقصدیت کے جوہر سے پوری طرح آراستہ ہے۔ یہ لفظوں کا کوئی قصرِ حمرا نہیں ہے،
یہ خیالات کی کوئی دیوارِ چین نہیں ہے، یہ جذبات کا کوئی صنم خانۂ بہزاد نہیں ہے، یہ فن برائے فن کی شعبدہ گری نہیں ہے، بلکہ
مقصدیت کا گرم خون اس کی رگوں میں خوب اچھی طرح دوڑ رہا ہے۔

جن لوگوں کے لیے افسانے کی پوری فضا میں رچی بسی ہوئی مقصدیت کو محسوس کرنے میں دقت ہو، ان کو میں مشورہ دوں گا کہ وہ
بعلم اور بوڑھے دیہاتی کی گفتگو پڑھ لیں (صفحہ) جس میں جیلانی کے افسانے کی مقصدیت کا رنگ اتنا نمایاں ہو گیا ہے کہ بغیر نظر جانے
اسے دیکھا جا سکتا ہے۔ بوڑھا جب کہتا ہے کہ "اموک سے تجھے کیا ملا؟" تو اس سوال کے پیچھے چھپا ہوا جیلانی اپنے مقصد کا تقاضا
پورا کر کے مسرور نظر آتا ہے۔ پھر وہ بوڑھا جب حقیقت کی حقیقت بیان کرتا ہے تو اس کے بعد جیلانی پر مقصدیت کا کوئی تقاضا
باقی نہیں رہ جاتا، لیکن کہانی اور صراحت کرتی ہے اور اتنی صراحت بڑی مشکل سے کسی افسانے کے مزاج میں گندھ سکتی ہے کہانی
کا پیالہ مقصدیت سے لبالب بھرا ہوا ہے، جیلانی اگر اس میں چند قطرے بھی اور ڈال دیتا تو یہ چھلک گیا ہوتا۔
آخر میں میں اس حقیقت سے پردہ اٹھا دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ جیلانی کی یہ کہانی ٹالسٹائی کی ایک عظیم المرتبت کہانی فادر سرگئیس کے
تاثر کا پرتو لئے ہوئے ہے۔ اسی جستجو میں حال ہی میں ٹالسٹائی کے چند افسانوں کا مطالعہ کرنے سے یہ راز مجھ پر منکشف ہوا کہ جیلانی کا ایک بڑا سرچشمہ
استفادہ ٹالسٹائی ہے، ورنہ اس علم سے قبل جیلانی کی بلند پروازیوں کے بارے میں کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ یہ کیسے ہو رہی ہیں۔ اس کے ساتھ
ساتھ میں نے پہلی مرتبہ ٹالسٹائی کو اس نقطۂ نظر سے جانا اور سمجھا ہے کہ اس کے ہاں سے مسلم ادیبوں کو افسانہ نگاری کے لئے کچھ نہ کچھ روشنی مل سکتی ہے۔
انصاف نہ ہوگا، اگر ہم اس کہانی کے کمزور پہلوؤں کی طرف توجہ نہ کریں۔
سب سے پہلے تو ہم اس اسٹائل پر اپنے عدم اطمینان کا اظہار کرتے ہیں جس کے تحت ایک تعارفی تمہید کو کہانی کا باقاعدہ جزو بنایا گیا ہے تمہید
کا یہ ٹکڑا بالکل اس نوعیت کا ہے جیسے قدیم ڈراموں اور کہانیوں میں "راوی" کچھ اپنی طرف سے کہتا ہے، اور وہ بھی تمثیل یا کہانی کے اندر شامل رہتا ہے۔
مانا کہ یہ اسٹائل مروج رہا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ متروک حد تک پرانا بھی ہو چکا ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ ایک خاص تاریخی روایت کے بارے
میں جو تصریح افسانہ نگار کے پیش نظر تھی، وہ اسے خود اپنی کہانی کی زبان سے کیوں نہ پیش کرا سکا کہ "راوی" بن کر اسے خود بیچ میں کودنا پڑا؟ —— پھر
اگر یہ حرکت کئے بغیر چارہ نہیں تھا تو کیا اتنے سے کام نہ چل سکتا تھا کہ کہانی کے عنوان کے نیچے دونوں طرف حاشیہ چھوڑ کر باریک قلم سے صرف اتنے
الفاظ لکھ دئے جاتے:-

"میں نے بیج کو ایک رات میں تناور درخت بنتے نہیں دیکھا!"

—— بس! اور اس کے بعد کہانی شروع ہو جاتی۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اس صورت میں افسانہ کی معنویت اور گہرائی صورت موجودہ کے
مقابلے میں کئی گنا بڑھ جاتی۔

کہانی کی اس خاص تمہید کے اسٹائل کے تقاضے سے مصنف نے جس طرز کے خاتمے کو اختیار کیا ہے۔ اُس نے کہانی کو بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ میں
اپنے اُن دوستوں کی رائے سے آہستہ آہستہ متفق ہو گیا ہوں جو یہ رائے رکھتے ہیں کہ اختتام کمزور ہے۔ کہانی جس موجودہ صورت کے ساتھ سامنے
آئی ہے۔ اُس نے مصنف کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ اختتام اُس طرح کرے جس طرح کیا گیا ہے۔ بصورت موجودہ اگر اختتام اُس موقعے پر کر دیا جاتا جہاں
بعلم چرواہے کی بیوی سے پاؤں دبواتے دبواتے اپنے ضمیر کے تاریک گرداب میں اچانک ڈوب گیا، تو کہانی کا ستیاناس ہو جاتا۔ لیکن سوال یہ ہے
کہ مصنف نے کیوں تمہید کے اس خاص اسٹائل کو کہانی کے گلے کا ہار بنا دیا تھا جس نے اختتام کے معاملے میں اسے پابند کر دیا ہے۔
تیسری کمزوری یہ ہے کہ یہ کہانی ایک حد تک اپنے قاری کو فلسفۂ جبریت کی طرف دھکیل دیتی ہے۔ "ایک حد تک" کے الفاظ میں نے اس لئے
کہے ہیں کہ مصنف یا مصنف کا کوئی حامی اس طرح کے تاثر کے حق بجانب نہ ہونے پر بھی کچھ نہ کچھ استدلال کہانی کے اجزا سے کر سکتا ہے، لیکن بہر حال
کہانی بہت سے ذہنوں کو اس طرح کا تاثر بھی دے سکتی ہے۔ اور اُن ذہنوں کو اس تاثر سے بچایا نہیں جا سکتا۔ بعلم کے بارے میں کہانی بتاتی ہے
کہ اس نے نفسیات کے نرغے میں آ کر بڑا کرب بھی محسوس کیا ہے اور اس کرب سے نکلنے کے لئے اس نے ہاتھ پاؤں بھی مارے ہیں، لیکن اس

کے تارِ حیات پر سے جونہی ایک گرہ کھلی ہے تو دوسری پڑگئی ہے، اس سے جبریت کے نظریہ میں وزن پیدا ہوتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ مصنف کے پیش نظر یہ دکھانا ہے کہ بعلم ضمیر کے پھوڑے سے اٹھنے والی درد کی ٹیسوں پر تڑپتا ضرور ہے، لیکن وہ اس پر راضی نہیں ہے کہ نشتر اس پھوڑے پر رکھا جائے۔ اُسے جو پھوڑا دکھ دیتا ہے وہ اسے محبوب بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ علاج پذیر نہ ہوسکا! لیکن مصنف کا یہ منشا مبہم ہوکر رہ گیا ہے، اتنا واضح نہیں ہوا، جتنا ہونا چاہئے تھا۔ مصنف جو دوسری تصریح اپنی صفائی میں پیش کرسکتا ہے وہ یہ ہوسکتی ہے کہ بعلم پہلے دور میں اپنے اخلاقی روگ کو خود پالتا رہا ہے، اور یہی دور علاج کا اصل دور تھا، لیکن بعد میں جب روگ نے خوب اچھی طرح جڑیں چھوڑ دیں اور وہ اپنے برگ و بار لانے لگا تو اس وقت کرب کے مارے ہوئے بعلم نے اس سے نجات پانے کے لئے کروٹیں لینا شروع کیں۔ وہ اب اپنی خودساختہ تقدیر سے نجات پانے کے لئے اپنی لاٹھی اور اپنا فرغل لے کر جیوا ہے کے غار سے نکل کھڑا ہوا، لیکن اب زنجیریں پل پل کر موٹی ہوگئی تھیں اور اب وہ شیر کی قوت صرف کرکے بھی توڑی نہ جاسکتی تھیں۔ یہ کیفیت بالکل وہی ہے جسے قرآن نے "نولہٖ ما تولیٰ" کہہ کر بیان کیا ہے۔ مگر ہمارا اعتراض وہی ہے کہ یہ مدعا فی نفسہٖ درست، لیکن اس کو پیش کرتے کا حق ادا نہیں ہوا۔

چوتھی کمزوری زبان کی کمزوری ہے۔ جیلانی اپنی پنجابیت سے اپنی کسی اچھی سے اچھی تحریر میں بھی کبھی نجات نہیں پاسکا۔ یہاں ہم اس کی کوئی خاص مثال پیش کرنا غیرضروری سمجھتے ہیں، اس کی مثالیں افسانے میں بکثرت ملیں گی۔

پانچویں کمزوری جس پر گرفت کی جاسکتی تھی وہی ہے جس کی طرف کوثر نیازی صاحب نے اشارہ کیا ہے، یعنی تاجر کی بیوی کے حسن و جمال کی نقشہ کشی میں مصنف ایک مسلم ذہن کی حدود سے بے نیاز ہوگیا ہے۔ لیکن اس میں رعایت دینے کی ایک وجہ ضرور ہے، اور وہ یہ کہ مصنف درحقیقت اپنی آنکھ سے نہیں دیکھ رہا، بلکہ وہ بعلم کی آنکھوں کی رعایت بھی کر رہا ہے۔ اس نے یہ منظرنگاری اتنے شوخ لفظوں میں اس لئے کر ڈالی ہے کہ وہ دکھا سکے کہ بعلم جیسا مریض فطرت آدمی کتنے بڑے خطرے کی زد پر جارہا تھا۔ اس کے باوجود اس طرح کے مواقع ہمارے اسلامی ذوق کے لئے بار ہوسکتے ہیں، اور ایسے مواقع پر ہمیں مزید محتاط ہونا چاہئے۔

ان کمزوریوں سے صرف نظر کرکے ہم نے افسانے کو عظیم قرار دیا تھا، بلکہ ان کو جانتے ہوئے یہ رائے قائم کی تھی کہ یہ افسانہ عظیم ہے۔ یہ اس لئے عظیم نہیں کہ اس میں کوئی کمزوری نہیں، بلکہ اس لئے عظیم ہے کہ کمزوریوں کے باوجود اس کا مقصدی زور اور اس کا فنی جمال ساری فضا پر حکمرانی کر رہا ہے۔ محض چند کمزوریوں کے ہونے سے کوئی نگارش گھٹیا نہیں ہوجاتی، بلکہ جب وہ گھٹیا ہوتی ہے تو اسے بہت ساری خوبیاں بھی اعلیٰ نہیں بنا سکتیں۔ کبھی کہانی کو ایک ہی خوبی مقام رفعت پر لے جاتی ہے اور کبھی اسے کوئی ایک ہی کمزوری ڈبو دیتی ہے۔

اس کہانی پر یہ اعتراض بھی کیا گیا ہے کہ اس میں انسانیت کا ایک گھٹیا اور ناقص اور قابل نفرت کرداری نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ اور اسلامی ادب میں ایسے کردار پیش نہ کئے جانے چاہئیں۔ یہ اعتراض اگر کوئی غیر ذمہ دار آدمی پیش کرتا تو کوئی بات نہ تھی۔ مگر ہمارے ذہین اور ذمہ دار رفیقوں کی طرف سے جب اسے چھیڑا گیا تو راقم الحروف نے بڑی ندامت محسوس کی۔ ادب اسلامی ہو یا غیراسلامی، اچھے کرداروں کو مقبول بنانے کے لئے اگر آپ پیش کرنا چاہیں گے تو لازماً ان کے متوازی برے کرداروں کو بھی پیش کرنا ہوگا تاکہ انسانیت ان کی کمزوریوں اور ان کے مفاسد کو سمجھے اور ان سے نفرت کرنے کی حس اور ان کو پچھلی صفوں میں دھکیلنے کا جذبہ اس میں پیدا ہو۔ ادب تو خیر ادب ہے، خود دین میں یہ ناگزیر ہے کہ سیرتِ انسانی کے روشن نمونوں کے ساتھ تاریک نمونے بھی آمنے سامنے رکھ کر پیش کئے جائیں۔ قرآن کو دیکھئے تو "ومن الناس ..." کے الفاظ سے اس نے جن مختلف انسانی کرداروں کو ہمارے سامنے بے نقاب کیا ہے ان میں ایک صف قابلِ تقلید مقدس کرداروں کی ہے، اور ایک صف قابلِ تحقیر پست کرداروں کی۔ اگر گھٹیا کرداروں کو پیش کرنے کا مفہوم یہ ہوتا کہ ان کرداروں کی تبلیغ ہوجائے گی تو قرآن کبھی ایسا نہ کرتا۔ یہی صورت اسلامی ادب کی ہے کہ اس میں گھٹیا کردار پیش کئے جاسکتے ہیں سے آگے بڑھ کر ہم یہ کہیں گے کہ اعلیٰ کرداروں کو ابھارنے کے لئے یہ بالکل

ضروری ہے کہ آپ ان کو پیش کریں۔ سوال صرف گھٹیا کرداروں کو پیش کرنے کے انداز کا ہے۔ اگر گھٹیا کردار اس طرح پیش کئے جائیں کہ ان سے محبت پیدا ہو تو یہ مقصد دشمنی ہوگی۔ لیکن اگر ان کو پیش کرنے کا انداز ایسا ہو کہ ان سے کراہت ہو اور ان کے نمونے پر اپنے آپ کو ڈھالنا آدمی کے لئے اپنی نگاہ میں موجبِ توہین ہو جائے تو یہ عین مطلوب ہے! درحقیقت مقصدی ادیب جب کسی ذلیل قسم کے انسانی کردار کی تصویر کشی کرتا ہے اور سماجی زندگی میں اس کی چلت پھرت دکھاتا ہے تو اس کا منشا یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش میں پائے جانے والے ایسے افراد کے سامنے ایک آئینہ رکھ دے کہ وہ اس میں اپنی صورت کے گھناؤنے خد و خال دیکھ لیں ——— اور سوسائٹی بھی ان کے چہرے کے ایک ایک نقش سے واقف ہو جائے۔ یہاں اگر "حامد" (جہنم کے دروازوں پر "کا مرکزی کردار) کو پیش کرنا ضروری ہوتا ہے تو دوسری طرف "اسلم" ("اسلم مر گیا ہے" کا کردار) کو بھی متعارف کرانا پڑتا ہے۔ ان اشارات کے بعد مجھے اپنے رفیقوں سے پورا پورا حسنِ ظن ہے کہ وہ اپنی رائے تبدیل کر لیں گے۔ لیکن اگر ان کی رائے برقرار رہے تو راقم الحروف کے نزدیک وہ غلط ہوگی، افسانے کے مصنف کے نزدیک بھی غلط ہوگی اور ہمارے پختہ ذوق رفقا کی نگاہ میں بھی غلط ہوگی، بہرحال وہ اپنی رائے رکھنے میں آزاد ہیں۔

ایک ذہین رفیق نے یہ سوال بھی چھیڑا ہے کہ نعیم کے پہلے کرداری تحولات کے مقابلے میں اس کی آخری پلٹی کچھ عجیب نظر آتی ہے۔ وہ آخر یکایک سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کیوں چل دیتا ہے۔ یعنی یہ مقام افسانے کی فضا میں فطری نہیں معلوم ہوتا بلکہ انوکھا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے پہلے تحولات کے مقابلے میں اس کی آخری پلٹی کا فرق سمجھنے کے لئے ہمیں نفسیاتِ انسانی کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ انسان ——— اور غیر معمولی ساخت کے انسان ——— جب کسی تقاضے کے تحت اپنے اندر متعدد مرتبہ رد و بدل کر کے مقصود کو حاصل نہیں کر سکتے تو وہ ہمیشہ ایک آخری پلٹی ایسی کھاتے ہیں جو تعجب انگیز ہوتی ہے اور اس کی حقیقت کی توجیہہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مثلاً بسا اوقات ایک شخص فرقہ دارانہ بحثوں میں پڑ کر مذہبیت کی کوچہ گردیاں کرتے کرتے جب تھک جاتا ہے اور وہ کہیں اطمینان نہیں پاتا تو بالآخر جھنجھلا کر وہ سرے سے مذہب ہی سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے اور کھلا کھلا ملحد اور دہریہ بن جاتا ہے۔ اسی طرح بعض لوگ جب کاروبار کے جب تجربات پے در پے کر کے بار بار ناکام ہوتے ہیں تو آخرکار وہ کاروبار کا میدان ہی سرے سے چھوڑ کر کسی چھوٹی موٹی نوکری پر پڑ رہتے ہیں۔ یا پھر یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک شخص اپنے کسی مزمن مرض کا پہلے ایلوپیتھی طریق سے علاج کراتا ہے، پھر طبِ یونانی کی طرف رجوع کرتا ہے، پھر ہومیوپیتھی کو آزماتا ہے، پھر تعویذ گنڈے اور دم درود اور ٹونے ٹوٹکوں سے مدد لیتا ہے، اور آخر میں جب بالکل مایوس ہو جاتا ہے تو خودکشی کر لیتا ہے (حال ہی پنجاب پولیس کے ایک ملازم نے بالکل یہی کیا ہے)۔ نعیم نے بھی اپنے ضمیر کے مرض سے نجات پانے کے لئے مختلف طریقے آزمائے، لیکن جب کسی طرح کامیابی نہ ہوئی تو اس کی سوشل زندگی نے خودکشی کر لی۔ یہ انسانی فطرت کے معروف مقامات میں سے ایک مقام ہے جو نعیم کو پیش آیا۔ ہر تارک الدنیا ایسے ہی مقامات سے گذر کر اپنی جگہ پہنچا ہے۔ مبالغہ نہ ہوگا، اگر یہ کہا جائے کہ جیلانی اپنے کردار کو اگر اس پلٹی سے نہ گذارتا تو کہانی مکمل نہ ہوتی اور تصویر کشی ناکام رہتی۔

اب بطورِ خاتمہ کلام چند اہم گذارشات سپردِ قلم ہیں:-

اوّل۔ اشاعتِ خاص کا افتتاحیہ لکھتے ہوئے جب میں جیلانی کے افسانے کے متعلق اظہارِ رائے کر رہا تھا تو عین اُس لمحے میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس اظہارِ رائے کے ساتھ میں ایک بڑی ذمہ داری لے رہا ہوں۔ میں جن لوگوں کو خطاب کر کے یہ سطور لکھ رہا ہوں، ممکن کہ ان کے سامنے مجھے ایک دن دلائل بھی رکھنے پڑیں۔ چنانچہ میں اُس کے لئے ایک حد تک تیار تھا۔ لیکن برعکس اس کے ہوا یہ کہ میں گھر کے دروازے پر کھڑا باہر کے دوستوں سے باتیں کر ہی رہا تھا کہ خود گھر کے لوگوں نے مطالبہ کیا کہ پہلے ہمیں مطمئن کرو، پھر دوسروں سے بات کرنا۔ میرے گریبان کو خطرہ سامنے سے تھا، لیکن چاک یہ پیچھے سے ہوا۔ اس کا مجھے افسوس ضرور ہوا، لیکن اپنوں کا حق بہرحال مقدم تسلیم کرتا ہوں۔ (بقیہ بر صفحہ ۴۰)

خیال افزا

نکی زاکانی

نہ ربطِ گُل نہ خوفِ پائمالی   مری ہربات دُنیا سے نرالی

شرابِ عیش سے محروم ہے دل   یہ شیشہ رہ گیا خالی کا خالی

غمِ اُلفت کی تصویروں سے میں نے   دُکانِ زندگی اپنی سجالی

سراپا دعوتِ فکر و نظر ہُوں   خیال افزا ہے میری بے خیالی

خرد کرتی رہی کانٹوں کے شکوے   نظر نے چوس لی پھولوں کی لالی

ہیں نہ افلاک میرے زیرِ شہپر   تری پرواز اب تک ڈالی ڈالی

نفس میرا مؤذن صُبحِ نو کا   مری آواز میں شانِ بلالی

یہ کیا جادُو کیا حُسنِ چمن نے

بنا پھرتا ہے ہر صیّاد مالی

●

قطعہ

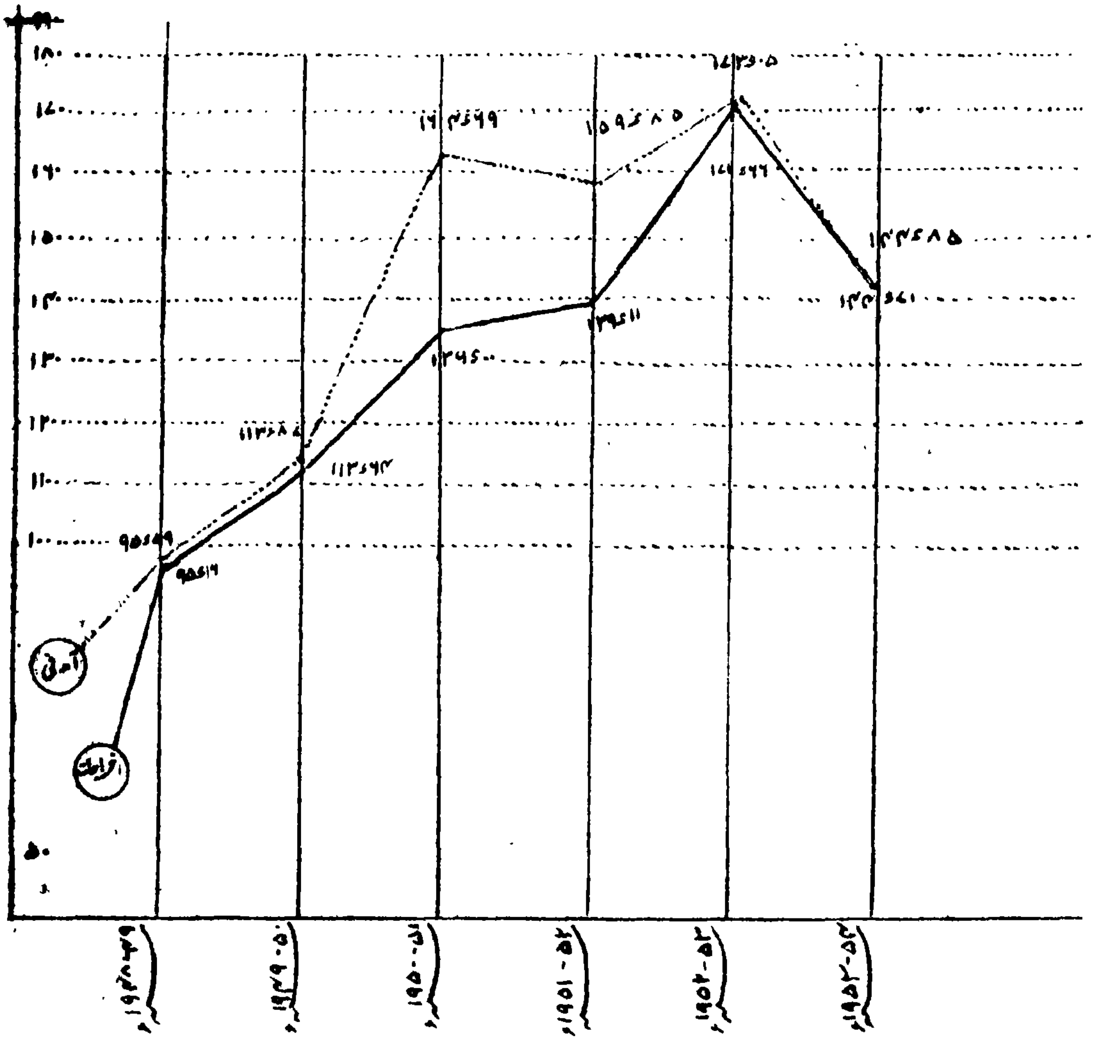
ہمارے واسطے یکساں ہیں دونوں   ہو فصلِ گُل کہ دورِ پائمالی

ہمارا ذوق ہر حالت میں تشنہ   ہمارا جام ہر موسم میں خالی

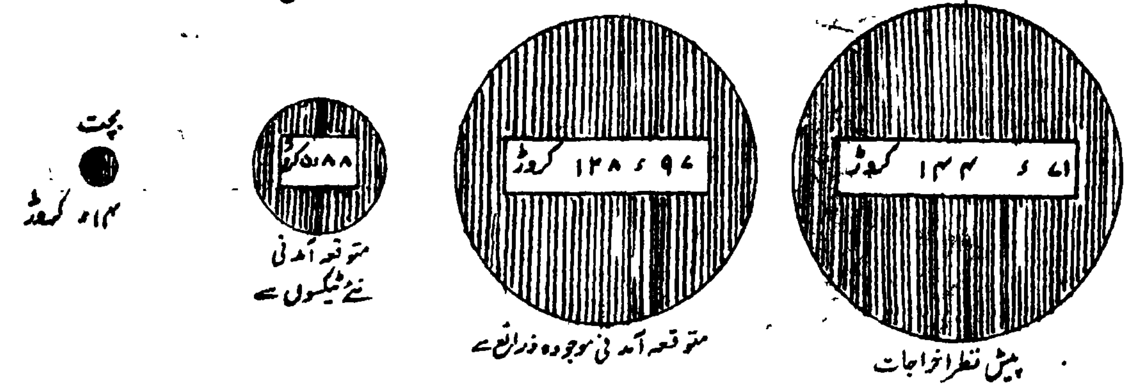
پاکستان کا بجٹ ایک نظر میں

ادارہ

مرکزی بجٹ کے آمد و صرف کا چھ سالہ گراف
(کروڑ روپوں میں)



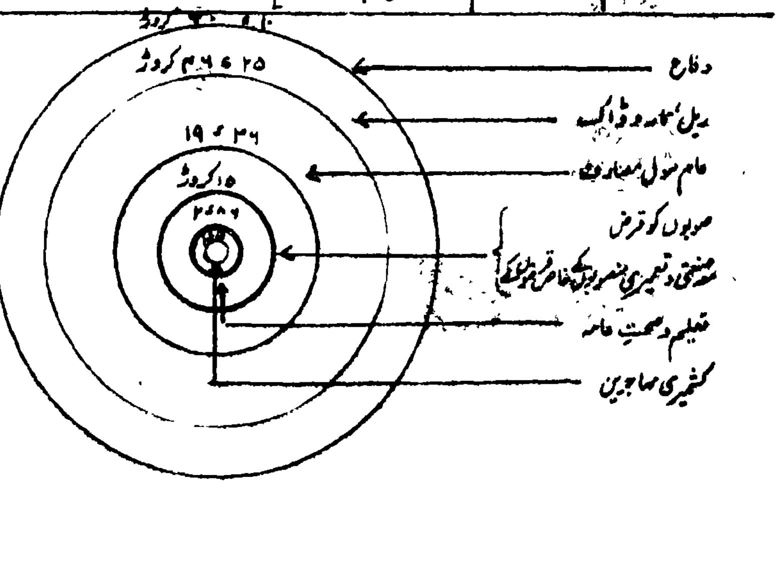
مصارف ——— آمدنی ——— نئے ٹیکس



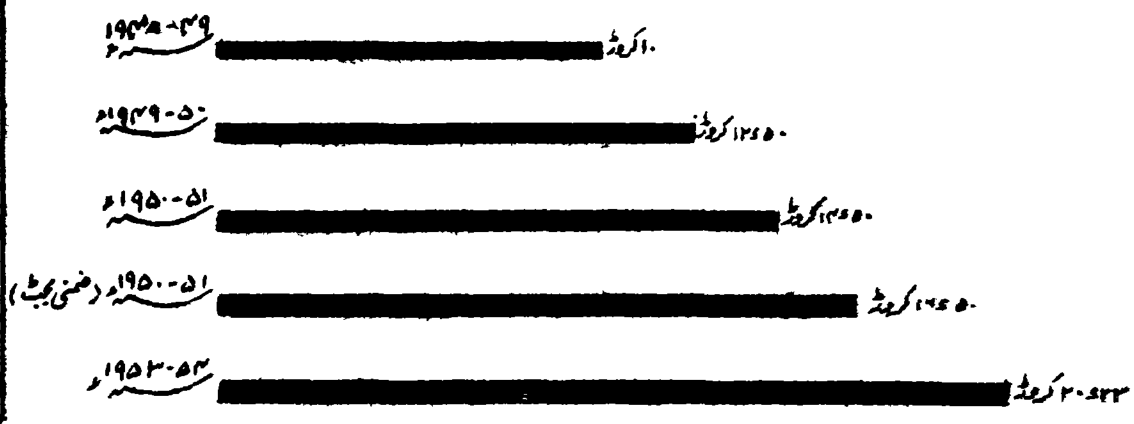
ٹیکس کی نئی تجاویز کا بار

نام جنس	قسم ٹیکس	شرح	
۱۔ وسکی، جن، برانڈی	امپورٹ ڈیوٹی	۵۰ روپے فی گیلن کا اضافہ	امراء پر بار پڑے گا۔
۲۔ پٹرول (ملکی)	ایکسائز ڈیوٹی	۴ سے بڑھا کر ۶ فی گیلن کر دی گئی ہے	متوسط طبقہ اور غریب طبقہ پر نیا دوبار پڑے گا۔
۳۔ " (درآمد)	امپورٹ ڈیوٹی	۶ فی گیلن کر دی گئی ہے	" " " "
۴۔ پٹ سن کی مصنوعات	" "	۳۰ فی صدی	یہ اقدام جیوٹ کی صنعت کے حق میں مفید ہوگا
۵۔ کپڑا (درآمد)	ایکسائز ڈیوٹی	۵ فی صدی سے بڑھا کر ۴ فیصدی کر دی گئی ہے۔	بار غریب طبقے پر پڑے گا دیسی پارچہ بافی کے لئے مفید ہے۔
۶۔ پٹ سن کے ٹاٹ اور بورے (استعمال شدہ)	امپورٹ ڈیوٹی	۳۴ فی صدی	پٹ سن کی پیداوار اور صنعت کے لئے مفید قدم۔
۷۔ سگریٹ	ایکسائز ڈیوٹی	۲۵ فیصدی۔ ہر دس سگریٹوں پر تقریباً دو پیسے کا اضافہ	بار متوسط اور غریب طبقے پر پڑے گا۔
۸۔ شکر (درآمد)	ایکسائز ڈیوٹی	۲۰ روپے سے ۳۲ روپے فی کوارٹر کر دی گئی	غریب طبقے پر بار پڑے گا۔
۹۔ شکر (ملکی)	" "	۳ روپے سے ۷ روپے فی کوارٹر کر دی گئی ہے	شکر سازی کی صنعت کے لئے خفیف سا فائدہ، غریب اور متوسط طبقے پر بار پڑیگا

مختلف مصارف کا تناسب



ٹیکس کے بار میں تدریجی اضافہ

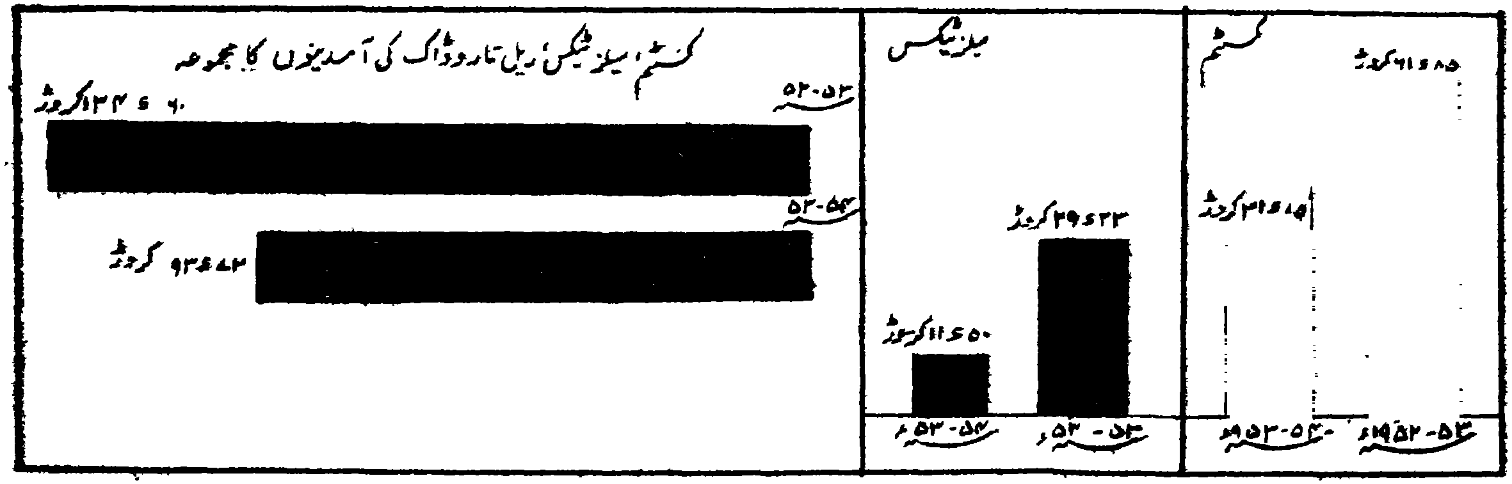


بجٹ کا اوسط بار فی کس

جملہ آمدنی کا فی کس اوسط بار = ۱۹٫۳۳ روپے

ٹیکس کا اوسط بار فی کس = ۲٫۷۲۸ روپے

سالِ آئندہ کے لئے سالِ رواں کے مقابلے میں آمدنیوں میں انحطاط (کروڑ روپوں میں)



تقسیمِ دولت کے مختلف فارمولے

نعیم صدیقی

[اس مضمون کو لکھتے ہوئے Guide's Political Economy سے خصوصی استفادہ کیا گیا ہے]

موجودہ دنیا کی بے چینیوں کے اسباب میں سے ایک بڑا اور نمایاں سبب معاشی فساد ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس دنیا کی معیشت انصاف کے اصولوں پر قائم نہیں ہے۔ مگر اس میں بنیادی بے انصافی کیا ہو رہی ہے؟ بنیادی بے انصافی یہ ہے کہ دولت کی نہریں سے زندگی کی ہر کیاری کو اس کا جائز حصہ نہیں مل رہا ہے' بلکہ چند ایسی کیاریاں ہیں کہ ان کو ضرورت سے' یا ان کے حق سے زیادہ پانی لگ رہا ہے اور دوسری طرف اکثر ایسی ہیں کہ جن کی سیرابی ان کی ضرورت اور ان کے حق کے مطابق نہیں ہو رہی۔ ایسی بے انصافی کو جب ہم علم معیشت کی زبان میں بیان کریں گے تو کہیں گے کہ تقسیم دولت کا سسٹم غلط ہے۔

تقسیم دولت ہوتی کیسے ہے؟

اگر دُنیا کا ہر شخص رابنسن کروسو کی طرح الگ تھلگ جزیرے میں آباد ہوتا اور وہ جو کچھ محنت و مشقت کرتا صرف اپنے لئے کرتا اور جو مصنوعات تیار کرتا اپنے ہی استعمال کے لیئے کرتا تو تقسیم دولت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ لیکن اجتماعی زندگی کا کوئی تصور ہم مبادلہ اور تقسیم کار کے اصولوں کے بغیر نہیں کر سکتے۔ یہاں تک کہ دُنیا کی وہ وحشی اقوام جو جنگلوں میں قبائلی زندگی بسر کرتی ہیں اور جن کی معیشت کی سرگرمیاں زیادہ تر شکار تک محدود ہیں وہ بھی تقسیم دولت کے سوال سے بالاتر نہیں ہیں۔ خود ہمارے سماج میں اگر کسی موچی' کمہار' جولاہے یا بھٹیارے سے کہا جائے کہ تم نے جو جوتے' برتن' کپڑا یا کھانا تیار کیا ہے وُہ سب تمہارا ہے' اسے سنبھال کر رکھو تو اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ جائیگا ظاہر بات ہے کہ ہم میں سے کسی کی ضروریات کا جواب وہ چیز نہیں ہے جو وہ براہ راست اپنی محنت سے تیار کرتا ہے' بلکہ اسے بہت سی چیزیں درکار ہیں جن کو وہ اپنی محنت کے نتائج کے مساویانہ بدلے کے طور پر حاصل کرتا ہے۔

ہر تمدنی معاشرے میں دولت کی بہتی ہوئی ندی کے اندر فرد فرد اپنی مصنوعات کو فروخت کرتے ہوئے اور اپنی خدمات کو بالمعاوضہ دیتے ہوئے کچھ معاشی اقدار کے قطرے متواتر ٹپکاتا رہتا ہے' جن کے جواب میں کچھ دوسری اقدار کے قطرے وہ اس ندی میں سے حاصل کرتا ہے ہم میں سے ہر ایک جو کچھ رکھتا ہے منڈی میں لاتا ہے۔ زمیندار غلہ لاتا ہے' مالک مکان اپنے مکانوں کے کمرے لاتا ہے' زردار اپنا نقد سرمایہ لاتا ہے صناع اپنے کارخانے کی مصنوعات لاتا ہے' اور جس کے پاس نہ زمین ہو' نہ مکان' نہ سرمایہ' وہ اپنی محنت اور اپنی ذہانت لاتا ہے۔ اور پھر ایک اپنی مصنوعات یا اپنی خدمات کو زیادہ سے زیادہ امکانی معاوضے پر فروخت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر قیمت محض اس کی تمناؤں اور امنگوں کے تقاضوں پر نہیں چکتی۔ منڈی میں جو کچھ بکتا ہے وہ "قانونِ طلب و رسد" (The Law of supply & demand) کے مقرر کردہ معیارِ قیمت کے مطابق بکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اشیاء اور خدمات کی قیمتیں اس بنیاد پر کم و بیش ہوتی ہیں کہ وہ کس درجے کی انسانی ضروریات کو کس درجے میں پورا کرنے والی ہیں۔ پس درحقیقت وہ طاقت جو اشیاء اور خدمات کی قیمت لگاتی ہے وہ عوام الناس —— یا —— صارفین (Consumers) ہوتے ہیں اور اس طاقت کی طرف سے جو قیمت لگائی جاتی ہے وہ مجموعی دولت میں سے ہمارے حصے کا تعین کر دیتی ہے۔ چنانچہ ہر فرد کو اس کا معاشی حصہ مزدوری' کرایہ مکان' زمین کے لگان' سُود منافع اور تنخواہ کے مختلف ناموں سے ملتا ہے۔

. . . کیا اس طریق پر "قانونِ طلب و رسد" کا عمل دولت کو جن اندازوں سے تقسیم کر دیتا ہے، اس سے انصاف کا تقاضہ بھی پورا ہو جاتا ہے؟

کلاسیکل معاشئیین کے نزدیک یہ سوال اٹھانے کا کسی کو حق نہیں پہنچتا۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ایسا ہی ہے کیونکہ اس کے علاوہ اور کچھ ہو نہیں سکتا۔ اگر کرہ ارضی کے مختلف حصوں میں سورج کی روشنی اور ہوا کی تقسیم کے بارے میں یہ سوال پیدا نہیں ہوتا تو دولت کی تقسیم کے بارے میں بھی کسی کو زبان کھولنے کا حق نہیں!

لیکن رجائی اسکول (Optimist school) انصاف کے اصول پر اس سوال کو ایک دوسری شکل میں اٹھاتا ہے، یعنی کیا ہر شخص دولت کے تالاب میں سے اُتنا حصہ پاتا ہے یا نہیں، جتنا کہ اُس نے شامل کیا ہے؟ اور پھر وُہ خود ہی اس کا جواب اثبات میں دیتا ہے! اس اسکول کے متوسلین کی نگاہوں میں قانونِ طلب و رسد تبادلہ کے عمل کو اس طرح کنٹرول کرتا ہے کہ لین دین میں ٹھیک ٹھیک مساوات خودبخود پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ قانون ہر شخص کو اُتنا ہی کچھ حاصل کرنے کی گنجائش دیتا ہے جتنا کہ اُس نے دوسری طرف سے ادا کیا ہو۔ اور چونکہ ہر تبادلہ آزادانہ معاہدے سے واقع ہوتا ہے اس لئے یہ قانون بڑی غیر جانب داری سے اپنا غیر جبری فیصلہ دیتا ہے۔ قدرتی طور پر ان اشیاء اور خدمات کی زیادہ قیمت لگنی چاہیئے جو کمیاب ہوں اور جن کی احتیاج سوسائٹی میں شدید طور پر پائی جاتی ہو۔ پھر کیا تبادلہ کا یہ انصاف تقسیم کو بھی منصفانہ نہیں بنا دیتا؟ قانونِ طلب و رسد بہرحال جو کچھ بھی قیمت بندی کرتا ہے "افادۂ عمومی" کے اصول پر کرتا ہے!

پھر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اقدارِ تبادلہ کی عدم مساوات کی روک تھام مسابقت کے ذریعے ہو جاتی ہے۔ یعنی اگر کسی چیز کی قیمت گراں ہو جاتی ہے تو بہت سے لوگ اپنے سرمایہ و محنت کو اس کی فراہمی و تیاری پر مرتکز کر دیتے ہیں، یہاں تک کہ قیمت اپنی منصفانہ سطح پر آ جاتی ہے۔ پھر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ تقسیم دولت کا موجودہ سسٹم خودکار ہے (it works automatically) یہاں قانون کی "بی اماں" کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ آکر بچوں میں روٹی تقسیم کرے۔ قانون کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ کسی کو کسی دوسرے کا حصہ چھیننے نہ دے، تقسیم خود بخود ہوتی ہے۔

ناقدین رجائی اسکول سے پوچھتے ہیں کہ "قانونِ طلب و رسد" فطری قانون سہی مگر یہ کیسے ثابت ہوا کہ اس قانون کے تحت جو تقسیم ہوگی وُہ منصفانہ بھی ہوگی؟ آخر دورانِ خون بھی فطری قانون کے تابع ہے، لیکن خون کی گردش ایک برائی کے عمل کے لئے بھی ہو سکتی ہے اور بھلائی کے لئے بھی۔ فی نفسہٖ دورانِ خون تو نہ انصاف کو جانتا ہے، نہ اخلاق کو۔ ذرا غور کیجئے کہ ایک بھنگی صحتِ عامہ کے تحفظ کے لئے دن بھر جھاڑو لئے محنت کرتا ہے لیکن ایک روپیہ یومیہ سے زائد اس کے پلے نہیں پڑتا۔ دوسری طرف ایک قوال ہے جو دو گھنٹوں میں ۵۰۰ روپیہ ایک مجلسِ موسیقی سے وصول کر کے اٹھتا ہے۔ ناقد پوچھتے ہیں "کیا یہ انصاف ہے؟ ——— اور اس پر Bastiat's school گرج کر جواب دیتا ہے" جی ہاں" یہ اس لئے کہ قوال ایک بھنگی کے مقابلے میں سینکڑوں گنی اہم خدمت انجام دے رہا ہے۔ اور دلیل اس کی یہ ہے کہ سماج اسے سینکڑوں گنا زیادہ معاوضہ ادا کرتا ہے"

بہت اچھا! اس بحث کو چھوڑیئے، ہم ایک دوسرا مسئلہ چھیڑتے ہیں۔ وہ یہ کہ آپ کہتے ہیں کہ قانونِ مسابقت تقسیمِ دولت کی بے انصافیوں کی اصلاح کر دیتا ہے، لیکن یہ تو بتایئے کہ اس مسابقت میں قوال کے مقابلے میں ہمیشہ بیچارا بھنگی ہی کیوں مارا جاتا ہے؟ مسابقت کا صحیح عمل وہاں ہو سکتا ہے جہاں کھیل دیانت دارانہ کھیلا جا رہا ہو۔ مارکیٹ کے میدان میں جو کوئی بھی اترے اپنی محنت اور اپنی خدمات لے کے اترے، اس صورت میں اگر کوئی تھوڑا لاتا ہے اور تھوڑا پاتا ہے تو وہ اپنا ذمہ دار خود ہے۔ لیکن یہاں تو قمار کی ایک ایسی بازی کھیلی جا رہی ہے جس میں پہلے سے جو جتنا زیادہ داؤں لگانے کے قابل ہے اتنا ہی زیادہ بڑا داؤں جیت جانے کے امکانات بھی اس کے لئے ہیں۔ اس قمار خانے میں غریب محنت کار سب سے پیچھے رہ جاتا ہے جس کے پاس بجز اپنے ہاتھوں کی حرکت کے اور کوئی چیز داؤں میں لگانے کی نہیں ہے اس کی جنس

ایک ایسی جنس ہے جس کی مارکیٹ میں افراط ہے اور اس وجہ سے یہی جنس سب سے ارزاں ٹھہرائی جاتی ہے۔ دوسری طرف صناع ہے جو کئی کئی ہزار ہارس پاور کی مشینیں لے کے آتا ہے، سرمایہ دار ہے جو سیم وزر کی تھیلیاں بھر کے لاتا ہے اور زمیندار ہے جو زمین لے کے آتا ہے۔ یہ تسلیم کہ ان کے ذرائع و وسائل معاشرے کی بڑی ہی اہم ضروریات پوری کرنے کا ذریعہ ہیں۔ لیکن سوال یہ رہ جاتا ہے کہ آخر یہ واقعہ انصاف کے کس اصول کے تحت آتا ہے کہ معاشرے کی زیادہ نفع آور اور قیمتی خدمات پر چند افراد کا مستقل اجارہ ہو اور کم افادیت رکھنے والی اور کم قیمت دلانے والی خدمات باقی لوگوں کی قسمت میں مستقل طور پر لکھ دی جائیں؟

یہ بے انصافی کلاسیکل اسکول کے ناقدین کے بقول "ملکیت" کے اس غلط نظام سے پیدا ہوتی ہے جو تقسیمِ دولت کے غیر منصفانہ نظریئے کا ایک لازمہ ہے۔ پس معاشی انصاف کو قائم کرنے کے لئے نظامِ ملکیت کی اصلاح بھی ضروری ہے، مگر خود نظامِ ملکیت کی اصلاح کے لئے تقسیمِ دولت کے موجودہ خود کار سسٹم کو بدلنا ناگزیر ہے۔ چنانچہ سوشلسٹ نظریہ کے تحت تقسیمِ دولت کے حسبِ ذیل نئے فارمولے سوچے گئے ہیں[۵]۔

مساویانہ حصہ داری

مساویانہ حصہ داری (equal sharing) کا فارمولا ماضی بعید میں اپنے سادہ ترین انداز پر کارفرما رہا ہے۔ قدیم مقننین مثلاً منو، لائی کرگس، رومولس، وغیرہم نے زمین کو اگر "فی کس" کے حساب سے نہیں، تو "فی کنبہ" کے حساب سے برابر برابر تقسیم کیا تھا۔ مگر یہ فارمولا جن زمانوں میں قابلِ عمل تھا وہ گذر گئے۔ اُن زمانوں میں سماجی زندگی چند شہروں تک محدود تھی اور صرف ایک زمین ہی ذریعہ معاش تھی۔ آج سماجی زندگی وسیع اور پیچیدہ تر ہو گئی ہے اور معاشی ذرائع گوناگوں ہیں۔ اب کوئی کٹر سے کٹر سوشلسٹ بھی اس فارمولے کو اس کے سادہ مفہوم کے ساتھ قابلِ نفاذ نہیں سمجھتا۔ البتہ سوشلسٹ نظریۂ معیشت کے قوام میں اس فارمولے کا ایک جوہر ضرور ترکیب یافتہ ہے۔

یہ بات سب کے نزدیک مسلّمہ ہے کہ مہذب اقوام میں عوام کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے وافر دولت موجود ہے، اور اس وفورِ دولت کے باوجود اگر افلاس و احتیاج کارفرما ہے تو اس سے خودبخود ثابت ہو جاتا ہے کہ غلط تقسیم کر کے قوی نے کمزور سے اُس کا حق چھین لیا ہے۔ اب اس کی اصلاح بجز اس کے نہیں ہو سکتی کہ قوی سے کمزور کو بجبر حق دلوایا جائے (جیسا کہ انقلابی سوشلسٹوں کا خیال ہے) یا بھاری ٹیکسوں کے ذریعے دولت کو امیر طبقے سے غریب طبقے کی طرف رواں کر دیا جائے (جیسا کہ جمہوری سوشلزم کا تقاضا ہے)

بات بڑی معقول نظر آتی ہے، مگر عملی نتائج کے لحاظ سے دیکھئے تو موجودہ حالات میں کوئی بڑا فرق واقع ہوتا نظر نہیں آتا۔ وجہ یہ کہ سوسائٹی میں بڑے دولت مند لوگ چند ہوتے ہیں اور غرباء کی تعداد کثیر ہے۔ چنانچہ سوسائٹی کو معاشی طبقات کے لحاظ سے ایک مخروطی مینار کی شکل میں دکھایا جاتا ہے جس کی اوپر کی نکیلی چوٹی زردار طبقے کو پیش کرتی ہے اور جس کا قاعدہ غریب طبقے کو۔ اب اگر یہ چوٹی کاٹ کے مخروط کے پیندے پر پھیلا دی جائے تو کوئی نمایاں اضافہ اس میں نہیں ہوگا۔ یا یوں سمجھئے کہ اگر کوہستانِ نمک کو ریزہ ریزہ کر کے، پورے پنجاب کی سطح پر تقسیم کر دیا جائے تو یہ سطح بقدر ایک سنٹی میٹر کے بھی اونچی نہیں ہو سکتی۔ مثلاً فرض کیجئے کہ پاکستان کا زردار طبقہ جو ستر کروڑ روپے کی مالیت کے املاک پر قابض ہے۔ آپ اگر اس طبقے سے یہ سارے املاک چھین کر پوری

---

[۵] واضح رہے کہ سوشلزم کے علمبردار مفکرین صرف تقسیمِ دولت ہی کی اصلاح نہیں کرنا چاہتے، بلکہ پورے نظامِ پیدا آوری اور نظامِ تبادلہ کو سرتاپا بدلنے کے درپے ہیں، کیونکہ بغیر اس کے خود تقسیمِ دولت کے طریقوں میں بھی تغیر واقع نہیں ہو سکتا۔

"اجتماعیت" کا فارمولا

"اجتماعیت" کمیونزم کی ایک ہلکی شکل ہے۔ یہ اسکول صرف ذرائع پیداوار۔ زمین، معادن، کارخانوں، بینکوں، ریلوے اور خام اجناس کو مشترک بنانے کی دعوت دیتا ہے اور اشیا سے صرف کو نجی املاک میں چھوڑ دیتا ہے۔ بشرطیکہ وُہ بہتر طریق پر تقسیم کی گئی ہوں۔ اجتماعیت نے اپنے آپ کو "عقلی سوشلزم" (Scientific Socialism) کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

یہ اسکول اپنی دعوت انصاف اور اخلاق کے نام پر پیش نہیں کرتا، بلکہ یہ اس نظام کی طرف رہنمائی کرتا ہے جس کی طرف اس کے نزدیک سوسائٹی کے احوال قانونِ ارتقا کے تحت طوعاً وکرھاً بڑھ رہے ہیں۔ اس کی تفصیل وہ یہ بتاتا ہے کہ جب تک دولت کی پیدائش کا نظام انفرادی تھا ملکیت بھی انفرادی تھی، لیکن اب پیدائش دولت کا نظام چونکہ اجتماعیت کے سانچے میں ڈھل رہا ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر وسائل پیدا آوری کو بھی اجتماعی ملک میں رہنا چاہیے۔ بحالاتِ موجودہ یہ تضاد کہ نظامِ پیدا آوری تو اجتماعیت میں ڈھل گیا ہے، لیکن تقسیم دولت بدستور انفرادی ملکیت کے تصور کی بُنیادوں پر ہو رہی ہے، ایک ایسا خطرناک تضاد ہے کہ موجودہ نظام سرمایہ داری اس کی وجہ سے تباہ ہو جائے گا۔ پیدا آوری اور تقسیم کے نظاموں میں بالآخر توافق پیدا ہو کے رہے گا۔

یہ تبدیلی یا تو جمہوری ذرائع سے واقع ہو سکتی ہے، یا انقلابی ذرائع سے۔ ذرائع پیداوار[1] تمام کے تمام یا تو براہِ راست قوم کے تصرف میں چلے جائیں گے، یا کمیون اور ٹریڈ یونین کے واسطے سے اجتماعی کنٹرول میں ہونگے۔ ایسی صورت میں تمام آمدنیاں قومی خزانے میں داخل ہونگی اور اجتماعی منافع میں سے اجتماعی ضروریات و مطالبات کے لئے ایک حصہ الگ کرنے کے بعد جو کچھ باقی رہے گا وہ کارکنوں میں تقسیم ہو جائیگا۔ جسے وہ اپنی مرضی سے کام میں لا سکیں گے۔

اب ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اس اسکول کی نگاہ میں تقسیم دولت کا فارمولا کیا ہو گا؟ وہ فارمولا یہ ہے:۔

"ہرایک کو اس کی محنت کے مطابق"

مگر اس فارمولا کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اُن نتائج کے مطابق جو اس کی محنت سے حاصل ہوں (اور یہ عملاً وہی بات ہے جو مینٹ سائمن اسکول کہتا ہے کہ "ہرایک کو اس کے کاموں کے مطابق") دوسرے یہ کہ ہرایک کو اس مشقت کے مطابق جو اس نے برداشت کی ہے۔ چنانچہ "اجتماعیت" کے علمبردار اپنے فارمولا کو اسی دوسرے مفہوم میں پیش کرتے ہیں اور اس کی تشریح یہ ہے:۔

"ہرایک کو اُس مشقت کے مطابق جو اس نے برداشت کی، اور جس کی پیمائش کارکردگی کے گھنٹوں کی تعداد سے کی جائے گی"

اور جو سرے سے ناکارہ ہوں ان کو ایک "کم از کم" وظیفہ دیا جائے گا۔

---

[1] واضح رہے کہ یہ اسکول کیمونزم سے جن امور میں مختلف ہے اُن میں سے ایک یہ ہے کہ یہ صرف اُن ذرائع پیداوار کو اجتماعیت کے تحت لانا چاہتا ہے جو عملاً یہ شکل اختیار کر گئے ہیں۔ لیکن وُہ ذرائع پیداوار جو ابھی تک انفرادی محنت، کاروں کے تصرف میں ہیں ان کو یہ جوں کا توں چھوڑ دینا چاہتا ہے۔ مثلاً ایک کسان اپنی جو زمین کاشت کرتا ہے، یا ایک ماہی گیر جو کشتی استعمال میں لاتا ہے اسے اجتماعیت کا اسکول انفرادی ملک میں چھوڑ دیتا ہے۔

بہت خوب! یہاں ہم اس نظریئے کے دوسرے کمزور پہلوؤں سے بحث کئے بغیر تقسیم کے فارمولے کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس عملی مشکل کا حل کیا ہے کہ اس بات کی ضمانت کبھی بھی نہیں دی جا سکتی ہے کہ "۱" جتنے گھنٹوں کی محنت سے تیار کی ہوئی چیز پیش کرتا ہے اتنے ہی گھنٹوں سے تیار کی ہوئی چیز اسے جواب میں ملے گی، کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کثیر الحصول اشیاء اور قلیل الحصول اشیا مارکیٹ میں ایک ہی قیمت پر بکیں، چاہے ان پر محنت کے گھنٹے برابر برابر صرف ہوئے ہوں یا کم و بیش! دوسرا سوال اخلاقی ہے۔ کیا انصاف اس میں ہے کہ ایک شخص کی محنت کو گھڑی رکھ کر ماپا جائے اور اس کی قیمت لگائی جائے، یا انصاف اس میں ہے کہ جو نتائج محنت اس نے پیدا کئے ہیں قیمت ان کی لگائی جائے؟

اس اسکول کے متعلق یہ بحث اب پرانی ہو چکی۔ یہ اپنی کئی شاخیں نکالتا اور کئی شکلیں بدلتا کہیں کا کہیں جا پہنچا ہے، اور اب عملاً ہم اسے سوشلزم سے الگ ایک مستقل اسکول کی حیثیت سے موجود نہیں پاتے۔

اسلامی فارمولا

ان فارمولوں میں ہر ایک علماء معیشت کی تنقیدوں کا ہدف بنا ہے اور تنقیدوں اور تجربوں سے نکل کر اگر عملاً کوئی باقی رہ گیا ہے تو وہ سوشلزم کا وہ فارمولا ہے جو معیاری طور پر روس میں کارفرما ہے۔

لیکن کیا یہ فارمولا واقعی اپنا مقصد پورا کر سکا ہے؟

مقصد کیا تھا؟ اصل بحث کہاں سے چھڑی تھی؟ — اصل بحث تو عدم مساوات سے چھڑی تھی اور مساوات پیدا کرنے کے لئے تقسیم دولت کا بہتر فارمولا ڈھونڈ نکالنے کے لئے غور و فکر شروع ہوا تھا۔ لیکن بالآخر عملاً سوشلزم نے انسان کو جہاں پہنچایا وہ تقسیم دولت کا ایک ایسا نظام ہے جس کے تحت ہر فرد کسی نہ کسی طرح جی سکے۔ معاشی مساوات ایک ناقابل عمل خیالیت (
) قرار پا کر بالائے طاق رکھی جا چکی ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ اصل بحث ہی غلط چھڑی تھی؟ اگر آپ اسے صحیح تسلیم کر لیں تو ہم اسلامی فلسفۂ معیشت کی نمائندگی کرتے ہوئے بحث کو صحیح نقطۂ آغاز سے شروع کرنے کی اجازت چاہتے ہیں۔

انسان کو اسلام نے یہ بات صراحت سے بتا دی ہے کہ خدا نے اگر تجھے پیدا کیا ہے تو تیرے لئے رزق بھی پیدا کیا ہے۔ تجھے ضروریات دی ہیں تو ضروریات کو پورا کرنے کا سامان بھی دیا ہے۔ اور مجموعی طور پر نوع انسانی کو خطاب کر کے یہ کہا ہے کہ خدا نے سب کچھ تمہاری ضروریات پوری کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ اسلام نے ان تصریحات کے ذریعے درحقیقت ہر فرد انسانی کا یہ حق تسلیم کیا ہے کہ اس کی بنیادی فطری ضروریات لازماً پوری ہوتی جائیں۔

دوسری طرف قرآن میں خدا نے انسانوں کے باہم دگر فضیلت رکھنے کو بطور امر واقعہ ہی کے تسلیم نہیں کیا، بلکہ یہاں تک صراحت کی ہے کہ یہ اونچ نیچ ہم نے خود رکھی ہے۔

ان دو حقیقتوں کو پیش نظر میں اگر ہم تقسیم دولت کا معقول ترین فارمولا معلوم کرنا چاہیں تو ہم آپ نے آپ کو روشنی میں پاتے ہیں۔ یہ فارمولا ایسا ہونا چاہئے کہ بنیادی ضروریات تو ایک ایک فرد کی پوری ہو سکیں، لیکن اس کے بعد ہر ایک کے لئے اپنی استعداد کے مطابق آگے بڑھنے کا میدان کھلا رہے اور افراد باہم دگر مختلف مدارج کی فضیلتیں حاصل کر سکیں۔ فارمولا یہ ہے:

"ہر ایک کو کم سے کم اس کی ضروریات زندگی پورا کرنے کی حد تک ——— اور زیادہ سے زیادہ اس کے ذرائع و وسائل اور اس کی صلاحیت و استعداد کے مطابق!"

لیکن جس کے پاس ذرائع و وسائل یا صلاحیت و استعداد بقدر صفر ہوں یا ضروریات زندگی پورا کرنے کے لئے کافی نہ ہوں گن

اس کی کمی پوری کرے گا؟

حکومت! سوسائٹی!

حکومت اور سوسائٹی اللہ کی دی ہوئی ضمانتِ رزق (ضروریاتِ زندگی کی حد تک) کو روبعمل لائے گی۔ اسی مقصد کے لئے وہ مامور ہے اس پر کہ زکوٰۃ کا ایک مستقل ادارہ قائم کرے اور مختلف حالات میں مزید جو ذرائع اس مقصد کے لئے درکار ہوں ان کو عمل میں لائے!

اصل میں معاشی فساد کا احساس نمودار ہی وہاں ہوتا ہے جہاں عدمِ مساوات ایک ایسی حد تک جا پہنچی ہو کہ عوام الناس اپنی بنیادی ضرورتیں پوری کرنے کے قابل نہیں رہے۔ اسی حالت میں پہنچ کر خود عدمِ مساوات کھلنے لگتی ہے اور مساوات کا نعرہ بلند ہوتا ہے۔ جہاں عوام بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ ہوں وہاں معاشی میدان میں کوئی انقلابی فکر نمودار ہو ہی نہیں سکتی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کسی سوسائٹی میں ایک ایک فرد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کا پورے ہوتے جانا وہ فطری حالت ہے کہ جس کو قائم کرنے کے لئے ہمیں تقسیم کا ایک متوازن فارمولا مطلوب ہے۔ اور یہ متوازن فارمولا صرف اسلامی فلسفۂ معیشت ہی سے حاصل ہو سکتا ہے!

اس فارمولے کو اختیار کیجئے تو نہ ملکیت کے خاتمے کا سوال پیدا ہوتا ہے، نہ معیشت پر اسٹیٹ کے کنٹرول کا، اور نہ انفرادی آزادی کی تباہی کا!

سے جاتے والی چیزیں ہیں۔ دوسری بھوک کا حل کر دینے کے بعد ظاہر ہے وہ نظام کیونکر پسند کر سکتا ہے کہ وہ جمال ادب میں پھل پھول سکے جو خواہ مخواہ غیر فطری ترنس پیدا کرنے کا موجب ہو اور پھر سماج میں فساد پھیلانے کا باعث ہو یا یہ کہ لوگوں کی بھوک کو بھڑکا کر خواہ مخواہ ایک صنفی انارکی اور ہیجان پیدا کرے جمالیات کی اس توسیع اور محویت نے ہمارے دیکھتے دیکھتے فرانسیسی قوت کا خاتمہ کیا ہے جو قوم کسی زمانہ میں قائم تھی وہ اب دست نگر ہے یہ صرف اس لئے کہ اس قوم میں فکر و ادب و تعمیری کام کرنے کے بجائے نام نہاد جمالیاتی ذوق کی تسکین کا بیڑا اٹھا لیا۔ انگلستان کا آفتاب مائل بہ غروب ہے۔ کیوں کہ وہ امریکی سامراج کے گھن میں آیا جا رہا ہے کیا اس کے اسباب ہم کہیں اور تلاش کرنے جائیں اس کے اسباب یہی اور صرف یہی نہیں کہ انہوں نے اپنی فکر اور اپنے ادب کو کسی متعین خدا پرستی کے نہج پر لگانے کے بجائے سراسر تخریبی خطوط پر قائم رکھا اور نوجوانوں کی وہ قوتیں جو دنیا میں فلاح کے لئے بہتر کام کر سکتی تھیں انہیں یہ سکھا دیا کہ بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

اس نام نہاد جمالیاتی ادب کا ساتھ ہمارے نام نہاد جمالیاتی فلموں اور تصاویر نے دیا۔ گر بہ روزِ اوّل کشتن، اسلام نے اشخاص کی تصویریں قائم رکھنا، اشخاص کے حسن و جمال کی قصیدہ خوانی اور موسیقیت کو بحیثیت پیشہ رائج ہونے نہیں دیا کیونکہ دراصل یہی وہ چیزیں ہیں جو کسی قوم کے لئے گھن ثابت ہوتی ہیں۔ انہیں گھنوں نے دیکھتے دیکھتے کتنی قوموں کو ہمارے سامنے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا ہے اور کتنی قومیں حرفِ غلط کی طرح مٹی جا رہی ہیں۔ اگر اشخاص کے حسن و جمال کے بجائے ہم جمال کو مظاہرِ فطرت اور آثارِ کائنات میں دیکھیں اور اسی طرح تصاویر کے دائرے کو بھی وسعت دیں تو اسلام ان سب کی سرپرستی کرے گا۔ اور یہ کہنا سراسر نادانی ہے کہ اسلام نے سرے سے جمالیاتی حس کو مردہ کر دیا ہے۔ ہاں مذکورہ بالا جمالیاتی مذاق کا پروان چڑھانا برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

چونکہ اس مقالہ کو مختصر رکھنا ہے اس لئے اسے اب اس بات پر ختم کرتا ہوں کہ اسلامی نظام میں زندگی کے سارے شعبوں اور فکر و ادب کی ساری چیزوں کو ایک بنیاد خدا پرستی پر مبنی کیا گیا ہے اور ان حدود کے اندر انہیں خطوط کے اوپر اور انہیں بنیادوں پر اسلام نے زندگی کو چلانا چاہا ہے جس طرح اس نے ساری انسانی ضرورتوں کا حل پیش کیا ہے اسی طرح فکر و ادب کے لئے بھی اس متعین صاف اور سیدھی راہیں پیش کی ہیں اب یہ ہمارا مذاق کہ ہم ان صاف اور متعین واضح اور روشن راہوں کو پسند کریں یا بھول بھلیوں اور خاردار جھاڑیوں کو!

۴ ایک مصرعہ

ایم عبداللہ راقمر

مصرعہ کیا ہوتا ہے؟ اسے آپ سب اچھی طرح سمجھتے ہیں، یعنی موزوں الفاظ کا ایک چھوٹا سا فقرہ، غزل یا نظم کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا، شعر کا نصف حصہ اور آزاد نظم کی صورت میں خود ایک مکمل شعر بشرطیکہ نظم میراجی کی نہ ہو ——

آپ کو کئی مصرعے زبانی یاد ہوں گے، مصرعوں پر ہی کیا موقوف ہے آپ کو تو شاید سینکڑوں شعر، درجنوں نظمیں حفظ ہوں گی، خط و کتابت میں آپ بلا تکلف مختلف مصرعوں اور شعروں کا استعمال کرتے ہوں گے، راہ چلتے یا شام کے وقت سیر کرتے ہوئے کسی مصرعہ کو بار بار گنگنانا تو خیر کوئی قابلِ ذکر بات ہی نہیں، یہ تو آج کل ایک عام فیشن ہے۔ مقرر سٹیج پر اپنی تقریر میں مختلف مواقع پر موزوں مصرعوں کے استعمال سے اپنی تقریر کو مؤثر اور زوردار بناتا ہے، ادیب ان موتیوں کو سلکِ تحریر میں پرو کر اپنے مضمون کو حسن و زیبائی عطا کرتا ہے۔ اس لحاظ سے آپ تسلیم کریں گے کہ ایک مصرعہ کو ہماری زندگی میں کافی دخل حاصل ہے، ہمارے شب و روز اس مصرعہ سے بہت بڑی حد تک متاثر ہیں اور شاید یہ مصرعہ کی اس دخل در معقولات کا اثر ہے کہ ہم کبھی اس مصرعہ کی تخلیق اور اہمیت پر زیادہ غور نہیں کرتے، ہم اس کو ذہنی عیاشی کے طور پر پڑھتے ہیں، اسے پڑھتے ہوئے ہمارا نطق ہماری زبان کے بوسے لیتا ہے لیکن ہم اس مختصر سی عبارت کی قدر و قیمت پہچاننے کی کوشش نہیں کرتے، ہم اس حقیقت کا تصور ہی نہیں کر سکتے کہ ایک مصرعہ کسی ایک اچھے بھلے انسان (شاعر) کو نانو سے کے پھیر میں ڈال دیتا ہے اور موزوں الفاظ کا یہ چھوٹا سا ٹکڑا، جس سے بسا اوقات ہم اپنے دل کی ترجمانی کا کام لیتے ہیں کس طرح شاعر کے شب و روز کو بے چینی و بے قراری کی بے کیف فضا کے تسلط میں دے دیتا ہے۔

میرا خیال ہے آپ نے کبھی بندوق سے شکار کھیلا ہوگا، خود نہ سہی تو کم از کم کسی شکاری کی مصاحبت کا فخر ضرور حاصل کیا ہوگا۔ آپ نے شکاری کی حالت دیکھی ہوگی۔ نہ تن کا ہوش نہ لباس کا خیال۔ بھوک ہو پیاس ہو کچھ پرواہ نہیں، بس ایک شکار کا خیال ہے، اب ٹاک ٹلا بیٹھنا حرام، دم لینا گناہ، بندوق کندھے پر آنکھیں شکار کی جستجو میں اور پاؤں خود بخود کسی نامعلوم منزل کی طرف، کشتے چلے جاتے ہیں قسمت اچھی ہوئی شکار مل گیا تو شکاری کا غنچۂ دل کھل گیا، تھکن دور پریشانی کافور ہوگئی۔ اور اگر شکار نہ ملا تو پھر رات کا اندھیرا ہی شکاری کو گھر کی طرف لے آئے تو لے آئے ورنہ یہ پسپائی اسے گوارا نہیں ہوتی۔

شکاری کی اس سرگردانی سے آپ ایک شاعر کی پریشانیوں کا کسی حد تک اندازہ لگا سکتے ہیں مکمل طور پر نہیں۔ شکاری بندوق سے پرندوں اور جانوروں کا شکار کرتا ہے پھر ان کے گوشت سے اپنے پیٹ کو پر کرنے کا سامان تیار کرتا ہے مگر شاعر دل، دماغ کی مدد سے جذبات و خیالات کا شکار کرتا ہے۔ ان کو مناسب الفاظ کا جامہ پہناتا ہے اور پھر ان میں خونِ جگر ملا کر مصرعے تیار کرتا ہے اور اربابِ ذوق کی ضیافتِ طبع کا سامان کرتا ہے۔ شکاری کی شکارگاہ اس زمین تک ہی محدود ہے۔ مگر شاعر کی جولانگاہ تحت الثریٰ سے لے کر عالمِ لاہوت تک ہے۔ اس سے اندازہ فرمائیے کہ ایک شکاری کی سرگردانی کو ایک شاعر کی بیقراری سے کیا نسبت ہو سکتی ہے۔ بعض اوقات شاعر کو مصرعوں کے لئے خیالات کی تلاش میں اپنے آپ سے بیگانہ ہونا پڑتا ہے اور کبھی محض وارداتِ قلب کے لئے موزوں الفاظ نہ ملنے کی وجہ سے کئی کئی دن تک پریشان رہنا پڑتا ہے۔ شکاری کا شغل صرف دن کی روشنی میں جاری رہتا ہے۔ مگر شاعر

کے لئے وقت کی کوئی قید نہیں۔ اس کا دل ہر وقت بیدار اور دماغ ہر آن اپنے کام میں مصروف رہتا ہے۔ شاید اس طرح آپ ایک معرعہ کی وقعت سے آگاہ نہ ہو سکیں۔ اس لئے آیئے آپ کو اس شاعرانہ بیقراری کی ایک جھلک دکھائیں جو مصرعوں کی تلاش کے بوقت شاعر کے احوال پر اکثر طاری رہتی ہے :-

اتوار کے روز بزم ادب کا اجلاس تھا۔ شاعر کا نام بھی پروگرام میں شامل تھا اسے ایک غزل پڑھنا تھی۔ بزم کی طرف سے ایک ہفتہ پیشتر ہی شاعر کو اطلاع مل چکی تھی اور وہ اس اجلاس کی اہمیت اور اپنی شہرت کے پیش نظر اپنی بہترین فکری صلاحیتوں کو اس غزل کی تیاری میں بروئے کار لا رہا تھا۔ ہفتہ کے روز غزل مکمل ہوگئی مگر ایک مصرعہ نہ ہو سکا۔ اور یہ مصرعہ مقطع کا پہلا مصرعہ تھا۔ مصرع ثانی ہو چکا تھا صرف پہلے کی کسر تھی۔ مگر یہ مصرعہ ثانی کچھ ایسی منحوس ساعت میں ذہن آیا تھا کہ مصرعہ اول کسی طرح موزون ہوتا ہی نہ تھا۔ آج ہفتہ کا دن تھا شاعر صبح سے ہی مصرعہ کے لئے پریشان تھا لیکن یہ مصرعہ موزوں نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ شاعر کو کھانے پینے کا ہوش تھا نہ نہانے دھونے کا' دماغ برابر اپنا کام کئے جا رہا تھا۔ تخیل محو پرواز تھا۔ یوں تو جس دن سے غزل کی تیاری ہو رہی تھی اسی دن سے شاعر دنیا و مافیہا سے بیگانہ سا ہو رہا تھا مگر آج اس کی پریشانی کا کچھ عجب عالم تھا کہ کل ہی بزم ادب کا اجلاس تھا غزل پر نظر ثانی بھی کرنا تھی مگر یہ ایک مصرعہ تھا کہ موزوں ہونے میں نہ آتا تھا۔

شاعر بیقراری کے عالم میں ادھر ادھر ٹہلتا رہا۔ بیگم نے کئی بار کھانا کھانے کو کہا مگر اس نے ہر بار سُنی اَن سُنی کر دی۔ دھن تھی تو صرف یہ کہ کسی طرح مصرعہ ہو جائے۔ اسے بھوک بھی تھی مگر خیال یہ تھا کہ جتنا وقت کھانے میں صرف ہوگا کیا عجب اتنے وقت میں مصرعہ ہی موزون ہو جائے۔ ٹہلتے ٹہلتے شاعر کی نگاہ اپنے میلے کچیلے لباس پر پڑی۔ یکایک خیال آیا کہ نہا دھو کر کپڑے بدل لے مگر پھر جلد ہی اس نے عنان توجہ اس مسئلہ کی طرف سے پھیر لی کہ اس سے سلسلہ خیالات برہم ہونے کا ڈر تھا۔ شاعر ٹہلتا رہا کہ نس پر آئینہ خدا جانے کیسے شاعر کے مقابل آگیا' شاعر نے آئینہ میں ایک نامانوس سی شکل دیکھی تعجب سے منہ پر ہاتھ پھیرا تو معلوم ہوا کہ یہ 'سبزہ' خود اسی کے درد دیوار پر اگ رہا ہے۔ ہاتھ سیفٹی ریزر کی طرف بڑھے ہی تھے کہ شاعر پھر سنبھل گیا اور خیالات میں غرق ہوگیا۔

شاعر تنگ آ کر گھر سے نکلا' شہر کے ہنگاموں کو خیرباد کہا اور آبادی سے دُور ایک ویران مقام پر پہنچ گیا۔ تمام دن تنہائی میں گذارا' دماغ پر کافی زور دیا تخیل کو خوب دوڑایا مگر غنچہ ناطر نہ کھلا۔ یوں تو کئی ایک مصرعے موزوں ہوتے مگر مصرعہ ثانی کی مناسبت سے شاعر کو جس بلند اور رفیع مصرعہ کی خواہش تھی وہ موزوں نہ ہو سکا' ناچار واپس لوٹنا پڑا دوپہر کا بھولا شاعر شام کو گھر پہنچا' خیالات کا اتار چڑھاؤ شکل سے ظاہر تھا' جبین شکنوں سے پُر تھی' قدم زمین پر پڑ رہے تھے مگر طائرِ فکر محو پرواز تھا' بڑھی ہوئی داڑھی کے ساتھ سر کے بکھرے ہوئے بال شاعر کو قیس کا حریف بنا رہے تھے۔

شام کے وقت شاعر نے مجبوراً چند لقمے زہر مار کئے اور اس کے بعد پھر وہی خبط' لیمپ جل رہا تھا اور شاعر خیالات میں غرق تھا۔ بیگم صاحبہ بارہ سال سے رفیقِ حیات تھیں خوب جانتی تھیں کہ آج ان کے سر پر خبط سوار ہے اور اس حالت جنوں میں ان کو بے مطلب بلانے کا کیا نتیجہ ہو سکتا ہے لہذا گھر کے دھندوں سے فارغ ہو کر آرام سے اپنی چارپائی پر ہو بیٹھیں' مگر بچے کھانے سے فارغ ہو کر شاعر کے اردگرد آ بیٹھے اور حیران ہو کر دیکھنے لگے کہ آج ابا جان کو کیا ہوگیا ہے جو یوں چپ چاپ ہیں' کوئی بات نہیں کرتے۔ ہم سے آج کا سبق سنا ہے نہ سوالات نکلوائے ہیں اور نہ لاہور کے مشہور ہونے کی وجہ پوچھی ہے' آخر کیا وجہ ہے ؟ پہلے تو انہوں نے اپنی ننھی ننھی شرارتوں سے ابا جان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کی کوشش کی مگر جب اس میں ناکامی ہوئی تو ایک لڑکے نے ڈرتے

ڈرتے پوچھ ہی لیا " ابا جی! کیا آپ کو بھی آج ماسٹر جی نے مارا ہے"؟ بیگم صاحبہ ضبط کے باوجود کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ بچے بھی ہنسنے لگے، شاعر آگ بگولا ہوگیا اور اس بچے کو ایک تھپڑ کا جرمانہ کر دیا، بچے نے رونا شروع کر دیا، دوسرے بچوں نے کچھ قیاس پینے کے لئے اور کچھ اس کی دیکھا دیکھی چلانا شروع کر دیا۔ بیگم نے اُٹھ کر بچوں کو سنبھالا اور شاعر کو اس طرح آڑے ہاتھوں لیا کہ بیچارے کو بیک بینی و دو گوش گھر چھوڑتے ہی بنی، خیالات کا ہجوم دھواں بن کر اُڑ گیا اور طائرِ فکر وہ کہیں فضاؤں میں گم ہو گیا۔

شاعر بازار میں پہنچا، پان کا بیڑا لے کر منہ میں دبایا اور اس شان سے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا کہ جو دیکھے یہی سمجھے کہ آ بجناب کھانے سے فارغ ہو کر ذرا چہل قدمی کے لئے تشریف لائے ہیں۔ جان پہچان والے ملے، اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں، شعر شاعری کا ذکر ہوا، کچھ وقت کٹا اور جب جانا کہ نیم خوابی کے باعث بیگم کا غصہ فرو ہو چکا ہوگا گھر کی راہ لی۔ گھر پہنچ کر شاعر چپکے سے اپنی چارپائی پر لیٹ گیا، خیالات کو اکٹھا کیا، طائرِ فکر کو آواز دی اور پھر اسی دھن میں مست ہوگیا۔

شاہدِ سخن کے شیدائیوں کو نیند کہاں؟ کافی دیر تک شاعر اسی ادھیڑ بُن میں رہا، کسی کروٹ چین نہ تھا، یورشِ خیالات سے دماغ جل رہا تھا اور مناظرِ فلم کی طرح مختلف تصورات پردۂ دماغ پر ظاہر ہو رہے تھے۔ درازیٔ شب کے ساتھ ساتھ شاعر کی بیقراری بڑھتی جا رہی تھی ——— آخر مقدر نے یاوری کی، اچانک ایک خیال ذہن میں آیا، چند الفاظ زبان پر آئے اور مصرعہ موزوں ہوگیا ——— شاعر فرطِ مسرت سے اُچھل پڑا فوراً اُٹھ کر بتی روشن کی۔ مصرعہ کو غزل میں شامل کیا۔ تمام غزل کو دوبارہ سہ بارہ پڑھا، چند معمولی نقائص تھے ان کو رفع کیا اور پھر غزل کو احتیاط سے تکیہ کے نیچے رکھ کر اطمینان کی نیند سو گیا۔

کافی دن چڑھے شاعر سو کر اٹھا، نہا دھو کر کپڑے بدلے، بچوں سے پیار کی باتیں کیں، خوب سیر ہو کر کھانا کھایا اور پھر شیروانی زیب تن کر کے مجسم انتظار بن کر بیٹھ گیا کہ کب چار بجیں اور اسے اپنا فکری شاہکار پیش کرنے کا موقعہ ملے۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے! یہ ایک مصرعہ اور اس کی کارفرمائیاں! ایسے کتنے مصرعے ہم ہر روز پڑھتے ہیں اور بس پڑھتے ہی چلے جاتے ہیں ایک سانس میں ایک غزل ختم کر ڈالتے ہیں، بیک وقت بے شمار نظمیں پڑھ لیتے ہیں اور وقتی طور پہ دماغی حظ اٹھانے کے بعد پھر انہیں بیکار سمجھ کر کتابوں کے ڈھیر میں پھینک چھوڑتے ہیں، ہماری میزوں کے نیچے رسائل کا ڈھیر لگا رہتا ہے جن میں ان گنت شعر اور لاتعداد مصرعے ہماری بے توجہی کا گلہ کرتے رہتے ہیں۔

ہم کبھی بھی اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ ایک ایک مصرعے پر شاعر نے کس طرح اپنے جگر کا خون کیا ہے اور ایک خیالی تخلیق کتنی بے چینیوں، شب بیداریوں اور مسلسل جگر کاویوں کی رہینِ منت ہے۔ یہ مصرعے نہیں شاعر کے دل کے ٹکڑے ہیں۔ شعر کو محض ذہنی تفریح سمجھنے والو! ان ٹکڑوں کی قدر کرو، ان کی عظمت کو پہچانو! یہ ٹکڑے کسی وارفتہ مزاج عاشق کے دل کے ٹکڑے نہیں بلکہ ایک رازدانِ فطرت کے دل کے ٹکڑے ہیں۔ بیشمار نظمیں بیک وقت ختم کرنے والو! غور کرو، فکر سے کام لو کہ ایک مصرعہ پر غور کرنے سے جو حظ حاصل ہوتا ہے وہ بے شمار نظموں کو فر فر پڑھنے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ نظموں کو جس طرح چاہو پڑھو۔ لیکن ایک مصرعہ سے دوسرے مصرعہ پر غور کئے بغیر مت جاؤ کہ ایک مصرعہ اپنی تخلیق اور اہمیت کی بنا پہ ہماری گہری توجہ کا مستحق ہے۔

موج و حباب

سید مظفر ضیاء

تیرہ و تار فضاؤں میں ہر اک سمت جمود ہر طرف تیرگیٔ شب کی فسوں کاری ہے
ایک بے نام سی حالت کا تسلط ہے یہاں ایک افسردگیٔ صبر شکن طاری ہے
ہاں مگر سازِ خموشی کے انہی تاروں پر چھیڑ دیتا ہے کوئی نغمۂ گم کردہ کی ترنگ
وہی نغمہ جو مداوائے غمِ انساں ہے جس سے بیدار ہوئی زندۂ جاوید اُمنگ
کوئی موہوم سی امید مجسم ہو کر لے کے آئی ہے توجہ سے برِ شایاں صبح
جیسے بے نور خلاؤں میں کرن پھوٹ پڑے جیسے تاریک فضاؤں میں جلے کوئی چراغ

●

شریف احسن ★

کھلیں گے پھول معطر روش روش ہو گی یہ اجتناب بہاروں سے کس لئے آخر
بہار آ کے رہے گی، بہار آنے دو یہ اضطراب بہاروں سے کس لئے آخر
انہیں یہ ضد کہ مسلط رہے چمن پہ خزاں مجھے یہ ضد کہ بہاروں کو لا کے چھوڑوں گا
انہیں یہ ضد ہے کہ قائم رہے تسلطِ بوم مرا یہ عزم، ہزاروں کو لا کے چھوڑوں گا
یہ قید و بند، یہ دار و رسن، یہ زنجیریں سمندِ عزمِ مسلماں کو روک دیں کیوں کر
یہ آندھیاں، یہ اندھیرے، یہ ظلمتوں کے ہجوم طلوعِ مہرِ درخشاں کو روک دیں کیوں کر
عجیب سادہ دلی ہے کہ چند تنکوں کو حضور لائے ہیں طوفاں کو روکنے کے لئے
چلے ہیں لے کے وہ تاریکیٔ شبِ زنداں فروغِ آتشِ ایماں کو روکنے کے لئے

کھلیں گے پھول معطر روش روش ہو گی
کلی کلی پہ چمن کی نکھار آنے دو
یہ اضطراب بہاروں سے کس لئے آخر
بہار آ کے رہے گی، بہار آنے دو

محمد نیاز

دلکشا صحرا ہے اور صحرا میں لالے ہیں ابھی
میکشو! ہر گام پر رنگین پیالے ہیں ابھی

زلفِ سنبل کی قسم، سرو و صنوبر کی قسم
حسنِ فطرت کے وہی جلوے نرالے ہیں ابھی

شب کی تاریکی میں پا سکتے ہیں رہرو کے دوست
چاند تارے، چاند تاروں میں اجالے ہیں ابھی

من کے لاوے میں پگھلنے کو ہے آہن کا جگر
غم نہیں گر دو گھڑی ہونٹوں پہ تالے ہیں ابھی

اہلِ دل، مردانِ حق، جنگ آزما، خارا شگاف
خوب جیوٹ ہیں ابھی، بھید جیالے ہیں ابھی

جگمگانے ہی کو ہر سو ہیں تبسم کے چراغ
گو ہنسی کے ساتھ ہی دلدوز نالے ہیں ابھی

اے زمین و آسماں والے! جہاں میں ہوں وہاں
حق کو حق، ناحق کو ناحق کہنے والے ہیں ابھی

حسنِ فطرت کے طلب گاروں سے یہ کہہ دو نیازؔ
اس فضا میں چند آہو بھولے بھالے ہیں ابھی

●

ابوالبیان حماد

زمانے کو پیامِ حق سُنانے کی ضرورت ہے
خدا کے دین کی جانب بُلانے کی ضرورت ہے

جہاں میں انقلابِ خیر لانے کی ضرورت ہے
نئی دُنیا، نیا آئین بنانے کی ضرورت ہے

خدا کے سامنے پھر سر جھکانے کی ضرورت ہے
وہ ہے روٹھا ہوا اس کو منانے کی ضرورت ہے

نظامِ دینِ حق قائم اگر دنیا میں کرنا ہو
نظامِ کفر و باطل کو مٹانے کی ضرورت ہے

قدم پیچھے ہٹانا ارتداد و کفر ہے گویا
رہِ حق میں قدم آگے بڑھانے کی ضرورت ہے

جنہیں نیند آگئی ہے، نیند گہری نیند، موت ایسی
اُنہیں پھر خوابِ غفلت سے جگانے کی ضرورت ہے

رہِ ایماں میں وقت و رخت کا تو ذکر ہی کیا ہے
یہاں خود نقدِ جاں تک بھی لٹانے کی ضرورت ہے

ضرورت ہے گذر کرنے کی پھر تیغوں کی چھاؤں میں
ہجومِ خوف میں بھی مسکرانے کی ضرورت ہے

کہیں یہ لُٹ نہ جائے رہزنوں کی چیرہ دستی سے
متاعِ دین و ایماں کو بچانے کی ضرورت ہے

جہانِ آرزو اُجڑا ہوا ہے ایک مُدّت سے
تمناؤں سے پھر اِس کو بسانے کی ضرورت ہے

اگر رستے میں آئیں آتش و خوں کے سمندر بھی
تو اُن کو بے تحاشا پھاند جانے کی ضرورت ہے

بہار آکر رہے گی گلشنِ دین و شریعت میں
مگر پہلے لہو اپنا بہانے کی ضرورت ہے

چلے آئیں گے پروانے، جلے جائینگے پروانے
یقین و عشق کی مشعل جلانے کی ضرورت ہے

بھلا دیکھیں تو آخر کون اِس سے دور رہتا ہے ذرا محفل قرینے سے سجانے کی ضرورت ہے
اگر منظور ہے روزِ قیامت سرخرو ہونا تو پھر خونِ شہادت میں نہانے کی ضرورت ہے
ضرورت ملتِ بیضا کو ہے شیرازہ بندی کی پُرانے تفرقے سب بھول جانے کی ضرورت ہے
ضرورت ہے طلسمِ سامری کو توڑ دینے کی فقط اللہ سے اب لَو لگانے کی ضرورت ہے
پرستارانِ حق پھر سے کفن بر دوش ہو جائیں خُدا کی راہ میں پھر سر کٹانے کی ضرورت ہے
ہوا ہو جو مرتّب سرفروشی جاں سپاری سے
زمانے کو کسی ایسے فسانے کی ضرورت ہے

●

عزیز حمیدی

حیف صد حیف کہ اب ذہن پہ فنکاروں کے میرے جذبات و خیالات و زبان و دل پر
شامِ ہجراں کی حکایات نے قابو پایا ہاں! ازل کی اُسی اک بات نے قابو پایا
چند اشکوں سے بھلا دل کی جلن بجھتی ہے؟ خندۂ گل پہ گلستاں کی تمناؤں پر
کبھی دوزخ پہ بھی برسات نے قابو پایا؟ دستِ گلچیں کی عنایات نے قابو پایا
چار تنکوں کے حسیں خواب کی تعبیروں پر مکرِ فرعون پہ شدّاد کی سب چالوں پر
برقِ سوزاں کی عنایات نے قابو پایا پسِ پردہ ہی کسی ہات نے قابو پایا

●

نعیم صدیقی

چرخ پر گرچہ وہ انجم بھی چمکتے ہی رہے پر ترے عشق کے راہی تو بھٹکتے ہی رہے!
جورِ گلچیں پہ بھی غنچوں سے چٹکنا نہ چھٹا کانٹے چبھتے رہے پر پھول مہکتے ہی رہے
اپنے ادس تبسم کی تو چھٹرکی لیکن چند انگارے سے پہلو میں دہکتے ہی رہے
اِس چہکنے نے قفس ہم کو دکھایا آخر پر قفس میں بھی پڑے ہم تو چہکتے ہی رہے
رند پیتے بھی رہے تو بہ بھی ہوتی ہی رہی توبہ ہوتی رہی اور جام کھنکتے ہی رہے!
بات جو لوگوں کے کہنے کی تھی اب تک نہ کُھلی روز منصور تو سولی پہ لٹکتے ہی رہے!
آنچل اِس طرح وہ سرکاتے ہیں جیسے سہواً اُن کا پردہ بھی رہا جلوے جھلکتے ہی رہے

●

★ نعیم صدیقی

اوپر نئی کرنوں کی، شعاعوں کی تگ و دَو — نیچے نئی فکروں، نئے جذبوں کی رَوا رَو
کن ذرّوں میں خوابیدہ ہیں کل کے مہ و خورشید؟ — کس خاک پہ پڑتا ہے ترے حُسن کا پرتَو؟
یاں سیزدہ صد سال کا ہے بادۂ کُہنہ — ساقی نئے انداز کا اور جام و خُم نَو
وادی بڑی پیچیدہ سہی، تیرہ سہی رات — کیا فکر مرے داغ ابھی دیتے ہیں کچھ لَو
وہ آج ہوئے عشق کے مانے ہوئے قبلے — جس جس بھی درو بام پہ برسا ترا پرتَو
تم ساری متاعِ دل و جاں دیتے ہو جس پر — اُس جنسِ ہوس کی نہیں قیمت دو کفِ جَو
اشکوں کی برستی ہوئی شبنم کو مبارک — اُس لب کے افق سے وہ تبسم کی پھٹی پَو
یہ کس نے فغاں کی تھی؟ اذاں کس نے پکاری؟ — ہستی کے تنِ مُردہ میں پھر دوڑ گئی رَو
گو ساحرِ دانش نے اٹھائے ہیں بگولے — پُر عشق کی آیات کی دھندلا نہ سکی ضَو!

●

★ نعیم صدیقی

جو دل بھر آنے پر آنسو اُمڈ کے آنے لگے
تو اپنے زخم ہی اپنی ہنسی اڑانے لگے

یہ کیا کہ جب بھی نئی کوئی چوٹ کھائی ہے!
تو بیتے دکھ بھی ہمیں سارے یاد آنے لگے

بس ایک آہوئے رم خوردہ تھا جو بچ نکلا
وگرنہ تیر ہمارے بھی کچھ نشانے لگے!

یہ دل انہی کی عطا تھی، یہ جاں انہی کا کرم!
انہی پہ دونو نچھاور ہوئے! ٹھکانے لگے!

سماں تو دیکھیئے کچھ، دونوں وقت ملتے ہیں
یہ کیسے وقت میں واللہ! آپ جانے لگے

اب اس دلیل کا بھی کوئی توڑ ممکن ہے؟
کوئی نہ بات جو بن آئی، مسکرانے لگے!

نعیم صدیقی

تیرے جمال سے جو ہٹی وہ نظر حرام — جو لمحہ تیرے غم سے بچا، ہر لمحہ حرام!

میری جگہ نہیں ہے یہ میخانۂ تضاد — مے پیتے بھی ہیں، کہتے بھی ہیں سب کہ ہے حرام

لبیک چاہتے ہیں یہاں ہر پکار پر — ہے شرعِ عاشقی میں اگر اور مگر حرام

جلووں کے اس ہجوم میں لازم ہے احتیاط — سہوِ نظر معاف ہے، قصدِ نظر حرام

میں اس شراب و نغمہ کی دُنیا کو کیا کروں؟ — تیرے بغیر عیش ہے اس جان پر حرام

نازک سی اک لکیر ہے اُن کی نگاہِ راز — اِسکے اِدھر جوازِ تماشا، اُدھر حرام

پائے گا چین دہر میں کس طرح وہ بدنصیب — جس کی فغاں پہ آپ کریں خود اثر حرام

جو رہبرِ حیات ہے بس وہ ہنر حلال — جو رہزنِ حیات ہو، ایسا ہنر حرام

بقیہ جیلانی کا افسانہ

دوم اہلِ نقد و نظر کو "اختلافِ رائے" کے معاملے میں ایک دوسرے کو پورا الاؤنس دینا چاہئے۔ مثلاً یہ کوئی ضروری نہیں کہ میں جس نگارش کو عظیم سمجھوں، دوسرے بھی اسے عظیم ہی قرار دیں، اسی طرح یہ بھی لازم نہیں کہ دوسرے جس چیز کو خس و خاشاک کا درجہ دیتے ہوں اسے میں بھی کسی وقعت کا مستحق نہ سمجھوں۔ ایک شخص اظہارِ رائے کرتا ہے، آپ کا جی چاہے تو آپ مانیں اور جی نہ چاہے تو نہ مانیں۔ یہاں کوئی سیفٹی ایکٹ تو نافذ نہیں ہے۔ اس سے زائد اگر کچھ کرنا ضروری ہو تو آپ اپنی رائے بھی پورے زور سے پیش کر دیں۔ اس میں نہ کوئی گناہ ہے، نہ ادب کے لئے کوئی خطرہ! لیکن جب اظہارِ رائے یا اختلاف کے ساتھ کچھ غیر متعلق چیزیں ترکیب پا جائیں گی تو ذہنی فضا مکدر ہو جائے گی۔ پھر ایک مکدر فضا میں جو بھی آنکھیں کھولے گا اور سانس لے گا اسے تکلیف محسوس ہوگی — خود فضا کو مکدر کرنے والے کو بھی تکلیف پہنچے گی۔ پس اختلافِ رائے کا پورا پورا مظاہرہ کیجئے، مگر فضا کو صاف رکھنے کی فکر بھی رکھیئے۔

سوم - میں یہ تصریح بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ جیلانی کے افسانے کو عظیم قرار دینے سے میرا منشا کسی دوسرے کو غیر عظیم قرار دینا نہیں تھا کم از کم عالمِ واقعہ میں ایسے سوئے ظن کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ اگر کسی نے اس طرح کا تاثر لیا ہو تو اس میں قصور میرا نہیں ہے۔ میں نے یہ ادائے فرض محض اس لئے کیا تھا کہ میں خود پست نہ ہو جاؤں۔

چہارم - یہ مقالہ میں نے جن حالات میں لکھا تھا، ان کے بدل جانے سے میری پوزیشن بدل گئی ہے۔ اب خود مجھے پسند نہیں ہے کہ اس کا روئے سخن کسی خاص طرف محسوس کیا جائے۔ پہلی قسط تو جیسی تھی، شائع ہو چکی۔ دوسری قسط بھی اگرچہ پہلے کی کتابت شدہ پڑی ہے، لیکن اس کے اندر میں نے ممکن حد تک ترمیمات کر دی ہیں۔ انشاء اللہ جب یہ مقالہ کسی مستقل صورت میں دوبارہ شائع ہوگا تو اس کو پوری طرح بدل دیا جائے گا۔ یہ وضاحت اس لئے کی جا رہی ہے کہ کوئی صاحب اس سے ناخوشگوار تاثر نہ لیں، اور لیں تو معاف فرماویں۔

پنجم - اس افسانے پر جو بحثیں ہوتی رہی ہیں، ان کو پڑھ کر ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ خود تنقید کے موضوع پر سنجیدگی کے کچھ لکھا جانا چاہئے۔ موجودہ فضا کو اس کے لئے موزوں نہ پا کر میں نے یہ کام مؤخر کر دیا ہے۔ ممکن ہے مئی یا جون میں کوئی چیز پیش کی جا سکے۔

موادِ مطالعہ

اسلامک لٹریچر (خاص نمبر)

● زیر نگرانی جناب شیخ محمد اشرف صاحب کشمیری بازار' لاہور ● فی کاپی عہ ●

عرصہ سے یہ انگریزی ماہنامہ ہمارے زیرِ مطالعہ ہے۔ اس وقت اس کی اشاعتِ خاص زیرِ تبصرہ ہے جو "ہمارا زوال اور اسکے اسباب" کے موضوع سے تعلق رکھنے والے دو علمی مقالات پر مشتمل ہے۔ ایک مقالہ حاجی ڈاکٹر عبدالکریم جرمانس (ہنگری) کے قلم سے ہے' اور دوسرا "فرشتہ جبریل" نامی ایک خاتون کا نتیجۂ فکر!

موضوع بڑا ہی اہم ہے اور اسلامیات سے دلچسپی رکھنے والا ہر شخص اس کی طرف فوراً متوجہ ہو جاتا ہے۔ یہ پوری کی پوری مسلمان امت کے دل کا ایک ایسا سوال ہے کہ یہ ایک ایک شخص سامنے ہے۔ اس موضوع پر بہت سے لکھنے والوں نے لکھا ہے اور ابھی تک بہت کچھ لکھنے کی گنجائش باقی ہے۔ اسلامک لٹریچر کے پیش کردہ مقالات میں سے حاجی صاحب کا مقالہ وسعت معلومات کا مظہر ہے' لیکن حاجی صاحب کے مقابلے میں" فرشتۂ جبریل" صاحبہ اپنے بعض نکات کو بیان کرتے ہوئے حقیقت کے زیادہ قریب سے ہو کر نکلی ہیں موصوفہ کی نگاہ میں زوال کے اسباب حسب ذیل ہیں :-

۱۔ عربوں نے جب دوسرے ممالک کو فتح کیا تو جا بجا' خارجی عقائد' عادات واطوار اور رسوم' اسلام کے سیاسی و سماجی نظام میں گھسنے لگ گئے۔

۲۔ فتح مکہ کے بعد بیشتر لوگ مصلحتہً اور مجبوراً ایمان لائے' لیکن ان کی ذہنیت وسیرت اسلام کے سانچے میں نہ ڈھل سکی۔

۳۔ نومسلموں کو اسلام کی تعلیم دینے کے جو انتظامات کئے گئے وُہ ناکافی تھے' کیونکہ داخلہ بڑی تیزی سے ہو رہا تھا۔

۴۔ غلامی' زنا' تعددِ ازدواج اور موروثی حکومت وغیرہ غیر اسلامی امور پھر سے مسلمانوں میں آ کر جڑ پکڑ گئے۔

۵۔ بُت پرستی کے ذوق کا احیاء جس نے اب پیر پرستی اور قبر پرستی کی شکل اختیار کر لی تھی۔

۶۔ احادیثِ نبوی میں جھوٹی روایات کی آمیزش اس حد تک کر دی گئی کہ صحیح احادیث کو نکھارنا ناممکن ہو گیا۔ اندریں حالات قانون جس کی بنیاد احادیث پر تھی' صحیح تعلیمات سے منحرف ہو گیا۔

۷۔ نو افلاطونیت تصوف کے پردے میں مسلم سماج میں سرایت کر گئی' چنانچہ مسلمان ایک منفی اور مایوسانہ نقطۂ نظر کے خوگر ہو گئے۔

۸۔ نسخ و منسوخ کا ایک غلط تصور پھیل گیا۔

۹۔ اسلامی تعلیمات کے برعکس مسلمانوں نے عورت کو سوسائٹی میں مساویانہ درجہ دینے کے بجائے پالتو جانوروں کی سطح پر گرا دیا۔

حاجی عبدالکریم صاحب نے حسب ذیل وجوہ پیش کئے ہیں :-

۱۔ مسلمانوں کا اپنی عقلیت پر انحصار کرنے کے بجائے اپنے متقدمین کی اندھی تقلید کرنا۔

۲۔ سول سروس کے لئے ایک باقاعدہ کلاس تیار کرنے سے تغافل اور نظامِ اجتماعی کا محض شخصیتوں کے بل پر چلنا ـــــ

بننا اور بگڑنا!

۳۔ عورتوں کا پستی میں رکھا جانا اور ان کے ذریعے نئی نسلوں کی ناقص ترتیت۔

۴۔ علمیات کے میدان میں تشکک سے مسلمانوں کا اجتناب کرنا۔

۵۔ سیاسی و اقتصادی میدانوں میں غیر مسلموں کے ساتھ مساویانہ اشتراک پیدا کرنے میں مسلمانوں کی نا اہلیت۔

۶۔ فنون و حکمت کے بجائے مسلمانوں کا اپنی دماغی قوتوں کو تمام تر مذہبیت کے دائرے میں محدود رکھنا۔

۷۔ عام سماجی اخلاق کا زوال ——— یعنی ایک مسلمان کا نماز روزہ کی پابندی کے ساتھ حرام سے بچنے کے بعد مطمئن ہو جانا کہ بس اب اس نے فرض ادا کر دیا' اور بے باکی سے فریب' جھوٹ' بے انصافی اور کمزور سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں مبتلا رہنا۔

۸۔ تصوف کا اس کے پر اسرار نظریات کے ساتھ رو بکار آجانا۔

قطع نظر اس سے کہ ہر دو مقالہ نگاروں نے جہاں اپنی علمیت کا ثبوت دیا ہے' وہاں بعض نکاتِ بحث ایسے چھیڑے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کو سمجھنے میں ان کا مطالعہ کوتاہ رہا ہے اور مغرب کے مادّی تمدن کی چمک دمک سے مرعوب ہو کر انہوں نے اپنے نظریۂ اسلام کو ایک خاص شکل دی ہے' ان کی اصل کوتاہی یہ ہے کہ متعدد مظاہرِ زوال کو انہوں نے اسبابِ زوال کی فہرست میں درج کر دیا ہے۔ چنانچہ مسئلہ اس خاص اشاعت کے سامنے آنے کے بعد بھی واضح نہیں ہو سکا کہ ہمارے زوال و انحطاط کی اصل مرکزی علّت کیا تھی!

کسی بھی ہیئت اجتماعی کے زوال کی علّت تلاش کرنے نکلئے تو پہلے یہ بات طے ہونی چاہیے کہ اُس ہیئت کی نوعیت کیا ہے اور پھر یہ سوچا جانا چاہیے کہ اس خاص نوعیت کی ہیئت کا زوال کی زد میں آنا کس واحد تاریخی ضابطے کے تحت ہوتا ہے مسلمان نہ تو ایک مذہبی ٹولی بنا کر کھڑے کئے گئے تھے اور نہ ایک جغرافی و نسلی قوم کی حیثیت سے رونما ہوئے تھے۔ مسلمان ایک جماعت ( ) تھے۔ اور جماعت یا پارٹی کی روح و رواں جو ساری ترقیوں کی محرک ہوتی ہے وہ اس کی آئیڈیالوجی اور ایک انقلابی نصب العین پر مشتمل ہوتی ہے جا بجا پارٹیوں میں جب کبھی زوال آتا تو ہمیشہ آئیڈیالوجی کے شعور اور نصب العین کی وابستگی کے کمزور پڑ جانے سے آتا ہے یہ ایک اٹل تاریخی قانون ہے کہ پارٹیاں آئیڈیالوجی کے زور سے پروان چڑھتی ہیں اور آئیڈیالوجی کے سرد پڑ جانے پر زوال پذیر ہوتی ہیں۔ پھر جب زوال شروع ہوتا ہے تو فساد پورے نظامِ حیات میں رونما ہوتا ہے' سیاسی تنظیم میں' معاشی سرگرمیوں میں' علوم و فنون کے اکتساب میں' صنعت کاری میں' عورت اور مرد کے تعلقات میں' مذہبی عقائد و عبادات میں' اخلاق اور معاملات میں' غرضیکہ ہر ہر گوشۂ زندگی میں زوال کسی خاص شکل میں سر اٹھاتا ہے۔ لیکن اس کے پیچھے اصل علت آئیڈیالوجی کے شعور کا اختلال ہوتا ہے۔ جب بھی آئیڈیالوجی کے شعور کا احیاء کیا جائیگا تو پارٹی از سرِ نو زندگی یا کر ترقی کی راہ پر گامزن ہو جائے گی۔ مسلمان جب اپنے نظریۂ حیات اور اپنے نصب العین کے شعور میں کمزور ہونے لگے تو آہستہ آہستہ ان کی ہیئتِ اجتماعی نے پارٹی کے بجائے قوم کی شکل اختیار کر لی اور پھر زوال نے ہر گوشے سے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ افسوس ہے کہ یہ موٹی سی حقیقت ہمارے مقالہ نگاروں اور اسبابِ زوال امت کی تحقیق کرنے والے ذہین لوگوں کی نگاہوں سے اب تک اوجھل ہے۔ اور اسلامک لٹریچر کی اشاعت خاص بھی اسے نمایاں نہ کر سکی۔

ان مقالات کو پڑھتے ہوئے ایک تبصرہ نگار کے دل میں یہ سوال پیدا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ خود اسلامک لٹریچر کے اپنے نظریات اس بارے میں کیا ہیں۔ چنانچہ اداریئے کو خاص توجہ سے ہم نے پڑھا ہے۔ اسلامک لٹریچر مقالات کا تجزیہ کرنے کے بعد دو نکات کو اصل وجوہِ زوال کی حیثیت سے چھانٹ کر ہمارے سامنے رکھتا ہے:۔

۱۔ اصحابِ نبی اور ائمہ و صلحاء متقدمین پر اندھا اعتقاد۔

۲۔ خواتین کی زیردستی جو حقیقی زندگی کے عملی تجربات سے ان کے بے بہرہ ہونے کا موجب ہوئی۔

پہلے نکتہ کے سلسلے میں ارشاد ہوتا ہے کہ اس چیز نے مسلمانوں کے اندر تفکر و تنقید کے قوائے کو مضمحل کر دیا اور وہ اس حقیقت سے بے خبر ہو گئے کہ کسی بڑے آدمی نے جو کچھ کہا یا کیا تھا وہ اس کے اپنے زمانے اور حالات میں تو صحیح تھا' لیکن تمام صداقتیں اپنے ہی وقت میں اضافی قدر رکھتی ہیں اور ضروری نہیں کہ وہ بدلے ہوئے حالات پر بھی منطبق ہو سکیں۔ لیکن مسلمانوں کا حال یہ ہو گیا کہ جہاں کسی نے نبی صلعم کی کسی روایت کو یا کسی صحابی یا امام کی رائے کو بیان کر دیا' بس اس پر بحث کی گنجائش نہیں رہتی۔

دوسرے نکتے کے تحت ارشاد ہوتا ہے کہ اسلام کا مطالبہ تو بس اتنا ہی تھا کہ مرد و عورت میل جول میں لباس' طور طریقوں اور گفتگو میں شرافت کے پسند اصولوں کو ملحوظ رکھیں تاکہ صنفی اشتعال کی کیفیت پیدا نہ ہو' لیکن مسلمان اس حد سے آگے نکل گئے اور عورتوں کو گھروں کی چار دیواریوں میں بند کر دیا ——— حالانکہ یہ تو اُن عورتوں کے لئے ایک سزا تجویز کی گئی تھی جن کی عصمت مشتبہ ہو گئی ہو ——— آج جبکہ مغربی خواتین زندگی کی سرگرمیوں اور قومی ترقیوں میں "اپنا پورا حصہ" ادا کر رہی ہیں' ہماری عورتیں کھانا پکانے سے زیادہ کچھ نہیں جانتیں۔

یہ باتیں کرتے کرتے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ جو لوگ اس صورتِ حالات کے خلاف آواز اُٹھانے والے ہیں وہ بھی حد سے گزر گئے اور یہ حقیقت نظرانداز کر گئے ہیں کہ خواتین کی اصل ذمہ داری کا دائرہ گھر ہے۔

ملاحظہ فرمایئے کہ ایک طرف قومی ترقی میں پورا حصہ ادا کرنے والی عورتوں کو رشک سے دیکھا اور دکھایا جا رہا ہے' دوسری طرف بتایا جاتا ہے کہ عورت کی اصل ذمہ داریوں کا دائرہ گھر ہے۔ جو عورتیں قومی ترقیوں میں پورا حصہ ادا کرتی ہیں وہ گھر کی ذمہ داریاں کبھی بھی ادا نہیں کر سکتیں اور جو گھر کی ذمہ داریوں کی انجام دہی کرتی ہیں وہ قومی ترقیوں میں پورا حصہ ادا نہیں کر سکتیں۔

ہم یہ بات صاف صاف کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اداریہ لکھنے والا ذہن ایک صاف ذہن نہیں ہے' وہ کبھی ایک طرف لپکتا ہے اور کبھی دوسری طرف میلان دکھاتا ہے اور اس طرح کی تحریریں ہمیشہ عوام الناس کے خیالات کو پریشان کرنے کا موجب ہوتی ہیں۔

یہاں پہنچ کر اسلامک لٹریچر کے بارے میں بہ حیثیت مجموعی یہ سوال خود بخود ہمارے سامنے پیدا ہو جاتا ہے کہ اس جریدے کا مقصد وجود کیا ہے؟ اسلامیات پر بے شمار معلومات افزا مضامین اور اداریئے اس میں شائع ہو چکے ہیں' مگر ان سب کے پیچھے اصل نظریۂ و اصول کونسا ہے؟ ہماری رائے یہ ہے کہ یہ جریدہ ہر قسم کے نظریات کے تحت لکھی ہوئی چیزیں شائع کرتا اور یہ کوئی خاص اسکول آف تھاٹ نہیں ہے۔ اگر ہماری یہ رائے صحیح ہو تو پھر یہ بات بھی ہمیں کہنی ہی پڑے گی کہ ایسے جرائد کی اشاعت بظاہر جتنی مفید نظر آتی ہے نتیجۃً اتنی ہی مضر بلکہ مہلک ہے۔ ایسے جرائد کا مطالعہ ہمارے نوجوانوں کو دین کے بارے میں طرح طرح کی پریشان خیالیوں میں مبتلا کر دینے والا ہے۔

ہمارے ہاں جس طرح ایسے پبلشروں کا وجود بڑا ہی خطرناک ہے جو محض بکری کے لئے کتابیں[1] شائع کرتے ہیں اور کوئی حقیقی اور ٹھوس اجتماعی مقصد اپنے سامنے نہیں رکھتے' بالکل اسی طرح ایسے جرائد کی اشاعت اور ان کا فروغ خطرناک ہے جو طرح طرح کی بحثیں محض اس لئے چھیڑتے ہیں اور گوناں گوں خیالات دسترخوان پر سجا کر اس لئے لاتے ہیں کہ اس طرح قارئین کی دلچسپی کو وہ جذب کر سکیں گے اور خریداروں کا حلقہ بڑھائیں گے ——— لیکن کوئی تعمیری نصب العین ان کے پیش نظر نہیں ہوتا اور کوئی

---

[1] یہ حضرات ایک طرف قرآن شائع کریں گے تو اسکے ساتھ ہی دوسری طرف "دو قرآن" بھی پیش کر دیں گے' ادھر حدیث کی کتابیں چھاپیں گے اُدھر انکارِ حدیث پر لٹریچر مہیا کریں گے اور ان کے ہاں اقبال اور اختر شیرانی ایک ہی ترازو تل جاتے ہیں!

مرکزی نظریۂ ایسا نہیں ہوتا جس کے وہ علمبردار ہوں۔ علم و ادب کی دُنیا میں یہ گویا "جنرل مرچنٹس" ہوتے ہیں اور کوشش ان کی یہ ہوتی ہے کہ گاہک کی ضرورت کی ہر چیز ان کے ہاں موجود ہو اور ہر قسم کے ذوق کی تسکین کا سامان وہ کر سکیں۔ ہم اس طرح کے ذہنی و فکری بساط خانوں کے خلاف اظہارِ رائے کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

مگر اس اظہارِ رائے کے پیچھے نہ تو دل کا بخار نکالنے کا جذبہ ہے نہ بدخواہی کا! ہم یہ کڑی تنقید اس لئے کر رہے ہیں کہ ہمارے ادبی و صحافی بھائی اپنا فرض پہچانیں اور اپنی ملّت کی مفید خدمات سرانجام دیں۔

قادیانی مسئلہ

● از قلم مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ● شائع کردہ: مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی (پاکستان) اچھرہ لاہور ● قیمت ۴/۳

یہ ایک مختصر سا پمفلٹ عین اُس زمانے میں شائع ہوا ہے جبکہ پنجاب قادیانیوں کو اقلیت قرار دلوانے کی جدوجہد شروع کر کے آتش فشاں بن چکا تھا۔ ۵ مارچ سے ۲۰ مارچ تک اس کے ستّار ایڈیشن تعدادی ۱۴ ہزار شائع ہو چکے ہیں اور ابھی اشاعت و نکاسی کا سلسلہ پوری رفتار سے جاری ہے۔ انگریزی، بنگلہ اور سندھی میں اس کے تراجم بھی ہو رہے ہیں اور عنقریب یہ مختلف زبانوں میں حاصل ہو سکے گا۔

اب ہم بتاتے ہیں کہ اس مختصر سے پمفلٹ کی اصل اہمیت کیا ہے!

قادیانی گروہ کے خلاف عوام میں ایک شدید جذباتی تحریک تو پھیل گئی ہے کیونکہ یہ گروہ نہایت خطرناک سماجی، سیاسی اور اقتصادی مسائل پیدا کرنے کا موجب بنا ہے۔ لیکن اس تحریک کی استدلالی بنیاد کمزور رہی اور ہمارے جوشیلے مقررین نے اس کے استحکام کی فکر کئے بغیر چھلانگ دی۔ کسی بھی حرکت سے پہلے اس امر کا اہتمام ناگزیر ہوتا ہے کہ تعلیم یافتہ طبقے کو اس کی اہمیت کے بارے میں دلائل سے مطمئن کر دیا جائے۔ تعلیم یافتہ طبقے سے بے نیاز ہو کر محض عوام کے ناخواندہ طبقے کے بل پر عشق کا بے خطر کود پڑنا کبھی بھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ عشق کی اس کوتاہی پر کم از کم مولانا مودودی کی عقل محوِ تماشائے لبِ بام نہ رہ سکی، بلکہ اُس نے وہ کوتاہی پوری کر دی۔

اس پمفلٹ میں پہلی مرتبہ مسلم قادیانی مسئلے کو ایک مناظرے اور ایک جذباتی مسئلے کی حیثیت سے پیش کرنے کے بجائے باقاعدہ ایک کیس کی طرح مرتب کر کے پیش کیا گیا ہے۔ نیز احراری خطابت کے بجائے اسے علمی و سائنٹفک زبان و استدلال کے ساتھ تعلیم یافتہ طبقے کے سامنے رکھا گیا ہے۔ چنانچہ پہلی مرتبہ لکھے پڑھے لوگوں کو معلوم ہوا ہے کہ یہ مسئلہ ایک فرقہ وارانہ مناظرہ بازی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ ایک سیاسی فتنہ اور ایک سوشل پرابلم ہے

آج جبکہ پنجاب اس مسئلے کی وجہ سے ایک آزمائش میں مبتلا ہے، آج جبکہ یہاں کی زندگی پر پولیس کی لاٹھیاں اور گولیاں اور دفعہ ۱۴۴، اور فوج کا مارشل لاء راج کر رہا ہے، آج جبکہ جذبۂ انتقام کے تحت قادیانی حضرات جس مسلمان کو چاہتے ہیں پکڑوا رہے ہیں اور صاف صاف لفظوں میں اکڑ اکڑ کر دفتروں اور بازاروں میں کہہ رہے ہیں کہ حکومت ہماری ہے اور ہمارے مقابلے میں جو آئے اس کی خیر نہیں ہے، آج جبکہ اس طوفان کی خبروں کا پورا بلیک آؤٹ ہو رہا ہے جو پنجاب کے اضلاع میں برپا ہے، آج جبکہ یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ چند احراریوں کی سازش اور چند غنڈوں کی ہڑبونگ ہے، ملک کے ایک ایک فرد کو چاہیئے کہ وہ مسلم قادیانی مسئلے کو سمجھنے کی کوشش کرے، اور چار آنے کے اس پمفلٹ پر پندرہ بیس منٹ کا وقت ضرور صرف کرے

دی پاک حج ٹرانسپورٹ کمپنی

یہ ایک کاروباری پمفلٹ ہے، مگر اہم! خشکی کے راستے امسال بسوں کا ایک قافلہ حج کمپنی کی طرف سے بھیجا جا رہا ہے۔
اس پمفلٹ کے مطالعہ سے اندازہ ہوا کہ نہایت معقول طریق سے سفر کی پیش بندی کی گئی ہے، پروگرام اس طرح بنایا گیا ہے کہ مسلمان ملکوں کے اہم شہروں سے ہوتے ہوئے اور قابلِ زیارت تاریخی و دینی مقامات کو دیکھتے ہوئے حجاج باطمینان فریضے میں شریک ہوں۔ بسیں خاص طور پر بنوائی گئی ہیں اور ایک بس کو ہم نے خود دیکھا ہے۔ سیٹیں آرام دہ، چھت پر پانی کی ٹینکی موجود، ایرکنڈیشنگ کا پورا انتظام، بیت الخلاء تک شامل، اور پھر قافلے کے ساتھ خوراک کا پورا انتظام، پانی کی ایک مستقل گاڑی اور واٹر پمپ کرنے کی مشین موجود، طبی امداد کا تسلی بخش اہتمام، گاڑیوں کی مرمت کے لئے ورکشاپ، ہر راہ پڑاؤ میں روشنی کرنے کے لئے بجلی گھر زادِ راہ میں شریک، سفر میں حجاج کے مطالعہ کے لئے کتب و جرائد کا ایک ذخیرہ بھی ساتھ، اور کیا چاہئے!
راولپنڈی سے مدینہ منورہ تک کے سفر آمد و رفت میں کل ۳۴ دن صرف ہونے کا اندازہ کیا گیا ہے، لیکن مناسب مقامات کی زیارت اور سیر کے لئے گنجائش رکھ کر ۸۰ دن کا پروگرام تجویز کیا گیا ہے۔ کرایہ اور خوراک سمیت ۲۰۵۰ روپے میں جملہ مقاماتِ مقدسہ کی زیارت اور اس کے ساتھ ساتھ مسلمان ممالک سے رابطے اور معلومات بڑھانے کے مواقع سے استفادہ فی الواقعہ بہت سستا سودا ہوتا ہے۔
کمپنی کے منتظمین سے گفتگو کرنے کا موقع بھی ملا۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ان کا یہ اولین تجربہ کامیاب رہے گا۔
مزید معلومات کمپنی کے دفتر "گنج منڈی، راولپنڈی" سے حاصل کریں۔

اقسام القرآن

● مؤلفہ مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ ● مترجمہ مولینا امین احسن اصلاحی ● شائع کردہ: مکتبہ چراغ راہ، کراچی ● قیمت [illegible] ●
یہ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے اور نظرِ ثانی کے بعد اضافوں کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ فہمِ قرآن کے لئے جن بنیادی مسائل کا سمجھ لینا بالکل ناگزیر ہے، اُن میں سے ایک مسئلہ اُن قَسموں کا مسئلہ ہے۔ جنہیں خود حق تعالےٰ نے اپنے کلامِ پاک کی زینت بنا دیا ہے۔ آخر ان قَسموں کی کلامِ الٰہی میں کیا اہمیت ہے، ان میں قرآن کے مخاطب یا قاری کے لئے کونسا افادہ مضمر ہے اور مختلف مواقع پر ان کا استعمال کس مقصد سے کیا گیا ہے، ان سوالات پر مختلف علماء مفسرین نے پہلے بھی بحثیں کی ہیں، مگر حق یہ ہے کہ علامہ فراہی نے قرآنی قَسموں کی ایک سائنس مرتب کر دی ہے اور اس سائنس کو اردو کا جامہ مولانا اصلاحی نے پہنایا ہے۔
ایسی کتابیں ہیں کہ جو ہمارے نوجوانوں کے مطالعہ میں رہنی چاہئیں۔
کتاب بہترین طباعتی محاسن کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔

اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل

● مولفہ مولانا امین احسن اصلاحی ● شائع کردہ: مکتبہ چراغ راہ، کراچی ● قیمت [illegible]
اس کتاب کا بھی یہ دوسرا ایڈیشن ہے جو نظرِ ثانی اور اضافوں کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ مسلمانوں کے فرقی و گروہی اختلافات کا تجزیہ کر کے جناب

مؤلف نے یہ واضح کیا ہے کہ یہ اختلافات کس طرح رونما ہوئے، کیسے پروان چڑھے اور اسلامی نظام کے قیام کی راہ میں کیوں یہ حائل نہیں ہیں نیز

اس کتاب میں سب سے اہم جو خدمت انجام دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ دورِ صحابہ میں اختلافات جن جائز حدود میں محدود ہو کر فطری طور پر اپنا مفید عمل

کرتے تھے ان کو نمایاں کیا گیا ہے اور بعد میں جن وجوہ سے یہ اختلافات اپنی حدود سے آگے نکل گئے ان کو واضح کرنے کے لئے اختلافات کی تاریخ

کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب میں دو اعتراضات کا جواب علمی حیثیت سے دیا گیا ہے

نظرِ ثانی کے بعد اس میں خاص اضافہ قانونِ اسلامی کی تدوین کا باب ہے۔ فقہ کے اندرونی اختلافات کے ہوتے ہوئے

ایک یہ کہ فقہی اختلافات کے ہوتے ہوئے یہ کیسے ممکن ہوگا کہ کسی ایک فقہ کو رائج کیا جا سکے اور خود ایک عدالتی نظامِ قانون

کوئی یک آہنگ ضابطہ قابلِ عمل بنایا جائے۔ دوسرے یہ کہ قانونِ اسلامی سرے سے مدوّن صورت میں موجود ہی نہیں ہے تو آخر کیسے

اسلامی کے نفاذ کی ذمہ داری انجام دے سکتا ہے۔

طباعتی معیار نہایت اعلیٰ!

حقیقتِ نفاق

● مولفہ مولانا صدر الدین اصلاحی ● شائع کردہ: مکتبۂ جماعت اسلامی (ہند) رام پور ● قیمت ۱۲ؔ

مسلمانوں کی تعداد کو دیکھئے اور پھر ان کا حالِ زار دیکھئے یہ دونوں باتیں اتنی بے جوڑ ہیں کہ ان کو اکٹھا دیکھ کر فوراً سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں

ہے؟ اسی سوال کا ایک قاطع جواب ہے حقیقتِ نفاق!

نفاق، خصوصاً نفاق فی العقیدہ کے بارے میں ایک عام غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ شاید یہ بلا محض دورِ نبوی کے لئے خاص تھی لیکن فی الحقیقت یہ

نفسیاتِ انسانی کا ایک مستقل روگ ہے، اور اسلامی معاشرہ اگر اس روگ کے جراثیم کو اپنے اندر پلنے کا موقع دے دے تو پھر وہ تباہی سے بچ نہیں

سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ قرآن نے نفاق کے ظہور کے ہر موقع پر شدید گرفت کی، منافقین کا گہرا نفسیاتی تجزیہ کیا، ان کی علامات کو ابھار کر دکھا دیا

اور سوسائٹی کو متنبہ اور خبردار کر دیا۔ لیکن جب قرآن سے مسلمانوں کا تعلق منقطع ہوا تو نفاق کی آکاش بیل ان کے شجرۂ زندگی پر خوب پھیلی اور

ان کو اس نے بالکل کھوکھلا کر کے رکھ دیا۔ آج اس کھوکھلے گروہ کو کسی چھنٹائی کے بغیر لے کر جب بھی کوئی کام شروع کیا جاتا ہے ـــــ خصوصاً

کوئی دینی کام ـــــ تو وہ آغاز میں ہی خوابِ پریشاں بن کے رہ جاتا ہے۔

اب جبکہ برعظیم ہندو پاک میں اسلام کے احیاء کی تحریکیں اٹھ رہی ہیں یہ ایک ناگزیر دینی فریضہ ہے کہ مسلمانوں کو ازسرِ نو نفاق کی حقیقت اور

اس کی علامات اور اس کے تباہ کن اثرات سے آگاہ کیا جائے، تاکہ وہ اپنے جوہرِ اخلاق کو تابناک بنانے کے لئے کچھ کر سکیں نیز جو لوگ تجدید

واحیائے دین کی مہم میں حصہ لینے کے لئے آگے بڑھیں وہ نفاق کے شیطانی حملوں کی مدافعت کے لئے چوکنے رہیں۔

اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے مولانا صدر الدین صاحب نے قرآن سے نفاق کی حقیقت اور اس کی علامات اور اس کی اقسام کو اخذ

کر کے جاندار اسلوبِ تحریر کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ہم یہ اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس موضوع پر اردو زبان میں یہ کتاب ایک کارنامہ ہے

اور فاضل مؤلف کی ساری دوسری تحریروں کے مقابلے میں فوقیت رکھتی ہے۔ خوبی یہ کہ اندازِ بیان اس طرح کا ہے کہ موجودہ سوسائٹی کے مختلف

عناصر اپنی صفات کے ساتھ نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں اور احتسابِ نفس کے ساتھ پڑھنے والا ہر قاری اپنی کیفیتِ ایمانی کا صحیح صحیح اندازہ

کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ کتاب کا مقصود تکفیر و تفسیق نہیں بلکہ جذبۂ اصلاح اس کی مرکزی روح ہے۔ اس کا مؤلف کسی کو منافق قرار دینا

نہیں چاہتا بلکہ نفاق کی علامات اور اقسام بتا کر اسے اس سے بچنے کی حس بیدار کرنا چاہتا ہے۔ یہ بھی اچھا ہے کہ آخر میں منافق اور گنہگار کا فرق

بیان کر دیا گیا ہے۔

درست اُردو

● مؤلف پروفیسر عاصی ضیائی رام پوری ● شائع کردہ: مکتبہ فروغِ اُردو بازار کشمیریاں۔ سیالکوٹ ● قیمت ۱۲ر

اُردو زبان جو پاکستان بھر کا واحد ذریعۂ اظہارِ خیال ہے' اس لحاظ سے بڑی مظلوم ہے کہ نہ تو درست اُردو مدرسوں اور کالجوں میں پڑھائی جاتی ہے اور نہ اردو بولنے اور لکھنے والے صحتِ زبان کی زیادہ فکر کرتے ہیں۔ بدقسمتی یہ کہ اُردو کے پرانے مرکز' جو گئے' جن علاقوں میں اہلِ زبان تھے وہ پاکستان سے الگ ہو گئے اور جو اہلِ زبان مہاجرین کر پاکستان کے حصے میں آئے وہ خود سندھ اور پنجاب اور صوبہ سرحد میں اس طرح بکھر گئے ہیں کہ خود ان کا اپنے بچوں کی زبان کو تباہی سے بچا لے جانا ممکن نہیں رہا۔ اور حال یہ ہے کہ اچھے اچھے مقرر' صحافی' ادیب اور شاعر تک زبان کی فاش غلطیاں کرتے ہیں۔ اندریں حالات نہایت ضروری ہے کہ اُردو کے قواعد' محاورات' روزمرے اور تلفظ کے بارے میں اتنا وسیع لٹریچر موجود ہو کہ جس سے ہمارے اساتذہ و طلبا بھی استفادہ کر سکیں اور ہمارے مقررین' صحافی اور ادیب بھی!

بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس ضرورت کا احساس کرتے ہوئے پروفیسر عاصی ضیائی نے ایک مختصر' مگر قابلِ قدر کتاب پیش کی ہے۔ اس میں مختلف پہلوؤں سے صحتِ زبان کے تقاضوں کا شعور دلایا گیا ہے۔ مثلاً بول چال اور تحریر میں جملوں کی ساخت' بعض حروف کے استعمالات' تذکیر و تانیث' ہندی الفاظ کے ساتھ فارسی عطف یا اضافت کے استعمال' روایت' اوقاف' تلفظ وغیرہ کی غلطیوں کو نمایاں کر کے صحیح پہلو پیش کر دیئے گئے ہیں۔

اس کتاب کی افادیت میں مزید اضافے کرنے کی گنجائشیں ہیں اور توقع ہے کہ مؤلف اشاعتِ ثانی کو نقشِ ثانی بنا کر پیش کریں گے۔

اسلامی جمعیتِ طلبہ کا لٹریچر

(۱) ہم اور ہمارا کام' اور ہماری دعوت اور ہمارا طریق کار قیمت ۶ر

(۲) دستور اسلامی جمعیتہ طلبہ پاکستان قیمت ۶ر

(۳) اسلامی نظامِ تعلیم اور پاکستان میں اس کے نفاذ کی عملی تدابیر قیمت ۵ر

یہ مرکزی مکتبہ اسلامی جمعیت طلبہ کا شائع کردہ لٹریچر ہے جس کے مطالعہ سے پاکستان کے طلبا کی اہم ترین فعال تنظیم سے تعارف پیدا کیا جا سکتا ہے۔ ان مختصر رسائل سے اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستان کے مسلمان نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد موجودہ نظامِ تعلیم کے سارے بگاڑ کے باوجود "مغرب زدگی" سے بچ نکلی ہے اور اسلام کو اپنے محبوب نظامِ زندگی کی حیثیت سے نصب العین بنا کر اپنی تعمیر و تنظیم میں پوری سنجیدگی سے مصروف ہے۔ ان رسائل میں جمعیت کے دستور کے علاوہ چند اہم تقاریر درج ہیں جن سے اسلامی جمعیت طلبہ کے مقاصد اور طریق کار پر روشنی پڑتی ہے۔

معیارِ طباعت نہایت اعلیٰ ہے!

ماہنامہ الفرقان' اشاعتِ خاص

● بادارت مولانا محمد منظور نعمانی ● مقامِ اشاعت: گوئن روڈ۔ لکھنؤ ● چندہ سالانہ ۵ر۔ فی پرچہ ۸ر

"الفرقان" بھارت کا مشہور دینی ماہنامہ ہے جو مولانا الیاس مرحوم کی تحریک کی فکری آبیاری کر رہا ہے۔ پیشِ نظر اشاعتِ خاص

ان چند اہم دینی تقاریر کا مجموعہ ہے جو مدیر الفرقان اور مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنے رفقائے تحریک کے سامنے ایک خصوصی تربیتی پروگرام کے طور پر درس کی صورت میں پیش کیں۔ ان تقاریر میں فی الحقیقت علم دین کے بہت سے انمول جواہر سمٹ گئے ہیں اور ہر دینی ذوق رکھنے والے مسلمان کے لئے ان میں سامان افادیت موجود ہے۔

مفید چارٹ معہ کیلنڈر

● شائع کردہ: مکتبۂ تعمیر انسانیت، گوجر گلی، اندرون موچی دروازہ، لاہور ● قیمت ۳ روپے فی درجن (۱۲ر محصول ڈاک)

یہ چھ مختلف نظم و نثر عبارتوں پر مشتمل مختلف رنگوں میں چھپے ہوئے چھوٹے سائز کے دیواری چارٹ ہیں، جن کے ساتھ اپریل ۱۹۶۵ء تا مارچ ۱۹۶۶ء کا کیلنڈر المضاعف کیا گیا ہے۔ عبارات کا انتخاب مقصدی و ادبی لحاظ سے بہت ہی قابل قدر ہے۔ ان کا ہمہ وقت نگاہوں کے سامنے رہنا فکر و سیرت پر اچھے اثرات ڈال سکتا ہے۔ گھروں، مدرسوں، دار المطالعوں، دفتروں اور مسجدوں میں آویزاں کرنے کے لیے یہ بہت موزوں ہیں۔

محض تعارف

● مرزا غلام احمد قادیانی کے کفریہ اقوال — از مولینا شاہ احمد نورانی ناظم دفتر جمعیۃ علمائے پاکستان، ۷۷ گارڈن ویسٹ کراچی۔ قیمت ۱۲ر

● البشر ای۔ حقیقتِ محمدی — از علامہ محمد المعروف بہ اسمٰعیل۔ مقیم پرنام بٹ۔ صوبہ مدارس۔ قیمت درج نہیں۔

● پردۂ شرعی کی چہل حدیث — از مولینا نور احمد صاحب، ناظم دار الافتاء مدرسہ امداد العلوم۔ شائع کردہ ادارہ اسلامیات لاہور۔ قیمت ۶ر

● امن کس طرح قائم ہو سکتا ہے؟ — از مولوی حبیب اللہ و مولوی حامد حسین۔ شائع کردہ: مکتبہ جماعت اسلامی کانپور۔ قیمت ۶ر

خریداروں کی خدمت میں

کاغذ کی گرانی اس حد تک جا پہنچی ہے کہ چراغ راہ گذشتہ دو ماہ سے
تقریباً یک صد روپیہ ماہانہ کے خسارے پر چل رہا ہے۔ یہ خسارہ دیر
تک قابلِ برداشت نہیں ہے۔ مجبوراً ہم آئندہ سے ضخامت کو
ایک بار پھر کم کر کے اشتہارات سمیت ۴۸ صفحات
کا رسالہ نکالنے کا فیصلہ کر رہے ہیں ٹائیٹل
اس مہینے سے ہلکا کیا جا رہا ہے حالات
جونہی بہتر ہوئے، ہم انشاء اللہ
ضخامت کو بحال کر دیں گے

"مینجر"

طرف متوجہ نہیں کرتا۔

پھر اس نظامِ تعلیم کے ارد گرد دور دور تک پھیلا ہوا گندا ماحول ہے کہ جو ہمہ تن فسق و فجور کی ایک عظیم الشان یونیورسٹی ہے۔ اس یونیورسٹی میں تن پرستی، نمائش کاری، نظر بازی، عشق آزمائی، ہوس رانی، رشوت خوری، چور بازاری، غنڈہ گردی پر زبان سے نہیں، عمل سے درس دینے والے اور دن رات درس دینے والے اتنے بڑے بڑے پروفیسر وقف ہیں کہ اخلاقی فساد کے پرچے ہیں بالکل کورے ہی قسم کے کچھ طلبا پاس مارک لئے بغیر رہ جائیں تو رہ جائیں، ورنہ اکثر تو فسٹ ڈویژن میں آتے ہیں۔

یہ طلبا ماحول کے باغیچہ کے وسط میں جڑیں پھوڑنے والے شجرۂ تعلیم کے بالکل واجبی پھل ہیں۔ آپ کو یہ پھل کڑوے لگتے ہوں تو ان پھلوں پر غصہ نہ اتاریئے، توجہ فرمایئے اس شجرۂ خبیثہ پر جو اس کے سوا کوئی اور پھل دے ہی نہیں سکتا —— اور توجہ فرمایئے اُس صحافت پر، اس ادب و شاعری پر، اس مصوری و موسیقی پر، ان فلمی مناظر پر، اُن ریڈیو ٹاورں پر، ان مینا بازاروں پر، اُن متحرک جلوہ ہائے سبز رہے پر جو اس شجرۂ خبیثہ کی آبیاری کرتے ہیں۔ پھر اگر ولولۂ اصلاح اپنے اندر کروٹ لیتا محسوس ہو تو اس شجرۂ خبیثہ کی جڑوں پر کلہاڑا رکھنے اور اس ماحول کے خلاف معرکہ لڑنے کے لئے اٹھ کھڑے ہو جئے!

شعاعیں

کوثر نیازی

(رباعیات)

(۱)

خورشید کو پھونکوں سے بجھانے والو!
دریاؤں میں سے آگ لگانے والو!
آخر میں بہرحال تمہیں دبنا ہے
اے دین کو دنیا میں دبانے والو!

(۲)

تکنیک میں ایمان بدل جاتا ہے
ہر لحظہ و ہر آن بدل جاتا ہے
بے مہریٔ خالق کے لئے شاکی بندو
خالق نہیں، انسان بدل جاتا ہے

(۳)

اے ظلم کے ماحول میں جینے والے
آلام سے اے فگار سینے والے
تجھ پہ ہی سدا دھونس جماتے جائیں
تیری ہی رگوں کا خون پینے والے؟

کیا ؟

آپ نے کبھی سوچا کہ کلامِ الٰہی میں جا بجا قسمیں کیوں کھائی گئی ہیں ـــ ؟ یہ سوال تمام مفسرین کے سامنے آیا اور انھوں نے اس پر بڑی طبع آزمائیاں کی ہیں، پھر بھی بات کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی ـــــ !

بالآخر

مولانا حمید الدین فراہی

نے

اس سوال کو سامنے رکھ کر کاوش کی

اور

قرآن کی قسموں کی ایک سائنس مرتب کر کے رکھ دی

جسے

مولانا امین احسن اصلاحی

نے

عربی سے اردو میں منتقل کیا

قرآن کے

طالب علموں

کے لئے

ایک ٹھوس

علمی کتاب

اقسام القرآن

قیمت :ـــــــــ ڈیڑھ روپیہ

زلزلے بام و در پر ہی نہیں آتے ـــــــــــ دلوں اور دماغوں پر بھی آتے ہیں ـــــ !

ـــ تاکہ ـــــــ فرسودہ خیالات ـــــــ اور ـــــــ بوسیدہ قدریں تلپٹ ہو جائیں !

o ـــ ـــ ـــ ـــ ـــ ـــ اور تعمیرِ نَو کے لئے میدان ہموار ہو !

نعیم صدیقی

جو آج اسلامی ادبی محاذ کا ایک، جانباز سپاہی ہے، اس کے دل و دماغ بھی زلزلوں سے دوچار ہوئے تھے! ان زلزلوں کی لہروں کو جب اُس نے پورے سماج پر طاری کرنا چاہا۔ تو اس کے سحر تخیل سے وہ افسانے بن گئے۔

نعیم صدیقی کے ان ہی افسانوں کا اولین مجموعہ

ذہنی زلزلے

...ے نام سے ۱۹۴۹ء میں پہلی بار شائع ہوا اور مصنف کی اس ابتدائی کوشش نے دنیائے ادب میں اپنی جگہ پیدا کر لی ـــ اب مکتبہ "چراغِ راہ" اس کا دوسرا ایڈیشن پیش کر رہا ہے۔ ضخامت ۱۸۵ صفحات ـــ طباعتی معیار اعلیٰ ـــــــ قیمت دو روپے

مکتبۂ چراغِ راہ۔ کراچی نمبرا

قیادت نمبر — اور — شعر نمبر

کے بعد

چراغِ راہ (کراچی)

اپنی معرکہ آرا اشاعتِ خاص جنوری ۱۹۵۳ء

پیش کر چکا ہے

•

یہ ہے اس کے مندرجات کی فہرست :-

ادبی و تنقیدی مقالات —— پاکستان بننے کے بعد ادبی رفتار و رجحانات (عاصی نسیانی) مشرقی پاکستان میں نئے ادبی و سماجی رجحانات (فروغ احمد) پاکستان کے ترقی پسند ادب کا جائزہ (حمید اللہ صدیقی) پاکستان کے مشاعرے (ماہر القادری) افسانہ کی اصل بنیادی قدریں (اصغر علی عابدی) اسلامی ادب کا فلسفیانہ پس منظر (نعیم صدیقی)

تمثیل —— شکار چو (عاصی ضیائی)

نظمیں —— منزلیں دور راہ دشوار، ساقی سے، شاعر نوجوان کے نام (ضیا محمد ضیا) قرآن کی فریاد (ماہر القادری) الدین کلہ ادب (ملی منظور) موسٹ ارجنٹ (شمیم جاوید) مقبرے —— ایک رفیق کے نام (کوثر نیازی) ذخیرہ اندوزوں سے (مظفر گجراتی) مرے احوال۔ چڑیل۔ کیوں؟ اے نیل کی موج (نعیم صدیقی) منشورِ آزادی (ابو سعید حسرت) کربلا (طالب حجازی) رجز (ابو البیان حماد)

افسانہ و طنز —— بعلم بن بعور (جیلانی بی اے) میرا گاؤں (نعیم صدیقی) بھوکا ہے پنجاب (نعیم صدیقی) مالِ حرام (فضل من اللہ) جزیدہ زندہ دلاں (فضل الرحمٰن) منبر کا موٹر (جلال)

غزلیں —— عاصی کرنالی، ضیا محمد ضیا، عبد الکریم ثمر، کوثر نیازی، ارشد کاظمی، احمد پرویز، ابو ظہیر انصاری، ظہور الحق صدیقی، نعیم صدیقی۔

جائزہ پاکستان —— ظہور پاکستان اور اس کے پس منظر (ضیا محمد ضیا) مشرقی پاکستان (مولانا محمد عبد الرحیم) دستورِ پاکستان (س ظ) تعلیمی حالت کا جائزہ (ا ن سلیم ایم اے) پنج سالہ معاشی جائزہ (پروفیسر عبد الحمید) معاشی بحران (پروفیسر اے آر رحیم) جبری انتخابات (سید صدیق الحسن) طبِ یونانی (حکیم محمد سعید دہلوی) مسئلہ کشمیر (محمد منظور احمد) چند غیر ملکی شخصیتیں (مولانا محمد مسعود عالم ندوی) میو قوم پاکستان میں (سردار محمد خاں میواتی۔

یہ اشاعتِ خاص درحقیقت علم و ادب کی دنیا کا ایک سنگِ میل ہے۔ صفحات ۳۳۶ ۔ قیمت ۲/۴ روپے

اس اشاعت سے سال بھر کی خریداری قبول کرنے والوں کو کل سات روپے ادا کرنے ہوں گے۔

مینجر چراغ راہ

غلام محمد:- پرنٹر پبلشر نے ناظر پریس میکلوڈ روڈ سے طبع کرا کر دفتر چراغ راہ کراچی ۱ سے شائع کیا۔

Printed at Nazir Printing Press, McLeod Road, Karachi &
Title Printed at SHAN ELECTRIC PRESS Arambaugh Road, Karachi.
Printer & Publisher Ghulam Mohammed M. Chaudhri

چراغ راہ

مرتب
غلام محمد

مئی ۱۹۵۳

قیمت -/۸/-

عزیمتِ مومن

"آپ کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم سے یہ مطالبہ نہیں کیا ہے کہ ہم ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی حکومت کی طرح ایک حکومت قائم کر دیں۔ نہ بندوں کو اس بات کی طاقت حاصل ہے نہ خدا نے اس کی تکلیف دی ہے۔ البتہ یہ مطالبہ ہم سے کیا گیا ہے کہ ہم اقامت دین کے لئے جدوجہد کریں اور اس جدوجہد میں اپنا تمام سرمایۂ زندگی لگا دیں۔ جان بھی اور مال بھی اور اپنی تمام مرغوبات و محبوبات بھی۔ اور دین سے مراد اجزائے دین میں سے کوئی جزء مراد نہیں ہے خواہ وہ کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو بلکہ دین بحیثیت مجموعی مراد ہے۔ اس کے کلیات بھی اور جزئیات بھی، عقائد بھی اور اعمال بھی۔ یہ جدوجہد پورے عشق اور پورے جوش کے ساتھ مطلوب ہے اور اللہ کے نزدیک یہی چیز ہمارے ایمان اور نفاق کی کسوٹی ہے کوئی سینہ جو اس ولولہ سے خالی ہو ایمان کا مسکن نہیں بن سکتا اور کوئی دل جو اس درد سے ناآشنا ہو خدا کا گھر نہیں ہو سکتا۔ کتنی ہی تسبیحیں گردانی جائیں، کتنے ہی وظیفے پڑھے جائیں اور کتنی ہی ضربیں لگائی جائیں اس عشق کے بدل نہیں ہو سکتے۔ ساری دینداری کی روح یہی ہے۔ اور خدا کے ہاں دلوں کے اندر سب سے پہلے یہی چیز ڈھونڈی جائے گی۔ اور یہ بھی ایک ضروری شرط ہے کہ یہ جدوجہد جماعتی شکل میں ہو، انفرادی شکل میں نہ ہو۔ ہر مردِ حق کا فرض ہے کہ وہ پہلے اپنے اندر اس کی گرمی پیدا کرے اور پھر یہ کوشش کرے کہ اس آگ سے سارے دل بھڑک اٹھیں۔ یہ سوال بحث سے خارج ہے کہ یہ جدوجہد کس نتیجہ تک منتہی ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ ہم آروں سے چیر ڈالے جائیں، گملیوں میں گھسیٹے جائیں، انگاروں پر لٹائے جائیں اور ہمارے جسموں کو چیل اور کوے نوچیں اور ان ساری باتوں کے بعد بھی ہمیں یہ سعادت حاصل نہ ہو سکے کہ ہم موجود نظامِ باطل کو ایک نظامِ حق سے بدل دیں لیکن نہ تو یہ ناکامی ناکامی ہے اور نہ اس کا اندیشہ بلکہ اس کا یقین بھی ہم کو اس مطالبہ سے سبکدوش کر سکتا ہے۔ جو خدا نے اقامت دین کے لئے ہم سے کیا ہے۔ وہ ایک قطعی اور اٹل فرض ہے۔ جو ہر قیمت پر اور ہر حال میں ہمیں ادا کرنا ہے۔"

امین احسن اصلاحی

چراغ راہ

ادب میں اسلامی قدروں کا علمبردار

مرتبہ: غلام محمد

جلد ۶
شمارہ ۵

چندہ سالانہ
پانچ روپے

قیمت ۸ آنے

مئی ۱۹۵۳ء

مندرجات

دفتر ماہنامہ چراغ راہ ۹۔ لوٹیا بلڈنگ آرام باغ روڈ کراچی

سوچ بچار

یہ گرفتاریاں کیوں؟

۲۸ مارچ ۱۹۵۳ء کی صبح کو ۲ بجے کے قریب سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اور جماعت اسلامی کے دیگر رہنماؤں کی گرفتاری عمل میں آئی اور ۲۹ مارچ ۱۹۵۳ء کو رات کے ۸½ بجے پہلی بار پاکستان ریڈیو نے اس خبر کو نشر کیا۔ پاکستان کی نیم سرکاری نیوز ایجنسی اے۔پی۔پی نے اس کو دو روز تک نشر نہیں کیا۔ چند روز کے بعد اس ایجنسی نے کراچی دفتر سے یہ خبر پھیلائی کہ مولانا مودودی اور ان کے رفقاء پر مارشل لاء کے تحت مقدمہ چلایا جانیوالا ہے۔ خود حکومت نے اس سلسلہ میں نہ تو کوئی وضاحتی بیان دینے کی ضرورت محسوس کی اور نہ ہی پبلک کو یہ بتانے کی زحمت گوارا کی کہ یہ گرفتاریاں کس وجہ سے عمل میں لائی گئی ہیں۔ پبلک منتظر تھی کہ حکومت اپنے اس اقدام کی وجوہات بیان کرے لیکن حکومت کو یہ توفیق آج تک نہیں ہوئی — لہٰذا ہم مجبور ہیں کہ مزید انتظار کئے بغیر پوری صورت حال قوم کے سامنے رکھ دیں۔

امید ہے کہ ان صفحات کے مطالعہ کے بعد قوم پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ یہ گرفتاریاں کس غرض کیلئے عمل میں لائی گئی ہیں اور پاکستان میں آج کیسی کشمکش برپا ہے۔

ناظم شعبہ نشر و اشاعت جماعت اسلامی پاکستان ۱۲ اپریل ۵۳ء

پاکستان مسلمان قوم کی جن تمناؤں کا مظہر ہے اس سے اس ملک کا کون فرد ناآشنا ہے۔ حصول پاکستان کی جدوجہد کا یہ مقصد کیا جملہ آج بھی بچہ بچہ کو یاد ہے "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ" اسی مقصد عظیم کے لئے ہندوستان کا مسلمان خون کے دریا میں غوطہ زن ہوا تھا اسی اسلامی سلطنت کے خواب کی تعبیر کے لئے اس نے عزت و عصمت کی بے بہا قربانی دی تھی اور نظام اسلامی کی تمنا کے لئے اس نے گھر بار چھوڑا تھا۔ آج بھی آنکھوں کے سامنے مسلمانوں کے بکس دبے بس قافلے پھر جاتے ہیں جو دنیا کی ہر متاع عزیز کو لٹا کر اور بڑی سے بڑی دولت و عزت قربان کرکے پاکستان کی سرحدوں میں داخل ہوئے تھے۔ لیڈروں کے وعدوں کے مطابق اسلامی نظام کا نقشہ ان کے ذہنوں میں جما ہوا تھا۔ وہ اسلام کیلئے ہر دکھ درد، تکلیف اور مصیبت کو خوشی خوشی برداشت کرتے ہوئے آئے تھے۔ ان کی آنکھیں حسرت سے لیڈروں کی زندگیوں میں اسلامی جھلک دیکھنے کے لئے بیتاب تھیں۔ دوسری طرف برسر اقتدار گروہ کی ایک بہت بڑی اکثریت کے ذہنوں میں اسلام کی بجائے یہاں لادینی نظام زندگی مسلط کرنے کی دھن سمائی ہوئی تھی۔ عوام پاکستان میں اسلام کو جاری و ساری دیکھنا چاہتے تھے۔ مگر یہ برسر اقتدار لوگ اگرچہ زبان سے اسلام اسلام پکارتے تھے لیکن حقیقت میں ان کی کوششوں کا رخ اسلام کی مخالف سمت میں تھا۔ ان کی پالیسی دورخی تھی۔ اسلامی نظام کے قیام کے وعدے میں اگر یہ حضرات مخلص ہوتے اور ان کی نیتوں میں وہی ہوتا جو زبان پہ تھا تو قرارداد مقاصد پاس کرنے میں جھجک اور دشواری پیش نہ آتی جو پیش آئی

اس اعلان کے لئے کہ پاکستان کا دستور اسلام کی بنیادوں پر بنے گا قیام پاکستان کے بعد سے پورے ڈیڑھ سال کی طویل مدت اور کشمکش

[illegible] متعمرد واضح اور بروقت اعلان کی بجائے۔ اس طبقے کی طرف سے ایسے اقدامات شروع ہو گئے جن میں عوام کو الجھانے اور اسلامی نظام کے پہلی منزل سے ہٹانے کی اسپرٹ کارفرما تھی۔ اس صورت حال کو جماعت اسلامی نے اچھی طرح بھانپ لیا تھا۔ چنانچہ اس نے مسلمانوں کے ان جذبات کو جن کے لئے انہوں نے اتنی عظیم قربانیاں دی تھیں ایک مطالبہ کی شکل میں مرتب کر کے دستور یہ کے سامنے رکھ دیا۔ اس مطالبہ میں دستوریہ سے کہا گیا تھا کہ وہ غیر مبہم الفاظ میں اعلان کرے کہ پاکستان میں انسانوں کا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا قانون نافذ ہوگا۔ قانون کا منبع اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت ہوگی اور یہ کہ کوئی ایسی قانون سازی نہ کی جائے گی جو خدا اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے صریح احکام کے خلاف ہو۔

مغرب زدہ طبقہ نے اس اعلان کو اپنی سیاسی موت کے مترادف سمجھا اور جماعت اسلامی کو اس گستاخی کی سزا دینے کے لئے اپنے ترکش کذب وافترا کے تمام تیر ایک ایک کر کے چلا دیئے۔ حد یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنے ان افسوسناک عزائم کو طاقت کے زور سے بروئے کار لانے کے لئے جماعت اسلامی اور دوسرے اسلام پسند عناصر کو مغلوب کرنے کے جوش میں ملکی اور قومی مفاد کے نقصان کی بھی پرواہ نہ کی اور تھوڑی دیر کے لئے یہ تدبیریں چل بھی گئیں اور وقتی طور پر عوام کی آنکھوں میں دھول ڈالنے میں کامیابی بھی ہوگئی چنانچہ اس "کامیابی" کے نشہ میں جماعت اسلامی پاکستان کے امیر سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ مولانا امین احسن اصلاحی اور میاں طفیل محمد صاحب قیم جماعت کو گرفتار کر لیا گیا۔[1]

اگر نظام اسلامی کا مطالبہ صرف چند ملاؤں کی طرف سے ہی ہوتا تو اس کا بچہ بچہ اس وقت ہو جاتا لیکن یہ تو مسلمان عوام کے دلوں کی دھڑکنیں تھیں۔ یہ ان کے جسم میں خون کی طرح گردش کرنے والے جذبات تھے ان کے خوابوں کی تعبیر تھی۔ ان کی قربانیوں کا ثمر تھا ان کے زخموں کا مرہم اور ان کے دلوں کا قرار تھا۔ اسلئے اس مطالبہ کو تمام اسلام پسند لوگوں نے اپنا لیا۔ یہ جماعت اسلامی ہی کا مطالبہ نہ رہا بلکہ پوری قوم کا مطالبہ بن گیا۔ اور دن بدن قوت پکڑتا گیا۔ ہر طلوع ہونے والی صبح مطالبہ کے منشور پر اپنی تائید کی مہر ثبت کرتی رہی۔ ہر نکلنے والے سورج کی کرنیں مطالبہ کی تائید کا اعلان کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ حکمران طبقے نے مجبور ہو کر ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو یہ مطالبہ منظور کر لیا۔ خوشی سے نہیں بلکہ انتہائی مجبوری اور ناگواری سے۔ انشراح قلب کے ساتھ نہیں بلکہ دل کی گھٹن کے ساتھ۔ یہ سب کچھ عوام کے جذبات کے تموج میں سکون پیدا کرنے کے لئے کیا گیا۔ اور ظاہر ہے کہ اس میں اخلاص کم اور ڈپلومیسی زیادہ تھی۔

عوام کے مقابلہ پر اپنی شکست کے بعد حکمران طبقے نے قوم کے ذہنوں کو اسلام سے دور لے جانے اور تہذیب مغرب کا زہر ان کی رگ و پے میں اتارنے کے لئے یہ تدبیریں اختیار کیں۔

(۱) سیفٹی اور سیکورٹی قوانین کے ذریعہ آزادی رائے کو کچلنا۔

(۲) جنگل کے ان قوانین کے تحت اپنے مخالفوں اور خصوصاً اسلام پسند عناصر کو دبانا اور ان کی زبان بندی کرنا۔

(۳) تہذیب مغرب سے متاثر کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ پاکستانیوں کو معمولی معمولی کاموں کے لئے بھاری قومی اخراجات پر مغربی ممالک میں سیر وتفریح اور "ترقی" کے مناظر دیکھنے کے لئے بھیجنا۔

(۴) اسلامی اخلاق واقدار کو مجروح کرنے کی مہم چلانا اور سینما بازاروں۔ نمائشوں۔ مخلوط تعلیم اور مخلوط اجتماعات کی سرکاری مصارف پر حوصلہ افزائی آرٹ کی سرپرستی کا نام لیکر عریانی وفحاشی کی تبلیغ وترویج۔

ان پروگراموں کی کامیابی کے لئے اس طبقے نے ملک کا روپیہ نہایت بے دردی سے بہایا۔ ۱۹۵۰ء میں اس نے محسوس کیا کہ شاید اب وہ غیر اسلامی دستور کو نافذ کرنے کے لئے ماحول کو کافی سازگار بنا چکا ہے۔ چنانچہ دستوریہ کی بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ پبلک کے سامنے

---

[1] ان واقعات کی تفصیل "مولانا مودودی کی گرفتاری کیوں" پمفلٹ میں ملاحظہ فرمالی جائے۔

رکھدی گئی لیکن ماحول کی سازگاری کا اندازہ غلط ثابت ہوا اور وہ یہ دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئے کہ قوم نے بالاتفاق اس غیر جمہوری اور غیر اسلامی دستاویز کو ٹھکرا دیا۔ اگرچہ اس طبقہ نے اپنی شکست اور ضعف کا پورا نقشہ دیکھ لیا تھا۔ لیکن ان کے قبضہ میں قومی دولت تھی ملک کے وسائل اور طاقت تھی ان ہی چیزوں پر اعتقاد کرتے ہوئے انھوں نے پھر بھی یہ کوشش جاری رکھی کہ کسی نہ کسی طرح اسلام پسند عناصر کو کچل کر لادینی دستور نافذ کرنے کے لئے فضا سازگار بنائی جائے اور جب بھی یہ ممکن ہو فوراً اس کے نفاذ کی کوشش کی جائے اور ترتیب دستور کی مدت کو بقدر بروز طول دیکر عوام کو لادینی نظام کا عادی اور حالات پر قانع بنا دیا جائے۔

پھر اسلامی محاذ میں انتشار پیدا کرنے کے لئے ان لوگوں نے دوسرا پینترا بدلا اور چیلنج کیا کہ اسلامی دستور کے بنیادی اصولوں پر علماء متفق نہیں ہیں۔ لیکن علماء نے ان کے اس غبارے سے بھی ہوا نکال دی اور پاکستان کے ہر مکتب فکر کے اکتیس (۳۱) سربرآوردہ علماء کرام نے ۲۱-۲۲-۲۳ اور ۲۴ جنوری ۱۹۵۱ء کو کراچی میں جمع ہو کر ایک اسلامی مملکت کے دستور کے لئے بائیس (۲۲) بنیادی اصول بالاتفاق طے کر دیئے۔ اس متفقہ فیصلہ نے مغرب زدہ طبقہ کے لئے پھر بہت زیادہ مشکلات پیدا کر دیں اور ان کے لئے ممکن نہ رہا کہ الجھاوے کی باتوں سے عوام کے ذہن کو مطالبۂ دستور اسلامی سے ہٹا سکیں۔

دوسرا حملہ

اس کے بعد سیکولرازم کے حامی طبقہ کی طرف سے انڈونیشیا کی دارالسلام پارٹی اور جماعت اسلامی پاکستان کے طرز عمل میں یگانگت ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان دنوں دارالسلام پارٹی کے متعلق "تشدد" کے استعمال کی مختلف خبریں پھیل رہی تھیں۔ ہمارے ملک کا مغرب زدہ طبقہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھا کہ جماعت اسلامی آئینی اور دستوری طریقوں سے اسلامی انقلاب برپا کرنا چاہتی ہے۔ مبالغہ نہ ہوگا اگر کہا جائے کہ برصغیر پاک و ہند میں کسی اجتماعی تحریک نے حدود نظم و اخلاق کو ہر حال میں قائم رکھنے اور اپنی تمام جدوجہد کو آئین و قانون کے دائرے میں رکھنے کا اتنا اہتمام کبھی نہیں کیا جتنا جماعت اسلامی کرتی رہی ہے۔ لیکن محض اسلام پسند عناصر کا زور توڑنے کے پیش نظر اور جماعت اسلامی جیسی منظم پارٹی کو ہدف طعن بنانے کے لئے اس کے طریق کار کا جوڑ دارالسلام پارٹی سے لگانا شروع کر دیا تاکہ تشدد کا الزام لگا کر ان کو کچل دیا جائے۔ لیکن اس چال کا انکشاف بھی قبل از وقت ہو گیا۔

تیسرا حملہ

اس کے بعد انھوں نے پھر پینترا بدلا اور ایک بھرپور وار کیا گیا۔ باخبر حلقوں کو تو اس کی تیاری کا علم پہلے ہی ہو چکا تھا اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اس سازش کی طرف جماعت کے سالانہ اجتماع کراچی منعقدہ ۱۱ نومبر ۱۹۵۱ء میں اشارہ بھی کر دیا تھا۔ لیکن عوام کو اس کا علم اس وقت ہوا جب جناب لیاقت علی خاں مرحوم کے قتل کی رپورٹ انکوائری کمیشن نے شائع کی۔ کمیشن نے اس حقیقت کو بے نقاب کیا کہ یہ بات بار بار ان کے کانوں میں ٹھونسنے کی کوشش کی گئی کہ مسٹر لیاقت علی خاں کے قتل کا باعث مذہبی جنون تھا۔ پراسیکیوشن کی طرف سے ایک موہوم بات کو اتنا اچھالنا اس کے علاوہ اور کسی بات کی غمازی کرتا ہے کہ کمیشن کے فیصلے کو متاثر کیا جا سکے۔ پھر اس فیصلے کی آڑ لیکر ملک کی رائے عامہ کو اسلام پسند عناصر کے خلاف بھڑکا دیا جائے اور اس مشتعل فضا اور ہیجانی دور میں ان اسلام پسند عناصر کو انتقاماً کچل دیا جائے۔ جنھوں نے اسلامی نظام کے مطالبہ کی پشت پر رائے عامہ کو مجتمع کر کے ارباب اقتدار کو قرارداد مقاصد پاس کرنے پر مجبور کر دیا تھا اور جو اب اسلامی دستور کی جدوجہد شروع کر رہے تھے اس سازش کی بعض مغرب زدہ پریس نے بھی ہوا دینے کی کوشش کی تھی۔ ناکامی کے بعد بھی اس طبقے کے حوصلے پست نہیں ہوئے اسلئے کہ ابھی اقتدار کی طاقت ان کے ہاتھ میں تھی اور یہ ہر قسم کی دھاندلی مچانے کا اختیار رکھتے تھے۔ اس لئے وہ اسلامی دستور کے خلاف طرح طرح سے زمین ہموار کرنے میں لگے رہے۔ دستور کے معاملے میں ان کی غیر معمولی تاخیر سے تنگ آکر جماعت اسلامی نے پاکستان کے مشاہیر علماء کے متفقہ بائیس اصول (مملکت اسلامی) کا خلاصہ حسب ذیل نو نکاتی مطالبہ کی شکل میں مئی ۱۹۵۲ء میں دستوریہ کے سامنے رکھدیا۔

ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ دستور ساز اسمبلی پاکستان کا نیا دستور ۱۹۵۲ء کے ختم ہونے سے پہلے بنا دے جس میں حسب ذیل امور کی قطعی صراحت ہو

۱۔ ملک کا قانون اسلامی شریعت ہوگی۔

۲۔ کوئی ایسی قانون سازی نہ کی جائے گی جو شریعت کے احکام یا اصول کے خلاف ہو۔

۳۔ تمام ایسے قوانین کو منسوخ کیا جائے گا جو شریعت کے احکام یا اصول سے متصادم ہوں۔

۴۔ حکومت کا یہ فرض ہوگا کہ ان برائیوں کو مٹائے جنھیں اسلام مٹانا چاہتا ہے اور ان بھلائیوں کو فروغ دے جنھیں اسلام فروغ دینا چاہتا ہے۔

۵۔ لوگوں کے شہری حقوق (تحفظ جان و مال، آزادی تحریر و تقریر، آزادی نقل و حرکت اور آزادی اجتماع) کو ان کا جرم کھلی عدالت میں ثابت کئے بغیر اور انھیں صفائی کا موقع دئے بغیر سلب نہ کیا جائے گا۔

۶۔ لوگوں کو حق ہوگا کہ انتظامیہ یا مقننہ اگر اپنے حدود سے تجاوز کرے تو وہ ملک کی عدالتوں سے چارہ جوئی کر سکیں۔

۷۔ عدلیہ انتظامی حکومت کی مداخلت سے آزاد ہوگی۔

۸۔ حکومت اس بات کی ضامن ہوگی کہ ملک میں کوئی شخص بنیادی ضروریات زندگی۔ غذا، لباس، مکان، علاج اور تعلیم سے محروم نہ رہے۔

۹۔ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیتوں کی فہرست میں شامل کر کے ان کے لئے بھی جداگانہ انتخاب کے ساتھ آبادی کے لحاظ سے نشستیں مقرر کر دی جائیں۔

ان امور کی صراحت کے بغیر کوئی دستور ہمارے لئے قابل قبول نہ ہوگا۔

اس مطالبے کو عوام نے بہت جلد اپنا لیا۔ اور تھوڑی ہی مدت میں لاکھوں کی تعداد میں مطالبے کے خطوط، تار۔ اور محضر نامے دستور یہ کے پاس پہونچنے لگے۔ عوام نے پُرامن با قاعدہ منظم جلسے اور جلوس اور مظاہرے کے ذریعہ اسلامی دستور کے پاس کرانے کا مسلسل مطالبہ کیا۔ چنانچہ اس دباؤ سے مجبور ہو کر بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ ۱۹۵۲ء کے اندر اندر دستور یہ میں پیش کر دی گئی جس میں کتاب و سنت اور خدا اور رسول کا نام بار بار لیا گیا۔ خدا اور رسول کے نام کی یہ تکرار دیکھ کر "سیکولر زدہ" طبقہ تو بالکل ہی بوکھلا گیا۔ اور اس نے ظالم کی آڑ لے کر اسلام کو خوب خوب کوسنا شروع کر دیا۔

دوسری طرف ہمارے سیاست بازوں نے دستور میں خوردبین لگا کر اپنی اپنی کرسیوں کے امکانات تلاش کئے اور دستور کو صرف عہدہ اور اقتدار کی عینک سے دیکھا۔ یہ بات ہمارے اقتدار پرست گروہ کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی کہ ان کو ملکی دستور میں اگر کوئی چیز قابل غور نظر آئی تو وہ صرف ان کے صوبوں کے لئے نشستوں کی تعداد تھی۔ اور اس پر انھوں نے ہنگامے برپا کئے۔ لیکن کسی کو اس دستور کے اخلاقی، معاشی۔ اسلامی اور شہریوں کے بنیادی حقوق اور دستوری پہلوؤں پر نظر ڈالنے کی توفیق نہ ہوئی۔

اس کے برعکس علماء حضرات نے اس رپورٹ کی ایک ایک شق پر اسلامی نقطہ نظر سے غور کیا اور دستور یہ کے سامنے اپنی متفقہ ترمیمات پیش کر دیں۔ ان سفارشات میں علماء حضرات نے کئی ایک خامیوں کی نشاندہی کی۔ لیکن ہمارے مغرب پسند سیاستدانوں کے نزدیک تو یہ سفارشات بھی جو اگرچہ مکمل طور پر اسلامی نہ تھیں محض اسلئے ناقابل قبول قرار پائیں کہ اس میں خدا و رسول اور کتاب و سنت کا نام کیوں آیا تھا۔ اور اسلئے بھی کہ یہ سفارشات کسی نہ کسی پہلو سے ان کی خواہشات نفس کی جولانیوں پر کچھ قدغن لگا رہی تھیں۔ لیکن اس طبقے میں یہ جرأت بھی نہ تھی کہ عوام کے سامنے جا کر انھیں اپنی پسند کے مطابق سیکولر دستور پر مطمئن کر سکے۔ اور انھیں اپنا ہم خیال

بنا گئے۔ یعنی اس نمایاں شکست کو تسلیم کرنا اس کے لئے بالکل ہی ناقابل برداشت ہو گیا چنانچہ اس نے اپنے اقتدار سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے دینی رجحانات رکھنے والے عناصر کو کچلنے کی تدبیریں پھر سے شروع کر دیں

یہ لوگ ایک ایسا مسئلہ کھڑا کرنے کی فکر میں تھے جس کی آڑ لے کر کم سے کم لکھے پڑھے لوگوں میں جماعت اسلامی کی پوزیشن کو مشتبہ بنا سکیں اور بیرونی دنیا کی آنکھوں میں بھی دھول ڈال سکیں۔ ملک کے کئی ایک پیچیدہ مسائل میں سے ایک مسئلہ قادیانیت بھی تھا۔ اور سوء اتفاق سے یہ تھا بھی ایسا ہی جس کے متعلق ملک کا تعلیم یافتہ طبقہ بالخصوص اور پنجاب اور بہاولپور کے علاوہ عوام بالعموم کما حقہ واقف نہ تھے۔ ایسے حالات میں مغرب زدہ طبقہ کے لئے اسلام پسند عناصر سے اس مسئلہ پر پنجہ آزمائی کرنے کا بہترین اور سنہری موقع تھا۔

اس حقیقت سے واقف ہیں کہ علماء حضرات نے دستوری ترمیمات میں قادیانیوں کے متعلق یہ دفعہ رکھی تھی کہ ان کو غیر مسلم اقلیت قرار دیکر ان کے لئے ایک نشست مخصوص کر دی جائے۔ جماعت اسلامی دوسری ترمیمات کے ساتھ ساتھ اس شق کو منوانے کے لئے اپنا آئینی اور دستوری پروگرام بنا چکی تھی۔ اس سلسلے میں اولین کام یہ تھا کہ ملک کے تعلیم یافتہ لوگوں اور عوام کو تمام ترمیمات سے بالعموم اور قادیانی مسئلہ کی شق سے بالخصوص باخبر کیا جائے۔ اور اس معاملہ میں تمام الجھنوں، غلط فہمیوں، ناواقفیتوں اور پیچیدگیوں سے ان کا ذہن صاف کیا جائے۔ نیز اس مسئلہ پر پیدا کردہ شکوک و شبہات کا ازالہ کیا جائے۔ اگر یہ کام ہو جاتا اور ملک کے دونوں حصوں کے تعلیم یافتہ لوگ اور عوام کی اکثریت قادیانیوں کا ملت اسلامیہ کے لئے مار آستین ہونا سمجھ لیتے تو اس مسئلہ پر بھی مغرب زدہ حکمرانوں کو اسلام پسندوں سے ٹکر لینے کی جراءت نہ ہوتی۔ اور وہ اس مطالبہ کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جاتے اس صورت میں نہ ڈائرکٹ ایکشن کی ضرورت ہوتی اور نہ قانون شکنی کی اور نہ وہ دلخراش واقعات منظر عام پر آتے جن کے تصور سے ہر مسلمان کے دل پر رنج و ملال چھا جاتا ہے۔

جماعت اسلامی دستوری ترمیمات (یعنی جن میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی شق بھی شامل تھی) سے رائے عامہ کو واقف کرانے کا پروگرام لے کر اٹھ ہی رہی تھی کہ یکایک سرزمین پنجاب سے قادیانیوں کا مسئلہ آندھی کی طرح اٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے تمام صوبہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

جماعت اسلامی اور دوسرے اسلام پسند عناصر مجبور تھے کہ مسئلہ ختم نبوت پر ایمان رکھتے ہوئے اور مسئلہ قادیانیت کو حل کرانے کے لئے جدوجہد پا رہ ہوتے ہوئے بھی اس بد امنی اور لاقانونیت سے اپنا دامن بچائیں اور اس مقصد کے لئے دینی اور اخلاقی حدود کا لحاظ کر کے آئینی اور پرامن ذرائع اختیار کریں۔ چنانچہ جماعت اسلامی نے راست اقدام کی تحریک سے الگ رہتے ہوئے اصل مسئلہ سے اپنے اتفاق اور وابستگی کا اعلان کر دیا اور جماعت کی مجلس شوریٰ نے ۴ مارچ ۱۹۵۳ء کو مسئلہ قادیانیت کے بارے میں حکومت کے طرز عمل اور طریق عمل کی پالیسی کا تفصیلی جائزہ لے کر اپنا موقف اور پروگرام پبلک کے سامنے رکھدیا جو یہ تھا۔

جماعت اسلامی پاکستان کی مرکزی مجلس شوریٰ کا فیصلہ

جماعت اسلامی پاکستان کی مجلس شوریٰ نے ۴، ۵ مارچ ۱۹۵۳ء کی سلسلہ نشستوں میں اس صورت حال کا پورا جائزہ لیا ہے جو خصوصیت کے ساتھ پنجاب میں قادیانی مسئلے پر حکومت اور عوام کی کشمکش سے پیدا ہو گئی ہے۔ اس جائزے سے مجلس شوریٰ حسب ذیل نتائج پر پہنچی ہے

۱۔ قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ اقلیت قرار دینے۔ سر ظفر اللہ خان . . . . کو . . . . . وزارت خارجہ سے ہٹانے اور سرکاری کلیدی ملازمتوں میں ان کے قبضے کا تدارک کرنے کے لئے مسلم عوام کا مطالبہ جائز بھی ہے۔ معقول بھی ہے [illegible] اور اس کو بیک تحریک [illegible] سواد اعظم کی تائید بھی حاصل ہے۔

۲۔ ایسے مطالبہ کو مان لینا۔ اور پھر کوئی معقول وجہ بتائے بغیر اس کو جواب دینا مرکزی قیادت کی سخت غلطی ہے [illegible]

ما اس مسئلہ کی حقیقت سے آشنا ہونے کے لئے ملاحظہ ہو "قادیانی مسئلہ" از سید ابوالاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی پاکستان

طرح حق بجانب ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

۳۔ اگر عوام کے ایسے مطالبات کو جن کے پیچھے دلیل کی طاقت بھی ہو اور رائے عام کی طاقت بھی بلا دلیل رد کر دیا جائے تو عوام میں اس سے غصے اور ناراضی کا پیدا ہونا بالکل ایک قدرتی بات ہے یہی باتیں ہیں جو بالآخر لوگوں کو غیر آئینی طریقے اختیار کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ ہم حکومت ہی کو پوچھتے ہیں کہ جب ایک بات دلائل سے ثابت کر دی جائے اور آپ اسے بے دلیل رد کر دیں اور جب وہ تمام طریقے بھی اختیار کر لئے جائیں جن سے کسی مطالبہ کو عوامی مطالبہ ثابت کیا جا سکتا ہے اور پھر بھی آپ اسے مان کر نہ دیں تو آخر لوگ کیا کریں۔

۴۔ ایک حکومت کے لئے جو قومی حکومت اور نمائندہ حکومت ہونے کی مدعی ہو۔ اس سے بڑی کوئی غلطی نہیں ہو سکتی کہ اس طرح کے مطالبات کو وہ ظلم و تشدد سے دبانے پر اتر آئے اور پھر جب لوگ اس تشدد کے خلاف مشتعل ہوں تو اپنی ہی قوم کی پولیس اور فوج کو اپنی ہی قوم سے لڑوا دے یہ راستہ سیدھا ملک کو خانہ جنگی کی طرف لے جاتا ہے جس سے اگر حکومت نے فوراً قدم پیچھے نہ ہٹایا تو وہ اس ملک کے کسی خیر خواہ کی ادنیٰ سی ہمدردی کی بھی مستحق نہیں رہے گی۔

۵۔ جماعت اسلامی نے پچھلے چند روز میں حکومت کو سمجھانے کی مسلسل کوشش کی ہے۔ چنانچہ ۴ مارچ اور ۵ مارچ کو امیر جماعت نے وزیر اعظم کو بار بار تار دیئے اور ۵ مارچ کو گورنمنٹ ہاؤس میں معززین شہر کی موجودگی میں گورنر صاحب اور پنجاب کی وزارت کو صاف صاف مطلع کر دیا کہ عوام کے مطالبات کو ٹھکرانے کے بعد امن کی اپیلیں کرنا بے معنی ہے اور پھر عوامی مطالبات کو ظلم و تشدد اور بے رحمی و سنگدلی کے ساتھ دبانے کی کوشش جاری رکھتے ہوئے امن کے واعظ کہنے سے کچھ حاصل بھی نہیں ہو سکتا۔ اگر حکومت اب بھی اس کشمکش کو تباہ کن حد تک بڑھ جانے سے روکنا چاہتی ہے تو سب سے پہلے تشدد سے مطالبے کو دبانے کی کوشش ترک کر کے عوام کے جذبات کو ٹھنڈا کرے اور پھر عوام کے نمائندوں سے اس اصل مطالبے پر گفتگو کرے جس پر یہ ساری کشمکش برپا ہوئی ہے۔ دلیل سے بات ماننے یا دلیل سے منوا لینے کا اصول جب تک اختیار نہ کیا جائے گا یہاں آئے دن کشت و خون اور فتنہ و فساد رونما ہوتا رہے گا۔ اگر حکومت کے پاس عوامی مطالبے کو رد کرنے کے لئے معقول دلائل ہیں تو وہ کیوں انہیں سامنے نہیں لاتی؟ تاکہ لوگ اسے پرکھ سکیں اور اگر اسے اس مطالبے کے عوامی مطالبہ ہونے میں شک ہے تو وہ خود بتائے کہ آخر وہ کون سا معیار تجویز کرتی ہے جس پر پورا اترنے کے بعد وہ کسی مطالبے کو عوامی مطالبہ مان سکتی ہے؟

حکومت کی پوزیشن پر غور کرنے کے ساتھ مجلس شوریٰ نے اس تحریک کا بھی پورا جائزہ لیا جو عوامی مطالبہ کو تسلیم کرانے کے لئے اس وقت چل رہی ہے۔ دیانت کا تقاضہ یہ ہے کہ یہ مجلس اس کے بارے میں بھی اپنی رائے اور پالیسی کا صاف صاف اظہار کر دے۔

۱۔ جماعت اسلامی کی ابتدا سے یہ رائے تھی کہ دستور اسلامی کی جدوجہد اور قادیانی مسئلے سے متعلق جدوجہد الگ الگ نہیں ہونی چاہئیے کیونکہ دو لڑائیاں بیک وقت نہیں لڑی جا سکتیں اور علماء کی متفقہ تجاویز میں قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کی تجویز شامل ہو جانے کے بعد اس کے لئے الگ جدوجہد کرنے کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ پچھلی جنوری میں آل پارٹیز کنونشن کی سب کمیٹی کے سامنے امیر جماعت نے پورے دلائل کے ساتھ اس تجویز کو پیش کیا اور سب کمیٹی نے اسے مان بھی لیا مگر افسوس ہے کہ کنونشن میں اس کے خلاف فیصلہ کیا گیا۔

۲۔ اس کے بعد جب ڈائرکٹ ایکشن کے لئے قدم اٹھانے کا اعلان کیا گیا تو امیر جماعت نے وسط فروری سے ۲۲ فروری تک مجلس عمل کو بار بار اس طرف توجہ دلائی کہ اس تحریک میں دو بڑے خلا ہیں جن کو بھرے بغیر کوئی قدم اٹھا دینا مناسب نہیں ہے۔ پہلا خلا یہ ہے کہ پنجاب کے سوا دوسرے صوبوں کے باشندے قادیانی مسئلے کی نوعیت اور اہمیت سے ابھی تک واقف نہیں ہیں کیونکہ یہ مسئلہ اس نزاکت کے ساتھ پایا ہی نہیں جاتا جو اسے پنجاب میں حاصل ہے اور دوسرا خلا یہ ہے کہ خود پنجاب کے بھی تعلیم یافتہ لوگ اس مسئلے کے مذہبی، معاشرتی، سیاسی اور معاشی پہلوؤں کو اچھی طرح نہیں سمجھتے مجلس عمل کے بیشتر شرکاء امیر جماعت کی اس رائے سے اتفاق ظاہر کرتے رہے مگر افسوس ہے

راست اقدام شروع کر دیا گیا۔
تحریک کے ان مکروہ پہلوؤں کو جاننے اور ماننے کے باوجود ایک
جو اسلامی اخلاق کے خلاف ۳۔ پھر جب راست اقدام شروع کیا گیا تو آغاز ہی میں اکثر مقامات پر اس کے اندر ایسے طریقے اختیار کر لیئے گئے
ختم نبوت جیسے مقدس عنوان کے وقار کو مجروح کر دینے والے تھے۔ اور اس کا مزید یہ کہ اس میں بدنظمی کا رنگ بھی نمایاں تھا۔ جماعت اسلامی اگرچہ اس
تحریک کے مقصد سے پورا اتفاق رکھتی تھی اور آج بھی رکھتی ہے مگر اس کے لیئے یہ ممکن نہ تھا کہ اپنے سارے اصولوں کو قربان کر کے ان طریقوں کا ساتھ
دیتی اور دین و اہل دین کا جو وقار ایک مدت کی جدوجہد کے بعد قائم ہوا ہے اسے یوں اپنے ہاتھوں ایسے نازک موقعہ پر ختم کرا دیتی جبکہ "اخلاقاً" تحریک
اس ملک سے دینی عناصر کے اثر و رسوخ کو مٹانے کے لیئے بے چین ہے۔
۴۔ جماعت اسلامی کو اس امر کا پورا احساس ہے کہ پنجاب کے عوام اس وقت حکومت اور اپنے لیڈروں کی غلطیوں کے درمیان بری طرح پس
رہے ہیں۔ اس حالت میں جماعت اسلامی اپنا فرض پوری طرح پہچانتی ہے۔ لیکن اس وقت جماعت پر تین بڑی ذمہ داریاں ہیں۔
اول یہ کہ ان دونوں خلاؤں کو جلدی سے جلدی بھرا جائے جنھیں پر کیئے بغیر قدم اٹھا دیا گیا ہے۔
دوم یہ کہ راست اقدام کی بدولت جو لوگ ظلم و تشدد کے شکار ہو رہے ہیں ان کی خبر گیری (جس کی اسوقت سخت ضرورت ہے) کا انتظام کیا
جائے۔
سوم یہ کہ عوام کے اصل مطالبے کو جس کے لیئے اتنی قربانیاں دی جا رہی ہیں منوانے کے لیئے موثر تدابیر اختیار کی جائیں۔
ان ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے ساتھ جماعت یہ کوشش کر رہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اور جہاں جہاں بھی ممکن ہو عوام کی تحریک کو پُرامن
منظم اور حدود اخلاق کا پابند بنایا جائے۔ حکومت اور عوام کے تصادم سے ملک میں جو خوفناک صورت حال پیدا ہو گئی ہے۔ اس کا جلدی سے جلدی
مداوا کیا جائے۔ اور ملک کے تمام انصاف پسند عناصر کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ متحدہ طاقت کے ساتھ اس جبر و تشدد کو بند کرائیں جس کی بدولت
ملک کا امن ہی نہیں بلکہ اس کی سلامتی تک خطرے میں ہے۔ مجلس شوریٰ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی ہے کہ وہ ہم سب کی مدد کرے۔ ہمیں اور ہمارے
حکومت کو راستی پر چلنے کی توفیق بخشے اور اس ملک کو تباہی سے بچائے۔ آمین!
جماعت اسلامی کے اس موقف کا حکومت کو بخوبی علم تھا جن کا ثبوت ان واقعات سے ملتا ہے۔
۱۔ ۵ مارچ ۵۳ء کو گورنمنٹ ہاؤس لاہور میں گورنر پنجاب نے معززین شہر کو دعوت دی تھی کہ امن کی بحالی کے لیئے کوشش کی جائے
سید ابوالاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی نے جس فراخدلی اور جرات سے ان فسادات کی آگ کو ٹھنڈا کرنے میں تعاون کا یقین دلایا وہ حکومت کے سامنے تھا
۲۔ امیر جماعت اسلامی پاکستان کا امیر جماعت اسلامی حلقہ سندھ و کراچی کے نام ایکسپریس ڈلیوری خط ۲۴ فروری کو لاہور سے بذریعہ ڈاک
روانہ کیا گیا لیکن مکتوب الیہ کو ۲۶ فروری ۵۳ء کو ملا اور خط اس وقت ملا جب کونسل آف ایکشن میں شامل ہو کر مکتوب الیہ واپس آ چکے تھے معتبر
ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ یہ خط اتنے عرصہ حکومت کے زیر مطالعہ رہا۔ اس خط میں اس طرز عمل کی وضاحت کی گئی تھی جو جماعت اسلامی کو اس مجلس میں اختیار کرنا تھا۔
۳۔ جماعت اسلامی پاکستان کی مرکزی مجلس شوریٰ کا فیصلہ۔
ان شواہد کے علاوہ وزیر اعظم پاکستان کی وہ تقریر بھی اس پر شاہد ہے جو انھوں نے پارلیمنٹ میں ان فسادات کے سلسلہ میں کی۔ اس
میں دوسرے اسلام پسند عناصر کے ساتھ نام لیئے بغیر جماعت اسلامی کی پوزیشن ان الفاظ میں بیان کی گئی تھی۔
"کونسل آف ایکشن کے بعض علماء، جو قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کے مطالبے کے حامی تھے ڈائرکٹ ایکشن کے اقدام کے اس لئے
خلاف تھے کہ ان کے نزدیک یہ ملک کے لئے مفید ہونے کی بجائے مضر ہو گا۔ اور یہ کہ اس کو چلانے کی جو پالیسی اور طریق کار اختیار کیا گیا ہے وہ
ان کے نزدیک غیر اسلامی تھا۔ لہذا ان کی اکثریت نے ڈائرکٹ ایکشن کے اقدام میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔" (ڈان مورخہ ۶ مارچ

جیساکہ پہلے لکھا جاچکا ہے برسر اقتدار گروہ کے مغرب پرست عنصر کے سامنے اصل سوال جماعت کے موقف کی صحت وعدم صحت کا نہیں تھا بلکہ ان کے دل میں تو نظام اسلامی کے خلاف نفرت کا زہر ابل رہا تھا ان کی تمنائیں اور آرزوئیں یہ تھیں کہ جماعت کسی نہ کسی طرح فسادات کی اس خوفناک آگ کی لپیٹ میں آجائے یعنی اگر جماعت نے قانون شکنی کا ساتھ نہ دیا اور ڈائرکٹ ایکشن میں شامل نہ ہوئی تو عوام کے غیظ و غضب کی آگ اسے جھلس کر رکھ دے گی اور اگر قانون شکنی کی طرف قدم اٹھایا تو حکومت اسے کچل دے گی۔ یہ حضرات سمجھتے تھے کہ جماعت اسلامی دو دھاری تلوار کی زد میں ہے۔

جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ نے اصل مسئلہ کے حصول کا سوچا سمجھا صحیح حل نہایت ہی جرأت سے ملک کے سامنے رکھ دیا جسے پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا گیا۔ پبلک کی اس پسندیدگی کے بعد مغرب زدہ طبقہ کی تدبیر کی وہ دو دھاری تلوار کند ہو کر رہ گئی اور ان کے ترکش تدبیر کے یہ تیر بھی خطا ہو گئے۔ تمناؤں کے اس خون اور آرزوؤں کی اس پریشانی نے ان کی قوت فیصلہ کو بالکل ہی ماؤف کر دیا۔ جماعت کے صاف بچ جانے اور صحیح سلامت رہنے پر یہ لوگ بہت جھنجھلا رہے تھے جیسا کہ شکاری کے جال کے قریب سے شکار نکل گیا ہو۔ اور یہ واقعہ ہے کہ جھنجھلاہٹ نے ان کے تدبر کا دیوالہ نکال دیا۔ ان کے سامنے یہ سوال تھا کہ جماعت اسلامی تو قانون شکنی کرتی ہی نہیں اور موقع ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے اب اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا کہ سکھاشاہی طرز عمل اختیار کیا جائے۔ چنانچہ ۲۷، ۲۸ مارچ ۱۹۵۳ء کی درمیانی شب کو جماعت اسلامی کے امیر سید ابوالاعلیٰ مودودی اور ارکان مجلس شوریٰ کی اکثریت اور امراء حلقہ واضلاع کی بیشتر تعداد کو گرفتار کر لیا گیا۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ گرفتاری کے حکم نامے میں اس بات کی ہدایت بھی کر دی گئی تھی کہ جماعت کے دفتروں اور اس کے کارکنوں کے گھروں کی تلاشی لیتے وقت یہ بات ضرور ملحوظ رکھی جائے کہ جماعت اسلامی کا تعلق کسی بیرونی طاقت سے تو نہیں ہے اور یہ کہ اس کی آمدنی کا کیا ذریعہ ہے۔[2]

مارشل لاء

جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے قادیانی مسئلہ کے بارے میں جماعت اسلامی کا موقف اتنا درست اور صحیح تھا کہ ملک کے تعلیم یافتہ حضرات اور عوام نے اسے پسند کیا۔ یہی وجہ تھی کہ اپنی اس تمام جھنجھلاہٹ کے باوجود مغرب پرست حکمران طبقہ ملک کے سول قانون کے تحت جماعت کے لیڈروں پر ہاتھ ڈالنے سے گھبراتا تھا لہٰذا لاہور میں جماعت اسلامی کے لیڈروں کی گرفتاری کا سارا کاروبار مارشل لاء

---

[1] ڈان جو سیکولرزم اور مغربیت کا اندھا مقلد ہی نہیں پرجوش مبلغ بھی ہے اور جس کے دل میں اسلام پسند عناصر کانٹے کی طرح کھٹکتے ہیں اس نے وزیر اعظم کی اس تقریر پر اپنے ایک اداریہ میں جماعت اسلامی کی پوزیشن کو دیدہ و دانستہ عوام کے سامنے غلط انداز میں پیش کیا اور حکومت کو اکسایا کہ یہ لوگ تو ان سے بھی زیادہ خطرناک ہیں جنہوں نے ڈائرکٹ ایکشن میں حصہ لیا لہٰذا ان کا تیاپانچا کرنا لازمی و ضروری ہے۔

[2] جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے جماعت پہلے بھی اور اب بھی یہی سمجھتی ہے کہ اس مسئلہ کو کامیابی کے مراحل تک پہنچانے کا صحیح طریقہ اور صرف یہی ہے کہ ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ اور عوام کو قادیانیوں کے سیاسی، مذہبی اور معاشی پہلوؤں کی خطرناکی سے آگاہ کیا جائے کیونکہ جس وقت ان کا ذہن اس مسئلہ میں صاف ہو جائے گا تو وہ نہ تو غلط پروپیگنڈہ کا شکار ہو سکیں گے اور نہ اس معاملہ کو صرف تماشائی کی حیثیت سے دیکھیں گے۔ اس وقت حکمران طبقہ کو قادیانیوں کے بارے میں مسلمانوں کے مطالبہ کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہ ہوگا۔ چونکہ جماعت کے نزدیک اس کام کی تکمیل ابھی باقی تھی لہٰذا ان ہی خلاؤں کو پر کرنے کا تذکرہ اس نے اپنی شوریٰ کے ریزولیشن میں کیا اور ساتھ ہی کی طرف کونسل آف ایکشن کی توجہ دلائی لیکن ڈان کی خباثت دیکھئے کہ اس نے جماعت کے اس موقف کو نہایت ہی ہوشیاری سے الٹا کر اس رنگ میں پیش کیا کہ یہ لوگ ان خلاؤں کو اس لئے پر کرنا چاہتے ہیں کہ اس کے بعد حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے۔

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

کے تحت کیا گیا اور ابھی ایسے حالات میں جب کہ لاہور میں شورش و ہنگامہ آرائی کا غبار چھٹ چکا تھا اور خود مارشل لا کے نفاذ و قیام کا کوئی جواز نہیں تھا۔

مارشل لا کے ناظم نے ۲۲ مارچ ۱۹۵۳ء کو اعلان کیا تھا کہ اب لاہور میں امن و امان ہو چکا ہے۔ کاروبار باقاعدہ ہو رہا ہے۔ بدنظمی اور بے انتظامی تمام شکنی اور انتشار کی کیفیت ختم ہو چکی ہے لہٰذا قیام امن کا پہلا دور ختم ہو چکا اور اب اس کا دوسرا دور شروع ہو رہا ہے جس کے تحت مندرجہ ذیل تعمیری کام کرنا ہیں۔

۱۔ نظم و نسق و سرکاری محکموں کو مضبوط بنانا۔

بقیہ صفحہ ۱۵۔ ۲ اس سلسلہ میں قارئین کے لئے یہ جاننا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ قادیانیوں کے مرکز ربوہ نے حال ہی میں اپنے مریدوں کو یہ بلیٹن بھیجا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

مکرمی۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ'

آپ کو یہ علم ہو ہی چکا ہوگا کہ موجودہ فتنہ میں احراری۔ مودودی ایک ساتھ متحد اور متفق ہیں ان میں سے ایک فریق میدان میں کھلے بندوں آیا اور ہنگامہ فتنہ و فساد برپا کیا۔ اب یہ دیکھ کر کہ وہ ہنگامہ درہم ہو رہا ہے مودودی میدان میں آگے آگے ہونے لگے ہیں۔ یہ بات متعدد رپورٹوں سے جو ہمیں ملی ہیں ثابت ہوتی ہے لہٰذا مندرجہ ذیل پانچ باتوں کے متعلق مجھے اطلاع دیجئے۔

۱۔ آپ کے ہاں اگر مودودی لیڈر اور ان کے کارکن ہوں جو فتنہ فساد کی آگ بھڑکا رہے ہوں تو ان کے نام و پتہ سے مفصل اطلاع دیں۔

۲۔ آپ کے ہاں ان کی تعداد کتنی ہے۔

۳۔ وہ نماز مسلمانوں کے ساتھ پڑھتے ہیں یا الگ یا کس مقام پر اپنے امام کے پیچھے۔

۴۔ ان کے اخراجات کی صورت کیا ہے اور یہ اخراجات کہاں سے آتے ہیں۔ اگر یہ چندہ سے تو یہ چندہ مقرر ہے یا غیر مقرر۔ اور اگر چندہ سے نہیں تو ان کے اخراجات کے لئے روپیہ کہاں سے آتا ہے۔

۵۔ جس جس صورت میں وہ موجودہ فتنہ و فساد کی تحریک میں حصہ لے رہے ہیں اسے مفصل بیان کیا جائے۔ یہ چٹھی بصیغہ ضروری آپ کو بھیجی جاتی ہیں جو رپورٹ ہو واقعات پر مبنی۔

والسلام۔ خاکسار ایڈیشنل ناظم اعلیٰ۔

جماعت اسلامی کو "سیکولر زدہ" اہل اقتدار اور قادیانی "وفاداروں" نے اپنے تحقیقی و تفتیشی شکنجے میں کسنے کی سازش کر رکھی ہے۔ قادیانی لال بجھکڑوں کی تحقیق تو یہ ہے کہ دونوں "احراری مودودی ایک ساتھ متحد و متفق ہیں" فرق صرف یہ ہے کہ "ایک فریق میدان میں کھلے بندوں آیا اور دوسرا اب ...... میں آگے آگے ہونے لگے ہیں"

دوسرے کی تفتیش کا نتیجہ بتا دے گا کہ دونوں مخالفین اسلام اور عاشقان لادینیت جماعت اسلامی کے خلاف تحقیق و تفتیش میں ایک دوسرے سے کتنے قریب۔ کہاں تک ہم راز اور کس حد تک معاون رہے۔

۲۔ سماج دشمن عناصر کو کچلنا۔

۳۔ رشوت ستانی اور اقربا پروری کا خاتمہ۔

۴۔ اناج کی ناجائز برآمد اور چور بازاری کا سدباب۔

۵۔ اناج کو نقصان پہونچانے سے بچانا۔

۶۔ شادی بیاہ میں زیادہ اخراجات پر پابندی۔

سوال یہ ہے کہ جب نظم و نسق قائم ہو چکا ہے مار دھاڑ ختم ہو چکی ہے۔ کاروبار چلنا شروع ہو گیا ہے۔ تو یہ کام ایسے نہیں ہیں جن کے لئے مارشل لا کی توسیع کو جائز قرار دیا جائے۔ کیونکہ یہ کام فوج کے نہیں بلکہ سول کے ہیں۔[1] بدعنوانیوں کی روک تھام اور ان خرابیوں کے استعمال کے لیے مارشل لا نہیں بلکہ سول لا درکار ہے اور اگر مسلم لیگ کی پاپولر اور ہر دلعزیز نمائندہ حکومت یہ سمجھتی ہے کہ اس میں ان کاموں کے کرنے کی صلاحیت نہیں ہے تو پھر تمام پاکستان ہی میں مارشل لا نافذ کر دینا چاہئیے کیونکہ آخر یہ بے اعتدالیاں اور برائیاں اس ملک کے کس حصہ میں نہیں ہیں۔ اس قسم کے حیلوں اور بہانوں سے مارشل لا کی مدت میں توسیع کرتے چلے جانا عوام کے دلوں میں شکوک و شبہات کے کانٹے بو رہا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ حکمران طبقہ پاکستانی فوج کی ہر دلعزیزی اور طاقت سے کام لیکر جماعت اسلامی کو مارشل لا کے ذریعہ کچلنا چاہتا ہے۔ ورنہ اگر مولانا مودودی امیر جماعت اسلامی پاکستان کے خلاف کوئی معقول الزام موجود تھا تو ملک کے سول قانون کے تحت ان پر مقدمہ کیوں نہیں چلایا گیا؟۔

یہ واقعات صاف طور پر بتا رہے ہیں کہ جماعت اسلامی کو کچلنے، کمزور اور بے دست و پا کرنے کے لئے کیسے کیسے حربے استعمال کئے گئے ہیں اور کیسی کیسی چالیں چلی گئی ہیں لیکن ان تمام ریشہ دوانیوں اور نت نئی دشواریوں کے باوجود جماعت اسلامی اپنے نصب العین کی طرف برابر بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ ہم اللہ کے فضل اور اس کی نصرت پر ایمان اور یقین رکھتے ہیں کہ جماعت اسلامی انشاء اللہ اس آزمائش سے بھی کامیاب اور بامراد نکلے گی اور اسلام دشمن عناصر کی سازشیں پانی کے بلبلوں کی طرح تھوڑی سی نمود کے بعد اللہ نے چاہا تو ختم ہو کر رہیں گی اور اسلامی نظام جو ملک کیلئے مقدر ہو چکا ہے یہاں قائم اور نافذ ہو گا۔

مشکلات اور مصائب کے اس اندھیرے میں بھی منزل کے نشان ہمیں صاف نظر آ رہے ہیں۔ افق لاکھ ابر آلود سہی لیکن طلوع آفتاب اور نمود صبح ان بدلیوں کے روکے رُک نہیں سکے گی۔ وہ جو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ اپنی جانیں بیچ چکے ہیں کسی لالچ سے متاثر اور کسی خوف سے مرعوب نہیں ہو سکتے۔

ہمارا اصل مقصد رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ چلنا اس راہ میں ہے غبار راہ بن کر اڑ گئے تو بھی کامیاب رہیں گے۔ خدا کی راہ میں اگر راحتیں اور آسودگیاں آئیں گی تو انشاء اللہ ہم اترائیں گے نہیں اور کفرانِ نعمت نہ کریں گے۔ اور سختیاں اور مصیبتیں آئیں تو صبر و استقامت بلکہ عزیمت کا ثبوت دیں گے۔

ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ حق کا مظلومیت کے دور سے گزرنا لازمی ہے ہماری تاریخ کے نہ جانے کتنے ورق شہیدوں کے خون سے آج تک لالہ گون ہیں۔ امام مالکؒ نے آخر کس کا کیا بگاڑا تھا یہی کہ انھوں نے "اقتدار" کی ہاں میں ہاں نہیں ملائی تھی۔ اس جرم بےگناہی کی پاداش میں ان پر جبر و تشدد کے پہاڑ توڑ دیئے گئے مگر کیا جبر و تشدد نے حق کو دبا دیا؟ تاریخ اس دعویٰ کو حقارت کے ساتھ ٹھکراتی ہے۔ حضرت سعید ابن مسیب پر کیا کیا نہ زیادتی تھی جو نہیں کی گئی مگر کامیابی کا سہرا اس مظلوم مجاہد کے سر رہا۔ امام ابو حنیفہؒ کو جبر و استبداد کے ذریعہ دبانے کی کوشش کی گئی لیکن عراق کا ذرہ ذرہ گواہ ہے کہ امام اعظم کو جتنا دبایا گیا اسی قدر وہ ابھرے اور سربلند ہوئے۔ امام احمد بن حنبل کو جیل کی کال کوٹھڑی میں

---

[1] ملک کا تعلیم یافتہ طبقہ یہ خطرہ محسوس کر رہا ہے کہ فوج سے اس قسم کے معمولی کام لینا گویا اسے سیاسیات میں الجھانا ہے۔

کہ بے وقوف حکمرانوں نے یہ سمجھا تھا کہ حق کی آواز دبا دی گئی لیکن تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ اس مرد مجاہد کا نعرہ حق در و دیوار سے گونجتا گیا
قلعہ میں سید احمد سرہندی مجدد الف ثانی کو محبوس کر کے طاقت و اقتدار نے کیا پھل پایا؟ یہی نا کہ جہانگیر جیسے مطلق العنان شہنشاہ کو اس تقصیر کے آگے جھکنا پڑا۔

طاقت اور سچائی کا مقابلہ کوئی نئی چیز اور حق و باطل کا تصادم کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ اور نہ نیکی اور بدی کا دست و گریباں ہونا کوئی عجوبہ ہے۔ اسلامی اصول اور کافرانہ یا نیم کافرانہ نظریے ہر دور میں ٹکراتے رہے ہیں۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

ان آزمائشوں میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہمارے سامنے ہے۔
ولنبلونکم بشیءٍ من الخوف والجوع ونقصٍ من الاموال والانفس والثمرات۔ وبشر الصابرین الذین اذا اصابتھم مصیبۃ قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون

ہماری عین تمنا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی اس بشارت کے مصداق بن جائیں۔
حق و باطل کی کشمکش جس طرح ضروری ہے اسی طرح حق کی کامیابی بھی یقینی ہے۔ معاملہ بس دیر سویر کا ہے۔ ہمیں دینِ حق کی کامیابی کا اتنا ہی یقین ہے جتنا کہ کل کے طلوع ہونے والے سورج کا یقین ہے۔ حق بہت دنوں تک مغلوب نہیں رہ سکتا۔ اس کو یک نہ ایک دن غالب آنا ہے۔

تصحیح

اپریل ۵۵ء کے شمارہ کے سوچ و بچار میں چراغ راہ خاص نمبر کے ایک مضمون "مشرقی پاکستان کے سماجی و ادبی رجحانات" کے حوالے سے کچھ اندراجات ہیں۔ اس کو غلطی سے جناب مولانا عبدالرحیم صاحب کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ یہ مقالہ جس کا حوالہ دیا گیا تھا جناب فروغ احمد صاحب کا ہے۔

۲۔ دی پاک حج ٹرانسپورٹ کمپنی راولپنڈی کے شائع کردہ پمفلٹ "پہلا قدم" کا تعارف کراتے ہوئے یہ لکھا گیا تھا کہ کرائے اور خوراک سمیت -/-/2050 روپے صرف ہوں گے۔ یہ درست نہیں۔ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) حج بیت اللہ کا کرایہ بمعہ مقامات مقدسہ 1500-0-0 و بمعہ خوراک

(۲) صرف مقامات مقدسہ کی زیارتیں اور واپسی 550-0-0

پاکستان کی نئی وزارت

چودھری احمد خاں

گورنر جنرل پاکستان نے ۱۷ اپریل ۱۹۵۳ء کو ناظم الدین وزارت کو برخاست کر دیا۔ کیونکہ وہ وزارت خوراک، اقتصادیات اور نظم و نسق کے
مسائل کو حل کرنے میں بُری طرح ناکام رہی۔ گورنر جنرل کے اس بیان سے اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔ اس وزارت کے دور میں اقتصادی بدحالی۔
بدنظمی۔ غذائی قلت اور صوبائی عصبیت نہایت ہی بدترین شکل میں رونما ہو چکی تھیں۔ اس وزارت کی بجائے گورنر جنرل نے مسٹر محمد علی (سفیر پاکستان متعینہ امریکہ)
کو نئی کابینہ کی تشکیل کا حکم دیا۔ صاحب موصوف نے نئی کابینہ مرتب بھی کر لی۔ اس کابینہ میں اگرچہ اسی نالائق وزارت کے ارکان کی اکثریت لے لی گئی ہے۔
تاہم عوام کو چاہئے۔ کہ اس کابینہ کی آئندہ کارکردگی سے اسے پرکھیں۔

گورنر جنرل کے اس اقدام کے آئینی و غیر آئینی ہونے کے بارہ میں نہ صرف پاکستان ہی میں، بلکہ بین الاقوامی سطح پر اظہار خیالات ہو رہا ہے۔
دین جمہوریت کے "مفتیوں" میں بھی اس مسئلہ کے اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ کوئی اسے آئینی (حلال) قرار دیتا ہے۔ اور کوئی غیر آئینی (حرام) لیکن مقام
صد شکر ہے۔ کہ اس اختلاف کو برا نہیں سمجھا جاتا۔ البتہ دین اسلام کے مفتیوں میں اگر اس سے بہت ہی معمولی اور فروعی مسئلہ پر بھی اختلاف ہو جائے۔
تو وہ کشتنی و گردن زدنی قرار دئے جاتے۔

اس اقدام کو آئینی قرار دینے والے حضرات گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء (جسے کہ پاکستان نے اسے اپنایا ہے) کی دفعہ ۱۰ پر انحصار
کرتے ہیں۔ ان کا استدلال یہ ہے۔ کہ اس دفعہ نے گورنر جنرل کو اختیار دے رکھا ہے۔ کہ وہ جس وزارت کو جب بھی چاہیں برخاست
کر سکتے ہیں۔ لہٰذا اس اختیار کی رو سے ان کا یہ اقدام بھی سو فیصد آئینی ہے۔ لیکن معلوم نہیں۔ یہ حضرات اس حقیقت کو کیوں بھول گئے ہیں۔ کہ جمہوری
ملک میں سرِ حکومت (HEAD OF THE STATE) کے لئے اس قسم کے اختیارات، دراصل اس عہدہ کی محض تزئین ہی کے لئے ہوتے ہیں
استعمال کے لئے نہیں۔ کیونکہ اگر وہ استعمال کئے جائیں۔ تو ایک مطلق العنان بادشاہ اور جمہوری سرِ حکومت میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ
آسٹریلیا۔ کنیڈا۔ جنوبی افریقہ وغیرہ کی ڈومینیوں نے اپنے دساتیر میں سرِ حکومت کے یہی اختیارات درج کر رکھے ہیں۔ لیکن معمول یہی رہا ہے۔
کہ وہ اس اختیار کو کبھی بھی استعمال نہیں کرتا اور اب تو کسی کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی۔ کہ ان ملکوں کا کوئی سرِ حکومت ایسا اقدام بھی
کر سکتا ہے۔

ایک ڈومینین (DOMINIEN) ہونے کی حیثیت سے پاکستان کو اسی معمول پر کاربند ہونا چاہیئے۔ اور جب تک نیا دستور مرتب نہیں ہوتا پاکستان
ڈومینین ہی ہے اور اس کے سرِ حکومت کا تقرر ملکہ برطانیہ کی منظوری سے ہوتا ہے۔ گورنر جنرل کے لئے بہتر یہ تھا۔ کہ اس نالائق وزارت سے ملک کو
نجات دلانے کے لئے رائج العمل اور معروف جمہوری طریقہ اختیار کرتے۔ اور ملک کی دستور ساز اسمبلی کے سامنے صورت حال رکھ کر وزارت کے خلاف
عدم اعتماد کا ووٹ لیتے اور اگر دستور ساز اسمبلی بھی اتنی ہی نالائق ثابت ہوتی۔ تو فوراً ہی نئے انتخابات کے ذریعہ نئی وزارت منتخب کرائی جاتی۔ یہ طریق کار
صحیح اور جمہوری تھا۔ نیز آئندہ کے لئے ایک بہتر اور اچھی نظیر بھی قائم ہوتی۔ یوں بھی پاکستان میں ابھی جمہوریت کا آغاز ہی تو ہے۔ اس قسم کے صحیح
نظائر کے لئے اشد ضرورت ہے تاکہ ایشیا اور افریقہ کے ملک بھی اپنے لئے نمونہ پائیں۔ لیکن اگر خدانخواستہ ابتدا ہی سے اس قسم کے
غیر جمہوری معمول (CONVENTION) قائم ہونے لگے۔ تو ہم بعد میں آنے والی نسلوں کے لئے بہت ہی بری مثالیں چھوڑ جائیں گے۔

اگر یہ اصول تسلیم کر لیا جائے۔ کہ مرکزی وزارت صرف گورنر جنرل ہی کے رحم وکرم پر ہے۔ تو اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا۔ کہ موجودہ وزارت اور جس دوسری کو بھی گورنر جنرل چاہے۔ فوراً برخاست کر سکتا ہے۔ آج ایک کو برخاست کر دیا تو کل دوسری کو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ ہر وزارت اپنے آپ کو اصلاً تو گورنر جنرل ہی کے سامنے جواب دہ سمجھے گی۔ اور اسی کی خوشنودی کی طلب گار ہوگی۔ عوام کی خوشنودی اس کی نظر میں ثانوی حیثیت رکھے گی۔۔۔ ادھر عوام یہ محسوس کرینگے۔ کہ ان کے سر پر ایک نیا جابر مسلط ہوگیا ہے۔ جو ان کی منتخب کردہ ہر وزارت کو برخاست کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ جس کی جبیب جبین ناز شکن آلود ہوئی۔ اور نہیں کہہ سکتے کہ کونسی بات، کونسا معاملہ اور کونسا مسئلہ طبع نازک پر گراں گزرے۔ اسی وقت وزارت کی خیر نہیں۔ عوام کا یہ تاثر ہماری تاریخ میں ایک نہایت ہی المناک اور منحوس دور کا آغاز ہوگا۔

نئے وزیراعظم مسٹر محمد علی نے حلف عہدہ لیتے ہی قوم کے سامنے اپنی حکومت کا جو لائحہ عمل پیش کیا وہ یہ ہے۔

۱۔ اتحاد و سالمیت کے ان نظریات (IDEALS) پر زور دینا۔ جن پر پاکستان معرض وجود میں آیا ہے۔

۲۔ اختلاف و انتشار، صوبائیت اور عدم رواداری کا استیصال۔

۳۔ جمہوریت کا موثر نفاذ۔ اور تمام نمائندہ اداروں کے لئے آزادانہ اور منصفانہ انتخابات

۴۔ رشوت ستانی اور اقربا نوازی سے پاک مستعد نظام حکومت کے لئے انتہائی کوشش وغیرہ۔

آیئے ہم جائزہ لیں۔ کہ یہ وزارت کس حد تک ان مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ کیونکہ اصل چیز تو ان وعدوں کا ایفاء ہے ورنہ اگر ہم بھولتے نہیں۔ تو تشکیل پاکستان کے بعد ہر وزارت نے قریب قریب اسی قسم کے پروگرام کو اپنا ہدف مقصود بنایا۔ لیکن یہ بھی ناقابل تردید واقعہ ہے۔ کہ ہر وزارت اس کے حصول میں بُری طرح نہ صرف ناکام ہی رہی۔ بلکہ اس قسم کے مسائل کی پیچیدگیوں کو پیچیدہ تر ہی کرتی رہی۔ لہٰذا مقصود ہونے کے لحاظ سے تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں جو محمد علی وزارت نے عوام کے سامنے پیش کی ہے۔ البتہ کرنے کا کام یہ ہے کہ ان مقاصد کے حصول میں جو رکاوٹیں ہیں ان کا تجزیہ کر کے انھیں دور کریں۔ اگر محمد علی وزارت ان رکاوٹوں کو دور کرنے کا صحیح اور درست طریقہ اختیار کرے۔ تو ہر فرد کی حمایت انھیں حاصل ہوگی۔ ہم ہر شق کا جائزہ لیتے ہیں اور اس کی رکاوٹوں کے ساتھ ساتھ صحیح حل بھی پیش کرتے ہیں:۔

● I اتحاد و سالمیت کے ان نظریات پر زور دینا جو پاکستان کی بنیاد ہیں:

ہر باشعور پاکستانی اس حقیقت سے آگاہ ہے۔ کہ تشکیل پاکستان صرف اسلامی نظریات ہی کی رہین منت ہے۔ برصغیر ہند و پاک کے ہر گوشہ کے مسلمانوں کو اتحاد و یگانگت کی جس رسی میں پرو دینا ممکن تھا وہ صرف اسلام ہی کی رسی تھی۔ اسلامی اصولوں کی کشش اور جاذبیت نے تمام اختلافات کو دبا دیا اور اتحاد و اتفاق قومی کا نتیجہ حصول پاکستان کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ لیکن پاکستان کے قیام کے بعد سوء اتفاق سے برسر اقتدار طبقہ نے اسلامی اصولوں اور نظریات کی جگہ نیشنلزم۔ وطنیت اور سیکولرازم جیسے غیر اسلامی نظریات کی سکہ میں قوم کو پرو دینا چاہا۔ لیکن یہ نظریات چونکہ قوم کے لئے نہ تو کوئی کشش رکھتے تھے اور نہ جاذبیت بلکہ قوم کا باشعور طبقہ ان کو غیر اسلامی زہر کو بھی سمجھتا تھا۔ لہٰذا یہ بیل منڈھے نہ چڑھی اور جاہل حکمران طبقہ ان نظریات کو ٹھونسنے کی کوشش کرتا رہا، ملت کی دیوار اتحاد اور سالمیت کی اینٹیں اکھڑتی گئیں۔ اور اب تک یہ سلسلہ چل رہا ہے۔

اگر مسٹر محمد علی دیانتداری سے اتحاد و سالمیت کے ان نظریات ہی کو پروان چڑھانا چاہتے ہیں۔ تو انھیں صاف صاف کہہ دینا چاہیے کہ ان کی وزارت سیکولرازم کی دشمن اور اسلام کی علم بردار ہے۔ لیکن اتنی سی بات کہنے سے کام نہیں چلے گا۔ کیونکہ اسلامی نقطۂ نظر سے جب عوام ان کی وزارت کے "ترتیب" کو پرکھتے ہیں۔ تو ان میں انھیں ایسے لیسے "خادمان ملت" ملتے ہیں۔ جن کا سرمایہ افتخار اور خدمات ملی کی پونجی اس سے زیادہ نہیں۔ کہ انھوں نے اسلامی دستور کے مطالبہ کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ اگر محمد علی وزارت اپنے اعمال و کردار سے عوام کے دل

عناصر کو غلط ثابت کر دے۔ تو اس وزارت سے زیادہ کوئی مقبول وزارت نہیں ہو سکتی۔

II. اختلاف و انتشار (ب) صوبائیت (ج) عدم رواداری کا استیصال

ہر صاحب بصیرت انسان جانتا ہے کہ ان برائیوں کا منبع بھی لادینی نظام سیاست ہی ہے۔ برسر اقتدار طبقہ نے اسلام پر متحد و متفق
ملت کو سیکولرازم اور نیشلزم کے غیر اسلامی رنگ میں رنگنے کی کوشش کی۔ جوں جوں اسلام سے بُعد ہوتا گیا۔ اتحاد و سالمیت کے فرنٹ میں
شگاف پڑتے گئے۔ اور خود غرض سیاست بازوں نے اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے صوبائیت کو ہوا دی۔ اور ایک طبقہ جو اپنی فرنگیت
زدگی کے جنون میں انتہائی متعصب واقع ہوا ہے۔ اس نے اسلام اور اسلام پسند لوگوں کے خلاف انتہائی عدم رواداری کا ثبوت دیا ہے۔

(۱) اختلاف و انتشار:۔ برسر اقتدار طبقہ نے ہر جگہ عہدہ و اقتدار کے لئے جنگ زرگری شروع کر دی۔ پنجاب میں ممدوٹ
دولتانہ کی چھینا جھپٹی۔ سندھ میں کھوڑو۔ عبدالستار دھینگا مشتی۔ سرحد میں قیوم کھنگ چپقلش۔ بنگال میں نورالامین۔ حمیدالحق اختلاف نے
اپنی انتہائی گھناؤنی شکل اختیار کر لی۔ اپنے اپنے جتھہ کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے کے لئے ان لوگوں نے اپنے اپنے پیروؤں کو عہدوں کی رشوتیں
دیں۔ یہاں تک کہ لیگ کے نظام کو عہدوں ہی کے گھن نے کھا لیا۔ ان میں سے ہر شخص کی زبان پر تو اتحاد۔ ایمان اور نظم کا کلمہ ہوتا۔ مگر ہاتھ اقتدار کی کرسیوں
پر دست درازیوں میں مصروف ہوتے۔ اس طرح مسلم لیگ کے ان خادمان نے عوام میں انتشار پیدا کیا۔ ان میں سے کسی کو بھی اقتدار کی دیوی کا وصال نہ
نصیب ہوا۔ اس نے لیگ پر تین حرف بھیجتے ہوئے دوسری جماعت میں شرکت کا اعلان کر دیا۔

انتشار و اختلاف اگر ختم کرنا ہے۔ تو ان "امیدواروں" کے دلوں سے عہدہ اور اقتدار کا خناس نکالنا ہوگا۔ کیونکہ عہدے بہرحال محدود ہیں
اور ان "خادمان ملت" کی تعداد لامحدود۔ اسلئے اصل علاج داخلی دنیا سے حرص و ہوس کا قلع قمع کرنا ہے۔ یہ کام بھی محض دلخوش کن نعروں سے
نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے اسلام کا انقلابی نظریہ اپنانا ہوگا۔

(ب) صوبائیت:۔ جب برسر اقتدار طبقہ نے اخوت اسلام کی جگہ نیشلزم کو ابھارنا شروع کیا۔ تو اجتماعیت کی شیرازہ بندی کے لئے اسلام
کی جگہ سیکولرازم نے لے لی۔ ظاہر ہے۔ کہ سیکولرازم کے دامن میں طبقاتی۔ جغرافیائی۔ لسانی اور لونی اختلافات کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔ جو کسی
کو دے سکے۔ چنانچہ وہ ملت جو تھوڑا ہی عرصہ پہلے ملت اسلامیہ ہونے پر فخر کرتی تھی۔ اب اس کے سیاستدان صوبائی اور علاقائی نعروں پر عروج سے
گیا۔ یہ زہر یہاں تک اتر چکا ہے کہ پارلیمنٹ کی سیٹوں سے لیکر ملازمتوں کے تناسب تک اور تجارت کے لائسنسوں سے لیکر بیرونی ممالک میں وفود
بھیجنے تک میں صوبائی کوٹا سسٹم غالب آگیا ہے۔ اس زہر کا تریاق بھی محض صوبائیت کی مخالفت میں لفظی جنگ لڑنے میں نہیں۔ بلکہ ضروری ہے کہ
نیشلزم کی جگہ اخوت اسلامی اور سیکولرازم کی جگہ دین حق کو ذہنوں میں مثبت طور پر اتارا جائے۔

(ج) عدم رواداری:۔ عدم رواداری کے لئے ایک وقت میں محلہ کے مولوی بدنام تھے۔ لیکن آج کل تو تہذیب مغرب کے دلدادہ
اس مرض کا بری طرح شکار ہو چکے ہیں۔ ہمارے ملک میں یہ طبقہ نہایت ہی قلیل التعداد ہے۔ مگر انگریز اپنے وارث کی حیثیت سے نظام حکومت اسی
کے سپرد کر گیا۔ یہ لوگ نشہ اقتدار میں مدہوش ہو کر مغرب سے درآمد مخصوص تمدن کو تمام ملک پر ٹھونسنا چاہتے ہیں۔ ملک کی اکثریت اسلامی تہذیب و
تمدن کا احیاء چاہتی ہے۔ چنانچہ جب اسلامی تہذیب تمدن کے احیاء۔ اسلامی نظام کے اجراء کا نام لیا جاتا ہے۔ تو یہ طبقہ انتہائی اشتعال میں آ جاتا ہے اور
ثبوت دیتا ہے کہ یہ طبقہ اتنا تنگ نظر۔ اتنا تنگ ظرف۔ اتنا تلخ مزاج۔ اتنا متعصب اور تہذیب مغرب کا اتنا اندھا مقلد ثابت ہوا ہے۔ کہ اسلام کا نام
سنتے ہی علمبرداران اسلام کو اپنی مخصوص زبان میں "ملا" کی گالی دیتا ہے۔ اسلام کو "ملاازم" کے نام سے بدنام کرتا ہے۔ اس طبقہ کی بیگمات کے سامنے
اسلامی احکام پردہ کا ذکر کیجئے۔ آگ بگولا ہو کر کہنے والے کا زن بچہ پر کولہو چلانے پر تیار ہو جاتی ہیں۔ رجعت پسندی اور تاریک خیالی کے فتوے
ملنے شروع ہو جاتے ہیں۔ کیا محمد علی کی حکومت اس عدم رواداری کو ختم کرنے کا عزم و ارادہ رکھتی ہے؟

دوسری قسم کی عدم رواداری جو وزارت حکومت سے ہو پائی جاتی ہے وہ مرکزی ان کے سینوں میں مستور ہے یہ لوگ خود تو اپنے مخالفین کو ہر طرح کی "گالیاں" دیتے ہیں۔ اور غدار کا ٹھپہ تو ان کا شناختی نشان عام ہو چکا ہے کہ نہایت ہی آسانی سے ہر مخالف کی پیشانی پر لگا دیا جاتا ہے۔ لیکن جب عوام ان کی غلط کاریوں اور بدکرداریوں کا نوٹس لیتے ہیں تو ایک فراخدل اور انصاف پسند، خادم قوم" کی طرح ان پر ٹھنڈے دل سے غور کر کے اپنا جائزہ لینے کی بجائے جھنجھلا کر عدم رواداری کا انتہائی گھٹیا مظاہرہ سیفٹی اور سیکورٹی ایکٹوں کے استعمال ہی کرتے ہیں۔ کیا مسٹر محمد علی اس عدم رواداری کا بھی نوٹس لینا چاہتے ہیں۔

مزید برآں کیا مسٹر محمد علی نے محسوس کیا ہے۔ کہ ان کی وزارت نے جونہی حلف وفاداری لیا۔ مذکرہ بالا طبقہ کی طرف سے اعلانات شروع ہو گئے۔ کہ اب "ملازم" کی خیر نہیں۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا یہ اسی عدم رواداری کا مظاہرہ نہیں جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے مسٹر محمد علی نے آج تک اس پراپیگنڈہ کی تردید نہیں کی۔ کیا ان کے نزدیک یہ عدم رواداری نہیں ہے؟ کیا اپنی اس خاموشی سے وہ اس ناپاک پراپیگنڈہ پر اپنی رضامندی کی مہر لگا کر عوام کو یہ سمجھنے پر مجبور کرنا چاہتے ہیں۔ کہ وہ اس مغرب زدہ طبقہ کے ہاتھ میں ایک کھلونا بن گئے ہیں جن کے نزدیک عدم رواداری کا اطلاق صرف انھیں خیالات پر ہوتا ہے جو ان کے مخصوص نظریات کے خلاف ہوں۔ رہا اسلام کے خلاف عدم رواداری کا معاملہ تو وہ عین فراخدلی اور وسیع القلبی ہے۔ مسٹر محمد علی نے اس پراپیگنڈہ کی تردید کر کے عوام کے دلوں میں شکوک و شبہات کے کانٹے بو دئے ہیں اور ان کے اس اعلان کا وزن ان کی نظروں میں کم ہو گیا ہے۔

● ۴۔ جمہوریت کا مؤثر نفاذ اور تمام نمائندہ اداروں کے لئے آزادانہ اور منصفانہ انتخابات

معلوم ہوتا ہے۔ کہ پاکستان سے ۴ یا ۵ سال باہر رہنے کے باوجود بھی مسٹر محمد علی اس سے اچھی طرح واقف ہیں۔ کہ پاکستان میں جمہوریت کی کیا گت بنی ہے۔ وہ جانتے ہیں۔ کہ سیاسی اور نظریاتی مخالفین کو کس طرح حوالہ زندان کیا گیا۔ وہ اس سے ناواقف نہیں۔ کہ کس طرح عوام کے مطالبات کو، وہ مطالبات جو شہیدوں کی سرخی سے لکھے گئے۔ ایک قلیل التعداد، مگر برسراقتدار، گروہ نے بغیر کسی دلیل، کسی معقول وجہ کے رد کر دیا اور جب عوام اپنے "نمائندوں" کے اس سلوک پر برہم ہوئے۔ تو ان کے سینوں پر گولیاں برسائی گئیں۔ مسٹر محمد علی نے دیکھا ہوگا۔ کہ کس طرح عوام کے نمائندوں کے مقابلہ پر برسراقتدار طبقہ نے اپنے "آدمیوں" کو کرسیوں پر لانے کے لئے ایسے اصحاب، نامزد کئے جو ان اسمبلیوں کے اراکین تک بھی نہ تھے۔ سندھ میں یوسف ہارون کو ایک نہیں دو مرتبہ وزیراعلیٰ نامزد کیا گیا۔ پنجاب میں فیروز خاں نون کا تقرر ابھی آپ کی آنکھوں کے سامنے کا واقعہ ہے۔

جمہوریت کا مؤثر نفاذ اور آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کا اجراء بڑے دل گردہ کا کام ہے۔ اگر مسٹر محمد علی یہ کام کر پائیں، تو تاریخ پاکستان میں وہ مقام حاصل کریں گے۔ جو آئندہ نسلوں کے لئے باعث افتخار ہوگا۔ لیکن یہ کہنے کی باتیں نہیں کرنے کے کام ہیں۔ کاش پاکستان میں اتنا بڑا کام کرنے کا عزم رکھنے والا شخص اپنی جمہوریت پسندی کا ثبوت اپنے عہدہ کی تقرری کے موقع پر دے سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ ناظم الدین وزارت کی برخاستگی گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء (جیسا کہ پاکستان میں اپنایا گیا ہے) کی دفعہ ۱۰ کے مخصوص الفاظ کی رو سے غیر آئینی نہ قرار دی جا سکے۔ لیکن کیا اسے غیر جمہوری قرار دینے سے کوئی جمہوریت پسند انکار کرنے کی جرأت کر سکتا ہے؟ ہماری دلی تمنا تھی۔ کہ مسٹر محمد علی جیسے جمہوریت نواز شخص (جیسا کہ ان کے متعلق کہا جاتا ہے۔ اور خود ان کا دعویٰ ہے) کا دامن اس داغ سے ملوث نہ ہو پاتا۔

علاوہ ازیں ان کی وزارت ہی کے ایک سرکردہ رکن نے صوبہ سرحد کے ان تمام "نمائندوں" کو وزارت عظمیٰ کے لئے نااہل قرار دیا۔ جو خود ان ہی کے نامزد کردہ تھے۔ اور وزارت اعلیٰ کا عہدہ ایک ایسے سرکاری افسر کو سونپ دیا۔ جس کا سفینۂ حیات آج تک کسی سیاسی

پاکستان کی نئی وزارت

طوفان سے بھی آشنا نہیں ہوا — اور جن کی کتاب زندگی کا ہر باب، اور ہر باب کا ہر صفحہ، ہر صفحے کی ہر سطر اور ہر سطر کا لفظ خدمت سرکار ہی سے روشن ہے۔ نیز یہ صاحب نہ مسلم لیگ کے رکن اور نہ صوبائی اسمبلی کے ممبر تھے۔ ان کو اقتدار کی کرسی پر بٹھانے کے لئے ایک ہی دن میں ان کا استعفیٰ مرکز سے منظور کرایا گیا اور اسی دن لیگ کا رکن۔ اور اسمبلی پارٹی کا لیڈر اور صوبہ کا وزیر اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ اس قسم کی حرکتیں عوام کے دلوں میں جمہوریت اور منصفانہ انتخابات کے دعوؤں کو بڑی حد تک بے وزن کر دیتی ہیں۔ ہم مانتے ہیں۔ کہ عہدوں کے تقرر میں "خسروان دانند" کا فارمولا کارفرما ہے۔ لیکن کاش مسٹر محمد علی غریب عوام کے نقطۂ نظر سے بھی سوچنے کی زحمت گوارہ فرماتے۔

● ۴۔ رشوت ستانی اور اقربا نوازی سے پاک مستعد نظام حکومت۔

مسٹر محمد علی نے قلمدان وزارت سنبھالتے ہی اعلان کیا۔ کہ ان کی وزارت مسلم لیگی وزارت ہوگی۔ ظاہر ہے کہ صاحب موصوف کا صوبوں میں ان ہی مسلم لیگی وزارتوں پر انحصار ہوگا۔ جو اس وقت قائم ہیں۔ معاشرتی خدمات میں بھی دار و مدار اسی جماعت کے کارندوں پر ہوگا۔ اقتدار حکومت کا قیام بھی ان ہی کا رہین منت ہوگا۔

ہمارے خیال میں مسٹر محمد علی نے مسلم لیگ سے پوری طرح واقف ہوئے بغیر اس میں شمولیت کا اعلان کر دیا ہے۔ ورنہ پاکستان کا کوئی واقف کار انسان نہیں جانتا۔ کہ اس جماعت کے عہدہ داران ہی کے رویہ سے بڑی حد تک سوسائٹی میں رشوت ستانی۔ اقربا نوازی اور غیر مستعد نظم حکومت کی برائیاں پھیلی ہیں۔ مسلم لیگ کے نظام میں اس وقت سب کے سب الا ماشاء اللہ ذاتی اغراض ہی کے حصول کے لئے شامل ہیں۔ ان کا قبلہ مقصود شخصی مفاد ہے۔ جب تک لیگ کے اندر رہ کر یہ مفاد پورے ہوتے ہیں تو یہ لوگ اس کے اندر رہتے ہیں۔ اور اگر باہر نکل کر ان کے پورے ہونے کی توقع ہوتی ہے۔ تو باہر آ جاتے ہیں۔ اور اگر پھر اندر جا کر مقصد بر آری ہوتی ہے۔ تو ان کے لئے یہ قدم بھی باعث عار نہیں ہوتا۔ ادھر اس جماعت (مسلم لیگ) کی فراخدلی اور رواداری کا یہ حال ہے۔ کہ نہ کسی آنیوالے پر کوئی پابندی اور نہ جانیوالے سے باز پرس ایسی حالت میں اس جماعت کے بل بوتے پر مسٹر محمد علی کا یہ دعویٰ واقف حال لوگوں کے لئے نہ صرف تعجب خیز بلکہ حیران کن ہے کیونکہ اس جماعت کے رگ و پے میں رشوت ستانی خون کی طرح گردش کرتی ہے۔ اقربا پروری اور خویش نوازی کے گھن نے اس کا جوہر اخلاق چاٹ لیا ہے۔ لیگی کارکنوں کی اکثریت —— کے منہ کو اقتدار سے غلط فائدہ اٹھانے کا خون لگ چکا ہے۔ اور اب یہ بالکل ہی کھوکھلا ڈھانچہ ہے۔ اس کے ذمہ دار کارکنوں کی آئے دن کی مداخلت نے نظم حکومت میں گڑبڑ پیدا کر دی ہے۔ مسٹر محمد علی اگر ان لوگوں کو ان حرکات سے روکیں گے۔ تو عجب نہیں۔ کہ وہ مسٹر محمد علی ہی کو لیگ سے باہر نکال دیں۔

ایک طرف تو یہ مشکلات ہیں اور دوسری طرف محمد علی کی ٹیم کے کھلاڑیوں کی شخصیتیں بھی سامنے ہیں۔ اس میں اکثریت انہی لوگوں کی ہے جو گذشتہ وزارت میں بھی اکثریت میں تھے۔ قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ جب ان لوگوں نے اُس وزارت میں اس مقصود کی طرف چلنے کے لئے کوئی اقدام نہیں کیا۔ تو کیسے باور کیا جا سکتا ہے۔ کہ دس منٹ کے اندر اندر ان لوگوں کی کایا پلٹ گئی۔ اور اب یہ ان سب برائیوں کے جانی دشمن بن گئے۔ جنہیں کل تک انگیز کر رہے تھے۔ سوال یہ ہے۔ کہ اگر یہ دیانتاً ان باتوں کو برا محسوس کر رہے تھے تو انھیں دور کرنے کے لئے کل تک انھوں نے کیا کیا۔ اگر یہ اپنے آپ کو لاچار پاتے تھے۔ تو اپنی اکثریت کی بناء پر انھوں نے وزارت ہی کا تختہ کیوں نہ الٹ دیا۔ یا پھر بوجہ مجبوری دل سے مستعفی کیوں نہ ہو گئے۔ اُس وزارت سے چمٹ کر ان برائیوں کو برداشت کرنا جن کے استیصال کی اب قسمیں کھائی جا رہی ہیں۔ عوام کو کچھ یہ سمجھنے پر مجبور کر رہا ہے کہ ان لوگوں کا نصب العین محض آسمان وزارت پر ستارے بن کر چمکنے ہی تک محدود ہے۔ کل خواجہ ناظم الدین ان برائیوں کے ختم کرنے کے سلسلہ میں لاپرواہی سے تغافل سے کام لے رہے تھے۔ لیکن یہ لوگ پھر بھی ان کے ساتھ تھے۔ کیونکہ وزارت مل رہی تھی اور آج مسٹر محمد علی ان برائیوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ تو ان کی کمانڈ میں یہ سب سے بڑے مجاہد بن گئے

پاکستان کی نئی وزارت

وزارت میں بھی ہے کیا اتنا بڑا اصلاحی کام کرنے کے لئے محمد علی اس قسم کے لوگوں پر انحصار کر سکتے ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ محمد علی صاحب کی شخصیت کا انجن ان ناکارہ گاڑیوں کو منزل مقصود کی طرف کھینچ کر لیجائیگا۔ تو اس بات کو بھی صرف وہی لوگ تسلیم کر سکتے ہیں جنہیں "طرز جمہوری" سے پوری واقفیت نہیں ہے۔ ایک شخص خواہ ڈکٹیٹرانہ اختیارات ہی کیوں نہ رکھتا ہو۔ ان برائیوں کے استیصال میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ زینۂ اقتدار کی ہر سیڑھی نے اپنی جگہ اس کام کو اپنا مقصد وجود نہ بنا لیا ہو۔ ہمارے نزدیک اگرچہ شخصیتوں کے جائزہ سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ کہ شخصیتیں بہرحال ثانوی حیثیت ہی رکھتی ہیں۔

اصل حیثیت اس طرز فکر۔ نظریہ زندگی اور مقصد حیات کو ہے۔ جو ہر کارروائی کا محرک، ہر پالیسی کا پس منظر۔ ہر اقدام کی روح اور ہر فعل کی جان ہوتا ہے۔ اگر محمد علی وزارت کا ہدف مقصود اس طرز کا نظام حکومت ہے۔ جو آج امریکہ اور دنیا کے دوسرے لادینی نظاموں کے تحت رائج ہے۔ تو پھر ایک محمد علی چھوڑ ہزار ہا محمد علی بھی آ جائیں۔ منزل مقصود تک پہونچنا نہ صرف دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ کیونکہ دوسرے ملکوں کا تجربہ ہمارے سامنے ہے چھوڑیئے کسی اور کو امریکہ ہی کو لیجئے۔ کیا وہاں پر رشوت ستانی کا وجود مفقود ہے؟ کیا وہاں اقربا نوازی نہیں ہوتی؟ کیا وہاں الیکشن میں انتہائی قسم کی دھاندلی سے پاک ہیں؟ کیا وہاں مختلف طبقات نہیں پائے جاتے؟ غرضیکہ کون سا عیب اور کون سی برائی ہے۔ جس کو امریکی نظام اپنے بطن میں نہیں رکھتا۔ اس کی وجہ یہ نہیں۔ کہ امریکہ کو کبھی دیانتدار حکمران نہیں ملے۔ یہ بھی وجہ نہیں کہ وہاں پر مخلص اور نیک نیت لوگوں کو حرم اقتدار میں پہونچنے کا موقعہ نہیں ملا۔ بلکہ اصل وجہ یہ اور صرف یہ ہے۔ کہ جس لادینی نظریہ حیات، جس سیکولر زندگی کو ان لوگوں نے اپنا رکھا ہے۔ یہ اسی کے "عطیات" ہیں۔ یہ دین و سیاست کی جدائی کا منطقی نتیجہ ہے۔ یہ اس شجر خبیثہ کے ثمرات ہیں۔ جس جگہ بھی سیکولر نظام حیات مسلط ہے وہاں ان برائیوں کا وجود ناگزیر ہے۔ سیکولر نظام زندگی اور ان خباثتوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایک ہے تو دوسری لازماً آئے گی۔ اسلئے اگر اس وزارت کے پیش نظر سیکولر طرز حکومت ہے۔ تو ہم صاف صاف کہے دیتے ہیں۔ کہ پھر ان برائیوں کا قلع قمع کرنے کا خواب کبھی بھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ برائیاں اشخاص کی تبدیلی سے نہیں نظریات کی تبدیلی سے ختم ہو سکتی ہیں۔ ان کو ختم کرنے کا صرف ایک ہی طریق ہے۔ اور وہ ہے۔ انسان کے اندر اس حقیقت کا جیتا جاگتا اور فعال تصور۔ کہ اسے ہر نجی۔ پرائیویٹ۔ شخصی۔ گھریلو۔ دفتری۔ سرکاری۔ ملی اور قومی۔ ملکی اور بین الاقوامی کام کا جواب اللہ تعالیٰ کے ہاں دینا ہے۔ اس اللہ کے سامنے جو ہر ڈھکی چھپی اور ظاہری حرکت اور ارادے تک سے واقف ہے۔ اور یہ کہ خدا کی دی ہوئی ہر قوت اور پوزیشن عملی ہو یا علمی۔ ذہنی ہو یا دماغی جسمانی ہو یا روحانی۔ داخلی ہو یا خارجی۔ ہر دلعزیزی کی ہو۔ یا منصبی۔ نمائندگی کی ہو یا نامزدگی کی قرآن و سنت کے احکام کے مطابق صرف کرنی ہے۔ اللہ کے احکام کو آخری سند اور اس کے سامنے جواب دہی کا تصور ان دو باتوں پر ایمان ہی تمام اخلاقی بیماریوں کا علاج ہے۔

چار سرٹیفکیٹ

ادارہ

(۱)

خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل پاکستان نے ۲۴ جنوری ۱۹۴۹ء کو پنجاب کی مسلم لیگی وزارت (جس کے لیڈر خان افتخار حسین آف ممدوٹ تھے) کو مندرجہ ذیل سرٹیفکیٹ دیا۔

" (پنجاب کی) پبلک زندگی بدعنوانیوں کی وجہ سے مسخ ہو گئی ہے۔ اور سروسز کا نظم و نسق سازشوں کی وجہ سے تباہ ہو گیا ہے۔ انتظامیہ کو چند لوگوں کے مفاد کی خاطر استعمال کیا گیا ہے۔ اور عوام کی توقعات اور ان کی ضروریات کی طرف بالکل کم یا بقدر صفر توجہ دی گئی ہے۔ اس حالت کی وجہ بہت سے اسباب ہیں۔ لیکن گورنر جنرل کی رائے میں سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ مختلف حالات میں منتخب شدہ مجلس قانون ساز کے ممبر آزادی کے بعد آنیوالی شدید تر ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں ناکام رہے ہیں۔"

(سرکاری اعلامیہ ۲۴ فروری ۱۹۴۹ء)

(۲)

مسٹر غلام محمد گورنر جنرل پاکستان نے ۳۰ دسمبر ۱۹۵۱ء کو سندھ کی مسلم لیگی وزارت کو مندرجہ ذیل سرٹیفکیٹ دیا۔

" گورنر جنرل سندھ کی صورت حالات کا قریب سے مطالعہ کرتے رہے ہیں۔ اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اب ایک ایسا مقام آگیا ہے جو ان کی مداخلت کا تقاضا کرتا ہے! وہ اس بات پر مطمئن ہیں کہ وزراء کی باہمی نااتفاقی اور مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے اندرونی تنازعات ، مجلس قانون ساز کے ممبروں کے غیر ذمہ دارانہ رویہ اور ان کی متزلزل ہوئی وفاداریوں کی وجہ سے پیدا شدہ عدم استحکام بڑے پیمانے پر بدعنوانیوں کے ظہور اور نظم و نسق کے معیار میں افسوسناک کمی کی وجہ سے ایسے حالات پیدا ہو چکے ہیں۔ کہ کوئی مستقل وزارت کانسٹی ٹیوشن ایکٹ (۱۹۳۵ء) کی اسکیم کے مطابق کام نہیں کر سکتی۔ لہٰذا گورنر جنرل نے گورنر کو یہ ہدایت کرنے کا فیصلہ کیا ہے کہ وہ کانسٹی ٹیوشن ایکٹ کی دفعہ ۹۲ الف کے تحت ان کی طرف سے صوبہ سندھ کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ گورنر کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ مقننہ کو برطرف کر دیں۔ اور جسقدر جلد حالات اجازت دیں۔ عام انتخابات کا اعلان کر دیں۔"

(پریس کمیونک ۳۰ دسمبر ۱۹۵۱ء)

(۳)

۲۴ مارچ ۱۹۵۳ء کو خواجہ ناظم الدین صاحب وزیراعظم پاکستان نے خود لاہور جا کر دولتانہ وزارت سے استعفیٰ طلب کر لیا۔ اگرچہ خواجہ صاحب نے اس موقعہ پر کوئی بیان نہیں دیا۔ تاہم اس قیادت کے ڈھنڈورچی " ڈان " نے اس پر مندرجہ ذیل اداریہ لکھا۔

" پنجاب کو (فوج کے) حوالہ کئے جانے پر ملک میں گونہ اطمینان کی فضا پیدا ہو جائے گی۔ اور اس صوبہ کے لوگ سب سے زیادہ خوش ہوں گے۔ وہ ایک ایسے شمالی سراب سے گزرے ہیں۔ جس کی پوری کہانی کا بیان کرنا ابھی باقی ہے! قیام پاکستان کے وقت سے ہی پاکستان کے بیرونی دشمنوں کے خطرہ کا ایک موہوم تصور ہمارے عوام کے دماغوں میں موجود رہا ہے۔ لیکن بہت کم لوگوں کو یہ خیال تھا کہ ان سے

بھی بڑے دشمن ہمارے اپنے اندر چھپے ہوئے ہیں۔ آج تک ہمیں سوائے کشمیر کے (اور کسی مقام پر) اپنی مسلح افواج کو کسی بیرونی حملہ کو روکنے کے لئے استعمال نہیں کرنا پڑتا۔ لیکن اندرون ملک میں کچھ عناصر کی شیطانی سازشوں سے ملک کو بچانے کے لئے فوج کو استعمال کرنا پڑا۔ ہر پنجابی اور ہر پاکستانی آج شکر گزاری کے ساتھ فوج کی خدمت کو تسلیم کرتا ہے۔

لیکن مارشل لاء ہمیشہ یا کسی طویل مدت کے لئے جاری نہیں رکھا جاسکتا اس مصیبت زدہ صوبہ کے لوگ حیران ہونے لگے تھے۔ کہ جب موجودہ ہنگامی صورت جس کی وجہ سے مارشل لاء کا نفاذ ضروری ہو گیا تھا ـــــ ختم ہوگی تو کیا بنے گا، اس کا جواب خواجہ ناظم الدین نے جلد ہی مؤثر طور پر فراہم کر دیا۔ انھوں نے مرکزی حکومت کے وزیر اعظم اور قومی تنظیم کے صدر کی حیثیت سے اپنے دوہرے اختیارات کا استعمال اسما طریقہ پر کیا ہے۔ آج پورا ملک ان کی توقیر و تحسین کرنے پر مجبور ہے"

(ڈان ۱۵ ر مارچ ۱۹۵۳ء)

(۴)

اب چوتھا سرٹیفکیٹ ملک غلام محمد صاحب گورنر جنرل پاکستان نے خواجہ ناظم الدین صاحب کو حسب ذیل الفاظ میں دیا ہے:۔

"میں نے بڑی بے چینی کے ساتھ ان انتہائی نازک حالات کا مطالعہ کیا ہے جن سے آج پاکستان دوچار ہے۔ غذائی حالت انتہائی نازک ہے۔ عام معاشی حالت (ہمارے سامنے) کئی ایسے مسائل پیش کرتی ہے۔ جو جو صلہ مندی سے حل کئے جانے چاہئیں۔ نظم و نسق کی حالت سنبھالنے کے لئے طاقتور ہاتھوں کی ضرورت ہے۔ ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے حکومت نے جو اقدامات کئے ہیں ان پر سخت تنقید کی بوچھاڑ کی گئی ہے۔ خود اس بات پر بھی کہ انتظامات غیر مؤثر اور ناکافی تھے، لوگوں نے نکتہ چینیاں کی ہیں۔ میں بنا بریں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ خواجہ ناظم الدین کی کابینہ ان مشکلات کا مقابلہ کرنے میں قطعاً نااہل ثابت ہوئی ہے۔ جس سے ملک دوچار ہے۔

اس ہنگامی صورتحال میں۔ جو اس طرح پیدا ہو گئی ہے۔ میں نے اپنا فرض سمجھا کہ میں کابینہ سے کہوں کہ وہ اپنی جگہ خالی کر دے۔ تاکہ ایک ایسی کابینہ بنائی جائے۔ جو پاکستان کے حق میں اپنے فرائض کو ادا کرنے کی بہتر صلاحیت رکھتی ہو اس لئے میں نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی دفعہ ۱۰ کے تحت اپنے اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے خواجہ ناظم الدین کی کابینہ کو اپنی مجلس وزراء کی حیثیت میں اسکی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا ہے۔ میں نے مسٹر محمد علی کو جو ریاستہائے متحدہ امریکہ میں حکومت پاکستان کے سفیر (اور آج کل کراچی میں مقیم ہیں) حکومت بنانے کی دعوت دی ہے۔ میں پاکستان کے عوام سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ مستقل مزاجی سے متحد ہو کر اپنے اس عزم پر جمے رہیں کہ وہ ملک کی ایک مستحکم علیہ حکومت کے ذریعہ اپنی ضروریات کو مناسب طریقہ پر پورا ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں"

(پریس کمیونک ۱۷ ر اپریل ۱۹۵۳ء)

اب اس چپا چھ میں کوئی مکھن باقی نہیں ہے

اور

پاکستان کو ایک دیانتدار، جرات مند، باحوصلہ اور مخلص قیادت کی ضرورت ہے!

فریبِ نظر

شریف احسن

او مرے دیس کو آزاد بتانے والے
اور اللہ کے بندوں کو ستانے کے لئے
اس میں قانون ابھی ظلم کا ہم معنی ہے
اور انصاف غریبوں کے دلوں میں پنہاں
اس میں قانون نے باطل کی حمایت کیلئے
تا لرز جائیں نہ بے خوف اداؤں سے محل
اب بھی اس باغ میں صیاد کے خونیں پنجے
اور گلچیں کی چمن سوز جفاؤں کے ہجوم
بوم رخصت ہو تو ہو سکتی ہے اب بھی پیدا
ہو جو باد سحری نظم گلستاں میں شریک
اس اجالے کو اندھیرا ہی کہیں گے جس سے
کس طرح کھاؤں میں اس حسن کی شوخی کا فریب
ہو نہ مایوس کہ ہر سمت اندھیرا ہے محیط
بزم دنیا میں اُجالے کے سپاہی بن کر
اٹھ کر توڑیں یہ گھٹا ٹوپ اندھیرے کا طلسم
سوزِ صدیق سے سینوں میں اُجالا کر دیں
اٹھ کر طاغوت کے بندوں کے ہوس کے خیبر
آ کے پھر ڈٹ کے تہ بندوں کے مقابل ہیں ندیم

اس میں آزاد زبانیں ہیں گرفتار ابھی
اس میں موجود ہے زنجیر کی جھنکار ابھی
اس کی درگاہوں میں نالوں کا صلا کچھ بھی نہیں
ایک دیرینہ تمنا کے سوا کچھ بھی نہیں
کتنی بے باک زبانوں کو دبا رکھا ہے
لب پہ تعزیر کے پہروں کو بٹھا رکھا ہے
مسکراتی ہوئی کلیوں کو مسل دیتے ہیں
اب بھی غنچوں کی امنگوں کو کچل دیتے ہیں
نالۂ بلبل گریاں سے ترنم کی بہار
اب بھی آ سکتی ہے غنچوں پہ تبسم کی بہار
زندگی کی شب تاریک سحر ہو نہ سکی
جو مجھے باعثِ تسکینِ نظر ہو نہ سکی
اس اندھیرے کو اجالے میں بدل سکتے ہیں
لے کے خورشید کے پرچم کو نکل سکتے ہیں
نورِ پیغمبر اسلام سے تنویر کریں
نقشِ فاروق پہ دنیا نئی تعمیر کریں
قوتِ حیدرِ کرار سے تسخیر کریں
اسوۂ حضرت شبیرؓ کی تفسیر کریں

صبح صادق

ابوالمجاہد زاہد

(۱)

رات تاریک تھی رات پرہول تھی زندگی کے کہیں بھی نظارے نہ تھے
ماہتاب آدمیت کا روپوش تھا، عدل و انصاف کے بھی ستارے نہ تھے
رہگزاروں پہ تھی رات چھائی ہوئی کوئی جگنو فضا میں چمکتا نہ تھا
جھلملاتی ہوئی ٹمٹماتی ہوئی شمعِ اخلاق کا بھی اُجالا نہ تھا

راہرو تیرگی میں بھٹکتے رہے، رہنماؤں کی بھی لاج جاتی رہی
رات اکڑتی رہی رات بڑھتی رہی ہر طرف جال اپنا بچھاتی رہی
تھی اخوت پہ بھی رات چھائی ہوئی، تھی محبت پہ بھی رات چھائی ہوئی
تھی حکومت پہ بھی رات چھائی ہوئی، تھی سیاست پہ بھی رات چھائی ہوئی

کفر و الحاد کے خارزاروں میں تھا دامنِ فکر و احساس الجھا ہوا
"شر" تو طبعاً ہی "تاریک تر" تھا مگر "خیر" پہ بھی اندھیرا تھا چھایا ہوا
بربریت کے گہرے سمندر میں تھا ڈوبا ڈوبا ہوا سا ضمیرِ بشر
وحشتوں کے دہکتے جہنم میں تھی شعلہ زن روحِ صدق و یقیں کی گر

کوہِ فاراں پہ اک "روشنی" جاگ اٹھی اور پھر بڑھ کے مہرِ مبیں ہو گئی
رات نے بڑھ کے پہلے تو دھاوا کیا اور پھر صبح کے نور میں کھو گئی
چادرِ تیرگی پارہ پارہ ہوئی امن کی روشنی مسکرانے لگی
آدمی کا مقدر چمکنے لگا ہر طرف زندگی مسکرانے لگی

کیا عرب کیا عجم ہر جگہ ہر طرف "صبحِ صادق" کے جلوے مچلنے لگے
جن مناظر پہ تھیں ظلمتوں کی تہیں وہ بھی رنگ اپنا اپنا بدلنے لگے
تانے بانے تمدن کے بدلے گئے مرنے جینے کا معیار بدلا گیا
خیر و شر کی حدیں بھی مقرر ہوئیں، کھانے پینے کا معیار بدلا گیا

ساری دنیا میں مچی سحر ہو گئی زندگی کو حسین آسرا مل گیا
جو خود اپنی طلب میں بھی ناکام تھے ان جہالت زدوں کو خدا مل گیا

(۲)

رات تاریک ہے رات پر ہول ہے زندگی کے کہیں بھی نظارے نہیں
ماہتاب آدمیت کا روپوش ہے عدل و انصاف کے بھی ستارے نہیں
روح پر کفر و الحاد کی "چھاپ" ہے ذہن مفلوج ہے فکر بیمار ہے
دودھ پیتے ہوئے زہر اگلتے ہوئے ناگوں کی بہ ہول پھنکار ہے
یہ بہاروں کی کچلی ہوئی تازگی روح کی سسکیاں امن کی تشنگی
یہ نحوست کے جلتے ہوئے قہقہے اور یہ اہرمن کی بھیانک ہنسی
رنگ و نسل و وطن کی بلائیں بھی ہیں مزدکیت کی خونیں صدائیں بھی ہیں
نفرتوں کی سلگتی ہوائیں بھی ہیں زر پرستی کی کالی فضائیں بھی ہیں
وحدت زندگی کے ترانے بھی ہیں عالمی امن کی لب پہ باتیں بھی ہیں
اور اپنی خدائی کا نشہ بھی ہے ایٹمی جنگ کی دل میں گھاتیں بھی ہیں
دامن علم و حکمت میں ہے تیرگی درسگاہوں پہ ہے رات چھائی ہوئی
رہنماؤں پہ ہے رات چھائی ہوئی اور راہوں پہ ہے رات چھائی ہوئی
کس جگہ بربریت کا ڈیرا نہیں کس جگہ ظلمتوں کا بسیرا نہیں
دور نو کی چمک پر نہ جائے کوئی یہ فریب سحر ہے سویرا نہیں
ساتھیو! امن کی ہے اگر جستجو چاہتے ہو کہ سکھ چین آرام ہو
"امن عالم پیام خدائی میں ہے" ——— ہمنوا ہو پیام خدا عام ہو
جرأت مومنانہ سے کچھ کام لو رات کا یہ فسوں توڑنا ہے تمہیں
ساتھیو! عصر حاضر کے دھارے کا رخ موڑنا ہے تمہیں موڑنا ہے تمہیں
آج بھی وہ زمانے میں موجود ہے کوہ فاراں سے ابھری تھی جو روشنی
لیکن افسوس اس کا ہے وہ روشنی چادر تیرگی میں ہے لپٹی ہوئی
ساتھیو! روشنی جس میں مستور ہے اٹھ کے وہ چادر تیرگی پھاڑ دو
رات کے سینۂ ظلمت خیز پہ صبح صادق کا بڑھ کر علم گاڑ دو

دعوت

ضیا محمد ضیا

آج ہم کس کو سنائیں اپنے غم کی داستاں
قائدانِ محترم! اے رہنمایانِ کرام

ہم نے توڑا تھا بڑی مشکل سے افرنگی کا جال
سخت تر تم نے کیا اس سے بھی محکومی کا دام

حق عطا کرتے بھی ہو آزادیٔ اظہار کا
اختلافِ رائے کا بھی لے رہے ہو انتقام

کرکے لوگوں کے حقوقِ شہریت کو پائمال
کس زباں سے اُن کو حُرّیت کا دیتے ہو پیام

فخر سے فرما رہے ہو "آج ہم آزاد ہیں"
ہو مگر فکر و نظر میں اب بھی غیروں کے غلام

کہہ رہے ہو "سارے دکھوں کی دوا اسلام ہے"
ہیں خلاف اس کے تمہاری زندگی کے سارے کام

چل رہے ہو خود بہ تقلیدِ امامانِ فرنگ
مُنہ سے کہتے ہو "مسلماں ہے زمانے کا امام"

ہم سے کہتے ہو کہ "اب خود کو بدلنا چاہیئے"
خود ذرا سے بھی تغیّر کو سمجھتے ہو حرام

غُل مچاتے ہو بداخلاقی کے طوفاں پر مگر
اپنے ہی ہاتھوں سے کرتے ہو خود اسکا انتظام

اک طرف سرمایہ داری کو غلط کہتے ہو تم
اک طرف اُس پر معیشت کا چلاتے ہو نظام

مُلک کی دولت اُڑاتے جا رہے ہو بے دریغ
قلتِ زر کا بھی رونا رو رہے ہو صبح و شام

سیرت و کردار کی تعمیر پر کرتے ہو وعظ
آپ کیوں کرتے نہیں اس پر عمل کا اہتمام

ہر غلط طرزِ عمل کو تم نے اسلامی کہا
کر دیا بدنام تم نے شرعِ پیغمبرؐ کا نام

کل تلک جو کلمہ پڑھتے تھے تمہارے نام کا
آج کچھ دل میں نہیں اُن کے تمہارا احترام

خاک میں تم نے ملائی آپ اپنی آبرو
آہ تُم نے کھو دیا خود اپنی عظمت کا مقام

کس سے سیکھا ہے یہ تم نے حکمرانی کا طریق
سہمے رہتے ہیں تمہارے نام سے بیکس عوام

ہاں اگر اب بھی خدا کے دین کو قائم کرو
مشکلیں آسان ہو سکتی ہیں ملت کی تمام

گدھ

[redacted] اسعد گیلانی

یہ ذکر ماقبل تاریخ کا ہے جب لوگ تاریخ کو تعریف کیا کرتے تھے۔
سلسلہ کوہ ہمالہ کے شمال مغرب میں ایک وسیع میدان تھا جس کے مغربی کنارے کو سمندر کی لہریں ہر وقت چاٹتی تھیں۔ شمال میں سطح مرتفع
تھی اور اس کے دامن میں ایک ریگزار تھا جہاں سے بالو کے طوفان اٹھا کرتے۔ میدان کے چاروں طرف سبز جھالر کی طرح درختوں کے جھنڈ کھڑے
تھے۔ اور اس کے سینے سے پر کئی ایک ندیاں سانپ کی طرح لوٹتی ہوئی گزرتی تھیں۔ انھیں ندیوں میں سے ایک ندی کے کنارے ایک کٹیا تھی۔
یہ کٹیا اس دیس کے مشہور و معروف فلسفی نغمہ ساز کی تھی۔ جس کے نغموں سے یہ سارا میدان اپنی بستیوں کے ساتھ گونجتا تھا اور جس کے نغمے سات
سمندر پار کے دیسوں میں بھی بکھرے ہواؤں کے دوش پر پہنچ چکے تھے۔ مغنی کا نام بختیار تھا۔ بہت کم لوگ جانتے تھے کہ وہ مغنی کس قبیلے کا فرد تھا۔ صرف
اتنا معلوم تھا کہ ایک شام میدانی چرواہوں نے ایک نہایت حسین شکارہ برف پوش پہاڑوں کے دامن میں سے آنیوالی بل کھاتی ہوئی ندی کی سطح پہ تیرتا
بہتا دیکھا اور وہ اس کی نقل و حرکت کو دم بخود دیکھتے رہے۔ ندی کے کنارے ایک مقام پر وہ شکارہ ٹھہرا۔ اور اس میں سے ایک حسین و جمیل جوڑا اترا ہے
پر اترا جس نے اسی مقام پر مستقل سکونت اختیار کر لی۔ انھیں کی یادگار یہ مغنی تھا۔ جس نے فطرت کی گود میں پرورش پائی تھی۔ اس نے چنار کے پھولوں کو
سورج کی تپش میں انگارے بنتے دیکھا تھا۔ اس نے ندی کے۔ اس تیندوے کا بھی مشاہدہ کیا تھا جو ندی کے کنارے پانی پینے کے لئے آنیوالے پیاسے
جانوروں کو اپنے جان لیوا جال میں جکڑ کر ندی کی ۔ . . . تہ میں لے جایا کرتا تھا۔ اس مقام کی فضا مغنی کے فنون کے آثار چڑھاؤ سے ہی اپنا ڈھنگ بدلتی
تھی۔ اس کی فضا میں ملک ملک کی شوکت کے نقشاں اجاگر ہوتے۔ اس کے نغموں کی لے پہ ہرنوں کی ڈاریں اپنی ان مغموم اور حیران آنکھوں کے ساتھ
مسحور گھوما کرتیں جو تاریخ کے قدیم فاتحوں کی آنکھوں سے مشابہ تھا۔
غرض وہ مغنی اس فضا کی روح کا حقیقی حکمران تھا۔ اور اس کے لبوں کی ہلکی سی کپکپاہٹ بھی ساری فضا کو گوش برآواز کر دیتی تھی۔
کچھ دنوں سے ایک اضطراب اسکی ساری ہستی کو گھیرے ہوئے تھا۔ وہ اس ندی کی طرف دیکھتا جو کسی کے حکم کی اطاعت میں ایک ہی سمت ایک

ہی رخ۔ ایک ہی بہاؤ میں چلی جا رہی تھی۔
" اے ندی تجھے حکم ہے کہ ہمیشہ ڈھلوان کی طرف بہتی رہ " گویا فطرت کے بے آواز حکم پر وہ سر جھکائے اپنا کام کئے جا رہی تھی۔
ایک وقت مقررہ پہ بادل نہ معلوم کہاں کہاں سے گھر گھر آتے نہ موسم سے پہلے نہ موسم کے بعد اور آکر چھم چھم برس جاتے۔ گویا ایک ڈیوٹی تھی جسے

ادا کرنے پہ وہ مامور بھی تھے اور مجبور بھی۔
ایک وقت مقررہ پہ مشرق سے سورج طلوع ہوتا۔ نہ کبھی تاخیر کرتا۔ نہ تعجیل۔ حکم کے بندے کی طرح۔ طلوع ہوتا۔ چڑھتا۔ اترتا۔ ڈوب جاتا۔ ایک
ننھا سا بیج چڑیا کی چونچ میں یا ہوا کے دوش پہ اڑتا ہوا آکر کہیں گر جاتا۔ زمین کی نرمی۔ گداز اور نمی اسے گدگدا کر ایک کونپل اگلنے پہ مجبور کرتے۔ اور پھر ایک
تن آور درخت کھڑا ہو جاتا جسے آندھیوں کے زبردست جھکڑ بھی جھکا نہ سکتے۔ وہ تن آور درخت اس ننھے بیج میں کہاں چھپا پڑا تھا۔ وہ سوچا کرتا۔ درخت
پھولوں سے لد جاتے۔ لیکن ہر پھول کی رنگت دوسرے سے جدا ہوتی۔ درخت پھلوں سے معمور ہو جاتے لیکن ہر پھل اپنے مزے میں یکتا ہوتا۔

پھل کے ہر حصے کا مزہ الگ ہوتا۔
فلسفی نغمہ ساز گھنٹوں فکر میں غرق رہتا۔ یہ نظم و ضبط۔ یہ جز و بندی۔ یہ رکھ رکھاؤ۔ یہ حساب و کتاب۔ اس کا فہم ایک ایسی قوت کے سامنے

سرنگوں ہو جاتا تھا۔ اس سارے کارخانے کو چلا رہی تھی۔
•انسان احمق اور ظالم ہے۔ اس ملک کے باشندے۔ بیوقوف اور ضدیاں کا سہی۔ جمادات اور نباتات تک ایک خدا کے اطاعت گذار ہیں اور
انسان صاحبِ عقل و فہم ہوکر بھی ہزاروں بتوں کو خود تراشتا ہے اور خود ہی انھیں پوجتا ہے۔
"احمق۔ ظالم۔ زیاں کار" وہ بڑبڑایا۔
اس کے تخیل میں ایک مقام پہ درشن پارہا تھا جہاں انسان زندگی کے ہر مسئلہ کے لئے خدا کی رہنمائی حاصل کریں اور صرف اسی کی اطاعت کریں
باقی اطاعتوں کو اپنی بستیوں سے شہر بدر کر دیں۔ اطاعت کے مدعیوں کو نیچا دکھادیں۔ اور اعلان کر دیں کہ ہم صرف ایک خدا کے بندے ہیں۔ اس سے زیادہ
کسی کو ہم سے بندگی کرانے کا حق نہیں ہے۔

اس نے ایک دن خواب دیکھا۔
"ایک دور کی بستی میں زلزلہ آیا اور زمین پاش پاش ہوگئی۔ ایک وسیع علاقہ کھنڈرات سے معمور ہوگیا۔ ایک شخص دبلا پتلا۔ چھریرا بدن۔ لمبا قد
خوش لباس ان کھنڈرات میں سے برآمد ہوا۔ وہ ایک چتکبرے گھوڑے پہ سوار تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک عصا تھا۔ اس نے وہ عصا سلسلۂ کوہ ہمالیہ
کی چوٹی پہ پنجال پر مارا۔ جو دو ٹکڑے ہوکر درمیان میں ایک وسیع تاریک گپھا پیچھے ہٹ گئی۔ اور اس کے پیچھے سے ایک تند و تیز دریا بہہ گیا جو سارے میدان
میں پھیل گیا۔ اس دریا کا پانی خون کی طرح سرخ تھا۔ بلکہ اس میں گندہ بلکہ انسانی اعضا اور لاشے بھی تیرتے نظر آتے تھے۔ اس دریا کے پار مغنی لے
تخلیات کا محسوس شکل میں مشاہدہ کیا۔ گویا آسمان سے جنت اتر آئی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ لپک کر وہاں پہنچ جائے لیکن خون کا دریا حائل تھا اور
ایک آہنی دروازہ اس کا راستہ روکے ہوئے تھا۔ ——— وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے ایک خوشگوار لیکن ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔ دوسرے
دن وہ اس تمنا میں سویا کہ وہ پھر خواب دیکھے لیکن اس کے خوف سے وہ آنکھیں بند کرتے ہوئے گھبراتا تھا۔ اور تعجب کہ دوسرے دن اس
نے پھر وہی خواب دیکھا۔

مغربی کنارے پہ بسنے والے ایک شہر میں ایک ویران سے مکان میں تنہائی اور غمزدگی کا شکار دو انسان رہتے تھے۔ ایک عورت
ایک مرد۔ یہ دونوں بہن بھائی تھے۔ مقصدِ زیست سے بے خبر جہد للبقا میں مصروف۔ ان کا باپ کہاں تھا۔ ان کی ماں کہاں تھی۔ انھیں
کچھ خبر نہ تھی۔ مرد میں ایک جوہر تھا جو اس کی بہن نے رات کی تنہائیوں میں بھی اور دن کے اجالوں میں بھی ہیرے کی کنی کی طرح اس کی پیشانی
پہ چمکتے دیکھا تھا یعنی صبر و استقلال تھا۔ ورنہ وہ اس ملک کے کروڑوں دوسرے انسانوں کی طرح ایک معمولی انسان تھا۔ دبلا پتلا۔ چھریرا بدن۔ لمبا قد
خوش لباس۔ کم گو اور کچھ کچھ تیز مزاج۔

مرد کا نام توصیف جاہ تھا۔ ایک رات اس نے ایک خواب دیکھا۔ دوسری شب پھر دیکھا۔ وہ خوابوں کا قائل نہ تھا۔ لیکن اس کی ساری ہستی
اس خواب کے بوجھ تلے لرز رہی تھی۔ تیسری شب پھر اس نے وہی خواب دیکھا۔ تیسری شب وہ اس حال میں اپنے بستر پہ لیٹا کہ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ
خواب اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ وہ خواب اس کے وجود کا جزو بنا جا رہا تھا۔
"ایک تیز شور پھوٹ نکلا جس کی آواز سے وہ چونک پڑا۔ اس نے دیکھا کہ اندھیروں کو چیرتی ہوئی ایک روشنی اس کی طرف چلی آرہی تھی۔ یہ روشنی
اپنے حلقہ میں ایک خوبرو شخص کو لئے ہوئے تھی جس کا صرف نصف دھڑ نظر آتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک دبیز اور منقش نقشہ تھا۔ اس نے دیکھا
نقشہ اس کے اپنے ملک کے نقشے سے بہت ملتا جلتا تھا۔ اس نقشے کو ایک سرخ لکیر شمالاً جنوباً چیرتی ہوئی نظر آتی تھی۔
آنے والے نے ایک پروقار لہجے میں کہا۔ "توصیف تمہیں قبیلے کی سربلندی کے لئے قدرت نے ایک عظیم الشان کام کے لئے منتخب کیا ہے۔
ادھر دیکھو"

توصیف نے دیکھا تو آنیوالے کی پیشانی کے عقب میں ایک وسیع خطۂ زمین کا منظر پھیلا ہوا تھا۔ گویا آنیوالے کی تخیل نے ایک محسوس صورت اختیار کر لی تھی۔ اس خطۂ زمین پر آسمان سے نور کی پھوار برس رہی تھی۔ زمین کا سینہ اپنے پوشیدہ خزانے سطح پر اگل رہا تھا۔ زر و جواہر ڈھیروں کی شکل میں سطح زمین پر پڑے جگمگا رہے تھے۔ علم و فضل کے چرچے اس کی فضا میں رچے بسے محسوس ہوتے تھے۔ خدا ترسی اور نیکی گویا اس خطے کی آب و ہوا تھے۔ پھر اس نے دیکھا کہ اس کی ندیاں دودھ کی ندیاں تھیں اور شہد کے چشمے پھوٹ رہے تھے۔ ان جلوؤں سے وہ سرزمین مہکی مہکی نظر آ رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ آسمان والوں کا اس زمین سے کوئی بہت گہرا اور قریبی تعلق تھا۔ فضا میں عبودیت کی خنکی اور اطاعت کی سرگرمی نمایاں تھی۔ اس منظر کے عقب میں ایک بلند مینار اس پورے خطۂ زمین کو ایک عبادت گاہ کا سا تقدس دے رہا تھا۔ مسحور توصیف ایک بے پناہ انداز میں اس تخیلی جنت کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا تھا۔

آنیوالے نے کہا "توصیف وہ تمہاری منزل ہے۔ تمہیں وہاں تک پہنچنا ہے۔" اور آنیوالا یہ کہہ کر گویا ہوا میں تحلیل سا ہو گیا۔

اور پھر اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہی اس کا سنسان کمرہ تھا۔ اور وہ تھا۔ اس نے فوراً اپنے کمرے کے فرش کو دیکھا دیواروں اور چھت کو دیکھا گویا وہ اچانک کسی بڑے شگاف کو دیکھنے کا منتظر تھا۔ پھر اس نے اپنے سرہانے کی طرف دیکھا ایک موہوم خیال کہ شاید وہاں کوئی اب تک کھڑا ہو۔ لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ اسے احساس ہوا کہ کوئی ہستی اپنی بے لفظ آواز میں اور اپنے بے صوت اشاروں سے اسے کچھ سمجھا رہی تھی۔ اسے کسی کام پر ابھار رہی تھی۔ لیکن وہ کام کیا تھا جو اس کے ذمے لگ رہا تھا یہ خود اس پر واضح نہ تھا۔ خواب میں آنیوالے کی پیشانی کے عقب میں نظر آنیوالی تخیلی جنت کا حسین تصور اسکی رگوں کو گرم پرجوش خون سے معمور کر رہا تھا۔ اس کے اندر ایک ہیجان اور اضطراب کھول رہا تھا۔ کوئی ہیجان تھا جو سکون کو اس کے قلب میں سے خارج کر کے اس میں اپنا گھر بنانا چاہتا تھا۔ کوئی اضطراب تھا جو اس کی ہستی سے گہرا رشتہ قائم کرنا چاہتا تھا۔ لیکن نہ اس ہیجان کی صحیح کیفیت کا اسے علم تھا اور نہ اس اضطراب کے خدوخال اس پر نمایاں تھے۔ وہ خواب کی جنت اسکے تصورات میں شہد ٹپکاتی تھی اور وہ جاگتے میں بھی گویا خواب دیکھنے کی سی کیفیت محسوس کرتا لیکن وہ کون تھا اور اس کا کیا مفہوم تھا جو وہ ان گونگے اشاروں سے خواب کے مناظر کی صورت میں اس پر واضح کرنا چاہتا تھا۔

تین دن تک مسلسل آنیوالے خواب نے اس کا سارا سکون چھین لیا۔ وہ محسوس کرنے لگا کہ اسکے ذمے کوئی فریضہ عائد ہو گیا تھا جس کے مفہوم کی بے خبری اسے ادائیگی سے غفلت کا شکار کر رہی تھی۔ وہ اپنے آپ کو مجرم محسوس کرنے لگا تھا۔

اس کی بہن اسکے اضطراب سے بے خبر تھی لیکن اس اپنی برابر کی شریک تھی۔ اس کے بھائی کی بے چینی اسکی بے چینی تھی۔ اس نے اپنی بہن سے اس کا تذکرہ کیا۔

"یہ پریشان خیالی ہے۔" اس نے ساری روداد سن کر کہا۔

"لیکن پریشانی کو پریشانی کہہ دینے سے وہ دور نہیں ہو جاتی۔"

کسی نے اسے وسطی میدانوں میں بسنے والے مشہور فلسفی نغمہ ساز کا پتہ بتایا۔ اس نے اس سے پہلے بھی اس کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ اور اضطراب اسے اپنے گھر سے نکال کر پردیس کی ٹھوکریں کھلاتا ہوا وہاں تک لے گیا۔

جب یہ تھکا ماندہ مسافر کٹیا کے قریب پہنچا۔ تو اندھیرا گہرا ہو چلا تھا اور بادل گھر گھر کر ندی کے کنارے پہاڑ تے چلے آ رہے تھے۔ اس نے دور سے ایک دیا ٹمٹماتا ہوا دیکھا اور وہ اس سمت بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ دیے کی روشنی تند جھونکوں کی نذر ہو گئی۔ اب وہ اٹکل پچو چلتا رہا اچانک بجلی نے چمک کر اسے بتایا کہ وہ کٹیا کے دروازے پر کھڑا تھا۔ سنسان شائیں شائیں کرتے ہوئے درخت اپنے لمبے لمبے سیاہی مائل سبز لبادے پہنے دو رویہ کھڑے تھے۔ کہیں کسی گوشے میں کوئی پرندہ اپنی معصوم آواز سے اس خطے میں زندگی کے آثار کا اعلان کر رہا تھا۔

گلاب کی جھاڑیوں کے درمیان پانی چمک چمک کر عالم نباتات سے اپنے مکمل تعاون کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ وہ کٹیا کے اور قریب چلا گیا۔ وہاں کوئی کتا نہ تھا جو اس کی قدم بوسی کے لئے آگے بڑھتا۔ اور کوئی انسان نہ تھا جو اس کے ذہن میں لہریں لینے والے اضطراب انگیز تصورات کو پراگندہ کرتا۔ ایک شگفتہ شادابی اور ایک سنجیدہ رونق اسکے چاروں طرف پھیلی ہوئی سی محسوس ہوتی تھی۔

دروازے پر پہنچکر وہ رک گیا۔ وہ دستک یا آواز میں انتخاب کر رہا تھا۔ شوق اسے آواز دینے پر اکسا رہا تھا اور ادب اسکی زبان پکڑے ہوئے تھا۔ اس نے سسکیوں کی آواز دروازے کی درازوں میں سے نکلتی ہوئی محسوس کی۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ وہ سسکیاں گویا بلند نالوں کی شکل میں آسمان کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ اس کا تصور فضا میں اس غیر محسوس مخلوق کے وجود کا احساس کر رہا تھا۔ جو ان سسکیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ کر آسمان کی طرف لئے جا رہی تھی تو

خلشی کی فغان نیم شبی کا تذکرہ اس نے پہلے بھی سن رکھا تھا۔ ایک مقدس ہیبت سے مرعوب ہو کر اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ ایک رقت سی اسکے قلب میں تحلیل ہو کر آنکھوں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ایک سکون سا اس کے مضطرب ذہن میں اتر رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا۔ جیسے اسکے بے صوت خواب کو قوتِ گویائی عطا ہونیوالی تھی۔

اچانک کٹیا کا دروازہ کھلا اور ۔ رندھی ہوئی آواز میں کسی نے کہا۔

"تشریف لائیے"

توصیف کو نظریں اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہ تھی وہ خاموشی سے اندر داخل ہو گیا۔

کٹیا کے کونے میں ایک بڑے سے پتھر پر ایک دیا جل رہا تھا۔ اور تنکوں کا فرش اپنے مکین کے بستر کی غمازی کر رہا تھا۔

"مجھے آپ کا انتظار تھا۔ بالآخر آپ آگئے تشریف رکھئے" مکین نے آنیوالے کیلئے ہرن کی ایک کھال بچھاتے ہوئے کہا۔

"آپ مضمحل ہیں۔ آپ تھک گئے ہیں۔ لائیے میں آپ کے پاؤں دبا دوں" میزبان نے اس کے قدموں کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

اور توصیف نے مرعوب ہو کر فوراً اپنے پاؤں کھینچ لئے۔

"مجھے گنہگار نہ کیجئے میں آپ کے پاس عقدہ کشائی کے لئے حاضر ہوا ہوں" توصیف نے پہلی بار اپنے میزبان کی طرف دیکھا۔

اور اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ کیا وہ پھر خواب دیکھ رہا تھا۔ کیا اب وہ جاگتے ہوئے بھی خواب دیکھنے لگا تھا۔ خواب میں آنیوالا اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ کتنی شباہت تھی۔ کسی نامعلوم خوف کی ایک تھرتھری سی اس کے سر سے پاؤں تک لپک گئی۔ وہی متفکرانہ چمکتی ہوئی آنکھیں۔ وہی گردن میں ایک متواضع خماؤ۔ وہی کھلتا ہوا رنگ اور موزوں ناک نقشہ۔ وہی دانتوں کی ایک مخصوص چمک۔ وہی بلند پیشانی کی کشادگی۔ وہی مخموم آنکھوں میں مسکراتی ہوئی معصومیت۔

توصیف کی زبان نے جواب دیدیا۔ اس نے کیا کیا باتیں سوچی تھیں۔ کتنے سوالات تھے۔ کتنی الجھنیں اور پیچیدگیاں تھیں۔ کتنے اضطراب اور ذہنی الجھاؤ تھے کتنی قلبی کمزوریاں اور اخلاقی بیماریاں تھیں جن کا حل وہ طلب کرنیوالا تھا لیکن حل خود مجسم شکل میں اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ اب وہ کس سے سوال کرتا اور کس الجھاؤ کا جواب طلب کرتا۔ ایک تسکین نے اس کے قلب کے سارے ناسوروں پر پھاہا رکھ دیا تھا۔

"میرے عزیز اور معزز مہمان آپ کے انتظار نے مجھے رلایا ہے۔ برسوں سے میں ایک ایسے انسان کے ہیولے کو اپنی تخیل میں جنم دے رہا ہوں اور اپنا خونِ جگر پلا پلا کر پال رہا ہوں جو اپنا احتساب خود کرنا جانتا ہو۔ جو اپنا مقام پہچانتا ہو جو کائنات کے وجود پر غور کر سکتا ہو اور کائنات کو وجود دینے والے کی عظمت کا اقرار کرنے کی ہمت رکھتا ہو۔ جب کبھی میں نے یہ تصور کیا ہے کہ میں اس قوت کا مطیع فرمان ہوں جو اس کائنات کی خالق ہے تو پہلے میرا بدن لرز گیا ہے۔ پھر دل میرا نفس نفس میرے رونگٹے رونگٹے کو جھٹلاتا رہا ہے۔ پھر دل میں نے اپنی رگوں کے اندر خون

گرد

تک ایک کر چلتے محسوس کیا ہے۔ جب کبھی میں نے یہ اعلان کرنے کی کوشش کی اور میرے ضمیر نے چٹکیاں لے لے کر مجھے اکسایا تو دن پہ دن آتے رہے اور
مجھے میرے کذبِ عمل پر شرماتے رہے۔ گفتار کے میدان جہاد میں میں نے بہت بہت گھوڑے دوڑائے لیکن مجھے اس میدان سے آگے گزرنے کی ہمت
نہ ہو سکی۔ اس لئے میں اس شخص کا انتظار کرتا رہا جو میدانِ عمل میں نیزے چمکائے اور میں آگے بڑھ کر اس کی رکاب تھاموں۔ دجلہ و فرات دو ندیوں کا نام نہ تھا
میں نے پہروں اپنی آنکھوں کو ان ندیوں کا منبع بنائے رکھا لیکن میرے سوز میں وہ گداز کبھی نہ پیدا ہوا جو پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہلا دے۔ میرے ساز میں وہ شوکت
کبھی نہ پیدا ہوئی جو قبیلوں کو میری آواز کا ہم آہنگ کر کے ابھار دے۔ میں نے بالآخر اس انسان کو اپنے تخیل میں جنم دے لیا اور اسے اپنے خونِ جگر سے پالتا اور
میں اس دن کا منتظر رہا جب وہ انسان آئے اور آکر پہاڑوں کو گداز کرے اور اپنی ضربِ کلیمی سے وہ جنت وجود میں لائے جہاں انسان کی متاعِ زندگی کو جو اس
کے لئے حاصلِ حیات ہے چور اور ڈاکو نہ لوٹ لے جاتے ہوں بلکہ وہ اپنے حقیقی مقام تک پہنچ سکے۔ بالآخر میری آنکھ نے جو اندھیرے میں بھی دیکھتی ہے
آپ کو بے شعور انسانوں کی بھیڑ میں ایک نمایاں نشانِ امتیاز لئے ہوئے دیکھا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ مردِ مجاہد جس کو میں نے اپنی تخیل کی جنت میں اپنے خونِ جگر
سے پالا ہے۔ آپ ہیں۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ آپ میں اس کام کے کرنے کی صلاحیت دیکھتا ہوں چنانچہ میں آپ کا منتظر رہا۔ میری شمعوں کی تاریکی اور میرے دلوں کا اجالا
آپ کا انتظار کرتا رہا یہاں تک کہ ننھے طائرِ بہار نے مجھے آپ کی آمد سے آگاہ کیا ـــــ"

یہ کہہ کر نغمہ ساز اٹھا اور اپنی کٹیا کے کونے میں پڑے ہوئے خشک پتوں کے ڈھیر میں سے تہ کیا ہوا ایک پارچہ اٹھا لایا۔ اور لا کر توصیف کے سامنے
بچھا دیا۔ یہ ہرن کی جھلی پر بنا ہوا ایک وسیع نقشہ تھا جس میں سبز اور زرد رنگوں کے ذریعے ملک کے دو حصوں کو دکھایا گیا تھا اور جیسے ایک سرخ لکیر درمیان سے
چیرتی ہوئی گزر رہی تھی۔ "میرے محترم مہمان! میری تخیلی جنت کی بنیاد ہے"
یہ ہے وہ شوالیوں کا وہ سلسلہ کوہ جسے ایک مردِ خدا کی ضربِ کلیم ہی توڑ سکتی ہے۔ اس کے ٹوٹنے سے وہ سبزہ زار وجود میں آسکتا ہے جس پر
میرے تخیل کی جنت آباد ہے۔ میں آپ میں وہ جوہرِ قابل پاتا ہوں جو اپنے قبیلے کو بانگِ درا سے بیدار کر دے جو انہیں بالِ جبریل لگا کر اڑائے اور انہیں
اسرار و رموزِ خودی کی سربلندی پر لے جائے۔ جو ایک خطۂ زمین اس لئے وجود میں لائے کہ وہاں خالق و مخلوق میں پردے حائل نہ ہوں اور خالق کا حکم
براہِ راست مخلوق پر نافذ ہو۔ جہاں سب کچھ خداوند کا ہو اور قیصر کا کچھ نہ ہو۔ میرے معزز مہمان اگر آپ کو اس خطۂ زمین میں داخل ہونے کا فخر حاصل
ہو تو میری ہڈیاں اس سرزمین میں دفن کرنا۔ اس لئے کہ قیصر کے اقتدار میں جینے اور مرنے والے غلام زادے کی قبر اس پر تا قیامت لعنت بھیجتی رہتی ہے اور
غلامی کے سوز سے اس کی قبر بھٹی کی طرح دہکتی رہتی ہے اس کی سوزناکی سے زمین کا پردۂ ناموس چاک ہو جاتا ہے"

بختیار کی آواز میں ایک ولولہ انگیز تمنا جھلک رہی تھی۔ وہ گویا ایک خواب دیکھ رہا تھا۔ اسکی روح اس خطۂ زمین میں پہنچنے کے لئے بیتاب تھی۔

"میرے محسن میری روح نے آپ کا پیغام سن لیا۔ میں نے جان لیا کہ آپ کا قبلۂ مقصود کیا ہے۔ میری ساری الجھنیں اپنا حل پا چکیں۔ لیکن مجھے ایک
خوف ہے کہ میرے قبیلے والوں کی اکثریت عرصۂ دراز سے غیروں سے مرعوبیت کے مرض میں مبتلا ہے۔ وہ میری بات نہ سنیں گے اور میری زبان
میں لکنت ہے ـــ"

"آپ ان سے وہ بات کہنے جا رہے ہیں جو صالحین نے اپنی قوموں سے کہی اور ہر زمانے میں کہی۔ یہ بات تو چاند سورج اور ستارے بھی
اپنی خاموش آواز سے کہہ رہے ہیں۔ آپ کی آواز سے ساری کائنات ہم آہنگ ہے۔ کیا آپ کو جھٹلائے جانے کا ڈر ہے۔ اگر جھٹلایا جانا [illegible]
بات ہے تو آپ کا وقارِ انسانیت کے ان رہنماؤں کے وقار سے زیادہ بلند نہیں ہے"

"آپ میرے لئے دعا کریں"، توصیف نے کہا۔

"میں نے آپ کے لئے عمر بھر دعا کی ہے۔ آپ میری دعا کی تخلیق ہیں۔ میں پھر دعا کرتا ہوں"

اور توصیف نے دیکھا کہ کٹیا کے کونے میں دیئے کی ٹمٹماتی لو میں بختیار مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ بارگاہِ خداوندی میں

کے لئے سربسجود ہو گیا ـــــــ اور پھر کبھی نہ اٹھا۔

صبح صادق کے وقت یہ بات توصیف کو اس طبل نے بتائی جو تخیار کے کندھے پر بیٹھا مغموم انداز میں اس بات کا اقرار کر رہا تھا کہ اطاعت صرف خداوند کے لئے ہے۔

توصیف اپنی قوم کے لئے ایک اجنبیت تھی۔ اسکی زبان میں لکنت تھی۔ اس کے لباس میں اسکی قوم کا تمدن کم جھلکتا تھا۔ وہ اپنی قوم میں پہلے سے کوئی معروف آدمی نہ تھا۔ عرصے سے قوم کے اندر رنگ برنگ کی آوازوں نے اس کے مزاج کو بگاڑ رکھا تھا لیکن قدرت نے توصیف کی آواز میں تاثیر دی تھی۔ اس کی بات میں لکنت کے باوجود یقین محکم کا رنگ جھلکتا تھا۔ اس کے طور طریقوں میں ایک عظیم اتحاد کی پکار محسوس ہوتی تھی۔ اس نے تنظیم کا کام کیا۔ اور اسکی تحریک کے بہاؤ کے سامنے ہمالہ کی مضبوطی ٹھہر نہ سکی۔ اسکے تحرکی عصا کی ضرب کاری سے پیر پنجال کی چوٹی دو ٹکڑے ہو کر اپنے درمیان ایک وادی پیدا کرتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی۔ زمانہ نے اپنے بہاؤ کا رُخ بدل دیا۔ ایک سُرخ خونی دریا ہمالہ کی چوٹی سے بہتا میدانوں کو چیرتا، انسانوں کو اپنے بہاؤ میں بہاتا خلیج عرب میں آگرا۔ سطح زمین پر ایک نیا خطہ نمودار ہو گیا۔ اس میدان جنگ میں اس کے قبیلے کے نصف نوجوان کام آئے۔

نیا خطہ زمین اس خواب کی بنیاد بننے والا تھا جو تخیار نے ایک کٹیا میں برسوں پہلے دیکھا تھا جس کا نقشہ اس نے توصیف کے سامنے پیش کیا تھا۔ توصیف نے دیکھا کہ جب وہ اٹھا تو وہ تنہا تھا اور آج اس کے گرد موٹے موٹے شکموں والے امیر زادوں کا ہجوم تھا جن میں سے ہر شخص اس پر جان نچھاور کرنے کا مدعی تھا۔ اسے نئی تعمیر کے لئے معماروں کی تلاش تھی لیکن ان میں سے کسی میں وہ صلاحیت نہ پاتا تھا جو تعمیر میں اس کا ہاتھ بٹا سکیں۔ وہ متفکر تھا۔ اسے تخیار یاد آ رہا تھا۔ وہ پہروں اس کٹیا میں بسنے والے کے تصور میں محو رہا کرتا۔ اسکی بہن جانتی تھی کہ اس کے قلب میں وہ کون سے غم کی کونپل تھی جو تن آور درخت بنتی جا رہی تھی۔

ایک صبح وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔ سردیوں کی صبح میں اسکی پیشانی عرق عرق تھی۔ اس کے قلب پر گویا کسی نے ایک غیر مرئی سے ہتھیار سے حملہ کر دیا تھا ایک بےچینی نے اسے گھیر لیا۔ بےچینی جو اس ماں کو ہو سکتی ہے جسکی آنکھوں کے سامنے اس کا بچہ آگ میں جھونکا جا رہا ہو۔ جسے مجبور کیا جا رہا ہو کہ وہ اپنے بچے کو قاتلوں اور ڈاکوؤں کے ایک گروہ کے حوالے کر دے جو اس کا خون پینے کے لئے مستعد کھڑے ہوں۔ اس کا احساس حضرت یعقوب کا سا تھا جنہوں نے جانتے بوجھتے حضرت یوسف کو ان لوگوں کے حوالے کیا تھا جن کا ظلم اور انتقام وہ جانتے تھے اور جن کا مجرمانہ عذر بھی انھیں معلوم تھا۔ فجر سے وہ کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اس میں ٹہلنے کی ہمت نہ رہی تھی۔ وہ لیٹ گیا تھا۔ وہ اطمینان سے لیٹ بھی نہ سکتا تھا وہ کروٹ پر کروٹ بدل رہا تھا۔ اس کی سانس بھی غیر ہموار تھی۔ اس کا خون بھی گویا رگوں میں خشک ہو گیا تھا اور چہرے پر زردی آ رہی تھی۔ اس کا سارا عزم جس کی مدد سے اس نے پہاڑوں کو فتح کیا تھا۔ چٹانوں کو توڑا تھا۔ دریاؤں کو چیرا تھا گویا اچانک اس کے اندر سے سلب ہو گیا تھا۔ گویا اس کے قدموں تلے سے کسی نے زمین کھینچ کر اسے عظیم کوہ پر سے نیچے لڑھکا دیا تھا اور وہ اتھاہ گہرائیوں میں نیچے ہی نیچے کسی نامعلوم سمت کی جانب گرا چلا جا رہا تھا۔ وہ ایک ایسا مسافر تھا جو ایک ایک کنکر کا سہارا لے کر ساری عمر میں ایک بلند پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا تھا اور اچانک وہ نیچے آ رہا تھا۔ اس نے ساری عمر کر آسمان کے تارے گنے تھے اور وہ اچانک حساب بھول گیا تھا۔ اس نے تنکا تنکا جمع کر کے ایک گھونسلہ بنایا تھا اور تند ہوائیں اسے لے اڑی تھیں۔ اس نے عمر بھر میں ایک کھیتی بوئی تھی اور اس میں اتھ دھے اُگ آئے تھے۔

"بتول مجھے کہیں لے چلو۔ مجھے اس مقام سے دور کہیں لے چلو۔ ان لوگوں کو مجھ سے نہ ملنے دو۔ میں جن سکوں کو چن چن کر جمع کرتا رہا وہ سب کھوٹے سکے نکلے۔ جن کا اپنے پاس رکھنا بھی جرم ہے۔ جن کا صحیح مقام کوڑے کا کوئی ڈھیر یا سنار کی بھٹی ہے۔ جو اپنی موجودہ شکل میں مجسم دھوکا

خوغریب ہیں۔ مجھے ان سے بچاؤ ـــــــ بچاؤ" وہ بڑبڑا رہا تھا۔

"بھائی ـــ خیر تو ہے" وہ اپنے بھائی کے درد سے خوب آگاہ تھی۔

"خیر نہیں ہے بتول ـــ وہ سامنے سے گزرنے والا کڑیارا مجھ سے زیادہ خوش قسمت ہے ـــ میں لٹ گیا ہوں۔ میں منزل تک پہنچنے والا تھا کہ لٹ گیا" توصیف نے رک رک کر کہا۔

"میں نے آج خواب دیکھا ہے۔ میں نے دیکھا کہ میں زمین میں سینے تک گڑا ہوں۔ میرے عصا کو دیمک چاٹ گئی ہے اور وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر میرے سامنے پڑا ہے۔ میرا راہوار مردہ پڑا ہے اور اسے بڑے بڑے گدھ نوچ رہے ہیں۔ ان کا سارا جسم گدھوں جیسا ہے لیکن ان کی شکلیں انسانوں جیسی ہیں۔ میں ان میں سے ایک ایک کو پہچانتا ہوں بتول۔ ان میں سے ایک ایک بڑھ بڑھ کر وہ درندگی سے بڑے سے بڑے خونخوار گدھ کی طرح چیخ چیخ کر تا ہوا میرے راہوار پر جھپٹا ہے اور اس کی بوٹیاں نوچ نوچ کر کھا رہا ہے۔ اس کے خون کے چھینٹے اڑا رہا ہے۔ اس کی ہڈیاں ادھر سے ادھر گھسیٹ رہا ہے۔ ان میں سے ہر ایک بوٹیاں نوچ نوچ کر میری طرف آتا ہے میرے سامنے جھکتا ہے اور پھر نوچنے میں محو ہو جاتا ہے۔ اور میں نے مختیار کو دیکھا کہ اس کے ہونٹوں پہ خاموشی کی مہر ہے اور اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ گدھ آپس میں ایک دوسرے پر جھپٹتے ہیں۔ ایک دوسرے کو پنجوں اور چونچوں سے مارتے ہیں۔ ایک دوسرے کو پر مار مار کر پرے دھکیلتے ہیں اور میرے راہوار کو نوچے جا رہے ہیں۔ اور میری منزل ابھی بہت دور ہے۔ وہ جنت جس کا تصور مختیار نے اپنی تخیل میں میرے سامنے پیش کیا تھا وہ ابھی بہت دور ہے اور گدھوں نے میرا راہوار کھا لیا ہے۔ دیمک نے میرا عصا چاٹ لیا ہے اور ظالم حوادث نے مجھے سینے تک زمین میں گاڑ دیا ہے۔ بتول میں ایسا مسافر ہوں جس کی منزل اس سے دور ہے جیسے صحراؤں کے بڑے بڑے پاٹ طے کرنے ہیں اور جس کا اونٹ توشہ لے کر کہیں غائب ہو گیا ہے ـــ بتول ان گدھوں کو میں خوب اچھی طرح پہچانتا ہوں جن کو میں نے اپنے خزانے معمور کر کے دئے آج وہ سب کھوٹے نکلے ہیں۔ آج میں پھر کنگال ہو گیا ہوں۔ اور یہ کھوٹے خزانے میری کمر کا بوجھ بن گیا۔ جو مجھے قبر کی طرف دھکیل رہے ہیں ـــــــ"

توصیف کی حالت بہت غیر ہو گئی تھی۔ اس کی سانس اکھڑ رہی تھی۔

"بتول اس کلثوم کو تو ڑ دو جو میری عیادت کے لئے آنیوالوں کا اعلان کرتی ہے۔ مجھے ان لوگوں سے خوف آتا ہے یہ خونخوار گدھ ہیں جو میرے راہوار کو نوچ کر اب مجھے نوچتے چلے آ رہے ہیں۔ بتول مجھے ان سے بچاؤ ـــ مختیار مجھے معاف کر دو" یہ خونخوار گدھ ـــــــ میرے اللہ یہ خو۔ ن ۔ خوار ـــ"

بتول نے چادر سر کا کر اپنے بھائی کا چہرہ ڈھانپ دیا۔ اور پھر آنسوؤں کی چادر نے خود اس کے چہرے کو ڈھانپ لیا۔

"میرپور مسلم کانفرنس"

ایک غیر جانبدارانہ لیکن آنکھوں دیکھا حال

یعقوب طاہر

ابھی حال میں "ڈان" (DAWN) جو اس مغرب زدہ طبقہ کا نمائندہ ہے، جس کو اسلام سے عناد اور شعائر اسلام سے نفرت ہے، کشمیر پر اداریہ لکھتے ہوئے یہ شرمناک حملہ کرتا ہے کہ مولوی تو ہمیشہ لڑتا ہی آیا ہے، قوم کے اتحاد کو ہمیشہ اس "مُلّا" نے ختم کیا ہے اور مسئلہ کشمیر اسی "مُلّا" کی انتشار انگیزیوں کے سبب حل نہیں ہونے پاتا، یہ بات اس ڈھٹائی اور بے شرمی سے کہی گئی ہے کہ انسانیت سر گریباں ہے۔ بالفعل تو ہم ماضی کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتے کہ دنیادار اقتدار کی کرسیوں کے لئے زیادہ لڑے ہیں یا علماء، اور اس اسلام دشمن طبقہ کو ہم متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اسلام دشمنی کے مظاہرے بند کرے اور شعائر اسلام کی توہین سے باز آجائے، ہم نہیں چاہتے کہ تاریخ کے وہ ابواب کھلیں، جن سے میر جعفر اور صادق کی شکلیں نمودار ہوں، جو یقیناً "مُلّا" نہ تھے، ہم یہ پسند نہیں کرتے کہ شہدائے بالاکوٹ کا وہ تاریخی آئینہ دکھایا جائے، جس میں اُن غداران ملک و ملت کے عکس ثبت ہیں، جنھیں "مُلّائیت" سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا، ہماری خواہش نہیں کہ ہند و پاکستان کی تحریک آزادی کے سلسلہ میں اُن چہروں کو بے نقاب کیا جائے، جن کو ساری دنیا —— حتیٰ کہ اس مغرب زدہ طبقہ کی زبان و قلم سے بھی —— "مسٹر" ہی کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، اور اگر اس طبقہ نے اپنی یہ روش نہ بدلی تو پھر ہم مجبور ہوں گے کہ ننگ انسانیت، ننگ دین اور ننگ وطن اُن چہروں کو عریاں کر دیں جو تاریخ کے دامن میں محفوظ ہیں اور جن کے متعلق ماضی و حال نے کبھی بھی کسی زاویہ سے "مُلّا" کا گمان نہیں کیا —— البتہ قیام پاکستان کے بعد ہی سے "سیکولر زدہ" "مسلم لیگیوں" نے اقتدار کی جو شرمناک جنگ کا آغاز کیا ہے اور جو دن بدن تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے، تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے، اس وقت اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ آخر وزارتوں کا جوڑ توڑ، پیر ووڈا کے کارنامے اور یہ جنگ زرگری کس "مُلّا" کے نام منسوب کی جائے گی؟ یہ زبان کا مسئلہ کس "مُلّا" نے کھڑا کر کے قوم میں انتشار پیدا کر رکھا ہے؟ پیریٹی کے مسئلہ پر مغرب زدہ اقتدار پرست لوگوں نے جو حرکتیں کی ہیں، وہ کس کے سامنے نہیں؟ ایک دوسرے کی پگڑیاں اچھالنے اور مقدمہ بازی تک کی نوبت پہونچ جانے میں کس "مُلّا" کا ہاتھ ہے؟ آخر آج تک عہدوں کی کشمکش کے باعث، کراچی اور بلوچستان کی مسلم لیگ کی تشکیل نہ ہو سکنے میں کون سا "مُلّا" پارٹ ادا کر رہا ہے؟

دوسری طرف علماء کی یہ حالت ہے کہ پاکستان میں انھوں نے اسلام اور ملک و ملت کی خاطر جس اتحاد و اتفاق اور وقار کا ثبوت دیا ہے، اس کی مثال "مسٹروں" کی پوری تاریخ میں نہیں دکھائی جا سکتی، آپ بھری محفل میں علماء کے اختلاف کو بہانہ بنا کر دستور اسلامی کے اصول سے گریز کرنا چاہتے ہیں مختلف مکتب فکر و خیال کے ۳۱ پاکستانی اکابر علماء جمع ہوتے ہیں اور تین دن کے اندر اندر متفقہ طور پر ۲۲ نکات ترتیب دے کر پیش کر دیتے ہیں۔ آپ ۵۲ء کی دستوری سفارشات میں مندرجہ پیریٹی پر باہم دست و گریبان ہیں اور

ابھی ابھی کرسیوں کے امکانات تلاش کرنے کی دھن میں ہیں۔ ادھر ادھر کا ہر علاقہ متحد ہو کر بیٹھے ہیں اور بالاتفاق چند ترمیمات و سفارشات مرتب کر کے رکھ دیتے ہیں۔

کشمیر کا مسئلہ پاکستان کے لئے درجہ اول کی اہمیت رکھتا ہے۔ پاکستان کے عام باشندے اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے بے تاب ہیں۔ مگر ان "مشیروں" نے اس مسئلہ پر بھی ذاتی اغراض کے لئے جنگ شروع کر رکھی ہے۔ اس کے متعلق اتنے تلخ ہیں کہ ان کا بیان کرنا ملک و ملت اور اس مسئلہ کے لئے بے حد مضر ہے۔ اس جنگ نے اس مسئلے کے حل میں کیا کیا رکاوٹ ڈالی ہے، اس کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو ان حالات اور ساری تفصیلات سے واقف ہیں۔

حال ہی میں چودھری غلام عباس کے دوبارہ سیاست میں آنے کے موقع پر میرپور (آزاد کشمیر) میں ایک کانفرنس ہوئی تھی۔ دوسرے اخباری نمائندوں کے ساتھ روزنامہ تسنیم کا نمائندہ بھی وہاں گیا۔ اس نے جو کچھ وہاں دیکھا ایک غیر جانبدار مبصر کی حیثیت سے قلمبند کر دیا ہے۔ تسنیم کی بندش کی وجہ سے اس کی اشاعت اب "چراغِ راہ" میں کی جا رہی ہے۔ ہمیں آزاد کشمیر کے قائدین اور مسلم لیگ کے لیڈروں کی جنگ اور رسہ کشی سے کوئی واسطہ نہیں، اور ہم ان کی پارٹی بازیوں میں نہ الجھنا چاہتے ہیں، نہ ہمیں اس سے دلچسپی ہے اور نہ کسی پارٹی کی طرف ہمارا ذرہ برابر بھی رجحان ہے۔ ہمیں تو بس کشمیر عزیز ہے، اور ہم اس کو پاکستان کے لئے ناگزیر سمجھتے ہیں۔ اس مقالہ کی اشاعت سے ہم صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ مسئلہ کشمیر کے حل میں سب سے بڑی رکاوٹ پاکستان کی موجودہ نااہل، خودغرض اور مطلب پرست قیادت ہے اور جب تک یہ رہے گی یہ مسئلہ حل نہ ہو سکے گا۔

(ادارہ)

سب سے چودھری غلام عباس کی طرف سے پچاس کشمیری کارکنوں سے بند کمرے میں اجلاس کے بعد سیاسیات میں واپس آنے اور پھر ۱۳ اور ۱۴ مارچ ۱۹۵۲ء کو میرپور (آزاد کشمیر) میں مسلم کانفرنس کے چودھویں سالانہ اجلاس کا اعلان پڑھا تھا۔ دل میں رہ رہ کر یہی خیال چٹکیاں لیتا رہا۔ کہ اس اجلاس میں شرکت کی جائے۔ اور پھر دیکھا جائے۔ کہ کشمیر کے معاملے میں کشمیری نوجوانوں کے احساسات میں اتنی شدت اور چودھری غلام عباس کی قیادت میں ہمہ گیر اعتماد کے باوجود کشمیر کی گتھی سلجھتی کیوں نہیں۔

خدا خدا کر کے ۱۱ مارچ ۱۹۵۲ء آئی۔ اور دفتر تسنیم میں مسلم کانفرنس لاہور والوں کی طرف سے ٹیلیفون پر اطلاع ملی۔ کہ آج شام کو مسلم کانفرنس کے اجلاس میں شرکت کے لئے کشمیری کارکنوں کی ایک پارٹی میرپور روانہ ہو رہی ہے تسنیم کا ایک نمائندہ ہمارے ساتھ بھیجا جائے۔ میری دیرینہ آرزو پوری ہوئی۔ اور قرعہ فال میرے نام پڑا۔

میں کئی دن سے اپنے جہیز کو دیکھنے کے لئے گوجرانوالہ جانے کی فکر میں تھا۔ اور مارشل لا کی وجہ سے باہر جانے کے لئے پرمٹ حاصل کرنا کچھ دشوار سا ہو رہا تھا۔ ۱۱ مارچ کو درخواست لیکر گیا۔ تو حکم ملا کر پرمٹ لینے کے لئے فوٹو پیش کرو۔ جو کسی مجسٹریٹ کی طرف سے تصدیق شدہ ہو۔ اور پولیس تمہارے متعلق نیک چلنی اور شناخت کا "سرٹیفکٹ" دے۔ اس دردسر میں کون مبتلا ہوتا۔ مگر مسلم کانفرنس والوں نے اخباری نمائندہ کی حیثیت سے پرمٹ لیکر دے دیا۔ اور میں "ناسے پہلے" گوجرانوالہ روانہ ہو گیا۔

لاہور سے باہر نکل کر ایک عجیب اطمینان اور سرور محسوس ہوا۔ اللہ کا شکر ادا کرتا ہوا گوجرانوالہ پہنچا۔ تقریباً اڑھائی گھنٹے وہاں گزار کر ریل کے ذریعہ رات کے تین اور ساڑھے تین بجے کے بیچ جہلم پہنچا۔ اور ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ بدقسمتی یا خوش قسمتی سے ہوٹل میں مسلم کانفرنس کے اجلاس میں شرکت کی غرض سے مغربی پاکستان کے کونے کونے سے آئے ہوئے کشمیری "مظلومین" کچھ فروکش تھے۔ بس قسم لے لیجئے جو سونا نصیب ہوا ہو۔ ایک ہنگامہ بے موقوف بے گھر کی رونق" والا سماں بندھا ہوا تھا۔

میں اور دوسرے ساتھی وغیرہ سے فراغت کے بعد ہوٹل سے نیچے اترا۔ تاکہ لاہور مسلم کانفرنس کے کارکنان کو دیکھوں۔ وہ ملے اور تپاک سے ملے۔ خصوصاً مسلم ہوٹل کے مالک سردار محمد عالم خاں کے خلوص، ملنساری اور تواضع کا نقش میرے دل پر اب تک باقی ہے۔

جہلم سے روانگی

حسب اعلان ہمیں آٹھ بجے جہلم سے روانہ ہونا تھا مگر دس بجے تک اڈے پر کھڑے انتظار کرتے رہے۔ معلوم ہوا کہ تمام موٹر بسوں کے ذریعے قافلہ کی شکل میں روانہ ہوں گے۔ دس بجے "آہنی گھوڑوں" پر سوار ہو کر روانگی ہوئی۔ دریائے جہلم پہلی مرتبہ دیکھا۔ ایک عظیم دریا جو خشک سالی کے دنوں میں بھی اتنا دم خم رکھتا تھا۔ کہ ہمارا راوی اس کے سامنے نالہ سا معلوم ہو رہا تھا۔ جہلم سے اس پار ڈیڑھ دو میل کے فاصلہ پر قافلہ رک گیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا۔ کہ ابھی اور موٹریں آ رہی ہیں۔ نیز بارات کے "دولہا" کا بھی انتظار ہے۔ بسیں نہر اپر جہلم کے کنارے کھڑی کر دی گئیں۔ اور ہم اتر کر گھاس میں کھڑے ہو گئے۔ وہاں سردار محمد عالم صاحب نے متعدد کشمیری نوجوانوں سے تعارف کرایا۔ گفتگو چلی۔ تو میں نے قصداً کشمیر کا ذکر چھیڑ دیا۔ تاکہ معلوم ہو۔ کشمیری نوجوان کس طرز پر سوچ رہے ہیں۔ دورانِ گفتگو میں جہاں کشمیر کو آزاد کرانے کے لئے نوجوانوں کے دلوں میں عزائم کے طوفان محسوس ہوئے۔ وہاں "عالم بالا" کی شکایتیں بھی سنیں۔ سادہ عجیب و غریب انکشافات ہونے لگے۔ مجھے کشمیر کی سیاسیات کے اندرونی پہلوؤں کا کچھ بھی علم نہیں تھا "گھر والوں" کے انکشافات سے پہلی مرتبہ کشمیر کی گتھی کے نہ سلجھ سکنے کی وجوہات کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگیں۔

کم و بیش ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کے بعد بارات کے "دولہا" یعنی چودھری غلام عباس کی کار آ گئی۔ فضا چودھری غلام عباس زندہ باد۔ قائد کشمیر زندہ باد۔ جموں و کشمیر مسلم کانفرنس زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی۔ اتفاق سے چار پانچ افراد پر مشتمل ایک بینڈ پارٹی بھی آ گئی۔ جنھیں ہمارے ہی موٹر کی چھت پر چڑھا دیا گیا۔ بینڈ اور نعروں کی گونج میں قافلہ روانہ ہو گیا۔ میری توجہ بار بار بینڈ کی طرف منعطف ہو جاتی تھی۔ اچھے اچھے گانے والے بھی سنے ہیں۔ خود بھی معمولی سا ذوق کسی زمانے میں رہ چکا ہے۔ اور بینڈ بھی ہر قسم کے سنے ہیں۔ اچھے سے اچھے بھی۔ اور برے سے برے بھی۔ مگر یقین کیجیے۔ ایسا "سریلا" بینڈ آج تک نہیں سنا تھا۔ ہر تان اور ہر سُر پر خیال آتا تھا کہ شاید اگلا "قدم" ڈھب کا ہوگا۔ مگر بینڈ والوں کی انتہائی کوشش اور "خلوص" کے باوجود سُر اور تان تھا۔ کہ کمبخت قابو ہی میں نہیں آتا تھا۔

بسوں اور ٹرکوں کی ترتیب درست کی گئی۔ آگے آگے چودھری صاحب کی کار اور پیچھے باقی موٹریں۔ شمار کرنے پر معلوم ہوا کہ بسوں اور ٹرکوں کی تعداد بائیس ہے۔ اور سب کے سب کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ بسوں کی چھتوں پر بھی سواریاں تھیں۔ اس طرح سج دھج سے اور نعرے لگاتا ہوا قافلہ روانہ ہوا۔ مجھے فوراً خیال آیا۔ کہ چودھری صاحب بھی کہیں مسلم لیگی لیڈروں کی سطح پر تو نہیں آ گئے ہیں۔ کیونکہ انھیں بھی پنجاب میں جب کہیں جلسہ کرنا ہوتا ہے تو "حاضرین" ساتھ لیجاتے ہیں۔ اسی طرح چودھری صاحب بھی اپنے "حاضرین" ساتھ ہی لئے جا رہے ہوں۔ لیکن غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ اگرچہ دونوں طرز کے لیڈروں کا "ظاہر" ایک ہی جیسا ہے۔ لیکن باطن میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مسلم لیگی لیڈروں کے "حاضرین" سرکاری اہل کار۔ ان پڑھ جاہل اور لٹھ باز دیہاتی ہوتے ہیں۔ جن کی حرکات و سکنات سے ان کے "اندر" کا پول بالکل نمایاں نظر آتا ہے۔ لیکن یہاں یہ بات نہیں تھی۔ ان میں بہت کم تعداد ان پڑھ لوگوں کی نظر آئی۔ تقریباً تمام کے تمام پڑھے لکھے معلوم ہوتے تھے۔ پھر ان میں اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ بھی نظر آئے۔ جن سے گفتگو پر معلوم ہوا۔ کہ وہ نہایت سنجیدگی سے مسائل پر سوچتے ہیں اور ہر معاملہ میں بڑی جچی تلی رائے رکھتے ہیں۔ پھر سب سے زیادہ حیران کن اور باعث دلچسپی یہ بات تھی کہ چودھری غلام عباس کے لئے ان کے دلوں اور چہروں سے بے پناہ عقیدت اور جوش جھلک رہا تھا۔

بسوں۔ ٹرکوں اور کاروں کا یہ قافلہ نہر کے کنارے کنارے روانہ ہوا۔ جہاں کہیں کوئی موڑ آتا تھا وہاں سرخ۔ پیلے رنگ کے موٹروں کا نظارہ نہر کے پانی میں عکس ڈالتا ہوا نظر آتا تھا۔ اور ان کے اندر اور چھتوں پر سفید پگڑیاں۔ ٹوپیاں اور قمیصیں نظر آتی تھیں۔ جیسے الھڑ دیہاتی لڑکیاں رنگا رنگ کے لباس زیب تن کئے کھیتوں سے کپاس کی گٹھڑیاں سروں پر رکھے کسی تنگ پہاڑی پگڈنڈی پر بھاگی جا رہی ہوں۔ راستے

میں کچی پل نہایت شاندار نظر آنے لگا۔ جہلم پل کا نقشہ بڑا جاذب نظر تھا۔ اس جگہ پانچ گول موڑ مڑنے پڑتے ہیں۔ یہاں آکر موٹروں کا نظارہ نہایت ہی جاذب نظر بن گیا۔ بالکل اسی طرز کا پل علی بیگ ہے۔ جس سے اس طرف ایک بورڈ لگا ہوا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ آزاد کشمیر اور پاکستان کی سرحد ہے۔ یہاں بڑے کھل کر نعرے لگائے گئے۔ اور آزاد کشمیر کے جھنڈے موٹروں پر لہرا دئے گئے۔ یہاں تقریباً ڈیڑھ سو آدمی قافلے کے استقبال کے لئے جمع تھے انھوں نے فلک شگاف نعروں اور گلوں سے چودھری صاحب کا استقبال کیا۔ وہ بھی تین بسوں میں سوار ہو کر قافلے کے ساتھ مل گئے۔ اور قافلہ چل دیا۔ راستے میں کئی جگہ ارد گرد کے دیہات سے لوگوں نے چھوٹی چھوٹی ٹولیوں کی شکل میں آکر چودھری غلام عباس کی قیادت پر اعتماد کا اظہار کیا۔ اور زندہ باد کے نعرے لگائے۔

نماز جمعہ

اتفاق سے اُس دن جمعہ تھا۔ ساڑھے بارہ اور ایک بجے کے درمیان پل افضل پور پر گاڑیاں رک گئیں۔ جمعہ رہ کر نماز جمعہ کا خیال آرہا تھا۔ جمعہ کے قضا ہونے پر میں چودھری غلام عباس سے مل کر احتجاج کرنے کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ بسوں سے کچھ منچلے اتر کر نہر پر وضو کرنے لگے۔ میں نے بھی وضو کیا۔ اور سڑک کے کنارے گھاس پر جا کھڑے ہوگئے۔ بعض نمازیوں نے شور مچا کر اعلان کیا۔ کہ کیوں نہیں نماز جمعہ ادا کی جائے آخر ان گیارہ بارہ سو مسلمانوں کا جمعہ کیوں ضائع جائے۔ چنانچہ سب نے بالاتفاق نماز باجماعت ادا کرنے کا اعلان کر دیا۔ ایک بھاری بھرکم مولوی صاحب نے چند لفظوں کا خطبہ پڑھا۔ اور نماز باجماعت ادا کی گئی۔ بہت سے بے حس مسلمان بسوں پر ہی بیٹھے رہے۔ جن پر سخت افسوس ہوا۔ میں چودھری غلام عباس کی راہ تک رہا تھا کہ وہ آکر خطبہ بھی پڑھائیں گے۔ اور نماز جمعہ بھی۔ کیونکہ میری آنکھیں ایسے ہی لیڈروں کی متلاشی ہیں۔ لیکن معلوم ہوا کہ انھوں نے تقریباً دو فرلانگ کے فاصلہ پر مولوی عبدالعزیز راجوروی کے پیچھے نماز پڑھی ہے۔ چودھری حمید اللہ وزیر خزانہ آزاد کشمیر بھی اپنی کار میں قافلے سے آملے

ٹول ٹیکس

بہرحال نماز جمعہ کے بعد قافلہ پھر روانہ ہوا اب ہم نہر کو ایک طرف چھوڑ کر دائیں طرف مڑ گئے۔ کچھ دور چل کر موٹریں رک گئیں۔ اور بائیں طرف کو دو تین کرسیاں اور میز سجائے کچھ ملازم نظر آئے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا۔ کہ وہ ٹول ٹیکس کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ پوچھا گیا کہ یہ کیا بلا ہے۔ معلوم ہوا۔ کہ یہاں سے سڑک عام استعمال کے لئے ممنوع ہے۔ پہلے سے اجازت لیکر جانا پڑتا ہے اور فی سواری -/۶/- روپے سڑک کا ٹیکس دینا پڑتا ہے۔ ایک پڑھے لکھے نوجوان نے بتایا کہ ہم سے اچھا تو مہاراجہ کشمیر ہی تھا۔ جس نے سابقہ ایجی ٹیشن کے دنوں میں برطانوی فوجوں کی نقل و حرکت کا ٹول ٹیکس لاکھوں روپے کی شکل میں برطانوی حکومت ہند سے وصول کیا تھا۔ لیکن پچھلے دنوں جب پاکستانی فوجیں اس طرف آئیں۔ تو ان کی نقل و حرکت سے ٹول ٹیکس کی جو رقم کم و بیش ایک لاکھ دس ہزار روپیہ بنتی ہے۔ وہ حکومت پاکستان نے آزاد کشمیر کو آج تک نہیں دی۔ ایک دوسرے نوجوان نے نہایت ہی درد بھرے انداز میں بتایا کہ آپ ٹول ٹیکس کو رو رہے ہیں۔ یہاں تو جس طرح انگریز کے زمانے میں دیسی سپاہی کی تنخواہ بیس روپے ہوتی تھی۔ اور برطانوی سپاہی کی اس سے کئی گنا زیادہ۔ بالکل اسی طرح اب دیسی سپاہی اور پاکستانی سپاہی کی تنخواہوں میں تفاوت ہے۔ ایک کشمیری ڈی۔ سی کو پانچ سو روپے ماہوار تنخواہ ملتی ہے۔ اور اسی عہدے پر اگر پاکستان کا کوئی افسر لگایا جائے۔ تو اس کو بارہ سو روپے ماہوار تنخواہ دی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ ہم لوگ ایک معمولی چپراسی تک بھی اپنی مرضی سے نہیں رکھ سکتے۔ میرے لئے یہ انکشافات اتنے المناک تھے۔ کہ میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ مگر دل دونوں ہاتھوں میں تھام کر بیٹھا سنتا رہا۔ ایک اور نوجوان کہنے لگے کشمیری قوم کی غیرت تباہ کر دی گئی ہے۔ انھیں کیمپوں میں مفت کی روٹیوں پر [illegible] نے پھینک کے ان کے اندر سے انسانی شرافت۔ حمیت اور خودداری بالکل محروم کر کے رکھ دی گئی ہے۔ یہی نہیں۔ ہماری اپنی اندرونی سیاست کو بھی اتنا گندہ کر دیا گیا ہے۔ کہ ہر لیڈر ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی ادھیڑ بن میں اپنا وقت گنوا رہا ہے جن لوگوں کو کل تک کوئی جانتا بھی نہیں تھا۔ انھیں بڑے بڑے

ہمارے دیگر ایک دوسرے کے خلاف استعمال کیا جاتا ہے۔ اور سب سے زیادہ جس شخص کو دبانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ وہ چوہدری غلام عباس ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ یہ شخص بے داغ سیرت کا مالک ہے۔ اس نے کشمیر اور جموں کی آزادی کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا ہے۔ اور ساری کی ساری کشمیری قوم اس کی قیادت کو دل سے چاہتی ہے لیکن "خواجگانِ بلند بام" کو یہی چیز پسند نہیں۔ ان کے قریب ترین ساتھیوں کو بڑے بڑے لالچ دیکر توڑ لیا گیا ہے میں نے عرض کیا۔ کہ چوہدری صاحب نے ایسے ساتھیوں کو اپنے قریب کیوں آنے دیا۔ اور ان پر اعتماد کیوں کیا۔ تو وہی صاحب فرمانے لگے مگر بس ان کی یہی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اور ان کی اسی سادگی سے فائدہ اٹھا کر لوگوں نے بڑے بڑے "سیاسی میدان" مارے ہیں۔ حتیٰ کہ اس شخص سے جیتے جی وہ سلوک کیا گیا ہے۔ جو کسی "صاحب کرامت" بزرگ کی خانقاہ سے اس کے مطلب پرست مجاور کیا کرتے ہیں۔ ان کا نام بیچ بیچ کر بڑے بڑے فائدے حاصل کیے گئے ہیں۔ بتائیے۔ اس ایک شخص کے خلوص اور ایمانداری کو ہم لوگ آخر کیا کریں۔

ساتویں پاس وزیر تعلیم | میرے ذہن میں ابھی یہی انکشافات چٹکیاں لے رہے تھے۔ کہ سامنے ایک گاؤں نظر پڑا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا۔ کہ یہ چیچیاں ہے۔ اور چوہدری لرزحسین وزیر تعلیم آزاد کشمیر گورنمنٹ کا گاؤں ہے۔ اور وہ سامنے ان کا مکان ہے۔ میں نے وزیر کے مکان کو غور سے دیکھا ایک طویلہ نما پختہ مکان تھا۔ بالکل اسی طرح کا جس طرح کے مکانات دیہات میں چودھریوں کے ہوتے ہیں۔ اس میں "وزارت" کی کوئی "کرم فرمائی" نظر نہیں آتی تھی۔ بلکہ سو فیصدی "دیہاتیت" ٹپک رہی تھی۔ میں اس زمانے میں ایسے "درویش" وزیر سے متاثر ہو رہا تھا۔ کہ ان کے مکان کے سامنے چوپایوں کی کچی "کوٹھڑیوں" میں بیٹھی ہوئی دس بارہ عورتیں نظر آئیں۔ جو قافلہ کی طرف سے غلام عباس زندہ باد کے نعروں کے جواب میں خالص دیہاتی انداز میں ہاتھوں اور جوتیوں کے اشارے سے "مردہ باد" کا اظہار کر رہی تھیں۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے حیران ہو کر پوچھا۔ کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ بتایا گیا۔ کہ یہ چودہری نور حسین کے گاؤں کی عورتیں ہیں۔ وہ چودہری غلام عباس کے خلاف ہے ——؟ دریافت کیا کہ ایسا کیوں ہے۔ اور یہ کیا بدتمیزی ہے۔ بتایا گیا کہ یہ وہ بزرگ ہیں۔ جنہیں قیام پاکستان سے پہلے کوئی جانتا بھی نہیں تھا۔ پاکستان اور کشمیر کے ہنگاموں کے دنوں میں انھیں "دست غیب" سے کچھ مل گیا۔ اور پھر انھیں پنڈی اور مظفرآباد میں اینٹوں کے بھٹے الاٹ ہو گئے۔ جن سے انھیں لاکھوں کی آمدنی ہونے لگی۔ اور بعد ازاں مخصوص مصلحتوں کی بنا پر انہیں آزاد کشمیر کا وزیر تعلیم بنا دیا گیا۔ میں نے ان عورتوں کا "منظاہرہ" دیکھ کر مجھے یہ شک ہوتا ہے۔ کہ یہ شخص تعلیم یافتہ نہیں ہے۔ اور اگر خود تعلیم یافتہ ہے تو اس کے گھر میں ضرور جہالت ہے۔ ایک نوجوان درد بھری آواز میں کہنے لگے۔ کہ یہ شخص مڈل سے کم پڑھا ہوا ہے۔ عرض کیا کہ ایک مڈل پاس کو وزیر تعلیم کیوں مقرر کیا گیا ہے۔ آپ لوگ احتجاج کیوں نہیں کرتے؟ کہنے لگے۔ کہ ہم لوگ انگریزوں کو برا بھلا کہا کرتے تھے۔ وہ کافر تھے۔ اور ان کا مقصد ہی ہم کو ایک دوسرے سے پھاڑ کر اپنی حکومت کی بنیادوں کو مستحکم سے مستحکم تر کرنا تھا۔ انھیں ہم سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ مگر اب ہماری اپنی حکومت ہے۔ کس سے گلہ کریں۔ اور کس سے شکوہ۔ کس کس ملکہ کو روئیں۔ اور کون سا دروازہ کھٹکھٹائیں۔

بنجر علاقہ | چیچیاں سے آگے باقاعدہ پہاڑی سلسلہ شروع ہو گیا۔ دور دور تک نظریں دوڑا کر دیکھا۔ سارا علاقہ بالکل بنجر اور خشک نظر آ رہا تھا۔ میں نے پوچھا کشمیر کے متعلق تو سنا تھا۔ کہ بڑا سرسبز اور جنت نظیر ہے۔ مگر یہاں کی سرسبزی کہاں گئی۔ بتایا گیا۔ کہ زرخیز اور سرسبز علاقہ سارے کا سارا شیخ عبداللہ اور بھارت کے پاس ہے۔ اور یہاں ہمارے پاس بالکل اسی قسم کا سارا علاقہ بھرا ہوا ہے۔ آبادی اور رقبہ کے لحاظ سے بھی آزاد کشمیر کا علاقہ غلام کشمیر سے ایک چوتھائی ہے۔ میں حیران تھا۔ کہ اسی چھہ کوس کے علاقہ کے لئے لوگ مرتے جا رہے ہیں؟ اور پورے جموں و کشمیر کو آزاد کرلینے کی بجائے اس مختصر علاقہ کو بھی سیاسی سازشوں کا اکھاڑہ بنائے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔

آنکھ مچولی | پہاڑی سلسلہ شروع ہونے پر ڈرائیوروں نے چھتوں پر بیٹھنے والے رضاکاروں سے کہا۔ کہ قدم قدم پر موڑ اور نشیب و

گزر رہے ہیں۔ لہٰذا سنبھل کر بیٹھے گا یہاں پہنچ کر نظارہ اتنا دلفریب ہو گیا کہ اس کا تصور آج تک دل میں چٹکیاں لے رہا ہے۔ ایک سڑک ادھر جا رہی ہے۔ تو دوسری سڑک اس سے سر کے اوپر سے گزر گئی۔ وہ چار موٹریں دائیں طرف کو بھاگی جا رہی ہیں۔ تو دو بالکل بائیں طرف کو۔ کچھ بالکل سر کے اوپر سے سرپٹ دوڑ رہی ہیں۔ تو کچھ بالکل پاؤں کے نیچے۔ ابھی توجہ ادھر ہے کہ دوسری طرف دو موٹریں دائیں طرف سے یوں آئیں کہ گویا ابھی جیسے کوئی ننھا سا خرگوش قدموں کی آہٹ پا کر اچانک جھاڑی سے نکل بھاگے۔ ہم سب کے اوپر پہنچ گئے۔ وہ دیکھئے ایک ٹرک یوں معلوم ہو رہا ہے۔ جیسے کسی بڑے درخت کے ساتھ کوئی بڑا سا پنجرہ لٹک رہا ہو۔ وہ ایک خوبصورت سی بس کھڑی ہو گئی۔ شاید موڑ آ گئی تھی۔ یہ نظارہ دیکھ کر مجھے بچپن یاد آ رہا تھا جبکہ ہم الہڑ دیہاتی لڑکیاں آنکھ مچولی کھیلا کرتے تھے۔ وہ ناہید بہن کا دائیں گلی میں مڑ جانا۔ وہ آمنہ کا کھٹ سے کوٹھے پر چڑھ جانا اور وہاں سے دوپٹہ لہرا لہرا کر اور انگوٹھا ہلا ہلا کر ہمیں چیلنج کرنا۔ کہ آؤ چھو لو۔ کوئی گلی میں بھاگ رہا ہے۔ تو کوئی سیڑھیاں پھلانگ رہا ہے۔ ایک چھت کی منڈیر پر آنکھیں مٹکا رہا ہے۔ تو دوسری پاؤں پکڑ کر منہ بسور رہی ہے۔ کیا ہوا ناہید بہن؟ موچ آ گئی ہے۔ اسی تصور میں مرے جسم کا رواں رواں ابھی یہ شعر الاپ رہا تھا۔

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا!

مخالفانہ نعرے اور سنگباری

کہ سامنے بائیں طرف ایک گاؤں نظر پڑا۔ جہاں دو تین سو آدمی کھڑے تھے۔ ہم نے سمجھا کہ استقبال کے لئے کھڑے ہوں گے۔ مگر معلوم ہوا کہ وہ چودھری نور حسین کے آدمی ہیں۔ اور کالی جھنڈیاں اٹھا غلام عباس مردہ باد کے نعروں سے مظاہرہ کر رہے ہیں۔ ان کے جواب میں قافلہ والوں نے چودھری غلام عباس زندہ باد کے نعرے لگائے۔ قریب تھا کہ فساد ہو جاتا۔ لیکن خدا جانے کس طرح فساد نہ ہو سکا۔ چودھری حمید اللہ کی کار بھی ساتھ ہی تھی۔ اتنے میں پیچھے سے چودھری نور حسین بھی اپنی کار میں تشریف لے آئے۔ قافلہ اور آگے بڑھا۔ تو تین چار سو کے لگ بھگ اور آدمی کھڑے تھے۔ قافلہ کے وہاں پہنچتے ہی ان لوگوں نے پتھر برسانے شروع کر دئے۔ کچھ آدمیوں کے سر پھٹے۔ اور کچھ کے بازو وغیرہ زخمی ہوئے۔ یہ دیکھ کر چودھری غلام عباس کے ساتھی بسوں اور ٹرکوں سے اتر پڑے۔ قریب کے کھیتوں میں پتھر بکھرے پڑے تھے۔ وہ اٹھا اٹھا کر انھوں نے بھی سنگ باری شروع کر دی جس سے وہ لوگ بھاگ کھڑے ہوئے۔ ایک صاحب نے بتایا۔ کہ چودھری نور حسین بازو ہلا ہلا کر ان کو واپس بلا رہے ہیں۔ میں اس شخص کی جرأت اور بہادری سے بڑا متاثر ہوا۔ کہ اپنے مجمع کی قیادت خود کر رہا ہے۔ اور کس شان سے کر رہا ہے۔ کہ اپنے مخالف گروہ کے عین درمیان میں تن تنہا کار لیکر کھڑا ہے۔ وہ تین نہاد ساتھی ہیں تو ضرور۔ مگر بالکل بے سود قسم کے۔ ان کے اشارہ پر دیہاتی لوگ پھر پلٹے۔ کہ ہمارا قافلہ چل پڑتا تا کہ انھوں نے موٹروں میں سوار قافلہ والوں پر پھر پتھراؤ شروع کر دیا۔ قافلہ والوں نے پھر موٹروں سے اتر کر اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔ ایک دبلا پتلا مگر مضبوط آدمی ان کی طرف یہ کہتے ہوئے لپکا۔ کہ میں بھی دلیر ہوں۔ یہ کہتے ہوئے اس نے ہوا میں پستول کے دو فائر بھی کئے۔ اس کا نام سنتے ہی کشمیری دیہاتی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ ان کو بھگا کر قافلہ والے چودھری نور حسین پر ٹوٹ پڑے۔ اور ان کی کار پر پتھر مار کر شیشے وغیرہ توڑ دئے۔ ان کے دو تین ساتھی کار سے نکل کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان کو لوگوں نے مارنے کی کوشش کی۔ لیکن راولپنڈی کے ایک نوجوان مفتی ضیاء الحق بخاری اور دو اور آدمیوں نے چودھری نور حسین کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ اور اس طرح بڑی مشکل سے ان کی جان بچی۔ پولیس وہاں چند قدم پر تماشہ کھڑی دیکھتی رہی۔ مگر کیا کچھ نہیں۔ مفتی صاحب اور ان کے ساتھیوں نے چودھری نور حسین کو کار میں بٹھا کر روانہ کر دیا۔ اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ قافلہ والے مفتی صاحب پر بہت بگڑے۔ کہ آپ نے ایک ایسے شخص کی جان بچائی ہے۔ جو چند ٹکوں کے عوض ملک اور قوم سے دشمنی کر رہا ہے اور جس نے آج ایک ایسی قیامت بپا کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس میں سینکڑوں انسان موت کے گھاٹ اتر سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے جواب دیا کہ جو کچھ ان کا فرض تھا۔ وہ انھوں نے ادا کیا۔ اور جو ہمارا فرض تھا۔ وہ ہم نے ادا کر دیا ہے۔ شاید اسی سلوک سے وہ شخص اپنے رویہ پر غور کرے۔

[illegible] ایک کشمیری نوجوان نے بتایا کہ یہ پہلا شخص ہے جسے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اور سننے میں آیا ہے۔ کہ اسے انہی [illegible] کے لئے چالیس ہزار روپے دئے گئے ہیں۔ تاکہ یہ ثابت کیا جا سکے۔ کہ چوہدری غلام عباس کی قیادت پر پوری کشمیری قوم متفق نہیں [illegible] پڑھے لکھے نوجوان نے بتایا کہ ایک "ذمہ دار افسر" نے ہمارے ایک ساتھی سے کہا تھا۔ کہ کبھی اگر نور حسین کی پارٹی تمہارے سٹیج پر بڑھ [illegible] کرلے تو آپ کیا کریں گے؟ میرے ذہن میں ہندوستان کی پرانی تاریخ چکر لگا رہی تھی۔ میری سمجھ میں یہ بات آرہی تھی۔ کہ ہندو راجاؤں نے خود اپنے ہی بھائی ہندو راجاؤں سے بدلہ لینے کے لئے مسلمان بادشاہوں کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی کیوں دعوتیں دی تھیں۔ میری آنکھوں کے سامنے کشمیری مہاجرین کے بچے اور عورتیں کیمپوں میں گھومتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ بچے کوئلے اور جلانیوالی لکڑی کے ٹکڑے ہمارے گھروں میں دو دو پیسے میں فروخت کرتے ہوئے نظر آتے۔ پاؤں اور ٹانگیں ننگی۔ گلے میں پھٹا ہوا اور میل سے اٹا ہوا کرتا بالکل یتیموں اور لاوارث بچوں کی طرح۔ عورتیں — آہ — وہ جوان عورتیں خدا جانے کیا کیا کچھ کر رہی ہیں۔ ان کی اسی حالت سے متاثر ہو کر میں نے ایک دفعہ ایک نظم کہی تھی جس کے یہ اشعار میری شدت تاثر کا مظہر ہیں۔

بساطِ دنیا کے مہرہ بازو! تم ابن آدم سے خوب کھیلو — جواں کو سوجھے تو "بات" سوجھے [illegible] آئے تو غم کا "خانہ"!
یونہی جہاں میں رہیں بھٹکنے پڑی ہے ان کو پیٹ ہی کی — جو آگئی ان کو ہوش کچھ بھی تو ہے خطر میں "نگار خانہ"
تری ہی مخلوق ہے خدایا! یہ پھر رہی ہے جو ماری ماری — نہ تن پہ کپڑا نہ مال میسر نہ سر چھپانے کو ہے ٹھکانہ!
یہ ظلم دیکھا نہیں ہے جاتا ترے کرم پہ نظر ہے میری — یہ میری آہیں یہ میرے نالے مری دعا ہے پہنچ گا نہ

عذاب اتار ان پہ یا تو ایسا ہو مفلسی جس میں بھسم یا رب
نہیں تو ہمت وہ مجھ کو دیدے بدل کے رکھدوں یہ کارخانہ

میری آنکھوں کے سامنے غلام کشمیر کے مسلمانوں کا نقشہ بھی چکر لگا رہا تھا۔ ڈوگروں جن سنگھی۔ پرجا پریشدی۔ ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں پسے جا رہے تھے۔ اور ادھر چھ کوس کے خشک اور بنجر علاقے میں ناپاک سازشوں کا یہ جال تنا ہوا نظر آرہا تھا۔ میرے دل پر یہ راز منکشف ہو رہا تھا کہ کشمیریوں کا یہ حال کیوں ہے۔

میرپور — بہر حال جل تو جلال تو کا ورد کرتے ہوئے ساڑھے تین بجے کے قریب میرپور پہنچے۔ کئی جگہ چوہدری غلام عباس کیخلاف پوسٹر بھی چسپاں دیکھے۔ قافلہ کے استقبال کے لئے جھنڈیاں لگائی گئیں تھیں۔ گولوں اور ڈھولوں سے قافلہ کا استقبال کیا گیا۔ سینکڑوں انسان اوپر اور نیچے کھڑے تھے۔ ہم میرپور کی عین دیواروں کے نیچے موٹروں سے اتر کھڑے ہوئے۔ سڑک کے اوپر میرپور شہر تھا۔ ہم نے اپنے اپنے بستر کندھوں پر اٹھائے۔ اور جلسہ گاہ کو چل دیئے۔ چند قدم ہی چلے تھے کہ ایک خوش پوش نوجوان چھوٹی چھوٹی گھنی سیاہ داڑھی چہرے پر سجائے سامنے آکھڑے ہوئے۔ یہ راولپنڈی کے وہی مفتی ضیاء الحق تھے جنہوں نے چوہدری نور حسین کو راستے میں مار پیٹ سے بچایا تھا۔ مجھ سے نام اور پیشہ دریافت کیا۔ عرض کیا روزنامہ تسنیم کا رپورٹر ہوں۔ اور مجھے یعقوب ظاہر کہتے ہیں۔ بڑی عقیدت اور تپاک سے ملے۔ بستر چھین کر اپنے ایک ساتھی کے ہاتھ میں دیدیا۔ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی تعریف کرنے لگے۔ چوہدری غلام عباس کے خلوص اور بے لوث خدمات کا ذکر کرتے ہوئے آزاد کشمیر گورنمنٹ کے ریسٹ ہاؤس میں لے گئے۔ وہاں بستر اور ہینڈ بیگ رکھوا دیا۔ پیٹ میں "مشاعرہ" ہو رہا تھا۔ صبح سے صرف چائے پی تھی۔ عرض کیا۔ کھانا کھا لیا جائے۔ فرمانے لگے۔ ابھی جلسہ شروع ہو جائے گا۔ اس کا رنگ ڈھنگ دیکھ لینا مناسب ہے۔ ذرا دہل ہو [illegible] کھانا کھالیں گے۔

جلسہ گاہ | جلسہ گاہ میں پہنچے۔ پنڈال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ایک ہجوم امنڈا ہوا دیکھ کر میں نے مفتی ضیاء الحق صاحب سے عرض کی کہ ہم اسٹیج پر کیسے پہنچیں گے۔ فرمانے لگے۔ آئیے۔ اور وہ مجمع کو چیرتے کسی کو دھکا دیتے اور کسی کا دھکا کھاتے مجھے پیچھے لئے آگئے۔ سٹیج پر سردار محمد عالم صاحب بھی کھڑے تھے۔ جلسہ شروع ہو رہا تھا۔ خشخشی ڈاڑھی والے ایک لانبے لیکن دبلے پتلے بزرگ صدارت کی کرسی پر تشریف فرما تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا۔ کہ یہ کرنل علی احمد صاحب ہیں، آزاد کشمیر گورنمنٹ کے سابق نگران اعلیٰ۔ نمازی، پرہیزگار، تہجد گزار، خدا ترس انسان۔ ان کے ساتھ کرسی پر ایک کھدر پوش اور ڈاڑھی مونچھ صاف بزرگ بیٹھے تھے۔ ان کے متعلق معلوم ہوا۔ کہ چودھری غلام عباس ہیں۔ میرے متعلق اطلاع دی گئی۔ اور عرض کیا گیا کہ میرے لئے جگہ بنا دیجئے۔ چودھری صاحب بلا تکلف فرمانے لگے۔ یہاں دری پر بیٹھ جائیے۔ دری پر نظر دوڑائی۔ تو معلوم ہوا۔ کہ وہاں ایک انچ جگہ بھی خالی نہیں ہے۔ اور دھکم پیل ہو رہی ہے۔ میں نے صاف انکار کر دیا۔ کیونکہ ایسی حالت میں جبکہ وہاں بیٹھا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ رپورٹنگ کرنا بالکل ناممکن تھا۔ عرض کیا۔ کہ اتنی دور سے جو ہمیں ساتھ لایا گیا ہے۔ آخر اس کا اتنا پاس تو ہونا چاہیئے۔ کہ ایک کرسی بیٹھنے کے لئے الگ مہیا کر دی جائے۔ تاکہ اطمینان سے رپورٹنگ کی جا سکے۔ چودھری صاحب نے اپنی کرسی خالی کر دی اور بلا تکلف مجھے کھینچ کھینچ کر اسی پر بٹھانے لگے۔ میں نے بصد مشکل جان چھڑائی۔ پھر مجھے کھینچ کر اپنی کرسی کے بازو پر بٹھا لیا۔ اور آہستہ سے پوچھنے لگے۔ کون سے اخبار کے نمائندہ ہیں آپ؟ عرض کیا تسنیم کا۔ اس پر تسنیم کے مقاصد اور مشن کو سراہتے ہوئے مجھ سے فرمایا "آپ دری پر بیٹھتے ہوئے ہچکچاتے کیوں ہیں؟" میں نے عرض کرنا چاہا کہ یہ پریس کا معاملہ ہے۔ اور مجھے رپورٹنگ کرنا ہے۔ یہاں جگہ کا جو حال ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ ورنہ میں آپ کا خادم ہوں۔ اور دری پر بیٹھنے سے مجھے کوئی عار نہیں ہے۔ لیکن شور میں بات آئی گئی ہو گئی۔ چودھری صاحب نے فوراً کرسی لانے کے لئے کہا۔ کرسی آئی تو بصد مشکل اسے سٹیج پر "ٹکایا" جا سکا۔ چودھری صاحب نے فرمایا۔ کہ یہاں جو حالات ہیں۔ وہ آپ نے دیکھ لئے ہیں۔ ایسے میں اگر کوئی تکلیف پہنچ جائے۔ تو اس کا خیال نہ کریں۔ ان کا یہ طرز عمل شاید مجھے کبھی نہ بھولے۔ ورنہ اگر وہ "اپنے بڑے پن" کا مظاہرہ کرتے۔ جیسا کہ تمام بڑے کیا ہی کرتے ہیں۔ تو پھر ایسے لوگوں سے ٹکرانا تو میری زندگی کا واحد مقصد ہے۔ اور خدا گواہ ہے۔ کہ اس قسم کے ٹکراؤ میں مجھے جو سرور آتا ہے۔ وہ کسی اور بات میں نہیں آتا۔

بہر حال تلاوت کلام پاک کے بعد جلسہ کی باقاعدہ کارروائی شروع ہوئی۔ ایک صاحب نے خان عبدالقیوم خان وزیر اعلیٰ صوبہ سرحد اور میاں ممتاز دولتانہ وزیر اعلیٰ پنجاب کی طرف سے مبارکباد کے پیغامات پڑھ کر سنائے۔

میاں ممتاز دولتانہ کا پیغام | چودھری غلام عباس کی سیاسیات میں دوبارہ واپسی پر میاں ممتاز دولتانہ وزیر اعلیٰ پنجاب نے اظہار مسرت کرتے ہوئے کشمیری عوام سے دلی محبت اور اخوت کا اظہار کیا ہے۔ آپ نے اپنے پیغام میں کہا ہے۔ کہ آج مسئلہ کشمیر ہم سب کے لئے ایک رستا ہوا ناسور ہے۔ آزادانہ استصواب کے لئے پاکستان کی طرف سے ہر قسم کی مخلصانہ اور امن پسندانہ کوشش کی جا چکی ہیں۔ اقوام متحدہ پر یہ بات اچھی طرح واضح ہے۔ کہ کشمیر کے مسئلہ کو امن اور صلح جوئی کے ساتھ حل کرنے میں کون تعاون کر رہا ہے۔ اور کون اس کی راہ میں مختلف قسم کے روڑے اٹکا رہا ہے۔

میاں ممتاز دولتانہ نے مزید کہا۔ مجھے افسوس ہے کہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اقوام متحدہ محض تماشائی بنے بیٹھی ہیں۔ اس وقت کشمیر کے مسلمانوں پر جو کچھ بیت رہی ہے۔ اسے وہی اچھی طرح جانتے ہیں۔ ان کی تڑپ اور جذبۂ آزادی ہم سے پوشیدہ نہیں۔ آپ نے اس مرحلہ پر چودھری غلام عباس کو مشورہ دیا ہے۔ کہ انہیں صورت حال کا نہایت عمیق نگاہوں سے جائزہ لینا چاہیئے۔ انہیں چاہیئے۔ کہ اپنی جماعت

کی مخلص اور حکیم الامت [illegible] کے اتحاد کشمیر کے [illegible] ایک مشترکہ [illegible] کریں۔ ان جدوجہد میں [illegible] صرف میری اور میرے
صوبہ کے عوام کی دعائیں شامل حال ہیں بلکہ ہم اس جدوجہد میں مجاہد کی طرح اپنا تن من دھن بھی پیش کرتے ہیں

خان عبدالقیوم خان کا پیغام

خان عبدالقیوم صوبائی سرحد کا پیغام چوہدری غلام عباس کی ایک سال اور پانچ ماہ تک کامل خاموشی کے بعد
سیاسیات میں دوبارہ واپسی پر ان کی خدمت میں خلوص بھرا پیغام پیش کرتے ہوئے کہا۔ کہ بھارت کے مظالم ہمارے سامنے ہیں۔ مسئلہ کشمیر کے بارے میں
اور مظلوم متحدہ پاکستان سے جو سلوک روا رکھا جا رہا ہے۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ لہٰذا پاکستانی اور کشمیری بھائیوں کا فرض ہے کہ وہ اب ان
مظالم [illegible] کو کامیاب جدوجہد سے دور کریں

صوبہ سرحد کا ذکر کرتے ہوئے خان عبدالقیوم خان نے اپنے پیغام میں کہا کہ سرحد کے عوام اب یہ تہیہ کر چکے ہیں۔ کہ وہ اس وقت تک چین
نہیں بیٹھیں گے جب تک وہ جموں و کشمیر کے چالیس لاکھ مظلوم کشمیریوں کو بھارت کے چنگل سے نجات نہ دلا لیں۔ اپنے پیغام میں خان عبدالقیوم خان نے
صوبہ سرحد کے لوگوں کی طرف سے چوہدری غلام عباس کو مبارکباد دیتے ہوئے دعا کی کہ خدا انہیں اپنے مقاصد میں پوری کامیابی عطا کرے۔ آپ نے
سرحدی عوام کی طرف سے ہر ممکن تعاون کی پیش کش کی

چوہدری غلام عباس کی تقریر

اب زندہ باد کے نعروں کی گونج میں چوہدری غلام عباس تقریر کے لئے کھڑے ہوئے۔ ان کے سلام
کا جواب دیا۔ تو معلوم ہوا کہ آپ کسی قدر کمزوری محسوس [illegible] ہوئے ہیں۔ میں نے ساتھ بیٹھے ہوئے مفتی صاحب سے کہا کہ سوچا
[illegible] آنے دے گا۔ یہی قربت ہے۔ جو چوہدری صاحب سے یہ سلوک
ہو رہا ہے۔ وہ بڑا ہنسے اور فرمانے لگے کہ اگر آپ ان کی زندگی کے حالات سنیں تو حیران رہ جائیں۔ ان کا اپنا اور گھر کا بالکل یہی حال ہے۔ لیکن ان کے
نام سے یار لوگوں نے بڑے بڑے فائدے اٹھائے ہیں۔

بہرحال چوہدری صاحب نے تقریر شروع کی۔ مجمع پورے سکون اور عقیدت سے ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھ گیا۔ آپ نے فرمایا۔ کہ مسئلہ کشمیر کو سیکورٹی
کونسل میں بہت بری طرح ختم کر دیا گیا ہے۔ اور میری رائے میں اب صورت یہاں تک بدل گئی ہے۔ کہ اگر اس وقت بھی ہم خاموش رہے۔ اور ہم نے
اس مسئلہ کی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش نہ کی۔ تو ایک روز بھارت ہمارے رہے سہے آزاد کشمیر پر بھی ہاتھ صاف کر دینے سے گریز نہیں کرے
گا۔ کس قدر افسوس کی بات ہے۔ کہ یہاں برادریاں۔ کنبے اور پارٹی بازی کو ہوا دی جا رہی ہے۔ اور دوسری طرف مسئلہ کشمیر کی نزاکت روز بروز
بڑھتی جا رہی ہے۔ خدارا وقت کی نزاکت کا احساس کیجئے۔ اور کشمیر کے سلسلہ میں لوگوں کی بے چینیوں کو دور کرنے کے لئے جلد از جلد عملی قدم اٹھائیے

سیاسیات سے کنارہ کشی کی وجہ

میری ایک سال پانچ ماہ کی کامل خاموشی ایک ایسا مسئلہ ہے۔ جس پر فی الحال کچھ کہنا قرین مصلحت نہیں
جن حالات میں مجھے سیاسیات سے علیحدہ ہونا پڑا۔ ان کی نوعیت اس قدر عجیب و غریب تھی۔ کہ اگر میں انہیں زبان پر لاؤں۔ تو زبان جلتی ہے۔ [illegible]
[illegible] البتہ میں اس قدر کہہ سکتا ہوں۔ کہ میری پوزیشن کو ایسا بنا دیا گیا تھا۔ کہ ان حالات میں تحریک کو کوئی نقصان پہنچے
[illegible] کشمیر کے [illegible] نقصان پہنچ سکتا تھا۔ ایسے وقت میں میرے لئے یہی بہتر تھا کہ میں سیاسیات سے علیحدہ ہو جاؤں۔ میری اس
علیحدگی کی عام طور پر تین وجوہات بیان کی جاتی ہیں۔
۱۔ آپس کے جھگڑے ۲۔ حکومت پاکستان سے اختلافات ۳۔ میری بزدلی یعنی میں مشکلات و مصائب سے گھبرا کر قوم کو چھوڑ کر

جھک گیا تھا۔

میں ان تینوں وجوہ کی بنا پر دورِ تجدید کرتا ہوں۔ جس جماعت نے کامل چھ سال تک انتہائی ناساعد حالات میں ڈوگرہ شاہی کے مظالم کے خلاف منظم جہاد کیا۔ وہ یہی مسلم کانفرنس تھی۔ جس کا ایک ادنیٰ خادم میں بھی ہوں۔ اس زمانہ میں جبکہ دشمن نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ میں نے مسلم کانفرنس کے کارکنوں میں بد دلی اور ان کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آنے دی۔ اور ہمارے قدم کبھی بھی پیچھے نہیں ہٹے۔ مولانا ابراہیم، میر واعظ یوسف شاہ اور چوہدری نور حسین اگرچہ آج سیاسیات میں آ گئے ہیں۔ پھر بھی میرا ان سے کوئی جھگڑا نہیں کوئی ناراضگی نہیں۔ میں ان کی خدمت میں گزارش کروں گا۔ کہ میرا مقصد زندگی کشمیری عوام اور کشمیر کو آزاد اور سر بلند دیکھنا ہے۔ مجھے عہدوں کا لالچ نہیں۔ اگر ایسا ہوتا۔ تو آزاد کشمیر گورنمنٹ کے صدارت عالیٰ کا منصب میں خود نہ چھوڑتا۔ اگر میرے دوستوں کی نیتیں نیک ہیں۔ اور ان کا مقصد جموں و کشمیر کے مسلمانوں کو مکمل طور پر آزاد کرانا ہے۔ تو پھر یہ قوموں اور برادریوں، مہاجروں اور غیر مہاجروں کے نعرے بلند کرنے سے آخر کیا مقصد ہے؟ وہ میدان کارزار میں تشریف لائیں۔ میں انہیں صدارت پیش کر کے خود ایک ادنیٰ کارکن کی حیثیت سے کام کرنے کے لئے تیار ہوں۔ چوہدری نور حسین اور ان کے چند ساتھیوں نے میرے خلاف آج جو مظاہرہ کرایا ہے۔ میں اس کے لئے ان کا شکرگزار ہوں۔ پچیس سال تک اس شخص کے خلاف کوئی مظاہرہ نہیں ہوا تھا اس کے خلاف آج آزاد کشمیر میں ——— جس کو آزاد کرانے کے لئے اس نے اپنی زندگی کی ساری متاع لٹا دی ——— مظاہرہ کرایا گیا ہے۔ لیکن اگر وہ ذرا گہری نظر سے دیکھیں۔ تو یہ مظاہرہ دراصل میرے خلاف نہیں تھا۔ بلکہ آزادی جموں و کشمیر کی تحریک کے خلاف تھا۔ اگر ہمارا مقصد جموں و کشمیر کو آزاد کرانا ہے۔ تو پھر ان مخالفتوں کا آخر کیا مقصد ہے۔ واقعہ یہ ہے۔ کہ یہ سب کچھ کیا نہیں گیا۔ بلکہ کرایا گیا ہے۔ میں حکومت پاکستان سے ہمیشہ یہ مطالبہ کرتا رہا ہوں۔ کہ کشمیری مسلمانوں کو عدم دلچسپی کی روٹی دے کر ان کی غیرت اور خودداری کو ذبح نہ کرو۔ میں کشمیری مہاجرین کو مستقل اور باعزت طور پر آباد کرنے کے سوال کو بار بار اٹھاتا رہا ہوں۔ لیکن حکومت پاکستان کو خطرہ ہے۔ کہ اگر کشمیری مہاجرین معاشی طور پر مطمئن ہو گئے تو صورتِ حال یقیناً بدل جائے گی۔ میں چوہدری نور حسین اور ان کے ساتھیوں کو دعوت دیتا ہوں۔ کہ وہ خدا کے لئے اپنے دلوں کو صاف کریں۔ عہدوں میں حصہ داری کے خطرہ کو اپنے دلوں سے نکال دیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ کہ جب کبھی کسی قربانی اور کچھ دینے کا وقت آئے گا۔ تو میں اور میری جماعت پیش پیش ہوں گے۔ اور جب کبھی کچھ حاصل کرنے کا وقت آئے گا۔ تو اسی وقت میدان آپ دوستوں کے لئے خالی کر دیا جائے گا۔

میری واپسی کا مطالبہ

میری علیحدگی کے بعد جس شدت کے ساتھ مختلف اطراف سے میری واپسی کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اسے دیکھنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ کہ اگر میں چند دن اور سیاسیات سے علیحدہ رہا۔ تو لوگوں میں مایوسی اور بد دلی پھیل جائے گی۔ اس لئے میں نے مجبور ہو کر اپنے آپ کو قوم کے روبرو پیش کر دیا ہے۔

تین باتوں کا اعلان

اب میں آپ سے تین باتیں واشگاف طور پر کہہ دینا چاہتا ہوں۔

۱۔ پاکستان کی سالمیت اور استحکام کو برقرار رکھنا ہمارا پہلا اور آخری فریضہ ہو گا۔

۲۔ غلام کشمیر کی آزادی۔ جہاں ہمارے بائیس لاکھ کشمیری بھائی ظلم اور تشدد کی چکی میں پس رہے ہیں۔

۳۔ آزاد کشمیر میں جو ہولناک دھاندلی مچی ہوئی ہے۔ مہاجر اور غیر مہاجر کا جو شور مچایا جا رہا ہے۔ برادریوں اور برادریوں میں جو پھوٹ ڈال دی گئی ہے۔ بھائی اور بھائی کو جس طرح ایک دوسرے سے پھاڑ دیا گیا ہے۔ برادریوں کے جو نعرے بلند ہو رہے ہیں۔ راجپوتوں

بہت کچھ ہماری ملی ہی ہے۔ میں کہ دیکھتے ہوئے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آزاد کشمیر کی آزادی اور سالمیت بھی خطرے سے خالی نہیں ہے۔ اس طرح جب تک یہاں
کوئی فیصلہ کن تحریک پیدا نہیں کی جائے گی کشمیری عوام کے لئے ہماری ساری جدوجہد بالکل بے معنی رہ جائے گی۔
میں ایک بار پھر میدان میں آنے کیلئے نکلا ہوں۔ لہٰذا اب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ آپ اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرتے ہیں
راستے میں مصیبتوں اور مشکلات کے بڑے بڑے پہاڑ حائل کئے جائیں گے۔ اگر ایسے حالات میں آپ ثابت قدم رہے اور ان مصیبتوں اور مشکلات سے گھبرا کر
میرا ساتھ چھوڑنا ہے۔ تو بسم اللہ آج ہی مجھ سے الگ ہو جائیے۔ میں اب دوبارہ سیاست میں آیا ہوں تو پہلے کی طرح بالکل سوچ سمجھ کر آیا ہوں۔
تکالیف کا پورا اندازہ کر کے آیا ہوں۔ میرا اب مصمم ارادہ ہے کہ کوئی ساتھ دے یا نہ دے میں اب ملک اور قوم کی آزادی اور استحکام کے لئے تن من دھن
میں ایک بیٹی اور گھر بار کی قربانی پہلے دے چکا ہوں اور وطن عزیز کو آزاد کرانے کے لئے اگر مجھے دوسرے بچوں اور خود میری قربانی کی بھی ضرورت پڑی
تو انشاء اللہ اس سے بھی گریز نہیں کروں گا۔ میں آپ کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے نکلا ہوں (نعرے) اگر آپ میرا ساتھ دینا چاہتے ہیں۔ تو پھر خدا
اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بنا کر عہد کیجئے کہ آپ پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ مشکلات اور مصائب کے خوف سے ہیں جانوں کی بازی لگانے سے ہچکچائیں گے نہیں۔
(نعرے:۔ ہم عہد کرتے ہیں کہ آپ کا ساتھ دینگے۔)
مجھے کل جو کچھ کرنا ہے۔ وہ بڑا کٹھن ہے۔ میں انشاء اللہ اب مرتے دم تک آپ کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔ اب غلام عباس سیاست
مرتے دم تک علیحدہ نہیں ہوگا۔ یہ میرا حتمی اور آخری فیصلہ ہے۔ مجھ سے ذلت کی یہ زندگی اب برداشت نہیں ہوتی۔

مسئلہ کشمیر اور مظاہرہ بازی

مسئلہ کشمیر اب سلامتی کونسل میں بالکل ختم ہو چکا ہے۔ اور میری رائے یہ ہے۔ کہ یہ مسئلہ اب ویسے بھی
ہر لحاظ سے ختم ہی ہو چکا ہے۔ اگر ہم خاموش بیٹھے رہے تو بھارت اب آزاد کشمیر کو بھی نہیں چھوڑے گا (ملاحظہ کیجئے۔ کہ ایک طرف مسئلہ کشمیر بھی قدر
نازک صورت اختیار کر چکا ہے۔ کہ ہماری اور پاکستان کی زندگیاں تک خطرے میں ہیں۔ اور دوسری طرف برادریوں، قبیلوں اور گروہوں کے نام پر
ایک ایسی آگ بھڑکائی جا رہی ہے۔ جو نہ صرف ہمیں اور آپ کو جلا کر رکھ دے گی۔ بلکہ پاکستان کے مستقبل کو بھی نقصان پہنچائے بغیر نہیں رہے گی۔
میں آج کے مظاہرے سے پانی پانی ہوا جا رہا ہوں۔ دشمن سر پر کھڑا ہے۔ اور یہ خادمان قوم یہ حرکتیں کر رہے ہیں۔ کیا آپ حضرات ان عصبیتوں کو برداشت
کر دینگے (آوازیں —— ہرگز نہیں)
دراصل یہ لوگ کوتاہ اندیش اور کم نظر ہیں۔ انھیں معلوم نہیں کہ اس طرح کی حرکتوں سے وہ کس کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں۔ میں انہیں متنبہ کرتا ہوں کہ اپنی
احمقانہ کوششوں سے باز رہیں۔ کشمیری عوام اب آپ کی کارستانیوں کو تماشائی بن کر نہیں دیکھیں گے۔
میں خاموش نہیں رہ سکتا۔
سرحد کے اس پار ہمارے بھائی پنجہ ستم میں سسک سسک کر اور رو رو کر ڈوگروں کے مظالم سے نجات پانے کے لئے دعائیں مانگ رہے
ہیں۔ اور تم یہاں چند کوس کے علاقہ میں وزارتوں اور صدارتوں کے لئے لڑ رہے ہو۔
برادریوں اور قبیلوں کی جنگ کو ہوا دے رہے ہیں میں نے برابر دو سال تک صبر کیا ہے۔ مگر اب میں خاموش نہیں رہ سکتا۔ اگر پاکستان کے استحکام
کو نقصان پہنچ رہا ہو۔ کشمیری مسلمان خاندان برباد ہو رہے ہوں۔ اور ہر طرف تاریکیاں ہی تاریکیاں منڈلا رہی ہوں۔ تو ایسے
حالات میں اگر مجھے حکومت پاکستان کے رویہ کے خلاف بھی کچھ کہنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تو میں برملا کہوں گا۔ گذشتہ سالوں میں "اندر خانے" جو
کچھ بھی ہوتا رہا ہے۔ اور حکومت پاکستان کی مجبوریوں اور مخصوص بین الاقوامی حالات کے پیش نظر مسئلہ کشمیر کو جس بری طرح ذبح کیا گیا ہے۔ وہ اب ناقابل
برداشت بن چکا ہے۔ حکومت پاکستان کو اگر کل کچھ کرنا ہے۔ تو میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ آج اپنا خون پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں

[illegible] کا اعلان

میں اب آخر میں بہت ہی مختصر کہنا چاہتا [illegible] کہ حکومت پاکستان اپنی کمزور پالیسی کی بنا پر اب کشمیر کو حاصل نہیں کر سکتی۔ کشمیر کا حصول اب اگر ممکن ہے۔ تو پاکستان اور کشمیری عوام کی جدوجہد ہی سے ممکن ہے۔ حکومت پاکستان اب کچھ نہیں کر سکے گی۔ لہٰذا اب یہ پاکستان اور کشمیر کے عوام کا فرض ہے کہ وہ خود اٹھیں۔ اور اللہ کے بھروسہ پر اس بازی پر اپنا سب کچھ لگا دیں۔ مجھے امید ہے کہ پاکستان کے عوام ہمارے ساتھ اس لڑائی کو لڑنے کے لئے تیار ہیں۔ اس لئے حکومت پاکستان کو مجبوراً کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔ آپ میرے ساتھ وعدہ کریں۔ کہ میں جو پروگرام آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ آپ اس پر پوری قوت کے ساتھ عمل کریں گے۔

(اس پیغام اور کارکنوں نے کھڑے ہو کر نعروں کے ساتھ عہد کیا کہ ہم چوہدری غلام عباس کے ہر حکم کی دل و جان سے تعمیل کریں گے۔۔۔)

سردار عبدالقیوم کی رہائی

اس وقت پنجاب میں جو حالات ہیں۔ اور تحفظ ختم نبوت کی وجہ سے حکومت اور عوام میں جو خلفشار برپا ہے اس کی وجہ سے کشمیر کی قطعی پالیسی کی ابھی وضاحت نہیں کی جائے گی۔ حالات درست ہونے پر انشاء اللہ ہم اپنی واضح پالیسی کا اعلان کریں گے۔ میں اس وقت حکومت پاکستان سے صرف اتنی اپیل کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے ساتھی سردار عبدالقیوم اور ان کے ساتھیوں کو کس الزام میں گرفتار کیا گیا ہے۔ سردار صاحب کا یہی قصور تھا کہ وہ جنگ بندی لائن کو توڑ دینا چاہتے تھے؟ میں پوچھتا ہوں کہ کیا کشمیر کو آزاد کرانے کے لئے جنگ بندی لائن کو توڑ دینے کے سوا اب کوئی اور راستہ باقی رہ گیا ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں۔ تو پھر جس راستہ پر کل ہم کو اور خود حکومت پاکستان کو چلنا ہے۔ آج اس پر آج چلنے والے کیوں پابند سلاسل ہوں۔ میں مطالبہ کرتا ہوں کہ انہیں جلد از جلد رہا کیا جائے۔ تاکہ آزادی کشمیر کی جدوجہد میں ان کی خدمات سے فائدہ اٹھایا جائے۔ ورنہ ان پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلا کر ان کا جرم ثابت کیا جائے۔

پھر مخالفانہ مظاہرہ

جلسے کے دوران میں چوہدری نور حسین کے دس بیس آدمیوں نے پنڈال کے سامنے ذرا فاصلہ پر آ کر پھر مخالفانہ نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ لیکن جلسہ بغیر کسی افراتفری کے جاری رہا۔

چوہدری حمید اللہ وزیر خزانہ آزاد کشمیر

چوہدری غلام عباس کے بعد چوہدری حمید اللہ خان وزیر خزانہ آزاد کشمیر نے ایک قرارداد پیش کی جس میں چوہدری غلام عباس کی سیاسیات میں واپسی پر ان کا شکریہ ادا کیا۔ آپ نے چوہدری غلام عباس کی زندگی اور موت کو اپنی اور کشمیر کی زندگی اور موت کے مترادف قرار دیتے ہوئے اعلان کیا کہ ہم ان کی قیادت میں کسی بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ قرارداد کی تائید مسٹر ثناء اللہ شمیم سابق وزیر تعلیم آزاد کشمیر گورنمنٹ کی۔ آپ نے فرمایا۔ کہ آزاد کشمیر میں سیاست کی جو تاریخ بن رہی ہے وہ خود بخود ہی نہیں بن رہی ہے۔ بلکہ اس کا سرا کسی اور کے ہاتھوں میں ہے اور یہ اور ہماری نگاہوں سے پوشیدہ بھی نہیں ہے۔

عام انتظام

جلسہ تقریباً ساڑھے پانچ بجے شام ختم ہوا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہاں عام نظم کے متعلق بھی کچھ عرض کر دیا جائے۔ جہاں تک عام جوش و خروش۔ وطن عزیز کو آزاد کرانے کے جذبہ اور چوہدری غلام عباس کی قیادت میں اعتماد کا تعلق ہے۔ وہ قریب قریب اتنا ہی اور اسی پائے کا تھا۔ جتنا کسی زندہ قوم میں ہونا چاہیے۔ لیکن جہاں تک جلسہ کے عام ڈسپلن، کام کی باقاعدہ تقسیم اور (SETUP) اور متانت و سنجیدگی کا تعلق ہے۔ میری ناقص رائے میں ان میں بہت سی خامیاں تھیں۔ جلسہ میں کوئی ڈسپلن نہیں تھا۔ لوگ ذرا سے شور اور گڑبڑ سے فوراً متاثر ہو جاتے تھے۔ اور اپنی اپنی جگہوں سے اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ کوئی ادھر سے یہ نعرہ شروع کر دیتا تھا۔ اور کوئی اُدھر سے۔ ہر شخص یہ کوشش کرتا تھا کہ سٹیج کے سامنے، دائیں، بائیں یا پیچھے ہو کر اس کوشش میں اس بات کا تقاضا پہلا

نہیں کرتا تھا کہ وہاں جگہ ہے بھی یا نہیں کوئی مستقل انتظام موجود نہیں ہوتا تھا ہر شخص ہر شیخ کو نوواں نیا سمجھ کر وہیں آگے بیٹھنے کی کوشش کرتا تھا پہلیں کیسے تھے بیٹھنے بیٹھنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ کوئی کسی کو پوچھنے والا نہیں تھا۔ وہ تو خدا بھلا کرے۔ سردار محمد عالم اور مفتی ضیاء الحق بخاری صاحبان کا شکریہ ہے کہ اگر یہ نہ ہوتے تو ہم بالکل نہ ہوتے۔ تو اگر یہ بنیں میں ہر خاص بزرگ گائوں سے آئی چاہیوالی بڑھیا کے قصہ کی طرح وہاں صبح ہونے سے تو وہ کوئی بہر حال تکلیف ضرور ہوتی۔ انھوں نے ریسٹ ہاؤس میں ادھر اُدھر شور مچا کر نو دس بجے کے قریب کھانا پکوا ہی لیا۔ اگرچہ دوسرے دن انتظام نسبتاً بہتر ہو گیا تھا۔ مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ دوسرے دن بھی جلسہ گاہ کے نظم کا تقریب قریب وہی حال رہا جیسے پہلے دن تھا اگر یہ محسوس نہ کیا جائے۔ تو میں قائد کشمیر چودھری غلام عباس اور دوسرے کشمیری لیڈروں اور کارکنوں سے درخواست کروں گا۔ کہ وہ جماعت اسلامی کے . . . . ہونے والے سالانہ اجتماع میں ضرور شرکت کریں۔

رات کو چار پانچ کشمیری نوجوانوں سے گفتگو کا موقع ملا۔ ان میں سے بعض وکیل تھے۔ اور بعض ویسے اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ ان سے چودھری نور حسین کے متعلق کچھ اور معلومات حاصل ہوئیں۔ انھوں نے بتایا۔ کہ ایک ذمہ دار افسر نے چودھری غلام عباس کے خلاف مظاہرہ کرانے کے لئے چالیس ہزار روپیہ لے کر انھوں نے اپنے جاٹ بھائیوں میں اعلان کرایا۔ کہ ان چالیس ہزار روپے کے ساتھ میں اپنی طرف سے مزید چالیس ہزار روپیہ دیہاتیوں میں تقسیم کروں گا۔ چنانچہ مظاہرہ کے دن انھوں نے اپنے گائوں میں اردگرد کے دیہاتیوں کو جمع کیا۔ اور پچاس کے قریب دیگیں چاول کی پکوائیں اسی ذمہ دار افسر کے متعلق بتایا۔ کہ کشمیر کے سیاہ و سفید کے مالک ہیں ——— اور ہم لوگ اتنے بے بس ہیں۔ کہ اپنی مرضی سے ایک چپڑاسی تک بھی نہیں رکھ سکتے۔

مفتی ضیاء الحق صاحب نے پیر ضیاء الدین وزیر زراعت آزاد کشمیر سے ملاقات کرائی۔ متشرع اور پابند صوم و صلوٰۃ بزرگ تھے۔ بڑی محبت اور تپاک سے ملے۔ اور قہوہ پیش کیا۔ چونکہ رات کافی گزر چکی تھی۔ اور دن بھر کے تھکے ہوئے تھے۔ لہٰذا وہاں چند منٹ گفتگو کے بعد ہم اپنے کمرے میں آ گئے۔

جماعت اسلامی اور کشمیری

کشمیری نوجوانوں اور لیڈروں میں سے جس جس سے بھی ملاقات ہوئی۔ جماعت اسلامی کا نام سن کر ان کی اکثریت نے نہایت اچھے الفاظ اور احترام سے یاد کیا۔ اور یہ اسی احترام ہی کا نتیجہ تھا کہ راقم الحروف سے ہر شخص بڑے تپاک اور احترام سے پیش آیا۔ مدینہ میں تو یہی سمجھ رہے تھا۔ کہ شاید حکومت پاکستان کے پراپیگنڈے کا اثر اب تک کشمیری بھائیوں کے دل پر ہوگا۔ لیکن اللہ کا شکر ہے۔ کہ اس نے "مجاہدین" کی اپنی حقیقت ان مظلوم کشمیری بھائیوں پر اچھی طرح کھول دی ہے۔

دوسرا دن

علی الصبح (۱۲ مارچ ۱۹۵۳ء) حوائج ضروریہ اور نماز سے فراغت کے بعد ناشتہ کیا۔ کشمیری نوجوان تو جلسہ گاہ کے انتظامات اور دیگر ضروریات کے لئے چلے گئے۔ لیکن میں نے موقع غنیمت جان کر اجلاس کی پہلی نشست کی کاروائی مرتب کرنی شروع کر دی۔ بات کو دریافت کرنے پر معلوم ہوا تھا کہ میرپور میں ٹیلیگراف آفس نہیں ہے۔ اور نہ ٹیلیفون کا کوئی خاص اور براہ راست انتظام ہے۔ اس لئے میں نے خیال کیا۔ کہ آج دس بجے سے پہلے پہلے گزشتہ دن کی کاروائی مرتب کر کے جہلم جاؤں۔ اور وہاں سے اسے لاہور بھیجنے کا بندوبست کروں لیکن معلوم ہوا کہ اے پی پی کے نمائندہ مسٹر محمد اسلم (راولپنڈی) اپنی طرف سے انتظام کر رہے ہیں۔ اور کاروائی اے پی پی کی پنڈی برانچ سے ملک کے اخبارات کو CREED کر دی جائے گی۔ مجھے ایک گونہ اطمینان سا ہو گیا۔ لیکن ملا میں بہر حال حیرانی ضرور تھی۔ کہ ضلع صدر مقام ہونے کے باوجود یہاں تار اور ٹیلیفون کا انتظام نہیں ہے۔

میرپور کی سیر

تقریباً نو بجے تک کاروائی مرتب کرنے کے بعد دو تین ساتھیوں کے ہمراہ ہم نے میرپور شہر کا چکر لگایا۔ آثار بتا رہے تھے۔ کہ کسی وقت یہ خاصا خوبصورت شہر ہوگا۔ ساتھیوں نے اس کی تائید کی۔ کہ جنگ کشمیر سے پہلے یہ واقعی بڑا

بارونق اور خوبصورت شہر تھا جس میں بائیس ہزار کے لگ بھگ آبادی تھی۔ جنگ کشمیر میں اس پر بھارتی فوجوں کا قبضہ ہو گیا لیکن بعد ازاں آزاد کشمیر کے رضاکاروں
اور پاکستانی فوجوں نے قبضہ کر لیا۔ پاکستانی قبضہ کے بعد بھارتی فوجوں نے اس پر شدید بمباری کی۔ جس سے شہر کا تقریباً ۲/۳ حصہ تباہ و برباد ہو گیا
اور اب تک اسی حالت میں پڑا ہے۔ بازار نہایت ہی خوبصورت اور بارونق تھا لیکن اب نہایت ہی معمولی قسم کی دکانیں ہیں۔ جنہیں لوگوں نے از خود
چھپر اور گارا وغیرہ جوڑ کر کھڑا کر رکھا ہے۔ اس وقت آبادی کم و بیش آٹھ ہزار افراد پر مشتمل ہے۔

دوسرا اجلاس

یہ عبرت ناک منظر دیکھتے ہوئے ہم دس بجے جلسہ گاہ میں پہنچ گئے۔ آج پریس گیلری میں تین کرسیوں کا انتظام تھا۔ ایک میرے
لئے۔ دوسری امروز لاہور اور تیسری اے پی پی کے نمائندہ کے لئے صدارت کے فرائض آج پھر کرنل علی احمد صاحب نے
سرانجام دیئے۔ تلاوت قرآن پاک کے بعد مختلف حضرات نے متعدد قراردادیں پیش کیں۔ اور اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ان کی تائید میں درجنوں
کارکنوں نے تقریریں کیں۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ جہاں کہیں کسی مقرر نے کشمیری قوم کے دکھی دلوں کے تاروں کو چھیڑا۔ اور —— اس بیماری کی ذمہ داری
"عالم بالا" پر ڈالی۔ تو لوگوں نے اتنی شدت سے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ کہ گویا ان کے اصل مرض کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ جس مقرر نے جتنی
شدت سے "عالم بالا" پر تنقید کی۔ اتنی ہی شدت اور جوش سے اس کی تقریر کا خیر مقدم کیا گیا۔ بہت سے مقرروں نے ایسی ایسی باتیں کہیں۔ کہ
اگر ان کا ذکر کر دیا جائے تو خدا جانے کتنے سیفٹی ایکٹ اور گرد ناچنے لگیں۔ چودھری غلام عباس صاحب ایسے موقع پر میری طرف مخاطب
ہو کر فرماتے تھے۔ کہ دیکھ لیجئے۔ آپ بار بار "اعتدال" پر زور دے رہے ہیں۔ لیکن یہاں ان لوگوں کے یہ تاثرات ہیں۔ میں حیران و ششدر دیکھ
رہا تھا۔ نوجوانوں کے دلوں میں "خدا جانے" کس کے خلاف اور کیا کیا طوفان ابل رہے تھے۔

سردار عبدالقیوم کی رہائی کا مطالبہ

ایک قرار داد میں سردار عبدالقیوم کی سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بندی کے خلاف احتجاج کیا گیا۔ اور کہا گیا۔ کہ ان کا قصور صرف یہ ہے۔ کہ
انہوں نے جنگ بندی لائن کو توڑ دینا چاہا تھا۔ یہ قصور تو حکومت پاکستان کو اور خود ہم کو بھی کرنا ہی پڑے گا۔ اگر ہم کشمیر کو بھارت کے پنجہ استبداد
سے آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ کشمیر کو آزاد کرانے کا اب اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ ممکن ہی نہیں ہے۔ لہذا سردار عبدالقیوم کو جلد از جلد باعزت طور
پر رہا کیا جائے۔ اور اگر انہیں نظر بند رکھنا ہے۔ تو پھر ان پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلا کر ان کا جرم ثابت کیا جائے۔

پاکستان سے الحاق کی شرط

ایک اور قرارداد میں کہا گیا۔ کہ موجودہ حالات کے پیش نظر حکومت پاکستان ہمیں اس بات کی گارنٹی دے۔ کہ جموں و کشمیر اور آزاد کشمیر
الحاق پاکستان سے صرف تین بنیادوں پر ہو گا (ا) دفاع (ب) رسل و رسائل (ج) امور خارجہ۔

چودھری غلام عباس کو اختیارات

چودھری حمید اللہ وزیر خزانہ آزاد کشمیر کی طرف سے ایک متفقہ قرارداد میں چودھری غلام عباس کو مسلم کانفرنس کی جنرل کونسل کے سیاہ
سفید کے مکمل اختیارات تفویض کئے گئے۔ چودھری غلام عباس نے اس قرارداد پر کارکنوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ کہ ابھی میں حالات کا گہرا
مطالعہ کرنا چاہتا ہوں۔ اور جب تک پنجاب کے حالات بھی روبہ اصلاح ہو جائیں گے۔ لہذا میں اپنی طرف سے کرنل علی احمد سابق نگران اعلیٰ حکومت
آزاد کشمیر کو یہ اختیارات سونپتا ہوں۔ دو ماہ کے بعد وہ مجھے یہ ذمہ داری از خود لوٹا دیں گے۔

پرجا پریشد تحریک کی مذمت:۔ ایک قرارداد میں جموں و کشمیر میں پرجا پریشد تحریک کی سخت مذمت کی گئی۔

مسئلہ ختم نبوت:۔ ایک اور قرارداد میں مسئلہ تحفظ ختم نبوت میں جمیع مسلمانان پاکستان کے مطالبہ کی حمایت اور حکومت کے رویہ کی شدید
مذمت کی گئی۔ اور حکومت پاکستان سے مطالبہ کیا گیا۔ کہ اس مطالبہ کو کچلنے اور دبانے کی بجائے حکومت کا فرض ہے۔ کہ اسے فی الفور تسلیم کرے۔

قبیلہ پرستی کی مذمت :- اس سے قبل حضرت ایک ساغر نے ایک تقریر کی جس میں فرقہ پرستی اور گروہی عصبیت کی شدید مذمت کی۔ یہ تقریر سب سے زیادہ اثر انداز اور باوقار تھی۔ آپ نے فرمایا کہ ہمارے معاشرے میں سب سے بڑا خطرہ موجودہ حالات میں نہیں۔ بلکہ جماعتی گروہ بندی، بلکہ الزام اور قبیلہ پرستی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ چھوٹی چھوٹی بیماریاں معمولی دواؤں سے دور ہو جاتی ہیں۔ لیکن جو روگ دل کو لگ جائے۔ اس کا انجام سوائے موت کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ آپ نے مزید فرمایا کہ جس وقت اسلام رونما ہوا تھا۔ تو عرب میں قبیلہ پرستی کی دیانت سے پہلے یہی حالت تھی اور یہ حال ہو چکا تھا کہ قبیلوں کی آپس کی لڑائیاں صدیوں تک جاری رہتی تھیں۔ ایسے حالات میں اگر حضور نبی کریم صلعم بھی — تاہم — قبیلہ پرستی اور گروہ بندی کو ہوا دیتے۔ تو کیا وہ عظیم الشان انقلاب رونما ہو سکتا تھا جس نے نسلی گروہی، خاندانی اور ملکی تمام عصبیتوں کے بخیے ادھیڑ کر رکھ دیئے۔ انگریز اور ڈوگرہ مہاراجہ کو تو فرقہ پرستی اور گروہ بندی سے فائدہ تھا۔ کیونکہ اس طرح بھائی کو بھائی سے پھاڑ کر وہ اپنی جڑیں مضبوط کر سکتے تھے۔ لیکن ہمارے اپنے ہی بھائیوں کو خدا جانے کیا ہو گیا ہے کہ وہ بھی یہی طریق کار اختیار کر رہے ہیں۔ آپ نے عوام کو متنبہ کرتے ہوئے کہا کہ یاد رکھو۔ قبیلہ پرستی ایک ایسی ڈائن ہے۔ کہ اس کے جبڑوں میں جو بھی گھسے گا۔ یہ اسے ہضم کئے بغیر نہیں چھوڑے گی۔ ایسے لوگ — جو جاٹ۔ راجپوت اور دوسری عصبیتوں کو ہوا دے رہے ہیں — ملک اور قوم اور اسلام کے بدترین دشمن ہیں۔ مجھے حکومت پاکستان سے گلہ ہے کہ وہ ایسے ہتھکنڈے استعمال کر رہی ہے۔ کسی کو کوئی لالچ دیا جا رہا ہے۔ اور کسی کو کوئی۔ حتیٰ کہ مجھے بھی اسی لعنت میں مبتلا کرنے کے لئے متعدد پیشکشیں کی جا رہی ہیں۔ میں پوچھتا ہوں۔ کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ہمارے ارباب اقتدار آخر چاہتے کیا ہیں؟ کیا وہ انگریزوں کی طرح ہمیں ایک دوسرے سے پھاڑ کر ہمیں ہمیشہ کے لئے اپنا غمہ بردار بنائے رکھنا چاہتے ہیں؟ یہ نور حسین جیسے معمولی آدمی (نعرے) کھڑے کرنے سے آخر مقصد کیا ہے۔ خدارا ہمارے حال پر رحم کیجئے۔ اور وطن عزیز کو آزاد کرانے کے لئے ہماری جد و جہد میں رکاوٹیں نہ ڈالیے۔

مخالفانہ مظاہرہ | اتنے میں سامنے کے میدان میں ایک عظیم مجمع ارد گرد سے اکٹھا ہو کر چوہدری غلام عباس کے خلاف نعرے لگانے لگا معلوم ہوتا تھا۔ یہ لوگ پورے منصوبے سے یہاں آئے ہیں۔ یہ لوگ ڈھول پیٹ رہے تھے۔ اور ناچ کود رہے تھے۔ ہوتے ہوتے تقریباً پانچ ہزار آدمی جمع ہو گئے۔ ان میں چوہدری نور حسین بھی تھے۔ انہوں نے وہاں سٹیج جما لیا۔ اور لاؤڈ سپیکر کے بغیر ہی جلسہ شروع کر دیا۔ میں اٹھ کر پیچھے سے وہاں پہنچا۔ سٹیج سے ادھر ہی مجھے تین چار خونخوار قسم کے آدمیوں نے آگھیرا۔ تم کون ہو؟ عرض کیا۔ اخباری نمائندہ ہوں۔ بڑی مشکل سے چوہدری نور حسین تک پہنچا۔ تعارف کے بعد وہ بڑے تپاک سے ملے۔ اور اپنے قریب بنچ پر بٹھا لیا۔ ایک ان پڑھ قسم کے مقرر تقریر فرما رہے تھے۔ بار بار مجمع پوری ہانگ سے تالی بجاتا تھا۔ اور سٹیج سے ایک شخص کو نعرے لگانے کے لئے — موقع بے موقع — کھڑا کر دیا جاتا تھا۔ سٹیج پر تین چار آدمی بیٹھے تھے۔ صاحب صدر کچھ پڑھے لکھے معلوم ہوتے تھے۔ اور باقی سارا مجمع خالص دیہاتیوں کا تھا۔ چوہدری نور حسین نے اس موقعہ سے ذرا دور جا کر نماز ظہر بھی پڑھی۔ خدا جانے یہ سیاسی نماز تھی۔ یا روزمرہ کی۔ میں کچھ دیر تک بیٹھا رہا اور پھر اٹھ کر واپس چلا گیا۔ افسوس کہ سٹیج سے ہلڑ کا ہونے کی وجہ سے چوہدری نور حسین کی تقریر نہ سن سکا۔ قریب تھا کہ دونوں مجمعوں کے درمیان تصادم ہو جاتا۔ لیکن مسلح پولیس کی موجودگی نے دونوں فریقوں کو اپنی اپنی حدود میں ہی رکھا۔ تقریباً پانچ ساڑھے پانچ بجے شام دونوں جلسے برخاست ہو گئے۔

میرپور سے واپسی اور دلچسپ دلیر

تیسرے دن تقریباً ساڑھے آٹھ بجے میرپور سے واپسی کا پروگرام تھا۔ بس کے اڈہ پر پہنچے۔ کرنل علی احمد صاحب نے وہاں بک سٹال سے انگریزی میں لکھا ہوا ایک کتابچہ پیش کیا۔ میں نے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ تو معلوم ہوا کہ یہ "سلطنت الٰہیہ" "Kingdom of God"

فامی کا بچہ ہے جو کرنل صاحب موصوف ہی کی تخلیق ہے۔ ادھر سے چودھری غلام عباس کی جانے والے رہ گئے۔ تو معلوم ہوا کہ چودھری [illegible] تک ہمارے قافلہ کو چلا کرائیں گے۔ انھوں نے اپنے دیہاتیوں کی ایک بہت بڑی تعداد راستے میں جمع کر رکھی ہے۔ چودھری غلام عباس [illegible] کے پاس آدمی روانہ کیا۔ کہ وہ ایسا نہ کریں۔ یہ باتیں ہمارے کاز کو نقصان پہنچانے والی ہیں۔ لیکن شاید وہ مانے نہیں۔ وہیں کھڑے کھڑے چودھری صاحب نظر آئے۔ میں نے بڑھ کر ان سے ہاتھ ملایا۔ اور دو چار منٹ تک ان سے بات چیت کرتا رہا۔ خوش طبیعت تپاک سے ملے لیکن چہرے پر غیر معمولی عزم اور حوصلہ کی علامات۔ جنگ کشمیر میں تن تنہا دشمن کی صفوں میں گھس جاتے رہے ہیں۔ اسی بہادری کی وجہ سے آپ کو آزاد کشمیر کی فوج کا کمانڈر انچیف بنا دیا گیا تھا۔ چودھری صاحب سے کہنے لگے صرف دس آدمی ساتھ لے جانے دیجئے پھر آپ دیکھ لیجئے گا۔ کرنل حسین صاحب کہاں ہیں۔ اور ان کے ساتھی کہاں۔ لیکن چودھری غلام عباس نے روک دیا۔ اور غالباً پولیس کی دو جیپوں کو ہمراہ لیکر اور قافلہ والوں کو ضروری ہدایات دیکر قافلہ کو چلنے کا حکم دیا۔ چلتے وقت ہم تینوں اخباری نمائندوں کو چودھری غلام عباس کی کار میں بٹھا دیا گیا۔ ہم نے کوشش کی کہ چودھری صاحب چونکہ ہم سے زیادہ "قیمتی" ہیں۔ اور ان کی حفاظت زیادہ ضروری ہے۔ اس لئے انھیں اپنے درمیان بٹھائیں۔ مگر وہ اللہ کا بندہ نہیں مانا۔ اور کھڑکی کے بالکل ساتھ ہی بیٹھا۔ پھر چند منٹ کے بعد کار سے اتر کر ہم سے فرمایا۔ کہ میں تو اس قسم کی لڑائیاں لڑتا رہا ہوں۔ آپ حضرات اخباری نمائندے ہیں۔ آپ کیوں خواہ مخواہ لپیٹ میں آئیں۔ یہ کہکر ہمارے لئے ایک انتظام کر دیا۔ اور قافلہ چل پڑا۔ لیکن اللہ کا احسان کہ راستے میں چودھری نور حسین کے گاؤں سے ادھر صرف چالیس پچاس آدمیوں نے صرف مخالفانہ نعرے ہی لگائے۔ کوئی اور گڑبڑ نہ ہوئی۔ البتہ چودھری نور حسین کار میں آتے ہوئے ضرور دکھائی دیئے۔ جہلم میں ہم لوگ قافلہ سے الگ ہو گئے اور سب نے اپنی اپنی "منزل" کی راہ لی۔ راقم الحروف بھی کشمیر کی پوری صورت حال پر غور کرتا ہوا تقریباً چار بجے شام گھر پہنچ گیا۔

کیا؟

آپ نے بھی کبھی سوچا کہ کلام الٰہی میں جابجا قسمیں کیوں کھائی گئی ہیں ـــ؟ یہ سوال تمام مفسرین کے سامنے آیا اور انھوں نے اس پر بڑی طبع آزمائیاں کی ہیں، پھر بھی بات کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکی ـــ؟

قرآن کے
طالب علموں
کے لئے
ایک ٹھوس
علمی کتاب

اقسام القرآن

قیمت: ـــ ڈیڑھ روپیہ

بالآخر

مولانا حمید الدین فراہی

نے

اس سوال کو سامنے رکھ کر کاوش کی

اور

قرآن کی قسموں کی ایک سائنس مرتب کر کے رکھ دی

جسے

مولانا امین احسن اصلاحی

نے

عربی سے اردو میں منتقل کیا

زلزلے بام و در پر ہی نہیں آتے ـــ دلوں اور دماغوں پر بھی آتے ہیں ـــ

ـــ تاکہ ـــ فرسودہ خیالات ـــ اور ـــ بوسیدہ قدریں تلپٹ ہو جائیں !

اور تعمیر نو کے لئے میدان ہموار ہو !

نعیم صدیقی

جو آج اسلامی ادبی محاذ کا ایک جانباز سپاہی ہے، اس کے دل و دماغ بھی زلزلوں سے دوچار ہو رہے تھے ! ان زلزلوں کی لہروں کو جب اس نے پورے سماج پر طاری کرنا چاہا تو اس کے سحر تخیل سے وہ افسانے بن گئے

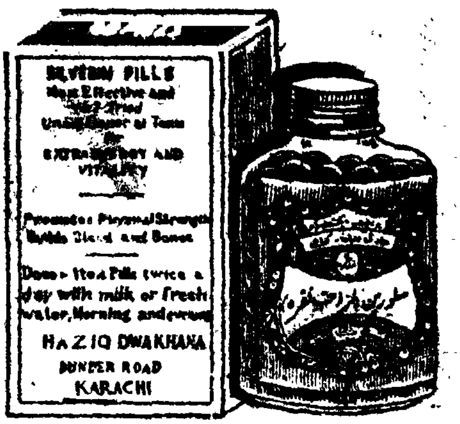
نعیم صدیقی کے ان ہی افسانوں کا اولین مجموعہ

ذہنی زلزلے

کے نام سے ۱۹۴۴ء میں پہلی بار شائع ہوا اور مصنف کی اس ابتدائی کوشش نے دنیائے ادب میں اپنی جگہ پیدا کر لی۔ اب مکتبہ چراغ راہ اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کر رہا ہے۔ ضخامت ۲۰۰ ـــ طباعت اعلیٰ ـــ قیمت دو روپے

مکتبہ چراغ راہ - کراچی نمبر ۱

مقویات سرتاج سلورین پلز



مردوں کے لئے ایک اچھا متوازن اور آج کل کا آزمودہ
جنرل ٹانک ہے جو بھوک کو بڑھاتا ہے اور جسم میں تازہ
اور سرخ خون پیدا ہوتا ہے۔ قوت اور طاقت پیدا کرتا ہے

سلورین

پر آپ بھروسہ کر سکتے ہیں۔ قیمت ۴۰ گولی چار روپے بارہ آنے ۸۰ گولی ۹ روپے

فیملین (نسائی خاص)



یہ گولیاں عورتوں کی جملہ پوشیدہ شکایتوں کو دور کرنے
میں اکسیر ہیں۔ سیلان ماہواری کی بے قاعدگی اور اسی قسم کی
دوسری زنانہ شکایتوں سے پیدا شدہ نقائص کو دور
کرنے میں لاثانی ہیں، استقرار حمل کو مدد دیتی ہیں، گویا
عورتوں کے لئے ایک جنرل ٹانک ہے۔ جس کا متواتر استعمال
عورتوں کے نظام عصبی کو درست کرتا ہے جن عورتوں کو اسقاط
حمل کی بار بار شکایت ہوتی ہو ان کے لئے بید مفید ہے

قیمت مکمل کورس ۴۰ گولی ۲۰ یوم کی خوراک دو روپے بارہ آنے

حاذق دواخانہ بندر روڈ۔ کراچی نمبر ۱


روح افزا
موسمِ گرما کا بہترین تحفہ
موسمِ گرما میں روح افزا فرحت و تازگی کا
پیغام لاتا ہے۔ سخت گرمی میں جب
طبیعت پریشان ہو اور حلق سوکھ
رہا ہو روح افزا کا ایک گلاس آپ
کی تشنگی کو دور کرے گا اور طبیعت میں
شگفتگی اور کیف و سرور پیدا کرے گا

قیادت نمبر ــــ تعمیر نو ــــ شعر نمبر
کے بعد

چراغ راہ کراچی

اپنی معرکہ آرا خاص اشاعت جنوری سنہ ۱۹۵۳ء
پیش کر چکا ہے

یہ ہے اس کی مندرجات کی فہرست :۔

ادبی و تنقیدی مقالات پاکستان بننے کے بعد ادبی رفتار و رجحانات (عاصی ضیائی) مشرقی پاکستان میں نئے ادبی و سماجی رجحانات (فروغ احمد) پاکستان کے ترقی پسند ادب کا جائزہ (حمید اللہ صدیقی) پاکستان کے مشاعرے (ماہر القادری) افسانے کی اصل بنیادی قدریں (اصغر علی عابدی) اسلامی ادب کا فلسفیانہ پس منظر (نعیم صدیقی)

تمثیل ــــ تشکارچو (عاصی ضیائی)

نظمیں ــــ منزلیں دور راہ دشوار ساقی ہے، شاعر نوجوان کے نام (ضیا محمد ضیا) قرآن کی فریاد (ماہر القادری) الدین کلہ ادب (علی منظور) موت ارجنٹ (شمیم جاوید) مقبرے ــ ایک رفیق کے نام (کوثر نیازی) ذخیرہ اندوزوں سے (مظفر گجراتی) مرے احوال، چڑیل کیوں؟ اے نیل کی موجو! (نعیم صدیقی) منشور آزادی (ابو سعید حسرت) کربلا (طالب حجازی) رجز (ابوالبیان حماد)

افسانہ و طنز ــــ بلم بن بجو (جیلانی بی اے) ہیرا گاؤں (نعیم صدیقی) بھوکا ہے پنجاب (نعیم صدیقی) مال حرام (فضل من اللہ) جزیرہ زندہ دلاں (فضل الرحمن) مسٹر کا موٹر (جلال)

غزلیں ــــ عاصی کرنالی، ضیا محمد ضیا، عبدالکریم ثمر، کوثر نیازی، ارشد کاظمی، احمد پرویز، ابو ظہیر انصاری، ظہور الحق صدیقی، نعیم صدیقی

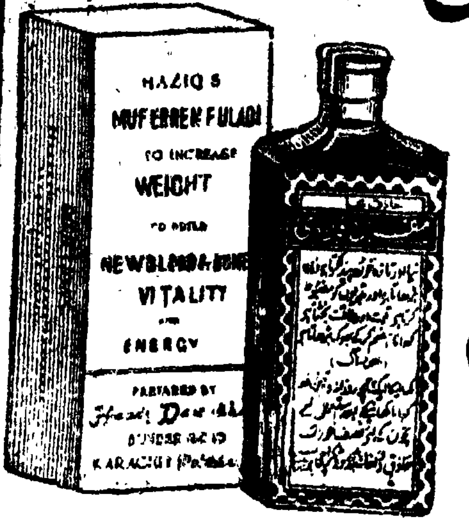
جائزہ پاکستان ــــ ظہور پاکستان اور اس کے پس منظر (ضیا محمد ضیا) مشرقی پاکستان (مولانا محمد عبدالرحیم) دستور پاکستان (ابن ظفر) تعلیمی حالت کا جائزہ (ابو سلیم ایم، اے) پنج سالہ معاشی جائزہ (پروفیسر عبدالحمید) معاشی بحران (پروفیسر اے آر رحیم) جبری انتخابات (سید صدیق الحسن) طب یونانی (حکیم محمد سعید صاحب دہلوی) مسئلہ کشمیر (محمد منظور احمد) چند غیر ملکی شخصیتیں (مولانا محمد مسعود عالم ندوی) ـ میو قوم پاکستان (سردار محمد خان میواتی) ـ

یہ اشاعت خاص درحقیقت علم و ادب کی دنیا کا ایک سنگ میل ہے قیمت ۲/۴ روپے صفحات ۲۳۶

اس اشاعت سے سال بھر کی خریداری قبول کرنے والوں کو کل سات روپے ادا کرنے ہوں گے

اپنی طاقت کی حفاظت کریں

جب آپ کی صحت کمزور ہو اور جسم میں خون کم ہو تو
مشہور عالم



مفرّح فولادی

استعمال کریں۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ مقبول اور
مقوی دوا آپ کی قوت میں اضافہ کرتی ہے۔ اور کھوئی
ہوئی توانائی واپس لاتی ہے۔

دو روپے آٹھ آنے
قیمت فی شیشی

الٰہی زین معدہ من مرنجان۔ وگرچہ رنجیدہ رنجیدہ باشد
معدہ کی خرابیوں کو نظر انداز نہ کیجئے
کہیں ....
معدہ کی خرابیاں آپ کو نظر انداز نہ کر دیں



ھضمی

ایک بہترین سفوف معدہ ہے جو عمل ہضم کو قدرتی طور پر
کام کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اور معدہ کو ہر خرابی سے
محفوظ رکھتا ہے۔ حفظ ما تقدم علاج سے بہتر ہے۔ اس لئے
ہضمی کا استعمال کیجئے تاکہ آپ کا معدہ ہر خرابی سے محفوظ رہے، مرد اور عورت دونوں کے لئے یکساں مفید ہے

ایک روپیہ چار آنے
قیمت فی شیشی

تیار کردہ:۔ حاذق دواخانہ، بندر روڈ کراچی نمبر ا

مکاتیب زنداں

[illegible]

—مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب، مولانا امین احسن اصلاحی صاحب اور میاں طفیل محمد صاحب کے ان خطوط کا مجموعہ جو انہوں نے اپنی اسیری کے دوران میں مرکزی جیل ملتان سے لکھے —

★—اس مجموعے میں تینوں حضرات کی زندگی کا مختصر خاکہ۔ گرفتاری کا پس منظر اور میاں محمد طفیل صاحب کی لکھی ہوئی جیل کی ڈائری (گرفتاری سے رہائی تک) بھی شامل ہے —

★—حکیم محمد شریف امرتسری (حافظ آباد۔ ضلع گوجرانوالہ) نے اس مجموعے کو مرتب کیا ہے —

صفحات ۲۰۸ - مجلد حسین گرد پوش

قیمت—————صرف ۲ روپے

الاخوان المسلمون اور ان کی دعوت

شہید راہ حق شیخ حسن البنا کے ایک خطبہ کا ترجمہ جو آپ نے ۱۹۳۸ء میں اخوان المسلمون کے پانچویں اجلاس میں دیا تھا —

ترجمہ — طٰہٰ یٰسین، رفیق دارالعروبہ۔ راولپنڈی قیمت -/۴/۱

مندرجات

★—دو لفظ از مولانا مسعود عالم ندوی

★—عرض مترجم

★—تمہید

★—جماعت الاخوان المسلمون کی تاسیس

★—الاخوان المسلمون کا اسلام

★—ہماری فکری جامعیت

★—دعوت الاخوان کی بعض دوسری خصوصیات

مولانا امین احسن اصلاحی کی گراں بہا تصنیف

تدبر قرآن

قرآن مجید میں تدبر کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ —اس کام میں کن آداب و شرائط کا اہتمام ضروری ہے۔ تفسیر کی کتابوں سے کون سی کتابیں کس حد تک مفید ہیں؟ عربی ادب کی کس درجہ کی استعداد قرآن فہمی کے لئے ضروری ہے؟ لغت کی کونسی کتاب مطالعۂ قرآن کے وقت پیش نظر رکھنی چاہئے۔ نحو، بلاغت، تاریخ اور حدیث سے قرآن مجید کو کس حد تک تعلق ہے۔؟

دوسرا ایڈیشن۔ ترمیم و اضافے کے ساتھ قیمت -/۴/۳

مکتبہ چراغ راہ کراچی-۱

Printed at Nazir Printing Press, McLeod Road, Karachi &
Title Printed at SHAN ELECTRIC PRESS Arambaugh Road, K...
Printer & Publisher Ghul...


11 JUN 1953

ادب میں اسلامی قدروں کا علمبردار

چراغِ راہ

مدیر:- غلام محمد

جلد ۶
شمارہ ۶

چندہ سالانہ:- پانچ روپے

قیمت فی پرچہ:- ۸ آنے

جون سنہ ۱۹۵۳ء

مندرجات

دفتر ماہنامہ چراغ راہ ۹۔ لوٹیا بلڈنگ آرام باغ روڈ کراچی

چودہری غلام محمد نے ناظر پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر دفتر چراغ راہ آرام باغ روڈ سے شائع کیا۔

ایک مرتبہ کی گرفتاری، پھر رہائی، پھر گرفتاری یہ کچھ ایسا چکر ہے کہ بے اختیار مصرع ذہن میں ابھر آتا ہے:-

کیا اسیری ہے، کیا رہائی ہے

جیل کے پھاٹک سے نکلتے ہوئے ارادہ یہ تھا کہ جتنا جلد ممکن ہوا، اپنے تاثرات و واردات قلمبند کر دوں گا، تاکہ چراغ راہ کے جون کے شمارہ میں شائع ہو جائیں علاوہ بریں خیال تھا کہ جناب مولانا امین احسن اصلاحی کوثر نیازی اور دوسرے رفقاء کے تاثرات بھی اسی شمارے میں جمع کر دیئے جائیں۔ مگر ابھی کچھ ایسے تجربات سے گذرنا باقی ہے کہ اس سے پہلے اظہار کی اجازت خود اُدھر سے نہیں ہے۔ اسی لئے تو میں جیل کے پھاٹک سے باہر آ گیا، مگر میرا قلم ابھی تک جیل ہی میں ہے۔ ابھی داستان اتنی مکمل ہوئی نہیں کہ کسی سے کہی جائے

مختصر یہ کہ یہ چالیس روز جو گذرے ہیں، یہ گویا ایک عظیم الشان "خانقاہ" یا تربیت گاہ میں چلّہ کھینچا گیا ہے۔ چلّہ تصوف کا چلّہ نہیں، تحریک اسلامی کا چلّہ!

ایک کورس ہو چکا، اور اللہ کا شکر کہ کامیاب رہے، اب دوسرا کورس شروع ہونا ہے اور خدا سے دعا ہے کہ وہ بہت تھوڑے وقت میں اس میں بھی کامیابی عطا فرما کر تربیت گاہ سے فارغ کر دے۔ وہی ہمارا ولی ہے، وہی وکیل ہے، وہی نگہبان ہے اور وہی ہر شر کے مقابلے میں ہمارا دفاع کرنے والا ہے۔

نعیم صدیقی

۹ - مئی ۱۹۵۳ء

تھانہ اچھرہ

سوچ بچار

اصل سرچشمۂ طاقت

آج سے ڈھائی ہزار برس قبل ایک چینی مصلح نے حکومت کے بارے میں ایک استفسار کے جواب میں کہا "حکومت کے تین لوازم ہیں عوام کے پاس کافی خوراک ہونی چاہئے۔ ملک میں کافی فوج ہونی چاہئے۔ اور حکومت کو عوام کا اعتماد حاصل ہونا چاہیئے"

مستفسر نے پوچھا۔ "اگر تمہیں ان تینوں لوازم میں سے ایک کو چھوڑ دینے کے لئے مجبور کیا جائے تو تم کس کو چھوڑنا گوارا کروگے؟"

کنفوشس نے جواب دیا "میں فوج چھوڑ دونگا"

مستفسر نے پھر پوچھا "اور اگر تم کو باقی ماندہ دو لوازم میں سے بھی ایک چھوڑ دینے پر مجبور کیا جائے پھر کس کو چھوڑو گے؟"

کنفوشس نے جواب دیا۔ "میں یہ گوارا کرلونگا کہ عوام کے لئے کافی خوراک موجود نہ ہو۔ جب سے آدمی اس کرۂ ارضی پر آباد ہے موت کا سلسلہ ہر زمانے اور ہر قرن میں جاری رہا ہے۔ لیکن ایک قوم اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتی جب تک کہ اس کو اپنے حاکم پر اعتماد نہ ہو"

اعتماد کے مفہوم کی مزید وضاحت اس کے ایک جلیل القدر پیرو نے اس کی موت کے دو سو برس بعد یوں کی "جب عوام کو بن مانگے وہ کچھ مل جاتا ہے جو وہ چاہتے ہیں تو حاکم کو وہ چیز حاصل ہو جاتی ہے۔ جسے اعتماد کہتے ہیں"۔

اس حقیقت کا اظہار آج نہیں۔ اس ملک کے کسی حزب مخالف کے لیڈر نے نہیں، اس ملک سے کئی ہزار میل دور اور ہزارہا برس پہلے ایک شخص نے کیا تھا۔ اگر یہ بات ایک اٹل اور غیر متغیر حقیقت نہ ہوتی تو آج سے اتنے ہزار برس پہلے اس شخص نے کبھی محسوس نہ کی ہوتی مگر معلوم ایسا ہوتا ہے کہ تکوینی قوانین کی طرح قوموں کے بناؤ بگاڑ کے بھی قوانین ہیں۔ ہماری زندگی کا وہ حصہ جو بظاہر شعبۂ اختیار سے تعلق رکھتا ہے وہ بھی کسی قانون اور کسی اصول کا پابند ہے

اس زاویۂ نگاہ سے جب ہم اپنی حکومت کی طرف دیکھتے ہیں۔ تو معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ اس حقیقت پر قائم نہیں ہے جس کو ایک شخص نے آج سے ڈھائی ہزار برس پہلے محسوس کیا تھا۔ اور اس کے بعد ہر زمانے کے ذہین لوگ پیہم محسوس کرتے چلے آئے ہیں۔ اس حقیقت کی چھان بین کی زیادہ ضرورت نہیں، اور نہ اس کا اقرار کروانے کے لئے دلائل کے انبار لگانے کی ضرورت ہے۔ یہ ایک سیدھی سادی سی بات ہے کہ لوگ اسی وقت تک کسی حاکم یا حکومت کی اطاعت کرتے ہیں جب تک کہ وہ اس کو پسند کرتے ہیں اور اس کی دانائی اور تدبر پر اعتماد کرتے ہیں۔ جونہی وہ اپنی حکومت سے ایسے احکام سرزد ہوتے دیکھتے ہیں۔ جو ان کی قومی خواہشات کے منافی ہوں تو وہ رفتہ رفتہ اس سے جدا ہو جاتے ہیں۔ اور اس خلا اور تضاد کو محسوس کرنے لگتے ہیں جو ان کی خواہشات اور حکومت کی خواہشات کے درمیان پیدا ہو جاتا ہے ایسا خلا اچانک پیدا نہیں ہوتا، ایسا تضاد یک بیک رونما نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے ارتقاء کی کڑیاں مدت تک پھیلی ہوتی ہیں۔ جو کبھی تو نظر آجاتی ہیں اور کبھی عوام کی نفسیات میں چھپی رہ جاتی ہیں۔ جب تضاد کا یہ مواد پک جاتا ہے، حکومت اور عوام کے راستے اتنے جدا ہو جاتے ہیں کہ ایک کی آواز دوسرے تک نہیں پہنچ سکتی تو اچانک ملک و ملت ریت کے گھروندے کی طرح کھڑ کھڑا کر نیچے آ رہتے ہیں۔

اپنے حاکم پر اعتماد اور اس سے اچھے نتائج کی ترتیب کی عمدہ مثال تحریک پاکستان میں بخوبی نظر آجاتی ہے۔ یہی مسلمان قوم تھی جس کی بے مقصد زندگی اور انتشار ذہنی کا ثبوت شہید گنج ایجی ٹیشن میں نمایاں ہوگیا تھا۔ اس کا کوئی عناں گیر نہ تھا۔ کوئی رہبر نہ تھا۔ یہ ہر گماشتۂ اجل کی نخچیر بن رہی تھی۔ پھر یہی قوم تھی جس نے قائداعظم مرحوم و مغفور کا دامن تھاما اور اس پر اس حد اعتماد کا

اظہار کیا کہ اس نے ہر مرشد سے بیعت توڑ اس ایک کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اور چند ہی سالوں میں گولیاں کھائے اور گرفتاریاں دیئے بغیر اتنا عظیم انقلاب بپا کر دیا کہ تاریخ عالم میں اس کی نظیر نہیں ملتی ہے۔

کم از کم ہم کو تو اس کامیابی کی یہی سب سے بڑی وجہ نظر آتی ہے کہ قائد اعظم نے اپنی دیانت اور فراست سے اپنی قوم کا اعتماد حاصل کر لیا تھا، قوم جن صفات کو چاہتی تھی اسے وہ بدرجۂ اتم قائد اعظم کے کردار میں نظر آگئیں۔ اس سے پہلے وہ بددیانت اور متلون لیڈروں کے کافی پرکھ کے سہہ چکی تھی۔ وہ اپنے اعتماد کو کسی کے حوالے کرنا چاہتی تھی لیکن کوئی ایسا امین نہ ملتا کہ جس کے پاس وہ اپنی یہ گرانمایہ امانت رکھ سکتی۔ جب ایک ملا تو اس نے اپنا آپ ہی اس کے حوالے کر دیا۔

قائد اعظم خود بھی اپنی قوم کی نفسیات سے پوری طرح آگاہ تھے۔ اور انہوں نے عین مایوسی کے عالم میں اپنی قوم کا ہاتھ تھاما انہوں نے پاکستان کی تجویز اسی بنا پر سوچی تھی کہ مسلمان قوم کی نفسیات اس کا مقصد وجود اور اس کا دین بالکل الگ نوعیت کے ہیں اور وہ کسی صورت بھی ہندو قوم کی تنگ نظری سے لگا نہ کھا سکتے تھے۔ یہ ایسا دعویٰ تھا کہ جس نے اچانک قوم کو بیدار کر دیا۔ وہ محسوس کرنے لگے کہ جو بات ہمارے لاشعوری اعمال سے ظاہر ہوتی تھی، اور ہم خود اس کو نہ پا سکتے تھے۔ وہ اس شخص نے نکھار کر ہمارے شعور میں ڈالی ہے۔ مطالبۂ پاکستان گویا کھوئی ہوئی چابی تھا۔ جس کو ساری قوم تلاش کر رہی تھی۔ جس طرح مریض صحیح تشخیص سے مطمئن ہو کر ہو کر اپنے آپ کو معالج کے حوالے کر دیتا ہے اسی طرح قوم نے قائد اعظم کی صحیح تشخیص پر اعتماد ظاہر کیا اور اپنے آپ کو ان کی قیادت میں دے دیا۔ پھر جب تک قائد اعظم زندہ رہے انہوں نے قوم کو کبھی مایوس نہ کیا اور خود قوم نے بھی کبھی اپنے قائد پر شک نہ کیا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ان کا قائد ان کے اُن مطالبات اور تقاضوں کو بھی سمجھتا ہے جو فی الحال ان کے شعور میں اجاگر نہیں ہوئے۔ اور وہ جو کہتا ہے وہ کر گذرتا ہے اگرچہ اس کی راہ میں کتنے ہی سنگ گراں حائل ہوں۔

قائد اعظم اپنے پیچھے مسلم لیگ نہیں، اسلامی نظام کا شرمندہ تعبیر خواب چھوڑ گئے، انہوں نے پاکستان کا خواب پورا کر دکھایا دوسرا وعدہ جو انہوں نے پاکستان بننے کے فوراً بعد کیا تھا وہ یہ تھا۔ کہ ہم اپنے تصوّرات کے مطابق ایک ریاست تعمیر کریں گے

انہوں نے اس وعدے کا اظہار لاہور میں کیا، ڈھاکے

میں کیا، اور پشاور میں کیا۔ اور ان کے اس وعدہ پر شک کرنے کی کوئی گنجائش نہ تھی، وہ جو کچھ کہتے تھے اسے عمل میں ڈھالنے کیلئے کہتے تھے ان کے الفاظ صحیح معنوں میں سنگ ہائے بنیاد عمل تھے۔ لیکن قدرت کا منشا یہ تھا کہ ان کے جانشینوں کی آزمائش کی جائے۔

قائد اعظم کی بے محل وفات نے ملک کے لئے ایک نئی مشکل پیدا کر دی اور وہ انکی بجائے کسی لائق نائب کا انتخاب تھا۔ یہ جگہ جلد ہی ان کے ایک لائق رفیق نے پوری کر دی۔ وہ سالہا سال قائد اعظم کے ساتھ کام کرتے رہے تھے۔ اور انہوں نے قریب سے ان کی کامیابی کے رازوں کا مطالعہ کیا تھا۔ قوم مطمئن ہو گئی کہ وہ مقام بالکل خالی نہیں رہ گیا۔

پاکستان کی حکومت کا رویّہ قائد اعظم کے بعد کسی رخ پر چلتا نظر نہ آیا۔ تو عوام میں کھسر پھسر شروع ہو گئی، ذہین طبقہ بغور حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ فی الواقع حکومت مصائب میں گرفتار تھی، بیخ و بن سے اکھڑے ہوئے لوگوں کو از سر نو بسانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ کشمیر کا قضیّہ پورے وجود پاکستان کے لئے وجۂ اضطراب تھا۔ لیکن جو چیز سب سے زیادہ کھٹک رہی تھی وہ انتظام حکومت میں خرابی تھی اور اس خرابی کی تہ میں ہی غیر مسلموں کا سا طور طریق صاف صاف نظر آ رہا تھا۔ اس وقت انتظام حکومت کے بارے میں تو یہ عذر پیش کیا جا سکتا تھا کہ نو زائیدہ مملکت کے پرزے ابھی آزمودہ کار نہیں ہوئے، اور تجربے کے آلام ابھی چین نہیں لینے دیتے لیکن

سوچ بچار

رشوت کی گرم بازاری کی کیا توجیہ پیش کی جا سکتی تھی؟ عدالتوں میں بے انصافی، تھانوں میں ظلم اور سیاست میں سینہ زوری کی کیا توضیح ہو گی۔ یہ ٹھیک ہے کہ مدت ہائے دراز کی پچھلی روش سے یک لخت نہیں ہٹا جا سکتا لیکن کسی رخ کی طرف چلنے کا ثبوت تو ملنا چاہیئے تھا۔ یہاں ذرح کے کیفیٹوں اور میس روموں میں ویسے ہی شراب چلتی تھی جیسے قبل تقسیم، یہاں مذہبی شعائر کو ویسے ہی ناپسند کیا جاتا تھا جیسے قبل تقسیم یہاں سیاست میں وہی خیالات رچنے بسنے لگے جیسے کہ قبل تقسیم۔ وزیروں اور گورنروں کو وہی تنخواہیں اور دبدبے میسر آنے لگے جیسے کہ قبل تقسیم۔ اگر تقسیم کے بعد بھی وہی صورت قائم تھی تو تقسیم کا مطلب؟

پاکستان بھر میں صرف ایک شخص نے یہ صورت حال پورے درد و سوز اور وضاحت کے ساتھ محسوس کی۔ اس نے محسوس کیا کہ یہ خرابی جلد از جلد دور ہونی چاہیئے۔ اور اگر ریاست نے اسلام کو اپنا نصب العین بنانے کا اعلان نہ کیا تو قوم میں ذہنی انتشار پیدا ہو جائے گا جس نیو پر اس کی اٹھان تھی وہی ڈھے جائے گی۔ اور یہ احساس کوئی غیر منطقی اور غیر معقول نہ تھا۔ اگر پاکستان میں اشتراکی نظام کے قیام کا مطالبہ کیا جا سکتا تھا تو اسلامی نظام کا مطالبہ کیوں نہ کیا جاتا جبکہ اس کی بنیاد ہی اس مطالبے پر اٹھائی گئی تھی اور اسکے بانی نے اس کا وعدہ کیا ہوا تھا۔ اس سلسلے میں تقریریں ہوئیں، قوم کی نفسیات اور ملک کی حالت سامنے رکھ کر اس کا علاج اسلام کے قانون میں دکھایا گیا، خود اسلام کو عالمگیر سچائی ثابت کرنے کے لئے دلائل سامنے لائے گئے، اور اس کی کامیابی کے روشن امکانات کا جلوہ دکھایا گیا۔ لیکن حکومت نے کروٹ تک نہ بدلی۔ اور اس سے عوام کو اپنے سابق آقاؤں کی یاد دلانے والی یہ روش بھی نظر آ گئی اب تقریریں مطالبے کی صورت اختیار کر گئیں۔ اور یہ مطالبہ پاکستان گیر بن گیا۔ اس کے جواب میں اس شخص کو کشمیر کے کاز کو نقصان پہنچانے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا جس نے سب سے پہلے اس مطالبے کی اذان دی تھی۔

ابھی اسلام میں دلچسپی رکھنے والے پاکستان میں اسلام کے امکانات پر سوچ بچار ہی کر رہے تھے کہ اچانک قرارداد مقاصد منظور کر لی گئی، اس کی دفعتہً منظوری گویا ایک حادثہ تھا جو اچانک واقع ہو گیا۔ اب اسلام کے امکانات روشن ہو گئے تھے۔ اس شخص کا ساری قوم نے شکریہ ادا کیا جس نے اسے وہ چیز عطا کی جس کی وہ طلب رکھتے تھے سوائے اس قلیل طبقہ کے جو قوم میں سے ہوتے ہوئے اس کی سی حیثیت اسکے سے جذبات اور اس کی سی نفسیات نہ رکھتا تھا۔

لوگ پھر مطمئن ہو گئے لیکن ان کے آبگینۂ اعتماد پر مطالبہ دستور اسلامی کی مہم کے دوران میں دراڑیں ضرور آ گئی تھیں اور یہ وہ سبب منجملہ واضح نہ ہوا تھا جس کی بناء پر پورے انیس ماہ اعلان اسلام میں تعویق کی گئی تھی؟

لیکن ان کو وہ سبب معلوم کرتے دیر نہ لگی جب بنیادی حقوق کی پہلی رپورٹ ان سامنے آ گئی۔ اس رپورٹ نے وہ کچھ ظاہر کر دیا جو کسی دوسرے ذریعے سے معلوم نہ ہو سکتا تھا۔ اس نے بتا دیا کہ حکومت اور اس کے حوالی موالی درحقیقت اسلام کے خواہاں نہیں۔ لیکن جب عوام اسلام ہی پہ مصر ہیں تو ملک میں اسلام کی وہ شکل رائج کی جائیگی جس کو وہ چاہتے ہیں۔ یہ اسلام خلافت راشدہ کی نظائر سے مستنبط نہیں کیا گیا، نہ یہ قرآن و حدیث سے اخذ کیا گیا تھا۔ یہ اسلام تو سرمایہ داری اور ڈکٹیٹرشپ کے صحیفوں سے استخراج کیا گیا تھا۔ اور اس کے اس مزاج کو چھپانے کی اتنی بھی کوشش نہ کی گئی کہ ایک اوسط درجے کے مسلمان سے مخفی رہتا۔

اس رپورٹ پر بلند اور ہمہ گیر احتجاج اٹھا۔ حکومت نے وہ رپورٹ واپس لے لی۔ اور اس کے ساتھ ہی اسلام چاہنے والے لوگوں کو ملا کی گالی دے کر اور حزب اختلاف کے سرخیلوں کو ابولہب اور دشمن کے کتے کہہ کر چیلنج کیا کہ اسلامی حکومت کے قوانین اگر کہیں ہیں تو سامنے لائیں، گویا دستور سازی کوئی کرے اور اس کی اجرت کوئی لے۔ مگر ہر مذہب و مسلک کے چیدہ نمائندہ علمائے یہ چیلنج قبول کر لیا اور دو دن میں اسلامی حکومت کے وہ اصول پیش کر دیئے جو قرآن و حدیث سے مستنبط اور ہر مذہب و مسلک کو قبول تھے۔

سوچ بچار

اور جن کی تلاش میں اتنا قیمتی وقت اور اتنا روپیہ ضائع کیا گیا تھا۔
اور بعد میں پیدا ہونے والے حالات کے پیش نظر یہ امر باعث شاق نہیں ہونا چاہیئے۔ کہ یہ متفقہ علیہ اصول حکومت نے قبول نہیں کئے

لیاقت علی خاں مرحوم کے بعد حالات نے ایک اور پلٹا کھایا۔ اب وہ شخص برسراقتدار آیا جس کی دیانت داری مشتبہ نہ تھی۔ عوام نے قدرے اطمینان کا سانس لیا۔ اور خیال کیا کہ اب حالات زیادہ بہتر اور اسلام کے حق میں مفید ثابت ہوں گے۔ وزیر اعظم نے قوم کا اعتماد طلب کیا۔ لیکن قوم کا یقین مجروح ہو چکا تھا۔ وہ متذبذب رہی اور اپنی رائے کو اس وقت تک محفوظ رکھا جب تک کہ نئے وزیر اعظم کوئی اعتماد خیز کام نہیں کرکے دکھاتے تھے۔
لیکن چند روز بعد انتخابات کے سلسلے میں معلوم ہو گیا کہ وہ بھی اپنی دینداری کو اپنی پرائیویٹ زندگی تک محدود رکھنا چاہتے ہیں انتظام حکومت میں زیادہ ڈھیلاپن آ گیا۔ ملک میں غذائی بحران پیدا ہو گیا اور اس عرصہ میں وہ بنیادی حقوق کی رپورٹ بھی سامنے آ گئی۔ جس کو ایک مدت طویل سے تیار کیا جا رہا تھا۔ عوام قیاس کر رہے تھے کہ یہ رپورٹ خالص اسلامی اور جمہوری ہوگی' ان میں ان کی خواہشات کا پورا پورا عکس ہوگا۔ لیکن جب یہ سامنے آئی تو یک لخت ہر جانب سے یہ آواز تھی کہ یہ تو وہی پرانی شراب ہے۔ عوام جس حقیقت سے صرف نظر کر رہے تھے وہ پھر سامنے آ گئی۔ اور اس شدت سے آئی کہ بعض جماعتوں نے برسر اقتدار طبقہ سے حکومت کی گدیاں چھوڑ دینے تک کے مطالبے پر دستخط کرانے کی مہم شروع کر دی۔ ملک کے مختلف گروہوں نے اس رپورٹ کو بھی قابل تنسیخ قرار دیا۔ لیکن نمائندہ علماء نے اپنے وقار اور شان علم کے مطابق نہایت سنجیدگی سے اس کی ایک ایک شق پر غور کیا اور اسے قابل ترمیم قرار دیا۔
اسی عرصہ میں قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کا مطالبہ بھی کیا جا رہا تھا۔ اور توقع تھی کہ بنیادی حقوق میں اس مطالبہ پر بھی غور کیا جائے گا۔ لیکن اس میں اس کا قطعی ذکر تک نہ تھا۔ علماء کی ایک جماعت نے اس نکتہ کو سب مسائل سے اہم جان کر اس کو منوانے کا تہیہ کر لیا۔ جب اس مطالبہ کی مہم جاری تھی تو حکومت نے پھر اسی اغماض اور بے رخی کا ثبوت دیا اور علماء کی آواز کو قوم کی آواز کی بجائے چند ملاؤں کی چیخیں سمجھ کر درخور اعتنا نہ جانا۔ اور ملک کے ایک حصہ میں وہ کچھ ہو گیا جس کی پیش بینی کوئی مدبر نہ کر سکتا تھا۔

پاکستان کے معرض وجود میں آنے سے اب تک جتنے اہم واقعات ہوئے ہیں ان کو ایک جلوس کی شکل میں دیکھ کر ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ حکومت اور عوام کی درمیانی خلیج بجائے گھٹنے کے کچھ بڑھتی ہی گئی (ہم ان واقعات کا تذکرہ قصدًا درمیان میں نہیں لائے جو موضع ڈھیرو کی اور موچی دالا میں ہوئے۔ اس لئے کہ وہ حوادث ایک ہی بڑی موج کے چند تھپیڑے تھے) حکومت پر بداعتمادی بجائے کم ہونے کے زیادہ ہی ہوتی گئی۔ اس کا کوئی وعدہ قابل یقین نہیں رہا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام جو کچھ چاہتے تھے وہ انہیں انہیں جو کچھ مطلوب تھا وہ دیا نہیں گیا۔ ان کے ساتھ جو وعدے کئے گئے تھے انہیں پورا نہ کیا گیا۔ اور ہر بات منوانے پر انہیں زور ہی صرف کرنا پڑا۔ طلباء نے چند مطالبات پیش کئے تو گولیاں کھائیں۔ دینداروں نے اسلام یاد دلایا تو انہیں جیل میں ٹھونس دیا۔ اب عوام قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کر رہے ہیں تو ان پر سختی کی جا رہی ہے۔ عوام پسند نہیں کرتے کہ عورتیں مرد بنیں لیکن انہیں مرد بنایا جا رہا ہے۔ عوام راگ رنگ' اور رقص و آرٹ کو گناہ تصور کرتے ہیں لیکن اسے وضو کرا کے عین اسلامی شکل و صورت میں انہیں کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے عوام غافل ہیں لیکن کافر نہیں۔ وہ سست عمل ہیں۔ کم عمل ہیں بلکہ بدعمل ہیں لیکن بدعقیدہ نہیں' وہ ان چیزوں سے

علیحدہ نفرت کرتے ہیں جو ان کے ان اعتقادات کے خلاف ہیں جو پیدا ہوتے ہی ان کے کان میں پھونکے گئے تھے۔ اب ان کو ان کے اعتقادات اور قومی مزاج کے خلاف باتوں کا حکم دیا جائے تو اسے کب قبول کریں گے؟ ان سے جتنی چیزیں بھی خلاف طبیعت منوائی جائیں گی اتنی ہی ان کی بیزاری حکومت سے بڑھے گی۔ اور اتنی ہی بداعتمادی ان کے اندر پھیلے گی۔

جب حکومت عوام میں اپنا اعتماد کھو دے تو وہ کبھی حکم چلا سکتی ہے؟ اس صورت میں خود عوام کی حالت کبھی سدھر سکتی ہے؟ اس صورت میں دونوں کے لئے زندگی ایک بوجھ بن جاتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ قانون فطرت اپنی انتقامی کارروائی شروع کر دیتا ہے۔

جب ہم حکومت پر قوم کی نفسیات سمجھنے پر زور دیتے ہیں تو اس سے ہمارا مطلب اس تہذیب و ثقافت کو جاننا اور پہنچانا ہے جو ساڑھے تیرہ سو برس سے ہمارے مزاج کو بناتی اور ڈھالتی چلی آ رہی ہے۔ ہم عورت کا مرد بننا اسی لئے ناپسند کرتے ہیں کہ ہماری طبیعت ایسی ہے، ہم تک جو روایات پہنچی ہیں ان سے ہم نے ایسا کرنا سیکھا ہے۔ ہماری تہذیب ثقافت نے ہمیں مسئلہ جنس کو اسی اسلوب پر حل کرنا بتایا ہے، ہم ہر کلمہ گو کو اپنا بھائی اور معاشری لحاظ سے برابر سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ ہمارے دین نے اوّل روز ہمیں یہی سبق پڑھایا۔ اور اس کے علمبرداروں نے اس پر ایسا ہی عمل کر دکھایا تھا۔ اب یہ روش ہمارا مزاج اور ہماری طبیعت بن چکی ہے۔ صدہا برس تک ہندوؤں کے پہلو بہ پہلو بسنے کے باوجود اپنے اس مزاج کو نہیں بدل سکے۔ ڈیڑھ سو برس کی بدترین قسم کی غلامی تک نے ہماری طبیعت کو نہیں بدلا بالآخر ہمارے مزاج نے ایک ایسا انقلاب برپا کر دیا کہ تاریخ عالم میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

قومی مزاج ایک دن میں نہیں بن جایا کرتے، ان کی تعمیر و پختگی میں صدیاں لگتی ہیں پھر اس کی تخریب و ریخت بھی ایک دن میں نہیں ہو جاتی۔ اس کے لئے صدیوں کی پیہم اور مسلسل عیاری اور ہمت درکار ہے۔ یہ مزاج ایک نہیں کروڑہا انسانوں کے صدیوں کے تجربہ و دانش کا ثمرہ ہوتا ہے اور اس مزاج کو ادھیڑنا گویا ان کروڑوں انسانوں کے صدیوں کے تجربہ و دانش کو ادھیڑنا ہے۔ ہم مغرب سے اس لئے مختلف ہیں کہ ان کروڑوں انسانوں کا تجربہ و دانش مختلف تقاضوں کے تحت ہمیں یہ مزاج ملا ہے۔ اور ہمارے مزاج کو مغرب کے علوم سے نہیں دریافت کیا جا سکتا۔ اس کا انکشاف ہماری تہذیب و ثقافت کے ان علوم سے ہوگا جس نے ہم کو ایسا بنایا۔ کیمبرج اور آکسفورڈ میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ ان کے آباؤ اجداد کا ورثہ ہے، وہاں جس تہذیب و ثقافت کی نمائش کی جا سکتی ہے وہ ان کے آباؤ اجداد کے تجربات و دانش کا نچوڑ ہے۔ مغربی تہذیب و ثقافت و سائنسی علوم جس نتائج پر پہنچے ہیں وہ ہماری تہذیب و ثقافت اور ہمارے علوم سے بنیادی طور پر مختلف ہیں، ان کے نزدیک یہ کائنات ایک بے مادی ارتقاء کا نتیجہ ہے جس کو کسی سبب اولیٰ نے محض اتفاق سے تشکیل دیا ہے۔ جب کہ ہم اسے ایک ایسی ہستی کی منصوبہ بندی سمجھتے ہیں جو حکمت اور تدبّر والی ہے۔ ان کے خیال میں انسان کی زندگی میں دو ہی قوّت ہائے محرکہ ہیں جنس اور بھوک۔ ہمارے نزدیک انسان کی زندگی اخلاق اور نیکی ہی سے عبارت ہے۔ ان کی تہذیب و ثقافت اور ان کے علوم نے ان کو اس نتیجہ پر پہنچایا جب کہ ہماری تہذیب و ثقافت، ہماری روایات، ہمارے دین اور اس سے پیدا شدہ علم نے ہمیں یہ کچھ بتایا۔

ہماری سوسائٹی کے وہ افراد جن کو اپنی تہذیب و ثقافت اور اپنے علوم سے بے گانہ رکھ کر مغربی علوم اور اس کی تہذیب و ثقافت میں رچایا گیا ہے، اختلاف کی اس خلیج کو نہیں سمجھ سکتے جو ان کے اور ہماری قوم کے سواد اعظم میں پائی جاتی ہے۔ وہ غیر ملکی عہد حکومت میں ان کی نگاہوں میں مقبول ہو کر تو اپنی قوم میں سرفراز ہو سکتے تھے لیکن اب جبکہ ریاست ہی عوام کی خواہشات پر بنائی گئی ہے تو وہ کیوں کر ان خیالات کے ساتھ بلکہ ان کا تسلّط چاہتے ہوئے اس قوم میں سرفرازی حاصل کر سکتے ہیں جس نے ان کے محبوب خیالات کو کبھی بھی نگاہ تحسین سے نہیں دیکھا تھا۔ پہلی حکومت غیر ملکی تھی۔ وہ اپنی قوت اور دباؤ کے بل بوتے پر حکومت کرتی تھی۔ اب حکومت اپنی ہے، یہ قوت اور دباؤ کے بل بوتے پر

ے

حکومت نہیں کر سکتی۔ اور قوت اور دباؤ سے کبھی حکومتیں چلا کرتی ہیں؟ اپنی حکومت صرف چل سکتی ہے تو اپنے عوام کے مزاج اور اپنی قوم کی طبیعت کے مطابق حکم کرکے۔ آبادی سے دور شیشے کے محلوں میں بیٹھ فائلوں پر دستخط تو کئے جا سکتے ہیں، حکم بھی جاری کئے جا سکتے ہیں لیکن لوگوں کو مطیع و منقاد نہیں بنایا جا سکتا۔ انہیں مطیع و منقاد ان کی خواہشات کا احترام کرکے ہی کیا جا سکتا ہے۔

ہم مزاجاً اسلام چاہتے ہیں۔ اور جس طرح اس مزاج نے پاکستان بنانے کی راہ پیدا کرلی تھی۔ اسی طرح اب اسلام قائم کرنے کی تدبیر بھی کرلے گا۔ اور اس مزاج کی قوت کا اندازہ تقسیم کے وقت کل دنیا نے دیکھ لیا تھا، یہ مزاج ایک آدمی کا مزاج نہیں تھا، کروڑوں انسانوں کا مزاج تھا۔ اور اس مزاج کے خلاف حکم دینا گویا ان کروڑوں انسانوں کے تجربات زندگی، غور و فکر اور تدبر و دانش سے ٹکر لینا ہے۔

اسلامی دستور کا مطالبہ ہم اس لئے نہیں کرتے کہ اس بارے میں ہم کوئی متعصب رائے رکھتے ہیں بلکہ اس لئے کرتے ہیں کہ یہ ملک صرف اسلام ہی کے سہارے جی سکتا ہے اس کے بغیر نہیں اس کی دو وجوہ ہیں ایک تو یہ کہ یہ ملک حاصل ہی اسلام کے نام پر کیا گیا تھا۔ دوسری یہ کہ اسلام کے حق میں جو دلائل آج سے تیرہ برس پہلے یعنی تجویز پاکستان کے وقت موجود تھے وہ اب بھی موجود ہیں۔

بحیثیت مسلمان کے ہم نہ تو اشتراکیت قبول کر سکتے ہیں نہ سرمایہ داری، کیونکہ دونوں نظریات کی بنیاد جس مادی لادینی تصور زندگی پر ہے وہ ہمارے لئے طبعاً، مزاجاً اور عقلاً ناقابل قبول ہے۔ یہ دونوں نظریات اس معاملے میں مشترک ہیں کہ اجتماعی زندگی کے معاملات مذہب سے غیر متعلق ہو کر حل کئے جائیں۔ حالانکہ ہماری زندگی کا مدار ہی مذہب پر ہے۔ ان نظریات کے لحاظ سے آدمی کی آدمیت اس کے معاشی مسائل کے سلجھنے میں مضمر ہے جبکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ آدمی کی آدمیت اس کے بدن میں نہیں اس کی روح میں مضمر ہے۔ دونوں نظریات کی اساس اس لحاظ سے مشترک ہے کہ وہ خدا کے بغیر دنیوی مسائل حل کرنا چاہتے ہیں اگرچہ دونوں کے نقشہ ہائے زندگی میں قدرے اختلاف ہے، جہاں تک معاشی مسائل کے حل کا تعلق ہے اشتراکیت نے ان کو سرمایہ داری سے بہتر حل کیا ہے۔ لیکن اس کی معاشی منصوبہ بندی سیاسی ڈکٹیٹر شپ اور تمام ذرائع آمدن پر جابرانہ قبضے کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ مغربی سرمایہ داری میں اشتراکیت سی دہشت ناک جبریت نہیں لیکن افلاس اور بے روزگاری ہے۔ دونوں نظریات کے عملی انجام اب قریب قریب ظاہر ہو چکے ہیں۔ اس کے ساتھ ان کے علمبرداروں کی عملی زندگیاں بھی، لیکن ہم ان نظریات کو ان کے انجام بد کی بنا پر ہی نہیں بلکہ اس بنا پر ناپسند کرتے ہیں کہ ان کی روح ہماری روح مذہب سے بیگانہ و متضاد ہے ان نظریات کے سوچنے والے جانتے ہی نہیں کہ مشرقی اقدار کا علمبردار ہے اور اس سرزمین میں پیدا ہونے والے زندگی کے کس پہلو کو عزیز جانتے ہیں زندگی کو دیکھنے کا یہ بنیادی فرق ہم کو اور ان نظریات کے ماننے والوں کو بالکل مختلف راستوں پر ڈال دیتا ہے اور ان کے سیاسی غلبہ کے باوجود ہم مزاجاً اس راہ سے کبھی اثر پذیر نہیں ہو سکتے۔ . . . .

. . . . زندگی کے ہر ہر موڑ اور اہم معاملہ میں ہمارے اور ان کے درمیان ٹکر ہو جاتی ہے۔ وہ عورت کو گھر کی چار دیواری سے باہر کھینچ لانا چاہتے ہیں جبکہ ہم اس منطق کو کبھی سمجھ ہی نہیں سکے۔ ان کے نزدیک انگور کے افشردہ اور عرق میں کیا بنیادی فرق ہے جبکہ ہمارے لئے وہ زندگی اور موت کا معاملہ ہے وہ اس کو غیر قانونی یا زیادہ سے زیادہ بے وفائی سے تعبیر کردیں گے اگر بیوی کسی غیر سے آشنائی پیدا کرلے یا خاوند کی نظر التفات دوسری جانب ہو جائے جبکہ ہم اس کو گناہ کبیرہ سمجھتے ہیں۔ غرض زندگی کے ہر شعبہ میں ہمارا اندیشۂ نگاہ ان سے بالکل مختلف و متضاد ہے جب ہم ان کے تصور زندگی اور اس سے مترتب ہونے والے اخلاق ہی کو صحیح نہیں سمجھتے تو اسی تصور زندگی سے پیدا ہونے والے معاشی اور سیاسی نظام سے ہم کیونکر سمجھوتہ کرلیں گے؟ یہ نظام جب آئے گا اپنے ساتھ اپنی اخلاقیات اور اپنا ذوق بھی لائے گا۔ اگر ہم نے اسے قبول کرلیا تو انہیں بھی قبول کرنا پڑے گا۔ اور ان کو قبول کرنا صرف اپنے کئے کرائے پر پانی پھیرنا ہی نہیں بلکہ اپنے آپ کو روس یا امریکہ کی غلامی میں دے دینا ہے۔ اشتراکیت یا سرمایہ داری

دونوں میں سے کسی ایک کو قبول کرنا گویا روس یا امریکہ کی غلامی کا قلادہ اپنے گلے میں ڈالنا ہے۔ کیونکہ یہی دونوں اپنے اپنے نظریات کے امام و قبلہ گاہ ہیں۔ اور جو بھی ان کو قبول کریگا اسے بہرحال اپنے ہی قبلہ کی طرف ہی مڑنا ہوگا۔ اشتراکیت قبول کرکے روس سے محبت نہ کرنا یا سرمایہ داری کی تہذیب کا پیشمہ لیکر امریکہ سے غیر متعلق رہنا ایسے ہی ہے جیسے مسلمان ہو کر مسجد الحرام سے روگرداں ہونا۔

حقیقت یہ ہے کہ ان نظریات کے پاس اپنی کوئی عقلی دلیل یا وجہ جواز نہیں ان نظریات کا سارا بل کس اور دبدبہ صرف ان کے ماننے والوں کا بل کس اور دبدبہ ہے۔ انہوں نے سائنس کی ساری قوت ان نظریات کے فروغ پر صرف کر دی ہے۔ اور یہ صرف ایسی سائنسی قوت کی بناء پر اتنے پُر رعب اور ناگزیر نظر آرہے ہیں۔ ہم میں سے جو لوگ ان نظریات کو تسلیم کرتے اور ان کا غلبہ چاہتے ہیں وہ دراصل ان دلائل اور اس طرز فکر سے مسحور ہو چکے ہیں جس سے یہ نظریات پُر رعب اور ناگزیر نظر آرہے ہیں

یورپ کے یہ نظریات اب تک کوئی کلمۂ جامعہ اپنے پیروؤں کو نہیں دے سکے۔ یورپ کی ثقافتی تاریخ سے عیاں ہے کہ نشاۃ ثانیہ کے بعد وہ یورپ پارہ پارہ ہو گیا جو عیسائیت کے عہد تسلط میں یکمشت تھا۔ قریب قریب وہی نقشہ اب صوبائی اور لسانی عصبیت کی شکل میں خود ہمارے ملک میں رونما ہو رہا ہے۔ غور کرنے کی یہ بات ہے کہ ایسے فتنے کونسا طبقہ اٹھا رہا ہے؟ کیا یہ وہ لوگ ہیں جو علوم یورپ کے متعلم ہیں یا وہ جن نے دین کی تعلیم پائی تھی اور اسی کا اخلاق سیکھا تھا؟

جن لوگوں نے یورپ کے علوم پڑھے ہیں اور اسی کے طرز فکر پر سوچتے ہیں وہ ان راستوں پر چلے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جن راستوں سے یورپ کی ساری تاریخ گزر چکی ہے۔ یورپ میں قومیت اور وطنیت اور لسانیت کی تحریکیں چل چکی ہیں اور چل رہی ہیں۔ اور وہ اپنے لیے معقول دلائل نہیں رکھتیں بلکہ انہوں نے اپنے مطالبات کو ایسی سائنٹیفک صورتیں دی ہیں کہ آدمی دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے۔ مگر جب یہ تحریکیں چل چکتی ہیں، خون بہہ چکتا ہے اور لاکھوں آدمی بے خانماں ہو چکتے ہیں تو اچانک ایک "مفکر" پیدا ہوتا ہے اور سارے حالات کے جائزے کے بعد فیصلہ کرتا ہے کہ اس فساد کا علاج عالمگیر جذبۂ اخوت ہے۔ اخلاق کی طرح پھر رجوع کرنا اور مذہب سے رشتۂ قدیم از سر نو جوڑنا ہے اگر ہم نے بھی یہی سبق ایسے ہی تلخ تجربوں کے بعد سیکھنا ہے تو کیوں نہ ابھی سے سیکھ لیں۔ کیوں نہ ابھی اس مسئلہ کے مالہ وماعلیہ پر غور کر لیں۔

اپنے ملک اور اس کے باشندوں کے حالات کو یورپ اور اس کے باشندوں کے حالات تصور کرکے مسائل حل نہیں کئے جا سکتے۔ اپنے حالات پر غور کرنے کے لیئے ہمیں اپنی نگاہ اور اپنی بصیرت چاہیئے۔ ہم کو ان وادیوں میں نہیں گھومنا چاہیئے کہ جن میں اہل مغرب گھوم کر ٹھوکریں کھا چکے ہیں۔ ہم ایک ملّت ہیں، ہمارا ایک مقصد وجود ہے۔ اور ہم صرف اسی کی جوت سے روشن رہ سکتے ہیں۔ اگر ہم نے اسلام کو چھوڑ کر اسی راہ کو اختیار کیا کہ جس کو یورپ اختیار کئے ہوئے ہے تو کبھی دنیا کے امام نہیں بن سکتے۔ کم از کم بیس پچاس برس تک ہم دوسرے درجہ کے ملکوں کی صفوں سے بھی نہیں نکل سکتے۔ کیونکہ ہماری مملکت نوزائیدہ ہے، ہمارے پاس تو اپنا اسلحہ تیار کرنے کا بھی ایک کارخانہ نہیں۔ پھر ہم اس تہذیب میں بہرحال کامل نہ ہوں گے جس کو ہم ایک متبع اور نقّال کی حیثیت سے اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اگر ہم نے اپنے دین کی اتباع کر لی اور اس کو اپنا لیا تو نہ صرف یہ کہ ہم ایک ایسا سلاح حاصل کر لیں گے کہ جو ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم سے بھی سریع الاثر ہوگا ہم ایک چراغ ہدایت بن کر دنیا کے امام بن جائیں گے۔ دنیا ایک ایسی انجمن کی تڑپ رکھتی ہے جو ان کے مصائب میں ہاتھ بٹائے ان کی رہبری کرے اور ان کے تنازعات فیصل کرے، جب ہم "امۃً وسطا" بن گئے تو وہ دنیا ہماری طرف پلٹے گی، وہ ہر مسئلہ میں ہم سے روشنی چاہیگی اور ہر مصیبت میں ہماری مدد طلب کرے گی۔

یہ حیثیت ہمارے لئے باعث خیر و فخر ہوگی یا وہ؟

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی

مولانا مودودی کو سزائے موت دی گئی پھر اس کو چودہ برس قید با مشقت میں تبدیل کر دیا گیا۔

ہم جذبات میں ڈوبے بغیر پورے ملک سے پوچھتے ہیں کہ آپ کے ملک میں اس شخص کو اتنی سنگین سزائیں دی گئی ہے جس کی نجی اور جماعتی زندگی کا کوئی پہلو پبلک سے خفیہ نہیں ہے؟ اس سے آخر کیا جرم سرزد ہو گیا تھا جس کی بنا پر وہ قابل گردن زدنی ٹھہرا؟ ہم یہ سوال اس لئے کرتے ہیں کہ اس ملک کی جمہوریت اور اسلام نوازی کے ترانے صبح و شام گائے جاتے ہیں۔ اسلام بھی کسی احتساب سے نہیں کتراتا اور جمہوریت تو نام ہی پبلک کے حق احتساب کا ہے۔ اگر حکومت قوم کے کسی فرد کو پکڑ سکتی ہے تو جمہوریت اور اسلام کے مطابق قوم بھی حکومت کا دامن پکڑے رکھنے اور اس وقت تک نہ چھوڑنے کا حق رکھتی ہے جب تک کہ اس کو اطمینان حاصل نہ ہو جائے۔

۲۸ مارچ کو مولانا مودودی اور ان کے رفقا کو لاہور میں مارشل لاء کے تحت گرفتار کیا گیا۔ روپیہ اور ریکارڈ پولیس لے گئی اور پھر مولانا مودودی اور دوسرے کارکنوں کو لاہور کے بدنام قلعہ میں رکھ کر INTERROGATION کیا گیا۔ ادھر نام نہاد قومی نیوز ایجنسی P.P.A نے ایک خبر گمری اور کراچی کے دفتر سے شائع کہ مولانا مودودی پر فوج میں بغاوت پھیلانے کے الزام میں مقدمہ چلایا جانے والا ہے۔ مگر جب مقدمہ قائم ہوا تو الزام صرف دو تھے۔ قادیانی مسئلہ کی تصنیف اور اشاعت اور یکم مارچ اور ۵ مارچ کے بیانات دفعہ ۱۲۴ الف اور ۱۵۳ پاکستان پینل کوڈ بشمولیت مارشل لاء ریگولیشن نمبر ۸

جس زاویہ نگاہ سے حکومت حالات کو دیکھ رہی ہے اس سے مولانا مجرم ہی دکھائی دیتے ہیں۔ حکومت یہ سمجھتی ہے کہ قادیانیوں کی فرقہ وارانہ حیثیت چند مخصوص عقائد کی بنا پر ہے جو اسلام کے بنیادی تقاضوں سے قطعاً متصادم نہیں ہیں۔ اس لحاظ سے واقعی ہر وہ شخص مجرم ہے جو قوم کو ایک ایسے فرقے کے خلاف ابھارتا یا نفرت پھیلاتا ہے جس کی گنجائش اسلام کی حدود میں ہے۔ یہ فعل غیر اسلامی اور غیر جمہوری نہیں بلکہ تہذیب و شائستگی اور پاکستان کے نام پر بٹہ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ حکومت اس پوزیشن میں ہے کہ وہ اس قسم کا دو ٹوک فیصلہ سواد اعظم کی رائے لئے بغیر کر دے؟ اس وقت قوم کی اکثریت مطالبہ کر رہی ہے کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے جبکہ حکومت وقت اصرار کر رہی ہے کہ نہیں وہ مسلمان ہیں اور انہیں غیر مسلم کہنا جرم ہے۔ حکومت کا یہ خود ساختہ منصب افتاء محل نظر ہے۔ حکومت اپنی اس پوزیشن میں زیادہ سے زیادہ لاقانونیت اور فساد کی روک تھام کر سکتی ہے لیکن اسے یہ حق کہاں سے حاصل ہو گیا کہ وہ فتویٰ بھی جاری کرے۔ جب کہ ملک کا دستور بھی نہیں بنا۔ اور خود حکومت اپنی منزل کے متعلق متذبذب ہے۔ اگر قوم میں ایک تحریک غلط موقع پر چل کھڑی ہوئی تھی تو حکومت کو چاہئے تھا کہ قوم کے سامنے اپنی پوزیشن واضح کر کے یہ مسئلہ دستور ساز کے سامنے پیش کر دیتی۔ اس کے لئے یہ کسی صورت میں بھی مناسب اور درست نہ تھا کہ اس کے چند ارکان اپنے ذاتی عقائد کی صفائی پیش کر کے ایک ایسی پالیسی اختیار کر لیتے کہ جس سے ان کا مافی الضمیر بالکل بے نقاب ہو جاتا۔

اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ عوام ارباب حکومت پر دین کے معاملات میں دو گونہ وجوہ سے اعتماد نہیں کرتے۔ ایک تو یہ کہ اسلام کی جیسی کچھ صورت انہوں نے بنیادی حقوق کی رپورٹ اور اپنی ذاتی اور سرکاری سرگرمیوں میں دکھائی ہے اس سے ظاہر ہو گیا ہے کہ وہ اسلام کو بالقصد نہیں چاہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ علوم دین میں درک نہیں رکھتے۔ ان کو معلوم نہیں کہ اسلام کی حدود کیا ہیں اور اس کے تقاضے کیا ہیں؟ وہ مغربی تعلیم پائے ہوئے ہیں، ان کے متعلق یہ کیسے گمان کیا جا سکتا ہے۔ کہ وہ کتاب و سنت کے باریک نکتے تو کیا موٹے مسائل بھی بتا سکیں گے۔ ان کی سوانح عمریاں بتا رہی ہیں کہ وہ کسی دوسری منزل کے مسافر رہے ہیں۔ اب جب وہ دین کے معاملات میں کوئی فیصلہ کرتے ہیں

توعوام کو قائل کرنے کی بجائے ان کی حسّ تنقید کو بگاڑ دیتے ہیں۔ جب وہ اصرار کرتے ہیں تو عوام چڑ جاتے ہیں۔ اور عوام اور حکومت کے
خیالات کا یہی تضاد ہے جو ملک کے اندر ایک خطرناک رجحان لا قانونیت کو پرورش دے رہا ہے۔ ہم کہنا نہیں چاہتے تھے مگر کہے
بغیر چارہ نہیں۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے گویا عوام نے ان سے حق نمائندگی واپس لے لیا۔ وہ صرف قانونی نمائندے ہیں۔ دلی نمائندے نہیں۔
۔ الزام یہ ہے کہ مولانا مودودی نے "قادیانی مسئلہ" سے عوام کے جذبات کو مشتعل کیا۔ کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ ڈائرکٹ ایکشن
کے لیڈروں سے تو ایسی کوئی حرکت سرزد نہیں ہوئی تھی؟ پورے ایک مہینے کا نوٹس دینے کے بعد ڈائرکٹ ایکشن کمیٹی جلسے بھی
کرتی رہی، جلوس بھی نکالتی رہی اور ملک بھر میں ہڑتالیں بھی کراتی رہی۔ اس ایک مہینے کی سرکردہ علماء کی سرگرمیاں جذبات
کو اتنا اشتعال نہ دے سکیں۔ جتنا کہ اس چند صفحوں کے چھوٹے سے پمفلٹ نے دیا کیا یہی وجہ ہے کہ ڈائرکٹ ایکشن کے لیڈروں
کو تو صرف ایک ایک سال کی سزائے قید ہوئی اور مولانا مودودی کو سزائے موت' پھر رحم کھا کر (یا عوام کے دباؤ سے مجبور ہو کر) چودہ
برس کی قید با مشقت حکومت کے ان فیصلوں سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ مولانا مودودی ڈائرکٹ ایکشن کی تحریک کے مخالف تھے
انہوں نے اپنے اہل جماعت کو بھی اس سے الگ رہنے کی ہدایت کی اور خود خواجہ ناظم الدین نے بھی پارلیمنٹ میں
اس امر کا اعتراف کیا کہ چند علما اس تحریک سے الگ ہیں۔ اور اس سے اشارہ مودودی صاحب ہی طرف تھا۔ تاہم وہ زیادہ خطرناک
تھے اور ان کے کام ملک و قوم کے لئے کہیں زیادہ مہلک تھے۔ ان فیصلوں کے بعد جب ہم مولانا مودودی اور دوسرے علمائے
راست اقدام کی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم کسی طور بھی قائل نہیں ہوتے کہ دونوں گروہوں کی سرگرمیاں کسی نوع مختلف
تھیں۔ دونوں کے مقاصد ایک تھے صرف طریق کار کا فرق تھا۔ اور اگر صرف مقاصد کے لحاظ سے سزا ہے تو دونوں کو یکساں
سزا ہونی چاہیئے اور اگر طریق کار پر حکومت گرفت کر رہی تو پھر مولانا مودودی بالکل بری ہیں۔ اور ان کی بریت کا ہر ہر ثبوت ملک
کی تاریخ میں محفوظ ہو چکا ہے۔ ہر لحاظ سے موازنہ و مقابلہ کرنے کے باوجود ہم نہیں سمجھ سکے کہ یہ فیصلہ درحقیقت کس بناء پر
کیا گیا ہے؟ مولانا مودودی نے وہ کونسی خطرناک بات کی تھی جس کی بناء پر انہیں سزائے موت دی گئی؟ حکومت کیوں نہیں اس کو
فاش کرتی تاکہ پوری قوم اس شخص سے باز پرس کرے اور آئندہ نسلیں بھی ایسے شخص کی تحریروں کے اثرات سے محفوظ رہیں۔ اگر ان سے
کوئی ایسا جرم سرزد ہوا ہے جو واقعی قابل گردن زدنی وکشتنی ہے تو ایسے شخص کا وجود پاکستان کے لئے ننگ ہے اور اس کا ختم ہو جانا ہی
بہتر ہے۔ مزید برآں یہ امر بھی ہمارے لئے باعث شرم و ندامت ہے کہ ہماری سیاسی زندگی پر ایسے ایسے خطرناک لوگ چھائے ہوئے ہیں
کہ جن کا مرنا زندہ رہنے سے بہتر ہے۔ اور اگر حکومت بنائے فیصلہ بتانے کی بجائے سزا میں تخفیف ہی کرتی جائے گی تو ہم یہ سمجھنے پر مجبور
ہو جائیں گے حکومت کا فیصلہ قانونی نہیں سیاسی تھا۔ حکومت انصاف نہیں کرتی اپنے سیاسی حریفوں پر ہاتھ صاف کرنا چاہتی ہے وہ سزا
نہیں دیتی اپنے مدّمقابل پر رعب جمانا چاہتی ہے۔ وہ گرفت کرتی ہے تو صرف ان کا زور آزمانے کے لئے اور ہم نہیں چاہتے کہ ہم پر یہ
حقیقت واضح ہو، ہم ایسی تلخ واقعیت کو باور نہیں کرنا چاہتے۔ اس لئے کہ ہم اپنے ملک کی نیک نامی چاہتے ہیں یہ ملک مقدس ملک
ہے اس لئے کہ یہ خاتم النبییّن کے دین کا ملک ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اشتعال اس کتاب سے نہیں پیدا ہوا بلکہ حکومت کی اپنی غلط پالیسی سے پیدا ہوا ہے۔ اس کتاب سے
جتنا کچھ فساد رکا ہے۔ وہ ایک ماہر نفسیات ہی جان اور بیان کر سکتا ہے۔ اس کتاب نے بات کو جذبات سے نکال کر عقل کے
درجے تک پہنچا دیا اور یہ ایک ایسا کام ہے جس کی حکومت جتنی بھی شکرگزار ہو اتنا کم ہے۔ جن نے اجتماعی نفسیات کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے
ہیں کہ عوام کبھی عقل و دلیل سے مشتعل نہیں ہوتے اشتعال پیدا کرنے کے لئے کسی اندھے اور مبہم جذبے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر یہ کتاب

نہ تھکتی جاتی تو لوگوں کے جذبات اسی دھارے پر بہہ جاتے کہ جس پر متحدہ ہندوستان میں جمہوری حکومت میں بہے تھے اس کتاب نے
اچانک معاملے کو صاف کر دیا اور مواد فکر مہیا کر کے ایک طرف حکومت کو متنبہ کیا دوسری طرف عوام کو غور کا موقع دیا۔ اس نے حقیقت
نکھار کر سامنے رکھ دی۔ مولانا نے صرف مسلمانوں ہی کی نہیں بلکہ قادیانیوں کی بھی صحیح صحیح پوزیشن واضح کر دی اور جو کچھ قادیانیوں کے
دلوں میں تھا اور جس کو وہ خود اتنی وضاحت اور کمال کے ساتھ بیان نہ کر سکتے تھے وہ مولانا نے کر دیا۔ جب دونوں گروہوں کی پوزیشن اور
دونوں کے خیالات واضح ہو گئے تو وہ خطرناک ابہام دور ہو گیا جس سے جذبات میں جھنجھلاہٹ کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اور جو بالآخر ملک
میں خونی انقلاب پر منتج ہوتی ہے۔ کتاب بغیر کسی خوف کے سائنٹفک ٹیسٹ کے لئے پیش کی جا سکتی ہے۔ اور اس کے اثرات کو اس
کے قارئین سے نوٹ کر کے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اشتعال اس سے پیدا ہوا تھا یا کسی اور وجہ سے؟

اس وجہ کو معلوم کرنے کے لئے ہمیں ۲۲ جنوری سے نفاذ مارشل لاء تک کے واقعات کا بنظر غائر جائزہ لینا ہوگا۔ ۲۲ جنوری کو وزیر
پاکستان سے بالمشافہ گفتگو سے مایوس ہو کر راست اقدام مجلس نے حکومت کو ایک ماہ کا نوٹس دے دیا کہ وہ اس مطالبہ کو اس مدت کے
اندر تسلیم کر لے ورنہ وہ راست اقدام کریں گے۔ ایک ماہ کے اس عرصہ میں ہر قسم کے جلسے، جلوس اور ہڑتالوں سے اس امر کا مظاہرہ
کیا گیا کہ یہ مطالبہ محض علماء کی ایک مجلس کا مطالبہ یا کسی پارٹی کا مطالبہ نہیں بلکہ عوام کا مطالبہ ہے۔ اور اس عرصہ میں جب خواجہ ناظم الدین
لاہور آئے تو ان کو کالی جھنڈیاں دکھائی گئیں اور شہر بھر میں مکمل ہڑتال کی گئی، صرف اسی علامت سے حکومت قوم کے مطالبے کی نوعیت
کا اندازہ کر سکتی تھی۔ لیکن حکومت نے نہ تو مضمون مطالبہ پر غور کیا نہ نوعیت مطالبہ پر۔ بلکہ اس احتجاج کے متعلق کچھ ایسی خاموشی
اختیار کی گویا حکومت ایسے مطالبوں کی قطعی پرواہ کرتی ہے نہ ان کا نوٹس لیتی ہے۔ جب آخری تاریخ پہنچی تو لوگ بڑی بے چینی سے حکومت
کے جواب کا انتظار کرنے لگے۔ لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ ڈائرکٹ ایکشن کے لیڈر مزید اقدام کے لئے کراچی میں جمع ہوئے تو انہیں
اچانک گرفتار کر لیا گیا۔ یہی حکومت کا جواب تھا۔ اس پر مظاہرے شروع ہوئے، حکومت نے بجائے قوم کے سامنے اپنی پالیسی واضح
کرنے کے الٹا تشدد اور جبر سے اس تحریک کو دبانا شروع کر دیا۔ کراچی میں یہ تحریک اتنی نہ چلی غالباً عوام کی توانائی طلباء کے ہنگامے
میں صرف ہو چکی تھی۔ لاہور میں اس کی سرگرمیاں دو وجوہ سے بڑھتی چلی گئیں۔ ایک تو یہ کہ اہل پنجاب اس نبوت جدیدہ سے سب سے
زیادہ زخم کھا چکے تھے اور وہ اس کی حقیقت حال سے اس وقت سے واقف تھے۔ جب اس نے پر پرزے نکالنے شروع کئے تھے دوسرے
یہ کہ یہاں کی زمین تحریک کے لئے زیادہ تیار ہو چکی تھی۔ پہلے یہاں ہڑتالیں ہوئیں، پھر جتھوں کی صورت میں گرفتاریاں شروع ہو گئیں اس
کھچاوٹ پر دس دن سے اوپر گزر چکے تھے۔ لوگ ہر آن حکومت کے جواب کے انتظار میں تھے۔ اور کسی اعلان کے بہانے اس اضطراب
اور بے چینی کی حالت سے نکلنا چاہتے تھے۔ لیکن تشدد اور دباؤ اس کی بجائے بڑھتا ہی گیا۔ پولیس نے لاٹھی چارج کیا، گولیاں چلائیں
اور گرفتاریاں دینے والوں کی ہر ممکن بے عزتی کی۔ اس سے عوام کو اک صدمہ سا ہوا۔ وہ اپنی حکومت اور اپنی پولیس سے ایسا سلوک کبھی
توقع نہ کرتے تھے، وہ پہلے حکومت سے مایوس ہو چکے تھے۔ پھر اس کے گماشتوں سے۔ اسی مایوسی سے ان کے اندر وہ کیفیت پیدا ہو گئی جو
کسی نادان بچے کے اندر اپنی ماں کی توجہ کھینچنے کے لئے ہوتی ہے۔ لیکن حکومت نے اس کے باوجود کوئی توجہ نہ کی۔ اور جب کی تو وہ ایسی توجہ تھی
کہ اس سے توجہ نہ کرنا ہی بہتر تھا۔ اعلان میں وزیر اعظم پنجاب اور گورنر پنجاب نے نفس مطالبہ کے متعلق ایک لفظ بھی نہ کہا۔ صرف اپنے
عقائد کی صفائی پیش کر کے اس گروہ علماء کی مذمت شروع کر دی جس نے اس تحریک کو اٹھایا۔ ہم کو یہ معلوم نہیں کہ حکومت کو اس کے محکمہ خفیہ سے
کیا اطلاع ملی لیکن جو کچھ ہم جانتے اور دیکھتے رہے ہیں وہ انتہائی یاس اور ملال کی کیفیت تھی۔ اس مطالبہ سے صرف نظر کر کے حکومت گویا اس مطا
کو سرے سے غلط سمجھ رہی تھی اور یہ غلط فہمی بس مطالبہ کی حد تک نہیں رہتی تھی بلکہ اس بنیادی عقیدے تک جا پہنچتی تھی جس کی بنا پر یہ مطالبہ کھڑا کیا گیا تھا اور اعلان کرنے والوں نے بس اس بات کی صفائی

یہ کبھی کا مطالبہ عوام نے ہرگز نہیں کیا تھا وہ کب وزیر اعظم پنجاب اور گورنر پنجاب کے عقائد پر شبہ رکھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ خواجہ ناظم الدین بھی صحیح العقیدہ مسلمان ہیں لیکن وہ تو قادیانیوں کے عقائد کی صفائی طلب کر رہے تھے۔ مگر اس کے متعلق ایک لفظ نہیں کہا گیا۔ مرکزی حکومت نے بیان دیا تو اس میں بھی یہی سوال گندم جواب چنا باتیں تھیں۔ عوام اس رویّہ سے بالکل مایوس ہو گئے اور نفاذ مارشل لا سے رہی سہی کسر پوری ہو گئی کیونکہ مارشل لا کا مفہوم یہ ہے کہ سول کے افسر سرکش عوام کو قابو میں نہیں رکھ سکتے۔ اس سے کہیں بڑی اور شدید قوت ان کی سرکوبی کے لئے چاہئے۔

اگر حکومت ذرا بھی تدبّر سے کام لیتی تو سوچتی کہ وہ کیا بات ہے جس نے سب عوام کو یک زبان و یک قلب بنا دیا ہے۔ پھر وہ خود نفس مطالبہ پر غور کرتی۔ وہ انگریز تو تھے نہیں کہ معاملہ ان کی دلچسپی و مفاد کا نہ تھا۔ وہ عوام کے تھے اور عوام ان کے تھے۔ اگر انہیں اس مسئلہ کی شرعی حیثیت میں کچھ شک تھا تو وہ نمائندہ علماء کی ایک مجلس طلب کر کے اس کی تنقیح کر سکتی تھی۔ وہ اس کی بھی تحقیق کر لیتی کہ اس مطالبہ کو منوانے میں صرف ایک ہی جماعت زور لگا رہی ہے یا ہر مسلمان جماعت اور ہر مسلمان فرد اس پر اصرار کر رہا ہے۔

مگر حیرت اس پر ہے کہ اتنے بڑے ہنگامے کے بعد بھی حکومت نے اس بارے میں اپنی پالیسی کی وضاحت کی نہ اس مطالبہ کی تحقیق کیلئے کوئی کمیشن مقرر کیا۔ اور اصرار ہے تو اس پر کہ عوام غلط سوچ رہے ہیں۔ بیسویں صدی کی جمہوریت کی تاریخ میں یہ انوکھا واقعہ ہے کہ عوام کی اپنی نمائندہ حکومت اس مطالبے سے ایسا سلوک کرے کہ کبھی کسی غیر ملکی حکومت نے باشندگان ملک کی جدوجہد آزادی پر نہ کیا ہو کیا اسی رویئے بعد بھی حکومت یہ چاہتی ہے کہ عوام اس کی اطاعت کریں اور اسی کو اپنا رہبر تسلیم کریں۔ ہم ارباب حکومت سے پوچھتے ہیں کہ کیا وہ یہ سب کچھ پورے اخلاص سے کر رہے ہیں؟ کیا انہوں نے مطالبے کو سن و عن سمجھ کر یہ روش خسروانہ اختیار کی ہے؟ ——————

اور اس کے باوجود اشتعال انگیزی کا سبب" قادیانی مسئلہ" سمجھا جا رہا ہے! قابل گردن زدنی و کشتنی مولانا مودودی قرار دیئے جا رہے ہیں!

ارباب حکومت کی تقریروں سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ اس فکر میں گھلے جا رہے ہیں کہ جاہل ملا عوام میں عدم رواداری کی روح پھونک کر انہیں غیر مہذّب بنائے جا رہے ہیں۔ اور ایسی صورت میں پاکستان متمدن ممالک کی مجلس میں آنکھ اٹھانے کے قابل نہ رہے گا۔ یہاں ملک میں جتنی کچھ سختی اور تشدد کیا جا رہا ہے وہ بس حفاظتی تدابیر ہیں۔ عدم رواداری کے خلاف' اور رواداری کے قیام کے لئے جذبہ بجائے خود بڑا مستحسن اور نیک ہے۔ اگر حکومت فی الواقع یہی نیت رکھتی ہے تو ہم سب اس کار خیر میں تعاون کے لئے بدل و جان تیار ہیں۔ لیکن اس اشتراک و تعاون سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ حکومت ہماری وہ غلط فہمیاں بھی دور کر دے جن کی وجہ سے اس کی نیک نیتی مشکوک رہی ہے۔ ہم ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکے کہ عبدالغفار خان اور اس کے بھائی کو آزادی سے کیوں محروم رکھا گیا ہے جبکہ ہر کانگریسی یہاں آزاد ہے اور انہوں نے پاکستان سے وفاداری کا اعلان بھی کر رکھا ہے؟ سرحد کے حزب مخالف کے ارکان کو کیوں صوبہ بدر کیا گیا ہے؟ مشرقی بنگال میں اختلاف رائے رکھنے والے مسلم لیگیوں کو کیوں جبر سے دبا دیا جاتا ہے؟ اور حال ہی سابق وزیر پنجاب محمد حسین چٹھہ کو کیوں ۱۸۱۸ء کے فرسودہ ریگولیشن کے ماتحت زیر حراست کیا گیا ہے؟

اگر رواداری کا مطلب صرف محدود قسم کی مذہبی رواداری ہی ہے اور سیاسی رواداری یا آزادی فکر و عمل نہیں تو ہم متعجب ہوئے بغیر نہیں رہتے کہ خود قادیانی یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ہم مسلمانوں سے الگ اور جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں اور حکومت اس مطالبہ کو تسلیم نہیں کرتی۔ یہ بھی تو رواداری کے منافی ہے۔ کہ ان کے اپنے دعویٰ کو قبول نہ کیا جائے۔ اسی بات کا تقاضا جب مسلمان کرتے ہیں تو یہ عدم رواداری کے حکم میں آجاتا ہے۔ وہ خود چاہے ایسا کرتے رہیں اور اپنے نبی کے نہ ماننے والوں کو بدترین گالیاں دیتے رہیں وہ عدم رواداری نہیں۔

بلکہ رواداری اور مروّت ہے۔ اور عین اسلام کی اسپرٹ کے مطابق ہے۔

اگر حکومت کے نوٹس میں "قادیانی مسئلہ" نہ آچکا ہوتا تو ہم خود وہی باتیں کہنے پر مجبور ہو جاتے جس کو مولانا نے کمال عمدگی کے ساتھ بیان فرمایا ہے انسانی فطرت میں یہ چیز داخل ہے کہ وہ غلطی کو برداشت نہیں کر سکتی۔ قادیانیوں کی پھیلائی ہوئی گمراہیوں جھوٹ اور غلط فہمیوں کے ازالے کی کوشش کوئی غلط نہیں بلکہ عین فطری ہے۔ اگر وہ محض ایک فرقہ بننے پر قناعت کر لیتے تو یہ بھی ایک غنیمت تھا۔ وہ تو ایک بالکل الگ حیثیت رکھتے ہیں۔ اور اس کا علم ہم کو خود انہی کی زبانی ہوا ہے' مگر وہ اپنے فروغ کے لئے ایسی پرفریب چالیں اختیار کئے ہوئے ہیں کہ کسی کو ان کی جداگانہ حیثیت کا سان و گمان نہیں ہوتا۔ وہ بظاہر ہمارے اہل خانہ کیا سے ہیں لیکن خود انہی سے معلوم ہوا ہے کہ ان کا مرکز عقیدت اپنا گھر نہیں غیر کا گھر ہے۔ خود انہی نے انکشاف کیا ہے۔ کہ وہ ہمارے خاندان اور ہماری نسل سے نہیں بلکہ غیر نسل اور غیر خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی حیثیت اس ملازم کی سی ہے جو تنخواہ تو ایک گھر سے لے لیکن خدمت دوسرے گھر کی انجام دے۔ اگر ایسی حیثیت ہم اپنی انفرادی زندگی میں برداشت نہیں کر سکتے تو اجتماعی زندگی میں ایسا کرنا کب روا ہے۔ رواداری جمہوری پارلیمنٹ سے مشابہ ہے۔ جس میں حکومت اور حزب مخالف اپنے اختلاف رائے کے باوجود ریاست کی اساس اور دستور پر ایمان کامل رکھتے ہیں۔ اس سے رواداری سے نہیں برتی جا سکتی ہے۔ جو آپکی ریاست کی اساس ہی پر ایمان نہ رکھتا ہو؟

افسوس اس کا ہے کہ جو طعنہ اس مسئلہ کے بارے میں ایک دہریئے کی زبان سنا تھا وہ آج خود اپنی حکومت سے سن رہے ہیں جب پنڈت نہرو نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ مسلمان قادیانیوں کو اپنے اندر کیوں برداشت نہیں کرتے تو علامہ اقبال ؒ نے اس کے جواب میں جو فرمایا تھا وہ آج بھی حرف بحرف صحیح ہے۔

"جس طرح اسٹرلم کے یہودی سپینوزا کو انتشار پسند عنصر قرار دیتے ہوئے اپنے گروہ سے خارج کرنے میں حق بجانب تھے اسی طرح ہندوستانی مسلمان بھی قادیانیوں کو خارج از اسلام سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ وہ ساری دنیائے اسلام کو کافر کہتے اور ان سے ہر قسم کا سوشل بائیکاٹ کئے ہوئے ہیں۔ یہ صورت حال ہندوستان میں اسلام کی مجموعی زندگی کے لئے زیادہ خطرناک اور مہلک ہے بہ نسبت یہودیوں کے حق میں سپینوزا کا فلسفہ' ہندوستانی مسلمان اس صورت حال کو وجدانی طور پر بھانپ گیا ہے اور وہ انتشار پیدا کرنے والی قوتوں کو دوسرے ممالک کے مسلمانوں سے زیادہ تیزی سے محسوس کر لیتا ہے۔ ایک اوسط مسلمان کی یہ حس وجدان میرے خیال بالکل صحیح اور درست ہے۔ اور میں بلا خوف تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس حس وجدان کی جڑیں ہندوستانی اسلام کے ضمیر میں دور تک پہنچی ہوئی ہیں۔ جو لوگ اس مسئلہ میں رواداری کی تلقین کرتے ہیں وہ اس لفظ کے استعمال میں انتہائی عیر محتاط ہیں لیکن میں تو کہونگا کہ وہ اسکے مفہوم سے قطعی ناآشنا ہیں۔ رواداری آدمی کے دل کی مختلف کیفیتوں سے پیدا ہوتی ہے۔ بقول گبن۔ ایک وہ رواداری ہے جو فلسفی اختیار کرتا ہے جس کے نزدیک سب مذاہب یکساں سچے اور اچھے ہیں۔ ایک رواداری تاریخ دان کی ہے جو سب کو یکساں باطل قرار دیتا ہے اور ایک رواداری سیاست دان کی ہے جس کے لئے سب یکساں مفید ہیں۔ ایک رواداری اس شخص کی ہے جو ہر مسلک فکر و عمل گوارا کر لیتا ہے اس لئے کہ وہ خود ہر قسم کے مسلک فکر و عمل سے بیزار ہو چکا ہے' پھر ایک رواداری اُس کمزور شخص کی بھی ہے جو ہر قسم کی ذلت اور بے عزتی اس لئے برداشت کر لیتا ہے کہ اس کے سوا اس کے لئے اور کوئی چارہ نہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کی کوئی بھی رواداری قابل قدر ہے نہ اس کی کوئی اخلاقی وقعت ہے۔ اس کے برعکس اس سے اس شخص کا روحانی افلاس نمایاں ہو جاتا ہے یہی

رواداری ذہنی اور قلبی وسعت سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ وہ رواداری ہے جو روحانی لحاظ سے مضبوط شخص کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ وہ ایک طرف اپنے ایمان کی سرحدوں کی نگرانی کرتا ہے اور دوسری طرف اپنے سے علاوہ ہر قسم کے عقیدے کو برداشت کرتا ہے اور اس قسم کی رواداری ایک سچا مسلمان ہی کر سکتا ہے۔ اس کا اپنا ایمان وسیع اور مرکب ہے اس لئے وہ دوسروں کے عقائد و ایمان کی قدر کرتا ہے ہمارے ایک عظیم شاعر امیر خسرو نے ایک شعر میں اس قسم کی رواداری کی صحیح صحیح تصویر کھینچ دی ہے۔ ایک بت پرست کی بت سے والہانہ عقیدت بیان کرنے کے بعد امیر خسرو اپنے مسلمان قاری سے کہتے ہیں۔

اے کہ زبت طعنہ بہ ہندو بری
ہم ز وے آموز پرستش گری

خدا کا ایک سچا مومن ہی اس عقیدت کی قدر کر سکتا ہے اگرچہ وہ ان بتوں ہی کے لئے کیوں نہ ہو جن کے توڑنے پر وہ مامور ہے۔ بالعموم مخالفین کی یہ نادانی ہے کہ وہ آدمی کے ایمان کی سرحدوں کے جذبۂ حفاظت کو عدم رواداری کہتے ہیں وہ غلطی سے اس جذبے کو دنائت سے تشبیہ دیتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ ایک آدمی کا اپنے ایمان کی سرحد کو بچانا ایک حیاتیاتی فعل ہے۔ جب ایک گروہ کے ارکان وجدانی یا عقلی طور پر محسوس کریں کہ ان کے معاشرتی نظام کی اجتماعی زندگی کہ جس کے وہ اجزاء ہیں خطرے میں ہے تو ان کی حفاظتی تدابیر حیاتیاتی معیار پر پرکھی جائیں گی اس سلسلے میں ان کا ہر خیال و عمل اس کی زندگی بخش قدر سے جانچا جائے گا۔ یہاں یہ سوال نہیں پیدا ہوتا کہ ایک شخص کے خلاف کسی فرد یا قوم کا رویّہ نازیبا ہے اور اسے بے دین قرار دینا اخلاقی طور پر جائز ہے یا نہیں یہاں سوال یہ ہے کہ یہ رویّہ زندگی بخش ہے یا زندگی کُش؟

"قادیانی مسئلہ" میں اسی حقیقت کو نکھار کر پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں ہماری اسلامی زندگی کی ان سرحدوں کی نشان دہی کی گئی ہے کہ جن کی حفاظت ہی ہماری زندگی ہے۔ یہ کتاب اشتعال پیدا کرنے کے لئے نہیں بلکہ اپنے اور پرائے کی پہچان پیدا کرنے کے لئے اپنے ملک و ملت کو پارہ پارہ کرنے کے لئے نہیں بلکہ اس کو بنیان مرصوص بنانے کے لئے لکھی گئی۔ اور حکومت اس کی حقیقت سے اس وقت تک آگاہ نہیں ہو سکتی جب کہ وہ تعصب چھوڑ کر اس مسئلہ کی غیر جانبدارانہ تحقیقات نہ کرائے۔

تعجب اس پر ہے کہ جو شخص قوم کی زندگی اور اس کے ایمان کو بچاتا ہے وہ غدار اور ملک دشمن سمجھا جاتا ہے اس کو سزائے موت دیجاتی ہے اور جنہوں نے فی الواقع غداری اور ملک دشمنی کی تھی انہیں تابرخاست عدالت سزا دی جاتی ہے انہیں اگر سزائے قید دی گئی تو اے کلاس کی سہولتوں اور راحتوں کے ساتھ۔ اور اس شخص کو جو جب تک جیتا تو اس کی ایک آنکھ کھلی رہتی تھی جو ملک و ملت کے ہر ہر گام پر اس کی سلامتی کی دعائیں کرتا اور اس کے جادہ کو روشن کرنے کیلئے اپنے خون جگر سے چراغ جلاتا تھا اس لائق بھی نہ سمجھا گیا کہ اس کے ساتھ عام اخلاقی قیدیوں سے الگ سلوک کیا جاتا۔ اپنا چشمۂ فیض جاری رکھنے کے لئے اس کو چند مراعات دی جائیں اور تماشا تھا یہ کہ اس پہ بغاوت کا الزام عائد کیا گیا۔ اگر ہماری حکومت کا دار الخلافہ سات سمندر پار ہوتا تو بھی گمان ہو سکتا تھا کہ اسے اپنے ملک کے متعلق صحیح اطلاعات نہیں پہنچ رہی ہیں۔ جب محکمۂ خفیہ پر اتنا خرچ محض اس لئے برداشت کیا جا رہا ہے کہ ملک ہنوز دشمن کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ نہیں ہے تو حکومت کو اب تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ملک کے دشمن اور باغی کون ہیں اور ملک کے سپاہی اور خیر خواہ کون ہیں یا تو حکومت کے محکمۂ خفیہ کی قابلیت مشکوک ہے یا خود ارباب حکومت کی نیت بخیر نہیں کہ وہ اس شخص پر بغاوت اور انتشار کا جرم لگا رہے ہیں جس نے سب سے پہلے پاکستانی سیاست میں لاقانونیت کے خطرناک

ھا ہمارے علم میں یہ بات آئی ہے کہ اب مولانا کو اے کلاس دے دی گئی ہے۔

رجحانات بجا طور پر حکومت کو متنبہ کیا تھا کہ وہ قانونی دروازوں کو مت بند کرے ورنہ عوام دہشت پسندی اور لاقانونیت پر مجبور ہو جائیں گے پاکستان کے نوخیز رجحانات کو اس غور و فکر سے کسی مدبر نے دیکھا بھالا ہے؟ خود ارباب حکومت ہی اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ جس فکرمندی سے قوم کی حالت کو لمحہ بہ لمحہ یہ شخص دیکھ رہا ہے ویسا کبھی انہوں نے اپنے تصور کے خوابوں میں بھی دیکھا؟ اور اس شخص کے بروقت انتباہ کیا ہمیشہ صحیح ثابت نہیں ہوئے؟ پھر اپنی جماعت کی ہر کارروائی جس کھلے انداز پر کرنے کی طرح اس شخص نے ڈالی ہے وہ تاریخ سیاست میں بے مثال ہے۔ جماعت میں داخل ہونے والے ہر ہر رکن اور اس سے ہمدردی رکھنے والے ہر ہر فرد کا اخلاقی معیار جس بلندی پر اس خدا کے بندے نے لا پہنچایا ہے وہ کم از کم سیاسی دنیا میں عنقا ہے اس کے باوجود اس کی جماعت پر دشمن سے ساز باز رکھنے کا شک کیا گیا' اور اس کے ہر جذبۂ خیر خواہی کو بغاوت پر محمول کیا گیا!

حکومت کی یہ روش ہمیں اس لئے پریشان نہیں کر رہی ہے کہ مولانا مودودی کو تکلیف اور ذلت دے کر ان کے عقیدت مندوں کو اذیت دی جا رہی ہے بلکہ ہمیں پریشانی اس پر ہے کہ حکومت نے جو وطیرہ اختیار کر رکھا ہے اس سے سیاست ملک میں ایک بری مثال قائم ہو رہی ہے۔ عوام اسی وطیرہ کو اختیار کر لیتے ہیں جس کا مظاہرہ خود حکومت نے کیا ہو۔ اگر حکومت عدم رواداری کا ثبوت دیتی اور اپنے سیاسی حریفوں سے نہایت کمینگی اور اوچھے ہتھیاروں سے انتقام لیتی ہے تو اس سے نہ صرف یہ کہ یہ ارباب حکومت اپنی پبلک زندگی خراب کر رہے ہیں بلکہ ملک کی پبلک زندگی کا بھی ستیاناس کر رہے ہیں۔ یہ لوگ تو بہرحال ایک نہ ایک روز چلے جائیں گے' اگر انتخابات کے ذریعہ نہ گئے تو اجل کے ذریعہ چلے جائیں گے لیکن جو تخم خبیث وہ کشت سیاست میں بوتے جا رہے ہیں اس کے انجام بد سے وہ اپنے ہی لئے نہیں بلکہ ملک کے لئے بھی صدیوں کا عذاب الیم تیار کر رہے ہیں۔ کیا عجب اسی مثال کی پیروی کرتے ہوئے آئندہ حکومت بھی ان کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرے جیسا کہ آج وہ اپنے مدمقابل سے کر رہے ہیں۔ دال میں کالا کالا تو اسی وقت نظر آ گیا تھا جب پنجاب کے انتخابات ہوئے تھے لیکن اس استنباط پر سوءِ ظن کا گمان ہو سکتا تھا۔ جب سرحد کے انتخابات ہو گئے' بہاولپور میں نئی وزارت بن گئی' اور کراچی کے انتخابات ہوئے ہیں تو یہ گمان حق الیقین تک پہنچ گیا ہے کہ حکومت وقت کا یہ رویہ اس کی مستقل پالیسی اور مزاج ہے۔ اور ان تازہ ہنگاموں میں اس کے تدبر نے تو اسے عین الیقین کا درجہ دے دیا ہے۔ ہم پوری خیر خواہی سے حکومت کو آگاہ کرتے ہیں کہ جس وطیرہ کو وہ اختیار کئے ہوئے ہے وہ صرف اسی کے لئے نہیں بلکہ ملک کے لئے بھی نہایت مہلک ہے۔ ابھی موقع ہے کہ پچھلی غلط کاریوں کا ازالہ ہو سکے۔

دوسرا خطرناک رجحان عوام کی خواہشات کو دبانا ہے۔ جن کو انسانی نفسیات میں بصیرت حاصل ہے وہ جانتے ہیں کہ خواہشات کبھی دبائی نہیں جا سکتیں۔ ان کو موڑا جا سکتا ہے لیکن توڑا نہیں جا سکتا۔ انہیں جب دبایا جاتا ہے تو وہ اپنے لئے دوسرے چور دروازے تلاش کر لیتی ہیں اور اس وقت تک ختم نہیں ہوتیں جب تک کہ ان کی تسکین نہ ہو جائے۔ جہاں تک ہماری عقل و بصیرت کام کرتی ہے ہم خوفزدہ ہیں کہ قوم کی خواہشات ہنوز تسکین نہیں پا سکیں۔ اور ان کو جتنی سختی اور غیر دانشمندی سے دبایا جا رہا ہے اتنی ہی شدت کے ساتھ ان کے ابھر کر انتقام لینے کا خدشہ ہے۔ مولانا مودودی نے صحیح فرمایا تھا جب انہوں نے حکومت سے کہا تھا کہ یا تو عوام کا مطالبہ مان لیجئے یا انہیں دلیل کے ساتھ مطمئن کر دیجئے' یہ گومگو کی کیفیت اور غیر واضح پوزیشن سخت خطرناک حالت ہے۔ آج عوام قانونی طریقہ سے اپنے مطالبے پیش کرتے ہیں اگر ان کے جذبات کے نکلاؤ کو اس راستے سے بھی بند کر دیا گیا تو وہ غیر قانونی طریقے اختیار کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اور عوام کی خواہشات کو تادیر روکا نہیں جا سکتا۔ جب انگریزوں جیسی عظیم قوت عوام کی خواہش آزادی کو نہ کچل سکی تو یہ حکومت کس طرح اسے کچل سکے گی؟ تاریخ کے صفحات اپنے اندر عبرت کے ہزاروں درس لئے ہوئے ہیں اگر کوئی چشم بینا رکھتا ہو۔ انقلاب فرانس کس طرح آیا تھا اور انقلاب روس کیونکر برپا ہوا تھا؟ ہم نہیں چاہتے کہ ہم انہیں گڑھوں میں گریں جن میں وہ لوگ

گرے تھے جنہیں چراغِ ہدایت الہٰی نہ دیا گیا تھا۔ ہم قرآن کے حامل ہیں۔ کا فرانہ بے تدبری اور غیر دانشمندی ہماری شان کے شایاں نہیں

وہ پبلک سے جس رواداری اور احترام قانون کا تقاضا کرتی ہے اس کا ثبوت پہلے خود بہم پہنچائے' وہ پبلک سے جس اطاعت کا مطالبہ کرتی ہے اس کے لائق امامت کا ثبوت پہلے خود بہم پہنچائے وہ پبلک سے جس جاں سپاری کی توقع کرتی ہے اس کے شایاں وفاشعاری کا ثبوت وہ پہلے خود بہم پہنچائے۔ وہ پبلک سے جس اعتماد کو چاہتی ہے ویسے ہی اعتماد کا مظاہرہ پہلے خود کرے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حکومت خود تو عوام سے اعتماد مانگے لیکن جب عوام اس سے اپنے لئے اعتماد مانگیں تو انہیں یہ کہہ کر رد کر دیا جائے کہ وہ غنڈوں اور مفسدہ پردازوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حکومت خود تو عوام سے اطاعت و انقیاد کا مطالبہ کرے لیکن جب عوام اس کے سامنے اپنی شکایات پیش کریں تو بہرا کان آگے بڑھا کر انہیں ڈانٹ دیا جائے کہ یہ ملک دشمنی ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حکومت خود اپنے لئے تو عزت و احترام چاہے لیکن جب عوام اور اس کے نمائندے اس کے سامنے پیش ہوں تو وہ ان سے اس قدر گرا ہوا سلوک کرے کہ کسی مہذب شخص نے اپنے باغیوں سے نہ کیا ہو۔ کیا ایسے سلوک اور ایسے رویئے کے بعد بھی حکومت یہ چاہتی ہے کہ اس سے پیار کیا جائے اور اس کی اطاعت بدل و جان کی جائے۔ انجیل میں آیا ہے "تم دوسروں کے لئے وہ کچھ کرو جو تم دوسروں سے اپنے لئے چاہتے ہو"۔ حکومت جس احترام و عزت کو چاہتی ہے وہ دبدبے اور رعب سے حاصل نہ ہوگی محبت و الفت سے حاصل ہوگی۔ وہ عوام کے دلوں میں گھر کر سکتی ہے مگر لطف و کرم کے ہتھیاروں سے جبر و تشدد کے ہتھیار سے نہیں۔ وہ قوم کا اعتماد جیت سکتی ہے ان سے دور ہو کر نہیں بلکہ اپنے دل کو ان کے دل کے قریب کر کے۔

ہم حکومت سے نہایت خیر خواہی سے کہتے ہیں کہ وہ عوام کے اس مطالبہ کی تحقیق کرائے اور اگر اس میں حق نظر آئے تو بے جا ضد چھوڑ کر اسے قبول کر لے ورنہ بلاتأمل عوام کے سامنے اپنی صداقت ظاہر کر دے۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہماری سیاست کے افق پر جو طوفان بداماں گھٹائیں چمک رہی ہیں وہ ضرور ہی برسیں۔

قوم اور اس کے لیڈروں سے ہم یہ کہتے ہیں کہ سیاست کا پرانا رویہ اور تصور ختم کیا جائے' سیاست اکھاڑ پچھاڑ اور جوڑ توڑ کا نام نہیں ہونا چاہیئے بلکہ صحیح معنوں میں تدبر امور ہونا چاہیئے۔ اس میں اس منزل کی جھلک نمایاں ہونی چاہیئے جس کو قرار داد مقاصد کی شکل میں ہم نے تیار کیا ہے۔ اب ہماری منزل متعین ہو چکی ہے اور اس بارے میں ہم کو زیادہ دیر تک متذبذب نہیں رہنا چاہیئے۔ تعین منزل کے بعد ہم پر لازم ہو جاتا ہے کہ ہم اپنے سب امور اجتماعی کو اسی رخ پر موڑ لیں۔ اگر ہم تعلیم میں دینیات کا کورس شامل کر سکتے ہیں تو سیاست میں اخلاق کو کیوں نہیں داخل کرنا چاہیئے۔ قرار داد مقاصد کے ملک میں سیاست داؤ پیچ اور اقتدار طلبی کا نام نہیں ہونا چاہیئے اس کو ایک ایسا حمام نہیں ہونا چاہیئے جس میں ننگوں کے سوا کوئی داخل نہ ہو سکتا ہو۔ ایسی گزرگاہ نہیں ہونی چاہیئے کہ جس میں شریف آدمی پاؤں رکھتے ہوئے ہچکچائیں۔ یہاں کی سیاست ایک ایسی تربیت گاہ ہونی چاہیئے کہ جس میں سے تانبا بھی سونا بن کر نکلے۔ قرار داد مقاصد کے بعد ہم نے خود فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم اس امر میں دنیا سے نرالے ہوں گے۔ پھر سیاست میں قدیم ریشہ دوانیاں اور جھوٹ کیوں ہیں؟

دوسری اہم تبدیلی سیاست میں یہ کرنی ہوگی کہ اسے جذبات کی نیو سے اٹھا کر عقل و دلیل کی نیو پر استوار کرنا ہوگا۔ دنیا میں جذبات سے کبھی کام نہیں چلتے۔ دنیا میں جن قوموں نے ترقی کی ہے اور ان کی سیاست دنیا پر چھا گئی ہے وہ عقل و ہنر سے چھائی ہے نہ کہ جذبات کے سہارے پر نہیں چھائی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جو بھی تحریکیں محض جذبات کے بل بوتے پر اٹھی ہیں وہ کبھی کامیاب نہیں ہوئیں۔ صرف وہی تحریک کامیابی حاصل کرتی ہے جس کی بنیادیں مضبوط عقلی دلائل پر ہوں۔ ہمارے ملک میں خاکسار تحریک کی ناکامی اور تحریک پاکستان کی کامیابی

اس دعوت کی تصدیق کے لئے کافی مضبوط ثبوت بہم پہنچاتی ہے۔ عوام کو جذبات کے نشہ پر لگا کر گویا ان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے عقل و علم سے دور کر دینا ہے۔ اور اس دور تعمیر میں ہمیں عقل و علم کی اشد ضرورت ہے۔ اس کے بغیر ہم ترقی کی کٹھن گھاٹی عبور نہیں کر سکتے اور اہل جماعت سے ہمارا خطاب یہ ہے کہ قرآن کے اس مقام کو یاد کریں۔ جہاں اللہ تعالےٰ نے نبیؐ کی شہادت کی افواہ سے ہراساں ہو جانے پر مسلمانوں کو سرزنش کی تھی۔ افان مات محمدؐ او قتل انقلبتم علی اعقابکم ——— الخ۔ خدا کا دین اگر محض رسولؐ کے دم سے قائم نہ تھا تو اس کے بعد کسی شخصیت کے متعلق اس قسم کا گمان کرنا کتنی غلطی ہے۔ جس کامل فہم کا مظاہرہ حضرت ابوبکرؓ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے انتقال مبارک پر فرمایا تھا وہ سامنے رکھئے۔ اور انہی کے الفاظ میں سوچیے کہ اگر تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بندگی کرتے تھے تو وہ گئے اور اگر تم خدا کی بندگی کرتے تھے تو وہ حیّ و قیوم ہے۔ یہ دین خدا کا ہے۔ اور وہی اس کا نگران ہے اس کے بندوں کا بس صرف یہی فرض ہے کہ وہ اس کے دین کے لئے اپنی جانوں تک کو لڑا دیں۔ اپنے اس خون تک کے بہانے سے گریز نہ کریں جس کو بچانے کے لئے وہ کسی وقت طبی امداد کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ اپنے ان مالوں تک کو اس کی راہ میں لٹانے سے نہ ہچکچائیں کہ جس کی حفاظت کے لئے وہ کسی وقت بڑی تشویش کرتے ہیں۔ مولانا مودودی نے جس عزم و بلند کرداری کا ثبوت دیا ہے وہ ان کی شان کے بیں شایاں ہے۔ انہوں نے حضرت خبیبؓ کی یاد پھر تازہ کر دی ہے اور اصحابہ کے عہد کی جن قربانیوں کا ہم ذکر سیرت کی کتابوں میں پڑھتے تھے اس کا مرقع مولانا نے کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ اقبال جس مرد مومن کے ترانے گاتا تھا اس کے دیدار سے ہم اپنی آنکھوں کو کیسے نورانی کرتے۔ اگر مولانا عزم امر کا نمونہ نہ دکھاتے۔ مولانا نے جس طرح خیالات میں ایک نئی راہ اسلام دکھائی تھی سیاست میں طرح ایک نیا جادۂ اسلام بنایا۔ اسی طرح ابتلاء میں بھی نئی روش اسلام دکھا دی ہے۔ انہوں نے جو کچھ کیا تھا وہ کرنے کے لئے کہا تھا۔ اور انہوں نے آج سے پانچ برس پہلے اس کی پیشگوئی کر دی تھی۔

> "جس وقت ہم نے سنہ ۱۹۴۱ء میں تحریک اسلامی کا آغاز کیا تھا۔ اس وقت ہمیں پورا اندازہ تھا کہ ہم کیا کرنے چلے ہیں اور اس کا خیر مقدم دنیا میں ہمیشہ کس طرح ہوتا آیا ہے۔ اس لئے ہم پہلے ہی اس کے راستہ کی آزمائشوں کے لئے تیار ہو چکے تھے۔ البتہ افسوس صرف اس بات کا ہے۔ کہ دعوت اسلامی کے راستے میں مزاحمت کا شرف خود مسلمانوں کو حاصل ہو رہا ہے کفار اگر یہ کام کرتے تو کچھ عجیب بات نہ ہوتی۔ لیکن مسلمانوں کے لئے بظاہر یہ ایک عجیب چیز ہے۔ بہر حال دنیا کی تاریخ میں یہ کوئی پہلا ہی موقعہ نہیں ہے کہ کچھ خدا کے بندوں کو وہی لوگ تکلیف پہنچانے کے لئے تیار ہو جائیں، جن کی فلاح و بہبودی کے لئے وہ کام کرنے اٹھے ہوں۔"
>
> (سید ابوالاعلیٰ مودودی [illegible])

دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے ایسا ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ دنیا میں نئی راہ اصلاح پیدا کرنے والوں کے لئے کبھی پھولوں کے ہار نہیں بنے ہمیشہ لوہے کی زنجیریں بنی ہیں۔ لیکن ہمارے لئے ان واقعات کا سیاسی اسباب و علل سے تجزیہ کرنا زیادہ مناسب نہیں ہے ہم قرآن کے قاری ہیں۔ جس نے اس حقیقت کا صاف صاف اعلان کیا ہے کہ کوئی ضرر پہنچانے والا نہیں سوائے خدا کے اور کوئی نفع دینے والا نہیں سوائے خدا کے۔ یہ سب کچھ اسی کی جانب سے ہو رہا ہے۔ اور ہمارا ایمان ہے کہ عسیٰ ان تکرھوا شیئاً وھو خیر لکم اس سے بھی کوئی خیر کا چشمہ پھوٹنے والا ہے۔ اسلام کے پودے کا ظہور حضور (فداہٗ امی و ابی) کے سازش قتل کے بعد ہی ہوا تھا ہر خیر کی جڑیں شر کی گہرائیوں سے پھوٹتی ہیں۔ اس لئے اس سانحہ پر ملال ہمیں نہیں کرنا چاہئے بلکہ ان کو کرنا چاہئے جو خون معصوم سے اپنا دامن تر کرنا چاہتے تھے اس پر رنج ہمیں نہیں کرنا چاہئے بلکہ ان منصفوں کو کرنا چاہئے جو بے گناہ کو مجرم ٹھہرا کر اپنے حصہ میں ظلم

سے انبار جمع کر رہے ہیں۔ اپنی فکر ان کو کرنی چاہیئے ہم کو نہیں۔ اہل حق تو آتے ہی رسم حسینؓ زندہ کرنے کے لئے ہیں۔ وہ ہوتے ہی ملت ہدایت کے رکن ہیں۔

ہم پابند اصول ہیں۔ ہمارے لئے اشتعال کے جتنے بھی سامان مہیا کئے جائیں ہم کبھی مشتعل نہ ہوں گے۔ جو لوگ جلد ہی مغلوب الغضب ہو جاتے ہیں وہ نہ اپنی بہبودی سوچتے ہیں نہ ملک و قوم کی۔ ہمارے ملک کی قسمت ہمارے ہر ہر فرد کے رویئے سے وابستہ ہے۔ ایک ہنگامی سے بعض اوقات محل جل جاتے ہیں۔ اس لئے ہم کو اپنے قول و فعل میں نہایت درجہ محتاط رہنا چاہیئے۔ ہمیں اپنے ملک و ملت کے لئے پابندی اصول و قانون کی سچی تصویر پیش کرنی چاہیئے۔ اور اسی میں ہم سب کی فلاح ہے۔

"جمہوری حکومت میں اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں آتا ہے جن کو ووٹروں کی پسندیدگی حاصل ہو۔ ووٹروں میں اگر اسلامی ذہنیت اور اسلامی فکر نہیں ہے، اگر وہ صحیح اسلامی کیرکٹر کے عاشق نہیں ہیں۔ اگر وہ اس بے لاگ عدل اور ان بے لچک اصولوں کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں جن پر اسلامی حکومت چلائی جاتی ہے تو ان کے ووٹوں سے کبھی "مسلمان" قسم کے آدمی منتخب ہو کر پارلیمنٹ یا اسمبلی میں نہیں آ سکتے اس ذریعہ سے تو اقتدار انہی لوگوں کو ملے گا جو مردم شماری کے رجسٹر میں چاہے تو مسلمان ہوں مگر اپنے نظریات اور طریق کار کے اعتبار سے جن کو اسلام کی ہوا بھی نہ لگی ہو۔ اس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اسی مقام پر کھڑے ہیں جس مقام پر غیر مسلم حکومت میں تھے بلکہ اس سے بھی بدتر مقام پر کیونکہ وہ "قومی حکومت" جس پر اسلام کا نمائشی لیبل لگا ہوگا اسلامی انقلاب کا راستہ روکنے میں اس سے بھی زیادہ جری و بے باک ہوگی، جتنی غیر مسلم حکومت ہوتی ہے۔ غیر مسلم حکومت جن کاموں پر قید کی سزا دیتی ہے وہ "مسلم قومی حکومت" ان کی سزا پھانسی اور جلاوطنی کی صورت میں دے گی اور پھر بھی اس حکومت کے لیڈر جیتے جی غازی اور مرنے کے بعد رحمۃ اللہ علیہ ہی رہیں گے۔"

(اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے) (ابوالاعلیٰ مودودی)

"ان کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ اکثریت کے صوبوں میں حاکمیت جمہور کے اصول پر خود مختار حکومت کا قیام آخر کار حاکمیت رب العالمین کے قیام میں مددگار ہو سکتا ہے۔ جیسی مسلم اکثریت اس مجوزہ پاکستان میں ہے، ویسی ہی بلکہ عددی حیثیت سے بہت زیادہ زبردست اکثریت افغانستان، ایران، عراق، ٹرکی اور مصر میں موجود ہے اور وہاں اس کو وہ "پاکستان" حاصل ہے جس کا یہاں مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ پھر کیا وہاں مسلمانوں کی خود مختار حکومت کسی درجہ میں بھی حکومت الٰہی کے قیام میں مددگار ہوتی نظر آتی ہے؟ مددگار ہونا تو درکنار، میں پوچھتا ہوں کیا آپ وہاں حکومت الٰہی کی تبلیغ کر کے پھانسی یا جلاوطنی سے کم کوئی سزا پانے کی امید کر سکتے ہیں؟"

جمہوری انتخاب کی مثال بالکل ایسی ہے۔ جیسے دودھ بلو کر مکھن نکالا جاتا ہے اگر دودھ زہریلا ہو تو اس سے جو مکھن نکلے گا۔ قدرتی بات ہے کہ وہ دودھ سے زیادہ زہریلا ہوگا۔ اسی طرح اگر سوسائٹی بگڑی ہوئی ہو تو اس کے ووٹوں سے وہی لوگ منتخب ہو کر برسر اقتدار آئیں گے جو اس سوسائٹی کی خواہشات نفس سے سند قبولیت حاصل کر سکیں گے۔ پس جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے۔ تو اس طرح حکومت الٰہی قائم ہو جائے گی۔ ان کا گمان غلط ہے ورنہ اصل اس کے نتیجہ میں جو کچھ حاصل ہوگا۔ وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔ اس کا نام حکومتِ الٰہی رکھنا اس پاک نام کو ذلیل کرتا ہے"

سیاسی کشمکش حصہ سوم ——— ابوالاعلیٰ مودودی

پاکستان میں سیاسی تغیرات

(اکانومسٹ لندن مورخہ ۹ مئی ۱۹۵۳ء سے اقتباس)

کچھ دنوں سے یہ بات بالکل واضح تھی کہ پاکستان میں حالات کی شدت اب اپنی آخری حد کو جا پہنچی تھی۔ خواجہ ناظم الدین کی حکومت اپنا وقار کھو چکی تھی اور قوم کا اعتماد اس سے پوری طرح اٹھ گیا تھا۔ "بڑھتی ہوئی بے چینی" جیسا کہ گورنر جنرل نے اپنے کمیونک میں کہا ملک کے ہر طبقے میں تیزی سے پھیل رہی تھی۔ بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ نے صوبہ پرستی کی آگ پر تیل کا کام کیا اور ملک کے دونوں حصوں میں شدید ناراضگی کا اظہار کیا گیا جس سے ملک کی سالمیت تک کو خطرہ لاحق ہو گیا۔ نئے دستور میں ملاؤں کو دی گئی رعایت نے ترقی پسند عناصر کو چونکا دیا تھا اور احمدیوں کے خلاف طبقہ وارانہ ایجی ٹیشن نے بہت بدنما مظاہرہ کیا۔ ملک کی غذائی حالت انتہائی مایوس کن ہو رہی تھی اور حکومت نے گیہوں کی کمی کا قبل از وقت اندازہ اور اہتمام نہ کر کے اپنے خلاف بہت شدید رائے عامہ تیار کر لی تھی۔ نیز عام معاشی بدحالی خصوصاً بیرونی تجارت میں زرمبادلہ کی کمی نے بھی کچھ کم بے چینی نہیں پیدا کر رکھی تھی۔

ملک میں ایک اچھی حوصلہ مند قیادت کی شدید کمی محسوس ہو رہی تھی اور حکومت پر تنقید اور اس سے عام بیزاری پیدا ہو گئی تھی چنانچہ یہ بات بالکل عیاں ہو گئی تھی کہ کابینہ کے افراد ایک ٹیم کی طرح کام نہیں کر رہے تھے اور باہمی ریشہ دوانیاں چل رہی تھیں۔ لیکن خواجہ ناظم الدین کی حکومت اس اضطراب سے بظاہر پوری طرح بے نیاز تھی۔ چنانچہ ملک کے سامنے اب یہ سوال آ کھڑا ہوا تھا کہ دستوری طور پر تبدیلیٔ حکومت کیسے ہو سکتی ہے؟ ہر قسم کی بے اطمینانی اور اضطراب کے باوجود حکومت کے لئے یہ کوئی مشکل کام نہ تھا کہ وہ دستور ساز اسمبلی کا اعتماد ہر حال میں حاصل کئے رہے۔ حزبِ مخالف کی چند محدود آوازیں صدا بصحرا سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی۔ بلاشبہ اسمبلی ("LONG PARLIMENT") ہو کر رہ گئی تھی جو اب صحیح معنوں میں عوام کی نمائندہ بھی نہ رہی تھی اور ایک متفقہ دستور کی تیاری میں تاخیر کی وجہ سے ملک کے عام انتخابات نامعلوم عرصے کے لئے ملتوی ہوتے چلے جا رہے تھے۔ ان حالات میں خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ حکومت کی تبدیلی اب صرف غیر آئینی ذرائع سے ہی ممکن رہ گئی تھی۔ یہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ بیمار گورنر جنرل مسٹر غلام محمد جو اسی کابینہ کی سفارش سے متعین کیا گیا تھا وہ کام کر سکے گا یا کرنے پر آمادہ ہو جائے گا جو کسی کے کئے ہوتا نظر آتا تھا۔ اور جس کے لئے ملک چشم براہ تھا۔ وزارت کی برخاستگی اس کا ایک بر وقت اور جرأت مندانہ اقدام تھا جو بالکل ڈرامائی انداز میں ہوا۔

کیا یہ فعل صحیح معنوں میں آئینی تھا یہ مسئلہ مدت تک زیر بحث رہے گا۔ گورنر جنرل نے یہ کام گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ پاکستان سکشن ۱۰ کے تحت انجام دیا جس کی رو سے اس کی کابینہ صرف اس کی رضامندی سے ہی وزارت قائم رکھ سکتی تھی۔ اس قانون کے الفاظ کی رو سے یہ فعل یقیناً حق بجانب تھا لیکن یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ یہ دستور کی روح کے بھی مطابق تھا۔ بہرحال مسٹر غلام محمد لائق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے حالات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا۔ اور وقت کی آواز کے عین مطابق ایک قدم اٹھایا۔ ان کا یہ فعل ایسے غیر معمولی حالات میں جبکہ کسی بڑے سے بڑے سیاسی اقدام تک کی توقع کی جا سکتی تھی بہرحال ایک جائز دستوری فعل سے بہت کچھ مشابہت رکھتا ہے۔

یہ واقعی بہت افسوسناک صورت حال ہے کہ قوم خواجہ ناظم الدین کی خدمات سے وقتی طور پر محروم ہو گئی ہے اسلئے کہ اس حقیقت سے کسی کو انکار نہ ہو گا کہ وہ ایک دیانتدار۔ معزز۔ مفاد پرستی سے بالا اور خدا ترس انسان ہیں۔ اگر وہ اپنی کابینہ کے کچھ ناکام اور سخت بدنام افراد کو نکالنے پر آمادہ ہو گئے ہوتے تو حالات نے یہ رُخ نہ اختیار کیا ہوتا۔ انھوں نے حال ہی میں پنجاب کی معطّلانہ وزارت کو برطرف کر کے سخت خطرناک صورت حال پر قابو پایا تھا مجھ [illegible] سندھ کے سابق وزیر اعظم مسٹر کھوڑو کے خلاف بہت سختی سے قدم اٹھایا تھا جس کے خلاف بیسیوں الزامات ثابت تھے اور جسے پبلک

منصب کیلئے نااہل قرار دیا گیا تھا لیکن اس کے باوجود انہوں نے صوبائی مسلم لیگ کی صدارت کے اختیارات استعمال کئے جانے کا دعویٰ تھا لیکن مضبوطی اور جرأت مندی کی یہ چند جھلکیاں ملک کو اس بات پر مطمئن نہ کر سکیں کہ خواجہ ناظم الدین ہی ان مشکل حالات پر قابو پانے کا اہل ہوتا تھا۔

عوام کا تعجب

وزارت عظمیٰ کے لئے مسٹر محمد علی کا انتخاب جو واشنگٹن سے اپنے مختصر دورے پر پاکستان میں موجود تھے عوام کے لئے سخت تعجب انگیز اور حیران کن تھا۔ خیال کیا جاتا تھا کہ جب بھی کبھی کوئی ایسی صورت حال پیدا ہوئی تو صوبہ سرحد کے مضبوط وزیر اعظم خان عبدالقیوم خاں کو مرکز میں ذمہ داری سنبھالنے کیلئے بلایا جائے گا۔ اب خان قیوم کو مسٹر محمد علی کی مرکزی کابینہ میں شرکت کے لئے دعوت دی گئی ہے جہاں ان کی شخصیت بہر حال اپنے اثرات دکھلائے گی۔ غالباً صوبہ داری توازن قائم کرنے کے لئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ بنگالی کی جگہ بنگالی ہی وزیر اعظم ہو۔ اور اسی لئے مسٹر محمد علی کا انتخاب عمل میں لایا گیا۔ اور کچھ اس حقیقت کو بھی دخل ہو سکتا ہے کہ وہ اوٹاوا اور واشنگٹن کے سیاسی حلقوں میں کافی وزن رکھتے ہیں اسلئے پاکستان کے اس شدید غذائی بحران کے موقعہ پر جبکہ اسے کئی ہزار ٹن گیہوں کی ضرورت ہے ان کی شخصیت زیادہ مفید ثابت ہو سکتی ہے، اس کے علاوہ بھی وہ بہت کچھ عمدہ شخصی خصوصیات کے حامل ہیں۔

کابینہ کی تبدیلی بھی صوبہ داری رقابت کو کم کرنے میں بظاہر کامیاب نظر نہیں آتی۔ اور ضروری ہوگا کہ مرکز میں ایک بنگالی وزیر اور لایا جائے۔ اب یہ یقین کرنے کے خاطر خواہ اسباب موجود ہیں کہ مرکزی کابینہ میں باہمی اختلاف اور چپقلش کا امکان بہت کم ہو گیا ہے نہ صرف یہ کہ گورنر جنرل۔ جو آئندہ پبلک معاملات میں بہر حال زیادہ موثر طور پر حصہ لیں گے۔ کسی قسم کا کوئی اختلاف پسند نہ کرینگے بلکہ وزراء بھی یہ محسوس کرینگے کہ وہ ہر وقت زیر نگاہ ہیں اور اگر کوئی مشکل وقت آئے تو الگ الگ بھٹکنے کی بجائے وہ سب مشترکہ طور پر بھٹکیں کچھ اسلئے بھی کہ حالیہ صورت حال نے غیر مطمئن سیاستدانوں کی تعداد میں کچھ اور اضافہ ہی کر دیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ نئی کابینہ کے سامنے انتہائی پیچیدہ مسائل اور مشکلات ہیں اور محض دو پرانے وزراء (مسٹر پیرزادہ وزیر خوراک اور مسٹر فضل الرحمن وزیر اقتصادیات اور وزیر تجارت) کی علیحدگی جو واضح طور پر ناکام ثابت ہوئے تھے ان مشکلات کا حل نہ بن جائے گی۔ البتہ اس سے ایک مضبوط اور صحت مند پالیسی مرتب ہونے کا زیادہ امکان پیدا ہو گیا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اب وزارت خوراک اور زراعت مسٹر عبدالقیوم خاں کے حوالے کی گئی ہے جو ظاہر ہے کہ اپنے محکمے میں کسی گوشے سے کسی قسم کی کوئی خرابی بالکل برداشت نہ کرینگے اور وزارت اقتصادیات مسٹر محمد علی وزیر خزانہ کے حوالے کی گئی ہے جو ایک موزوں ترین شخص کے ہاتھوں میں ہے۔ اب ایک نئے وزیر تجارت کی تلاش باقی ہے۔

نئے رجحانات

حکومت کی تبدیلی نے سب سے نمایاں اثر میدانِ فکر و نظر میں پیدا کیا ہے۔ گذشتہ سال ملاؤں اور ان رجعت پسند عناصر کا پلڑا بھاری رہا جو پاکستان میں مذہبی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں لیکن نئی کابینہ کی ترتیب نے ترقی پسند عناصر کو جو پہلے ان رجعت پسند رجحانات کو پرورش پاتے ہوئے موثر طریقے پر روکنے سے اپنے آپ کو قطعی بے بس پا رہے تھے کافی تقویت پہنچائی ہے۔ اب انھیں امید ہو چلی ہے کہ "ملا" بحیثیت ایک سیاسی طاقت کے مکمل طور پر ختم ہو کر رہ گئے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ گورنر جنرل نے خود بھی ان رجعت پسند رجحانات کو شدت سے ناپسند کیا تھا جو بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ میں جگہ پا گئے تھے۔ اور نئے وزیر اعظم کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ وہ ایک ترقی پسند اور ماڈرن طرز کے آدمی ہیں۔ اگر مذہبی انتہا پسندوں کو ذرا بھی خوش کرنا یا ان کی کچھ دلداری منظور ہوتی تو موقعہ تھا کہ نئی کابینہ میں سر ظفر اللہ خاں کو شریک نہ کیا جاتا جو احمدی قوم کے فرد ہونے کی حیثیت سے قدیم فکر کے لوگوں کا مرکز غم و غصہ رہے ہیں۔ اب انھیں دوبارہ نئی کابینہ میں شریک کر لیا گیا ہے اور اس کے خلاف ایک صدائے احتجاج بھی بلند نہیں ہوئی

بھارت سے تعلقات

سردار عبدالرب نشتر جسے کابینہ میں ملاؤں کا سب سے بڑا مویّد سمجھا جاتا تھا اور جو بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی طرف سے دستوری تجاویز کا مصنف یا کم از کم ان کی ترتیب میں پیش پیش تھا کہ ملاؤں کے بورڈ قائم کئے جائیں کابینہ سے علیحدہ کر دیا گیا ہے اور اس کی جگہ اسے۔ کے بروہی کو لایا گیا ہے جو رجعت پسند طاقتوں کے خلاف جنگ لڑنے والے ذہین طبقے کا سرگروہ رہا ہے۔ عموماً اب یہ خیال کیا جا رہا ہے کہ نئے دستور کو زیادہ لادینی رنگ دیا جا سکے گا۔ اگرچہ قرار داد مقاصد کو جس کی رو سے پاکستان کو اسلامی ریاست قرار دیا گیا تھا برقرار رکھا جائے گا۔ یہ قرار داد لیاقت علی مرحوم کے وقت پاس کی گئی تھی اور جس کی حیثیت عملی نکتہ نظر سے ایک قابل تعریف بیان سے کچھ زیادہ نہ تھی۔

یہ بھی توقع کی جاتی ہے کہ نئی کابینہ کے مرتب ہونے سے بھارت کے ساتھ روابط پہلے سے بہتر ہو سکیں گے۔ دونوں ملکوں کے درمیان فضا بہت سازگار نظر آتی ہے۔ تجارتی گفتگو بھی کافی کامیاب رہی ہیں اور پاکستانی وفد کے ممبروں نے کھلے دل سے نئی دہلی میں اپنی مہمان نوازی کی تعریف کی ہے۔ اور اب تک نہرو کو خواجہ ناظم الدین ملاقات کے سلسلے میں جو کوششیں رہی تھی وہ دونوں طرف بہت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں اور اب مسٹر محمد علی دونوں ملکوں کے درمیان دوستانہ روابط قائم کرنے کے اپنے پیشرو سے بھی زیادہ بیچین نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے لئے نئے وزیر مسٹر شعیب قریشی بہت ممد ثابت ہوں گے جو اس سے پہلے بھارت میں ہائی کمشنر تھے اور جن کے پنڈت نہرو اور بھارتی گورنمنٹ کے دوسرے ارکان کے ساتھ شخصی تعلقات بہت گہری بنیادوں پر قائم ہیں۔

غیر ملکی سرمایہ

اب یہ سمجھنے کے امکانات بھی زیادہ واضح ہو گئے ہیں کہ غیر ملکی سرمائے کو پاکستان میں زیادہ گرمجوشی اور خوشدلی کے ساتھ لگنے کا موقعہ دیا جائیگا اور اس کے ساتھ زیادہ تعاون کیا جائے گا۔ گذشتہ سال اس کے باوجود کہ خواجہ ناظم الدین کی حکومت پاکستان میں غیر ملکی سرمائے کو دعوت دینے میں مسلسل زبانی جمع خرچ کرتی رہی لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی پالیسی دعوت کی جائے عملاً رکاوٹ پر کاربند رہی مسٹر محمد علی نے اپنا طرز فکر بالکل واضح کر دیا ہے۔ انہوں نے اپنی پہلی ہی پریس کانفرنس میں بتایا کہ ہمارے لئے غیر ملکی سرمایہ بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے جو تعمیر پاکستان میں بہت بڑی خدمت انجام دے سکتا ہے اور یہ کہ میں اس کی ہمت شکنی کو سخت ناپسند کرتا ہوں۔

تحریکِ اسلامی کے داعی!

(مختصر حالاتِ زندگی)

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

مولانا مودودی ۲۵ر ستمبر ۱۹۰۳ء بروز جمعہ اورنگ آباد میں ایک امیر اور متمول گھر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ماجد مولانا احمد حسن وکیل تھے۔ اور دہلی کے مشہور مودودیہ گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ گھرانا علم و فضل، دولت و ثروت کے لحاظ سے دہلی کے ان چند گھرانوں میں سے ہے۔ جو بہت زمانے سے دلی میں آباد ہیں۔

مودودی صاحب کا بچپن عجیب و غریب واقعات سے پر ہے۔ مولانا کے متعلق بچپن ہی سے خیال کیا جاتا تھا کہ یہ ہونہار بچہ آگے چل کر اسلام کے مستقبل کا محافظ ہوگا۔ مولانا بچپن ہی سے نہایت صاف ستھری اور دینی طبیعت رکھتے تھے، وہ بہت کم عمر میں عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم سے فارغ ہوگئے۔ چنانچہ مولانا نے ۱۹۱۴ء میں مولوی کا امتحان حیدرآباد سے پاس کیا۔ اور ۱۱ سال کی عمر میں انھوں نے عربی سے اردو میں ترجمہ کرنا بھی شروع کر دیا تھا دینی اور مذہبی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی۔ اور انگریزی کی ابتدائی شُدبُد اپنے ایک انگریزی اتالیق سے اور بقیہ تعلیم پرائیویٹ حاصل کی۔ چونکہ مولانا کے والد مرحوم انگریزی اسکولوں اور کالجوں کی فضا سے سخت نفرت کرتے تھے۔ اس لئے انھیں گوارا نہیں ہوا کہ وہ اپنے بیٹے کو اسکولوں میں بھیج کر اس کی زبان اور اس کے اخلاق اور کردار کو خراب ہونے دیں۔ مولانا کے والد دہلی کی زبان و تہذیب کے بارے میں بہت متشدد تھے۔ اس لئے وہ اپنی اولاد کی زبان کی صحت کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ چونکہ وہ نہایت متقشف قسم کے مذہبی انسان تھے، اور اپنی اولاد کے بارے میں بھی ایک رحم دل باپ کے ساتھ دین کے بارے میں ایک سخت گیر باپ بھی تھے۔ اسلئے وہ اپنے بچوں کو بداخلاقی، بدتمیزی، گالی گلوچ پر کڑی سزا دیتے تھے۔

مولانا اپنے بھائی بہنوں میں اپنے والد کو سب سے زیادہ پیارے تھے۔ اور اس کی وجہ ان کی نیکی، ذہانت، اور باپ کی اطاعت تھی۔ اور آج تک اس تربیت کا نشان ان پر بہت گہرا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے بچوں کے ایک شفیق باپ اور اپنی بوڑھی ماں کے ایک فرمانبردار بیٹے ہیں۔ آج وہ علم و فضل، شہرت اور اخلاق کے بلند مقام پر فائز ہیں۔ لیکن ان کی والدہ ابھی تک ان کو پیار سے "منا" میاں ہی پکارتی ہیں ——

مولانا کی ذہانت کی ایک واضح مثال ان کے بچپن کا ایک واقعہ ہے۔ مولانا کے برادر اکبر مولانا ابوالخیر صاحب کی روایت ہے کہ ایک دن عصر کے وقت والد مرحوم مسکراتے ہوئے گھر آئے۔ اور کہنے لگے کہ آج میرے بیٹے (ابوالاعلیٰ) نے میرا دل انتہائی مسرت سے لبریز کر دیا اور اپنی آواز میں اپنا مستقبل دکھا دیا۔ واقعہ یہ تھا کہ مسجد میں اذان کا وقت ہوگیا تھا، لوگ مؤذن کے منتظر تھے۔ یہ بے جھجک اذان کی طرف بڑھے، اور ترتیل کے ساتھ گہری اور بلند آواز میں اس طرح اذان کہی کہ اذان کہنے کا حق ادا کر دیا۔ مولانا اس وقت چار برس کے تھے۔ رسمی طور پر بسم اللہ اس وقت تک نہیں ہوئی تھی۔ لیکن دس بارہ سورتیں حفظ تھیں اور قرآن کا ڈیڑھ پارہ پڑھ چکے تھے۔ اس طرح مولانا کی ذہانت کے بے شمار ایسے واقعات ہیں۔ جسے سن کر ان کے عبقری (GENIUS) ہونے میں کوئی شک باقی نہیں رہتا۔

مولانا کی تاریخِ زندگی میں جو چیز سب سے زیادہ قابل تقلید اور دلچسپ ہے۔ وہ ان کی تعلیم و تربیت، اور ان کا مطالعہ ہے، [illegible] سال کی عمر تک مولانا نے فقہ، حدیث، علم کلام، تفسیر، نحو و صرف، منطق و فلسفہ جدید علوم کی خاص تحصیل کر لی تھی۔ اور اس وقت تک وہ چھوٹی چھوٹی کتابوں کے مترجم بھی

بن چکے تھے۔ اور مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا چنانچہ آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ مولانا ابتدائی عمر میں "نگار" میں جو نیاز فتح پوری کی ادارت میں بھوپال سے نکلتا تھا۔ لکھتے تھے۔

مولانا کے والد کے انتقال کے بعد انھیں بعض اوقات معاشی مشکلات بھی پیش آئیں۔ لیکن ان کی اولوالعزم طبیعت پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ مولانا جب ایک زمانے میں بیکار تھے۔ تو اس وقت انھوں نے اپنے ذہن و دماغ کی قوتوں کو منتشر کرنے کے بجائے جدید فلسفہ و سائنس کے مطالعہ پر صرف کیا اور آج اسی کی برکت ہے کہ جدید علوم و فنون پر ان کو جو معلومات اور عبور ہے۔ وہ بہت کم لوگوں کو حاصل ہے،

مولانا نے لکھنے کا کام جبل پور کے ایک اخبار سے شروع کیا۔ اس زمانہ میں آپ نے پہلی مرتبہ تقریر کی سامعین کی تعداد ۱۵ ہزار تھی۔ اس وقت آپ کی عمر ۱۷ سال کی تھی۔ بعد میں وہ "الجمعیۃ" دہلی کے ایڈیٹر ہوئے۔ اور چار سال تک ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس زمانے میں انھوں نے اپنی مشہور کتاب "الجہاد فی الاسلام" لکھی۔ اور تحقیق اور اکتشاف کا حق ادا کر دیا۔ الجمعیۃ کے بعد مولانا نے ۳۲ء میں ترجمان القرآن حیدرآباد دکن سے نکالا۔ اور آج تک برابر یہ رسالہ ان کی علمی اور فکری جولانیوں کا حامل ہے۔

مولانا ان لوگوں میں ہیں۔ جن کے فکر میں کبھی بھی کجی نہیں آتی۔ وہ اسلام کو ہمیشہ سے ایک نظام حیات کی حیثیت سے مانتے تھے اور اس کو اسی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ ۳۲ء سے بہت پہلے ان کے مضامین کا رنگ بھی ہمیں یہی بتاتا ہے۔ مولانا کا یہی عقیدہ تھا اور ان کا اسلام کا یہی تحقیقی مطالعہ تھا۔ جو بعد میں ایک اہم دینی اور اسلامی تحریک کا داعی بنا۔

ترجمان القرآن جب نکلا تو لوگوں کو پہلی مرتبہ محسوس ہوا کہ اسلام ایک سائنٹفک اور مدون نظام حیات ہے۔ چنانچہ مولانا نے زندگی کے ہر شعبے میں اسلامی اصولوں کی برتری ثابت کی۔ اور آج یہ بجا طور پر کہا جاتا ہے کہ اسلام کو واضح کرنے میں برعظیم ہند و پاک میں ان کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔ اس برعظیم میں شاید ہی کوئی ایسا ہمہ پہلو مفکر ہو۔ جو اسلام ہی نہیں بلکہ علوم و فنون کے ہر شعبے پر اتنی گہری تحقیقی نظر رکھتا ہو۔

مولانا بہت محنتی انسان ہیں۔ ذہانت کے ساتھ محنت۔ مولانا جب کسی مسئلہ پر لکھنے بیٹھتے ہیں تو اس سے پہلے اپنے کتب خانے میں ہزاروں صفحات پڑھتے ہیں۔ پڑھنے کے بعد سوچ کر اسطرح لکھتے ہیں کہ عموماً وہ اس موضوع پر حرف آخر ہوتا ہے۔

مولانا نہایت نفاست پسند اور ستھرے انسان ہیں۔ ان کے ذوق میں مغرب اور مشرق کا لطیف امتزاج ہے، مزاح ان کی طبیعت کا ایک بڑا جزو ہے۔ احباب اور رفقاء کے ساتھ جس مجلس میں بیٹھتے ہیں۔ وہ زعفران زار بن جاتی ہے۔ چنانچہ ان کے متعلق مشہور ہے کہ ان کی تحریروں کو پڑھ کر لوگ اتنا متاثر نہیں ہوتے جتنا ان کو دیکھ کر یا ان کی باتیں سن کر۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ایک دنیا ان سے والہانہ عشق و محبت رکھتی ہے،

مولانا کا لکھنے پڑھنے میں بھی ایک خاص ذوق ہے۔ وہ ہر چیز اعلیٰ درجہ کی رکھتے ہیں۔ کاغذ، قلم، پنسل، فرنیچر، الماریاں، کتابیں۔ غرضیکہ نفاست یہاں بھی پوری طرح موجود ہے۔ چنانچہ بعض دقیانوسی قسم کے لوگ ان کی اس عادت کو غیر اسلامی سمجھتے ہیں اور ان کے خلاف پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ یہ علماء کی خصوصیات نہیں رکھتے۔

مولانا ۱۹۴۱ء سے پہلے ایک مفکر تھے۔ لیکن تحریک اسلامی کے قیام کے بعد وہ مفکر ہی نہیں رہے بلکہ ایک مبلغ اور مجاہد بھی ہیں۔ انھوں نے اس مقصد کے لئے ہر طرح کی مصیبت اٹھائی احباب و رفقاء سے مفارقت گوارا کی، اعزہ و اقرباء سے طعنے سنے، حکومتوں اور منادرتوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے لیکن اپنے مقصد میں کوئی کمی نہ ہونے دی۔

جماعت اسلامی کا بیشتر لٹریچر آپ کی تصانیف پر مشتمل ہے۔ آپ کی کل تصانیف چالیس سے زائد ہیں۔ اسلام پر اس سے زیادہ جامع لٹریچر اسلامی تاریخ میں آج سے ۵۰۰ سال پہلے تک کہیں نظر نہیں آتا۔

مولانا امین احسن اصلاحی

مولانا امین احسن اصلاحی یوپی کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ایک ایسے ماحول میں آنکھ کھولی اور تربیت پائی جو ان کے موجودہ
مشن کے لحاظ سے کسی طرح سازگار نہیں تھا۔ وہ تعلیم و تربیت کے جس گہوارے میں پروان چڑھے۔ وہ بھی اسلامی دعوت کے لئے سازگار نہیں تھا۔ وہ تو
ان کی خوش قسمتی تھی کہ قدرت کی طرف سے انھیں غیر معمولی ذہن و دماغ ودیعت کیا گیا تھا کہ وہ بہت جلد اپنے اصل موقف پر آگئے۔

مولانا نے اردو کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مدرسۃ الاصلاح اعظم گڑھ میں عربی فارسی اور انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔ ابھی زیر تعلیم ہی تھے کہ
اپنی ادبی اور فکری صلاحیتوں کی وجہ سے انھیں "مدینہ" جیسے اخبار کی ادارت تفویض کی گئی۔ جہاں جاکر ان کا ادبی جمال اور نکھرا اور وہ چار سال کی صحافتی
زندگی بسر کرنے کے بعد ایک مشہور اہل قلم کی حیثیت سے ملک کے علمی حلقوں میں شامل ہو گئے۔ "مدینہ" سے صحت کی خرابی کے باعث قطع تعلق کے بعد وہ "الناظر" لکھنو
کے حلقہ ادارت میں شامل ہو گئے۔ جو اس وقت مولانا ظفر الملک علوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی کی ادارت میں لکھنو سے نکل رہا تھا۔ ابھی غالباً وہ لکھنو ہی میں تھے کہ اس
دوران میں قرآن حکیم کے مشہور مفسر اور اسلامی علوم و فنون کے مشہور عالم مولانا حمید الدین فراہی نور اللہ مرقدہ، حیدرآباد دکن کے مدرسۃ العلوم جامعہ عثمانیہ کی پرنسپل
سے مستعفی ہو کر اپنے وطن اعظم گڑھ تشریف لائے۔ مولانا اصلاحی قرآن حکیم کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ان کی خدمت میں پہنچے اور آخری دم تک ان کے ساتھ رہے۔
اور بعد میں ان کے ذہنی اور فکری وارث قرار دیئے گئے۔ اور مولانا کی متعدد تفسیروں اور ان کی عربی کتابوں کو اردو میں منتقل کیا اور ان کے مخصوص قرآنی فکر کو پھیلانے
کے لئے ۱۹۳۶ء میں الاصلاح نکالا۔ اور مولانا کی قائم کردہ درسگاہ میں قرآن حکیم کی تعلیم اور درس دیتے رہے۔

"الاصلاح" ایک ماہنامہ تھا۔ یہ رسالہ قرآن حکیم کے معارف، جدید عصری مسائل، سیاسی اور علمی مضامین کا ایک خوبصورت گلدستہ ہوتا تھا۔ جس وقت
میں وہ اردو رسالوں کی صف اول میں تھا۔ الاصلاح کی ادارت اور مولانا اصلاحی کے قرآنی فہم و بصیرت نے انھیں علماء کی صف اول میں جگہ دی۔

مولانا اصلاحی قدیم و جدید دونوں علوم پر کافی دستگاہ رکھتے ہیں۔ ان کو بعض لوگ مغربی و مشرقی فنون کا ایک لطیف امتزاج کہتے ہیں۔ خصوصاً مغربی
فلسفہ اور علم السیاست میں علمی حیثیت سے وہ ایک خاص حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی عمر کے اوائل ہی میں اپنے استاد اور شدید محنت کی وجہ سے بہت
جلد علم و فن کے ہر گوشے کی سیر کر لی۔

اردو ادب میں ان کا ایک خاص اسلوب ہے۔ ان کی تحریروں میں غضب کا انشاء، بلا کا بانکپن اور استدلال کا غیر معمولی مادہ بھرا ہوا ہوتا ہے "مدینہ" سے
دور "الاصلاح" تک ان کے ادب پر خطابت کا رنگ غالب تھا۔ یہ غالباً مولانا محمد علی اور ابوالکلام آزاد کا اثر تھا۔ وہ نثر میں شاعری اور خطابت دونوں سے
کام لیتے تھے۔ لیکن تحریک اسلامی نے ان کے ادب اور آرٹ کو غیر معمولی حد تک بدل دیا ہے۔ اب وہ نہایت محتاط اور دعوتی رنگ میں لکھتے ہیں۔ اور بائبل
کے مطالعہ نے ان کی زبان کو خاصا متاثر کیا ہے۔ اس لحاظ سے وہ اپنے فن میں منفرد ہیں۔

مولانا اصلاحی نے علمی اور عملی سیاسیات میں بھی اپنی عمر کا ایک مختصر حصہ صرف کیا ہے۔ وہ انگریزی امپریلزم کے خلاف ایک مدت تک جہاد کر چکے ہیں۔ اور
آزادی پسندوں کے ساتھ ہر طرح کی مصیبت اٹھائی ہے لیکن وہ کبھی وطنی اور قومی حد بندیوں کے قائل نہیں رہے۔ مسلم لیگ کی قیادت کے ابھرنے سے پہلے
وہ خالص اسلامی نظریہ حیات کے داعیوں میں شامل ہو چکے تھے۔

یہ بات بڑی دلچسپی کا باعث ہوگی۔ کہ ایک زمانے میں تحریک اسلامی کے ان دو لیڈروں میں یعنی مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے درمیان "ترجمان القرآن"
اور "الاصلاح" میں بڑی نوک جھونک رہ چکی ہے۔ مولانا مودودی نے متحدہ قومیت اور کانگریس کی تحریک کے خلاف جب "ترجمان القرآن" میں سیاسی کشمکش
کے عنوان سے سلسلہ شروع کی اور مسلمانوں کو متحدہ قومیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے نجات دلانے کے لئے اس کے اصول و مبادی پر زبردست علمی اور اتفاقی
تنقید شروع کی تو مولانا اصلاحی خوش تھے۔ لیکن ایک وقت ایسا آیا کہ مولانا مودودی کی بعض تحریروں سے "مسلم قومیت" کی بو آنے لگی تو مولانا اصلاحی نے اس پر تنقید

کی۔ اور اس موقع پر ان دونوں کے درمیان ایک ہلکا سا اختلاف پیدا ہو گیا۔ جو بعد میں چل کر اس طرح دور ہو گیا کہ مولانا نے سیاسی کشمکش حصہ سوم لکھنی شروع کی اور مسلم لیگ کے نظام، اس کے اصول و مقاصد پر تنقید شروع کی اور خالص "اصول" کی طرف دعوت دینے لگے تو مولانا اصلاحی کی یہ غلط فہمی دور ہو گئی۔ پھر اس کے بعد وہ وقت آیا کہ یہ دونوں مسلمانوں کو خالص اسلام کی طرف دعوت دینے لگے۔

جب مولانا مودودی نے خالص اسلامی بنیادوں پر ایک جماعت کی تشکیل کے لئے صحیح فکر و نظر رکھنے والے علماء کو دعوت دی۔ مولانا اصلاحی اس دعوت پر لبیک کہنے والوں میں پیش پیش تھے۔ مولانا اصلاحی اور مولانا مودودی چونکہ اصحاب مدرسہ نہیں ہیں۔ اور جدید رجحانات اور مقتضیات کو سمجھتے ہیں۔ اسلئے دونوں کے ذہن اور غور و فکر کے طریقوں میں کامل یکسانیت پائی جاتی ہے۔ یہ لوگ طبقہ علماء کی عام روش سے ہٹ کر تحقیق و اجتہاد سے مسائل حاضرہ میں کام لینے کے قائل تھے۔ اس کے اسلامی اصولوں پر ایک نئی سوسائٹی کی داغ بیل ڈالنے کے لئے ان دونوں میں اشتراک ہو گیا۔ چنانچہ جماعت اسلامی کی تشکیل کے بعد یہ دونوں اسلامی دعوت کے علمبردار بن کر میدان میں نکل گئے اور آج تک ساتھ ہیں۔ اور دم واپسیں تک ساتھ رہنے کا ارادہ ہے۔

مولانا اصلاحی متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ جماعت اسلامی کے لٹریچر میں ان کے قلم نے خاصا اضافہ کیا ہے۔ مولانا مودودی کے نائب کی حیثیت سے وہ جماعت اسلامی کی ساری سرگرمیوں میں شریک رہے ہیں۔ اور انہیں "جماعت اسلامی کی تلوار" کہا جاتا ہے۔

باطل پر چوٹ لگانے میں ان کے قلم و زبان نے کبھی مصلحت وقت کی پرواہ نہیں کی۔

مولانا تحریک اسلامی میں آنے سے پہلے بھی اس طبقہ سے کوئی راہ و رسم نہیں رکھتے تھے۔ جو انگریزی امپیریلزم کی دی ہوئی خیرات سے موٹا ہو رہا تھا۔ چاہے وہ سرکاری حکام کا طبقہ ہو یا والیان ریاست کا۔ اور نہ آج کے خان بہادروں اور مفاد پرستوں سے انہیں کوئی لگاؤ ہے۔ یہ سارے لوگ مولانا سے سخت گھبراتے ہیں۔ کھری کھری سنانے میں وہ اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے۔ بعض وقت یہ شدت رفقائے جماعت پر بھی نازل ہو جاتی ہے۔ وہ جرأت اور صاف گوئی کی متاع گرانمایہ سے پوری طرح بھرپور ہیں۔ عمر تقریباً ۶۴ سال ہو گی۔ صحت کمزور اور جسم دبلا پتلا ہے لیکن چہرے پر ابھی بڑھاپے کے آثار نمایاں نہیں ہیں۔

ان دنوں آپ لاہور سنٹرل جیل میں جرم شہادت حق کی سزا بھگت رہے ہیں۔

مولانا محمد عبد الجبّار غازی

کیتھل ضلع کرنال کے رہنے والے ہیں سنہ ۱۹۰۱ء میں کیتھل کے مشہور طبیب اور عالم دین مولوی عبد الغنی مرحوم کے گھر پیدا ہوئے۔ آپ ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس کے کئی بزرگ شاہ اسماعیل شہید اور سید احمد شہید رحمۃ اللہ کی تحریک میں شریک رہے اور عملی خدمات انجام دیں اور جماعت مجاہدین سے اس خاندان کے تعلقات اس وقت تک باقی رہے جب تک خود سرحد پار کی مرکزی جماعت میں انتشار پیدا نہیں ہو گیا۔

غازی صاحب نے پہلے گھر ہی پر عربی فارسی کی ابتدائی کتب پڑھیں اور فقہ و حدیث کے معمولی مسائل سے روشناس ہونے کے بعد گورنمنٹ مڈل اسکول کیتھل میں داخل ہوئے۔ قرآن و حدیث کی تعلیم گھر پر جاری رہی۔ غازی صاحب نے مڈل کا امتحان کیتھل سے اور میٹرک کا مسلم ہائی اسکول سے پاس کیا۔ اس کے بعد سنٹرل کالج پٹیالہ میں داخل ہو گئے۔

پہلے ان کا ارادہ انجینئر بننے کا تھا لیکن دوران تعلیم میں ہی انہوں نے محسوس کیا کہ وہ اپنے اندر تعلیم و تدریس کی زیادہ صلاحیتیں رکھتے تھے۔

بی۔ اے کی تعلیم کا زمانہ غازی صاحب کے لئے سخت آزمائش و ابتلاء کا زمانہ تھا۔ نئی نئی شادی ہوئی تھی کہ اہلیہ کا انتقال ہو گیا۔ پھر یکے دیگرے تین جوان بہنوں اور والد کے انتقال نے دماغی سکون چھین لیا۔ آپ کے اعصاب پر اتنا برا اثر پڑا کہ ایک سال امتحان بھی نہ دے سکے۔ چنانچہ بی۔ اے کی ڈگری غازی صاحب نے ۱۹۲۴ء میں حاصل کی۔ بعد ازاں سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی میں داخل ہو گئے اور فلسفہ کا مضمون لیکر ایم۔ اے کی تیاری شروع کی۔ ایم۔ اے کی ڈگری آپ نے ۱۹۲۶ء میں حاصل کی۔

تحریکِ اسلامی کے داعی

غازی صاحب کی پوری تعلیمی زندگی ایک ہونہار اور ذہین طالب علم کی زندگی تھی۔ احباب اور بعض اعزہ کو توقع تھی کہ آپ سرکاری ملازمت اختیار کرلیں تو ترقی کی راہیں کھل جائیں گی۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد بعض احباب نے پی۔ سی۔ ایس کے مقابلہ میں بیٹھنے کا مشورہ دیا۔ مولوی عبدالغنی مرحوم کے عزیز دوست ایک ممتاز عہدے پر فائز تھے۔ انھوں نے ہر ممکن امداد کا یقین بھی دلایا لیکن آپ اوّل تو یہ ارادہ کرچکے تھے کہ معلّم بنیں گے دوسرے آپ نے یہ تہیہ کرلیا تھا کہ گورنمنٹ کی ملازمت کبھی نہیں کریں گے چنانچہ آپ نے انکار کردیا۔

بعدازاں صوبہ دہلی کی طرف سے سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے بی۔ ٹی پاس کیا۔

بیاور اجمیر کے مسلمانوں نے مولانا محمد علی جوہر مرحوم کی یادگار میں ایک محمد علی میموریل ہائی اسکول قائم کیا تھا جبکہ حالات بہت ابتر ہوگئے تھے ڈاکٹر ذاکر حسین اور دوسرے اصحاب نے مجبور کیا کہ آپ ادارے کو بچائیں۔ غازی صاحب دوستوں کے اصرار سے مجبور ہو کر بیاور چلے گئے اور چار سال کے مختصر عرصے میں اس مدرسہ کو اتنی ترقی دی کہ وہ کرایہ کی عمارت سے نکل کر اپنی ایک نئی شاندار عمارت میں منتقل ہوگیا۔ اور دہلی و راجپوتانہ میں اس کے قابل عملہ اور بہتر تعلیمی نظام کے چرچے ہونے لگے۔

۱۹۳۸ء میں دہلی کے احباب نے غازی صاحب سے واپس چلے آنے کی درخواست کی اور آپ سینٹ اسٹیفنز ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر بنکر آگئے

۱۹۴۱ء میں آپ کا تبادلہ اینگلو عربک ہائی اسکول دریا گنج میں ہوگیا۔ پھر یہ ہائیر سیکنڈری اسکول بن گیا اور آپ ۱۹۴۵ء تک اس کے پرنسپل رہے۔

غازی صاحب نے بچپن میں جو تربیت حاصل کی تھی اور جس دینی ماحول میں آپ نے پرورش پائی تھی اس کا اثر کالج کے زہریلے ماحول میں بھی زائل نہ ہوسکا اور آپ کو ہمیشہ اپنی دینی ذمہ داریوں کا احساس رہا۔ یہی وجہ تھی کہ ۱۹۴۱ء میں جب مولانا مودودی نے جماعتِ اسلامی کی تشکیل کی دعوت دی تو آپ نے فوراً لبیک کہا اور سابقون الاولون میں شامل ہوگئے۔

موجودہ نظامِ تعلیم میں داخل ہونے کے تھوڑے ہی عرصے بعد غازی صاحب پر اس نظام کے نقائص آشکارا ہوگئے تھے۔ آپ تعلیم کے متعلق اپنے چند مخصوص نظریات رکھتے ہیں۔ چنانچہ آپ کو جس ادارے میں بھی کام کرنے کا موقع ملا آپ نے اس کے نظام کو اپنے نظریات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی لیکن چونکہ سرے سے بنیادیں ہی غلط تھیں اس لئے خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ جماعت اسلامی کا پروگرام سامنے آیا تو اپنی مرادیں پوری ہوتی دکھائی دیں۔ آپ نے اسلامی اصولوں کی بنیادوں پر اسلامی نظامِ تعلیم کی ترتیب و تدوین کا کام شروع کیا۔ ۱۹۴۵ء میں ملازمت چھوڑتے ہی جماعت کے مرکز دارالاسلام پٹھانکوٹ منتقل ہوگئے اور جماعت کے شعبۂ تعلیم کے ناظم بنائے گئے اور آپ نے ایک ابتدائی درسگاہ جاری کرنے کے منصوبے بنائے۔ لیکن جماعت کی مالی حالت اور بعض دوسری مجبوریوں نے ان منصوبوں کو جامۂ عمل پہنانے کی اجازت نہیں دی۔ ۱۹۴۶ء میں ارکانِ جماعت کی تربیت کے لئے ایک تربیت گاہ کھولی گئی جس کے ناظم غازی صاحب ہی تھے۔ پھر بہار کے فسادات کے زمانہ میں ریلیف کے کام کے لئے آپ کو پٹنہ بھیجا گیا اور تربیت گاہ بھی وہیں منتقل کردی گئی تقسیم ہند تک غازی صاحب پٹنہ ہی رہے۔

تشکیل پاکستان کے بعد جماعتِ اسلامی کے مرکز کو بھی مشرقی پنجاب سے ہجرت کرنی پڑی۔ لاہور آنے کے بعد کوئی ایسا نظام نہ ہوسکا کہ مرکز کے تمام ارکان یکجا رہ سکیں لہٰذا راولپنڈی میں مرکزی شاخ کا قیام عمل میں آیا اور مولانا امین احسن اصلاحی و غازی صاحب کو راولپنڈی بھیج دیا گیا۔ راولپنڈی میں شعبۂ تعلیم نے ازسرِنو کام شروع کیا اور اعلیٰ تعلیم کے ایک ادارے کا افتتاح بھی ہوا لیکن مالی بدحالی نے پھر رکاوٹ ڈالی اور مولانا مودودی و مولانا اصلاحی کی گرفتاری کے بعد تو حالات یکسر بدل گئے۔ اور غازی صاحب کو امیر جماعتِ اسلامی کی حیثیت سے لاہور میں مقیم رہنا پڑا۔

مولانا کی رہائی کے بعد آپ دوبارہ راولپنڈی منتقل ہوگئے۔ جہادِ کشمیر میں جب جماعت اسلامی نے عملی تعاون کے لئے ہاتھ بڑھایا تو غازی صاحب نے ہی جماعت کے نمائندے کی حیثیت سے آزاد کشمیر کے ذمہ دار حضرات سے گفتگو کی۔ ۱۹۵۱ء میں پنجاب کے انتخابات میں آپ ناظم انتخابات تھے اس دوران میں آپ نے بڑی تندہی سے کام انجام دیا اور راتوں کی نیندیں اور دن کا آرام حرام کرلیا۔ انتخابات کے بعد سے اب تک غازی صاحب

راولپنڈی میں آپ اسلامی خطوط پر تعلیمی منصوبہ بندی اور نصاب کی ترتیب کا کام کر رہے تھے کہ ۲۸ مارچ ۱۹۵۳ء کو حکومت نے اپنی مخصوص مصلحتوں کے تحت انہیں گرفتار کر لیا۔

آپ کی پوری زندگی تعمیری کاموں میں صرف ہوئی ہے۔ آپ کے کردار کی بنیادی خصوصیات یہ ہیں کہ آپ کسی کام کے کرنے کی ذمہ داری اٹھاتے ہیں تو پوری سرگرمی اور انہماک سے اس میں لگ جاتے ہیں حتیٰ کہ صحت کی ناسازگاری کا بھی خیال نہیں رکھتے۔ نظم و ضبط کے بہت پابند ہیں اور کسی خلاف نظم کام کو پسند نہیں کرتے۔

میاں طفیل محمد

طفیل محمد صاحب جو، لاہور سنٹرل جیل میں آج کل حکومت پاکستان کے مہمان ہیں۔ ریاست کپورتھلہ کے ایک متوسط زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جماعت اسلامی میں شریک ہونے سے پہلے وہ ایک وکیل تھے۔ لیکن تحریک اسلامی کی دعوت اور پیشہ وکالت کی حرمت نے انھیں پریکٹس چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ طفیل صاحب نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے کیا اور پھر لا کالج لاہور سے وکالت کا امتحان پاس کیا۔

طفیل صاحب اپنے علاقہ کے ایک مشہور و معروف وکیل اور اپنے اخلاق و کیرکٹر کی وجہ سے ایک محبوب شخصیت تھے۔ ان کی عمر مشکل سے ۳۸ سال ہو گی۔ وہ تحریک اسلامی کے ایک جانباز مجاہد اور پارٹی کے ایک ہونہار سپاہی ہیں۔ اپنی خداداد صلاحیتوں، جماعت کے ساتھ مومنانہ خلوص اور جماعتی سرگرمیوں میں غیر معمولی انہماک اور شوق نے انھیں مولانا مودودی کی قربت کا شرف بخشا ہے۔ تقریباً دس سال سے جماعت اسلامی پاکستان کے قیم کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

جماعتی حلقوں میں بھی وہ اس لحاظ سے واحد فرد ہیں کہ لوگ ان سے بے حد مانوس اور محبت کرتے ہیں۔ عموماً پوری جماعت انھیں "بھائی جان" کہہ کر پکارتی ہے۔ اور ہر شخص ان پہ جان چھڑکتا ہے۔ اور ان کے اس اخلاق نے جہاں ان کے کردار کو نکھار دیا، وہاں جماعت کی دعوت کو بھی بہت فائدہ پہنچایا ہے۔

طفیل صاحب بھی اور لیڈر ٹائپ قسم کے انسان کم اور مبلغ اور آرگنائزر زیادہ ہیں۔ ان میں مسائل کو سمجھنے اور حالات کا تجزیہ کرنے کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ وہ بہت خاموش مگر انتہائی لطیف مزاج کے انسان ہیں۔ ان میں بوڑھوں جیسا وقار بھی موجود ہے لیکن اس وقار میں خشونت اور عبوست نہیں ہے۔

مولانا مودودی کی رات دن کی صحبت نے ان کے علم و فکر میں نہایت ٹھوس اضافہ کیا ہے۔ اور خود وہ نہایت محنتی اور طالب علم قسم کے انسان ہیں اس لیے علم و فن کی گہرائیوں تک بہت جلد پہنچ جاتے ہیں۔ چنانچہ طفیل صاحب تحریک اسلامی میں جب آئے تو وہ زیادہ سے زیادہ قانونی علم سے واقف تھے۔ دینی علم انھوں نے جماعت اسلامی کی کتابوں میں پڑھا تھا۔ لیکن بہت جلد وہ اصل ماخذ تک پہنچ گئے۔

طفیل صاحب کی زندگی میں سادگی اور نفاست کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ نہایت سادہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن آرٹ سے خالی نہیں۔ پنجاب کی بہترین روایات کے حامل ہیں۔ پنجابی اور اردو دونوں زبانوں میں تحریر و تقریر پر قدرت رکھتے ہیں۔ لکھنے کا انداز بھی دعوتی ہے۔ وضاحت بیان کا خاص ملکہ ہے۔

ہمیں کیسا ادب مطلوب ہے

نعیم صدیقی

ہم ایک ایسی قوم ہیں جو اپنی پوری زندگی کی تعمیرِ نو کا کام شروع کر رہی ہے۔ ہم ایک زیرِ تعمیر ریاست اور ایک زیرِ تشکیل معاشرہ ہیں۔ اس حالت میں ہمارے سامنے جتنی اہمیت کے ساتھ یہ سوال آ گیا ہے کہ ہم اپنی سیاسی ہیئت، اپنے معاشی و اقتصادی نظام، اپنے قانون اور اپنی تعلیم کو کن مقاصد اور کن بنیادوں پر استوار کریں، اتنی ہی اہمیت کے ساتھ یہ مسئلہ بھی ہمارے سامنے ہونا چاہئے کہ ہم اپنے ادب، اپنے لٹریچر یا اپنے جہانِ فکر و تخیل اور اپنی دنیائے شعر و افسانہ کو کس نقشے پر تعمیر کریں۔ ادب اگر زندگی ہی کا ایک لازمہ ہے اور اگر وہ زندگی کے ہنگاموں میں کوئی بڑا پارٹ ادا کرنے والی طاقت ہے، اور اگر وہ معاشرہ کو متاثر کرتا ہے تو یہ حماقت ہوگی کہ ہم اپنے ادب کی تعمیر کے لئے اسی طرح کاوش نہ کریں جس طرح ہم سیاسی اور معاشی نظم کے بارے میں فکر کرتے ہیں۔

ادب کا پارٹ زندگی میں!

سوال یہ ہے کہ ادب ہماری زندگی، تہذیبی و سماجی زندگی میں کیا پارٹ ادا کرتا ہے؟ زندگی کو ادب کی ضرورت کیا ہے؟ ادب کس تقاضے کو پورا کرنے کے لئے وجود میں آیا ہے؟ آیا ادب کسی قوم کی دولت میں اضافہ کرتا ہے؟ اس کی دماغی قوت کو بڑھاتا ہے؟ اس کے بین الاقوامی وقار کو مضبوط کرتا ہے؟ ——— وہ کیا کرتا ہے؟

وہ ان سب خدمات سے بڑی ایک خدمت انجام دیتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسانی زندگی میں جتنی مختلف طاقتیں پائی جاتی ہیں، اُن میں سب سے بڑی اور زوردار طاقت خیال کی طاقت ہے۔ خیالات ہی قوموں کا اصل سرمایۂ حیات ہوتے ہیں۔ خیالات کے سوتے اگر جاری رہیں تو زندگی پیہم ارتقا کرتی چلی جاتی ہے۔ خیالات جب مر جاتے ہیں تو ساری زندگی جذام میں مبتلا ہو جاتی ہے اور خیالات جب جمود پذیر ہو جاتے ہیں تو زندگی پر فالج گر جاتا ہے۔ خیالات میں جب کوئی قوم مفلس ہو جاتی ہے تو اسے معاشی خزانے پھر خوش حال نہیں بنا سکتے اور خیالات کے محاذ پر جس معاشرے نے شکست کھائی ہو اسے پھر عساکر اور اسلحہ فاتح نہیں بنا سکتے، اور جو ملک افلاسِ تخیل کی وجہ سے دوسروں سے افکار کی بھیک مانگنے پر اتر آئے، پھر کسی بازار سے اسے حقیقی استقلال خرید کر نہیں دیا جا سکتا۔

دنیا میں انسان نے جتنی تمدن گری کی ہے، جتنی ایجادات کی ہیں، جتنی سیاسی تنظیمیں پیدا کی ہیں، پیداآوری کے جتنے اسباب فراہم کئے ہیں، ترقی کے جو ذرائع و وسائل حاصل کئے ہیں، جتنی جنگیں لڑی ہیں، جتنے انقلاب اٹھائے ہیں۔ اُن کے پیچھے خیال ہی تھا جو شعبدے دکھاتا رہا ہے۔ ہندوستان اور چین میں، مصر اور دمشق میں، بابل اور نینوا میں، ایران اور عرب میں، یونان اور روما میں۔ اور آج یورپ اور امریکہ اور روس میں "انسانی تہذیب" نے جو جو بھی قدم جادۂ ارتقاء پہ بڑھایا ہے، خیال ہی کی ڈان میں بڑھایا ہے۔ جب ایک ترقی کرتی ہوئی قوم کے خیالات کی قوت جواب دے دیتی ہیں تو آگے بڑھتے بڑھتے رک جاتی ہے، اس پر بڑھاپا طاری ہو جاتا ہے اور بالآخر اس کی تہذیبی موت واقع ہو جاتی ہے، اور اسی طرح جب ایک مردہ قوم کے اندر خیال کروٹ لیتا ہے اور اس میں بالیدگی آنے لگتی ہے تو وہ قوم معاً پچھلی صفوں سے اٹھ کر آگے آ جاتی ہے، وہ قبر سے

نکلتی ہے اور کشمکش ارتقاء کے وشکل میں نظر آتی ہے۔ ہماری پوری تاریخ درحقیقت ہمارے خیالات کی بنائی ہوئی ہے۔

ادب خیال انگیز اور خیالات افروز قوت ہے۔ وہ معاشرے کی کھیتی میں خیالات کے بیج ڈالتا ہے اور پھر ان کی آبیاری کرتا ہے وہ خیال کے جمود کو توڑتا ہے اور حرکت پیدا کرتا ہے۔ وحی الٰہی کے بعد اگر کوئی دوسرا ذریعہ انسانیت کو خیالات سے مالا مال رکھنے کا ہے تو وہ ادب ہے۔ ادب خیالات کو ابھارتا ہے' اچھے خیالات کو بھی ابھارتا ہے' بُرے خیالات کو بھی ابھارتا ہے، وہ پرانے خیالات کو بھی زندہ رکھتا ہے اور نئے خیالات کو بھی زندہ رکھتا ہے اور نئے خیالات کی تخلیق بھی کرتا ہے' پھر وہ متضاد خیالات کو لڑاتا ہے' ان میں ٹکراؤ پیدا کرتا ہے اور ان کو زندگی پر اثر انداز ہونے والی قوت میں بدلتا ہے

ادب کا دوسرا کام انسانی جذبات کو متحرک کرنا ہے۔ ہمارے جذبات ہماری اجتماعی زندگی میں وہی پارٹ ادا کرتے ہیں جو مشینری کے لئے اسٹیم اور برقی قوت کا ہے۔ یہ ہماری ساری سرگرمیوں کے اندر قوتِ محرکہ (MOTIVE FORCE) کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ جس معاشرے کے افراد کے جذبات میں جمود آجائے اس کے حوصلوں پر اوس پڑ جاتی ہے' جذبات اگر سرد پڑ جائیں تو پھر زندگی کے خون کو گرم کرنے والی اور کوئی طاقت نہیں ہے۔ ایک قوم جذبات کی ضرورت مند جتنی کہ میدانِ جنگ میں ہوتی ہے اتنی ہی اپنی اسمبلیوں' دفتروں' کارخانوں' کھیتوں اور منڈیوں میں بھی ہوتی ہے۔ کوئی قربانی اگر ایک معاشرہ افراد سے لے سکتا ہے' کوئی ڈسپلن اگر وہ ان پر عائد کر سکتا ہے' کوئی تعاون اگر ان سے وہ حاصل کر سکتا ہے۔ کوئی اپیل اگر ان کے لئے مؤثر بنا سکتا ہے تو محض اچھے جذبات کی موجودگی میں بنا سکتا ہے۔ جس قوم کے جذبات میں پستی آگئی ہو' اس کے افراد کو دشمن کی گولیوں کے سامنے کھڑا کرنا تو کجا' ان کو کسی بھیڑ بھڑکے کی جگہ پر لگانے پر بھی آمادہ نہیں کیا جا سکتا۔

اور ادب جذبات کو تحریک دلانے میں اوّل درجے کی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ انسانی جذبات کو حسّاس بناتا ہے' ان میں اکساہٹ پیدا کرتا ہے اور ان کے لئے ظہور کے راستے بناتا ہے۔ بے جا نہ ہو گا اگر یہ کہا جائے کہ ادب کا مزاج استدلالی نہیں' جذباتی ہوتا ہے اس کا خمیر ہی جذباتیت سے اٹھتا ہے۔ اسے اگر استدلال بھی کرنا ہوتا ہے تو وہ جذبات ہی کے پیرائے میں کرتا ہے۔ چنانچہ غیر حساس اور غیر جذباتی لوگ کبھی ادیب نہیں بن سکے۔ ادب کی دنیا میں داخلہ کا پاسپورٹ ہی فطرت اس شخص کو دیتی ہے جو حساس جذبات سے آراستہ ہو۔ ادیب اور ادب کا بنیادی فرض یہ ہے کہ وہ انسانیت کو جذبہ ہائے بلند سے مالا مال کرے

تیسرا کام جو زندگی کے لئے ادب کرتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ اس کی شاہراہِ ارتقاء کے دونوں کناروں پر اخلاقی قدروں کے چراغ روشن کرتا ہے۔ اخلاقی قدروں کے یہ چراغ اگر کسی معاشرہ میں گُل ہو جائیں تو پھر سارے آسمانی چاند سورج اور ستارے مل کر بھی دل و دماغ کی ظلمتوں کا ازالہ نہیں کر سکتے۔ انسان کی اجتماعی زندگی کا ایوان آفتاب و ماہتاب کی شعاعوں سے روشن نہیں ہوتا بلکہ وہ اعلیٰ اخلاقی قدروں سے روشن ہوتا ہے اخلاقی قدریں زندگی کے حق میں ایمون پیدا کرنے والے غدود کی حیثیت سے کام کرتی ہیں۔ یہ غدود اگر ناکارہ ہو جائیں تو پھر زندگی کی ساری ہما ہمی ختم ہو جاتی ہے یہ اخلاقی قدریں سماج کیلئے گویا زندگی افروز جبلتیں ہیں

وہ ادب ہی ہے جو اخلاقی قدروں کے چراغ جلاتا ہے اور ان چراغوں میں ہزاروں ادیب اپنے اپنے قطرہ ہائے خونِ جگر نچوڑتے رہتے ہیں' تاکہ ان چراغوں کو جلتا رکھیں۔

اب یہ واضح ہو گیا ہے کہ ادب انسانی خیالات' جذبات' اور اخلاقی قدروں کو زندہ رکھنے اور بنانے اور بگاڑنے والی عظیم الشان طاقت ہے۔

کیا ایسی طاقت کو بغیر کسی منصوبے کے اس کے حال پر چھوڑا جا سکتا ہے کہ وہ جیسے چاہے ارتقا کرے اور جو شکل چاہے اختیار کر لے جائے۔ یقیناً نہیں! کیونکہ ادب خیالات' جذبات اور اخلاقی قدروں کے بنانے میں جتنا بڑا پارٹ ادا کر سکتا ہے' اتنا ہی بڑا پارٹ

وہ ان کو تباہ کرنے میں بھی ادا کر سکتا ہے۔ لہٰذا ایک زندہ اور حساس قوم کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ اپنے ادب کے بارے میں سوچے۔ اس کے لئے کوئی منصوبۂ تعمیر پیشِ نظر رکھے اور اس کے لئے سمت ارتقا تجویز کرے۔

کسی ادب کی قدر و قیمت کا اصل پیمانہ ہی یہ ہے کہ وہ کس قدر خیال آفریں ہے، وہ افکار کو کتنی بالیدگی دیتا ہے، وہ تخیل کے لئے کس درجہ محرک بنتا ہے ——— اور پھر وہ اعلیٰ اور پاکیزہ انسانی جذبات کو کتنی شدت سے متحرک کرتا ہے، اور انسانیت کی بنیادی اخلاقی قدروں کی آبیاری کا فن ادا کرتا ہے یا نہیں!

ادب کی تین شاہراہیں

اگر ہم دنیا بھر کے سرمایۂ ادب کو زمان و مکاں کی لکیروں سے قطع نظر کر کے سامنے رکھیں تو ہم اس کا ایک طائرانہ جائزہ لیتے ہوئے دیکھتے ہیں کہ تین بڑی شاہراہیں ہیں جن پر انسانی ادب کے قافلے حرکت کرتے نظر آتے ہیں۔ ان شاہراہوں کے ساتھ کچھ پگڈنڈیاں بھی ہیں، لیکن وہ کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتیں۔ بنیادی طور پر ادب کے اسکول تین ہی ہیں:

ایک اسکول لذّتیت کا اسکول ہے۔ یہ خیالات سے کھیلتا ہے، یہ جذبات انسانی کو ذریعہ تفریح بناتا ہے۔ یہ رومانس کے غبارے اُڑا اُڑا کر تفریح کا سامان پیدا کرتا ہے، یہ جمالیت کا پرستار ہے، اس کو زندگی کے صلاح و فساد سے کوئی واسطہ نہیں، اس کو خیر و شر کی کشمکش سے کوئی دلچسپی نہیں بلکہ الٹا وہ اسی کشمکش سے انسان کو فرار سکھاتا ہے اور اس کے لئے خیالات کا ایک قہوہ خانہ، جذبات کا ایک سرکس اور شعر و افسانہ کا ایک کلب مہیا کرتا ہے جہاں لوگ زندگی سے بھاگ کر تھوڑی دیر تصورِ جاناں کئے بیٹھے رہتے ہیں۔ لذتیت پسند ادب ایک مداری کی طرح طرح طرح کے شعبدے دکھا کر تماشائیوں کے دل بہلاتا ہے۔

ادب کے اس اسکول نے نوعِ انسانی کے لئے ذہنی افیون کے بہم پہنچانے کی خدمت انجام دی ہے۔

دوسرا اسکول زندگی کی مصوّری کا اسکول ہے۔ اس اسکول کے نزدیک ادیب کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ وہ زندگی کو جوں کا توں لوگوں کے سامنے پیش کر دے اور اصلاح و تغیر کا علمبردار بننے اور معاشرے کو کوئی رہنمائی دینے کی ذمہ داری قبول نہ کرے۔ اس کا فن ایک کیمرہ ہونا چاہئے جو زندگی کی تصاویر ہر پہلو سے لے لے کر انسان کے سامنے رکھتا جائے، پھر یہ کام خود انسان کا کام ہے کہ ان تصاویر کو دیکھ کر وہ کوئی رائے قائم کرے، غلط اور صحیح کا احساس کرے اور کسی تغیر کا ارادہ کرے۔

ادب کا یہ اسکول زندگی کے سامنے ایک آئینہ رکھ دینے سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکا!

تیسرا اسکول مقصدی ادب کا ہے، جسے ہم تعمیری ادب بھی کہہ سکتے ہیں اور انقلابی ادب بھی!

اس کا طریقِ کار یہ ہے کہ ادب میں زندگی کی عکاسی اس طرح کی جانی چاہئے کہ جو کچھ "ہے" وہ سامنے آ کر خود ہی اشارہ کر دے کہ "ہونا کیا چاہئے" دوسرے لفظوں میں وہ "حاضر" کے کمزور پہلوؤں کو نمایاں کرتا جائے اور "مطلوب" کی طرف رہنمائی دے، وہ "غلط" کا غلط ہونا بھی دکھا دے اور اس کے ذریعے "صحیح" کی طرف متوجہ بھی کر دے۔

صرف ایسا ہی ادب زندگی کے سفرِ ارتقاء کا جرس بن سکتا ہے اور اس میں چونکہ ادیب کے سامنے کچھ اصول و مقاصد ہوتے ہیں کچھ معیار اور پیمانے ہوتے ہیں، اس لئے ہم اسے مقصدی ادب قرار دیتے ہیں۔ مقصدی ادب زندگی کی انگلی تھام کر چلتا ہے اور اسے سیدھا منزلِ ترقی کی طرف لئے ہوئے آگے بڑھتا ہے۔

ہماری ضرورت نہ لذتیت پسند اسکول سے پوری ہوتی ہے، نہ فوٹوگرافر اسکول سے، بلکہ ہمیں اپنے آپ کو بنانے کے لئے مقصد

ادب کی ضرورت ہے!

مقصدی ادب کا ایک لازمہ

مقصدی ادب کوئی بھی ہو، اپنے پیچھے ایک آئیڈیالوجی رکھتا ہے، زندگی کا ایک مستقل نظریہ، انسان کا ایک تصور، تاریخ کا ایک فلسفہ اور خیر و شر کا ایک پیمانہ وہ اپنے ماخذ رکھتا ہے۔ درحقیقت وہ آئیڈیالوجی ہی اسے مقصدی ادب بناتی ہے۔ بغیر ایک خاص آئیڈیالوجی کے کبھی کوئی مقصدی ادب پایا نہیں گیا۔

اب اگر ہم یہ چاہیں کہ ہمارا ادب مقصدی ادب ہو تو ہمیں اس بات کا بھی فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ نظریہ حیات کونسا ہو گا جس پر ہم اپنے ادب کو استوار کریں۔

بنیادی طور پر نظریات دو ہی ہیں جو ہماری دنیائے خیال پر حکمراں رہے ہیں اور جن کے سانچے میں تمدن و سیاست کے اصول ڈھلتے رہے ہیں۔

ایک نظریہ یہ ہے کہ ہمارے گرد پھیلی ہوئی کائنات اپنے پیچھے کوئی ارادہ، کوئی شعور، کوئی منصوبہ اور کوئی اقتدار نہیں رکھتی، یہ کائنات مادّے کا ایک ظہور ہے اور اس میں جو کچھ ہو رہا ہے ایک حادثے کے طور پر ہو رہا ہے۔ یہاں زندگی بھی مادّے کے ایک تقاضے کی حیثیت سے خود بخود نمودار ہو گئی ہے۔ اس زندگی نے جس طرح اور بہت سے پیکر اختیار کئے ہیں۔ ایک پیکر وہ بھی اختیار کر لیا ہے جس نے انسان کا نام پایا۔ انسان کا مقصدِ زندگی اپنی خواہشات کی تکمیل سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

دوسرا نظریہ ہے کہ کائنات ایک ارادے اور ایک شعور کا کرشمہ ہے۔ اس کے پیچھے ایک حکمت اور ایک منصوبہ کام کر رہا ہے۔ یہ اپنے رب اور اپنے الٰہ کے اقتدار میں کسی ہوئی، منظم طریق سے ارتقاء کر رہی ہے۔ زندگی ایک شرارہ ہے جو اس کائنات کے رب اور الٰہ کی طرف سے جب مادّے کو ودیعت کیا جاتا ہے تو اس میں ایسی صلاحیتیں ابھر آتی ہیں جو مادے کے اپنے خواص نہیں ہیں۔ انسان محض ایک ترقی یافتہ حیوان نہیں ہے بلکہ اس پر اخلاقی حق اور خیر و شر کی تمیز کا القاء کر کے اسے اس کے خالق نے اپنی خلافت و نیابت کے لئے مامور کر دیا ہے۔ اب اس کا مقصدِ وجود ربِّ کائنات اور ربِّ الناس کی رضا کے مطابق زندگی کی تعمیر کرتا ہے، اور یہ اس کے لئے پوری طرح ذمہ دار اور جوابدہ ہے۔

پہلا نظریہ الحاد کا نظریہ ہے کہ جس کی بنیادوں پر آج کا پورا دورِ تہذیب تعمیر کیا گیا ہے اور دنیا بھر کے ادب کی رگوں میں یہی نظریہ سرایت کئے ہوئے ہے۔ لیکن جس طرح اس نظریہ پر کھڑی ہونے والی تہذیب دنیا کے لئے موجب فساد بنی ہوئی ہے۔ اس طرح نظریئے کا حامل ادب بھی انسانی خیالات و جذبات کے بگاڑ اور اخلاقی قدروں کی تباہی کا ذریعہ بن کر کام کر رہا ہے۔

دوسرا نظریہ اسلام کا نظریہ ہے، اور آج یہ نظریہ اگر ہماری انفرادی زندگیوں سے آگے نکل کر ایک سماجی ہیئت اور ایک ریاستی نظام کی بنیاد بننے والا ہے تو ناگزیر ہے کہ یہی نظریہ ہمارے آئندہ ادب کی رگوں کا خون بھی بنے۔

یہ واضح رہے ایک نظریۂ حیات کو ادب کی بنیاد بنانے کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ ادیب اس پر وعظ کہیں۔ بلکہ مدعا یہ ہوتا ہے کہ زندگی کو دیکھنے اور دکھانے کے لئے ان کا نقطۂ نظر ایسا ہوگا جو اس نظریہ حیات کا قدرتی لازمہ ہو۔

اسلامی نظریۂ حیات جہاں ہمارے "حال" کے لئے زندگی افروز نظریہ ہے، وہاں یہ ہمیں اپنے زریں ماضی سے وابستہ رکھ کر ہمیں ایک روشن مستقبل سے مالا مال کر سکتا ہے۔

ہماری تہذیبی قدریں

دنیا کا ہر ادب اپنا چمن کچھ خاص تہذیبی قدروں کے گرد بناتا ہے۔ اور یہ تہذیبی قدریں لازماً اس نظریۂ حیات کے مطابق ہونی چاہئیں جن کو کسی ادب کے فن کار اپنا زاویۂ نظر بنا کر سوچتے ہوں۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ نظریۂ حیات کسی اور طرح کا ہو، اور ادب تہذیبی قدریں کسی اور طرح کی اختیار کر لے۔ اب اگر ہم اپنے مطلوبہ ادب کے لئے اسلامی نظریہ حیات کو بنیاد بنائیں تو ناگزیر ہے کہ ہم تہذیبی قدریں بھی اسی کے مزاج کے مطابق اختیار کریں۔

اب میں بتانا چاہتا ہوں کہ اسلامی تہذیب کی بنیادی قدریں کیا ہیں جن کو ہمارے مطلوبہ ادب میں جذب ہونا چاہئے۔

۱۔ اسلامی تہذیب کی اولین قدر "توحید" ہے۔ یعنی یہ شعور کہ انسانیت کے لئے معبود، حاکم، قانون ساز اور سرچشمۂ ہدایت صرف ایک ہے۔ وہی مقتدرِ اعلیٰ ہے، وہی ایک ہے جس کے سامنے جھکا جا سکتا ہے۔ اس ایک حقیقت کو ماننے سے یہ خود بخود لازم آ جاتا ہے کہ انسان اور ہر الٰہ کی غلامی، عبدیت اور اطاعت سے آزاد ہو جائے۔

اسلام "ایک خدا" کو اس طرح منواتا ہے کہ ہر دوسری خدائی سے، چاہے وہ کسی ایک فرد کی خدائی ہو، یا ایک خاندان اور طبقے کی، وہ بادشاہت کی خدائی ہو یا جمہورِ قوم کی، وہ مذہبی خدائی ہو یا معاشی یا سیاسی، آدمی آزاد ہو جاتا ہے۔

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات!

یہاں نظریۂ توحید ایک کلامی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ یہ ایک عمرانی و تمدنی مسلک ہے۔ اس سے انسان پر حقیقی اور مکمل آزادی کے دروازے کھلتے ہیں۔ اس لئے یہ ہمارے نظامِ زندگی کی بنیادی تہذیبی قدر ہے۔ اسلامی معاشرے میں پروان چڑھنے والے ادب کا فرض یہ ہے کہ وہ انسان پر اس حقیقی آزادی کے دروازے کھولے جو صرف توحید کی کنجی سے کھلتے ہیں۔

۲۔ اسلامی تہذیب کی دوسری قدر وحدتِ انسانی ہے۔ انسان اور انسان کے درمیان امتیاز کی جتنی لکیریں بھی آج تک کھینچی گئی ہیں، وہ وطنیت کی ہوں یا نسلیت کی، قومیت کی ہوں یا طبقات کی، اُن سب کو اسلامی نظریۂ حیات توڑ دیتا ہے۔ تمام مصنوعی تقسیموں کو اسلام جاہلی عصبیتیں قرار دیتا ہے اور ان کے خلاف لڑتا ہے۔ اس کے نزدیک اگر کوئی تقسیم قابلِ تسلیم ہے تو وہ حق اور باطل کی تقسیم ہے۔ وہ ایک اخلاقی تقسیم کے سوا اور کسی کا روادار نہیں۔ بس ہمیں جو ادب مطلوب ہے وہ ایسا ہونا چاہئے کہ انسان کو تمام مصنوعی تقسیموں اور تفریقوں سے آزاد کر دے۔

۳۔ اسلامی تہذیب کی تیسری قدر یہ ہے کہ وہ فرد کو زندگی کی ایک اکائی کی حیثیت سے پورے احترام کا مستحق سمجھتی ہے۔ اور وہ سماج کو ایک ایسے نقشے پر اٹھاتی ہے کہ جس میں فرد اپنی صلاحیتوں کو بہتر طریق پر پوری پوری نشوونما دے سکے اور اس نشوونما میں کوئی چیز اس کے لئے رکاوٹ بننے والی نہ ہو۔ چنانچہ وہ فرد پر جتنی پابندیاں بھی عائد کرتی ہے، اسی لئے کرتی ہے کہ دوسرے افراد کی صحیح نشوونما میں رکاوٹیں پیدا کرنے والے عوامل ظہور نہ کر سکیں۔ اسلام نے فرد کو معاشرے کا ایک بے جان پرزہ بنا کے نہیں چھوڑ دیا ہے، بلکہ اُس کو حساس، ذی ارادہ اور خودی سے آراستہ وجود کی حیثیت سے لیا ہے۔

ہمارے لئے سازگار ادب وہی ہو سکتا ہے جو فرد کی اُس حیثیت کا احساس رکھتا ہو جو اسلام نے اسے دی ہے۔

۴۔ ایک تہذیب کی نوعیت کا دار و مدار جن چیزوں پر ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ عورت کو اپنے نظام میں کیا مقام دیتی ہے

دنیا میں جس تہذیب نے عورت کو اُس کے صحیح مقام سے آگے یا پیچھے ہٹا دیا ہے وہ فساد سے کبھی نہیں بچ سکی۔ چنانچہ قدیم عہد کی وہ تہذیبیں جنہوں نے عورت کو انسانیت کے مرتبے سے گرا کر بھیڑ بکریوں میں بدل دیا تھا جس طرح وہ مفاسد سے بھر گئی تھیں۔ اسی طرح وہ جدید تہذیبیں بھی فتنہ میں مبتلا ہو گئی ہیں جنہوں نے عورت کو وقار سے ہٹا کر اور گھر سے نکال کر مرد کی ہوس کا کھلونا بنا دیا ہے۔

بخلاف اس کے ہماری تہذیب کی قدروں میں سے ایک اہم قدر نسائیت کو اُس کے فطری مقام عدل پر رکھنا ہے۔ اسلام میں عورت کو گھر کی سلطنت کا انچارج اور نئی نسلوں کے چمن زاروں کا باغبان بنایا گیا ہے۔ یہاں اسے انسان گری کے آرٹ کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔
ہمارا مستقبل کا ادب وہی ہو سکتا ہے کہ جو عورت کو ٹھیک اس مقام پر رکھے جس پر فطرت نے اسے رکھا ہے۔ آج جو ادب عورت کو سامان تفریح بنا بنا کر شعر و افسانہ میں لا رہا ہے ہمارا معاشرہ اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

یہ ہیں ہماری بنیادی تہذیبی قدریں کہ جن سے بے نیاز ہو کر ارتقاء کرنے والا ادب ہمارا ادب نہیں ہو سکتا اور ایسا ادب ایک اسلامی سماج کی آبیاری میں کوئی حصہ نہیں لے سکتا۔ ہمیں کل کے ادب کا چمن ان بنیادی قدروں کے گرد بنانا ہے۔

۵۔ ہماری تہذیب کی پانچویں بنیادی قدر حق کے احترام اور ظلم کے استیصال کا جذبہ ہے۔ ہر انسان دوسرے کے مقابلے میں کچھ فطری حقوق رکھتا ہے۔ اس کی زندگی محترم ہے، اس کی آبرو محترم ہے، اس کی ملکیت کا حق محترم ہے اس کا احساس خودی محترم ہے وہ اس کا حقدار ہے کہ دوسروں کے ساتھ حقوق میں بھی اور فرائض میں بھی برابر سرابر کے مقام پر رہے۔ معاشرے پر اس کے دل و دماغ کے حقوق بھی واجب آتے ہیں اور اس کے پیٹ کے حقوق بھی، اُس کا من بھی کچھ تقاضے رکھتا ہے اور اس کا تن بھی۔
——— اور جب تک ان حقوق اور تقاضوں کا احترام معاشرے میں برقرار رہتا ہے، تہذیب ترقی کرتی ہے، امن پائیدار بنیادوں پر قائم رہتا ہے، انصاف فضا پر چھا جاتا ہے، مسرت و اطمینان کی کرنیں چاروں طرف نور بکھیرتی ہیں اور زندگی اپنے معیار اور اپنے توازن پر برقرار رہتی ہے۔
لیکن جب سماج کا کوئی قوی عنصر انسان کے کسی حق پر چھاپہ مارتا ہے، دولت کی قوت سے چھاپہ مارتا ہے، سیاسی سازش سے چھاپا مارتا ہے، قانون سازی کے راستے چھاپا مارتا ہے تو سماج کا توازن درہم برہم ہو جاتا ہے۔ فرائض کا زیادہ سے زیادہ بار کمزوروں پر ڈال دیا جاتا ہے اور حقوق ان سے اُچک لئے جاتے ہیں، پھول طاقت کے وسیع دامن میں چلے جاتے ہیں اور کانٹے کمزوری کی تقدیر میں لکھ دئے جاتے ہیں، عوام پستے ہیں اور خواص کاٹتے ہیں، کچھ اونچے بن کے بیٹھتے ہیں اور کچھ کو نیچ بنا دیا جاتا ہے ——— زندگی کے محدود گوشوں میں بھی اور ہمہ گیر دائروں میں بھی!
اس حالت کا نام ظلم ہے۔ ظلم احترام حقوق کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ ظلم مساوات کی جڑ کاٹ دیتا ہے، ظلم انصاف کی بنیادیں ڈھا دیتا ہے، ظلم امن کی جنتوں کو کھنڈروں میں بدل کے رکھ دیتا ہے۔ اس ظلم کی روک تھام کے لئے خدائے برتر کے انبیا نے انسانی حقوق کو متعین کیا ہے اور سماج اور ریاست اور ہر فرد کا فرض قرار دیا ہے کہ وہ ان حقوق کی نگہبانی کریں۔ ہر انسان کا یہ فطری فریضہ ہے کہ ظلم کے خلاف وہ ساری عمر جنگ آزما رہے تمدن کی قلعہ کے دروازے پہ کھڑا ہو کر شر کی یورش کے آگے سینہ سپر رہے۔
اگر کوئی ادب اس تہذیبی تصور کو زندہ و بیدار نہیں رکھتا تو اگر ادب ایک ایک انسانی حق کی پاسبانی اور ظلم کی ایک ایک شکل کی مدافعت کا جذبہ بیدار نہیں کرتا تو ایسا ادب ہمارے کام کا نہیں ہے۔ ایسے ادبیات ہماری تہذیب کی ضروریات پوری نہیں کرتیں، ایسا ادب جامعہ اجتماعی مزاج سے میل نہیں رکھتا، ایسا ادب ہمارے مستقبل کی تعمیر میں حصہ لینے کے قابل نہیں ہو سکتا۔

ہمیں کیسا ادب مطلوب ہے

ہمیں وہ ادب مطلوب ہے جو قدیم اور جدید کی بحثوں میں پڑنے کے بجائے حق اور ظلم میں تفریق کرنے والا ہو' جو حق کی علمبرداری کا ولولہ دے سکے اور جو ظلم کے استیصال کی اسپرٹ سے روحِ انسانی کو مالا مال کرے۔ جو زندگی کا تجزیہ کرکے محدود گوشوں میں بھی ظلم کو اپنی سرچ لائٹ کے ذریعے اجاگر کردے اور وسیع اجتماعی فضاؤں میں بھی ظلم کے ہر پارٹ کی حقیقت واضح کردے۔ جو سیاسی ظلم کو بھی نمایاں کرے' معاشی ظلم کو بے نقاب کرے اور معاشرتی ظلم کو بھی انسان کی نگاہوں پر فاش کردے ——— اور پھر ظلم کے خلاف معرکہ لڑنے کے لئے جذبۂ تغیر کو اکسائے۔

انسانیت کا اصل خادم ادب وہی ہے جو انسان کو ظالم قوتوں کے سامنے تن جانے کا درس دیتا ہے اور جو ظلم کے خلاف روحِ بغاوت کو بیدار کرتا ہے۔

ہم ایسے ادب کے ضرورت مند ہیں!

جوہرِ محرک

اجتماعی زندگی بغیر اس کے ترقی پذیر نہیں رہ سکتی کہ اس کے اندر جو جوہرِ محرک کام کر رہا ہو جو اس کی روحِ عمل کو اُکساتا رہے اور مقصدی ادب اس جوہرِ محرک کو زندہ و بیدار رکھتا ہے۔ یہی جوہرِ محرک ہوتا ہے۔ جو انسان کے اندر سے تخلیقی صلاحیتوں کو اُبھارتا ہے' یہ کشمکشِ حیات میں خون کو گرم رکھنے کا وسیلہ بنتا ہے اور تاریخ کے بڑے بڑے معرکے اسی کے بل پر لڑے جاتے ہیں۔ جس ادب میں یہ جوہرِ محرک موجود نہیں ہوتا وہ ایک افیون ہوتا ہے۔ وہ ایک سحر ہوتا ہے' وہ ایک قصۂ خواب آور ہوتا ہے۔ جس سے زندگی کا خون گرمی حاصل نہیں کر سکتا' لیکن جس ادب میں جوہرِ محرک کار فرما ہوتا ہے وہ یا تو نغمۂ جبرائیل ہوتا ہے یا بانگِ اسرافیل!

جوہرِ محرک کے طور پر تاریخِ انسانی میں کہیں قوم پرستی کو استعمال کیا گیا ہے' کہیں حُبِّ وطن کو' کہیں نسلی برتری کے احساس کو۔

لیکن ان کے مقابلے میں ایک اور جوہرِ محرک ایسا بھی ہے جو ان سب سے زیادہ مؤثر بھی ہے اور ان سب سے زیادہ حقی بھی! وہ ہے کسی مقدس فرض پر مامور ہونے کا احساس و شعور!

یعنی جس معاشرے کے اندر اور جس ادب کے اندر یہ حس موجود ہو کہ ان کی زندگی مقدس فرض ہے' اس کا ایک اونچا نصب العین ہے تو یہ احساس و شعور انتہائی زوردار جوہرِ محرک ثابت ہوتا ہے۔

ٹھیک یہی جوہرِ محرک ہے جو اسلام اپنے معاشرے کے لئے اور اس کی ادبی تخلیقات کے لئے بہم پہنچاتا ہے۔ وہ اپنے ماننے والوں میں یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ:-

ہم ایک ایسے نظامِ زندگی کے علمبردار ہیں جو پوری انسانیت کے لئے ذریعہ فلاح ہے۔

ہم دنیا میں ظلم' بدی اور جھوٹ کی طاقتوں کے خلاف ہر محاذ پر لڑنے والے سپاہی ہیں۔

ہم انسانیت کے جوہرِ فکر و عمل کے محافظ ہیں۔

ہم اپنے فریضۂ حیات پر اپنے رب اور اپنے الٰہ کی طرف سے مامور ہیں' ہم خُدا کے نقیب اور اس کے ایجنٹ اور نمائندے ہیں۔ اس احساس سے زیادہ معقول اور اس سے زیادہ زوردار جوہرِ محرک تاریخِ انسانی میں اور کوئی نہیں پایا جاتا۔

ہمارا مستقبل کا ادب وہی ہوگا جو اس جوہرِ محرک سے مالا مال ہو اور پورے معاشرے کو اس سے مالا مال کرے۔

بقیہ حصہ بر صفحہ ۴۰

دھارے کے خلاف

نعیم صدیقی

وہ ریلوے ملازم تھا۔ پہلے چند سال گڈس کلرک رہا۔ پاکستان بننے کے بعد ایک چھوٹے سے اسٹیشن کا اسٹیشن ماسٹر بن گیا۔ آدمی کچھ جنونی تھا، یعنی تمام ساتھی رشوت لیتے تھے اور وہ بے وقوف اپنے آزاد پاکستان میں بھی رشوت لینے پر تیار نہ تھا، حالانکہ اب نہ ہندو کی رقابت کا سوال تھا، نہ انگریز کے سامنے جوابدہی کا! اپنا ملک، اپنی قوم، اپنے بھائی، اپنی گاڑیاں، اپنے دفتر اور اپنا روپیہ۔ لوگوں نے اسے عقل مند بنانے کی بڑی کوششیں کیں مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ آخر "ناصح" کب کسی سرپھرے عاشق کو راہِ راست پر لا سکتا ہے! یہ حضرت سو روپلے پر پڑے تھے اور گھر میں مہینے کے دس ہی دن گذرنے پر بھونی بھانگ نہیں رہتی تھی، کپڑوں کا یہ حال کہ کوٹ کوٹ نکلے لگ رہے ہیں، ٹوپی کا جغرافیہ ہر روز بدلا نظر آتا ہے، جوتیاں ایسی کہ صرف گھر سے دفتر تک چٹخانے کے قابل، چہرہ بجھا بجھا، ماتھے پر پریشانی کی شکنیں، بچوں کا یہ نقشہ کہ کسی کا کرتا ہے تو پاجامہ نہیں، پاجامہ ہے تو جوتا نہیں، جوتا ہے تو ٹوپی ندارد! کسی کے بال بکھرے ہوئے ہیں اور کسی کی ناک بہ رہی ہے —— لیکن بابو صاحب ہیں کہ ایک "رزقِ حلال" کی رٹ لگا رکھی ہے۔ یہ حضرت اقبال کے "شاہین" بنے پھرتے تھے اور نگاہیں ہمیشہ "آخرت" پر جمی رہتی تھیں بس اوڑھنا بچھونا تھا تو یہ جنونا نہ جذبہ کہ پاکستان بن گیا ہے، یہ اسلام کا گھر ہے تو اب نہ رشوت کا ایک پیسہ لینا جائز ہے، نہ اپنے قلم سے ایک حرف اور ایک ہندسہ خلافِ دیانت درج کرنا روا ہے۔ جیسے کہ سارے پاکستان کی ذمہ داری ان کے سر ہو اور ملک کے گورنر جنرل یہی بزرگوار ہوں!

ساتھ کام کرنے والوں کا تبصرہ ان کی غیر حاضری میں نہیں ان کے منہ پر بھی کچھ اسی طرح کا ہوتا تھا۔ تاہم جب تک وہ کلرک رہے تو لوگوں نے نیکی اور شرافت کے اس عذاب الیم کو مسلسل گوارا کیا۔ لیکن چونکہ یہ شخص کارکن ہونے کے لحاظ سے ہزاروں میں سے ایک تھا، لہٰذا جب اسے ترقی ہوئی اور اسٹیشن ماسٹری کا مقام مل گیا۔ تو عملے کے لئے معاملہ قابلِ برداشت نہ رہا۔ یہ بیچارا اسٹیشن ماسٹر ظفر الحق چونکہ ساری صورتِ حالات سے خوب واقف تھا، اس لئے اس نے اسٹاف کی میٹنگ میں بات واضح کر دی کہ تم لوگ اگر رشوت لو یا خیانت کا ارتکاب کرو تو میں تم کو برادرانہ طور پر اس کے خلاف نصیحت ضرور کرونگا لیکن میں بہرحال اپنے آپ کو اس پوزیشن میں نہیں پاتا کہ تمہارے خلاف کوئی مخالفانہ کارروائیاں کروں۔ البتہ اتنی بات صاف کر دوں کہ رشوت ستانی کی کسی کارروائی میں میری حصہ داری نہ ہوگی، نیز اگر پبلک کے کسی آدمی سے کوئی ناجائز چیز اسے لاعلم رکھ کر سرکاری چارجز کے نام پر وصول کی گئی تو میرے نوٹس میں آنے پر میں اسے ضرور آگاہ کر دونگا کہ اصلاً واجب الادا کیا تھا اور تمہاری حجامت کتنی ہوئی ہے۔ بس اس کے سوا میرا تمہارا کوئی جھگڑا نہیں۔ تم مجھے اپنی اسکیموں میں شریک ہونے کا اہل نہ سمجھو۔

اسٹاف کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی کہ یہ مُلّا ازم کہاں کندھوں پہ آ سوار ہوا، وہ لوگ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ ان بچاروں کے لئے! ایسے آدمی کی ماتحتی میں رہنے کے معنی یہ تھے کہ گویا پاکستان بنا ہی نہیں اور آزادی آئی ہی نہیں۔ ان کے لئے تو گویا یہ ہندو راج تھا اور یہ انگریزی حکومت تھی، وہ تو سمجھتے تھے کہ جیسے ایک غیر ان کے سروں پر آ سوار ہوا ہے اور کوئی فساد اور فتنہ کا مسئلہ ہے جسے اسٹیشن کی راج دھانی کا راجہ بنا دیا گیا ہے۔ وہ مولوی ظفر الحق کو گالی دینے کے لئے مولوی بھی کہتے تھے اور ملک کا بڑا تخریب پسند بھی سمجھتے تھے۔

چند روز کے تجربے نے بتا دیا کہ اسٹیشن ماسٹر کی حصہ داری اور شرکت و مضاربت کے بغیر "فضل ربی" کا کاروبار چلنا مشکل ہے۔ عوام کی جیب تراشی اکیلے دکیلے آدمی کے بس کا معاملہ نہیں، اس کے لئے لمیٹڈ فرم کی صحت بڑی ضروری ہوتی ہے۔ دو چار آنے مار لینا تو

اس فن شریف کی توہین ہوتی ہے' لیکن زیادہ ہاتھ مارنے کے لئے بہت سے آدمیوں کی سازش ضروری ہے۔ چنانچہ مولوی ظفرالحق کا اس "تعاون علی البر" سے گریز اسٹاف کے لئے عذاب بن گیا۔ دلوں کی بھڑاس نکالنے کے لئے پہلی تدبیر تو یہ کی گئی کہ دن رات اسٹیشن ماسٹر صاحب کا مذاق اڑایا جاتا اور اس کے ساتھ ساتھ اسلامیات پر بڑی بحثیں ہوتیں۔ کسی دن یہ موضوع چھڑ جاتا کہ جب سارا معاشرہ رشوت ستانی کے نظام پر چل رہا ہو تو بیچ میں ایک آدمی کا متقی بن جانا حماقت ہے۔ کبھی یہ بحث ہوتی کہ اللہ نے ہر ایک کی تقدیر لکھ دی ہے اور وہی ہیرپھیر رشوت خوروں سے رشوت خوادی کراتا ہے۔ کبھی یہ فقرہ بگھاری جاتی کہ جب لوگ خود آ آ کے دیتے ہیں تو انکار کرنا کیا ضرور۔ پھر جبکہ یہ ٹھیکیدار اور بیوپاری لوگ بڑے پیسے والے ہوتے ہیں اور یہ بھی عوام کا پیسہ حرام طریقے سے مار مار کے کھاتے ہیں' ان سے جتنا وصول کر لیا جائے اچھا ہے۔ کبھی یہ استدلال کہ ہم سے اوپر کے لوگ ہماری جیبیں کاٹتے ہیں تو ہم بھی اسی پیشہ کے اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ کبھی یہ ہماری تنخواہیں ضروریات سے جب کم رکھی گئی ہیں تو ہم بالائی آمدنی کے راستے نہ نکالیں تو کریں کیا۔ کبھی یہ نظریہ اُبھر کے سامنے آجاتا کہ بہشت و دوزخ محض افسانے ہیں اور ان افسانوں کے پیچھے بیوقوف لوگ ہی اپنی اور اپنے بچوں کی عمریں برباد کرتے ہیں۔ اس طرح کی حجتوں سے اسٹاف نے اسٹیشن ماسٹر کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ وہ اسے نکّو (INFERIOR) بنانے کی مہم چلا رہے تھے۔ لیکن ظفرالحق بھی بڑا اکھڑ ملا تھا' وہ اپنے اصول سے نہ ٹلا پر نہ ٹلا۔ اب اسٹاف نے ہر اس افسر کو اس صورتِ حالات کی طرف متوجہ کرنے کی ٹھانی جو معائنہ کے لئے آتا تھا۔ ان لوگوں نے افسروں کو متنبہ کیا کہ یہ حال رہا تو اس کے نتائج آخر کار آپ ہی کو بھگتنے ہوں گے کیونکہ اپنی موجودہ تنخواہوں کے ساتھ آپ کی کوئی خدمت کرنا ہمارے بس میں نہیں ہے۔ چنانچہ افسروں نے بہت مشفقانہ اور مربیانہ انداز سے ظفرالحق کو آدمی بننے کی تلقین کی مگر وہاں تو زمین جنبد نہ جنبد گل محمد! ان افسروں نے ظفرالحق کو یہ حقائق بھی بتائے کہ بھائی تم کیوں پاکستان کا سارا درد اپنے پہلو میں لئے ہوئے ہو' یہاں تو بڑے بڑے وزیر تک کھاتے پیتے ہیں۔

اسٹاف نے دیکھا کہ یہ داؤں کارگر نہیں ہوا تو انہوں نے کسی شدید تر اقدام کے لئے غور و خوض شروع کیا۔ آخر ایک قادیانی کلرک کی اسکیم پاس ہو گئی اور لوگوں نے مل کر اوپر یہ چغلی کھائی کہ ظفرالحق کا تعلق ایک ایسی دینی تنظیم سے ہے کہ سیاسی پارٹی قرار دیئے جانے کی وجہ سے اس کے ساتھ کوئی ملازم رابطہ نہیں رکھ سکتا۔ جب ظفرالحق کو اس چغلی کا علم ہوا تو غیرتِ ایمانی سے مجبور ہو کر اس نے عملاً تحریک اسلامی کا سپاہی بننے کا فیصلہ کر لیا اور یہ فیصلہ بہت ہی جلد عمل میں آگیا۔

کچھ ہی دن گذرے تھے کہ اوپر سے دریافت کیا گیا کہ تم فلاں تحریک کے رکن' یا ہمدرد یا کارکن یا مالی مدد کرنے والے تو نہیں ہو۔ ظفرالحق صاحب نے بڑی روح خلوص کے ساتھ جواب لکھنے کے لئے قلم تھاما اور قلم تھا کہ جذباتِ باطن کا بوجھ پڑنے کی وجہ سے لرز رہا تھا اور کاغذ پر یہ الفاظ قلمبند کر دئے کہ ہاں یہ خاکسار مسلمان ہونے کے لئے مجبور ہے کہ خدا کے دین کو یتیمی کی حالات سے نکال کر برسرِ اقتدار لانے والی ہر جدوجہد کا ساتھ دے۔ پھر ایک ہی ہفتے میں نوٹس آگیا کہ "یا ریلوے کی نوکری یا ———" دونوں میں سے ایک چیز کا انتخاب کر لو!

ظفرالحق پہلے ہی اس حادثے کے متوقع تھے اور اگرچہ وہ آج دیکھ رہے تھے کہ بے روزگاری ان کی نوکری قرق کرنے آ رہی ہے اور ضابطۂ ملازمت ان کو پونے دو صد روپیہ ماہانہ سے محروم کرنے کے لئے ہلّہ بول رہا ہے' لیکن آج سے زیادہ وہ کبھی مطمئن نہ تھے' روح کی اتنی ٹھنڈک ان کو کبھی محسوس نہ ہوئی تھی' آج وہ چھوٹے سے حسین تھے' آج وہ ذرا سے امام مالک تھے۔ اور آج وہ کسی قدر مجدد الف ثانی کا پرتو اپنی زندگی میں محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے خلافِ معمول ایک کرسی پلیٹ فارم کی سنتی کی باڑ کے ساتھ پیپل کے سایہ میں رکھوائی اور نوٹس کا جواب لکھنا شروع کیا۔ جواب میں انہوں نے لکھا کہ محکمہ کو چاہئے تھا کہ وہ میرے کئی سال کے

کام کو دیکھ کر رائے قائم کرتا اور مجھے بتاتا کہ میری جانفشانی اور میری دیانت میں فلاں جگہ کوئی رخنہ ہے اور میری یہ ساری دیانت اور جانفشانی اسی ملعون تحریک کی وجہ سے ہے جس سے تعلق رکھنے کی بنا پر مجھے برطرف کرنے کے ارادے کئے جا رہے ہیں۔ میں یہ سمجھ کر اس تحریک کا خادم بنا ہوں کہ پاکستان کا جو مقصود قراردادِ مقاصد کی رو سے طے کیا گیا ہے اس کے لئے سوائے اس تحریک کے اور کوئی قوت کام کی نظر نہیں آتی اور اس سے علیحدہ رہنا ایک طرف اسلام سے اور ایک طرف پاکستان کے مقاصد سے بے وفائی ہے۔ لہٰذا اگر مجھے دونوں میں سے ایک چیز کو چھوڑنے پر مجبور کر دیا جائے تو میں نوکری چھوڑتا ہوں۔

پاکستان ایکسپریس آرہا تھا۔ کانٹے والے نے سگنل ڈاؤن کیا اور وہ کانٹے بدلنے کنجی لے کر چلا گیا۔ ادھر ظفر الحق کی زندگی کی گاڑی کا کانٹا بھی بدل رہا تھا۔ ظفر الحق نے دفتر میں جاکر لفافہ بند کیا۔ گاڑی آئی' رکی' مسافر سوار ہوئے' سامان لدا' لفافہ بھی اسی گاڑی پر جا رہا تھا' آخر گارڈ نے وسل دیا' سبز جھنڈی ہلائی' انجن نے سیٹی دی اور گاڑی چھک پھک کرتی آگے بڑھ گئی۔

ظفر الحق آخر چلے گئے' کوئی الوداعی ٹی پارٹی نہیں ہوئی' خس کم جہاں پاک! ———— لیکن عملے میں سے ایک کانٹے والا ایسا تھا جس کا دل سارے گذرے ہوئے حالات سے پگھلا' اس نے علیحدگی میں جاکر اعتراف کیا کہ وہ ظفر الحق کے اصول سے متاثر ہوا ہے اور وہ اپنی زندگی اب اسی سانچے میں ڈھالے گا۔ کوارٹر خالی ہو رہا تھا' سامان نکالا جا رہا تھا اور ایک گاڑی ظفر الحق' اس کی بیوی اور اس کے بچوں کو گاؤں لے جانے کے لئے پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ یہ گاڑی بھی وسل دے کر چلی گئی اور عملے نے ٹھنڈی سانس لی کہ آج مدت بعد میخانۂ رشوت پر سے احتساب کا خاتمہ ہوا۔ نیا اسٹیشن ماسٹر ان کے مذاق کا تھا۔ اور پہلے دن ہی "لمیٹڈ فرم" بن گئی اور اچھی خاصی آمدنی ہونے لگی۔

ظفر الحق نے نوکری کے جمع شدہ روپے کو لے کر تجارت کا ارادہ کیا۔ وہ کراچی پہنچا اور وہاں دوست احباب کے مشورے سے کاغذ امپورٹ کرنے کا فیصلہ ہوا۔ امپورٹ لائسنس کے لئے جب کوشش کی تو معلوم ہوا کہ ان لائسنسوں کو حاصل کرنے والے تو چند خاص لوگ ہیں اور وہ ان کی بلیک مارکیٹ کرتے ہیں۔ اس معاملے پر ظفر الحق تیار نہ تھا' کیونکہ اسی سے تو بھاگا تھا۔ آخر اسکیم بدل دی اور کچھ اونی سامان خرید لیا۔ سامان بُک کرانے جب آپ اسٹیشن پر پہنچے تو "عمل دستِ غیب" والوں نے اپنی فیس طلب کی۔ ظفر الحق جیسا با اصول آدمی بھلا اس کے لئے کہاں تیار ہو سکتا تھا۔ جھگڑے نے طول کھینچا تو معاملہ اسٹیشن ماسٹر کے پاس پہنچا۔ اسٹیشن ماسٹر اتفاق سے ظفر الحق کا دوست نکلا۔ مدت بعد اچانک یہ ملاقات دونوں کے لئے بہت ہی موجب تفریح ہوئی۔ ظفر الحق کی رام کہانی سُن کر اس کا دوست بہت متاثر ہوا' چائے منگائی' گپ شپ رہی اور سامان بہرحال رشوت ٹیکس کے بغیر بُک ہو گیا۔ اب یہ سامان راولپنڈی پہنچ کر اترتا ہے۔ آپ مال چھڑانے پہنچے اور وہاں پھر وہی قضیہ درپیش ہو گیا۔ کلرک کو ضد کہ لے کے چھوڑوں گا۔ اور ظفر الحق کو ضد کہ ایک پیسہ نہیں دونگا۔ اسی ردّ و قدح میں دن گذر گیا۔ اور دفتر بند ہو گیا۔ صبح پھر ظفر الحق گودام میں موجود ہو گئے' لیکن اتفاقاً مال پر جو نظر پڑی تو وہ دم بخود رہ گئے۔ کمبلوں اور اون کے بوریوں کے اندر تیل کے کنستر انڈیل کر ان کو تباہ کر دیا گیا تھا۔ کلرک سے ملے تو اس نے کہا کہ یہ ہمارے دس روپوں کی قیمت ہے جو آپ کو ادا کرنی پڑی ہے۔ آئندہ خبردار رہیئے۔ بہت عرضی پرچہ کیا مگر کچھ نہ بنا۔ اور تجارت شروع ہوتے ہی بیٹھ گئی۔

بچارے ظفر الحق نے مجبوراً دوسرا راستہ نکالا۔ آپ کو شروع سے ادبی و صحافی ذوق تھا۔ کالج کے زمانے میں کالج میگزین کے کامیاب ایڈیٹر رہے تھے' معلومات عامہ اور اخباریات سے خاصا مس تھا۔ چنانچہ لاہور کے ایک روزنامے میں جائنٹ ایڈیٹری کر لی۔ دو سو روپے کا کام مل گیا اور مطمئن ہو گئے۔ جب تک تو خبروں کے ترجمہ کرنے کی ذمہ داری رہی۔ معاملہ ٹھیک رہا۔ لیکن آخر کار نوٹ لکھنے پر مامور ہوئے تو

ظفرالحق اس معاملہ میں بڑے محتاط تھے کہ کسی سے بے جا اختلاف نہ کیا جائے، جھوٹ نہ بولا جائے، مبالغہ آرائی نہ ہو، واقعات و حقائق کو توڑا موڑا نہ جائے، کسی کی ناجائز حمد و ثنا نہ ہو۔ چیف ایڈیٹر نے ظفرالحق کی اس کمزوری کو بھانپ لیا اور ان کی ترتیب پر خصوصی توجہ دی مگر وہ یوں کے توں رہے۔ آخر چیف ایڈیٹر نے ان کو سمجھایا کہ یہ اخبار نویسی کی دنیا اپنی خاص قدریں رکھتی ہے، یہاں بہت زیادہ دیانت نہیں چلتی، ہمیں حکومت کی پالیسی کو سراہنا بھی پڑتا ہے، پبلک کے ذوق کا لحاظ بھی رکھنا ہوتا ہے، سیاسی پارٹیوں کے مراتب بھی ہمارے سامنے ہوتے ہیں اور کچھ ذاتی تعلقات کا معاملہ بھی ہوتا ہے۔ لیکن ظفرالحق نے اخلاقی اصولوں کو ان مادی چیزوں سے بالاتر قرار دیا چیف ایڈیٹر سمجھ گیا کہ پالا پڑا ہے بے ڈھب آدمی سے، چنانچہ انتخاب کا ہنگامہ آیا تو اس نے ظفرالحق کے سامنے اپنی مجوزہ پالیسی پیش کر کے دو ٹوک فیصلہ معلوم کیا کہ آپ اس پالیسی پر کام کر سکیں گے یا نہیں۔ ظفرالحق اپنے ایمان و ضمیر کو معاش کے داؤں میں لگانے پر تیار نہ ہوئے۔ یہ نوکری بھی ختم ہو گئی۔

یہاں سے نکلے تو پھر چھوٹی سی بساطی کی دوکان کھول لی۔ دکان چلنے لگی۔ روزانہ آمدنی ہو جاتی تھی کہ بیوی بچوں کو پیٹ بھرنے کے لئے دال روٹی اور تن ڈھانکنے کے لئے کپڑا مل سکے۔ لیکن ایک دن سیلز ٹیکس مشخص کرنے کے لئے انسپکٹر صاحب آدھمکے۔ ظفرالحق صاحب نے اپنے اثاثے اور اپنی فروخت کا مکمل حساب ان کے سامنے رکھ دیا۔ حساب پوری ایمانداری سے مرتب کیا گیا تھا اور رجسٹر شہادت دے رہے تھے۔ کہ جملہ اثاثہ پانچ سو روپے ہے اور یومیہ اوسط فروخت دس بارہ روپے ہوتی ہے۔ لیکن انسپکٹر صاحب نے سیلز ٹیکس سو روپیہ سالانہ مشخص کیا۔ درآنحالیکہ ایک ہمسایہ بزاز کی آٹھ ہزار کے سرمائے کی دکان پر جس کی بکری ۲۰ روپیہ یومیہ تھی، صرف پانچ سو چالیس روپے سالانہ ٹیکس لگایا گیا تھا۔ دونوں میں فرق کیا تھا، ایک یہ کہ ظفرالحق کے حسابات بالکل درست اور ایماندارانہ تھے اور بزاز نے سرمایہ اور بکری اصل سے کم دکھائی تھی، دوسرے یہ کہ ظفرالحق انسپکٹر کو کوئی نذرانہ دینے پر تیار نہیں تھا لیکن بزاز نے اسے کھلا پلا دیا تھا۔ ظفرالحق نے بڑا احتجاج کیا اور انسپکٹر صاحب سے پوچھا کہ آخر جو شخص عام دکانداروں کے مقابلے میں واقعی ایماندارانہ حساب رکھے اس کا معاملہ کیا خاص نوعیت نہیں رکھتا۔ انسپکٹر نے بتایا کہ ہم عام فضا کے پیش نظر مجبور ہیں کہ حسابات کو جعلی فرض کریں اور اصل حساب کے مقابلہ میں اکو نصف اور تہائی سمجھ کر معاملہ کریں۔ علاوہ بریں ہمیں اوپر سے ہدایت یہ ہے کہ ٹیکس زیادہ سے زیادہ مشخص کئے جائیں۔ ظفرالحق کا خون کھول رہا تھا مگر اس نے صرف اتنا ہی کہا کہ تو کیا آپ کی حکومت ملک کے تاجروں کو جھوٹا اور خائن بنانا چاہتی ہے۔ آپ حلال کے دروازے بند کرنا چاہتے ہیں اور حرام کے شاہدرے کھولنا چاہتے ہیں۔ جو لوگ اپنی کمائی کو پاک رکھنے کے لئے خوش حالی ترک کر کے غریبی کی سطح پر آ گرے ہیں ان سے آپ سرے سے زندگی کا حق ہی چھین لینا چاہتے ہیں۔ اور ان کی آمدنیوں کو بھی ناپاک بنا کے رکھ دینے پر تُل گئے ہیں۔ مگر ان باتوں سے انسپکٹر تاؤ میں آ گیا اور اس نے آٹھ سو کے بجائے ٹیکس کی مقدار ایک ہزار کر دی اور تن کر کہا کہ مولوی صاحب، اب جا کر اپیل کر دیکھئے!

گندگی کے تالاب میں غوطے کھاتا ہوا عبدالحق چند روز بعد انار کلی میں ایک خوانچہ فروش بنا پھر رہا تھا۔ مگر اسے صرف خوانچہ متحرک سے کمائی کرنے کا حق تھا، کیونکہ خوانچہ رکھ کر بیٹھنے کیلئے ایک طرف کارپوریشن کی اجازت ضروری تھی، دوسری طرف خوانچہ فروش کی نگرانی کرنے والے پولیس کانسٹیبلوں کی خوشنودیٔ مزاج حاصل ہونی چاہئے تھی۔ یہ دونوں چیزیں منحصر تھیں اس پر کہ کچھ خوشامد کی جائے، کچھ چڑھاوا چڑھایا جائے اور حلال میں کچھ نہ کچھ آمیزش حرام کی کی جائے ——— اور یہی وہ چیز تھی جس پر ظفرالحق تیار نہیں تھا۔ وہ ماحول سے جنگ کرنے کی پاداش بھگت رہا تھا۔ مگر تھا ضدی! ادھر ماحول اسے یوں سزا دے رہا تھا، اُدھر اسی ماحول کے گماشتے تھے کہ جو اس کا مذاق اڑاتے تھے، اس پر دباؤ ڈالتے تھے، اس کو پاگل کہتے تھے۔ خود اس کی بیوی اس کی دینداری سے نالاں تھی، اس کے بچے اس کے اخلاق حسنہ سے نفرت کرتے تھے، اس کے پڑوسی اس کے رزق حلال کے جنون کی تحقیر کرتے تھے ——— لیکن ظفرالحق کو صرف ایک جگہ سے سہارا ملتا تھا۔

وہ جب خدا کے حضور نماز کے لئے کھڑا ہوتا تو اسے اطمینان ہوتا کہ اس کے بدن کی کوئی بوٹی حرام سے پلی ہوئی نہیں اور جب وہ رکوع و سجود میں تسبیح کہتا تو اس کے کلمات کو حضورِ خداوندی میں لے جانے کے لئے کئی فرشتے باہم مسابقت کرتے اور جب وہ کاروبار کی زکوٰۃ نکالتا تو اسے تسلی ہوتی کہ وہ نہ تو نفس کو دھوکا دے رہا ہے اور نہ اپنے جرائم کے پھوڑوں پر پٹیاں باندھ رہا ہے۔

یہ ظفر الحق جو پیٹ کے لئے دل کو بیچنے پر تیار نہ تھا، ہاں یہ ظفر الحق جس نے ایمان و ضمیر کی قیمت پر روٹی کے چار لقمے خریدنے کی پستی اختیار نہ کی، اور پھر یہ ظفر الحق جو اپنی ساری تقدیر دنیا ہی میں وصول کرنے اور اپنی آخرت کو معاش پر بھینٹ چڑھانے پر راضی نہ ہو سکا تھا ——— کون کہہ سکتا ہے کہ اسے ابھی اور کتنے تلخ تجربات کرنے ہیں۔

تاآنکہ دھارے کا رخ بدل جائے!

بقیہ صفحہ ۳۵

ہمیں اپنا ادب خود پیدا کرنا ہے

جس مطلوبہ ادب کا میں تصور دلا رہا ہوں، اسے ہم بنا بنایا کہیں سے درآمد نہیں کر سکتے، اس کو ہم باہر سے ترجمہ کر کے نہیں اپنا سکتے، اس کو ہم کسی منڈی سے خرید کر نہیں لا سکتے، بلکہ اس کو تو ہمیں خود اپنے اندر سے ابھارنا ہے۔ اس ادب کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں اپنی ہی تخلیقی صلاحیتوں پر دارومدار کرنا ہوگا۔ ہمیں اپنے راستے خود بنانے ہیں اور اپنی وادیوں میں چراغ ہمیں خود جلانے ہیں۔

اب تک ہماری ادبی سرگرمیوں کے پیچھے ایک مفعولانہ تقلیدی ذہن کارفرما ہے۔ ہم مرعوبانہ طرزِ فکر کے ساتھ بڑی بڑی طاقتوں کو نیازمند بن بن کر دیکھتے ہیں اور پھر بڑی سعادت مندی کے ساتھ ان کی ادبی تخلیقات کی نقل اتارتے ہیں اور اس کا نام پھر ترقی پسندی رکھتے ہیں ہمارے ادیبوں کے قبلے ان کے اندر نہیں، ان کے باہر واقع ہیں ——— چاہے مشرق میں ہوں یا مغرب میں، چاہے سرخ ہوں یا سفید!

لیکن یاد رکھئے، جن لوگوں کے فکر و ادب کا قبلہ ان کا اپنا ہی حریمِ خودی نہ ہو، جو تقلیدی ذہن رکھتے ہوں، جو خیالات باہر سے درآمد کرتے ہوں، جو دوسروں کو مرعوبیت سے دیکھیں، جن کا اپنا تخلیقی ترجمان سرنگوں پڑا ہو، وہ کاروانِ حیات کو جادۂ ارتقاء پر نہیں لے جا سکتے

پس ہمیں تقلیدی رجحانات کا خاتمہ کر کے اپنے تخلیقی رجحان کو بیدار کرنا ہے اور باہر کے فکری قبلوں سے بے نیاز ہو کر خود اپنے ہی حریمِ خودی کو اپنا قبلہ بنانا ہے، اور جس دن یہ تبدیلی پوری طرح واقع ہو جائیگی، ہم اپنا مطلوبہ ادب پیدا کر سکیں گے۔

میں یہ اطلاع دیئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس ادب کی تخلیق کے لئے ابتدائی کوششیں آپ کے ہاں شروع ہو چکی ہیں اور یہ کوششیں بڑی حد تک حوصلہ افزا ہیں۔ آہستہ آہستہ ایک نئی ادبی شاہ راہ سامنے آ رہی ہے اور اس شاہراہ پر خیالات کے نئے کاروان چلنے لگے ہیں۔ مگر یہ مہم اپنی تکمیل کے لئے اس وقت کا انتظار کر رہی ہے جب کہ آپ نئے ارادوں اور ولولوں کے ساتھ کالجوں سے نکل کر اس مہم میں اپنی محنتیں صرف کریں گے۔

۳۴ ———

ایک منظری تمثیل

اِسٹالن کی موت

محمد سعید بی۔اے بی ٹی (علیگ)

افراد

اسٹالن ———— بستر مرگ پر

مولوٹوف ———— نائب وزیر اعظم

مالنخوف ———— حکومت کا ایک اہم رکن

بیریا ———— خفیہ پولیس کا افسر اعلیٰ

ڈاکٹر روزدسکی ـــ رینڈوف ـــ الیشاؤ

مقام

ماسکو ———— اسٹالن کا کمرہ

رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ کمرہ میں ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی ہے اسٹالن عالم بیہوشی میں بستر مرگ پر پڑا ہوا ہے۔ اُس کے جسم کو ایک گرم چادر سے ڈھک دیا گیا ہے۔ پلنگ کے سرہانے دیوار پر لینن اور مارکس کی قدِ آدم تصاویر آویزاں ہیں۔ دونوں کے وسط میں روس کا قومی نشان لہرا رہا ہے۔ کمرے میں انتہائی خاموشی ہے۔ ڈاکٹر روزدسکی بلڈ پریشر کا اندازہ لگا رہا ہے۔ مولوٹوف، مالنخوف، بیریا اور دوسرے ڈاکٹروں کی نگاہیں روزدسکی کی جانب لگی ہوئی ہیں۔ پردہ اٹھتے ہی ایک شخص اندر داخل ہوتا ہے اور سربمہر لفافہ مولوٹوف کے ہاتھ میں دیکر ایک جانب چپ چاپ کھڑا ہو جاتا ہے مولوٹوف لفافہ چاک کر کے پڑھنا شروع کرتا ہے۔

بیریا: "کیا پھر کوئی اور نئی خبر"

مولوٹوف: "ہاں نئی اور بالکل نئی........ بیریا! یہ خبر نہیں میرے ضبط و صبر کے لئے ایک تازیانہ ہے..... شر پسند اور خود پرست عناصر یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ مارشل زندہ نہیں رہا...... اس گمان سے ان چیونٹیوں کے پر نکل آنے ہیں۔ مگر..... مگر میں ان سب کا سر کچل ڈالوں گا..... ......کیا ٹراٹسکی کی خبیث روح نے ان کو پھر موت کی دعوت دی ہے...... کیا مارٹنگل کا انجام بھول گئے؟..... کیا ان کو کریمیا کے خون آشام واقعات یاد نہیں رہے؟...... وہ اسٹالن کا خونی پنجہ اور آہنی گرفت کا نتیجہ تھا اور.... اور اب مولوٹوف انھیں اس سے زیادہ عبرتناک سزائیں دیگا۔"

بیریا: "مولوٹوف۔ اُس سیلاب کے سدِّباب سے پہلے تم اس خواب کی دنیا سے تو باہر نکلو.... کیا اب یہ کوئی جھوٹ ہے کہ مارشل کی آنکھوں کی روشنی ماند پڑ چکی ہے، اُس کا جسم سرد ہو چکا ہے۔ اُس کی سانس اکھڑ چکی ہے۔"

مولوٹوف: "بیریا۔ تم اس طرح کی باتیں کہہ کر میرے عزائم کو متزلزل نہیں کر سکتے۔ میں تمہارے الفاظ کے معنی اچھی طرح سمجھتا ہوں اور اس کا حل بھی جانتا ہوں۔"

بیریا: "شیشہ کے مکانوں میں رہ کر دوسروں پر پتھر نہ پھینکو مولوٹوف.... تمہارے ہاتھ بھی...... "

مولوٹوف: (بپھر کر) "بیریا....... وہ آگے کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ ڈاکٹر کی آواز نے اُسے خاموش کر دیا)

ڈاکٹر روزدسکی: "خون کا دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ میں نے اس کے روکنے کے لئے ایک متعدد انجکشن دئے ہیں۔ حیرت اور انتہائی حیرت ہے کہ پانی کو

اسٹالن کی موت

برف کی طرح جامد کر دینے والی دوائیں بھی بے اثر ثابت ہو رہی ہیں۔"

ڈاکٹر رنیوف: "میرے خیال میں اپریشن کے علاوہ اسے روکنے کی اور کوئی صورت نہیں۔"

ڈاکٹر ایشناؤ: "برقی شعاعوں کا استعمال ہمیں یقیناً اپنے مقصد میں کامیاب کر دے گا۔ اسے کیوں نہ آزمایا جائے۔"

روزنوسکی: "برقی شعاعیں...... ٹھیک ٹھیک...... میرے ذہن میں اس کا خیال ہی نہ تھا... جاؤ جلدی کرو مشینیں یہاں دس منٹ کے اندر اندر آجانی چاہیئے۔ میں اس عرصہ میں ایک انجکشن اور دیتا ہوں۔

(ڈاکٹر ایشناؤ جاتا ہے۔ مولوٹوف، مالنخوف اور بیریا ایک گوشہ میں کھڑے ہو جاتے ہیں)

مالنخوف: "اے ظالم موت... کیا تیرا منحوس سایہ مارشل کی مقدس روح پر پڑ گیا ہے... اس سے قبل کہ ایسا ہوتا تو خود کیوں نہ اپنی آگ میں جل اٹھی..... مالوٹوف، بیریا بتاؤ تم لوگ بتاؤ کیا ہمارا رہبر ہمیں چھوڑ جائے گا؟

مولوٹوف: "نہیں...... نہیں... مارشل اس لئے پیدا نہیں ہوا تھا کہ موت اُس پر اسقدر آسانی سے قبضہ کر لے..... اُسے ابھی زندہ رہنا ہے ابھی اُن عزائم کو بروئے کار آنا ہے جو اس کے سینہ میں چھپے ہوئے ہیں..... مالنخوف ہمت رکھو اسٹالن دنیا پر حکومت کرنے کے ارادے رکھتا تھا ابھی اس خواب کو حقیقت بننا ہے۔"

مالنخوف: مگر...........!

مولوٹوف: "تمہارا مطلب ملکی خانہ جنگی اور بغاوت سے ہے!

مالنخوف: "ہاں...... ملک کی فضا آتش بداماں ہو چکی ہے... گھٹی ہوئی آوازوں میں روانی پیدا ہو گئی ہے...... روندے اور جھلسے ہوئے سبزے نے سر اُٹھانا شروع کر دیا ہے...... آج اُن راکھ کے ڈھیروں سے پھر چنگاریاں ضوفشانی کرنے لگی ہیں جن پر ہماری قہر کی بجلیاں گری تھیں..... آج وہ خون جسے ہم نے بے دریغ بہایا تھا لالہ و گل کی طرح پھوٹ نکلے ہیں ایسا نہ ہو کہ سسکتی ہوئی زندگیوں میں جان پیدا ہو جائے اور یہ ہمارے خرمن حیات کو جھلس کر رکھ دیں۔

مولوٹوف: "میری آنکھیں بھی وہ سب کچھ دیکھ رہی ہیں جس کی طرف تم نے اشارہ کیا ہے..... مگر تم یہ نہ بھولو کہ مارشل ابھی زندہ ہے۔ اور مولوٹوف کے بازو قوی ہیں...... وہ جو آج فتنہ جگانے کا خواب دیکھ رہے ہیں کل خاک و خون میں تڑپتے نظر آئیں گے ہماری قہاریت کے فسانے زباں زد عام ہیں وہ تاریخ جو ۳۹-۱۹۳۸ میں لکھی گئی تھی ایک بار پھر دہرائی جائے گی ابھی ہمارے افتراک میں مخالفت کے شکار کو موت کی نیند سلانے کے لئے بہت سے تیر باقی ہیں۔ ابھی مارشل کی سانس چل رہی ہے اُس کی رگوں میں خون دوڑ رہا ہے۔

بیریا: "مارشل کی سانس موت کا سنبھالا ہے اور خون کی حرکت بجھتے ہوئے چراغ کی لَو ہے..... موت نے اس کرہ کی ہر شئے پر قبضہ کر لیا ہے۔ ڈاکٹر کا انجکشن اور برقی شعاعیں ڈوبتی ہوئی نبض میں جان نہیں ڈال سکتیں بہتر ہے کہ ہم خواب دیکھنے کے بجائے حقیقت پر آجائیں۔

مولوٹوف: "یعنی مارشل کی موت کا اعلان!

بیریا: "بیشک.....!

مالنخوف: "نہیں مالوٹوف نہیں..... یہ اقدام خانہ جنگی کو دعوت دیدے گا... ملک کے گوشہ گوشہ میں فتنہ و فساد کے سوتے پھوٹ نکلیں گے۔

بیریا: "تو کیا تم یہ قریب دیگر طوفان کے تھپیڑوں کو روک سکو گے..... وہ زمین جو لاوا بن چکی ہے اُسے پھٹنے سے روک سکو گے۔

مولوٹوف: بیریا..... ہمیں اچھی طرح معلوم ہے تم کیا چاہتے ہو مگر یقین رکھو یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا

(بیریا کچھ کہنا چاہتا تھا کہ ڈاکٹر روزنوسکی گھبرایا ہوا مولوٹوف کو مخاطب کرتا ہے)

اسٹالن کی موت

ڈاکٹر: برقی شعاعیں بھی ناکام ثابت ہو رہی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا یہ بھی اسٹالن سے بغاوت پر آمادہ ہیں۔"

مولوٹوف: ڈاکٹر! مارشل کو زندہ رکھنے کے لئے روئے زمین کی ہر طاقت استعمال کی جائے۔ یہ مارشل کی زندگی کا سوال ہی نہیں بلکہ یہ ہماری ایجادات کی شکست بھی ہوگی۔ . . . یہ ہمارے اُن اصولوں کی شکست ہوگی جن کی تبلیغ نے یہاں سے "ہستی اعلیٰ" کا تصور ہی ختم کر دیا ہے اور پھر کوئی ماننے کو تیار نہ ہوگا کہ "یہ مادی دنیا جس کا ادراک ہم اپنے حواس سے کرتے ہیں یہی اور صرف یہی حقیقی ہے"

بیریا: اب اس سعیِ رائیگاں سے کیا حاصل۔ رباب کے تار ٹوٹ چکے ہیں . . . . پھول کمھلا چکا ہے اب بہار بھی اسے عطر بیز نہیں بنا سکتی . . . . تم اس جنگ میں شکست کھا چکے ہو۔

مولوٹوف: شکست مولوٹوف کے سایہ سے بھی پناہ مانگتی ہے اور موت کا یہ ناگہانی حملہ بھی میرے دل میں وسوسہ اور دہشت نہیں پیدا کر سکتا . . . . . میں دیکھتا ہوں کون سی طاقت مارشل کو ہم سے چھین سکتی ہے۔

(مالنخوف ایک عجیب اضطرابی کیفیت میں بڑبڑانا شروع کر دیتا ہے۔)

"مولوٹوف . . . . بیریا . . . . وہ دیکھو عقبی دروازہ سے یہ کون چلا آ رہا ہے . . . . . ارے یہ تو لینن کی روح ہے . . . لینن . . . لینن . . . . سنو سنو وہ کیا کہہ رہا ہے ہاں ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ ٹھیک کہتے ہو۔ ہم موت سے نہیں جیت سکتے۔ ہم مارشل کو اُس کے چنگل سے نہیں بچا سکتے . . . ہاں ہاں وہ تمہارا داہنا بازو تھا، ہمراز تھا، اور اب وہ تمہارے پاس جا رہا ہے . . . . بیشک ہماری مادی طاقتیں موت کے آگے سپر ڈال چکی ہیں . . . . یقیناً مادہ کی طاقت کسی بڑی طاقت کی محکوم ہے . . . . مگر بتاؤ وہ کیا ہے . . . . ارے تم چلے گئے . . . . لینن . . . لینن"

(مولوٹوف غصہ سے ہاتھ کانوں پر رکھ لیتا ہے)

مولوٹوف: مالنخوف کو جھنجھوڑتے ہوئے "مارشل کی موت نے تمہیں اسقدر وہمی بنا دیا . . . تم وہ کہنے لگے جس کا تم نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا . . . . ہوش میں آؤ اپنی کم ہمتی کا ثبوت مت دو (ڈاکٹر سے) ڈاکٹر تم اپنی تمام کوشش صرف کر دو۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ مالنخوف کی یہ بکواس تھی یا حقیقت۔

(ایک دھماکے کے ساتھ بجلی کی مشین ٹوٹ کر گر جاتی ہے)

بیریا: مولوٹوف . . . . . اپنی کوششوں کا انجام اپنے سامنے دیکھ لو۔ کیا تم اب بھی اس کے منکر ہو کہ موت نے اس کرہ کے ذرہ ذرہ کو اپنا مطیع بنا لیا ہے؟

مولوٹوف: بیریا . . . . تم بزدلی کا ثبوت دو . . . . تم اس طرح باغیوں کا دل بڑھاؤ۔ تم اسٹالن کو مرتا ہوا دیکھ کر چراغاں کے خواب دیکھو . . . مگر یاد رکھو تم کبھی نافرمانی کے جرم میں اسٹالن کے عتاب سے نہیں بچ سکتے۔ وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا (ڈاکٹر سے) ڈاکٹر اگر تم نے ذرا سی بھی لوتاہی برتی یا ہمت ہاری تو یاد رکھنا میرے پستول کی ایک گولی تمہارے لئے کافی ہوگی . . . . . چلو اپنا کام کرو۔

(مالنخوف پھر بڑبڑانا شروع کرتا ہے)

مارکس۔ مارکس ہمارا پیغمبر، غریبوں کا محسن۔ انسانیت کا رہبر . . . . تم کچھ کہنا چاہتے ہو۔ ہاں ہاں ٹھیک کہتے ہو . . . . . تمہاری بات پر ہمارا ایمان ہے . . . . . یقیناً اسٹالن نے تمہارے خواب کو حقیقت بنایا ہے . . . . . . ترکستان، بلقان، یوکرین کی سڑکیں اور وادیاں اب تک اس کی گواہ ہیں . . . . . تمہارا پیغام پہنچانے کے لئے مارشل مخالفین کے کاشانوں پر قہر بن کر پہنچا اور عتاب بن کر نازل ہو گیا۔ کس میں دم تھا جو اُف کرتا . . . . بیشک اس کی تلوار نے وہ سب کر دکھایا جس کا تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا . . . . ایں ایں تمہاری آنکھوں میں آنسو . . . . پیغمبر کی آنکھیں اشکبار . . . . نہیں نہیں تم غلط سمجھ رہے ہو . . . . . سٹالن کی موت اشتراکیت کی موت نہیں ہو سکتی . . . . دنیا اس کے جال میں پھنس چکی ہے . . . . مارکس مارکس تم روتی ہوئی آنکھیں لیکر چھپ گئے . . . . تو کیا یہ سب ہو کر رہے گا؟ کیا . . . .

(مولوٹوف اسے زیادہ سختی سے جھنجھوڑتا ہے)

اسٹالن کی موت

مولوٹوف: مالنخوف .... تم نے پھر کیا بکواس شروع کر دی ..... معلوم ہوتا ہے کہ موت نے تم پر بھی حملہ کر دیا ہے ..... ہوش میں آؤ اپنے حواس درست کرو۔

(یکایک ڈاکٹر روزووسکی چیختا ہے)

" موت .... موت .... میرا سر چکرا رہا ہے۔ مجھے بچاؤ مجھے بچاؤ ... (گر جاتا ہے)

(ڈاکٹر ایشٹاؤ اور رینٹوف اسے سنبھالنے کے لئے دوڑتے ہیں لیکن آپس میں ٹکرا کر گر جاتے ہیں اور بے ہوش ہو جاتے ہیں)

مالنخوف " (چیختا ہے)" مارشل ..... مارشل تم کہاں جا رہے ہو .... تمہیں یہ کون اُٹھائے لئے جا رہا ہے .... اُف کس قدر بھیانک شکل ہے ..... موت۔ موت ..... بچاؤ۔ بچاؤ

(بھاگ جاتا ہے)

مولوٹوف: بزدل .... موت سے کھیلنے والا ... موت سے اتنا ڈرنے لگا .....

(ایک دھماکا)

بیریا: مولوٹوف۔ وہ دیکھو اسٹالن کی مسہری جلنے لگی ہے ... بھاگو .... بھاگو .... موت اب پوری طرح مسلط ہو چکی ہے .... مگر نہیں تم نہیں جاؤ گے تمہیں اب بھی یقین نہیں آتا۔ شاید تم اُس وقت سمجھو گے۔ جب وہ خود تمہارا گلا دبا دے گی۔ اچھا تو تم بھی موت کے آغوش میں جاؤ .... میں جاتا ہوں ..... (جاتا ہے)

خوفناک چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ سارا کمرہ دھوئیں سے بھر جاتا ہے بجلی کی مشین سے آگ کے شعلے بلند ہونے لگتے ہیں۔ اسٹالن کی گھٹی ہوئی آواز سنائی دیتی ہے " اشتراکیت .... اشتراکیت .. الوداع "

(مولوٹوف دھوئیں کے اندر جانے کی کوشش کرتا ہے مگر اُس کا دم گھٹنے لگتا ہے اور چیخنا شروع کرتا ہے ....)

" بیریا ... مالنخوف۔ جاؤ گرجا کی گھنٹیاں بجاؤ .... عبادت خانے آباد کراؤ .... جاؤ جلدی کرو پادری سے کہو کہ وہ دعا کرے ..... ٹھہرو ٹھہرو میں بھی آتا ہوں ... اُف میرا گلا ..... ہائے میرا سر ... مارکس مارکس مجھے یقین آگیا کہ ان تمام طاقتوں سے بالاتر کوئی اور طاقت بھی ہے اور اُس پر قابو پانا ناممکن ہے ...... بیریا۔ تم کہاں ہو .... ٹھہرو میں بھی تمہارے پاس آ رہا ہوں .... اسٹالن .... اسٹالن ....."

(جاتا ہے)

پردہ گرتا ہے

اس ملک پہ اللہ کا کرم ہو کے رہے گا
یہ دیر کسی روز حرم ہو کے رہے گا

جیتے ہیں اسی آس پہ ناکامِ محبت
اک روز وہ مائل بہ کرم ہو کے رہے گا

ہاں سنگِ گراں اور بھی کچھ راہ میں ڈالو
یہ قافلہ اب تیز قدم ہو کے رہے گا

زندانیو! گھبراؤ نہ اس جور و جفا سے
سر جبر کا اکڑا ہوا خم ہو کے رہے گا

پہرے تو بٹھا دو گے مگر میرے قلم سے
اسلام کا پیغام رقم ہو کے رہے گا

وہ وقت بھی آئے گا کہ مظلوم پہ کوثر
جو ہاتھ بھی اُٹھے گا، قلم ہو کے رہے گا

غزل

محمّد عثمان رمز

کانٹوں میں بسر ہم کرتے ہیں پھولوں سے ہمیں کچھ کام نہیں
کہتے ہیں مذاق عام اسے لیکن یہ مذاق عام نہیں

الزام ہے سارا کانٹوں پر پھولوں پہ کوئی الزام نہیں
اس باغ کا بس حافظ ہے خدا انصاف کا جس میں نام نہیں

جس صبح کو شبنم روتی ہو جس شام کو تارے ہنستے ہوں
وہ صبح ہماری صبح نہیں وہ شام ہماری شام نہیں

کیوں توڑ رہے ہو پھولوں کو کلیوں کو مسلتے ہو ناحق
برباد چمن کو کر دینا یہ اہل چمن کا کام نہیں

اس مکر و ریا کی دنیا میں اس ظلم و ستم کی بستی میں
انسان کی خاطر کام بھی ہیں انسان برائے نام نہیں

ذکر و فکر

وہی جبیں ہے وہی بارگاہ رب جلیل
ازل کے دن سے ہے ممتاز محوِ ذکرِ جمیل

خبر نہ تھی کہ وہ آجائینگے شبِ فرقت
وفورِ غم میں نکل آئیگی خوشی کی سبیل

بھٹک رہا ہے یہ کس رہ میں کاروانِ حیات
نشانِ منزلِ مقصود ہے نہ سنگِ میل

سمجھ سکے تو کوئی چارہ گر کو سمجھائے
کہ دردِ عشق ہے دراصل زندگی کی دلیل

پرائی آگ میں کودے کوئی یہ ناممکن
فروغِ گلشنِ جنت ہے امتحانِ خلیل

ازل سے شیفتۂ شاہدِ ازل ہوں میں
نگاہ میں ہے وہی پیکرِ حسین و جمیل

ہر ایک نقشِ قدم رہ نمائے راہِ حبیب
مری تلاش ہے دنیا کے واسطے تمثیل

ہر ایک خوگرِ بیداد ہو نہیں سکتا
متاعِ درد ہے بخششِ خدائے جلیل

ممتاز العیشی

دریوزۂ فقر

شاہد عرفانی

یارب وہ فقر دے جسے شانِ غنا کہیں
سرمایۂ حیات کہیں جاں فزا کہیں

وہ فقر جس کے زیرِ نگیں ہے یہ کائنات
وہ فقر جس کا فیض عناں گیرِ شش جہات

وہ فقر جس پہ فخرِ دو عالمؐ کو ناز ہے
جس کی ادائے ناز سراپا نیاز ہے

وہ فقر جس کی ہمتِ عالی غنا پسند
وارث ہے تختِ جم کا مگر بوریا پسند

جس کی نظر میں ہیچ ہے فرِ شہنشہی
دولت ہے جس کی دولتِ ایمان و آگہی

زیرِ گلیم شانِ سکندر لئے ہوئے
نانِ شعیر و سطوتِ حیدر لئے ہوئے

وہ فقر جو حریم محبت کا نور ہے
یعنی دل و نگاہ میں جس سے سرور ہے

کافر نظر کو جس نے مسلماں بنا دیا
جس نے خرد کو صاحبِ عرفاں بنا دیا

شیریں ہے جس کے فیض سے تلخابۂ حیات
ہر روز روزِ عید ہے ہر شب شبِ برات

وہ فقر جس پہ مسندِ شاہی کو ناز ہے
ہر دیدہ ور کی تشنہ نگاہی کو ناز ہے

جس فقر میں ہے مستیٔ پیمانۂ کلیم
جس کی ادا ہے جراتِ رندانۂ کلیم

وہ فقر ہے جو واقفِ سرِ نہانِ عشق
ہے جس کی اِک نگاہ سراپا بیانِ عشق

وہ فقر دے جو حسنِ ازل کا امین ہے
جو فقر اصلِ دولتِ دنیا و دین ہے

"ہمارا نظریۂ ادب"

ابوالبیان حماد

ہوا بہار در آغوش گلستانِ ادب
ہوئی ہے پھر سے فزوں رونقِ دکانِ ادب

ہے زخم خوردۂ فسق و فجور جانِ ادب
ذرا سنے تو کوئی شیون و فغانِ ادب

حرم کی سمت ہے محوِ خرام و گرمِ سفر
بصد نشاط و بصد شوق کاروانِ ادب

ادب میں پھر سے نیا انقلاب آئے گا
بنا رہے ہیں نرالا ہم اک جہانِ ادب

بہار خیز و بہار آفریں ہیں غنچہ و گل
سدا بہار ہے شاداب گلستانِ ادب

وقار و شانِ ادب کو بڑھا رہے ہیں ہم
ہر اک ادیب ہمارا ہے پاسبانِ ادب

"ادب برائے ادب" وہ غلط تصور ہے
اسیر جس میں رہی جانِ ناتوانِ ادب

"ادب برائے ادب" لغو، ہیچ، ناکارہ
"ادب برائے ادب" باعثِ زیانِ ادب

"ادب برائے ادب" شیطنت کا ہتھکنڈہ
ہے جس سے معصیت آلود اب دکانِ ادب

"ادب برائے ادب" ہے وہ لفظِ بے معنی
نہیں ہے جس میں ذرا سا بھی کچھ نشانِ ادب

"ادب برائے ادب" اصل میں ہے بے ادبی
"ادب برائے ادب" ظلمتِ جہانِ ادب

"ادب برائے عبادت" ہے اپنا نظریہ
میں دے رہا ہوں زمانے میں پھر اذانِ ادب

ادب کو دیں سے جدا کیسے کر دیا جائے
ادب ہے قالبِ موزوں، دین جانِ ادب

بنا ہمارے ادب کی ہے وحی اور الہام
خدا کا آخری پیغام ترجمانِ ادب

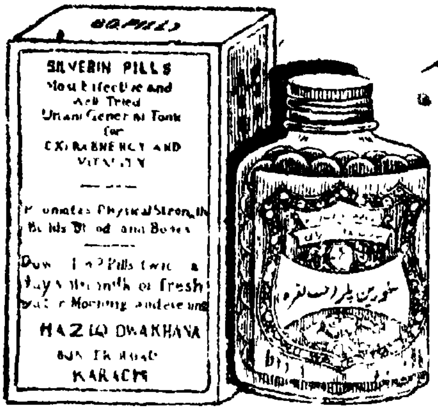
ابھر رہے ہیں جو پھر سے نئے نئے تارے
نہ کیوں ہو پھر سے درخشندہ آسمانِ ادب

نشانِ منزلِ مقصود آشکارا ہے
قدم بڑھائے چلو تیز رہروانِ ادب!

ابوالبیان جو ہو دردِ دل بیان میں کچھ
تو پھر نہ کیوں ہو دلآویز وہ بیانِ ادب

(حلقۂ ادبِ اسلامی عمرآباد کے ایک جلسے میں سنائی گئی)

مقویات سرتاج سلورین پلز



مردوں کے لئے ایک اچھا متوازن اورآج کل کا آزمودہ
جنرل ٹانک ہے جو بھوک کو بڑھاتاہے اورجسم میں تازہ
اورسرخ خون پیدا ہوتاہے۔قوت اورطاقت پیداکرتاہے

سلورین

پر آپ بھروسہ کرسکتے ہیں۔قیمت ۴۰ گولی چار روپے بارہ آنے ۸۰ گولی ۹ روپے

فیملین (نسائی خاص)



یہ گولیاں عورتوں کی جملہ پوشیدہ شکایتوں کو دور
کرنے میں اکسیر ہیں۔ سیلان الرحم ماہواری کی بے
قاعدگی اور اسی قسم کی دوسری زنانہ شکایتوں سے
پیدا شدہ نقائص کو دور کرنے میں لاثانی ہیں استقرار
حمل کو مدد دیتی ہیں، گویا عورتوں کے لئے ایک جنرل
ٹانک ہے۔ جس کا متواتر استعمال عورتوں کے نظام
عصبی کو درست کرتاہے جن عورتوں کو اسقاط حمل کی
بار بار شکایت ہوتی ہو ان کے لئے بے حد مفید ہے۔

قیمت مکمل کورس ——— ۴۰ گولی ——— ۲۰ یوم کی خوراک ——— دو روپے بارہ آنے

حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی نمبرا

اپنی طاقت کی حفاظت کریں



جب آپ کی صحت کمزور ہو اور جسم میں خون کم ہو تو

مشہور عالم

مفرّح فولادی

استعمال کریں۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ مقوی اور مقوی دوا آپ کی قوت میں اضافہ کرتی ہے۔ اور کھوئی ہوئی توانائی واپس لاتی ہے۔

قیمت فی شیشی:——————دو روپے آٹھ آنے

الٰہی زمن معدہ من مرنجان۔ دگر چہ رنجیدہ رنجیدہ باشد

معدہ کی خرابیوں کو نظر انداز نہ کیجے۔

کہیں - - - - - - - - - - - - - - - -

معدہ کی خرابیاں آپ کو نظر انداز نہ کردیں۔



ہضمی

ایک بہترین سفوف معدہ ہے جو فعل ہضم کو قدرتی طور پر کام کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اور معدہ کو ہر خرابی سے محفوظ رکھتا ہے۔ حفظ ماتقدم علاج سے بہتر ہے۔ اس لئے ہضمی کا استعمال کیجئے تاکہ آپ کا معدہ ہر خرابی سے محفوظ رہے، مرد اور عورت دونوں کے لئے یکساں مفید ہے۔

قیمت فی شیشی ——————ایک روپیہ چار آنے

تیار کردہ:- حاذق دواخانہ، بندر روڈ۔ کراچی نمبر ۱

غلام محمد:- پرنٹر پبلشر نے ناظر پریس میکلوڈ روڈ سے طبع کرا کر دفتر چراغ راہ کراچی ۱ سے شائع کیا۔